إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ
(الانعام ۱۵۹)
شیعیت
تاریخ وافکار
ایک منفرد علمی، تاریخی اور تحقیقی دستاویز
پروفیسر قاضی محمد طاہر علی الہاشمی
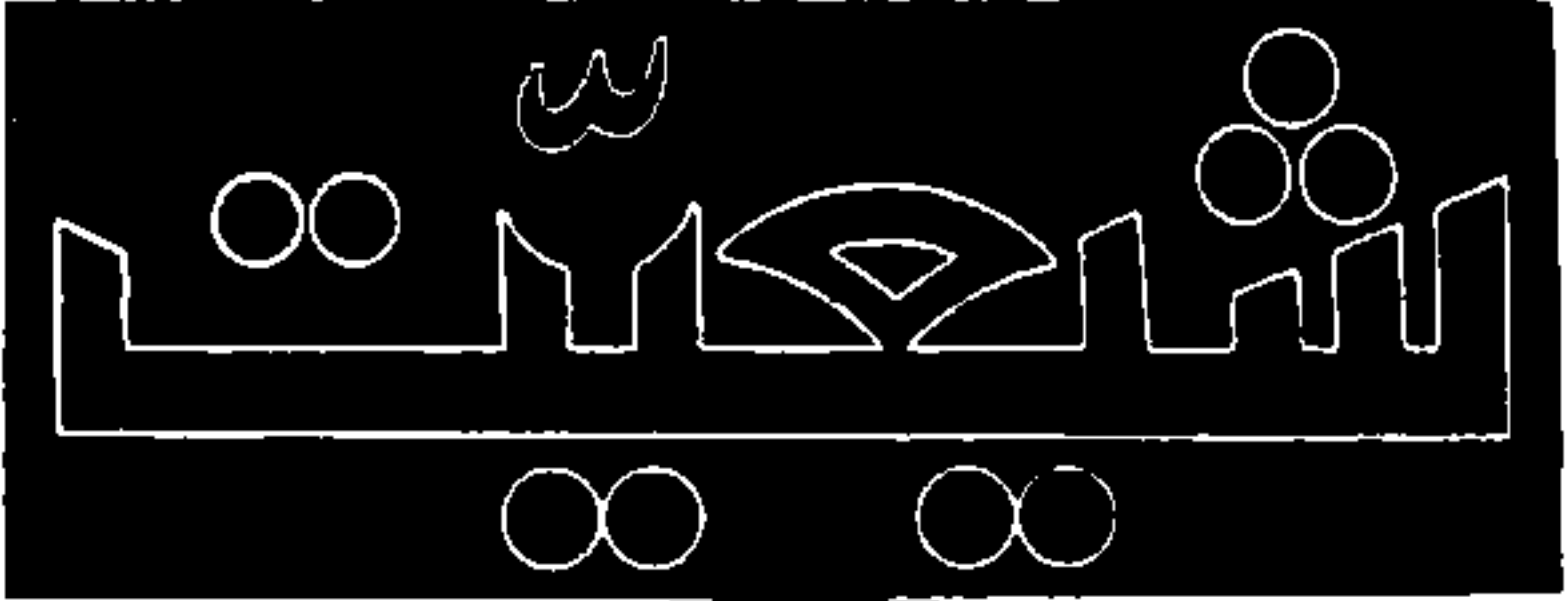
اہل تشیع کے جملہ اہم فرقوں کے عقائد و نظریات اور ان کی مکمل تاریخ

(بترتیب زمانی) از عہد رسالت مآبؐ تا ۳۱، دسمبر ۲۰۰۰ء

ایک منفرد علمی، تاریخی اور تحقیقی دستاویز

پروفیسر قاضی محمد طاہر علی الہاشمی

کتاب	:	شیعیت تاریخ وافکار
مؤلف	:	پروفیسر قاضی محمد طاہر علی الہاشمی
اشاعت اول	:	۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء
سائز	:	۲۳x۳۶x۱۶
ضخامت	:	۸۳۲ صفحات
کمپوزنگ	:	شعیب (نیازی)
تعداد	:	ایک ہزار
زر تعاون	:	۳۰۰ روپے
نگران اشاعت	:	ابوالحسن حفیظ الرحمٰن طاہر جسوال

ملنے کے پتے

۱۔ قاضی چمن پیر الہاشمی اکیڈمی، مرکزی جامع مسجد سیدنا معاویہ چوک، حویلیاں، ہزارہ۔

۲۔ بخاری اکیڈمی دار بنی ہاشم، مہربان کالونی ملتان۔

۳۔ مدرسہ حیدریہ مسجد سیدنا معاویہؓ محلہ حسنین کریمین جسوال ایبٹ آباد۔

۴۔ مولانا الطاف الرحمٰن صاحب جامع مسجد رحمانیہ کیہال ایبٹ آباد

۵۔ مولانا توحید الرحمٰن توحیدی صاحب، ہری پور

انتساب

میں اس حقیر کاوش کو بنام ئے امیر شریعت

خصوصاً قاطع سبائیت و قادیانیت، فاتح ربوہ، فخر السادات سید عطاء المحسن حسنی ہاشمی بخاری،

محترم و مشفق والد ماجد جناب قاضی چمن پیر الہاشمیؒ،

صاحب السیف پیر طریقت مفتی بشیر احمد صاحب پسروریؒ،

ترجمان اہلسنت، جبل استقامت مولانا محمد اعظم طارق صاحب،

جملہ متلاشیان حق

اور

جذبۂ دفاع صحابہؓ واہل بیتؓ سے سرشار، مخلص، جان نثار، اولوالعزم، کفن بدوش اور سربکف مومنین کے نام منسوب کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

پروفیسر قاضی محمد طاہر علی الہاشمی

لائے گا تاب سماعت کس کا دل کس کا جگر
داستان درد و غم ہے داستان عندلیب

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

غیر ممکن ہے کہ حالات کی گتھی سلجھے
"اہل تشیع" نے بہت سوچ کے الجھائی ہے

کے شب ہندوستان آید بروز
مردہ جعفر زندہ روح او ہنوز

ملتے راہر کجا غارت گرے است
اصل او از صادقے یا جعفرے است

الاماں از روح جعفر الاماں
الاماں از جعفران ایں زماں

کس کس سے چھپاؤ گے تحریک ریاکاری
محفوظ ہیں تحریریں مرقوم ہیں تقریریں

اک پردہ وفاداری صد سازش غداری
تعمیر کی ہیں آوازیں تخریب کی تدبیریں

دبے گی کب تک آواز حق ہم بھی دیکھیں گے
رکیں گے کب تک جذبات برہم ہم بھی دیکھیں گے

در زنداں سے دیکھیں یا عروج دار سے دیکھیں
تمہیں رسوا سر بازار عالم ہم بھی دیکھیں گے

چراغ زندگی ہوگا فروزاں ہم نہیں ہوں گے
چمن میں آئے گی فصل بہاراں ہم نہیں ہوں گے

ہمارے بعد ہی رنگ لائے خون شہیداں
یہی سرخی بنے گی زیب عنواں ہم نہیں ہوں گے

مت سوچ "جھنگوی" نہیں ارباب وطن میں
یہ دیکھ فضا شعلہ فشاں ہے کہ نہیں ہے

جو آگ سلگتی رہی اس شیر کے دل میں
اس آگ سے ہر روح تپاں ہے کہ نہیں ہے

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

تمہارے جذبۂ بے باک کی قسم تم نے
شب خزاں کو عطا کی متاع صبح بہار

تمہارے خون سے رنگین ہے داستان وفا
تمہارے عزم پہ نازاں ہے عظمت احرام

تمہارے خون سے رنگینی حنا لے کر
عروس صبح بصد افتخار آئے گی

بجے گی چار طرف فصل گل کی شہنائی
بہار آئے گی بے اختیار آئے گی

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موج طوفاں کا حریف
جانتا میں بھی ہوں عافیت ساحل میں ہے

فقیہ مصلحت بیں سے وہ رند بادہ خوار اچھا
نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں

یہ مدعی اسلام تو ہیں ساتھی ہیں مگر بیگانوں کے
تقویٰ کی وہ بو بھی ان میں نہیں وہ رنگ نہیں ایمانوں کے

وہ تو ہیں کینہ دشمن ان کا غیر سے کیا ذکر
دوستی مگر حضرت آپ کی قیامت ہے

یا گردنِ روزگار راز نجیرے — یا سرکشی زمانہ کا تدبیرے

ایں زاغ وشاں بسے پرید ند بلند — سنگے، چوبے، گزے، خدنگے، تیرے

شبیدِ حق سے عشق کا بتاؤں کیا اصول ہے — کہ جو کہ راہِ حق میں ہم کو موت بھی قبول ہے

اگر تمہاری زندگی میں ہو طعن اصحابِ رسولؐ پر — تو جانے والا کہہ گیا پھر زندگی فضول ہے

عزم راسخ ہو تو پھر خوف سفر کیا معنی؟ — ہو لیے ہے کہ راہ میں شام تو ہو جانے دو!

چراغوں کی حفاظت کرتے کرتے ہوا کا رخ بدلنا آ گیا — کہاں تک آگ برسائے گا سورج ہمیں شعلوں پہ چلنا آ گیا ہے

کسے خبر تھی کہ لے کر چراغ مصطفوی — جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا — ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو — خوف باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

جذبۂ مسلم کی پیدا ہو نہیں سکتی مثال — عشق اس کا غیر فانی الفت اس کی لازوال

سر بکف رہتا ہے وہ ناموس ملت کے لیے — برق ہے باطل کے خرمن کے لیے اس کا جلال

اس کی غیرت کا سمندر موجزن جب بھی ہوا — بہہ گئے خاشاک کی مانند اس میں راجپال

اس کی ہیبت سے سدا کفار تھرّاتے رہے — اس کی سطوت نے کیا اعدائے حق کو پائمال

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق — نے طفل مکتب ہوں نہ تہذیب کا فرزند

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش — میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

ہے غارت چمن میں یقیناً کسی کا ہاتھ — پتوں پہ انگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں میں

یاد رکھیں جب لکھیں تاریخ گلشن کی — میں نے بھی لٹایا ہے چمن میں آشیاں اپنا

میں خود غرض نہیں مرے آنسو پرکھ کے دیکھ — فکر چمن ہے مجھ کو غم آشیاں نہیں

چمن میں تلخ نوائی مری گوارہ کر — کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف — کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے — یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

دین کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے — تیری بربادیوں کے تذکرے ہیں آسمانوں میں

ہم نے تو دل جلا کے سرِ عام رکھ دیا — اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی

فہرست عنوانات

نمبر شمار	نام عنوان	صفحہ نمبر

نمبر شمار	نام عنوان	صفحہ نمبر

نمبر شمار	نام عنوان	صفحہ نمبر

مقدمہ از محقق اہلسنت مولانا ابو ریحان عبدالغفور صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیعیت کیا ہے؟ اسلام کے خلاف یہودیت و مجوسیت کی ملی بھگت کا نام ہے۔
شیعیت نہ صرف یہ کہ یہودیت کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے بلکہ اس کی تخلیق کا مقصد ہی اسلام کے خلاف ایک گھناؤنی سازش تھا۔ یہ دونوں کبھی تو متفق ہو کر اور کبھی صرف ایک دوسرے کی اعانت کے ذریعے ہمیشہ امت مسلمہ کے خلاف ہی کاروائیاں کرتی رہی ہیں اسلام دشمنی دونوں کے خمیر میں داخل ہے فرق صرف یہ ہے کہ یہودیت تو اسلام کی کھلی دشمن ہے جبکہ شیعیت منافقانہ روش اپنا کر مسلمانوں کی صفوں میں رہ کر اسلام کی جڑوں کو دیمک کی طرح چاٹتی رہی ہے۔
اہل تشیع اسلامی تاریخ کے ہر موڑ پر و ہر دور میں اسلام دشمن قوتوں سے ساز باز کر کے ہر اسلامی ریاست کے خلاف منافقانہ کردار ادا کرتے اور عالم اسلام کے امن و استحکام کیلئے خطرہ بنے رہے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی مایہ ناز کتاب "منہاج السنۃ" میں شیعیت کے سیاسی اور نظریاتی اجزاء ترکیبی کا نہایت ہی محققانہ اور مدلل تجزیہ کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں اس پر مفصل گفتگو کی ہے۔
شیعیت پر کسی بھی زاویے سے نظر ڈالی جائے تو وہ اسلام کے بالمقابل اور متوازی ایک مستقل مذہب اور ایک علیحدہ ہی تہذیب محسوس ہوتی ہے اور اسکا مقصد ہر چھوٹے بڑے مسئلے میں جمہور اُمت اور راہ سُنت سے علیحدگی اور انحراف معلوم ہوتا ہے اور ان دونوں کے درمیان عقائد اور علم و عمل کے لحاظ سے اختلاف کی خلیج اتنی وسیع و عمیق ہے کہ اس کو اصولی و بنیادی تبدیلیوں کے بغیر پاٹا نہیں جا سکتا۔

باقاعدہ ایک تحریک کی حیثیت سے تو شیعیت کا سلسلہ اگرچہ عبداللہ بن سبا یہودی سے ملایا جاتا ہے جس کا آسانی سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن شیعیت کے مزاج و منہاج اور خدوخال کو دیکھتے ہوئے اس کا سلسلہ نسب اس سے بھی پہلے مدینہ کے منافقین یہود سے قائم نظر آتا ہے جیسا کہ حضرت مولانا پروفیسر قاضی محمد طاہر الہاشمی مدظلہ نے اپنی زیر نظر کتاب میں بیان کیا ہے۔
تاریخ اسلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعوں کے اکثر فرقوں کے اصول و عقائد، اغراض و مقاصد اور اہداف و کردار اسلام دشمنی پر مبنی ہیں اور انہوں نے تاریخ میں جمہورِ امت سے نہ صرف علیحدگی بلکہ انکی بیخ کنی، ان کے خلاف سازش اور ان کے دشمنوں سے دوستی کا

عمل برابر جاری رکھا ہے اور اس مقصد کیلئے انہوں نے تمام امکانی ذرائع اپنائے ہیں۔ تقیہ اور اخفاء و رازداری چونکہ ان کے اصول دین میں ہے اس لئے اپنے عقائد و مقاصد کی کبھی کھل کر وضاحت نہیں کی جس کی وجہ سے اہل سنت ان کے عزائم و مقاصد سے نہ تو پوری طرح واقف ہو سکے اور نہ ان کا اصل چہرہ ہی پہچان سکے نتیجۃً وہ شجر ملت کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھوکھلا کرتے رہے اور کاروانِ امت کی پیش قدمیوں کی راہ میں برابر رکاوٹ بنے رہے ہیں۔ شیعیت کے عقائد و مقاصد تو اگرچہ پوری طرح کبھی واضح اور متعین نہیں رہے لیکن اسلام دشمنی اور مسلم کشی ان کے تمام فرقوں میں قدرِ مشترک کے طور پر قائم رہی ہے۔

اپنے تاریخی سفر میں اس نے ہر اس عقیدے اور عمل کو اپنا لیا جو جمہور امت اور مسلک اہل سنت کے خلاف پڑتا یا اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ جنگ جمل و صفین میں اسی جماعت نے مسلمانوں کو آپس میں لڑایا۔ اس کے بعد بھی یہی جماعت مسلمانوں کے درمیان فتنہ و فساد کی آگ بھڑکاتی اور ان میں خانہ جنگی بپا کرتی رہی ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کو جتنا نقصان شیعہ فرقوں سے پہنچا ہے وہ ایک المناک اور افسوسناک تاریخی حقیقت ہے۔ اپنے ان مقاصد کے حصول کیلئے انہوں نے اپنی تاریخ میں مختلف بھیس بدلے، متعدد بہروپ بھرے اور طرح طرح کی من گھڑت اصطلاحات ایجاد کیں چنانچہ

الف۔۔۔ کبھی تو انہوں نے حُبِ علیؓ اور محبت اہل بیت کا دعویٰ کیا مگر ان کے دلوں میں دراصل بغض معاویہؓ و صحابہؓ اور اہل بیتؓ و اہل سنت کی مخالفت اور عداوت کا جذبہ موجزن تھا۔

ب۔۔۔ اور کبھی "اہل بیت" کے مفہوم کو محدود کر کے اس سے رسول ﷺ کی صاحبزادی سیدہ فاطمہؓ کے علاوہ دیگر صاحبزادیوں اور ازواجِ مطہرات کو خارج کر دیا۔ پھر بجائے ان کی پیروی کے ان کا نام اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

ج۔۔۔ اسی طرح "خلافت" کی جگہ "امامت" کی اصطلاح اپنائی اور تبرا کو اپنا اصول بنایا۔

د۔۔۔ قرآن مجید میں معنوی تحریف لانے کے لئے "باطنیت" کا حربہ اپنایا جس کے تحت اسلام کے معنی و مفہوم اور مقصد و نصب العین کو برباد کرنے کا ایک سوچا سمجھا دور رس اور دیرپا منصوبہ تیار کیا گیا۔ چنانچہ کہا جانے لگا کہ قرآن کی ہر آیت کا ایک باطنی مفہوم ہے جسے ہمارے ائمہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور انسان باطنی ترقی کے ذریعے اس مقام تک جا پہنچتا ہے جہاں شریعت

بے معنی ہو جاتی ہے۔

اسی کے ساتھ دوسری پیوندکاری انہوں نے یہ کی کہ اپنے کو خواص مومنین اور دوسروں کو عوام و جمہور کے خانوں میں بانٹا اور پھر یہ دعویٰ کیا کہ قرآن کی تاویل، اصل ہے جو ہمارے حصے میں آئی ہے۔ جبکہ عوام کے ہاتھ میں صرف قرآن کا متن اور تنزیل ہے۔ اس بہانے قرآن کی ایسی تاویل بلکہ تحریف کی کہ وہ ربانی ہدایت کے عالمی صحیفے کی بجائے ان کے مزعومہ اہلبیت کا قصیدہ اور تبرا نامہ نظر آنے لگا اور اس کے پیغام کی اصلیت و حقیقت فوت اور اس کا مقصد و مفہوم، خبط و مفقود ہو کر رہ گیا۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے شیعیت و باطنیت کے اس مہلک تاویلی حربے کی نشاندہی کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ!

"انہوں نے اپنی ذہانت سے اس نکتہ کو سمجھا کہ الفاظ و معانی کا یہ رشتہ، امت کی پوری زندگی اور اسلام کے فکری و عملی نظام کی بنیاد ہے اور اسی سے اس کی وحدت اور اپنے سرچشمہ اور اپنے ماضی سے اس کا ربط قائم ہے اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے اور دینی الفاظ و اصطلاحات کے مفہوم و معانی متعین نہ رہیں یا مشکوک ہو جائیں تو یہ امت ہر دعوت اور ہر فلسفہ کا شکار ہو سکتی ہے اور اس کے سنگین قلعہ میں سینکڑوں چور دروازے اور اس کی مضبوط دیواروں میں ہزاروں شگاف پیدا ہو سکتے ہیں۔۔۔۔ الفاظ شرعی کے متواتر و متوارث معنی و مفہوم کا انکار اور قرآن و حدیث کے ظاہر و باطن اور مغز و پوست کی تقسیم ایسا کامیاب حربہ تھا جس سے اسلام کے نظامِ اعتقاد و نظام فکر کے خلاف سازش کرنے والوں نے ہر زمانہ میں کام لیا۔ اسلام کی پوری عمارت کو اس طرح آسانی سے ڈائنا میٹ کیا جا سکتا تھا اور اسلام کے ظاہری خول کے اندر ریاست اندرونِ ریاست قائم کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعد کی صدیوں میں جن فرقوں نے اور منافقین کی جس جماعت نے نبوتِ محمدی کے خلاف بغاوت کرنی چاہی اس نے باطنیت کے اس حربہ سے کام لیا اور اس معنوی تواتر و توارث کا انکار کر کے پورے نظامِ اسلامی کو مشکوک و مجروح بنا دیا اور اپنے لئے دینی سیادت بلکہ نئی نبوت کا دروازہ کھول لیا۔ ایران کی بہائیت اور ہندوستان کی قادیانیت اس کی بہترین مثالیں ہیں"

(تاریخ دعوت و عزیمت جلد اص ۱۲۵، ۱۲۷)

دینی و فکری محاذ کی طرح سیاسی و معاشرتی محاذ پر بھی باطنیت نے اسلام کو برابر اور ناقابلِ معافی اور تلافی نقصان پہنچایا۔ ابتدائے اسلام میں عباسیوں کی حمایت کے پردے میں

عجمیت اور شعوبیت نے عربیت کو شکست دی جو اسلامیت کا دوسرا نام تھی۔ پھر خلافتِ عباسیہ کے خلاف بغاوتوں کی ہمت افزائی کرتی رہی جس کے نتیجے میں متعدد شیعی حکومتیں قائم ہو گئیں جو خلافتِ عثمانیہ کے لئے دردِ سری رہیں اور مسلمانوں کے متحدہ محاذ کو سبوتاژ کرتی رہیں جس کے نتیجے میں پہلے خلافتِ عباسیہ، پھر خلافتِ عثمانیہ اور آخر میں ہندوستان کی سلطنتِ مغلیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

محدث عصر علامہ محمد انور کشمیری فرماتے ہیں کہ "اکثر تخریب السلطنة الاسلامية على يدى الروافض خذلهم الله ولعنهم الله۔ (فیض الباری صفحہ ۱۷۱ جلد ۲)

ترجمہ۔ اکثر اسلامی حکومتوں کی بربادی روافض کے ہاتھوں ہوئی۔ اللہ ان کو رسوا کرے اور ان پر اس کی مار پڑے۔

الغرض شیعیت کے حربۂ باطنیت کا مقصد علم و عمل اور سیاست و معاشرت کے ہر محاذ پر جمہور امت سے اختلاف اور مخالفت تھی۔ تاویل کا دروازہ کھول کر اس نے اسلامی عقائد و نظامِ حیات اور اقدار کو تہ و بالا کرنے کی سعی نا مشکوری اور خوب کو ناخوب اور حرام کو حلال کر دکھایا۔ اسلامی فکر میں عقلیت و اعتزالیت اور یونانیت و عجمیت کی ہمت افزائی کی اور وحی الٰہی کی جگہ عقل اور اقوالِ اکابر کو اہمیت دی۔ اس طرح دین کے سیدھے راستے کو چھوڑ کر چند مفروضات و روایات کے پیچھے چل پڑی اور قیامت تک کیلئے دین میں تحریف و انحراف کا دروازہ کھول دیا۔

پھر جمہور امت اور راہِ سنت سے متصادم اپنی ان تاویلات بلکہ تحریفات کو اہلِ اسلام کی تردید و تغلیط کی زد سے بچانے، اپنے اصلی عقائد و عزائم کو مخفی رکھنے اور مسلمانوں کی صفوں میں چھپے رہنے کی غرض سے تقیہ اور کتمان جیسی خلافِ اسلام اصطلاحیں ایجاد کیں اور انکو دین کا درجہ دیا۔

تقیہ کا مطلب ہوتا ہے اپنے قول یا عمل سے امرِ واقعہ اور اصل حقیقت کے یا اپنے عقیدہ و ضمیر اور مذہب و مسلک کے خلاف ظاہر کر کے دوسروں کو دھوکے اور فریب میں مبتلا کرنا۔ اور کتمان کا معنی ہوتا ہے اپنے اصل عقیدے اور مذہب و مسلک کو چھپانا اور دوسروں پر ظاہر نہ کرنا۔

شیعیت، جیسا کہ بتایا جا چکا ہے چونکہ یہودیت کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے اور قرآن کریم نے یہ دونوں خصلتیں تلبیس الحق بالباطل اور کتمانِ حق کے عنوان سے یہود کی بھی بیان کی ہیں اس لئے شیعیت کی یہ دونوں اصطلاحیں بھی در حقیقت یہودیت زادی ہی ہیں۔ البتہ فرق کیساتھ کہ یہود نے ان کو صرف عمل کی حد تک اپنایا تھا انہیں دین و ایمان نہ بنایا تھا اور نہ ان کو فرض و واجب اور ضروری

ہی ٹھہرایا تھا جبکہ شیعوں نے نہ صرف یہ کہ اس کو اپنا دین و ایمان بنایا بلکہ دین کے دس میں سے نو حصے صرف تقیے میں بتائے۔ لا دین (وفی روایۃ لا ایمان) لمن لا تقیۃ لہ۔ تسعۃ اعشار الدین فی التقیۃ۔ (اصول کافی)

اسی طرح اس کو نماز کی طرح کا فرض اور ضروری قرار دیا۔ تارک تقیہ کو تارک صلوٰۃ کی طرح کا تارک فرض گنہگار بتلایا۔ تارک التقیۃ کتارک الصلوۃ۔ (من لا یحضرہ الفقیہ)

اسی تقیہ اور کتمان کا ہی نتیجہ ہے کہ شیعیت کو عام طور پر اسلام کا ہی ایک فرقہ یا مکتب فکر کہا اور سمجھا جاتا رہا ہے اور اہل تشیع بھی دنیا کو یہی باور کراتے رہے ہیں۔

جبکہ یہ واقعہ یوں نہیں ہے اس لئے شیعیت کے حقیقی خدوخال، اس کے بنیادی عقائد مقاصد اور اصل اغراض و اہداف سے پردہ اٹھانا اور اس کا اصل چہرہ اہل اسلام کو دکھانا ضروری تھا۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے حضرت مولانا پروفیسر قاضی محمد طاہر الہاشمی صاحب کو جنہوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس موضوع پر ایک جامع، پر از معلومات اور فکر انگیز ضخیم کتاب تصنیف فرمائی۔ جسکا مطالعہ انشاء اللہ چشم کشا، بصیرت افروز اور معلومات افزا ہوگا۔ اس موضوع پر اس انداز کی اتنی مفصل کتاب اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آئی۔

جناب قاضی صاحب اب علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں رہے۔ اس سے قبل ان کی کئی علمی و تحقیقی کتب اہل علم سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں ان کی زیر نظر علمی و تحقیقی کتاب "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" کے مصداق کسی مقدمہ یا پیش لفظ کی محتاج نہ تھی لیکن انہوں نے مجھے بھی اس سعادت میں شریک کرنا چاہا اس لئے ان کی خواہش پر یہ چند سطور تحریر کر دی ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت ان کی اس محنت کو شرف قبولیت سے نوازے اہل اسلام کیلئے اسکو نافع اور مفید بنائے آمین

یا رب العالمین بجاہ سید المرسلین و خاتم النبیین صلی اللہ علیہ علی آلہ الطیبین و صحابۃ الاکرمین الی یوم الدین

ابو ریحان سیالکوٹی

۱۶ شوال ۱۴۲۱ھ / ۱۲ جنوری ۲۰۰۱ء

عرض مؤلف

الحمدللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ○ صدق وعدہ و نصر عبدہ ○ و اعز جندہ و ھزم الاحزاب وحدہ ○ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہ ولا نبوۃ بعدہ ○ لارسول بعدہ ولارسالۃ بعدہ ○ لا معصوم بعدہ ولا عصمۃ بعدہ ○ الذی قال فی خطبۃ حجۃ الاخیرۃ ○ انّی قد ترکت فیکم کتاب اللّٰہ ان اعتصمتم بہ فلن تضلّوا بعدہ ○ و علیٰ اھل بیتہ و اصحابہ خصوصاً علیٰ خلفائہ الراشدین العادلین الھادین المھتدین المھدیین ابی بکر و عمر و عثمان وعلی و حسن و معاویۃ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنھم ○ الّذین ھم خلاصۃ العرب العرباء و خیر الخلائق بعد الانبیاء وھم کالنجوم فی السماء للاقتداء والاھتداء و ھم الذین اوفوا عھدہ ○ امّا بعد!

زیرِ نظر کتاب ”شیعیت، تاریخ وافکار“ جو اہل تشیع کے تمام فرقوں کی اجمالی تاریخ بترتیب زمانی از ابتدا تا اختتام بیسویں صدی (یعنی ۳۱ دسمبر ۲۰۰۰ء مطابق ۴ شوال ۱۴۲۱ھ) ان کے عقائد ونظریات، ان کی اسلام اور ملّت اسلامیہ کے خلاف سازشوں وریشہ دوانیوں اور ان کے متعلق اکابرین امت کی آراء وفتاویٰ پر مشتمل ہے ہدیۂ قارئین کی جارہی ہے۔

لائے گا تاب سماعت کس کا دل کس کا جگر　　　داستانِ دردوغم ہے داستانِ عندلیب

اس کتاب کی تالیف کا محرک ایک سوال ہے جو ایک ”تقریب سعید“ میں وقفہ سوالات کے دوران سامنے آیا۔

مخدومی ومکرّمی مولانا شفیق الرحمٰن صاحب ڈسٹرکٹ خطیب ایبٹ آباد کی دعوت پر راقم الحروف نے جامعہ انوار الاسلام میں دورۂ تفسیر میں شریک طلباء وطالبات کو بسلسلہ ”تقابل ادیان۔ بعنوان اسلام اور شیعیت“ تقریباً چار گھنٹوں پر محیط ایک طویل لیکچر دیا۔ جس کے آخر میں شرکاء کی جانب سے ایک یہ سوال بھی سامنے آیا کہ

”کسی ایک ایسی کتاب کا نام بتائیں جس میں اہل تشیع کے تمام فرقوں کی زمانہ بزمانہ تاریخ مختلف ادوار میں ان کا عروج واقتدار، ان کے عقائد ونظریات اور اسلام وملّت اسلامیہ کے خلاف ان کی سازشوں اورریشہ دوانیوں کا ذکر ہو۔“

اس سوال سے شرکاء کے ذوق تحقیق کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ راقم نے وقتی طور پر مختلف کتابوں کے نام بتائے لیکن بعد میں محسوس ہوا کہ سوال ہنوز جواب طلب ہے اسی اثناء میں مولانا علی شیر حیدری صاحب ہزارہ کے دورہ پر ایبٹ آباد تشریف لائے۔ راقم الحروف نے علماء کرام کی موجودگی میں اس سوال کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق ایسی کتاب کی اشد ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس کتاب کی تصنیف و تالیف کی عظیم ذمہ داری بھی راقم الحروف پر ہی ڈال دی۔

چنانچہ موصوف کے حکم کی تعمیل میں راقم الحروف نے اپنی تمام تر کم علمی اور کمزوری کے باوجود اس سوال کا جواب تیار کرنا شروع کر دیا۔ زیر نظر کتاب کی تالیف کے دوران ترجمان اہلسنت، جبل استقامت مولانا محمد اعظم طارق صاحب ۷ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ مطابق ۱۱ جون ۲۰۰۰ء بسلسلہ "پیام امن کارواں" حویلیاں تشریف لائے تو انہوں نے بھی کتاب کی تکمیل کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ جو الحمد للہ اب طباعت کے مراحل سے گذر کر قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہے۔

اس کتاب کی تصنیف و تالیف کا بنیادی مقصد اہل سنت والجماعت کے تعلیم یافتہ طبقے کو اہل تشیع بالخصوص فرقہ اثنا عشریہ کی تاریخ اور عقائد و نظریات کے بارے میں مختصر مگر جامع معلومات یکجا فراہم کرنا ہے تاکہ "شیعہ سنی اتحاد" کے جھوٹے مکارانہ اور پر فریب دعویٰ کی قلعی کھل سکے۔

علاوہ ازیں قارئین کرام اس کتاب میں "تخلیق و تحقیق" کا حسین امتزاج بھی پائیں گے۔ یہ واضح رہے کہ اس میں اہل تشیع کے عقائد و نظریات کا جواب شامل نہیں ہے کیونکہ علماء حق اس فریضہ کی ادائیگی سے پہلے ہی بطریق احسن سبکدوش ہو چکے ہیں۔

فجزاهم الله تعالى احسن الجزاء

اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال رہی تو اہل حق کی ان خدمات پر مشتمل ایک مستقل کتاب "تاریخ محاسبہ سبائیت" ہدیہ قارئین کی جائے گی۔

راقم الحروف نے کئی ماہ کی جگر سوزی اور جگر کاوی محض اس لئے برداشت کی ہے کہ اہل اسلام شیعیت کے خطرناک اور عظیم ترین فتنے سے آگاہ ہو کر اپنے دین و مذہب کا تحفظ کر سکیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اہل تشیع قیام پاکستان کے ساتھ ہی شیعیت کے فروغ بالفاظ دیگر دین اسلام کو العیاذ باللہ مٹانے اور پاکستان پر مکمل طور پر چھا جانے کی کوششوں میں معروف ہو گئے جن میں وہ اپنی توقعات سے بھی بڑھ کر کامیاب ہوئے پھر ایران میں جناب خمینی کی زیر قیادت ایک خالص شیعی حکومت کے قیام کے بعد پاکستان میں شیعوں کی سرگرمیوں میں خطرناک حد تک اضافہ ہو گیا اور انہوں نے اس قدر زور پکڑ لیا کہ ان کے سامنے جنرل محمد ضیاء الحق کی مضبوط فوجی حکومت بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئی۔ موصوف کے پورے دور میں یہ طبقہ ملکی سیاست پر چھایا رہا

حتی کہ اس نے جنرل صاحب کو راستے سے ہٹا کر بے نظیر اور آصف علی زرداری رافضی کو اقتدار دلوا دیا۔ اس طرح اب اس طبقے نے پاکستان میں برصغیر کی تاریخ کے دو مشہور کردار "سید برادران" کی طرح باقاعدہ "بادشاہ گر" کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

محرم الحرام کے دوران پاکستان مکمل طور پر ایک شیعہ ریاست کا نقشہ پیش کر رہا ہوتا ہے اور سرکاری ذرائع ابلاغ بالخصوص ریڈیو اور ٹیلی ویژن "مرکزی امام باڑے" میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جبکہ غیر سرکاری ذرائع ابلاغ بھی "ایرانی بھتے" کے زور پر کسی سے پیچھے دکھائی نہیں دیتے۔

اس حیرت انگیز ترقی کی وجہ سے شیعوں کو تو اپنی منزل قریب دکھائی دے رہی ہے مگر ہمارے اکثر مداہن، بے حس اور بے حمیت سنی قائدین اور "علمائے اسلام" نے ایرانی "چمک" سے متاثر ہو کر تصور "اتحاد بین المسلمین" کی افیون اتنی زیادہ مقدار میں استعمال کی ہے کہ اس کے نشے کی وجہ سے انہیں وہ آثار نظر نہیں آرہے۔

اگر ان کی غفلت اور مصلحت بلکہ مداہنت کا یہی عالم رہا تو (اللہ نہ کرے) بہت جلد اہل تشیع پاکستان میں ایرانی انقلاب درآمد کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک اک عرض تمنا ہے سو وہ ہم کرتے رہیں گے

لہٰذا ملت اسلامیہ کے ہر فرد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ کتاب و سنت، رسول اکرم ﷺ، صحابہ کرامؓ اور اہل بیت عظامؓ کی عزت و آبرو اور اہل سنت والجماعت کے مذہب و حقوق کے مکمل دینی، سیاسی اور قانونی تحفظ کی خاطر ہر مصلحت، لالچ، مفاد اور خوف سے بے پروا ہو کر اس عظیم فتنے کے خلاف اٹھ کھڑا ہو اور اپنے تمام وسائل بروئے کار لا کر امت مسلمہ کو اس

"ضلالت مبین" سے بچائے۔

حرمت کی ایک حد ہوتی ہے "رواداری اور بے غیرتی" میں زمین و آسمان کا فرق ہے اندھی اور غیر مشروط رواداری ہی وہ خوفناک اور خطرناک طرزِ عمل ہے جس سے اہل سنت نے ہمیشہ ناقابل تلافی نقصانات برداشت کیے ہیں۔

شیعیت درحقیقت اسلام کے خلاف یہود و مجوس کی ایک خفیہ سازش ہے اور یہ وہ کفر ہے جس پر اسلام کا لیبل لگا کر مسلمانوں کو چودہ صدیوں سے مسلسل دھوکہ دیا جارہا ہے جس کا حقیقی اور اصلی اسلام کے ساتھ کوئی دور کا بھی واسطہ اور تعلق نہیں ہے۔

شیعیت دراصل یہودیوں کی ایک مستقل اور ذیلی سیاسی تحریک اور اسلام کی نظریاتی سرحدوں پر ایک منظم اور بھرپور یلغار ہے۔

شیعیت شکر میں ملی ہوئی زہر ہلاہل ہے۔

شیعیت "یہودیت اور سبائیت" کے دودھ سے پلا ہوا وہ طویل العمر، منقش، نظر فریب، زہرناک اور خونی اژدھا ہے جس نے اہل سنت کی بے شمار نسلوں کو "موت کی نیند" سلایا۔

شیعیت یہودیوں، عیسائیوں، مجوسیوں اور سبائیوں کی انتقامی تحریک کا نام ہے۔

شیعیت اللہ سے بیزاری اور نبی اکرم ﷺ سے اعلانیہ غداری کا نام ہے۔

بلاشبہ اس وقت شیعیت نہ صرف پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے سب سے بڑا اور خطرناک فتنہ ہے۔ ان تمام دعووں کی تفصیل زیر نظر کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔

اثر کرے نہ کرے سن تو لے میری فریاد نہیں داد کا طالب یہ بندہ آزاد

کتاب کے آخر میں اثنا عشری عقائد و نظریات کے عنوان کے تحت توہین انبیاء، توہین صحابہؓ اور توہین اہل بیتؓ پر مبنی اہل تشیع کی انتہائی دل آزار اور ناقابل برداشت عبارات دل پر جبر کر کے اور بکثرت توبہ و استغفار کرتے ہوئے محض "نقل کفر کفر نباشد" کے اصول کے تحت نقل کی ہیں۔ اس پر راقم ملت اسلامیہ سے بھی معذرت خواہ ہے۔

بے باکی تنقید پہ ناخوش تو ہو لیکن جب آئینہ دیکھو گے ہمیں یاد کرو گے

راقم الحروف اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے اس کا بہتر فیصلہ اہل علم غیر متعصب، غیر جانبدار اور منصف مزاج حضرات ہی کر سکتے ہیں۔

فلن کنت لاتدری فتلک مصیبة وان کنت تدری فالمصیبة اعظم

قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ زیر نظر کتاب "شیعیت، تاریخ و افکار" کا پوری دلجمعی، بکمال یکسوئی اور مکمل غور و فکر کے ساتھ مطالعہ فرمائیں۔

راقم الحروف اپنے جملہ احباب و معاونین کا بے حد ممنون اور شکر گزار ہے جن کے مخلصانہ تعاون سے زیر نظر کتاب زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔

آخر میں باری تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ غلطیوں اور لغزشوں کو معاف کرے اور اس حقیر کاوش کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے اسے امت مسلمہ کی ہدایت، اصلاح اور خواب غفلت سے بیداری کا ذریعہ بناوے آمین

الحمد للّٰہ علیٰ وضوح الحق و فضوح الباطل۔ انّ الحق لا یعرف بالرجال و انّ الرجال یعرفون بالحق۔ والحق لحق بالاتباع فماذا بعد الحق الّا الضلال فانّیٰ تصرفون۔

ان ارید الّا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الّا باللّٰہ

پروفیسر قاضی محمد طاہر علی الہاشمی
خطیب مرکزی جامع مسجد
سیدنا معاویہؓ چوک حویلیاں ہزارہ
۴ شوال ۱۴۲۱ھ
۳۱ دسمبر ۲۰۰۰ء

شیعی اقتدار (جزوی یا مستقل) کی ایک جھلک تاریخ کے آئینے میں

۱۔	مختار ثقفی	۶۶ھ	تا	۶۷ھ
۲۔	خلافت عباسیہ	۱۳۲ھ	تا	۶۵۶ھ
۳۔	خلافت ادریسیہ	۱۷۹ھ	تا	۲۹۶ھ
۴۔	حکومت طاہریہ (ایران)	۲۰۵ھ	تا	۲۵۹ھ
۵۔	دولت علویان (زیدیہ)	۲۵۰ھ	تا	۳۱۶ھ
۶۔	قرامطہ بحرین وملتان	۲۸۲ھ	تا	۳۷۵ھ، ۴۰۱ھ
۷۔	حکومت عبیدیہ یا فاطمی حکومت	۲۹۷ھ	تا	۵۶۷ھ
۸۔	حکومت آل بویہ	۳۲۰ھ	تا	۴۴۸ھ
۹۔	حسن بن صباح اور اس کے جانشین	۴۸۳ھ	تا	۶۵۵ھ
۱۰۔	عہد ایلخانیہ	۶۷۰ھ	تا	۶۹۳ھ
۱۱۔	عہد قرا قوینلو	۷۸۰ھ	تا	۸۷۲ھ
۱۲۔	عہد آق قوینلو	۷۸۰ھ	تا	۹۰۸ھ
۱۳۔	امیر تیمور اور اس کے جانشین	۷۸۲ھ	تا	۹۰۶ھ
۱۴۔	سلاطین صفویہ	۹۰۵ھ	تا	۱۱۴۸ھ
۱۵۔	نادر شاہی عہد	۱۱۴۸ھ	تا	۱۱۶۳ھ/۱۷۳۵ء تا ۱۷۵۰ء
۱۶۔	عہد زندیہ	۱۱۶۳ھ	تا	۱۱۹۳ھ
۱۷۔	عہد قاچاریہ	۱۲۱۰ھ	تا	۱۳۴۷ھ/۱۷۹۶ء تا ۱۹۲۳ء
۱۸۔	پہلوی عہد	۱۹۲۵ء	تا	۱۹۷۹ء
۱۹۔	خمینی انقلاب	۱۹۷۹ء	تا	حال (۳۱ دسمبر ۲۰۰۱ء) جاری ہے

ہندوستان میں شیعہ ریاستیں

۲۰۔	بہمنی سلطنت	۷۴۸ھ	تا	۹۳۳ھ
۲۱۔	عادل شاہی سلطنت	۸۹۵ھ	تا	۱۰۹۷ھ
۲۲۔	قطب شاہی سلطنت	۹۱۸ھ	تا	۱۱۱۵ھ

۲۳۔ نظام شاہی سلطنت ۹۰۳ھ تا ۱۰۱۶ھ

۲۴۔ مغلیہ سلطنت {بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں، بہادر شاہ اول}

۲۵۔ سید برادران کا عہد در عہد متاخر شاہان مغل

۲۶۔ نوابان بنگال ۱۷۴۰ء تا ۱۷۶۵ء

۲۷۔ نوابان اودھ ۱۷۲۳ء تا ۱۸۵۶ء

۲۸۔ راجگان رام پور حکومت برطانیہ کے زیر سایہ

۲۹۔ راجگان خیر پور حکومت برطانیہ کے زیر سایہ

۳۰۔ راجگان محمود آباد وغیرہ حکومت برطانیہ کے زیر سایہ

۳۱۔ کشمیر میں جزوی اقتدار کے علاوہ چک خاندان کی صورت میں مستقل حکومت {۱۵۵۲ء تا ۱۵۸۶ء}

اہل تشیع پاکستان میں جزوی طور پر تو ہمیشہ ہی شریک اقتدار اور کلیدی مناصب پر قابض رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بعض دفعہ مستقل اقتدار حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوئے۔ شیعی اقتدار کے ان تمام ادوار کی تفصیل زیر نظر کتاب میں اپنے اپنے مقام پر ملاحظہ فرمائیں۔

لفظ "شیعہ" کے لغوی و اصطلاحی معنی

"شیعہ" مادہ شیع، شی ع۔ شایع یشایع مشایعۃ۔ متابعت، کسی کے پیچھے چلنا، شیعہ اسم بمعنی دوست، پیروکار، جماعت، گروہ، رفقاء، کسی کے پیچھے چلنے والے، مطیع و فرماں بردار، مدد کرنے والا۔ آدمی کے پیروکار اور مددگار، فرقہ، واحد، تثنیہ، جمع، مذکر اور مؤنث سب کے لئے یکساں ہے۔ وہ لوگ جن سے انسان قوت حاصل کرتا ہے اور وہ لوگ اس کے ارد گرد پھیلے رہتے ہیں۔ اسی سے بہادر کو مشیع کہا جاتا ہے۔ شیعہ کی جمع شیع و اشیاع آتی ہے۔

القدریۃ شیعۃ الدجال۔ قدریہ دجال کے گروہ ہیں۔ تشیّع "ش ی ع"۔ شیعہ فرقہ سے منسوب۔ تشیّع شیعہ ہونا، شیعہ ہونے کا دعویٰ کرنا۔

{تاج العروس للزبیدی صفحہ ۴۰۵ جلد ۵، المنجد صفحہ ۶۲۹، فیروز اللغات اردو صفحہ ۸۵۵، فیروز اللغات فارسی صفحہ ۹۰، اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۹۸ جلد ۱۱، مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۲۴۸ جلد ۱، مفردات القرآن صفحہ ۱۵۰ از راغب اصفہانی، لغات الحدیث صفحہ ۱۲۲ جلد ۲ از وحید الزمان}

اصطلاح میں شیعہ سے مراد وہ فرقہ ہے جو حضرت علیؓ کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کا حقدار مانتا ہے امامیہ مذہب کا پیرو۔ وہ لوگ جو مذہب امامیہ رکھتے ہیں اور حضرت علیؓ کے سوا حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کو نہیں مانتے۔ شیعہ سے مراد دوستداران علیؓ و اولاد علیؓ، اثنا عشری امامت بالنص کے قائل لوگ ہیں۔ شیعہ ایک فرقہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علیؓ کو امام جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کی خلافت پر نص کر دیا تھا اور امامت ہمیشہ آپؓ کی اولاد میں رہے گی دوسرے خاندان میں نہیں جا سکتی۔ اگلے پچھلے فقہاء اور اہل کلام کی اصطلاح میں "شیعہ" علیؓ و اولاد علیؓ کے پیروکاروں کو کہا جاتا ہے۔

النوبختی کا قول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد امت کے تین گروہ ہو گئے۔

۱۔ شیعہ: یعنی علی بن ابی طالب کے پیروکار۔

۲۔ انصار: جنہوں نے امامت کی سعی کی اور سعد بن عبادہ کو امیر بنانا چاہا۔

۳۔ وہ گروہ جس نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت کی۔ (فرق الشیعہ صفحہ ۱، مقالات الاسلامیین للاشعری)

جو شخص خلافت راشدہ کا منکر اور اس کو غیر شرعی قرار دیتا ہے اور نص سے حضرت علیؓ کی

خلافت ثابت کرتا ہے وہ شیعہ ہے۔ فرقوں کی تقسیم رسول خدا ﷺ کی وفات کے فوراً بعد ہوگئی تھی جبکہ ابوبکر صدیقؓ تخت خلافت پر بیٹھ چکے تھے۔ (شیعہ ہی اہلسنت ہیں صفحہ ۴۳ مولفہ ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی)

جن اصحاب نے حضرت علیؓ کو نبی کریم ﷺ کے بعد خلیفہ بلا فصل مانا وہ شیعہ کہلائے اور جنہوں نے حضرت علیؓ کو چھوڑ کر ابوبکر صدیقؓ کو خلیفہ مانا وہ بعد میں چل کر اہل سنت کہلائے اور یہی جھگڑا چودہ سو سال سے شیعوں اور سنیوں میں چلا آرہا ہے اور ملوانوں کے شور و غل سے ختم نہیں ہو سکتا۔ (حقیقت فقہ حنفیہ صفحہ ۱۵۵ مولفہ غلام حسین نجفی)

رافضی کے لغوی و اصطلاحی معنی

رَفَض کا لغوی معنی ہے چھوڑ دینا اور رافضی چھوڑ دینے والے کو کہتے ہیں۔ المنجد میں "الرَّافضة" کے معنی ہیں۔ لڑائی وغیرہ میں اپنے پیشوا اور رہنما کو چھوڑ دینے والا گروہ۔ اس کی جمع روافض ہے۔ اسی سے ان کا یہ قول ہے۔ لا خیر فی الروافض "یعنی روافض میں بھلائی بالکل نہیں۔ شیعوں کی ایک جماعت۔ نسبت کے لئے رافضی۔

علامہ وحید الزمان لکھتے ہیں کہ "رفضونا فھم الروافض" امام زید بن علی بن حسینؓ نے فرمایا ان لوگوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا یہی رافضی ہیں۔ خبیث جن کے پیدا ہونے کی خبر آنحضرت ﷺ نے دی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ امام زید بن علیؓ نے ہشام بن عبدالملک پر خروج کرنا چاہا سچے شیعہ اولیٰ یعنی اہلسنت والجماعت نے آپؒ کی رفاقت اختیار کی یہاں تک کہ امام ابو حنیفہؒ نے بھی مال و زر سے آپ کی مدد کی اور پوشیدہ طور پر آپ کی اعانت اور امداد کے لئے اور ہشام کو منصب خلافت سے ہٹانے کے لئے فتویٰ دیا۔ آپ کے لشکر میں کچھ نام کے شیعہ بھی تھے جو اب رافضی کہلاتے ہیں انہوں نے حضرت زیدؒ سے کہا کہ تم شیخین یعنی "حضرت ابو بکرؓ و عمر فاروقؓ" پر تبرا کرو تو ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔ آپ نے اس سے انکار کیا اور فرمایا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا وہ میرے نانا یعنی رسول اللہ ﷺ کے وزیر و مشیر اور رفیق خاص تھے۔ تب ان جھوٹے شیعوں نے آپؒ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس وقت آپ نے یہ فرمایا۔ ان لوگوں نے ہم کو چھوڑ دیا یہی روافضہ ہیں۔ اس کے بعد آپ شہید کئے گئے سولی پر چڑھائے گئے۔ ایسے ہی جھوٹے شیعہ کوفہ میں بھی تھے۔ جنہوں نے عین وقت پر امام حسینؓ کا ساتھ چھوڑ دیا اور ابن زیاد سے ڈر گئے۔ خدا کی مار ایسے ڈرپوک اور بزدل نام کے شیعوں پر ہو جو پہلے تو سیدوں کو ابھارتے ہیں ان کی رفاقت اور امداد

کام بھرتے ہیں۔ مگر جب وقت آتا ہے تو الگ ہو جاتے ہیں۔ ارے کم بختو اگر سچ پوچھو تو امام حسین امام زید اور دوسرے سادات کرام کے قتل کے باعث تم ہی لوگ ہو نہ تم امام حسین کو طلبی کے خطوط لکھتے نہ آپ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ سے نکلتے نہ یہ حادثہ کربلا ہوتا جس کا رنج قیامت تک ہر مسلمان کے دل پر رہے گا۔ مجمع البحرین میں ہے کہ اب رافضی کا لقب ہر اس شخص کو دیا جاتا ہے جو دین میں غلو کرے اور صحابہؓ پر طعن و تشنیع جائز رکھے۔ محیط میں ہے کہ رافضی کی جمع رفضۃ اور رفاض آتی ہے۔ (لغات الحدیث صفحہ ۱۰۹ جلد ۲)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ یظهر فی آخر الزمان قوم یسمون الرافضة یرفضون الاسلام۔ آخر زمانہ میں ایک قوم ظاہر ہوگی۔ جس کا نام رافضہ ہوگا۔ جو اسلام کے (اصول و فروع) کو ترک کر دے گی۔ (مسند احمد صفحہ ۱۰۳ جلد ۱)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس تھا اور آپ ﷺ کے پاس حضرت علیؓ بھی تھے آپ ﷺ نے فرمایا اے علیؓ میری امت میں عنقریب ایک قوم ظاہر ہوگی جو اہلبیت کی محبت کا دعویٰ کرے گی اسکو رافضہ کہا جائیگا۔ قاتلوهم فانهم مشركون۔ تم ان لوگوں سے قتال کرو کیونکہ وہ مشرک ہوں گے۔ (مجمع الزوائد صفحہ ۲۲ جلد ۱۰)

شیعہ مجتہد غلام حسین نجفی لکھتا ہے کہ رفض کا معنی ہے چھوڑنا۔ ابوبکر و عمر کو چھوڑنے کی وجہ سے شیعان علیؓ کا نام رافضی رکھا گیا۔ رافضی کا معنی روشن ہو گیا کہ شیخین کو چھوڑنے والا رافضی ہے۔ ابوبصیر نے امام جعفر صادق کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ انہوں نے ایک حدیث کی وجہ سے ہمارا ایک نام رکھا ہوا ہے اور حکام نے اس حدیث کی وجہ سے ہمارا خون حلال سمجھ رکھا ہے۔ امام پاک نے فرمایا الرافضہ۔ عرض کی ہاں حضور اسی نام کی وجہ سے۔ امام پاک نے فرمایا بخدا انہوں نے آپ کا نام رافضہ نہیں رکھا بلکہ یہ نام تم کو اللہ نے دیا ہے کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کے ستر ہزار آدمیوں نے فرعون اور اسکی قوم کو چھوڑ دیا تھا جب کہ ان کو فرعون کی گمراہی معلوم ہو گئی اور انہوں نے جب موسیٰؑ کی حقانیت کو پالیا تو موسیٰؑ کے لشکر کے ساتھ مل گئے اور موسیٰؑ کے لشکر میں ان کا نام ہو گیا "رافضہ" کیونکہ انہوں نے فرعون کو چھوڑ دیا تھا۔ اے ابوبصیر تمہارے دشمن نے خیر کو چھوڑ دیا اور تم نے شر کو چھوڑ دیا۔ یہ لقب بھی شیعوں کے لئے باعث مدح ہے نہ کہ مذمت۔ (شیعان علی اور ان کی شان صفحہ ۱۲۵، ۱۲۸ مؤلفہ غلام حسین نجفی)

ایک دوسری روایت کے مطابق امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ سب سے پہلے جو لوگ رافضی کے نام سے نامزد ہوئے وہ جادوگر تھے۔ جب انہوں نے عصائے موسیٰ کا معجزہ دیکھا تو اس پر ایمان لائے اور اس کی متابعت اختیار کی اور امر فرعون کو ترک کیا اور جو بلا ان پر وارد ہوئی اس کو نہایت خوشی سے تسلیم کیا تب فرعون نے ان کو رافضی کے نام سے نامزد کیا کیونکہ انہوں نے اس مردود کے دین کو ترک کر دیا تھا۔ (آثار حیدری صفحہ ۲۷)

ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی لکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے ابو بکر کی بیعت نہیں کی تھی علیؑ اور ان کے شیعہ جو کہ اقلیت میں تھے۔ اسی وجہ سے ان کی کوئی پرواہ بھی نہیں تھی۔ حکومت کے عتاب کا نشانہ بنے رہتے تھے۔ لوگ ان کو رافضی کہتے تھے۔ (شیعہ ہی اہلسنت ہیں صفحہ ۳۰)

اس تفصیل سے واضح ہو گیا ہے کہ لفظ رافضی کا مصداق تمام شیعہ ہیں کیونکہ انہوں نے نہ صرف آنحضرت ﷺ کی رحلت کے بعد امت کے متفق علیہ خلیفہ اول بلا فصل حضرت ابو بکر صدیقؓ اور ان کی جماعت کو چھوڑ کر ملت اسلامیہ سے الگ راہ اپنائی بلکہ ہر مشکل وقت میں اپنے ائمہ کو بھی بے یار و مددگار چھوڑا۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ (النساء نمبر ۱۱۵)

جو شخص ہدایت کے ظاہر ہو جانے کے بعد رسول کے خلاف چلے اور مومنین کے راستے کے علاوہ کسی اور راستہ کو اختیار کرے تو ہم بھی اسے ادھر ہی جانے دیں گے اور اس کو دوزخ میں داخل کریں گے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

لفظ شیعہ قرآن مجید میں

اگر چہ مذہب شیعہ کی تخلیق و تدوین اور تصنیف و تالیف مختلف ادوار میں ہوئی اور ہنوز ہو رہی ہے۔ لیکن اہل تشیع کی ذہنی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے اپنے جماعتی نام کا ثبوت قرآن سے دینا شروع کر دیا کہ "قرآن مجید میں خدا کے ایک عظیم اولو العزم پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کو شیعہ کہا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد رب العباد ہے وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ۝ (الصافات نمبر ۸۳) اسی طرح سورۃ القصص کی آیت نمبر ۱۵ میں حضرت موسیٰؑ کے گروہ کو شیعہ کہا گیا ہے کیونکہ حضرت موسیٰ شیعہ تھے اور ان کے ماننے والے بحکم قرآن شیعہ تھے۔ (تحفۂ حنفیہ صفحہ ۱۳۱)

قرآن مجید میں درج ذیل مقامات پر لفظ شیعہ مختلف صورتوں اور مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن کہیں بھی اصطلاحی معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ پھر شیعہ کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہوا؟؟

۱۔ ثُمَّ لَنَنزِعَنَّ مِن كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَٰنِ عِتِيًّا ۝ {مریم نمبر ۶۹}
پھر ہم ضرور ہر گروہ میں سے انہیں الگ نکال کر کھڑا کریں گے جو رحمٰن سے بہت اکڑے اکڑے پھرتے تھے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہم ہر گمراہ فرقے (شیعہ) کے بڑے بڑے سرکشوں اور لیڈروں کو الگ کر لیں گے اور ان کو اکٹھا کر کے جہنم میں پھینک دیں گے۔ کیونکہ یہ قائدین دوسرے جہنمیوں کے مقابلے میں سزا کے زیادہ مستحق ہیں۔

۲۔ وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَىٰ حِينِ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هَٰذَا مِن شِيعَتِهِ وَهَٰذَا مِنْ عَدُوِّهِ ۖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِن شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ ۝ {القصص نمبر ۱۵}

اور موسیٰ ایک ایسے وقت شہر میں آئے جبکہ شہر کے لوگ غفلت میں تھے یہاں دو شخصوں کو لڑتے ہوئے پایا ایک تو ان کی قوم میں سے تھا اور یہ دوسرا ان کے دشمنوں (فرعون کی قوم قبط) میں سے تھا۔ ان کی قوم والے نے اس کے خلاف جو ان کے دشمنوں میں سے تھا ان سے فریاد کی۔

یہاں دو مرتبہ لفظ شیعہ استعمال ہوا ہے۔ مگر اس سے اہل تشیع کا لغوی و اصطلاحی مفہوم کیسے اخذ کیا جا سکتا ہے؟ یہاں اسے موسیٰ کے قومی ہونے کی بنا پر شیعہ کہا گیا ہے۔ وہ تو ابھی تک موسیٰ کی نبوت کا بھی قائل نہیں تھا اور پورا یہودی بھی نہیں بن پایا تھا شیعہ کیسے بن گیا۔؟ اور پھر اس کو موسیٰ نے۔ إِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِينٌ۔ بے شک تو کھلا گمراہ ہے۔ بھی فرما دیا تھا۔

۳۔ وَإِنَّ مِن شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ ۝ {الصافات نمبر ۸۳}
اور بے شک ابراہیمؑ بھی اس (نوحؑ) کے گروہ میں سے ہیں۔

شیعہ کے معنی گروہ اور پیروکار کے ہیں۔ یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ بھی اہل دین و اہل توحید کے اسی گروہ (انبیاء) سے ہیں جن کو حضرت نوحؑ ہی کی طرح انابت الی اللہ

کی توفیق خاص نصیب ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ اولوالعزم پیغمبر اور حضرت نوحؑ سے بھی افضل ہیں وہ کس طرح ان کے شیعہ ہو گئے؟ کیا اہل تشیع بھی حضرت علیؓ سے افضل ہیں؟ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اہل تشیع کا "شیعان علیؓ" سے بھی ہرگز کوئی تعلق نہیں ہے۔

۴۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ شِیَعِ الْاَوَّلِیْنَ وَمَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (الحجر نمبر ۱۰۔۱۱)

ہم نے آپ ﷺ سے پہلے اگلی امتوں (شیعوں) میں بھی اپنے رسول بھیجے اور لیکن جو بھی رسول آتا وہ اس کا مذاق اڑاتے۔

اس آیت کریمہ میں آنحضرت ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ کے ساتھ ہی استہزا نہیں ہوا بلکہ ہر رسول کے ساتھ اس کی قوم نے یہی معاملہ کیا ہے۔ اہل تشیع بھی اگلے شیعوں کی طرح نبی ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے ساتھ یہی سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔

۵۔ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤى اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ یَلْبِسَكُمْ شِیَعًا وَّ یُذِیْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ اُنْظُرْ كَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّهُمْ یَفْقَهُوْنَ ۝ (الانعام نمبر ۶۵)

آپ کہیے کہ اس پر بھی وہی قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب تمہارے اوپر سے بھیج دے یا تمہارے پاؤں تلے سے یا کہ تم کو گروہ گروہ کر کے سب کو بھڑا دے اور تمہارے ایک کو دوسرے کی لڑائی چکھا دے۔ آپ دیکھیے تو سہی ہم کس طرح دلائل مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں شاید وہ سمجھ جائیں۔

• اس آیت سے معلوم ہوا کہ شیعہ ہونا یعنی گروہوں میں بٹنا عذاب الٰہی میں مبتلا ہونا ہے۔

۶۔ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ۝ (الانعام نمبر ۱۵۹)

بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ آیت عام ہے کفار و مشرکین سمیت وہ سب لوگ اس میں داخل ہیں جنہوں نے دین میں تفرق و تحزب کا راستہ اپنایا اور گروہوں میں بٹ گئے۔ آنحضرت ﷺ کا ان گروہوں سے یعنی شیعوں سے کوئی تعلق نہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ ابتداء اسلام سے حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت کے وسط تک مسلمانوں میں کوئی فرقہ نہ تھا سب سے پہلے اہل تشیع نے ہی اس کی بنیاد رکھی اور اللہ کے دین اور آنحضرت ﷺ کے راستے کو چھوڑ کر عبداللہ بن سبا کے دین کو اختیار کیا۔

۷۔ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا o (القصص نمبر ۴)

یقیناً فرعون نے زمین میں سرکشی کر رکھی تھی اور وہاں کے لوگوں کو شیعہ (گروہ گروہ) بنا رکھا تھا

۸۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (الروم نمبر ۳۲)

ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود بھی شیعہ (گروہ گروہ) ہو گئے۔ ہر گروہ اس چیز پر جو اس کے پاس ہے مگن ہے۔

اس آیت سے پہلے وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ کے الفاظ ہیں۔ اس میں فرقہ پرستی اور شرک سے منع کیا گیا ہے۔ یہ لوگ اصل دین کو چھوڑ کر یا اس میں من مانی تبدیلیاں کر کے شیعہ یعنی الگ الگ فرقوں میں بٹ گئے۔

۹۔ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ o (القمر نمبر ۵۱)

اور ہم نے تم جیسے بہتیروں کو ہلاک کر دیا ہے پس ہے کوئی نصیحت لینے والا۔

یہاں اَشْيَاعَكُمْ سے مراد اَشْبَاهَكُمْ۔ یعنی گذشتہ امتوں کے کافروں کو جو کفر میں تمہارے ہی جیسے تھے ہلاک کر دیا۔

۱۰۔ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ o (السبا نمبر ۵۴)

اور ان کی چاہتوں اور ان کے درمیان پردہ حائل کر دیا گیا جیسے کہ اس سے پہلے بھی ان جیسوں کے ساتھ کیا گیا وہ بھی (ان ہی کی طرح) شک و تردد میں (پڑے ہوئے) تھے۔

یعنی آخرت میں وہ چاہیں گے کہ ان کا ایمان قبول کر لیا جائے عذاب سے ان کی نجات ہو جائے لیکن ان کے درمیان اور ان کی خواہش کے درمیان پردہ حائل کر دیا جائے گا۔

پچھلی امتوں کا ایمان بھی معائنہ عذاب کے بعد قبول نہیں کیا گیا تو اس امت کے کافروں کا ایمان عذاب کے معائنے کے بعد کس طرح قبول ہو سکتا ہے؟

مذکورہ بالا آیات سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ ان مقامات پر لفظ شیعہ مختلف معانی میں استعمال ہوا۔

جماعت اور گروہ کے معنی میں بھی آیا ہے اور وہ اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔

۔ نیز کفار اور جہنمیوں کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔

لہذا محض شیعہ کا لفظ دیکھ کر استدلال کر لینا درست نہیں جب تک شیعہ کے مخصوص عقائد و نظریات یعنی تحریف قرآن، رجعت، خلافت بلافصل، وصایت اور تولی و تبری وغیرہ ثابت نہ ہو جائیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس امر کو کتاب و سنت تو در کنار شیخین کے عہد میں بھی قطعاً ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

لفظ شیعہ حدیث میں

مؤلف "تحقیقی دستاویز" زیر عنوان "شیعہ احادیث رسول ﷺ کی روشنی میں" لکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ اور ان کے شیعہ تمام مخلوق سے بہتر ہیں۔ اُولٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ فقال النبیؐ انت یا علی و شیعتك۔ وہ لوگ جو تمام مخلوق سے بہتر ہیں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اے علیؓ وہ تو اور تیرے شیعہ ہیں۔

حضرت علیؓ اور ان کے شیعہ بروز محشر خوش و خرم ہوں گے۔ جب آیت مبارکہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ نازل ہوئی تو رسالت مآب ﷺ نے حضرت علیؓ کو فرمایا اے علیؓ وہ تو اور تیرے شیعہ ہیں جو بروز قیامت خوش و خرم ہوں گے۔

آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو فرمایا۔ یا اباالحسن اما انت و شیعتك فی الجنۃ اے ابالحسن تو اور تیرے شیعہ ہی داخل جنت ہوں گے۔

آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو فرمایا۔ اول اربعۃ یدخلون الجنۃ انا و انت و الحسن و الحسین و ذریتنا خلف ظهورنا و ازواجنا خلف ذریتنا و شیعتنا عن ایماننا و شمائلنا

اے علیؓ چار ہستیاں سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گی میں، آپ، حسن اور حسین اور ہماری ذریت ہمارے پیچھے پیچھے ہوگی اور ہماری ازواج ہماری ذریت کے پیچھے اور ہمارے شیعہ دائیں بائیں ہوں گے۔ (تحقیقی دستاویز صفحہ ۱۹۸۷)

یہ علیات موضوعہ اور من گھڑت ہیں۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت انسؓ سے روایت کیا کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ ﷺ کو مخاطب کر کے کہا السلام علیك یا خیر البریة۔ اے خیر البریة آپ پر سلام۔ آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا ذاك ابراهیم علیه السلام۔ خیر البریة تو ابراہیم علیه السلام تھے۔

حضرت ابراہیمؑ ابوالانبیاء اور خلیل اللہ ہونے اور نبی کریم ﷺ خاتم الانبیاء ہونے کے باعث خیر البریة ہیں۔ اس طرح کذاب راویوں نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت محمد ﷺ کی ذات اقدس پر تبرا کیا ہے۔

مؤلف "تحقیقی دستاویز" نے "الصواعق المحرقة" کے حوالے سے لکھا ہے کہ شیعہ جنت میں داخل ہوں گے؟ موصوف نے نامکمل عبارت نقل کی ہے۔ اگر وہ پوری عبارت نقل کرتے تو معلوم ہو جاتا کہ کون سے شیعہ جنت میں داخل ہوں گے؟ ان کی علامات کیا ہیں؟ کیا شیعہ اس روایت کے مصداق ہیں؟

امام ابن حجر ہیثمی کی کتاب کے نام سے ہی اس مؤقف کی تردید ہو جاتی ہے اس کتاب کا نام ہے۔ الصواعق المحرقة فی الرد علیٰ اهل البدعة و الزندقة۔ بھلا جو کتاب ہی بدعتیوں اور زندیقوں کے خلاف لکھی گئی ہو تو اس میں زندیقوں کے مؤقف کی تائید کیوں کر پائی جا سکتی ہے؟ امام موصوفؒ نے روایت نقل کرنے کے بعد "فیه کذاب" اس روایت میں کذاب راوی ہیں۔ کے الفاظ بھی لکھے ہیں مگر شیعہ مؤلف کو اس سے کیا غرض؟

ابن حجر لکھتے ہیں کہ دارقطنی نے ایک روایت کا اخراج کیا وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا۔ اے علیؓ (ابوالحسن) تم اور تمہارے شیعہ جنت میں جائیں گے اور یقیناً ایک قوم اپنے متعلق یہ زعم رکھتی ہوگی کہ وہ تم سے محبت کر رہے ہیں حالانکہ اسلام کو بالکل حقیر جانیں گے پھر اسے بالکل ہی پھینک دیں گے اور اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر کمان سے یقال لهم الرافضة۔ انہیں رافضی کہا جائے گا سو اگر وہ تمہیں مل جائیں تو ان کے خلاف صف آرا ہو جانا وہ مشرک ہیں۔

پھر دارقطنی نے حضرت ام سلمہؓ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک رات میرے پاس قیام پذیر تھے اور سیدہ فاطمہؓ تشریف لائیں ان کے پیچھے حضرت علیؓ بھی آ گئے تو آپ ﷺ

نے ان سے فرمایا اے علیؓ "انت و شیعتك فی الجنة" تم اور تمہارے شیعہ جنتی ہیں خبردار آگاہ رہنا تمہارے ساتھ محبت کے دعویداروں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اسلام کو حقیر سمجھتے ہوں گے قرآن کریم پڑھیں گے۔ لیکن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ ان میں سے ہی ایک گروہ ہوگا جو رافضی کہلائے گا۔ فجاهدهم فانهم مشركون۔ تو ان کے ساتھ جہاد کرنا کیونکہ وہ مشرک ہیں۔ انہوں نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ ان کی علامت کیا ہوگی؟ فرمایا۔ لا يشهدون جمعة ولا جماعة و يطعنون علی السلف۔ وہ نہ جمعہ اور نہ ہی عام نمازوں میں حاضر ہوں گے اور سلف صالحین پر لعن طعن کریں گے۔ (الصواعق المحرقة مع تطهير الجنان صفحہ ۲۱)

اس عبارت سے تو یہ معلوم ہوا کہ اہل تشیع کے متعلق آنحضرت ﷺ نے پہلے ہی حضرت علیؓ کو آگاہ کر دیا تھا کہ یہ آپؓ کی محبت کے دعویدار ہوں گے لیکن اسلام کی توہین اور صحابہ کرامؓ پر طعن و تشنیع کریں گے۔ یہ اسلام سے اس طرح خارج ہو جائیں گے جس طرح تیر کمان سے۔

شیعہ نے جس روایت کی رو سے اپنے جنتی اور خیر البریة ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ اسی روایت کی بناء پر وہ جہنمی اور شر البریة ثابت ہو گئے۔ فبذلك فليفرحوا۔

شیعہ کی تعریف

شیعہ کا لغوی معنیٰ مطیع و فرمانبردار، پیروکار، جماعت اور گروہ کے ہیں اور اصطلاح میں امامیہ مذہب کا پیرو، اثنا عشری، امامت بالنص کا قائل و معتقد اور خلفائے راشدین حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ان کے پیروکاروں کا منکر شیعہ و رافضی کہلاتا ہے۔ سیاسی طور پر سب سے پہلے حضرت علی المرتضیٰؓ کے دور خلافت میں شیعان علیؓ، شیعان عثمانؓ اور شیعان معاویہؓ یا شیعان بنی امیہ کے نام سامنے آئے۔ اس کے ساتھ مذہب شیعہ کی تخلیق و تدوین کا خفیہ کام بھی شروع ہو گیا تھا جو عبداللہ بن سبا اور اس کی پارٹی تک ہی محدود رہا لیکن خالقین مذہب شیعہ (یہود و مجوس) سیاسی اور مذہبی دونوں محاذوں پر سرگرم عمل رہے۔ یہی وجہ ہے کہ لفظ شیعہ کے متعلق متقدمین اور متاخرین کی اصطلاح جدا جدا ہے۔ کتب لغت میں آج شیعہ کے جو اصطلاحی معنیٰ مذکور ہیں۔ وہ متقدمین کے حاشیۂ ذہن میں بھی نہیں تھے۔ یہ ملحوظ رہے کہ محدثین اور فقہاء کے نزدیک متقدمین اور متاخرین کا دور مختلف ہے۔ محدثین کرام کے ہاں حد فاصل ۳۰۰ھ ہے۔ (لسان العرب ابن منظور جلد ۸ صفحہ ۱۹۶ جلد ۵) اور فقہاء عظام کے نزدیک امام شمس الائمہ

الحلوائی المتوفی ۲۵۶ھ ہیں۔ (فوائد بہیہ صفحہ ۲۳۶ بحوالہ ارشاد الشیعہ صفحہ نمبر ۱۹)

شیعیت کی تعریف کرتے ہوئے امام ابوالحسن اشعری فرماتے ہیں کہ شیعہ وہ ہے جس نے حضرت علیؓ کی طرف داری کی اور انہیں آنحضرت ﷺ کے تمام صحابہ کرامؓ سے افضل جانا۔

(الصلة بين التصوف و التشيع صفحہ ۱۴ مؤلف ڈاکٹر کامل مصطفی الشیبی)

امام ابن حزم کہتے ہیں کہ شیعہ وہ ہے جو شیعوں کے ساتھ اس بات میں متفق ہو کہ حضرت علیؓ آنحضرت ﷺ کے بعد سب سے افضل ہیں اگرچہ وہ شیعوں کے دوسرے عقائد سے اختلاف رکھتا ہو جو عام مسلمانوں کے عقائد سے مختلف ہیں۔ لیکن اگر وہ پہلے عقیدہ میں ان سے مخالف ہے تو وہ شیعہ نہیں ہے۔ (الملل والنحل صفحہ ۱۰ جلد ۲)

علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ شیعیت حضرت علیؓ کی محبت اور صحابہ کرامؓ پر ان کو فوقیت دینے کا نام ہے۔ لہٰذا جس نے ان کو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ پر فوقیت دی وہ شیعیت میں غالی ہے اور اسے رافضی بھی کہا جاتا ہے اور اگر ایسا نہیں یعنی حضرت علیؓ کو ان پر فوقیت نہیں دیتا تو وہ شیعہ ہے لیکن اگر وہ حضرت علیؓ کی محبت کے ساتھ دوسروں پر سب و شتم کرتا ہے یا کھل کر بغض کا اظہار کرتا ہے تو وہ رفض میں غالی ہے اور اگر اس کے ساتھ دنیا میں ان کی رجعت کا بھی قائل ہے تو یہ غلو میں اور زیادہ سخت ہے۔ (مقدمہ فتح الباری صفحہ ۴۵۹)

علامہ ابن حجر ایک دوسری کتاب میں لکھتے ہیں کہ متقدمین کے عرف و اصطلاح میں شیعیت کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ پر فضیلت دی جائے اور یہ کہ حضرت علیؓ اپنی جنگوں میں صواب پر اور ان کے مخالف خطا پر تھے اور یہ کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ ان (حضرت علیؓ) سے مقدم اور افضل تھے شاید ایسے بھی بعض لوگ ہوں جو یہ سمجھتے ہوں کہ حضرت علیؓ آنحضرت ﷺ کے بعد مخلوق میں سب سے افضل ہیں۔ اب اگر یہ سمجھنے والا پرہیز گار، دین دار، سچا اور صاحب اجتہاد ہے تو اس کی روایت کو اس بات کی وجہ سے رد نہ کیا جائے گا خصوصاً جبکہ وہ اپنے اس نظریہ کی دعوت نہ دیتا ہو۔ لیکن متاخرین کے عرف و اصطلاح میں شیعیت خالص رفض کا نام ہے یعنی خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ پر سب و شتم کرنا۔ لہٰذا نہ تو اس غالی رافضی کی روایت کو قبول کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کی عزت کی جاسکتی ہے۔ (تہذیب التہذیب صفحہ ۹۴ جلد ۱)

بعض حضرات نے شیعیت کو بدعتی شیعیت اور رافضی شیعیت کا نام بھی دیا ہے۔

بدعتی شیعیت۔۔۔اس کی تین قسمیں ہیں۔

ایک شیعیت وہ تھی جو حضرت علیؑ کو حضرت عثمانؓ پر فضیلت دیتی تھی لیکن حضرت عثمانؓ کی فضیلت کی بھی معترف تھی۔

دوسری شیعیت وہ تھی جو حضرت علیؑ کو حضرات ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر فضیلت دیتی تھی اور ان تینوں حضرات کی فضیلت کی بھی قائل تھی۔

تیسری شیعیت وہ تھی جو حضرت علیؑ کو ان تینوں خلفاءؓ کے بالمقابل خلافت کا زیادہ حقدار سمجھتی تھی۔

ان تین قسم کی شیعیت کے ماننے والوں کی روایات کو اہل سنت نے قبول کیا ہے۔

رافضی شیعیت۔۔۔اس کی بھی دو شاخیں ہیں ایک عام رافضی شیعیت اور دوسری غالی رافضی شیعیت۔

عام رافضی شیعیت۔۔۔یہ ہے کہ حضرت علیؑ کو خلفاء ثلاثہؓ پر فضیلت دی جائے اور ان تینوں خلفاءؓ سے برأت کی جائے انہیں برا بھلا کہا جائے اور انہیں ان کے مقام سے گرایا جائے۔

اور غالی رافضی شیعیت۔۔۔یہ ہے کہ حضرات خلفاء ثلاثہؓ اور صحابہ کرامؓ کی اکثریت کی تکفیر کی جائے۔

اس غالی رفض کے سائے میں شعوبیت، ہوائے نفس، اسلام کے خلاف سازش اور سیاسی اغراض جیسی صفات والے لوگ جمع ہوئے اور انہوں نے اسلام میں مصائب کا اضافہ کیا اور شیعیت کے نام سے (جو در حقیقت رفض تھا) اہلسنت والجماعت اور رافضیوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہو گئی۔ جس کے نتیجے میں وقتاً فوقتاً ان دونوں میں مسلح جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ اسلام اور عربوں کے خلاف کینہ رکھنے والی شعوبیت نے رفض اور گمراہی کی شکل میں اپنا زہر پھیلانا شروع کیا اور امت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے انہوں نے فاسد عقیدے اور غلط افکار ایجاد کیے اور جاہل و ناسمجھ لوگوں کو ان افکار پر جمع کرنا شروع کیا۔ اسلام سے کینہ رکھنے والوں نے اپنا زہر پھیلانے اور لوگوں کو اسلام سے دور کرنے کے لئے رفض کے شعار کے سائے میں کام کرنے سے بہتر کسی چیز کو نہ پایا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں اور فتنوں میں شیعیت

کا فتنہ سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا کیونکہ یہ ایک یہودی دماغ کی اختراع ہے جبکہ اس کی پیدائش یہودیت، عیسائیت، اور مجوسیت کی کوکھ سے ہوئی۔ اس کے ظہور کا مقصد ہی اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام اور امت مسلمہ کو نقصان پہنچانا تھا۔ اس لئے اسے جب بھی موقع ملا اس نے مسلمانوں اور اسلام کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ

وهذا دأب الرافضة دائما يتجاوزون عن جماعة المسلمين الى اليهود و النصارى والمشركين في الاقوال والموالات والمعاونة و القتال و غير ذلك ومن اضل من قوم يعادون السابقين الاولين من المهاجرين والانصار و يوالون المنافقين و الكفار۔ (منہاج السنة صفحہ جلد)

روافض کی ہمیشہ سے عادت ہے کہ وہ مسلمانوں کی جماعت کو چھوڑ کر یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا ساتھ دیتے ہیں اور ان ہی کی دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ ان لوگوں سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین سے عداوت رکھیں اور منافقین و کفار سے دوستی کریں۔

اس کے بعد علامہ موصوف شیعوں کے کفار کا ساتھ دینے اور ان کی مدد کرنے کے واقعات کا ذکر یوں الفاظ کرتے ہیں۔

و كثير منهم يواد الكفار من وسط قلبه اكثر من موادته للمسلمين ولهذا لما خرج الترك الكفار من جهة المشرق و قتلوا المسلمين و سفكوا دماءهم ببلاد خراسان و العراق و الشام والجزيرة وغيرها كانت الرافضة معاونة لهم على المسلمين و كذلك الذين كانوا بالشام والحلب و غيرهما من الرافضة كانوا من اشد الناس معاونة لهم على قتال المسلمين وكذلك النصارى الذين قاتلوا المسلمين با الشام كانت الرافضة من اعظم المعاونين لهم و كذلك اذا صارا اليهود دولة بالعراق وغيره تكون الرافضة من اعظم اعوانهم فهم دائما يوالون الكفار من المشركين واليهود والنصارى و يعاونونهم على قتال المسلمين ومعاداتهم (منہاج السنة صفحہ جلد)

اکثر رافضی کفار سے تہہ دل سے دوستی رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں

زیادہ۔ چنانچہ جب تاتاری مشرق کی طرف سے آئے اور انہوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا اور خراسان و عراق اور شام اور جزیرہ میں ان کے خون کے دریا بہائے تو یہ روافض مسلمانوں کے مقابلے میں ان کے حامی و مددگار تھے اسی طرح جو شیعہ شام اور حلب وغیرہ میں تھے وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں دشمنان اسلام کی بہت زیادہ مدد کرنے والے تھے۔ اسی طرح سے جب عیسائیوں نے شام میں مسلمانوں سے جنگ کی تو روافض ان کی کمک پر تھے اسی طرح اگر یہودیوں کی عراق میں یا کہیں اور حکومت قائم ہو جائے تو یہ روافض ان کے سب سے بڑے مددگار ثابت ہوں گے۔ شیعہ ہمیشہ کفار، مشرکین، یہود و نصاریٰ کی مدد کے لئے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کا ساتھ دینے کیلئے تیار رہتے ہیں۔

امام موصوف ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ

الرافضة يوالون لعداء الدين الذين يعرف كل احد معاداتهم من اليهود والنصارى والمشركين مشركى الترك و يعادون لوليآء الله الذين هم خيار اهل الدين و سادات المتقين وهم الذين اقاموه و بلغوه و نصروه و لهذا كان الرافضة من اعظم الاسباب فى دخول الترك الكفار الى بلاد الاسلام ولما قصة الوزير ابن العلقمى وغيره كالنصير الطوسى مع الكفار و ممالاتهم على المسلمين فقد عرفها الخاصة و العامة و كذالك من كان فيهم بالشام ظاهروا المشركين على المسلمين وعاونوهم معاونة عرفها الناس و كذالك لما انكسر عسكر المسلمين لما قدم غازان ظاهروا الكفار النصارى و غيرهم من اعداء المسلمين و باعوهم اولاد المسلمين بيع العبيد واموالهم وحاربوا المسلمين ومحاربة ظاهرة وحمل بعضهم راية الصليب وهم كانوا من اعظم الاسباب فى استيلاء النصارى قديما على بيت المقدس۔ (منہاج السنۃ صفحہ ۱۰ جلد ۲)

روافض ہمیشہ یہود، نصاریٰ، تاتاری مشرکین وغیرہ دشمنان اسلام کا ساتھ دیتے ہیں اور اللہ کے ان مخلص بندوں سے بغض و عداوت رکھتے ہیں جو اعلیٰ درجہ کے دین دار اور متقیوں کے سردار تھے اور دین کی تبلیغ و نصرت اور اس کو قائم کرنے والے تھے۔ تاتاری کفار کے اسلامی ملکوں میں راہ پانے میں سب سے زیادہ دخل ان روافض ہی کا تھا۔ ابن علقمی اور طوسی وغیرہ کی دشمن

نوازی اور مسلمانوں کے خلاف ان کی سازشیں اب ہر خاص و عام کو معلوم ہو چکی ہیں۔ شام میں جو روافض تھے انہوں نے بھی کھلم کھلا کافروں کا ساتھ دیا تھا اور اس وقت انہوں نے عیسائیوں کی پوری مدد کی تھی یہاں تک کہ مسلمانوں کے بچوں اور ان کی مملوکات کو ان کے ہاتھوں غلاموں کی طرح فروخت کر دیا تھا بلکہ ان کے کچھ لوگوں نے تو صلیبی جھنڈا بھی بلند کیا تھا اور گزشتہ دور میں عیسائیوں کے بیت المقدس پر قبضہ میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

اسلام اور مسلمانوں پر شیعہ کے مظالم کی ایک طویل تاریخ ہے۔ یہاں صرف یہ واضح کرنا ہے کہ متقدمین اور متاخرین محدثین و فقہاء کی اصطلاح میں لفظ شیعہ کی تعریف میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ متقدمین کی اصطلاح میں شیعہ وہ تھے جو تمام اصول و فروع میں اہلسنت سے متفق تھے صرف حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ پر فضیلت دیتے تھے جبکہ اہل سنت کے ہاں اتنا نظریہ بھی اجماع امت کے خلاف ہونے کی وجہ سے بدعت اور رفض سمجھا جاتا ہے۔

شیعیت کا آغاز

شیعیت کے موضوع کو جن علماء نے اپنی تحقیق کا محور بنایا ہے ان میں اس بات پر اختلاف ہے کہ اسلام میں شیعیت کی ابتداء کب ہوئی؟ اس سلسلے میں مختلف اقوال پائے جاتے ہیں۔

۱۔ حضور نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں ہی شیعیت کا ظہور ہو چکا تھا۔

۲۔ حضور نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد جب چند اصحاب نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا اس وقت سے شیعیت کی بنیاد پڑ گئی تھی۔

۳۔ ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ شیعیت کی ابتداء حضرت عثمانؓ کے آخری دور خلافت میں عبداللہ بن سبا کے ہاتھوں ہوئی۔

۴۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ شیعیت کی ابتداء حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد ہوئی ہے

۵۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ شیعیت کا آغاز حضرت عثمانؓ کے عہد میں ایک سیاسی فرقے کی حیثیت سے ہوا جسے آگے چل کر بنو عباس کے دور میں مستقل طور پر ایک علیحدہ مذہب میں تبدیل کر دیا گیا۔

۶۔ اہل تشیع کی سب سے زیادہ مستند کتاب "الکافی" کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ مذہب پہلی صدی ہجری کے بعد مرتب ہونا شروع ہوا۔ روایت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

"پھر امام محمد بن علی ابو جعفر تشریف لائے اور شیعان علی ان کی آمد سے قبل احکامات حج اور حلال و حرام کو قطعاً نہ جانتے تھے انہوں نے آکر طریقہ حج اور حلال و حرام کو خوب بیان کیا یہاں تک کہ اب اور لوگ (غیر شیعہ) ان معاملات و مسائل میں اہل تشیع کے محتاج ہو گئے حالانکہ ان سے پہلے خود شیعہ ان لوگوں سے مسائل معلوم کرنے کے محتاج تھے۔ (اصول کافی صفحہ ۳۹۶)

امام باقر نے ۷ ذی الحج ۱۱۴ھ میں وفات پائی اس کا مطلب یہ ہے کہ شیعہ مذہب کا وجود دوسری صدی ہجری کے اوائل تک نہیں تھا اور اس دوران ائمہ اہل بیت اور شیعہ، خلفائے راشدینؓ اور خلفاء بنوامیہ ہی کے دین، مذہب اور مسلک کے پابند تھے۔ ان میں عملی طور پر باہم کوئی اختلاف نہیں تھا۔ جبکہ متاخرین شیعہ کا موقف یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں ہی شیعیت کا ظہور ہو چکا تھا۔

شیعہ مجتہد حجۃ الاسلام محمد حسین آل کاشف الغطاء لکھتے ہیں کہ

"تشیع کوئی نیا مذہب نہیں جہاں سے اسلام شروع ہوتا ہے وہیں سے شیعیت کی بھی ابتدا ہوتی ہے۔ چمن آرائے شریعت یعنی سرکار خاتم الانبیاء نے اسلام کے ساتھ ہی ساتھ اپنے ہی ہاتھوں یہ پودا لگایا آبیاری کی اور خود حضور ﷺ ہی اس کی نگہداشت فرماتے رہے پودا بڑھ کر ہرا بھرا درخت ہوا اور رسول مقبول ﷺ کی زندگی میں پھولنے لگا مگر پھلنے نہ پایا تھا کہ چراغ نبوت گل ہو گیا"۔ (اصل اصول شیعہ صفحہ ۲۷)

علامہ سید محمد طباطبائی لکھتے ہیں

کہ مذہب شیعہ کے ماننے والوں کو سب سے پہلے حضرت علیؓ کے شیعہ یا پیروکار کہا گیا۔ مذہب شیعہ کی پیدائش یا آغاز کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب پیغمبر اکرم ﷺ اس دنیا میں موجود تھے۔ پیغمبر اکرم ﷺ کی ولادت سے لے کر ۲۳ سالہ زمانہ بعثت تک اور تحریک اسلامی کی ترقی کے دوران بہت سے اسباب و واقعات رونما ہوئے جن کے نتیجے میں خود رسول خدا ﷺ کے اصحاب میں ایک ایسی جماعت کا پیدا ہونا ناگزیر اور لازمی ہو گیا تھا۔ (شیعہ در اسلام صفحہ ۳۳)

علامہ محمد حسین مظفر نے بھی شیعیت کا آغاز رسالت مآب ﷺ کے عہد سے قرار دیا ہے

(تاریخ شیعہ صفحہ ۱۹ تحت دعوت بہ تشیع از چہ زمانہ آغاز شد)

عصر حاضر میں ملت جعفریہ کے ترجمان ابو مصعب جوادی لکھتے ہیں کہ

شیعہ مذہب زمانہ پیغمبر اسلام میں موجود تھا جس نے پیغمبر اکرم ﷺ کی تعلیمات کو ان کے اہلبیت سے حاصل کیا جو کہ حصہ ہائے رسالت اور اجزائے نبوت ہیں جو علوم نبوی کے وارث اور شہر علم نبی کے در ہیں لہٰذا ان کی تعلیمات و ہدایت اور ان کے اقوال و افعال عین تعلیمات رسول ہیں۔

(تحقیقی دستاویز صفحہ ۱۵)

آیت اللہ العظمیٰ السید محمد باقر الصدر لکھتے ہیں کہ

یہ بھی درست نہیں کہ اسلامی دعوت میں شیعیت کی بحث کا آغاز لفظ "شیعہ" اور لفظ "تشیع" کی ایجاد و استعمال سے کریں پھر یہ سوچیں کہ مسلمانوں کے ایک معین گروہ سے یہ نام کب وابستہ ہوا اور یہ اصطلاح کیوں کر عام ہوئی کیونکہ نام کی ایجاد اور اصطلاح کا عام ہونا۔ ایک الگ بات ہے اور مفہوم و تعبیر فکر کا وجود تحقیق دوسری بات ہے۔ فرض کیجئے زمانہ رسالت مآب ﷺ میں بولی جانے والی زبان و روزمرہ میں لفظ "شیعہ" کسی کو نہیں ملتا تو کیا اس کا یہ نتیجہ نکالنا درست ہے کہ اصل مفہوم تشیع اور شیعی فکر و رجحان بھی اس وقت موجود نہ تھا۔

(شیعیت کا آغاز کب اور کیسے صفحہ ۳۲)

بہر حال اہل تشیع کا دعویٰ یہی ہے کہ شیعہ مذہب پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانہ میں موجود تھا۔ باقر الصدر شہید نے مزید رہنمائی کر دی کہ اگر اس زمانے میں بولی جانے والی زبان میں "شیعہ" کا لفظ نہیں ملتا تو اس کا یہ مطلب لینا درست نہیں ہے کہ اس زمانے میں تشیع کا اصل مفہوم اور شیعی فکر و رجحان بھی موجود نہیں تھا۔ تاہم اتنی بات درست ہے کہ اس دور میں شیعہ ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے موجود تھے اور اس میں شیعی فکر اور تشیع کا اصل مفہوم بھی پایا جاتا تھا یہ کون لوگ تھے اور شیعی فکر کیا تھی؟ اس کا حال آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

شیعیت رسول اکرم ﷺ کے عہد میں

اہل تشیع کے اس دعوے "کہ شیعہ اور مذہب شیعہ کا آغاز آپ ﷺ کے زمانے سے ہوا" کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی حقیقت زمانہ بزمانہ عہد بعہد اور تاریخی ترتیب کے ساتھ ہدیہ قارئین ہے۔

شیعہ کی اصطلاحی تعریف پیچھے گذر چکی ہے کہ "وہ لوگ جو مذہب امامیہ رکھتے ہیں اور خلفائے ثلاثہؓ اور حضرت عائشہؓ کو نہیں مانتے"

(فیروز اللغات فارسی صفحہ ۹۰ جلد ۲)

نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں شیعہ کی موجودگی کا پتہ چلانے کیلئے ان لوگوں کی تلاش ضروری ہے جو خلفائے ثلاثہؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کو نہیں مانتے تھے وہ کون لوگ تھے جو اسلام کو پھیلتا

پھولتا نہیں دیکھ سکتے تھے؟ اور اسلام کی ترقی سے بے چینی کن لوگوں میں پائی جاتی تھی؟

جب آنحضرت ﷺ نے اسلام کی دعوت شروع کی تو تقریباً تمام عرب آپ ﷺ کا مخالف ہو گیا۔ ایک طرف مشرک قبائل تھے جو آپ ﷺ کے خون کے پیاسے ہو گئے دوسری طرف یہودی سرمایہ دار تھے اور تیسری طرف ان کی ذیلی شاخ منافقین تھے، اس طرح طاقت، سرمایہ اور اندرونی سازش سہ طرفہ مخالفتوں کے طوفان میں آپ ﷺ اپنے جانثار صحابہؓ کے ہمراہ اپنی تحریک چلاتے رہے یہاں تک کہ سارا جزیرہ عرب اسلام کے زیر نگین آ گیا۔

یہود۔۔۔ دشمنان اسلام میں سب سے زیادہ زخم خوردہ یہود تھے۔ کیونکہ آپ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری سے ان کی چودھراہٹ اور بادشاہت ختم ہو گئی۔ ان کے تینوں قبیلوں بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع کو ان کی بداعمالیوں اور بدکرداریوں کی بناء پر جلاوطن کیا گیا۔ ایک قبیلے کی سرکشی کی وجہ سے خود ان کے مقرر کردہ حکم کے فیصلے کے مطابق تمام مردوں کو قتل بھی کیا گیا جس سے مدینہ اور خیبر میں ان کے مضبوط گڑھ ختم ہو گئے۔ پھر آنحضرت ﷺ نے آخری وقت میں وصیت بھی فرمائی کہ "اخر جوا الیهود والنصاری من جزیرة العرب" (بخاری کتاب الجہاد) یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کو جزیرہ عرب سے نکال دو۔ لہٰذا انتقام کے لئے سب سے پہلے یہودیوں نے ریشہ دوانیاں اور سازشیں کیں اور یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ جتنا سازشی ذہن اس قوم کا ہے اس میں کوئی دوسری قوم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

یہودیوں کی فطرت میں خودسری، احساس برتری اور نسلی غرور کے جراثیم بھرے ہوئے تھے۔ چنانچہ پہلے تو وہ غزوہ احد اور غزوہ احزاب میں مشرکین عرب کو مسلمانوں کے خلاف ورغلا کر لائے اس منصوبے میں ناکامی کے بعد انہوں نے عربوں کو علاقائیت کی بنیاد پر باہم لڑانے کا دوسرا محاذ کھولا چونکہ یمن میں پہلے سے یہودیوں کا ایک مضبوط مرکز تھا اور وہاں کی تجارت پر بھی وہی لوگ چھائے ہوئے تھے وہ اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ یمن کے عربوں (جو قحطانی کہلاتے ہیں) اور حجاز کے عربوں (جو عدنانی کہلاتے ہیں) کے درمیان حریفانہ چشمک موجود چلی آ رہی ہے۔ ہوا یوں کہ یمن کے حکمران ابرہہ نے خانہ کعبہ کی مرکزیت کو ختم کرنے اور حجازی عربوں کو زک پہنچانے کی خاطر یمن کے دارالسلطنت صنعاء میں ایک عبادت گاہ تیار کی۔ جس کی ایک حجازی عرب نے مذہبی جوش میں آ کر توہین کر دی اس کا انتقام لینے اور کعبہ کو گرانے کے عزم

سے یہ ملک مصر پر حملہ آور ہوا مگر اللہ تعالیٰ نے اسے ناکام [illegible]

میں موجود ہے

یہودیوں کی اس کم ظرفی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے [illegible]
کا بدلہ لینے کے لئے یمن کے یہودیوں نے نبی اکرم ﷺ کے مقابلے میں جھوٹے نبی [illegible]
کھڑا کیا۔ جن میں سب سے زیادہ شہرت مسیلمہ کذاب نے حاصل کی [illegible]
ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو فی الحقیقت اسے نبی نہیں مانتا تھا مگر اس کا اعلان یہ تھا کہ [illegible]
جھوٹا نبی یمن کا ہے سچے نبی ﷺ سے زیادہ محبوب ہے۔ اس کے علاوہ یہودیوں نے کئی مرتبہ خود
نبی کریم ﷺ کی زندگی کو ختم کرنے کی کوشش بھی کی۔ ایک دفعہ آپ ﷺ ایک مکان کی دیوار کے
زیر سایہ آرام فرما رہے تھے کہ انہوں نے بھاری پتھر آپ ﷺ پر گرانے کا منصوبہ بنایا۔ ایک
دوسرے موقع پر انہوں نے آپ ﷺ کی یہودی پڑوسن کے ذریعے پکا ہوا گوشت بھیج دیا جس
میں زہر ملایا گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے بغض و عناد سے آپ ﷺ کو آگاہ کرتے ہوئے فرمایا۔
لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا۔ (المائدہ نمبر ۸۲)
یقیناً! آپ ایمان والوں کا سب سے زیادہ دشمن یہودیوں اور مشرکین کو پائیں گے
کیونکہ یہودیوں کے اندر بغض و عناد، حق سے انحراف اور اہل ایمان کی تنقیص کا جذبہ
بہت پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء کا قتل اور ان کی تکذیب ان کا شعار رہا ہے۔ اور اس معاملے
میں عیسائیوں اور مشرکوں کا بھی یہی حال ہے۔ خواہ وہ عرب کے مشرک ہوں یا ایران کے مجوسی۔

منافقین ۔ اسلام اور مسلمانوں کو منافقین کے طبقے سے بھی بہت نقصان اٹھانا پڑا۔
منافق اس غیر مسلم کو کہتے ہیں جو اسلام کا دکھاوا کرتا ہے۔ منافقت کی غرض سوائے اس
کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ اہل اسلام کو دھوکا دیا جائے۔ آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف
لے گئے تو وہاں اسلام کی ایک خود مختار ریاست قائم کر لی۔ دین اسلام تیزی سے مقبول ہونے
لگا۔ عبداللہ بن ابی کی رسم تاج پوشی کی تیاریاں مکمل تھیں لیکن ہجرت اور اسلام کی ترقی سے اس کے
سارے خواب چکنا چور ہو گئے اس نے علی الاعلان اسلام کی مخالفت شروع کر دی اور قریش مکہ
کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا۔ غزوہ بدر کے بعد وہ اسلام کی قوت سے مرعوب ہو گیا اور بظاہر کلمہ پڑھ لیا

لیکن مرتے دم تک اندرونی طور سے اپنے جتھے سمیت اسلام کا دشمن رہا کئی دفعہ اس کی منافقت رسوا ہوئی مگر یہ کینہ سے باز نہ آیا۔

مدینہ کے یہود بھی مسلمانوں کے بدخواہ تھے یہ کچھ افراد کو پٹی پڑھا کر اسلامی مجلسوں میں بھیجتے تھے کہ وہاں سے خبریں اڑا لاؤ یا مسلمانوں میں غلط فہمی پھیلاؤ یہ منافقین کا دوسرا زمرہ تھا۔

تیسرا گروہ وہ تھا جو بزدلی کی وجہ سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا یہ لوگ مصلحت کے بندے تھے یہ نہ تو کھلم کھلا اسلام کی مخالفت کا حوصلہ رکھتے تھے اور نہ اس سے وابستہ ہو کر یہود کو ناراض کرنے کی ہمت پاتے تھے۔ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ اسلام کی تحریک ناکام رہ جائے اور پھر ہمیں یہود اور دیگر دشمنان اسلام کے ہاتھوں مصائب اٹھانے پڑیں۔ اس لیے ان کا خیال تھا کے ہم دورخی چال چل کر بہت فائدے میں رہیں گے۔ ایک طرف مسلمانوں کی کامیابیوں سے نفع اندوز ہوں گے اور دوسری طرف ضرورت محسوس ہوئی تو یہود کی پناہ حاصل رہے گی۔ اس طرح منافقین کو یہ جرأت تو نہ ہوتی تھی کہ اعلانیہ اسلام کی مخالفت کر کے اس کو نقصان پہنچائیں البتہ اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح درپردہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر کے انہیں کمزور کر دیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے انہوں نے جہاں اور بہت سی فتنہ سامانیاں بپا کر رکھی تھیں ان میں ایک مسجد ضرار کی تعمیر بھی ہے جو مسجد قبا کے مقابلہ میں ۹ھ میں بنائی گئی تھی۔ منافقین نے نبی اکرم ﷺ کو یہ باور کرایا کہ بارش، سردی اور اس قسم کے موقعوں پر بیماروں اور کمزوروں کو زیادہ دور جانے میں دقت پیش آتی ہے ان کی سہولت کے لئے ہم نے یہ مسجد بنائی ہے آپ وہاں چل کر نماز ادا فرمائیں تاکہ ہمیں برکت حاصل ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس وقت تو میں اہم غزوہ کے لئے جا رہا ہوں واپسی پر دیکھا جائے گا لیکن واپسی پر وحی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے منافقین کے اصل مقاصد کو بے نقاب کر دیا کہ اس سے وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانا، کفر پھیلانا، مسلمانوں کے درمیان تفرقہ پھیلانا اور اللہ و رسول اللہ ﷺ کے دشمنوں کے لئے کمین گاہ (خفیہ اڈہ) مہیا کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کے ذریعے اس مسجد کو جلوا کر خاکستر بنا دیا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰى

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ط فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ○ {التوبۃ نمبر ۱۰۷-۱۰۸}

اور (منافقوں میں سے) وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے ان اغراض کے لئے مسجد بنائی ہے کہ (اسلام کو) ضرر پہنچائیں اور کفر کی باتیں کریں اور ایمان داروں میں تفریق ڈالیں اور اس شخص کے قیام کا بندوبست کریں جو اس سے پہلے سے اللہ اور رسول ﷺ کا مخالف ہے اور قسمیں کھا جائیں گے کہ بجز بھلائی کے اور ہماری کچھ نیت نہیں اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ آپ (ﷺ) اس میں کبھی کھڑے نہ ہوں البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقوی پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ (ﷺ) اس میں کھڑے ہوں اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسجد "ضرار" میں چار چیزیں تھیں جن کی وجہ سے یہ مسجدیت سے نکل گئی۔

اول --- یہ کہ اسے منافقین نے اپنی اغراض فاسدہ کی تکمیل کا ذریعہ اور مسلمانوں کی ضرر رسانی کا حیلہ بنایا تھا۔ جس کو لفظ "ضرار" بتلا رہا ہے۔

دوم --- یہ کہ اس کی آڑ میں کفر کی تقویت مقصود تھی اور اسلام کا ضعف و اضمحلال جیسا کہ لفظ "کفر" سے ظاہر ہے۔

سوم --- یہ کہ صحابہ کرامؓ کی باہمی اخوت و محبت اور ان کا اتحاد پامال کر کے ان میں اختلاف عداوت اور تفرقہ پیدا کرنا جس پر "تَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ" کا جملہ شاہد ہے۔

چہارم --- یہ کہ منافقین نے اس مسجد ضرار کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دشمن کی روپوشی، گھات اور خفیہ کاروائی کے لئے تیار کیا تھا۔ جس کا نام مفسرین نے "ابو عامر خزاعی نصرانی" بتایا ہے اس کی طرف اشارہ ہے "لِمَنْ حارب اللّٰه و رسوله" میں۔

منافقین کی ان اغراض فاسدہ (جن کی نشاندہی قرآن کریم نے کی) کو پیش نظر رکھتے ہوئے مذہب شیعہ کا مطالعہ کیا جائے تو دونوں کی اغراض میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا جو مقاصد مسجد ضرار کی تعمیر کے تھے وہی مقاصد امام باڑوں، عزاخانوں اور ماتم کدوں کی تعمیر کے بھی ہیں۔ ان میں بھی اسلام کے مقابلے میں کفر کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہاں بھی فضائل و مصائب اہلبیت

کے نام پر صحابہ کی تفسیق وتکفیر کی جاتی ہے۔ یہاں بھی صحابہؓ اور مسلمانوں کو ضرر پہنچانے کے منصوبے بنائے جاتے ہیں اوران مراکز کو بھی اللہ، پیغمبر ﷺ، صحابہؓ اور اسلام کے دشمن، سبائیوں، یہودیوں اور مجوسیوں کی خفیہ کاروائی کے لئے بطور کمین گاہ اور گھات استعمال کیا جاتا ہے۔

مجوس (ایرانی)۔۔۔عہد رسالت مآب ﷺ میں دو بڑی طاقتیں تھیں۔ایک فارس (ایران) کی اور دوسری روم کی۔جزیرہ نمائے عرب کے مشرق میں خلیج فارس کے دوسرے ساحل پر ایرانی حکومت قائم تھی

اور مغرب میں بحر احمر کے کناروں سے لے کر اوپر بحر اسود تک سلطنت روم تھی۔

اول الذکر کا دوسرا نام ساسانی سلطنت اور مؤخر الذکر کا بازنطینی سلطنت ہے۔ان دونوں حکومتوں کی سرحدیں عرب کے شمال میں عراق کے مشہور دریاؤں دجلہ وفرات پر آ کر ملتی تھیں یہ دونوں اپنے زمانے کی طاقتور ترین سلطنتیں تھیں۔اس کے ساتھ ساتھ ایرانی آتش پرست اور سورج دیوتا کے پرستار تھے۔جبکہ رومی حضرت عیسیٰؑ کے پیرو اور اہل کتاب میں سے تھے۔

اب سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ایران اور اہل اسلام کے درمیان مخالفت کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ بعض حضرات نے اس اختلاف کا آغاز ایک خط کو قرار دیا جو آنحضرت ﷺ کی طرف سے شاہ ایران کو دعوت اسلام کے سلسلہ میں لکھا گیا تھا لیکن اسے کشمکش کا بنیادی سبب قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ شاہ ایران کے نام اسلام کا دعوت نامہ ہجرت کے ساتویں سال صلح حدیبیہ کے بعد روانہ کیا گیا تھا۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ رومی اور ایرانی دونوں حکومتیں عربوں کی پرانی دشمن تھیں اور ہمیشہ سے ان کی آزادی سلب کرنے کے درپے رہتی تھیں خصوصاً ایرانی عربوں کو نہایت تحقیر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انہوں نے کئی مرتبہ عرب کو زیر فرمان کرنے کی کوشش کی تھی اور ساسانی سلسلہ کے دوسرے فرمانروا سابور بن اردشیر نے حجاز اور یمن دونوں کو باج گزار بنا لیا تھا اور سابور ذی الاکتاف ایک مرتبہ یمن وحجاز فتح کر کے مدینہ تک پہنچ گیا تھا۔یہ عربوں کا اتنا شدید دشمن تھا کہ جو عرب گرفتار ہو کر اس کے قبضہ میں جاتے تھے ان کے شانے اکھڑوا دیا کرتا تھا اس لئے عربوں میں وہ ذی الاکتاف یعنی شانے والے کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ (اخبار الطوال صفحہ ۴۹)

لیکن عرب کسی بیرونی طاقت سے دبنے والے نہیں تھے اور جب انہیں موقع ملتا تھا

ان سے نکو خلاصی حاصل کر لیتے تھے بلکہ آگے بڑھ کر ان کے علاقوں پر بھی قبضہ کر لیتے تھے۔ چنانچہ قبیلہ معد بن عدنان نے عراق میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لی تھیں۔ غرض عربوں اور ایرانیوں میں نہایت قدیم رقابت چلی آرہی تھی اور عہد اسلام میں اس میں مزید اضافہ ہو گیا۔ جس کی چند وجوہات درج ذیل ہیں۔

اول۔۔۔ روم اور ایران کے درمیان جنگ کے نتیجے میں رومی مغلوب ہو گئے اور ایرانی غالب آ گئے۔ عراق، شام، فلسطین، مصر اور ایشیائے کوچک ہر جگہ صلیبی علم کے بجائے درفش کاویانی لہرا رہا تھا رومی سلطنت قسطنطنیہ کی چار دیواری میں محدود ہو کر رہ گئی تھی جو محاصرہ کی وجہ سے تمام راستے بند تھے۔ چنانچہ شہر میں قحط اور وبائی امراض نے پھیل کر مزید مصیبت پیدا کر دی رومی سلطنت کے عظیم الشان درخت کا صرف تنا باقی رہ گیا تھا اور وہ بھی خشک ہو رہا تھا خود قسطنطنیہ کے اندر دشمن کے گھس آنے کا خوف تمام آبادی پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ تمام کاروبار بند تھے۔

آتش پرست حکومت نے رومی علاقہ پر قبضہ کرنے کے بعد مسیحیت کو مٹانے کے لئے شدید ترین مظالم کئے مذہبی شعائر کی توہین کی گئی گرجا گھر مسمار کر دیئے گئے تقریباً ایک لاکھ عیسائیوں کو بے گناہ قتل کر دیا گیا ہر جگہ آتش کدے تعمیر کئے گئے اور سورج کی جبری پرستش کو رواج دیا گیا مقدس صلیب کی اصل لکڑی جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اس پر مسیح نے جان دی تھی وہ چھین کر مدائن پہنچائی گئی خسرو پرویز شاہ ایران اس فتح سے اس قدر مغرور ہو گیا کہ اس نے ہرقل کے نام ایک خط میں یہ الفاظ لکھے کہ!

> "سب خداؤں سے بڑا خدا تمام روئے زمین کے مالک خسرو کی طرف سے اس کے کمینہ اور بے شعور بندے ہرقل کے نام"
> تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے خدا پر بھروسہ ہے کیوں نہ تیرے خدا نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچا لیا۔

روم و ایران کی اس جنگ سے اہل مکہ میں ایک نئی کشمکش پیدا ہو گئی ایرانی سورج دیوتا کو مانتے تھے اور آگ کی پرستش کرتے تھے اور رومی اہل کتاب اور وحی و رسالت پر یقین رکھتے تھے اس لئے نفسیاتی طور پر اس جنگ میں مسلمانوں کی ہمدردیاں رومی عیسائیوں کے ساتھ تھیں اور مشرکین مظاہر پرست ہونے کی وجہ سے مجوسیوں سے اپنا مذہبی رشتہ جوڑتے تھے۔

نبی اکرمﷺ کی بعثت کے چند سال بعد جب ایرانیوں کا غلبہ نمایاں ہو گیا اور رومیوں کے تمام مشرقی علاقے ایرانیوں کے قبضہ میں چلے گئے اور اسکی اطلاع مکہ پہنچی تو اسلام کے مخالفین نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ کہنا شروع کیا کہ دیکھو ہمارے بھائی تمہارے جیسا مذہب رکھنے والوں پر غالب آگئے ہیں اسی طرح اپنے ملک میں بھی ہم تمہیں اور تمہارے دین کو مٹا کر رکھ دیں گے۔ مکہ کے مسلمان جس بے بسی اور کمزوری کی حالت میں تھے اس میں یہ الفاظ ان کے لئے زخم پر نمک کا کام کرتے تھے۔

عین اس حالت میں آنحضرتﷺ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری کئے گئے۔

غُلِبَتِ الرُّوْمُ ○ فِیْ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ○ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ وَ یَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ بِنَصْرِ اللّٰهِ یَنْصُرُ مَنْ یَّشَآءُ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ○ وَعْدَ اللّٰهِ لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ○ (الروم نمبر ۲-۶)

رومی قریب کی زمین میں مغلوب ہو گئے ہیں مگر وہ مغلوب ہونے کے بعد چند سال میں عنقریب غالب آجائیں گے۔ پہلے اور پیچھے سب اختیار اللہ تعالیٰ ہی کا ہے اور اس دن مسلمان اللہ کی مدد سے خوش ہونگے وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے وہ غالب اور مہربان ہے اللہ کا وعدہ ہے اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا خلاف نہیں کرتا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

بظاہر اسباب یہ پیش گوئی ناممکن العمل نظر آتی تھی تاہم مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے یقین تھا کہ ایسا ضرور ہو کر رہے گا۔ اسی لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ابوجہل یا بروایت دیگر ابی بن خلف کے ساتھ یہ شرط لگائی کہ رومی پانچ سال (یا تین سال) کے اندر دوبارہ غالب آجائیں گے۔ جب نبی اکرمﷺ کے علم میں یہ شرط آئی تو فرمایا کہ "بضع" کا لفظ تین سے دس تک کے عدد کے لئے استعمال ہوتا ہے تم اس میں اضافہ کرلو۔ چنانچہ آپکی ہدایت کے مطابق حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس مدت میں اضافہ کروالیا اور پھر ایسا ہی ہوا کہ رومی نو سال کی مدت کے اندر اندر یعنی ساتویں سال دوبارہ فارس (ایران) پر غالب آگئے۔ جس سے یقیناً مسلمانوں کو بڑی خوشی ہوئی۔ (ترمذی تفسیر سورۃ الروم)

قرآن نے یہ اعلان بھی کیا کہ اس دن مومن خوش ہونگے۔ حضرت ابوبکر صدیق

حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ سے زیادہ خوشی کسے ہو سکتی تھی؟ بالخصوص حضرت ابو بکر صدیقؓ جنہوں نے رومیوں کے دوبارہ غالب آنے پر شرط لگائی تھی (اس وقت شرط لگانا حرام قرار نہیں دیا گیا تھا) اس لئے ایرانیوں کے دل میں پیغمبر اسلام ﷺ اور صحابہؓ کے خلاف اس پیشن گوئی کی بنیاد پر کینہ و عداوت پیدا ہو گئی جو آج تک بدستور چلی آ رہی ہے۔

دوم ۔۔۔ ایران اور اسلام کے مابین عداوت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابو بکر ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے جا رہے تھے تو سراقہ بن جعشم تیز رفتار گھوڑے پر ہتھیار لگائے تعاقب کرتا ہوا قریب آ گیا۔ آپ ﷺ نے دعا فرمائی اور گھوڑا گھٹنوں گھٹنوں زمین میں دھنس گیا۔ سراقہ نے کہا یا محمد ﷺ دعا کیجئے میں اس مصیبت سے چھوٹ جاؤں میرا وعدہ ہے کہ میں تعاقب کرنے والوں کو واپس کر دونگا۔ آپ ﷺ نے دعا فرمائی گھوڑا باہر نکل آیا۔ جب واپس جانے لگا تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا وقت ہوگا جب تمہارے ہاتھ میں کسریٰ کے کنگن ہوں گے سراقہ غریب کی سمجھ میں نہ آیا کہ کبھی ایسا وقت بھی آ سکتا ہے کہ شہنشاہ ایران کے کنگن ایک غریب اعرابی کے ہاتھ میں ہوں اس نے بڑی بے ساختگی سے پوچھا کیا کسریٰ ابن ہرمز کے کنگن؟ فرمایا ہاں۔

پھر دنیا نے یہ پیشن گوئی پوری ہوتی ہوئی دیکھی جب دور فاروقیؓ میں کسریٰ کا تاج اور کنگن حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کئے گئے تو امیر المومنینؓ نے سراقہ کو دونوں کنگن پہنائے اور فرمایا دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر اللہ کی کبریائی اور اس کی حمد بیان کرو کہ اس نے شہنشاہ ایران کسریٰ کے کنگن چھین کر بنو مدلج کے ایک اعرابی سراقہ کو پہنا دیئے۔ حضرت عمرؓ نے یہ بات بلند آواز سے کہی پھر مال غنیمت مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ (حیات ابو بکر صدیق صفحہ ۲۰۰ موکفہ الاستاد علی الطنطاوی سابق جج ہائی کورٹ دمشق)

سوم ۔۔۔ ایران اور اسلام کے درمیان عداوت کا تیسرا سبب غزوہ احزاب کے موقع پر آنحضرت ﷺ کی یہ پیشن گوئی ہے۔ نبی اکرم ﷺ خود خندق کھودنے میں مشغول ہیں ایک پتھر ایسا آ جاتا ہے۔ جس پر کدالیں اور پھاوڑے کام نہیں کرتے۔ صحابہ کرامؓ آپ ﷺ سے عرض کرتے ہیں تو آپ ﷺ اس پر کدال مارتے ہیں جس سے پتھر دو ٹکڑے ہو جاتا ہے اور اس سے ایک چمک نکلتی ہے ارشاد ہوتا ہے کہ میں نے اس روشنی میں ایران کا سفید محل اور شام کا زرد محل دیکھا ہے تم ان محلوں کو فتح کرو گے۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ محل دور فاروقیؓ و عثمانیؓ میں فتح ہوئے۔

چہارم ۔۔۔اس عداوت کا چوتھا سبب کسریٰ پرویز کے نام نبی اکرم ﷺ کا خط ہے۔ جس میں اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ آپ ﷺ نے ہرقل، مقوقس اور نجاشی کے نام بھی اس مضمون کے خطوط بھیجے تھے۔ ان تینوں نے مکاتیب نبوی ﷺ کے ساتھ ادب کا معاملہ کیا، قاصدوں کا بہت احترام کیا اور آپ ﷺ کی خدمت میں ہدایا بھی بھیجے۔ ان کے برعکس کسریٰ پرویز نے خط مبارک سنتے ہی چاک کر ڈالا اور بولا میرا غلام ہو کر مجھے یوں لکھتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ اس کے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے"۔ (صحیح بخاری، کتاب النبی ﷺ الی کسریٰ و قیصر)

کسریٰ نے یمن کے حاکم باذان کو اس کا حکم دیا کہ آپ ﷺ کو حاضر کیا جائے اس نے بابویہ کو آپ ﷺ کے پاس بھیجا اور یہ کہلوایا کہ شہنشاہ کسریٰ نے باذان کو یہ ہدایت کی ہے کہ کسی کو بھیج کر آپ ﷺ کو وہاں حاضر کیا جائے۔ انہوں نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔ آپ ﷺ نے اس کو یہ اطلاع دی کہ اللہ تعالیٰ نے کسریٰ پر اس کے بیٹے شیرویہ کو مسلط کر دیا ہے۔ جس نے اس کو قتل کر دیا ہے۔ (تاریخ طبری صفحہ ۹۰ جلد ۳)

آپ ﷺ نے جو خبر دی تھی وہ حرف بحرف صحیح نکلی۔ کسریٰ کے تخت پر اس کا لڑکا "قباذ" اس کا لقب شیرویہ تھا قابض ہوا۔ کسریٰ اسی کے اشارے پر قتل کیا گیا۔ اس کی موت کے بعد ملک کا شیرازہ منتشر ہو گیا اور حکمران خاندان کے ہاتھ سلطنت ایک کھلونا بن گئی۔ شیرویہ بھی چھ ماہ سے زیادہ حکومت نہ کر سکا، اور اس کے تخت پر چار سال کے اندر یکے بعد دیگرے دس بادشاہ متمکن ہوئے سلطنت کی چولیں ہل گئیں۔ آخر میں یزدگرد پر سب کا اتفاق ہوا اور اس سلطنت کا تاج اس کے سر پر رکھا گیا یہ ساسانی خاندان کا آخری فرمانروا تھا اور اسی کو اسلامی افواج کا سامنا کرنا پڑا تھا جنہوں نے بالآخر سلطنت آل ساسان کی قسمت پر مہر لگا دی اور اس سلطنت کا جس کا چار سو سال تک ڈنکا بجتا رہا چراغ گل ہو گیا اور آپ کی پیشن گوئی کا دوسرا جزو بھی پورا ہوا کہ "اذا ھلک کسری فلا کسری بعدہ"۔

عہد نبوی ﷺ میں ایران اور اہل اسلام کے درمیان مخالفت کے یہ چار بنیادی اسباب تھے یہی وجہ ہے کہ شاہ ایران نے نہ صرف آپ کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کئے بلکہ یہودیوں اور منافقوں کی سرپرستی کرتے ہوئے آپ ﷺ کی نبوت کے مقابلے میں جھوٹے مدعیان نبوت کو

بھی لا کھڑا کیا۔

عہد نبوت میں جن اسلام دشمن تحریکوں (یہودیت، مجوسیت، منافقت اور عیسائیت) نے پیغمبر اسلام ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے خلاف خفیہ یا اعلانیہ کردار ادا کیا تھا، بعد کے تمام ادوار میں بھی وہی قوتیں سرگرم عمل رہیں۔ کوئی دور ایسا نہیں بتایا جا سکتا جس میں یہ دشمنان اسلام اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں مصروف نہ رہے ہوں۔ کبھی انفرادی شکل میں اور کبھی "الکفر ملۃ واحدۃ" کے تحت متحدہ محاذ کی صورت میں پھر ان اسلام دشمن قوتوں کی قیادت میں بھی حالات کی مناسبت سے تبدیلی ہوتی رہی۔ کبھی یہودیوں نے قیادت کے فرائض سرانجام دیئے اور کبھی مجوسیوں نے۔ آنحضرت ﷺ اور شیخین (ابوبکرؓ و عمرؓ) کے عہد میں یہ دشمنان اسلام یہودی، عیسائی، مجوسی اور منافق کے نام سے فساد پھیلاتے رہے جبکہ عہد عثمانیؓ و مرتضویؓ میں انہوں نے سبائی، شیعہ اور خوارج کے نام سے اپنی خفیہ کاروائیاں جاری رکھیں۔

شیعیت سیدنا ابو بکر صدیقؓ کے عہد میں

آنحضرت ﷺ کی وفات کے فوراً بعد سارے عرب میں ارتداد کی آگ پھیل گئی۔ یمن، حضرموت، بحرین اور نجد کے تمام علاقے مرتد ہو گئے۔ دشمنان اسلام نے لوگوں کو زکوۃ نہ دینے پر اکسایا۔ جھوٹے مدعیان نبوت کو کھڑا کر دیا گیا۔ یہودیت اور نصرانیت نے جو عرب سے جلاوطن ہو گئی تھی سر اٹھایا نفاق نے جو پہلے سوسائٹی کا ایک جرم اور پوشیدہ عیب تھا نقاب الٹ دی اور لوگوں نے کھل کر شک و نفاق کی باتیں کرنی شروع کر دیں۔ عرب مؤرخین نے بڑی بلاغت کے ساتھ اس وقت کے مسلمانوں کی بے بسی اور درماندگی کی تصویر کھینچی ہے وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی اس وقت وہ کیفیت ہو گئی تھی جیسے بارش کی رات میں بھیڑوں کی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے باڑہ میں دبک جاتی ہیں اور سردی سے ٹھٹھرنے لگتی ہیں۔ ان تمام فتنوں میں یہودیوں، مجوسیوں، عیسائیوں اور خصوصاً یہودی منافقوں کا ہاتھ تھا۔ ان فتنوں کا خاتمہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا وہ کارنامہ ہے جس کی نظیر سے امتوں کی تاریخ خالی ہے۔ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی جانشینی کا حق ادا کر دیا۔ آج دنیا میں اگر اسلام محفوظ ہے اور اس کی شریعت بے کم و کاست موجود ہے تو یہ حضرت ابو بکرؓ ہی کی استقامت عزیمت اور جدوجہد کا نتیجہ ہے اور یہ عزیمت و استقامت حضرت ابو بکر صدیقؓ کے اس یقین کا نتیجہ تھا جو ان کو مشکوٰۃ نبوت اور مرکز ایمان و یقین سے ملا تھا اور جس

کی بنا پر وہ صدیق اکبر کہلاتے ہیں جس کی بدولت انہوں نے دین کی گرتی ہوئی عمارت کو تھام لیا اور اس کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو اپنی ہمت وقوت اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے پار لگا دیا۔ صدیق اکبرؓ ان فتنوں پر قابو پانے کے بعد ان کے سرپرستوں روم وایران (جو اس وقت دنیا کی عظیم ترین سلطنتیں تھیں) کی طرف متوجہ ہوئے۔ رومیوں سے تو عہد نبوی ﷺ میں ہی جنگ کا آغاز ہو گیا تھا۔ جنگ موتہ، غزوہ تبوک اور جیش اسامہؓ بھی ان ہی کے خلاف لشکر کشی کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ البتہ ایران کے خلاف اس دور میں (باوجود اس کی سازشوں اور فتنہ سامانیوں کے) باقاعدہ کوئی فوج کشی نہیں ہوئی تھی۔

تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو فتنہ ارتداد کے قلع قمع کے بعد ایران کے خلاف فوجی اقدامات کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اسلام تو امن وآشتی کا دین ہے وہ بلاوجہ کسی ملک پر فوج کشی کی اجازت نہیں دیتا۔ اکثر مؤرخین اس سوال کو حل کئے بغیر آگے نکل گئے۔ حالانکہ تاریخی حیثیت سے یہ نہایت اہم مسئلہ تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب (جیسے حضرات) نے یہ لکھا کہ "حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب اندرونی شورشوں سے نمٹنے کے بعد توسیع انقلاب کیطرف توجہ کی تو آپؓ نے صحابہ کرام کا ایک لشکر ملک شام کی طرف روانہ کیا جو سلطنت روم کا باج گذار علاقہ تھا اور ایک لشکر عراق کی طرف بھیجا جو ایران کا باج گزار علاقہ تھا۔ لیکن زندگی نے آپ کو زیادہ مہلت نہ دی"۔ (ماہنامہ میثاق صفحہ ۹ نومبر ۱۹۸۹ء)

بعض حضرات نے یہ جواب دیا کہ نبی اکرم ﷺ نے پیشن گوئی کی تھی کہ کسریٰ کی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوں گے اس لیے یہ پیش قدمی کی گئی جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ایران کئی دفعہ نبی اکرم ﷺ کی گستاخی کا مرتکب ہو چکا تھا۔ اسلام کی ترقی اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اس نے اپنے زیر اثر علاقوں میں مدعیان نبوت اسود عنسی کو یمن، مسیلمہ کذاب کو یمامہ اور طلیحہ اسدی کو بنو اسد اور طے میں کھڑا کر کے ان کی مکمل پشت پناہی بھی کی۔ خود کسریٰ ایران نے اس داخلی انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور اسے ریاست اسلامی کو ختم کرنے کا بہترین موقع سمجھتے ہوئے اپنی فوجوں کو عراق کی سرحد پر جمع کرنا شروع کر دیا۔ فراست صدیقیؓ نے اس خطرے کو پہلے سے ہی بھانپ لیا تھا، اور حضرت مثنیٰ بن حارثہ کی سرکردگی میں مجاہدین کا ایک دستہ دشمن کی نقل وحرکت دیکھنے کے لئے روانہ کر دیا تھا۔ جب صدیق اکبرؓ کو ایران کے جنگی عزائم

کا پتہ چلا تو انہوں نے حضرت عیاض بن غنمؓ اور خالد بن ولیدؓ کو حکم دیا کہ فوراً شمالی عراق اور جنوبی عراق کی طرف روانہ ہو جائیں۔ اس طرح ایرانیوں اور مسلمانوں کے درمیان دورِ صدیقی میں باقاعدہ جنگ کا آغاز ہو گیا۔ فتنہ ارتداد اور دیگر فتنوں کے سرپرست اگرچہ یہودی مجوسی اور نصرانی تھے۔ لیکن چونکہ "شیعہ" کی تعریف میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا انکار شامل ہے اس لئے دورِ صدیقیؓ میں باغی مرتدین ہی شیعہ جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔

شیعہ مجتہد سید محمد طباطبائی لکھتے ہیں کہ

"ٹھیک اس وقت جبکہ پیغمبر اکرم ﷺ نے رحلت فرمائی اور ابھی آپ ﷺ کی تجہیز و تکفین بھی نہیں ہوئی تھی اور اہلبیت اور بعض اصحاب سوگواری اور کفن دفن کے انتظامات کر رہے تھے۔ خبر ملی کہ ایک جماعت نے جو بعد میں اکثریت کی حامل ہوئی بہت ہی جلد بازی سے پیغمبر اکرم ﷺ کے اہل و عیال، رشتہ داروں اور پیروکاروں سے مشورہ کئے بغیر اور حتیٰ کہ ان کو اطلاع دیئے بغیر ظاہری خیر خواہی اور مسلمانوں کی بہبودی کی خاطر مسلمانوں کے لئے خلیفہ کا انتخاب کر لیا۔ حضرت رسول اکرم ﷺ کے کفن دفن کے بعد جب حضرت علیؓ اور آپ کے پیروکاروں عباس، زبیر، سلمان، ابوذر، مقداد اور عمار کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو انہوں نے انتخابی خلافت اور خلیفہ کو انتخاب کرنے والوں پر سخت اعتراضات کیے اور اسی ضمن میں احتجاجی جلسے بھی ہوئے مگر جواب دیا گیا کہ مسلمانوں کی اسی میں بہتری تھی۔ یہی اعتراض تھا جس نے اقلیت (شیعہ) کو اکثریت سے جدا کر دیا تھا اور حضرت علی کے پیروکاروں کو شیعہ علی کے نام سے پہچوایا تھا۔ البتہ حکومت اور خلافت کے مامور بھی سیاسی لحاظ سے کڑی نظر رکھے ہوئے تھے کہ مذکورہ اقلیت اسی نام سے مشہور نہ ہو اور اسلامی معاشرہ اکثریتی اور اقلیتی گروہوں میں تقسیم نہ ہونے پائے۔ بلکہ وہ خلافت کو اجماع امت جانتے تھے اور اعتراض کرنے والوں کو بیعت اور مسلمانوں کے مخالفوں کے طور پر تعارف کراتے تھے اور کبھی دوسرے برے ناموں سے بھی یاد کیا کرتے تھے۔

موصوف نیچے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ عمرو بن حریث نے سعید بن زید سے کہا۔ آیا کسی نے حضرت ابوبکر کی بیعت کرنے کی مخالفت کی ہے۔ تو اس نے جواب دیا کسی نے مخالفت نہیں کی سوائے ان لوگوں کے جو مرتد ہو گئے ہیں یا مرتد ہو رہے ہیں" (شیعہ صفحہ ۲۶)

شیعہ مجتہد کی اس گواہی سے صاف معلوم ہو گیا ہے کہ صرف مرتدین نے ہی حضرت

ابوبکرؓ کی مخالفت کی تھی اور ان کی پیروی میں شیعہ بھی آں محترمؓ کی مخالفت کر رہے ہیں۔ گویا خود ان کے اپنے بقول اس دور کے شیعہ "مرتد" کے نام سے پہچانے جا رہے تھے۔ جہاں تک حضرات علی، عباس، زبیر، سلمان، ابوذر، مقداد اور عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اختلاف کا تعلق ہے تو ان سب حضرات نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت کی اور زندگی بھر اس پر قائم رہے بلکہ حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ نے بیعت کرتے وقت ان الفاظ کا اظہار بھی فرمایا کہ

بے شک ہم ابوبکرؓ کو سب لوگوں سے زیادہ خلافت کا مستحق سمجھتے ہیں کیونکہ یہ صاحب غار ہیں اور ثانی اثنین ہیں ہم ان کی شرافت و بزرگی کے معترف ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں ان کو تمام لوگوں کی نماز کا امام مقرر فرمایا تھا۔ (مستدرک حاکم صفحہ ۶۶ جلد ۳)

اس سے ثابت ہوا کہ اصلی شیعان علیؓ صرف وہی ہیں جو حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ (اول بلا فصل) راشد، عادل اور برحق تسلیم کرتے ہیں۔

شیعیت سیدنا عمر فاروقؓ کے عہد میں

حضرت ابوبکرؓ کے انتقال کے بعد نئے خلیفہ کی تقرری سے متعلق وصیت نامہ پڑھنے سے پہلے حضرت عثمانؓ نے حاضرین (صحابہؓ) سے پوچھا کہ جس شخص کو اس تحریر میں خلیفہ مقرر کیا گیا ہے کیا وہ آپ کو منظور ہے؟ سب نے اپنی رضامندی ظاہر کی لیکن حضرت علیؓ نے بلا جھجک جواب دیا کہ "لا نرضیٰ اِلا ان یکون عمر بن الخطاب" ہم عمر بن خطاب کے علاوہ اور کسی سے راضی نہیں ہونگے۔ (اسد الغابہ صفحہ ۷۰ جلد ۳، تاریخ الخلفاء صفحہ ۶۱، طبقات ابن سعد صفحہ ۱۴۲ جلد ۳)

تمام حاضرین نے بلا اختلاف اس انتخاب کو قبول کرتے ہوئے مسجد نبوی ﷺ میں بیعت خلافت کر لی حضرت علیؓ اور اہل بیت نبوت میں سے کسی نے بھی ان کی بیعت سے انکار نہیں کیا اور ہمیشہ خلیفہ وقت کے معاون رہے۔

عہد صدیقیؓ میں مدعیان نبوت، مانعین زکوٰۃ اور مرتدین عرب کا خاتمہ ہو کر فتوحات ملکی (روم و ایران) کا آغاز ہوا ہی تھا کہ خلیفہ وقت انتقال کر گئے۔ حضرت عمرؓ نے عنان حکومت ہاتھ میں لی تو ان کا سب سے اہم فرض ان ہی مہمات کو پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا۔ لہٰذا انہوں نے اپنے ساڑھے دس سالہ عہد خلافت میں روم و ایران کی عظیم الشان سلطنتوں کا تختہ الٹ کر ۲۲ لاکھ مربع میل رقبہ زمین پر اسلام کا پرچم لہرا دیا۔ نبی اکرم ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق ایران فتح ہوا کئی

ہزار سالہ قدیم شاہی نظام نیست ونابود ہوگیا۔ ایران کے خلاف معرکوں میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حضرت عمرؓ نے خود سپہ سالار اعظم کا منصب سنبھالتے ہوئے ایران کی طرف پیش قدمی شروع کردی جنہیں صحابہؓ نے دانستہ سے مشاورت کے بعد باصرار واپس مدینہ بھیجا۔

سراقہ بن جعشم کو ہجرت کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے جو کسریٰ ایران کے کنگن پہننے کی خوشخبری سنائی تھی وہ دور فاروقی میں پوری ہوئی۔ جب سلطنت کسریٰ کی دھجیاں بکھر گئیں اور کسریٰ کے کنگن سراقہؓ کو پہنائے گئے۔ حضرت عمرؓ نے جب اہل ایران کو میدان جنگ میں شکست دے دی اور ان کی ہزاروں سال پرانی بادشاہت کو بیخ وبن سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ جس سے ان کے آتش کدے تو ٹھنڈے ہوگئے لیکن "آتش انتقام" ان کے سینوں میں بھڑک اٹھی اور وہ اس شکست کا بدلہ لینے کی تدبیریں سوچنے لگے۔

ڈاکٹر براؤن نے اپنی کتاب میں ایک ایرانی شاعر رضائے کرد کے دو شعر نقل کئے ہیں جن میں ایرانیوں کی حضرت عمرؓ کے ساتھ دشمنی کی اصل وجہ بیان کی گئی ہے۔

بشکست عمر پشت ہژبر ان اجم را	برباد فنا داد رگ و ریشہ جم را
ایں عربدہ بر غصب خلافت ز علی نیست	با آل عمر کینہ قدیم است عجم را

{تاریخ ادبیات ایران صفحہ ۲۹ جلد ۴، تجلیات روح ایران در ادوار تاریخی}

حضرت عمرؓ نے ایرانی پہلوانوں کی کمر توڑ ڈالی تھی اور ان کی شہنشاہیت کا رگ وریشہ بکھیر دیا تھا۔ یہ جو فتنہ اہل عرب کے خلاف ہے حضرت علیؓ کے حق خلافت کے غصب ہونے کے باعث نہیں بلکہ آل عمرؓ (اہل عرب) کے ساتھ عجمیوں کی عداوت پرانی ہے (جس کی ایک جھلک عہد نبوی ﷺ اور عہد صدیقیؓ میں مجوسیوں کے کردار کے حوالہ سے دکھائی جاچکی ہے)

صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے کافی عرصہ تک مجوسیوں سے کوئی جزیہ نہیں لیا۔ جب حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے شہادت دی کہ حضرت محمد ﷺ نے ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا تھا تو پھر حضرت عمرؓ نے بھی مجوس سے جزیہ لینا شروع کردیا۔

{صحیح بخاری، کتاب فرض الخمس، باب الجزیۃ}

اس کے علاوہ حضرت عمرؓ نے اپنی شہادت سے ایک سال پہلے یہ حکم جاری کیا کہ مجوس کے ایسے تمام نکاح جو انہوں نے محرم رشتہ داروں سے کئے ہیں (ختم کردیئے جائیں اور میاں بیوی میں

تفریق کردی جائے۔(حوالہ مذکور)

تو ایسی زخم خوردہ قوم کے جذبہ انتقام کا اندازہ کیوں کر لگایا جاسکتا ہے۔

قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ O(آل عمران نمبر ۱۱۸)

بغض و نفرت کے بعض جذبات بھی کبھی ابھر کر ان کی زبان تک آجاتے ہیں لیکن وہ حسد و انتقام کی آگ اس آگ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو ان کے سینوں میں دبی ہوئی ہے۔"

یہودیوں کی حضرت عمرؓ کے ساتھ عداوت اور جذبہ انتقام اس پر مستزاد ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے دور میں غزوہ خیبر کے موقع پر جب یہودیوں نے شکست کھائی تو آپ ﷺ کے سامنے صلح کی پیش کش کی اور کہا کہ آپ (ﷺ) ہمیں اسی جگہ قیام کی اجازت دے دیں ہم زمین کی دیکھ بھال اور کھیتی باڑی کا کام کریں گے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں خیبر میں قیام کی اجازت اس شرط پر دی کہ تمام پیداوار غلہ اور پھلوں کا ایک حصہ مسلمانوں کو ملے گا اور آپ ﷺ جب تک چاہیں گے معاہدہ کو برقرار رکھیں گے۔ اس معاہدے کے باوجود یہودی ہمیشہ زیر زمین سازشوں اور خفیہ سرگرمیوں میں مشغول رہے۔ ان کے جزیرۃ العرب کی انتہائی نازک اور حساس حدود میں رہنے اور سرحد پار آباد دشمن اقوام سے ساز باز میں مشغول ہونے کو اسلام اور مسلمانوں کے لئے ہمیشہ خطرہ سمجھا جاتا رہا۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے آخری وقت وصیت فرمائی کہ "اخرجوا الیھود والنصاری من جزیرۃ العرب" (صحیح بخاری کتاب الجہاد) یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کو عرب کے جزیرے سے نکال دو۔

اس وصیت کی تعمیل کا اعزاز بھی حضرت عمرؓ کو نصیب ہوا۔ جنہوں نے ہر جگہ سے یہودیوں کو نکال کر جزیرہ عرب کو ان کی نحوست سے پاک کیا۔ یہودیوں کی جلاوطنی کا ذکر صحیح بخاری کتاب الشروط باب اذا اشترط فی المزارعۃ و کتاب المزارعۃ اور صحیح مسلم باب المساقات و المقاملۃ یجزوا من الثمر میں موجود ہے۔

اسلام کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ جب مخالفین یہود و مجوس اسلام اور مسلمانوں کو عقل و دلیل سے شکست دینے سے عاجز آئے تو انہوں نے تلوار اٹھائی۔ پھر جب ان کی تلوار بھی عقل و دلیل کی طرح کند ہوگئی۔ تو وہ سازشوں پر اتر آئے کیونکہ عقل و دلیل کا میدان محدود ہوتا ہے۔ جبکہ سازشیں لامحدود پیمانے پر لامحدود مدت تک جاری رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے

خلاف دشمنان اسلام (شیعہ) کی سازشوں کا سلسلہ گزشتہ چودہ سو برسوں سے جاری ہے۔

یہ طبقہ (شیعہ) اپنی تمام تر دولت اور حربی قوت کے باوجود میدان میں شکست سے دوچار ہوا لیکن اس کا سازشی کردار ناقابل شکست ثابت ہوا۔ یہودی اپنی بدعہدیوں اور ناقابل اصلاح بدعنوانیوں کی بناء پر جزیرۃ العرب سے نکلنے کے بعد قرب و جوار کے ملکوں میں پھیل گئے۔ ایران اور اس کی مقبوضات ان کے لئے موزوں پناہ گاہیں ثابت ہوئیں۔ کیونکہ عیسائی ملکوں میں انہیں قاتل مسیح تصور کیا جاتا تھا اس میں شک نہیں کہ مالی امور میں بے مثال مہارت کی وجہ سے بعض عیسائی بادشاہ ان کی آؤ بھگت بھی کرتے تھے۔ چنانچہ یہودیوں کو ایران اور ایرانی مقبوضات عراق وغیرہ میں اسلام کے خلاف سازشیں کرنے اور سازشی منصوبے بنانے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ عیسائیوں کو بھی اسلام کی ترقی سے وحشت ہوئی تو انہوں نے "الکفر ملة واحدة" کے اصول پر عرب سے نکلے ہوئے یہودیوں کو اسلام کے متعلق اطلاعات و معلومات کا مستند حبر و سیلہ سمجھتے ہوئے خوش آمدید کہا۔

اس سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ عرب کے جلاوطن یہودیوں اور ایران کے تاراج شدہ مجوسیوں نے اپنی رسواکن شکستوں کا انتقام لینے کے لئے اہل اسلام کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا اور وہ اسلام جس کو وہ میدان جنگ میں شکست نہ دے سکے اس کو انھوں نے اپنی خفیہ تحریکوں اور مخفی سازشوں سے ناکام بنانے کے منصوبے بنائے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ کہ اسلام کے خلاف ابتدائی سازشیں یہود مجوس (شیعہ) نے ہی کی تھیں۔ جن کے نتائج آج بھی پوری شدت کے ساتھ محسوس کئے جاتے ہیں۔ اسلام کے خلاف پہلی اور عظیم ترین سازش حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت سے متعلق ہے۔ ابولولو، فیروز جفینہ، ہرمزان اور کعب الاحبار وغیرہ نے حضرت عمرؓ کو راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنایا (گویا امیر المومنین کو شہید کرنے کے جرم میں تین طاقتیں (یہودی، عیسائی اور مجوسی شریک تھیں) اس سازش میں دو ایرانی، ایک عیسائی اور ایک یہودی ہے۔

حضرت عمرؓ کی شہادت تاریخ اسلام کا سب سے بڑا المیہ ہے جس کے بعد اسلام میں فتنوں کے دروازے چوپٹ کھل گئے۔ مگر ارباب تاریخ و سیر کا اس بدترین سازش کو بے نقاب نہ کرنا۔ اس سے بھی بڑا المیہ ہے۔ تاریخ کا یہ بیان کس قدر سطحی ہے کہ!

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے ایرانی غلام ابولولو فیروز نے اپنے آقا کی حضرت عمرؓ سے شکایت کرتے ہوئے کہا کہ وہ ان سے بہت زیادہ خراج وصول کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا تم کتنا خراج ادا کرتے ہو؟ اس نے کہا روزانہ دو درہم پوچھا کام کیا کرتے ہو۔ وہ بولا نجاری، نقاشی، اور آہن گری کا۔ یہ جواب سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا تمہارے پیشوں کو دیکھتے ہوئے خراج زیادہ نہیں معلوم ہوتا۔ پھر فرمایا میں نے سنا ہے تم کہتے ہو کہ "اگر میں چاہوں تو ہوا سے چلنے والی چکی بنا سکتا ہوں" فیروز نے اثبات میں جواب دیا۔ تو آپؓ نے فرمایا "پھر مجھے ایک چکی بنا دو۔ حضرت عمرؓ کی خواہش سن کر فیروز نے کہا اگر میں زندہ رہا تو آپ کے لئے ایسی چکی بناؤں گا جس کا چرچا مشرق سے مغرب تک ہوگا۔ فیروز یہ کہہ کر چلا گیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا "اس غلام نے ابھی ابھی مجھے دھمکی دی ہے۔

غور فرمایئے! تاریخ اسلام کے اس عظیم ترین سانحے کا اس قدر پس منظر بیان کر کے سکوت اختیار کر لینا کیا مورخین کی بوالعجبی ہے یا نہیں؟ اس عظیم شخصیت کے سانحہ ارتحال کو ایک غلام کی محض وقتی اور برائے نام رنجش کا نتیجہ قرار دینا کیونکر درست ہو سکتا ہے؟

اس معاملہ میں مولانا نورالحسن شاہ بخاری مرحوم بھی چوک گئے وہ لکھتے ہیں!

''حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے مجوسی غلام فیروز نے جس کی کنیت ابولولو تھی ایک ذاتی پرخاش کی بناء پر ۲۷ ذی الحجہ ۲۳ھ کو صبح کی نماز میں زہر آلود خنجر کے ساتھ متواتر چھ وار کئے آپؓ زخموں سے بے تاب ہو کر گر پڑے اور خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے۔

(سیرت سیدنا عمر بن خطاب صفحہ ۴۳)

یہ روایت اس گتھی کو نہیں سلجھاتی کیونکہ شکایت تو حضرت مغیرہؓ سے تھی اس غلام نے اپنے مالک پر حملہ کیوں نہیں کیا؟ اس نے امیر المومنینؓ کو اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کیوں کی؟ حضرت عمرؓ آخر اس عجمی غلام کی راہ میں کس طرح رکاوٹ تھے؟ ایک غلام اتنی اونچی سیاسی فکر نہیں رکھ سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ معمولی پرخاش فیروز کو ایسے سنگین جرم کے ارتکاب پر آمادہ نہیں کر سکتی تھی۔ دارالخلافہ میں حضرت عمرؓ جیسے سربراہ مملکت کے قتل کے لئے اس سے کہیں زیادہ قوی محرکہ کی ضرورت تھی۔ اس جذبہ محرکہ کی نشاندہی اس خنجر نے کر دی جس سے فیروز نے حملہ کے بعد خودکشی کر لی تھی۔ جب حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے وہ خنجر دیکھا تو کہا کہ میں نے اس خنجر کو

کل ہرمزان اور جفینہ کے پاس دیکھا تھا میں ابولولو فیروز کے پاس سے گذرا جفینہ اور ہرمزان اس کے ساتھ تھے وہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے میں اچانک ان کے پاس پہنچا تو وہ بھاگے اور ایک خنجر ان کے ہاتھ سے گر پڑا جس کے دو پھل اور بیچ میں دستہ تھا یہ وہی خنجر تھا جس سے حضرت عمرؓ کو شہید کیا گیا۔

اس سے واضح ہو گیا ہے کہ یہ ایک یہودی، نصرانی، مجوسی اور ایرانی سازش تھی جس میں ذاتی انتقام اور قومی و مذہبی غیظ و غضب دونوں کارفرما تھے۔ سازشی عناصر کا منصوبہ یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کو قتل کر کے یکبارگی طور پر اپنی مرضی کے آدمی سے بیعت کر لی جائے پھر سب لوگ بھی اس بیعت کو تسلیم کر لیں گے جس طرح حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اگر چہ یہ واقعہ دور نبوت کے بعد پیش آیا لیکن صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں اس کے متعلق واضح اشارات پائے جاتے ہیں۔ حضرت حذیفہ بن یمانؓ صاحب سر رسول ﷺ کہلاتے تھے انہیں خود نبی اکرم ﷺ نے فتنہ پرداز منافقین کے نام بتائے تھے۔

امام بخاری نے ان سے ایک روایت بیان کی ہے کہ!

ایک دن صحابہ کی مجلس میں حضرت عمرؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث جو فتنوں کے متعلق ہے تم میں سے کسے یاد ہے میں (حذیفہؓ) نے کہا مجھے اسی طرح یاد ہے جیسا آپ ﷺ نے فرمایا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تم سے بے شک اسی جرأت کی امید ہو سکتی ہے۔ میں نے کہا کہ آدمی کا وہ فتنہ جو اس کی بیوی، اس کے مال، اس کی اولاد اور اس کے پڑوس میں ہوتا ہے اس فتنہ کو نماز، روزہ، صدقہ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مٹا دیتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا میری مراد اس فتنہ سے نہیں بلکہ اس فتنہ سے ہے جو سمندر کی طرح موجیں مارے گا۔ حضرت حذیفہؓ نے کہا۔ لیس علیک منها بأس یا امیر المؤمنین اِنَّ بینکَ و بینها لباباً مغلقاً" اے امیر المومنین اس فتنہ سے آپکو کچھ خوف نہیں کیونکہ آپ کے اور اس کے درمیان ایک بند دروازہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا وہ بند دروازہ کھولا جائے گا یا توڑا جائے گا۔ حضرت حذیفہؓ نے کہا۔ توڑا جائے گا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "اذا لا یغلق ابدا" تو پھر وہ کبھی بند نہ ہوگا۔ ہم لوگوں نے حذیفہؓ سے کہا کیا عمرؓ اس دروازہ کو جانتے تھے انہوں نے کہا ہاں۔ اس طرح جانتے تھے جس طرح تم کل کے بعد رات کو جانتے ہو یہ دروازہ خود حضرت عمرؓ کی ذات ہے۔

(صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلوۃ، باب الصلوۃ کفارہ، و کتاب الزکوۃ و کتاب الصوم صحیح مسلم کتاب الایمان باب بیان ان الاسلام بدأ غریباً و کتاب الفتن)

اسلام کی اس قدر تیزی کے ساتھ اشاعت اور ترقی کو دیکھ کر دشمنان اسلام اس نتیجہ پر پہنچے کہ جب تک مسلمانوں میں حضرت عمرؓ کی شخصیت موجود ہے اس وقت تک اسلام کی یلغار کو نہیں روکا جا سکتا۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے حضرت عمرؓ کے قتل کی سازش تیار کی اور نئے ہونے والے خلیفہ کے متعلق عوام میں افواہیں پھیلانی شروع کر دیں۔ منصوبہ یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کی موت (قتل) کے بعد یکبارگی اپنی مرضی کے آدمی کے ہاتھ پر بیعت کر لی جائے جس طرح حضرت ابو بکرؓ کی بیعت یکبارگی ہوئی تھی اور پوری امت نے اسے قبول کر لیا تھا اسی طرح ہم بھی یکبارگی اپنی مرضی کے آدمی سے بیعت کر لیں گے اور امت بھی اسے تسلیم کر لے گی۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کیلئے وہ موقع کی تلاش میں تھے صحیح بخاری کی ایک روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں ایک دن منیٰ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے خیمہ میں پہنچا تو وہ اس وقت حضرت عمرؓ کے پاس گئے ہوئے تھے یکا یک وہ وہاں سے واپس ہو کر میرے پاس آئے اور کہنے لگے کاش تم اس آدمی کو دیکھتے جو آج امیر المومنین کے پاس آیا اور کہا اے امیر المومنین!

هَـلْ لكَ فِي فلان يقول لوقد مات عمر لقد بايعت فلاناً فو الله مَا كانت بيعَةُ ابي بكـرٍ الا فلتة فتمت فَغَضَبَ عُمَرُ ثُمَّ قال اِنِّيَ ان شاء الله لَقائِم العشية في الناس فمحذرهـم هو لاء الَّذِين يُرِيْدُوْنَ اَن يَغْصِبُوا امورهم.

آپ کو فلاں شخص کے متعلق کچھ خبر ہے جو کہتا ہے کہ اگر عمرؓ مر گئے تو میں فلاں کی بیعت کر لوں گا اللہ کی قسم ابو بکرؓ کی بیعت اتفاقیہ تھی جو پوری ہو گئی۔ حضرت عمرؓ کو بہت غصہ آیا کہ انشاء اللہ شام کے وقت لوگوں میں کھڑا ہو کر انہیں ان لوگوں سے آگاہ کروں گا جو امور خلافت (مسلمانوں کے امور) غصب کرنا چاہتے ہیں۔

عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا بیان ہے کہ میں نے کہا اے امیر المومنین ایسا نہ کیجئے اس لئے کہ موسم حج میں جاہل، رذیل اور پست قسم کے لوگ جمع ہوتے ہیں جب آپ تقریر کرنے کھڑے ہوں گے تو یہی لوگ آپ کے قریب ہوں گے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ جو باتیں کہیں

گے۔ اس کو اڑا کر ہر طرف لے جائیں گے اور اس کی حفاظت نہیں کریں گے اور اس کو اس کے مقام پر نہیں رکھیں گے (یعنی آپ کی تقریر کے مفہوم کو بدل کر لوگوں کے سامنے پیش کریں گے) اس لئے آپ انتظار کریں۔ یہاں تک کہ مدینہ پہنچ جائیں اس لئے کہ وہ دار الهجرة والسنة ہے صرف سمجھدار اور سربرآوردہ لوگوں کے سامنے آپ جو کہنا چاہیں کہیں تا کہ اہل علم آپ کی گفتگو کو محفوظ رکھیں اور اس کو اس کے مناسب مقام پر رکھیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اللہ کی قسم میں مدینہ میں سب سے پہلے یہی تقریر کروں گا۔

ابن عباس کا بیان ہے کہ ذی الحجہ کے آخر میں ہم لوگ مدینہ پہنچے جب جمعہ کا دن آیا تو آفتاب کے ڈھلتے ہی ہم مسجد کی طرف جلدی سے پہنچے یہاں تک کہ میں نے سعید بن زید بن عمرو بن نفیل کو منبر کے ستون کے پاس بیٹھا ہوا پایا، میں بھی ان کے پاس بیٹھ گیا اتنے میں حضرت عمرؓ تشریف لائے۔ میں نے سعید بن زیدؓ سے کہا آج حضرت عمرؓ ایک ایسی بات کہیں گے۔ جو انہوں نے پہلے کبھی نہیں کہی ہوگی۔ سعیدؓ نے میری اس بات کا انکار کیا اور کہا کہ مجھے امید نہیں ہے۔ کہ ایسی بات کہیں گے۔ جو اس سے پہلے نہ کہی ہو چنانچہ حضرت عمرؓ منبر پر بیٹھ گئے۔ جب مؤذن خاموش ہو گئے۔ تو کھڑے ہوئے اللہ کی حمد بیان کی پھر فرمایا!

امابعد! میں تم سے ایسی بات کہنے والا ہوں۔ جس کا کہنا میرے مقدر میں تھا۔ میں نہیں جانتا کہ میرا یہ کہنا میری موت کا پیش خیمہ ہو جو اسے سمجھ لے اور یاد کر لے اسے چاہیے کہ جہاں بھی وہ پہنچے اس بات کو بھی پہنچائے اور جس کو یاد نہ رہے تو میں اس کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ مجھ پر جھوٹ بولے۔ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ تم میں سے کوئی کہتا ہے۔ کہ اللہ کی قسم اگر عمرؓ مر جائیں تو میں فلاں شخص کی بیعت کر لوں گا اور خبردار کوئی شخص یہ کہہ کر فریب نہ دے کہ حضرت ابو بکرؓ کی بیعت بھی اتفاقیہ تھی اور پھر وہ پوری ہو گئی۔ سن لو کہ وہ ایسی ہی تھی لیکن اللہ نے اس کے شر سے محفوظ رکھا (یعنی اچانک بیعت کر لینے سے جن خدشات کا خطرہ تھا وہ ظہور پذیر نہیں ہوئے) اور تم میں سے کوئی شخص نہیں جس میں ابو بکرؓ جیسی فضیلت ہو!

مَنْ بَايَعَ رَجُلًا عَنْ غَيْرِ مَشُوْرَةٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَلَا يُبَايِعُ هُوَ وَلَا الَّذِي بَايَعَهُ تَغِرَّةً اَنْ يُقْتَلَا (صحيح بخاری، كتاب الحدود باب رجم الحبلى من الزنا اذا احصنت)

اب جس کسی نے مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کے ہاتھ پر بیعت کی تو نہ اس کی اور

نہ اس کے متبع کی بیعت کی جائے اس خوف سے کہ وہ دونوں بہر حال قتل کر دیئے جائیں گے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ منصوبہ یہی تھا کہ حضرت عمرؓ کے قتل کے بعد اچانک اپنی مرضی سے ایک شخص کی بیعت کر لی جائے گی اور امت اسے اسی طرح قبول کر لے گی جس طرح ابو بکرؓ کی بیعت کو قبول کیا تھا۔ دوسری بات جو اس روایت سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ کہ حج کے موقع پر اس بات کو پھیلانے والا حضرت عمرؓ کے قتل کی اس سازش سے آگاہ تھا۔

بلکہ ایک تاریخی روایت کے مطابق رمی جمار کے وقت ایک کنکر آپ کے سر پر آ کر لگی جس سے ایک رگ پھٹ گئی اور یہ آواز بھی سنائی دی کہ امیر المومنین اس سال کے بعد یہاں کبھی نہیں ٹھہریں گے۔ اس سے ایک دن پہلے بھی ایک شخص کے متعلق بتایا گیا کہ وہ کہہ رہا تھا کہ امیر المومنین اس سال کے بعد جبل عرفات پر کبھی کھڑے نہیں ہوں گے منیٰ میں حضرت عمرؓ کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کہنے والا ایک شخص نہ تھا بلکہ ایک جماعت تھی "الذین یریدون ان یغصبوا امور ھم"

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے مشورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایام حج میں حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد ہونے والے خلیفہ کے متعلق افواہ اڑائی گئی تھی اگر وہاں حضرت عمرؓ عوام سے خطاب کرتے تو بدوی دیہاتی جو امور سیاست سے واقف نہ تھے اس اہم بات کا مطلب نہ سمجھ سکتے اور افواہ اڑانے والے جو لوگوں میں موجود تھے۔ وہ مزید افواہیں اڑا کر انتشار پیدا کر دیتے۔

روایت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا کہنے والا مدینہ کا باشندہ تھا اور مدینہ میں کچھ لوگ تھے جو مسلمانوں کا سیاسی حق غصب کرنا چاہتے تھے اور اپنی مرضی سے کسی کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے اور اس قتل کی سازش سے باخبر تھے۔

صحیح بخاری کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ زخمی ہو گئے تو انہوں نے فرمایا! "اے ابن عباسؓ دیکھو مجھے کس نے قتل کیا ہے؟ وہ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر دیکھتے رہے اس کے بعد آئے اور کہا آپ کو مغیرہؓ کے غلام نے قتل کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس کاریگر نے؟ ابن عباسؓ نے کہا ہاں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا! اللہ اسے غارت کرے میں نے تو اسے عمدہ بات کا حکم دیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری موت کسی ایسے شخص کے ہاتھ پر نہیں کی جو اسلام کا دعویٰ کرتا ہو۔ اے ابن عباسؓ تم اور تمہارے والد اس بات کو پسند کرتے تھے کہ مدینہ

میں غلام بہت ہو جائیں اور عباسؓ کے پاس سب سے زیادہ غلام تھے انہوں نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ اگر آپ چاہیں تو میں ان سب کو قتل کر دوں؟ میں نے کہا تھا یہ بات ٹھیک نہیں اس لئے کہ وہ تمہاری زبان میں گفتگو کرنے لگے ہیں تمہارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور تمہاری طرح حج کرتے ہیں۔ (صحیح بخاری باب قصۃ البیعۃ و الاتفاق علی عثمان بن عفان)

یہ بات باعث تعجب ہے کہ حضرت عمرؓ خلافت کے فرائض بطریق احسن ادا کر رہے ہیں۔ وہ صحت مند ہیں۔ حج کے لئے طویل سفر طے کر چکے ہیں انہیں بظاہر کسی قسم کا مرض بھی لاحق نہیں ہے اس کے باوجود "نئے خلیفہ" کے متعلق افواہ اتنی زور پکڑ گئی تھی کہ صحابہؓ کو حضرت عمرؓ سے یہ درخواست کرنا پڑی کہ آپ خود ہی کوئی فیصلہ فرما دیں۔ حضرت عمرؓ نے مسجد نبوی ﷺ میں خطبہ جمعہ میں پالیسی بیان دیتے ہوئے ان لوگوں کو "غاصب" قرار دیا جو مسلمانوں کے مشورے کے بغیر یہ کام کرنے کے خواہش مند تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جن لوگوں کو حضرت عمرؓ نے اس وقت "غاصب" قرار دیا تھا آج ان کی ذریت نے الٹا حضرت عمرؓ ہی کو غاصب قرار دے دیا۔

(اس سے ثابت ہوا کہ واقعی دور فاروقیؓ میں بھی شیعہ کا وجود تھا)

صحیح مسلم میں معدان بن طلحہؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے جمعہ کے دن خطبہ دیا اس میں نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کا ذکر کیا پھر فرمایا میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک مرغ نے مجھے تین ٹھونگیں ماریں میں سمجھتا ہوں کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ میری موت اب نزدیک ہے "و ان اقواما یامرو ننی ان استخلف" بعض لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ اپنا جانشین نامزد کر دیجئے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے دین۔ خلافت اور اس چیز کو جس کے ساتھ رسول ﷺ کو مبعوث کیا تھا۔ ضائع نہ کرے گا۔ اگر میری موت جلد ہی واقع ہو جائے۔ تو مشورہ کرنے کے بعد خلافت ان چھ آدمیوں میں رہے گی۔ جن سے نبی اکرم ﷺ اپنی وفات تک راضی رہے۔

"ان اقواما یطعنون فی ھذا الامر انا ضربتھم بیدی ھذہ علی الاسلام فان فعلوا ذالک فاولئک اعداء اللہ الکفرۃ الضلال۔"

(صحیح مسلم کتاب المساجد و مواضع الصلوۃ. باب نھی من اکل ثوما او بصلا)

اور میں سمجھتا ہوں کہ بعض لوگ جن کو میں نے اپنے ہاتھ سے مارا ہے (ایرانی، رومی، یہودی) اس کام میں اسلام پر طعن کرتے ہیں۔ اگر انہوں نے پھر ایسا کیا تو وہ اللہ کے دشمن اور

گمراہ کافر ہیں۔۔۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت حفصہؓ کے پاس گئے اور ان سے کہا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے والد کسی کو خلیفہ نامزد کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ انہوں نے کہا کہ وہ بے شک ایسا ہی کریں گے۔ یہ سن کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے قسم کھائی کہ وہ ضرور اس معاملہ میں حضرت عمرؓ سے گفتگو کریں گے۔ پھر وہ حضرت عمرؓ کے پاس گئے اور کہا لوگ کہتے ہیں کہ آپ کسی کو خلیفہ مقرر نہیں کریں گے۔ بتایئے اگر آپ کا کوئی چرواہا ہو اور وہ آپ کے اونٹوں یا بکریوں کو چھوڑ کر آپ کے پاس چلا آئے تو کیا آپ یہ نہیں سمجھیں گے کہ اس نے مویشی ضائع کر دیئے اور لوگوں کی نگہبانی تو مویشیوں کی نگہبانی سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ حضرت عمرؓ نے ان کے قول سے موافقت کی پھر کچھ دیر کے لئے سر جھکایا پھر سر اٹھایا اور فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت کرے گا۔ اگر میں خلیفہ مقرر نہ کروں تو رسول اللہ ﷺ نے خلیفہ مقرر نہیں کیا تھا اور اگر میں کسی کو خلیفہ نامزد کر دوں تو ابوبکرؓ نے خلیفہ مقرر کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سمجھ گئے کہ جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا ذکر کیا ہے تو پھر وہ آپ ﷺ کے برابر کسی کو کوئی درجہ نہیں دیں گے اور آپ ﷺ کی اتباع میں کسی کو خلیفہ نہیں بنائیں گے۔ (صحیح مسلم، کتاب الامارۃ باب الاستخلاف و ترکہ)

ان روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب غاصبین خلافت کے عزائم واضح ہو گئے تو صحابہؓ نے بھی حضرت عمرؓ کو مشورہ دیا کہ کہیں یہ سازش کامیاب نہ ہو جائے لہٰذا آپ کسی کو خلیفہ مقرر کر دیں۔ اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے ایسے لوگوں کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا!

اگر مسلمانوں کے مشورے کے بغیر ایسا کوئی قدم اٹھایا گیا تو نہ صرف بیعت کرنے والے کو بلکہ جس کی بیعت کی جائے گی اسے بھی قتل کر دیا جائے گا اگر میری موت واقع ہو جائے تو مشورہ کرنے کے بعد خلافت ان چھ آدمیوں میں رہے گی۔ (حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہم)۔

دوسری طرف شورش پسند لوگ بڑی بے صبری کا مظاہرہ کر رہے تھے اور شوریٰ کے بغیر خلافت پر قبضہ کرنے کی فکر میں تھے۔ چنانچہ اس بدترین سازش کے مرکزی کرداروں (یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں) کے گٹھ جوڑ نے ابولولو فیروز کے زہریلے خنجر کی شکل اختیار کی جس سے عصائے اسلام عزت اسلام، شوکت اسلام، مراد رسول ﷺ، خسر رسول ﷺ اور داماد

بقول حضرت عمرؓ عین اس وقت جب وہ نماز فجر کی امامت کرا رہے تھے شہید کر دیا گیا اور حقیقت یہ ہے کہ قاتل کا خنجر سینۂ عمرؓ میں نہیں بلکہ قلب کائنات میں پیوست ہو گیا۔

اس طرح ایران جس نے مسلمانوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کھائی تھی ابولولو فیروز کے ذریعے امیر المومنینؓ سے انتقام لینے میں کامیاب ہو گیا۔

تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابولولو فیروز نے حضرت عمرؓ پر قاتلانہ حملے اور دیگر نمازیوں کو زخمی کرنے کے بعد خودکشی کا ارتکاب کر لیا تھا اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ قبیلہ بنو تمیم کا ایک شخص اس کے تعاقب میں گیا اور اسے پکڑ کر قتل کر دیا۔

بہر حال ابولولو فیروز نے خودکشی کی ہو یا سازش میں شریک کسی شخص نے سازش کے بے نقاب ہو جانے کے خوف سے اسے قتل کرا دیا ہو۔ اس کی نعش مدینہ سے ایران ہرگز منتقل نہیں ہوئی تھی۔ لیکن چونکہ ابولولو فیروز اس فعل شنیع کی وجہ سے مجوسیوں کا ہیرو بن گیا تھا اس لئے انہوں نے ابولولو فیروز کو بابا شجاع الدین کا لقب دے کر ایران میں اس کی قبر بنائی اس قبر کی شبیہ کیلنڈر کی صورت میں مکانات و دکانات میں آویزاں کی گئی۔ پھر ہر سال ان ایام میں اس کا عرس منایا جاتا ہے۔ جس میں اسے خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔

چنانچہ شیعہ مجتہد قاضی نور اللہ شوستری لکھتے ہیں۔

کاشان کے عوام اور اوباش ذوالحجہ کی چھبیس تاریخ کو جو عمر کے قتل کی تاریخ ہے۔ اس میں آٹے کا ایک مجسمہ تیار کرتے ہیں اور اس کے پیٹ کو سرخ دوشاب اور شیرہ سے پر کرتے ہیں۔ اور اس مجسمے کا نام عمر رکھتے ہیں۔ پھر اس مجسمے کو ہلاتے ہیں اور اٹھا کر وجد و رقص کرتے ہیں اور اسی دوران ڈھول طبلے اور دیگر آلات لہو استعمال کئے جاتے ہیں اور عمر پر حد سے زیادہ سب و شتم اور لعن طعن کرتے ہیں اور ساتھ ہی فریاد اور زاری اور آہ و بکا کرتے ہیں اور صبح سے شام تک تمام دن اسی حال میں گذارتے ہیں جب رات کی تاریکی چھانے لگتی ہے اور گھروں کی طرف واپسی کا ارادہ کرتے ہیں اور بابائے مذکور یعنی ابولولو فیروز مجوسی کی قبر سے رخصت ہونے لگتے ہیں تو ان میں سے بعض اراذل اور اوباش چھری یا خنجر لیکر اس مجسمہ کے پیٹ میں گھونپ دیتے ہیں تا آنکہ وہ سرخ دوشاب اور شیرا اس مجسمہ کے پیٹ میں سے باہر نکلنے لگتا ہے پھر وہ اس کو عمر کا خون سمجھ کر پیتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ ہم ان کے خون کے پیاسے ہیں۔ (مجالس المومنین صفحہ ۷ جلد ۲)

یہاں شوستری صاحب نے محض تفنن سے کام لیا ہے کہ یہ کام صرف کاشان کے عوام اور اوباش کرتے ہیں اگر اہل تشیع کی نگاہ میں یہ کام برا اور غلط تھا تو شیعہ علماء اور حکام نے انہیں اس سے منع کیوں نہیں کیا؟ اس فرضی قبر کو منہدم کیوں نہیں کیا؟ اس عرس پر پابندی کیوں نہیں لگائی؟ اور اس فعل شنیع کے مرتکب افراد کو سزا کیوں نہیں دی گئی؟ دراصل یہ شیعہ کے اندر کا بغض ہے اگر انکا بس چلے اور اہل سنت کی مزاحمت کا خطرہ نہ ہو تو وہ ایران کے علاوہ ہر جگہ مجالس عزا کی طرح اس پروگرام کو بھی کھلے عام سرانجام دیں اس کے باوجود انہوں نے جھنگ (حسو بلیل) اور بھٹ شاہ میں اپنے خبث باطن سے مجبور ہو کر حضرت عمرؓ کا پتلا جلایا۔

{قد بدت البغضاء من افواههم وما تخفي صدورهم اكبر}

شیعیت سیدنا عثمان ذوالنورینؓ کے عہد میں

حضرت عمرؓ تین دن تک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد یکم محرم الحرام ۲۴ھ کو انتقال فرما گئے۔ خلیفہ کے تقرر کیلئے حضرت عمرؓ کی مقرر کردہ کمیٹی نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کے بعد بالاتفاق حضرت عثمانؓ کا نام تجویز کیا۔ اس کے بعد مسجد نبوی ﷺ میں ان کے ہاتھ پر بیعت ہو گئی کسی نے کوئی اختلاف نہیں کیا۔ کمیٹی کے سربراہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے سب سے پہلے بیعت کی اس کے بعد حضرت علیؓ نے بیعت کی امام ابن کثیر نے لکھا ہے کہ!

وجآء اليه الناس يبايعونه وبايعه علي بن ابي طالب اولاً۔

اور لوگ ان کی بیعت کیلئے بڑھنے لگے اور سب سے پہلے علی بن ابی طالبؓ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں توسیع انقلاب کا عمل زور شور سے جاری رہا اور تقریباً پینتالیس لاکھ مربع میل کے رقبہ پر اسلامی حکومت پھیل گئی لیکن دوسری طرف دشمن بھی تو کچھ بے کار بیٹھا ہوا نہیں تھا۔ اس نے ایک طرف حضرت عمرؓ پر قاتلانہ حملہ کرایا اور دوسری طرف مختلف علاقوں میں بغاوتیں کرا کر داخلی انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ دور فاروقیؓ میں ایران کی فتح کے بعد یزدگرد ترکستان بھاگ گیا تھا اور اس وقت سے وہ برابر ایران میں بغاوت کرانے کی سازشیں کرتا رہا۔ لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور فارس و کرمان سے لیکر خراسان تک سارے عجم میں بغاوت کے شعلے بھڑک

اٹھے۔ حضرت عثمانؓ نے فوراً اس کی طرف توجہ کی اور عبیداللہ بن معمر کو فارس کی مہم پر مامور کیا۔ لیکن وہ ناکام ہو کر مارے گئے۔ ان کے قتل ہونے کے بعد عبیداللہ بن عامر والی بصرہ نے اس مہم کو سر کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور بصرہ سے فارس پہنچا۔ اہل فارس نے پوری قوت و شجاعت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ لیکن ابن عامرؓ نے انہیں شکست دے کر فارس پر دوبارہ قبضہ کر لیا اسکے بعد ابن عامرؓ نے مجاشع بن مسعود سلمی کو کرمان اور ربیع بن زیاد کو سجستان کی بغاوت فرو کرنے کے لیئے بھیجا، اور خود خراسان پہنچے اور اس پورے علاقے میں فوجیں پھیلا دیں اور ایک ایک کر کے تمام بغاوتیں کچل کر ان علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ ساسانی خاندان کا آخری تاجدار اور تمام بغاوتوں کا سرغنہ جو اسی علاقہ میں روپوش تھا۔ شکست کھانے کے بعد مایوس ہو کر بھاگا، مسلمان عرصہ تک اس کا تعاقب کرتے رہے آخر میں ایک دہقانی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس کی موت کے ساتھ ہی ساسانی خاندان کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

شاہ معین الدین ندوی لکھتے ہیں کہ!

اس میں شک نہیں ہے کہ فاروق اعظمؓ نے اپنے حسن تدبیر اور غیر معمولی سیاسی قوت عمل سے روم و ایران کے تختے الٹ دیئے اور ان کی دولت و مملکت فرزندان توحید کا ورثہ بن گئی۔ دولت کیانی صفحۂ ہستی سے معدوم ہو گئی اور تمام ایران مسخر ہو گیا۔ شام، مصر، الجزائر نے بھی سپر ڈال دی لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ فاتح قوم کا ایک ہی سیلاب مفتوح اقوام کے احساس خودی کو فنا کر دے اور کیا تاریخ کوئی ایسی مثال پیش کر سکتی ہے کہ ایک ہی شکست نے کسی قوم کی حریت و آزادی کے جذبہ کو معدوم کر دیا ہو؟ اور اس کے قوائے عملی بے کار ہو گئے ہوں۔ سکندر نے تمام دنیا کو مسخر کر لیا لیکن اس کے جانشینوں نے کتنے دنوں تک حکومت قائم رکھی؟ چنگیز و تیمور نے بھی عالم کو تہ و بالا کر دیا لیکن ان کی فتوحات کیوں نقش بر آب ثابت ہوئیں؟

درحقیقت یہ ایک تاریخی نکتہ ہے کہ جب اولوالعزم فاتح کا جانشین ویسا ہی اولوالعزم اور عالی حوصلہ نہیں ہوتا۔ تو اس کی فتوحات اس تماشہ گاہ عالم میں صرف ایک وقتی نمائش ہوتی ہیں۔ اس بناء پر جانشین فاروقؓ کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ممالک مفتوحہ میں حکومت و سلطنت کی بنیاد مستحکم کی اور مفتوح اقوام کے جذبہ خودسری کو رفتہ رفتہ اپنے حسن تدبیر اور حسن عمل سے اس طرح ختم کر دیا کہ مسلمانوں کی باہمی کش مکش کے موقعوں میں بھی انہیں سرتابی کی ہمت

سنا ہوگی۔ تم نے فتوحات کے سلسلہ میں پڑھا ہوگا کہ حضرت عثمانؓ کو کثرت کے ساتھ بغاوتیں فرو کرنا پڑیں۔ مصر میں بغاوت ہوئی۔ اہل آرمینیہ اور آذر بائیجان نے خراج دینا بند کر دیا۔ اہل خراسان نے سرکشی اختیار کی۔ یہ تمام بغاوتیں اسی جذبہ کا نتیجہ تھیں جو مفتوح ہونے کے بعد بھی اقوام کے جذبہ آزادی کو برانگیختہ کرتا رہتا ہے۔

عہد عثمانؓ میں ممالک محروسہ کا دائرہ بھی نہایت وسیع ہوا افریقہ میں طرابلس، برقہ اور مراکش مفتوح ہوئے ایران کی فتح تکمیل کو پہنچی۔ ایران کے متصل ملکوں میں افغانستان، خراسان اور ترکستان کا ایک حصہ زیر نگین ہوگیا۔ دوسری سمت آرمینیہ اور آذربائیجان مفتوح ہو کر اسلامی سرحد کوہ قاف تک پھیل گئی۔ اسی طرح ایشائے کوچک کا ایک وسیع خطہ ملک شام میں شامل کرلیا گیا۔ بحری فتوحات کا آغاز حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت سے ہوا۔ ذوالنورینؓ کی اولوالعزمی نے خطرات سے بے پرواہ ہو کر عظیم الشان بیڑا تیار کر کے جزیرہ قبرص پر اسلامی پھریرا بلند کیا اور پھر بحری جنگ میں قیصر روم کے بیڑے کو جس میں پانچ سو جنگی جہاز شامل تھے ایسی فاش شکست دی کہ پھر رومیوں کو اس جرات کے ساتھ بحری حملہ کی ہمت نہ ہوئی۔" (سیر الصحابہ حصہ خلفائے راشدین صفحہ ۲۴۳)

جب یہودیوں اور مجوسیوں نے دیکھا کہ ایرانی مقاومت ختم ہوگئی اور قسطنطنیہ کی رومن حکومت کو مجبور ہو کر اور بڑا حصہ کھو کر آئندہ پیش قدمی نہ کرنے کا معاہدہ کرنا پڑا تو ان دونوں دشمنان اسلام نے مل کر یہ سازش کی کہ مسلمانوں میں داخلی اختلافات پیدا کیے جائیں چونکہ خلافت کا مرکز حضرت عثمانؓ کی ذات تھی۔ اس لئے ان ہی کے خلاف پروپیگنڈا شروع کیا طرح طرح کے فرضی الزامات قائم کیے۔

تاریخ کا ایک طالب علم اس معاملہ کو بڑی آسانی سے سمجھ جاتا ہے جب دیکھتا ہے کہ حجاز، نجد، شام اور دیگر علاقوں میں کوئی فتنہ پیدا نہیں ہوا۔ یہ فتنہ پیدا ہوا مصر میں اور پرورش پایا عراق میں جہاں لچوں اور شہدوں نے اس کا ساتھ دیا۔

سوال یہ ہے کہ شکایات صرف ان ہی دو صوبوں میں کیوں پیدا ہوئیں؟ کیا اس میں تاریخ عالم کا وہ کلیہ کام کر رہا تھا کہ ہر مفتوح کو فاتح کے خلاف شدید نفرت ہوتی ہے جو حسب موقع عجیب عجیب شکلیں اختیار کر لیتی ہے اور تاریخ عالم کا کون سا طالب علم ہے جسے یہ نہ معلوم ہو کہ چھٹی صدی قبل مسیح سے ایرانیوں اور یہودیوں میں دوستی اور ہم آہنگی پیدا ہو چکی تھی۔ عراق فتح

اسلامی سے پہلے ایرانی حکومت کا ایک صوبہ ہی نہیں بلکہ آخری ساسانی فرمانرواؤں کا دارالسلطنت بھی تھا۔ پھر نبی اکرم ﷺ اور حضرت شیخینؓ کے دور میں یہودیوں اور مجوسیوں نے اسلام اور اہل اسلام کے خلاف باقاعدہ منظم اور مسلح تحریکیں بھی شروع کر دی تھیں۔

عبداللہ بن سبا

حضرت عمرؓ کے قتل کے بعد ان مفتوح، مغلوب، مغضوب اور ملعون اقوام (یہود و مجوس) نے جن کی حکومت اور جن کے مذہبی وقار کو اسلام نے مٹایا تھا۔ تحت منتقمانہ جذبات کے تحت اپنی حکمت عملی میں پھر تبدیلی کی انہوں نے سابقہ منصوبوں میں ناکامی کے بعد محسوس کیا کہ کسی ایک بڑے شخص کو خواہ وہ عمرؓ ہی کیوں نہ ہوں قتل کر دینے سے اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا چنانچہ خود اسلام میں فساد پیدا کرنے کی سازش کو انہوں نے اپنا مقصد حیات بنا لیا۔

اس مقصد کے حصول کے لئے مجوسیوں نے قیادت یہودیوں کے حوالے کر دی یہودیوں نے دیکھا کہ اسلام کو کمزور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ اسلام کا چولا پہن کر مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پھیلایا جائے۔ ان کے عقائد کو مشکوک و مشتبہ بنایا جائے۔ تاکہ اس طرح اسلام کی روح ہی ختم ہو جائے۔ اس خطرناک منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بہت سے یہودیوں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ عبداللہ بن سبا ان یہودیوں میں سر فہرست تھا اور اس کی تمام تر توجہ اسلامی عقائد پر شک و شبہ کا اظہار کرنا اور نبی اکرم ﷺ سے منسوب کر کے جھوٹی احادیث تیار کرنا تھا۔

عبداللہ بن سبا یمن کا رہنے والا تھا اور یمن میں پہلے سے ہی یہودیوں کا ایک مضبوط مرکز قائم تھا۔ جہاں سے باقاعدہ اسلام کے خلاف سازشوں کے جال پھیلائے جاتے رہے۔ عبداللہ بن سبا نے جب اپنے تخریبی مشن کا آغاز کیا تو اس وقت کے حالات اس کے لئے بڑے سازگار تھے۔ اس نے مدینہ منورہ میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد کوفہ کو اپنی خفیہ سازشوں اور سرگرمیوں کا اولین مرکز بنایا۔ وہ کچھ عرصہ مدائن میں بھی رہا جو ایران کا دارالسلطنت تھا۔ اس کے بعد وہ مصر چلا گیا اور وہاں سے سازش کا جال ہر طرف پھیلانا شروع کر دیا۔ اس سازش کا مقصد حضرت عثمانؓ کو خلافت سے دست بردار کرانا تھا۔ چنانچہ ۳۵ھ میں اہلیان مصر، کوفہ، اور بصرہ پر مشتمل ایک مسلح لشکر نے مدینہ پہنچ کر خلیفۃ المسلمین کو طویل محاصرے کے بعد انتہائی بے دردی

کے ساتھ شہید کر دیا۔ عہد مرتضوی میں ابن سبا اپنے گروہ (شیعہ) کے ساتھ حضرت علیؓ کے لشکر میں موجود تھا۔ جب اس نے جنگ جمل میں صلح کے آثار دیکھے تو اس نے حضرت عائشہؓ کے لشکر پر حملہ کر کے جنگ کی آگ بھڑکا دی۔ پھر یہی جماعت جنگ صفین کے موقع پر بھی اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہی جن کے نتیجے میں ہزاروں مسلمان خاک و خون میں تڑپا دیے گئے۔

یہ تو ابن سبا کا ایک سیاسی کردار تھا۔ جو اس نے اپنے مجوسی معاونین کے ساتھ مل کر ادا کیا۔ لیکن اس کی اصل سازش اسکے مذہبی نظریات تھے۔ جن کے ذریعے اس نے خود اسلام کو وہ عظیم نقصان پہنچایا جس کی تلافی تا قیام قیامت ناممکن ہے۔

دراصل شیعیت (جو یہودیت، مجوسیت اور نصرانیت کا ملغوبہ ہے) کا آغاز بھی عہد عثمانیؓ میں ابن سبا کی اسی تحریک سے ہوتا ہے اور عبداللہ بن سبا بجا طور پر مذہب شیعہ کا بانی کہلانے کا مستحق ہے۔ اس کے برعکس اہل تشیع اپنا وجود عہد رسالت ﷺ میں ثابت کرتے ہیں اس لئے راقم نے ان کے دعوے کے مطابق گزشتہ صفحات میں ان کا وجود تاریخ کے اوراق سے تلاش کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔

شیعہ مجتہد سید محمد طباطبائی کس بھونڈے انداز سے اس دور کا ذکر کرتے ہیں

"خلیفہ دوم ۲۳ھ میں ایک ایرانی غلام کے ہاتھوں قتل ہوئے اور چھ رکنی کمیٹی کی اکثریت رائے سے جو خلیفہ دوم کے حکم سے منعقد ہوئی تھی۔ خلیفہ سوم نے زمام امور سنبھالی۔ انہوں نے اپنے عہد خلافت میں اپنے اموی خویش و اقارب کو لوگوں پر مسلط کر دیا تھا۔ انہوں نے لاقانونیت کی بنیاد رکھی اور آشکارا طور پر ظلم و ستم اور فسق و فجور کی خلاف ورزی اسلامی حکومت میں شروع ہو گئی۔ دار الخلافہ میں ہر طرف سے شکایتوں کے طومار آنے لگے لیکن خلیفہ اپنی اموی کنیزوں اور لونڈیوں اور خاص کر مروان بن الحکم کے زیر اثر ان شکووں اور شکایتوں پر توجہ ہی نہ کرتے اور اس طرح ظلم و ستم کا انسداد کرنے کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی حکم دیتے کہ شکایت کرنے والوں پر مقدمہ چلایا جائے اور آخر کار ۳۵ھ میں لوگوں نے ان کے خلاف مظاہرے کئے اور چند روز تک ان کے مکان کو گھیرے رکھا اور پھر مار دھاڑ کے بعد ان کو قتل کر دیا گیا۔ (شیعہ صفحہ ۳۴)

شیعہ مجتہد کے اس اقتباس سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ جن لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف مظاہرے کئے اور ان کے مکان کا محاصرہ کر کے انہیں شہید کیا وہی لوگ عہد عثمانؓ میں شیعہ

کہلاتے تھے اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس جماعت کا بانی عبداللہ بن ابی کا بروز ثانی عبداللہ بن سبا ہی تھا۔ جو اپنی اصل میں یہودی اور اپنی تحریک میں مجوسی تھا۔ اس لئے اس نے دونوں طریقوں کو اختیار کرتے ہوئے دین اسلام کے مقابلے میں "شیعیت" کے نام سے ایک متوازی دین پیش کر دیا (جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے) اہل تشیع چونکہ اس حقیقت کا سامنا نہیں کر سکتے تھے اس لئے انہوں نے بہتر یہی سمجھا کہ سرے سے عبداللہ بن سبا کے وجود کا ہی انکار کر دیا جائے۔

عبداللہ بن سبا حقیقت یا افسانہ

عبداللہ بن سبا کی شخصیت اور اس کا وجود ایک ایسی واضح حقیقت ہے جس کا انکار کسی بھی ذی عقل اور ذی علم کے لئے ناممکن ہے

جہاں تک بعض متاخرین شیعہ کے انکار کا تعلق ہے تو اس کی ذرا بھی کوئی حیثیت نہیں۔ بھلا جو شیعہ قرآن، حدیث، اہلبیت رسول ﷺ، بنات طاہرات اور اصحاب رسول کا انکار کر سکتا ہے تو اس سے آخر ابن سبا کے انکار کی توقع کیوں نہیں کی جا سکتی؟

شیعہ سکالر سید مرتضیٰ عسکری نے اپنی کتاب "عبداللہ بن سبا" میں ابن سبا کو فرضی شخصیت ثابت کیا۔ پاکستان میں منظور حسین بخاری نے اس کی تائید میں "عبداللہ بن سبا" نامی ایک پمفلٹ شائع کیا۔ جس کا انگریزی ترجمہ وسیع پیمانے پر مفت تقسیم کیا گیا۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری نے بھی اپنی کتاب "الفتنة الكبرى صفحہ ۱۳۲ جلد ۱" میں ابن سبا کے متعلق اسی قسم کے شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے۔

شیعہ مجتہد محمد حسین ڈھکو کے نزدیک بھی ابن سبا ایک افسانوی شخصیت اور فرضی فرد کا نام ہے۔ جس کا عالم حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہے۔ نیز ان کا موقف یہ ہے کہ ہر مذہب والے اپنے بانیان مذہب کی تعریف کرتے ہیں اور ان کا تذکرہ بڑی آب و تاب اور شان و شوکت سے کرتے ہیں مگر پورا شیعی لٹریچر پڑھ جایئے کسی جگہ ایک جملہ بھی ابن سبا کی مدح میں نظر نہیں آئے گا۔ (تنزیہ الامامیہ صفحہ ۱۵۶-۱۶۰)

حال ہی میں اہل تشیع نے "تاریخی دستاویز" کے جواب میں "تحقیقی دستاویز" شائع کی ہے اس میں مؤلف ابو مصعب جوادی نے "افسانہ عبداللہ بن سبا" کا عنوان قائم کر کے لکھا ہے کہ "جس عبداللہ بن سبا کو اچھالا جاتا ہے اس کا اہل تشیع سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اہل تشیع کو اس

کی طرف منسوب کرنا ایک فاش غلطی ہے اور علماء و محققین کے نزدیک ابن سبا ایک فرضی اور خیالی شخصیت ہے۔ دنیا عالم میں اس کا کبھی وجود ہی نہ تھا صرف بنی امیہ اور بنی عباس کی ظالم حکومتوں اور دیگر مفسد اور فتنہ انگیز افراد نے اپنے دنیاوی اور سیاسی اغراض کی وجہ سے شیعہ کو بدنام کرنے کے لیے ایک فرضی اور خیالی انسان کو جنم دیا اور پھر اسلام میں تمام تر خرابیوں کا ذمہ دار اسے قرار دے دیا گیا۔ عصر حاضر کے عظیم فلسفی اور مفکر ڈاکٹر طٰہٰ حسین المصری لکھتے ہیں!

اگر اس امر کو تسلیم کر ہی لیا جائے کہ ابن سبا نامی شخصیت موجود تھی تو یہ بات ہر ایک پر عیاں ہے کہ ہر مذہب والے اپنے مذہب کے بانیوں اور سر براہوں کا تذکرہ بڑی شان و شوکت سے کرتے ہیں مگر شیعہ کتب رجال کا مطالعہ کیا جائے کسی جگہ بھی عبداللہ بن سبا کی مدح نہیں کی گئی بلکہ ہر جگہ اس کی مذمت کی گئی ہے۔ علماء شیعہ نے ہلکی سے ہلکی عبارت بھی اس کے متعلق یہ لکھی ہے۔ ان عبدالله بن سبا العن من ان یذکر۔ عبداللہ بن سبا کے بارے میں جتنا کہا جا سکے اس سے زیادہ ملعون ہے۔ اس ڈرامے کا اولین کہانی نویس سیف بن عمر ہے جس سے رواۃ کے ذریعہ طبری نے اپنی تاریخ میں ۳۵ھ کے واقعات میں اسے درج کیا ہے۔ سیف بن عمر جس کو علماء رجال نے ایک جھوٹا افسانہ نگار قرار دیا ہے۔ (تحقیق دستاویز صفحہ ۱۱۳-۱۱۲)

یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اہل تشیع کے عالمی سطح کے ایک ریسرچ سکالر ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی (جنہوں نے ملت جعفریہ کے لیے عربی زبان میں متعدد کتب تصنیف کیں اور جن میں سے بعض کے اردو تراجم بھی شائع کر دیئے گئے ہیں) نے عبداللہ بن سبا کے متعلق ایک انوکھا انکشاف کیا ہے!

ایسی ہی ہوشیاریوں میں سے ان کا عمار یاسر کو عبداللہ بن سبا یا ابن سوداء کے نام سے پکارنا اور ان کی تحقیر کرنا ہے عمار یاسر کی صرف یہ خطا تھی کہ وہ خلفاء کے موقف کے خلاف تھے اور لوگوں کو علیؑ کی امامت کی دعوت دیتے تھے اس سلسلہ میں ڈاکٹر مصطفیٰ کامل مصری کی کتاب الصلة بين التصوف والتشيع ملاحظہ فرمائیں۔ مؤلف نے دسیوں دلیلوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ عبداللہ بن سبا یہودی یا ابن سودا عمار یاسر ہی ہیں۔ (شیعہ ہی اہلسنت ہیں صفحہ ۱۰۰)

عبداللہ بن سبا کا وجود اہل تشیع کے لیے "سانپ کے منہ میں چھچھوندر" کی مثل ہو گیا ہے نہ اگلتے بنتی ہے اور نہ نگلتے بنتی ہے۔

ماتھے پہ شکن لبوں پہ ہنسی اقرار بھی ہے انکار بھی ہے
اس وعدے کا کیا مطلب سمجھوں آسان بھی ہے دشوار بھی ہے۔

سخت حیرت ہے کہ بعض شیعہ عمار بن یاسرؓ کو ابن سبا قرار دے رہے ہیں۔ جبکہ بعض متاخرین شیعہ سرے سے اس کے وجود کے ہی منکر ہو گئے ہیں۔ متقدمین شیعہ اس بات کے قائل تھے کہ سیدہ ام کلثومؓ بنت سیدنا علیؓ کا نکاح حضرت عمر فاروقؓ کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کے برعکس متاخرین اس نکاح کا انکار کرتے ہیں۔

متقدمین شیعہ اس بات کے قائل تھے کہ نبی اکرم ﷺ کی چار حقیقی صاحب زادیاں ہیں۔ جبکہ متاخرین صرف ایک بیٹی کا اقرار کرتے ہیں۔

مذہب شیعہ میں اس قسم کے اختلاف کی بیسیوں مثالیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن عبداللہ بن سبا کی شخصیت کے متعلق ان کے انکار کی اتنی ہی وقعت ہے جتنی کسی شخص کے اس دعوے کی کہ میدان کربلا میں حضرت حسینؓ کی شہادت سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے متعلق جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ وہ محض افسانہ ہے۔

مدینہ یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر سعدی الہاشمی لکھتے ہیں کہ!

"لقد اتفق المحدثون و اهل الجرح و التعديل و المؤرخون و اصحاب كتب الفرق والملل و النحل و الطبقات و الادب و الكتب الخاصة في بعض فنون العلم علي وجود شخصية خبيثة يهودية تلك هي شخصية عبدالله بن سبا الملقب بابن السودك"۔ (محاضرات الجامعة الاسلاميه ۱۳۹۸-۱۳۹۹ صفحہ ۲۰۱)

محدثین، علمائے جرح و تعدیل، مورخین، مختلف مذاہب اور فرقوں کے حالات قلمبند کرنے والے مصنفین نیز طبقات اور ادب کے مختلف فنون علم کے مولفین کا عبداللہ بن سبا الملقب با بن سوداء کی خبیث یہودی شخصیت پر اتفاق ہے۔

خود مذہب شیعہ کی تمام امہات الکتب میں ابن سبا کا ذکر موجود ہے اور وہ تمام روایات ان کے ائمہ معصومین سے مروی ہیں۔ جن کا مقام ملائکہ مقربین اور انبیاء و مرسلین سے بالاتر ہے۔

خمینی صاحب لکھتے ہیں!" و ان من ضروريات مذهبنا ان لائمتنا مقاما لا يبلغه ملك مقرب ولا نبي مرسل"۔ (الحكومة الاسلامية صفحہ ۵۲)

اور ہمارے مذہب (اثنا عشریہ) کے ضروری اور بنیادی عقائد میں سے یہ عقیدہ بھی ہے کہ ہمارے ائمہ معصومین کو وہ مقام و مرتبہ حاصل ہے جس تک کوئی مقرب فرشتہ اور نبی مرسل بھی نہیں پہنچ سکتا۔

اگر بالفرض ابن سبا کی شخصیت محض فرضی اور خیالی ہوتی تو شیعہ محدثین، مورخین اور مترجمین نے اس کے تذکرے سے اپنی کتابوں کے اوراق سیاہ کیوں کیے؟

تیسری صدی ہجری کے مشہور رافضی مورخ محمد الحسن بن موسیٰ النوبختی لکھتے ہیں!

حضرت علیؓ کے اصحاب میں سے ایک اہل علم جماعت کا کہنا ہے۔ کہ عبداللہ بن سبا ایک یہودی تھا۔ جو اسلام لانے کے بعد حضرت علیؓ کی ولایت (تولی) کا دم بھرنے لگا۔ وہ اپنی یہودیت کے زمانہ میں یوشع بن نون کو حضرت موسیٰؑ کا وصی قرار دیتا تھا اور اسلام لانے کے بعد اس نے اعلان کیا کہ حضرت علیؓ نبی اکرم ﷺ کے وصی ہیں اور یہ وہ پہلا شخص ہے جس نے حضرت علیؓ کی امامت کے فرض ہونے کا دعویٰ کیا اور حضرت علیؓ کے مخالفین سے برأت کرنے کو ضروری قرار دیا۔ (یعنی تبرا کرنے کو لازم ٹھہرایا) پس اسی وجہ سے شیعہ کے مخالف لوگوں نے یہ کہا ہے کہ رفض و تشیع کا اصل سرچشمہ یہودیت ہے۔ (فرق الشیعہ لابی محمد حسن بن موسیٰ النوبختی صفحہ ۴۳)

مذہب شیعہ کے اسماء الرجال کے مشہور امام ابوعمرو محمد بن عمر بن عبدالعزیز الکشی (جو چوتھی صدی ہجری کے علماء میں سے تھے) وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے شیعہ اسماء الرجال پر قلم اٹھایا ان کی کتاب معرفة اخبار الرجال جو "رجال کشی" کے نام سے مشہور ہے۔ شیعہ کے ترجمان اعظم ملا باقر مجلسی "رجال کشی" اور "رجال نجاشی" کے متعلق لکھتے ہیں!

و کتابا الرجال علیهما مدار العلماء الاخیار فی الاعصار و الامصار (بحار الانوار صفحہ ۴۳ جلد ۱)

رجال کی ان دونوں کتابوں پر تمام زمانوں اور تمام شہروں میں علماء اخیار کا مدار و انحصار ہے۔ گویا "رجال کشی" شیعہ کی مستند ترین اور معتبر ترین کتاب ہے اس میں از صفحہ نمبر ۹۹ تا صفحہ نمبر ۱۰۱ عبداللہ بن سبا کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے ملاحظہ فرمائیں!

۱۔ ابان بن عثمان سے مروی ہے کہ میں نے ابوعبداللہ جعفر صادق علیہ السلام کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ عبداللہ بن سبا پر لعنت فرمائے اس نے امیر المومنین (علی المرتضیٰ) کے حق

میں رب ہونے کا دعویٰ کیا اور اللہ کی قسم امیر المومنین اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار بندے تھے۔ اس شخص کے لئے جہنم ہے جس نے ہم پر جھوٹے بہتان باندھے اور ایک قوم ہمارے متعلق ایسی ایسی باتیں گھڑتی ہے جو ہم قطعاً اپنے متعلق نہیں کہتے۔ ہم ان سے اللہ تعالیٰ کی طرف برأت کا اظہار کرتے ہیں۔

۲۔ ابوحمزہ ثمالی سے مروی ہے کہ حضرت علی بن حسینؑ (زین العابدین) نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص پر لعنت بھیجے جس نے ہم پر جھوٹ بولا میں نے عبداللہ بن سبا کو یاد کیا تو میرے بدن کا ہر رونگٹا کھڑا ہو گیا البتہ تحقیق اس نے امر عظیم کا دعویٰ کیا ہے۔ اسے کیا ہے؟ اللہ اس پر لعنت کرے۔ اللہ کی قسم علیؑ اللہ کے نیک بندے تھے اور رسول اللہ کے بھائی انہوں نے بارگاہ خداوندی سے جو کرامت اور عزت پائی ہے تو وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت سے ہی پائی ہے اور رسول اللہ نے جو عزت و کرامت پائی ہے تو وہ بھی صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے ہی حاصل کی ہے۔

۳۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہم اہلبیت بہت ہی سچے ہیں مگر ہم ایسے کذابوں سے محفوظ نہیں ہیں جو ہم پر جھوٹ باندھتے ہیں اور ہمارے صدق کو اپنے جھوٹ اور بہتان کے ذریعے ناقابل اعتبار ٹھہراتے ہیں رسول اللہ تمام لوگوں اور ساری مخلوق سے زیادہ سچے تھے اور مسیلمہ کذاب ان پر جھوٹ باندھا کرتا تھا۔ امیر المومنین حضرت علیؑ نبی اکرم ﷺ کے بعد اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق سے سچے تھے اور جو شخص ان پر جھوٹ باندھتا تھا۔ وہ عبداللہ بن سبا ملعون تھا۔

۴۔ علامہ کشی نے کہا کہ بعض اہل علم نے ذکر کیا ہے کہ تحقیق عبداللہ بن سبا یہودی تھا بعد ازاں مسلمان ہو گیا اور حضرت علیؑ سے محبت کا دعویٰ کرنے لگا۔ وہ اپنی یہودیت کے زمانے میں موسیٰؑ کے وصی یوشع بن نون کی شان میں غلو کرتا تھا اور اسلام کا اظہار کرنے کے بعد حضرت علیؑ کے بارے میں بھی اسی طرح کی مبالغہ آمیز باتیں کرتا تھا اور وہ سب سے پہلا شخص ہے جس نے حضرت علیؑ کی امامت کی فرضیت کے عقیدہ کو شہرت دی اور ان کے دشمنوں سے بیزاری کا اظہار کیا ان کے مخالفین پر زبان طعن دراز کی اور ان کی تکفیر کی۔ لہٰذا اسی وجہ سے مخالفین شیعہ نے کہا کہ تشیع اور رفض کی اصل بنیاد اور جڑ یہودیت ہے۔ {بحارالانوار صفحہ ۲۸۷۔ ۲۸۔ صفحہ ۲۰۶ جلد ۲۵ جلد ۲۵، رجال الکشی صفحہ ۹۹-۱۰۱، تنقیح المقال للشیخ عبداللہ المامقانی صفحہ ۱۸۴ جلد ۲، تحفۃ الاحباب شیخ عباس قمی صفحہ ۱۸۴ تحت عبداللہ بن سبا}

ابو ہالمقشر ی لکھتے ہیں کہ

"عبداللہ بن سبا پر اللہ کی لعنت ہو اس نے تو عبادت گذار امیر المومنین کی الوہیت کا دعویٰ کر دیا تھا"۔ (قاموس الرجال صفحہ ۶۱ جلد ۵)

شیعہ مجتہد نعمت اللہ الجزائری لکھتے ہیں کہ

"ابن سبا دراصل ایک یہودی تھا۔ جو بعد میں اسلام لایا وہ اپنی یہودیت کے زمانہ میں یوشع بن نون کو حضرت موسیٰؑ کا وصی مانتا تھا اور پھر اسلام لانے کے بعد اسی قار سولے کو اس نے حضرت علیؓ پر چسپاں کر دیا اور انہیں نبی ﷺ کا وصی قرار دے دیا"۔ (انوار النعمانیہ صفحہ ۲۳۴ جلد ۲)

زیدی شیعہ مورخ ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ لکھتے ہیں کہ

"عبداللہ بن سبا یمن کا رہنے والا ایک یہودی تھا۔ اس کی ماں حبشن تھی وہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں (بظاہر) اسلام لایا پھر مسلمانوں کے شہروں میں گھوم پھر کر ان کو گمراہ کرنے لگا۔ اس نے رجعت کا عقیدہ وضع کیا۔ پھر اس نے کہا ہزار نبی ہو گذرے ہیں ہر نبی کا وصی ہوتا ہے اور حضرت علیؓ حضرت محمد ﷺ کے وصی ہیں پھر کہنے لگا محمد خاتم الانبیاء ہیں اور علیؓ خاتم الاوصیاء ہیں"۔ (تاریخ طبری تحت ۳۴ھ ۳۵ھ)

علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون لکھتے ہیں کہ

"مفسدہ پردازوں میں نمایاں عبداللہ بن سبا معروف با بن السوداء تھا۔ جو اس سے پیشتر یہودی مذہب رکھتا تھا اور زمانہ خلافت امیر المومنین عثمانؓ میں مدینہ آ کر بطمع مال وزر ایمان لایا مگر سچا و پکا دین دار نہ ہوا اہل بیت کی محبت کی آڑ میں لوگوں کو امیر المومنینؓ اور شیخینؓ کے خلاف اکساتا اور ان حضرات کے خلاف بہتان تراشتا رہا امیر المومنین حضرت عثمانؓ پر اکثر طعن و تشنیع کرتا خفیہ طور سے اہل بیت کی دعوت دیتا اور کہتا تھا کہ رسول ﷺ پھر واپس آئیں گے جیسا کہ عیسیٰؑ بن مریم واپس آئیں گے اور علی بن ابی طالب وصی رسول ﷺ ہیں عثمانؓ اور ان سے پہلے ابو بکرؓ اور عمرؓ نے جبراً و غصباً بغیر کسی استحقاق کے خلافت حاصل کی"۔ تاریخ ابن خلدون اردو صفحہ ۳۲۹ جلد ۱)

شیعہ مورخ مرزا محمد تقی لسان الملک لکھتے ہیں کہ۔

"عبداللہ بن سبا یہودی آدمی تھا جس نے عثمان کے زمانہ خلافت میں اپنا اسلام ظاہر کیا اور پہلی کتابوں اور صحیفوں کا اچھا عالم تھا۔ جب مسلمان ہوا تو عثمان کی خلافت اس کے دل کو

پسند نہ آئی لہذا اس نے محافل اور مجالس میں بیٹھ کر عثمان کے متعلق بدگوئیاں اور شکوہ وشکایات شروع کر دیں اور برے اعمال واخلاق جو کچھ بھی اس کے بس میں تھا۔ عثمان کی طرف منسوب کرنے لگا۔ جب عثمان تک یہ بات پہنچائی گئی تو انہوں نے کہا یہ یہودی ہے کون؟ اور اسے مدینے سے نکلنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ عبداللہ بن سبا مصر پہنچ گیا اور چونکہ وہ ایک عالم اور دانا آدمی تھا لہذا لوگ اس کے اردگرد جمع ہونا شروع ہو گئے اور اس کی تقریروں پر یقین کرنا شروع کر دیا۔ تو ایک دن اس نے کہا اے لوگو! تم نے شاید سن رکھا ہو گا۔ کہ عیسائی لوگ کہتے ہیں کہ عیسیٰ اس جہاں میں دوبارہ آ سکتے ہیں۔ تو حضرت محمد ﷺ جو مرتبہ میں بہت زیادہ ہیں کس طرح دوبارہ تشریف نہ لائیں گے اور اللہ تعالیٰ بھی قرآن میں فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ " کہ جس ذات نے آپ پر قرآن نازل کیا ہے وہ یقیناً آپ کو آپ کے اصلی وطن کی طرف لوٹائے گی۔

جب اس عقیدے کو لوگوں کے دلوں میں راسخ اور پختہ کر چکا تو کہنے لگا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اس دنیا میں بھیجے ہیں اور ہر ایک پیغمبر کا ایک وزیر اور خلیفہ تھا تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام دنیا سے تشریف لے جائیں علی الخصوص جبکہ وہ صاحب شریعت ہوں اور اپنا نائب اور خلیفہ مقرر نہ فرمائیں اور امت کا معاملہ یوں ہی چھوڑ دیں۔

لہذا یقیناً محمد ﷺ کے وصی اور خلیفہ علیؑ ہیں چنانچہ رسول اکرم ﷺ نے خود فرمایا ہے۔ تو میرے نزدیک ایسا ہے جیسے حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے نزدیک تھے۔ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت علیؑ آپ ﷺ کے خلیفہ ہیں اور عثمان نے اس منصب کو غصب کر لیا ہے اور اپنی ذات کے ساتھ مخصوص ٹھہرا لیا اور عمر بن خطاب نے بھی ناحق منصب خلافت کو مجلس شوریٰ کے سپرد کر دیا"۔ (تاریخ اخوند جلد دوم کتاب دوم صفحہ ۲۱۳ تحت ذکر پیدا آمدن مذہب بدعت در سال سی و پنجم ہجری)

مستشرقین نے بھی عبداللہ بن سبا کے متعلق مورخین کے نظریات کی تائید و تصدیق کی ہے ملاحظہ فرمائیں!

سر ولیم میور۔	خلافت کا عروج و زوال صفحہ ۲۱۶
پروفیسر نکلسن۔	ہسٹری آف عرب
پروفیسر فلپ۔	ہسٹری آف عرب صفحہ ۲۲۸-۲۲۹

علاوہ ازیں تاریخ میں عبداللہ بن سبا کی طرف منسوب ایک فرقہ بھی پایا جاتا ہے۔

عبدالکریم شہرستانی لکھتے ہیں کہ

"السبائیة۔اصحاب عبدالله بن سبا الذی قال لعلیؑ انت انت یعنی انت الاله فنفاه الی المدائن وزعموا انه کان یهودیا فاسلم و کان فی الیهودیة یقول فی یوشع بن نون وصی موسیٰ مثل ما قال فی علی علیه السلام وهو اول من اظهر القول بالغرض بامامة علی۔

(الملل والنحل صفحہ ۱۱۶ جلد ۲، معجم رجال الحدیث الخوئی صفحہ ۲۰۰ جلد ۱۰، المقالات الاشعری قمی، انوار النعمانیہ صفحہ ۲۳۴ جلد ۲)

سبائیہ عبداللہ بن سبا کے پیرو کہلاتے ہیں۔ جس نے حضرت علیؓ سے کہا تھا کہ آپ آپ ہیں یعنی آپ ہی خدا ہیں۔ حضرت علیؑ نے اس کو مدائن کی طرف جلاوطن کر دیا تھا۔ یہ یہودی تھا اور اپنی یہودیت کے زمانے میں یوشع بن نون کو موسیٰؑ کا وصی کہا کرتا تھا جیسا کہ وہ حضرت علیؑ کے بارے میں کہتا تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے وصی ہیں یہ سب سے پہلا شخص ہے جس نے اس عقیدہ کا اظہار کیا کہ حضرت علیؑ کی امامت کا قائل ہونا فرض ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ

"یہ فرقہ عبداللہ بن سبا کے شاگردوں، ساتھیوں اور ہم عقیدہ لوگوں کا ہے یہ کہتے تھے کہ حضرت علی معبود حقیقی ہیں وہ شہید نہیں ہوئے بلکہ ابن ملجم نے ایک شیطان کو مارا ہے۔ جو آپ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ (نعوذ باللہ بھلا شیطان لعین آپ کی پاک شکل میں کیسے منتقل ہو سکتا ہے) یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ ابر (بادل) میں پوشیدہ ہیں اور یہ بجلی کا کڑکا آپ کی آواز ہے اور بجلی آپ کا کوڑا ہے اسی لئے جب یہ لوگ بادل کی گرج سنتے ہیں تو کہتے ہیں۔ الصلوٰۃ و السلام علیك یا امیر المومنین ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ آپ ایک موت کے بعد نزول فرمائیں گے اور اپنے دشمنوں کو زیر وزبر کر ڈالیں گے۔ ان لوگوں کے کلمات باہم ایک دوسرے کا رد کرتے ہیں اور لایعنی ہیں اس لئے کہ ابر کی سخت کڑک اور بجلی گرا کر جب ایک عالم کو مار سکتے ہیں تو اپنے دشمنوں کے بارے میں یہ ڈھیل کیوں اور یہ انتظار کس کا؟ (تحفہ اثنا عشریہ اردو صفحہ ۳۰)

الغرض اس تمام تفصیل سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی ہے کہ عبداللہ بن سبا اور اسکی بپا کردہ اسلام دشمن تحریک "سبائیت" ایک حقیقت ہے جس کا انکار ناممکن ہے۔

نرینہ اولاد موجود نہ تھی۔ اہل فارس کے نزدیک نبی کریم ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی نیابت کا حق سب سے زیادہ آپ کے چچازاد بھائی حضرت علیؓ کو پہنچتا تھا لہذا جو لوگ بھی آپ ﷺ کے بعد خلیفہ قرار پائے مثلاً حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ غصب خلافت کے مرتکب ہوئے تھے۔ اہل فارس سلاطین کو تقدس طہارت کی نگاہ سے دیکھنے کے بھی عادی تھے۔ چنانچہ وہ حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کو بھی مقدس مانتے تھے اور کہتے تھے کہ امام کی اطاعت فرض اولین ہے اور اس کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے۔

بعض یورپین مستشرقین کا خیال ہے کہ شیعہ نے فارسی تہذیب کے بجائے یہودیت سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ انکی دلیل یہ ہے کہ عبداللہ بن سباء جو حضرت علیؓ کی تقدیس کے عقیدہ کا بانی تھا پہلے یہودی تھا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہودی آثار کے علاوہ شیعہ مذہب میں بعض ایشیائی مذاہب مثلاً بدھ مت کے عقائد بھی شامل ہیں۔

پروفیسر موصوف زیر عنوان "شیعہ مذہب اور یہودیت" لکھتے ہیں کہ

"غالباً شیعہ مذہب کے یہودیت سے ماخوذ ہونے کا مستشرقین نے امام شعبی اور محدث ابن حزم کے اقوال سے اخذ کیا۔ امام شعبی شیعہ کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ شیعہ اس امت کے یہود ہیں"۔

امام ابن حزم اپنی کتاب الفصل میں لکھتے ہیں کہ

"شیعہ بھی یہود کی راہ پر چلے جن کا خیال ہے کہ حضرت الیاس اور فنحاس بن عازر ابن ہارونؑ اب تک بقید حیات ہیں۔ اسی طرح بعض صوفیہ حضرت خضر اور الیاس کو تا حال زندہ تصور کرتے ہیں"۔

حق بات یہ ہے اور ہمارا اس پر ایمان ہے کہ شیعہ حکومت و سلطنت کے موروثی ہونے کے بارے میں فارسی افکار سے متاثر ہوئے تھے جیسا کہ شیعہ مذہب اور فارسی نظم مملکت کی باہمی مماثلت سے واضح ہوتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اکثر اہل فارس اب تک شیعہ چلے آتے ہیں اولین شیعہ بھی فارس کے رہنے والے تھے۔

یہودیت شیعہ مذہب سے اس لئے قریبی مماثلت رکھتی ہے کہ شیعہ فلسفہ مختلف مذاہب سے ماخوذ ہے۔ تشیع پر فارسی تخیلات کی چھاپ صاف نمایاں ہے اگرچہ وہ اسلامی افکار کی طرف

منسوب کرتے ہیں۔ {اسلامی مذاہب صفحہ ۶۹-۷۰}

شیعیت کی عیسائیت سے مشابہت

گذشتہ صفحات میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ عیسائیت کے دشمن سینٹ پال نے عیسائیت قبول کر کے دین عیسوی کو بری طرح مسخ کر کے اس میں عقیدہ تثلیث اور عقیدہ کفارہ کو داخل کر دیا تھا۔ مذہب شیعہ میں بھی تثلیث کی بجائے تخمیس، غلو اور عقیدہ کفارہ کی جھلک صاف نمایاں ہے۔ اصول کافی میں امام موسیٰ کاظم سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ شیعوں پر غضبناک ہوئے تو مجھے اختیار دیا کہ یا تو میں اپنی جان دیدوں یا شیعہ ہلاک کیے جائیں پھر اللہ کی قسم میں اپنی جان دیکر شیعوں کو بچاتا ہوں۔

ترجمان سبائیت ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں کہ

"امام جعفر صادق نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے دعا مانگی اے خداوندا میرے بھائی علی بن ابی طالب کے شیعوں اور میرے وصی فرزندوں کے شیعوں کے اگلے اور پچھلے گناہ میرے اوپر ڈال دے اور شیعوں کے گناہوں کی وجہ سے مجھے دوسرے پیغمبروں کے سامنے رسوانہ کر پھر حق تعالیٰ نے تمام شیعوں کے گناہ آنحضرت ﷺ پر ڈال دیے اور تمام گناہ آنحضرت ﷺ کی وجہ سے معاف کیے گئے۔

مفضل نے امام جعفر صادق سے پوچھا کہ اگر آپ کے شیعوں میں سے کوئی شیعہ مر جائے اور اس کے ذمہ مومنوں کا قرضہ باقی ہو تو وہ کیوں کر ادا ہوگا۔ حضرت نے فرمایا کہ امام مہدی پہلی مرتبہ اعلان کریں گے کہ میرے شیعوں میں سے جس کے ذمے بھی کسی کا کوئی قرض ہو تو وہ وصول کر لے پھر خود ہی ادا کریں گے"۔ {حق الیقین صفحہ ۳۶۷}

عیسائیوں کے عقیدہ کفارہ کی طرح شیعوں کے تمام قرضے بھی معاف اور ان کے تمام گناہ و بدکاریاں بھی نبی اکرم ﷺ کے کھاتے میں ڈال دی گئیں۔ یہودیوں نے بھی یہی دعویٰ کیا تھا کہ "وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝" {البقرہ نمبر ۸۰}

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو صرف چند دن جہنم میں رہیں گے۔ ان سے کہو کیا تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا کوئی پروانہ ہے؟ اگر ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کا خلاف نہیں کرے گا۔

(ہرگز نہیں) بلکہ تم تو اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاتے ہو جنہیں تم نہیں جانتے۔

یہودیوں نے سات دن یا چالیس دن عذاب کا اقرار کیا تھا لیکن یہاں تو شیعوں کے لئے بڑا ہی آسان نسخہ پیش کر دیا گیا کہ خوب قرضے لے کر عیاشی کرتے رہو اور گناہ آلود زندگی بسر کرتے رہو قرضے امام مہدی ادا کر دیں گے۔ جبکہ گناہ نبی اکرم ﷺ نے خود اپنے ذمے لے لئے کہ کہیں وہ دیگر انبیاء کی موجودگی میں شیعوں کے کرتوتوں کی وجہ سے رسوا نہ ہو جائیں۔

موجودہ عیسائیت میں ہر انسان پیدائشی گناہ گار ہے آدم وحواؑ نے (معاذ اللہ) گناہ کیا لہٰذا ہر انسان موروثی گناہ گار ہے۔ اس میں اعمال صالحہ نجات کا ذریعہ نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے گناہ توبہ واستغفار سے معاف کرے تو وہ اللہ کا رحم ہے۔ لیکن رحم اسکے عدل کے خلاف ہے اللہ کے رحم کا یہ تقاضہ ہے کہ انسان سزا سے بچ جائے لیکن وہ عادل بھی ہے لہٰذا آپ کے عدل کا تقاضہ ہے کہ جرم کی سزا ضرور دی جائے پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی نجات کے لئے اپنے بیٹے یسوع مسیح جو کہ تمام گناہوں سے پاک ہیں قیامت تک آنے والے عیسائیوں کے بوجھ اٹھوا کر ان سے جان کی قربانی لی۔ اس طرح ان کا صلیب پر چڑھ کر اپنی جان دینا تمام عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ اور نجات کا وسیلہ بن گیا۔

شیعہ کے بنیادی عقائد میں بھی توحید کے بعد عدل ایک مستقل بنیادی عقیدہ ہے۔

بہرحال عیسائیوں کے عقائد (الوہیت، غلو، تثلیث اور کفارہ) کی کچھ جھلک مذہب شیعہ میں بھی پائی جاتی ہے۔

شیعیت کی یہودیت سے مشابہت

جب یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ مذہب شیعہ کا بانی عبداللہ بن سبا تھا تو پھر لامحالہ شیعہ افکار وعقائد کا ڈھانچہ بھی یہودیت کے خطوط پر ہی استوار ہوگا۔ شیعہ عقائد کی تفصیل آگے ایک مستقل عنوان کے تحت آرہی ہے۔

عبداللہ بن سبا اپنے زمانہ یہودیت میں غلو سے کام لیتے ہوئے یوشع بن نون کو وصی موسیٰ کہا کرتا تھا اور اس نے اپنے زمانہ اسلام میں حضرت علیؓ کو وصی رسول ﷺ کہا۔ مذہب شیعہ میں "عقیدہ وصایت وامامت" کو مرکزی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے یہ عقیدہ فلسفہ شیعیت کی اساس اور اصل الاصول ہے اور اسی پر ایمان اور کفر کا مدار ہے۔

مذہب شیعہ کے بنیادی عقیدہ امامت کی جڑیں بنی اسرائیل کی قدیم تاریخ سے جا ملتی ہیں۔ اول یہ کہ حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) کو جن کے بارہ فرزند تھے۔ انتہائی چالاکی سے حضرت علیؓ سے مربوط کر دیا ہے۔

"علیؓ نے اپنے بارہ فرزندوں سے فرمایا اللہ چاہتا ہے کہ میں حضرت یعقوبؑ کی سنت کا پھر سے احیاء کروں"۔ (اصول کافی کتاب الحجہ)

دوم یہ کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ایک امام ہر قبیلہ کا سردار ہوتا تھا۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ؕ (المائدہ نمبر ۳)

اور اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد و پیمان لیا اور ان ہی میں سے بارہ سردار ہم نے مقرر فرمائے۔

آیت میں ان اسرائیلی سرداروں کو نقیب (رہبر کا نام دیا گیا ہے۔ اسی طرح مذہب شیعہ میں بارہ اماموں (رہبروں) کا نظریہ بنی اسرائیل کے بارہ نقیبوں سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ امام اور نقیب کا مفہوم ایک ہے اور رئیس (سردار) یا رہبر کے معنی میں ہے۔ پھر جس طرح بنی اسرائیل کے ان بارہ نقیبوں کا تعین اللہ تعالیٰ نے کیا تھا اسی طرح مذہب شیعہ میں بھی بارہ اماموں کی نامزدگی اور تقرری اللہ تعالیٰ کے ذمہ واجب قرار دی گئی۔

مذہب شیعہ کا سب سے اہم مسئلہ شریعت محمدیہ کا منسوخ ہو جانا اور شریعت آل داؤدؑ اور آل سلیمانؑ کا احیاء ہے جو خالص یہودی خواہش اور تمنا کا مظہر ہے۔

چنانچہ شیعیت کا ایک اہم عقیدہ امام آخر الزمان پر ایمان لانا ہے۔ جس کے بارہ میں یہ دعویٰ ہے کہ قیامت سے پہلے دنیا کا ایک نجات دہندہ ہوگا۔

امام خمینی لکھتے ہیں کہ

"ہمیں فخر ہے کہ تمام ائمہ معصومین حضرت علی بن ابی طالب سے لیکر انسانیت کے نجات دہندہ حضرت مہدی صاحب الزمان علیہم الالف التحیۃ و السلام تک جو قادر مطلق کی قدرت سے زندہ اور ہمارے تمام امور کے شاہد ہیں ہمارے امام ہیں۔ (صحیفہ انقلاب صفحہ ۳۰)

اہل تشیع کی سب سے زیادہ مستند اور معتبر کتاب اصول کافی کے ایک باب کا عنوان ہی یہی ہے کہ "باب فی الائمه علیهم السلام انهم اذا ظهر امرهم حکموا بحکم

دلوبوآل دلود ولایسالون البینة علیہم السلام و الرحمة الرضوان"
باب اس بارے میں کہ ائمہ کا ظہور ہوگا تو وہ داؤد اور آل داؤد کے حکم کے مطابق حکومت کریں گے اور کسی کو ان سے دلیل پوچھنے کا حق نہیں ہوگا۔

اس باب میں پانچ احادیث بیان کی گئی ہیں۔ جن میں سے پہلی تین حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اذا قام قائم آل محمد علیه السلام حکم بحکم داؤد و سلیمانؑ و لایسئالون بینة.

جب آل محمدؐ کا امام قائم (مہدی) ظاہر ہوگا۔ تو وہ داؤدؑ اور سلیمانؑ کی شریعت کے مطابق حکومت کریں گے اور ان سے اس کی دلیل یا وجہ نہیں پوچھی جا سکے گی۔

۲۔ لا تذهب الدنيا حتى يخرج رجل منى يحكم بحكومة آل داؤد و لا يسئال بينة يعطى كل نفس حقها۔

یہ دنیا اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک ہم میں سے ایک شخص (ساری دنیا کا مالک ہو کر) حکومت داؤد و سلیمانؑ کی طرح حکومت نہیں کرے گا اور ان سے اس کی دلیل نہیں پوچھی جائے گی اور ہر شخص کو اس کا حق دے گا۔

۳۔ عمار ساباطی سے مروی ہے کہ میں نے ابوعبداللہ (امام جعفر صادق) سے پوچھا کہ بما تحکمون اذا حکمتم قال بحکم الله و حکم داؤد۔ (اصول کافی کتاب الحجۃ)

جب آپ برسر اقتدار آئیں گے تو کس شریعت کے مطابق فیصلے کریں گے؟ تو انہوں نے فرمایا اللہ اور داؤد کی شریعت کے مطابق۔

اس طرح امام غائب کے ظاہر ہو کر دنیا پر آل داؤد کے طریقے کے مطابق حکومت کرنے کا شیعی عقیدہ بھی یہودیوں سے لیا گیا ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ کے بعد یہودی دینی اور دنیوی دولت سے محروم ہو گئے۔ تو بعد میں آنے والے اسرائیلی انبیاء نے اپنی قوم کو ایک مسیح کی بعثت کی یقین دہانی کرائی جو ان کو اس زبوں حالی سے نجات دلائے گا۔ لیکن جوں ہی مسیح موعود (حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ) کا ظہور ہوا۔ یہودیوں نے اس بناء پر ان کو ماننے سے انکار کر دیا کہ وہ حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کی طرح سیاسی اقتدار کے حامل نہ تھے۔

اس کے بعد آج تک یہودی قوم اپنے مسیح موعود کا انتظار کر رہی ہے۔ جو بقول ان کے ایک طاقتور دنیوی بادشاہ ہوگا۔

یہودیوں کی طرح شیعہ بھی تقریباً بارہ صدیوں سے اپنے نجات دہندہ امام قائم کا انتظار کر رہے ہیں۔ شیعہ اصطلاح میں اس عقیدے کا نام "عقیدہ رجعت" ہے اور ان کے مخصوص عقائد میں سے ہے۔ شیعہ کے مجتہد اعظم ملا باقر مجلسی "عقیدہ رجعت" کے متعلق لکھتے ہیں کہ

'بدانکہ از جملہ اجماعیات شیعہ بلکہ ضروریات مذہب فرقہ محقہ حقیت رجعت است۔

{حق الیقین صفحہ ۳۳۲ جلد ۲ در بیان اثبات رجعت}

جاننا چاہیے کہ من جملہ ان اعتقادیات کے کہ جن پر تمام شیعوں کا اجماع ہے بلکہ ان کے مذہب کی ضروریات میں سے ہے وہ عقیدہ رجعت کی حقانیت کا اعتراف واقرار ہے۔ کوئی شخص عقیدہ رجعت پر ایمان ویقین کے بغیر مذہب شیعہ میں داخل نہیں ہوسکتا۔

یہی ملا باقر مجلسی بحوالہ " من لا یحضرہ الفقیہ" لکھتے ہیں کہ

"حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ 'از ما نیست کسیکہ ایمان برجعت ماند اشتہ باشد' یعنی جس شخص کا ایمان عقیدہ رجعت پر نہیں ہے وہ ہم سے نہیں ہے۔

اہل تشیع کی ایک دوسری معتبر کتاب میں تحریر ہے کہ

"ایمان لانا رجعت پر بھی واجب ہے یعنی صاحب الامر علیہ السلام ظہور اور خروج فرمائیں گے۔ اس وقت مومن خاص اور کافر ومنافق مخصوص سب زندہ ہونگے عالم کو پر از عدل وداد کریں گے۔ ہر ایک اپنی داد وانصاف کو پہنچے گا اور ظالم سزا پائیں گے۔ {تحفۃ العوام صفحہ ۶ باب پہلا اصول دین میں}

عبداللہ بن سبا نے مسلمانوں کی سادگی پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ تو حضرت عیسیٰؑ کی دوبارہ تشریف آوری کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن نبی اکرم ﷺ جو مرتبہ میں سب سے زیادہ ہیں۔ ان کی واپسی کا اعتقاد نہیں رکھتے۔ پھر اس نے حضرت علیؓ کے متعلق نیا عقیدہ یہ ظاہر کیا کہ اگر ان کا سر ستر تھیلیوں میں میرے سامنے حاضر کرو تو پھر بھی میں ان کی وفات کا قطعاً یقین نہیں کروں گا۔

کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ نہ وہ فوت ہوئے ہیں اور نہ وہ فوت ہوں گے۔ حتیٰ کہ تمام اہل عرب کو اپنے زیر فرمان لائیں گے اور ان پر حکمرانی فرمائیں گے۔

شیعہ مجتہد نعمت اللہ الجزائری اپنی کتاب "انوار النعمانیہ" میں لکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ بادلوں سے نزول فرمائیں گے اور ساری دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔ "انہ ینزل بعد ھذا الی الارض و یملاء ھا عدلا"

ابن سبا نے ابتداء میں نبی کریم ﷺ کی رجعت کا عقیدہ پیش کیا تھا اور بعد میں حضرت علیؑ کو بھی اس میں شامل کر دیا گیا۔ لیکن دیگر حضرات نے محمد بن حنفیہؒ، حضرت جعفر صادقؒ، حضرت موسیٰ کاظم وغیرہم کے متعلق بھی دعویٰ کیا ہے کہ وہ دوبارہ تشریف لا کر حکمرانی کریں گے۔

شیعہ اثنا عشری نے امام قائم (مہدی) کی رجعت پر زیادہ زور دیا ہے کہ جب وہ غار سے برہنہ بدن برآمد ہوں گے تو سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ پھر دیگر ائمہ شیعہ بیعت کریں گے۔ (امام غائب کے "کارہائے نمایاں" کا خلاصہ آگے بعنوان "مہدی کے بعد از ظہور کارنامے" آرہا ہے)

بہر حال مذہب شیعہ کا اہم عقیدہ رجعت اور ظہور امام غائب بھی خالصتاً ایک یہودی عقیدہ ہے۔ شیعہ کا دعویٰ ہے کہ ان کے ائمہ تورات اور انجیل بلکہ کل انبیاء کے علوم کے وارث ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیعی عقائد بنی اسرائیل کی آسمانی کتابوں کی روشنی میں مرتب کئے گئے ہیں۔

امام باقر فرماتے ہیں کہ خداوند عالم کے لئے دو علم ہیں ایک وہ جس کا وہ تنہا عالم ہے اسے کوئی نہیں جانتا۔ دوسرا وہ جسے اس نے اپنے ملائکہ اور اپنے رسولوں کو بتایا ہے۔ سنو وہ تمام علوم جو خدا نے اپنے ملائکہ اور رسولوں کو بتائے ہیں ان سب کا علم ہمیں بتایا اور سکھایا گیا ہے۔

(اصول کافی۔ کتاب الحجہ۔ باب جمیع علوم ملائکہ انبیاء مرسلین سے ائمہ طاہرین کے واقف و عالم ہونے کے بیان میں)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت جعفر صادقؒ نے فرمایا کہ ہمارے پاس "جفر" بھی ہے۔ یہ ایک کھال کا ظرف ہے جس میں تمام انبیاء واولیاء اور علمائے بنی اسرائیل کے علوم ہیں۔

{حوالہ بالا۔ باب صحیفہ جفر وجامعہ اور مصحف فاطمہ کے بیان میں}

امام جعفر صادق نے فرمایا کہ

"حضرت داؤدؑ علم انبیاء کے وارث تھے۔ ان کے بعد داؤدؑ کے وارث علم سلیمان

ہوئے۔ پھر حضرت محمد مصطفی ﷺ سلیمانؑ کے وارث علم ہوئے اور ہم لوگ محمد مصطفی کے وارث علم ہیں۔ بے شک ہمارے پاس صحف ابراہیمؑ اور الواح موسیٰؑ ہیں۔

(اصول کافی کتاب الحجہ۔ باب ائمہ طاہرین کے نبی کریم ﷺ اور کل انبیاء و اوصیاء کے وارث علم ہونے کے بیان میں)

مندرجہ بالا اقتباسات کا خلاصہ یہ ہے کہ شیعہ ائمہ کو بنی اسرائیل کا علم اور آسمانی کتب اور صحیفے ورثے میں پہنچے۔ اور ان ہی کی روشنی میں مذہب شیعہ تیار کیا گیا۔ جو دراصل یہودیت ہی کی ایک شاخ ہے۔ دین اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کا لیبل انہوں نے اپنے یہودی افکار اور عزائم پر پردہ ڈالنے اور مسلمانوں کو دھوکے میں رکھنے کے لئے چسپاں کر رکھا ہے۔

شیعہ کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ حضرت علیؓ نے جو قرآن جمع کیا تھا۔ وہ حضرت امام مہدی کے پاس غار میں ہے وہ اپنے ظہور کے بعد اسے پیش کریں گے۔ چنانچہ امام کلینی لکھتے ہیں کہ!

ان القرآن الذی جاء به جبرئیل علیه السلام الی محمد صلی الله علیه و سلم سبعة عشر الف ایة۔ (الکافی کتاب فضل القرآن)

بے شک قرآن جو جبرائیلؑ کے ذریعے محمد ﷺ پر نازل ہوا وہ سترہ ہزار آیات پر مشتمل تھا۔

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے قرآن جمع کر کے لوگوں کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا تھا کہ!

هذا کتاب الله عزو جل کما انزله الله علی محمد صلی الله علیه وسلم وقد جمعته من اللوحین۔ (حوالہ بالا)

یہ اللہ کی کتاب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ پر نازل کیا تھا۔ جسے میں نے "دو لوحوں" سے جمع کیا۔

پھر یہی اصلی قرآن امام مہدی کے پاس غار میں موجود ہے۔ جسے وہ اپنے دوبارہ ظہور پر ساتھ لائیں گے۔ روایت میں "اللوحین" (دو لوحوں) کا لفظ ور طلب ہے۔ تورات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو دو لوحین عطا کی تھیں۔ جن پر احکام عشرہ درج تھے اور حضرت علیؓ نے بھی دو لوحوں سے قرآن جمع کیا تھا۔ جو موجودہ قرآن سے یکسر مختلف ہے۔

اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ امام مہدی قرآن کے نام سے تورات کی تعلیم دیں گے اور

حیرت ہے کہ مؤلف "تحقیقی دستاویز" نے مرتضیٰ عسکری، محمد حسین ڈھکو، ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور منظور حسین بخاری کی تحقیق کو قبول کرتے ہوئے [illegible] شخصیت کو خیالی اور فرضی قرار دے دیا اور شیعہ مذہب کے مستند ترین مآخذ اور امام زین العابدین، امام باقر اور امام جعفر صادق کے اقوال کو رد کر کے اپنے "پکے شیعہ" ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا۔ کیونکہ "تقیہ شریفہ" اگر ایسے مواقع پر کام نہ دے تو پھر اس کے ایجاد کرنے کا مقصد ہی کیا ہو سکتا ہے؟ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مذہب شیعہ میں اپنے شیعوں سے بھی تقیہ اسی طرح ضروری ہے جس طرح غیر شیعہ سے ضروری ہے۔

اگر ابن سبا کو افسانوی شخصیت تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اہل تشیع نے ائمہ کرام کے نام پر جتنی روایات بیان کی ہیں وہ سب افسانے، من گھڑت اور ناقابل اعتبار ہیں۔ لہٰذا اس کو افسانوی شخصیت قرار دینا خود مذہب شیعہ ہی کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے کے مترادف ہے کیونکہ شیعہ کا دعویٰ ہی یہ ہے کہ ان کا مذہب اہل بیت کرام سے منقول ہے۔ مؤلف "تحقیقی دستاویز" نے طبری کے رواۃ کو امام ذہبی اور ابن حجر العسقلانی کے ذریعے جھوٹا اور کاذب ثابت کیا ہے۔ لیکن اس سے بھی موصوف کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ جب شیعہ کے نزدیک ائمہ اہلبیت کے اقوال کے مقابلے میں خلفاء ثلاثہؓ اور دیگر صحابہؓ کے اقوال کی کوئی اہمیت نہیں تو بے چارے امام ذہبیؒ اور ابن حجرؒ کے اقوال کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے؟

امام ذہبی لکھتے ہیں کہ

"شیعہ کا ایک فرقہ السبیۃ کہلاتا ہے۔ یہ عبداللہ بن سبا کے پیرو ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؓ فوت نہیں ہوئے وہ دنیا میں لوٹ کر آئیں گے اور کرہ ارض کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے"۔ (المنتقیٰ اردو صفحہ ۱۴۹)

حافظ ابن حجر العسقلانی لکھتے ہیں کہ

"ابوالجلاس کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ کو عبداللہ بن سبا سے یہ کہتے ہوئے خود سنا ہے کہ اللہ کی قسم مجھے رسول اللہ ﷺ نے ایسی راز کی کوئی بات نہیں بتائی جس کو کسی سے چھپایا ہو اور میں نے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد خود سنا کہ "قیامت سے پہلے تیس جھوٹے ہوں گے تو بھی ان میں سے ایک ہے"

ابو اسحاق فزاری نے اپنی سند سے نقل کیا ہے کہ "حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں

سوید بن غفلہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ میں کچھ لوگوں کے پاس سے گذرا جو ابوبکرؓ و عمرؓ کو برائی سے یاد کر رہے تھے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ آپ بھی ان دونوں کے بارے میں یہی بات اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہیں جو وہ کہہ رہے ہیں۔ اس گروہ میں سے ایک عبداللہ بن سبا ہے اور ابن سبا سب سے پہلا شخص تھا جس نے اس کا اظہار کیا۔ حضرت علیؓ نے میری بات سن کر فرمایا! مالی و لهذا الخبيث الاسود؟ مجھے اس کالے خبیث سے کیا تعلق؟ پھر فرمایا کہ اللہ کی پناہ کہ میں شیخینؓ کے بارے میں بھلائی اور خوبی کے سوا کوئی اور بات اپنے دل میں چھپاؤں پھر آپؓ نے عبداللہ بن سبا کو بلا بھیجا پس اس کو مدائن کی طرف چلتا کیا اور فرمایا یہ میرے ساتھ ایک شہر میں نہیں رہ سکتا۔

عبداللہ بن سبا کے حالات تواریخ میں مشہور ہیں اور الحمدللہ کہ اس کی کوئی روایت نہیں۔ اس کے کچھ پیروکار ہیں۔ جن کو سبائیہ کہا جاتا ہے۔ وہ حضرت علیؓ کی الوہیت کا عقیدہ رکھتے ہیں اور حضرت علیؓ نے ان کو آگ میں جلایا تھا۔ (لسان المیزان صفحہ ۲۹۰ جلد ۳)

اگر طبری کے راوی سیف بن عمر سے متعلق امام ذہبی اور ابن حجر العسقلانی کی تحقیق مولف "تحقیقی دستاویز" کے لئے قابل قبول ہے تو خود عبداللہ بن سبا کے بارے میں ان کی تحقیق قبول کرنے میں کیا چیز رکاوٹ اور مانع ہے؟ موصوف نے ڈاکٹر طہ حسین کے قول کو بھی اپنی تائید میں پیش کیا کہ ان کے نزدیک بھی عبداللہ بن سبا کی شخصیت خیالی اور فرضی ہے۔ یہ درست ہے کہ سب سے پہلے اسی مصری ادیب نے یہ شوشہ چھوڑا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کون ہیں؟ ان کے نظریات کیا ہیں؟ ان کا کردار کیا رہا ہے؟

دراصل اس پراسرار شخصیت کا تعلق یہودیوں کی عالمی تنظیم فری میسن **(Free Messon)** کے ساتھ تھا۔ موصوف اس تنظیم کے باقاعدہ ممبر تھے ان کا یہودیوں کے ساتھ دلچسپی اور لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے یہودیوں کے پیشوا حاخام ناحوم آفندی کو عربی ادب کے ماہرین کا نگران مقرر کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب ہی کی زیر نگرانی قاہرہ یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی (کلیۃ الآداب) میں جو پہلا تحقیقی مقالہ پیش کیا گیا اس کا عنوان تھا۔ "عرب میں یہودی قبائل" یہ مقالہ پیش کرنے والا طالبعلم اسرائیل ولفنسون تھا جو آج کل تل ابیب کی ہاداسا یونیورسٹی میں ڈین ہے۔

ڈاکٹر طہ حسین نے پہلے ایک کتاب "الشعر الجاہلی" کے نام سے لکھی تھی جس میں اس

نے دعویٰ کیا کہ قرآن میں جن تاریخی قصص کا تذکرہ ہے وہ سب فرضی کہانیاں ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس پر عالم عرب میں ایک زلزلہ آگیا اور طٰہٰ حسین پر کفر کے فتوے لگائے گئے۔ لیکن چونکہ انہیں فری میسن اور ایسے ممبر افسران کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس لئے کوئی بھی ان کا بال بیکا نہ کر سکا۔ اس کے بعد طٰہٰ حسین نے ایک اور کتاب "الفتنۃ الکبریٰ" کے نام سے لکھی جس میں شہادت عثمانؓ پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ابن سبا کے متعلق یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ ایک فرضی کیریکٹر ہے۔ واقعات کی دنیا میں اس کا کوئی وجود ہی نہیں سبائی اسے لے اڑے اور اس پر مستقل تصانیف کر ڈالیں۔ (جیسے مرتضیٰ عسکری نے ان کی تائید میں ابن سبا کے انکار میں تین جلدوں میں ایک کتاب مرتب کی ہے جو شیعوں میں بہت مقبول ہے) غالباً طٰہٰ حسین نے یہودیوں اور سبائیوں کو خوش کرنے کے لئے ہی یہ شوشہ چھوڑا تھا ورنہ تاریخ کا کوئی طالب علم بھی اس کی جرأت نہیں کر سکتا۔

یہ جرأت وہی شخص اور طبقہ کر سکتا ہے جو قرآنی بیانات سے انکار کرنے میں بھی دریغ نہ کرے جیسا کہ طٰہٰ حسین نے قرآنی قصص کا انکار کر کے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا ہے اور شیعوں نے قرآنی تصریح "وَبَنَاتِكَ" کے باوجود سوائے حضرت فاطمہؓ کے آنحضرت ﷺ کی باقی تین صاحبزادیوں کا انکار کر کے یہ دکھا دیا ہے کہ وہ روز روشن میں چمکتے ہوئے سورج کے انکار کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہیں۔

ہر صاحب علم کے نزدیک طٰہٰ حسین اور اس کے متبع شیعوں کی طرف سے ابن سبا کے انکار کی وہی حیثیت ہے جو اردو کے مشہور ادیب و مؤرخ، سوانح نگار اور مترجم قرآن مرزا حیرت دہلوی کے واقعہ کربلا کے انکار کی ہے مرزا صاحب نے کتاب شہادت کے نام سے چھ جلدیں جو تقریباً چار ہزار صفحات پر مشتمل ہیں لکھی تھیں۔ اپنے کرزن گزٹ میں وہ اس موضوع پر سالہا سال لکھتے رہے کہ تاریخی طور پر واقعہ کربلا کا وجود ثابت نہیں کیونکہ ابتدائی دور کی حدیث و تاریخ کی کتابوں میں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ نہ موطا امام مالک میں اس کا ذکر ہے نہ موطا امام محمد میں نہ بخاری میں نہ مسلم میں نہ طبقات ابن سعد (اسماء الرجال اور تاریخ کی سب سے پہلی کتاب) میں نہ کسی اور قدیم کتاب میں...... پہلی مرتبہ ابو مخنف ـــ ن نے اس موضوع پر مقتل حسینؓ کے نام سے کتاب لکھی جو سراسر افسانہ ہے اور اس شخص کے جھوٹے، کذاب اور افسانہ گو

ہونے پر تمام محدثین کا اتفاق ہے۔ اسی ابو مخنف کے حوالہ سے طبری وغیرہ نے اپنی کتابوں اور تاریخوں میں یہ واقعہ نقل کیا ہے ظاہر ہے کہ جب اس کا پہلا راوی ہی ناقابل اعتبار ہے تو اس قصے کی کیا تاریخی حیثیت ہے؟ (بحوالہ فقہ القرآن صفحہ ۲۱۵ جلد ۴)

اب غور طلب یہ بات ہے کہ شیعہ اس شد ومد کے ساتھ عبداللہ بن سبا کے وجود کو خیالی اور فرضی شخصیت کیوں قرار دیتے ہیں؟

متاخرین شیعہ ترقی کر کے اپنے وجود کو نبی اکرم ﷺ کے زمانے سے ثابت کرنا چاہتے ہیں جب انہوں نے اپنے راستے میں عبداللہ بن سبا کی شخصیت کو رکاوٹ پایا تو انہوں نے کمال ڈھٹائی سے اس کے وجود کا ہی انکار کرنا شروع کر دیا۔ شیعہ کا موقف یہ ہے کہ لفظ "شیعہ" خود حضور نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں مستعمل تھا اور آپ نے خود مذہب شیعہ کی داغ بیل ڈالی تھی جس کی خلفاء ثلاثہؓ کے عہد میں جڑ ہی کاٹ کر رکھ دی گئی (اس پر مفصل بحث پیچھے گذر چکی ہے) اہل تشیع کی طرف سے عبداللہ بن سبا کے انکار کی دوسری بڑی اہم وجہ یہ ہے کہ اس نے سب سے پہلے "تقیہ شریفہ" پر عمل ترک کر کے اپنے عقائد کا اظہار اعلانیہ شروع کر دیا تھا۔ بحار الانوار کے فاضل محشی کا یہ حاشیہ بڑا معنی خیز ہے کہ "کان قبل ذالك يتقون ولا يقولون علانية تلك الامور فظهرو ترك التقية و اعلن القول بذالك ـ (بحار الانوار صفحہ ۲۸۷ جلد ۲۵)

عبداللہ بن سبا سے پہلے کے لوگ تقیہ سے کام لیتے تھے اور ان امور کو (کہ حضرت علیؓ وصی رسول ﷺ ہیں۔ احق بالامامت ہیں۔ حضرات ابو بکر و عمر و عثمانؓ سے افضل ہیں۔ خلفاء ثلاثہؓ غاصب ہیں) اعلانیہ نہیں کہتے تھے۔ لیکن اس نے تقیہ چھوڑ دیا اور ان باتوں کا اعلانیہ ذکر کرنا شروع کر دیا۔

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ موجودہ شیعہ عبداللہ بن سبا کے پیرو اور متبع ہیں کیونکہ یہ بھی تقیہ چھوڑ کر ان امور کو اعلانیہ طور پر اپنے عقائد کا اہم جزء سمجھتے ہوئے تحریر و تقریر اور کلمہ واذان میں بیان کرتے ہیں۔

عبداللہ بن سبا کے عقائد

مسلم اور غیر مسلم مفکرین اور ادیان کے محققین نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہودیوں کے بڑے بڑے علماء اور راہب مختلف ممالک اور مختلف عہد میں موجود فرقوں اور معاشروں میں ایک

کمزور اقلیت کی حیثیت سے گھس جاتے اور بظاہر ان کے دین و مذہب کو بھی اختیار کر لیتے تاکہ
ان کے دین میں خرابی تحریف، کجی اور تغیر و تبدل پیدا کریں جن کے ذریعے عالمی یہودیت کے
مفادات و مصالح کی خدمت انجام دی جاسکے اور اپنے آپ کو ان فرقوں کی دشمنی اور مخالفت سے
بھی محفوظ رکھیں۔ وہ ان میں اس طرح گھل مل کر واردات کرتے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ یہ مار
آستین ہیں بعثت مسیح سے لیکر آج تک یہود نے جو بالفعل اس طرح کے جوہر دکھائے ہیں تو وہ
مسیحیت کی آڑ میں عیسائیت کا روپ دھار کر انجام دیئے ہیں۔ سب سے پہلے جس معاشرے میں
انہوں نے اپنا یہ خبیث طریقہ نافذ کیا وہ ایرانی معاشرہ تھا۔ کیونکہ بخت نصر کے حملے کے نتیجے میں
یہ غلام بن کر ایران پہنچ چکے تھے۔ اور عرصہ دراز تک وہ اسی حالت میں رہے بالآخر اپنی سازشی اور
تخریبی ذہنیت کے زیر اثر یہ ان میں گھل مل گئے اور ان کا مذہب مجوسیت اختیار کر لیا۔ یہاں تک
کہ ان کے بڑے کاہن اور مذہبی پیشوا بن گئے اور مکر و فریب سے ایرانی درباروں میں اتنا اثر
رسوخ حاصل کر لیا کہ ایرانی بادشاہوں کو تیسری صدی عیسوی کے عیسائیوں اور ان کی باغی افواج
کی تباہی و ہلاکت پر اکسانے لگے۔ اسی طرح جب شہنشاہ قسطنطنیہ نے عیسائیت کا مذہب اختیار
کر لیا تو عیسائیوں کو بڑا عروج حاصل ہوا۔

چنانچہ مکار یہودیوں نے فوراً اپنا طریقہ واردات بدل ڈالا اور جلد ہی عیسائیت کے
مذہب میں داخل ہو گئے۔ دین عیسوی کی مقبولیت اور توسیع کا راستہ روکنے کے لئے ساؤل
(پولوس) نام کا ایک مشہور یہودی عالم جو دین عیسوی کا انتہائی دشمن تھا اور وہ اس کی مخالفت میں
پیش پیش رہتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ شدید مخالفت اور مظالم کے باوجود دین عیسوی پھیل رہا ہے تو
اس نے پینترا بدلا اور ایک اجتماع میں ڈرامائی انداز میں اعلان کیا کہ میں عیسائیت کے خلاف
اپنی جدوجہد کے لئے دمشق جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک جگہ آسمان سے زمین تک ایک نور ظاہر ہوا
اور آسمان ہی سے یسوع مسیح کی آواز مجھے سنائی دی کہ اے ساؤل تو مجھے کیوں ستاتا ہے اور انہوں
نے مجھے ایمان لانے اور اپنے دین کی خدمت کرنے کی وصیت فرمائی میں یہ معجزہ دیکھ کر ان پر
ایمان لے آیا ہوں اور اب میں نے اپنی زندگی کو یسوع مسیح کے دین کی خدمت کے لئے وقف کر
دیا ہے۔ حضرت عیسیٰ کے صحیح الفکر اور صادق الایمان حواریوں نے پال کے اس مکاشفہ کو قبول
کرنے سے انکار کر دیا اور ان عقائد کی بھی تکذیب کی جو اس نے گھڑ لئے تھے۔ لیکن چند حواریوں

نے پال کی باتیں قبول کرلیں۔ جس کے باعث دین مسیح مسخ ہو کر رہ گیا۔ ساؤل نے لوگوں کو بتایا کہ حضرت عیسیٰؑ نے اس مکاشفہ میں مجھے نام بدلنے کی بھی ہدایت کی ہے چنانچہ اب میرا نام پولوس ہوگا۔ یہی مکار شخص اب عیسائی دنیا میں سینٹ (ولی) پولوس یا سینٹ پال کے نام سے مشہور ہے۔

اس یہودی نے دین عیسوی میں تحریفات پر ہی بس نہیں کیا بلکہ خالص دین توحید کو مسخ کر کے اس میں بدترین شرک شامل کر دیا۔ یہ پال ہی ہے۔ جس نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا صلبی بیٹا قرار دیا ان کو الوہیت میں شریک ٹھہرایا اور روح القدس کو (جس سے بعض فرقے حضرت مریم اور بعض حضرت جبرائیل مراد لیتے ہیں) اقانیم ثلاثہ میں شامل کر کے تثلیث کا عقیدہ گھڑا۔ اس پال نے کفارہ کا عقیدہ ایجاد کیا یہ بھی اسی کی خرافات میں سے ہے کہ جو بھی حضرت عیسیٰؑ پر اس کے عقیدے کے مطابق ایمان لائے گا۔ اس کے گناہ آخرت میں اسے کوئی گزند نہیں پہنچائیں گے کیونکہ اپنے بندوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے خدا نے اپنا بیٹا صلیب پر چڑھوا دیا۔

عبداللہ بن سبا کے متعلق گزشتہ صفحات میں یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ وہ ایک یہودی تھا۔ جس نے حضرت عثمانؓ کے بالکل ابتدائی دور خلافت میں اسلام قبول کیا تھا۔ بعد کے واقعات سے ثابت ہو گیا کہ اس کا قبول اسلام ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تھا وہ اسلام میں داخل ہو کر ایک طرف توحید و رسالت کی بنیادوں کو منہدم کرنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف اس کی تدبیر یہ تھی کہ مسلمانوں میں اختلافات و افتراق پیدا کر کے ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دے۔ خلافت فاروقیؓ کے دس سالوں میں دعوت اسلامی اور عسکری فتوحات کا دائرہ اتنی تیزی سے وسیع ہوا کہ دو سپر طاقتوں روم و ایران کے بیشتر علاقے اسلام کے زیر نگین آ گئے۔ مجوسیوں کی سازش کے نتیجے میں حضرت عمرؓ شہید کر دیے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں میں داخلی انتشار پیدا ہوگا۔ اسلام کی فتوحات کی یلغار رک جائے گی لیکن حضرت عثمانؓ نے زمام خلافت سنبھال کر حالات پر پوری طرح قابو پا لیا۔ مفتوحہ علاقوں میں بغاوتوں کو کچل کر فتوحات کا دائرہ مزید وسیع کر دیا۔ یہاں تک کہ عہد فاروقیؓ میں ایران کا جو علاقہ فتح ہونے سے رہ گیا تھا۔ وہ اسلام کے زیر نگین آ گیا اور نبی اکرم ﷺ کی پیشن گوئی کے مطابق خلافت عثمانیؓ میں کسریٰ کی سطوت اور سلطنت کے پرخچے اڑنے کا کام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا اسلام کی اس یلغار کو روکنے کے لئے کچھ لوگ منافقانہ طور پر اس ارادے اور منصوبے کیساتھ مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہوئے کہ

موقع ملتے ہی کوئی شورش اور فتنہ کھڑا کر کے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں گے۔ ابن سبا نے ایسے ہی لوگوں میں سے اپنی مرضی کے افراد کو چن کر خفیہ طور پر اپنے ساتھ ملانا شروع کر دیا۔ اس مکار اور عیار یہودی نے اسلام کے خلاف مذہبی اور سیاسی محاذ ایک ساتھ کھول رکھے تھے اور ہر ایک محاذ پر وہ مکمل طور پر کامیاب رہا لیکن جو چرکے اور زخم اس نے خود اسلام کو لگائے وہ آج تک مندمل نہ ہو سکے۔

شیعہ مجتہدین نے ابن سبا کے حسب ذیل عقائد صراحت کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

۱۔ وہ پہلا شخص تھا۔ جس نے امامت علیؓ کے عقیدہ کی فرضیت کو مشہور کیا۔

۲۔ عبداللہ بن سبا جس وقت یہودی مذہب پر تھا تو غلو سے کام لیتے ہوئے حضرت یوشع بن نون کو وصی موسیٰؑ کہا کرتا تھا اور اپنے دور اسلام میں حضرت علیؓ کے بارے میں اسی طرح کہا۔ یعنی غلو سے کام لے کر انہیں وصی رسول ﷺ قرار دیا۔

۳۔ عبداللہ بن سبا پہلا شخص ہے جس نے حضرت علیؓ کے مخالفین سے برأت کا اظہار کیا ان پر طعن و تشنیع اور ان کی تکفیر کی۔

۴۔ ابن سبا وہ پہلا شخص ہے جس نے حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ پر حضرت علیؓ سے خلافت چھیننے کا الزام عائد کیا۔

۵۔ ابن سبا ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ کہا کہ مجھے مسلمانوں کی اس سادگی پر تعجب آتا ہے کہ یہ اس کے تو قائل ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ دوبارہ دنیا میں آئیں گے لیکن نبی اکرم ﷺ کے دوبارہ دنیا میں آنے کو یہ نہیں مانتے جبکہ ان کی مراجعت دنیا میں ضرور ہوگی۔

ابن سبا نے حضرت علیؓ کی الوہیت کا دعویٰ کرتے ہوئے ان کی رجعت کی یقین دہانی کرائی کہ حضرت علیؓ کا انتقال نہیں ہوا وہ قیامت آنے سے قبل اس دنیا میں آئیں گے۔

النوبختی نے بھی اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ ابن سبا کہا کرتا تھا کہ حضرت علیؓ کی نہ تو وفات ہوئی ہے اور نہ ہی وہ قتل ہوئے ہیں۔

بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے اسے زندہ آگ میں جلا دیا تھا لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ ۴۰ھ حضرت علیؓ کی شہادت کا سال ہے اور اسی سال ابن سبا کا انتقال ہوا ہے۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے وقت یہ موجود تھا چنانچہ اس نے یہ خبر سنی تو اس نے کہا اگر تم

لوگ ہزار مرتبہ بھی حضرت علی کا سر میرے سامنے لاکر پیش کر دیں گے تو میں پھر بھی ان کی موت کی تصدیق نہیں کروں گا وہ ہرگز اس وقت تک مر ہی نہیں سکتے جب تک وہ ساری دنیا کو عدل و انصاف سے ایسا ہی پر نہ کر دیں جیسا کہ اس وقت ظلم و جور سے بھری ہوئی ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی ہے کہ عبداللہ بن سبا ہی عقیدہ امامت کی فرضیت، عقیدہ وصایت، عقیدہ تولیٰ و تبریٰ اور عقیدہ رجعت کا بانی اور موجد تھا۔ شیعہ مذہب کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل تشیع کے بنیادی عقائد وہی ہیں جو ابن سبا کے ہیں لہذا اس سے یہ حقیقت بھی خود بخود ثابت ہوگئی کہ عبداللہ بن سبا ہی وہ شخص ہے جس نے باقاعدہ ایک منظم سازش کے تحت شیعہ مذہب کی بنیاد رکھی کیونکہ اس سے پہلے مذکورہ عقائد کا کوئی تصور بھی موجود نہیں تھا اور نہ ہی اُس وقت لغوی یا اصطلاحی معنوں میں شیعہ کا کوئی وجود تھا۔ بلکہ حضرت علیؓ خود حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت عثمانؓ کے "شیعہ" اور اُن کے وزیر و مشیر تھے۔ لہذا خلفاء ثلاثہؓ کے دور میں "شیعان علیؓ" کے نام سے ایک علیحدہ جماعت بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک دور عثمانؓ میں فرقہ سبائیہ یعنی عبداللہ بن سبا اور اس کی تربیت یافتہ جماعت کا تعلق ہے تو اس کے عقائد و نظریات کے ساتھ حضرت علیؓ کا دور کا بھی واسطہ اور تعلق نہیں تھا آج کی شیعیت، سبائیت ہی کا دوسرا نام ہے اور سبائیت ملغوبہ ہے نصرانیت یہودیت اور مجوسیت کا یہی وجہ ہے کہ خود شیعہ مجتہدین و محدثین و مورخین (نوبختی، کشی، مامقانی، صاحب ناسخ التوارخ وغیرہ) نے اسکو تسلیم کر لیا ہے کہ تشیع اور رفض کی اصل بنیاد اور جڑ یہودیت ہے۔

پروفیسر محمد ابوزہرہ لاء کالج الجامعۃ القاہرہ مصر لکھتے ہیں کہ

"ان (شیعہ) کے نظریات کچھ فلسفیانہ آراء پر بھی مشتمل تھے۔ جن کا مصدر و ماخذ علماء مشرق و مغرب کی نگاہ میں وہ فلسفی و دینی مذاہب تھے جو ظہور اسلام سے قبل پائے جاتے تھے مزید براں شیعہ مذہب اسی فارسی تہذیب سے بھی متاثر ہوا تھا جو ظہور اسلام سے ختم ہوگئی"۔

بعض یورپین مستشرقین جن میں سے پروفیسر ڈوزی بھی ہیں یہ خیال رکھتے ہیں کہ شیعہ مذہب ایران و فارس کی پیداوار ہے ان کے نزدیک اس کی دلیل یہ ہے کہ عربوں کا ایمان انسانی حریت و آزادی پر ہے اس کے برعکس اہل فارس خاندانی بادشاہت و حکومت کے معتقد تھے ان کی نگاہ میں انتخاب خلیفہ کا کوئی مطلب ہی نہیں جب نبی کریم ﷺ کا انتقال ہوا تو آپ ﷺ کی کوئی

اسی کو نافذ و جاری کریں گے۔ پیچھے اصول کافی کی وہ روایات گذر چکی ہیں جن میں یہ بتایا گیا تھا کہ امام مہدی اپنے ظہور کے بعد حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کی شریعت کے مطابق حکومت کریں گے اور ان سے اس کی دلیل یا وجہ نہیں پوچھی جائے گی۔

گویا امام قائم کے اس طریق کار سے یہودیوں کی "اسرائیل عظمیٰ" کی خواہش کی تکمیل ہوگی۔

شیعہ مذہب کا ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل کے متروکات جو تابوت سکینہ (ایک صندوق) میں موجود ہیں۔ اس کے ائمہ ہی وارث ہیں۔ یہ تابوت سکینہ یہودی غلبے کا نشان رہا ہے۔ حضرت موسیٰ کے بعد یہودی مالی اور اخلاقی لحاظ سے انحطاط کا شکار ہو گئے تو نہ صرف فلسطین کا بڑا حصہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا بلکہ تابوت سکینہ (جس میں تورات اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے تبرکات بھی تھے) بھی بنی اسرائیل سے چھین لیا گیا۔ جو بعد میں جناب طالوت بادشاہ کے دور میں بنی اسرائیل کو واپس ملا قرآن نے تابوت کی اس واپسی کو طالوت کی بادشاہت کی علامت قرار دیا۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ○ (البقرہ نمبر ۲۴۸)

اور ان کے نبیؑ نے انہیں یہ کہا کہ اس کی بادشاہت کی ظاہری نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آ جائے گا۔ جس میں تمہارے رب کی طرف سے دل جمعی ہے اور آل موسیٰ اور آل ھارونؑ کا بقیہ ترکہ ہے فرشتے اسے اٹھا کر لائیں گے یقیناً یہ تمہارے لئے کھلی دلیل ہے۔ اگر تم ایمان والے ہو۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ

"الواح موسیٰ عندنا عصا موسیٰ عندنا و نحن ورثة النبین۔

الواح موسیٰؑ اور عصاء موسیٰؑ ہمارے پاس ہیں ہم انبیاء کے وارث ہیں"۔

مزید فرمایا کہ "حجر موسیٰ، قمیص آدمؑ، خاتم سلیمان اور قمیص یوسفؑ بھی ہمارے پاس ہے آخر میں فرمایا۔ کل نبی ورث علما اوغیرہ فقد انتهی الی آل محمد ﷺ۔ جو نبی بھی علم یا کسی اور چیز کا وارث ہوا ہے۔ اس کی انتہا آل محمد ﷺ پر ہوئی ہے وہ تمام انبیاء کے

وارث ہیں۔ (اصول کافی کتاب الحجہ باب ائمہ طاہرین کے پاس انبیائے کرام کی نشانیوں کے ہونے کے بیان میں)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ امام جعفر صادق نے فرمایا کہ جب رسول خدا ﷺ کا انتقال ہوا تو ان کے علم اور سلاح اور ان چیزوں کے وارث علی بن ابی طالب ہوئے جو کچھ ان کے پاس تبرکات انبیاء وغیرہ میں سے تھا۔ پھر وہ چیزیں امام حسنؑ تک پہنچیں ان کے بعد امام حسینؑ کو ملیں. راوی کہتا ہے کہ پھر میں نے عرض کیا کہ ان کے بعد امام زین العابدین کو پھر امام محمد باقر کو ملیں. یہاں تک کہ آپ تک پہنچیں فرمایا. ہاں

اسی باب کی دیگر احادیث میں اور بھی کئی چیزوں کا تذکرہ ہے۔ مثلاً روایت، مغفر، دو خچر، ذلدل، دو گھوڑے، ایک گدھا، تین ٹوپیاں، عمامے وغیرہ۔ رسول خدا نے سب کچھ علی بن ابی طالب کو دیا تھا۔ ان کے بعد امام حسنؑ کو ملا پھر امام حسینؑ تک پہنچا۔ امام حسین نے عراق جاتے وقت وہ صحیفہ ام سلمہ کو دیا تھا۔ واقعہ کربلا کے بعد جب امام زین العابدین مدینہ واپس آئے تو ام سلمیٰؓ نے وہ امانت امام زین العابدین کے حوالے کردی۔

(اصول کافی۔ کتاب الحجہ۔ باب۔ ائمہ طاہرین کے پاس سلاح رسول اور ان کی پونجی ہونے کے بیان میں)

امام محمد باقر فرماتے ہیں کہ

"ہم میں سلاح رسول ﷺ (تبرکات رسول ﷺ) کی مثال بالکل ویسی ہی ہے جیسی بنی اسرائیل میں تابوت کی تھی۔ ان کے عہد میں یہ تھا کہ جہاں تابوت ہوتا تھا وہیں حکومت و سلطنت ہوتی تھی۔ ہمارے ہاں یہ ہے کہ جہاں سلاح رسول ﷺ ہیں وہیں علم یعنی امامت ہے

(اصول کافی کتاب الحجہ۔ باب سلاح رسول ﷺ کے تابوت بنی اسرائیل کے مانند ہونے کے بیان میں)

اس حدیث کی توضیح کرتے ہوئے نجم الحسن کراروی لکھتے ہیں کہ

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تابوت بنی اسرائیل اور نبوت و حکومت لازم و ملزوم تھے جہاں تابوت ہوتا تھا وہاں نبوت و سلطنت ہوتی تھی بشرطیکہ تابوت چھینا نہ گیا ہو یعنی اگر جبراً چھین لیا جائے جیسا کہ جالوت نے چھین لیا تھا اور تابوت اس کے وہاں چلا گیا تھا، تو لزوم باقی نہ رہے گا۔ بلکہ اس کی صورت یہ ہوگی کہ درصورت جبر وقہر نبوت بدستور رہے گی یہی صورت ائمہ اہلبیت سے متعلق ہے۔ (الصحیح البحری ص ۱۵۵)

الغرض تابوت سکینہ اور دیگر بنی اسرائیلی متروکات ائمہ کے پاس ہیں اور اس سلسلے میں

یہودیت اور شیعیت کا یکساں عقیدہ اور ایمان ہے۔ تابوت اور امامت لازم و ملزوم ہیں۔ جہاں تابوت ہوگا وہیں امامت بھی ہوگی۔ جس طرح جالوت نے تابوت جبراً چھین لیا تھا مگر وہ اس سے بادشاہت کا حق دار نہیں بن گیا تھا، اسی طرح ائمہ اہل بیت کا حق جبراً غصب کرنے کے باوجود خلفاء ثلاثہؓ خلافت و امامت کے صحیح حقدار نہیں ہوئے بلکہ وہ غاصب اور جابر ہی ٹھہرے (العیاذ باللہ)

عاشورہ کے تصور میں مماثلت

"عاشورہ محرم" کے عنوان پر راقم الحروف کا ایک مفصل مضمون ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان (اپریل ۱۹۹۹) میں شائع ہو چکا ہے یہاں اس کا ایک اقتباس ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے۔

یہودیوں کے ہاں ایک عاشورہ یوم عید کی طرح منایا جاتا تھا اور اس میں وہ روزہ بھی رکھتے تھے جس سے بعض حضرات کو یہ اشکال پیدا ہوا کہ عید اور روزہ کا جوڑ بعید از فہم ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس خیال کی بنیاد صرف یہ ہے کہ ہم عیسائیوں اور یہودیوں کے روزہ کو اسلامی روزہ پر قیاس کرنے لگتے ہیں۔ جیوش انسائیکلو پیڈیا میں ساتویں مہینہ کے اوائل کے متعلق وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ روزہ اور عید کا دن ہے۔ جبکہ دوسرا عاشورہ جو ان کے مذہبی مہینہ "تشری" کا دسواں روز ہے جس کو "یوم کپور" کہا جاتا ہے۔ یعنی کفارہ کا روزہ جو یہودیوں میں بہت مشہور معروف ہے۔ یہاں کی شریعت اور مذہبی کتابوں میں اسی صیغہ یعنی Yom kippur کے ساتھ مذکور ہے اور اسکو انگریزی میں day of atonement کہتے ہیں (جیوش انسائیکلو پیڈیا) یہ ان کے کسی بڑے گناہ اور کسی تاریخی اور قومی جرم (غالباً یہ جرم گوسالہ پرستی ہے) کے کفارہ کے طور پر رکھا گیا ہے اور اس کو غم و ماتم و تعذیب نفس کا دن کہا گیا ہے۔

یہودیوں کی مذہبی کتاب "سفر الاحبار" میں کفارہ کے دن کا ذکر (جو ساتویں مہینہ تشری کا دسواں روز ہے) اس طرح ملتا ہے۔ "اور یہ تمہارے لئے ایک دائمی قانون ہو کہ ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو تم اپنی جان کو دکھ دینا اور اس دن خواہ کوئی دیسی ہو یا پردیسی جو تمہارے بیچ بود و باش رکھتا ہو کسی طرح کا کام نہ کرے کیونکہ اس روز تمہارے واسطے تم کو پاک کرنے کیلئے کفارہ دیا جائیگا سو تم اپنے گناہوں سے خداوند کے حضور پاک ٹھہرو گے"۔ (جز باب نمبر ۱۶ آیت نمبر ۲۹-۳۱)

دوسری جگہ آتا ہے اور خداوند نے موسیٰ سے کہا اسی ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو

کفارہ کا دن ہے۔ اسی روز تمہارا مقدس مجمع ہو اور اپنی جانوں کو دکھ دینا۔ اور خداوند کے حضور قربانی گذراننا۔ تم اس دن کسی طرح کا کام نہ کرنا کیونکہ وہ کفارہ کا دن ہے جس میں خداوند تمہارے خدا کے حضور تمہارے لئے کفارہ دیا جائیگا۔ (کتاب مقدس، پرانا اور نیا عہد نامہ، برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی)

گنتی میں ایک جگہ آیا ہے۔ پھر اسی ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو تمہارا مقدس مجمع ہو تم اپنی اپنی جان کو دکھ دینا اور کسی طرح کا کام نہ کرنا۔ (گنتی باب نمبر ۲۹ بحوالہ ارکان مذہب صفحہ ۲۶۵)

اہل تشیع نے عاشورہ کو یہودیوں کی پیروی میں حزن وملال، غم وماتم اور عقوبت وتعزیر کا دن قرار دیا ہے ان کا قومی جرم "گوسالہ پرستی" تھا اور ان کا جرم قتل حسینؓ اور اس میں "اعانت" ہے۔ اس طرح اہل تشیع اس آیت کریمہ کے مصداق ہو گئے۔

كذالك قال الذين من قبلهم مثل قولهم تشابهت قلوبهم قد بينا الايت لقوم يوقنون ○ (البقرۃ ۱۱۸)

اسی طرح ایسی ہی بات ان کے اگلوں نے بھی کہی تھی۔ اُن کے اور ان کے دل یکساں ہو گئے ہم نے تو یقین والوں کیلئے نشانیاں بیان کر دیں۔

شیعہ کا باغ فدک اور دوسری یہودی املاک پر ملکیت کا دعوی

مذہب شیعہ کا ایک اہم عقیدہ مدینہ منورہ کے شمال میں واقع فدک اور دوسرے مقامات پر حق وراثت کا ہے۔ جسے یہودیوں سے حاصل کر کے دور رسالت ﷺ ہی میں اسلامی ریاست میں شامل کر لیا گیا تھا۔ شیعہ فدک اور دوسری یہودی زمینوں کو اسلامی ریاست کا حصہ نہیں سمجھتے جبکہ دور فاروقیؓ میں یہودی شرپسندوں اور سازشیوں کے نکالے جانے کے بعد ان کی زمینوں پر مدینہ کی اسلامی ریاست کے حق ملکیت پر نہ صرف یہ کہ اعتراض کرتے ہیں بلکہ اسلامی ریاست کے سربراہوں (خلفاء ثلاثہؓ) کو غاصب سمجھتے ہیں۔ آج یہودی اپنی ان املاک اور علاقوں کی بازیابی کے متمنی اور خواہش مند ہیں۔ یہودیوں کا یہ احتجاج تو سمجھ میں آتا ہے لیکن شیعہ کے پیٹ میں کیوں مروڑ اُٹھ رہے ہیں۔ اس مسئلہ پر یہودیت اور شیعیت کے زاویہ نظر وفکر میں کلیۃً مطابقت کیوں ہے؟

شیعی فکر کے مطابق "فدک" جو یہودیوں سے "مال فئے" کی صورت میں حاصل کیا گیا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کی ذاتی ملکیت تھا۔ اس لئے آپ ﷺ کے بعد اسکی منتقلی حضرت فاطمہؓ

سے شروع ہو کر آل محمدﷺ (ائمہ اہل بیت) پر ہونا لازمی تھی۔ لیکن حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ نے سیدہ کو ان کا حق نہ دے کر ناانصافی اور ظلم کا ارتکاب کیا۔ شیعہ کے نزدیک فدک کی حدود میں

"حد منها جبل احد وحد منها عريش مصر، وحد منها سيف البر، وحدمنها دومة الجندل۔

احد کے پہاڑ، عریش مصر، سیف البحر اور دومۃ الجندل آتے ہیں۔

ایک دوسری روایت کے مطابق امام نے اس (مخاطب) سے پوچھا تم جانتے ہو کہ بیت المقدس کیا ہے اس نے جواب دیا کہ بیت المقدس سوریا (شام) میں واقع ہے۔ اس پر امام نے فرمایا کہ بیت المقدس بیت آل محمدﷺ کے سوا کچھ نہیں۔ (حوالہ بالا)

شیعی فکر کے مطابق فدک ایک مخصوص مقام کا نام ہی نہیں بلکہ اس وسیع عرب علاقے کیلئے مستعمل ہے جو کبھی یہودیوں کی ملکیت میں تھا۔ مزید یہ کہ شیعی نظریہ کے مطابق بیت المقدس سے بیت آل محمدﷺ مراد ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ یروشلم نہ صرف بنی اسرائیل کا مرکز اور قبلہ ہے بلکہ ائمہ کا بھی قبلہ وکعبہ ہے یہی وجہ ہے کہ اہل تشیع ہر سال امام خمینی کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے یوم القدس بڑے زور وشور سے مناتے ہیں۔

اس سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ عرب کی سرزمین جو پہلے یہودیوں کی تحویل میں تھی اس پر یہودی اور شیعہ دونوں ابتداء ہی سے حق ملکیت کا دعویٰ کر رہے ہیں اور یہی دراصل "اسرائیل عظمیٰ" کا خواب اور منصوبہ ہے۔ جس کی تعبیر اور تکمیل کے لیے یہودی اور شیعہ مل کر کام کر رہے ہیں ۱۹۴۸ کو اسرائیل کے وزیراعظم بن گوریان نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو ان تمام علاقوں سے نکال باہر کریں گے جہاں سے ماضی میں وہ (یہودی) نکالے گئے تھے۔

اسرائیل نے ۱۹۷۱ء میں یوم سائرس (ایرانی شہنشاہیت کی ڈھائی ہزار سالہ تقریب) ایران کے ساتھ یک جہتی کے اظہار کیلئے سرکاری طور پر منایا۔ بدقسمتی سے اُن دنوں پاکستان میں شیعہ صدر یحییٰ خان برسر اقتدار تھا۔ اس نے یوم سائرس (۱۵ اکتوبر ۱۹۷۱ء) کے موقع پر نہ صرف قومی تعطیل کا اعلان کیا بلکہ اس کی ہدایت کے مطابق پاکستان بھر میں یہ تقریب دھوم دھام سے منائی گئی۔ جبکہ خود یحییٰ خان نے تہران جا کر مرکزی سائرس تقریب میں شرکت کی۔

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہودیت اور شیعیت دونوں برسرپیکار ہیں۔ یہ دونوں

کبھی متفق ہو کر اور کبھی ایک دوسرے کی اعانت کے ذریعے امت مسلمہ کے خلاف کاروائیاں کرتے رہے۔ان میں فرق صرف یہ ہے کہ یہودیت اسلام کی کھلی دشمن ہے جبکہ شیعیت منافقانہ روش اپنا کر اسلام کی جڑوں کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔

بالفاظ دیگر شیعیت اسلامی لبادہ میں یہودیت کا دوسرا نام ہے۔کیونکہ اس کی پیدائش ہی یہودیت کی کوکھ سے ہوئی اور اس کے زیادہ تر عقائد و نظریات بھی یہودیت سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً شیعی عقیدۂ امامت، ائمہ کے علم و ہدایت کا ذریعہ، امام مہدی کی رجعت، ائمہ کی ہدایت کا سرچشمہ، بنی اسرائیل سے نسلی تعلق، ورثہ، تورات کے احکام کی روشنی میں داؤدؑ اور سلیمانؑ کی شریعت کے مطابق حکومت کرنا، بنی اسرائیل کے تابوت سکینہ پر عقیدہ، عاشورہ کے تصور میں مماثلت یعنی تعذیب نفس، اور سابقہ یہودی علاقوں پر اپنا حق جتانا وغیرہ۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ شیعہ اور یہود کے عقائد و اعمال میں مماثلت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ!

شیعوں کا مذہب یہودیوں کے مذہب سے مشابہت رکھتا ہے۔شعبی نے فرمایا کہ فرقہ رافضیہ کی محبت یہودیوں کی محبت کی طرح ہے۔

یہودی کہتے ہیں کہ آل داؤد کے سوا کوئی انسان لائق امامت نہیں اور شیعہ اولاد علیؓ کے سوا کسی کی امامت نہیں مانتے۔

یہودی کہتے ہیں جب تک کانے دجال کا خروج نہ ہو اور کسی سبب سے جناب عیسیٰؑ آسمان سے نہ اتریں تب تک جہاد جائز نہیں اور رافضی کہتے ہیں جب تک مہدی آخرالزمان تشریف نہ لائیں اور سروش غیبی گواہی نہ دے کہ یہ مہدی آخرالزمان ہیں تب تک راہ خدا میں جہاد کرنا روا نہیں۔

یہودی مغرب کی نماز کو بتاخیر ادا کرتے ہیں یہاں تک کہ ستارے آپس میں گتھم گتھا ہو جائیں۔اسی طرح شیعہ نماز مغرب میں دیر کرتے ہیں۔

یہودی قبلہ سے ترچھے ہو کر نماز پڑھتے ہیں۔رافضی بھی اسی طرح کرتے ہیں۔

یہودی نماز میں ادھر ادھر ہلتے جلتے ہیں اور شیعہ بھی اسی طرح کرتے ہیں۔

یہودی نماز میں اپنے کپڑوں کو لٹکاتے ہیں اور شیعہ کا عمل بھی یہی ہے۔

یہودی ہر مسلمان کے خون کو حلال جانتے ہیں۔ شیعوں کا بھی یہی عقیدہ ہے۔

یہودی عورت کے حق میں عدت کا انتظار نہیں کرتے۔ روافض کا دستور بھی یہی ہے۔

یہودی تین طلاقوں میں کچھ حرج نہیں سمجھتے۔ شیعوں کا اندازِ فکر بھی یہی ہے۔

یہودیوں نے توریت میں تحریف کی ہے اور شیعوں نے قرآن مجید میں تغیر و تبدل کیا۔ اس لیے کہ بقول ان کے پہلے ہی سے قرآن مجید میں تغیر و تبدل راہ پا چکا اور اس کی نظم و ترتیب کو الٹ دیا گیا ہے اس کی تنزیلی ترتیب باقی نہیں رہی اور اب اس طرح پڑھا جاتا ہے کہ رسالت مآب ﷺ سے اس طرح کا پڑھنا ثابت نہیں اور قرآن کریم میں کمی بیشی کی گئی ہے۔

یہودی حضرت جبرئیل سے دشمنی رکھتے اور کہتے ہیں کہ وہ فرشتوں میں ہمارا دشمن ہے۔ اسی طرح شیعوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ جبرئیلؑ نے وحی لانے میں غلطی کی کہ حضرت محمد ﷺ کو پہنچائی حالانکہ وہ وحی جناب علیؑ کو پہنچانی تھی۔ شیعہ جھوٹ بکتے ہیں۔ خداوند عالم تا قیامت انہیں غارت کرے۔

(غنیۃ الطالبین صفحہ ۱۷۰۔ بحوالہ مذہب ۱۳۳ مؤلفہ پیر سید نصیر الدین نصیر گیلانی۔ گولڑہ شریف)

شیعیت کی مجوسیت سے مشابہت

عقیدہ امامت شیعیت کی اصل بنیاد ہے اور اس عقیدے کا موجد اول عبداللہ بن سبا یہودی تھا۔ شیعہ مجتہدین و محدثین خود اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ!

وکان اول من اشهر بالقول بفرض امامة علی علیه السلام ولظهر البرأة من اعدائه کاشف مخالفیه واکفرهم.

(بحار الانوار صفحہ ۲۸۷ جلد ۲۵، فرق الشیعہ صفحہ ۴۴ النوبختی، رجال کشی صفحہ ۱۰۱، تنقیح المقال للمامقانی صفحہ ۱۸۴ جلد ۲، تحفۃ العباس صفحہ ۱۸۴ للشیخ عباس قمی)

عبداللہ بن سبا سب سے پہلا شخص ہے جس نے یہ مشہور کیا کہ حضرت علیؑ کی امامت کا قائل ہونا فرض ہے اور اس نے حضرت علیؑ کے دشمنوں پر اعلانیہ تبرا کیا اور ان کے مخالفین کو واشگاف کیا اور ان کو کافر کہا۔

عبداللہ بن سبا یہودی یمن کا رہنے والا تھا۔ یمن اُس زمانے میں ایرانیوں کا مقبوضہ علاقہ تھا، اور وہاں ایرانی بکثرت آباد تھے۔ اس لیے ابن سبا کے ان خیالات کا سرچشمہ ایرانیوں

کے معتقدات ہی تھے۔ وہ اس کے بعد زیادہ عرصہ کوفہ اور بصرہ میں رہا۔ جہاں ایرانیوں نے (اسلام لانے کے بعد) سکونت اختیار کر رکھی تھی۔ اسکے علاوہ وہ مدائن میں بھی رہا جو ایران کا دارالسلطنت تھا۔ اہل ایران کا اپنے بادشاہوں کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ وہ عام انسان نہیں بلکہ فوق البشر اور خدائی صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں کے منتخب کردہ نہیں ہوتے، بلکہ خدا کی طرف سے حکومت کیلئے مامور ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے حکومت صرف ان ہی کا حق ہوتا ہے اور کوئی شخص ان کا یہ حق چھین نہیں سکتا پھر یہ حق ان ہی اولاد میں وراثتاً منتقل ہوتا رہتا ہے۔ وہ زمین پر خدا کا سایہ اور اس کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ وہ کوئی غلطی نہیں کر سکتے۔ اس لیئے لوگوں پر ان کے ہر حکم کی اطاعت لازم ہوتی ہے۔ ساسانی بادشاہوں کے زمانے میں یہ عقائد شدت اختیار کر چکے تھے۔ جب قرآن آیا تو اس نے ان تمام عقائد کو باطل قرار دے دیا۔

محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں کہ!

ایرانی عقیدہ ملک کے بادشاہ کو خدا کا بیٹا قرار دیتا تھا اور اسے پیدائشی طور پر عظمت وتقدس کا دیوتا سمجھتا تھا۔ چنانچہ جب ایرانیوں نے مدینہ اور دمشق کی حکومتوں کے خلاف بغاوت کی تو وہ (حضرت) محمد ﷺ کے عم زاد بھائی اور شرعی وارث حضرت علیؓ کے گرد جمع ہو گئے۔ جنہیں خلافت سے دور رکھا گیا تھا اور ان کے چاروں طرف جلال وتقدس کا وہ ہالا قائم کر دیا گیا جو ان کے اسلاف اپنے قومی بادشاہوں کے گرد قائم کرتے چلے آئے تھے۔ پھر جس طرح ان کے بزرگ کسریٰ کو آسمان کا بیٹا مقدس بادشاہ کے لقب سے ملقب کرنے کے عادی تھے اور ان کی کتابوں میں اسے سید و مرشد لکھا جاتا تھا اسی طرح انہوں نے اپنے اسلام کے زمانے میں حضرت علیؓ کو امام کا لقب دے دیا۔ جو اپنی سادگی کے باوجود بڑے اہم معانی کا مالک ہے۔

جب حضرت علیؓ وفات پا گئے تو ایرانی ان کے صاحبزادوں (حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ) کے گرد جمع ہو گئے اور ان کے بعد ان کی اولاد کے گرد کہا جاتا ہے کہ حضرت حسینؓ نے اکاسرہ ساسان کے آخری تاجدار کی بیٹی سے شادی کی تھی چنانچہ اس ازدواج سے امامت مقدس حق کے ساتھ رشتہ بدامن ہو گئی پھر کربلا کے میدان میں حضرت حسینؓ کے خون نے اس وحدت کو متبرک بنا دیا جو اسلام اور قدیم ایران کے درمیان میں قائم ہوئی تھی۔

وہ بغاوت جس نے بنو امیہ سے حکومت چھین کر رسول اللہ ﷺ کے قرابت داروں

بنو عباس کو تخت پر بٹھا دیا ایرانیوں ہی کی برپا کی ہوئی تھی جس کے ذریعے انہوں نے اپنے اصول امامت کی تشکیل و تصدیق کر دی۔ اگرچہ وہ اس گھرانے کو تاج نہ پہنا سکے جس تاج کیلئے انہوں نے اپنی تمام تر کوششیں صرف کر دی تھیں۔ (مرقاۃ اعظم اردو ترجمہ ص۴۹)

اس روایت میں ہوکل نے شہر بانو بنت یزدگرد کا بھی ذکر کیا ہے۔ اسکی حقیقت معلوم کرنے سے پہلے اہل تشیع کی مستند ترین اور معتبر ترین کتاب اصول کافی سے اس کا ذکر ملاحظہ فرمائیں!

علی بن حسین (امام زین العابدین) ۳۸ھ میں پیدا ہوئے اور ان کی وفات ۹۵ھ میں واقع ہوئی۔ پس وقت ان کی عمر ستاون (۵۷) سال تھی۔ و اُمّه سلامه بنت یزد جرد بن شهریار بن شیرویه بن کسری پرویز وکان یزدجرد آخر ملوك الفرس۔ ان کی ماں سلامہ (شہر بانو) بنت یزدجرد بن شہریار بن شیرویہ بن کسریٰ پرویز تھیں اور یزدجرد ایران کا آخری بادشاہ تھا۔

اس کے بعد ثقۃ الاسلام کلینی روایت نقل کرتے ہیں کہ!

امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ جب بنت یزدجرد عمر کے پاس آئیں تو مدینہ کی باکرہ لڑکیاں ان کا حسن و جمال دیکھنے بالائے بام آئیں جب مسجد میں داخل ہوئیں تو چہرہ کی تابندگی سے مسجد روشن ہوگئی۔ عمر نے جب ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے اپنا چہرہ چھپا لیا اور کہا برا ہو ہرمز کا کہ اس کی سوء تدبیر سے یہ روز بدنصیب ہوا۔ عمر نے کہا کیا تو مجھے گالی دیتی ہے اور ان کی اذیت کا ارادہ کیا۔ امیر المومنین (حضرت علیؑ) نے کہا ایسا نہیں ہے اسکو اختیار دو کہ مسلمانوں میں سے کسی کو اپنے لیے اختیار کرلے اور اسے اس کے حصہ غنیمت میں سمجھ لیا جائے۔ جب اختیار دیا گیا تو وہ لوگوں کو دیکھتی ہوئی چلیں" حتی وضعت یدها علی راس الحسین علیه السلام " یہاں تک کہ انہوں نے حضرت حسینؓ کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ لیا۔ امیر المومنین (علیؑ) نے پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟ کہا جہاں شاہ" امیر المومنین نے اس سے کہا نہیں بلکہ شہر بانو" پھر حضرت حسینؑ سے فرمایا" یا ابا عبدالله لَیَلِدَنَّ لَكَ منها خیر لهل الارض " اے ابو عبداللہ تمہارا ایک بیٹا اس کے بطن سے پیدا ہوگا۔ جو اہل زمین میں سب سے بہتر ہوگا۔ چنانچہ علی بن حسینؑ پیدا ہوئے۔" وکان یقال لعلی بن الحسینؑ ابن الخیرتین فخیرة الله من العرب هاشم و من العجم فارس " اور وہ فخر العرب والعجم کہلاتے تھے۔ پس وہ

بہترین عرب تھے ہاشمی ہونے کی وجہ سے اور بہترین عجم تھے ایرانی ہونے کی وجہ سے۔

ان کے متعلق ابوالاسود دوئلی نے کہا ہے کہ!

یہ وہ فرزند ہیں کہ جن کا سلسلہ نسب ماں کی طرف سے بادشاہ کسریٰ اور باپ کی طرف سے ہاشم بن عبد مناف سے ملتا ہے۔ یہ ان تمام بچوں سے کہیں بہتر و افضل ہیں جن کے گلے میں تعویذ ڈالے جاتے ہوں۔ (اصول کافی کتاب الحجہ باب مولد علی بن الحسین)

علاوہ ازیں تاریخ میں ایک قصہ یہ بھی مشہور ہے کہ جب فارس فتح ہوا تو یزدگرد کی تین بیٹیاں گرفتار ہو کر مدینہ آئیں۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ انہیں عام لونڈیوں کی طرح سر بازار فروخت کر دیا جائے۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ خاندان شاہی کے ساتھ اس قسم کا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ ان لڑکیوں کی قیمت کا اندازہ لگا لیا جائے اور انہیں اس قیمت کے عوض معزز اشخاص کے سپرد کر دیا جائے۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے خود انہیں اپنی نگرانی میں لے لیا اور ان میں سے ایک حضرت امام حسینؓ کو ایک محمد بن ابی بکرؓ کو اور ایک عبداللہ بن عمرؓ کو عنایت کر دی۔ جو لڑکی امام حسینؓ کو ملی وہ ان کی زوجہ شہر بانو کے نام سے مشہور ہے۔

شہر بانو سے متعلق کتب شیعہ میں اور بھی بہت سے قصے مشہور ہیں۔ لیکن اصول کافی کی روایت کا ایک خاص مقام ہے پھر وہ خود امام باقر کی بیان کردہ ہے۔ جس کا انکار کرنا خود مذہب شیعہ ہی کے انکار کے مترادف ہے۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ جب ایرانی لڑکی مدینہ لائی گئی تو مدینہ کی تمام جوان لڑکیاں اسے دیکھنے کے لئے مکانوں پر چڑھ گئیں اور جب وہ مسجد میں داخل ہوئی تو اس کی خوبصورتی کی وجہ سے مسجد روشن ہو گئی۔ حضرت عمرؓ نے جب اس کی طرف دیکھا تو اس نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ حیرت ہے کہ ایک لڑکی ایران سے مدینہ تک بے پردہ سفر کرتی ہے اس سارے راستے میں اس نے کسی سے منہ نہیں چھپایا گویا روئے زمین پر صرف حضرت عمرؓ ہی اس کے غیر محرم تھے۔

حضرت علی مشورہ دیتے ہیں کہ اس لڑکی کو اختیار دیا جائے کہ وہ اپنے لئے خود کسی مرد کا انتخاب کر لے اور پھر اس مرد کو بقیہ مال غنیمت میں سے کچھ حصہ نہیں ملے گا۔ چنانچہ اس "باپردہ" اور "باحیا" لڑکی نے تمام مردوں کے گرد چکر لگائے اور بالآخر حضرت حسینؓ کے سر پر ہاتھ رکھ لیا۔ لڑکی نے اپنا نام "جہاں شاہ" بتایا لیکن حضرت علیؓ نے بدل کر "شہر بانو" رکھ دیا پھر حضرت حسینؓ

کو خوش خبری دی کہ اے ابو عبداللہ تمہارا ایک بیٹا اس کے بطن سے پیدا ہوگا۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت حسینؓ کی ولادت جمہور کے قول کے مطابق ۴ھ میں ہوئی اور یہ واقعہ ۱۴ یا ۱۶ھ کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت حسینؓ نے دس سال کی عمر میں "دوسری شادی" ایک لونڈی شہر بانو کے ساتھ کی۔ اس لونڈی نے بھری محفل میں ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر انہیں اپنے لئے پسند کر لیا۔ ۳۸ھ میں ان سے زین العابدین تولد ہوئے۔ پھر معلوم نہیں کہ شہر بانو کہاں چلی گئی۔ بعض نے کہا کہ حالت زچگی میں فوت ہوگئی۔ بعض نے کہا کہ شہادت حسینؓ کے فوراً بعد گھوڑے پر سوار ہو کر واپس ایران چلی گئی اور بعض روایات کے مطابق دریائے فرات میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔

دوسری طرف خود یزدگرد کا معاملہ ہے کہ وہ کب برسر اقتدار آیا اور کب فوت ہوا۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فاتح ایران جب مدائن میں داخل ہوئے تو شہر خالی تھا اور یزدگرد مع اپنے اہل و عیال کے پہلے ہی فرار ہو چکا تھا۔ ١٦ کے بعد مسلمان فوجیں جہاں بھی پہنچیں یہ وہاں سے بھاگ جاتا رہا۔

لہٰذا مدائن یا اس کے بعد کی فتوحات کے ضمن میں یزدگرد کی لڑکیوں کے گرفتار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اگر یزدگرد کے اہل و عیال میں سے کوئی گرفتار ہوا بھی ہوگا تو وہ یزدگرد کے قتل کے بعد کا واقعہ ہو سکتا ہے۔ اس کا قتل بعہد عثمانیؓ ۳۰ یا ۳۱ھ کو ہوا۔

اس کے متعلق تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ!

"۳۱ھ بمطابق ۶۵۲ء میں یزدگرد خراسان کے مشہور شہر مرو میں مقیم تھا اور ایران کی ہر شکست کی آواز اس کے کانوں تک پہنچتی تھی اور وہ کفِ افسوس مل کر رہ جاتا تھا۔ آخر مایوسی اور نامرادی کے عالم میں اس نے ترکستان کی سرحد پر ایک آسیابان کے ہاں پناہ لی لیکن اس نے جواہرات کے لالچ میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس پر ساسانی عہد کا چراغ ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگیا۔"

(تاریخ ایران صفحہ ۵۵۶ جلد اول از پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی)

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یزدگرد ۱۳ھ میں (جب حضرت عمرؓ نے اقتدار سنبھالا) تخت نشین ہوا اس وقت اس کی عمر ۱۶ یا ۱۸ سال کی تھی مدائن کی فتح ۱۶ھ میں ہوئی اس وقت اس کی عمر زیادہ سے زیادہ اُنیس یا اکیس سال ہو سکتی ہے۔ کیا اس عمر کے لڑکے کے ہاں تین بیٹیاں اتنی

بڑی عمر کی ہو سکتی ہیں کہ وہ تمتع کے قابل ہو سکیں۔

شاہ معین الدین ندوی لکھتے ہیں کہ!

بعض پچھلی کتابوں میں حضرت امام حسینؓ کی ازواج میں ایک نام یزدگرد شاہ ایران کی لڑکی شہر بانو کا بھی ملتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ امام زین العابدین ان ہی کے بطن سے تھے لیکن کسی قدیم ماخذ میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ اس لیے قابل اعتماد نہیں اور یہ ایرانیوں نے سیاسی مقصد کے لئے گھڑی ہے۔ {سیر الصحابہؓ صفحہ ۲۳۲ جلد ۲}

علمائے انساب کے نزدیک حضرت زین العابدینؒ کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی سلافہ یا غزالہ تھا۔ ایرانیوں نے سیاسی اغراض کی خاطر شہر بانو کا کردار تخلیق کیا اور یہ دنیائے سبائیت کی عجوبہ کاریوں میں سے ایک ہے۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ عبداللہ بن سبا یہودی ہی عقیدۂ امامت کا موجد اول ہے چونکہ وہ مجوسیوں کے زیر اثر رہا اس لیئے اس کے عقائد پر یہودیت اور مجوسیت (قدیم ایران) دونوں کے عقائد کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔

شیعیت علی المرتضیٰؓ کے عہد میں

امام مظلوم سیدنا عثمانؓ کی دردناک اور المناک شہادت کا سانحہ شیعوں (سبائیوں) کے ہاتھوں جمعہ کے دن ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو پیش آیا تاریخ اقوام عالم میں اس عظیم سانحہ سے زیادہ عبرت ناک کوئی واقعہ نہیں گذرا۔ جس میں ایک شریف النفس اور حلیم الطبع مظلوم نے اپنے دفاع میں ہر قسم کی طاقت رکھنے کے باوجود محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور امت مسلمہ کی خون ریزی سے اجتناب کی خاطر اپنا ہاتھ روک لیا۔ جس کی بنا پر امام مظلوم شیعہ کی بربریت و درندگی کا شکار ہو گئے۔ قتل عثمانؓ شیعیت کی باقاعدہ پہلی منظم جماعتی کاروائی تھی۔ اس سے پہلے وہ عہد رسالت ﷺ و عہد شیخینؓ میں یہودی مجوسی اور عیسائی کے نام سے اپنے اپنے طور پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے عبداللہ بن سبا پہلا شخص ہے جس نے ان تمام دشمن قوتوں کو "شیعیت" کے نام سے ایک پلیٹ فارم پر اور ایک جھنڈے تلے جمع کر کے خلیفہ ثالث سیدنا عثمانؓ پر یلغار کر دی۔

آپ کی شہادت کے بعد پانچ دن تک مسند خلافت خالی رہی اور مدینہ طیبہ پر عملاً

شیعوں اور سبائیوں کے سرغنہ غافقی بن حرب کی حکومت تھی۔ یہی لوگ خلیفہ مقرر کرنے کے لیے دوسروں سے زیادہ بے چین تھے۔ بالآخر انہوں نے باصرار تمام حضرت علیؓ کو خلیفہ مقرر کر لیا۔

جس نے سب سے پہلے آپؓ کے ہاتھ پر بیعت کی وہ شیعوں اور سبائیوں کا سب سے بڑا سردار مالک الاشتر نخعی تھا۔ اس کے بعد دوسروں نے بیعت کی۔ بعض لوگوں سے جبراً بیعت لی گئی جبکہ مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد نصف یا اس سے کم یا زیادہ نے بیعت نہیں کی۔

جناب مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ!

حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانے میں ان لوگوں کی شرکت جو حضرت عثمانؓ کے خلاف شور برپا کرنے کیلئے باہر سے آئے ہوئے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے بالفعل جرم قتل کا ارتکاب کیا تھا اور وہ بھی جو قتل کے محرک اور اس میں اعانت کے مرتکب ہوئے تھے اور ویسے مجموعی طور پر فساد کی ذمہ داری ان سب پر عائد ہوتی تھی۔ خلافت کے کام میں ان کی شرکت ایک بہت بڑے فتنے کی موجب بن گئی۔ بعض اکابر صحابہ کا حضرت علیؓ کی بیعت سے الگ رہنا۔ وہ بہر حال امت کے نہایت بااثر لوگ تھے ان میں سے ہر ایک ایسا تھا۔ جس پر ہزاروں مسلمانوں کو اعتماد تھا۔ ان کی علیحدگی نے دلوں میں شک ڈال دیئے۔ (خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۲۳)

اکابر صحابہؓ کے بیعت علیؓ سے الگ رہنے کی بڑی وجہ شیعہ (قاتلین عثمانؓ) کی امور خلافت میں شرکت تھی۔ ورنہ صحابہؓ و تابعین کو حضرت علیؓ کے خلیفہ ہونے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی پورے ملک میں قصاص عثمانؓ کے مطالبے کی صدا گونجنے لگی کہ امت کے متفق علیہ خلیفہ کو جن لوگوں نے ظلماً اور بغیر کسی وجہ کے شہید کیا ہے وہ سب لوگ احکام الٰہی کے مطابق واجب القتل ہیں۔ کیونکہ حضرت عثمانؓ کا قتل نہ صرف ایک مسلمان کا، ایک صحابی کا، بلکہ صحابہ کرامؓ کے سربراہ اور خلیفہ راشد کا قتل ہے بغیر کسی وجہ کے قتل ہے مرکز اسلام مدینہ منورہ میں روضۂ رسول ﷺ کے سایہ میں قتل ہے اور قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے ایک روزہ دار کا قتل ہے۔

اس سانحہ فاجعہ سے نہ صرف حضرت عثمانؓ کی ذاتی بے حرمتی ہوئی بلکہ ایک امام و خلیفہ اور منصب خلافت کی بے حرمتی ہوئی۔ جس کا سارا دبدبہ و جلال خاک میں ملا دیا گیا۔ ان وجوہات کی بناء پر قصاص عثمانؓ کی اہمیت کس قدر زیادہ ہو جاتی ہے؟

حضرت علیؓ بھی طالبین قصاص کے اس مؤقف کو اصولی طور پر درست سمجھتے تھے۔ جب حضرت

طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے ان سے قصاص کا مطالبہ کیا تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ!

''بھائیو! جو کچھ آپ جانتے ہیں اس سے میں بھی بے خبر نہیں ہوں مگر ان لوگوں کو کیسے پکڑوں جو اس وقت ہم پر قابو یافتہ ہیں نہ کہ ہم ان پر۔ خدا کی قسم میں بھی وہی خیال رکھتا ہوں جو آپ کا ہے۔ ذرا حالات سکون پر آجانے دیجیئے تا کہ لوگوں کے حواس بر جا ہو جائیں۔ خیالات کی پراگندگی دور ہو اور حقوق حاصل کرنا ممکن ہو جائے''۔ (خلافت وملوکیت صفحہ ۱۳۷/۱۴۸)

حضرت علیؓ اس اہم فرض سے غافل نہ تھے۔ مگر سائے کی طرح ان کے ساتھ رہنے والے شیعوں (سفاک قاتلوں) نے ان کی تمام تدابیر کو ناکام بناتے ہوئے مسلمانوں کے درمیان باقاعدہ جنگ کی آگ بھڑکا دی۔ جنگ جمل کے موقع پر جب حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کے درمیان صلح ہوگئی۔ تو امیر المومنینؓ نے اعلان کیا کہ جو لوگ حضرت عثمانؓ کے خون میں براہ راست ملوث ہیں وہ علیحدہ ہو جائیں۔ اس وقت شیعوں میں کھلبلی مچ گئی وہاں ان کے لیڈر عبداللہ بن سبا اور مالک اشتر بھی موجود تھے دونوں نے سازش کے تحت رات کی تاریکی میں لشکر عائشہؓ پر حملہ کر دیا۔ نتیجتاً صلح کی بجائے جنگ چھڑ گئی اور دونوں طرف سے تقریباً دس ہزار مسلمان کام آئے۔ اس کے بعد جب حضرت معاویہؓ کی طرف سے ایک قاصد پیغام صلح لے کر آئے کہ حضرت علیؓ قاتلین عثمانؓ کو کیفر کردار تک پہنچا دیں ہم بیعت کے لیئے تیار ہیں۔

حضرت علیؓ نے جب کوفہ کی جامع مسجد میں حضرت معاویہؓ کے سفیر کی موجودگی میں پیغام صلح پڑھ کر سنایا تو دس ہزار مسلح کوفیوں نے کھڑے ہو کر بیک زبان کہا کہ۔ ہم سب عثمانؓ کے قاتل ہیں لو ہم سے بدلہ۔ حضرت علیؓ یہ دیکھ کر بے بس ہو گئے۔ بالآخر حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان صفین کے مقام پر شدید جنگ ہوئی اور تقریباً چونسٹھ ہزار مسلمان تہ تیغ ہوئے۔

حضرت علیؓ کو تخت خلافت پر قدم رکھنے کے بعد ایک دن کے لیئے بھی داخلی انتشار سے فراغت نہ ملی اس لیئے بیرونی فتوحات کی جانب وہ توجہ ہی نہیں کر سکے۔ حتیٰ کہ انہوں نے پورے دور خلافت میں ایک مرتبہ بھی اتنی فرصت نہ پائی کہ وہ حج کے موقع پر ہی اہل ایمان کی قیادت کرتے۔

اس طرح شیعوں نے حضرت عثمانؓ کو شہید کرنے کے بعد دور مرتضوی میں فتوحات کا سلسلہ روک کر اور داخلی انتشار و خانہ جنگی پیدا کر کے مزید مقاصد حاصل کر لیئے۔ عہد مرتضویؓ

میں مسلمان واضح طور پر دو بڑے گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ طالبین قصاص عثمانؓ کا تھا۔
جس میں ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیر حضرت معاویہؓ، فاتح مصر عمرو بن العاصؓ اور ان کے متبعین تھے۔ جبکہ دوسرا گروہ حضرت علیؓ اور ان کے پیروکاروں پر مشتمل تھا۔
مؤخر الذکر گروہ میں دو قسم کے لوگ شامل تھے۔ ایک قسم تو اُن لوگوں کی تھی جو مخلص اور پکے مسلمان تھے قصاص عثمانؓ کے بھی حمایتی تھے لیکن پہلے خلافت کا استحکام چاہتے تھے۔ جبکہ دوسری قسم ان لوگوں کی تھی جو اسلام اور مسلمانوں کے بدترین دشمن عبداللہ بن سبا کے پیرو اور قاتلین عثمانؓ تھے۔

حضرت علیؓ کے لشکر کا پہلا حصہ جو مخلص مسلمانوں پر مشتمل تھا کے عقائد و نظریات وہی تھے جو حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت معاویہؓ کے تھے۔ حضرت علیؓ نے جنگ صفین کے بعد تمام شہروں میں ایک سرکلر بھیجا جس کے الفاظ حسب ذیل تھے۔

والظاهر ان ربنا واحد ونبينا واحد ودعوتنا في الاسلام واحدة لا نستزيدهم في الايمان بالله والتصديق برسوله ولا يستزيدوننا الامر واحد الا ما اختلفنا فيه من دم عثمان و نحن منه براء۔ (نہج البلاغۃ صفحہ ۱۱۴ جلد ۲)

(ہمارا اور اہل شام کا جو مقابلہ ہوا) ظاہر ہے کہ ہمارا رب ایک ہے ہمارے نبی ایک ہیں اور ہماری دعوت ایک ہے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور اس کے رسول کی تصدیق کرنے پر نہ ہم ان سے زیادہ ہیں اور نہ وہ ہم سے زیادہ ہیں ہماری اور ان کی دینی حالت ایک جیسی ہے۔ مگر خون عثمانؓ کے بارے میں ہمارا اختلاف پیدا ہو گیا ہے حالانکہ ہم اس سے بری ہیں۔
اس سرکلر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فریقین کے دلوں میں کوئی بغض و عناد نہیں تھا۔
دونوں کے عقائد ایک جیسے تھے۔ دونوں اسلام کے داعی تھے اور دونوں کو کفر سے نفرت تھی۔ اس لیئے جنگ صفین کے بعد دونوں بھائیوں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان مصالحت ہو گئی جو در حقیقت شیعوں (قاتلین عثمانؓ) کے لیئے موت کا پیغام تھی۔
اس صلح کے بعد شیعوں (سبائیوں) کے پھر دو گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ منافقانہ طور پر حضرت علیؓ کے ساتھ چمٹا رہا جبکہ دوسرا گروہ باغی ہو کر حضرت علیؓ کے لشکر سے علیحدہ ہو گیا جو بعد میں خارجی کہلایا۔ یہ حضرت علیؓ کے لشکر سے نکلے ہوئے سادہ لوح لوگ تھے۔ جو سبائی پروپیگنڈا

کے زیر اثر تھے جب یہ لوگ آمادہ فساد ہوئے تو حضرت علیؓ نے ان کے ساتھ بھی جنگ کی۔ انہوں نے صلح کرنے کی بناء پر حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ جیسے برگزیدہ اصحاب رسول کو کافر مرتد اور واجب القتل قرار دیا۔

عبداللہ بن سبا نہ تو محب علی تھا اور نہ ہی دشمن صحابہؓ وہ تو یہودی تھا اور یہود کو بنو ہاشم کے ایک ممتاز فرد حضرت محمد ﷺ کی نبوت سے انکار کرنے کی وجہ سے مدینہ چھوڑنا پڑا۔ مدینہ کے بعد انہوں نے خیبر کو اپنا وطن قرار دیا اور نبی اکرم ﷺ کی اس پیشن گوئی کے مطابق کہ "آج میں علم اُس کو دوں گا جو خیبر کو فتح کرے گا" حضرت علیؓ نے در خیبر ہی نہیں اکھاڑا بلکہ یہودیوں کو سرزمین عرب سے اکھاڑ باہر پھینکا۔

یہ تھا وہ بغض و حسد و تعصب جس کو سینے میں دبائے ہوئے عبداللہ بن سبا اور اس کے اعوان و انصار تقیۃً مسلمان ہوئے۔ انہوں نے "حب علیؓ" کی آڑ میں اسلام، نبی اکرم ﷺ، صحابہ جلیؓ اور آل علیؓ سے اپنے آباؤ اجداد کا ایسا بدلہ لیا جو تا قیامت یاد رہے گا۔

اگر خیبر کا دروازہ اکھاڑ کر علیؓ نے یہودیوں کو بے گھر کیا تو انہوں نے بھی علیؓ کو مدینۃ الرسول چھوڑنے پر مجبور کیا، اور ان سے اپنے محبوب ترین نبی ﷺ کی رفاقت ایسی چھڑائی کہ دوبارہ کوفے سے مدینہ کی زیارت کو آنا بھی نصیب نہ ہوا۔

بالآخر تین شیعوں (خارجیوں) نے ایک معاہدے اور منصوبے کے تحت ملت اسلامیہ کے نگہبان و ترجمان حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ تینوں بزرگوں پر بیک وقت قاتلانہ حملے کیے۔ حضرت معاویہؓ پر وار او چھاپڑا علاج کے بعد وہ رو بصحت ہو گئے۔ حضرت عمرو بن عاصؓ بیمار تھے اس روز نماز پڑھانے مسجد میں تشریف ہی نہیں لائے ان کی جگہ جس نے امامت کی وہ لقمۂ اجل بن گئے۔ لیکن حضرت علیؓ کی پیشانی پر عبدالرحمن بن ملجم کے زہر آلود خنجر کا وار کاری ثابت ہوا اور وہ بھی حضرت عثمانؓ کی طرح شیعوں (سبائیوں) کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔

عہد مرتضویؓ میں سبائیت کے بطن سے شیعوں کا ایک دوسرا فرقہ خوارج کے نام سے پیدا ہوا۔ یہ ملحوظ رہے کہ مذہب شیعہ بہت بعد میں مرتب ہوا۔ اُس وقت ان کے موجودہ عقائد کا نام و نشان تک نہ تھا۔ صرف چند مخصوص لوگ بعض عقائد سے باخبر تھے۔ لہٰذا اس پر یہ اعتراض وارد نہیں ہو سکتا، کہ شیعہ اور خوارج مختلف عقائد رکھتے ہیں۔ شیعہ اور خوارج دونوں سبائی تھے

دونوں کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانا تھا اور دونوں حضرت علیؓ کی فوج میں شامل تھے۔

شیعہ مجتہد علامہ سید محمد طباطبائی حضرت علیؓ کے متعلق لکھتے ہیں کہ!

(ثلاثہؓ کے دور میں) اس طرح (شیعہ) روز بروز اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کر رہے تھے۔ پھر حضرت علی بھی جو تمام لوگوں کی تربیت کرنے سے قاصر تھے۔ صرف خاص لوگوں کی تربیت پر توجہ دے رہے تھے۔ ان پچیس سالوں میں حضرت علیؓ کے چار خاص اصحاب اور دوستوں میں سے تین وفات پا گئے جو ہر حال میں آپ کی پیروی میں ثابت قدم رہے تھے۔ یعنی سلمان فارسی، ابوذر غفاری اور مقداد لیکن اس مدت میں اصحاب اور تابعین کی ایک خاصی بڑی جماعت حجاز، یمن، عراق اور دوسرے ممالک میں حضرت علیؓ کے پیروکاروں میں شامل ہو گئی تھی۔ (شیعہ صفحہ نمبر ۴۳)

طباطبائی نے اعتراف کیا ہے کہ ثلاثہؓ کے دور میں شیعہ نے اپنی خفیہ سرگرمیاں جاری رکھیں۔ حضرت علی تمام لوگوں کی تربیت کرنے سے قاصر تھے۔ وہ صرف خاص لوگوں کی تربیت پر توجہ دے رہے تھے۔ یہ حضرت علیؓ کی ذات پر بدترین اتہام ہے۔ البتہ یہ کام ابن سبا کا تھا۔ جس نے چند خاص لوگوں کی تربیت کر کے ان کے ذریعے مسلمانوں میں مذہبی وسیاسی انتشار پھیلایا۔

یہ حقیقت ہے کہ شیخینؓ کے دور میں شیعہ بحیثیت ایک مذہبی فرقہ کے متعارف نہیں ہوا تھا، اور وہ مختلف لیبل لگا کر سیاسی محاذ سے مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے رہے۔ عہد عثمانیؓ میں ابن سبا نے مذہبی اور سیاسی دونوں محاذوں سے اسلام کے خلاف یلغار کی، اور دونوں محاذوں پر اسے بھرپور کامیابی حاصل ہوئی۔ اس طرح پہلی مرتبہ "سبائیہ" کے نام سے ایک مستقل فرقہ معرض وجود میں آ گیا۔ جس سے آگے چل کر شیعہ کے مختلف فرقے پیدا ہوتے رہے۔

حجۃ الاسلام محمد حسین آل کاشف الغطاء لکھتے ہیں کہ!

صاحب ذوالفقار ان ہی بلند احساسات کے زیر اثر محض احتجاج پر اکتفا کرتے ہیں اور مسند خلافت کو لوٹنے کی کوئی تدبیر نہیں اختیار فرماتے۔ شیعہ بھی اپنے امیر کی روش پر چلتے رہے۔ تقاضائے وقت ہی یہ تھا کہ تفریق سے کام نہ لیا جائے اسی بناء پر خلفاء ثلاثہؓ کے دور میں اس فرقہ نے بحیثیت فرقہ ابھرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ دوستان علیؓ ہر حکمران کے طریق کار اور زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا خاموش مطالعہ کرتے رہے یہاں تک کہ قوم نے خود ہی علیؓ کو منتخب کر لیا۔ (اصل واصول شیعہ صفحہ ۳۲)

موصوف نے کمال ڈھٹائی کے ساتھ یہ لکھ دیا کہ حضرت علیؓ نے ثلاثہؓ کی خلافت کو الٹنے کی کوئی کوشش نہیں کی انہوں نے صرف احتجاج پر اکتفا کیا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے ثلاثہؓ کی خلافت کو دل و جان سے قبول کیا۔ ان کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت کی ان کے وزیر و مشیر رہے۔ ایسے حالات میں احتجاج کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

موصوف کا یہ کہنا کہ اشیعہ بھی اپنے امیر کی روش پر چلتے رہے تقاضائے وقت ہی یہ تھا کہ تفریق سے کام نہ لیا جائے۔ بددیانتی، مکاری اور عیاری کی انتہا ہے۔

بڑے سیدھے ہو بڑے بھولے کہیں کے ذرا دیکھو تو دیکھو آستین کے

بہرحال عہد مرتضوی میں شیعوں (سبائیوں) کی دوسری شاخ خوارج کا ظہور ہوا۔ یہ کون لوگ تھے؟ ان کی تاریخ اور حقیقت کیا ہے؟ اور انہوں نے کیا کیا گل کھلائے؟ ملاحظہ کیجئے!

خوارج

خوارج، خارجہ کی جمع ہے جو خَرَجَ سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے۔ خَرَجَ کے معنی نکلنے کے ہیں۔ خَرَجَ عَلَيْهِ۔ اس نے اس کے خلاف خروج کیا یعنی بغاوت کی۔ خارجہ کے معنی بغاوت کرنے والی جماعت کے ہیں جس کی جمع خوارج آتی ہے۔ اَلْخَارِجِیُّ اس آدمی کو کہتے ہیں جو شاہی خاندان سے نہ ہو اور بادشاہ بن جائے۔ نیز اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کے ماں باپ تیز دوڑنے والے نہ ہوں مگر وہ ماں باپ کے خلاف تیز دوڑے ایسے ہی اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو سلطان یا جماعت کی مخالفت پر اتر آئے۔ نیز اس شخص کو بھی جو خارجی فرقوں کے عقائد کو اختیار کرے۔ چنانچہ اسلامی بڑے فرقوں میں سے سات فرقے خوارج کہلاتے ہیں۔ جن کی تفصیل کتب عقائد میں موجود ہے۔ (المنجد، تاج العروس وغیرہ)

عام مؤرخین کے نزدیک فرقہ خوارج کی ابتدا واقعہ تحکیم سے ہوتی ہے۔ جنگ صفین کے دوران قتال کو ختم کرنے کیلئے اہل شام کی طرف سے حضرت علیؓ کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی کہ کتاب اللہ کا فیصلہ فریقین کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ اس تجویز کا مدعا یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے مسلمانوں میں جو اختلاف پیدا ہوا اور بالآخر جنگ کا باعث بنا اس کو دو حکموں کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ قرآن کے مطابق فیصلہ کریں۔

حضرت علیؓ کی فوج کی اکثریت نے اس تجویز کو بلا تاخیر قبول کر لیا۔ اس موقع پر یہ کہا

جاتا ہے کہ حضرت علیؑ اس تجویز کے حق میں نہیں تھے انہوں نے اپنے شیعوں کو لاکھ سمجھایا کہ "اس چال میں نہ آؤ اور جنگ کو آخری فیصلے تک پہنچ جانے دو"۔

لیکن یہ بات خلاف واقعہ ہے کیونکہ حضرت علیؑ "دعوت الی القرآن" کے جواب میں یہ طرز عمل اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ط (الانفال نمبر ۶۲/۶۱)

اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو آپ ﷺ بھی صلح کیلئے آمادہ ہو جائیں اور اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ یقیناً وہ بہت سننے، جاننے والا ہے اگر وہ آپ ﷺ سے دغابازی کرنا چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کے لیے بالکل کافی ہے۔

جب قرآن کافروں کی صلح کی پیش کش کو مسترد کرنے سے منع کر رہا ہے تو حضرت علیؑ مسلمانوں کی طرف سے جذبہ خیر خواہی کے پیش نظر اس تحکیم کو کیوں کر رد کر سکتے تھے؟

شیعان علیؑ میں سے ایک گروہ (جو اکثر بنی تمیم میں سے تھے) نے اسکی شدید مخالفت کی۔ عروہ بن اُدَیّہ کھڑا ہوا اور کہا "اتحکمون فی دین اللہ الرجال؟ کیا اللہ کے دین میں تم لوگوں کو حکم بناتے ہو؟ اس شخص کی یہ بات شیعان علیؑ میں سے قراء کے کئی گروہوں نے مان لی اور بطور احتجاج یہ آواز بلند کی کہ" لا حکم الا للہ "یعنی سوائے اللہ کے اور کوئی حکم نہیں لگا سکتا۔ یہ خوارج کے ظہور کا آغاز تھا۔ یہیں سے اس فرقہ کی بنیاد پڑی جس کا شعار و عقیدہ یہی جملہ تھا۔ انہوں نے حضرت علیؑ کا ساتھ چھوڑ دیا اور کوفہ کے قریب حروراء کے گاؤں میں جا کر عبداللہ بن وھب کو اپنا سردار چن لیا۔ یہ لوگ جنہوں نے سب سے پہلے اختلاف کیا اَلْحَرُوْرِيَّة یا اَلْمُحَكِّمَة کہلائے۔ پھر اس نام کے وسیع مفہوم میں بعد کے تمام خوارج شمار ہونے لگے۔

یہ چھوٹا سا گروہ بعد کے انحرافات کی وجہ سے رفتہ رفتہ بڑھتا رہا خاص طور پر جب حکمین کا فیصلہ قراء کی توقعات کے برعکس ہوا۔ اس موقع پر شیعان علیؑ میں سے بہت سے لوگ جن میں سے بعض قراء بھی شامل تھے خفیہ طور پر کوفے سے (جہاں عارضی صلح کے دوران حضرت علیؑ کی فوج واپس آ گئی تھی) باہر نکل آئے (خروج) اور ابن وھب کی فوج میں شامل ہو گئے۔ پھر یہ سب ہم خیال لوگ نہروان کے مقام پر اکٹھے ہو گئے اور باقاعدہ ایک علیحدہ فرقہ کی حیثیت اختیار کر لی اور یہ

لوگ اپنے نظریات میں نہایت جری تھے۔ (البدایہ والنہایہ صفحہ ۲۸۱ جلد نمبر ۷ تحت ذکر خروج الخوارج من الکوفہ)

ایک اور نام جو ان ابتدائی خوارج کو دیا جاتا ہے "اَلشُّرَاۃ" (الشاری کی جمع) ہے جس کے معنی ہیں بیچنے والے۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے اپنی جانوں کو اللہ کے راستے میں بیچ ڈالا ہے۔ یہ لفظ اس آیت کریمہ سے ماخوذ ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ۔ لوگوں میں کچھ وہ ہیں جو اپنی جان کو اللہ کی مرضیات کے حصول میں بیچ دیتے ہیں۔

"شراۃ" نے یہ نام خود اپنے لیئے تجویز کیا تھا اور پھر اس کا اطلاق ان کے جانشینوں پر بھی ہونے لگا۔

خوارج نے جلد ہی اپنے انتہائی تعصب اور تنگ نظری کا اظہار انتہا پسند اعلانات اور دھشت ناک افعال کی صورت میں کیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ حضرت علیؓ کا دعویٰ خلافت باطل ہے۔ مگر ساتھ ہی اسی شد و مد کے ساتھ انہوں نے حضرت عثمانؓ کے مسلک کی بھی مذمت کی۔ وہ اس سے بھی تجاوز کر کے ہر اس شخص کو جو ان کے نظریے کو تسلیم نہیں کرتا تھا کافر اور دین سے خارج قرار دینے لگے۔ اس کے بعد انہوں نے بہت سے لوگ قتل کیے یہاں تک کہ عورتوں کے خون سے بھی ان کے ہاتھ رنگین ہوئے۔ رفتہ رفتہ خارجی فوج کی قوت تشدد پسند اور فتنہ انگیز عناصر کے شامل ہونے سے بڑھتی گئی۔ بہت سے غیر عرب بھی ان میں شامل ہو گئے۔

حضرت علیؓ نے گفت وشنید میں ناکامی کے بعد نہروان کے مقام پر ان سے جنگ کی اور ان کو بری طرح شکست دی۔ جس میں ابن وھب اور اس کے پیرووں میں سے اکثر لوگ مارے گئے۔ لیکن اس شکست سے وہ فنا نہیں ہوئے، اور نہ ان کا عقیدہ ختم ہوا۔ بلکہ اس کی وجہ سے خوارج کے اندر حضرت علیؓ سے بیزاری کا جوش بڑھ گیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے یہ سازش بھی کی کہ حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ اور مصر کے گورنر حضرت عمرو بن عاصؓ کو بیک وقت قتل کر دیا جائے۔

چنانچہ اس سازش کو عملی جامہ پہنانے کے لیئے تین آدمیوں نے اپنی خدمات پیش کیں۔ حملے کے لیئے ایک ہی تاریخ اور ایک ہی وقت مقرر ہوا۔ عبدالرحمٰن بن ملجم کوفے پہنچا۔ برک بن عبداللہ التمیمی دمشق اور عمرو بن بکر التمیمی مصر پہنچا۔ حضرت معاویہؓ پر حملہ ہوا اور وہ زخمی ہو گئے۔ حضرت عمرو بن عاصؓ اس رات بیمار تھے ان کی جگہ خارجہ بن حذافہ امامت کیلئے آئے تھے، قتل ہو گئے، اور حضرت علیؓ عبدالرحمٰن بن ملجم کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔

حضرت معاویہؓ کے دور میں بھی خوارج نے اپنی باغیانہ سرگرمیاں جاری رکھیں۔ جنہیں بہت سرعت سے دبا دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے چھاپہ مار (گوریلا) طرز جنگ اختیار کر لیا۔ وہ آناً فاناً جمع ہو جاتے اور کسی علاقے میں تیزی سے یلغار کرتے، غیر محفوظ علاقوں میں اچانک حملہ کر دیتے اس کے بعد وہ اسی تیزی سے واپس چلے جاتے تا کہ سرکاری فوج کے تعاقب سے بچ نکلیں خوارج کے اجتماع کے مراکز بصرے کے اطراف میں بطائح کا دلدلی علاقہ تھا۔ یا دریائے دجلہ کے بائیں کنارے پر "جوخا" کے اطراف کا علاقہ تھا۔ جہاں ان کی تحریک کی ابتداء ہوئی تھی۔ شکست کی صورت میں وہاں سے یہ لوگ بسرعت تمام ایرانی سطح مرتفع کے پہاڑی علاقوں میں واپس چلے جاتے تھے۔

یزید بن معاویہؓ کے انتقال کے بعد جو خانہ جنگی ہوئی اس کے خلفشار میں خارجی تحریک نے بہت زیادہ زور پکڑا، اور ملک کی صورتحال نازک ہو گئی۔ ان کی وجہ سے عبداللہ بن زبیرؓ کا قبضہ اس علاقے پر مخدوش ہو گیا۔ جسے انہوں نے پہلے فتح کر لیا تھا۔ ان کی شکست کے بعد اموی گورنروں کو ان ناقابل تسخیر باغیوں کے خلاف سخت جدوجہد کرنی پڑی۔ جو فاتح اور مفتوح دونوں کے یکساں دشمن تھے۔ تاہم خارجی اپنی ریشہ دوانیوں سے بنو عباس کو بنو امیہ پر فتح دلانے میں کامیاب ہو گئے۔

خوارج کے فرقے

"خارجی" بھی بنیادی طور پر اہل تشیع کا ہی ایک فرقہ ہے۔ دونوں حضرت علیؓ کے لشکر میں شامل رہے۔ ایک ظاہری دشمن تھا اور دوسرا باطنی، گویا کہ ایک "کافر" تھا اور دوسرا "منافق"۔

مرور زمانہ کے ساتھ خوارج بھی مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ان کا مختصر تعارف ہدیۂ قارئین کیا جاتا ہے۔

۱۔ بیہسیہ ـــــ یہ لوگ بیہس بن ہیصم بن جابر کی طرف منسوب ہیں جو قبیلہ بنی سعد بن ضبہ سے تھا۔ اس فرقے کو "ہیصمیہ" بھی کہتے ہیں۔ ابن خلدون کے نزدیک بیہسیہ فرقہ اباضیہ سے ہے۔

۲۔ مرداسیہ ـــــ یہ فرقہ ابو بلال مرداس حنظلی کی طرف منسوب ہے۔ جو قبیلہ بنی تمیم سے تھا۔ جنگ صفین میں حضرت علیؓ کے ہمراہ تھا اور بوجہ "تحکیم" کے ان سے علیحدہ ہو گیا تھا۔

۳۔ **ازارقہ** ۔۔۔ یہ ابی راشد نافع بن ازرق کے پیرو ہیں۔ یہ جوش اور تعداد میں سب فرقوں سے زیادہ تھا قوت و شوکت میں بھی سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ نافع کی سرکردگی میں ازارقہ نے امویوں اور ابن زبیرؓ سے پورے انیس سال تک نہایت پامردی کے ساتھ جنگ جاری رکھی۔ یہ حضرت علیؑ کی تکفیر کرتے تھے اور حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ اور ان کے ہمراہیوں پر تبرا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

۴۔ **نجدات** ۔۔۔ یہ لوگ نجدہ بن عامر (عمیر، عویمر) کے پیرو ہیں۔ جو قبیلہ بنو حنفیہ کی طرف منسوب تھا۔ نجدات ایک نظریہ میں خوارج سے بالکل منفرد تھے اور وہ تقیہ کا اعتقاد تھا۔ تقیہ کے پیش نظر جہاں ضرورت ہوتی وہ تحفظ مال و جان کے لیئے کہہ دیتے کہ وہ خارجی نہیں۔ مناسب وقت آنے پر اپنے خارجی ہونے کا اظہار کر دیتے۔ اس فرقہ کے لوگ یمامہ میں رہتے تھے۔ پہلے اس جماعت کا سردار ابو طالوت خارجی تھا۔ پھر نجدہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس فرقہ نے بڑا عروج حاصل کیا۔ چنانچہ بہت جلد یہ لوگ بحرین، عمان، حضرموت، یمن اور طائف پر قابض ہو گئے۔

۵۔ **اصفریہ** ۔۔۔ یہ زیاد بن اصفر کی طرف منسوب ہیں بعض نے کہا کہ یہ نعمان بن صفر کے اصحاب ہیں، بعض کے نزدیک عبداللہ بن صفار کے پیرو ہیں. کسی کے نزدیک ان کا یہ نام "صفرت" (زردی) مرض کے پڑا ہے اور بعض نے کہا کہ چونکہ کثرتِ عبادت کی وجہ سے وہ زرد رنگ ہو گئے تھے اس وجہ سے انہیں اصفریہ یا صفریہ کہا جانے لگا۔ صفریہ کو "زیادیہ" بھی کہتے ہیں۔

۶۔ **اباضیہ** ۔۔۔ یہ لوگ عبداللہ بن اباض کی طرف منسوب ہیں بعض نے کہا ہے کہ یہ فرقہ "اباض" کی طرف منسوب ہے جو یمامہ میں ایک گاؤں کا نام ہے۔ یہ لوگ غلو اور انتہا پسندی سے بالکل الگ تھے۔ میانہ روی، توسط اور اعتدال ان کا شعار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام کے بعض اطراف میں یہ اب بھی موجود ہے۔ ان کے نزدیک غیر خارجی مسلمان نہ مشرک ہیں نہ مومن البتہ انہیں کفران نعمت کی وجہ سے کافر کہا جائے گا۔ ان کے نزدیک حضرت علیؑ اور اکثر صحابہ کافر ہیں۔ اگر یہ اعتدال ہے تو معلوم نہیں کہ شدت کس کا نام ہے؟ تاہم خوارج کے دیگر فرقوں کے مقابلے میں یہ معتدل ہیں۔ آگے چل کر اباضی مزید چار فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔

۱۔ **حفصیہ** ۔۔۔ یہ ابو حفص بن ابی مقدام کی طرف منسوب ہیں۔

۲۔ **یزیدیہ** ۔۔۔ یہ یزید بن انیسہ کے اصحاب ہیں۔ اس کا شمار غالی فرقوں میں ہوتا ہے

اس کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک رسول عجم سے مبعوث کرے گا اور اس پر یکبارگی کتاب نازل ہو گی جو شریعت محمدیہ کو منسوخ کر دے گی۔

۳۔ حارثیہ۔۔۔ یہ لوگ ابوحارث اباضی کے پیرو ہیں۔

۴۔ عبادیہ۔۔۔ یہ فرقہ ایک بدعت قبیحہ کے ساتھ منفرد ہوا۔ ان کا مذہب یہ ہے کہ جو عبادت "ریا" کے ساتھ کی جائے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اس سے مقصود نہ ہو وہ بھی اطاعت ہے۔

۷۔ عجاردہ۔۔۔ اس فرقے کے لوگ عبدالرحمٰن بن عجرد کے پیرو تھے۔ شہرستانی نے عبدالکریم بن عجرد لکھا ہے۔ ان کو "عجردیہ" بھی کہتے ہیں یہ لوگ مذہباً نجدات سے بہت قریب تھے۔ انکے نزدیک بیٹی، پوتی، نواسی، بھتیجی اور بھانجی وغیرہ سے نکاح کرنا جائز ہے۔ یہ فرقہ مزید دس گروہوں میں تقسیم ہو گیا

۱۔ میمونیہ، ۲۔ حمزیہ، ۳۔ شعیبیہ، ۴۔ حازمیہ، ۵۔ خلفیہ، ۶۔ اطرافیہ، ۷۔ معلومیہ، ۸۔ مجہولیہ، ۹۔ صلتیہ، ۱۰۔ ثعالبہ یا ثعلبیہ۔ ثعالبہ کے پھر پانچ فرقے ہو گئے۔

۱۔ اخنسیہ، ۲۔ معبدیہ، ۳۔ رشیدیہ، ۴۔ شیبانیہ، ۵۔ مکرمیہ۔

۸۔ ضحاکیہ۔۔۔ یہ خوارج کا آٹھواں فرقہ ہے جو ضحاک بن قیس کا پیرو ہے۔

۹۔ شبیبیہ۔۔۔ یہ فرقہ شبیب بن یزید بن نعیم شیبانی کی طرف منسوب ہے۔

۱۰۔ کوزیہ۔۔۔ اس فرقہ کے لوگ طہارت میں مبالغہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بدن کی مالش غسل کے وقت فرض ہے۔

۱۱۔ کنزیہ۔۔۔ یہ لوگ مال جمع کرتے ہیں، زکوٰۃ کی فرضیت کے منکر ہیں۔

۱۲۔ شمراخیہ۔۔۔ یہ فرقہ عبداللہ بن شمراخ کی طرف منسوب ہے اسکے نزدیک ماں باپ کا قتل حلال ہے اور وطی بلا نکاح بھی حلال ہے۔

۱۳۔ بدعیہ۔۔۔ یہ فرقہ ازارقہ کے موافق ہے مگر اس بات میں منفرد ہے کہ نماز میں صرف دو رکعت صبح کو اور دو رکعت شام کو پڑھنا چاہیے۔ (بحوالہ مذاہب الاسلامیہ۔ جامع تفسیر و مفسرین)

خوارج رسول اکرم ﷺ کے عہد میں

مؤرخین اور ارباب سیر کے نزدیک خوارج کی ابتداء واقعہ تحکیم کے بعد ہوئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شیعیت کی طرح خارجیت کے جراثیم بھی نبی اکرم ﷺ کے دور ہی میں پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ تاریخ اسلام میں خوارج دراصل وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلامی حکومت کے خلاف خروج و بغاوت کی ہو، اور وہ جماعت سے الگ ہو گئے ہوں۔ اسلام آیا تو تین قسم کے لوگ سامنے آئے۔

ایک وہ جنہوں نے اسلام کی دعوت کو شرح صدر کے ساتھ قبول کر لیا۔ یہ مؤمنین کہلائے۔

دوسرے وہ جنہوں نے اس کا کھلم کھلا انکار کر دیا قرآن نے انہیں کافر کہا ہے۔

تیسرے وہ جو بظاہر حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے لیکن وہ دل سے اسلام نہیں لائے انہیں منافقین کے لقب سے یاد کیا گیا ہے ان منافقین ہی میں دو قسم کے لوگ شامل تھے۔

ایک تو وہ جنہوں نے اسلام کو ظاہر میں قبول کر لیا اور انہیں کھلم کھلا اسلام کی مخالفت کی جرأت نہیں ہوئی لیکن وہ در پردہ مخالفین اسلام سے ساز باز کرتے رہے اور اسلام کے خلاف خفیہ سازشیں کرتے رہے یہ تو منافقین ہی کہلائے ان ہی میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوئے کہ انہوں نے کبھی کچھ طاقت حاصل کر لی اور وہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہوئے بھی اسلامی حکومت اور اسلامی جمعیت کے خلاف مسلح مزاحمت اور مسلح بغاوت پر اُتر آئے یہ لوگ تھے تو منافقین ہی۔ لیکن ان کو تاریخ اسلام نے خوارج کے لقب سے یاد کیا۔

آگے چل کر ان ہی میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوئے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اور عام مسلمانوں کے عقائد کے برخلاف انہوں نے چند عقائد میں ان سے اختلاف کیا اور اپنے لیے کچھ نئے عقائد کا پرچار کیا، اور رفتہ رفتہ مسلمانوں سے ان مختلف مخصوص عقائد رکھنے والوں ہی کو خوارج کہا جانے لگا۔ لیکن اپنی اصل کے اعتبار سے وہ ان منافقین ہی کا حصہ تھے جنہوں نے اسلامی حکومت اور اسلامی جماعت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ یہ اس معنی میں بھی خارجی تھے، وہ اپنے آپ کو دوسرے مسلمانوں سے بہتر مسلمان اور باقی مسلمانوں کو کافر اور مرتد سمجھتے تھے۔ ان خوارج کا وجود ہر زمانے میں رہا ہے۔ چنانچہ رسول ﷺ کے مبارک عہد میں بھی ان کا وجود ملتا ہے۔

امام بخاری نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ!

ایک مرتبہ آپﷺ مال غنیمت تقسیم کر رہے تھے کہ عبداللہ بن ذی الخویصرۃ تمیمی آیا اور کہا کہ اے اللہ کے رسولﷺ۔ انصاف کیجئے۔ آپﷺ نے فرمایا تیرا ناس اور خرابی ہو اگر میں بھی انصاف نہیں کروں گا تو اور کون انصاف کرے گا۔ حضرت عمرؓ بن خطاب نے عرض کیا مجھے اجازت دیجئے میں اس کی گردن اڑا دوں۔ آپﷺ نے فرمایا اسے چھوڑ دو۔ اس کے ساتھی ایسے ہیں کہ تم انکی نماز کے سامنے اپنی نماز کو اور ان کے روزوں کے مقابلے میں اپنے روزے کو حقیر سمجھو گے۔ لیکن وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ ان کی نشانی ایک ایسا آدمی ہوگا کہ اس کا ایک ہاتھ یا چھاتی عورت کی طرح ہوگی یا یوں فرمایا کہ گوشت کے ایک لوتھڑے کی طرح ہوگا جس میں ایک طرح کی لرزش اور کپکپی ہوگی۔ یہ لوگ مسلمانوں کے باہم اختلاف کے وقت نکلیں گے۔ ابو سعیدؓ نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے یہ نبی اکرمﷺ سے سنا ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو قتل کیا ہے اور میں آپ کے ساتھ تھا کہ ایک نعش اسی صورت کی لائی گئی جس کا وصف آپﷺ نے بیان فرمایا تھا۔

ابوسعیدؓ کا بیان ہے کہ آیت "وَمِنْهُمْ مَنْ يَلْمِزُكَ فِي الصدقات" (ان منافقون میں ایسے لوگ بھی ہیں جو آپﷺ کو صدقات کے بارے میں مطعون کرتے ہیں) اسی شخص (ذی الخویصرۃ تمیمی) کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

(صحیح بخاری کتاب استتابة المرتدین والمعاندین وقتالھم باب من ترک قتال الخوارج للتألف وان لا ینفر الناس عنه)

اس حدیث پر امام بخاری نے "مَنْ تَرَكَ قتال الخوارج للتألف" کا باب باندھا ہے اور انہوں نے ہی اس سے پہلے باب "قتل الخوارج والملحدین" (یعنی خوارج اور ملحدین کے قتل کرنے کے بیان میں) کے تحت حضرت علیؓ سے یہ حدیث نقل فرمائی ہے کہ!

آخری زمانہ میں ایک قوم ایسی نکلے گی جو نو عمر اور کم عقل ہوگی باتیں تو اچھے لوگوں جیسی کریں گے۔ لیکن ان کا ایمان ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا وہ لوگ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے تم جہاں بھی ایسے لوگوں کو پاؤ قتل کر دو کیونکہ قیامت کے دن اس کو اجر ملے گا جس نے انہیں قتل کیا۔

(صحیح بخاری کتاب استتابة المرتدین باب قتل الخوارج والملحدین بعد اقامة الحجة علیھم)

مذکورہ بالا دونوں حدیثوں پر امام بخاریؒ نے جو باب باندھے ہیں وہ خوارج ہی سے

متعلق ہیں۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خوارج کا وجود رسول اکرم ﷺ کے عہد میں شروع ہو چکا تھا۔ یہ وہی منافقین اور خوارج تھے جنہوں نے قبا میں کفر پھیلانے اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے اور مخالفین اسلام کی سازشوں کے لیئے ایک پناہ گاہ اور مرکز کے طور پر استعمال کرنے کے لیئے مسجد ضرار بنائی تھی جس کا اللہ تعالیٰ نے سورۃ توبہ آیات (۱۰۷ تا ۱۱۰) میں ذکر فرمایا ہے اس مسجد کی تعمیر سے منافقین کے چار مقاصد تھے۔

۱۔ ضِـــرَارًا۔۔۔ یعنی اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا کر مخلص مومنوں کو نقصان پہنچائیں۔

۲۔ وَکُفْرًا۔۔ کفر کے مقاصد پورے ہوں۔

معلوم ہوا کہ نیک کاموں کا نیک ہونا مقصد اور نیت پر موقوف ہے ورنہ مسجد بنانے جیسا نیک کام بھی کفر کیلیئے ہو جاتا ہے۔

۳۔ وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمؤ منين۔۔۔ مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کیلیئے۔

کیونکہ قبا کی تمام آبادی ایک ہی مسجد میں نماز پڑھتی تھی۔ اب جب بالکل اس کے پاس دوسری مسجد بنے گی تو جماعت بٹ جائیگی اور جب ایک جماعت نہ رہی تو مسلمانوں کے باہمی اجتماع وتعارف کا وہ مقصد بھی فوت ہو گیا جو قیام جماعت کے اہم ترین مقاصد میں سے ہے۔

۴۔ وَاِرْصَـادًا لمن حارب الله ورسوله من قبل۔۔۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جن لوگوں نے جنگ کی ان کے لیئے ایک کمین گاہ اور ایک مرکز بنا دیا جائے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں قبیلہ خزرج کا ایک آدمی ابو عامر راہب تھا جو ظہور اسلام سے پہلے عیسائی ہو گیا تھا۔ جب پیغمبر اسلام مدینہ تشریف لائے تو کلمہ اسلام کا عروج اس پر شاق گذرا اور وہ اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو گیا۔ پہلے قریش مکہ کا ساتھ دیا پھر شہنشاہ قسطنطنیہ کے پاس پہنچا اور اسے مسلمانوں پر حملے کی ترغیب دی۔ قبا کے بعض منافقین کے ساتھ اس کے دیرینہ تعلقات تھے یہ انہیں اسلام کے خلاف اکساتا رہتا اور رومیوں کے حملے کا یقین دلاتا آیت میں " لمن حارب الله ورسوله من قبل " سے اسی کی طرف اشارہ ہے۔

امام ابن کثیر لکھتے ہیں کہ!

بدر کی لڑائی میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غالب رکھا تو ابو عامر پر یہ بات بہت شاق

گذری اور کھلم کھلا عداوت ظاہر کرنے لگا اور مدینہ سے بھاگ کر کفار مکہ اور مشرکین قریش سے جاملا اور انہیں نبی اکرم ﷺ سے جنگ کرنے پر اکسانے لگا اب عرب کے سارے قبیلے اکھٹے ہو گئے اور جنگ اُحد کیلیئے پیش قدمی کی۔ نتیجہ میں مسلمانوں کو ضرر پہنچا اس فاسق نے دونوں طرف کی صفوں کے درمیان کئی گڑھے کھود رکھے تھے۔ ان میں سے ایک میں نبی اکرم ﷺ گر پڑے آپ ﷺ کو معزرت پہنچی آپ ﷺ کا چہرہ زخمی ہو گیا نیچے کی طرف سے سامنے کے چار دانت ٹوٹ گئے اور سر مبارک بھی زخمی ہو گیا اسلام بڑھتا چلا جا رہا تھا تو وہ ملک روم ہرقل کے پاس گیا اس سے آپ ﷺ کے برخلاف مدد مانگی۔ اس نے اپنی امیدیں کامیاب ہوتی دیکھیں تو ہرقل کے پاس ٹھہر گیا اور اپنی قوم انصار میں سے ان لوگوں کو مدینہ بھیجا جو اہل نفاق تھے کہ لشکر لے کر آ رہا ہوں تم ایک مسجد بناؤ اور جس قدر بھی تم سے ممکن ہو اس میں ہتھیار اور سامان جنگ چھپائے رکھو میں قیصر روم کی طرف جا رہا ہوں ادھر سے لشکر لیکر آؤں گا اور محمد ﷺ اور ان کے اصحاب کو مدینے سے نکال دوں گا۔ (تفسیر ابن کثیر تحت الآیۃ)

ان تصریحات سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ مسجد ضرار بنانے والے دراصل وہی منافق تھے جو مسلح بغاوت اور مملکت اسلامیہ کے خلاف خروج کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے بظاہر ایک مسجد بنائی تھی۔ لیکن ان کا اصل مقصد اسلام کے خلاف اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے لیئے ایک مرکز، ایک کمین گاہ اور ایک پناہ گاہ بنانا تھا۔ جہاں ان کے اجتماعات منعقد ہو سکیں اور ابو عامر راہب کے گماشتے اور قاصد جو اس کے احکام اور پیغامات لے کر آتے تھے وہاں قیام اور مسلح جدوجہد کے لیئے اسلحہ اور سامان جنگ ذخیرہ کر سکیں۔ لہٰذا یہ مسجد خوارج (باغیوں) کا مرکز تھی جسے آپ ﷺ نے منہدم کرا کے اس میں آگ لگوا دی۔

خوارج سیدنا ابو بکر صدیقؓ کے عہد میں

آنحضرت ﷺ کی وفات حسرت آیات کے بعد ان خارجیوں کی سرگرمیاں مزید تیز ہو گئی تھیں۔ انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ نبی اور رسول کی شخصیت اوجھل ہو جانے کے بعد اسلامی تحریک کو ختم کر دینا آسان ہوگا۔ لیکن یہ غلط فہمی تھی کہ اسلام کا مدار کسی ایک شخصیت پر ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنی عظیم تربیت سے ایک ایسی ملت کی تشکیل فرما دی ہے۔ جو آپ کے بعد بھی اس تحریک کو ارتقاء سے ہمکنار کر سکتی ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد مدینہ منورہ، مکہ معظمہ، طائف اور مزید ایک آدھ

جگہ کے علاوہ باقی اہل عرب نے مرتدین، مدعیان نبوت اور مانعین زکوٰۃ کی صورت میں مملکت اسلامیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ ان سب گروہوں کے نظریات اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ لیکن خلافت اسلامیہ کو ختم کرنے کے لیئے یہ سب باہم متحد و متفق تھے۔ یہ اسلام کے لیئے نازک ترین لمحہ تھا۔ مؤرخین کے بقول "اسلام کی حالت اس بکری کی سی ہو گئی تھی جو موسم سرما کی بارش میں کھڑی بھیگ رہی ہو اور جسے سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ ملے"۔ یہ ملت اسلامیہ کی خوش نصیبی تھی کہ انہیں ایسے وقت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صورت میں کوہ آسا ہمت و حوصلہ کا مالک قائد میسر آ گیا۔

بہر حال یہ ایک زبردست خارجی (باغیانہ) تحریک تھی۔ جس کا مقصد اسلامی مملکت کا تختہ الٹنا ہی نہیں تھا بلکہ خود اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا تھا۔ عہد صدیقیؓ میں خلافت اسلامیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے دراصل خوارج تھے جو آگے چل کر مخصوص عقائد کی وجہ سے مستقل ایک فرقہ کی حیثیت اختیار کر گئے۔ لیکن ابتداء میں وہ منافقین جو حکومت کے خلاف مسلح خروج کرتے تھے وہی خوارج کہلاتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی بے مثال شجاعت، بصیرت، دوراندیشی اور فراست ایمانی کی بناء پر نہ صرف خوارج (باغیوں) کے اس زبردست فتنہ کو فرو کر دیا بلکہ ان کی سرپرستی کرنے والی ایرانی اور روم کی صدیوں پرانی مستحکم حکومتوں سے بھی نبرد آزمائی کی ابتدا کر دی جو یقیناً ایک بڑے ہی دل گردے کا کام تھا۔

خوارج سیدنا عمر فاروقؓ کے عہد میں

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ مقرر ہوئے ان کا دور خلافت بظاہر نہایت کامیاب رہا اور روز افزوں فتوحات و غنائم سے مسلمان ایک عظیم طاقت بنتے چلے گئے۔ ہر طرف خوش حالی اور فارغ البالی کا دور دورہ ہو گیا بظاہر خوارج نے ان کے عہد میں سر نہیں اٹھایا لیکن زیر زمین سازش اور ریشہ دوانیاں ان کے عہد میں بھی ہوتی رہیں۔ ابو العباس المبرد نے خوارج کے باب میں ایک حدیث کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے پاس ایک اعرابی آیا اور بولا میں نے حالت احرام میں ایک ہرن کو مار ڈالا ہے اب مجھے کیا کرنا چاہیئے اس مجلس میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ موجود تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا آپ جواب دیجئے۔ انہوں نے فرمایا ایک بکری ذبح کر دے حضرت عمرؓ نے یہی جواب اعرابی کو دیا تو وہ

بولا بخدا امیر المومنین کو مسئلہ معلوم نہ تھا جبھی تو دوسرے شخص سے دریافت کیا۔
حضرت عمر سمجھ گئے کہ یہ خارجی ہے اور درّہ سے اس کی خبر لی۔ (الکامل للمبرد صفحہ ۱۴۳ جلد ۲)

موطا امام محمد میں حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر کی یہ روایت موجود ہے کہ!
حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں اپنے سے زیادہ کسی شخص میں اس امر (خلافت) کی قوت و صلاحیت دیکھتا تو میرے لیے اپنی گردن کٹوا دینا اس منصب کو قبول کرنے سے زیادہ آسان ہوتا لہذا جو شخص میرے بعد اس منصب پر فائز ہوا سے دور یا نزدیک کے سب لوگ ہی اس منصب سے ہٹانے کی کوشش کریں گے اور مجھے بھی اپنے نفس کی طرف سے لوگوں سے نبرد آزما رہنا پڑا ہے۔ (موطا امام محمد باب النوادر صفحہ ۴۰۰)

حضرت عمرؓ کے اس بیان سے دو باتیں واضح ہیں اول یہ کہ حضرت عمرؓ منصب خلافت کے ہرگز خواہش مند نہیں تھے بلکہ انہوں نے اس منصب کو اس مجبوری سے قبول کیا تھا کہ ملت اسلامیہ میں اس وقت کے حالات کے پیش نظر کوئی زیادہ با صلاحیت اور قوی تر شخص موجود نہیں تھا۔ اگر حضرت عمرؓ اس منصب کو قبول نہ فرماتے تو مسلمانوں کو سخت مشکلات سے گذرنا پڑتا یہ ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف کرنے پر تمام اہل الرائے حضرات مجبور ہیں کہ حضرت عمرؓ کا ثانی آج تک پیدا نہیں ہوا اور ان کا انتخاب بالکل صائب اور صحیح تھا۔

دوسری بات حضرت عمرؓ نے یہ ارشاد فرمائی کہ اس کے باوجود انہیں بھی مخالفتوں اور مزاحمتوں کا سامنا رہا ہے اور انہیں بھی اپنے نفس کی طرف سے شورش پسندوں سے نبرد آزما رہنا پڑا ہے چنانچہ وہ اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو یہ انتباہ فرما رہے ہیں کہ دور اور نزدیک کے سب لوگ اس کو رد کرنے کی کوشش کریں گے لہذا اسے برابر چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔

صحیح بخاری کی ایک طویل روایت میں بھی سازشی عناصر کے اشارے ملتے ہیں جس کا ذکر زیر عنوان "شیعیت حضرت عمر فاروق کے عہد میں" میں آچکا ہے۔

(صحیح بخاری۔ کتاب الحدود باب رجم الحبلی من الزنا اذا احصنت)

منصوبہ یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کی موت کے بعد یکبارگی اپنی مرضی کے آدمی کی بیعت کر لی جائے حضرت صدیق اکبرؓ کی بیعت بھی یوں ہی یکبارگی ہو گئی تھی جسے امت نے بھی قبول کر لیا تھا اسی طرح اگر ہم بھی اپنی مرضی کے کسی شخص سے بیعت کر لیں گے تو امت اُسے بھی تسلیم کر

لے کی یہ سب "خوارج" تھے یعنی خلافت اسلامیہ کے مخالفین ہی تھے جو اس قسم کی منصوبہ بندی کر رہے تھے اور ان کی اس منصوبہ بندی سے فکر مند ہو کر صحابہ کرامؓ نے حضرت عمرؓ سے یہ درخواست کر دی کہ اُمت کو کسی نئے فتنے میں مبتلا ہونے سے بچانے کیلئے اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کا اعلان کر دیں اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کر دی جو باہمی مشاورت سے نئے خلیفہ کے تقرر کا اعلان کریگی۔

دوسری طرف خوارج اپنی اسکیم کو روبہ عمل لانے کیلئے حضرت عمرؓ کی طبعی موت کا انتظار بھی نہ کر سکے اور انہوں نے (یعنی ابولؤلؤ فیروز، ہرمزان، جفینہ اور کعب الاحبار نے) حضرت عمرؓ کے قتل کی سازش تیار کی۔ اس اسکیم میں خوارج، رومی، ایرانی، یمنی، یہودی اور منافقین شریک ہیں۔

خوارج سیدنا عثمان ذوالنورینؓ کے عہد میں

حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی جس سے خوارج کا منصوبہ بری طرح ناکام ہو گیا لیکن انہوں نے اپنا سازشی کردار برابر جاری رکھا اور انہیں اپنی اسکیم و بروئے کار لانے میں بارہ سال کا عرصہ لگ گیا البتہ اس مرتبہ وہ اپنے پروگرام میں کامیاب ہو گئے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ!

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس ایک شخص آیا اور تین سوالات کئے ۱۔ کیا عثمان غزوہ بدر میں نہ تھے؟ ۲۔ کیا انہوں نے غزوہ احد میں فرار اختیار نہیں کیا تھا؟ ۳۔ کیا انہوں نے صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی؟ عبداللہ بن عمرؓ اس شخص کے ہر سوال پر "ہاں ہاں" کرتے رہے اور پھر ہر ایک کی وجہ بیان فرمائی۔ (صحیح بخاری، باب مناقب عثمان)

محدثین لکھتے ہیں کہ یہ شخص خارجی تھا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت کا ہنگامہ اچانک نہیں ہوا بلکہ معاشرہ میں شروع سے ایسے لوگ تھے جو خارجی ذہنیت رکھنے کے باعث حضرت عثمانؓ کی خلافت کے منکر اور ان کے دشمن تھے۔ اسلام کیلئے یہ لوگ کس درجہ خطرناک تھے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت علیؓ پر قاتلانہ حملہ کرنے کے بعد جب ابن ملجم پکڑا گیا اور اس سے پوچھا گیا کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی تھی؟ تو اس نے جواب دیا میں نے خانہ کعبہ کے

حطیم میں بیٹھ کر قسم کھائی تھی کہ میں "شرالناس" یعنی علیؑ اور معاویہ کو قتل کروں گا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والوں میں ایک بڑی تعداد خوارج کی بھی تھی۔ ابن جریر طبری اور حافظ ابن کثیر دونوں نے اس کا ذکر کیا ہے بلکہ ابن کثیر نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ دو ہزار خارجی تھے جو برسر جنگ تھے۔ (البدایہ والنھایہ صفحہ ۱۸۰ جلد ۷)

پیچھے یہ بتایا جا چکا ہے کہ خوارج دراصل وہ منافقین تھے جو بظاہر مسلمان ہو گئے تھے لیکن در پردہ وہ اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ان میں یہودیوں، مجوسیوں اور رومیوں کے علاوہ کچھ عرب بھی تھے اور عربوں میں اکثریت قبیلہ بنو تمیم کی تھی۔ اسی قبیلے کے ایک شخص عبداللہ بن ذی الخویصرہ تمیمی نے نبی اکرم ﷺ پر اموال غنیمت کی تقسیم میں انصاف نہ فرمانے کا الزام بھی عائد کیا تھا۔

خوارج علی المرتضٰیؑ کے عہد میں

حضرت علیؑ کے عہد میں خوارج کا ظہور ایک فرقہ کی حیثیت سے اگرچہ واقعہ تحکیم کے بعد ہوا لیکن یہ وہی لوگ تھے جو سابقہ ادوار میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیاں کرتے چلے آرہے تھے۔ چنانچہ حضرت علیؑ کے عہد میں جنگ صفین کے بعد جو خوارج سامنے آئے ان میں بھی قبیلہ تمیم کے افراد کی اکثریت تھی۔

پروفیسر احمد امین مصری خوارج کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ!

باہمی بحث و تردد کے بعد حضرت علیؑ نے تحکیم کو قبول کر لیا اور حضرت معاویہؓ نے اپنی نمائندگی کے لیے حضرت عمرو بن العاصؓ کو اور اصحاب علیؑ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو منتخب کیا اس وقت حضرت علیؑ کے لشکر میں سے ایک جماعت ظاہر ہوئی جن کی اکثریت قبیلہ بنو تمیم سے تھی ان کی رائے یہ تھی کہ تحکیم غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم اس معاملہ میں بالکل واضح اور ظاہر ہے۔

(فجر الاسلام صفحہ ۲۵۶)

موصوف ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ!

شروع میں حضرت عمرؓ کی فتوحات کے بعد جن لوگوں نے خارجی مذہب کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالا وہ بصرہ اور کوفہ کے رہنے والے تھے اور ان میں سے اکثر پر بدوی پن غالب تھا اور ان میں سے زیادہ تر بنو تمیم کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے پھر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض موالی (ایرانی

اور رومی آزاد کردہ غلام) بھی ان کے عقیدے میں داخل ہو گئے اور غالباً ان کے داخلے کا سبب خوارج کے ساتھ بنوامیہ سے بغض میں اشتراک تھا اور بنوامیہ کے خلافت کے حق دار نہ ہونے کا اعتقاد تھا اور یہ عقیدہ بھی کہ جب تک ان کی حکومت بالکلیہ ختم نہ ہو جائے ان کے خلاف خروج واجب ہے۔ (ضحیٰ الاسلام صفحہ ۳۳۶ جلد ۳)

پروفیسر احمد امین مصری نے ایرانی اور رومی غلاموں کے متعلق وضاحت کی ہے کہ وہ بنو امیہ کے ساتھ بغض وعناد کی بناء پر خوارج کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ موصوف کا یہ تجزیہ اپنی جگہ درست ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ بعض موالی نے صدق دل سے خارجی عقائد قبول کر لیے تھے۔ بلکہ خارجیت کو عجمی افکار میں رنگ دیا تھا۔

چنانچہ لاء کالج قاہرہ کے پروفیسر شیخ محمد ابوزہرہ لکھتے ہیں کہ!

اگر چہ خوارج میں موالی کی تعداد بہت کم تھی بعض خارجی فرقوں میں اس کا اثر موجود تھا۔ چنانچہ یزیدیہ کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک رسول اہل عجم میں بھیجے گا جس پر کتاب نازل کرے گا جو شریعت محمدیہ کو منسوخ کر دے گی۔ بلاشبہ اس رائے پر فارسیت کا اثر نمایاں ہے۔ کیونکہ اہل فارس ہی اپنی قوم میں کسی نبی کے ظہور پزیر ہونے کے متمنی تھے۔ یزیدیہ خارجیوں کا ایک فرقہ ہے جو یزید بن انیسہ خارجی کا پیرو ہے ان کے یہ خیالات اس وجہ سے ہو گئے تھے کہ وہ جب وطن چھوڑ کر سیستان چلے آئے تو ایرانیوں کے خیالات سے متاثر ہو گئے۔ فرقہ میمونیہ جو میمون عجردی خارجی کے پیروکار تھے کے نزدیک اولاد سے نکاح جائز تھا اور بھائی بہنوں کی اولاد سے بھی شادی کر لینا مباح تھا۔ یہ سراسر کفری عقائد ہیں اور فارسی افکار کا اثر قبول کرنے کی غمازی کرتے ہیں۔ کیونکہ مجوسِ فارس ہی اس قسم کی شادیوں کو جائز تصور کرتے تھے۔ (اسلامی مذاہب صفحہ ۱۰۹)

بہرحال خوارج میں ایرانی اور رومی موالی کے علاوہ بصرہ اور کوفہ کے دیہاتی لوگ بھی شامل تھے جن کا تعلق قبیلہ بنوتمیم سے تھا۔ عرب قبائل کے دوسرے لوگ بھی ان کے ساتھ شامل تھے لیکن اکثریت بنوتمیم ہی کی تھی۔ جنگ جمل میں بھی حضرت عائشہؓ کے مخالف لشکر میں بنوتمیم کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ ملتا ہے حضرت علیؓ کی فوج میں اس قبیلے کے لوگ اس کثرت سے شامل تھے کہ صرف ایک قبیلے کے مقتولین کی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ تھی۔

یعنی ایک طرف عہد صدیقیؓ میں فتنہ ارتداد میں بنوتمیم پیش پیش تھے پھر قاتلین عثمانؓ

میں بنو تمیم کی اکثریت تھی اسی نیئے جنگ جمل کے موقع پر قصاص عثمان کا علم بلند کرنے والوں کے مقابلے کیلئے حضرت علیؓ کے لشکر میں اسی قبیلہ کی اتنی تعداد تھی کہ انکے پانچ سو آدمی کام آئے۔ دوسری طرف تحکیم کے بعد حضرت علیؓ کے خلاف احتجاج کر کے ان سے الگ ہو جانے والوں میں بھی اکثریت اسی قبیلے کے لوگوں کی تھی پھر کربلا کے مقام پر حضرت حسینؓ سے جنگ کرنے والوں میں بھی یہی بنو تمیم کے لوگ پیش پیش تھے

جناب عمر کحالہ لکھتے ہیں کہ!

وتعد تميم من القبائل التي قاتلت الحسين و شيعته فجاءت بسبعة عشر رأسا منهم {معجم قبائل العرب ص ۱۳۱ مطبوعہ دار العلم للملایین بیروت}

اور بنو تمیم کا شمار ان قبائل میں کیا جاتا ہے جنہوں نے حضرت حسینؓ اور ان کے شیعوں سے جنگ کی۔ چنانچہ جنگ کے بعد بنو تمیم قبیلے کے افراد حسینی قافلے کے سترہ سر لائے۔

قبائل کے علاوہ نمایاں شخصیتوں کو دیکھا جائے تو وہاں بھی یہی صورت نظر آتی ہے کہ جو ارتداد میں پیش پیش تھے وہی حضرت فاروق اعظمؓ کی شہادت نیز حضرت عثمانؓ اور حضرت حسینؓ کی شہادت میں بھی آگے نظر آتے ہیں مثلاً قاتلین حسینؓ میں ایک شخصیت شبث بن ربعی بہت مشہور ہے اس کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ!

كان مؤذن سجاح التي ادعت النبوة ثم راجع الاسلام ۔ كان من اصحاب علیؓ ثم صار مع الخوارج ثم تاب ثم كان فيمن قاتل الحسين ۔ كان اول من اعان على قتل عثمانؓ۔ {الاصابہ مع الاستیعاب صفحہ ۱۶۳ جلد ۲}

شبث بن ربعی سجاح جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ کا موذن تھا۔ پھر اسلام کی طرف رجوع کیا وہ حضرت علیؓ کے شیعوں میں سے تھا پھر خوارج کے ساتھ ہو گیا پھر اس نے توبہ کی پھر ان لوگوں میں شامل ہو گیا جنہوں نے حضرت حسینؓ کے ساتھ جنگ کی یہ پہلا شخص تھا جس نے حضرت عثمانؓ کے قتل میں خارجیوں (باغیوں) کی امداد کی۔

بہر حال یہ سب خوارج کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں جنہوں نے حکومت وقت کے خلاف وقتاً فوقتاً علم بغاوت بلند کیا سربراہان مملکت کو قتل و شہید کیا اور ان کی حکومتوں کو اُلٹا۔ اس تفصیل نے یہ واضح ہو گیا ہے کہ فرقہ خوارج بنیادی طور پر شیعیت ہی کی ایک شاخ

ہے۔ یہ دونوں اسلام اور مسلمانوں کو ضرر پہنچانے کے ایک نکاتی فارمولے پر باہم متحد و متفق تھے۔ دونوں نے یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں کی زیر قیادت عہد نبویؐ اور عہد خلفائے ثلاثہؓ میں اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے کی بھرپور کوشش کی پھر عہد مرتضویؓ میں دونوں نے اپنے مخصوص مفادات کے تحت لشکر علیؓ میں شمولیت اختیار کرلی۔

لیکن واقعہ تحکیم کے بعد ایک دوسرے سے بظاہر الگ ہو گئے مگر اس کے باوجود سیاسی و مذہبی مشن (یعنی خلافت اسلامیہ میں عدم استحکام، مسلم سربراہوں کا تختہ الٹنا اور اسلام کے بالمقابل ایک متوازی اسلام پیش کرنا) دونوں کا ایک ہی رہا۔

اہل تشیع اپنے آپ کو "شیعان علیؓ" کہلاتے ہیں اور اپنا وجود عہد نبوت ﷺ سے ثابت کرتے ہیں ان کے وجود کے متعلق سیر حاصل بحث تفصیل کے ساتھ پیچھے گذر چکی ہے کہ عہد نبوت ﷺ سے عہد مرتضویؓ تک یہ لوگ مختلف بھیسوں میں اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے زریعے اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے کے لیئے مسلسل سرگرم عمل رہے جس میں انہوں نے حضرت علیؓ کے دور میں داخلی انتشار و خلفشار اور خانہ جنگی کے ذریعے قدرے کامیابی حاصل کی لیکن حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ صلح کر کے اس عارضی فتح کو ناکام بنانے کی بنیاد رکھ دی پھر ان کے جانشین حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو کر اسے بدترین شکست سے دوچار کر دیا۔

اہل تشیع کا یہ دعویٰ کہ وہ "شیعان علیؓ" ہیں سو یہ بھی باطل ہے کیونکہ "شیعان علیؓ" کا معنی ہے کہ حضرت علیؓ کی پیروی اور اتباع کرنے والے لوگ جبکہ شیعہ عقائد اور شیعہ مذہب کا حضرت علیؓ کے عقائد و مذہب کے ساتھ ہرگز کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ انہوں نے ابن سبا کے زیر قیادت آں محترمؓ کے عقائد و مذہب کے مقابلے میں بالکل نئے عقائد اور نیا مذہب ایجاد کیا ہے۔ جس کا ذکر آگے ایک مستقل عنوان کے تحت آرہا ہے۔

اب تک "شیعان علیؓ" کے دو گروہوں کا ذکر ہوا ہے ایک خوارج کا جس نے العیاذ باللہ حضرت علیؓ کو مرتد قرار دے کر واجب القتل ٹھہرا لیا اور دوسرا گروہ سبائیہ کا تھا جس نے دین اسلام کو مسخ کیا اور حضرت علیؓ نے اس سے برأت کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا۔

میری خواہش و تمنا یہ ہے کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان جدائی ڈال دیں میری

خواہش یہ ہے کہ معاویہ میرے ساتھ اس طرح تبادلہ کر لیں کہ تمہارے دس آدمی لے لیں اور مجھے ان کے بدلے میں ایک شامی عطا کر دیں۔ اے اللہ میں ان سے طول اور تنگ دل ہوں اور وہ مجھ سے تنگ دل ہیں پس مجھے ان کے بدلے اچھے رفقا عطا فرما۔ اے اللہ ان کے دلوں کو اس طرح گھول دے جس طرح نمک پانی میں گھل جاتا ہے۔ تمہارے ہاتھ خاک آلودہ ہو جائیں۔

(نہج البلاغہ صفحہ ۱۳۶، ۱۴۰ ج ۱)

شیعیت سیدنا حسن مجتبیٰؓ کے عہد میں

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت حسنؓ مسند آرائے خلافت ہوئے۔ آپ بڑے عبادت گذار رحم دل صاحب الرائے اور خون ریزی سے اجتناب کرنے والے بزرگ تھے

امام بخاری حضرت ابوبکرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ!

میں نے نبی اکرم ﷺ کو مسجد نبوی کے منبر پر اس حال میں دیکھا کہ آپ ﷺ کے پہلو میں حضرت حسنؓ بیٹھے ہوئے تھے آپ ﷺ کبھی لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور کبھی ان کی طرف پھر فرمایا۔ انّ ابنی هذا سید لعلّ الله ان یصلح به بین فئتین عظیمتین من المسلمین" یعنی میرا یہ نواسہ سید ہے اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرا دے گا۔ (صحیح بخاری۔ کتاب الصلح باب قول النبی ﷺ للحسن بن علیؓ ابنی هذا سید)

حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ سے مصالحت کر لی تھی جس پر امت مسلمہ نے سکھ و اطمینان کا سانس لیا مگر یہ مصالحت شیعوں (قاتلین عثمانؓ) کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ شیعان علیؓ کا ایک گروہ خوارج کے نام سے الگ ہو گیا تھا لیکن دوسرا سبائی گروہ منافقانہ طور پر حضرت حسنؓ کے ساتھ چمٹا رہا ان ہی فتنہ پردازوں نے ایک اور صفین برپا کرنے کا منصوبہ بنایا حضرت حسنؓ حضرت معاویہؓ کے خلاف لشکر لے کر نکلے تو راستے میں افواہ اڑی کہ حضرت حسنؓ کے لشکر کے ہراول دستے کو شکست ہو گئی ہے اور قیس بن عبادہ امیر لشکر قتل ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ "شیعہ" خود حضرت حسنؓ کی جان کے درپے ہو گئے۔ انہوں نے اعلانیہ اپنے امام سے بغاوت کر کے ان پر حملہ کر دیا، چادر اتار لی، مصلّٰی کھینچ لیا اور جراح بن قبیصہ نے ران مبارک کو زخمی کر دیا حضرت حسنؓ اسی زخمی حالت میں مدائن کے قصر ابیض میں مقیم ہو گئے۔ شیعہ لیڈر مختار بن ابی عبید ثقفی نے اپنے چچا سعد بن مسعود (گورنر مدائن) سے کہا۔ کیا تم کو دولت و عزت حاصل کرنے کا راستہ بتاؤں؟؟ اس نے کہا کیا

مطلب؟ کہا حسنؓ کو پکڑو اور قید کر کے معاویہؓ کے پاس بھیج دو۔ سعد بن مسعود نے کہا کہ خدا تجھے غارت کرے کیا میں نواسہ رسول ﷺ سے دھوکہ بازی کروں۔ (البدایۃ والنہایۃ صفحہ ۱۳ جلد ۸)

حضرت حسنؓ اپنے شیعوں سے بیزار اور مایوس ہو گئے اور ان پر بالکل اعتماد نہ رہا اور حق یہ ہے کہ یہ لوگ اعتماد کے قابل ہی نہ تھے کیونکہ یہ لوگ بار بار زبان سے وفادار اور عمل سے بے وفا ثابت ہو چکے۔ نیز جلد ہی حضرت حسنؓ پر ان کی سازش اور ان کے اصلی مقاصد کھل گئے۔ لہٰذا آپؓ نے اپنا تاریخی رول ادا کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا اور معقول و مناسب شرائط طے کر کے حضرت معاویہؓ کے حق میں رضا کارانہ اور برضا و رغبت خلافت سے ربیع الاول ۴۱ھ میں دست بردار ہو کر ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ تاریخ اسلام میں صلح و جنگ کے بہت سے واقعات ہیں۔ لیکن یہ صلح بڑی تاریخی، یادگار اور بہت ہی اہم تھی جس کی پیشن گوئی اللہ کے رسول ﷺ نے دی تھی اور حضرت حسنؓ کی سعادت اور خوش بختی کہ اس کی تکمیل کا شرف انہیں حاصل ہوا۔

حضرت حسنؓ کا یہ کارنامہ یقیناً لائق صد آفرین و صد تحسین ہے جنہوں نے بالکل صحیح سوچا کہ خلیفہ ہاشمی ہو یا اموی، عربی ہو یا عجمی، گورا ہو یا کالا، اس کو کوئی اہمیت حاصل نہیں اصل مقصد ملت اسلامیہ کا اتحاد، قیام امن، خلافت کا استحکام اور اشاعت و تحفظ اسلام ہے۔ آپؓ کے اس اقدام سے اب سارے مسلمان ایک خلیفہ اور ایک ہی مرکز کے تحت دوبارہ اکٹھے ہو گئے اس لئے اس سال کا نام ہی "عام الجماعۃ" رکھا گیا یعنی وہ سال جس میں شیعوں کا پیدا کردہ تشتت و افتراق ختم ہوا بچھڑے ہوئے گلے ملے۔ جہاد کا ملتوی شدہ فریضہ از سر نو شروع ہوا۔

لیکن دوسری طرف یہ صلح شیعوں کے لئے پیغام موت تھی اس عظیم الشان صلح سے یہودیوں، مجوسیوں، منافقوں، تفرقہ بازوں، ابن ابی اور ابن سبا کے تربیت یافتہ مفسدوں کی امیدوں پر اوس پڑ گئی جو امت مسلمہ میں انتشار و خلفشار باقی رکھنے اور حضرت حسنؓ کو محض نام کا خلیفہ بنا کر دولت اور اقتدار پر قابض رہنے کے خواہش مند تھے۔ ان شیعوں نے اپنے امام پر حملوں کے علاوہ ان کی شدید ترین توہین و تحقیر بھی کی۔ ان کی شان میں گستاخانہ کلمات کہے۔ انہیں مسود وجوہ المسلمین مذل المومنین اور عار المومنین کے خطابات سے نوازا۔

امام ابن کثیر لکھتے ہیں کہ

جب حضرت معاویہؓ کی حکومت قائم ہو گئی اسی سال حضرت حسنؓ اپنے بھائی حضرت

حسینؓ اور دیگر افراد خاندان کے ساتھ واپس مدینہ منورہ آ گئے حضرت حسنؓ جب بھی ان محلوں سے گذرتے جوان کے "شیعوں" کے تھے تو وہ ان پر ملامت آمیز جملے کہتے کہ آپ کیوں حضرت معاویہؓ کے حق میں دستبردار ہوئے یہ ملامت کا سلسلہ عرصہ کے بعد پھر شروع ہوا اور آج تک بہت سے دلوں اور دماغوں میں یہ کھٹک ہے لیکن حق یہ ہے کہ ان (حضرت حسنؓ) کا یہ طرز عمل قابل قدر اور جن کو ان حالات کا سامنا کرنا پڑے۔ ان کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے وہ بلاشبہ تعریف کے مستحق تھے اور ہیں کہ امت کو خون ریزی سے بچا لیا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے پیشن گوئی فرمائی تھی۔ (البدایہ والنہایہ صفحہ ۱۹ جلد ۸)

اس طرح حضرت حسنؓ اپنے مخلص رفقاء کے ہمراہ حضرت معاویہؓ کے گروہ میں شامل ہو گئے جبکہ آپ کے اس اقدام کی مخالفت کرنے والے شیعہ خلافت اسلامیہ اور اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف ہو گئے۔

شیعیت سیدنا معاویہؓ بن ابی سفیانؓ کے عہد میں

حضرت حسنؓ کی دست برداری اور بیعت کے بعد حضرت معاویہؓ عالم اسلام کے متفقہ خلیفہ مقرر ہو گئے۔ تمام صحابہؓ و تابعینؒ نے برضا و رغبت ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی اس طرح امت مسلمہ کی خانہ جنگی اور انتشار و خلفشار کا دور ختم ہو کر امن و سلامتی میں تبدیل ہو گیا ملت اسلامیہ نے سکھ اور سکون کا سانس لیا اور اس بات کی خوشی منائی گئی کہ اب اسلامی سلطنت کا ہر مسلمان ایک اللہ، ایک رسول ﷺ ایک کتاب، ایک کعبہ، ایک دارالخلافہ اور ایک ہی خلیفہ کے دامن سے وابستہ ہے۔ جب حضرت معاویہؓ نے زمام خلافت سنبھالی تو اس وقت عالم اسلام تین گروہوں میں تقسیم تھا۔

پہلا گروہ شیعوں (سبائیوں) کا تھا۔ چونکہ حضرت معاویہؓ کا تعلق خاندان بنو امیہ کے ساتھ تھا۔ اس لئے شیعوں (یہودیوں، مجوسیوں، ایرانیوں) کی سازشوں کا رخ بھی اسی خاندان کی طرف پھر گیا مگر حضرت حسنؓ کی دست برداری اور بیعت کے بعد ان کی ہمت پست ہو گئی اور وہ حضرت امیر معاویہؓ کے سامنے سر نہ اٹھا سکے لہذا انہوں نے زیرزمین اپنی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔
دوسرا گروہ (حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ کے گروہ پر مشتمل) مخلص مسلمانوں کا تھا جنہوں نے حضرت معاویہؓ کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت کر لی تھی۔

تیسرا گروہ شیعوں کی دوسری شاخ خوارج کا تھا۔ یہ لوگ حضرت علیؓ، حضرت معاویہ اور ان کے متبعین کو گمراہ اور کافر یقین کر کے ان کے مقابلے میں ہر قسم کی قوت و شدت کام میں لاتے تھے۔ نیز منافق اور سازشی لوگ (شیعہ) بھی ان میں ملے جلے رہتے تھے۔ حضرت معاویہؓ کے سریر آرائے خلافت ہوتے ہی اسلام دشمن قوتوں نے سر اٹھایا اور کئی طرح کے فتنوں اور شورشوں کا آغاز ہو گیا مگر حضرت معاویہؓ نے تمام اندرونی اور بیرونی بغاوتوں، شورشوں اور سازشوں کا قلع قمع کر کے مکمل امن و سکون قائم کر دیا۔ توسیع انقلاب کا جو عمل اندرونی سازشوں اور فتنہ و فساد کے نتیجے میں بالکل رک گیا تھا۔ پھر سے اس کا آغاز ہوا اور اسلامی حکومت کا رقبہ ۶۵ لاکھ مربع میل تک بڑھ گیا۔

بہر حال یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت معاویہؓ کے پورے بیس سالہ (۴۱ھ تا ۶۰ھ) دور میں شیعہ اپنے اسلام دشمن منصوبے کو بروئے کار لانے میں بری طرح ناکام رہے۔ جس کا اعتراف دنیائے شیعیت کے عظیم سکالر علامہ سید محمد طباطبائی بالفاظ ذیل کرتے ہیں۔

شیعوں کے لئے سب سے مشکل زمانہ: شیعہ افراد اور شیعہ مذہب کے لئے تاریخ میں سب سے مشکل حالات معاویہ کی بیس سالہ حکومت کے دوران تھے۔ جس وقت شیعوں کے لئے کسی قسم کا امن و چین موجود نہ تھا۔ اسی دوران میں اکثر شیعہ حضرات معروف اور مشہور ہو چکے تھے۔ ادھر شیعوں کے دو امام (امام دوم امام سوم) معاویہ کے زمانے میں حالات کو بہتر بنانے اور خلافت کو لوٹانے میں بے بس اور بے اختیار تھے حتیٰ کہ شیعوں کے تیسرے امام (امام حسینؑ) یزید کی سلطنت کے پہلے چھ مہینوں کے دوران ہی اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ اپنے دوستوں اور اصحاب و اولاد کے ساتھ یزید کی مخالفت کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ امیر معاویہؓ کی آخری دس سالہ خلافت کے دوران اس کام کا امکان بھی نہ تھا کہ خلافت پھر دوبارہ اہل بیت کو واپس مل جائے۔" {شیعہ صفحہ ۴۳}

موصوف کی یہ بات تو درست ہے کہ حضرت معاویہؓ کا دور خلافت شیعوں کے لئے سب سے مشکل زمانہ ثابت ہوا کیونکہ وہ دوبارہ امت مسلمہ میں کوئی خانہ جنگی اور داخلی انتشار و خلفشار پیدا نہیں کر سکے۔ لیکن ان کی یہ بات تاریخ کا ایک عظیم جھوٹ ہے کہ امام دوم اور سوم خلافت کو لوٹانے میں بے بس اور بے اختیار تھے اگر وہ خلافت کے خواہش مند ہوتے تو پھر اسے حضرت معاویہؓ کے حوالے ہی کیوں کرتے؟

شیعہ مجتہد محمد بن عمر کشی لکھتے ہیں کہ!

پس انہوں نے کہا اے حسنؓ اٹھیے اور بیعت کیجئے۔ یہ سن کر حضرت حسنؓ اٹھے اور معاویہؓ کی بیعت کر لی۔ پھر یہی بات حضرت حسینؓ سے کہی۔ چنانچہ یہ بھی اٹھے اور بیعت کر لی۔ (رجال کشی تحت تذکرہ قیس بن سعد صفحہ ۱۰۲)

شیعہ کی مستند و معتبر کتاب رجال کشی سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ حضرات حسنینؓ نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ صرف صلح ہی نہیں کی بلکہ ان کے ہاتھ پر بیعت خلافت بھی کی۔

حضرت معاویہؓ کے پورے دور خلافت میں حضرات حسنینؓ نے امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کی۔ ان کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار رہے۔

امام ابن کثیر لکھتے ہیں کہ

جب حضرت معاویہؓ کی خلافت قائم ہو گئی تو حضرت حسینؓ اپنے بھائی حضرت حسنؓ کے ساتھ ان کے پاس تشریف لے جاتے تو وہ ان دونوں کی بہت زیادہ تکریم کرتے نہایت خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرتے اور گراں قدر عطیات سے انہیں نوازتے اور بعض اوقات ایک دن میں دو دو لاکھ درہم بھی پیش کر دیتے تھے۔ (البدایۃ و النہایۃ صفحہ ۱۵۱ جلد ۸)

حضرت حسنؓ کی وفات (۵۰ھ) کے بعد بھی حضرت حسینؓ ہر سال ملاقات کے لئے شام تشریف لے جاتے رہے اور حضرت معاویہؓ کی طرف سے داد و دہش کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

حضرت شیخ علی ہجویریؒ لکھتے ہیں کہ

ایک دن حضرت حسینؓ کے پاس ایک سائل آیا اور درخواست کی کہ میں ایک فقیر ہوں اور کثیر العیال ہوں آپ مجھے آج کا کھانا عنایت فرمائیں۔ حضرت حسینؓ نے فرمایا آپ ذرا انتظار کریں ہمارا وظیفہ پہنچنے والا ہے۔ تو آپ کو دے دیں گے۔ کچھ زیادہ دیر نہ ہوئی کہ حضرت معاویہؓ کی طرف سے پانچ عدد تھیلیاں (جن میں ایک ایک ہزار دینار تھے) پہنچ گئیں اور پہنچانے والے نے یہ پیغام دیا کہ حضرت معاویہؓ معذرت کرتے تھے کہ یہ قلیل سی مقدار ہے آپ صرف فرمادیں حضرت حسینؓ نے وہ تھیلیاں سائل کو دے دیں اور معذرت بھی کی۔ (کشف المحجوب صفحہ ۹۲)

نہج البلاغہ کے شارح ابن ابی الحدید نے لکھا ہے کہ!

معاویہؓ دنیا میں پہلے شخص تھے جنہوں نے دس دس لاکھ درہم عطا کئے اور ان کے فرزند

پہلے شخص ہیں۔ جنہوں نے اسے دوگنا کر دیا۔ یہ عطایا حضرت علیؓ کے دونوں بیٹوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو ہر سال عطا ہوتے تھے۔ (شرح ابن ابی الحدید جلد دوم)

یہی نہیں بلکہ حضرت حسینؓ نے غزوہ قسطنطنیہ (جس کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے بشارت دی تھی کہ میری امت کا پہلا لشکر جو قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوگا اس کی مغفرت مقدر ہو چکی ہے صحیح بخاری کتاب الجہاد باب ما قیل فی قتال الروم) میں بھی ایک سپاہی اور ایک مجاہد کی حیثیت سے شرکت فرمائی یہ ملحوظ رہے کہ اس "مغفور لھم" لشکر کے امیر و قائد حضرت معاویہؓ کے فرزند امیر یزیدؒ تھے۔

حضرت معاویہؓ کے دور میں شیعہ حضرات حسنینؓ کو ان کی بیعت توڑنے پر اکساتے رہے لیکن دونوں بھائی اپنے موقف پر جرأت و بہادری کے ساتھ قائم رہے۔ حضرت حسنؓ کی وفات کے بعد ایک دفعہ پھر کوفیوں نے حضرت حسینؓ کو بیعت توڑنے پر اکسایا جب یہ بات حضرت معاویہؓ تک پہنچی تو انہوں نے وضاحت طلب کی حضرت حسینؓ نے جواب دیا کہ مجھے آپ کا خط ملا میرے بھائی حضرت حسنؓ نے آپ سے جو معاہدہ کیا تھا اللہ کی پناہ میں اس کو نہیں توڑوں گا جو باتیں آپ تک پہنچیں وہ چغلخوروں، غیبت کرنے والوں اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے والوں نے کیں۔ (مقتل ابی مخنف)

شیعہ مورخ ابو حنیفہ دینوری لکھتا ہے کہ!

جب حضرت حسینؓ کو نقض بیعت پر آمادہ کیا گیا تو انہوں نے فرمایا "انا قد بایعنا وعاھدنا ولا سبیل الی نقض بیعتنا" (اخبار الطوال) یقیناً ہم بیعت اور معاہدہ کر چکے ہیں اور بیعت توڑنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

حضرت حسینؓ نے دور معاویہؓ میں اپنا یہ عہد خوب نبھایا یہاں تک کہ حضرت معاویہؓ ۲۲ رجب ۶۰ھ میں وفات پا کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

شیعیت سیدنا حسینؓ بن علیؓ کے عہد میں

حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد ان کے لڑکے امیر یزیدؒ کے ہاتھ پر بیعت خلافت ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت حسینؓ نے ان کی خلافت کو قبول کرنے سے انکار کیا اور مکہ تشریف لے آئے اس دوران شیعوں (کوفیوں) کی طرف سے حضرت حسینؓ کے پاس

کثرت سے وفود اور خطوط آئے جن میں ان کو دعوت دی گئی کہ کوفہ تشریف لے آئیں۔ شیعوں نے حضرت حسینؓ کو ڈیڑھ سو کے قریب خطوط لکھے جن میں انہوں نے لکھا تھا کہ آپ کے ساتھ ایک لاکھ آدمی ہیں۔ ان خطوط میں ان سے جلد آنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ شیعہ ہر خط میں اصرار کرتے اور ان کو دعوت دیتے کہ وہ آ کر یزید بن معاویہؓ کی جگہ بیعت لیں۔ حضرت حسینؓ نے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیلؓ کو صحیح صورت حال معلوم کرنے کے لئے کوفہ بھیجا حضرت مسلم کوفہ آئے تو شیعوں نے حضرت حسینؓ کی امارت پر بیعت کی اور قسم کھائی کہ وہ اپنی جان و مال سے مدد کریں گے۔ ان کی بیعت پر بارہ ہزار اور پھر بڑھ کر اٹھارہ ہزار جمع ہو گئے۔ تو مسلم بن عقیلؓ نے حضرت حسینؓ کو کوفہ تشریف لانے کی دعوت دے دی کہ ان کے لئے بیعت کی راہ ہموار ہے۔

اس کے بعد مسلم بن عقیلؓ نے ہزاروں شیعوں کے ساتھ مل کر قصر امارت کا محاصرہ کیا تو امرائے قبائل نے (جو عبیداللہ بن زیاد کے ساتھ قصر امارت میں تھے) اپنے اپنے قبیلے کے افراد کو (جو مسلمؒ کے ساتھ تھے) حکم دیا کہ مسلم کو چھوڑ کر چلے جائیں تو شیعوں نے بھاگنا شروع کر دیا یہاں تک کہ مغرب کی نماز کے بعد مسلم تنہا رہ گئے اور انہیں کوئی راستہ تک بتانے والا نہیں تھا۔ جب مسلمؓ گرفتار ہو گئے تو انہوں نے محمد بن الاشعث سے کہا کہ ان کی طرف سے حضرت حسینؓ کو یہ پیغام بھجوا دیں کہ

اپنے اہل خاندان کے ساتھ واپس جایئے۔ شیعوں (کوفیوں) کے دھوکہ میں نہ آیئے کیونکہ یہ آپ کے والد ماجد کے وہی ساتھی ہیں جن سے وہ اپنی موت یا شہادت کے ذریعے جدائی چاہتے تھے۔

دوسری طرف حضرت حسینؓ کو جب مسلمؓ کی طرف سے کوفہ آنے کی دعوت ملی تو انہوں نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت حسینؓ کو اس سفر سے منع کیا اور کہا کہ شیعہ (کوفی) دھوکے باز لوگ ہیں ان سے دھوکہ نہ کھایئے اسی شہر میں قیام کریں تا آنکہ کوفی اپنے دشمن کو وہاں سے نکال دیں پھر وہاں تشریف لے جائیں۔ حضرت حسینؓ نے کہا اب تو میں نکلنے کا عزم کر چکا ہوں۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ اگر آپ ہر حال میں وہاں جانا طے کر چکے ہیں تو بچوں اور عورتوں کو ہرگز ساتھ نہ لے جائیں کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ کو اس طرح شہید نہ کیا جائے جیسے عثمانؓ کو ان کی عورتوں اور بچوں کے سامنے شہید کیا گیا تھا۔ (البدایہ والنہایہ صفحہ ۱۵۹ جلد ۸)

اسی طرح عبداللہ بن عمرؓ نے بھی روکا مگر حضرت حسینؓ نے واپس جانے سے انکار کیا۔
حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بھی روکا تو حضرت حسینؓ نے کہا کہ میرے پاس چالیس ہزار آدمیوں کی اطلاع آئی ہے جنہوں نے طلاق عتاق کی قسم کھائی ہے کہ میرے ساتھ ہیں۔
حضرت ابوسعید الخدریؓ، جابر بن عبداللہؓ اور سعید بن المسیب نے بھی ان کو روکا لیکن وہ سفر پر مصر رہے۔ {حوالہ مذکور صفحہ ۱۴۰ جلد ۸}
ان کے علاوہ عبداللہ بن جعفر اور محمد بن علیؓ (الحنفیہ) نے بھی روکا حتیٰ کہ گورنر مکہ نے امان نامہ دے کر بھی اس سفر سے روکا مگر وہ اپنے عزم پر قائم رہے
راستہ میں فرزدق شاعر سے ملاقات ہوئی تو اس سے صورت حال دریافت کی۔ اس نے کہا اے فرزند رسول ﷺ ان (شیعوں) کے دل آپ کے ساتھ ہیں اور تلواریں آپ کے خلاف مدد آسمان سے آتی ہے۔ {الاصابہ صفحہ ۳۳ جلد ۱}
حضرت حسینؓ نے اپنے افراد خاندان اور (۶۰) شیعوں جو کہ کوفہ کے رہنے والے تھے کوفہ کی طرف سفر جاری رکھا۔ راستہ میں حضرت مسلمؒ کے شہید ہونے کی خبر ملی تو بار بار کلمہ ترجیع (انا للّٰہ و انا الیہ راجعون) پڑھتے رہے اور فرمایا قد خذ لنا شیعتنا "یقیناً ہمیں ہمارے شیعوں نے رسوا کر دیا اور یہیں سے واپسی کا قصد کیا۔ مگر بنو عقیل نے کہا واللہ ہم اس کے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یا تو اپنے بھائی مسلم کا انتقام لیں یا ہم بھی اسی انجام سے دوچار ہو جائیں ان جذبات کے پیش نظر حضرت حسینؓ نے اپنا سفر جاری رکھا ظاہر ہے کہ حکومت کے تعاون کے بغیر حضرت مسلمؒ کا قصاص نہیں لیا جا سکتا تھا۔ لیکن وفد میں شامل شیعوں (کوفیوں) اور خطوط لکھنے والے شیعوں نے حضرت حسین کا یہ منصوبہ ناکام بنا دیا۔ حضرت حسینؓ نے قرہ بن سعد قاصد عمرو بن سعد کے جواب میں فرمایا کہ تمہارے شہر والوں نے مجھے خطوط لکھ کر بلایا ہے اب اگر تمہیں میرا آنا پسند نہیں ہے تو میں واپس لوٹ جاتا ہوں۔
یوم عاشورہ جنگ سے پہلے فرمایا! اے شبث بن ربعی، اے حجار، اے قیس بن اشعث، اے یزید بن حارث۔ کیا تم نے مجھے نہیں لکھا تھا۔ خدا کی قسم تم نے لکھا تھا۔ لوگو! اگر تم کو میرا آنا ناگوار ہے تو مجھے چھوڑ دو تا کہ میں کسی پر امن خطہ کی طرف چلا جاؤں۔ یہی نہیں بلکہ حضرت حسینؓ نے تین شرطیں بھی پیش کیں۔

۱۔ یا آپ مجھے جہاں سے میں آیا ہوں وہاں واپس جانے دیں

۲۔ یا آپ مجھے کسی سرحد کی طرف بھیج دیں تاکہ میں کفار کے خلاف جہاد کرتا رہوں

۳۔ یا آپ مجھے یزید بن معاویہؓ کے پاس جانے دیں تاکہ میں اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر فیصلہ کرلوں۔

یہ تینوں شرطیں اہلسنت والجماعت اور اہل تشیع دونوں کی کتب میں پائی جاتی ہیں۔ (مزید تفصیل کے لئے راقم کی کتاب "سیدنا امیر معاویہؓ پر اعتراضات کا علمی تجزیہ صفحہ ۳۸۰-۳۸۲، ملاحظہ فرمائیں)

لیکن شیعوں کو ان شرائط کے قبول کرنے میں صاف موت نظر آتی تھی۔ اس لئے انہوں نے حضرت حسینؓ اور ان کے رفقاء کو انتہائی بے دردی کے ساتھ شہید کر کے اس خاندان سے مکمل طور پر انتقام لے لیا اس طرح حضرت حسینؓ بھی اپنے بھائی حضرت حسنؓ اور اپنے والد حضرت علیؓ کی طرح شیعوں کی سازش کا شکار ہو گئے۔

اس تمام تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد کوفہ میں شیعوں کی مجلس مشاورت منعقد ہوئی جس میں طے پایا کہ حضرت حسینؓ کو کوفہ بلایا جائے اس مقصد کے لئے خطوط لکھے گئے اور وفود روانہ کئے گئے۔ یہ اجتماع کرنے والے، امام مظلوم کو بلانے والے، خطوط لکھنے والے خطوط پہنچانے والے اور خطوط میں (طلاق وعتاق) قسمیہ عہد و پیمان کرنے والے اپنی موت و حیات کو حضرت حسینؓ کی موت و حیات سے وابستہ کرنے والے مسلم بن عقیلؓ کے ہاتھ پر ۸۰ ہزار کی تعداد میں بیعت کرنے والے پھر توڑنے والے مسلمؓ کو شہید کرنے والے حضرت حسینؓ کو گھیر کر کوفہ لانے والے ان کا راستہ روکنے والے انہیں اور ان کے رفقاء کو شہید کرنے والے مستورات کے خیموں میں لوٹ مار کرنے والے زینبؓ و فاطمہؓ کے زیورات اتارنے والے اور فرضی محبت جتا کر نوحہ ماتم کرنے والے سب کے سب شیعہ ہی تھے کیونکہ کوفہ اصل کے اعتبار سے شیعوں کا شہر ہے جس میں کسی کا سنی ہونا محتاج دلیل ہے۔ لیکن شیعہ ہونے کے لئے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ میں کوفی ہوں شیعہ مجتہد قاضی نور اللہ شوستری لکھتے ہیں کہ

اہل کوفہ کا شیعہ ہونا محتاج دلیل نہیں ہے۔ بلکہ بدیہی امر ہے اور اہل کوفہ کا سنی ہونا خلاف اصل ہے اور محتاج دلیل ہے۔ (مجالس المومنین صفحہ ۲۵)

جب تاریخ کی مسلمہ شہادت سے شیعہ کا قاتلان حسینؓ ہونا ثابت ہو گیا تو اب شیعہ نے واویلا کرنا شروع کر دیا کہ "جی قاتلان حسینؓ شیعہ نہیں بلکہ سنی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کوفہ میں اتنی تعداد میں شیعہ موجود ہی نہیں تھے۔ کیونکہ معاویہؓ نے اپنے دور میں چن چن کر قتل کرا دیا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے حضرت حسینؓ کو قتل کیا تھا۔ وہ حضرت علیؓ کو خلیفہ بلا فصل نہیں مانتے تھے اور تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ شیعوں والا کلمہ بھی نہیں پڑھتے تھے۔ ان وجوہات کی بنا پر ثابت ہو گیا کہ قاتلان حسین سنی تھے۔"

چنانچہ شیعہ مجتہد علامہ محمد حسین ڈھکو لکھتے ہیں کہ

۱. درحقیقت امام حسینؑ کے قاتل وہ لوگ تھے جن کا نعرہ میدان کربلا میں یہ تھا۔ "انا علیٰ دین عثمان" اور انصار حسینی کا جواب یہ تھا۔ "بل انت علیٰ دین الشیطان"

۲. جس کوفہ میں حضرت امیر المومنینؑ کی شہادت کے بعد پورے بیس سال معاویہ کی حکومت رہی ہو اور زیاد بن ابیہ گورنر رہا ہو اور جس نے ہر شجر و مدر کے نیچے چھپے ہوئے شیعہ کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ اس کوفہ میں ہزاروں کی تعداد میں شیعہ کہاں سے آ گئے؟

۳. جہاں شیعہ کا لفظ موجود ہے تو اس سے مذہب شیعہ پر کاربند لوگ مراد نہیں بلکہ ان پر یہ لفظ بایں معنی استعمال کیا گیا ہے کہ معاویہ کے مقابلے میں حضرت علیؑ کے ساتھ تھے۔ ورنہ ان کی اکثریت تو حضرت علیؑ کو چوتھا خلیفہ ماننے والی تھی نہ کہ خلیفہ بلا فصل۔ اگر ایک ہی ایسا فرد ثابت کر دیا جائے جو یزیدی افواج کی طرف سے لڑ رہا تھا اور خلافت بلا فصل کا بھی قائل تھا تو منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔ (تنزیہ الامامیہ صفحہ ۱۶۵)

ایک دوسرے شیعہ مجتہد علامہ عبدالکریم مشتاق کے استاد شیخ محمد علی پٹیالوی لکھتے ہیں کہ

میں نواصب و خوارج سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ جب آپ لوگ ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ قاتلان حسین شیعہ تھے تو اس بات کا فیصلہ کلمے ہی سے کیوں نہ کر لیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ شیعہ جو کلمہ پڑھتے ہیں۔ اس میں شہادتین کے بعد علی ولی اللہ وصی رسول اللہ و خلیفتہ بلا فصل کے الفاظ بھی ہیں۔ تو آپ اپنی ہی کسی معتبر و مستند کتاب سے یہ ثابت کریں کہ لشکر یزید کلمے میں شیعوں والے مذکورہ الفاظ پڑھتا تھا۔ یا یزید پڑھتا تھا۔ تو ہمارا یہ کھلا اور واضح اعلان ہے کہ ہم آپ کا الزام تسلیم کر کے مذہب شیعہ چھوڑ دیں گے۔ اگر آپ یہ ثابت نہیں کر سکتے اس کا

مطلب صاف صاف یہ ہوگا کہ قاتلان حسین صرف لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہی پڑھتے تھے۔ لہٰذا شیعہ نہیں تھے۔ پھر ان کا: "سب کیا تھا کلمے کی مطابقت سے سمجھ لیں ہمارا کلمہ یزید اور یزیدیوں سے نہیں ملتا۔ (علی ولی اللہ صفحہ ۵ مؤلفہ عبدالکریم مشتاق)

علامہ پنیالوی اور علامہ ڈھکو نے یہ تسلیم کرلیا کہ "شیعان علیؓ" کی اکثریت حضرت علیؓ کو چوتھا خلیفہ تسلیم کرتی تھی نہ کہ خلیفہ بلا فصل اور قاتلین حسینؓ سنیوں والا کلمہ پڑھتے تھے۔ کاش شیعہ مجتہدین اس حقیقت کو بھی واضح کردیتے کہ اس وقت "شیعہ کلمہ" پڑھنے والے کون لوگ تھے؟ اور کہاں تھے؟ اور کیا اس وقت "شیعہ کلمہ" کا کہیں وجود بھی تھا؟ جب اس وقت "شیعہ کلمہ" ہی کا کہیں وجود نہیں تھا۔ اس کے پڑھنے والے کہاں سے آتے؟ دوسری بات یہ ہے کہ جب حضرت معاویہؓ نے ہر شجر و مدر کے نیچے چھپے ہوئے شیعوں کو تہ تیغ کر دیا تھا اور کوفہ میں موجود شیعہ اپنی قلت کی وجہ سے اس پوزیشن میں ہی نہیں تھے کہ وہ حکومتی سطح پر کوئی انقلاب برپا کر سکیں۔ تو کیا یہ صورت حال حضرت حسینؓ کو معلوم نہیں تھی؟ جب معلوم تھی تو پھر آپ نے کوفہ کا سفر کیوں اختیار کیا؟ کیا جن لوگوں نے آپ کو خطوط لکھے تھے ان کو آپ نہیں جانتے تھے؟ اور کیا ان کا مذہب و مسلک آپ کو معلوم نہیں تھا؟ اگر کوفہ میں خلافت بلا فصل کا عقیدہ رکھنے والے اور حقیقی شیعہ موجود نہیں تھے۔ تو پھر آپ کا اس دعوت کو قبول کرنا اور کوفہ کی طرف عازم سفر ہونا بالکل بے جواز ثابت ہوتا ہے۔ اگر لشکر یزید کے ساتھ مقابلہ کرنے کی قوت نہیں تھی۔ تو پھر "تقیہ شریفہ" کیوں ترک کیا؟ اگر بہر صورت جان ہی دینی تھی تو مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ اور دیگر صوبوں میں بھی یزید کے گورنر موجود تھے ادھر کا رخ کر کے حصول شہادت کی سعی کیوں نہ فرمائی؟ اگر کوفہ میں شیعہ اقلیت میں تھے تو پھر مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے لوگ کہاں سے آئے تھے؟ حضرت حسینؓ کی احتیاط کا تو یہ عالم تھا کہ انہوں نے شیعوں کے خطوط اور وفود آنے کے باوجود اصل حالات معلوم کرنے کی خاطر پہلے مسلم بن عقیل کو روانہ کیا۔

بہر حال یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ کہ شیعوں نے حضرت حسینؓ کو مخصوص مفادات (مذہب شیعہ کی افزائش) کی خاطر دھوکے سے بلا کر شہید کر دیا جس سے ان کے دامن پر ایک داغ کا مزید اضافہ ہو گیا جو قیامت تک نہیں دھل سکتا۔

دراصل حضرت معاویہؓ نے اپنے حسن تدبر اور قابلیت اور صلاحیت سے شیعوں کی

سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا قلع قمع کر دیا تھا۔ جس سے اس طبقہ کو بہت ہی مایوسی ہوئی۔ لیکن حضرت معاویہؓ کی وفات کے فوراً بعد اس نے پھر سر اٹھایا اور حضرت حسینؓ کے خون سے ہولی کھیل کر اپنے مقصد (مذہب شیعہ کی نشو ونما، باہمی خانہ جنگی اور داخلی انتشار و خلفشار) میں کامیابی حاصل کر لی۔ چنانچہ دنیائے شیعیت کے عظیم مجتہد علامہ سید محمد طباطبائی لکھتے ہیں کہ!

خصوصاً شیعوں کے تیسرے امام حضرت حسینؓ کی دلخراش شہادت شیعوں کی افزائش کا باعث بنی اور خاص کر مرکز خلافت سے دور دراز علاقوں مثلاً عراق، یمن اور ایران میں ــــ کربلا کا واقعہ ایک اہم عنصر تھا۔ جس کے فوری اثر نے بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا اور مذہب شیعہ کی بنیاد بہت مضبوط ہو گئی۔ اس واقعہ کا فوری اثر یہ ہوا کہ انقلاب اور شورشیں شروع ہو گئیں اور ساتھ ہی خون ریز جنگوں کا ایک طویل سلسلہ بھی شروع ہو گیا جو بارہ سال تک جاری رہا (شیعہ صفحہ ۴۸-۴۷)

موصوف مزید لکھتے ہیں کہ

اگر اس وقت امام حسنؑ اور امام حسینؑ معاویہ کے خلاف جنگ کرتے تو اس میں شک نہیں کہ شہید ہو جاتے مگر اسلام کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا۔۔۔۔ اس کے علاوہ معاویہ اپنے کارندوں کے ذریعے دونوں اماموں کو قتل کروا سکتا تھا اور پھر ان کی سوگواری اور تعزیت کرتے ہوئے ان کا ظاہری انتقام لینے پر بھی آمادہ ہو جاتا جیسا کہ اس نے خلیفہ سوم کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا تھا۔ (حوالہ مذکور صفحہ ۱۴۹)

موصوف نے اصل راز سے پردہ اٹھا دیا کہ اگر دور معاویہ میں حضرات حسنینؓ شہید ہو جاتے تو اسلام یعنی مذہب شیعہ کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا کیونکہ آں محترمؓ کی گرفت بہت مضبوط تھی اور وہ شیعہ قاتلین کو بھی اسی طرح کیفر کردار تک پہنچا دیتے۔ جس طرح انہوں نے قاتلان عثمانؓ کو پہنچایا تھا۔ لیکن شیعوں کی یہ خوش فہمی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسے مجرموں کے لئے پہلے سے انتظام کر رکھا تھا اور ان کے لئے بھی وہی سزا تجویز ہوئی جو ان کے "سلف صالحین" بنی اسرائیل کے لئے مخصوص تھی۔ یعنی "فَاقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ" (اپنے کو آپس میں قتل کرو تمہاری بہتری اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسی میں ہے) (البقرۃ نمبر ۵۴)

اور آج بھی دنیا بچشم خود اس کا مشاہدہ کر رہی ہے۔

شیعیت زین العابدین کے عہد میں

علی بن حسینؑ المعروف زین العابدین سانحہ کربلا کے عینی شاہد ہیں ان کی ولادت ۳۸ھ میں ہوئی اور وفات مدینہ منورہ میں بعمر ۵۷ سال ۹۵ھ میں ہوئی۔

کربلا سے واپسی پر جب کوفیوں نے آواز گریہ و نوحہ بلند کی تو حضرت زین العابدین نے فرمایا کہ اب ہم پر نوحہ اور گریہ کرتے ہو۔ یہ تو بتاؤ تمہارے علاوہ ہمیں قتل کس نے کیا ہے؟

سیدہ زینب بنت علیؑ نے بھی انہیں ڈانٹتے ہوئے فرمایا!

اے اہل کوفہ اے اہل مکر و غدر! تم ہم پر گریہ کرتے ہو تم ہی نے ہمیں قتل کیا ہے اور اپنے آپ کو ابد الآباد تک سزاوار جہنم کیا ہے۔ سیدہ فاطمہ بنت حسینؑ نے فرمایا

اے اہل کوفہ اے اہل مکر و غدر! تم نے ہماری تکذیب کی اور ہم پر قتال کرنا حلال سمجھا کل کے روز تم نے علیؑ کو قتل کیا اور بسبب کینہ ہائے دیرینہ ہر وقت ہم اہلبیت کا خون تمہاری تلواروں سے ٹپکتا رہا اور ہمارے قتل کرنے سے تمہارے دل شاد ہوتے رہے (جلاء العیون)

چونکہ یہ حادثہ امیر یزید کی لاعلمی میں بغیر ان کے حکم کے پیش آیا تھا اور انہوں نے زیادہ سے زیادہ بیعت لینے کا حکم دیا تھا۔ لڑنے کی اجازت نہ دی تھی۔ اس لئے جب انہیں اس حادثہ کی اطلاع دی گئی تو ان کے آنسو نکل آئے اور کہا کہ اگر تم حسینؑ کو قتل نہ کرتے تو میں تم سے زیادہ خوش ہوتا ابن زیاد پر اللہ کی لعنت ہو اگر میں موجود ہوتا تو خدا کی قسم حسینؑ کو معاف کر دیتا۔ خدا ان پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔

(تاریخ طبری صفحہ ۳۷۵ جلد ۷۔ تاریخ اسلام شاہ معین الدین ندوی صفحہ ۳۸ جلد ۱۔ الاصابہ صفحہ ۱۹۱ جلد ۱۔ بحوالہ المرتضیٰ صفحہ ۳۶۱)

اس کے بعد جب اہل بیت کا قافلہ شام پہنچا تو یزید ان کی حالت دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ اور ان سے کہا۔ خدا ابن مرجانہ کا برا کرے اگر اس کے اور تمہارے درمیان قرابت ہوتی تو وہ تمہارے ساتھ یہ سلوک نہ کرتا۔ سیدہ فاطمہ بنت علیؑ کا بیان ہے کہ جب ہم لوگ یزید کے سامنے پیش کئے گئے۔ تو ہماری حالت دیکھ کر اس پر رقت طاری ہو گئی۔ ہمارے ساتھ بڑی نرمی اور ملاطفت سے پیش آیا اور ہمارے متعلق احکام دیئے۔ (طبری صفحہ ۳۷۷ جلد ۷)

قافلہ اہل بیت کو حرم سرائے شاہی میں ٹھہرایا گیا۔ یزید نے ان کے ساتھ نہایت عمدہ سلوک اور کریمانہ برتاؤ کیا۔ حضرت زین العابدین کو اپنے ساتھ دستر خوان پر کھانا کھلاتا رہا۔

چند دن ٹھہرانے کے بعد جب اہل بیت کرام کو کسی قدر سکون ہوا تو یزید نے انہیں بڑے اہتمام کے ساتھ رخصت کیا اور حضرت زین العابدین سے کہا! ابن مرجانہ پر خدا کی لعنت ہو اگر میں ہوتا تو خواہ میری اولاد ہی کیوں نہ کام آجاتی میں حسینؓ کی جان بچا لیتا لیکن اب قضائے الٰہی پوری ہو چکی۔ آئندہ آپ کو جس قسم کی بھی ضرورت پیش آئے مجھے لکھیں۔

اس کے بعد بڑی حفاظت اور اہتمام کے ساتھ قافلہ کو روانہ کیا چند دیانت دار اور نیک آدمیوں کو حفاظت کے لئے ساتھ کیا۔ ان لوگوں نے بڑے اعزاز واحترام کے ساتھ مدینہ پہنچایا۔ ان کے شریفانہ سلوک سے اہل بیت کی خواتین اتنی متاثر ہوئیں کہ فاطمہ اور زینب نے اپنے زیور اتار کر ان کے پاس بھیجے لیکن انہوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ ہم نے دنیاوی منفعت کے خیال سے نہیں بلکہ خالصتاً لوجہ اللہ اور قرابت نبوی کے خیال سے یہ خدمت انجام دی اس لئے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ (ابن اثیر صفحہ ۴ جلد ۳ بحوالہ تاریخ اسلام صفحہ ۸۵ جلد از شاہ معین الدین ندوی)

علاوہ ازیں حضرت حسینؓ اور یزیدؒ کے مابین خاندانی مراسم بھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت حسینؓ نے کربلا میں شیعوں کی غداری ظاہر ہو جانے کے بعد جو شرائط پیش کی تھیں۔ ان میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ مجھے یزید کے پاس شام بھیج دیا جائے تاکہ میں اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر فیصلہ کرلوں۔ کیونکہ یزیدؒ باعتبار رشتہ حضرت حسینؓ کے برادر نسبتی تھے۔ یزیدؒ کی حقیقی پھوپھی زاد بہن لیلیٰ بنت ابی مرہ بنت میمونہ بنت ابی سفیانؓ حضرت حسینؓ کے نکاح میں تھیں ان کے بطن سے علی اکبر پیدا ہوئے جو میدان کربلا میں شہید ہو گئے۔

دوسرا اہم رشتہ یہ بھی تھا کہ حضرت حسینؓ کے بہنوئی سیدہ زینب کے شوہر اور چچازاد بھائی عبداللہ بن جعفر طیار کی بیٹی ام محمد یزیدؒ کے نکاح میں تھیں۔ اس رشتے کے اعتبار سے یزیدؒ حضرت حسینؓ کے بھتیجے داماد ٹھہرے۔ ان کے علاوہ بھی دونوں خانوادوں میں بہت سی رشتہ داریاں اور تعلقات قائم تھے۔

سانحہ کربلا کے بعد دوسرا اہم واقعہ حرہ کا ہے۔ جس میں اہل مدینہ نے یزیدؒ کی بیعت فسخ کر کے امویوں کو مدینہ سے نکال دیا تھا۔ حضرت زین العابدین کے لئے قصاص حسین کا یہ ایک اچھا موقع تھا۔ لیکن آں محترمؒ نے اس میں کچھ بھی حصہ نہ لیا اور یزیدؒ کے لئے دعائے خیر کی۔ ابن سعد لکھتے ہیں کہ ایک شخص نے امام محمد باقرؒ سے واقعہ حرہ کے بارے میں دریافت

کیا کہ کیا ان کے گھرانے کا کوئی فرد یزید کی فوج سے لڑنے کے لئے نکلا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ نہ خاندان ابو طالب کا کوئی فرد لڑنے کے لئے نکلا تھا اور نہ ہی خاندان عبدالمطلب میں سے کوئی شخص مقابلے میں آیا۔ سب کے سب اپنے گھروں میں بیٹھے رہے۔ جب حضرت مسلم بن عقبہؓ بغاوت کچلنے میں کامیاب ہو گئے۔ تو حضرت زین العابدین ان کے پاس آئے۔ مسلم بن عقبہؓ نے ان کی عزت و تکریم کی اور کہا کہ یزید نے مجھے حکم دیا تھا کہ آپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤں یہ سن کر حضرت زین العابدین نے فرمایا "وصلی اللہ امیر المومنین یزید" یعنی اللہ تعالیٰ امیر المومنین یزید کو اپنی رحمت میں ڈھانپے۔ {طبقات ابن سعد تحت تابعین جلد ثانیہ علی بن الحسین}

شیعہ روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت زین العابدین نے یزیدؒ کی بیعت بھی کر لی تھی۔ امام جعفر صادق نے فرمایا کہ جب یزید بن معاویہ حج کے ارادے سے جاتے ہوئے مدینہ میں داخل ہوا تو ایک قریشی آدمی کو بلوایا اس کے آنے پر کہا کیا تو میرا غلام ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ اگر میں چاہوں تجھے بیچوں چاہوں تو غلام ہی رکھ لوں۔ اس قریشی نے جواب دیا خدا کی قسم قریش میں باعتبار حسب کے تو مجھ سے زیادہ باعزت نہیں اور نہ ہی تیرا باپ میرے باپ سے جاہلیت اور اسلام میں بہتر ہے اور نہ تو ہی دین میں مجھ سے افضل ہے تو میں کیوں کر تیرا سوال قبول کروں۔ یزید نے کہا اگر نہ مانا تو قتل کر دوں گا۔ قریشی نے کہا میرا قتل حسین بن علیؓ کے قتل سے زیادہ بڑا نہیں۔ پھر اس قریشی کو یزید نے قتل کروا دیا۔

پھر یزید نے امام زین العابدین کو بلوایا اور ان سے بھی وہی کچھ کہا جو اس قریشی کو کہا تھا۔ امام موصوف نے کہا کہ اگر میں مطلوبہ اقرار نہ کروں تو کیا مجھے بھی اس شخص کی طرح قتل کر دے گا۔ یزید نے کہا۔ فقال لہ علی بن الحسین علیہما السلام قد اقررت لک بما سألت انا عبد مکرہ فان شئت فامسک وان شئت فبع"...... زین العابدین نے فرمایا میں نے تیرا مطالبہ مان لیا۔ میں ایک مجبور غلام (بندہ) ہوں تیری مرضی اگر چاہے مجھے بیچ دے اور چاہے رکھ لے۔ {فروع کافی کتاب الروضہ صفحہ ۲۳۴ جلد ۸}

ترجمان شیعیت ملا باقر مجلسی نے بھی یہی واقعہ جلاء العیون صفحہ ... جلد ۲ میں نقل کیا ہے۔

اس بات کی وضاحت اہل تشیع ہی کر سکتے ہیں کہ ایک عام قریشی شخص میں اتنی جرأت ہے کہ وہ یزیدؒ کے سامنے حق گوئی اور بے باکی کا مظاہرہ کر کے اپنی جان قربان کر دیتا ہے لیکن

حضرت زین العابدین اپنے والد اور دیگر افراد خاندان کے "قاتل" کی بیعت کر لیتے ہیں۔

شیعہ امامیہ پر تعجب ہے کہ وہ ائمہ کو دین کا محافظ و مبلغ سمجھتے ہیں لیکن ان کے ائمہ نہ دین کی تبلیغ کا فریضہ ادا کر سکے اور نہ ہی دین کی حفاظت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے۔

ابو الائمہ حضرت علیؓ کی موجودگی میں بقول شیعہ ثلاثہؓ نے دین میں تغیر و تبدل کر دیا لیکن حضرت علیؓ ان پچیس سالوں میں "تقیہ" کی زندگی بسر کرتے رہے اور حکومت و خلافت سے بالکل الگ تھلگ رہے اور خود اپنے دور خلافت میں نہ دین کو تحریف سے پاک کر سکے اور نہ ہی ثلاثہؓ کی بدعات کو ختم کر سکے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔

مجھ سے پہلے کے حکمرانوں نے ایسے بہت اعمال کئے جن میں قصداً نبی اکرم ﷺ کی مخالفت کی۔ آپ ﷺ کے عہد کو توڑ ڈالا اور آپ ﷺ کی سنت کو بدل ڈالا۔ اب اگر میں لوگوں کو ان کے چھوڑنے پر آمادہ کرنا چاہوں اور ان کو بدل کر اسی نہج پر لانا چاہوں جس پر وہ آپ ﷺ کے عہد مبارک میں تھے۔ تو (مجھے خوف ہے کہ) میری ہی فوج یقیناً مجھ کو چھوڑ دے گی اور میں تنہا رہ جاؤں گا۔ یا صرف میرے وہ چند شیعہ میرے ساتھ رہ جائیں گے جن پر میری فضیلت اور کتاب و سنت سے میری امامت کی فرضیت کی حقیقت ثابت ہو چکی ہے۔ اللہ کی قسم میں نے لوگوں کو حکم دیا تھا کہ رمضان میں فرض کے علاوہ کوئی نماز با جماعت ادا نہ کیا کریں (یعنی تراویح کی نماز نہ پڑھیں) اور ان کو یہ بتلایا کہ نوافل کا با جماعت ادا کرنا بدعت ہے تو میرے ہی لشکر میں ایسے لوگ میری معیت میں قتال کرتے ہیں چلا اٹھے کہ اے اہل اسلام سنت عمرؓ کو تبدیل کیا جا رہا ہے۔ یہ شخص ہمیں رمضان میں نفلی نماز پڑھنے سے روکنا چاہتا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ یہ لوگ میرے لشکر کے ایک حصہ کو ہی میرے مقابل کھڑا کر دیں گے میں نے ان لوگوں کو بہت ہی فرقہ باز ائمہ ضلالت کے پیروکار اور جہنم کی طرف دعوت دینے والا پایا۔ (روضہ کافی صفحہ ۵۹۔ ۶۲ جلد ۸)

امام قمی بھی اسی حقیقت کا بالفاظ ذیل اعتراف کرتے ہیں کہ "یکے از بدعت ہائے آنہا امیر وا صدای وا عمراہ وا عمراہ بلند کردند تا عاقبت علی علیہ السلام از حرف خود برگشت۔

بدعت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے نیچے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ "نافلہ ماہ رمضان در زمان رسول خدا و ابوبکر و اوائل خلافت عمر فرادی خواندہ میشد عمر امر کرد کہ بجماعت بخوانند وگفت ایں خوب بدعتی است علی بن ابی طالب خواست آنرا تغیر دہد و ایں بدعت را بردارد صدای مردم

وامر او بلند شد۔

(کشف الاسرار صفحہ ۱۶۶)

موصوف اپنی دوسری کتاب میں حضرت علیؓ کی بے بسی کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔
حضرت علیؓ شریح سے فرماتے ہیں تم ایسی جگہ پر بیٹھے ہو جہاں نبی یا وصی نبی یا شقی کے علاوہ کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔ ظاہر ہے شریح نہ تو نبی تھے نہ وصی لہٰذا شقی تھے شریح وہ شخص ہے جو ۵۰۔۶۰ سال تک کوفہ میں منصب قضاء پر فائز رہے اور ان کا شمار ان میں ہوتا ہے جنہوں نے معاویہ سے تقرب کی خاطر ایسے فتوے جاری کیے ہیں۔ جو حکومت اسلامی کے برخلاف تھے حضرت علیؓ بھی دوران حکومت میں اس کو معزول نہ کر سکے کیونکہ یہ شیخین کے معین کردہ تھے لہٰذا لوگوں نے ان کو معزول نہیں ہونے دیا۔

(حکومت اسلامی حصہ دوم صفحہ ۳)

اس تفصیل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ ان سنگین بدعات کی اصلاح نہ تو خلفائے ثلاثہؓ کے دور میں کر سکے اور نہ ہی خود اپنے دور خلافت میں۔ شیعہ کے آں محترمؒ پر اس الزام کو تسلیم کرنے سے ایک انتہائی مکروہ صورت سامنے آتی ہے کہ ثلاثہؓ نے اپنے دور میں جو کام کئے وہ اپنے اجتہاد کے مطابق درست اور صحیح سمجھ کر ہی کئے تھے لیکن حضرت علیؓ تو دیدہ دانستہ جانتے بوجھتے اس بدعت و تحریف کو برداشت کرتے رہے۔ ثلاثہؓ کے دور میں "تقیہ شریفہ" آڑے رہا مگر اپنے دور خلافت و حکومت میں کیا امر مانع تھا؟

بلکہ اس سے تو یہ ثابت ہو رہا ہے کہ حضرت علیؓ العیاذ باللہ اپنی حکومت کی بقاء کو دین و ملت کی حفاظت سے مقدم سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے بدعت و تحریف کو تو گوارہ کر لیا مگر اپنی حکومت کو خطرے میں ڈالنا پسند نہیں کیا کہ کہیں ان کا لشکر ان کو چھوڑ کر الگ نہ ہو جائے۔ کیا ترک فریضہ نہی عن المنکر کی اس سے بڑھ کر کوئی مثال ہو سکتی ہے؟

جبکہ فروع کافی میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ ایسے مومن ضعیف سے بغض رکھتا ہے۔ جس کا کوئی دین ہی نہ ہو عرض کیا گیا کہ ایسا مومن جس کا کوئی دین ہی نہ ہو کون ہو سکتا ہے؟ فرمایا "الذی لا ینھی عن المنکر" جو نہی عن المنکر کا فریضہ ادا نہیں کرتا۔

(فروع کافی صفحہ نمبر ۵۹ کے ۵)

امام دوم حضرت حسنؓ تحریف و تغیر کو کیا دور کرتے انہوں نے تو خلافت ہی حضرت معاویہؓ کے سپرد کر دی۔ امام سوم کے ساتھ شیعوں نے جو شرمناک کھیل کھیلا اس کی وضاحت

پیچھے گذر چکی ہے۔

حضرت زین العابدین کے متعلق شیعہ کا ایک قول فروع کافی کے حوالے سے آپ ابھی ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اب شیعہ مجتہد علامہ سید محمد طباطبائی کا ارشاد پیش خدمت ہے۔

امام چہارم مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو گئے اور اپنے گھر کے دروازے تمام لوگوں پر بند کر کے خدا کی عبادت میں مشغول ہو گئے اور اپنے خاص شیعوں مثلاً ابو حمزہ ثمالی ابو خالد کابلی اور ایسے ہی چند دوسرے افراد کے سوا کسی اور سے نہیں ملتے تھے۔ البتہ یہ خاص لوگ اپنے امام سے جو تعلیمات حاصل کرتے آپ کے پیروکاروں تک پہنچا دیتے تھے اور اس طرح مذہب شیعہ روز بروز ترقی کرتا گیا۔ جس کے بیشتر اثرات پانچویں امام کے زمانے میں رونما ہوئے۔ {شیعہ صفحہ ۱۰۰}

خود امام جن پر تبلیغ دین اور حفاظت دین کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی وہ تو واقعہ کربلا کے بعد مدینہ منورہ میں گوشہ نشین ہو گئے اور پورے مدینۃ النبی ﷺ میں صرف ابو حمزہ ثمالی اور ابو خالد کابلی وغیرہ تعلیمات امام شیعوں تک پہنچانے میں مصروف ہو گئے۔

ترجمان شیعیت ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں کہ "اللہ کی قسم یہ امت تین مرتبہ کافر اور مرتد ہوئی۔ پہلی مرتبہ جب ابو بکرؓ مسند نشین خلافت ہوئے، دوسری مرتبہ جب معاویہ نے زمام خلافت سنبھالی اور تیسری مرتبہ جب حضرت حسینؓ کو قتل کر دیا گیا"۔ {تذکرۃ الائمہ صفحہ ۱۰۷}

موصوف اپنے دوسری کتاب میں لکھتے ہیں کہ: حضرت زین العابدین ہر وقت روتے رہتے تھے کہ آپؓ کی شہادت سے اہل جہاں گمراہ ہو گئے۔ خدا کا دین ضائع ہو گیا اور نبی اکرم ﷺ کی سنتیں معطل اور بنو امیہ کی بدعات ظاہر ہو گئیں۔ {جلاء العیون صفحہ ۵۰۳}

قاضی نور اللہ شوستری لکھتے ہیں کہ حضرت زین العابدین سے روایت ہے کہ حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد پانچ آدمیوں کے سوا باقی سب مرتد ہو گئے۔ {مجالس المومنین صفحہ ۱۴۵}

جبکہ حضرت جعفر صادق فرماتے ہیں کہ: شہادت حسینؓ کے بعد تین آدمیوں کے سوا سب لوگ مرتد ہو گئے۔ {رجال کشی صفحہ ۸۱}

یہ سب اہل تشیع کے خود تراشیدہ قصے اور کہانیاں ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ حضرت زین العابدین اپنے دامن کو شیعوں سے چھڑانے میں کامیاب ہو گئے۔

بقول شیعہ حضرت زین العابدین ۱۱ محرم ۶۱ھ تا ۱۸ محرم ۹۵ھ منصب امامت پر فائز رہے اس دوران یزید بن معاویہؓ، معاویہ ثانی، عبداللہ بن زبیرؓ، مروان بن حکمؓ، عبدالملک بن مروان اور ولید بن عبدالملک برسر اقتدار رہے۔ حجاز پر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا قبضہ تھا۔ جو عبدالملک کے دور میں ختم ہوا۔ لیکن حضرت زین العابدین نے ابن زبیرؓ کے مقابلے میں خلفائے بنوامیہ کے ساتھ تعلق قائم رکھا اور ان کی اقتداء میں نمازیں بھی ادا کرتے رہے۔

مروان بن حکمؓ کے دور خلافت میں ایک شخص ابراہیم بن حفصہ نے زین العابدین کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ کے عقیدت مندوں میں جو ابوحمزہ ثمالی ہے وہ کہتا ہے کہ ان امراء و خلفاء کے پیچھے ہم نماز ادا نہیں کریں گے۔ جب تک یہ لوگ ہمارے نظریات کے موافق نظریات و خیالات نہ رکھیں۔ یہ سن کر زین العابدین نے فرمایا بلکہ ہم ان کے پیچھے نمازیں ادا کریں گے اور سنت کے مطابق ان سے نکاح کریں گے۔ (المصنف لابن ابی شیبہ صفحہ ۳۷۸ جلد ۲ تحت تذکرہ الصلوٰۃ خلف الامراء)

جب حضرات حسنینؓ مروانؓ کی اقتدا میں نمازیں ادا کرتے رہے تو زین العابدین کیوں نہ ادا کرتے؟ یہاں تقیہ کا شبہ ہو سکتا ہے۔ لیکن حضرت جعفر صادق اور حضرت باقر کی روایت ہے کہ کان الحسن و الحسین یصلیان خلف مروان بن الحکم فقالو الاحد هما ما کان ابوك یصلی اذا رجع الی البیت فقال لا واللّٰه ما کان یزید علی صلوة۔ (بحار الانوار ملا باقر مجلسی صفحہ ۱۵۱ جلد ۱۰)

حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ مروان بن حکم کے پیچھے ہمیشہ نمازیں ادا کیا کرتے تھے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ کے باپ دادا جس وقت گھر واپس ہوتے تو کیا وہ نماز کو لوٹاتے نہیں تھے؟ تو حضرت باقر نے فرمایا اللہ کی قسم وہ سابقہ نماز پر زیادتی نہیں کرتے تھے طبقات ابن سعد میں بھی حضرت باقر کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ۔ انا لنصلی خلفهم من غیر تقیة و اشهد علی علی بن حسین انه کان یصلی خلفهم فی غیر تقیة.

ہم خلفاء وقت کی اقتدا میں بغیر تقیہ کے نماز ادا کیا کرتے ہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ میرے والد (زین العابدین) بھی خلفاء وقت کی اقتدا میں بغیر تقیہ کے نماز ادا کیا کرتے تھے۔

حضرت جعفر صادق سے مروی ہے کہ ایک دفعہ مروان بن حکم نے حضرت زین العابدین کو ضرورت رشتہ کے لئے ایک لاکھ درہم کی کثیر رقم بطور قرض حسنہ دی تاکہ اس سے باندی خرید لیں۔ جس سے اولاد ہو سکے۔ چنانچہ حضرت زین العابدین نے اسی طرح کیا اور اس

باندی سے آپ کی بہت اولاد ہوئی۔

اس کے بعد جب مروانؓ بیمار ہوئے تو انہوں نے اپنے لڑکے عبدالملک کو وصیت کر دی کہ علی بن حسینؓ کو جو کچھ ہم نے قرض دیا ہوا تھا۔ ان سے واپس نہ لینا۔ مروانؓ کی وفات کے بعد زین العابدین نے عبدالملک کو رقم واپس کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے وصول نہ کی۔

(البدایہ والنہایہ صفحہ ۲۵۸ جلد ۸، صفحہ ۱۰۵ جلد ۹)

تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ مروانؓ اور عبدالملکؒ کے ساتھ حضرت زین العابدین کے ہمیشہ اچھے تعلقات قائم رہے۔ ابن سعد نے مختار کے دور کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ مختار نے اپنے دور حکومت میں ایک مرتبہ حضرت زین العابدین کی طرف ایک لاکھ درہم کی خطیر رقم ارسال کی۔ حضرت انؓ کے قبول کرنے میں متردد ہوئے اور ظاہری حالات کے ماتحت اس رقم کو رد بھی نہ کر سکے اس لئے رقم ہذا کو اپنی نگرانی میں محفوظ کر لیا۔ جب مختار قتل ہو گیا اور عبدالملک والی بن گیا تو زین العابدین نے عبدالملک بن مروانؒ کو خط لکھا کہ مختار نے میری طرف ایک لاکھ درہم ارسال کئے تھے۔ میں اس رقم کو لینا پسند نہیں کرتا تھا اور اس وقت نہ ہی اسے واپس کر سکا اب وہ رقم میرے پاس موجود ہے کسی کو بھیج کر واپس منگوا لیجئے۔ اس کے جواب میں عبدالملک نے تحریر کیا کہ اے میرے چچا کے بیٹے میں نے وہ رقم آپ کو ہدیۃً دے دی ہے۔ آپ اسے قبول کر لیں تب انہوں نے رقم قبول فرمائی۔ (طبقات لابن سعد تحت تذکرہ علی بن الحسین)

شیعوں (سبائیوں، مجوسیوں اور یہودیوں) کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ عالم اسلام میں امن نہ ہو اور امت مسلمہ باہم دست و گریبان رہے تاکہ فتوحات اسلامی کا سیلاب جو حضرت معاویہؓ کے دور میں امڈ آیا تھا وہ رک جائے اور عالم کفر و شرک اور یہودیت و مجوسیت سکھ کا سانس لے۔ جنگ جمل و صفین کے بعد سانحہ کربلا کے ذریعے انہوں نے پھر اپنا مقصد حاصل کر لیا۔

علامہ طباطبائی نے یہ اعتراف کیا ہے کہ "کربلا کا واقعہ ایک اہم عنصر تھا۔ جس کے فوری اثر نے بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا اور مذہب شیعہ کی بنیاد بہت مضبوط ہو گئی۔ اس واقعہ کا فوری اثر یہ ہوا کہ انقلاب اور شورشیں شروع ہو گئیں۔ اور ساتھ ہی خون ریز جنگوں کا ایک طویل سلسلہ بھی شروع ہو گیا جو بارہ سال تک جاری رہا"۔ (شیعہ صفحہ ۱۹۸)

سوال یہ ہے کہ شیعوں نے کس کی ہدایت پر یہ شورشیں شروع کی تھیں؟ حضرت زین العابدین

تو بقول ان کے گوشہ نشین ہو گئے۔ انہوں نے اپنے گھر کے دروازے شیعوں کے لئے بند کر دیئے اور انہیں ملاقات تک کا شرف نہیں بخشا۔ کیونکہ وہ ان کے کردار سے بخوبی آگاہ ہو چکے تھے جس طرح حضرت حسنؓ نے شیعوں سے تنگ آ کر خلافت حضرت معاویہؓ کے حوالے کر دی تھی اسی طرح حضرت زین العابدین نے داخلی انتشار و خلفشار کے باوجود خلفائے بنو امیہ (یزیدؒ، مروانؒ، عبدالملکؒ اور ولیدؒ) کی حمایت جاری رکھی۔

حضرت زین العابدین کی گوشہ نشینی یا شیعوں سے بیزاری کی وجہ سے شیعوں میں ایک نئے فرقے کی بنیاد پڑ گئی جس کا نام فرقہ کیسانیہ ہے۔

فرقہ کیسانیہ

حضرت زین العابدین کی روپوشی کے بعد "شیعان علیؑ" کا سب سے بڑا گروہ کیسانیہ کہلاتا ہے۔ یہ لوگ حضرت علیؓ کے صاحبزادے محمد بن الحنفیہ کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ حضرت محمد کی والدہ کا تعلق قبیلہ بنو حنفیہ سے تھا اور اس نسبت سے انہیں محمد بن الحنفیہ کہا جانے لگا۔ یہ ۱۶ھ میں پیدا ہوئے۔ عہد عثمان غنیؓ میں باشعور تھے۔ ۳۵ھ میں حضرت عثمان غنیؓ شہید ہوئے یہ ان کے ہوش کا واقعہ ہے۔ حضرت علیؓ کے ساتھ بصرہ آئے جنگ جمل میں حضرت علیؓ نے علم انہیں دیا تھا اور اس طرح ان کو حضرت علیؓ سے براہ راست امامت ملی۔ اس کے بعد جنگ صفین میں بھی یہ علمبردار تھے۔ واقعہ تحکیم کے بعد حضرت علیؓ کے ساتھ کوفہ آ گئے۔ حضرت معاویہؓ کے آخری ایام خلافت میں جب مدینہ آئے تو انہوں نے بطیب خاطر یزید کی بیعت کر لی۔ حضرت معاویہؓ کہتے تھے کہ اکابر قریش میں محمد بن علیؓ (ابن الحنفیہ) سے زیادہ بردبار، زیادہ عالم، زیادہ سنجیدہ مزاج، غرور، طیش اور آلودگی سے پاک وصاف کوئی دوسرا نہیں ہے۔ (رحماء بینہم ص۲۹۰)

واقعہ کربلا کے بعد محمد بن علیؓ دمشق گئے۔ یزید نے الگ محل رہائش کے لئے دیا اور ان کی نہایت ہی تکریم کی۔

جب ذی الحجہ ۶۳ھ میں اہل مدینہ نے یزید کی بیعت توڑ دی اور محمد بن علیؓ سے بھی بیعت توڑنے کا مطالبہ کیا تو انہوں نے یزید بن معاویہؓ کی تعریف کرتے ہوئے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں یزید کی صحبت میں رہا ہوں میں نے اسے نماز و نیکی کا پابند اور متبع سنت پایا اور لوگ اس سے فقہی مسائل دریافت کرتے تھے۔

(البدایہ والنہایہ صفحہ ۲۳۳ جلد ۸)

محمد بن علیؓ نے عبداللہ بن زبیرؓ کے مقابلے میں عبدالملک بن مروانؓ کی بیعت کی اور وظائف و تحائف لے کر مدینہ واپس آ گئے۔ جہاں ۸۱ھ میں ان کا وصال ہوا۔

محمد بن علیؓ سے عقیدت نے یہ رخ اختیار کیا کہ ان کے پیروؤں نے ان کی وفات ۸۱ھ کے بعد یہ کہنا شروع کیا کہ وہ مستور ہو گئے ہیں اور عنقریب ظاہر ہوں گے۔

(انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، مقالہ "کیسانیہ")

کیسان کے متعلق ارباب تحقیق میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ کیسانیہ کی نسبت کیسان کی طرف ہے...... بعض کہتے ہیں مختار ہی کا نام کیسان تھا۔ بعض کی رائے میں کیسان حضرت علیؓ کا آزاد کردہ غلام تھا۔ بعض کے نزدیک آپ کے بیٹے محمد بن حنفیہ کے شاگرد کا نام ہے اور ایک قول یہ ہے کہ بجیلہ کا آزاد کردہ غلام تھا اور اس کا نام زاذان فارس تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مختار نے اس کا یہ لقب رکھا ہے۔ کیونکہ حضرت علیؓ نے اس کو فرمایا تھا۔ یا کیس. یا کیس ؑ ں کا تثنیہ کیسان بنا دیا گیا۔

تیسری صدی ہجری کے مشہور رافضی مؤرخ النوبختی کے بیان کے مطابق کیسان مختار کا لقب تھا۔ اس نسبت سے اس کا پیدا کردہ گروہ فرقہ کیسانیہ اور مختاریہ کہلاتا تھا۔ (فرق الشیعہ صفحہ ۳۲،۲۶) لیکن شہرستانی کے بیان کے مطابق یہ دونوں فرقے ہیں۔ کیسانیہ حضرت علیؓ کے ایک ساتھی یا غلام کی طرف منسوب ہے۔ (الملل والنحل صفحہ ۱۹۶ جلد ۱)

علامہ محمد طباطبائی لکھتے ہیں کہ!

دنیا کے تمام ادیان و مذاہب میں بہت سے فرقے موجود ہیں خصوصاً چار آسمانی مذاہب یعنی یہودیت، عیسائیت، مجوسیت اور اسلام میں..... مذہب شیعہ میں پہلے تین اماموں کے زمانوں میں کوئی فرقہ موجود نہیں تھا۔ لیکن امام سوم کی شہادت کے بعد شیعوں کی اکثریت حضرت علی بن حسین کی پیروکار اور قائل ہو گئی۔ جبکہ اقلیت نے جس کو کیسانیہ کہا جاتا ہے۔ حضرت علیؓ کے تیسرے بیٹے محمد بن حنفیہ کو اپنا امام بنا لیا تھا۔ ان کے خیال کے مطابق محمد بن حنفیہ چوتھے امام ہیں اور وہی امام مہدی ہیں۔ جو کوہ رضوی میں غائب ہو گئے تھے اور آخری زمانے میں امام مہدی کے نام سے ظاہر ہوں گے۔ (شیعہ صفحہ ۵۷)

موصوف نے کیسانی شیعوں کو اقلیت اور امام چہارم کے پیروکاروں کو اکثریتی گروہ قرار دیا۔

جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ امام کی گوشہ نشینی کے بعد سارے شیعہ مختار کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے تھے۔ جو اپنے آپ کو محمد بن حنفیہ کے نائب کے طور پر متعارف کراتا تھا۔

سید علی حیدر نقوی لکھتے ہیں کہ!

کیسان حضرت علیؑ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ کیسان کی نسبت سے یہ فرقہ کیسانیہ کہلاتا ہے۔ وہ اپنے پیروکاروں کے ساتھ اس بات کے معتقد تھے کہ امام حسنؑ و حسینؑ کے بعد حضرت علیؑ کے سب سے بڑے بیٹے محمد بن حنفیہ امام تھے اور امام زین العابدینؑ امام نہیں تھے۔ وجہ یہی تھی کہ امام زین العابدینؑ واقعہ کربلا کے بعد مظالم بنی امیہ کے باوصف خاموش تھے اور عبادت و درس میں مصروف رہتے۔ انتقام کے لئے تلوار نہیں اٹھائی لیکن محمد بن حنفیہ نے ان مظالم کے خلاف تلوار اٹھائی اور شہید ہوئے۔ آپ علم، زہد، تقویٰ میں مشہور تھے۔ یہ فرقہ اب بھی موجود ہے۔ (ادیان عالم اور فرقہ ہائے اسلام کا تقابلی مطالعہ صفحہ ۱۴۲)

کیسان کے نسبتا کا استعمال سب سے پہلے اس شیعہ گروہ "الموالی" کے لئے ہوا جن کا سرگردہ کیسان ابوعمرہ تھا۔ جس کی حمایت مختار ثقفی نے کی لیکن بعد میں اس کا مصداق وسیع تر ہو گیا اور اس میں وہ لوگ بھی شامل کر لئے گئے۔ جنہوں نے ان خیالات کو تسلیم کیا جو مختار کے زیر قیادت شیعہ گروہ میں پھیل چکے تھے اور جن کا اثر بعد میں بھی بہت عرصہ تک رہا۔ جب کچھ مدت گزرنے پر گمنام شخص کیسان عملاً بھلا دیا گیا تو کیسان کی توجیہ یہ کی جانے لگی کہ یہ مختار کا لقب تھا اور قدیم تر طبقۂ کیسانیہ کا دوسرا نام اس وجہ سے "مختاریہ" ہو گیا۔

اس کے علاوہ کیسانیہ کی وجہ تسمیہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ یہ کیسان کی طرف جو حضرت علی کا مولیٰ (آزاد کردہ غلام) تھا۔ منسوب ہے۔ یہ غلام جنگ صفین میں قتل ہوا۔ کہا گیا ہے کہ مختار نے اپنے عقائد اسی سے اخذ کئے تھے۔

کیسانیہ کو خشبیہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک خاص قسم کی لکڑی (خشب) کا ڈنڈا ہتھیار کے طور پر اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ "خشبیہ" (لٹھ باز) دراصل کوفے کے ان موالی کا اہانت آمیز نام تھا۔ جو لاٹھیوں سے مسلح تھے اور مختار ثقفی کے ساتھیوں کا جزو غالب تھے اور اس کے سپہ سالاروں مثلاً ابراہیم بن مالک الاشتر کی سرکردگی میں جنگ میں شریک ہوئے۔ جن سپاہیوں نے مختار کے حکم سے مکہ مکرمہ پر چڑھائی کی اور محمد بن الحنفیہ کو عبداللہ بن زبیرؓ کی قید سے رہائی دلوائی

انہیں خشبیہ کہا گیا۔ بظاہر وہ خود اپنے ڈنڈوں کو "کافر کوبات" کہتے تھے۔ بعد کے زمانے میں اس قسم کے ہتھیار ابو مسلم خراسانی کے ساتھیوں کے پاس بھی پائے گئے اور ۲۵۱ھ میں بغداد کی خانہ جنگی کے زمانے میں انہیں عوام میں تقسیم کیا گیا تھا۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۹۴۳ جلد ۸)

بہر حال یہ فرقہ واقعہ کربلا کے بعد حضرت زین العابدین کی شیعوں سے بیزاری اور علیحدگی کے بعد پیدا ہوا۔ جس نے محمد بن حنفیہ کی طرف دعوت دی اور مختار ثقفی کی زیر قیادت اسلام کے خلاف اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔

الشہرستانی کے بیان کے مطابق کیسانی محمد بن الحنفیہ کو تمام علوم کا مالک مانتے تھے اور کہتے تھے کہ انہوں نے دو سیدوں (یعنی الحسنؑ اور الحسینؑ) سے تمام باطنی، تاویلی اور مخفی علوم نیز کرہ ہائے افلاک اور ارواح کا علم حاصل کر لیا تھا۔ کچھ زمانے کے بعد ایسے کیسانی پیدا ہوئے جنہوں نے ابن الحنفیہ کو اپنے والد (حضرت علیؑ) کا بلا واسطہ جانشین امام قرار دیا اور اس طرح حضرات حسنینؑ کو درمیان سے بالکل خارج کر دیا۔ اس کے ثبوت میں انہوں نے ایک روایت پیش کی کہ جنگ جمل میں حضرت علیؑ نے جھنڈا ان کے سپرد کیا تھا۔ غالباً یہ عقیدہ امامیوں اور زیدیوں کے مقابلے میں پیدا ہوا۔ محمد بن حنفیہ کی وفات کے بعد کیسانیوں میں پھوٹ پڑ گئی اور یہ فرقہ حسب ذیل فرقوں میں بٹ گیا۔

کیسانیہ کے فرقے

ا۔ کربیبہ۔۔۔ کیسانیہ کا یہ فرقہ ابو کریب ضریر سے منسوب ہے غالباً یہ وہی شخص تھا۔ جس نے اس نظریہ کی (جو کربیبہ کا امتیازی عقیدہ ہے) اشاعت کی کہ ابن حنفیہ مسیح علیہ السلام کی طرح پھر ظہور کریں گے۔ الاشعری نے مقالات الاسلامیہ میں ان کا یہ عقیدہ بیان کیا ہے کہ ان کے امام محمد بن الحنفیہ ابھی زندہ ہیں وہ مدینہ منورہ کے مغرب میں رضویٰ کے پہاڑوں میں رہتے ہیں۔ جہاں دائیں جانب ایک شیر اور بائیں جانب ایک چیتا ان کی حفاظت کرتا ہے اور صبح و شام ان کے لئے کھانا آجاتا ہے۔ چنانچہ اپنے خروج کے وقت تک وہ وہیں رہیں گے۔

کربیبہ کے نزدیک امام کو اس طرح چھپا رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایک خاص کام تجویز کر رکھا ہے۔

عبدالقاہر البغدادی نے بھی اپنی کتاب "اَلْفَرقُ بَیْنَ الْفِرَق" میں ان کے قیام "رضویٰ" کا حال

انہیں الفاظ میں بیان کیا ہے۔ بقول ان کے امام کے قریب ہی ایک چشمہ پانی کا اور ایک شہد کا موجود ہے اور یہی چشمے ہیں جن سے وہ ہر روز اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں۔ الشہرستانی نے بھی اگرچہ اس بات کا ذکر کیا ہے لیکن اس سلسلے میں خاص طور سے کریبیہ کا حوالہ نہیں دیا۔

المنصور باللہ عبداللہ بن حمزہ نے (العقد الثمین میں) اس خیال کی طرف اشارہ کیا ہے کہ رضوی میں امام فرشتوں کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں (جیسا کہ ابن حزم نے بھی لکھا ہے) اور یہ کہ بزمانِ غیبت ان کی حیثیت اللہ تعالیٰ کی آنکھ کی ہے جو اس کی مخلوقات کو دیکھ رہی ہے ان میں سے کئی ایک باتوں کا سلسلہ ظہور مسیح کے قدیم عقیدے سے جا ملتا ہے اور تقریباً سب کے سب کثیر اور السید الحمیری کے اشعار میں ملتے ہیں چنانچہ ملاحدہ کے مختلف فرقوں میں جس کسی نے قلم اٹھایا اس نے اپنی معلومات انہیں سے حاصل کیں۔

شیعوں میں عبداللہ بن سبا کے بعد ابو کریب وہ پہلا شخص ہے جس نے عقیدہ غیبت اور رجعت (یعنی امام صاحب الزمان کے غائب ہو جانے اور پھر دوبارہ واپس آنے) کی دعوت دی۔ شیعوں کے تمام فرقوں نے امام غائب کے بارے میں دل کی تسلی کے لئے یہ سبق اسی ابو کریب سے سیکھا ہے۔

۲۔ بیانیہ ــــ بیان بن سمعان تمیمی کے ماننے والے اس فرقے والے لوگ حضرت زین العابدینؑ (۶۱ تا ۹۴ھ) کے زمانے تک رہے۔ یہ بیان سید زین العابدین پر جھوٹ بولتا تھا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ امامت محمد بن حنفیہ سے ان کے بیٹے ابو ہاشم عبداللہ بن محمد کی جانب منتقل ہو گئی تھی۔ پھر ابو ہاشم نے بیان بن سمعان تمیمی کے حق میں وصیت کر دی تھی۔ بیان بن سمعان کے بارے میں اس فرقے کے لوگ مختلف الخیال ہیں۔ بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ نبی تھا اور اس نے شریعت محمد ﷺ کو منسوخ کر دیا۔ بعض اس کی الوہیت کا عقیدہ رکھتے تھے۔ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۱۳۸ "هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ" (عام لوگوں کے لئے تو یہ قرآن بیان ہے اور پرہیزگاروں کے لئے ہدایت و نصیحت ہے) کے متعلق اس فرقہ کا بانی بیان بن سمعان کہا کرتا تھا کہ میرا ہی نام "بیان ہدی اور موعظت" ہے وہ کہا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نور سے بنا ہوا ایک آدمی ہے۔ چہرہ کے سوا اس کا سب بدن فنا ہو جائے گا۔ اس آیت کے یہی معنی ہیں کہ "كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ" (القصص نمبر ۸۸) (اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے) (بحوالہ تاریخ تفسیر و مفسرین صفحہ ۳۴۳)

بیان بن سمعان کے متعلق الوہیت کا عقیدہ رکھنے والے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے نبی اکرم ﷺ کے بدن میں حلول کیا پھر حضرت علیؑ کے بدن میں. پھر محمد بن حنفیہ کے بدن میں پھر ابو ہاشم بن محمد بن حنفیہ کے بدن میں. اس کے بعد بیان بن سمعان کے بدن میں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ لاھوت، ناسوت، کے ساتھ ملکر بیان کے رگ وپے میں ایسا سرایت کر گیا ہے جیسے کوئلے میں آگ.....

۳۔ فرقہ ھاشمیہ ---- یہ لوگ ابو ہاشم عبداللہ بن محمد بن حنفیہ کے پیروکار تھے اور ابو ہاشم کو کیسانیہ کا امام مانتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک ابو ہاشم اپنے باپ کے مخفی علوم کے وارث تھے۔ اس لئے ان کا لقب ہاشمیہ ہوا. اسے فرقہ اسحاقیہ بھی کہا جاتا ہے. جو اسحٰق بن عمر کے ساتھیوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ محمد بن حنفیہ کی موت کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی وفات کے بعد امامت ان کے بیٹے ابو ہاشم کو منتقل ہوگئی جو ان کی اولاد در اولاد منتقل ہوئی کیونکہ ہر امام اپنے بیٹے کے لئے وصیت کر جاتا تھا. یہ فرقہ حضرت باقرؑ اور سلیمان بن عبدالملک کی خلافت کے دور میں ۹۶ھ سے ۹۹ھ تک رہا۔

ابو ہاشم کی وفات ۹۸ھ یا ۹۹ھ کے بعد جانشینی کے مسئلہ پر ان کی کئی شاخیں ہوگئیں. اس وقت عباسیوں نے اس خیال کی اشاعت شروع کی کہ ابو ہاشم نے اپنی وفات سے پہلے امامت کے جملہ حقوق محمد بن علی بن عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منتقل کر دیئے تھے۔ اسے "فرقہ عباسیہ" یا "راوندیہ" بھی کہا جاتا ہے۔ جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ابو ہاشم نے مرنے سے پہلے محمد بن علی بن عبداللہ بن عباسؓ کے لئے وصیت کی ہے اور اپنے ماننے والوں کو اس کی طرف بھیجا ہے اور یہ کہ امامت حضرت علیؑ کی اولاد سے منتقل ہوتی ہوئی منصور عباسی تک پہنچی ہے۔

۴۔ فرقہ حمزیہ ---- حمزہ بن عمارہ کی جماعت. یہ لوگ حضرت باقرؑ اور حضرت جعفر صادقؑ (۹۴ھ تا ۱۴۸ھ) کے زمانے تک رہے۔ اس حمزہ کے بارے میں یہ نقل کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنی بیٹی سے خود نکاح کر لیا تھا اور تمام محرم عورتوں سے نکاح کو حلال قرار دیتا رہا ہے اور کہتا تھا جس نے امام کو پہچان لیا وہ جو چاہے کرتا رہے اس پر کوئی گناہ نہیں۔

۵۔ فرقہ حربیہ ---- عبداللہ بن حرب کندی کی جماعت. یہ فرقہ حضرت جعفر صادق (۱۱۴ھ تا ۱۴۸ھ) کے زمانے میں پیدا ہوا ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ابو ہاشم سے امامت منتقل ہو کر امام

جعفر صادق کے پاس آ گئی ہے۔ ان میں سے ایک جماعت نے زنا اور غیر فطری فعل کو جائز قرار دیا ہے۔ اس فرقے کے بعض لوگ خود عبداللہ بن حرب کندی کو امام مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابو ہاشم نے اس کے حق میں وصیت فرمادی تھی۔ یہ فرقہ "کندیہ" بھی کہلاتا ہے۔

۶۔ فرقہ طیاریہ / جناحیہ۔۔۔ اس فرقہ کا دعویٰ ہے کہ جناب ابو ہاشم نے اپنے بعد جناب عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر طیارؓ کی امامت کے لئے وصیت کی تھی۔ حضرت جعفر طیارؓ کا لقب چونکہ ذوالجناحین بھی ہے۔ اس لئے یہ فرقہ جناحیہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ عبداللہ مذکور تناسخ ارواح کا قائل تھا اور عقیدہ رکھتا تھا کہ روح الٰہی انبیاءؑ میں دائر سائر ہے۔ انبیاءؑ کے بعد حضرت علیؑ پھر حسنین و محمد بن حنفیہؒ، اولاد علیؑ میں آئی۔ اس کے بعد خود عبداللہ میں روح الٰہی نے حلول کیا۔ یہ فرقہ شراب و مردار اور محارم ابدی کے ساتھ نکاح کو حلال سمجھتا اور قیامت کا منکر ہے۔ عبداللہ مذکور نے خروج کر کے فارس کے اکثر علاقوں پر ۱۲۹ھ میں قبضہ کر لیا تھا۔ ابو مسلم نے اس کو اس لئے قتل کرا دیا کہ وہ عباسیوں کو حقدار خلافت نہیں سمجھتا۔ بلکہ خود خلیفہ و امام بننا چاہتا تھا۔ اس کے معتقدین کا خیال ہے کہ عبداللہ قیامت کے قریب اصفہان کے کسی پہاڑ سے برآمد ہوگا۔

فرقہ کیسانیہ کے عقائد

الشہرستانی کے بیان کے مطابق اس فرقہ کا عقیدہ تھا کہ دین صرف ایک شخص کی اطاعت کا نام ہے۔ بذریعہ تاویل افتاء اور استنباط مسائل کا حق ائمہ کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اس فرقہ کے درج ذیل عقائد ہیں۔

۱۔ امام ایک مقدس انسان ہوتا ہے۔ جس کی وہ اطاعت کرتے ہیں اس کے علم و فضل پر پورا بھروسہ کرتے ہیں اور علم الٰہی کا نشان ہونے کی وجہ سے اسے گناہوں سے معصوم سمجھتے ہیں۔

۲۔ کیسانیہ بھی دیگر شیعوں کی طرح رجعت امام کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ وہ امام ان کے خیال میں حضرت علیؑ، حسنؑ، حسینؑ کے بعد محمد بن حنفیہ ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ فوت ہو چکے ہیں اور پھر واپس آئیں گے لیکن اکثر یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ فوت نہیں ہوئے بلکہ رضوی نامی پہاڑ پر رہتے ہیں۔ ان کے پاس شہد اور پانی رکھا ہے۔ مشہور شاعر کثیر عزہ ان ہی میں سے تھا وہ کہتا ہے۔

اَلَا اِنَّ الْاَئِمَّۃَ مِنْ قُرَیْشٍ ۔ وَلَاۃِ الْحَقِّ اَرْبَعَۃٌ سَوَاءٌ

بلاشبہ قریش سے امام اور حق و صداقت کے وارث صرف چار بزرگ ہیں۔

عَلِیٌّ وَالثَّلَاثَةُ مِنْ بَنِیْهِ هُمُ الْاَسْبَاطُ لَیْسَ بِهِمْ خَفَاءُ

حضرت علیؓ اور آپ کے تین صاحبزادے نبیرگان رسول ﷺ ہیں ان میں کوئی پوشیدگی نہیں

فَسِبْطٌ سِبْطُ اِیْمَانٍ وَّبِرٍّ وَسِبْطٌ غَیَّبَتْهُ کَرْبَلَاءُ

ان میں سے ایک تو ایمان و نیکی والے تھے۔ (حسنؓ) اور دوسرے کو کربلا نے غائب کر دیا (حسینؓ)

وَسِبْطٌ لَّا یَذُوْقُ الْمَوْتَ حَتّٰی یَقُوْدَ الْخَیْلَ یَتْبَعُهُ اللِّوَاءُ

ان میں سے تیسرے اس وقت تک موت سے ہمکنار نہ ہوں گے۔ جب تک وہ فوج کی سپہ سالاری کے فرائض انجام نہ دے لیں۔

تَغِیْبُ لَا یُرٰی عَنْهُمْ زَمَانًا بِرَضْوٰی عِنْدَهٗ عَسَلٌ وَّمَاءُ

وہ (محمد بن حنفیہ) رضوی پہاڑ پر دنیا کی آنکھ سے اوجھل ہو گئے اور ان کے پاس شہد اور پانی رکھا ہے۔

کثیرؔ نے ۱۰۵ھ میں وفات پائی اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ پہلی صدی ہجری کے آخر تک ائمہ کی تعداد کے متعلق یہ خیال تھا کہ ائمہ صرف چار ہیں یعنی حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، اور محمد بن حنفیہ اس وقت امامت کے شیعہ نظریات صرف چند ذہنوں میں پرورش پا رہے تھے۔ جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

۳۔ کیسانیہ بداء کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ نئے حالات کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے قضائے الٰہی بدل سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم چونکہ تغیر پذیر رہتا ہے اس لئے وہ جس بات کو چاہتا ہے بدل دیتا ہے وہ ایک بات کا حکم دیتا ہے لیکن پھر اس کے برعکس حکم صادر کر دیتا ہے۔ علامہ شہرستانی لکھتے ہیں کہ مختار نے بداء کا عقیدہ اس لئے اختیار کیا کہ وہ ہونے والے واقعات کا دعویٰ کرتا ہے یا تو اس لئے کہ اس پر وحی نازل ہوتی تھی یا امام کے پیغام کی وجہ سے وہ اپنے رفقاء سے جب کسی واقعہ کے حدوث و ظہور کا وعدہ کرتا اور وہ اسی طرح ظہور پذیر ہو جاتا تو اسے وہ اپنے دعویٰ کی دلیل قرار دیتا اگر ایسا نہ ہوتا تو کہتا خدا نے اپنا ارادہ بدل لیا۔

۴۔ کیسانیہ تناسخ ارواح کے قائل ہیں۔ یعنی روح کا ایک جسم سے نکل کر دوسرے میں حلول کرنا یہ عقیدہ ہندی فلسفہ سے ماخوذ ہے۔ اہل ہنود کا قول ہے کہ انسان کو عذاب دینے کے لئے اس کی روح گھٹیا حیوان میں منتقل کر دی جاتی ہے اور اجر و ثواب کے لئے اعلیٰ حیوان میں وہ

تناسخ ارواح کے عقیدہ کو مکمل طور پر تسلیم نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اس کا اطلاق صرف ائمہ ... تے تھے۔ کسی اور پر نہیں۔

۵۔ کیسانیہ کا خیال ہے کہ ہر چیز کا ایک ظاہر اور باطن ہوتا ہے۔ ہر شخص کی ایک روح اور نازل شدہ آیت کی ایک تفسیر و تاویل ہوتی ہے۔ اس کائنات ارضی کی ہر مثال ایک حقیقت رکھتی ہے۔ آفاق ارضی میں جو اسرار و حکم پھیلے ہوئے ہیں وہ انسان کے وجود میں جمع ہیں یہی وہ علم ہے جو حضرت علیؑ نے اپنے لخت جگر محمد بن حنفیہ کو سکھایا اور جس ہستی میں یہ سب علوم جمع ہوں وہی سچا امام ہے۔

امامیہ اثنا عشریہ کے عقائد عصمت امام، اطاعت امام، بداء، غیبت امام اور رجعت امام بھی فرقہ کیسانیہ کے عقائد سے ماخوذ ہیں کیونکہ اسے تقدم حاصل ہے۔

اس لئے بعض حضرات نے لکھا ہے کہ امامیہ اور زیدیہ کے ہوتے ہوئے فرقہ کیسانیہ کو کوئی دیرپا زندگی نصیب نہ ہوئی۔ ابن حزم نے اپنے زمانے ہی میں کیسانیہ کو ایک مردہ فرقہ قرار دیا۔ عقیدہ غیبت اور رجعت کا علویہ کی طرف جن کی حمایت زیدیہ نے کی تھی منسوب کیا جانا غالباً کیسانیہ ہی کے اثر کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ ایک قابل توجہ وثیقہ بھی جس میں قرامطی عقائد پائے جاتے ہیں۔ ممکن ہے کیسانی حلقوں سے ہی نکلا ہو۔ اس میں ایک شخص احمد بن الحنفیہ نامی مہدی اور پیغمبر ہونے کا مدعی نظر آتا ہے۔ (طبری، ابن اثیر) لیکن محمد بن الحنفیہ کے بیٹوں میں کوئی ایسا شخص نہیں جس کا نام احمد ہو۔ {اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد نمبر ۷ صفحہ ۵۰۱۔۵۰۰ بحوالہ مذاہب الاسلامیہ از شیخ محمد ابوزہرہ صفحہ ۸۔۷۷}

شیخ محمد ابوزہرہ نے لکھا ہے کہ بلاد اسلامیہ میں کیسانیہ فرقے کے پیروکار کہیں بھی موجود نہیں جن کا ذکر کیا جائے۔ لیکن عصر حاضر کے ایک شیعہ مصنف سید حیدر علی نقوی (جس کا حوالہ پیچھے گذر چکا ہے) نے لکھا ہے کہ یہ فرقہ اب بھی موجود ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر فرقہ کیسانیہ کا عملاً کہیں بھی وجود نہ ہوتا تو بھی دیگر تمام شیعہ فرقوں میں اس کی روح موجود ہے کیونکہ ان کے عقائد اسی سے ماخوذ ہیں۔ لیکن چونکہ ایک شیعہ مصنف (جو گھر کا بھیدی ہے) نے اس کے عملاً وجود کا بھی اقرار کر لیا ہے تو ہمیں اس کے انکار کی کیا ضرورت ہے؟

حکیم فیض عالم صدیقی لکھتے ہیں کہ!

اس فرقہ کا بانی حضرت علیؓ کا غلام نو مسلم مجوسی کیسان تھا اس کے پیرو محمد بن حنفیہ کی شان میں بہت مبالغہ کرتے ہیں کہتے ہیں کہ آپ تمام علوم ظاہری و باطنی نیز تمام اسرار اور علوم

آفاق کے راز دان تھے۔ ان میں سے بعض تناسخ، حلول اور رجعت کے قائل ہیں۔ ان لوگوں نے آگے چل کر تاریخ اسلام میں قرامطیوں، باطنیوں، نزاریوں اور مستعلیوں کی طرح بڑے بڑے فتنے پیدا کیے۔ چنانچہ پروفیسر ڈوزی کیسان کے متعلق لکھتا ہے کہ!

اس کا عقیدہ تھا کہ بلا عذر اطاعت اور لا کلام حکمبرداری ایک ایسے آدمی کی کی جائے جو خدا بھی ہو۔ یہ عقیدہ امت زردشت کا تھا اور کیسان چونکہ ایک زیرز مین نو مسلم مجوسیوں کے گروہ کا سرغنہ تھا۔ اس لئے عرب کے ان پڑھ نو مسلموں میں اس خیال کو پختہ کرنے میں ان لوگوں کو دیر نہ لگی۔ پھر علیؓ اور معاویہؓ کی چپقلش نے بڑے بڑے جلیل القدر مسلمانوں کے اذہان کو پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ چونکہ ان لوگوں کا حقیقی مقصد اسلام دشمنی تھا۔ اس لئے انہوں نے شیعیت کو ہی اپنی مقصد برآری کا ذریعہ بنایا، اور من حیث المجموع شیعہ گروہ میں ہی شمار ہونے لگے۔ ان لوگوں نے شام اور اردن کی سرحد پر جبل الا ردر کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا اس وقت بھی ان لوگوں کی آبادی ایک ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ یہ لوگ اپنے عقائد کی بنا پر ہمیشہ دمشق کے جو اہلسنت کی قوت کا مرکز ہے مخالف رہے ہیں۔ شام میں ہونے والی تخریبی کاروائیوں میں ہمیشہ ان کا ہاتھ رہا۔ فرانسیسی استعمار نے انہیں استعمال کیا۔ اردن کے برطانوی انقلاب نے ان سے کام لیا۔ شام کی پہلی آزاد حکومت کا تختہ الٹنے میں بھی لوگ حسنی الزعیم کا دست و باز و تھے بعث پارٹی کی ریڑھ کی ہڈی بھی یہی ہیں۔ فرانسیسی فوج نے جو شامی فوج بنائی اس میں انہی کی اکثریت تھی بعد از اں اس فوج میں جب بھی اضافہ ہوا اس میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آج تمام عالم اسلام میں شام کے آئے دن کے انقلابات پر مسلمان حیران ہیں مگر یہ کسی کو معلوم نہیں کہ ان انقلابات کے پیچھے کون سے جذبات کارفرما ہیں۔ شام میں کیسانی شیعوں کے علاوہ باطنیوں کی بھی اکثریت ہے۔ یہ باطنی آج کل حموی نصیری اور علوی کہلاتے ہیں۔ دروزیوں کے بعد یہی نصیری بعث پارٹی کا مضبوط عنصر ہیں اور آج کل تو یہی لوگ برسراقتدار ہیں۔ اکرام حورانی۔ مصطفےٰ مدون، کرنل ابو عساف، میجر عبدالجواد بھی کیسانی اور نصیری ہیں۔ ان لوگوں نے محض اسلام دشمنی کی بناء پر بعث پارٹی کا ساتھ دیا........ (حقیقت مذہب شیعہ صفحہ ۳۲۹)

اس تفصیل سے واضح ہو گیا ہے کہ فرقہ کیسانیہ (جو حضرت زین العابدین کی روپوشی اور علیحدگی کے بعد شیعوں کا ترجمان تھا) کا بانی اور اس کے عقائد کو فروغ دینے والی سرکار حضرت

مختار بن ابی عبید ثقفی ہیں۔ یہ ذات شریف کون ہیں اور ان کا کیا کردار رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

مختار ثقفی

مختار بن ابی عبید بن مسعود بن عمرو بن عمیر بن عوف الثقفی ایک شیعی تحریک کا بانی اور قبیلہ ثقیف سے تھا۔ اس کے والد صحابی رسول ﷺ ابو عبید الثقفی جب ۱۳ھ میں ایرانیوں کے خلاف لڑتے ہوئے جنگ جسر میں شہید ہو گئے تو اس یتیم بچے کی پرورش اس کے چچا سعد بن مسعود نے کی جو حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں المدائن کے حاکم تھے۔ طبری اور ابن کثیر کے بقول جب حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ کے مقابلہ سے گریز کر کے مختار کے چچا سعد بن مسعود کے پاس پناہ لی جو اس وقت المدائن کے والی تھے۔ تو مختار (جو ابھی جوان تھا) نے اس موقع پر چچا کو یہ مشورہ دیا کہ حضرت حسنؓ کو ان کے حریف کے حوالے کر دیا جائے۔

حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد مختار گمنامی کے پردے سے دوبارہ نمودار ہوا اس نے ۶۰ھ میں مسلم بن عقیل کی حمایت میں نمایاں حصہ لیا تو ابن زیاد نے اسے قید کر دیا۔ واقعہ کربلا کے بعد رہا ہو کر مکہ چلا گیا۔ جہاں عبداللہ بن زبیر خفیہ طور پر ایک تحریک کی تیاری میں معروف تھے۔ مختار نے ابن زبیر کو قبل از وقت بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ناکامی پر وہ واپس طائف آ گیا۔ جہاں وہ اپنے آئندہ کے منصوبے پر غور و خوض کرتا رہا۔ اسی زمانے میں اس نے شیعی تحریک کو ایک نئے سیاسی یعنی حربی سیاست اور مذہبی رنگ میں پیش کر کے اس کی قیادت سنبھال لی۔ عبداللہ بن سبا کا بروز ثانی مختار کوفہ کی حربی سیاست اور شورش پسند میلانات کا خوب تجربہ رکھتا تھا اور حکومت و سیادت کی آرزو بھی اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ اس لئے اس نے سب سے پہلے حکومت پر قبضہ کرنے کے لئے شیعیت کو وسیلہ بنایا۔ وہ پہلے خارجی تھا پھر زبیری بنا پھر شیعہ اور کیسانی بن گیا۔ یزید کے انتقال کے بعد مختار نے ابن زبیرؓ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کر لی اور پانچ ماہ تک انتظار کیا کہ ابن زبیرؓ سے کوئی بڑا عہدہ عطا کریں گے لیکن اس کوشش میں ناکامی کے بعد اس نے محمد بن حنفیہ کی طرف رجوع کیا اور کہا کہ میں کوفہ جا رہا ہوں وہاں حسینؓ کا انتقام لوں گا اور آپ کے لئے حکومت حاصل کروں گا۔ دوسری طرف اس نے ابن زبیرؓ سے کوفہ جانے کی اجازت مانگی کہ میں وہاں کے الجھے ہوئے [illegible] سلجھانے میں آپ کے حاکم کی مدد کروں گا اور کوشش کروں گا کہ سب لوگ آپ کے وفادار بن جائیں۔ پھر ان کی بڑی

فوج لیکر شام پر چڑھائی کروں گا۔ چنانچہ ابن زبیرؓ نے اسے کوفہ جانے کی اجازت دے دی۔ کوفہ پہنچ کر مختار نے عبداللہ بن مطیع (گورنر ابن زبیرؓ) پر ظاہر کیا کہ وہ ان کا معاون اور ابن زبیر کا وفادار ہے جبکہ شیعوں پر ظاہر کیا کہ وہ ابن حنفیہ کا نمائندہ ہے جو ان کی مدد سے حکومت حاصل کرنے کی مہم پر مامور کیا گیا ہے اس نے یہ بھی کہا کہ مجھے ابن حنفیہ نے ایک ہدایت نامہ بھی دیا ہے جس کے بموجب حکومت کی جدوجہد میں مجھے عمل کرنا ہے۔ ابن حنفیہ کو اس نے وصی بن وصی اور مہدی بن مہدی کے لقب دیئے۔ اور ان کے فضل وتقویٰ کو خوب سراہا۔ بڑی چالاکی اور احتیاط سے اس نے مہم چلائی۔ شیعہ فوج در فوج اس کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ ان میں غلاموں اور موالی کی تعداد بہت تھی۔ چند ماہ میں ان کی قوت اتنی بڑھ گئی کہ گورنر ابن مطیع کو کوفہ چھوڑ کر بھاگنا پڑا اور حکومت کوفہ پر ۶۶ھ میں مختار کا قبضہ ہو گیا۔ یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ مختار نے قوت حاصل کرنے کے بعد قاتلین حسینؓ سے کوئی قصاص نہیں لیا۔ جبکہ وہ لوگ کوفہ میں موجود تھے اور ایک سال تک انہیں ڈھیل دیتا رہا۔ پھر جب مقامی سرداروں نے مختار کے رویے سے تنگ آ کر بغاوت کی تو اس نے انتقام حسینؓ کی آڑ میں خوب قتل وغارت کی۔

مختار ثقفی نے نہایت چالاکی سے کوفیوں کو اپنی کرامتوں اور خوارق عادت کرشموں کا یقین دلایا۔ حضرت علیؓ جب کوفہ میں قیام پذیر تھے تو ان کی ایک کرسی تھی جس پر وہ اکثر بیٹھتے تھے۔ وہ کرسی ان کے بھانجے جعدہ بن ام ہانیؓ کے قبضہ میں تھی۔ مختار نے وہ کرسی ان سے طلب کی انہوں نے وہ کرسی تو نہ دی مگر ایک دوسری اسی قسم کی کرسی پیش کر دی۔ مختار نے اس کرسی کو سامنے رکھ کر دو رکعت نماز پڑھی پھر بوسہ دیا اور اپنے تمام مریدوں کو جو اس کی فوج کے سپاہی تھے جمع کر کے کہا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تابوت سکینہ کو بنی اسرائیل کے لئے موجب نصرت و برکت بنایا تھا اسی طرح اس کرسی کو شیعان علیؓ کے لئے نشانی قرار دیا ہے۔ اب ہمیں ہر جگہ فتح و نصرت حاصل ہو گی۔ لوگوں نے اس کرسی کو بوسے دیئے اور اس کے آگے سجدے کئے۔ مختار نے ایک نہایت خوبصورت اور مرصع صندوق یعنی تابوت بنوایا۔ اس کے اندر کرسی رکھی گئی۔ تابوت میں چاندی کا قفل لگایا گیا۔ جامع مسجد کوفہ میں تابوت کو رکھ کر اس کی حفاظت کے لئے ایک فوجی گارڈ مقرر ہوا۔ ہر شخص جو جامع مسجد کوفہ میں نماز پڑھتا اسے نماز کے بعد تابوت کو ضرور بوسہ دینا پڑتا۔ اس کے بعد مختار نے نہایت چالاکی سے بتدریج اپنے الہام و وحی کا ذکر لوگوں سے کیا اور پھر بہت

جلد نبوت کا مدعی بن کر اپنے نبی ہونے کا اقرار کرنے لگا۔

مختار کے دیگر عقائد و نظریات بالخصوص عقیدہ رجعت و بداء پیچھے زیر عنوان "کیسانیہ کے عقائد" بیان ہو چکے ہیں۔

مختار بن ابی عبید ثقفی حضرت حسینؓ یا اہل بیت کا ہرگز محب اور حامی نہیں تھا۔ اس نے حکومت و اقتدار کے لالچ میں اس نعرہ کو شعار بنایا۔ عبداللہ بن سبا کے فتنہ خفتہ کو دوبارہ بیدار کر کے خاندانی امتیازات اور قبائلی عصبیتوں میں جان ڈالی ایرانی موالی اور غلاموں کے ذریعے عربوں کی تذلیل کی۔ حضرت حسنؓ کو (انعام کے لالچ میں) گرفتار کر کے حضرت معاویہؓ کے سپرد کرنے کی کوشش کی۔ حضرت حسینؓ کو دعوت دیکر بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ پھر عبداللہ بن زبیرؓ کی بیعت کر کے گورنری کا طلبگار رہا ناکامی کے بعد قاتلین حسینؓ سے مل کر کوفہ کے قصر امارت پر قبضہ کیا اور قاتلین حسینؓ سے کوئی تعرض نہ کیا بلکہ انہیں اپنا مقرب بنایا۔ بعد میں جب اس کے خلاف بغاوت ہوئی تو پھر اس نام کی آڑ میں خوب قتل و غارت کی۔ اقتدار کے نشے میں اندھا ہو کر اس نے حضرت علیؓ کے صاحبزادے عمر کو دھتکارتے ہوئے کہا جاؤ دفع ہو میرے پاس تمہارے لئے کوئی بھلائی نہیں ہے پھر انہیں قتل کرا دیا۔

مختار کی حضرت محمد بن حنفیہ کے ساتھ محبت کا یہ عالم ہے کہ جب اسے پتہ چلا کہ ابن حنفیہ کوفہ تشریف لانا چاہتے ہیں تو کہنے لگا کہ مہدی کی علامت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اسے تلوار سے مارے تو تلوار اس پر اثر نہ کرے جب اس کی یہ بات محمد بن حنفیہ کو پہنچی تو وہ وہیں ٹھہر گئے۔

(الانساب للبلاذری صفحہ ۲۷۶ جلد ۵)

مختار کے عقائد و نظریات حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت محمد بن حنفیہ اور حضرت زین العابدین کے عقائد و نظریات سے یکسر مختلف اور یہودیت، مجوسیت اور نصرانیت سے ماخوذ تھے اور وہ صحیح معنوں میں عبداللہ بن سبا کا بروز ثانی تھا۔

مختار ثقفی کو حضرت علیؓ کے داماد اور حسنینؓ کے بہنوئی حضرت مصعب بن زبیرؓ نے ۱۴ رمضان ۶۷ھ کو شکست دے کر کوفہ میں قتل کیا جس سے کوفہ میں اس کے دور حکومت (۱۴ ربیع الاول ۶۶ھ تا ۱۴ رمضان ۶۷ھ) کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

بعض اہل تشیع نے اپنے بزرگ اور مذہب شیعہ کے بانی عبداللہ بن سبا کے وجود کا

انکار تو کیا لیکن اس کے بروز ثانی مختار ثقفی کو حضرت زین العابدین کی بیعت نہ کرنے کے باوجود شیعہ کا ہیرو اور قابل فخر قرار دے دیا۔ مزید حیرت یہ ہے کہ شیعہ کے نزدیک امام معصوم اور مامور من اللہ ہوتا ہے۔ جس کے بغیر جہاد قلمی اور سیفی دونوں حرام ہیں۔

مرتضیٰ حسین فاضل لکھتے ہیں کہ!

مختار کی ابتدائی زندگی مدینہ اور طائف میں گذری اس نے عہد نبوت دیکھا اور عہد علی میں حضرت علیؑ کی شفقتوں اور دعاؤں سے سرفراز ہوا۔ شروع سے محبت اہلبیت تھی اور اس کا شمار شیعوں میں ہوتا تھا۔ جب امام زین العابدین اور امام محمد باقر و امام جعفر صادق کی تعریفی دعائیں ملتی ہیں۔ تو محققین علم رجال شیعہ مختار کے خلاف خبروں کو مسترد کر دیتے ہیں۔

(عباس قمی الآمال تہران ۱۳۷۹ھ صفحہ ۱۵ جلد ۱ علی نقی شہید انسانیت ۳۴۳)

بقول شیعہ مختار نے چونکہ امام حسین کے قاتلوں کو سخت سزائیں دیں اور عبداللہ بن زبیر کا ساتھ نہیں دیا۔ اس لئے انہیں (مختار کو) دو بڑے گروہوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان دونوں گروہوں کی طرف سے افواہوں اور مخالف پروپیگنڈے کو مخالفین اہل بیت اب تک مختار کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ جناب مسلم بن عقیلؑ کا بحیثیت نمائندہ امام علیہ السلام مختار کے گھر میں اترنا ثابت کرتا ہے کہ وہ قطعی محب اہلبیت تھا۔ بلکہ جناب مسلم بن عقیلؑ کی نظر میں مختار سب سے بڑا حامی و مددگار تھا اور جب مختار نے کوفے کے سربر آوردہ لوگوں کو مسلم کی حمایت پر جمع کیا اور بیرون کوفہ اپنے علاقے میں جا کر سپاہی تلاش کیے تو اسے اس جرم میں گرفتار کر لیا گیا اور سزا دی گئی ان کی قید کا سلسلہ اتنا طویل ہوا کہ جناب مسلم شہید ہوئے اور سانحہ کربلا پیش آ گیا اور مختار کو مسلم اور امام حسینؑ کی مدد اور ان واقعات کی اطلاع سے محروم رکھا گیا۔ (فاضل مضمون نگار سے کون پوچھے کہ اگر بالفرض مختار گرفتار ہو گیا تھا۔ تو کیا باقی ہزاروں کی تعداد میں بیعت کرنے والے شیعوں کو زمین نگل گئی تھی انہوں نے کیوں نہ مدد کی؟)..........

یزید کی موت سے کوفے میں شامی حکومت کے طرف داروں کی کمر ٹوٹ گئی۔ اہل شہر نے عمرو بن حریث حاکم کوفہ کو نکال دیا۔ اب حالات مختار کے منتظر تھے۔ مختار نے سوچا اگر اس موقع پر امام زین العابدین کی بیعت کر کے انہیں قائد بنا لیا جائے تو بہت مناسب ہو مگر امام آمادہ نہ ہوئے تو اس نے جناب محمد بن حنفیہ کے حوالے سے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا لیا اب مختار کو کوفے

میں دو طاقتوں سے مقابلہ کرنا پڑا عبداللہ بن زبیر سے جو کوفے کے حکمران تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی حکومت مختار کو خون خرابے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ (یہ بھی شیعہ کا بدترین جھوٹ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ابن زبیرؓ کے گورنر نے خود مختار کو قاتلین حسینؓ سے انتقام لینے کی پیش کش کی۔ مگر مختار کا مقصد صرف حصول اقتدار اور مذہب شیعہ کی اشاعت تھا۔ اس لئے اس نے حجاز کی سنی حکومت اور شام کی سنی حکومت دونوں سے ٹکر لی) دوسری طرف قاتلان امام حسینؑ شام کی حمایت میں تھے۔ اس لئے یہ یقینی تھا کہ اگر انہیں چھیڑا گیا تو حکومت شام ضرور مداخلت کرے گی۔ پھر دونوں حکومتوں اور دونوں گروہوں کے پروپیگنڈے کا بھی سامنا تھا۔ کوئی انہیں علم غیب کا مدعی کہنے لگا۔ کسی نے ایک نئے مذہب کا بانی قرار دیا۔ کسی نے الزام لگایا کہ وہ جعلی خط بناتا اور جھوٹی خبریں گھڑتا ہے۔ مختار سب کچھ سنتا اور آگے بڑھتا رہا۔ مختار نے عبداللہ بن مطیع کو کوفے سے نکال دیا اور خود نظم و نسق سنبھال لیا۔ مختار نے عبیداللہ بن زیاد، حصین بن نمیر، شرجیل بن ذی الکلاع اور عمرو بن سعد کے سروں کو مدینے میں امام زین العابدینؑ اور محمد بن حنفیہ کے پاس روانہ کیا۔ امام زین العابدینؑ سجدہ شکر بجالائے اور فرمایا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمارے دشمنوں سے ہمارا بدلہ لیا اللہ مختار کو جزا دے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہاشمی خواتین نے سروں میں کنگھی اور بالوں میں اس وقت تک خضاب نہیں لگایا۔ جب تک مختار نے قاتلان امام حسینؑ کے سر نہ بھیجے ....

(یہ بھی امام موصوف پر اتہام ہے۔ حیرت ہے کہ ہاشمی خواتین نے ۱۰ محرم ۶۱ھ سے لیکر ۶۷ھ تک سروں میں کنگھی نہیں کی۔ پنجاب یونیورسٹی نے کیوں کر اس تحقیقی مقالہ کو اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے اوراق کی زینت بنایا؟ فیا اسفا)

عبداللہ بن زبیرؓ نے بصرے میں مختار کے مخالفین کا زور دیکھا تو اپنے بھائی مصعب بن زبیر کو والی بصرہ بنا کر بھیج دیا۔ مصعب بن زبیر بصرے آئے تو یہاں شبث بن ربعی، محمد بن اشعث، مرہ بن منقذ عبدی، سنان بن انس اور عبداللہ بن عروہ خثعمی نے مختار کے خلاف آواز اٹھائی مصعب نے انہیں ساتھ لیا اور کوفے پر حملہ کر دیا۔ مگر مختار اپنے مقصد کو حاصل کر چکا تھا اس لئے بڑی دلیری سے مرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ وہ خود میدان جنگ میں آیا اور کئی دن تک دشمن سے جنگ کرتا رہا۔ اور آخری وقت میں محمد بن اشعث کو قتل کیا مگر بالآخر مارا گیا۔ ۱۴ رمضان ۶۷ھ / ۶۸۷ء کو مختار کا جسم کوفے کی مسجد جامع کے قریب دفن ہوا۔ جس پر بعد میں گنبد والی عمارت بنائی

گئی۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اس مقبرے کو دیکھا تھا۔

{الطبری جلد نمبر ۷، المسعودی مروج الذھب والتنبیہ الاشراف، ابو اسحٰق الاسفرائنی قرۃ العین فی اخذ ثار الحسین بمبئی ۱۲۹۲ھ، مثیر الاحزان واخذ الثار فی احوال المختار مطبوعہ طہران، نور اللہ شوستری مجالس المومنین جلد نمبر ۲ طہران ۱۲۷۹ھ، شیخ عباس قمی منتہی الآمال طہران ۱۲۷۹ھ، سفینۃ البحار جلد نمبر ۱ نجف، عماد الدین حسین اصفہانی زندگانی حضرت ابی عبداللہ الحسین سید الشہداء جلد نمبر ۲ طہران ۱۳۸۷ھ، عبد الرزاق الموسوی مقتل الحسین او حدیث کربلا نجف ۱۳۸۳ھ، تاریخ الکوفہ نجف ۱۲۷۹ھ، نجم الحسن کراروی مختار آل محمد لاہور ۱۹۶۲ء، سید علی نقی شہید انسانیت الہ آباد ۱۹۶۰ء بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد نمبر ۲۰}

بہر حال اہل تشیع نے اعتراف کر لیا ہے کہ مختار ثقفی شیعوں کا محسن اور ایک عظیم لیڈر تھا۔ کیونکہ ائمہ (زین العابدین، محمد باقر، جعفر صادق) نے اس کے لئے دعائیں کی تھیں۔ اب تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ حضرت جعفر صادق سے روایت ہے کہ مختار حضرت امام زین العابدین سے غلط روایتیں منسوب کرتا تھا۔ {رجال کشی بحوالہ مختار نامہ صفحہ ۳۴۹}

کیا امام کی طرف جھوٹی نسبت کرنے والے کا ٹھکانا جہنم نہیں ہے؟

حضرت محمد الباقر سے روایت ہے کہ مختار نے حضرت زین العابدین کی خدمت میں ہدیے اور تحفے بھیجے مگر آپ نے یہ کہہ کر واپس کر دیے کہ میں کسی دروغ گو کا ہدیہ قبول نہیں کرتا

{حوالہ مذکور}

ایک دفعہ مختار نے ایک لاکھ درہم امام زین العابدین کی خدمت میں بھیجے مگر آپ نے قبول کرنا مکروہ جانا اور واپس بھیجنے میں خوف محسوس کیا اور رقم لیکر دفن کر دی مختار کے قتل کے بعد امیر المومنین عبدالملک کو مطلع کیا تو اس نے کہا خرچ کر لیجئے

امام زین العابدین نے مختار پر لعنت بھی بھیجی اور فرمایا کرتے تھے کہ اس نے ہم پر اور خدا پر بہتان اور افتراء باندھا ہے وہ یہ بھی کہتا تھا کہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ حضرت جعفر صادق سے روایت ہے کہ قیامت کے روز جناب سید الثقلین حضرت امیر المومنین اور حسنین جہنم کے کنارے تشریف لے جائیں گے اور مختار کو جہنم میں دیکھیں گے۔ جناب امیر کی شہادت پر لوگوں کا خیال تھا کہ مختار بھی ابن ملجم کا ساتھی ہے اس لئے کوفہ میں ہر نماز کے بعد لوگ اس پر لعنتیں بھیجتے تھے۔ مختار نے اپنے چچا سعد بن مسعود کو حضرت حسنؓ کی گرفتاری پر آمادہ کرنا چاہا مگر اس نے کہا لعنت ہو تجھ پر مجھے کتنے برے کام کیلئے کہتا ہے۔

(تلخیص و تحریر سید محمد ابراہیم قبلہ مجتہد العصر ۔ ۔ صفحہ ۴۹ ۔ ۲۷۴ حقیقت مذہب شیعہ سنی)

شیعیت سید محمد باقر کے عہد میں

شیعہ اثنا عشریہ کے نزدیک حضرت زین العابدینؑ کی وفات (۹۵ھ) کے بعد حضرت محمد الباقر منصب امامت پر فائز ہوئے اور ۱۱۴ھ میں بزمانہ ہشام بن عبدالملک وفات پائی۔ عقیدہ امامت پر مستقل بحث آگے آرہی ہے۔ یہاں چند بنیادی نکات ملاحظہ فرمالیں۔

۱. ائمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء و مرسلین کی طرح مقرر اور نامزد کئے جاتے ہیں۔
۲. ائمہ نبی کی طرح معصوم ہوتے ہیں۔
۳. دنیا کبھی امام کے وجود سے خالی نہیں ہوتی خواہ وہ ظاہر ہو یا غائب۔
۴. ائمہ کی اطاعت بھی انبیاء و مرسلین ہی کی طرح امت پر فرض ہوتی ہے۔
۵. ائمہ کا درجہ نبی اکرمؐ کے برابر اور دوسرے انبیاء سے بالاتر ہوتا ہے۔
۶. ائمہ امت کے دینی و دنیوی سربراہ اور حاکم ہوتے ہیں۔
۷. امت پر بلکہ ساری دنیا پر حکومت کرنا صرف امام ہی کا حق ہے۔
۸. امام کے علاوہ جو بھی حکومت کرے وہ غاصب ظالم اور طاغوت ہے۔
۹. امامت بغیر نص کے قائم نہیں ہوتی۔
۱۰. امام وقت حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر سکتا ہے۔
۱۱. امامت کا انکار کرنے والا کافر ہے۔
۱۲. ائمہ کے مقابلے میں دعویٰ امامت کرنے والے ظالم، زندیق اور کافر ہیں اگرچہ وہ فاطمی یا علوی ہی کیوں نہ ہوں۔

عقیدہ امامت کے حوالے سے شیعہ حضرات کے درمیان امام دوم تک کوئی اختلاف واقع نہیں ہوا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے درمیان سب سے پہلا اختلاف حضرت حسینؑ کی شہادت کے بعد حضرت زین العابدین کے دور میں چچا اور بھتیجے کے درمیان شروع ہوا۔ شیعہ کے ایک گروہ نے حضرت زین العابدین کو امام تسلیم کیا۔ جبکہ دوسرا گروہ محمد بن حنفیہ کی امامت کا قائل ہوا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ حضرت حسینؑ کے بعد امامت حضرت علیؑ کے اس وقت موجود سب سے بڑے بیٹے (محمد بن حنفیہ) کا حق ہے۔ یہ لوگ کیسانیہ کہلائے۔ شیعہ پہلے خلفاء ثلاثہ، حضرت معاویہ، عثمان کے تبعین

کو حضرت علیؓ کی امامت کا مخالف اور منکر ٹھہراتے تھے۔ اب خود حضرت علیؓ ہی کے لڑکے محمد بن حنفیہ ان کے پوتے علی بن حسینؓ (زین العابدین) کی امامت کا انکار کر کے اسی صف میں شامل ہو گئے اور حضرت زین العابدین نہ صرف محمد بن حنفیہ کی وفات (۸۱ھ) بلکہ اپنی وفات (۹۵ھ) تک روپوشی اور گوشہ نشینی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ شیعہ کے جس گروہ نے حضرت زین العابدین کو امام تسلیم کیا تھا۔ اسی گروہ میں پھر ان کی جانشینی کے سلسلہ میں شدید اختلاف ہوا۔ یہ اختلاف خود حضرت زین العابدین کے دو صاحبزادوں کے درمیان رونما ہوا۔ شیعہ کے ایک گروہ نے (جس میں اسماعیلیہ اور اثنا عشریہ دونوں شاخیں شامل ہیں) حضرت زین العابدین کے بڑے صاحبزادے محمد الباقر کو امام تسلیم کر لیا۔ امام باقر کے دور میں پانچ اموی خلفاء یکے بعد دیگرے برسرِ اقتدار رہے۔

(ولید بن عبدالملک کی خلافت کے آخری دو سال، سلیمان بن عبدالملک، عمر بن عبدالعزیز، یزید الثانی بن عبدالملک اور ہشام بن عبدالملک)

لیکن موصوف نے ان میں سے کسی کے خلاف کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ اگر اموی خلفاء کی حکومت یا ان کا کردار خلافِ اسلام ہوتا تو امام موصوف جن کا کام ہی حفاظت و اشاعتِ دین تھا کیوں کر خاموش رہ سکتے تھے؟ البتہ شیعوں نے (جن کا مقصد ہی مملکتِ اسلامیہ میں انتشار و خلفشار پیدا کرنا ہے) حضرت موصوف کو اموی خلفاء کے بالمقابل لا کھڑا کرنے کے بہت جتن کیے مگر بری طرح ناکام رہے پھر انہوں نے ان کے دوسرے بھائی زید بن زین العابدین کی طرف رجوع کیا جس میں انہوں نے خوب کامیابی حاصل کی۔ شیعہ مجتہد علامہ سید محمد طباطبائی حضرت باقر کے دور پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ!

شیعوں کے پانچویں امام کے زمانہ میں۔ اموی حکومت میں کمزوری اور ضعف کے باعث شیعہ اسلامی ممالک کے کونے کونے سے پانچویں امام کے ارد گرد جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ تاکہ علم حدیث اور علم دین حاصل کر سکیں۔ ابھی پہلی صدی ہجری اختتام کو نہیں پہنچی تھی کہ حکومت کے چند ایک اعلیٰ عہدیداروں نے ایران میں شہر قم کی بنیاد رکھی اور اس شہر میں شیعوں کو لا کر آباد کیا۔ لیکن اس کے باوجود شیعہ چھپ چھپا کر اور اپنے مذہب کا اعلان کیے بغیر زندگی گذارتے رہے۔ اس دوران کئی بار علوی سادات نے اپنے اپنے زمانے کی حکومتوں کے ظلم و ستم

اور دباؤ کے خلاف تحریکیں شروع کیں۔ لیکن ان کو ہر بار شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور آخر کار اس راہ میں اپنی جان کی بازی لگاتے رہے مگر اس وقت کی حکومتوں نے ان کے جان و مال کو پامال کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ حضرت زید بن علی جو شیعہ زیدیہ کے امام تھے۔ ان کی نعش کو قبر سے نکال کر سولی پر چڑھایا گیا اور یہ لاش تین سال تک برابر لٹکتی رہی اور اس کے بعد لاش کو سولی سے اتار کر آگ میں جلا دیا گیا اور راکھ کو ہوا میں اڑا دیا گیا۔ یہاں تک کہ اکثر شیعہ جو چوتھے اور پانچویں امام کے معتقد اور پیروکار تھے۔ بنو امیہ کے ہاتھوں زہر دے کر شہید کر دیئے گئے اور اسی طرح امام دوم اور امام سوم کی شہادت بھی ان ہی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ (شیعہ صفحہ ۴۸-۴۷)

موصوف نہایت ہی منصف مزاج معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے یہاں امام اول کی شہادت کا الزام بنو امیہ پر عائد نہیں کیا۔ اگر وہ تھوڑا سا مزید غور کر لیتے تو انہیں امام دوم و سوم کے قتل کے الزام کی بھی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ کیونکہ امام اول کے قاتل وہی ہیں۔ جو امام دوم و سوم کے قاتل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باقی ائمہ شیعوں کے دام تزویر میں نہیں پھنسے بلکہ بارہویں امام نے تو صغرسنی ہی میں انہیں پہچان لیا اور "غیبت" اختیار کر کے اپنی جان بچائی۔ حیرت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امام باقر کو اس عظیم منصب کے لئے منتخب فرمایا لیکن وہ اپنی آنکھوں سے دین میں تحریف اور تغیر و تبدل دیکھتے رہے۔ شیعوں پر مظالم کا مشاہدہ کرتے رہے لیکن انہوں نے کوئی احتجاج تک نہیں کیا۔ دیگر علوی و فاطمی سادات نے اپنی جانوں تک کی بازی لگا دی۔ مگر امام نے خاموشی کو ترجیح دی۔ علامہ طباطبائی یہ کہتے ہیں کہ اموی حکمرانوں نے چوتھے اور پانچویں امام کے شیعوں کو زہر دے کر شہید کیا۔

تو سوال یہ ہے کہ زیدی شیعوں کی طرح اثنا عشری شیعوں کو قتل کیوں نہیں کیا؟ ان بے چاروں نے نہ اپنا مذہب ظاہر کیا۔ نہ کسی باغیانہ تحریک کا ساتھ دیا۔ نہ حکومت کا تختہ الٹنے کی کوئی کوشش کی اور نہ ہی ظلم کے خلاف کوئی احتجاج کیا تو پھر ان "معصوموں" کو زہر دے کر ہلاک کرنے کی انہیں ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟! اگر واقعتہً ایسا ہوا ہوتا تو امام باقر کے پاس شیعوں کا سیلاب کیسے امڈ آتا؟ یہی مصنف دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ پانچویں امام کے زمانہ امامت میں ایک طرف تو بنی امیہ کے مظالم کی وجہ سے اسلامی ممالک میں ہر روز انقلاب اور جنگیں رونما ہوتی رہتی تھیں اور دوسری طرف خود اموی خاندان میں اختلافات پیدا ہو رہے تھے اور ان مشکلات

نے خلافت اور حکومت کو اپنی طرف مشغول کر رکھا تھا۔ اس طرح ایک حد تک وہ اہلبیت پر ظلم کرنے سے باز رہے۔ دوسری طرف واقعہ کربلا اور اہلبیت کی مظلومیت جس کی مثال امام چہارم تھے ایسے امور تھے جو مسلمانوں کو اہلبیت کا گرویدہ بنا رہے تھے ان حالات وعوامل کی وجہ سے عوام اور خصوصاً شیعہ ایک سیلاب کی مانند پانچویں امام کے پاس مدینہ منورہ میں پہنچ کر اسلامی حقائق اور تعلیمات اہلبیت حاصل کرنے میں پیش پیش تھے اور آپ کے پاس لوگوں کا اس قدر مجمع لگا رہتا تھا کہ آپ سے پہلے ائمہ اہلبیت کو ایسا موقع میسر نہ آسکا تھا۔ (شیعہ صفحہ ۲۰۰)

شیعی نقطہ نظر سے امام اول کے متعلق تو یہ درست تجزیہ ہے کہ اسلامی حقائق سکھانے کے لئے انہیں اس قدر مجمع میسر نہ آسکا تھا۔ اگر وہ اصلاح کرنا بھی چاہتے تو مسلمان "واعمراہ" کی صدا بلند کر دیتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنا مشن پیش کرنے سے رک جاتے تھے۔ لیکن امام دوم اور امام سوم تو دور معاویہ میں پورے دس سال اور بیس سال تک انتہائی سکون واطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔ اس دوران ان کی کوئی دوسری انتظامی وسرکاری مصروفیات بھی نہیں تھیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انہوں نے مذہب شیعہ کی اشاعت میں دلچسپی نہیں لی؟ اسی طرح حضرت زین العابدین کو واقعہ کربلا کے بعد چونتیس سال کا طویل عرصہ نصیب ہوا لیکن ایک دو خصوصی شاگردوں ابوحمزہ ثمالی اور ابوخالد کابلی کے علاوہ ان کے قریب کوئی پھٹکنے بھی نہ پایا۔ دراصل اصول کافی کی درج ذیل روایت نے اس راز سے پردہ اٹھا دیا۔

پھر امام محمد بن علی ابوجعفر تشریف لائے اور شیعان علی ان کی آمد سے قبل احکامات حج اور حلال وحرام کو قطعاً نہ جانتے تھے۔ انہوں نے آکر طریقہ حج اور حلال وحرام کو خوب بیان کیا۔ یہاں تک کہ اب اور لوگ (غیر شیعہ) ان معاملات ومسائل میں اہل تشیع کے محتاج ہو گئے۔ حالانکہ ان سے پہلے خود شیعہ ان لوگوں سے مسائل معلوم کرنے کے محتاج تھے۔ (اصول کافی صفحہ ۳۹۶)

شیعہ کا ایک گروہ حضرت محمد باقرؑ کے متعلق بھی غلو کا شکار ہو گیا اور ان سے فرقہ باقریہ نے جنم لیا۔ جو حضرت باقرؑ کے متعلق حیّ لا یموت کا عقیدہ رکھتا ہے ان کو امام منتظر مانتا ہے۔

حضرت محمد باقرؑ کے دیگر مخالفین کا کیا ذکر خود ان کے حقیقی بھائی حضرت زید بن زین العابدینؒ نے اپنے بھائی کو امام تسلیم کرنے کی بجائے خود اپنی امامت کا دعویٰ کر دیا۔ حضرت زید کی امامت تسلیم کرنے والوں میں حسنی وحسینی سادات پیش پیش تھے اور انہوں نے اس تحریک

میں فعال کردار ادا کیا۔ ان کے متبعین اور پیروکار زیدیہ کہلائے۔ اس فرقہ کے عقائد و نظریات پیش کرنے سے قبل اس فرقہ کے بانی حضرت زید بن زین العابدین کی سیرت کا اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت زید بن زین العابدینؒ

زید بن علی بن حسینؓ بن علیؓ بن ابی طالب فاطمی وعلوی خانوادوں کے جید عالم، جوان مجاہد اور فرقہ زیدیہ کے امام جن کے پیروکار خاصی تعداد میں یمن میں موجود ہیں۔ وہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہ کے پوتے حضرت علی بن حسینؓ کے فرزند تھے۔ زید مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے تاریخ ولادت میں اختلاف ہے "الحدائق الوردیۃ فی مناقب لائمہ الزیدیۃ" کے مطابق ۷۵ھ تہذیب ابن عساکر میں ۷۸ھ اور بعض کے نزدیک ۶۷ھ ہے۔ لیکن بیالیس سال کی عمر میں شہید ہونے پر اتفاق ہے۔ لہٰذا ناجی حسن، ابوزہرہ اور ابراہیم بن الوزیر نے ۸۰ھ پر اتفاق کیا ہے۔ (ثورۃ زید صفحہ ۲۵ الامام زید صفحہ ۲۲)

حضرت زید بن علیؓ صرف ایک عالم و فاضل اور عابد و زاہد ہی نہیں تھے۔ بلکہ بذات خود ایک مجتہد اور فقیہ بھی تھے۔ موصوف نے اپنے بھائی محمد الباقرؒ اور بھتیجے حضرت جعفر صادقؒ کی امامت کا انکار کر کے اپنی امامت کا اعلان کیا تھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک امام کے لئے اپنی امامت کا اعلان کرنا ضروری ہے۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں کہ

زید اپنے بھائی محمد باقر سے اس دعویٰ پر کہ امام کے لئے امامت کا اعلان کرنا ضروری ہے۔ مناظرہ کیا کرتے تھے۔ امام باقر انہیں الزام دیا کرتے تھے۔ کہ اس شرط کی رو سے ہمارے والد زین العابدین امام ثابت نہیں ہوتے۔ کیونکہ انہوں نے نہ کبھی امامت کا دعویٰ کیا اور نہ کبھی اس کا خیال ان کے دل میں آیا اور امام موصوف معتزلہ کے مذہب کی تردید کرتے تھے اور اپنے بھائی زید سے کہا کرتے تھے کہ تم نے یہ رائے معتزلہ سے لی ہے۔ یعنی واصل بن عطاء سے جو معتزلہ کا امام و سرغنہ ہے۔ (مقدمہ ابن خلدون صفحہ نمبر ۳۸۲ جلد ا)

اصول کافی میں امام محمد باقرؒ سے روایت ہے کہ: ایک دفعہ زید بن علیؓ حضرت باقرؒ کے پاس آئے اور ان کے پاس کوفیوں کے خطوط تھے۔ جن میں زید کو کوفہ آنے کی دعوت اپنے اکٹھے ہونے کی اطلاع اور حکومت کے خلاف خروج کا مشورہ دیا گیا تھا۔

حضرت باقرؒ نے ان سے پوچھا کیا ان خطوط کی ابتدا کوفیوں کی طرف سے ہے یا آپ کے

کسی خط کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ جناب زیدؒ نے کہا ان کی ابتداء ان کی طرف سے ہی ہے۔ کیونکہ وہ لوگ ہمارے حقوق سے بخوبی واقف ہیں اور آپؑ سے ہماری قرابت کے متعلق بھی بخوبی جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ہمارے ساتھ دوستی کے وجوب کو اور اطاعت کے فرض کو وہ اچھی طرح جانتے ہیں اور اس لئے کہ انہوں نے ہماری تنگ دستی۔ پریشان حالی اور مصائب کو خوب جانا ہے۔ یہ سن کر جناب محمد باقرؑ نے کہا بے شک اللہ کی طرف سے اطاعت فرض کی گئی ہے اور یہ ایسا طریقہ ہے جو پچھلے گذرے لوگوں میں چلا آرہا ہے اور اسی طرح بعد میں آنے والوں میں بھی جاری رہے گا اور ہم میں سے کسی ایک کی اطاعت ہے اور ہم تمام سے محبت و مودت لازم ہے۔ اللہ کا حکم اس کے اولیاء میں جاری ہوتا ہے۔ یہ حکم متصل جاری ہے۔ یہ رجوع ان کی طرف فیصل شدہ ہے اور یقینی امر ہے اور ایک وقت مقررہ تک اس کی مدت معین ہے۔ تو اللہ تعالیٰ پر یقین نہ رکھنے والے کہیں تمہیں دھوکہ میں نہ ڈال دیں۔ یہ لوگ اللہ کے مقابلے میں تمہارے کچھ کام نہیں آسکتے لہٰذا آپ جلد بازی سے کام نہ لیں بے شک اللہ تعالیٰ بندوں کی جلد بازی کی وجہ سے جلدی نہیں کرتا اور تم اللہ تعالیٰ سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو ورنہ مصیبت تمہیں عاجز کر دے گی اور تمہیں پچھاڑ دے گی۔ یہ سن کر جناب زید کو غصہ آ گیا پھر کہا۔

لَیْسَ الْاِمَامُ مِنَّا مَنْ جَلَسَ فِیْ بَیْتِہٖ وَاَرْخیٰ سَتْرَہٗ وَثَبَّطَ عَنِ الْجِھَادِ وَلٰکِنَّ الْاِمَامَ مِنَّا مَنْ مَّنَعَ حَوْزَتَہٗ وَجَاھَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ وَدَفَعَ عَنْ رَعِیَّتِہٖ وَذَبَّ عَنْ حَرِیْمِہٖ۔

ہم میں سے ایسا شخص امام نہیں ہو سکتا جو اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور مکان کے سامنے پردے لٹکائے رکھے اور جہاد سے روگردانی کر کے بیٹھ جائے۔ بلکہ ہمارا امام وہ ہوتا ہے۔ جو اسلامی حدود سے لوگوں کو روکے اللہ کی راہ میں جہاد کرے جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے اور رعایا اور ظالموں کے ظلم کو دور کرے اور اپنے حرم کی حفاظت کرے۔ (اصول کافی کتاب الحجۃ باب مایفصل بہ بین المحق)

شیعیت کا اصلی مقصد ہی فتوحات اسلامی کی یلغار کو روکنا، دین اسلام میں تحریف اور امت میں انتشار و خلفشار پیدا کرنا ہے۔ اس لئے شیعہ نے جب یہ یقین کر لیا کہ حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد حضرت زین العابدین، حضرت محمد الباقر اور حضرت جعفر صادق ان کے نرغے میں نہیں آرہے تو انہوں نے دیگر افراد اہل بیت کے گرد گھیرا ڈالنا شروع کیا۔ انہوں نے جس طرح حضرت حسینؓ کو خطوط لکھ کر کوفہ آنے کی دعوت دی تھی بالکل اسی طرح حضرت زید کو

بھی خطوط کے ذریعے اپنے دام تزویر میں پھانس لیا۔اصول کافی کی مذکورہ بالا روایت سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔

یوسف بن عمر ثقفی کے عہد امارت (۱۲۲ھ) میں زید بن علیؑ نے مخفی طور پر لوگوں سے بیعت لینی شروع کی اس بیعت میں انہیں بڑی کامیابی ہوئی اور پندرہ ہزار افراد نے بیعت کر لی۔ بعض مخلصین نے زید بن علیؑ کو خروج سے باز رہنے اور مزید انتظار کرنے کا مشورہ دیا۔لیکن انہوں نے اس مشورہ پر عمل نہ کیا اور وقت معینہ (یکم صفر ۱۲۲ھ) سے ایک ہفتہ قبل ہی کوفہ میں رات کے وقت ہمراہیوں کو مشعل بردار جلوس کی شکل دے کر انقلاب کا اعلان کر دیا اور رات بھر کوفہ کے بازار "یا منصور امت" کے نعروں سے گونجتے رہے حکومت نے اس بغاوت کو دبانے کی کوشش کی اور نوبت باقاعدہ معرکہ آرائی تک پہنچ گئی۔کوفیوں نے جس طرح حسین بن علیؑ اور مصعب بن زبیر کو دھوکہ دیا تھا اسی طرح زید بن علیؑ کو بھی دھوکہ دیا۔جب تلوار چلانے اور مردانگی کے جوہر دکھانے کا وقت آیا تو انہوں نے زید بن علیؑ کے ساتھ کج بحثی شروع کر دی کہ پہلے آپ یہ فرمایئے کہ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کو آپ کیسا سمجھتے ہیں۔انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے خاندان میں کسی کو ان دونوں کی نسبت برا کہتے نہیں سنا۔کوفیوں نے کہا کہ جب خلافت کے اصل حق دار آپ ہی کے خاندان والے تھے اور ان دونوں کے خلافت پر قابض ہو جانے سے وہ ناراض نہ ہوئے تو اب اگر بنو امیہ نے بجائے آپ کے خلافت پر قبضہ کر لیا ہے تو آپ ان کو کیوں برا کہتے اور ان سے لڑتے ہیں۔یہ کہہ کر بیعت فسخ کر کے چل دیئے اور زید بن علیؑ نے ان کو رافضی کا خطاب دیا۔صرف دو سو بیس آدمی ان کے ساتھ رہ گئے۔وہ کوفہ کی گلیوں میں ایک ایک شخص کے گھر پر پہنچ کر آواز دیتے اور عہد بیعت یاد دلا کر اپنی حمایت کیلئے بلاتے تھے مگر کوئی نہیں نکلتا تھا۔بالآخر زید بن علیؑ لڑتے لڑتے جام شہادت نوش کر گئے۔زید کے بعد ان کی تحریک کو ان کے دو فرزندوں یحییٰ اور عیسیٰ نے خون دے کر آگے بڑھایا لیکن اس سے عباسیوں اور ایرانیوں نے خوب فائدہ اٹھاتے ہوئے بنی امیہ کا خاتمہ کر دیا۔زید بن علیؑ خطیب و مجاہد ہونے کے ساتھ ساتھ مصنف بھی تھے۔ان کی طرف منسوب تالیفات میں چند ایک کے نام یہ ہیں۔

۱۔ المجموع فی الفقہ ۲۔ المجموع فی الحدیث ۳۔ تفسیر الغریب (من القرآن) ۴۔ کتاب الحقوق

بنو عباس کے زمانے میں زیدیوں نے طبرستان میں حکومت بھی قائم کی اور ان کے

پیروکاروں میں سے بعض نے ان کے اصول و افکار کو مستقل مذہب کی شکل دی۔ جو فرقہ زیدیہ کی شکل میں اب تک باقی ہے۔

فرقہ زیدیہ

شیعوں کی ایک شاخ جسے زید بن علیؑ کو امام تسلیم کرنے کی بناء پر اثنا عشریہ اور سبعیہ سے ممتاز کیا جاتا ہے۔ علامہ سید محمد طباطبائی لکھتے ہیں کہ!

زیدیہ حضرت امام سجاد زین العابدین کے فرزند زید شہید کے پیروکار ہیں زید نے ۱۲۱ھ میں اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے خلاف تحریک چلائی اور ایک بڑی جماعت نے ان کی بیعت کر لی تھی لیکن شہر کوفہ میں ان کے مریدوں اور پیروکاروں اور اموی خلیفہ کی فوج کے درمیان جنگ ہوئی اور حضرت زید بھی اس جنگ میں شہید ہو گئے۔ زید شہید اپنے ماننے والوں اور پیروکاروں کے لئے اہلبیت کے پانچویں امام شمار کئے جاتے ہیں اور ان کے بعد ان کے بیٹے یحیٰ بن زید جنہوں نے اموی خلیفہ ولید بن یزید کے خلاف تحریک چلائی تھی اور شہید ہو گئے تھے۔ آپ کے جانشین مقرر ہوئے ان کے بعد محمد بن عبداللہ جنہوں نے عباسی خلیفہ منصور کے خلاف مہم شروع کی تھی اور یکے بعد دیگرے دونوں شہید ہو گئے تھے فرقہ زیدیہ کے امام سمجھے جاتے ہیں اس کے بعد کچھ مدت کے لئے زیدیہ فرقہ غیر منظم رہا یہاں تک کہ ناصر اطروش نے جو حضرت زید کے بھائی کی اولاد میں سے تھا خراسان میں اپنی امامت کا اعلان کر دیا۔ وہاں کی حکومت نے اس کو گرفتار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بھاگ کر مازندران پہنچ گیا۔ جہاں کے لوگوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ وہاں اس نے تیرہ سال اسلام کی تبلیغ کی اور بہت زیادہ افراد کو مسلمان بنا کر زیدیہ مذہب کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اس کے بعد ان ہی افراد کی مدد سے طبرستان پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اپنی امامت کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد اس کی اولاد میں سے بعض افراد نے کافی عرصے تک اس علاقے میں اپنی حکومت اور امامت جاری رکھی۔

زیدیہ فرقے کے عقیدے کے مطابق ہر وہ شخص جو فاطمی نسل سے ہو اور اس کے ساتھ ساتھ عالم، فاضل، زاہد، پارسا اور سخی بھی ہو اور حق کی خاطر ظلم و ستم کے خلاف اٹھے اور ظلم و ستم کو ختم کرنے کی تحریک چلائے وہ امام ہو سکتا ہے۔

شروع شروع میں زیدی لوگ خود حضرت زید کی طرح پہلے دو خلفاء حضرت ابوبکر و

حضرت عمر کو اپنے ائمہ میں شمار کیا کرتے تھے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد بعض لوگوں نے ان خلفاء کے نام اپنے اماموں کی فہرست سے نکالے اور اپنی امامت کو حضرت علیؑ سے شمار کرنا شروع کیا۔

(شیعہ صفحہ ۵۹)

موصوف نے اس کی وجہ نہیں بتائی کہ متاخرین زیدیہ نے شیخین کے ناموں کو سلسلہ امامت سے کیوں خارج کیا؟

اس کی وجہ یہی ہے کہ بعد کے زیدیوں پر دوسرے شیعہ فرقے غالب آ گئے۔ جس کے نتیجے میں زیدیہ فرقے والے اپنی خصوصیات کو کھو بیٹھے یہ مفضول کی امامت کے عقیدہ سے منحرف ہو گئے اور ان روافض میں شمار ہونے لگے جو حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی امامت کو تسلیم نہیں کرتے اس سے ان کی عظیم ترین خصوصیت جاتی رہی اس بناء پر بعض حضرات نے زیدیہ کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔

۱. متقدمین جو روافض میں شمار نہیں ہوتے اور شیخینؓ کی امامت کے قائل ہیں۔
۲. متاخرین جو رافضی ہیں اور شیخینؓ کی امامت کو تسلیم نہیں کرتے۔

شیعہ مصنف سید علی حیدر نقوی لکھتے ہیں کہ!

فرقہ زیدیہ۔۔۔ یہ فرقہ امام زین العابدین کے دوسرے صاحبزادے حضرت زید بن علی کی نسبت سے زیدیہ کہلاتا ہے۔ حضرت زید عالم، زاہد، عابد اور بہادر انسان تھے۔ ائمہ اثنا عشر میں کسی امام نے بھی نہ اپنی امامت تلوار کے ذریعے منوائی اور نہ حکومت حاصل کرنے کے لئے تلوار اٹھائی۔ بے پناہ مصائب بھی برداشت کئے لیکن نہ بددعا کی اور نہ ہی انتقام لیا۔ چنانچہ حضرت علیؑ دور ثلاثہ میں بالکل خاموش رہے۔ امیر معاویہ نے بغاوت کر کے حکومت حاصل کر لی۔ امام حسن خاموش ہو گئے۔

امام حسینؑ بھی مدینہ میں خاموش رہے اور خاموش ہی رہتے اگر یزید آپ سے بیعت طلب کرنے کے لئے آپ کی شہادت پر آمادہ نہ ہوتا اور واقعہ کربلا نہ ہوتا۔ چنانچہ یزید نے آپ کو مع خاندان بیعت نہ کرنے پر شہید کرا دیا۔ حضرت زین العابدین نے اپنے خاندان پر مظالم اپنی آنکھوں سے دیکھے لیکن تلوار نہیں اٹھائی اور ساری زندگی عبادت اور درس میں خاموشی سے گذار دی۔ حالانکہ واقعہ کربلا کے بعد مسلمان یزید سے بیزار ہو چکے تھے۔ آپ کے لئے حجاز کی حکومت

حاصل کرنا آسان کام تھا۔ آپ کے صاحبزادے حضرت امام محمد باقرؑ نے بھی کبھی تلوار نہیں اٹھائی اور اسی طرح دیگر ائمہ اثنا عشر نے بھی تلوار نہیں اٹھائی لیکن حضرت امام زین العابدینؑ کے دوسرے صاحبزادے حضرت زید (جو امام نہیں تھے) نے بنی امیہ کے مظالم کے خلاف تلوار اٹھائی جو خلیفہ ہشام بن عبدالملک کا زمانہ تھا۔ آپ بڑی جرأت اور بہادری سے جنگ کر کے شہید ہو گئے۔ آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے یحییٰ بن زید نے آپکی پیروی کی وہ بھی ہشام کی فوج کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ ان کے بعد محمد بن عبداللہ المعروف نفس زکیہ نے خلیفہ منصور عباسی کے خلاف تلوار اٹھائی اور شہید ہو گئے۔ ان کے بعد ابراہیم نے مقابلہ کیا اور وہ بھی شہید ہو گئے۔ پھر سرداری ابراہیم سے ادریس کو منتقل ہوئی بعد میں حضرت زید کے ماننے والوں نے آپ کو امام مان لیا۔ چنانچہ زیدیہ فرقہ میں پہلا عقیدہ یہ ہو گیا کہ امام کو لوگ بنائیں گے۔ جو آل رسولؐ سے ہوگا اور دوسرا عقیدہ یہ ہوا کہ افضل کی موجودگی میں مفضول امام بن سکتا ہے۔ زیدیہ فرقہ کے لوگ افریقہ اور ایشیا میں موجود ہیں۔ (ادیان عالم اور فرقہ ہائے اسلام کا تقابلی مطالعہ صفحہ ۱۳۳)

موصوف نے یحییٰ ابن زید کے متعلق لکھا کہ وہ بھی ہشام کی فوج کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ یہ تاریخی طور پر غلط ہے۔ یحییٰ ابن زید ولید ثانی بن یزید بن عبدالملک کے دور میں شہید ہوئے۔ ان کے قتل کا واقعہ اس طرح ہے کہ ولید کی تخت نشینی کے چند ہی دنوں بعد یحییٰ بن زید خراسان میں اٹھے۔ وہ اپنے والد زید بن علیؑ کے خروج میں ان کے ساتھ تھے۔ ان کے قتل کے بعد خراسان چلے گئے تھے اور بلخ کے ایک محب اہلبیت حریش بن عمرو بن داؤد کے یہاں مقیم تھے۔ ولید کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے حفظ ماتقدم کے خیال سے نصر بن سیار والی خراسان کو لکھا کہ حریش سے فوراً یحییٰ کو حوالے کرنے کا مطالبہ کرو۔ اس نے اس حکم کی تعمیل کی حریش نے لاعلمی ظاہر کی۔ نصر نے سختی سے کام لیا اس کی سختی دیکھ کر حریش کے لڑکے نے بتا دیا اور نصر نے یحییٰ کو گرفتار کر کے ولید کو اطلاع دی۔ وہ یحییٰ کو صرف شیعوں کے دام سے الگ کرنا چاہتا تھا اور ان کو نقصان پہنچانا مقصود نہ تھا۔ اس لئے لکھا کہ انہیں وہاں سے ہٹا کر چھوڑ دو۔ نصر نے انہیں دو ہزار درہم دے کر شام جانے کی ہدایت کی۔ لیکن بلخ سے نکلنے کے بعد ان کے پیروؤں نے انہیں یہ کہہ کر پھر ورغلایا کہ ہم لوگ کب تک ذلت برداشت کرتے رہیں گے۔ اس لئے یحییٰ شام جانے کی بجائے اپنی مختصر جماعت کے ساتھ نیشاپور چلے گئے یہاں کے حاکم عمرو بن زرارہ کو ان

کے ارادہ کا علم ہوا تو اس نے مقابلہ کیا۔ یحییٰ نے اسے شکست دے کر قتل کر دیا اور پھر بلخ لوٹ گئے نصر کو اس کا علم ہوا تو اس نے سلم بن احوز ہلالی کو ان کے مقابلہ پر مامور کیا اور خود بھی نکلا جوز جان میں دونوں کا مقابلہ ہوا اس میں یحییٰ بن زید قتل ہوئے اور ان کی پوری جماعت کام آئی۔

بہرحال زید بن علیؑ کی وفات کے بعد زیدیہ نے علویوں کی بہت سی بغاوتوں میں حصہ لیا لیکن ان کی کوئی متحد جماعت نہ تھی چنانچہ ملل و نحل پر کتابیں لکھنے والوں نے انہیں آٹھ مختلف ملل میں تقسیم کیا ہے۔ یہ ملتیں ابوالجارود سے شروع ہو کر (جس کے ہاں جنگی سرگرمیوں کے ساتھ عقیدہ الوہیت امام اور مہدی پر اعتقاد دونوں جمع ہیں) سلمہ بن کھیل پر (جس کی زیدیت گھٹتے گھٹتے صرف سادہ شیعی نظریہ رہ گئی ہے) ختم ہوتی ہیں۔ بعض دینی مسائل میں متاخرین زیدی اور شیعہ دونوں ایک ہیں۔ جیسے اذان میں "حی علیٰ خیر العمل" کہنا نماز جنازہ میں پانچ تکبیریں کہنا مسح علی الخفین کا انکار، نماز کے لئے غیر متقی امام کو قبول نہ کرنا زیدیہ کا تشیع اس بنا پر ثابت ہے کہ وہ امامت کو حضرت علیؑ، حضرت حسنؑ، حضرت حسینؑ پھر ان کی اولاد میں مختص مانتے ہیں۔ ان کے خیال میں حضرت حسینؑ کے بعد حسنی و حسینی سادات میں جو شخص شرائط امامت کا حامل ہو وہ امام ہوگا۔ ان کے نزدیک شرائط امامت درج ذیل ہیں۔

بالغ، عاقل مرد، زندہ، مسلمان، عادل، مجتہد، صاحب تقویٰ، سخی، سیاست دان، منتظم جو حقوق میں تبدیلی نہ کرے رعایا کے معاملات خود انجام دے۔ صائب الرائے، بہادر، جرأت مند اور سامعہ و باصرہ سے درست ہو۔

(امام زید بن علی ص ۱۶۹۔ ۱۶۸ از ناجی حسن)

زیدیہ کے نزدیک امام کیلئے جہاد کرنا اور فقیہ ہونا لازمی ہے۔ وہ زید بن علیؑ کو اصول و فروع کا سرچشمہ مانتے ہیں۔ توحید میں ان کے بیشتر عقائد شیعہ اثنا عشریہ و معتزلہ کے مطابق ہیں۔ مثلاً وہ ذات الٰہی کو منزہ عن الجسم و الجسمانیات اور صفات کو عین ذات مانتے ہیں۔ رویت کی نفی کرتے ہیں۔ عدل کے قائل ہیں اور وعد و وعید میں شفاعت کو خلف وعدہ کہتے ہیں۔ ان کے خیال میں جس کو جو جزا ہے وہ ضرور ملے گی اور اصحاب کبائر کی شفاعت ماننے سے اللہ کا وعید باطل ہو جائے گا۔ المنزلة بین المنزلتین "یعنی اصحاب کبائر فاسق ہیں۔ نہ انہیں کافر کہنا چاہیے نہ مومن۔ نبوت کے بارے میں ان کے امتیازی مسائل کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا گویا اس منزل میں وہ عام مسلمانوں کے ہم عقیدہ ہیں۔

امامت میں ان کا مسلک بنیادی طور پر حکومت جور کے خلاف عملی اقدام کے مترادف ہے ان کے نزدیک امام کے معنی ہیں "من دعا الی اللہ عزوجل من آل محمد فھو مفترض الطاعۃ" {النوبختی فرق الشیعہ صفحہ ۷۸}

صاحب سیف ہی واجب الاطاعت وحاکم شرعی ہے خانہ نشین امام نہیں ہوتا. امام برحق حضرت علیؑ پھر حضرت حسنؑ وحسینؑ ہیں۔ پھر حضرت زید رحمتہ اللہ علیہ اور بعض لوگوں کے عقیدے میں حضرت زین العابدین اور ان کے بعد زید. ان کے بعد حسنی وحسینی سادات میں جو بھی صاحب سیف ہو. یہ بھی ممکن ہے کہ بیک وقت دو امام ہوں. {الاشعری کتاب المقالات والفرق}

بقول شہرستانی (م ۵۴۸ھ) چھٹی صدی میں زیدیوں کی اکثریت اور معتزلہ کے عقائد میں بال برابر بھی اختلاف نہیں تھا۔ زیدی فقہ میں عموماً امام ابوحنیفہؒ سے اور بعض مسائل میں امام شافعیؒ سے متفق ہیں۔ {ابوزہرہ الامام زید ص ۲۰۱}

زیدیہ کے فرقے

کتب تاریخ وفرق میں زیدیوں کے حسب ذیل فرقے بتائے گئے ہیں۔

الجارودیۃ	السلیمانیہ	البتریۃ	الیعقوبیۃ
النعیمیۃ	المطرقیۃ		الزیدیۃ والامامیۃ
الابرئیۃ	العقبیۃ		الجریریۃ
الصالحیۃ	الصباحیۃ		المحمدیۃ
الطالبیہ	العمریۃ		الرکیۃ
الخشبۃ	الحلسفیۃ اور القاسمیۃ		{ثورۃ زید ص ۱۹۴ از ناجی حسن}

یہاں ان میں سے چند مشہور فرقوں کا قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔

فرقہ جارودیہ ۔۔۔ زیدیہ کا یہ فرقہ ابوالجارود زیاد بن المنذر الھمدانی کے پیروکاروں پر مشتمل ہے۔ ان کے نزدیک نبی اکرمؐ کے بعد بدلیل وصف نہ بدلیل تعین نام حضرت علیؑ امام ہیں اور صحابہ کرامؓ نے چونکہ ان کی اقتدا نہیں کی اس لئے ان کو کافر قرار دیتے ہیں۔ {تحفہ اثنا عشریہ ص ۴۲}

حضرت علیؑ کے بعد حضرت حسنؑ، حضرت حسینؑ، حضرت زین العابدین، حضرت زید بن علیؑ اور یحیٰ بن زید کو امام مانتے ہیں۔ امامت ومہدی المنتظر اور علوم اہل بیت کے بارے میں

ان کے عقائد امامیہ اثنا عشریہ سے قریب ہیں۔ امام منتظر کے بارے میں مختلف نظریات کے حامل ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ محمد بن عبداللہ بن حسن بن حسن ہیں جو عہد منصور میں مدعی امامت ہوئے اور مقتول ہوئے ان کے اعتقاد میں یہ ابھی زندہ ہیں قتل نہیں ہوئے۔ بعض دوسرے یہ کہتے ہیں کہ وہ محمد بن حسن طالقانی ہیں۔ جو معتصم کے عہد میں اٹھے قتال کیا اور قید ہوئے اور حالت اسیری میں ہی وفات پائی مگر ان کی وفات کے منکر ہیں۔

ان کی ایک دوسری جماعت کے نزدیک امام منتظر یحیٰی بن عمر ہیں جو جناب زید بن علی بن حسینؑ کے پوتوں میں سے ہیں جنہیں صاحب الکوفہ بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے مستعین کے عہد میں قتال کیا اور مقتول ہوئے مگر یہ جماعت ان کے قتل کی بھی منکر ہے۔

فرقہ جریریہ ــــــ اس فرقہ کو سلیمانیہ بھی کہتے ہیں۔ یہ سلیمان بن جریر کے معتقد و پیروکار ہیں۔ یہ بھی امامت کو شوریٰ سے مانتے ہیں۔ ان کے خیال میں مفضول شخص امام ہو سکتا ہے اس لئے یہ شیخینؓ (ابوبکرؓ و عمرؓ) کی خلافت کو صرف اجتہادی غلطی سمجھتے ہیں اور ان کی بیعت کرنے والوں کو خطا کار کہتے ہیں۔ کیوں کہ انہوں نے حضرت علیؓ کی موجودگی میں ان حضرات کی بیعت کی حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کو کافر بتاتے ہیں (معاذ اللہ)

صفات باری تعالیٰ اور خلافت اولیٰ میں اس فرقہ کے خیالات الگ ہیں۔ سلیمانیہ کی ایک شاخ تبریہ کہلائی۔ انہوں نے حضرت عثمانؓ کے بارے میں توقف کیا۔ ان میں سے بعض اصولی ہیں۔ اعتزال کی طرف رغبت رکھتے ہیں اور بعض نے فروع میں امام ابوحنیفہ کی تقلید کی کیونکہ ان کے بقول امام ابوحنیفہ محمد نفس زکیہ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے۔ مگر تحقیقی طور پر یہ قول غلط ہے۔ اسی فرقہ کی ایک شاخ نعیم بن الیمان کے نام پر نعیمیہ کہلائی۔

فرقہ نعیمیہ ــــــ یہ نعیم بن الیمان کے اصحاب کا گروہ ہے۔ یہ شیخین کی خلافت کو مبنی بر خطا نہیں سمجھتے کیونکہ حضرت علیؓ نے اس پر سکوت فرمایا تھا اور جس بات پر معصوم سکوت اختیار کرے وہ حق ہوتی ہے۔ البتہ حضرت عثمانؓ کی امامت تسلیم کرنے میں ان کو تأمل ہے کہ حضرت علیؓ کی رضامندی و سکوت اس معاملہ میں حسب دلخواہ ثابت نہیں اور خود حضرت علیؓ کو بیعت کے وقت سے امام مانتے ہیں۔

فرقہ دکینیہ ــــــ یہ فرقہ فضل بن دکین کی طرف منسوب ہے ان کا مذہب جارودیہ سے ملتا ہے۔ فرق

یہ ہے کہ یہ حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ اور ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کو کافر کہتے ہیں اور ان پر تبرّیٰ بھی کرتے ہیں لیکن باقی صحابہؓ کو بھلائی سے یاد کرتے ہیں۔

فرقہ خشبیہ ——— شیعہ فرقہ کیسانیہ کی ایک شاخ بھی خشبیہ کہلاتی تھی لیکن وہ محمد بن حنفیہ کی امامت کے قائل تھے۔ زیدیہ فرقہ کی شاخ خشبیہ خلف بن عبدالصمد کی طرف منسوب ہے۔ یہ اولادِ فاطمہ میں امامت شوریٰ کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ جب کوئی غیر مستحق خلافت پر قابض ہو جائے تو اس کی مخالفت واجب ہے۔ ان کو خشبیہ اس لئے کہتے ہیں کہ جب یہ اپنے وقت کے بادشاہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو تیر، تلوار کی بجائے لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے مسلح تھے۔ چونکہ لغت عرب میں خشب لکڑی کو کہتے ہیں۔ اس لئے ان کا نام خشبیہ (لٹھ بردار) پڑ گیا۔

فرقہ یعقوبیہ ——— یہ یعقوب نامی ایک شخص کے پیرو تھے۔ یہ مسئلہ رجعت کے قائل ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی امامت کو نہیں مانتے بلکہ ہر دو حضرات گرامی پر تبرّیٰ کرتے ہیں۔

فرقہ صالحیہ ——— حسن بن صالح حی (م ۱۶۷ھ) کے متبعین اور پیروکار۔

یہ بھی حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں امامت شوریٰ کے قائل ہیں اور کہتے ہیں فاطمیوں میں جو بھی صفات علم، شجاعت اور سخاوت سے متصف ہو کر ابھرے وہ امام ہے۔ ان کے نزدیک ایک زمانے میں ایک ملک میں بیک وقت کئی اماموں کا ہونا ممکن ہے۔ یعنی وقتاً فوقتاً کسی ضد امام کا ظہور اگر یہ خلف اپنے پیشرو امام کو نکال کر خود اس کی جگہ امام بن جائے تو اس پیشرو کی معزولی یا امامت سے کنارہ کشی قانوناً جائز قرار دی جائے گی اور اگر پانسا پھر پلٹ جائے تو وہ پیشرو دوبارہ امام بن کر آ سکتا ہے۔

فرقہ زیدیہ کے ہاں اگر امام میں شرائط امامت مکمل طور پر نہ پائی جاتی ہوں تو اسے مکمل امام تسلیم نہیں کیا جا سکتا البتہ وہ خاص شعبوں کا امام ہو سکتا ہے۔ جیسے جنگ میں ماہر صرف امامِ حرب اور علم میں ماہر صرف امامِ علم ہو گا۔ ایسے رہنما جن میں فقط اتنی قوت ہے کہ زیدی ادعا کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ داعی، محتسب، مقتصد وغیرہ کہلاتے ہیں۔ اس امر میں تذبذب کہ در حقیقت کس شخص کو امام سمجھا جائے ان علوی مدعیان خلافت کی فہرست سے ظاہر ہوتا ہے۔ جنہیں متاخر زیدیوں نے اس لئے منتخب کر لیا تھا کہ اصلی شیعی فرقے کے ساتھ ان کا تعلق قائم رہے۔ ان میں سب سے مکمل فہرست میں جو آج موجود ہے اور یمن میں زیدی حکومت کے بانی کی بتائی ہوئی

بے حسب ذیل نام ہیں۔

۱. علی ۲. الحسن ۳. الحسین ۴. زید بن علی ۵. یحییٰ بن زید ۶. محمد بن عبداللہ
۷. ابراہیم ۸. یحییٰ ۹. الحسین بن علی بن الحسن
۱۰. محمد بن ابراہیم طباطبا جنہوں نے ابو السرایا کے ساتھ مل کر بغاوت کی
۱۱. القاسم الرسی بن ابراہیم طباطبا بن اسمٰعیل الدیباج بن ابراہیم بن الحسن بن الحسن بن علی بن ابی طالب (م ۲۴۶ھ)

اس کے بعد کی فہرستوں میں مزید نام دیئے گئے ہیں جن کی تعداد سو تک پہنچتی ہے۔ دو مقامات پر زیدیوں کے سیاسی امکان پیدا ہوئے الحسن بن زید سے لے کر ۵۲۰ھ تک خزر کے علاقے میں بے قاعدہ وقفوں سے اور بعض اوقات ایک دوسرے کے خلاف تقریباً ایک امام اور داعی ظاہر ہوئے بعض کے یہاں کے زیدی "نکتوبۃ" میں جو ایک چھوٹا سا فرقہ تھا ضم ہو گئے۔ یمن میں زیدی حکومت کا بانی القاسم الرسی کا پوتا الہادی الی الحق یحییٰ بن الحسین (م ۲۹۸ھ) تھا۔ یمن کی تمام سلطنتوں میں سے صرف یہی اب تک باقی ہے۔ یحییٰ بن حسین بن قاسم الرسی کے نام سے ایک فرقہ بھی موجود ہے۔ جو "القاسمیہ" کہلاتا ہے اس فرقہ کے لوگ امامت کے لئے نص کے قائل ہیں اور کبھی امامت مفضول بھی مان لیتے ہیں۔ وہ اللہ کی رضا اور عدم آگہی میں بندے کے فعل کو بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔

(حوالہ تحفہ اثنا عشریہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد نمبر ۱۰ تحت زیدیہ اسلامی مذاہب تاریخ تفسیر وغیرہ)

زیدیہ کے افکار و عقائد

زیدیہ کے افکار و عقائد کا اوپر کسی قدر ذکر آ گیا ہے۔ لیکن یہاں ایک مستقل عنوان کے تحت ان کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ بعض سنی مولفین زیدیہ کو اہلسنت کے نظریات کے بہت قریب اور معتدل سمجھتے ہیں ان کا موقف ہے کہ زیدیہ ائمہ کو منصب نبوت پر فائز نہیں کرتے اور نہ ہی انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ یہ ائمہ کو عام لوگوں کی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل سمجھتے ہیں اور یہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تکفیر بھی نہیں کرتے خصوصاً وہ صحابہ جن کی امامت کو حضرت علیؑ نے تسلیم کیا تھا۔

لیکن زیدیہ کے متعلق یہ عقیدہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ زید بن علیؑ اور زیدیوں کے عقائد

نظریات ایک جیسے نہیں تھے۔ پیچھے ہم دیکھ چکے ہیں کہ زیدیہ اپنے اس اعتقاد پر قائم نہیں رہے اور دوسرے شیعہ فرقے (اثنا عشری وغیرہ) اس فرقہ پر غالب آ گئے اور متاخر زیدی تو کھلم کھلا اپنے اسلاف کے بعض عقائد سے منحرف ہو کر باقاعدہ روافض میں شمار ہونے لگے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ زیدیہ اہل تشیع ہی کا ایک فرقہ ہے۔ حضرت زین العابدین کی امامت تک یہ باہم متحد و متفق رہے اور ان میں کوئی اختلاف رونما نہیں ہوا صرف فرقہ کیسانیہ یعنی محمد بن حنفیہ کے پیروکار دیگر شیعوں سے الگ ہوئے۔ محمد بن حنفیہ کا تعلق غیر فاطمی اولاد سے ہے۔ جبکہ زیدیہ کے نزدیک امام کا بنو فاطمہ سے ہونا لازمی شرط ہے۔ اس فرقہ کے بانی جناب زید اپنے والد حضرت زین العابدین اور اپنے بڑے بھائی محمد باقر کی آغوش شفقت و سایہ رحمت میں پروان چڑھے۔ بعد میں انہوں نے اپنے بھائی محمد الباقر کی امامت سے اختلاف کرتے ہوئے خود اپنی امامت کا اعلان کیا تو ہزاروں کی تعداد میں شیعہ ان کے پیروکار بن گئے۔ فرقہ زیدیہ کے افکار و معتقدات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ زیدیہ کے نزدیک نبی اکرم ﷺ کے بعد بدلیل وصف حضرت علیؓ امام تھے۔ یعنی آپ نے امام کے متعلق کچھ اوصاف بیان فرمائے تھے جن کے حامل آپ ﷺ کے بعد صرف حضرت علیؓ تھے۔ اس طرح وہ افضل الصحابہ اور خلیفہ بلافصل ثابت ہوئے مگر صحابہؓ نے امام متعین کرنے میں ٹھوکر کھائی اور حضرت علیؓ کی بجائے ثلاثہؓ کو امام مقرر کر دیا۔ حضرت علیؓ کے بعد ان اوصاف کی رو سے امام کا اہل بیت (خواہ حسنی ہو یا حسینی) یعنی اولاد فاطمہؓ سے ہونا لازمی شرط ہے۔

۲۔ دوسروں کو اپنی امامت کی طرف دعوت دینا امام کا فرض ہے۔ اس میں حصول مقصد کے لیے حکومت وقت کے خلاف خروج بھی شامل ہے۔ یعنی امام ایسے شخص کو ہونا چاہیے جو اپنا حق منوانے کی اہلیت رکھتا ہو۔

۳۔ زیدیہ ایک وقت میں الگ الگ امام کے بھی قائل ہیں اور امام کے معزول و دست بردار ہونے کی بھی ان کے ہاں گنجائش ہے۔

۴۔ زیدیہ کے نزدیک مفضول کی امامت جائز ہے۔ حضرت علیؓ شیخینؓ (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ) سے اگرچہ افضل اور امامت و خلافت کے زیادہ حق دار تھے۔ لیکن ان کی خلافت بھی مفضول ہونے کی بنا پر جائز تھی۔ غالباً یہ "تقیہ شریفہ" کا سہارا ہے۔ زیدیہ کے عقیدہ امامت

میں امام کے لئے اپنی امامت کا اعلان اور اس کی طرف دعوت دینا ضروری اور لازمی ہے۔ تو اس شرط کی رو سے حضرت علیؑ اور زین العابدین کا امام ہونا ہی ثابت نہیں ہوتا۔ (حضرت حسنؑ کچھ عرصہ کے لئے امام بن گئے تھے۔ جبکہ حضرت حسینؑ نے خروج کر کے اپنی امامت بچالی تھی) کیونکہ حضرت علیؑ نے نہ صرف شیخینؓ بلکہ حضرت عثمانؓ کے دور میں اور حضرت زین العابدین نے یزید، ابن زبیرؓ معاویہ ثانی، مروانؓ، عبدالملک اور ولید کے دور میں نہ کبھی اپنی امامت کا اعلان کیا نہ اس کی طرف دعوت دی اور نہ ہی انہیں کبھی خروج کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پھر فرقہ زیدیہ کے بانی کا سب سے پہلے اختلاف اپنے گھر میں اپنے بڑے بھائی اور استاد کے ساتھ ہوا۔

کیا زیدؒ افضل تھے یا ان کے بھائی محمد الباقر اور بھتیجے جعفر صادقؒ۔ اگر یہ حضرات زید سے افضل تھے تو پھر زید کا دعویٰ امامت بالکل ہی باطل ثابت ہو جاتا ہے اور اگر محمد الباقر اور جعفر صادق مفضول تھے تو پھر بھی جب ان کے اعتقاد میں شیخینؓ کی خلافت مفضول ہونے کی بنا پر درست اور صحیح ہے تو محمد الباقر اور جعفر صادق کی امامت کیوں صحیح نہیں؟

اسی طرح دیگر خلفاء وقت کی خلافت بھی مفضول ہونے کی بناء پر صحیح اور درست ہونی چاہیے تھی۔ لیکن زیدیہ کا اس عقیدہ پر عمل نہیں رہا بلکہ خود بنو ہاشم (بنو عباس) کے خلاف بھی خروج کرتے رہے۔

۵۔ زیدیہ کے بعض فرقے امام منتظر کے بھی قائل ہیں کہ مختلف امام دوبارہ ظاہر ہوں گے ان کے ناموں کی تعیین میں بھی یہ باہم مختلف ہیں۔

۶۔ زیدیہ کے بعض فرقے تکفیر صحابہؓ کے بھی قائل ہیں۔ جیسے فرقہ جارودیہ اور فرقہ جریریہ و سلیمانیہ حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ کو علی الاعلان کافر کہتے ہیں۔

۷۔ زیدیہ کے نزدیک ائمہ میں اجتہاد کی شرط کا پایا جانا ضروری ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں اجتہاد کا بڑا چرچا ہے۔

۸۔ کوئی حدیث ان کے نزدیک صرف اسی صورت میں قابل اعتماد ہوتی ہے جب اہل بیت سے مروی و منقول ہو۔ چنانچہ فرقہ زیدیہ کی کتاب المجموع صرف ان ہی احادیث پر مشتمل ہے۔ جو حضرت زید بن زین العابدینؒ سے منقول ہیں اور وہ ائمہ اہل بیت کے واسطے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

سے روایت کرتے ہیں۔

زیدیہ لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی حد تک معتزلہ کے افکار و عقائد سے متاثر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے امام زید بن علی بانی اعتزال واصل بن عطا کے تلمیذ عزیز تھے۔ الشہرستانی (م ۵۴۸ھ) کے قول کے مطابق چھٹی صدی میں زیدیوں کی اکثریت اور معتزلہ کے عقائد میں بال برابر بھی اختلاف نہیں تھا۔ (ابوزہرہ۔ الامام زید)

ناجی حسن کے خیال میں زیدی چونکہ معتزلہ سے مقدم ہیں اس لئے کیا بعید ہے کہ معتزلہ نے افکار میں زیدیوں سے تاثر قبول کیا ہو۔ (ثورۃ زید صفحہ ۱۴۳)

یحیٰی بن حسین بن قاسم الرسی کی طرف منسوب زیدی فرقہ "القاسمیہ" جو آج کل زیدیوں کا تنہا ایک باقی ماندہ فرقہ ہے عقیدہ توحید کے اعتبار سے معتزلی ہے۔ اخلاقیات میں مرجیہ کے خلاف ہے اور ساتھ ہی تصوف کو رد کرتا ہے۔ جس سے ان کی سلفیت سے وابستگی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زیدی مملکت میں صوفیوں کے مشہور سلسلوں میں سے کسی میں شامل ہونا قطعاً ممنوع ہے۔

بہرحال اتنی بات واضح ہے کہ معتزلہ اور زیدی افکار میں کافی مماثلت و مشابہت پائی جاتی ہے۔ جہاں تک معتزلہ کی تاریخ کا تعلق ہے تو اس فرقہ نے بنو امیہ کے عہد خلافت میں بال و پر نکالے اور خلافت عباسیہ میں عرصہ دراز تک اسلامی فکر پر حاوی اور چھایا رہا اس فرقے کا بانی واصل بن عطا ہے۔ جو غزال (سوت کاتنے والا) کے لقب سے مشہور تھا ۸۰ھ میں پیدا ہوا اور ۱۳۱ھ میں ہشام بن عبدالملک کے عہد خلافت میں فوت ہوا۔ (بحوالہ تاریخ تفسیر و مفسرین صفحہ ۲۲۴)

اگر واصل بن عطا کی سن وفات کے متعلق پروفیسر غلام احمد حریری صاحب کا یہ قول صحیح ہے تو پھر ان کا ہشام بن عبدالملک کے عہد خلافت میں فوت ہونا یقیناً غلط ہے۔ کیونکہ خود ہشام ۶ ربیع الثانی ۱۲۵ھ میں وفات پا گئے تھے۔ تو وفات کے بعد بھی ۶ سال تک ہشام کا برسراقتدار رہنا کیوں کر تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ ۱۳۱ھ میں بنو امیہ کے آخری خلیفہ مروان ثانی بن محمد بن مروان الاکبر منصب خلافت پر فائز تھے۔

فرقہ معتزلہ کے ظہور میں اختلاف ہے ایک گروہ کا خیال ہے کہ جب حضرت حسنؑ حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہوئے تو اصحاب علیؑ کی ایک جماعت

سیاست سے بالکل کنارہ کش ہوگئی اور اس کی سرگرمیاں صرف عقائد تک محدود ہو کر رہ گئیں۔
چنانچہ ابوالحسن الملطی اپنی کتاب "تعل الاھواء والبدع" میں لکھتے ہیں کہ!

انہوں نے اپنا نام معتزلہ رکھا اس لئے کہ جب حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ کی بیعت کی اور خلافت انہیں تفویض کر دی تو ان لوگوں نے حسنؓ اور معاویہ دونوں سے کنارہ کشی کر لی بلکہ سب سے الگ ہو گئے۔ یہ لوگ حیان علیؓ میں سے تھے۔

علماء کا دوسرا گروہ معتزلہ کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ بانی معتزلہ واصل بن عطا تھے۔ یہ حسن بصریؒ کے حلقہ درس میں حاضر ہوا کرتے تھے اس زمانے میں مختلف سوال زور و شور سے اٹھا کرتے تھے اور اسی نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب مسلمان ہے یا نہیں؟ حضرت حسن بصریؒ کی مخالفت کرتے ہوئے واصل نے کہا "میں کہتا ہوں کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب علی الاطلاق مسلمان نہیں ہے بلکہ وہ کفر و ایمان کی درمیانی منزل میں ہے" اس اختلاف کے بعد واصل نے حسن بصریؒ کے حلقے سے علیحدگی اختیار کر لی اور اسی مسجد میں ایک علیحدہ حلقہ قائم کر کے بیٹھ گیا۔

جبکہ فرقہ معتزلہ کے علماء نے اپنی تصانیف میں لکھا ہے کہ یہ فرقہ واصل بن عطاء سے پہلے کا ہے وہ بہت سے اہل بیت کو معتزلی المسلک قرار دیتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ حسن بصریؒ بھی معتزلی تھے۔ وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ حسن افعال العباد کے مسئلہ میں قدریہ کے ہمنوا تھے۔ اس مسئلہ میں معتزلہ کا نظریہ بھی یہی ہے۔ مرتکب کبائر کے بارے میں حسن بصریؒ نے جو رائے ظاہر کی ہے وہ معتزلہ کے عقیدے کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔ وہ اسے منافق قرار دیتے ہیں۔ منافق دائمی جہنمی ہوتا ہے اور اہل ایمان کے زمرہ میں شامل نہیں۔ اس سے یہ بات صاف ہو گئی کہ حسن بصریؒ مرتکب کبائر کے مسئلہ میں بھی ان کے ہم خیال ہیں۔ مشہور عالم المرتضیٰ نے اپنی کتاب "المنیۃ والامل" میں معتزلہ کے تمام طبقات کا ذکر کیا ہے۔ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ فرقہ معتزلہ واصل سے پہلے کا ہے کیونکہ بہت سے اہل بیت یہی عقیدہ رکھتے تھے۔ مثلاً زید بن علیؓ جو واصل کے گہرے دوست تھے۔ اس فرقہ کو واصل کی طرف منسوب کرنے کی وجہ یہی تھی کہ واصل نے اس کی تبلیغ و اشاعت میں بہت سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ لہٰذا بہت سے لوگ اسے معتزلہ کا بانی تصور کرنے لگے۔ (بحوالہ اسلامی مذاہب صفحہ ۱۴۲)

یہ لوگ دین کی عجیب توجیہات کرتے تھے۔ حتیٰ کہ قرآن پاک کے مخلوق یا غیر مخلوق

یعنی حادث یا قدیم ہونے پر بحث کرتے اس فرقہ کے نمایاں ہو جانے کا سبب عباسی خلیفہ مامون الرشید کا معتزلہ خیالات اختیار کرنا اور باقاعدہ سرپرستی کرنا ہے۔ مامون اپنے زمانہ خلافت میں مختلف مکاتب فکر کو مباحث ومناظروں کی دعوت دیتا تھا اور ایک عرصہ تک امور حکومت سے بے نیاز ہو کر اپنا زیادہ وقت مطالعہ اور بحث کے سننے میں صرف کرتا رہا اس نے معتزلہ افکار قبول کر کے انہیں دنیائے اسلام میں زبردستی منوانے کی بھی کوشش کی اور نہ ماننے والوں پر جبر وتشدد بھی کیا۔ مامون کے بعد معتصم باللہ اور واثق باللہ نے بھی سرپرستی کی اور امام احمد بن حنبلؒ کو کوڑے تک لگوائے گئے جب متوکل خلیفہ بنا تو اس نے اس جھگڑے کو ختم کیا۔

معتزلہ کا ایک عقیدہ قرآن کو مخلوق ماننا ہے۔ دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ قیامت کے روز انسان اپنے جسم کے ساتھ قبروں سے نہیں اٹھائے جائیں گے۔ تیسرا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے افعال میں مختار ہے۔ چوتھا یہ کہ انسان اگر گناہ کبیرہ کرے تو نہ کافر ہے اور نہ ہی مومن۔

معتزلہ اور شیعہ دونوں کا خمیر ایک ہی ہے اور دونوں ایک ہی وادی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب زیدیہ بھی شیعہ ہی کا ایک مسلمہ فرقہ ہے تو پھر وہ "اعتزال" سے کیونکر دور رہ سکتے تھے؟ فرقہ زیدیہ میں جس طرح "فقہاء محدثین" کا طبقہ پایا جاتا ہے اسی طرح اس میں "مفسرین" کا طبقہ بھی موجود ہے۔ چنانچہ ابن ندیم لکھتے ہیں کہ مقاتل بن سلیمان زیدیہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور موصوف نے "التفسیر الکبیر" اور "کتاب نوادر التفسیر" قلمبند کی تھیں۔ {الفہرست لابن الندیم صفحہ ۲۵۳}

ابن ندیم مزید لکھتے ہیں کہ زیدیہ فرقہ کے ابو جعفر محمد بن منصور مرادی نے تفسیر قرآن پر دو کتابیں تحریر کی تھیں۔ ایک کا نام "کتاب التفسیر الصغیر" اور دوسری کا نام "کتاب التفسیر الکبیر" ہے۔ {الفہرست صفحہ ۲۷۴}

فرقہ زیدیہ کے علماء میں سے احمد بن عبداللہ الجنداری نے علم فقہ پر اپنی کتاب شرح الازہار کے مقدمہ میں تفسیر قرآن سے متعلق فرقہ زیدیہ کے علماء کی چند تصانیف کا ذکر کیا ہے یہ کتب حسب ذیل ہیں۔

۱۔ تفسیر غریب القرآن از امام زید بن علیؑ اس کو ائمہ زیدیہ میں سے محمد بن منصور بن زید کوفی (م ۲۹۰ھ) نے امام زید بن علیؑ کی سند کے ساتھ مرتب کیا۔ {مقدمہ شرح الازہار ص ۳۶}

۲۔ تفسیر اسماعیل بن علی الزیدی (م ۴۲۰ھ) یہ ایک جلد میں ہے۔
۳۔ التہذیب۔ از محسن بن محمد بن کرامہ معتزلی زیدی۔ ان کو (۴۹۴ھ) میں قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ تفسیر نہایت مشہور ہے۔
۴۔ تفسیر عطیہ بن محمد نجرانی زیدی (م ۶۶۵ھ)۔ یہ تفسیر فرقہ زیدیہ کے علوم کی جامع ہے۔
۵۔ التیسیر فی التفسیر از حسن بن محمد صنعانی (م ۷۹۱ھ)
۶۔ تفسیر آیات الاحکام از حسین بن احمد نجری یہ آٹھویں صدی ہجری کے زیدی عالم ہیں۔
۷۔ الثمرات الیانعة والاحکام الواضحة القاطعة از شمس الدین یوسف بن احمد (م ۸۳۲ھ) یہ نویں صدی ہجری کے زیدی عالم ہیں۔
۸۔ منتهى المرام فى شرح آيات الاحكام از محمد بن حسين بن قاسم۔ یہ گیارھویں صدی ہجری کے زیدی علماء میں سے ہیں۔
۹۔ تفسیر قرآن از قاضی بن عبدالرحمٰن مجاہد۔ یہ تیرھویں صدی ہجری کے زیدی عالم تھے۔
۱۰۔ فتح القدير للشوكاني۔ یہ محمد بن علی بن محمد بن عبداللہ شوکانی (م ۱۲۵۰ھ) کی ایک جامع تفسیر ہے۔

اس وقت فرقہ زیدیہ کے تفسیری اثاثہ میں سے صرف دو تفاسیر یعنی الثمرات اليانعة والاحكام الواضحة القاطعة اور فتح القدير للشوكانی موجود ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام شوکانی فرقۂ زیدیہ کے مفسر اور ممتاز مذہبی راہنما ہیں۔
زیدی شیعوں کی طرح غیر مقلدین (اہل حدیث حضرات) نے بھی امام شوکانی کو اپنا امام و رہنما تسلیم کر رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برصغیر میں تحریک اہل حدیث کے بانی مولوی عبدالحق بنارسی ہیں۔ یہ بنارس کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے ہندوستانی علماء کے علاوہ یمن کے علامہ شوکانی زیدی شیعہ سے بھی علم حاصل کیا تھا۔ (مقدمہ فتح القدیر مصری صفحہ ۵)
شیخ محمد اکرام صاحب نے بھی اپنی کتاب "موج کوثر" میں یہ تحریر کیا ہے۔ کہ شاہ اسمٰعیل اور سید احمد بریلوی کے بعض معتقدین نجدی اور یمنی علماء سے متاثر ہوئے اور یہی لوگ بعد میں "اہلحدیث" کہلائے {موج کوثر صفحہ ۶۵}
غیر مقلدین کے شیخ الکل میاں نذیر حسین دہلوی کے استاد اور خسر مولانا عبدالخالق اور

نواب صدیق حسن خان نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ عبدالحق بنارسی اپنی عمر کے درمیانی حصہ میں رافضی (شیعہ) ہو گیا تھا۔ اس عمر میں ان کے عقائد میں تزلزل اور اہل تشیع کی طرف ان کا رجحان بڑا مشہور ہے۔

قاری عبدالرحمن صاحب محدث پانی پتی لکھتے ہیں کہ!

بعد تھوڑے عرصے کے مولوی عبدالحق صاحب گلشن علی کے پاس گئے۔ جو دیوان راجہ بنارس کے شیعہ مذہب تھے اور یہ کہا کہ میں شیعہ ہوں۔ لب ظاہر شیعہ ہونا بہت آسان ہے۔ چنانچہ مولوی گلشن علی نے تیس روپیہ ماہواری ان کی نوکری کرا دی۔ (کشف الحجاب صفحہ ۱۲)

یہاں غیر مقلدین کی مذہب شیعہ سے مماثلت بیان کرنا مقصود نہیں ہے یہ ایک مستقل اور علیحدہ عنوان ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں بھی راقم کے پاس کچھ مواد جمع ہے جسے حسب ضرورت و فرصت مزید اضافہ جات کے ساتھ طبع کرانے کا ارادہ ہے۔

یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ امام شوکانی صاحب فتح القدیر جو زیدی شیعوں کے راہنما ہیں۔ خوش قسمتی سے وہ غیر مقلدین کے بھی "مقتداء" ہیں۔ فیا للعجب!

غیر مقلد "سکالر" پروفیسر طیب شاہین لودھی لکھتے ہیں کہ!

امام شوکانی نے ابتدائی طور پر زیدیہ فقہ کی تعلیم حاصل کی مگر وسعت مطالعہ اور حدیث میں رسوخ علم کی وجہ سے اپنے آپ کو امام زیدؒ کی فقہ میں محصور نہ رکھ سکے۔ انہوں نے زیدیہ فقہ پر ناقدانہ نظر ڈالی اور ان تمام مقامات پر گرفت کی جہاں قرآن و سنت سے ذرا بھی انحراف پایا جاتا تھا۔ اصول دین اور صفات الٰہی کے بارے میں سلف کی طرح وہ بھی مسلک تفویض رکھتے تھے۔ یعنی قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں وارد ہونے والی صفات کو بغیر کسی تشبیہ و تعطیل اور تاویل و تحریف کے ان کے ظاہر پر محمول کرتے تھے۔ انہوں نے مذہب سلف کی تائید میں کتابیں بھی لکھیں۔ انہوں نے تقلید کا جوا کندھوں سے اتار پھینکا، اور قرآن و سنت کی راہ پر گامزن ہو گئے۔ ان کا مطمح نظر کسی امام کے مذہب کا اثبات نہ تھا جیسا کہ مقلدین کا وطیرہ ہوتا ہے بلکہ قرآن و سنت کے مطابق جو مسلک حق ہوتا تھا اسے اختیار کرتے تھے۔ (حقیقت تقلید و اجتہاد صفحہ ۱۲)

موصوف امام شوکانی کی کتابوں کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ!

"الفوائد المجموعة في الاحاديث الموضوعة" امام شوکانی نے اپنی اس کتاب

کی تصنیف کے وقت موضوع احادیث ۔ کے بہت سے مجموعوں کو سامنے رکھا ہے۔ ان احادیث پر نقد کے بعد کچھ احادیث کے متعلق بتایا ہے کہ ان کو موضوع کہنا درست نہیں۔ ان کو زیادہ سے زیادہ ضعیف کے زمرے میں لایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ابن الجوزی نے بقول حافظ ابن حجر تساہل اور غفلت سے بعض صحیح احادیث کو بھی اپنی کتاب "الموضوعات الکبریٰ" میں شامل کر لیا ہے۔ مگر علامہ محمد بن جعفر الکتانی المتوفی ۱۳۴۵ھ اپنی کتاب "الرسالۃ المستطرفہ" میں یہی شکوہ مولانا عبدالحی لکھنوی کی کتاب "ظفر الامانی" کے حوالے سے امام شوکانی کے متعلق کرتے ہیں کہ انہوں نے بعض حسن اور صحیح احادیث کو بھی موضوع قرار دے دیا ہے۔ (حوالہ مذکور صفحہ ۱۹)

امام شوکانی کی تفسیر فتح القدیر الجامع بین فن الروایۃ و الدرایۃ من علم التفسیر کے تعارف میں پروفیسر صاحب لکھتے ہیں کہ

امام شوکانی کی یہ تفسیر ضخیم پانچ جلدوں پر مشتمل ہے اہل علم کے مشورے اور اصرار پر انہوں نے یہ تفسیر لکھی ہے۔ یہ تفسیر خود شوکانی کے قول کے مطابق روایت اور درایت کی جامع ہے اور بقول علامہ راغب طباخ امام شوکانی نے اس تفسیر میں اپنے اس دعویٰ کو بطریق احسن نبھایا ہے۔ (حوالہ مذکور)

اوپر دلائل قاہرہ سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ امام شوکانی زیدی شیعہ ہیں خود زیدی علماء اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کوئی ایک شیعہ بھی اس کی تردید کی جرأت نہیں کر سکا۔

غیر مقلدین کا امام شوکانی کے ساتھ ایک خاص رشتہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ بانی تحریک غیر مقلدیت جناب عبدالحق بنارسی موصوف کے شاگرد خاص تھے اس لئے پروفیسر طیب شاہین لودھی صاحب نے امام شوکانی کو شیعہ تسلیم کرنے کے بجائے اہل حدیث تسلیم کرا دیا امام شوکانی کی سلفیت ملاحظہ فرمائیں۔

پروفیسر شاہین صاحب نے لکھا ہے کہ امام شوکانی نقد حدیث میں اس قدر متشدد تھے کہ بعض اہل علم نے شکوہ کر دیا کہ انہوں نے بعض حسن اور صحیح احادیث کو بھی موضوع قرار دے دیا ہے۔ لیکن اس شکوے کے برعکس یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ شوکانی بکثرت موضوع و ضعیف احادیث ذکر کرتے ہیں اور ان پر نقد و جرح کیے بغیر آگے گزر جاتے ہیں۔ مثلاً قرآن حکیم میں آیا ہے کہ اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ (المائدہ نمبر ۵۵)

(بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ تمہارے دوست ہیں)

مذکورہ صدر آیت کی تفسیر میں امام شوکانی شیعہ کی وضع کردہ روایات کا ذکر کرتے ہیں مگر ان پر کوئی نقد و جرح نہیں کرتے۔

حالانکہ ان کا قول یہ ہے کہ ایسی احادیث سے حضرت علیؓ کی امامت پر احتجاج نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ وہ اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت ذکر کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے حالت رکوع میں جب اپنی انگوٹھی صدقہ کر دی تو نبی کریمؐ نے سائل سے دریافت کیا کہ یہ انگوٹھی تمہیں کس نے دی؟ اس نے کہا اس رکوع کرنے والے (حضرت علیؓ) نے تب مذکورہ صدر آیت نازل ہوئی۔ (فتح القدیر صفحہ ۵۰ جلد ۲)

یہ روایت جملہ اہل علم کے نزدیک موضوع ہے مگر امام شوکانی پر تعجب ہے کہ وہ جہاں اپنی آزاد خیالی سے بعض حسن اور صحیح احادیث کو بھی موضوع قرار دے دیتے ہیں وہاں وہ مذہب شیعہ کی تائید میں وارد بعض موضوع روایات کو بغیر کسی نقد و جرح کے نقل کر دیتے ہیں اور تقلید کے مخالف اہل حدیث حضرات خود اس قدر اندھی تقلید کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وہ امام شوکانی کے محض نقل کر دینے ہی کو "وحی و الہام" کا درجہ عنایت کر دیتے ہیں۔

امام شوکانی کی طرح ایک دوسرے زیدی شیعہ مفسر نے بھی اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب حضرت علیؓ نے حالت نماز میں اپنی انگوٹھی خیرات کر دی تھی۔ (الثمرات الیانعة از شمس الدین یوسف بن احمد)

زیدی شیعوں کو تو چھوڑیئے خود اثنا عشری شیعہ مفسرین نے بھی اس آیت سے حضرت علیؓ کی امامت پر استدلال کیا ہے۔ تفسیر صافی میں اس آیت کی تفسیر میں مختلف روایات درج ہیں۔ ایک روایت کافی کے حوالہ سے جناب امام جعفر صادق سے منقول ہے کہ!

ایک دن حضرت علی ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے آپ کے بدن پر ایک حلہ تھا۔ جس کی قیمت ایک ہزار دینار تھی وہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے آنحضرت ﷺ کو بطور ہدیہ دیا ہوا تھا اور آپ ﷺ نے اسے حضرت علی کو عطا فرما دیا تھا۔ آپ دو رکعت پڑھ کر حالت رکوع میں تھے کہ ایک سوالی نے آ کر کہا السلام علیک یا ولی اللہ و اولیٰ بالمومنین من انفسھم "مجھ مسکین کو کچھ صدقہ دیجئے" پس آپ نے وہ حلہ اتار کر پھینکا اور انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا کہ اسے اٹھا لو پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل

فرمائی وہ سائل اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ تھا۔ بعض روایات میں حلہ کا عطا کرنا آیا ہے اور بعض میں انگوٹھی کا...... صاحب تفسیر صافی لکھتے ہیں کہ ان روایات میں منافات نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ حضرت علیؑ نے ایک دفعہ حالت رکوع میں حلہ دیا ہو اور دوسری بار انگوٹھی۔ اور آیت ولایت دوسری بار عطا کرنے پر نازل ہوئی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؑ کی ولایت اور خلافت کا اعلان فرما دیا ہے۔

آیت کریمہ یا ایھا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (المائدہ نمبر ۶۷) کی تفسیر میں شوکانی حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت آنحضور ﷺ پر غدیر خم کے روز حضرت علیؓ کے بارے میں نازل ہوئی اسی طرح عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا اس آیت میں ہم عہد رسالت میں یہ الفاظ بھی پڑھا کرتے تھے "انّ علیاً مولی المؤمنین" (فتح القدیر صفحہ ۷۵ جلد ۲)
شوکانی ان دو روایتوں پر کوئی جرح نہیں کرتے۔

اس آیت کے تحت فرقہ اثنا عشریہ کی تفاسیر میں بھی یہی واقعہ درج ہے۔ کہ اس حکم خدا کی تعمیل میں آپ ﷺ نے یوم غدیر خم الصلوۃ جامعۃ پکارے جانے کا حکم دیا اور علیؑ کو مولیٰ مقرر فرمایا لوگوں کو یہ حکم دے دیا کہ جو حاضر ہے وہ غائب کو اس امر کی خبر کرے۔

اس کے برعکس ان آیات میں جن میں مشرکین کی مذمت کی گئی ہے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی پیروی کرتے تھے۔ امام شوکانی ائمہ فقہ کے مقلدین کو ان کا مصداق ٹھہراتے ہیں۔ وہ مقلدین پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ کے تارک اور سنت رسول ﷺ سے انحراف کرنے والے ہیں۔ قرآن عزیز میں آیا ہے کہ

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَیْھَا آبَاءَنَا.......... (الاعراف نمبر ۲۸)

وہ جب کسی برائی کا ارتکاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے بڑوں کو یہ کام کرتے پایا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں شوکانی لکھتے ہیں کہ!

اس آیت کریمہ میں مقلدین کے لئے درس پند و موعظت ہے جو خلاف حق مذاہب میں اپنے آباء کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ کفار کی پیروی ہے اہل حق کی نہیں۔ مقلدین بھی یہی کہتے ہیں کہ "ہم نے اپنے اکابر کو ایک مذہب پر پایا اور ہم ان کے نقش قدم پر گامزن ہیں" (الزخرف نمبر ۲۲)
مقلد اسی فریب میں مبتلا ہوتا ہے کہ اس نے اپنے اکابر کو اسی روش پر پایا اور اس کا حکم اللہ ہی نے دیا تھا۔ اگر وہ اس دھوکا کا شکار نہ ہوتا تو اس پر قائم نہ رہتا۔

اس غلط فہمی کی اساس پر یہودی یہودیت پر نصرانی نصرانیت پر اور بدعتی اپنی بدعت پر قائم ہے۔ اس گمراہانہ روش پر گامزن رہنے کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے اپنے بڑوں کو یہودیت نصرانیت اور بدعت کی راہ پر گامزن پایا۔ یہ لوگ اپنے بڑوں کے بارے میں یہ حسن ظن رکھتے ہیں کہ وہ حق کی راہ پر رواں دواں ہیں۔ یہ حق کی طلب وتلاش کی زحمت گوارا نہیں کرتے اسی کا نام تقلید ہے۔ حالانکہ اس امت میں اللہ نے ایک ہی رسول بھیجا تھا۔ جس کی اطاعت کا حکم دیا اور مخالفت سے منع فرمایا۔ اگر ائمہ مذاہب کی محض رائے ہی واجب الاتباع حجت ہوتی تو اس امت کے اتنے ہی رسول ہوتے جس قدر ائمہ فقہ کی تعداد ہوتی۔ حق سے بُعد اور غفلت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ مقلدین کتاب وسنت کے ہوتے ہوئے بھی رجال واشخاص کی آراء اختیار کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے اندر ایسے علماء موجود ہیں جن سے وہ کتاب وسنت کے دلائل معلوم کر سکتے ہیں اور وہ عقل وشعور اور فہم وادراک کی صلاحیت سے بھی بہرہ مند ہیں۔ (تحفہ صفحہ ۱۵ جلد ۲)

قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبہ نمبر ۳۱)

انہوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا۔

اس آیت کی تفسیر میں شوکانی لکھتے ہیں کہ

یہ آیت ہر عقل وبصیرت رکھنے والے انسان کو تقلید سے باز رکھتی اور اس بات سے روکتی ہے کہ ائمہ کے اقوال کو کتاب وسنت کے مقابلہ میں ترجیح دی جائے۔ جو لوگ نصوص ودلائل کی مخالفت کر کے علماء وائمہ کی آراء کی تقلید کرتے ہیں۔ ان کا طرز عمل یہود ونصاریٰ سے ملتا جلتا ہے۔ انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو رب بنا لیا تھا۔ یہ حتمی اور قطعی بات ہے کہ یہود ونصاریٰ اپنے علماء کی عبادت نہیں کرتے تھے۔ بخلاف ازیں وہ ان کی اطاعت کرتے تھے۔ جس چیز کو وہ حلال کہتے اس کو حلال سمجھتے اور جس کو حرام کہتے اس کو حرام قرار دیتے تھے۔

اس امت کے مقلدین کا طرز عمل بھی بعینہٖ یہی ہے بالکل اسی طرح جس طرح ایک کھجور دوسری کھجور سے ملی جلتی ہوتی ہے اور جس طرح انڈا انڈے کے اور پانی پانی کے مشابہ ومماثل ہوتا ہے۔ مقام حیرت وتاسف ہے کہ لوگوں نے کتاب وسنت کو چھوڑ کر اپنے ہی جیسے آدمیوں کی عبادت شروع کر دی ان کے افکار وآراء کی پیروی کرنے لگے اگرچہ دینی دلائل و

براہین سے ان کی تائید نہ ہوتی ہو۔ حالانکہ قرآن و حدیث کی نصوص ببانگ دہل اس کی تردید کرتی ہیں۔ (فتح القدیر صفحہ ۳۲۲ جلد ۲ بحوالہ تاریخ تفسیر و مفسرین صفحہ ۳۸۴)

بہر حال امام شوکانی ایک زیدی شیعہ عالم ہیں اور ایک شیعہ عالم سے اہلسنت کے خلاف اسی جارحانہ انداز ہی کی توقع ہو سکتی ہے۔ اسی لئے غیر مقلدین نے اہلسنت دشمنی میں اشتراک کی بناء پر ایک زیدی شیعہ کو اپنا مقتدا اور راہبر تسلیم کر لیا۔ فیا اسفا

حضرت محمد الباقر کے دور میں زیدی شیعوں کے علاوہ غلاۃ شیعوں میں سے فرقہ المنصوریہ اور فرقہ المغیریہ کا ذکر بھی ملتا ہے۔

فرقہ المنصوریہ۔۔۔ ابو منصور عجلی کے ماننے والے اس فرقہ کا بانی ابو منصور العجلی تھا۔ جو الکسف کے لقب سے معروف تھا۔ ابو منصور پہلے اپنی نسبت امام محمد باقر کی طرف کرتا تھا اور کہتا تھا کہ امامت حضرت علیؓ سے منتقل ہو کر ان کی اولاد میں سے امام باقر تک پہنچی اس کا دعویٰ تھا کہ میں امام باقر کا جانشین ہوں۔ جب اس نے غلو شروع کیا تو امام محمد باقر نے اس سے برأت کا اعلان کیا اور اسے اپنی مجلس سے بھگا دیا۔ تب اس نے خود امامت کا دعویٰ کیا۔ امام باقر کے زمانہ (۹۴ھ تا ۱۱۴ھ) میں اس کا فتنہ ظاہر ہوا۔

یہ کہتے تھے کہ آل محمد آسمان ہیں اور شیعہ زمین ہیں اور مجوسیوں کی طرح انہوں نے بھی ماں اور بیٹی سے نکاح کو حلال قرار دیا اور نبوت و رسالت کا نام امامت رکھ دیا کیونکہ یہ اس بات کے قائل ہیں کہ رسالت ختم نہیں ہوئی۔ حضرت علیؓ ایک ٹکڑا ہیں جو آسمان سے نازل ہوا اور وہ خدا ہے۔ ابو منصور نے کہا کہ مجھے آسمان پر لے جایا گیا۔ پھر اللہ نے مجھ سے کلام کیا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اے بیٹے میرے احکام لوگوں تک پہنچا دیجیے پھر مجھے زمین پر اتار آ گیا۔

اسی طرح جہنم سے امام کے مخالفین یعنی ابو بکرؓ و عمرؓ مراد ہیں۔ اس فرقہ کے لوگ کہتے ہیں کہ فرائض سے وہ اشخاص و رجال مراد ہیں جن سے محبت رکھنے کے لئے ہم مامور ہیں بخلاف ازیں محرمات سے وہ انسان مقصود ہیں۔ جن کے ساتھ بغض و عداوت رکھنا ضروری ہے۔ (الفرق بین الفرق صفحہ ۲۴۳)

وہ کہتا تھا کہ عالم قدیم ہے۔ احکام شریعت ملاؤں کی گھڑت ہے۔ جنت و دوزخ خیالی ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں اور قرآن و حدیث میں جس جنت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے خلیفہ و امام مراد ہیں۔ جس کی اطاعت ہمارے لئے ضروری ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ آیت

"وَاِنْ یَّرَوْا کِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ" (الطور نمبر ۴۴) میں کِسْف کے لفظ سے مجھے یاد کیا گیا ہے۔

فرقہ المغیریہ ۔۔۔ یہ فرقہ مغیرہ بن سعید العجلی کی طرف منسوب ہے اور اس فرقہ کے لوگ اسی گروہ کے پیرو ہیں۔ یہ شخص امام باقر کے زمانہ (۹۵ھ تا ۱۱۴ھ) میں تھا اور جھوٹ گھڑتا تھا۔ پہلے یہ شیعہ امامیہ کا ہم خیال تھا۔ پھر اس نے امام محمد باقر کی کتابوں (تعلیمات) میں کفر اور زندقہ کی باتوں کا اضافہ کیا۔ بعد میں اس نے امام باقر کی امامت کا انکار کر کے خود اپنی امامت اور نبوت کا اعلان کر دیا۔ اس وقت ہشام بن عبدالملک کی حکومت تھی اور عراق پر خالد بن قسری ان کی طرف سے گورنر مقرر تھے۔ مغیرہ بن سعید عجلی اسی گورنر عراق کا غلام تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک انسان کی شکل ہے۔ اس نے دنیا کو جب پیدا کرنا چاہا تو لوگوں کے اعمال کو خود ہی لکھا پھر خود ہی ان کی بداعمالیوں کے تصور سے غضب میں آیا تو جوش غضب سے پسینہ آیا۔ اس پسینہ سے سمندر سے دریا پیدا ہوئے۔ سمندر میں اللہ کا عکس پڑا اس عکس میں سے تھوڑا سا حصہ لے کر اللہ نے چاند، سورج اور ستارے بنائے پھر باقی عکس کو فنا کر دیا کہ اس کا کوئی شریک باقی نہ رہے پھر شیریں دریا سے مومن اور کھاری سے کافر بنائے۔ پھر خدا نے اپنی امانت یعنی امامت پہاڑوں کو سپرد کرنا چاہی تو انہوں نے اس لئے انکار کیا کہ وہ حضرت علیؑ کا حق ہے انہی کو پہنچنا چاہیے۔ اس نے حضرت علیؑ کے بارے میں بہت غلو کیا۔ حتیٰ کہ حضرت علیؑ کو تمام انبیاء سے افضل قرار دیا۔ مغیرہ کا عقیدہ تھا کہ امامت حضرت علیؑ کے بعد حضرت حسنؑ اور ان کے بعد انہی کی اولاد کا حق ہے۔ اس کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ میں اسم اعظم جانتا ہوں اور اس کے ساتھ مردوں کو زندہ کر سکتا ہوں اور لشکروں کو شکست دے سکتا ہوں۔ مغیرہ کہا کرتا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے دنیا کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو اسم اعظم پڑھا اسم اعظم اڑ کر ایک تاج کی شکل میں اس کے سر پر آ بیٹھا قرآن کریم کی آیت "سبح اسم ربك الاعلی" میں یہی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ اور کہا کرتا تھا اسم اعظم سے وہ تاج مراد ہے۔ (الفرق بین الفرق صفحہ ۲۹۹)

مغیرہ کے قتل ہونے کے بعد اس کی جماعت کے لوگ مغیرہ کو ہی آنے والا امام مہدی یقین کرنے لگے۔ یہ لوگ عقیدہ غیبت اور رجعت (عقیدہ اثنا عشریہ) کے بھی قائل ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ ہندوؤں کے بعض شاستروں میں پرم ایشور کے پسینہ سے دریا و سمندر وغیرہ بننے کی مذکورہ حکایت اسی کے قریب قریب الفاظ میں موجود ہے۔ ہندوؤں کے اکثر

شاستر مسلمانوں کی آمد کے بعد تصنیف ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرامطہ یا حشاشین کے ذریعے مغیرہ کے مذکورہ خیالات ہندوؤں میں شائع ہو کر مقبول اور پھر ان کی تصانیف میں داخل ہوئے نیز یہ بھی ممکن ہے کہ مغیرہ ہندوستان ہی سے اس خیال و عقیدہ کو خراسان میں لے گیا ہو۔

(بحوالہ تحفہ اثنا عشریہ، حقیقت مذہب شیعہ صفحہ ۱۳۲ حکیم فیض عالم صدیقی، شیعیت مترجمہ استاذ ابوز ہیرہ مدنی۔

تاریخ زوال ملت اسلامیہ صفحہ ۸۰، تاریخ تفسیر و مفسرین ص ۳۶۳)

شیعیت حضرت جعفر صادق کے عہد میں

حضرت جعفر صادق شیعہ کے چھٹے امام ہیں ۸۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۴۸ھ میں بعمر پینسٹھ (۶۵) سال وفات پائی۔ ان کی والدہ محترمہ ام فروہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پوتے قاسم (بن محمد بن ابوبکرؓ) کی صاحبزادی ہیں۔ ام فروہ والدہ کی طرف سے بھی صدیقی ہیں۔ (ام فروہ بنت اسماء بنت عبدالرحمن بن ابوبکرؓ)

حضرت محمد باقر شیعہ اقوال کے مطابق ۱۱۴ھ یا ۱۱۷ھ میں فوت ہوئے۔ ان کے بعد حضرت جعفر صادق منصب امامت پر فائز ہوئے۔ انہوں نے اپنی امامت کے دوران پانچ اموی خلفاء (ہشام، ولید ثانی، یزید ثالث، ابراہیم، مروان ثانی) اور دو عباسی خلفاء (ابوالعباس سفاح، ابوجعفر منصور) کا دور حکومت پایا۔ شیعہ کے نزدیک امام ششم کا دور مذہب شیعہ کے لئے ایک سنہری دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے مذہب کا نام بھی (مذہب جعفریہ) تمام ائمہ میں سے صرف ان ہی کی طرف منسوب ہو گیا۔

علامہ سید محمد طباطبائی لکھتے ہیں کہ!

آپ نے اپنی امامت کے آخری زمانے تک جو بنوامیہ کی خلافت کے خاتمے اور بنوعباس کی خلافت کے آغاز کا زمانہ تھا اس فرصت سے خوب فائدہ اٹھایا اور دینی تعلیم و تبلیغ میں مشغول رہے۔ آپ نے مختلف نقلی و عقلی علوم و فنون میں بہت زیادہ دینی اور علمی شخصیتیں پیدا کیں مثلاً زرارہ، محمد بن مسلم، مومن طاق، ہشام بن حکم، ابان بن تغلب، ہشام بن سالم، حریز، ہشام کلبی قسابہ، جابر بن حیان صوفی، شیمیائی وغیرہ جن کو آپ نے فیض یاب کیا۔ وہ احادیث جو "صادقین" یعنی امام پنجم اور امام ششم سے نقل ہوئی ہیں وہ ان تمام احادیث سے برابر ہیں جو پیغمبر اکرمؐ اور دوسرے دس ائمہ سے نقل ہوئی ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ ہیں لیکن آپ آخری عمر میں عباسی خلیفہ منصور کے مظالم

سے دوچار ہو گئے۔ آپ پر پابندی اور نظر بندی عائد کر دی گئی آپکو آزار و شکنجے بھی دیئے گئے اور اس کے ساتھ ہی علوی سادات کا اس قدر قتل عام کیا گیا کہ بنی امیہ اپنی سفاکی اور ظلم و ستم کے باوجود اس حد تک نہ پہنچے تھے۔ خلیفہ عباسی منصور کے حکم سے ان کے پیروکاروں کو گروہ در گروہ پکڑ کر جیلوں اور کوٹھڑیوں میں بند کر دیا جاتا تھا اور ان کو بے دریغ شکنجوں اور اذیت کے ساتھ قتل کر دیا جاتا تھا۔ بعض لوگوں کی گردن اڑا دی جاتی تھی۔ بعض کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا اور بعض کو زندہ عمارتوں کی دیواروں میں چنوا دیا جاتا تھا۔

عباسی خلیفہ منصور نے چھٹے امام کو گرفتار کرنے کے لئے حکم جاری کیا امام مدت تک نظر بند رہے اور کئی بار آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا اور آپ کی توہین کی گئی لیکن آخر کار آپ کو مدینہ جانے کی اجازت دے دی گئی اور امام واپس تشریف لے گئے اور باقی تمام عمر خاموشی سے گوشہ نشینی اور عزلت میں گذار دی۔ یہاں تک کہ منصور کی چالبازی سے آپ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔ (شیعہ صفحہ ۲۰۴)

حضرت جعفر صادق اپنے پیش رو "ائمہ" کے دین و مذہب پر تھے اور ان کا وہی مذہب تھا جو خلفائے راشدین کا تھا۔ حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت زین العابدینؒ، حضرت محمد باقرؒ اور حضرت جعفر صادق اپنے وقت کے حکمرانوں کی اقتداء میں بالکل ان ہی کے مسلک کے مطابق بغیر اعادہ کے اپنی نمازیں ادا کرتے رہے۔ بعد کے شیعہ نے ہزاروں روایات وضع کر کے حضرت جعفر صادقؒ کی طرف منسوب کر دیں۔ خود طباطبائی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ امام پنجم اور امام ششم کی مرویات کی تعداد نبی اکرم ﷺ اور دوسرے دس ائمہ کی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ حیرت ہے کہ حضرت علیؓ، حسینؓ، اور زین العابدین جو نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں یا آپؐ کے زمانے کے قریب تر موجود تھے اور بعد میں ۴۰ھ، ۵۰ھ، ۶۰ھ اور ۹۵ھ تک انہیں موقع بھی ملا مگر وہ اور ان کے شیعہ حلال و حرام سے بھی واقف نہ ہو سکے اور ان مسائل کے لئے وہ دوسروں (سنیوں) کے محتاج تھے۔

چنانچہ اصول کافی میں ہے کہ پھر امام محمد بن علی ابو جعفر تشریف لائے اور شیعان علی ان کی آمد سے قبل احکامات حج اور حلال و حرام کو قطعاً نہ جانتے تھے۔ انہوں نے آ کر طریقہ حج اور حلال و حرام کو خوب بیان کیا یہاں تک کہ اب اور لوگ (غیر شیعہ) ان معاملات و مسائل میں اہل تشیع

کے محتاج ہو گئے۔ حالانکہ ان سے پہلے خود شیعہ ان لوگوں سے مسائل معلوم کرنے کے محتاج تھے

(اصول کافی صفحہ ۲۰۷)

جناب طباطبائی نے حضرت جعفر صادق کے جن تلامذہ کا ذکر کیا ہے خود کتب شیعہ میں ان کے متعلق متضاد روایات پائی جاتی ہیں۔

چوتھی صدی ہجری کے مشہور شیعہ عالم محمد بن عمر کشی لکھتے ہیں کہ!

حضرت جعفر صادق فرماتے ہیں کہ اللہ کے حضور خشوع و خضوع کرنے والوں کو خوش خبری دے دو کہ وہ جنتی ہیں۔ برید بن معاویہ العجلی، ابو بصیر لیث بن البختری المرادی، محمد بن مسلم اور زرارہ یہ چاروں اللہ کے مقرب بندے اس کے حلال و حرام کے امین ہیں "لو لا هؤلاء انقطعت اثار النبوة" اگر یہ نہ ہوتے تو نبوت کے آثار کبھی کے مٹ گئے ہوتے (رجال کشی تذکرہ ابو بصیر لیث البختری صفحہ ۱۵۲)

یہی کشی مذہب جعفریہ کے اہم ستون زرارہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ حضرت جعفر صادق نے فرمایا "لو لا زرارة لظننت ان احادیث ابی ستذهب" "میرے خیال کے مطابق اگر زرارہ نہ ہوتا تو میرے والد (حضرت باقر) سے مروی تمام احادیث ختم ہو گئی ہوتیں۔

امام موصوف فرماتے ہیں کہ "یا زرارة ان اسمك فی اسامی اهل الجنة" "اے زرارہ تیرا نام اہل جنت کے نام میں شامل ہے (رجال کشی صفحہ ۱۲۳)

کشی نے زرارہ کے متعلق اس کے ساتھیوں کا یہ قول بھی نقل کر دیا ہے کہ "فکل من ادرك زرارة فقد ادرك ابا عبدالله" "جس نے زرارہ کو پایا گویا اس نے حضرت جعفر صادق کو پا لیا۔

اب ان ستونوں کے متعلق ائمہ کا دوسرا رخ ملاحظہ کیجئے ابو سیار کہتا ہے کہ میں نے حضرت جعفر صادق کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ برید پر لعنت کرے اللہ کی زرارہ پر لعنت ہو امام نے تین مرتبہ زرارہ پر لعنت بھیجی۔ (رجال کشی صفحہ ۱۴۸)

ابو بصیر کے متعلق حضرت موصوف کا فرمان۔

حماد کہتا ہے کہ ایک مرتبہ ابو بصیر حضرت جعفر صادق کے دروازے پر بیٹھا اندر جانے کی اجازت طلب کر رہا تھا لیکن اسے جب اجازت نہ ملی تو اس نے کہا "لو کان معنا طبق لاذن" "اگر ہمارے پاس طبق بھرا ہوتا تو ضرور اجازت مل جاتی۔ راوی کہتا ہے کہ اس کے بعد ایک کتا آیا "فشغر فی وجه ابی بصیر" "اور ابو بصیر کے منہ میں پیشاب کر گیا" قال اُف اُف ما هذه"

تو یہ اف کرتا ہوا پوچھنے لگا کہ یہ کیا ہے؟ تو اس کے ساتھی نے کہا کہ "ھذا کلب شغر فی وجھلک" یہ کتا ہے جو تیرے منہ میں پیشاب کر گیا ہے۔ (رجال کشی صفحہ ۱۵۵ ذکر ابو بصیر)

محمد بن مسلم کے متعلق حضرت جعفر صادق فرماتے ہیں کہ

اے ابو الصباح: اپنے دین میں شک کرنے والے ہلاک ہو گئے ان میں سے ہی زرارہ، برید، محمد بن مسلم اور اسماعیل جعفی ہیں۔ (رجال کشی صفحہ ۱۰۱ ذکر محمد بن مسلم)

مُفضّل بن عمر کہتا ہے کہ میں نے حضرت جعفر صادق کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ محمد بن مسلم پر لعنت کرے اللہ کے بارے میں یہ شخص کہا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کا علم اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک وہ چیز نہیں ہو جاتی۔ (حوالہ مذکور تنقیح المقال صفحہ ۱۸۶ جلد ۳)

عصر حاضر میں مذہب شیعہ کا ترجمان اعظم غلام حسین نجفی لکھتا ہے کہ

بالکل درست ہے اگر کوئی امام کی شان میں گستاخی کرے تو اس کے منہ میں کتے کو پیشاب کرنا چاہیے اور جو شخص نبی اکرم ﷺ کی عقل اور دماغ کی شان میں گستاخی کرے اس کے منہ میں خنزیر کو پیشاب کرنا چاہیے (حقیقت فقہ حنفیہ صفحہ ۳۹)

اس ملعون نے حضرت عمر فاروقؓ پر یہاں جو تبرا کیا ہے اس کا جواب کسی دوسرے موقع پر دیا جائے گا (ان شاء اللہ)

یہاں مذہب شیعہ کے جملہ راویوں کا کردار پیش کرنا مقصود نہیں صرف یہ بتانا ہے کہ "بمصداق ایں خانہ ہمہ آفتاب است" جملہ رواۃ کا یہی حال ہے انہوں نے ائمہ اہلبیت کی احادیث و روایات میں جھوٹی اور من گھڑت روایات داخل کیں۔ اور اسلام کے بالمقابل اور متوازی مذہب شیعہ کے نام سے ایک نیا دین و مذہب پیش کیا۔

بہر حال حضرت جعفر صادق کے دور میں شیعہ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک گروہ نے سیاست وقت سے الگ تھلگ رہتے ہوئے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور عبداللہ بن سبا کے اصولوں کی روشنی میں ایک نئے مذہب کی تصنیف و تدوین کے لئے اپنی کوششیں تیز کر دیں جبکہ شیعہ کے دیگر گروہوں نے سیاسی محاذ سنبھالے رکھا اور انہوں نے ملت اسلامیہ و خلافت اسلامیہ کو درہم برہم کرنے میں اپنی جانیں تک کھپا دیں۔ ان میں سے بعض گروہوں (خوارج، کیسانیہ اور زیدیہ) کا تفصیلی ذکر پیچھے گذر چکا ہے۔

حضرت جعفر صادق کے دور میں بھی یہ گروہ برابر سرگرم عمل رہے یہاں تک کہ وہ بنو امیہ کی خلافت ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بنوامیہ کی خلافت تقریباً ۹۲ سال تک قائم رہی۔
خلافت بنوامیہ کی اصطلاح کے متعلق مولانا سید عبدالقدوس حاشمی لکھتے ہیں کہ

یہ اصطلاح کہ حضرت معاویہؓ سے لے کر مروان ثانی تک سب کو خلفائے بنی امیہ کہا جائے عہد عباسی کے خوشامدیوں نے بنائی ہے۔ تاکہ عباسیوں کی خوشنودی حاصل کریں۔ ورنہ تاریخی اور عقلی دونوں بنیادوں پر یہ اصطلاح غلط ہے اگر مقصود یہ ہے کہ یہ سب امیہ بن عبدالشمس کی اولاد میں تھے تو حضرت عثمانؓ بھی امیہ بن عبدالشمس کی اولاد میں سے تھے۔ خلافت بنی امیہ میں انہیں کیوں نہ شمار کیا گیا اور اگر مقصود یہ ہے کہ سارے بنوامیہ ان کے طرف دار تھے تو تاریخی طور پر یہ بھی غلط ہے بہت سے بنوامیہ نے ان کے خلاف ہو کر جنگیں کی تھیں۔ اس لئے صحیح اصطلاح یہی ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ کو طالبین، حضرت معاویہؓ اور یزید اول کو سفیانین اور مروان اول سے مروان ثانی تک کے بارہ خلفاء کو مروانین کہا جائے۔ (خلافت اسلامیہ صفحہ ۲۷)

چونکہ شیعہ کی بنیاد ہی اسلام اور مسلمان دشمنی پر پڑی تھی۔ اس لئے ہر دور میں یہ ان دونوں کے دشمن رہے۔ پہلے دور میں حضرات خلفائے ثلاثہؓ نے نہ صرف اسلام کی تبلیغ و حفاظت کی ذمہ داری نبھائی بلکہ مملکت اسلامیہ کی سرحدوں میں بھی برابر اضافہ کرتے رہے۔ فتوحات کی اس یلغار کو روکنے کے لئے ایک منظم سازش کے تحت انہوں نے پہلے حضرت عمر فاروقؓ کا چراغ حیات گل کیا اور پھر مدینہ منورہ پر یورش اور چڑھائی کر کے حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کیئے۔ پھر دور مرتضوی میں جمل و صفین کے ذریعے مسلمانوں میں باہمی خانہ جنگی پیدا کر کے مزید ترقی کی۔ جو حضرت علیؓ کی شہادت پر ختم ہوئی۔ حضرت حسنؓ ان کے جال سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور خلافت کی باگ ڈور حضرت معاویہؓ کے ہاتھ میں آ گئی۔ جس سے سازشی کاروائیوں کا رخ بھی آں محترمؓ کی طرف مڑ گیا اور یہ عداوت یہاں تک بڑھی کہ "بغض معاویہؓ" کی ضرب المثل مشہور ہو گئی۔ عام طور پر اس مثال کو نامکمل نقل کیا جاتا ہے۔ پوری مثال اس طرح ہے: لَا لِحُبِّ علیؓ بل لبغض معاویۃؓ یعنی یہ جذبہ حضرت علیؓ کی محبت میں نہیں بلکہ حضرت معاویہؓ کی دشمنی میں اپنایا گیا۔ یزید بن معاویہؓ کے دور میں اسی طبقہ کی دسیسہ کاریوں کی بناء پر سانحہ کربلا رونما ہوا۔ پھر انتقام حسینؓ کے نام پر اسلام کے خلاف مختار ثقفی نے جو کردار ادا کیا

کا حال پیچھے گذر چکا ہے۔ بقول شیعہ جب مختار نے قاتلان حسینؓ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور چن چن کیفر کردار تک پہنچا دیا تو پھر اس کے بعد شیعہ بنو امیہ کی خلافت ختم کرنے کے درپے کیوں رہے؟

جبکہ ان کے ائمہ حضرت زین العابدین، حضرت محمد باقر اور حضرت جعفر صادق نے اس دور میں نہایت اطمینان اور عزت کے ساتھ زندگی بسر کی۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ شیعوں کو اگر بنو امیہ سے اس لئے نفرت ہے کہ وہ واقعہ کربلا میں ملوث تھے۔ تو پھر انہوں نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے خلاف میدان جنگ کیوں گرم کیا؟ وہ تو موقف حسینؓ کے مؤید اور حامی تھے۔ مختار ثقفی اموی خلیفہ عبدالملک کے ہاتھوں ہلاک نہیں ہوا بلکہ حضرت مصعب بن زبیرؓ کے ہاتھوں اپنے منطقی انجام تک پہنچا۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے بعد تمام مسلمان ایک دفعہ پھر باہم متحد و متفق ہو گئے اور عبدالملک بن مروان کی زیر قیادت فتوحات اسلام کا رکا ہوا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔ یہاں تک کہ ولید بن عبدالملک کے دور کے متعلق مؤرخین کو یہ اقرار کرنا پڑا کہ!

''امیر المومنین ولید اول کی حکومت کا رقبہ نہ صرف خلفائے اسلام میں سب سے زیادہ وسیع تھا۔ بلکہ تاریخ میں دنیا کے کسی بادشاہ کا رقبہ حکومت اس کے برابر نہیں ہوا۔ ولید اول کی وفات کے وقت خلافت اسلامیہ کی حدود افریقہ میں یوگنڈا سے شمالی ترکستان کے استرخان تک اور سنکیانگ سے لے کر اندلس میں سرحد فرانس تک اور وہ اس وسیع رقبہ پر مرکز دمشق سے حکومت کرتے تھے اور اتنی اچھی حکومت کی کہ اس پورے رقبہ میں نہ کہیں کوئی قابل ذکر بغاوت ہوئی اور نہ کوئی حصہ مرکز سے علیحدہ ہوا۔ حق یہ ہے کہ امیر المومنین ولید اپنی تخت دینداری، عبادت گذاری اور بیدار مغزی کے ساتھ دنیا کی تاریخ معلومہ کے سب سے عظیم اور بے مثال فرمانروا تھے۔ غرض یہ کہ چشم فلک نے صحابہ کرامؓ کے بعد ولید سے بڑھ کر دانش مند، معدلت پرور دیندار اور خوش تدبیر و ہوشیار فرمانروا شاید بہت ہی کم دیکھا ہوگا۔ {خلافت اسلامیہ صفحہ ۱۳۰-۱۳۱}

اگر شیعہ کی دانست میں یزید بن معاویہؓ ہی واقعہ کربلا کے ذمہ دار تھے تو پھر ان کی رحلت کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو جاتا یا پھر ان کی ذات کی حد تک ہی محدود رہتا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔

شیعوں کے دعویٰ کے مطابق فرقہ اثنا عشریہ ان میں اکثریتی فرقہ ہے (یہ ملحوظ رہے کہ اثنا عشری فرقہ حضرت جعفر صادق کے دور تک پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تک عام شیعوں

سے صرف خارجی، کیسانی اور زیدی ممتاز ہوئے تھے۔

کیا اثنا عشری فرقہ نے خلفاء بنو امیہ کے خلاف کسی تحریک میں حصہ لیا تھا؟ کیا ائمہ نے انہیں اس کی اجازت دی تھی؟ اگر جواب اثبات میں ہے۔ تو پھر ائمہ نے خود گوشہ نشینی کیوں اختیار کر رکھی تھی؟ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر جن شیعوں نے ان تحریکوں میں حصہ لیا تھا۔ وہ حق پر تھے یا باطل پر؟

اثنا عشری فرقہ اثنا عشریہ کے نزدیک وہ سارے شیعہ خواہ کیسانی ہوں یا زیدی باطل پر تھے۔ کیوں کہ انہوں نے امام منصوص و معصوم کے مقابلے میں غیر منصوص اور غیر معصوم کو امام بنا لیا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ جب اصل ائمہ نے کوئی تحریک نہیں چلائی اور خود گوشہ نشینی اختیار کر لی تو پھر ان کے پیروکاروں کے پیٹ میں بنی امیہ کے خلاف مروڑ کیوں اٹھ رہے ہیں؟ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ عہد بنی امیہ میں اسلام کی یہ ترقی شیعوں، یہودیوں، عیسائیوں مجوسیوں، عجمیوں اور موالیوں کو ایک آنکھ نہیں بھا سکتی تھی۔ اس لئے انہوں نے حکم امام کے انتظار کے بغیر ہی اپنی شورشیں اور سازشیں جاری رکھیں۔ کیونکہ وہ بخوبی جانتے تھے کہ امام انہیں ایسا خلاف شرع حکم ہرگز نہیں دے سکتے۔ چنانچہ یہ لوگ خلافت بنی امیہ کے خاتمہ کے لئے وقتاً فوقتاً، خارجیوں، کیسانیوں، زیدیوں اور عباسیوں کی زیر قیادت خروج کرتے رہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر ائمہ کا خلفاء بنی امیہ کے ساتھ کوئی دینی اختلاف ہوتا تو وہ ان کے ساتھ سلسلہ مناکحت ہرگز جاری نہ رکھتے مگر تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے واقعہ کربلا سے قبل اور بعد برابر ان کے ساتھ یہ سلسلہ جاری رکھا۔

خلافت بنو امیہ ۴۱ھ سے ۱۳۲ھ تک قائم رہی۔ ان بانوے سالوں میں کل چودہ حضرات خلافت سے سرفراز ہوئے ان میں سے حضرت معاویہؓ، یزیدؒ اور معاویہ ثانی کے علاوہ باقی تمام حضرات کا تعلق حضرت مروانؓ کے ساتھ ہے جو حسب ذیل ہیں۔

۱. مروانؓ اول	۲. عبدالملک بن مروانؒ	۳۔ ولید بن عبدالملک
۴. سلیمان بن عبدالملک	۵. یزید ثانی بن عبدالملک	۶۔ عمر بن عبدالعزیز
۷. ہشام بن عبدالملک	۸. ولید ثانی بن یزید ثانی	۹۔ یزید ثالث بن ولید ثانی
۱۰. ابراہیم بن ولید ثانی	۱۱. مروان ثانی	

ان میں سے ابراہیم بن ولید ثانی ۲۰ ذی الحج ۱۲۶ھ میں محض دو ماہ کے لئے خلیفہ ہوئے

اور وہ بھی صرف شام میں ان کی بیعت ہوئی اس لئے اکثر مورخین ان کو خلفائے اسلام میں شمار نہیں کرتے صفر ۱۲۷ھ میں مروان ثانی بن محمد بن مروان الاکبر فاتحانہ دمشق میں داخل ہو گئے اور ابراہیم بن ولید فرار ہو گئے۔ بعد میں مروان ثانی نے انہیں معافی دے کر اعزاز کے ساتھ دمشق میں واپس بلالیا۔

بہر حال ان چودہ خلفاء میں سے گیارہ خلفاء کا تعلق مروان اور ان کی اولاد کے ساتھ ہے اور یہ سب سانحہ کربلا کے بعد برسر اقتدار رہے۔ اب ائمہ اہل بیت کی خلفائے بنی امیہ کے ساتھ سلسلہ مناکحت کی صرف چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

ا۔ حضرت معاویہؓ بن ابوسفیانؓ نبی اکرم ﷺ کے بردار نسبتی تھے۔ ان کی ہمشیرہ سیدہ ام حبیبہؓ کو ام المومنین بننے کا شرف حاصل ہوا۔ اس رشتہ کے اعتبار سے یہ ائمہ اہل بیت کے ماموں ہیں۔ (المناقب ابن شہر آشوب صفحہ ۱۶۰ جلد ۱)

ب۔ حضرت معاویہؓ نبی اکرم ﷺ کے ہم زلف تھے۔ ام المومنین سیدہ ام سلمہؓ کی بہن قریبۃ الصغریٰ ان کے حبالہ عقد میں تھی۔ (کتاب المحبر صفحہ ۱۰۲)

ج۔ حضرت علیؓ کے چچا زاد بھائی کی اولاد میں سے حارث بن نوفل بن حارث بن عبدالمطلب بن ہاشم کے حبالہ عقد میں حضرت معاویہؓ کی بہن ہند بنت ابی سفیانؓ بن حرب تھیں۔

(الاصابہ جلد ۳ صفحہ ۵۸ تحت عبداللہ بن حارث طبقات ابن سعد جلد ۵ صفحہ ۱۳)

د۔ حضرت معاویہؓ کی حقیقی بھانجی سیدہ لیلیٰ حضرت حسینؓ کی زوجہ محترمہ تھیں اور حضرت حسینؓ کے بڑے صاحبزادے علی اکبر شہید کربلا ان ہی کے بطن سے تھے۔

(منتہی الآمال للشیخ عباس قمی جلد ۱ صفحہ ۵۰۲)

ا۔ یزیدؓ بن معاویہؓ

ا۔ یزید بن معاویہؓ کی حقیقی پھوپھی زاد بہن سیدہ لیلیٰ بنت ابی مرہ حضرت حسینؓ کے حبالہ عقد میں تھیں۔

ب۔ حضرت علیؓ کے بھتیجے و داماد اور حضرت حسینؓ کے چچازاد بھائی و بہنوئی حضرت عبداللہ بن جعفر طیارؓ کی بیٹی ام محمد یزید بن معاویہؓ کے نکاح میں تھیں۔ (کتاب الانساب والاشراف)

ج۔ حضرت حسینؓ کے بھائی عباس بن علیؓ کی پوتی سیدہ نفیسہ بنت عبداللہ بن عباس بن علیؓ

یزید بن معاویہؓ کے پوتے عبداللہ بن خالد بن یزید بن معاویہؓ کے حبالہ عقد میں تھیں اور ان کے بطن سے دو لڑکے علی بن عبداللہ بن خالد بن یزیدؒ اور عباس بن عبداللہ بن خالد بن یزیدؒ پیدا ہوئے۔

(جمہرۃ انساب العرب صفحہ ۱۰۳، کتاب نسب قریش صفحہ ۹۷)

۳۔ مروان بن الحکمؓ

دشمنان اسلام نے حضرت مروانؓ کی شخصیت اور کردار کو بہت مسخ کر کے پیش کیا ہے۔ راقم نے اپنی کتاب "حدیث حواب کا مصداق کون؟" میں ان کی صحابیت اور سیرت و کردار پر مختصر بحث کی ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ حضرت مروانؓ کے ائمہ اہلبیت کے ساتھ ہمیشہ اچھے تعلقات قائم رہے۔ جنگ جمل کے موقع پر جب یہ ماخوذ ہو گئے تو حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ نے حضرت علیؓ کی خدمت میں سفارش کی تو حضرت علیؓ نے یہ سفارش قبول کی اور انہیں امان دیتے ہوئے رہا کر دیا۔

(السنن لسعید بن منصور صفحہ ۳۶۶، نہج البلاغہ صفحہ ۱۲۳، مروج الذھب صفحہ ۳۷۸)

پھر جب دور معاویہؓ میں مروانؓ مدینہ کے والی اور گورنر ہوئے تو حضرت حسینؓ ہمیشہ مروانؓ کی اقتداء میں نماز ادا کرتے رہے۔

(المصنف لابن ابی شیبہ جلد ۲ صفحہ ۳۷۸، البدایۃ و النھایۃ جلد ۸ صفحہ ۲۵۸، تاریخ صغیر امام بخاری صفحہ ۷۷)

ایک شخص ابراہیم بن حفصہ نے حضرت زین العابدینؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ کے عقیدت مندوں میں جو ابو حمزہ الشمالی ہے وہ کہتا ہے کہ ان امراء و خلفاء کے پیچھے ہم نماز ادا نہیں کریں گے اور ان کے ساتھ نکاح اور رشتہ داری کا تعلق بھی قائم نہیں کریں گے جب تک یہ لوگ ہمارے نظریات نہ اپنالیں۔ یہ سن کر علی بن حسینؓ نے فرمایا اس طرح نہیں بلکہ ہم ان کے پیچھے نماز بھی ادا کریں گے اور سنت کے مطابق ان سے نکاح بھی کریں گے۔

(المصنف لابن ابی شیبہ تحت ذکر الصلوٰۃ خلف الامراء جلد ۲ صفحہ ۳۰۸)

ائمہ کرام کی حضرت مروانؓ کے ساتھ تعلقات کی بعض مثالیں حضرت زین العابدین کے حالات کے تحت بیان ہو چکی ہیں۔ یہاں صرف چند رشتے بیان کرنا مقصود ہے۔

۱۔ حضرت علیؓ کی صاحبزادی اور حضرات حسنینؓ کی بہن مروانؓ کے لڑکے معاویہ بن مروانؓ کے حبالہ عقد میں تھیں۔ چنانچہ علامہ ابن حزم اندلسی نے لکھا ہے کہ معاویہ بن مروانؓ جو

عبدالملک بن مروانؓ کے بھائی تھے ان کے ساتھ رملہ بنت علیؓ کا نکاح ہوا۔ ان سے پہلے رملہ ابو الھیاج عبداللہ بن ابی سفیان بن الحارث بن عبدالمطلب کے نکاح میں تھیں۔ (جمہرۃ انساب العرب صفحہ ۸۰) اس رشتے کا ذکر علامہ مصعب زبیری نے بھی اپنی کتاب نسب قریش صفحہ ۴۵ پر کیا ہے۔

۴۔ عبدالملک بن مروانؒ

ا۔ امام ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کی ایک دوسری صاحبزادی عبدالملک بن مروانؒ کے حبالہ عقد میں تھی۔ یعنی حضرت علیؓ کی دو صاحبزادیاں حضرت مروانؓ کے دو لڑکوں (معاویہ اور عبدالملک) کی بیویاں تھیں۔ (البدایۃ والنہایۃ جلد ۹ صفحہ ۶۹)

ب۔ حضرت حسینؓ کے چچازاد بھائی اور بہنوئی عبداللہ بن جعفر طیارؓ کی صاحبزادی ام ابیہا امیر المومنین عبدالملک بن مروانؒ کے حبالہ عقد میں تھیں۔

(جمہرۃ انساب العرب صفحہ ۶۲، کتاب نسب قریش صفحہ ۸۳، البدایۃ والنہایۃ صفحہ ۶۹ جلد ۹)

۵۔ ولید بن عبدالملک بن مروانؒ

ا۔ حسن مثنیٰ بن حسن علیؓ کی صاحبزادی سیدہ زینب جناب مروانؓ کے پوتے ولید بن عبدالملک کے حبالہ عقد میں تھی۔ ان سیدہ زینب کی والدہ ماجدہ حضرت حسین بن علیؓ کی صاحبزادی سیدہ فاطمہ تھیں۔ یعنی حضرت حسنؓ کی پوتی اور حضرت حسینؓ کی نواسی کا نکاح ولید بن عبدالملک کے ساتھ ہوا۔ (کتاب نسب قریش لمصعب زبیری صفحہ ۵۲، جمہرۃ انساب العرب صفحہ ۱۰۹)

ب۔ حضرت علیؓ کے پوتے زید بن حسنؓ کی صاحبزادی سیدہ نفیسہ کا نکاح حضرت مروانؒ کے پوتے ولید بن عبدالملک بن مروانؓ سے ہوا اور اس سے اولاد بھی ہوئی۔ اس سیدہ نفیسہ کی والدہ کا نام لبابہ بنت عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب تھا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ صفحہ ۲۳۴)

ج۔ حضرت حسینؓ کی نواسی ربیحہ بنت سکینہ (جن کے والد کا نام عبداللہ بن عثمان بن عبداللہ بن حکم تھا) کا نکاح ولید بن عبدالملک کے لڑکے عباس بن ولید کے ساتھ ہوا۔ (کتاب نسب قریش صفحہ ۵۹)

د۔ حضرت حسنؓ کی پوتی خدیجہ بنت حسین بن حسن کا نکاح ولید بن عبدالملک کے چچا زاد بھائی اسماعیل بن عبدالملک بن الحارث بن الحکمؓ کے ساتھ ہوا اور ان سے محمد الاکبر حسین، اسحاق اور مسلمہ پیدا ہوئے۔ (جمہرۃ انساب العرب صفحہ ۱۰۹)

علامہ مصعب زبیری نے خدیجہ کا نام ام کلثوم ذکر کیا ہے۔ (کتاب نسب قریش صفحہ ۵۱-۱۷)

پھر خدیجہ بنت حسین بن حسنؓ کے بعد ان کی چچا زاد بہن حمادہ بنت حسن بن حسنؓ اسی اموی سردار اسمٰعیل بن عبدالملک کے حبالہ عقد میں آ گئیں۔ (جمہرۃ نسب العرب صفحہ ۱۰۹)

۶۔ عمر بن عبدالعزیز

ا۔ حضرت حسینؓ کی صاحبزادی سیدہ سکینہ کا نکاح ان کے شوہر مصعب بن زبیرؓ کے قتل ہو جانے کے بعد عمر بن عبدالعزیز کے بھائی الاصبغ بن عبدالعزیز بن مروانؓ کے ساتھ ہوا جو خلیفہ عبدالملک بن مروانؓ کے بھتیجے تھے۔ (المعارف لابن قتیبہ صفحہ ۹۴، جمہرۃ انساب العرب صفحہ ۹۹، کتاب نسب قریش صفحہ ۵۹)

ب۔ حضرت علیؓ کے بڑے بھائی حضرت جعفر طیارؓ کی پوتی سیدہ رملہ بنت محمد بن جعفرؓ کا نکاح سلیمان بن ہشام بن عبدالملک بن مروانؓ کے ساتھ ہوا۔ اس کے بعد سیدہ کی شادی خاندان بنی امیہ ہی میں ابوالقاسم بن ولید بن عتبہ بن ابی سفیانؓ کے ساتھ ہوئی۔ (کتاب المحبر صفحہ ۴۴۹)

خاندان بنی امیہ اور ائمہ اہل بیت کے درمیان مذکورہ بالا تعلقات کی صرف چند مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ ان کے مابین کسی قسم کا کوئی مذہبی اور دینی اختلاف ہرگز نہیں تھا۔ اگر کوئی ایسا اختلاف ہوتا تو ائمہ اہلبیت خلفائے بنی امیہ کی اقتداء میں نہ اپنی نمازیں ادا کرتے اور نہ ہی ان کے ساتھ سلسلہ مناکحت جاری رکھتے۔ اسی لئے اہل تشیع نے جب یہ دیکھا کہ ائمہ اہلبیت نے ان کے بیان کردہ فرضی مظالم کے خلاف نہ خود کوئی تحریک چلائی نہ ہی کسی تحریک کا ساتھ دیا اور نہ ہی اپنے شیعوں کو کسی قسم کا حکم دیا تو انہوں نے اپنے ائمہ پر یہ الزام عائد کر دیا کہ خلفائے بنی امیہ کے اس قدر مظالم، دین میں تحریف و تغیر اور بدعات و منکرات دیکھنے کے باوجود انہوں نے "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کا فریضہ ترک کر دیا اور "تقیہ شریفہ" اختیار کرتے ہوئے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔

حضرت جعفر صادق کے دور میں کیسانیوں اور زیدیوں کے علاوہ بھی شیعہ کے چند فرقوں کے نام ملتے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

فرقہ باقریہ۔۔۔ یہ فرقہ حضرت محمد باقر کے بارے میں حی لا یموت کا عقیدہ رکھتا ہے یعنی وہ زندہ ہیں مرے نہیں یہ فرقہ ان کو امام مہدی اور امام منتظر مانتا ہے اور یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ ان کے بعد کوئی امام نہیں۔

فرقہ حاضریہ۔۔۔ ان کا کہنا ہے کہ امام باقر کے بعد ان کے بیٹے زکریا امام ہوئے جو اب

حاضر یہ پہاڑ میں چھپے ہوئے ہیں اور اس وقت تک چھپے رہیں گے تا آنکہ ان کو غیب سے خروج کا حکم نہ ملے۔ اس گروہ کے نزدیک امام زکریا آخری امام اور امام مہدی ہیں۔ لیکن علامہ شیخ مفید نے اپنی کتاب تذکرۃ الاطہار میں حضرت محمد باقر کی اولاد کے عنوان کے تحت زکریا نام کے کسی صاحبزادے کا ذکر نہیں کیا۔

فرقہ العلبائیہ۔۔۔ اس فرقہ کے لوگ بشار شعیری کے متبعین تھے اور ایک قول یہ ہے کہ علباء بن ذرع دوسی کے ماننے والے تھے۔ یہ حضرت جعفر صادق کے زمانہ (۱۱۴-۱۴۸ھ) میں تھے۔ حضرت جعفر نے بشار کے بارے میں فرمایا کہ یہ بشار شیطان بن شیطان ہے سمندر سے نکالا گیا ہے اور اس نے میرے ساتھیوں اور دوستوں کو گمراہ کر دیا ہے۔ (معجم رجال الحدیث خوئی جلد ۳ صفحہ ۲۰۴)

یہ فرقہ حضرت علیؑ کو نبی اکرم ﷺ سے افضل جانتا تھا اور آپ ﷺ کی شخصیت کا انکار کرتا تھا۔ وہ اس طرح کے نبی اکرم ﷺ بندے ہیں اور حضرت علیؑ رب ہیں۔ حضرت علیؑ رب نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔

فرقہ النعمانیہ۔۔۔ یہ فرقہ محمد بن علی بن نعمان احول کی طرف منسوب ہے اور اسے مومن الطاق بھی کہتے ہیں۔ اس کی ایک کتاب ہے جس میں ایسی احادیث ذکر کی گئی ہیں جو اس کے فساد عقیدہ کو بتاتی ہیں۔ لیکن اس کا مشہور لقب "شیطان الطاق" ہے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ عوام الناس نے اس کا یہ لقب رکھا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ طوسی نے بھی اس کو اسی لقب سے یاد کیا ہے۔ جہاں اس نے ہشام بن عبدالملک کی تالیفات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں ایک کتاب کا یوں ذکر کیا ہے کہ "کتاب الرد علی شیطان الطاق"

حضرت جعفر صادق سے اس نے بغاوت کی۔ قیاس بہت کرتا تھا اور امام موصوف کی طرف باتیں منسوب کرتا تھا جن کے وہ قائل نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا اگر میں اس کی باتوں پر ہاں کروں اور ان سے اپنی رضامندی کا اظہار کروں تو میں گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ اس کے کفریہ اقوال میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ (نعوذ باللہ) ناف تک اندر سے بالکل خالی ہے اور اس کا باقی حصہ ٹھوس ہے جب اس کی بات امام ابوالحسن الرضا تک پہنچی تو وہ سجدہ میں گر پڑے اور اس کی تکفیر کی۔ حضرت جعفر صادق کے زمانہ میں اس کا فتنہ قائم رہا۔

(معجم رجال الحدیث صفحہ ۳۰ جلد ۱۷، الملل والنحل شہرستانی صفحہ ۱۳۷ جلد ۲)

اس فرقہ کے لوگ نظریہ تناسخ حلول اور رجعت کے قائل تھے اور اس بات کے بھی قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کے وجود سے پہلے اس کا علم نہیں ہوتا۔

فرقہ الاسحاقیہ۔۔۔ اسحاقیہ کی نسبت اسحاق بن محمد نخعی ابو یعقوب احمر کی طرف ہے۔ اس فرقہ کے لوگ حضرت جعفر صادق کے زمانے (۱۱۴ھ تا ۱۴۸ھ) میں تھے۔ نیز اسحٰق نے ہشام بن الحکم کا زمانہ بھی پایا ہے اس کی کتابوں میں ایک کتاب مجالس ہشام بھی ہے۔ یہ فاسد المذہب، کذاب اور جھوٹی احادیث گھڑتا تھا۔ اس فرقے کا عقیدہ ہے کہ زمین کبھی بھی پیغمبر سے خالی نہیں رہتی حضرت علیؓ اور ائمہ میں خدا کے حلول کے قائل ہیں البتہ اس امر میں باہم اختلاف ہے کہ حضرت علیؓ کے بعد پہلے کس میں حلول ہوا۔ بلکہ حضرت علیؓ کی الوہیت کا قائل ہے اور یہ عقیدہ کی تخلیق سے پہلے موجود تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں بھی انہیں شریک ٹھہراتے ہیں۔ ائمہ پر الوہیت کے اطلاق کی کیفیت میں ان کا آپس میں اختلاف ہے۔ یہ تناسخ کے قائل تھے۔ محرم عورتوں سے نکاح کو مباح سمجھتے تھے یہاں تک کہ مردوں سے نکاح کو بھی جائز قرار دیتے تھے۔

فرقہ حسنیہ۔۔۔ اس فرقہ کے لوگ حضرت علیؓ کے بعد حضرت حسنؓ کو امام مانتے ہیں اور ان کے بعد ان کے بیٹے حسن مثنیٰ کو جنہیں ضامن آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہتے ہیں۔ پھر ان کے بعد ان کے صاحبزادے جناب عبداللہ کو امام تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے بعد ان کے بیٹے محمد نفس زکیہ کو پھر ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ کو امام مانتے ہیں یہ دونوں بھائی منصور دوانقی کے زمانے میں نکلے لوگوں کو اپنی طرف دعوت دی، لوگوں کی کافی جمعیت نے ساتھ دیا۔ بالآخر جنگ وجدل اور میدان کارزار گرم ہوا مگر امرائے منصور کے ہاتھوں دونوں بھائی شہید ہو گئے۔

اس فرقے کا ظہور حضرت جعفر صادق کے دور میں ہوا۔ حضرت حسنؓ کے پوتے اور حضرت حسینؓ کے نواسے جناب عبداللہ محض بن حسن مثنیٰ بن حسنؓ (ان کے نام کے ساتھ محض اس لئے ہے کہ یہ ماں اور باپ دونوں طرف سے خالص تھے یعنی دونوں طرف سے سیدہ فاطمہؓ کی اولاد میں سے تھے) ہے جن کی والدہ فاطمہ بنت حسین تھیں۔ یہ بہت بڑے عالم، دین دار، متقی اور زاہد تھے۔ ان کا بسلسلہ امامت حضرت جعفر صادق سے شدید اختلاف ہوا۔ یہ اپنے بیٹے جو بوجہ اپنے تقدس کے نفس زکیہ کے لقب سے ملقب تھے کو امام بنانا چاہتے تھے۔ محمد نفس زکیہ

حضرت جعفر صادق کے چچازاد بھائی ہیں۔ اہل تشیع کی معتبر کتب سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد نفس زکیہ قدسی صفت انسان تھے۔ حضرت جعفر صادق جیسے نابغہ روزگار نے ان کی رکاب تھامی اور موصوف نے اس فعل پر معترض سے کہا کہ یہ اہل بیت کے مہدی ہیں اور جب شیعوں نے حسب عادت نفس زکیہ کی بیعت توڑ دی تو حضرت جعفر صادق کو اس کا اس قدر صدمہ ہوا کہ آپ نے ان شیعوں پر لعنت بھیجی اور صدمہ کی وجہ سے بیس دن تک بیمار رہے اور رات دن گریہ فرماتے تھے۔ بقول راوی یہاں تک کہ ہمیں آپ کی موت کا خوف ہونے لگا۔ (کتاب الشافی ترجمہ اصول کافی صفحہ ۴۲۹ جلد ۱)

عبداللہ محض نے بار بار اپنے بھتیجے جعفر صادق سے جا کر کہا کہ میرے بیٹے کی بیعت کرو مگر موصوف نے انکار کیا تو عبداللہ محض نے غصہ سے کہا کہ میرے دادا حضرت حسنؑ نے امامت اپنی اولاد کو نہ دی بلکہ اپنے بھائی حسینؑ کو دی تو حسینؑ کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ امامت کو اپنی اولاد کی طرف منتقل کریں۔ حضرت عبداللہ محض کے ساتھ حضرت حسنؑ کی تمام اولاد متفق تھی اور دوسری طرف حضرت جعفر اکیلے تھے۔ کیونکہ ان کے باقی افراد خاندان ان کے چچا حضرت زید بن علی بن حسینؑ کے ساتھ تھے۔

شیعہ مورخ ابو الفرج الاصفہانی (م ۳۵۶ھ) لکھتے ہیں کہ

(راوی کہتا ہے کہ) ہم تمام بنی ہاشم کے ساتھ اکٹھے ہو کر چل پڑے حتیٰ کہ جناب عبداللہ محض کے پاس آ گئے۔ تو ہمیں محمد نفس زکیہ کی بیعت کرنے کی دعوت دی گئی اس کے جواب میں حضرت جعفر صادق نے فرمایا کہ "انک شیخ و ان شئت بایعتک و اما ابنک فواللہ لا ابایعہ وادعک" اے عبداللہ آپ بزرگ ہیں اگر چاہیں تو میں آپ کی بیعت کر سکتا ہوں اور آپ کے بیٹے کی بیعت اللہ کی قسم میں نہیں کروں گا اور آپکو آپ کے حال پر چھوڑتا ہوں۔ (مقاتل الطالبیہ، صفحہ ۲۰۶)

بہر حال شیعوں کی اکثریت نے نفس زکیہ بن عبداللہ محض کے ہاتھ پر بیعت کر لی مگر عین وقت پر ان کے ساتھ بھی دھوکہ اور فریب کر گئے۔ علاوہ ازیں فرقہ زیدیہ اور حسنی سادات بھی شروع ہی سے باہم متحد اور متفق چلے آ رہے ہیں کیونکہ فرقہ زیدیہ کے عقائد میں یہ بات شامل ہے کہ امام صرف بنو فاطمہ میں سے ہوگا خواہ وہ حسنی ہو یا حسینی۔ حضرت زید بن زین العابدین کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادے یحییٰ بن زید نے اپنے والد کے مشن کو جاری رکھا اور ۱۲۵ھ میں وہ بھی جام شہادت نوش کر گئے۔ اس کے بعد اس تحریک کی قیادت حسنی سادات کے ہاتھ میں

آگئی اور ایک قول یہ ہے کہ یحیٰی بن زید نے شہادت سے قبل محمد نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ محض کو قائم مقام مقرر کیا تھا۔ پھر اموی خلافت کے آخری دور میں مدینہ منورہ میں بنو ہاشم کا ایک عظیم اجتماع منعقد ہوا جس میں عبداللہ محض، حضرت جعفر صادق اور منصور عباسی کی موجودگی میں محمد نفس زکیہ کو امامت کے منصب پر فائز کیا اور سب حضرات نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

سید امیر علی نے اپنی کتاب سپرٹ آف اسلام (صفحہ ۳۳۲) میں حضرت جعفر صادق کی شرکت سے انکار کیا ہے۔ لیکن حضرت جعفر صادق نے ان کی شہادت پر جس ردعمل کا اظہار کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ موصوف بنی ہاشم کے نمائندہ اجتماع میں شریک تھے۔

بہر حال بنو امیہ کی خلافت کے خاتمے اور اہل بیت کے حقوق کے حصول کے لئے فاطمی، علوی اور عباسی مشترک جدوجہد کرتے رہے مگر آخر میں عباسی علویوں پر غالب آگئے اور ۱۳۲ھ میں اپنی خلافت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جس سے حسنی سادات میں حصول امارت کے لئے اضطراب مزید بڑھ گیا۔ چونکہ شیعہ کے اس گروہ کے قائد محمد نفس زکیہ تھے لہٰذا انہوں نے ۱۴۵ھ میں خلیفہ منصور عباسی کے خلاف خروج کیا اور شہید ہو گئے بقول شیعہ خلفائے بنی امیہ کے خلاف بار بار خروج محض قصاص حسینؑ کی بنیاد پر کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن بنو عباس کے خلاف اس خروج کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

اس کی وجہ سوائے حصول امارت و خلافت کے اور کیا ہو سکتی ہے؟ پیچھے یہ بتایا جا چکا ہے کہ دشمنان اسلام (یہود و مجوس) نہ حضرت علیؑ کے خیر خواہ تھے اور نہ بنو امیہ کے دشمن۔ ان کا واحد مقصد اسلام میں تحریف اور مسلمانوں کی حکومت میں انتشار و خلفشار پیدا کرنا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اب بنو عباس کے برسر اقتدار آجانے کے بعد ان کی سازش کا رخ بھی ان ہی کی طرف مڑ گیا جس کے لئے انہوں نے ائمہ اہل بیت کو آلہ کار بنایا تھا۔ محمد نفس زکیہ کی شہادت کے فوراً بعد ان کے دوسرے بھائی ابراہیم بن عبداللہ محض نے ۱۴۵ھ میں ہی عراق میں خروج کیا اور وہ بھی شہید ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود حسنی سادات نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور وہ مسلسل قربانیاں دیتے رہے۔ جس کے نتیجے میں وہ محمد نفس زکیہ اور ابراہیم کے بھائی ادریس کی زیر قیادت ۱۶۹ھ میں مراکو (مغربی مراکش) میں بعہد خلیفہ مہدی عباسی اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جو ۲۹۶ھ تک قائم رہی۔

حسنی سادات نے دیگر علاقوں میں بھی اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش جاری رکھی۔
چنانچہ حسین بن علی بن حسن مثلث بن حسن مثنیٰ بن حسن نے خلیفہ ھادی عباسی کے زمانے میں خروج کیا اور انہوں نے بھی جام شہادت نوش کیا۔ جس کے متعلق امام تقی سے روایت ہے کہ واقعہ کربلا کے بعد سادات پر "جنگ فخ" سے بڑا کوئی واقعہ نہیں گذرا۔ (مقاتل الطالبین صفحہ ۴۵۲)
گویا کہ یہ دوسرے حسین بن علیؑ ہیں جنہوں نے مکہ کے قریب مقام "فخ" میں دوسری کربلا برپا کر کے علم صداقت بلند کیا۔ اس کے بعد حسنی سادات کے ایک فرد محمد ابن طباطبا نے حضرت جعفر طیار کی اولاد کے ساتھ مل کر خروج کیا اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ علاوہ ازیں بنو فاطمہ کی دوسری شاخ حسینی سادات (فرقہ زیدیہ) کو طبرستان میں ۲۵۰ھ تا ۳۱۶ھ حکومت کرنے کا موقع ملا اور اس کے ساتھ یمن میں بھی وہ طویل عرصہ تک اقتدار کے مالک رہے۔
حضرت جعفر صادق کے بعد حسینی سادات مزید تقسیم ہو گئے۔ ایک حصہ عبداللہ بن جعفر صادق کی امامت کا قائل ہو گیا۔ یہ لوگ "فطحیہ" کہلائے۔ دوسرا حصہ اسمٰعیل بن جعفر صادق اور بعد ازاں ان کی اولاد کی امامت کا قائل ہوا۔ یہ لوگ "اسمٰعیلیہ" کہلائے اور تیسرا حصہ موسیٰ کاظم کے پیروکاروں پر مشتمل ہے۔ ان کی پھر آگے دو شاخیں بن گئیں۔ ایک نے سلسلہ امامت کو موسیٰ کاظم پر ختم کر دیا۔ یہ لوگ "واقفیہ" کہلائے اور دوسری شاخ نے سلسلہ امامت جاری رکھا اور موسیٰ کاظم کے صاحبزادے علی رضا کو امام تسلیم کر لیا۔
فرقہ خطابیہ ـــ ایک فرقہ کا نام ہے جس کا شمار انتہا پسند (الغلاۃ) شیعوں میں ہوتا ہے۔ یہ فرقہ ابوالخطاب محمد بن ابی زینب الاسدی الاجدع کے نام سے منسوب ہے۔ اس کے متعلق یہ مروی ہے کہ اس نے شروع میں حضرت جعفر صادق بعد ازاں خود اپنے اندر خدا کے حلول کا دعویٰ کیا۔ کوفہ کے چند لوگ اس کے پیرو بن گئے۔ جب اس نے غلو شروع کر دیا تو حضرت جعفر نے اس سے برأت کی اور اس پر لعنت بھیجی۔ پھر اس نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ اس کے پیرو یہ اعتقاد بھی رکھتے ہیں کہ گذشتہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے نبوت ابوالخطاب کے حوالے کر دی ہے اور اس کی اطاعت بھی سب لوگوں پر فرض ہے۔ ابوالخطاب اپنے پیروؤں کو اس بات کی نصیحت کرتا تھا کہ اپنے ہم مذہبوں کے لئے بوقت ضرورت جھوٹی قسم کھا لیا کریں۔ ابوالخطاب کہا کرتا تھا کہ حضرت حسنؓ و حسینؓ کے عزیز و اقارب خدا کے بیٹے اور محبوب تھے۔

حضرت جعفر صادق نے فرمایا کہ اس نے کوفہ والوں کو بگاڑ دیا ہے۔ پھر اسے اپنے یہاں سے نکال دیا۔ فرقہ خطابیہ کے نزدیک جنت سے دنیوی نعمتیں اور جہنم سے اس کے آلام و حوادث مراد ہیں ان میں سے بعض لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہر مومن کی طرف اللہ وحی کرتا ہے اس کی دلیل میں وہ یہ آیت پیش کرتے ہیں۔ وما کان لنفس ان تموت الا باذن الله (آل عمران نمبر ۱۴۵) اللہ کے اذن کے بغیر کسی جان کو موت نہیں آتی۔ وہ کہتے ہیں کہ "باذن اللہ" کے معنی ہیں "اللہ کی وحی کی بناء پر" بقول ان کے جب شہد کی مکھی پر وحی نازل ہو سکتی ہے تو ایک مومن پر کیوں نہیں ہو سکتی۔ اس فرقے کے لوگ جب شفق غائب ہو کر تارے نظر نہ آئیں وہ مغرب کی نماز نہیں پڑھتے۔ حضرت جعفر صادق اور ابو جعفر منصور کے عہد امامت و خلافت میں یہ فتنہ ظاہر ہوا۔ جب انہوں نے ابو الخطاب کی نبوت کی دعوت دینی شروع کی اور محرمات کو حلال قرار دیا تو ابو جعفر منصور کے کوفہ کے گورنر عیسیٰ نے ان پر حملہ کیا۔ ابو الخطاب نے اپنے معتقدین کو پتھروں اور چھریوں سے مسلح کر کے انہیں یقین دلایا کہ یہ ہتھیار دشمن کی تلواروں اور نیزوں پر غالب آ جائیں گے۔ لیکن یہ وعدہ غلط ثابت ہوا اور اس کے ساتھی جن کی تعداد (۷۰) تھی سب کے سب قتل ہو گئے اور وہ خود بھی فرات کے کنارے دار الرزق میں گرفتار ہو گیا۔ جس کے بعد اسے بڑے اذیت ناک طریقے سے موت کے گھاٹ اتار کر اس کا سر بغداد بھیج دیا گیا۔

بہر حال اس تباہی سے اس فرقے کا وجود ختم نہیں ہوا بلکہ اس کے بعض افراد اس بات پر مصر رہے کہ در اصل نہ تو خود ابو الخطاب اور نہ اس کا کوئی ساتھی مارا گیا کیونکہ جو کچھ ظاہر میں دکھائی دیا وہ محض ایک دھوکا تھا ۳۰۰ھ کے قریب اس فرقے کے لوگوں کی تعداد ایک لاکھ تھی اور وہ سواد الکوفہ اور یمن میں آباد تھے لیکن انہیں کوئی قوت اور اقتدار حاصل نہیں تھا۔ ابن قتیبہ کی کتاب المعارف میں ان کے عقائد کا مختصر طور پر ضمناً ذکر ہے اور یہ قدیم ترین ماخذ ہے اس کے پچاس سال بعد اسی طرح کا ایک حوالہ مطہر بن طاہر کی تصنیف میں بھی ملتا ہے لیکن اس اثناء میں اس فرقہ کے لوگوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو مؤرخین کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرتی۔

ابو الخطاب کے قتل کے بعد اس کے معتقدین میں پھوٹ پڑ گئی اور ہر ایک یہ دعویٰ کرنے لگا کہ امامت اس کی طرف منتقل ہو گئی ہے پھر اس کے بعد مختلف فرقے بن گئے۔ جو حسب ذیل ہیں

۱۔ معمریہ۔۔۔ جو معمر بن احمر کے متبعین تھے۔

۲۔ بزیعیۃ۔۔۔ جو بزیع کے مرید تھے۔

۳۔ صائدیہ ــــ صائد کے ساتھی

۴۔ بشیریہ ــــ محمد بن بشیر کی جماعت

یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابوالخطاب کی وفات کے بعد اس کے معتقدین نے محمد بن اسمٰعیل بن جعفر صادق کو امام تسلیم کر لیا اور اس وجہ سے ان کا شمار "اسماعیلیہ" میں ہونا چاہیے لیکن یہ ممکن ہے کہ اس فرقہ کے کچھ لوگ اسماعیلیہ فرقہ میں شامل ہو گئے ہوں۔

اس فرقے کا یہ عقیدہ تھا کہ غدیر خم کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے اپنا منصب نبوت علیؑ کو منتقل کر دیا تھا۔ پھر امامت حضرت جعفر صادق سے ابوالخطاب کی طرف منتقل ہو گئی۔ اس کی دوسری تعلیمات میں سب سے زیادہ مستند یہ ہے کہ وہ اپنے مخالفین سے قطعی بے رحمی کا برتاؤ کرنے کی تلقین کرتا تھا۔ مردوں، عورتوں اور بچوں سب کو اس کے خیال میں قتل کر دینا ضروری تھا اور اس کے جواز میں اس کی دلیل وہی تھی جو خوارج کے فرقے ازارقہ نے پیش کی تھی۔

المطہر نے بازغیہ کو ایک الگ فرقہ بتایا ہے لیکن باشمر ستانی انہیں اور معمریہ کو فرقہ خطابیہ کی ایک شاخ قرار دیتا ہے۔ المقریزی کے وقت تک ان شاخوں کی تعداد پچاس تک پہنچ گئی تھی۔

فرقہ راوندیہ ــــ حضرت جعفر صادق کے زمانہ امامت اور منصور کے عہد خلافت میں شیعہ کا ایک فرقہ راوندیہ کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جس نے ۱۴۱ھ میں شورش برپا کی۔ یہ ایک چھوٹا عجمی فرقہ تھا۔ جو تناسخ کا قائل تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ حضرت آدمؑ کی روح عثمان بن نہیک میں حلول کر گئی ہے اور منصور کو خدا کہتا تھا اور ہیثم بن معاویہ کو جبریل مانتا تھا۔ ۱۴۱ھ میں منصور کے محل کے پاس شور مچانا شروع کر دیا کہ یہ ہمارے رب کا محل ہے۔ منصور نے ان کے دو سو سردار گرفتار کر کے قید کر دیے راوندیہ اپنے سرداروں کی گرفتاری پر اور برہم ہوئے اور قید خانہ توڑ کر ان کو نکال لے گئے۔ چھ سو بلوائی منصور کے محل کی طرف چلے۔ شہر میں سخت ہنگامہ برپا ہو گیا جسے منصور کے لشکر نے فرو کر دیا۔

عباسی تحریک

مؤرخین کے نزدیک بنو امیہ کی خلافت "دولت عربیہ" شمار ہوتی ہے اور یہی اس وقت اسلام کی نمائندہ حکومت تھی۔ اس لئے عجمیوں، ایرانیوں، مجوسیوں اور موالیوں کی سازش کا رخ بھی اسی حکومت کے خلاف مڑ گیا چنانچہ یہ لوگ مخالف اسلام اور سیاسی تحریک میں سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔

بنو ہاشم میں دو گھرانے سربرآوردہ اور مقتدا سمجھے جاتے تھے ایک حضرت علیؑ کی اولاد

اور دوسرا حضرت عباس بن عبدالمطلب کی اولاد۔ یہ دونوں گھرانے اہل بیت نبوی ﷺ میں شمار ہوتے تھے۔ علویوں میں تین گروہ تھے۔ ایک وہ جو حضرت حسینؑ کی اولاد کو مستحق خلافت سمجھتے تھے۔ دوسرا گروہ حضرت حسنؑ و حسینؑ دونوں کی اولاد کو اور تیسرا گروہ محمد بن حنفیہ برادر حسینؑ کو سب سے زیادہ خلافت کا حق دار جانتے تھے۔

اب تک بنوہاشم کی جانب سے حصول امارت کے لئے کوئی منظم کوشش نہیں ہوئی تھی لیکن اب ان میں بھی اس کے حصول کے لئے اضطراب پیدا ہو گیا۔ چنانچہ حضرت محمد الباقر اور حضرت جعفر صادق کے دور میں بنوعباس بھی محمد بن علی بن عبداللہ بن عباسؓ کی قیادت میں بنوامیہ کی خلافت ختم کر کے اپنی خلافت قائم کرنے کے لئے متحرک ہو گئے۔ انہوں نے ابتداء بہت ہی خاموش اور نہایت غیر محسوس رفتار سے اپنا کام شروع کیا۔ عباسیوں نے اپنی جداگانہ سرگرمیوں کو بالکل پوشیدہ رکھا اور بنوفاطمہ کو اپنے معین و مددگار ہونے کا یقین دلاتے رہے۔ ہر ایک گروہ کے داعی اور نقیب جدا جدا تھے۔ تبلیغ کے لئے احتیاطاً ان کو ایسے الفاظ استعمال کرنے کی تاکید کی گئی تھی کہ ایک دوسرے کے ساتھ تصادم لازم نہ آئے۔ مثلاً بجائے اس کے کہ حضرت عباسؓ یا حسنینؑ یا محمد بن حنفیہ کی فضیلت بیان کی جاتی صرف "اہلبیت" کا ایک عام لفظ استعمال کیا جاتا تھا اور اہل بیت کی فضیلت بیان کر کے ان کو مستحق خلافت ثابت کرنے کی کوشش ہوتی تھی۔ پھر یہی نہیں کہ آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت نہ کرتے تھے بلکہ بنوامیہ کی مخالفت کے جوش میں خارجیوں کے ساتھ بھی ہمدردی و اعانت کا برتاؤ جائز سمجھا گیا تھا۔ کیونکہ خارجی بھی بنوامیہ کو کافر کہتے اور ان کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتے تھے۔ حالانکہ خارجی جس طرح بنوامیہ کے دشمن تھے اسی طرح حضرت علیؓ اور اولاد علیؓ کے بھی مخالف تھے۔ مگر اس کے باوجود "اہل بیت" خوارج کو اپنا معاون و مددگار سمجھتے تھے۔ کیونکہ بنیادی طور پر ان کا شمار بھی شیعان علیؓ میں ہی ہوتا ہے۔

فرقہ کیسانیہ کے امام ابوہاشم عبداللہ بن محمد بن حنفیہ نے محمد بن علی بن عبداللہ بن عباسؓ کے حق میں خلافت کی وصیت کی۔ وہ اس وقت ان کے پاس "حمیمہ" کے مقام پر مقیم تھے۔ حمیمہ مدینہ سے دمشق کے راستے پر واقع تھا۔ یہ سارا علاقہ خلفاء بنوامیہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بیٹے علی کو بطور جاگیر عطا کر رکھا تھا۔ جسے بنوعباس نے بنوامیہ کے خلاف بطور ہیڈکوارٹر استعمال کیا۔ یہاں امام موصوف نے اتفاقاً بیمار ہو کر وفات پائی۔ چونکہ ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اس

لئے بنو ۔ نے دعویٰ کر دیا کہ وہ علی کے لئے حق امامت کی وصیت کر گئے ہیں۔اس وصیت نے محمد بن علی کو بہت فائدہ پہنچایا یعنی وہ تمام شیعہ جو ابو ہاشم کے معتقد تھے۔محمد بن علی کے پاس آ کر مخفی طور پر بیعت ہو گئے۔

اگر چہ بنی عباس کی دعوت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ سے شروع ہو گئی تھی لیکن حضرت جعفر صادق اور ہشام کے زمانہ میں اس نے اور زیادہ وسعت اختیار کر لی منصب امامت ملنے کے بعد محمد بن علی نے باضابطہ دعوت کا مکمل نظام قائم کیا۔اس کے اصول و قواعد بنائے اور تجربہ کار داعیوں کی ایک جماعت منتخب کر کے اسے عراق و خراسان روانہ کیا۔یہ لوگ مختلف بھیسوں میں شہر شہر اور قریہ قریہ میں پھیل گئے اور بڑی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ عبداللہ کی تکنیک کے بالکل مطابق بنی امیہ کے مظالم اور انکی برائیوں کی تشہیر کر کے بنی عباس کی دعوت شروع کر دی اور دیکھتے دیکھتے خراسان و عراق کے بڑے حصہ میں یہ دعوت پھیل گئی اور جا بجا اعلانیہ بھی اس کے مظاہرے نظر آنے لگے۔۱۲۶ھ میں عباسی امام محمد بن علی کا انتقال ہو گیا اور ان کے لڑکے ابراہیم ان کے جانشین ہوئے انہوں نے از سر نو اس تحریک کو منظم کیا اور اس کے اصول و قواعد بنائے اور ایک تجربہ کار داعی بکیر بن ہامان کو ان قواعد کے اجراء کے لئے خراسان بھیجا اس نے تمام عباسی داعیوں کو جمع کر کے امام کے احکام و نصائح سنائے ان سے ان کی بیعت لی۔امام ابراہیم کو "خوش قسمتی" سے ابو مسلم خراسانی کی شکل میں ایک مبلغ اعظم اور داعی اعظم مل گیا جس نے عرب اور اسلام دشمنی میں بہت جلد اس سازش کو کامیابی تک پہنچانے کا تمام کام اپنے ذمہ لے لیا۔

ابو مسلم خراسانی

ابو مسلم کا نام ابراہیم بن عثمان بن بشار تھا۔یہ ایرانی الاصل اور بزرجمہر کی اولاد سے تھا۔ اصفہان میں پیدا ہوا اور کوفہ میں ابتدائی پرورش پائی یہ بلا کا ذہین اور اعلیٰ تنظیمی صلاحیتوں کا مالک تھا۔پروپیگنڈے کے فن میں اس کا کوئی حریف نہ تھا۔ابراہیم نے اس کی صلاحیتوں کو بھانپا اور ۱۲۷ھ میں اس کو رئیس الدعاۃ بنا کر خراسان بھیجا۔اور خود اپنے ہاتھ سے عباسی نشان جس کا نام "سحاب" تھا دے کر روانہ کیا۔خراسان میں اس نے بڑی ہوشیاری، دانش مندی،اور سرگرمی سے عباسی تحریک کو "آل بیت" کے نام سے خوب پھیلایا اور اس قدر شد و مد سے پروپیگنڈا کیا کہ خلافت بنی امیہ کی بنیادوں میں تزلزل پیدا ہو گیا۔ابو مسلم کی خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں قبیلہ مضر

یمن اور ربیعہ میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اس نے ابو مسلم کے لئے راستہ صاف کر دیا اور اس نے حکمت عملی سے اس خانہ جنگی کو زیادہ بھڑکا دیا اور عربوں کی قوت آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔

ابو مسلم عجمی النسل اور پارسی نژاد تو مسلم تھا۔ ایرانیوں کے دل سے ان کی حکومت کے زوال کا داغ نہ مٹا تھا اور ان کے دماغ میں ہمیشہ عربوں سے انتقام کے خیالات پرورش پاتے رہے لیکن ان کے مقابلے میں اعلانیہ اٹھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس لئے خفیہ سازشیں کرتے تھے اور عربی حکومت کو نقصان پہنچانے والی جو تحریک شروع ہوتی تھی۔ اس میں شریک ہو کر اس کے مبلغ اور داعی بن جاتے تھے۔ چنانچہ اس قسم کی اکثر تحریکیں سرزمین عجم سے ہی اٹھیں یا کم از کم انہیں اسی علاقے میں فروغ حاصل ہوا۔ خلافت کے بارے میں اہل بیت اور غیر اہل بیت کے مسئلہ کو بھی سب سے زیادہ عجمیوں نے بڑھایا اور اسی سرزمین میں وہ پروان چڑھا چنانچہ اہل بیت کے شیعہ زیادہ تر عجمی ہیں۔

عجمی یوں تو پوری قوم عرب کے خلاف تھے لیکن بنو امیہ سے ان کو دوہرا عناد تھا۔ کیونکہ اولاد وہ عرب تھے پھر ان کی حکومت خالص عربی تھی۔ جس میں عجمیوں کو زیادہ رسوخ حاصل نہ تھا۔ اس لئے وہ اس کے ساتھ بڑا عناد رکھتے تھے۔ عربوں کی باہمی خانہ جنگی سے جب ان کے اتحاد کا شیرازہ بکھر کر اموی حکومت کمزور ہو گئی تو اس وقت ابو مسلم اور اہل عجم کو ان سے انتقام لینے کا موقع مل گیا۔ ابو مسلم خود خراسانی اور ایرانی النسل تھا۔ اس کے لئے عربوں کے قتل سے زیادہ دلچسپ دوسرا کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا۔ مورخین کے بقول امام ابراہیم نے خود عرب ہونے کے باوجود ابو مسلم کو اپنے آخری خط میں تاکیدی طور پر یہ لکھ دیا کہ خراسان میں کسی عربی کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ چنانچہ ابو مسلم نے ذاتی عناد اور امام کے اس حکم کی تعمیل میں قتل و غارت کا بازار خوب گرم کیا۔ جس کے نتیجے میں ایرانی زبان و تمدن، ایرانی معاشرت اور ایرانی "اخلاق" از سر نو زندہ ہو گئے۔ اس دوران بنو فاطمہؑ نے بھی بنو امیہ کے خلاف محاذ آرائی اور تحریک جاری رکھی ۱۲۲ھ میں حضرت زین العابدین کے فرزند حضرت زید نے کوفہ سے بغاوت کی۔ ۱۲۶ھ میں زید کے بیٹے یحیٰی نے خراسان سے علم بغاوت بلند کیا۔ ان کے علاوہ حضرت جعفر طیار کی اولاد میں سے عبداللہ بن معاویہ نے بھی ۱۲۷ھ میں کوفہ سے بغاوت کی لیکن یہ کامیاب نہ ہو سکے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابو مسلم خراسانی نے پہلے حضرت جعفر صادق کو لکھا کہ میں نے دعوت کا آغاز کر دیا ہے اور لوگوں کو بنی امیہ سے ہٹا کر اہل بیت کی موالات کی طرف بلا رہا ہوں

اگر آپ کی خواہش ہوتو آپ پر مزید ذمہ داری نہیں ڈالی جائے گی۔ جب حضرت جعفر صادق نے اس کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تو وہ بنو عباس کی جانب مائل ہو گیا۔

بالآخر ابو مسلم کی محنت اور کوشش سے ۱۳۲ھ میں بنو امیہ کی خلافت کا خاتمہ ہو گیا اور خلافت بنو عباس کی طرف منتقل ہو گئی۔ ان کا پہلا خلیفہ ابو العباس عبداللہ بن محمد العباسی مقرر ہوا جو "سفاح" کے لقب سے مشہور ہے۔ بنو عباس کی نہایت ہی قابل شرم خون ریزی اور قتل و غارت کے واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں۔ بنو عباس نے جب ابو مسلم خراسانی کو بنو امیہ کے خلاف استعمال کر کے ان سے خوب انتقام لے لیا تو اس خطرہ کے پیش نظر کہ ابو مسلم کہیں زیادہ طاقت نہ پکڑ لے۔ منصور عباسی نے ۱۳۷ھ میں خود اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔

ابو مسلم خراسانی سے منسوب فرقے

فاطمیہ /مسلمیہ۔۔۔ ابو مسلم خراسانی کے قتل کے بعد اس کے پیروکاروں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ بعض کہتے تھے وہ مرا نہیں بلکہ زندہ ہے۔ وہ اس کی رجعت کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ وہ دوبارہ ظاہر ہو کر زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا اور بعض نے کہا وہ یقیناً مر چکا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ابو مسلم کی بیٹی فاطمہ کو امام تسلیم کیا جس کی بنا پر وہ "فاطمیہ" اور "مسلمیہ" کہلانے لگے۔ ان میں سے ایک مجوسی فیروز نامی جو سنباد کے لقب سے مشہور تھا نے ابو مسلم کے انتقام کا مطالبہ کرتے ہوئے خراسان میں بغاوت کا آغاز کیا اور کوہستان کے لوگوں نے اس کا ساتھ دیا۔ سنباد نے رے اور نیشاپور پر قبضہ کر کے لوگوں کے مال و اسباب کو لوٹا اور ان کو گرفتار کر کے باندی و لونڈی بنایا اور مرتد ہو کر اعلان کیا کہ میں خانہ کعبہ کو منہدم کرنے جاتا ہوں نو مسلم ایرانیوں کے لئے اس قدر تحریک کافی تھی اور انہوں نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ منصور نے جب اس فتنہ کا حال سنا تو سنباد کی سرکوبی کے لئے جمہور بن ضرار عجلی کو مامور کیا۔ ہمدان و رے کے درمیان لڑائی ہوئی جمہور نے سنباد کو شکست دی۔ قریباً سات ہزار آدمی سنباد کے ہمرائیوں میں سے مارے گئے۔ سنباد نے فرار ہو کر طبرستان میں پناہ لی۔ وہاں عامل طبرستان کے خادم نے سنباد کو قتل کر دیا۔

خُـرَمیّة۔۔۔ ابو مسلم خراسانی کی طرف منسوب ایک فرقہ ہے۔ بقول سمعانی یہ فارسی لفظ خرم (بمعنی خوش) سے ماخوذ ہے۔ اس لئے کہ اس فرقے کے لوگ اباحت کے قائل تھے وہ ہر خوش گوار چیز کو حلال سمجھتے تھے۔ لیکن زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ نام خرم سے منسوب ہے جو

اردبیل کا ایک ضلع ہے اور ممکن ہے یہاں یہ فرقہ پیدا ہوا ہو۔ بروایت مسعودی ان لوگوں نے ۱۳۶ھ یا ۱۳۷ھ میں ابو مسلم خراسانی کے قتل کے بعد شہرت پائی۔ سنباد کے قتل کے بعد ان کا ذکر خلیفہ المامون کے عہد میں آتا ہے۔ جب بابک الخرمی نے اسلامی حکومت کے خلاف سرکشی اختیار کی اور آذربائیجان اور ایران کے درمیان ایک گاؤں بذ ان میں مورچہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ اور ۲۰۱ھ سے لیکر ۲۲۲ھ تک اپنی جگہ پر قائم رہا۔

بعض مورخین نے بابک الخرمی کا تعلق باطنی تحریک کے ساتھ جوڑا ہے۔ یہ بات بھی کسی حد تک درست ہے کیونکہ ابو مسلم خراسانی کے پیروکاروں میں سے بعض فرقہ اسماعیلیہ میں شامل ہو گئے تھے۔ لیکن بابک خرمی اور سنباد کا اصل تعلق ابو مسلم کے ساتھ ہی ہے۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے مقالہ نگار نے بھی اس کا ذکر "خرمیہ" کے تحت ہی کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ہشتم ص ۹۱۲)

بابک خرمی ابو مسلم خراسانی کی طرح مجوسی النسل ہونے کی بناء پر ایک نئی تحریک لے کر اٹھا۔ یہ تحریک ایران کے پرانے مذہب مزدکی کی پیداوار ہے۔ مزدکی مذہب کے ایران سے مٹنے کے بعد سب سے پہلے ایک مجوسی جاویدان نے اس کو زندہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ دوسرے عجمی مذاہب کی طرح تناسخ اس کا بنیادی عقیدہ تھا اور چونکہ اس عقیدے میں فنا نہیں ہے۔ بلکہ محض قالب بدلتا رہتا ہے اس لئے اس نے اپنا لقب جاویدان یعنی ہمیشہ رہنے والا رکھا۔ اسلامی عہد میں بابک نے اسے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی اور دعویٰ کیا کہ تناسخ کے ذریعے جاویدان کی روح اس میں منتقل ہو گئی ہے اور وہ اس کا جانشین ہے۔ مزدکی مذہب میں اباحیت یعنی جنسی تمتع کے لئے بلا کسی قید کے مطلق آزادی کی خاص تعلیم تھی۔ اس لئے بابک نے خرمی یعنی شادمانی اپنا لقب رکھا اس آزادی کی وجہ سے ہزاروں آدمی اس میں شریک ہو گئے یہ تحریک مذہبی رنگ میں تھی لیکن در حقیقت مسلمانوں کے خلاف ایک سیاسی تحریک تھی چنانچہ بابک نے اسلامی آبادیوں پر حملہ کر کے ہزاروں مسلمان تہ تیغ کیے۔ بقول طبری اس شخص نے بیس سال تک ایران میں شدید ہنگامہ برپا رکھا۔ بالآخر ۲۲۳ھ میں اس کا قلعہ معتصم کے ایک افسر افشین نے فتح کر لیا۔ اور اسے گرفتار کر کے سامرا بھیج دیا گیا جہاں اسے ہلاک کر دیا گیا جس کے دوران اس نے حیرت انگیز صبر واستقامت کا ثبوت دیا۔ بابک نے الوہیت کا بھی دعویٰ کیا تھا اور اس طرح اس نے جہاں لاکھوں مسلمانوں کو

گمراہ کیا وہاں اس کے ہاتھوں بقول مسعودی پانچ لاکھ مسلمان تہ تیغ بھی ہوئے۔مسعودی کے زمانے (۳۳۲ھ) میں اس فرقے کے لوگ رے، اصفہان، آذربائیجان، کرج، برج اور مسبذن میں پائے جاتے تھے۔ان میں سے بعض قلعوں کو علی بن بویہ نے (جس نے بعد ازاں ۳۲۱ھ میں عماد الدولہ کا لقب اختیار کیا) یورش کر کے فتح کر لیا اور اس کے چالیس سال بعد وہ تر اور کرمان کے نواح میں جن قلعوں پر وہ قابض تھے انہیں عضد الدولہ کے نائب عابد بن علی کے حوالے کر دیا۔

فرقہ خرمیہ کے عقائد

"خرمیہ مختلف فرقوں اور جماعتوں میں منقسم ہیں لیکن یہ سب عقیدہ رجعت (جس کا بانی عبداللہ بن سبا تھا) کے مسلک پر متفق ہیں۔اس عقیدہ سے ان کی مراد یہ ہے کہ دنیا میں قیامت سے پہلے کسی برگزیدہ ہستی کی دوبارہ واپسی ہوگی۔یہ الگ بات ہے کہ شخصیات کی تعیین میں ان کے مابین شدید اختلاف ہے۔ہر فرقے کا اپنا ایک علیحدہ بزرگ اور مہدی ہے۔جس کی رجعت کے وہ قائل ہیں خرمیہ کے نزدیک الہام اور وحی کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔وہ ابو مسلم کی بہت تعظیم وتکریم کرتے ہیں اور خلیفہ منصور عباسی پر اس لئے لعنت بھیجتے ہیں کہ اس نے اسے قتل کرا دیا تھا۔وہ اکثر اوقات مہدی بن فیروز کے لئے فضل ربانی کی التجا کرتے رہتے ہیں۔اس لئے کہ وہ ابو مسلم کی بیٹی فاطمہ کی اولاد میں سے تھا ان کے اپنے امام ہوتے ہیں جن سے وہ شرعی معاملات میں مشورہ لیتے ہیں اور ان میں ایسے مبلغین بھی ہیں جو ان کے درمیان دورہ کرتے رہتے ہیں۔جنہیں وہ ایرانی نام "فرشتہ" سے موسوم کرتے ہیں۔ان کے خیال میں خمر (انگوری شراب) اور دیگر شرابیں دوسری سب چیزوں سے بڑھ کر خوشی اور برکت کا موجب ہیں۔ان کا دینی نظام نور اور ظلمت کے تصور پر مبنی ہے۔ان میں سے بعض لوگ اشتراک ازواج کو ممنوع تصور نہیں کرتے۔بشرطیکہ عورتیں اس پر راضی ہوں۔وہ امامت کو قدرتی طور پر ابو مسلم کے خاندان کے ساتھ مخصوص اور ابو مسلم کے وجود کو دائمی سمجھتے ہیں۔اور اس کی بیٹی کو اس کے حقوق کا وارث تصور کرتے ہیں۔بابک اس فرقے کا ایک ایسا رکن تھا جس نے سب سے زیادہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کی۔

عبدالقاہر البغدادی اپنی کتاب "اَلْفَرْقُ بَیْنَ الْفِرَق" میں لکھتے ہیں کہ!

بابک کے پیرو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے مذہب کا بانی انہی کا ایک امیر تھا۔جو

زمانہ قبل اسلام میں ہوا اور "خرزوستن" کے نام سے موسوم تھا۔ جس کا باپ ایک ذنگی تھا اور ماں ایک ایرانی بادشاہ کی بیٹی تھی۔ وہ پہلا شخص تھا۔ جس نے "ملک الجبال" کا لقب اختیار کیا۔ یہ لوگ پہاڑوں میں ایک جشن مناتے ہیں جس کی خصوصیت بے حجابانہ عیاشی ہوتی ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ ظاہری طور پر بعض اسلامی رسوم کی پابندی کرتے ہیں۔ (بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۸ صفحہ ۹۱۳)

شیعیت موسیٰ کاظم کے عہد میں

حضرت جعفر صادق شوال ۱۴۸ھ میں فوت ہوئے آپ کی اولاد کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اسماعیل ۲۔ عبداللہ ۳۔ ام فروہ (ان تینوں کی والدہ فاطمہ بنت حسین بن علی بن حسین تھیں) ۴۔ موسیٰ کاظم ۵۔ اسحٰق ۶۔ محمد (ان کی والدہ ام ولد تھیں) ۷۔ عباس ۸۔ علی ۹۔ اسماء ۱۰۔ فاطمہ (یہ مختلف ماؤں سے تھے)

حضرت موسیٰ کاظم کی ولادت ۱۲۸ھ میں ہوئی اور وفات بعمر پچپن سال رجب ۱۸۳ھ میں بغداد میں ہوئی۔ یہ اپنے والد حضرت جعفر صادق کی وفات (۱۴۸ھ) کے بعد شیعہ کے ایک گروہ کے نزدیک منصب امامت پر فائز ہوئے اس طرح ان کی کل مدت امامت پینتیس سال رہی انہوں نے عباسی خلفاء منصور، ہادی، مہدی اور ہارون الرشید کا زمانہ خلافت پایا۔ بقول شیعہ "آپ بہت ہی تاریک اور مشکل دور میں خاموشی کیساتھ سخت تقیہ کی حالت میں بہت کٹھن زندگی گذارتے رہے"۔

اہل تشیع نے موسیٰ کاظم کی والدہ کے متعلق ایک توہین آمیز روایت بھی نقل کی ہے کہ!

راوی کہتا ہے کہ ہم امام باقر کی خدمت میں حاضر ہوئے انھوں نے کہا کہ میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ وہ بردہ فروش جس کا میں نے ذکر کیا تھا۔ آ گیا ہے تم جاؤ اور اس تھیلی کے بدلے اس سے ایک کنیز خرید لو۔ چنانچہ ہم بردہ فروش کے پاس گئے تو اس نے کہا جو میرے پاس تھا وہ میں بیچ چکا اب میرے پاس صرف دو کنیزیں ہیں ایک ان میں سے دوسری سے اچھی ہے۔ ہم نے کہا انہیں دکھاؤ تو اس نے وہ دکھائیں ہم نے کہا یہ کنیز کتنے میں فروخت کرو گے؟ کہنے لگا ستر دینار۔ ہم نے کہا کچھ کم کر کے احسان کرو۔ اس نے کہا اس سے کم نہ زیادہ۔ ہم نے کہا ہم اس تھیلی کے بدلے خریدتے ہیں۔ ہمیں تعداد کا علم نہیں۔ اس کے پاس ایک شخص جس کے سر اور داڑھی کے بال سفید تھے بیٹھا تھا اس نے کہا تھیلی کھول کر رقم گن لو۔ بردہ فروش نے کہا تم مت کھولو اگر

ستر سے کم نکلے تو میں فروخت نہیں کروں گا۔ بوڑھے نے کہا میرے پاس آؤ اور تھیلی کی مہر توڑو۔ جب ہم نے کھولا تو اکیس ستر ہی دینار تھے۔ نہ کم نہ زیادہ۔ ہم نے خرید لیا اور اسے لیکر امام باقر کے پاس آئے۔ امام جعفر صادق ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے حضرت سے کل حال بیان کیا۔ حضرت نے اللہ کی حمد وثنا کے بعد کنیز سے پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا حمیدہ آپ نے فرمایا تم دنیا میں حمیدہ ہو اور آخرت میں محمودہ۔ مجھے یہ بتاؤ کہ باکرہ ہو یا ثیبہ؟ کہا۔ باکرہ فرمایا یہ کیسے؟ بردہ فروشوں کے ہاتھوں میں عورت آجاتی ہے وہ اسے باکرہ نہیں رہنے دیتے تو اس نے کہا "یجیئنی فیقعد منّي مقعد الرجل من المرأة فيسلّط الله عليه رجلاً ابيض الرأس و اللحية فلا يزال يلطمه حتى يقوم عنّي ففعل بي مرارًا وفعل الشيخ به مرارًا فقال يا جعفر خذها اليك فولدت خير اهل الارض موسٰى بن جعفر عليهما السلام"۔

یہ شخص میرے پاس آیا اور اس طرح بیٹھا جس طرح مرد عورت سے جماع کرتے وقت بیٹھتا ہے۔ پس اللہ نے اس پر ایک مرد بزرگ مسلط کر دیا جس نے اسے طمانچے مارے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کئی مرتبہ وہ اسی طرح کرتا رہا لیکن ہر بار اس بزرگ نے بھی اس کے ساتھ وہی سلوک کیا۔ حضرت باقر نے حضرت جعفر صادق سے فرمایا اس کو اپنے ساتھ لے جاؤ اس کے بطن سے اہل زمین کا بہترین شخص موسیٰ بن جعفر پیدا ہوگا۔ (اصول کافی کتاب الحجہ باب مولد ابی الحسن موسیٰ بن جعفر)

اس روایت پر کیا تبصرہ کیا جائے۔ ایک امام معصوم اپنے بیٹے (امام معصوم) کی موجودگی میں ایک کنیز سے (جو اسی بیٹے کی خاطر خریدی گئی ہے) اس طرح گفتگو کرے یہ بعید از فہم ہے۔ پھر یہ بات بھی باعث تعجب ہے کہ وہ بزرگ مرد جسے اللہ نے اس کنیز کی حفاظت پر مامور کر رکھا تھا۔ وہ ہر مرتبہ اس فعل کا انتظار کرتا رہا کہ کب وہ بردہ فروش اس کنیز کی ٹانگوں میں بیٹھے اور وہ اسے طمانچے رسید کرے۔ وہ بزرگ یہ کاروائی اس مرد کے قریب آنے سے پہلے بھی تو مکمل کر سکتے تھے۔

شیعوں نے یہ توہین آمیز روایت موسیٰ کاظم کی والدہ کی فضیلت" میں گھڑی تا کہ امام معصوم محمد باقر کی پیشن گوئی کہ "یہ عورت اہل زمین کے ایک بہترین شخص کو جنم دے گی۔" موسیٰ کاظم کے حق میں صحیح ثابت ہو جائے۔

شیعہ کے دوسرے گروہ نے جب یہ دیکھا کہ ایک بردہ فروش سے خریدی جانی والی ایک کنیز ایسے افضل شخص کو جنم دے سکتی ہے۔ تو کیوں نہ ہم نجیب الطرفین اسماعیل بن جعفر جن کی

والدہ ماجدہ حضرت حسین بن علی کی پر پوتی فاطمہ بنت حسین بن علی بن حسینؓ ہیں کی امامت تسلیم کرلیں۔ حضرت موسیٰ کاظم منصب امامت پر کس طرح فائز ہوئے؟

شیعہ مجتہد علامہ سید محمد طباطبائی کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔

چھٹے امام کی شہادت کی خبر سنتے ہی عباسی خلیفہ منصور نے مدینہ کے والی کو حکم دیا کہ آپ کے وارثوں پر مہربانی کے بہانے امام کے گھر جائے اور آپ کے وصیت نامے کو لیکر پڑھے اور جس کسی کو آپ کا وصی یا جانشین بنایا گیا ہو اس کی فوراً گردن اتار دی جائے البتہ اس حکم سے منصور کا یہ مطلب تھا کہ امامت کے سلسلے کو ختم کر دیا جائے اور شیعہ مذہب کی آواز کو مکمل طور پر خاموش کر دیا جائے لیکن اس کی سازش کے برعکس جب مدینہ کے حاکم نے وصیت نامہ پڑھا تو دیکھا کہ امام نے پانچ افراد کو اپنا جانشین مقرر کیا ہے۔

یعنی ۱. خود خلیفہ منصور عباسی ۲. مدینہ کا والی ۳. عبداللہ افطح امام کے بڑے فرزند ۴. موسیٰ امام کے چھوٹے فرزند ۵. حمیدہ بربریہ اس طرح منصور کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔

(شیعہ صفحہ ۲۰۴)

اس سے قبل حضرت جعفر صادق نے اپنے سب سے بڑے بیٹے اسماعیل کے حق میں امامت کی وصیت کی تھی مگر وہ ان کی زندگی ہی میں وفات پا گئے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت جعفر صادق کی وفات کے بعد ان کے شیعوں نے موسیٰ کاظم کو ساتواں امام تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ان کے بجائے اسماعیل کے کم سن بیٹے محمد بن اسماعیل کو امام تسلیم کیا۔ اس افتراق کے نتیجے میں شیعہ امامیہ کا ایک عظیم فرقہ وجود میں آیا جس کو اسماعیلیہ کہا جاتا ہے۔ اس فرقے کا تفصیلی ذکر آگے آرہا ہے۔

کیسانیہ، زیدیہ اور اسماعیلیہ کے باہمی افتراق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امامیہ اثنا عشریہ (امام ہفتم کے زمانے میں جن کا وجود تک نہیں تھا) کا یہ دعویٰ کہ نبی اکرم ﷺ ائمہ کا تعین و تصریح ناموں کی حد تک فرما گئے تھے بالکل غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ اگر صورت حال یہ تھی تو پہلی نامزدگی کے بعد دوسری نامزدگی کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ جب شیعہ اعتقاد کے مطابق امام کی اطاعت فرض ہے اور ان کی امامت کا منکر کافر ہے اگر چہ وہ علوی یا حسنی یا حسینی ہی کیوں نہ ہو تو کیا۔ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ کہ محمد بن حنفیہ، زید بن زین العابدین اور انکی اولاد، اولاد حسنؓ، عبداللہ محض، بن مثنیٰ بن حسنؓ، محمد المعروف نفس زکیہ حضرت جعفر صادق کی اولاد محمد بن اسماعیل

،عبداللہ افطح وغیرہ نے امام منصوص کی امامت واطاعت کا انکار کر کے کفر کا ارتکاب کیا تھا۔

حقیقت یہی ہے کہ اس وقت تک امامت کا عقیدہ، امام کے اوصاف و شرائط اور اس کے تعین و تقرر کے اصول و ضوابط تصنیف ہی نہیں ہوئے تھے۔ اسی لئے خود شیعہ مصنفین کی تصریحات کے مطابق حضرت جعفر صادق نے مختلف افراد کے حق میں امامت کی وصیت جاری کی جس کی بنیاد پر شیعہ مزید مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ نیز مختلف اشخاص کے حق میں وصیت کی بنیاد پر ہی اہل تشیع کو ایک نیا عقیدہ "بداء" (یعنی اللہ تعالیٰ موقع ومحل کے اعتبار سے اپنا ارادہ تبدیل کر دیتا ہے) ایجاد کرنا پڑا (جس کی توضیح وتشریح آگے آرہی ہے)

الغرض حضرت جعفر صادق کی وفات کے بعد شیعہ امامت کے مسئلہ پر باہم شدید اختلاف کا شکار ہو گئے۔ کیسانیہ اور زیدیہ تو پہلے سے ہی الگ ہو گئے تھے اب خود حضرت جعفر صادق کے شیعوں میں ایک بڑا گروہ الگ ہو کر محمد بن اسماعیل کی امامت پر متفق ہو گیا۔ یہ اسماعیل بن جعفر صادق نجیب الطرفین ہیں۔ ان کی والدہ ماجدہ کسی بردہ فروش سے نہیں خریدی گئی بلکہ وہ حضرت حسین بن علیؓ کی پر پوتی یعنی فاطمہ بنت حسین بن علی بن حسینؓ ہیں۔

شیعہ مجتہد شیخ مفید اسماعیل بن جعفر کے متعلق لکھتے ہیں کہ!

اسماعیل سب بھائیوں سے بڑے تھے اور ابو عبداللہ امام جعفر صادق کو ان سے بہت زیادہ محبت تھی اور ان پر بہت مہربان وشفیق تھے اور شیعوں کا ایک گروہ یہ گمان رکھتا تھا کہ یہ اپنے باپ کے بعد امام اور ان کے خلیفہ ہیں کیونکہ وہ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اور ان کے والد بھی ان کی طرف میل ومحبت رکھتے تھے اور ان کا اکرام وتعظیم کرتے تھے اور وہ اپنے والد گرامی کی زندگی میں ہی مقام عریض پر فوت ہو گئے اور لوگوں کی گردنوں پر ان کی لاش ان کے والد کی خدمت میں مدینہ میں لائی گئی۔ یہاں تک کہ انہیں جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔ روایت ہے کہ حضرت ابو عبداللہ ان کی موت پر سخت پریشان ومغموم ہوئے اور بغیر جوتا پہنے اور کندھے پر رداء رکھے جنازے کے آگے آگے تھے اور آپ نے کئی مرتبہ ان کے دفن سے پہلے حکم دیا کہ ان کا تابوت زمین پر رکھا جائے اور ان کے چہرے سے کفن ہٹا کر انہیں دیکھتے تھے۔

پس جب حضرت جعفر صادق کی وفات ہوئی تو ان سے ایک گروہ تو حضرت موسیٰ بن جعفر کی امامت والے قول کی طرف پلٹ آیا کہ وہ جناب اپنے والد کے بعد امام ہیں اور باقی دو

فرقوں میں بٹ گئے ایک گروہ اسماعیل کی امامت کا قائل ہو گیا کیونکہ ان کا گمان تھا کہ امامت ان کے باپ کا حق تھی اور بیٹا بھائی کی نسبت امامت کا زیادہ حقدار ہے۔ ایک گروہ اسماعیل کے زندہ رہنے پر ثابت رہا اور وہ آج کل بہت کم ہیں اور یہ دونوں فریق اسماعیلیہ کے نام سے پکارے جاتے ہیں اور جو آج کل موجود ہیں ان کا گمان ہے کہ امامت اسماعیل کے بعد ان کے بیٹے کے لئے اور ان کے بیٹے کی اولاد کے لئے زمانہ آخر تک ہے۔ (تذکرۃ الاطہار ترجمہ کتاب الارشاد صفحہ ۲۷۰)

اسماعیل کے بعد حضرت جعفر صادق کے دوسرے بیٹے عبداللہ بن جعفر جو اسماعیل کے عینی اور حقیقی بھائی ہیں۔ انہوں نے بھی اپنے والد کی وفات کے بعد اپنی امامت کا اعلان کیا کہ امامت میرا حق ہے کیونکہ امام ششم نے میرے حق میں امامت کی وصیت کی تھی۔ جس کا ذکر سید محمد طباطبائی نے بھی کیا ہے۔ تو شیعوں کے ایک گروہ نے ان کی اطاعت قبول کر لی جو "فطحیہ" اور "افطحیہ" کہلائے اور اس فرقہ کے لئے یہ لقب اس لئے مخصوص ہوا کہ وہ عبداللہ بن جعفر کی امامت کے قائل تھے۔ جو "افطح" (جس کے پاؤں چوڑے ہوں) تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے اس لقب کی وجہ یہ تھی کہ جس نے لوگوں کو عبداللہ کی دعوت دی اس کو عبداللہ بن افطح کہتے ہیں۔ لیکن صحیح پہلا ہی قول ہے یہ ان کی موت اور پھر ظاہر ہونے کے معتقد ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنے بعد کوئی نرینہ اولاد نہیں چھوڑی کہ ان کی نسل میں امامت کا سلسلہ چلتا۔

بہر حال شیعہ کا ایک گروہ حضرت موسیٰ کاظم کی امامت کا قائل ہو گیا۔ جنہوں نے بقول طباطبائی "بہت ہی تاریک اور مشکل دور میں خاموشی کے ساتھ سخت تقیہ کی حالت میں بہت کٹھن زندگی گذاری" یہی فرقہ آگے چل کر مزید فرقوں میں بٹ گیا جس کا ذکر آگے اپنے موقع پر آ رہا ہے۔

فرقہ ناؤسیہ۔۔۔ حضرت موسیٰ کاظم کے دور میں ناؤس بصری اس فرقہ کا بانی تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ امام جعفر صادق زندہ ہیں وہ فوت نہیں ہوئے اور وہ اس وقت غائب ہیں اور دوبارہ امام مہدی کے نام سے ظہور کریں گے۔

الغلاۃ من الواقفۃ۔۔۔ یہ لوگ محمد بن بشیر نامی شخص کے پیروکار تھے اور امام ابوالحسن موسیٰ کے دور (۱۴۸ھ تا ۱۸۳ھ) میں پیدا ہوئے ہیں۔ جب اس فرقہ نے ان کے حق میں غلو شروع کر دیا تو امام موسیٰ کاظم نے ان سے برأت کا اظہار کیا اور اس پر لعنت بھیجی اور جب ان کی وفات ہوئی تو اس نے دعویٰ کیا کہ امامت ان پر موقوف ہو چکی ہے اور ان کی ربوبیت کا بھی دعویٰ کیا نیز یہ کہ

جب امام ابوالحسن موسیٰ غائب ہو گئے تو انہوں نے مجھے اپنا وصی ٹھہرایا اور امام موسیٰ کی اولاد میں سے جس نے بھی امامت کا دعویٰ کیا انہوں نے اسے جھٹلایا اور اس کی تکفیر کی۔

اس فرقہ کے لوگ امام ابوالحسن موسیٰ کاظم کی ربوبیت اور حج وزکوٰۃ وغیرہ فرائض کے ترک کے قائل تھے۔ محارم کے نکاح، زنا اور غیر فطری جیسے گندے اور غلیظ افعال کو مباح سمجھتے تھے۔

الھشامیہ ـــ ہشام بن حکم کے پیروکار "ہشامیہ" کہلائے اس کا ایک نام "حکمیہ" بھی ہے۔

ھشام کندہ قبیلہ کا مولیٰ ہے۔ کوفہ میں بنی شیبان کے ہاں آتا جاتا تھا پھر بغداد چلا آیا۔ یہ حضرت جعفر صادق اور موسیٰ کاظم کے اصحاب میں شمار کیا جاتا رہا۔ اسی کی کوششوں سے شیعیت ایک مستقل فرقہ کی صورت میں ظاہر ہوئی جو اپنی الگ بنیادیں رکھتا ہے۔ جیسے امامت کا عقیدہ کہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے منصوص ہوتا ہے۔ ھشام پہلا شخص ہے جس نے امامت کی بحث شروع کی اور اس کے منصوص ہونے اور وصیت سے ثبوت کا اعلان کیا اور شیعیت کے قواعد کا بھی بانی و موسس شمار ہوتا ہے۔ اس کی مشہور تصنیف "کتاب الامامۃ" ہے جس میں اس نے اپنے مذہب کو عقلی طور پر پیش کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس نے کہا کہ وہ جسم ہے اور وہ اپنی سات بالشت کے برابر ہے اور یہ بھی اس کا قول نقل کیا گیا ہے کہ وہ چاندی کے ٹکڑے کی شکل پر ہے۔ نیز اس کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ مستقبل میں ہونے والے واقعات کو نہیں جانتا۔ یہی ھشام منصوریہ عالی فرقے کے قائد ابومنصور عجلی جس نے محرمات کو مباح قرار دیا تھا۔ کے ساتھیوں سے خوب واقف تھا۔ کیونکہ ھشام ان کے ساتھ کوفہ میں رہا اور ان کے ساتھ ان کے افکار میں بھی شریک رہا ھشام کے کردار کو جاننے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ یحییٰ بن خالد برمکی سے مل گیا تھا اور اس کی علمی اور کلامی مجالس کا منتظم بھی تھا پھر جب ہارون الرشید نے برامکہ کے خلاف سخت قدم اٹھایا تو یہ روپوش ہو گیا اور اسی حالت میں کوفہ میں مر گیا۔ ائمہ اہل بیت نے اس سے برأت کا اعلان کیا اور اس کی مذمت کی۔ حضرت موسیٰ کاظم کے دور میں جہاں کیسانی اور زیدی شیعہ (جو موصوف کی امامت کے منکر تھے) اپنے طور پر سرگرم عمل رہے وہاں خود ان کے بھائیوں نے بھی ان کے مقابلے میں اپنی امامت کا اعلان کیا۔

علاوہ ازیں حسنی شاخ میں سے بھی ایک عظیم اور بزرگ شخصیت جناب حسین بن علی بن حسن مثلث بن حسن مثنیٰ بن حسنؓ نے بھی موسیٰ کاظم کے مقابلے میں اپنی امامت کا اعلان کیا

اور جسے اہل بیت کی اکثریت نے تسلیم کیا۔ تاریخ میں یہ دوسرے حسین بن علی ہیں۔ جنہوں نے مکہ کے قریب مقام "فخ" پر دوسری کربلا برپا کر کے علم صداقت بلند کیا اور بالآخر جام شہادت نوش کیا۔ شیعہ امامیہ امام ششم تک متفق ہیں کہ وہ بالترتیب (حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت زین العابدین، حضرت محمد باقر اور حضرت جعفر صادق) منصب امامت و خلافت پر فائز ہوئے امام ششم کے بعد شیعہ امامیہ میں ایک اہم اور بڑا اختلاف ظاہر ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ حضرت جعفر صادق نے ابتداء میں اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کو اپنا جانشین یعنی ساتواں امام نامزد کیا تھا۔ یا شیعی اصطلاح میں اسماعیل پر نص کی تھی لیکن حضرت اسمٰعیل ۱۴۳ھ میں حضرت جعفر صادق کی زندگی میں ہی انتقال کر گئے۔ تو امام ششم نے اپنے تیسرے بیٹے موسیٰ کاظم کو اپنا جانشین امام نامزد کیا اس نئی صورت حال کے پیش نظر امام ششم کے شیعہ دو بڑے گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ کا خیال یہ تھا کہ ایک مرتبہ کی ہوئی نص واپس نہیں ہوتی لہذا اگر حضرت اسماعیل کا انتقال ہو گیا ہے تو چونکہ نص باپ سے بیٹے کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ اس لئے ساتواں امام حضرت اسماعیل کے بیٹے محمد کو ہونا چاہیے اس دلیل کے تحت انہوں نے محمد بن اسماعیل بن جعفر کو امام تسلیم کر لیا۔ اس طرح حضرت اسمٰعیل پر کی ہوئی نص برقرار رہی اور یہ لوگ اسمٰعیل بن جعفر کی نسبت سے "اسمٰعیلی" کہلائے اور آئندہ امامت کا سلسلہ محمد بن اسمٰعیل کی اولاد میں جاری ہوا۔ جبکہ دوسرے گروہ کا خیال یہ تھا کہ چونکہ اسمٰعیل حضرت جعفر صادق کی زندگی میں ہی انتقال کر گئے تھے لہذا اب امامت اسمٰعیل کے دوسرے بھائی اور امام ششم کے تیسرے بیٹے موسیٰ کاظم کی طرف (نص امام کی بناء پر) منتقل ہو جائے گی۔ یہ دوسرا گروہ جس نے موسیٰ کاظم کو ساتواں امام تسلیم کیا یہ "موسویہ" کہلائے۔

شیعہ اسماعیلیہ

یہ فرقہ حضرت جعفر صادق کے بڑے صاحبزادے اسماعیل کی نسبت سے اسماعیلیہ مشہور ہوا۔ جناب اسماعیل نجیب الطرفین ہیں ان کی والدہ حضرت زین العابدین کی پوتی سیدہ فاطمہ بنت حسین بن علی بن حسینؑ ہیں۔

حضرت جعفر صادق نے اپنے بڑے صاحبزادے اسماعیل کے متعلق اعلان کیا کہ میرے بعد امامت کے منصب پر وہ فائز ہوں گے۔ لیکن وہ ان کی زندگی میں ہی انتقال کر گئے۔

تاریخ میں اسماعیل کی موت و حیات کے متعلق مختلف اقوال پائے جاتے ہیں۔

۱۔ ایک روایت کے مطابق ان کا انتقال ۱۳۳/۱۳۸ھ میں ہوا اور اس وجہ سے امام ششم کو ان پر کی ہوئی نص بدلنا پڑی جس کے نتیجے میں حضرت موسیٰ کاظم امام مقرر کیے گئے۔

۲۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ ۱۳۳ھ میں فوت نہیں ہوئے بلکہ ۱۵۸ھ تک بقید حیات رہے۔

۳۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ شراب پیتے تھے اس لئے امام ششم نے ان پر کی ہوئی نص بدل دی۔

۴۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ بڑے نیک سیرت تھے اور امامت کے لئے نامزد کیا جانے والا معصوم ہونے کی وجہ سے شراب خور نہیں ہو سکتا۔

۵۔ ایک روایت کے مطابق ان کو عباسی خلیفہ منصور کے ظلم و ستم کے خوف سے ان کے والد بزرگوار نے شام بھیج دیا تھا۔

بہر حال حضرت جعفر صادق کی اپنے بڑے بیٹے اسماعیل کے حق میں کی ہوئی نص کی بناء پر اسماعیلیہ کا یہ اعتقاد ہے کہ اگر چہ اسماعیل اپنے والد کی زندگی میں ہی فوت ہو گئے ہیں۔ لیکن امامت پھر بھی انہی کا حق ہے اور اسماعیل کی وفات کے بعد یہ امامت خود بخود ان کے بیٹے اور پھر ان کی اولاد میں منتقل ہو جاتی ہے۔ تاریخ میں اسماعیلیہ کے مختلف نام پائے جاتے ہیں۔ **اسماعیلیہ، فاطمیہ، باطنیہ، سبعیہ، حشیشیہ، محمرہ، تعلیمیہ، میمونیہ** جبکہ بعض مؤرخین نے اسماعیلیہ کا ذکر "روافض باطنیہ" اور "ملاحدہ" کے تحت کیا ہے۔

اسماعیلیوں نے تقریباً ایک سو سال (۱۳۳ھ تا ۲۳۲ھ) تک محمد بن اسماعیل کے نام پر اپنی خفیہ دعوت (یعنی دینی و دنیاوی رہنمائی و حکومت کا حق بنی فاطمہ میں صرف محمد بن اسماعیل کا ہے) کا سلسلہ جاری رکھا ان کی دعوت کا مرکز شام میں سلمیہ اور ایران میں نہاوند رہا اس طرح یہ فرقہ ایک سو سال سے کچھ زیادہ مدت تک جنوبی عراق، عرب، شام اور یمن میں پھیلا رہا ان کے ائمہ "مہدویوں" کے برخلاف قطعی طور پر مستور رہتے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اپنی جائے قیام بدلتے رہتے تھے۔ ان کا عوام سے رابطہ صرف داعیوں کے ذریعے ہوتا تھا۔ کوئی ان سے براہ راست نہیں مل سکتا تھا۔ اس لئے ان کو ائمہ مستورین کہا جاتا ہے۔

ان کے پیروکاروں میں پہلا اختلاف امام احمد بن امام عبداللہ بن امام محمد بن اسماعیل

کے انتقال کے بعد ہوا ایک گروہ نے یہ عقیدہ اختیار کیا کہ امام محمد بن اسماعیل ساتویں اور آخری امام ہیں جو قیامت سے قبل ظاہر ہو نگے۔ جبکہ دوسرا گروہ ائمہ مستورین کا سلسلہ محمد بن اسماعیل کی اولاد میں جاری رہنے کا قائل تھا۔ پہلے گروہ نے ۔ ۔ ۔ لف بھگ اپنے قائد حمدان قرمط کی نسبت سے "قرامطہ" کے نام سے شہرت حاصل کی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب ۲۶۰ھ میں اثنا عشری اماموں کا سلسلہ ٹوٹ گیا تو ۲۸۰ھ کے قریب اس فرقے کے عقائد میں ایک تبدیلی عمل میں آئی جس کی رو سے اس نے پھر امامت کے تسلسل دائمی کا اثنا عشری عقیدہ اختیار کر کے یہ عقیدہ ترک کر دیا کہ محمد بن اسماعیل امام غائب مہدی موعود ہو کر واپس آئیں گے۔ لیکن قرامطہ نے اس نئے عقیدے کی شدید مخالفت کرتے ہوئے ایک علیحدہ گروپ کی حیثیت سے اپنی تحریک جاری رکھی۔

قرامطہ

قرامطہ اسماعیلی فرقہ کی ایک اہم شاخ اور حمدان قرمط کی طرف منسوب ایک فرقہ ہے۔ لفظ "قُرمُط" کے اشتقاق کے بارے میں اختلاف رائے ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ حمدان قرمط کے نام کے ساتھ ایک توصیلی کلمے کے طور پر مستعمل ہوا ہے۔ بعض نے اس کا سلسلہ ایک یونانی لفظ سے ملایا ہے لیکن زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ لفظ واسط کی مقامی آرامی بولی سے مستعار لیا گیا جہاں آج بھی قُرمطا کے معنی مدلس (دھوکے باز، ریاکار) کے لئے جاتے ہیں۔ ۲۵۵ھ سے اسی علاقے میں زنج کے باغی لشکر میں فراتیہ کے ساتھ قراماطیہ کے ایک دستے کا نام بھی ملتا ہے۔ قدیم فن کتابت میں قُرمط سے مراد ایک خاص قسم کا خط نسخ ہے۔

بعض حضرات نے قرمط کی یہ توجیہ پیش کی ہے کہ حمدان پستہ قد تھا اور چھوٹے چھوٹے قدم رکھتا تھا۔ اس وجہ سے یہ قرمط کہلایا جانے لگا۔ نیز اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور ایسے شخص کو نبطی زبان میں کرمیہ کہتے ہیں جو رفتہ رفتہ قرمط ہو گیا۔

بہر حال حمدان قرمطی کے عقائد و نظریات کیساتھ اتفاق کرنے والے قرامطہ کہلائے۔ صحیح معنوں میں قرامطہ عربوں اور نبطیوں کی ان باغی جماعتوں کا نام تھا۔ جو ۲۶۴ھ سے عراق زیریں میں زنج کی جنگ غلامی کے بعد منظم ہوئیں اور جس کی بنیاد ایک ایسے اشترا کی نظام پر رکھی گئی جس میں شمولیت کے لئے بعض رسوم کا بجالانا ضروری تھا۔ پر جوش تبلیغ کے

باعث اس خفیہ جماعت کا دائرہ عوام، کسانوں اور اہل حرفہ تک وسیع ہو گیا۔ "لاحساء" میں انہوں نے خلیفہ بغداد سے آزاد ہو کر ایک ریاست کی بنیاد رکھ لی اور خراسان، شام اور یمن میں ان کے ایسے اڈے قائم ہو گئے جہاں سے ہمیشہ شورشیں اٹھتی رہتی تھیں۔

قرامطہ کی تحریک بغاوت کا آغاز حمدان نے واسط کے مضافات سے شروع کیا ۲۷۷ھ میں اس نے کوفے کے مشرق میں ایک دارالہجرۃ (محصون ومحفوظ کمین گاہ یا مامن) کی بنیاد اپنے ان رفقاء کے لئے ڈالی جن کے مختلف رضا کارانہ چندے جماعت کے مشترکہ خزانے میں جمع ہوتے تھے۔

حمدان کے ساتھ اس کے برادر نسبتی عبدان (م ۲۸۶ھ) کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جو سات مدارج شمولیت (بلاغات سبعہ) کے ایک دستور العمل کا مصنف تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ان رہنماؤں کے دست نگر تھے جن کی شخصیت پردہ راز میں تھی اور جو سواد سے باہر کسی دوسری جگہ مقیم تھے۔ ان رہنماؤں میں سے ایک کا لقب "صاحب الظہور" تھا۔ جس نے حمدان کو اس عہدے پر فائز کیا اور دوسرا "صاحب الناقۃ" جس نے عبدان کو برطرف کر کے اس کی جگہ "ذِکرَوَیہ الدّنْدانی" کو مقرر کیا ۲۸۸ھ میں ذکرویہ نے صحرائے شام میں بنو علیص کے درمیان قرامطہ کو عام بغاوت کا حکم دیا جس کی مدت سے تیاری کی جارہی تھی اس نے صاحب الناقۃ کو اس بغاوت کا امیر مامور کیا۔ جس کا اسماعیلی شاہی لقب ابو عبداللہ محمد اور خاندانی نام فاطمی تھا۔ وہ ۲۸۹ھ میں بغداد میں محاصرہ دمشق کے دوران مارا گیا۔ اس کی جگہ اسکے بھائی "صاحب الخال" نے لی جس نے بطور امیر ابو عبداللہ احمد کا شاہی نام اختیار کیا اور گرفتار ہو کر ۲۹۱ھ میں بغداد میں قتل ہوا۔ عراق زیریں میں قرامطہ کی تحریک بزور شمشیر ختم کر دی گئی۔ جب ۲۹۴ھ میں ذکرویہ کا انتقال ہوا تو عملی طور پر ان کی سیاسی اہمیت بھی ختم ہو گئی مگر اس دوران قرامطہ کی یہ تحریک بحرین میں پھیل چکی تھی۔ بحرین ایک ملک کا نام ہے۔ جس کے مشرق میں خلیج فارس جنوب میں عمان مغرب میں یمامہ اور شمال میں بصرہ ہے۔

. ا ر ین شہر کے نام سے اس ملک کا نام بحرین مشہور ہوا اسی ملک میں ایک دوسرا شہر ہجر ہے لہٰذا ملک بحرین کو کبھی ملک ہجر کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں ایک تیسرا مشہور شہر قطیر یہ تھا۔ جس کو قرامطہ نے ویران کر کے اس کی جگہ "الاحساء" آباد کیا چنانچہ اس ملک کا نام تاریخ میں

"الاحساء" بھی لیا جاتا ہے۔ شہر احساء ہی قرامطہ کا مرکز و منبع تھا۔ جہاں "صاحب الناقۃ" نے ابو سعید حسن بن بہرام الجنابی کو ۲۸۱ھ میں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا۔ ۲۸۲ھ میں عبدالقیس کے ربیعی قبیلے کی اعانت سے الجنابی نے الاحساء کے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا اور وہاں ایک آزاد ریاست قائم کی جو قرامطہ کی پشت پناہ اور خلافت بغداد کے لئے ایک زبردست خطرہ بن گئی۔ الجنابی کے بعد اس کے بیٹے ابو طاہر سلیمانی عراق زیریں کی غارت گری اور تاخت و تاراج کے ساتھ ساتھ بحرین میں بڑی کامیابی کے ساتھ حکومت کرتا رہا۔ اسی دوران اس نے عبیداللہ المہدی (بانی خلافت فاطمیہ) کے ساتھ بھی خط و کتابت کی اور عبیداللہ مہدی نے اس کی حکومت و سلطنت کو بہ نظر اطمینان دیکھا۔ ۳۱۱ھ میں ابو طاہر نے بصرہ پر دوبارہ حملہ کر کے اس کو ویران کر دیا۔ جامع مسجد بالکل منہدم کر دی گئی جو عرصہ تک مسمار پڑی رہی بازاروں کو لوٹ کر خاک سیاہ کر دیا۔ ۳۱۲ھ میں ابو طاہر حاجیوں کے قافلے لوٹنے کے لئے نکلا۔ شاہی سپہ سالار ابوالہیجا بن حمدون کو جو قافلہ کے ہمراہ تھا گرفتار کر لیا اور حاجیوں کو خوب لوٹا۔ ۳۱۳ھ میں ابو طاہر نے عراق کی طرف فوج کشی کی کوفہ اور نواح کوفہ کو بصرہ کی مانند قتل و غارت سے تباہ و برباد کر دیا۔ ۳۱۵ھ میں ابو طاہر نے عمان پر حملہ کیا۔ حاکم عمان بھاگ کر براہ دریا فارس چلا گیا اور ابو طاہر نے عمان کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ ۳۱۶ھ میں اس نے شمال کی جانب حملہ آوری شروع کی خلیفہ مقتدر عباسی نے آذربائیجان سے یوسف بن ابی الساج کو طلب کر کے واسط کی سند حکومت عطا کی اور ابو طاہر سے جنگ کرنے کا حکم دیا۔ کوفہ کے باہر ان کے درمیان مقابلہ ہوا۔ سخت معرکہ آرائی کے بعد یوسف کی فوج کو شکست ہوئی اور وہ خود گرفتار ہو گیا۔ بغداد میں اس خبر سے سخت پریشانی پیدا ہوئی۔ پھر ابو طاہر کوفہ سے انبار کی جانب روانہ ہوا۔ دربار خلافت سے اس کی روک تھام کے لئے مونس اور ہارون وغیرہ سردار مقرر ہوئے مگر انہوں نے بھی شکست کھائی۔ پھر ابو طاہر رحبہ کی جانب بڑھا۔ رحبہ کو بھی خوب پامال کیا۔ اس کے بعد صوبہ جزیرہ کو متواتر اپنے حملوں سے روندتا رہا اور کوئی اس کو نہ روک سکا۔ وہ جزیرہ کے اکثر قبائل پر سالانہ خراج مقرر کر کے احساء چلا گیا اور بہت سے لوگ قرمطی مذہب میں داخل ہو گئے۔ ۳۱۷ھ میں ابو طاہر نے مکہ معظمہ پر چڑھائی کی بہت سے حاجیوں کو قتل کیا اور مکہ کو خوب لوٹا۔ میزاب رحمت اور خانہ کعبہ کے دروازے کو اکھیڑ ڈالا غلاف کعبہ تار تار کر کے اپنے لشکر میں تقسیم کر دیا اور حجر اسود اس اعلان کے ساتھ ہجر کی طرف لے گیا کہ آئندہ حج

ہمارے یہاں ہوا کرے گا۔ حجر اسود کے واپس کرنے کے لئے لوگوں نے ابوطاہر سے بہت خط و کتابت کی اور بعض سرداروں نے پچاس ہزار دینار اس کے معاوضے میں دینے چاہے مگر ابوطاہر نے اس کو واپس نہ کیا بلکہ اس کے بعد بھی اپنے حملوں کا سلسلہ جاری رکھا اور عراق وشام کو اپنی تاخت وتاراج سے برباد کرتا رہا یہاں تک کہ اہل دمشق پر بھی اس نے سالانہ ٹیکس مقرر کیا۔

ابوطاہر سلیمان کے بعد اس کا بڑا بھائی احمد قرامطہ کی سرداری وحکومت پر کامیاب ہوا۔ اس کو "ابوالمنصور" کی کنیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ قرامطہ کے ایک گروہ نے ابومنصور احمد کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کیا اور ابوطاہر کے بڑے بیٹے "سابور" کو مستحق حکومت قرار دیا۔ اس نزاع کے طے کرنے کے لئے تمام قرامطہ نے ابوالقاسم عبیدی کی طرف رجوع کیا ابوالقاسم نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ قرامطہ ابومنصور کو حاکم تسلیم کرلیں اور ابوالمنصور کے بعد سابور تخت نشین ہوگا۔ چونکہ قرامطہ اپنے آپ کو مہدی کا ایلچی اور طرف دار کہتے ہیں اور عبیداللہ مہدی (بانی خلافت فاطمیہ) کو اس کے دعوے کے موافق امام اسماعیل بن جعفر صادق کی اولاد میں سمجھ کر اس کی عزت وتکریم کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ابوالقاسم کے فیصلے کو بخوشی تسلیم کرلیا اور ابومنصور احمد قرامطہ کا حاکم بن گیا۔ اس کے بعد جب ۳۳۴ھ میں ابوالقاسم عبیدی فوت ہوا اور اس کی جگہ اسماعیل عبیدی افریقہ میں تخت نشین ہوا تو ابومنصور احمد قرمطی نے مبارکباد اور اظہار عقیدت کے لئے ایلچی روانہ کئے۔ اسماعیل عبیدی کے اصرار پر ابومنصور نے حجر اسود واپس بھیجا۔ ابومنصور کے عہد حکومت میں بیرونی ملکوں پر حملے کم ہوئے اور وہ اندرونی انتظامات میں زیادہ مصروف رہا۔

سابور اپنے چچا ابومنصور کی وفات کا انتظار نہ کرسکا اس نے بغاوت کرکے حکومت حاصل کی لیکن جلد ہی وہ ابومنصور کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ اور اس کے دیگر پیروکار جزیرہ آوال کیطرف جلاوطن کردیئے گئے۔ ۳۵۹ھ میں ابومنصور نے وفات پائی اس کے بعد اس کا بیٹا ابوعلی حسن بن احمد ملقب بہ "اعصم" تخت نشین ہوا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ابوطاہر نے دمشق پر سالانہ خراج مقرر کردیا تھا اور جو شخص دمشق کا والی ہوتا تھا وہ خراج کی مقررہ رقم قرامطہ کے بادشاہ کی خدمت میں بھجواتا رہتا تھا تاکہ قرامطہ کی حملہ آوری اور غارت گری سے محفوظ رہے۔ حسن اعصم قرمطی کے دور میں دمشق دولت عبیدیہ میں شامل ہوگیا تھا۔ اس لئے یہ توقع تھی کہ حسن اب والی دمشق سے خراج طلب نہیں کرے گا۔ مگر اعصم نے سختی سے خراج کا مطالبہ کردیا۔ یہاں

سے فرقہ اسماعیلیہ کے دونوں گروہوں عبیدین اور قرامطہ بحرین کے درمیان اختلاف شروع ہوا اور ایک دوسرے کو زچ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں اہل احساء نے اعصم کو گرفتار کر کے ابوسعید جنابی کے تمام خاندان کو حکومت و سلطنت سے محروم کر کے اپنے گروہ میں سے جعفر و اسحاق دو آدمیوں کو مشترکہ طور پر حکومت و سلطنت پر بٹھا دیا۔ اس جزیرہ میں ابوطاہر کی اولاد پہلے سے بحالت جلاوطنی موجود تھی اور ان کی تعداد زیادہ تھی۔ انہوں نے ان نئے جلاوطنوں کو جزیرہ میں قدم رکھتے ہی حملہ کر کے قتل کر ڈالا۔

جعفر و اسحاق مل کر قرامطہ پر حکومت کرنے لگے اور انہوں نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے ہی خلافت عباسیہ کی اطاعت سے منحرف ہو کر عبیدین کی خلافت کو تسلیم کر لیا اور عبیدی خلیفہ کا خطبہ اپنے مقبوضہ ممالک میں جاری کیا۔ اس کے بعد انہوں نے کوفہ پر حملہ کیا اور قابض ہو گئے۔ اس کے بعد جعفر اور اسحاق کے درمیان نا اتفاقی پیدا ہوئی اور ہر ایک اس کوشش میں مصروف ہوا کہ اپنے حریف کو مٹا کر تنہا بادشاہت کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرامطہ کے گروہ میں کمزوری کے آثار نمایاں ہو گئے۔ جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اصغر بن ابوالحسن تغلبی نے بحرین پر اور بنی مکرم نے عمان پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح تغلبی خاندان نے ۴۷۵ھ تک بحرین سے حکومت قرامطہ کا نام و نشان مٹا دیا۔ ان کی سلطنت کے برباد ہونے کے بعد قرامطہ کے عقائد و اعمال میں ایک خاص تبدیلی پیدا ہوئی۔ اگرچہ قرامطہ بحرین کے حاکم اعصم کے عقائد و اعمال دوسرے قرامطہ سے جدا تھے اور اس کو مصر کے عبیدی (فاطمی) خلیفہ سے سخت نفرت تھی۔ لیکن قرامطہ کی عام جماعت مصر کے عبیدی خلیفہ کو محبت و عقیدت کی نظر سے دیکھتی اور اس کو اپنا خلیفہ مانتی تھی۔ اب جبکہ بحرین کی حکومت ان کے قبضے سے نکل گئی اور عراق شام میں ان کے لئے کوئی جائے پناہ نہ رہی تو انہوں نے خفیہ طور پر اپنی انجمنیں قائم کیں اور بظاہر مسلمانوں میں ملے جلے رہے۔ ان خفیہ جماعتوں کے ذریعے انہوں نے اپنی تبلیغ اور اپنی جماعت کو ترقی دینے کا سلسلہ جاری کیا۔ عبیدیوں کی طرح انہوں نے جابجا اپنے داعی مقرر کر دیئے۔ ان داعیوں کی جماعت اپنے رازوں کو بہت محفوظ رکھتی تھی۔ زاہدوں اور پیروں کے لباس میں یہ لوگ نظر آتے اور لوگوں کو اپنا مرید بناتے پھرتے تھے۔ ان مریدوں میں جس شخص کو وہ اپنے ڈھب کا پاتے اس کو "شیخ" کا خطاب دیتے اور اپنے مخصوص عقائد کی تعلیم کرتے رہتے تھے۔ اس طرح ان میں دو طبقے

تھے۔ ایک داعیوں کا اور دوسرا رفیقوں کا۔ شام، عراق، فارس، خراسان میں ہر جگہ داعی پھیل گئے مصر کے عبیدی بادشاہ نے خلافت اسلامیہ کی بربادی کے لئے اسلامی ممالک میں قرامطہ کے داعیوں کا ایک جال غیر محسوس طریقہ سے پھیلا کر ان کی سرپرستی اور ہر قسم کی مدد کی۔

قرامطہ بحرین کی حکومت مٹنے کے بعد قرامطہ کی تمام تعلیم یافتہ اور ہوشیار جماعت داعیوں کے لباس میں تبدیل ہو گئی تھی اور اسی لئے عبیدی سلطنت کو مصر سے عراق و خراسان کی طرف آدمیوں کے بھیجنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ چونکہ یہ لوگ ایک مٹی ہوئی حکومت کے سوگوار تھے۔ اس لئے موقع پا کر ڈاکہ ڈالنے اور لوگوں کو قتل کرنے میں انہیں کوئی باک نہ تھا۔ چنانچہ یہ داعی یا پیر اپنے رفیقوں یعنی خاص مریدوں کی مدد سے رہزنوں اور ڈاکوؤں کے لباس میں بھی تبدیل ہو جاتے تھے انہوں نے اپنے مریدوں کو تعلیم دی تھی کہ ہر اس شخص کو جو ہمارا ہم عقیدہ نہیں ہے۔ قتل کرنا کوئی جرم کا کام نہیں اسی لئے ان کے وجود سے مسلمانوں کو سخت مصائب میں مبتلا ہونا پڑا۔ مسلمان سرداروں کو چھپ چھپ کر قتل کرنا انہوں نے اپنا خاص شیوہ بنا لیا۔ جس جگہ کوئی حاکم نہایت چست اور چوکس ہوتا وہاں یہ بالکل خاموش اور روپوش رہتے۔ لیکن جس جگہ انتظام سلطنت کو کسی قدر کمزور پاتے وہاں قتل و غارت کے ہنگاموں سے قیامت برپا کر دیتے تھے اس کے علاوہ قرامطہ نے منافقت اور تقیہ کا لباس بھی پہن رکھا تھا اور مسلمانوں کو دھوکا دینا کار خیر سمجھتے تھے۔ دراصل یہ ایک سیاسی تحریک تھی جس کا مقصد دنیا سے اسلام کو مٹانا اور عربوں کی فوقیت و برتری کو نیچا دکھانا تھا۔ اس تحریک کے ڈانڈے بھی ایران سے ملتے ہیں۔ مسلمانوں نے ایران تو فتح کر لیا تھا لیکن ان کے دل و دماغ کو تسخیر نہ کر سکے تھے۔ اس لئے نو مسلم عوام کے دماغ سے ان کے پرانے عقائد و نظریات ختم نہ ہو سکے مگر وہ اعلانیہ ان کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے مختلف تحریکوں کی صورت میں ان کا ظہور ہوتا رہا۔ بابک خرمی کی تحریک بھی اسی کی ایک شکل ہے۔

کسی ایسی تحریک کا جو اعلانیہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہو۔ اسلامی حکومت میں فروغ پانا مشکل تھا۔ اس لئے مفسدین اور سازشی عناصر نے اس پر باطنیت کی نقاب ڈال کر اپنے عقائد و نظریات کی اشاعت اور اس کی روشنی میں کلام اللہ اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تاویل شروع کی۔ قرمطی تحریک بھی باطنیت ہی کی ایک شاخ تھی۔ لیکن اس میں کچھ اور عقائد بھی شامل ہو گئے تھے۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے مقالہ نگار "باطنیہ" کے

عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ!

الف: اسماعیلیوں کو یہ نام خصوصاً اس لئے دیا گیا کہ وہ قرآن مجید اور احادیث کے ظاہری الفاظ کے "باطنی" معنوں پر زور دیتے تھے۔

ب: عموماً اس کلمے کا اطلاق ہر ایسے شخص پر بھی ہوتا تھا۔ جس پر یہ الزام ہو کہ وہ قرآن و حدیث میں لفظی معنوں کو رد اور باطنی معنوں کو قبول کرتا ہے۔

اسماعیلیہ اور ان سے ملتے جلتے شیعہ گروہوں میں ایک خاص قسم کی تاویل کا ارتقا ہو اجسے "باطنی تفسیر" کہہ سکتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے اپنے فرقے کے مخصوص اعتقادات کو پیش کیا جائے اسے ائمہ کی سند سے روایت کیا جاتا ہے اور یہ چیز اسرار میں سمجھی جاتی ہے۔ شیعوں کے تمام گروہوں نے بشمولیت فرقہ دروزی اس تاویل باطنی کو کسی نہ کسی صورت میں قائم کر رکھا ہے اور تفسیری نظام بھی ان باطنی حلقوں سے مربوط ہے۔ اس رمزی تاویل کا سراغ دوسری صدی ہجری میں عراق کے شیعہ غلاۃ میں مل سکتا ہے۔ یہ قول ابو منصور العجلی کی طرف منسوب ہے۔ "السموات" سے مراد امام ہیں اور "الارض" سے مراد امام کے پیرو۔ ابو الخطاب (م ۱۳۸ھ) کے متبعین میں تمثیلی تاویل خاص طور پر مروج معلوم ہوتی ہے۔ یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ باطنی تاویل کے ایسے عناصر خطابیوں سے اسماعیلیوں میں داخل ہوئے جہاں ان میں ایسی ایسی باریکیاں نکالی گئیں کہ باطنی تاویل ان کا امتیازی نشان بن گئی۔ باطنی نظام کے چار بنیادی تصورات ہیں ۱۔ باطن، ۲۔ تاویل ۳۔ خاص و عام ۴۔ تقیہ یہ سب بنیادی تصورات کسی بھی عقیدے کی تبلیغ کے وقت لازماً پیش نظر رہتے تھے۔ ان کا نظریہ ہے کہ باطن ایک ایسی مخفی دنیائے اسرار ہے جو ظاہر یا عام مشاہدے میں آنے والی دنیا کے متوازی موجود ہے اور مقدس کتاب کا اصل کام یہ ہے کہ وہ مخفی دنیا کی طرف اشارہ کرے لہٰذا ان کے خیال میں ظاہری عبارت سے باطن کا استنباط یا اس کی تاویل اتنی ہی بنیادی ہے جتنی کہ خود تنزیل، اور اسے بھی وہ منجانب اللہ ہی سمجھتے ہیں۔ ہر نبی کے لئے جسے عام لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے لئے کتاب دی گئی ایک وصی کا ہونا ضروری ہے اور حضرت محمد ﷺ کے وصی حضرت علیؑ تھے۔ جنہیں متقابل تاویل ملی ہے اب یہ وصی کا کام ہے کہ وہ خفیہ طور پر اس تاویل کو قابل آدمیوں کے ایک مخصوص گروہ کے سامنے پیش کرے اس مخصوص گروہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو اس جماعت سے

تعلق رکھتے ہوں جو وصی کا اقتدار تسلیم کرتی ہو۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد سوم صفحہ ۳۴۹۔۳۴۸)

یہ تاریخ اسلام کا ایک افسوسناک واقعہ ہے کہ اس قسم کی اکثر گمراہ کن تحریکیں اہل بیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے نام پر (جو دین کے حامل اور محافظ تھے) شروع ہوئی تھیں اور اس لئے اہل عجم نے ان سے رشتہ جوڑا تھا۔ چنانچہ قرمطی تحریک بھی دیگر شیعہ تحریکوں کی طرح ان ہی کے نام سے شروع ہوئی۔

تمام شیعوں کا مقصد خلافت اسلامیہ کو ناکام بنانا اور مٹانا تھا۔ اس لئے انہوں نے ہر دور میں خلافت راشدہ سے لیکر خلافت عثمانیہ تک ہر ایک کے خلاف خوب سازشیں اور شورشیں کیں۔ قرامطہ کی تحریک و حکومت نے بنو عباس کی خلافت کے لئے زبردست مسائل پیدا کر دیئے تھے۔ اس لئے دیگر شیعوں نے قرامطہ کو عباسیوں کا دشمن دیکھ کر نہ صرف یہ کہ ان کی کوئی مخالفت نہیں کی بلکہ باقاعدہ ان کی مدد و حمایت کرتے رہے۔

بہر حال یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تحریک قرامطہ شیعہ امامیہ اسماعیلیہ ہی کی ایک اہم شاخ ہے۔ شیعہ مجتہد سید محمد طباطبائی نے اپنی کتاب زیر عنوان "اسمٰعیلیہ شیعہ اور ان کے مختلف فرقے" قرامطہ کا ذکر باطنیہ کے ساتھ کیا ہے اور آخر میں ان کے مظالم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ!

"ان ہی واقعات اور حوادث کی وجہ سے مسلمانوں نے باطنیہ فرقے سے منہ موڑ لیا اور ان کو دین اسلام سے خارج یعنی کافر سمجھنے لگے یہاں تک کہ عبید اللہ مہدی فاطمی افریقہ (مصر) میں ظاہر ہوا اور اپنے آپ کو مہدی موعود اور اسماعیلیوں کا امام کہا کرتا تھا۔ اس نے بھی قرمطیوں سے بیزاری کا اعلان کر دیا تھا"۔ (شیعہ صفحہ ۶۳)

شیعہ مجتہد نے یہاں بدنامی سے بچنے اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے اسماعیلیوں اور شیعوں کے مشترک اصول "تقیہ" سے کام لیا ہے۔ اوپر بتایا جاچکا ہے کہ عبید اللہ مہدی اور اس کے جانشین قرامطہ کی حمایت کرتے رہے۔ بعض حضرات نے ذاتی مفادات کے تحت اور جزوی طور پر ان کی مخالفت کی۔ چنانچہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ!

"دوسری جانب اس امر کے بہت سے ثبوت موجود ہیں کہ بنو فاطمہ نے قرمطی عقائد اختیار کر لئے تھے۔ عبید اللہ نے اپنے اعلان خلافت سے بیشتر المغرب کے دارالھجرۃ ایکجان

ہی میں پناہ لی تھی۔ جس کی بنیاد صاحب البذر قرمطی نے رکھی تھی۔ باامتیاز اسلوب المعز کی مناجات سراسر قرمطی ہے اور یہی حال اس منحول (محفل) کی رسوم کا ہے جو اس نے قاہرہ میں قائم کی تھی۔ دروزی فرقہ قرامطہ ہی کا ایک باغی گروہ ہے۔ عبیداللہ نے اذان کے خاتمے پر صلوٰۃ علی النبی جو ترویج کی تو اس کا سراغ بھی امام ناطق کی اس حیثیت سے معلوم کیا جا سکتا ہے جو قرامطہ کے نزدیک نبی کریم ﷺ کو حاصل تھی۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور جلد ۱۶-۲ صفحہ ۲۵)

فاطمیہ (مغربی اسماعیلی)

اسماعیلیہ کا دوسرا گروہ جو محمد بن اسماعیل کی اولاد میں امارت جاری رہنے کا قائل تھا۔ اس کا مرکز سلمیہ تھا۔ رفتہ رفتہ زور پکڑتا گیا۔ ان کے داعی دور دور تک اسلامی ممالک میں خفیہ طریقوں سے فاطمی دعوت کے لئے کام کرتے رہے۔

اسماعیلیہ کے نزدیک اول ائمہ مستورین محمد بن اسماعیل معروف بہ محمد المکتوم ہیں جو اپنے والد اسماعیل کی وفات (۱۴۳ھ) کے بعد منصب امامت پر فائز ہوئے۔ ان کے بعد عبید اللہ مہدی کے ظہور (۲۹۷ھ) تک تاریخ میں اسماعیلیہ کے سلسلہ امامت کے متعلق مختلف اقوال پائے جاتے ہیں۔ لیکن ہر سلسلہ کی آخری کڑی عبیداللہ مہدی ہے جو پہلا فاطمی خلیفہ ہوا۔ اس خلافت کو مہدویہ، عبیدیہ، علویہ، فاطمیہ اور اسماعیلیہ کے عنوانات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پہلے فاطمی خلیفہ عبیداللہ کا نام عبداللہ تھا اس نے تقیہ کر کے اپنا نام عبیداللہ رکھا اور اس کا نسب اس حد تک مشتبہ ہے کہ اس کے متعلق نہ صرف مؤرخین بلکہ خود اسماعیلیہ بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔

ڈاکٹر زاہد علی نے (جو خود داؤدی بوہرے تھے) اس موضوع پر طویل بحث کی ہے اور آخر میں لکھتے ہیں کہ!

"بحث نسب کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد بن اسماعیل بن جعفر الصادق اور عبیداللہ بن میمون القداح دونوں کا وجود تاریخ سے ثابت ہے جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے۔ ثبوت طلب امر حسب شجرہ ذیل صرف اتنا ہے کہ دولت فاطمیہ کا پہلا امام مہدی محمد بن اسماعیل کی نسل سے ہے نہ کہ عبداللہ بن میمون القداح کی نسل سے جو دعوت اسماعیلیہ کا صدر تھا"۔ (تاریخ فاطمین مصر حصہ اول ۸۷)

لیکن علمائے انساب کی تحقیق کے مطابق محمد بن اسماعیل کی کوئی اولاد ہی نہیں تھی۔

ان محمد بن اسماعیل بن جعفر خرج من الدنیا لم یعقب و هذا شی قد اتفق علیه النسابة"

(التبصیر فی الدین صفحہ ۱۲۳)

تحقیق محمد بن اسماعیل نے دنیا سے اس حال میں کوچ کیا کہ ان کی کوئی اولاد نہ تھی اور یہ ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے کہ علمائے نسب کا اس پر اتفاق ہے۔

محققین انساب کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ بنی عبید کو خاندان نبوت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ ان کا مورث اعلیٰ عبید مجوسی یا یہودی تھا۔

قاضی ابو بکر محمد بن الطیب نے اپنی کتاب "الکشف عن اسرار الباطنیہ" اور قاضی عبدالجبار نے کتاب "تشبیت النبوۃ" اور مقدسی نے اپنی کتاب "کشف ماکان علیہ بنو عبید" میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔

عباسی خلیفہ احمد بن اسحاق المقتدر۔ اور القادر باللہ نے عبیداللہ مہدی کے نسب کے سلسلہ میں ۴۰۲ھ یا ۴۰۶ھ میں ایک محضر تیار کرایا۔ جس میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ عبیداللہ المہدی بانی خلافتِ فاطمی نسبی اعتبار سے فاطمی نہ تھا۔ اس محضر پر دستخط کرنے والوں میں امامیہ اثنا عشری کے دو اکابر بھی تھے۔ یہ دونوں بھائی الشریف رضی اور الشریف مرتضیٰ تھے۔

مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی دولت عبیدیین کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ!

محبت اہل بیت اور سلطنت عباسیہ کی مخالفت کا اشاعتی کام خفیہ طریقے سے تمام عالم اسلام میں علویوں نے پھیلا دیا تھا۔ مگر عباسیوں کی مستعدی اور ان کے ہوا خواہوں کی کوششوں نے علویوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اس پوشیدہ اور سازشی کام کی ابتداء عبداللہ بن سبا یہودی نے کی تھی۔ اسی کو اس سازشی کام کا استاد اور موجد کہنا چاہیے۔ اس کام میں مجوسیوں، یہودیوں اور بربریوں نے بھی نو مسلموں کے لباس میں علویوں کی امداد کی۔ جب سلطنت عباسیہ کی وسیع سلطنت کا شیرازہ ڈھیلا ہونے لگا تو بعض یہودی الاصل اور مجوسی النسب لوگوں نے اپنے آپ کو علوی بنا کر فائدہ اٹھانا چاہا۔ بربر کا علاقہ مرکز سلطنت سے زیادہ فاصلہ پر تھا اور بربری لوگوں کے مخصوص خصائل سے بآسانی فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ لہٰذا تیسری صدی ہجری کے آخری حصے میں محمد حبیب نامی ایک شخص نے جو سلمیہ علاقہ حمص میں سکونت پذیر تھا اپنے آپ کو امام جعفر صادق

کے بیٹے اسماعیل کی اولاد میں ظاہر کر کے حکومت و سلطنت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ امام جعفر صادق کے زمانے سے ان کے داعی یمن، افریقہ اور مراکش میں مصروف کار تھے اور لوگوں کو اس خیال کی طرف متوجہ کر رہے تھے کہ عنقریب امام مہدی کا ظہور ہونے والا ہے اور وہ علوی فاطمی ہونگے محمد حبیب نے اپنے رازداروں میں سے ایک شخص رستم بن حسن بن خوشب کو یمن کی طرف بھیجا کہ وہاں جا کر لوگوں کو اس بات کی تعلیم دے کہ امام مہدی بہت جلد ظاہر ہونے والے ہیں چنانچہ رستم نے یمن میں جا کر اپنے کام کو نہایت خوبی کے ساتھ انجام دیا اور ایک جمعیت بھی فراہم کر لی۔ اس کے بعد محمد حبیب کے پاس بصرے کا ایک شخص ابوعبداللہ حسن بن محمد بن زکریا جو شیعہ خیال کا آدمی تھا اور ہمیشہ علویوں کی حمایت و طرف داری میں کوشاں رہتا تھا آیا محمد حبیب نے اس کو مناسب تعلیم دے کر اور جوہر قابل پا کر ہدایت کی کہ تم اول یمن پہنچ کر رستم بن حسن کی صحبت میں چند دن رہو اور دعوت و تبلیغ کے قاعدے اس سے سیکھو اور پھر وہاں سے علاقہ بربر کی طرف جاؤ اور وہاں اپنا کام شروع کرو وہاں زمین تیار ہے تم جا کر تخم ریزی شروع کرو تم کو ضرور کامیابی ہوگی۔ ابوعبداللہ شیعی کو محمد حبیب نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ہمارا بیٹا عبیداللہ امام مہدی ہے اور تم اسکے داعی بنا کر بھیجے جاتے ہو۔

{تاریخ اسلام جلد ۳ صفحہ ۱۹۱}

یہ ایک حقیقت ہے کہ شمالی افریقہ میں دولت فاطمیہ کا بانی ابوعبداللہ شیعی ہے۔ اس کا نام الحسین بن احمد بن محمد بن زکریا ہے۔ جسے کبھی کبھی المحتسب بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ ابوعبداللہ نے نہایت کامیابی کے ساتھ یہ تحریک چلائی۔ اسی اثنا میں عبیداللہ مہدی گرفتار ہو گیا مگر ابوعبداللہ فتح پر فتح حاصل کرتا چلا گیا۔

پھر جب اس نے ۲۹۶ھ میں افریقہ کے مرکزی شہر "الاربس" کو بھی فتح کر لیا تو اغلبی امیر زیادۃ اللہ رقادہ (افریقہ) سے بھاگ گیا۔ یکم رجب ۲۹۶ھ کو ابوعبداللہ اغلبیوں کے دارالحکومت میں داخل ہوا اور وہاں اپنے بھائی ابوالعباس کو نائب مقرر کر کے ایک لشکر کے ساتھ سجلماسہ (جہاں عبیداللہ مہدی قید تھا) پر حملہ آور ہو کر اپنے امام کو قید سے رہائی دلائی۔ ۲۰ ربیع الثانی ۲۹۷ھ کو عبیداللہ مہدی ایک فاتح اور خلیفہ کی حیثیت سے رقادہ میں داخل ہوا اور ابوعبداللہ اور اس کے بھائی ابوالعباس کو بڑے بڑے اعزاز مرحمت کیے۔

عبیداللہ نے تخت نشین ہو کر اور اپنے آپ کو مطلق العنان فرمانروا دیکھ کر یہ چاہا کہ ابو

عبداللہ شیعی اور اس کے بھائی ابو العباس کے اثر و رسوخ کو مٹائے۔ اس کش مکش میں ان کے درمیان اختلاف بڑھتا گیا۔ اور یہ ایک دوسرے کے شدید مخالف ہو گئے۔ چنانچہ یکم ذی الحجہ ۲۹۸ھ کو عبید اللہ مہدی دولت فاطمیہ کے پہلے خلیفہ نے دونوں بھائیوں کو قتل کرا دیا۔

الغرض ۲۹۶ھ میں افریقہ (تیونس) کے اندر دولت اغلبیہ کا خاتمہ ہوا اور اس کی جگہ دولت عبیدیہ قائم ہوئی۔ دولت عبیدیہ نے ۳۵۶ھ میں خاندان اخشیدیہ سے مصر کا ملک چھین کر قاہرہ کو اپنا دارالسلطنت قرار دے دیا۔ ۳۶۱ھ میں عبیدیوں نے حلب پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح ان کی سلطنت سرحد مراکش سے ملک شام تک وسیع ہو گئی۔ عبیدیوں کے دعویٰ خلافت سے دنیا میں خلافت کے تین سلسلے قائم ہو گئے۔ پہلا اور سب سے بڑا سلسلہ تو وہی ہے جو حضرت ابوبکر صدیق (۱۱ھ / ۶۳۲ء) سے لیکر خاندان عثمانیہ کے آخری خلیفہ سلطان عبدالمجید خان (۱۳۴۲ / ۱۹۲۴ء) تک قائم رہا دوسرا سلسلہ خلافت وہ ہے جو اندلس میں عبدالرحمن اول (۱۳۸ھ) سے لیکر ہشام بن محمد کی وفات (۴۲۸ھ) تک قائم رہا۔ اس سلسلہ خلافت کو بھی علمائے اسلام نے خلافت حقہ تسلیم کیا ہے اور خلفائے اندلس کو باقاعدہ "خلفائے اسلام" تصور کرتے ہیں۔ یہ تمام خلفاء نسلاً اموی ہیں۔ عبدالرحمن اموی کی اولاد میں بعض ایسے باحوصلہ خلفاء ہوئے جنہوں نے اندلس کو "فخر الممالک" بنا دیا۔ انہوں نے نہ صرف ملک کی سرسبزی و شادابی میں حیرت انگیز کارنامے دکھائے بلکہ علوم و فنون کے بھی ایسے دریا بہائے کہ آج تک پوری دنیا ان کی قصیدہ خوانی میں معروف ہے اور پھر بھی حق ستائش ادا نہیں ہو سکا موجودہ یورپ کی علمی ترقی ان ہی اموی خلفاء کی رہین منت ہے۔ قرطبہ میں ان خلفاء نے علم کی وہ شمع روشن کی جس سے تمام یورپ مستفید ہوا خلفائے اندلس کی شوکت و طاقت کا بھی یہ حال تھا کہ تمام یورپ ان سے کانپتا تھا اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے سلاطین یورپ ہر قسم کی ذلت برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔

تیسرا سلسلہ خلافت عبیدیہ ہے جو مغربی افریقہ، مصر اور شام میں ابو محمد عبید اللہ المہدی (۲۹۷ھ) سے لیکر ابو محمد عبداللہ العاضد لدین اللہ (۵۶۷ھ) یعنی دو سو ستر سال تک قائم رہا اس اسماعیلی خلافت کو خلافت عبیدیہ و فاطمیہ کہا جاتا ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل حضرات یکے بعد دیگرے مسند آرائے خلافت ہوئے۔

۱۔ ابو محمد عبداللہ (عبید اللہ) المہدی باللہ — تاریخ بیعت ربیع الثانی ۲۹۷ھ

۲۔ ابوالقاسم بن عبیداللہ المہدی القائم بامر اللہ — تاریخ بیعت ربیع الاول ۳۲۲ھ

۳۔ ابوطاہر اسماعیل المنصور بنصر اللہ بن القائم بامر اللہ — تاریخ بیعت شوال ۳۳۴ھ

۴۔ ابوتمیم معد بن اسمٰعیل المعز لدین اللہ — تاریخ بیعت شوال ۳۴۱ھ

۵۔ ابومنصور نزار بن معد العزیز باللہ — تاریخ بیعت ربیع الثانی ۳۶۵ھ

۶۔ منصور بن نزار الحاکم بامر اللہ — تاریخ بیعت رمضان ۳۸۶ھ

۷۔ ابوالحسین علی بن منصور الظاہر لاعزاز دین اللہ — تاریخ بیعت شوال ۴۱۱ھ

۸۔ ابوتمیم معد بن الظاہر المستنصر باللہ — تاریخ بیعت شوال ۴۲۷ھ

۹۔ ابوالقاسم احمد بن المستنصر المستعلی باللہ — تاریخ بیعت ذی الحج ۴۸۷ھ

۱۰۔ ابوعلی منصور الآمر باحکام اللہ — تاریخ بیعت صفر ۴۹۵ھ

۱۱۔ ابوالمیمون عبدالمجید الحافظ لدین اللہ (نائب امام طیب)۔ تاریخ بیعت ذی الحج ۵۲۴ھ

یہ ابتداء میں امام طیب کے نائب تھے جب وہ ظاہر نہ ہوئے تو ۵۲۶ھ میں خود امام و امیرالمومنین ہو گئے۔

۱۲۔ ابومنصور اسماعیل الظافر — تاریخ بیعت ۵۴۴ھ

۱۳۔ ابوالقاسم عیسیٰ الفائز بنصر اللہ — تاریخ بیعت ۵۴۹ھ

۱۴۔ ابومحمد عبداللہ العاضد لدین اللہ — تاریخ بیعت ۵۵۵ھ تا ۵۶۷ھ

مؤرخ اسلام اکبر شاہ خان نجیب آبادی دولت عبیدیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"دولت عبیدیہ تین سو ستر سال تک قائم رہی ابتداً عبیدیوں کی حکومت افریقہ یعنی ملک مغرب میں قائم ہوئی پھر مصر پر قابض ہو کر انہوں نے قاہرہ کو دارالسلطنت بنایا۔ سلطنت ادریسیہ کو بھی عام طور پر لوگ علویوں اور شیعوں کی سلطنت سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ادریسیہ سلطنت نسباً بربری ہے اور اس لئے نیم شیعہ یا برائے نام شیعہ سلطنت تھی۔ ہاں عبیدیین کی حکومت ضرور شیعی حکومت تھی لیکن نسباً وہ علوی حکومت ہرگز نہ تھی عبیداللہ کا دادا تاریخ الخلفاء طلسیوطی کی روایت کے موافق مجوسی اور ذات کا لوہار و تیر گر تھا۔ عبداللہ مہدی نے ملک مغرب میں جا کر فاطمی ہونے کا دعویٰ کیا مگر علماء نسب نے اس کے دعویٰ کو تسلیم نہیں کیا۔ ایک مرتبہ عزیز عبیدی نے اندلس کے اموی خلیفہ کے نام ایک خط بھیجا جس میں ہجو و دشنام درج تھیں

خلیفہ اموی نے اس کے جواب میں عزیز عبیدی کو لکھا کہ تجھ کو چونکہ ہمارا نسب معلوم تھا اس لئے تو نے ہجو کی۔ اگر ہم کو تیرا نسب معلوم ہوتا تو ہم بھی تیری طرح تیرے بزرگوں کی نسبت ہجو کرتے عزیز کو جواب بہت ہی گراں گذرا مگر کوئی جواب نہ دے سکا۔ عبیدیین کو عام طور پر لوگ فاطمین کے نام سے یاد کرتے ہیں حالانکہ یہ بڑی جہالت اور غلطی ہے۔

عبیدیین عام طور پر اسماعیلی شیعہ تھے انہی کو باطنیہ بھی کہتے ہیں انہی کی ایک شاخ فارس کی وہ سلطنت تھی جو حسن بن صباح نے قائم کی تھی جس کا دارالحکومت قلعہ الموت تھا۔ اسی کو فدائین کی حکومت بھی کہتے ہیں وہ بھی علوی نہ تھے۔ عبیدیین کی حکومت میں ہزاروں صلحاء محض اس لئے مقتول ہوئے کہ وہ صحابہ کرام کو برا نہ کہتے تھے۔ عبیدیین سے اسلام کو کوئی نفع نہیں پہنچا اور ان کا کوئی جنگی، علمی اور اخلاقی کارنامہ ایسا نہیں جس پر فخر کیا جا سکے بعض علماء نے عبیدیین کو خارج از اسلام اور مرتد بھی قرار دیا ہے۔ ان میں سے بعض مثلاً عزیز عبیدی نے عالم الغیب ہونے کا دعویٰ کیا تھا شراب خوری کو یہ لوگ جائز سمجھتے تھے۔ اس قسم کی بہت سی باتیں ان کے عہد حکومت میں پائی جاتی تھیں جن کے سبب انکو علماء اسلام نے ننگ اسلام سمجھا ہے۔ (تاریخ اسلام جلد ۲ صفحہ ۲۲۲)

دولت عبیدیہ کے چوتھے خلیفہ ابو تمیم معد بن اسماعیل المعز لدین اللہ کے دور میں اسماعیلیوں کی سفاکی اور بے رحمی کی ایک مثال ابن النابلسی شہید کے قتل کا وہ واقعہ ہے۔ جس کا تذکرہ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایۃ (جلد ۱۱ صفحہ ۲۸۴) میں اور حافظ شمس الدین الذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں کیا ہے۔ اس واقعے کا خلاصہ ملاحظہ کیجئے۔

امام ابوبکر محمد بن احمد سہل الرملی المعروف بہ "ابن النابلسی" اپنے دور کے بہت بڑے محدث تھے۔ عابد و زاہد اور صائم الدھر تھے۔ حدیث و فقہ میں امام تھے فاطمیوں نے جب مصر پر غلبہ حاصل کیا تو اسماعیلی عقائد کو لوگوں پر بزور شمشیر مسلط کرنا چاہا ابن النابلسی شہید ان کی حرکت سے نالاں تھے اور وہ نہ صرف ان کے اس طرز عمل پر تنقید کرتے تھے. بلکہ ان کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیتے تھے۔ اسماعیلی حکمران انہیں گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ رملہ سے دمشق چلے گئے۔ وہاں کے گورنر نے ان کو گرفتار کر کے لکڑی کے پنجرے میں بند کر کے مصر بھیج دیا۔ یہ ۳۶۵ھ کا واقعہ ہے۔ اس وقت ابو تمیم معز فاطمی حکمران تھا اور اس کا غلام امیر عساکر "جوھر" سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ ابن النابلسی کو قائد جوھر کے سامنے پیش کیا گیا۔ جوھر نے پوچھا کہ تم نے یہ فتویٰ

دیا ہے کہ اگر کسی کے پاس دس تیر ہوں تو وہ ان میں سے ایک روم کے نصرانیوں کے خلاف اور نو اسماعیلیوں کے خلاف استعمال کرے۔ ابن النابلسی شہید نے فرمایا جناب آپ کو روایت غلط پہنچی ہے میں نے یہ فتویٰ نہیں دیا۔ بلکہ میرا فتویٰ یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس دس تیر ہوں تو وہ نو تیر تمہارے خلاف استعمال کرے اور دسواں تیر بھی روم کے نصرانیوں کے بجائے تم لوگوں پر ہی برسائے۔ فَاِنَّكُمْ غَيَّرْتُمُ الْمِلَّةَ وَقَتَلْتُمُ الصَّالِحِيْنَ وَادَّعَيْتُمْ نُوْرَ الْاِلٰهِيَّةِ۔ کیونکہ تم نے دین کو بدل ڈالا۔ خدا کے نیک بندوں کے خون سے ہاتھ رنگے اور تم نور الہیت کے مدعی بن بیٹھے۔

جوہر نے حکم دیا کہ ان کی تشہیر کی جائے (منہ کالا کر کے بازار میں پھرایا جائے)۔ دوسرے دن ان کی پٹائی کا حکم دیا۔ تیسرے دن ایک یہودی کو حکم دیا کہ ان کی زندہ کھال کھینچ لی جائے۔ یہودی نے سر کی چوٹی سے ان کی کھال کھینچنی شروع کی۔ چہرے تک کھال اتاری گئی مگر انہوں نے اف تک نہیں کی بلکہ نہایت صبر و سکون کے ساتھ ذکر الٰہی میں مشغول رہے اور قرآن کریم کی آیت وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (الاحزاب نمبر ۳۸) کی تلاوت فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ سینے تک کی کھال اتاری گئی اور ان کے صبر و استقامت کے پاؤں میں لغزش نہیں آئی۔ بالآخر کھال کھینچنے والے یہودی کو ان پر ترس آیا۔ اور اس نے دل کی جگہ چھری گھونپ کر ان کا قصہ تمام کر دیا۔ کھال اتارنے کے بعد اس میں بھوسہ بھرا گیا اور بھوسہ بھری کھال کو سولی پر لٹکایا گیا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔ (الذہبی: سیر اعلام النبلاء جلد ۱۶ صفحہ ۱۴۸-۱۴۹ بحوالہ ماہنامہ بینات کراچی دسمبر ۱۹۸۷ء)

یہ اسماعیلیوں / فاطمیوں / عبیدیوں / مہدیوں کی سفاکی و بربریت کی ایک مثال ہے جس کے پڑھنے سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان خونخواروں کے ہاتھوں کتنے علماء حقانی اور حق پرست مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا ہو گا۔ بہر حال عبیدیہ / فاطمیہ حکومت کو علماء اسلام نے کبھی خلافت تسلیم نہیں کیا۔ نہ ان کو خلیفہ مانتے تھے اور نہ ہی اسلامی نقطہ نظر سے ان کو مستحق عزت و تکریم سمجھتے تھے۔ ان لوگوں نے شرک و بدعت کو فروغ دیا۔ شعائر اسلام کی بے حرمتی کی۔ ہزاروں مسلمانوں کو تہ تیغ کیا اور مختلف قسم کی بداعتقادیوں و بداعمالیوں کے مرتکب ہوئے۔ بالآخر ۲۷۰ سال تک (۲۹۷ھ تا ۵۶۷ھ) قائم رہنے والی اس حکومت کو سلطان صلاح الدین ایوبی نے ختم کر کے مصر میں ایوبی سلطنت قائم کی اور خلافت عباسیہ کا خطبہ مصر میں دوبارہ جاری کر دیا۔

ایک موقع ایسا بھی آیا کہ بغداد (جو خلافت عباسیہ کا دارالسلطنت تھا) پر بھی اسماعیلیوں کا قبضہ ہو گیا اور یہاں بھی ایک سال (۸ ذیقعدہ ۴۵۰ھ تا ۶ ذیقعدہ ۴۵۱ھ) تک مستنصر عبیدی کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا رہا۔ دیالمہ کے ایک ترکی غلام ارسلان المعروف بہ بساسیری نے ملک الرحیم کے زمانہ میں اس قدر عروج اور اقتدار حاصل کر لیا کہ دولت عباسیہ کا مختار کل بن گیا تھا سارے امراء اس سے ڈرتے تھے۔ بساسیری چونکہ مذہباً باطنی شیعہ تھا۔ اس لئے بغداد کے شیعوں نے اس کی ہر طرح مدد کی جس کے نتیجے میں اس نے بغداد پر قبضہ کر لیا اور جامع مسجد بغداد میں مستنصر عبیدی کے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ یہ واقعہ ۸ ذیقعدہ ۴۵۰ھ کا ہے۔ بساسیری نے بغداد میں اذان میں "حی علی خیر العمل" کا بھی اضافہ کرایا۔ اس ایک سالہ حکومت کو طغرل بیگ نے ختم کر کے بغداد کو خلافت عباسیہ کے زیر نگین کر دیا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کے برسر اقتدار آتے ہی مصر سے شیعیت و رفض کے آثار مٹنے لگے، سنت کا فروغ ہوا، جا بجا مدارس قائم ہوئے۔ رفتہ رفتہ فاطمی/عبیدی حکومت کے اثرات ختم ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی اسماعیلیت جو تقریباً تین صدیوں تک مصر میں سرکاری مذہب کے طور پر رائج تھی مصر میں غریب الوطن اور زیر زمین چلی گئی۔

عبیدی حکومت کا یہ تین سو سالہ عہد اسلام کے لیے ایک دور ابتلا تھا جس میں مسلسل شریعت و سنت اور عقائد و اخلاق کے ساتھ تمسخر و تلاعب جاری رہا۔ اہل سنت اور اہل علم زیر عتاب و مغلوب رہے، سفلہ طبیعت، اوباش مزاج اور بے دین غالب و حاوی رہے۔ علامہ مقدسی اس دور کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عبیدیوں کی حکومت کے آغاز سے اختتام تک یہ بلا اسلام پر مسلط رہی۔ اس کی ابتدا ذی الحجہ ۲۹۹ھ سے ہوتی ہے اور اس کا خاتمہ ۵۶۷ھ پر ہوتا ہے۔ ان کے دور حکومت میں روافض کی کثرت اور ان کا غلبہ ہوا۔ لوگوں پر محاصل اور ٹیکس مقرر کیے گئے اور دوسروں نے ان کی اقتدا کی۔ شامی حدود پر بسنے والے کوہستانیوں، نصیریوں، دروزیوں، کے عقائد ان ہی کے اثر سے خراب ہوئے۔ حشیشی (بھنگ استعمال کرنے والے) ان ہی کی ایک قسم ہیں ان اسماعیلیوں کے مبلغین کا جو اثر و نفوذ ان کوہستانیوں کے اندر ان کی کم عقلی اور جہالت کی وجہ سے ہوا وہ دوسروں میں نہیں ہو سکا۔ ان ہی کے دور حکومت میں فرنگیوں نے شام اور جزیرہ کے اکثر شہروں پر

قبضہ کر لیا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا کہ خاندان اتابک برسر اقتدار ہوا اور صلاح الدین جیسے مجاہد سامنے آئے جنھوں نے اسلامی ملک از سر نو بازیاب کیا اور اس حکومت سے بندگان خدا کو نجات دی۔ (کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین جلد ا صفحہ ۲۴۳)

اس انقلاب سلطنت پر جو ایک بڑے دینی و اخلاقی انقلاب کا پیش خیمہ تھا صحیح العقیدہ مسلمان اور محبین سنت کی مسرت بالکل قدرتی بات تھی۔ علامہ مقدسی نے جن کی ولادت سے صرف ۲۹ سال پہلے انقلاب ہوا تھا اور ان تغیرات و اثرات کا انھوں نے خود مشاہدہ کیا تھا جو اس کے نتیجہ میں پیش آئے تھے اپنی مسرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔ فانقرضت تلك الدولة وزالت عن الاسلام بمصر بانقراضها الملة۔

یہ حکومت ختم ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ مصر میں اسلام کی ذلت کا دور بھی اختتام کو پہنچا۔ (حوالہ مذکور)

حافظ ابن قیم نے باطنیوں کے عروج اور اس کے اثرات پھر نور الدین اور صلاح الدین کے ہاتھوں اس سلطنت کے زوال کا تذکرہ ان پرجوش الفاظ میں کیا ہے!

ان باطنیوں کی دعوت مشرق میں تو مضمحل ہو گئی اور مغرب میں رفتہ رفتہ اس کا ظہور شروع ہوا یہاں تک کہ وہ بڑی طاقتور دعوت بن گئی اور اس کے پنجے جم گئے اور اس کے علمبردار مغرب اقصیٰ کے اکثر شہروں پر قابض ہو گئے پھر انھوں نے آگے قدم بڑھایا اور مصر تک پہنچ گئے انھوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور قاہرہ کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے اور ان کے حکام و قضاۃ نے کھلے طریقہ پر اپنی دعوت کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان ہی کے زمانے میں رسائل اخوان الصفا تصنیف ہوئے اور ابن سینا نے "اشارات" اور دوسری تصنیفات کیں۔ خود ابن سینا کا بیان ہے کہ میرے والد حاکم باللہ (فاطمی خلیفہ اور داعی) کے مبلغین میں سے تھے۔ ان فاطمیوں کے دور میں سنت و آثار کا چلن موقوف ہوا اور کتب سنت بالائے طاق رکھ دی گئیں۔ کہیں کوئی چھپ چھپا کر ان کو دیکھتا ہو گا اور عمل کرتا ہو گا۔ اس دعوت کا طرۂ امتیاز اور بنیادی اصول یہ تھا کہ عقل کو انبیاء علیہم السلام کی وحی و تعلیمات پر ترجیح حاصل ہے۔

رفتہ رفتہ سارے ملک مغرب، مصر و شام و حجاز پر ان باطنیوں کا تسلط ہو گیا عراق پر بھی سال بھر ان کا قبضہ رہا۔ اہل سنت ان کے دور حکومت اور ان کی مملکت میں ذمیوں (مسلم حکومت کی غیر مسلم رعیت) کی طرح رہتے تھے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ذمیوں کو وہ امن و امان اور عزت و

اعتبار حاصل تھا جو اہل سنت کو نصیب نہ تھا۔ کتنے علماء اس دور میں قابل گردن زدنی قرار پائے کتنے وارثین انبیاء ان کے قید خانوں میں پڑے پڑے دنیا سے چلے گئے۔

آخر غیرت الٰہی کو جوش آیا اور نور الدین اور صلاح الدین کے ذریعہ اللہ تعالٰی نے مسلمانوں کو ان باطنیوں کے پنجہ غضب سے چھڑایا۔ ان ملکوں میں اسلام کا دم واپسیں معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس انقلاب سلطنت سے اسلام کو نئی زندگی عطا ہوئی اور اس کا آفتاب اقبال گہن سے نکلا اور روئے زمین کے مسلمانوں کو اس سے مسرت ہوئی جبکہ ہر طرف یہ پوچھا جا رہا تھا کہ اس دور ابتلاء میں اس کا کوئی حامی و مددگار ہے؟ اللہ تعالٰی نے اپنے بندے اور لشکر مجاہدین کے ذریعہ بیت المقدس کو پرستاران صلیب سے آزاد کرایا اور اللہ اور اس کے انصار نے اپنی اپنی ہمت اور توفیق کے مطابق دین حق کی نصرت کا حق ادا کیا۔

(الصواعق المرسلۃ علی الجھمیہ والمعطلۃ جلد ۱ صفحہ ۲۲۳-۲۲۴)

اس طرح صلاح الدین ایوبی نے ایک طرف صلیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک کر عالم اسلام کو سیاسی غلامی اور اخلاقی و تہذیبی بدنظمی اور مغربی ترکتازوں کی ہوس کا شکار بننے سے صدیوں تک کے لیے محفوظ کر دیا۔ دوسری طرف عبیدی حکومت کا خاتمہ کر کے اس نے ایک چشمہ فساد کو بند کر دیا جو مصر سے نکل کر عالم اسلام میں باطنیت و اسماعیلیت کے اثرات کو پھیلا رہا تھا اور دو تین صدیوں سے امت میں ذہنی انتشار اور اعتقادی و اخلاقی فساد کا ذمہ دار تھا۔ تاریخ اسلام صلاح الدین کے ان دونوں کارناموں کو کسی طرح فراموش نہیں کر سکتی اور کسی ملک کا مسلمان اس کرد مجاہد کے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ (احتساب قادیانیت جلد ۵ صفحہ ۲۷۴ تا ۲۷۵)

دروزیہ اسماعیلیہ

اَلدُرُوز: واحد الدُّرْزِی اور الدَّرزِی. شامی نسل کے لوگ جو باطنی اسماعیلی مذہب کے پیرو ہیں۔ ان کی تعداد بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں دو لاکھ تھی۔ یہ شام کے متفرق حصوں میں رہتے ہیں۔ بالخصوص جبال، لبنان غربی، جبال شرقی، اور حوران میں ان میں سے زیادہ تر زراعت پیشہ اور زمیندار لوگ ہیں۔

فاطمیوں میں ائمہ ظاہر کا جو سلسلہ عبیداللہ مہدی (۲۹۷ھ) سے شروع ہوا تھا۔ وہ برابر چلتا رہا اور چوتھی صدی ہجری میں اس عقیدے کی تبلیغ و اشاعت بڑے زور سے کی گئی اور پانچویں

صدی ہجری کے وسط تک اسماعیلی بحر اوقیانوس سے لیکر عالم اسلام کے بعید ترین مشرقی علاقوں یعنی ماوراءالنہر بدخشاں، ہندوستان سندھ اور ملتان میں خوب مستحکم ہو چکے تھے۔ ایران میں انہیں بالخصوص استحکام حاصل تھا۔ چنانچہ صوبہ جات بحر خزر، آذربائیجان، رے، قومس، اصفہان، فارس، خوزستان، کرمان، خراسان بشمولیت قہس و طریشز، قہستان، بدخشان اور ماوراءالنہر میں ان کی تبلیغ و اشاعت کے اہم مراکز موجود تھے۔ ایران ہی میں چوٹی کے اسماعیلی فلاسفر پیدا ہوئے جنہیں حقیقی معنوں میں ان کے اصول و عقائد باطنیہ کا بانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ جیسے ابو حاتم رازی م ۳۲۲ھ، ابو یعقوب سجستانی ۳۸۶ھ، حمید الدین کرمانی ۴۱۲ھ اور المؤید الشیرازی ۴۷۰ھ۔

اس قدر تیزی کے ساتھ پھیل جانے والی اس اسماعیلی تحریک کے لئے جو بات سب سے زیادہ مضر ثابت ہوئی وہ اس کے پیشواؤں کے طبقے کا باہمی اختلاف تھا۔ یہاں تک کہ خود ان کے کلامیوں کے خاندان میں بھی نفاق پایا جاتا تھا۔

سب سے پہلا قابل ذکر اختلاف جس کی اہمیت فقط مقامی تھی حاکمیہ یعنی دروز کا تھا۔ ان کے مذہب کا آغاز مصر کے فاطمی خلیفہ منصور بن نزار الحاکم بامر اللہ (۳۸۶ تا ۴۱۱ھ) کے عہد خلافت کے آخری برسوں میں ہوا۔ الحاکم اسماعیلی مذہب کے پیروکاروں کا مسلمہ امام اور سردار تھا۔ وہ اپنی ذاتی زندگی اور مذہبی حکمت عملی دونوں میں ایک متلون مزاج فرمانروا ثابت ہوا۔ اپنے آخری سالوں میں اس کی یہ خواہش تھی کہ اسے ایک لاہوتی شخصیت تسلیم کیا جائے۔ جس کا مرتبہ ان سب مرتبوں سے بلند تر ہے جو کہ اسمٰعیلیت اسے دے سکتی ہے۔ اسماعیلیوں کی خاصی تعداد فی الحقیقت اسے ایسا ہی سمجھتی تھی اور بظاہر اس کی خفیہ رضامندی سے یہ لوگ اس کے مریدوں کی ایک خاص جماعت کی تشکیل میں مصروف ہو گئے۔ ان لوگوں میں سے پہلا شخص جس پر عوام کی نظر پڑی محمد بن اسماعیل درازی تھا۔ یہ بھی دیگر اسماعیلی قائدین کی طرح عجمی النسل تھا۔ اس لئے یہ فرقہ محمد بن اسماعیل درازی کی نسبت سے درازی کہلایا جو رفتہ رفتہ "دروزی" ہو گیا۔

درازی نے اس وقت کے امام الحاکم کو ایک مافوق الطبیعی وجود دے دیا۔ یعنی عقل کل کا اوتار جو نظام کونیہ میں سب سے بلند عقل ہے۔ لیکن ۴۰۸ھ میں اس کی عوامی سرگرمیوں سے فسادات برپا ہونے لگے جس کی وجہ سے الحاکم زیادہ محتاط رہنے پر مجبور ہو گیا۔ ۴۱۰ھ میں الحاکم نے ایک دوسرے قائد حمزہ بن علی کو جو ایران کے مقام "سوزن" کا رہنے والا تھا اس نئی تحریک کی نشرو

اشاعت پر مامور کیا جس نے الحاکم کے مذہب کی دروزی شکل مکمل طور پر متعین کی۔

حمزہ نے اپنی تبلیغ ۴۰۸ھ میں شروع کر دی تھی۔ جو دروزی سن کا پہلا سال شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا دوسرا سال ۴۱۰ھ ہے جبکہ عام تبلیغ از سر نو شروع کی گئی اس نے دعویٰ کیا کہ وہ شروع ہی سے الحاکم کا مقرر کردہ اور مجاز واحد خطیب (نائب اسلام) ہے۔

۴۱۰ھ میں محمد بن اسماعیل الدرزی کی وفات کے بعد اس نے کوشش کی کہ ساری تحریک کو اپنے ہی دائرہ اقتدار میں لے آئے۔ حمزہ کے نزدیک حاکم اب محض امام نہ تھا خواہ امام کے مفہوم کو کتنا ہی ارفع سمجھا جائے بلکہ وہ خالق اکبر کا اوتار تھا۔ دروزیوں کا عقیدہ ہے کہ خدا کروڑوں برس کے بعد الحاکم کی شکل میں ظاہر ہوا رعیت سے ناراض ہو کر غائب ہو گیا ہے اور آسمانوں پر چلا گیا ہے اور پھر دوبارہ لوگوں کے درمیان آئے گا۔

۴۱۱ھ میں الحاکم کے غائب ہونے کے بعد حمزہ نے اعلان کیا کہ اس کا غائب ہونا اس غرض سے ہے کہ اپنے پیروکاروں کی آزمائش کرے اور وہ بہت جلد واپس آ کر اپنی پوری قوت کا اظہار کرے گا اور فتح کی تلوار خود حمزہ کے ہاتھ میں دیدیگا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد حمزہ بھی یہ کہہ کر غائب ہو گیا کہ وہ الحاکم کے ساتھ ہی واپس آئے گا۔ اس کے بعد دروزی مذہب اس دور میں داخل ہو گیا جو اثنا عشریوں کے اس دور سے ملتا جلتا ہے جسے "غیبۃ الصغریٰ" کہتے ہیں۔ اس زمانے میں صرف بہاء الدین المقتنیٰ رہ گیا جو غائب حمزہ اور اس کے وفادار پیرووں کے درمیان واسطہ کا کام دیتا تھا۔ لیکن ۴۲۵ھ کے کچھ عرصہ بعد خود بھی اپنے وفادار مریدوں سے اسی طرح کنارہ کش ہو گیا جیسے حمزہ ہوا تھا۔ مگر پھر بھی ۴۳۴ھ کی طویل مدت تک وہ ہر طرف خطوط ارسال کرتا رہا۔ المقتنیٰ کے ہمت ہار دینے کے باوجود یہ تحریک جس حالت میں بھی آئندہ زندہ رہی اس کی بنیاد اسی کی کارگذاری تھی۔ اس نے ایک سو گیارہ (۱۱۱) خطوط (جو الحاکم، حمزہ، اسمٰعیل التمیمی اور خود اس کے تحریر کردہ تھے) کا مجموعہ تالیف کیا جو دروزیوں کی مقدس کتاب تسلیم کی گئی ہے اور "رسائل الحکمۃ" کے نام سے موسوم ہے۔

المقتنیٰ کی کنارہ کشی کے وقت سے شامی دروز میں حمزہ اور الحاکم کی آمد کے انتظار کا دور شروع ہوا جو اب تک قائم ہے اور جو اثنا عشریہ کی "الغیبۃ الکبریٰ" سے مطابقت رکھتا ہے۔ المقتنیٰ کی گوشہ نشینی کے بعد مزید تبلیغ کا سلسلہ بند ہو گیا اور اس بات کی تعلیم دی جانے لگی کہ اس

وقت سے کسی نئے آدمی کو "وحدانیت کی حقانیت" میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے اس کے بعد دروز ایک "دربند" فرقہ ہو گیا جس کے افراد اپنے قواعد و ضوابط کو صیغہ راز میں رکھتے تھے اس خود مختار جماعتی اور محدود زندگی کی طویل مدت کے دوران ایک نیا مذہبی طریق عمل پیدا ہو گیا جس کے متعلق اغلب گمان یہ ہے کہ دروزی معلم اخلاق عبداللہ التنوخی (م ۸۸۵ھ) کے زمانے میں متعارف ہو چکا تھا۔ اس نئے طریقے کی رو سے دروز دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔

۱۔ عُقال: جن کو مذہب کے حقائق سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔

۲۔ جُہال: جو جماعت میں شامل تھے لیکن حقائق مذہب سے متعارف نہ کئے گئے تھے

ہر شب جمعہ کو انتہائی سادہ معبدوں (عبادت گاہوں) میں منعقد ہونے والی مجلسوں میں سے بعض مجالس میں سارے عُقال کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن جُہال کو ان میں سے صرف ان مجلسوں کے اندر آنے کی اجازت ہے جن میں راز کی باتوں پر کم از کم بحث ہوتی ہے اور جہاں صرف اخلاقی مواعظ قدیم عربی زبان میں لکھے ہوئے پڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔

پراسرار دینی کتابوں کو پڑھنے کی صرف عُقال کو اجازت ہے اور صرف وہی خفیہ مذہبی رسموں میں حصہ بھی لے سکتے ہیں۔

حمزہ اور المقتنیٰ نے اسلام کے ارکان خمسہ کی جگہ سات احکام مقرر کئے ہیں یہی سات احکام ہیں جو عُقال کی اخلاقی تربیت کے اصول بن گئے ہیں اور کسی حد تک باقی دروز کے لئے بھی یہی احکام سبعہ اصول تربیت مانے جاتے ہیں۔

۱۔ جماعت کے افراد آپس میں ہمیشہ سچ بولیں لیکن اپنے بچاؤ یا اپنے مذہب کی خاطر منکرین عقیدہ سے جھوٹ بولنا جائز ہے۔

۲۔ ایک دوسرے کا بچاؤ اور ایک دوسرے کی مدد کریں۔

۳۔ تمام ادیان سابقہ کو ترک کر دیں۔

۴۔ منکروں سے کوئی میل جول نہ رکھیں۔

۵۔ اپنے "مولانا" (مولانا الحاکم کا بحیثیت الواحد عام لقب ہے) کی یکتائی کو ہر زمانے میں تسلیم کریں۔

۶۔ جو کچھ وہ کرے اس پر قانع رہیں۔ اس کے تمام احکام پر رضا و رغبت سے عمل کریں۔

عام طور پر جہاں کے عقائد کو عقال کی ہدایات کے تحت رکھا گیا ہے۔ لیکن اس پر مذہبی "تقیے" کے قاعدے کا بہت بڑا اثر پڑا ہے یعنی اپنے مذہب کو صیغہ راز میں رکھنے کے لئے ایک دروزی ظاہری طور پر ان لوگوں کا مذہب اختیار کر سکتا ہے جو اس وقت صاحب اقتدار ہوں۔

(دروز سے متعلق بیشتر حصہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۹ صفحہ ۷-۲۶۴ سے ماخوذ ہے)

دروزیہ کے متعلق امام شمس الدین ذہبی لکھتے ہیں کہ!

معلوم ہوا کہ ساحل شام پر الجرد و کسروان نام کے پہاڑ تھے۔ جن میں ہزاروں روافض (دروز) رہتے ہیں اور لوگوں کا خون بہاتے اور انہیں لوٹتے ہیں۔ جب ۶۹۹ھ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو ان کے ساز و سامان پر قبضہ کر لیا اور انہیں کافروں اور قبرص کے نصاریٰ کے ہاتھ بیچ دیا۔ وہ گذرنے والے مسلمان سپاہیوں کو بھی پکڑ لیتے تھے اور اس طرح وہ مسلمانوں کے لئے ان تمام دشمنوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوئے اور ان کے بعض امراء نے نصاریٰ کا علم بلند کیا یہ پوچھے جانے پر کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں کون بہتر ہے؟ کہا کہ نصاریٰ بہتر ہیں۔ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ قیامت میں کس کے ساتھ حشر پسند کرو گے تو کہا کہ نصاریٰ کے ساتھ ان لوگوں نے کئی شہروں کو نصاریٰ کے حوالے بھی کیا۔ (بحوالہ اسماعیلیہ اور عقیدہ امامت کا تعارف۔ تاریخی نقطہ نظر سے صفحہ ۱۸)

نزاریہ

فاطمیوں (عبیدیوں) میں دروزیوں کے بعد دوسرا بڑا شدید اختلاف ان کے امام ابو تمیم معد بن الظاہر المستنصر باللہ (۱۸ ذوالحجہ ۴۸۷ھ) کی وفات کے وقت ہوا جو ایک بڑی مصیبت ثابت ہوا۔

المستنصر کی وفات پر اس کا بڑا بیٹا نزار تخت سلطنت سے محروم کر دیا گیا اور اس کی جگہ اس کے بھائی ابو القاسم احمد بن المستنصر۔ المستعلی باللہ نے سپہ سالار اعلیٰ کی مدد سے اس پر قبضہ کر لیا مصر کے اسماعیلی حلقوں نے اس واقعے پر کوئی توجہ نہ دی اور نزار کو ضرورت کے مطابق طرفدار اور حمایتی نہ مل سکے تو وہ مستعلی کے تخت نشین ہونے کے تین روز بعد قاہرہ سے روانہ ہو کر اسکندریہ چلا گیا جہاں نصیر الدولہ افتگین عامل و حکمران تھا۔ وہ ابو القاسم مستعلی کی تخت نشینی کا حامی بن کر باغی ہو گیا اور نزار کو مستحق خلافت سمجھ کر نہ صرف اس کا مؤید بن گیا بلکہ اس نے اسکندریہ میں نزار کو تخت نشین کر کے اس کی بیعت بھی کر لی اور اس کا لقب "مصطفیٰ لدین اللہ"

مقرر کیا۔ اس نئی صورت حال کی اطلاع جب قاہرہ پہنچی تو وزیر السلطنت محمد ملک فوج لیکر نزار کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا اور اسکندریہ کا محاصرہ کر لیا۔ شدت محاصرہ سے تنگ آ کر محصورین نے اس کی درخواست کی اور اسکندریہ محمد ملک کے سپرد کر دیا۔ اس نے نزار کو گرفتار کر کے قاہرہ بھیج دیا جہاں وہ اپنے بھائی مستعلی کے حکم سے قید خانے میں اپنے بیٹے سمیت قتل کر دیا گیا۔ اس خبر کے مشہور ہوتے ہی شام اور سارے مشرق میں مستعلی کے خلاف سخت نفرت اور بے چینی پھیل گئی اور ان لوگوں نے اپنا تعلق نفس اولین (نزار) کے ساتھ قائم رکھا۔ جس سے ایک نئے اسماعیلی فرقے "نزاریہ" کی بنیاد پڑ گئی جسے حسن بن صباح کی قیادت نے بام عروج تک پہنچا دیا۔ اس طرح نزاریوں کا مرکز ایران قلعہ الموت میں منتقل ہو گیا۔

قلعہ الموت اور حسن بن صباح

تہران سے قزوین جانے والی سڑک کے دائیں جانب اور قزوین کے شمال مشرق میں دو روز کی مسافت پر واقع ہے اس کو "شکرے کا گھونسلہ" بھی کہتے ہیں۔ ابن اثیر کا قول ہے۔ اس مقام کا سراغ ایک عقاب کے ذریعے سے کسی دیلمی بادشاہ کو ملا تھا۔ جس نے وہاں ایک قلعہ تعمیر کرایا چنانچہ الموت "لہ" عقاب اور "اموت" سکھانا سے مرکب ہے۔ اس قلعہ کو ۲۴۶ھ میں طبرستانی اسماعیلیوں کے قائد الحسن العلوی "الداعی الی الحق" نے دوبارہ تعمیر کرایا۔ جس پر حسن بن صباح نے ۴۸۳ھ میں قبضہ کر کے اسے اپنی جماعت کا مرکز مقرر کر لیا اور ایک سو اکہتر (۱۷۱) یعنی (۴۸۳ھ تا ۶۵۴ھ) سال تک یہ اسماعیلی نزاریوں کا مذہبی، علمی اور سیاسی مرکز رہا۔ اس میں ایسے علاقے شامل تھے۔ جن کا سلسلہ بلا کسی ترتیب کے شام سے مشرقی ایران تک پھیلا ہوا تھا اور نزاری اسمٰعیلی فرقے کا سر گروہ ان پر حکمران تھا۔ اس فرقے کو حشیشین اور فدائین بھی کہتے ہیں۔ یہ سلطنت ایرانی اسماعیلیوں کی ان مساعی سے ظہور میں آئی جو انہوں نے مصر کے فاطمی حکمرانوں کی امداد کی خاطر سلاجقہ کا اقتدار توڑنے کے لئے کی تھیں۔ ان کی بغاوت کا آغاز ملک شاہ کے آخری عہد میں ہوا۔ برکیارق کے پر آشوب زمانے میں یہ بغاوت زیادہ پھیل گئی۔ اسماعیلیوں نے قہستان، قومس، فارس، الجزیرہ، شام اور دوسرے مقامات کے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ ان کی فوجیں مختلف خانہ جنگیوں میں بھی دخل دینے لگیں۔ دوسری طرف عبیدی خلیفہ المستنصر کی وفات (۴۸۷ھ) کے بعد اس کی اولاد میں خلافت کے حصول کے لئے جھگڑا شروع ہوا

جس میں نزار کو قتل کر دیا گیا اور مصر کی خلافت اس کے دوسرے بھائی المستعلی کے ہاتھ میں آ گئی۔
حسن بن صباح نزار کا حامی تھا اس لئے ایرانی اسماعیلیوں نے المستعلی کی امامت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور نزاریہ کے نام سے سے مصر سے الگ اپنی بغاوت جاری رکھی۔ حسن بن صباح نے ۴۸۳ھ سے ہی قلعہ الموت پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اب وہ حقیقۃً ایک آزاد اسماعیلی نزاری مملکت کا سربراہ بن چکا تھا۔ جس میں الموت کے نواحی علاقہ رودبار کے قلعے، قلعہ گردکوہ (جو قومس میں دامغان کے قریب واقع ہے) اور خراسان کے جنوب میں قہستان کے بہت سے شہر شامل تھے۔ اس کے علاوہ وہ اکثر اسماعیلیوں کا جو سلاجقہ کے زیر حکومت ایران اور "ہلال اخضر" (عرب و شام کے درمیان کا زرخیز علاقہ) میں مقیم تھے۔ بلکہ چند ایک مصری نزاریوں کا بھی پیشوا تھا۔ اس تھوڑے سے علاقے کے اضافے کے علاوہ جو بعد میں ملک شام کے ایک حصے پر قبضہ ہو جانے سے حاصل ہوا اس کی مملکت کی حدیں آخر تک تقریباً پوری کی پوری وہی رہیں جو پہلے دن سے تھیں۔ حسن بن صباح ۵۱۸ھ میں فوت ہو گیا اور وہ جماعت کی قیادت کے لئے اپنے ایک امیر عسکر اور شاگرد "کیا بزرگ امید" کو مقرر کر گیا۔

"کیا بزرگ امید" کے خاندان میں یہ حکومت ۶۵۵ھ تک قائم رہی۔ بزرگ امید کا بیٹا محمد ۵۳۲ھ میں اس کا جانشین ہوا۔ ان دونوں کے دور حکومت میں کبھی تو سلجوقی حکمرانوں (خاص طور پر سنجر اور محمود) کی مدافعت ہوتی اور کبھی خود اسماعیلی اپنے کوہستانی دشمنوں یا قرب و جوار کے شہروں مثلاً قزوین پر حملے کرتے رہتے۔ اسماعیلیوں کی دھاک بٹھانے میں ان کے ہاتھ سے دو عباسی خلیفوں المسترشد اور الراشد کا قتل نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔

اس اثنا میں حلب اور دمشق کی سیاسیات میں بڑا ہلاکت خیز کردار انجام دینے کے بعد شام کے اسماعیلیوں نے لبنان کے شمال میں جبل بہرئی کے ایک حصے کے قلعوں کو مسخر کر کے انہیں اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ محمد بن کیا بزرگ کے بیٹے حسن ثانی نے جو ۵۵۷ھ میں مسند نشین ہوا صرف داعی ہونے پر قناعت نہ کی بلکہ ۵۵۹ھ میں امام غائب کا خلیفہ ہونے کا اعلان بھی کر دیا۔ غالباً اس میں یہ بھی مضمر تھا کہ وہ خود ہی امام غائب ہے۔ یوم نشور یعنی دنیا کی روحانی تکمیل کا اعلان کر کے اس نے شیعہ قانون شریعت کو منسوخ قرار دیا کیونکہ وہ بہشت کی اس باطنی زندگی کے منافی تھا جس کی طرف اس وقت اسماعیلیوں کو دعوت دی جانے لگی تھی اس طرح اس

نے اسماعیلی فرقہ کو باقی امت مسلمہ سے کاملاً الگ کر دیا۔ بعض افراد نے اس نئے دستور کی مخالفت کی اور ۵۶۱ھ میں حسن قتل کر دیا گیا۔ لیکن اس کے نو عمر بیٹے محمد ثانی نے بڑی مضبوطی سے زمام اقتدار سنبھالی اور باپ کی حکمت عملی پر کاربند رہا۔ اس کے بعد سے "الموت" کے حکمران کو علوی امام مانا جانے لگا جو نسب نزار کی اولاد میں سے تھے۔ لیکن خارجی تعلقات بہت کچھ ویسے ہی رہے جیسے پہلے تھے۔ محمد ثانی کا عہد حکومت طویل تھا۔ اس کے عہد حکومت میں شامی اسماعیلیوں پر رشید الدین سنان کا تسلط رہا۔

محمد ثانی بن حسن کے بعد جلال الدین محمد ثانی ملقب حسن ثالث ۶۰۷ھ میں جانشین ہوا اس کے بعد علاؤ الدین محمد ثالث پھر رکن الدین خورشاہ بن علاؤ الدین حکمران ہوا۔ یہ فدائیوں نزاریوں کا آخری بادشاہ تھا۔ جس نے ۶۵۴ھ میں ہلاکو خان کے سامنے بلا شرط ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کے بعد جلد ہی اس کا کام تمام کر دیا گیا اور دیلمان، قومس اور قہستان کے اسماعیلیوں کا قتل عام ہوا جو لوگ زندہ بچ گئے انہیں پھر کبھی مکمل حکومت نصیب نہ ہوئی۔ مغول کے حملے سے صرف شامی قلعے محفوظ رہے لیکن انہیں مصر کے بادشاہ بیبرس نے فتح کر لیا تاہم اسماعیلیوں کو ایک خود مختار جماعت کے طور پر باقی رہنے دیا گیا۔

حسن بن صباح نے فدائین اور حشیشین کے نام سے جو جماعت تیار کی تھی وہ گویا ملحدوں کا ایک گروہ تھا۔ جنہیں اسلام کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ یہ ملحد، بے دین، بدچلن، اوباش اور بھنگیوں کی ایک جماعت تھی۔ ان کی کامیابیوں کا راز صرف اس بات میں مضمر تھا کہ وہ چھپ کر بڑے آدمیوں کو قتل کر دیتے تھے۔ حسن بن صباح نے اپنے ایسے فدائیوں سے اس دور کی بڑی بڑی عظیم الشان شخصیات کو قتل کرایا۔ اکبر شاہ خان نجیب آبادی لکھتے ہیں کہ!

"ان ملحدوں فدائیوں کے ہاتھ سے جو لوگ قتل ہوئے ان میں خواجہ نظام الملک طوسی وزیر اعظم سلطان الپ ارسلان و ملک شاہ سلجوقی، فخر الملک بن خواجہ نظام الملک۔ جناب شمس تبریزی پیر طریقت مولوی رومی، نظام الملک مسعود بن علی وزیر خوارزم شاہ، سلطان شہاب الدین غوری، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی اور حضرت امام فخر الدین رازی کو بھی ملاحدہ نے قتل کی دھمکی دی تھی مگر وہ بچ گئے" {تاریخ اسلام جلد ۳ صفحہ ۲۲۵}

شام کے ممتاز عالم شیخ عبدالرحمٰن المیدانی لکھتے ہیں کہ!

۴۹۴ھ میں قرامطہ نے پھر زور پکڑا ان کے سرغنہ احمد بن عبدالملک عطاش (نزاری داعی) کا مرکز قلعہ اصفہان (قلعہ شاہ دُر) تھا اور حسن بن صباح کا الموت جس کے فدائیوں نے نظام الملک کو قتل کیا۔ ۴۹۸ھ میں خراسان و ہندوستان کے قافلہ حجاج کو رَے کے پاس باطنیوں نے قتل کیا۔ بالآخر ۵۱۸ھ میں حسن بن صباح مر گیا۔ ۵۲۰ھ میں وہ پھر سرگرم ہوئے۔ (نزاری داعی) بہرام بن موسیٰ نے شام کو مرکز بنایا اور صلیبی حملوں سے فائدہ اٹھایا اور قلعہ بانیاس پر قابض ہو کر مسلمانوں کو ستانے لگے۔ ۶۲۳ھ میں اسماعیل باطنی نزاری نے پھر خراسانی حجاج کا قتل عام کیا۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ بلاد اسلامیہ کا کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں شرفاء و حجاج کے اس قتل پر احتجاج و افسوس نہ ہوا ہو۔ ۵۷۱ھ میں صلاح الدین ایوبی قلعہ اعزاز (نزد حلب) کے محاصرہ کے دوران طائفہ اسدیہ کے امیر جاولی کے خیمہ میں گیا جہاں ایک باطنی نے اس کے سر پر حملہ کیا مگر وہ مغفر کے سبب محفوظ رہا اور صحیح و سلامت نکل آیا۔ (حوالہ ماہنامہ الحق صفحہ ۳۶ مئی ۱۹۸۵ء)

بہر حال ایران (قلعہ الموت) میں نزاری اقتدار جو حسن بن صباح کی زیر قیادت ۴۸۳ھ میں قائم ہوا تھا۔ بالآخر ۶۵۶ھ میں تاتاریوں کے ہاتھوں ختم ہو گیا مگر اس کے بعد یہ لوگ زیر زمین اپنی دعوت میں مصروف ہو گئے۔ ان میں سے اکثر نے درویشوں اور پیروں کا روپ دھار لیا تھا۔

ساتویں صدی ہجری میں نزاری امام شمس الدین محمد کے زمانہ کابت میں نزاریوں میں اختلاف پیدا ہو گیا اور وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ کچھ نزاریوں نے امام شمس الدین کے بیٹے قاسم شاہ کو امام تسلیم کیا اور باقی نزاریوں نے قاسم شاہ کے بھائی مومن شاہ کی اولاد میں محمد شاہ کو امام مانا۔ پہلا گروہ "قاسم شاہی" اور دوسرا گروہ "محمد شاہی" کہلایا۔

نزاری امامت (قاسم شاہی) کا سلسلہ ایران میں جاری رہا ان کی دعوت کے مراکز آذربائیجان پابک، کہک، انجدان، کرمان، یزد اور محلات رہے۔ نزاریوں نے اپنے دور حکومت میں لوگوں کو اسمٰعیلی مذہب کی طرف راغب کرنے کے لئے اپنے داعی اور پیر مختلف اطراف میں بھیجے۔ برصغیر میں ان داعیوں کی کوشش سے بچے کھچے قرامطہ اور کچھ دیگر افراد نے نزاری دعوت کو قبول کر لیا۔ ان داعیوں میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

۱۔ **نور الدین یا نور شاہ**

برصغیر میں نزاری داعیوں کا سلسلہ نورالدین یا نور شاہ سے شروع ہوتا ہے۔ جو بارھویں

یا تیرہویں صدی عیسوی میں گزرا ہے۔انہیں قلعہ الموت سے بارہویں صدی عیسوی میں بھیجا گیا تھا۔ ان کی دعوت کا علاقہ گجرات اور نوساری تھا۔ انہوں نے اپنا نام ہندوانہ رکھا اور بہت سے افراد کو جن کا تعلق نیچ ذاتوں سے تھا اسمٰعیلی مذہب میں شامل کیا یہ "نورست گر" کہلائے جاتے تھے انہوں نے ۶۲۳ھ میں سلطانہ رضیہ کی حکومت کو غیر مستحکم دیکھ کر اسمٰعیلی جھنڈا لہرانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی طریقہ تبلیغ سے ہٹ کر ہندو شعار اپنانے میں پہل کی کیونکہ انہیں یہی ہدایت دی گئی تھی کہ جس ملک و ملت میں بھی رہو اسی کا شعار اختیار کرو چنانچہ تمام اسماعیلی نزاری پیروں میں یہ بات مشترک ہے کہ ان کی فکر و نظر پر ہندومت کا غلبہ ہے اسی وجہ سے انہوں نے ہندومت کے بعض عقائد کو صحیح تسلیم کیا یہاں تک کہ اپنے اور اپنی دعوت کے ارکان کے نام بھی ہندوانہ رکھے انہوں نے مقامی تہذیب و تمدن کی برتری تسلیم کرنے میں تامل نہیں کیا۔

شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب "آب کوثر" اور ڈاکٹر زاہد علی نے "تاریخ فاطمین مصر حصہ دوم" میں نور الدین یا نورست گروہ کا ذکر کیا ہے

۲۔ صید شمس الدین (۶۳۲ھ-۷۵۷ھ/۱۲۳۱-۱۳۵۶ء)

ان کو نزاری سلسلے کے امام قاسم شاہ (۷۱۰-۷۷۱ھ) نے پیر کا لقب دے کر ایران سے باہر تبلیغ کرنے کی ہدایت کی اس وجہ سے یہ پیر شمس کہلائے۔انہوں نے کشمیر و پنجاب کے علاقہ میں اسماعیلی مذہب کی دعوت دی۔ان کی پیدائش سبزوار میں ہوئی تھی۔اس لئے شمس سبزواری کہلاتے ہیں۔ان کے بزرگ قاہرہ سے سبزوار آئے تھے چنانچہ ڈاکٹر جے این ہالسٹر لکھتے ہیں کہ!

اسماعیلی سیدوں کا ایک قافلہ قاہرہ سے چل کر سبزوار آیا۔پیر شمس الدین سبزواری یہیں سے ملتان آیا تھا۔اس نے صوفیوں کے لباس میں اسمٰعیلیت کی تبلیغ کی بعض لوگوں نے شمس الدین سبزواری کو غلطی سے شمس تبریز سمجھ لیا ہے جو جلال الدین کا مرشد تھا۔ (شیعان ہند صفحہ ۲۵۳)

شمس الدین سبزواری کا مزار ملتان میں ہے۔انہوں نے بہت سے "گنان" لکھے گنان سن سکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی روحانی علم کے ہیں۔یہ منظوم کلام تیرھویں اور چودھویں صدی کی مروج زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔یہ کلام دین کی تعلیم دیتے ہیں۔جن میں خاص طور پر ذکر، فکر، عبادت، مرشد کامل، اہل بیت، امام کی شناخت وغیرہ کے موضوعات پائے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ مروج ہندو وشنو پنتھ کے عقائد اور مذہبی بیان اور واقعات کو

اسلامی تعلیمات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ پیر شمس نے متعدد گنان لکھے ہیں۔ جن کے نام نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ ان کی فکر و نظر کے آئینہ دار بھی ہیں مثلاً "سن سمجھانی، گربی گنان، چندر بان، برہم پرکاش، وغیرہ وغیرہ۔ پیر شمس نے ایک چھوٹا دس اوتار بھی لکھا ان گنانوں سے متعلق شیخ دیدار علی لکھتے ہیں کہ!

"پیر کا کلام زیادہ تر صوفیانہ ہے۔ جس میں دین کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دعوت کے نادر نمونے بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ہندو مت کو اسلامی رنگ میں پیش کیا ہے"

(تاریخ ائمہ اسماعیلیہ جلد ۲ صفحہ ۳۰)

پیر شمس الدین جو اسماعیلیہ نزاریہ فرقے کا داعی تھا ۱۳۹۶ھ میں کشمیر آیا اور تقیہ کر کے اپنے آپ کو یہاں کے باشندوں کے رنگ میں رنگین کر لیا۔ چنانچہ ایک دن ہندو مہرے کی خوشی میں گربا رقص کر رہے تھے۔ پیر صاحب بھی اس رقص میں شریک ہو گئے اور اٹھائیس (۲۸) گربا گیت تصنیف فرمائے۔ رفتہ رفتہ ہندو ان سے مانوس ہو گئے اور انہوں نے بہت سے ہندوؤں کو امام شاہ حضرت قاسم شاہ نزاری کا پیرو بنا دیا۔ کشمیر سے پیر شمس الدین اوچ میں آیا کہا جاتا ہے کہ یہاں اس نے ایک امیر آدمی کے مردہ بیٹے کو زندہ کر دیا جس کی وجہ سے اسے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ اس نے پیری مریدی کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس کے مرید شمسی کہلاتے ہیں۔ اس نے ۷۵۷ھ ۱۳۵۶ء میں وفات پائی۔ (وجہان منہ صفحہ ۲۵۵ بحوالہ اسلامی تصوف صفحہ ۴۳ از یوسف سلیم چشتی صفحہ ۳۴)

پیر و داعی سید صدر الدین

آپ کا اصل نام محمد تھا اور لقب بادگر، سوہو یہاجی صدر شاہ اور صدر الدین تھے۔ ہندو انہیں "مچھر ناتھ" کہتے تھے۔ "المولتی" امام اسلام شاہ نے آپ کو پیر کا لقب دے کر ہندوستان روانہ کیا۔ یہ پندرہویں صدی میلادی میں اسماعیلی عقائد کی تبلیغ کے لئے خراسان سے آئے انہوں اپنے عقائد ہندوؤں کے سامنے ایسی شکل میں پیش کئے جو ان کی ہندوانہ روایات سے مناسبت رکھتے تھے۔ جس میں وشنو کے اوتاروں کا سلسلہ اسلام سے اس طرح ملایا گیا ہے کہ پہلے نو اوتار تو ہندو تھے اور دسویں اوتار (جن کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ اس کا ظہور کسی آئندہ زمانے میں ہوگا) اسماعیلیوں کے امام غائب ہیں۔ پنجابی خوجے، برصغیر میں آغا خان کے پیرو نیز مشرقی افریقہ کے اسماعیلی آج تک دس اوتار اور صدر الدین کی مناجات دونوں کتابیں استعمال کرتے ہیں۔

صدرالدین نے بھی بہت سے گنان لکھے جن کے نام یہ ہیں!

آرادبوجھ، نرنجن، دتو، اتھرو، بدبادن گھائی، دعا گٹ پاٹ، کھٹ درشن، کھٹ نرنجن، وغیرہ ان کے گنانوں کی تعداد دو سو پچاس بتائی جاتی ہے۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ!

انہوں نے ہندو مذہب کے بعض عقائد کو صحیح تسلیم کیا تا کہ اسماعیلیہ مذہب کی اشاعت میں آسانی ہو انہوں نے ایک کتاب دس اوتار کے نام سے لکھی یا رائج کی جس میں رسول اکرم ﷺ کو برہما، حضرت علی کو وشنو اور حضرت آدم کو شیو سے تعبیر کیا ہے۔ یہ کتاب خوجہ قوم کی مقدس کتاب سمجھی جاتی ہے اور مذہبی تقریبوں پر اور نزع کے وقت مریض کے بستر کے قریب پڑھی جاتی ہے۔ اس کتاب کی تصنیف میں پیر صدرالدین نے ایک برہمن عالم سے مدد لی۔ (آب کوثر صفحہ ۳۳۶)

ڈاکٹر سجاین ہالسٹر لکھتے ہیں کہ!

پیر صدرالدین اسماعیلی نزاری فرقے کا داعی بھی پیروں کے لباس میں ہندوستان آیا تھا: اس نے ۱۴۳۰ء میں تبلیغ کا آغاز کیا اور قرامطہ کے اصول تبلیغ کے مطابق اس نے اپنا ہندوستانی نام سعد یو رکھا اور پنجاب کے لوہانہ راجپوتوں کو اپنے مذہب میں داخل کیا۔ اس نے کہا کہ وشنو کا دسواں اوتار حضرت علیؑ کی صورت میں ظاہر ہو چکا ہے۔ اس کے پیر و صوفیوں کی زبان میں محمد ﷺ اور علیؑ کی تعریف میں بھجن گایا کرتے تھے۔ اس نے اپنے مریدوں کے لئے دشم اوتار نامی کتاب لکھی جو آج بھی اسماعیلی نزاری خوجوں کی نہایت مقدس مذہبی کتاب ہے۔ پیر صدرالدین نے اوچ میں وفات پائی اس کے مزار پر ہر سال عرس منعقد ہوتا ہے۔ جو ترنڈا گورتج میں واقع ہے۔ یہ قصبہ اوچ سے ۱۵ میل کے فاصلے پر ریاست بہاولپور میں واقع ہے۔ (شیعان ہند صفحہ ۳۵۷)

۴۔ **پیر کبیر الدین (۱۳۳۱-۱۴۴۹ء/۷۳۲-۸۵۳ھ)**

کبیر الدین پیر صدر الدین کے بیٹے تھے ان کو بھی "المولی" امام اسلام شاہ (۱۳۷۰-۱۴۲۳ء/۷۷۱-۸۲۷ھ) نے پیر کا لقب دیا اور ہندوستان میں دعوت کے کام کی نگرانی پر مامور کیا۔ پیر کبیر الدین نے بھی متعدد گنان لکھے ان کے نام ملاحظہ کیجئے۔ اننت اکھاڑو، براہم گاؤ نسری، اننت کے نوچھگے، اننت کا دیوا، جنگر نور کا دیوا وغیرہ وغیرہ۔

۵۔ **سید امام شاہ (۱۴۳۰-۱۵۱۲ء/۸۳۴-۹۱۸ھ)**

یہ پیر کبیر الدین کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ انہوں نے بھی متعدد گنان لکھے۔

جن کے حسب دستور عجیب عجیب نام ہیں۔ مثلاً گھوکھری گنان، بھائی بڈلی گنان، مول گاتیری، جنکار وغیرہ۔ ان میں ہندومت کا زیادہ ذکر ملتا ہے۔ امام شاہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے سید نرمحمد شاہ نے جن کو نور محمد شاہ بھی کہتے ہیں اپنا تعلق "المولی" امام سے توڑ لیا اور ایک ست پنتھی یا امام شاہی فرقہ وجود میں آیا جو اسمٰعیلی خوجوں کی نسبت کبیر پنتھی اور نانک پنتھی طریقوں سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔ ان کی جماعت ایک شخص کے ہاتھ میں ہے۔ جو "کاکا" کہلاتا ہے۔ جو عرصہ سے ہندو ہوتا ہے۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ باطنی طور پر مسلمان ہے۔ ان میں کچھ ظاہری طور پر ہندو ہوتے ہیں۔ جن کو "گپتی" (پوشیدہ) کہا جاتا ہے اور جو ظاہر طور پر مسلمان ہوتے ہیں ان کو "مومنہ" کہا جاتا ہے۔ یہ زیادہ تر گجرات (ہندوستان) میں ہیں نزاریوں کے دوسرے سلسلے یعنی آغاخانی جماعت کے سلسلہ امامت کے پابند ہیں۔ (آب کوثر مولفہ شیخ محمد اکرام صفحہ ۲۷۵)

(مذکورۃ الصدر) ان نزاری داعیوں / پیروں کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ تقیہ بھی اپنے آپ کو سنی ظاہر کرتے۔ کبھی شیعہ اور کبھی کسی صوفی سلسلہ سے وابستگی ظاہر کرتے تھے۔ کبھی ہندو مندروں میں پوجا پاٹ کرتے تھے۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ!

"اسلامی حکومت کے دوران نزاری عام مسلمانوں کے ساتھ گھلے ملے ہوئے تھے۔ ان کی تجہیز و تکفین اور بیاہ شادی کی رسمیں سنی علماء ادا کرتے (اگر چہ وہ اپنے دیوانی جھگڑے اپنی پنچائیت سے طے کراتے) مغربی پنجاب میں کئی اسماعیلی سنی پیروں کے مرید تھے۔ (یا وہ تقیہ سنی بنے ہوئے تھے) بلکہ پیر صدر الدین کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ "سنی" مسلمان تھے۔ لیکن جب انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں آغا خان ہندوستان آگئے تو جماعت کو زیادہ منظم اور جداگانہ طریقے پر ترتیب دیا گیا۔ ایک تو وہ لوگ جو خوجوں سے باہر ہیں (مثلاً پنجاب کے شمسی اور گجرات کے ست پنتھی) انہیں بھی آغا خان کی قیادت میں منسلک کرنے کی کوشش کی گئی اور ہو رہی ہے اور دوسرے آغا خان اول نے حکم دیا کہ ان کے پیرو بیاہ شادی تجہیز و تکفین اور وضو طہارت میں اپنی جماعت کی پیروی کریں۔ بعض لوگوں نے اس کی مخالفت کی بلکہ بمبئی ہائی کورٹ میں اس مسئلے پر ۱۸۶۲ء میں ایک اہم مقدمہ لڑا گیا جس میں ان لوگوں کی طرف سے کہا گیا کہ پیر صدر الدین سنی تھے اور شروع سے ان کے پیرو بیاہ شادی وغیرہ میں سنی علماء کو بلاتے رہے ہیں۔ آغا

خان اول کی طرف سے کہا گیا کہ یہ سب باتیں "تقیہ" میں ہیں اصل میں اور پیر صدر الدین کو اسماعیلی نزاری امام وقت شاہ اسلام شاہ نے اس لئے ۔۔۔ بنا کر بھیجا تھا کہ وہ اسماعیلی عقائد پھیلائیں۔ عدالت نے آغا خان اول کا یہ دعویٰ قبول کر لیا جس پر بعض خوجے ان سے علیحدہ اور اعلانیہ طور پر سنی ہو گئے۔

(آب کوثر صفحہ ۳۵۲)

خوجے

ان داعیوں کی کوشش سے جو لوگ اسماعیلی ہوئے ان کو خواجہ کہا گیا جو بگڑ کر خوجہ یا کھوجہ ہو گیا آگے چل کر یہ لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔

۱۔ اسماعیلی ۲۔ اثنا عشری ۳۔ سنی

ان میں عقائد کے اعتبار سے اکثریت کا تعلق اسماعیلیوں کی نزاری شاخ سے ہے اور آغا خان کے پیرو ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر مندرجہ ذیل علاقوں میں آباد ہیں۔

۱۔ پاکستان ۔۔۔ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، کشمیر، گلگت، ہنزہ، چترال اور سندھ

۲۔ ہندوستان ۔۔۔ گجرات (کاٹھیاوار) بمبئی اور مغربی ساحل

برصغیر کے خوجوں کی تاریخ خاصی طویل ہے ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی رو سے برصغیر میں ان کی آبادی ساٹھ ہزار کے قریب تھی۔ پنجاب کے خوجے آغا خان کے پیرو ہیں اور ان کے مذہبی عقائد بمبئی کے خوجوں سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ بھی بمبئی کے خوجوں کی طرح ہندوؤں سے مسلمان ہوئے ہیں اور زیادہ تر تجارت پیشہ ہیں۔ وہ اپنا حساب کتاب ہندی میں کرتے ہیں اور ہندوانہ رسم و رواج کے پابند ہیں۔ ان کی ابتداء اسماعیلی نزاری داعی و پیر حاجی سید صدر الدین سے ہوئی جو پندرھویں صدی عیسوی میں اسماعیلی عقائد کی تبلیغ کے لئے خراسان سے آئے اور ریاست بہاولپور کی پیشکار گوٹھ چنی کے مقام ترنڈہ گورگج (جو قصبہ اوچ سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے) میں مدفون ہیں۔ انہیں خوجہ اور ست پنتھی فرقوں کا اصل بانی کہا جاتا ہے۔ امام شاہ سے قبل یہ دونوں فرقے ایک ہی جماعت سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے عقائد ہندوؤں کے سامنے ایسی شکل میں پیش کئے جو ان کی ہندوانہ روایات سے مناسبت رکھتے تھے۔ وہ ہندوانہ طرز کی تقریباً بیس مذہبی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے بعض (مثلاً دس اوتار) بہت اہم ہیں۔ ان کی کہی ہوئی بعض مناجات ان کے فرقے کے پیرو زبانی یاد کرتے اور مختلف تقریبوں پر گاتے ہیں۔

خوجے زیادہ تر رواجی قانون کے پابند ہیں۔ بمبئی کی عدالت عالیہ کے ایک فیصلے (۱۸۴۷ء) کی رو سے ان پر اسلامی قانون وراثت کا اطلاق نہیں ہوتا. چنانچہ ہندو قانون کی طرح ان کے یہاں بھی عورتیں فوری وراثت کے حق سے محروم ہیں۔

بمبئی کے خوجوں کے یہاں پیر صدر الدین سے پہلے کے ایک مبلغ و زست گر یا پیر ست گر نور کے متعلق یہ روایت چلی آتی ہے کہ وہ بارھویں یا تیرھویں صدی عیسوی میں گذرا ہے۔ ۱۵۹۴ء کے قریب ان کے امام آغا عبدالسلام نے ہندوستانی خوجوں کی ہدایت کے لئے فارسی زبان میں ایک کتاب "پند یاد جوانمردی" لکھی جس کے قدیم سندی نسخے کو چھبیسویں خوجے پیر یا ولی کا درجہ دے کر قابل تعظیم و تکریم سمجھا جاتا ہے۔

بمبئی کے خوجوں کے یہاں شادی طلاق اور تجہیز و تکفین کی رسوم عام اسلامی دستور اور شریعت سے مختلف ہیں۔ ان کی شادی کی رسوم پر قدیم ہندوانہ رنگ غالب ہے۔ نکاح کی مخصوص رسم کافی عرصہ تک سنی قاضی ادا کیا کرتے تھے۔ گجراتی زبان میں شادی کی ایک سند دی جاتی ہے۔ جس کے چاروں کونوں پر چار بڑے فرشتوں یعنی جبرائیل، اسرافیل، عزرائیل، اور میکائیل کے نام لکھے ہوتے ہیں۔ جماعت کی اجازت کے بغیر طلاق نہیں دی جا سکتی. ایک عجیب رسم جو مرتے وقت ادا کی جاتی ہے۔ "سَر جھاٹنا" ہے یعنی مقدس پانی کا چھڑکنا اور اس کے ساتھ کتاب "دس اوتار" کی تلاوت.

اس جماعت کی تنظیم میں مالی اعتبار سے آغا خان کی مقدس ذات کو مرکزیت حاصل ہے لیکن اس کے ساتھ ہی انتظامی امور میں کامل جماعتی آزادی حاصل ہے۔ ہر جماعت کا اپنا علیحدہ "جماعت خانہ" ہوتا ہے۔ جو مجلس اور مسجد دونوں کا کام دیتا ہے۔ اس کے عہدیدار "مکھی" (مکھیا، خازن و صدر) اور "کامڑیہ" (معتمد، محاسب) کہلاتے ہیں۔ اکثر انہیں منتخب کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات خود آغا خان بھی انہیں نامزد کرتے ہیں۔ امام کے لئے نذریں انہی کی وساطت سے جمع کی جاتی ہیں۔ یہ نذریں دسوند (عشر) کے علاوہ ایسی رقوم پر مشتمل ہوتی ہیں جو ہر سال مقررہ اوقات پر مثلاً تم چندی کے موقع پر اور بعض اوقات ولادت، نکاح اور تجہیز و تکفین کی رسوم کے موقعوں پر ادا کی جاتی ہیں۔ سولہویں صدی عیسوی میں مومنوں کی جماعت سے علیحدگی دَسُوندھ کی ادائیگی کے سوال پر ہی ہوئی تھی۔ (بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۹ صفحہ ۳۰۰۔۳۰۱)

آغا خانی

آغا خان کے پیرو درمیان وسط ہند یا شمال مغربی ہمالیہ کی سرحد پر بستے ہیں وہ عقیدۃً اسماعیلیوں کی نزاری شاخ کے مذہب کے پابند ہیں۔ عرب اور مصر کے مستعلیوں اور ہندستانی بوہروں (جن کا ذکر آگے آرہا ہے) کے معتقدان سے مختلف ہیں۔

نزاری سلسلہ امامت ۔۔۔ اسماعیلی روایات کے مطابق نزار کا لڑکا الہادی اپنے باپ کے ساتھ ہی قید خانے میں قتل کر دیا گیا تھا لیکن اس کے شیر خوار بچے المہدی کو معتمد حامیان میں بمقام "الموت" لے آئے اور وہاں اسے حسن بن صباح نے ایک بہت ہی خفیہ جگہ میں حفاظت کے ساتھ رکھا اور اس کی پرورش کی۔ جب ۵۵۷ھ میں اس کی وفات ہو گئی تو اس کا فرزند القاہر باحکام اللہ حسن (نزاریوں کے روایتی نسب نامے میں جو آج کل رائج ہے اس کی جگہ دو اماموں کے نام دیئے ہیں۔ قاہر اور حسن) اعلانیہ طور پر تخت نشین ہو گیا۔ اور ۱۷ رمضان ۵۵۹ھ / ۸ اگست ۱۱۶۴ء کو اس نے قیامت کبریٰ (قیامۃ القیامات) کے قائم ہو جانے کا اعلان کیا۔ اس نے اپنے متبعین پر باطنی عبادت فرض کی اور ان کی ظاہری اہمیت کو گھٹا دیا کیونکہ نجات یافتہ لوگوں کے لئے جو روحانی جنت میں داخل ہو چکے ہیں۔ عبادت کی یہی شکل موزوں ہے۔ مومنوں کی یہی بہشتی حالت اس نہایت مشہور اساطیری باغ کی اصل بنیاد ہے جسے جنت کے نمونے پر حسن بن صباح نے اپنے مریدوں کو فریب دینے کے لئے "الموت" کی بے نخل و گیاہ چٹانوں پر بنایا تھا۔ ریاست "الموت" کے دیگر چار حکمرانوں یعنی علاؤالدین، جلال الدین، علاؤالدین ثانی اور رکن الدین خورشاہ (جس پر "الموت" کی حکمرانی ختم ہو گئی) کی تاریخ کسی حد تک معلوم ہے۔ اس آخری حکمران رکن الدین خورشاہ کا بیٹا شمس الدین محمد ابھی بچہ ہی تھا کہ اسے بڑی احتیاط سے چھپا دیا گیا۔ وہ اور اس کے جانشین یا تو مکمل طور پر مستور رہتے تھے اور یا صوفی شیوخ کی صورت میں سامنے آتے تھے۔ جن کی اس زمانے میں بہت کثرت تھی روایت کے مطابق ان میں سے کئی ایک بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ انہیں صوبوں کی گورنری ملی۔ ان کے اور صفوی بادشاہوں کے درمیان شادیاں ہوئیں لیکن اب تک ان کے بارے میں بہت کم تفصیلات معلوم ہو سکی ہیں۔ بعض مآخذ میں ذکر آیا ہے [illegible] الدین کے بعد اس کے جانشین مومن شاہ اور اس کا بیٹا قاسم شاہ ہوئے لیکن سرکاری تذکرۂ انساب میں ان کا نام نہیں ملتا۔

ان کے علاوہ حسب ذیل اشخاص مسند نشین ہوئے۔

قاسم شاہ دوم، اسلام شاہ اول، اسلام شاہ دوم، مستنصر باللہ دوم، عبدالسلام، غریب مرزا (نیز المعروف بہ مستنصر باللہ سوم) بوزر علی، مراد علی، ذوالفقار علی، نوراللہ ہر علی، خلیل اللہ ولی، عطا اللہ نزار، سید علی حسن بیگ (ابوالحسن علی) قاسم علی شاہ، سید حسن علی جس نے تیرھویں صدی ہجری کے اوائل اور اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں وفات پائی۔ ان کے جانشین ان کے بیٹے خلیل اللہ دوم ہوئے جو ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷ء میں مارے گئے۔ ان کے جانشین ان کے بیٹے حسن علی شاہ مقرر ہوئے اور انہی کو سب سے پہلے شاہ ایران فتح علی شاہ قاچار کی طرف سے "آغا خان" کا لقب عطا ہوا۔ اس طرح یہ لقب اس خاندان کے اسماعیلی نزاری اماموں کا امتیازی لقب اور شعار بن گیا اور وہ آغا خان کہلوائے۔ ان کے پیروکار آغا خانی کہلاتے ہیں۔ نزاری آج کل حسب ذیل علاقوں میں موجود ہیں۔ شام میں حما کے قریب، ایران میں خراسان اور کرمان کے صوبوں میں، افغانستان میں جلال آباد کے شمال، بدخشان اور واخان میں، روسی اور چینی ترکستان میں پامائی جیحون کے اضلاع اور یارقند وغیرہ میں، پاکستان میں سندھ، چترال، گلگت، ہنزہ وغیرہ میں اور ہندوستان میں گجرات اور بمبئی وغیرہ میں ان کی نو آبادیاں پورے پاک و ہند اور مشرقی افریقہ میں پائی جاتی ہیں۔ آغا خانی سلسلہ امامت میں اب تک چار آغا خانی ہو چکے ہیں۔

آغا خان اول

ان کا پورا نام حسن علی شاہ (۱۸۰۰ء تا ۱۸۸۱ء) ہے۔ جو شاہ ایران فتح علی شاہ قاچار (۱۸۳۴م) کے حضور نظر منظور تھے۔ ان کے والد شاہ خلیل اللہ صوبہ کرمان کے گورنر تھے۔ ۱۸۱۷ء میں ان کے قتل کے بعد شاہ ایران نے آغا حسن علی شاہ کو کرمان کا گورنر مقرر کیا اور ان سے اپنی لڑکی کی شادی بھی کر دی۔ کرمان میں انہوں نے بڑی دانشمندی اور میانہ روی مگر مضبوطی سے حکومت کی۔

محمد شاہ قاچار (۱۸۴۸م) کے عہد حکومت میں درباری سازشوں کے زیر اثر حسن علی شاہ نے ۱۸۳۸ء میں کرمان میں بغاوت کر دی لیکن انہیں شکست ہوئی اور ۱۸۴۰ء میں وہ سندھ چلے آئے۔ انگریز اس وقت سندھ کو فتح کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ آغا حسن علی شاہ نے سر چارلس نیپئر کو سندھ کا اقتدار حاصل کرنے میں بہت مدد دی۔ انگریز اس سے بہت خوش ہوئے۔ حکومت برطانیہ نے اس وفاداری کے صلے میں ہز ہائینس کا اعزاز عطا کیا۔ پھر وہ بمبئی میں مقیم ہو گئے۔

۱۸۴۸ء سے اس کے بعد ایک مختصر سے وقفے کے سوا جب وہ بنگلور چلے گئے تھے۔ بمبئی اسماعیلی خوجوں کے امام کا مستقر (ٹھکانہ) رہا ہے۔

آغا خان دوم

آغا خان اول کے بیٹے آغا علی شاہ (م ۱۸۸۵ء) ان کے جانشین ہوئے۔ یہ بھی اپنے باپ کی طرح انگریزوں کے معتمد تھے۔ آغا علی شاہ "محمڈن نیشنل ایسوسی ایشن" کے صدر رہے۔ انہوں نے بمبئی کے "مسلمانوں" بالخصوص آغاخانیوں کی فلاح و بہبود کیلئے تعلیمی اداروں کی نہ صرف سرپرستی کی بلکہ ان کے مقاصد کی توسیع اور ترقی میں بھی قابل قدر کردار ادا کیا۔ ان غیر معمولی خدمات کے باعث وہ بلدیہ کونسل کے ممبر بھی رہے۔ انہیں گھڑ سواری اور دوسرے کھیلوں میں امتیاز حاصل تھا۔ انہوں نے اپنی پہلی دو بیویوں کے انتقال کے بعد ایران کے قاچاری تاجدار کے شاہ محمد علی کی بھتیجی اور ایران کے وزیر اعظم نظام الدولہ کی لڑکی نواب عالیہ شمس الملوک سے شادی کر لی۔ ان کے بطن سے آغا سلطان محمد شاہ ۲ نومبر ۱۸۷۷ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ یہ اپنے والد آغا خان دوم کے اکلوتے بیٹے تھے۔

آغا خان سوم

آغا سلطان محمد شاہ (۱۸۷۷ء، ۱۹۵۷ء) اپنے باپ علی شاہ آغا خان دوم کی وفات پر ۱۷ اگست ۱۸۸۵ء کو امامت کی مسند پر بیٹھے۔ اس وقت ان کی عمر صرف آٹھ برس کی تھی۔ لیکن والدہ نے اپنی شرقیت اور ماحول کے باوجود بیٹے کی تعلیم و تربیت پر بھرپور توجہ دی۔ انہیں مذہبی و دنیاوی رہنمائی کے قابل بنایا اور جائیداد کے انتظام کو بڑی خوبی سے سنبھالا۔

آغا خان نے اپنی والدہ کی رہنمائی میں مختصر مدت میں شرقی اور مغربی تعلیم مکمل کی۔ انہوں نے فارسی، عربی، فرانسیسی اور انگریزی کے قدیم اور جدید ادب کے ساتھ ساتھ فلسفہ، روحانیات، منطق، اور علم الکلام میں عبور حاصل کر لیا تھا۔ بچپن سے ہی انہیں گھڑ دوڑ اور گھڑ سواری کا بے حد شوق تھا۔ نشانہ بازی اور ورزش میں بھی وہ بڑے ماہر تھے۔

۱۸۹۷ء میں آغا خان علی گڑھ کالج گئے جہاں سر سید احمد خان نے ان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ ۱۸۹۸ء میں آغا خان نے ملکہ وکٹوریہ سے ملاقات کی۔ ۱۹۰۱ء میں انہوں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس دہلی کے اجلاس کی صدارت کی۔ سر آغا خان کو ہندوستان کے سیاسی

معاملات سے گہری دلچسپی رہی۔ ۱۹۰۲ء میں وہ ہندوستان کی امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے رکن نامزد ہوئے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلمانان ہند کے ایک وفد نے آغا خان کی قیادت اور سربراہی میں وائسرائے سے ملاقات کی۔ آغا خان کا شمار مسلم لیگ کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ وجود میں آئی جس کے وہ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۳ء تک نہ صرف صدر رہے بلکہ اس کے اخراجات کی کفالت بھی کرتے رہے۔

۱۹۲۰ء میں انہوں نے تیس لاکھ روپیہ جمع کر کے مسلم کالج علی گڑھ کو یونیورسٹی بنانے کا سامان فراہم کیا۔ ۱۹۲۴ء میں ہندوستان کی کونسل آف سٹیٹ نے آغا خان کو امن کا نوبل پرائز دینے کی سفارش کی۔ ۱۹۳۷ء میں ان کی عالمی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں لیگ آف نیشنز (جمعیت الاقوام) کا صدر منتخب کیا گیا۔ ۱۹۳۹ء میں حکومت ایران نے انہیں ایرانی قومیت عطا کی اور "والا حضرت ہمایوں" کا اعزاز بخشا۔ ۱۹۵۱ء میں حکومت شام نے انہیں "نشان بنوامیہ" عطا کیا۔ ۱۹۵۵ء میں انہیں انڈونیشیا نے "گل سرخ گل سفید" سے نوازا۔

سر آغا خان اپنی وسیع المشربی کی بنا پر عالمی شہری تھے وہ ہمیشہ ایک باوقار تبلیغی جماعت کے حامی رہے اور ان کی کوششوں سے ہزاروں غیر مسلموں نے اسماعیلی نزاری مذہب قبول کیا۔ ان کے مرید پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جن کی تعداد تقریباً دو کروڑ ہے۔ جنوبی امریکہ، انڈونیشیا، چین، ملایا، مشرق وسطی اور افریقہ کے مختلف علاقوں میں آباد ہیں۔ افغانستان اور وسط ایشیا میں بھی ان کے معتقدین موجود ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان میں ان کے مریدوں کو "خوجہ" بھی کہتے ہیں۔ یہ لوگ آغا خان کو امام حاضر (امام الوقت) مانتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ صحیح ہدایت کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس دنیا میں کوئی ایسا زندہ امام رہے جو نبی اکرم ﷺ کے غیر منقطع سلسلہ امامت میں منسلک ہو۔ اس سلسلے کے پہلے امام حضرت علیؑ اور انہی سے سلسلہ امامت شروع ہو کر آغا خان تک پہنچا اور موصوف اس سلسلے کے اڑتالیسویں امام مقرر ہوئے۔

۱۹۳۵ء میں آغا خان کا پچاس سالہ جشن (گولڈن جوبلی) دوبارہ منایا گیا۔ پہلے بمبئی میں پھر نیروبی میں ان دونوں موقعوں پر انہیں سونے سے تولا گیا۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں ان کی الماسی (ڈائمنڈ) جوبلی یا ساٹھ سالہ جشن بمبئی اور دارالسلام (افریقہ) میں منایا گیا اور انہیں ہیروں سے تولا گیا۔ ان کی ستر سالہ پلاٹینم جوبلی ۳ فروری ۱۹۵۴ء کو منائی گئی اور ان کے مغربی پاکستان میں

رہنے والے مریدوں نے انہیں پلاٹینم (زرسفید) سے (جو دنیا میں سب سے زیادہ بیش قیمت دھات ہے) تولا۔ سر آغا خان نے وہ تمام سونا، جواہرات اور پلاٹینم جن سے انہیں تولا گیا اپنے فرقے (مریدوں) کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیا۔

اس تفصیل سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آغا خانی ائمہ کو حکومت برطانیہ سے خصوصی تعلق کی بناء پر ہی یہ عروج حاصل ہوا۔ انہوں نے حکومت سے وفاداری کا یہ فائدہ اٹھایا کہ وہ ہندوستان اور برطانیہ کے زیر اثر علاقوں میں اپنی جماعت کو اطمینان سے منظم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بلکہ طویل عرصہ کے بعد سرزمین مصر سے بھی وہ دوبارہ تعلق قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ کیونکہ نزاریوں کا دعویٰ ہے کہ وہ مصر میں فاطمی خلافت کے جائز وارث ہیں۔ مصر بھی کچھ عرصہ قبل تک حکومت برطانیہ کے زیر اثر رہ چکا ہے۔ یہ اسی تعلق کا نتیجہ ہے کہ آغا خان نے ۱۱ جولائی ۱۹۵۷ء کو سوئزرلینڈ میں ورسوئے کے مقام پر وفات پائی اور اسوان مصر میں دفن کئے گئے۔

آغا خان اول اور دوم کی برطانیہ نوازی کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے اور آغا خان سوم نے بھی اس سلسلے کو جاری رکھا۔ حتیٰ کہ انہوں نے اس صدی کے شروع میں جنگ بلقان کے دوران ایک مضمون لکھا جس میں ترکوں کو سرزمین یورپ چھوڑ کر ایشیا چلے جانے کا مشورہ دیا جس سے خلافت عثمانیہ اور مسلمانوں کا وقار شدید طور پر مجروح ہوا اور مسلمانان عالم میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ علامہ شبلی نے اس سلسلے میں دو نظمیں لکھیں (کلیات شبلی اردو صفحہ ۵۸/۵۷) ایک اردو میں دوسری فارسی میں فارسی نظم کا مقطع جو خواجہ شیراز سے مستعار ہے معنی خیز ہے۔

پدرم روضۂ رضواں بدو گندم بفروخت ناخلف باشم اگر من بہ جوئے نفروشم

یعنی باپ نے جنت کو گندم کے دو دانوں کے بدلے بیچ دیا میں ناخلف ہوں اگر ایک جو کے بدلے میں نہ بیچوں۔

سر آغا خان سوم کی چار بیویاں تھیں۔ ان کی پہلی شادی ۲۱ برس کی عمر میں چچازاد بہن کے ساتھ ہوئی۔ دوسری تھریسا میلیانو اور تیسری آندرے جوزفین لیونی کاغون کے ساتھ ہوئی۔ ۱۹۴۵ء میں انہوں نے "ایوت لابروس" (اسلامی نام ام حبیبہ) کے ساتھ آخری شادی کی۔ وہ عام طور پر "داتا سلامت" کے لقب سے مشہور تھیں۔ ان کی دوسری بیوی سے شہزادہ علی خان (۱۹۶۰ء) اور تیسری بیوی کے بطن سے صدرالدین پیدا ہوئے۔

آغا خان چہارم

شہزادہ کریم آغا خان جو شہزادہ علی خان کے بیٹے اور سر آغا خان سوم سلطان محمد شاہ کے پوتے ہیں۔ آغا خان سوم کی وصیت کے مطابق ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ وہ اپنے دادا کی وفات کے وقت تقریباً بیس سال کے تھے۔ ۱۹۵۷ء میں نزاری اسماعیلیوں کے اڑتالیسویں امام آغا خان سوم کی وفات کے بعد ان کے جانشین کے سلسلہ میں اختلاف پیدا ہوا۔ ایک طبقے نے جو باپ کے بعد بیٹے کی امامت کے قائل ہیں۔ کریم آغا خان چہارم کو جو آغا خان سوم کے پوتے ہیں انچاسواں امام تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ گروہ آغا خان سوم کے بعد ان کے بیٹے شہزادہ علی خان کو انچاسواں امام مانتا ہے۔ بہر حال آغا خان سوم کی وصیت کے مطابق کریم آغا خان ۱۳ جولائی ۱۹۵۷ء کو اسماعیلی نزاری فرقے کے انچاسویں امام مقرر ہوئے۔

شہزادہ کریم آغا خان ۱۳ دسمبر ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر مصطفیٰ کامل سے حاصل کی اس کے بعد سوئزرلینڈ کے "لے روز" اسکول میں داخل ہو گئے وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کچھ عرصہ انگلستان میں قیام کیا۔ ۱۹۵۴ء میں ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ میں داخلہ لے لیا وہاں زیر تعلیم ہی تھے کہ آغا خان سوم کی رحلت پر اسماعیلی نزاری فرقے کی امامت کا بار ان کے کندھوں پر آ پڑا۔ انہیں انگریزی، فرانسیسی، اردو، فارسی اطالوی اور ہسپانوی زبانوں پر کافی عبور حاصل ہے۔ مشرق وسطی کی تاریخ سے خاص شغف اور کھیلوں سے بھی دلچسپی ہے۔ آغا خان سوم شروع سے ہی انہیں امامت کے منصب پر فائز کرنے کے متمنی تھے چنانچہ انہوں نے ان کی دینی تربیت پر خاص توجہ اور ان میں اسماعیلی فرقے اور عام مسلمانوں کے دینی اور دنیوی مسائل سے دلچسپی لینے کا جذبہ پیدا کر دیا۔ ۱۹۵۴ء میں شہزادہ کریم خان نے اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ امین کے ہمراہ مشرقی افریقہ، کینیا، یوگنڈا اور زمبیا کا دورہ کیا۔ ۱۹۵۶ء میں لندن سے کراچی تک کے سفر میں متعدد ملکوں کے اسماعیلیوں سے رابطہ پیدا کیا۔ گدی نشین ہونے کے ایک ماہ بعد انہوں نے پیرس، بیروت، کراچی، ڈھاکہ، بمبئی، دہلی اور مشرقی افریقہ کا دورہ کیا اور مریدوں سے بیعت لی۔ شہزادہ کریم کے امامت پر فائز ہونے کی پہلی رسم ۱۳ جولائی ۱۹۵۷ء کو جنیوا میں ادا ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹ اکتوبر کو دارالسلام میں ۲۲ اکتوبر کو نیروبی میں اور ۲۵ اکتوبر کو کمپالا میں ادا ہوئی۔ اگلے سال ۲۳ جنوری ۱۹۵۸ء کو کراچی میں ۱۱ مارچ

کو بمبئی میں اور ممبئی میں کانگو اور افریقہ میں ان کی گدی نشینی کی رسوم ادا کی گئیں۔ ۱۹۵۷ء میں ملکہ الزبتھ دوم نے "ہز ہائی نس" اور ۱۹۵۹ء میں شاہ ایران نے "ہز رائل ہائی نس" کے خطاب عطا کئے ۱۹۷۰ء میں حکومت پاکستان کی جانب سے "نشان امتیاز" ملا ۱۹۶۷ء میں پشاور یونیورسٹی اور ۱۹۷۰ء میں سندھ یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔

شہزادہ کریم آغا خان نے ۱۹۶۹ء میں ایک برطانوی انگریز خاتون سے شادی کی جس کا اسلامی نام "سلیمہ" رکھا گیا۔ ان کے بطن سے ایک لڑکی نے جنم لیا ہے۔ آغا خان چہارم نہایت ذہین، فطین اور بالغ نظر شخص ہیں اور اصلاحی اور فلاحی کاموں میں خصوصی دلچسپی لیتے ہیں۔ پاکستان میں آغا خان یونیورسٹی اور آغا خان ہسپتال قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دیگر شہروں بالخصوص شمالی علاقہ جات میں رفاہی کاموں کا ایک جال پھیلا رکھا ہے۔ لیکن ان تمام رفاہی اور فلاحی کاموں سے ان کا مقصد مسلمانوں یا دیگر انسانوں کی خدمت ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ انہیں ان کے دین سے برگشتہ کر کے اسماعیلی بنانا ہے۔ آغا خانیوں کی موجودہ تعداد اس بات کا واضح ثبوت ہے۔

اسماعیلی شیعہ شمالی ایران اور ملحقہ علاقوں سے ۱۷۱ سالہ (۴۸۳ھ تا ۶۵۴ھ) اسماعیلی نزاری حکومت کے خاتمہ کے بعد برابر اس کوشش میں مصروف رہے کہ وہ کسی خطہ پر دوبارہ اپنا اقتدار قائم کرلیں۔ مگر وہ اس میں بری طرح ناکام رہے البتہ وہ جزوی طور پر چاپلوسی اور تقیہ کے سہارے مختلف اوقات میں وزارت یا گورنری کا عہدہ حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہوئے۔

آغا خان اول حسن علی شاہ (جو کرمان کے گورنر تھے) نے ۱۸۳۸ء میں درباری سازشوں کے زیر اثر بغاوت کر دی۔ جب اس میں انہیں ہزیمت ہوئی تو وہ سندھ چلے آئے جہاں انہوں نے اپنے مریدوں اور دیگر سازشوں کے ذریعے برطانوی حکومت کو سندھ میں اقتدار دلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ آغا خان اول تا چہارم بھی نے اپنے اپنے وقت میں برطانیہ سے وفاداری کا سلسلہ قائم رکھا اور ان خدمات کے صلہ میں وہ متعدد خطابات، اعزازات اور انعامات سے نوازے گئے۔

یہودیوں کے رہنما روتھچائلڈ سے مل کر آغا خان سوم نے اسرائیلی مملکت کی منصوبہ بندی کی اور اس سلسلے میں خلیفہ سلطان عبدالحمید خان کو تین بار یادداشتیں پیش کیں مگر وہ ان کی سازش کا شکار نہیں ہو سکے۔

آغا خان سوم نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ خلیفہ کو درپیش مسائل کا حل یہ ہے کہ وہ

ریاستہائے بلقان سے خودہی دست بردار ہو جائیں۔ اس کے علاوہ آغا خان نے تحریک خلافت کے دوران اپنے برطانوی آقاؤں کا ساتھ دیا اور اس کے صلے میں انہوں نے اپنی علیحدہ مملکت کے قیام کے لئے ان پر دباؤ ڈالنا شروع کیا اور واضح کیا کہ ان کے تصرف میں افرادی قوت بھی ہے۔ ان کی اپنی زبان ہے۔ اپنا جھنڈا ہے اور مالی اعتبار سے بھی وہ لوگ خوشحال ہیں لہٰذا انہیں ایک خطہ باقاعدہ اسماعیلی ریاست کی تشکیل کے لئے عنایت کیا جائے۔ انگریزوں نے جنگ عظیم دوم کے بعد ملک شام دینے پر آمادگی کا اظہار کر لیا۔ لیکن آغا خانیوں نے مصر کا مطالبہ کیا جو برطانوی حکومت کے لئے ممکن نہ تھا۔ پھر انہوں نے سندھ کے لئے اصرار کیا۔ برطانوی حکومت نے اس مطالبے کو بھی خوبصورتی سے ٹال دیا اور آغا خان سوم کو صرف خطابات اور اعزازات کی حد تک محدود رکھا۔

اب آغا خانی اپنے امام کریم آغا خان چہارم کی راہنمائی میں ایک اسماعیلی ریاست کے قیام کا پھر خواب دیکھ رہے ہیں۔ جو پاکستان کے شمالی علاقوں پر مشتمل اور رقبہ کے اعتبار سے افغانستان کے برابر ہوگی۔ جس میں ہنزہ، ناگر، گلگت، مستوج، برغیل، کہت، یارخون اور اسی طرح دور دراز کے غیر ملکی علاقے مثلاً واخان، بدخشان، اشکاشم، زیباک رباط، شغنان پامیر، وغیرہ ہوں گے۔ یہ ایک بہت نازک اور حساس خطہ ہے جہاں افغانستان روس چین اور پاکستان کی بین الاقوامی سرحدیں ملتی ہیں۔

یہ سازش بے حد خطرناک اور پاکستان کی سالمیت کے لئے زبردست خطرہ ہے۔ اس کی وجہ سے اسلام اور پاکستان کی ساری نظریاتی اور جغرافیائی سرحدیں مسمار ہو سکتی ہیں۔ یہ سازشی واخان سے ہنزہ تک، سکھر سے کراچی تک اور گوادر و مکران کے پانیوں تک اپنے قدم جمانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اس میں سیاچن کا حصہ بھی شامل ہے۔ تمام علاقہ رقبہ کے اعتبار سے افغانستان کے برابر ہے۔ ان مقامات کے زیادہ حصوں میں اسماعیلیوں کی اکثریت ہے۔ بلکہ بعض علاقوں میں یہ حضرات سو فیصد ہیں۔ آغا خانیوں نے اپنا علیحدہ قومی نشان بنا لیا ہے۔ ان کا علیحدہ جھنڈا ہے۔ جس کا رنگ سبز اور سرخ ہے اور ان کا اپنا ترانہ ہے جسے اسماعیلی ترانہ کہا جاتا ہے۔ کریم آغا خان کو اس منصوبہ اور سازش کو عملی جامہ پہنانے میں روس کا مکمل تعاون حاصل ہے۔ روس ہمیشہ ان کی مدد کرتا رہا ہے اور یہ لوگ ہر مرحلہ پر روس کے مداح اور قصیدہ خوانی کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افغانستان میں روسی مداخلت کی انہوں نے کبھی مذمت نہیں کی اور نہ

ی افغان مجاہدین کے ساتھ بھی ہمدردی کا اظہار کیا۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ آغا خانیوں کی تمام تر کوشش یہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح شمالی علاقہ میں ایک اسماعیلی ریاست قائم کر لیں اور آغا خان کی پاکستان میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کا سب سے بڑا سبب بھی یہی ہے۔

افغانستان میں "واخان" کے علاقے کو روس کے تعاون سے اس مقصد کے حصول کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ روس پاکستان، چین، اور بھارت کو ملانے والی اس پٹی میں سو فیصد آبادی اسماعیلی کمیونٹی کی ہے۔ اس علاقہ میں وافر جنگلات پائے جاتے ہیں۔ اس علاقے کی اصل اہمیت دنیا کے چار انتہائی اہم ممالک کی سرحدوں کا اتصال ہے۔ پاکستان میں واخان کی سرحدیں کشمیر اور شمالی علاقہ جات دونوں سے ملتی ہیں جہاں اسماعیلی پہلے سے ہی آباد ہیں۔

"واخان" افغانستان کا وہ واحد علاقہ ہے جس کے باشندے دس سال تک جاری رہنے والے جہاد آزادی سے نہ صرف لاتعلق رہے بلکہ روس کے حامی و مددگار بھی رہے۔ روس نے پاکستان، چین اور بھارت پر نظر رکھنے کے لئے اس علاقہ کو ببرک کارمل کی کٹھ پتلی انتظامیہ سے پٹہ پر حاصل کرنے کے بعد یہاں فضائی اڈے قائم کئے۔ پھر یہاں سے پسپا ہوتے وقت وہ اس پورے علاقے کو اسماعیلی کمیونٹی کے حوالے کر گیا۔

واخان سے ملحقہ پاکستانی علاقہ چترال ہے اور یہاں بھی اسماعیلی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ اگر آغا خانی اپنی الگ ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ نئی ریاست پاکستان اور امت مسلمہ کے لئے ایک نئے اسرائیل کی شکل اختیار کر لے گی۔ آغا خان ریاست کا قیام محض قیاس آرائی نہیں ہے۔ بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ بے نظیر کے پہلے دور حکومت میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ترجمان اخبار روزنامہ شہاب میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ!

"کوئٹہ (شہاب نیوز) افغانستان سے ملنے والی اطلاعات کے مطابق افغان حکومت نے پاکستان اور چین کی سرحد کے قریب روسی علاقے سے ملحقہ افغان علاقہ واخان کو اسماعیلی فرقے کے حوالے کر دیا ہے۔ کابل حکومت نے اس سلسلے میں ایک نوٹیفیکیشن جاری کیا جس کے مطابق واخان کے علاقہ میں کسی قبیلے کو آباد ہونے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں جنگلات کاٹنے کی بھی ممانعت ہوگی۔ افغانستان نے واخان کا علاقہ اس سے قبل روسی فوجوں

کے حوالے کر دیا تھا اور اس طرح یہ علاقہ براہ راست روسیوں کی عملداری میں تھا۔ لیکن اب روسیوں کی واپسی کے بعد اس علاقے کو اسماعیلی فرقے کے حوالے کر دیا گیا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ واخان سے ملحقہ پاکستانی علاقے گلگت، ہنزہ اور چترال کے علاقے میں بھی بڑی تعداد میں اسماعیلی فرقے کے لوگ آباد ہیں اور اس امر کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ اسماعیلی فرقہ یہاں اپنی خود مختار ریاست قائم کرے گا۔ واضح رہے کہ پاکستان میں شاہراہ ریشم اور اس کے ارد گرد تمام علاقوں پر پہلے ہی اسماعیلی فرقے کی اجارہ داری ہے حکومت پاکستان ان علاقوں میں قائم سرکاری ہوٹل پہلے ہی اسماعیلی فرقے کے ہاتھوں فروخت کر چکی ہے۔"

{روزنامہ شہاب لاہور ۲۲ فروری ۱۹۸۹ء بحوالہ ہفت روزہ تکبیر کراچی ۲ فروری ۱۹۸۹ء}

اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور فضل سے افغانستان میں طالبان کی حکومت قائم ہو گئی ہے۔ جس سے "واخان" میں سر دست اسماعیلی ریاست کے قیام کا خواب چکنا چور ہو گیا ہے۔ مگر اسماعیلیوں نے ابھی ہمت نہیں ہاری اور اب وہ ایران، امریکہ، روس اور اقوام متحدہ کی وساطت سے اپنے راستے میں حائل واحد رکاوٹ یعنی طالبان حکومت کو ختم کرنے کی مذموم کوششوں میں مصروف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقوام متحدہ نے ۹۰ فیصد سے زائد رقبے پر قبضہ کے باوجود طالبان حکومت کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا کیونکہ یہ ادارہ جہاں امریکہ کے زیر تسلط ہے وہاں آغا صدر الدین کا بھی اس میں اہم کردار ہے۔

آغا صدر الدین آغا خان سوم سلطان محمد شاہ کا چھوٹا لڑکا ہے۔ جس کی زندگی کا بیشتر حصہ اقوام متحدہ میں ہی گذرا ہے۔ یہ ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) سے فراغت کے بعد ۱۹۵۸ء میں یونیسکو کے مشیر مقرر ہوئے ۶۰-۱۹۵۹ء میں اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے تارکین وطن کے ڈپٹی مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں ہی وہ ہائی کمشنر بنا دیئے گئے۔ ہارورڈ اسلامک ایسوسی ایشن کے بانی اور کونسل آف اسلامک افیئر نیویارک کے صدر ہیں پھر انہیں اقوام متحدہ کا جنرل سیکرٹری نامزد کیا گیا۔ پاکستان نے ان کی نامزدگی کی پر جوش حمایت کی۔

آغا صدر الدین اقوام متحدہ کی طرف سے افغان مہاجرین کی بحالی اور دوبارہ آبادکاری کمیشن کے سربراہ بھی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا جو کردار ہو سکتا ہے وہ کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ پاکستانی حکمران علماء حق اور غیور مسلمانوں سے خائف ہونے کے باوجود آغا خانیوں

کے لئے انتہائی نرم گوشہ رکھتے ہیں اور شمالی علاقہ جات میں ان کے "رفاہی اور فلاحی" کاموں کو مکمل تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ جس کی آڑ میں وہ آغا خانی (اسماعیلی) مذہب کا پرچار کرتے ہیں۔ ہمارے حکمرانوں پر آغا خان کا اتنا رعب ہے کہ صدر پاکستان ان کے استقبال کے لئے بنفس نفیس ایئرپورٹ تشریف لے جاتے ہیں۔ جبکہ وہ نہ کسی ملک کے سربراہ ہیں اور نہ ہی ان کا تعلق کسی شاہی خاندان سے ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کے شر سے امت مسلمہ کو محفوظ رکھے آمین۔

مستعلویہ

مصر کے آٹھویں فاطمی امام ابو تمیم معد بن الظاہر المستنصر باللہ (م ۴۸۷ھ) کے انتقال پر اسماعیلیوں میں ان کے جانشین کے مسئلہ پر اختلاف ہوا۔ المستنصر کے بڑے بیٹے نزار کو جائز جانشین ماننے والے "نزاریہ" کہلائے اور المستنصر کے دوسرے بیٹے ابوالقاسم احمد المستعلی باللہ کو امام تسلیم کرنے والے "مستعلویہ" کہلائے۔ نزار کی شکست اور قتل کے بعد اس کے بھائی المستعلی باللہ نے ۱۸ ذی الحجہ ۴۸۷ھ میں مصر میں فاطمی خلافت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اسی کے دور (۴۹۰ھ) میں یورپ کے عیسائیوں نے جن میں بڑے بڑے بادشاہ بھی شامل تھے متحد ہو کر بیت المقدس کو مسلمانوں کے قبضے سے نکالنے کے لئے حملہ کیا۔ شام کے تمام مسلمان عیسائیوں کے حملے روکنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اس دوران المستعلی باللہ کے وزیر محمد ملک نے مصری اسماعیلی فوج لے کر بیت المقدس پر حملہ کر دیا۔ اسماعیلی شیعوں کا یہ حملہ عیسائیوں کے لئے بے حد مفید اور مددگار ثابت ہوا کیونکہ شام کی فوج بیک وقت ان دونوں زبردست حملہ آوروں کا مقابلہ نہ کر سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیت المقدس پر عیسائیوں نے قبضہ کرنے کے بعد مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ مسلمانوں نے محراب داؤد میں پناہ لی کہ یہاں عیسائی قتل سے باز رہیں گے۔ مگر انہوں نے یہاں بھی ان کو خوب قتل کیا۔ مسجد اقصیٰ اور صخرہ سلیمان میں ستر ہزار مسلمان شہید کئے گئے۔

اسماعیلی فاطمی امام المستعلی باللہ کی وفات کے بعد ۱۷ صفر ۴۹۵ھ کو اس کے بیٹے ابو علی منصور الآمر باحکام اللہ کو پانچ سال کی عمر میں تخت سلطنت پر بٹھا دیا گیا۔ اس کی کم سنی کی وجہ سے تمام امور خلافت وزیر السلطنت کے ہاتھ میں آ گئے اگرچہ وہ المستعلی کے دور میں بھی سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ الآمر باحکام اللہ کے والد المستعلی نے اپنے بھائی نزار کو اس کے بیٹے سمیت قتل کرا دیا

تھا۔ اس لئے نزاریوں (جو قلعہ الموت میں الگ نزاری ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے) نے چند فدائین کو اس کے انتقام کی ذمہ داری سونپ دی چنانچہ فدائیوں کے ایک گروہ نے ۵۲۴ھ میں ایک دن موقع پا کر آمر عبیدی کو قتل کر دیا۔ چونکہ اس نے (بقول مورخین) کوئی بیٹا نہ چھوڑا تھا۔ اس لئے اس کے بعد اس کا چچازاد بھائی ابو میمون عبدالمجید الحافظ لدین اللہ تخت نشین ہو گیا۔ جبکہ اسماعیلی مآخذ کی رو سے آمر عبیدی کا ایک بیٹا امام طیب ۴ ربیع الثانی ۵۲۴ھ کو پیدا ہوا جسے چھپا دیا گیا۔ (یہاں سے فرقہ اسماعیلیہ مستعلویہ میں ستر کا ایک دور شروع ہوتا ہے جو تا حال جاری ہے) اور الحافظ لدین اللہ اور اس کے بعد آنے والے تین خلفاء امام طیب کے نائب کی حیثیت سے امور خلافت سرانجام دیتے رہے۔ ۵۴۴ھ میں حافظ لدین اللہ ستر سال کی عمر میں فوت ہوا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا ابو منصور اسمٰعیل الظافر لاعداء اللہ مسند نشین ہوا۔ ۵۴۹ھ میں خلیفہ ظافر بھی اپنے مرید کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابوالقاسم عیسیٰ الفائز بامر اللہ عمر پانچ سال تخت نشین ہو گیا۔ ۵۵۵ھ میں خلیفہ فائز کی وفات کے بعد وزیر السلطنت صالح بن زریک نے خدام کو حکم دیا کہ وہ شاہی خاندان کے لڑکوں کو پیش کریں تا کہ ان میں سے کسی ایک کو تخت سلطنت کے لئے منتخب کیا جائے چنانچہ ابو محمد عبداللہ بن یوسف بن حافظ عبیدی کو تخت پر بٹھا دیا گیا اور اس کا لقب "العاضد لدین اللہ" رکھا۔ عاضد اس وقت سن بلوغ کے قریب پہنچ چکا تھا اس کا دور خلافت ۵۵۵ھ سے ۵۶۷ھ تک رہا۔ اس دور میں عیسائیوں نے مصر میں قدم جما لئے اور امور خلافت میں دخل اندازی شروع کر دی اور یہ سب کچھ اسماعیلی وزیر السلطنت شاور کی ملی بھگت سے ہوا۔ بالآخر سلطان نور الدین زنگی نے اپنی فوج کے ذریعے مصر کو عیسائیوں کے تسلط سے آزاد کرایا اور سلطان صلاح الدین ایوبی مصر کے وزیر اعظم مقرر ہو گئے۔ یہ امام شافعی کے معتقد تھے انہوں نے شیعہ قاضیوں کو برخاست کر کے شافعی قضاۃ مامور کئے۔ مدرسہ شافعیہ اور مالکیہ کی بنیاد رکھی۔ امام طیب کے چاروں نائبین امام موعود القائم کے نام سے خطبہ پڑھتے تھے۔ سلطان نور الدین زنگی نے سلطان صلاح الدین ایوبی کو لکھا کہ مصر سے اسماعیلی ائمہ کا خطبہ ختم کر کے اس کی جگہ عباسی خلیفہ کے نام سے خطبہ جاری کیا جائے چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں محرم ۵۶۷ھ کے پہلے جمعہ کو جامع مسجد قاہرہ کے منبر پر بغداد کے عباسی خلیفہ المستضئی باللہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور عباسی خلیفہ کے لئے دعا کی گئی۔ دوسرے جمعہ میں صلاح الدین ایوبی نے قاہرہ اور پورے

ملک مصر کے خطیبوں کو خلیفہ عاضد کے نام کا خطبہ موقوف کرنے اور عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھنے کا حکم دیا۔ تمام خطیبوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ خلیفہ اس وقت سخت بیمار تھا اور اسی علالت کے دوران محرم ۵۶۷ھ میں اس نے وفات پائی۔ اس طرح مصر میں دولت فاطمیہ عبیدیہ کا خاتمہ ہو گیا اور مصر پھر خلافت عباسیہ بغداد کے زیر نگین ہو گیا۔ خلیفہ بغداد کی طرف سے سلطان صلاح الدین ایوبی کو سند حکمرانی عطا ہوئی اور یہیں سے مصر میں دولت ایوبیہ کی بھی ابتداء ہو گئی وہ مصر جہاں پر دو سو ستر (۲۷۰) سال تک اسماعیلیوں کا دور دورہ رہا نہ صرف مصر بلکہ شام و حجاز اور مغربی افریقہ بھی ان ہی کے زیر نگین رہے۔ خلیفہ عاضد عبیدی کے مرنے سے گویا ان لوگوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ کچھ شیعان مصر کو یہ امر ناگوار گذرا۔ ان میں سے ایک گروہ نے جمع ہو کر داؤد بن عاضد کے ہاتھ پر ۵۶۹ھ میں خلافت ولایت کی بیعت کر لی۔ صلاح الدین ایوبی کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے سب کو گرفتار کر کے قتل کر دیا اور داؤد کو قصر خلافت سے نکال دیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد داؤد بن عاضد کے بیٹے سلیمان نے سر اٹھایا اور گرفتار ہو گیا حتیٰ کہ قید کی حالت میں ہی فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اطراف فارس میں محمد بن عبداللہ بن عاضد نے "مہدی" کے لقب سے ملقب ہو کر خلافت ولایت کا دعویٰ کیا اور وہ بھی قتل ہو کر صلیب پر چڑھا دیا گیا۔ اس طرح مصر و اطراف میں خلافت فاطمیہ عبیدیہ اپنے انجام کو پہنچ گئی۔

مصر سے خلافت عبیدیہ کے خاتمہ سے قبل ہی مستعلویوں کا انتظامی مرکز یمن میں منتقل ہو گیا اور یہیں سے ان کے داعی مطلق ہدایات و احکام جاری کرتے رہے۔ مصر اور شمالی افریقہ سے اسماعیلی مذہب حیرت انگیز سرعت کے ساتھ غائب ہوا۔ یمن میں مستعلویوں کو مختصر مدت کے لئے اقتدار بھی ملا لیکن وہ تقریباً پانچ سو سال تک خاموش زندگی گذارتے رہے۔ ان کی دعوت کو اس درمیان میں ہندوستان میں کامیابی ہوئی۔ یہاں کی ابتدائی اسماعیلی نو آبادی گیارہویں صدی ہجری اور سترہویں صدی عیسوی کے اوائل میں بہت وسیع ہو گئی تھی اور اس کی اہمیت ابتدائی جماعت کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑھ چکی تھی۔ جس کی وجہ سے ضروری ہو گیا تھا کہ داعیوں کی قیام گاہ ہندوستان میں منتقل کر دی جائے۔ اس صورت حال کے پیش نظر مستعلویہ کا مرکز ۱۵۲۰ء/۹۲۶ھ میں احمد آباد منتقل ہو گیا۔ ہندوستان میں پہلا داعی یوسف بن سلیمان ہے مگر اس تبدیلی کے ساتھ مستعلویہ میں ایک نیا افتراق پیدا ہو گیا۔ جس کا باعث مذہبی پیشواؤں کی باہمی رقابت تھی۔ احمد آباد میں چھبیسویں داعی داؤد بن عجب شاہ کی وفات (۱۵۸۷ء/۹۹۶ھ)

کے بعد مستعلویہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے ان کی اکثریت داؤد بن قطب شاہ کو ستائیسواں داعی تسلیم کر کے ان کے تابع فرمان ہو گئی۔ جبکہ یمن والے سلیمان بن حسن کو ستائیسواں داعی تسلیم کر کے ان کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ داؤد بن قطب شاہ کو داعی تسلیم کرنے والے "داؤدی" اور سلیمان بن حسن کو داعی تسلیم کرنے والے "سلیمانی" کہلائے اس کے علاوہ اور بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے افتراقات ہوئے لیکن ان کی کوئی اہمیت نہیں۔

داؤدیوں اور سلیمانیوں میں بھی حقیقی اور اصولی اختلاف کوئی نہیں ہے۔ ہندوستان کے مستعلوی زیادہ تر گجرات، وسط ہند اور بمبئی میں مقیم ہیں۔ ہندوستان کی آخری مردم شماری ۱۹۵۵ء کی رو سے ان کی تعداد دو لاکھ بارہ ہزار ہے۔ مشرقی افریقہ میں ان کی بہت سی نو آبادیاں ہیں ان میں سے سلیمانی صرف چند سو ہیں اور باقی سب کے سب داؤدی ہیں جبکہ یمن میں چند ہزار اسماعیلیوں میں سے اکثریت سلیمانیوں کی ہے۔ یہ لوگ کلیۃً تجارت سے وابستہ ہیں اس لئے بوہرے کہلاتے ہیں۔

بوہرے

یہ لوگ بیشتر اسماعیلی فرقے کے شیعہ ہیں اور اس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو مصر کے فاطمی خلفاء میں سے المستعلی (۱۰۹۴ء تا ۱۱۰۱ء) کے اس دعوے کی حمایت کرتی ہے کہ وہی اپنے باپ (المستنصر) کے بعد تخت نشینی کا جائز حقدار تھا۔ بوہرے زیادہ تر ہندو نسل سے ہیں اور ان میں کسی قدر یمنی عربوں کے خون کی آمیزش بھی ہے۔ بوہرے کے معنی تاجر یا بیوپاری کے ہیں۔ یہ گجراتی لفظ "وہورو" سے لیا گیا ہے۔ جس کے معنی ہیں بیوپار کرنا اور تجارت کرنا۔ مگر یہ نام صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے کاغذات میں چھ ہزار چھ سو باون (۶۶۵۲) ہندوؤں اور پچیس (۲۵) جین مت کے پیروؤں نے اپنے آپ کو بوہرہ لکھوایا۔ ان کی صحیح تعداد کسی قدر مشکوک ہے کیونکہ ہندو بوہروں، سنی بوہروں (جو گجرات اور خاص طور پر راندیر میں پائے جاتے ہیں) اور جینی بوہروں کو کبھی کبھی اسماعیلی بوہروں کے ساتھ ملتبس کر دیا جاتا ہے ۱۹۰۱ء میں بوہروں کی تعداد ایک لاکھ چھیالیس ہزار دو سو چھپن بتائی گئی تھی۔ جن میں سے ایک لاکھ اٹھارہ ہزار تین سو سات بمبئی میں رہتے تھے۔ فرقوں کے تحت بوہروں کی مندرجہ ذیل تعداد دی گئی ہے۔

بوہرہ ۱۹۱۱ء، ۱۹۲۱ء، ۹۲۰۸۱ء، ۱۹۳۱ء، ۱۰۸۱۵۰ء، ۱۹۴۱ء، ۱۱۰۱۲۳ء، اور ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی روداد میں فرقوں کی تقسیم نہیں دی گئی۔ جس کی وجہ سے پاک و ہند میں ان کی صحیح تعداد ڈیڑھ لاکھ

بوہرے

اور تمام دنیا میں دولاکھ کے قریب ہوگی جن میں سیلون اور مشرقی افریقہ کے کاروباری لوگ داخل ہیں۔ بوہرے دو بڑی جماعتوں میں منقسم ہیں ان میں سے بڑی جماعت جو سب کے سب تاجر ہیں شیعوں (اسماعیلیوں اِمستعلویوں) کی ہے۔ دوسری جماعت سنیوں کی ہے۔ جس میں زیادہ تر کسان اور کاشتکار ہیں۔ راندیر (گجرات) کے کچھ سنی بوہرے برما میں کاروبار کرتے ہیں۔

اسماعیلی بوہروں کے کچھ خاندان اس بات کے مدعی ہیں کہ وہ ان لوگوں کی اولاد ہیں جنہوں نے عرب اور مصر سے نقل کر ہند میں پناہ لی تھی۔ اس دعویٰ کا ثابت کرنا مشکل ہے لیکن باہمی رشتہ ناتا خصوصاً یمن کے مستعلویوں سے شادی بیاہ کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ سلیمانی بوہروں کے سنیوں، اثنا عشری شیعوں، ہندوؤں یہاں تک کہ یورپ والوں سے بھی باہمی شادی بیاہ کے رشتے قائم ہوئے ہیں۔ لیکن بوہروں کی اکثریت گروہ کے باہر شادی نہیں کرتی۔

اس میں شک نہیں کہ بوہروں کی غالب تعداد ہندو نسل سے ہے جن کے آباؤ اجداد کو اسماعیلی مبلغوں نے "اسلام" میں داخل کیا تھا۔ عام روایت یہ ہے کہ ان میں سے پہلا مبلغ عبداللہ نامی ایک شخص تھا۔ جسے فرقہ مستعلویہ کے امام نے یمن سے بھیجا تھا۔ اس مبلغ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ۴۶۰ھ/۱۰۶۷ء میں کھمبایت (جنوبی ہندوستان) میں اترا اور سرگرمی کے ساتھ اپنے مذہب کی اشاعت کرنے لگا۔ دیگر روایات کے مطابق مستعلویوں کے پہلے مبلغ کا نام محمد علی (م ۵۳۲ھ/۱۱۳۷ء) تھا۔ جس کی قبر آج تک کھمبایت میں موجود ہے اور اس وقت انہلواڑہ کا چالوکیہ خاندان گجرات پر حکومت کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ہندو حکومت نے اسماعیلی مبلغوں کو اپنے مذہب کی اشاعت کی اجازت دے رکھی تھی اور اس نے ان کے تبلیغی کام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی جس سے ان مبلغوں کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ ۱۲۹۷ء میں یہاں کی مقامی ہندو حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور ایک صدی تک کم و بیش گجرات دلی کی حکومت کے زیر نگین رہا۔ بہر حال گجرات کے آزاد حکمرانوں کے زمانے میں (۱۳۹۹ء تا ۱۵۶۲ء) جو سنی عقائد کی اشاعت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے بوہروں کو چند موقعوں پر سخت دار و گیر سے دو چار ہونا پڑا۔

۹۴۶ھ/۱۵۳۹ء تک اس فرقے کا پیشوا یمن میں رہتا تھا اور بوہرے اس کی زیارت کرنے کے لئے وہاں جاتے تھے۔ آمدنی کا عشر اسے ادا کرتے اور اپنے تنازعے اور جھگڑے فیصلے کے لئے اس کے سامنے پیش کرتے تھے۔ اس کے بعد ۹۴۶ھ میں یوسف بن سلیمان

ترک وطن کر کے یمن سے ہندوستان آ گیا اور سدھ پور (ریاست بمبئی) میں سکونت اختیار کی۔ اس کے تقریباً پچاس سال بعد جب ۹۹۶ھ/۸۸-۱۵۸۷ء میں داعی داؤد بن عجب شاہ کا انتقال ہو گیا تو اس فرقے میں کچھ باہمی اختلاف پیدا ہو گیا۔ گجرات کے بوہروں نے جو اس فرقے کی اکثریت تھے۔ داؤد بن قطب شاہ کو اس کا جانشین منتخب کیا اور اس کے تقرر کی خبر اپنے ہم مذہبوں کو یمن بھیج دی۔ مگر اہل یمن جن کے ساتھ اس فرقے کے تھوڑے سے ہندوستانی بھی شامل تھے۔ ایک شخص سلیمان نامی کے دعاوی کی تائید کی جو کہتا تھا کہ جانشینی کا حق اسے پہنچتا ہے کیونکہ داؤد بن عجب شاہ نے اس کے متعلق تحریری حکم دے دیا تھا۔ یہ وثیقہ ابھی تک سلیمانی "دعوت" کے قبضے میں موجود ہے (اس فرقے کے جماعتی انتظام کو "دعوت" کہتے ہیں) لیکن اس کی صحت کی علمی، تنقیدی یا قانونی طور پر کبھی چھان بین نہیں کی گئی۔ سلیمان کی وفات احمد آباد میں ہوئی جہاں اس کی قبر کا اور اس کے حریف داؤد بن قطب شاہ کی قبر کا ان دونوں کے ماننے والے اپنے طور پر احترام کرتے ہیں۔ جو لوگ سلیمان کے دعاوی کو تسلیم کرتے ہیں وہ سلیمانیہ کہلاتے ہیں اور ان کا داعی یمن میں رہتا ہے۔ ہندوستان میں اس کا کارندہ "منصوب" کہلاتا ہے اور سلیمانی "دعوت" کا صدر مقام بڑودہ ہے۔ جہاں اسماعیلی مخطوطات کا ایک بڑا کتب خانہ ہے۔ ان دونوں میں ایک اور فرق یہ ہے کہ داؤدی گجراتی زبان کی ایک شکل استعمال کرتے ہیں جو عربی الفاظ اور جملوں سے معمور ہے۔ یہ لوگ اس زبان کو عربی خط میں لکھتے ہیں اور اسی میں اپنے انتظامی فرامین جاری کرتے ہیں اور خطبے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس سلیمانی ان تمام اغراض کے لئے اردو استعمال کرتے ہیں۔

داؤدی بوہروں کا پیشوا عموماً بمبئی میں رہتا ہے۔ لیکن اس کا صدر مقام سورت میں ہے اور "ڈیوڑھی" کے نام سے مشہور ہے۔ دونوں جگہ اسماعیلی مخطوطات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ سورت میں ایک عربی مدرسہ ہے جو "درس سیفی" کے نام سے مشہور ہے اور جس کا نام آج کل کے داعی سید طاہر سیف الدین کے نام پر رکھا گیا ہے (ان کا انتقال ہو چکا ہے اور ان کے جانشین ان کے بیٹے ہیں) ان کا دفتری لقب الداعی المطلق ہے۔ عام طور پر لوگ انہیں "ملاجی صاحب" یا "سیدنا صاحب" کہتے ہیں اور ان کے مرید ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ ان کے حضور میں ان کے گروہ کی ایک بڑی تعداد مخصوص انداز میں اظہار عجز و نیاز کرتی ہے۔ جسے "تقبیل الارض" زمین بوسی کہتے ہیں۔ بظاہر یہ رسم فاطمیوں کے زمانے سے چلی آتی ہے اور اس میں اور

فلسفہ میں ان کی بعض کتب طبع ہوئی ہیں۔ جیسے "دعائم الاسلام، کتاب الاقتصار، سیرت سیدنا المؤید" "راحۃ العقل، الرسالۃ الجامعہ" وغیرہ۔

بہرحال بوہرے ابوعلی منصور الآمر باحکام اللہ (م ۵۲۴ھ) کے بعد امام طیب بن آمر مستور کو تسلیم کرتے ہیں اور وہ آمر کے بعد قاہرہ میں مسند نشین ہونے والے خلفاء کو نہیں مانتے۔

بوہروں میں اوصیاء اور ائمہ کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

۱۔	حضرت علی	۲۔	امام حسن	۳۔	امام حسین
۴۔	امام زین العابدین	۵۔	امام محمد باقر	۶۔	امام جعفر
۷۔	امام اسماعیل	۸۔	امام محمد	۹۔	امام عبداللہ
۱۰۔	امام احمد	۱۱۔	امام حسین	۱۲۔	امام مہدی
۱۳۔	امام قائم	۱۴۔	امام منصور	۱۵۔	امام معز
۱۶۔	امام عزیز	۱۷۔	امام حاکم	۱۸۔	امام ظاہر
۱۹۔	امام مستنصر	۲۰۔	امام مستعلی	۲۱۔	امام آمر
۲۲۔	امام طیب				

پس بوہرے مہدویہ اعبیدیہ افاطمیہ میں مستعلویہ ہیں اور مستعلویہ میں طیبیہ ہیں۔

حضرت جعفر صادق کے بعد چار اماموں کے مستور و مخفی ہونے کے قائل ہیں اور وہ چار یہ ہیں۔

عبداللہ، احمد، حسین اور طیب

بوہرے بانی خلافت فاطمیہ اعبیدیہ امہدویہ عبداللہ مہدی کا سلسلہ نسب حضرت جعفر صادق تک اس طرح ملاتے ہیں۔

مہدی بن حسین بن احمد بن عبداللہ بن محمد بن اسماعیل بن جعفر صادق

چونکہ ۵۲۶ھ سے امام طیب مستور ہیں اس لئے ان کی طرف سے تمام کام داعی انجام دیتے ہیں اور ان کی ماتحتی میں دوسرے مذہبی عہدے دار ان کے حکم سے کام کرتے ہیں۔ داعی کی نسبت بوہرے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ گویا یہ امام الزمان کے قائم مقام ہیں اور ان کی عزت کرنا ایسا ہے جیسے امام الزمان کی عزت کرنا اور یہ بھی زعم ہے کہ امام الزمان نے داعی کو اس مسند پر بیٹھنے کی اپنی طرف سے اجازت دی ہے اور امام الزمان اس وقت مستور ہیں۔ جس وقت وہ ظاہر

گے اپنی مسند پر قائم ہو جائیں گے اور داعی ان کی طرف دعوت دیتے رہیں گے۔

داؤدی بوہروں کے دعاۃ مطلقین کی تعداد ایک فہرست کے مطابق چون (۵۴) اور ری کے مطابق پچپن ہے۔ اس سلسلے کے آخری داعی ابو محمد طاہر سیف الدین (۱۸۸۸-۱۹۶۵ء) ہ۔ انہیں ۲۷ برس کی عمر میں سیف الدین کا خطاب ملا۔ یہ اپنی وسیع المشربی اور مصالحت کے سلسلے میں بڑے مشہور ہیں اور علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے ہیں۔ جب یہ اودے پور سا جاتا آئے تو بوہروں کی عورتیں استقبالیہ نعرے لگاتے ہوئے کہتی تھیں کہ علی جی آئے علی جی آئے" یعنی امیر المومنین علی آئے۔

بوہروں میں "داعی" کے بعد دوسرا درجہ ماذون کا ہے اس کو اس بات کا اذن ہے کہ داعی عدم موجودگی میں وہ کام جو داعی کرتے ہیں یہ انجام دے اور جب داعی خود موجود ہوں تو تمام لات کی تحقیق کر کے داعی کے سامنے پیش کرے۔

"ماذون" کے بعد "مکاسر" کا درجہ ہے یہ شخص ماذون کا نائب سمجھا جاتا ہے اور نے چھوٹے دینی کام کو طے کرتا ہے اگر مناسب سمجھتا ہے تو ماذون تک پہنچا دیتا ہے۔

مکاسر کے بعد "مشائخ" کا درجہ ہے ان لوگوں کا یہ کام ہے کہ سب کو مجلس میں ب بٹھائیں اور داعی کا جو حکم ہو وہ مومنین کو سنائیں۔ انہیں مشائخ میں سے "عامل" بھی ہوتے ہیں۔ "ملّا" وہ ہوتا ہے جو روزے نماز کے مسئلے جانتا ہو۔ اس کا درجہ شیخ سے کم ہے ا کی طرف سے اس کو بطور اعزاز ایک گول پگڑی ملتی ہے۔

"میاں صاحب" عامل سے چھوٹا ہوتا ہے اور بعض اوقات عامل کسی سبب سے مسجد یا مں نہ آ سکے تو میاں صاحب کو وہ اپنی قائم مقامی کی اجازت دے دیتا ہے اس کے پاس سفید چادر رہتی ہے کسی وقت وہ اس کو اوڑھ لیتا ہے اور کسی وقت بغل میں دبا لیتا ہے ں صاحب جامہ بھی پہنے رہتا ہے اور اسے بھی عامل بنا دیا جاتا ہے۔

اسماعیلیہ کے افکار و عقائد

فرقہ اسماعیلیہ شیعہ امامیہ کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت جعفر صادق کی امامت تک اثنا عشریہ اور اسماعیلی دونوں متفق ہیں۔ چھٹے امام کے بعد اول الذکر فرقے کے نزدیک موسیٰ کاظم امامت کے منصب پر فائز ہوئے جبکہ مؤخر الذکر فرقے کے نزدیک امامت اسماعیل بن جعفر صادق اور پھر آگے ان کی اولاد میں منتقل ہو گئی۔ اسماعیل چونکہ اپنے والد کی زندگی میں ہی وفات پا چکے تھے۔ اس لئے ان کے بعد محمد بن اسماعیل امام مقرر ہوئے۔ تاریخ میں فرقہ اسماعیلیہ کے حسب ذیل نام پائے جاتے ہیں۔

۱۔ اسماعیلیہ۔۔۔ چونکہ یہ حضرت جعفر صادق کے بعد ان کے بڑے بیٹے اسماعیل کی امامت کے قائل ہیں اس لئے اسماعیلیہ کہلاتے ہیں۔

۲۔ سبعیہ۔۔۔ سبع سات کو کہتے ہیں یعنی سات کو ماننے والے۔ اسماعیلیہ کے یہاں سات کا عدد خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ شریعت کی دعوت دینے والے مندرجہ ذیل سات حضرات تھے۔

آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، محمد اور محمد مہدی بن اسماعیل المنتظر

مذکورہ بالا سات داعیوں میں سے ہر دو داعیوں کے درمیان سات امام ہوتے ہیں جو ان کی شریعت کی تکمیل کرتے ہیں۔ اس گروہ کے نزدیک ساتویں امام اسماعیل یا ان کے بیٹے محمد المکتوم ہیں۔ اس لئے یہ لوگ اثنا عشریہ کے مقابلے میں سبعیہ کہلائے۔

۳۔ بابکیہ یا خرمیہ۔۔۔ چونکہ یہ لوگ بابک خرمی کی پیروی کرتے تھے جس نے بائجان کے علاقے میں خروج کیا تھا اس لئے اس نام سے موسوم ہوئے۔

۴۔ محمرہ۔۔۔ بابک خرمی کی بغاوت کے دور میں یہ لوگ سرخ لباس پہنتے تھے اس لئے محمرہ (سرخ پوش) کہلائے۔

۵۔ تعلیمیہ۔۔۔ مخلوق کو امام معصوم کی تعلیم کی طرف بلانے کی وجہ سے ان کو تعلیمیہ کہا گیا۔

۶۔ میمونیہ۔۔۔ حمدان قرمط کے بھائی میمون نے فارس میں اسماعیلی دعوت دی۔ قرامطہ کو فارس میں میمونیہ بھی کہا گیا ہے۔ عبداللہ بن میمون القداح کی طرف منسوب فرقہ۔ اس شخص نے اسماعیلی افکار و عقائد کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

۷۔ باطنیہ۔۔۔۔ اس فرقے کا عقیدہ یہ ہے کہ شریعت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ ظاہر کو تو عام لوگ جانتے ہیں لیکن باطن کو صرف امام جانتا ہے۔ ان کی رائے میں قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ تاکہ اس عقیدہ کی بناء پر وہ جس طرح چاہیں قرآن کریم کی آیات اور احادیث نبویہ کی اپنے مخصوص مقاصد کے پیش نظر تاویل کر سکیں۔ ان تاویلات بعیدہ کو وہ باطن کا نام دیتے ہیں۔ ظاہر و باطن کے اس چکر میں اثنا عشریہ بھی باطنیہ کے ہم نوا ہیں۔ بہت سے صوفیاء نے بھی باطنی علم کا عقیدہ اسماعیلیہ سے اخذ کیا۔

انہیں یہ لقب اس لئے ملا کہ یہ اپنے معتقدات کو لوگوں سے چھپانے کی بھی کوشش کرتے تھے۔ اسماعیلیہ میں اخفاء کا رجحان پہلے پہل تو جور و ستم کے خوف سے پیدا ہوا اور پھر ان کی عادت ثانیہ بن گیا۔ ان کو باطنیہ کہنے کی یہ وجہ بھی ہے کہ یہ اکثر حالات میں امام کو مستور مانتے ہیں۔ ان کی رائے میں مغربی افریقہ میں ان کی سلطنت کے قیام کے زمانہ تک امام مستور رہے۔ یہ حکومت پھر مصر منتقل ہو گئی۔

بہر کیف اسماعیلیہ اپنے عقائد کو پس پردہ رکھنے کی کوشش کرتے اور مصلحت وقت کے تحت بعض افکار کو منکشف کرتے تھے۔ باطنیہ کے اخفاءِ عقائد کا یہ عالم تھا کہ مشرق و مغرب میں برسر اقتدار ہونے کے دوران بھی وہ اپنے افکار و آراء کو ظاہر نہیں کرتے تھے۔

اسماعیلیوں کے باطنی عقائد دو شعبوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک تاویل جس سے مراد نصِ قرآن اور صورت عبادات کے گہرے اندرونی معانی کا انکشاف ہے اور یہ فقط اماموں کا ہی حق ہے۔ دوسرے حقائق جو یونانی علم و فلسفہ، علم النجوم، علم الاسرار، علم السحر اور دیگر تصورات و اوہام کے باقیات کا معجون مرکب ہے۔ اسماعیلیوں کا اولین اقتدار خلافت بنی فاطمہ کے نام سے قائم ہوا۔ اسے عبیدی سلطنت بھی کہا جاتا ہے۔ یہ حکومت تقریباً دو سو ستر سال (۲۹۷ھ۔ ۵۶۷ھ) تک قائم رہی۔ اس نے اسلامی دنیا کے ایک بڑے حصہ کے عقائد، اعمال، اخلاق اور تمدن پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ یہ دور حکومت اعتقادی عجائبات، عجیب و غریب احکام اور مضحکہ خیز قوانین سے پر تھا۔ مشہور مؤرخ مقریزی لکھتے ہیں کہ!

۳۶۲ھ میں قانون میراث میں ترمیم کی گئی اور قانون بنایا گیا کہ اگر متوفی نے بیٹی چھوڑی ہو تو بیٹے، بھتیجے، چچا وغیرہ کو میراث میں کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ اس قانون کی خلاف ورزی

کو حضرت فاطمہؑ کے ساتھ عداوت کا مرادف سمجھا جاتا ہے۔ ہلال کا دیکھنا پوری مملکت مصر میں موقوف ہو گیا روزہ اور عید حساب سے ہونے لگے۔

۳۷۲ھ میں پورے ملک مصر میں تراویح کی سرکاری ممانعت کر دی گئی۔ مؤطا امام مالک کے ایک نسخہ کے پائے جانے پر ایک شخص کی تشہیر کی گئی۔

۳۹۳ھ میں تیرہ آدمیوں کو اس جرم میں زدوکوب کیا گیا اور ان کی تشہیر کی گئی کہ انہوں نے صلوٰۃ الضحیٰ (نماز چاشت) پڑھی تھی۔ ۳۹۵ھ میں ملوخیا (ایک ترکاری کو جو اہل مصر کو بہت مرغوب ہے اس لیئے ممنوع قرار دیا گیا کہ حضرت عائشہؓ کو بہت پسند تھی۔ اسی سن میں تمام مساجد ودیواروں اور مقابر پر سلف کو سب وشتم اور لعنت لکھی گئی اور اس کو منقش کیا گیا۔

۴۱۱ھ میں الظاہر لاعزاز دین اللہ نے شراب کی عام اجازت دی۔ عیش وعشرت اور لہو ولعب کی گرم بازاری ہوئی۔ اسی زمانے میں ملک میں سخت گرانی اور بیماریوں کا زور تھا لوگ شاہی محل کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور "الجوع الجوع" یعنی بھوک بھوک کے نعرے لگاتے تھے۔

۴۲۴ھ میں ولی عہد کی جس کی عمر چار سال کی تھی سواری نکلی تمام بازار آراستہ تھا لوگ زمین بوس ہوتے تھے۔ ان خلفاء میں متعدد اشخاص ایسے تھے جو نہایت کم سنی میں خلیفہ بنائے گئے اور مسلمانوں پر ان کی اطاعت فرض قرار دی گئی۔ مستنصر باللہ جب خلیفہ ہوا تو سات برس کی عمر تھی۔ آمر باحکام اللہ کی عمر خلافت کے وقت پانچ سال ایک مہینہ کچھ دن تھی۔ الفائز بنصر اللہ خلافت کے وقت صرف پانچ سال کا تھا۔ عاضد لدین اللہ کی عمر گیارہ سال تھی۔

(کتاب الخطط والآثار صفحہ ۲۵۵،۲۳۰۔ بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت جلد ۱، صفحہ ۲۷۰)

شیعہ مجتہد علامہ سید محمد طباطبائی لکھتے ہیں کہ!

اسماعیلیوں کا ایمان اور اعتقاد یہ ہے کہ یہ دنیا ہرگز حجت خدا سے خالی نہیں ہوتی اور خدا کی حجت دو طرح کی ہے۔ ایک ناطق ہے اور دوسری صامت، حجت ناطق تو خود پیغمبر ہوتے ہیں اور حجت صامت ولی یا امام ہوتے ہیں۔ جو پیغمبرؐ کے جانشین اور وصی ہیں۔

بہرحال حجت خداتعالیٰ کی ربوبیت اور خدائی کا مظہر ہے۔

حجت کی بنیاد ہمیشہ سات (۷) کے عدد کے گرد گھومتی ہے اس طرح کہ ایک نبی یا رسول آتا ہے جس کو خدا کی طرف سے نبوت اور ولایت ملی ہوتی ہے اور اس کے بعد اس

پیغمبرؐ کے سات جانشین ہوتے ہیں جن کو ولایت ملتی ہے۔ ان سب جانشینوں کا ایک ہی درجہ یا مقام ہوتا ہے سوائے اس کے کہ ساتواں جانشین نبی بھی ہوتا ہے۔ اس کے تین درجے ہیں۔ یعنی نبوت، جانشینی اور ولایت۔ اس کے بعد پھر دوبارہ جانشینی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور پہلے کی طرح سات جانشین ہوتے ہیں ساتواں جانشین ان تینوں مقامات اور درجات کا حامل ہوتا ہے اور یہ سلسلہ اسی نہج اور طریقہ پر چلتا رہتا ہے اور کبھی ختم نہ ہوگا۔ اسماعیلی کہتے ہیں کہ حضرت آدمؑ نبوت اور ولایت کے ساتھ دنیا میں تشریف لائے تھے اور ان کے سات جانشین تھے جن میں سے ساتویں حضرت نوحؑ تھے جن کو نبوت ولایت اور جانشینی عطا ہوئی تھی۔ پھر حضرت ابراہیمؑ ساتویں جانشین اور حضرت نوحؑ کے وصی تھے اور ابراہیمؑ کے ساتویں جانشین حضرت موسیٰؑ تھے حضرت موسیٰؑ کے ساتویں جانشین حضرت عیسیٰؑ تھے اور حضرت عیسیٰؑ کے ساتویں جانشین حضرت محمد ﷺ تھے اور اسی طرح حضرت محمد ﷺ کے ساتویں جانشین محمد بن اسماعیل تھے۔ اس طرح حضرت محمد ﷺ کے جانشین بالترتیب حضرت علیؑ، امام حسینؑ، حضرت علی بن حسینؑ (زین العابدین) حضرت امام محمد باقر، حضرت امام جعفر صادق، حضرت اسماعیل اور حضرت محمد بن اسماعیل ہوتے ہیں۔ (یہ لوگ دوسرے امام یعنی حضرت امام حسنؑ کو اپنا امام نہیں مانتے) محمد بن اسماعیل کے بعد ان کی اولاد سے سات افراد جانشین ہیں جن کا نام پوشیدہ ہے۔ اس کے بعد فاطمی بادشاہوں میں سے پہلے سات افراد جن میں سب سے پہلے عبیداللہ مہدی تھے۔ جو فاطمی سلطنت کے بانی ہوئے جانشین تھے۔ (شیعہ سنی ۴۹)

اسماعیلیہ باطنیہ کا انحصار زیادہ تر "علم تاویل" پر ہے۔ وہ تاویل کو شریعت کی حکمت، دین کا راز اور علم روحانی و باطنی بھی کہتے ہیں نبی کا فریضہ ہے کہ وہ لوگوں کو شریعت کے ظاہری احکام بتائے اور وصی کا کام یہ ہے کہ وہ ان کو ان کی تاویلوں سے آگاہ کرے۔ تاویلات میں یکسانیت ضروری نہیں یعنی ایک حکم کی تاویلات ایک سے زیادہ بھی ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ تاویلات بیان کرتے وقت مخاطب کی لیاقت، تقاضائے وقت اور حد امکان کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے اس لئے علم تاویل خاص درجہ والوں کو سکھایا جاتا ہے۔ باطنیہ کی چند تاویلات ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ وضو، سے امام کی پیروی مراد ہے۔
۲۔ تیمم، کا مطلب یہ ہے کہ جب اصلی امام موجود نہ ہو تو اس کے جانشین سے استفادہ کیا جائے۔
۳۔ صلوٰۃ، داعی کی دعوت میں داخل ہونا یا اس سے نبی اور رسول مراد ہے۔

۴۔ قبلہ کی طرف متوجہ ہونا، امام کی طرف متوجہ ہونا۔

۵۔ غسل، جو شخص غیر شعوری طور پر کسی راز کو افشاء کردے اس سے دوبارہ رازداری کا عہد لینے کو غسل کہتے ہیں۔

۶۔ زکوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ باطنی عقائد و احکام کا علم حاصل کر کے اپنے نفس کو پاک کیا جائے

۷۔ کعبہ، سے نبی اکرم ﷺ مراد ہیں اور "باب" سے حضرت علیؑ۔

۸۔ صفا و مروہ، صفا سے نبی اکرم ﷺ اور مروہ سے حضرت علیؑ۔

۹۔ تلبیہ، یعنی لبیک کہنا۔ اس کے معنی ہیں دعوت کو قبول کرنا۔

۱۰۔ سات مرتبہ طواف کعبہ، سے سات ائمہ کے ساتھ اظہار الفت و محبت مراد ہے۔

۱۱۔ جنت، تکلیف سے آرام پانے کا نام ہے۔

۱۲۔ جہنم، مشقت اٹھانے کو دوزخ کہتے ہیں۔

۱۳۔ ملائکہ، سے وہ داعی مراد ہیں جو اسماعیلی عقائد کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں۔

۱۴۔ شیاطین، سے اسماعیلیہ کے مخالفین مراد ہیں۔

۱۵۔ طوفان، اس سے علم کا سیلاب مراد ہے۔

۱۶۔ سفینہ، اس سے مراد بچاؤ کی جگہ ہے۔ جہاں امام کی دعوت کو قبول کرنے والا پناہ لیتا ہے

۱۷۔ یاجوج ماجوج، سے اہل ظاہر مراد ہیں۔

باطنیہ نے اپنے عقائد کی نشر و اشاعت کے لئے خفیہ تنظیمیں قائم کر رکھی تھیں۔ ان کا اولین نصب العین یہ تھا کہ اسلامی احکام کی تاویل کر کے ان کو باطنیہ کے مبنی بر دہریت والحاد اصول و قواعد کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے دعوت و تبلیغ کے چند مراتب مقرر کر رکھے تھے جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ذوق۔۔۔ سے مراد یہ ہے کہ دعوت دینے سے قبل یہ دیکھا جائے کہ جس شخص کو دعوت دی جا رہی ہے۔ وہ اسے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں۔

۲۔ تانیس۔۔۔ سے وہ یہ مراد لیتے ہیں کہ ہر شخص کو اس کے میلانات و رجحانات کے پیش نظر اپنے عقائد سے مانوس کرنے کی کوشش کی جائے اگر اس کا میلان "زہد" کی جانب ہو تو اس کے سامنے زہد کی مدح و ستائش اور حرص و آز کی مذمت کی جائے اور اگر آزاد منش ہو تو اس کے

سامنے آزاد خیالی اور آوارگی کی مدح وتوصیف اور زہد وتقویٰ کی مذمت پر لیکچر دیئے جائیں۔
داعی جس شخص کو دیکھے کہ وہ حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کا مداح ہے تو اس کے سامنے ان
تعریف کرے اور اسے بتائے کہ ابوبکرؓ وعمرؓ بھی شرعی احکام کی تاویل کے حق میں تھے۔ اس
نبی اکرم ﷺ ابوبکرؓ کو اپنے ساتھ غار میں لے گئے اور ان کو تاویل کا طریقہ سکھایا۔

۳۔ تشکیک۔۔۔ باطنیوں کا تیسرا طریقہ یہ تھا کہ دین اسلام کے اصول وارکا
صداقت کو مخاطب پر مشکوک بنانے کی کوشش کی جائے۔ مثلاً اس سے پوچھے کہ سورتوں کے
میں جو حروف مقطعات ہیں ان کا مطلب ومفہوم کیا ہے؟ اس میں کیا حکمت ومصلحت مضم
کہ حائضہ روزہ کی قضا دیتی ہے اور نماز کی نہیں؟ نماز کی رکعات میں فرق واختلاف کیوں
اس طرح مخاطب کے ذہن کو شک کے جال میں پھنسا دیتے تھے۔

۴۔ ربط۔۔۔ سے وہ دو باتیں مراد لیتے تھے اول یہ کہ مخاطب سے عہد لیتے تھے کہ و
کا راز افشا نہیں کرے گا۔ وہ اس کو یہ آیت سناتے "وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْكِیْدِ
قسموں کو پختہ کرنے کے بعد مت توڑو۔

دوم۔ وہ مخاطب کو اس بات کی تاکید کرتے تھے کہ جب بھی کسی الجھن میں مبتلا ہو
کا حل امام سے دریافت کرے کیونکہ امام کے سوا دوسرا کوئی شخص اس کو حل نہیں کر سکتا۔

۵۔ تدلیس۔۔۔ باطنیہ کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم دینی ودنیوی اکابر کے بالکل ہم نوا ہیں۔
سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ان کے مسلک کو فروغ ہو۔ اپنی مخصوص اصطلاح میں وہ اس کو تد
(فریب دہی) کہا کرتے تھے۔

۶۔ تاسیس۔۔۔ مخاطب کو دعوت دینے سے قبل باطنیہ اس کے حسب حال کچھ با
بطور تمہید بیان کرتے تھے۔ تاکہ وہ ان کی دعوت کا قائل ہو جائے۔ اس کو وہ تاسیس (بنیاد
کہتے تھے۔

۷۔ خلع۔۔۔ سے وہ یہ مراد لیتے کہ اسلام میں بدنی اعمال (نماز، روزہ) کی کچھ اہمیت نہ

۸۔ سلخ۔۔۔ اس کے لفظی معنی کھال اتارنا ہیں۔ باطنیہ کے نزدیک اس کا یہ مطلب
کہ جس شخص کو اپنے عقائد کی دعوت دی جائے پہلے اس کو اسلامی عقائد سے برگشتہ ومنحرف
جائے اور پھر اسے اسلامی احکام کی من مانی تاویلات قبول کرنے کے لئے آمادہ کیا جائے۔

دعوت کے ان مراتب سے باطنیہ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی نگاہ میں اسلامی افکار و معتقدات اور قرآنی تعلیمات کو تاویلات کے ذریعے مشکوک بنا دیا جائے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے ائمہ اہلبیت کی مدح سرائی کا ڈھونگ رچایا۔ مسلہ امامت میں اثنا عشریہ اور اسماعیلیہ کے درمیان کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔ محض شخصیتوں کا اختلاف ہے۔ دونوں کے نزدیک امامت اہلبیت کا حق ہے اور امام منصوص، معصوم اور مطاع ہوتا ہے۔ ایک کے نزدیک بارہواں امام محمد مہدی غائب، منتظر اور قائم ہے۔ جبکہ دوسرے کے نزدیک ساتواں امام محمد بن اسماعیل اس منصب پر فائز ہے۔

اسماعیلیہ کے بعض عقائد گذشتہ صفحات میں ان کے فرقوں کے حالات کے تحت گذر چکے ہیں۔ آج کل اسماعیلیہ کے ترجمان آغا خانی ہیں لہٰذا ان کا مسلک پیش خدمت ہے!

اسماعیلی / نزاری / آغا خانی فرقے کے پیر داعی سید صدر الدین کا ارشاد ہے کہ

"ہندو بھی اور مسلمان بھی روئیں گے۔ برہمن جوتشی بھی پران پڑھ کر روئیں گے۔ ملا قاضی بھی قرآن پڑھنے کے باوجود روئیں گے۔ اپنی کٹیا میں بیٹھے ہوئے جوگی بھی روئیں گے۔ جھوٹے سنی کتے بھی روئیں گے۔ کیونکہ ان کو شاہ برحق (امام) کی حفاظت نصیب نہ ہوئی۔ سب گمراہ لوگ پیر (امام) کو نہ پہچاننے کی وجہ سے روئیں گے۔ بس وہ نہیں روئیں گے جن کو ست گر (امام) مل گیا۔ ان کو تو نر علی مل گئے۔ ان کی حقیقت کا کیا کہنا"۔

(گنان نمبر ۱۳ صفحہ ۴ المقدس گنان کا مجموعہ۔ اسماعیلیہ ایسوی ایشن برائے بھارت بمبئی)

آغا خان سوم سلطان محمد شاہ کا ارشاد ہے کہ

"میں براہ راست حضرت محمد ﷺ کی نسل سے تعلق رکھتا ہوں اور دو کروڑ مسلمانوں کی تعداد مجھ پر یقین رکھتی ہے۔ مجھے اپنا روحانی پیشوا مانتی ہے۔ مجھے خراج ادا کرتی ہے اور میری عبادت کرتی ہے۔ اس وجہ سے کہ میری رگوں میں پیغمبر ﷺ کا خون ہے"۔

(ایور لیونگ گائیڈ از قاسم علی ایم جے۔ اسماعیلیہ ایسوی ایشن پاکستان کراچی)

موصوف مزید فرماتے ہیں کہ!

مرشد یعنی امام حاضر کو ہر بات کی خبر ہے اگر وہ یہ کہے کہ مہر (یعنی امام کی تصویر) کے آگے شراب کو سجدہ کرو تو کرنا چاہیے کیونکہ مرشد کا فرمان ہے۔ مرتضیٰ علی بزرگ ہیں ان کے

فرمان ماننے چاہئیں کیونکہ وہ خود اپنی قدرت سے گناہ بخش کر جنت میں بھیج سکتے ہیں۔ خ
ثانؓ کے وقت میں کچھ حصہ قرآن شریف میں سے نکال دیا گیا ہے اور کچھ حصہ بڑھا دیا
ہے۔ امام حاضر کے پاس ہر وقت ایک نئی چیز ہوتی ہے۔ عورتیں جو برقع پہنتی ہیں۔ وہ ا
بات نہیں ہے۔ مگر اپنے دل کی آنکھوں پر حیا کا برقعہ ڈالو تا کہ تمہارے دل میں کبھی کوئی برا خیال
آئے۔ لوگ کربلا میں جا کر اپنا وقت کیوں پھوکٹ میں ضائع کرتے ہیں؟ حضرت امام حسی
جماعت خانہ میں تشریف فرما ہیں اس لئے جماعت خانہ میں آیئے۔ آج کے دن تک جتنے گ
آپ لوگوں نے کئے ہیں وہ سب ہم معاف کرتے ہیں اب آئندہ گناہ نہ کرنا۔ ہمارے سار
روحانی بچوں کا مذہبی اور معاشرتی فرض اولین ہے کہ اپنی پوری وفاداری سے اور کلی طاقت
برٹش حکومت سے تعاون کریں۔ سلطنت (برطانیہ) اپنے مذہب، اپنے مقصد اور اپنی آزادی
محافظ ہے اس لئے اس وقت پر خلوص وفاداری کے ساتھ لاانتہائی خدمات انجام دینی چاہئیں"۔

{آغا خان سوم کے فرامین کا مجموعہ کلام امام مبین۔ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے انڈیا بمبئی}

یاد رکھنا چاہیے کہ امام حاضر کے فرامین کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے امام حاضر کے
احکام کی خلاف ورزی اللہ کے احکام کی خلاف ورزی ہے"

{کلام الٰہی یعنی فرامین امام مبین۔ برائے اسماعیلیہ ایسوی ایشن افریقہ۔ تنزانیہ}

یا علی مدد ــــ "یا علی مدد" ہمارا سلام ہے "مولیٰ علی مدد" سلام کا جواب ہے۔ اٹھتے بیٹھے
"یا علی مدد" بولتے رہنا۔ گھر سے باہر نکلتے وقت "یا علی مدد" بولنا۔ مذہبی سکول میں داخل ہوتے
وقت "یا علی مدد" کہنا۔ گھر میں داخل ہوتے وقت "یا علی مدد" کہنا۔

آغا خانیوں کا کلمہ حضرت علیؓ پر اللہ کے اوتار کی حیثیت سے ایمان رکھنا ہے۔ یعنی علیؓ
اللہ ہیں اور آغا خان حضرت علیؓ کے اوتار ہیں اور نور خداوندی کے مظہر ہیں۔ ان کے نزدیک
حضرت علیؓ میں خدائی نور ہونے کی وجہ سے اور حضرت علیؓ کا مبارک نام لینے سے خدائی نور کی
شناخت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ حضرت علیؓ کا نام کلمہ میں لیتے ہیں۔ علی اللہ یعنی اللہ میں سے
علیؓ ہیں۔ یا علی میں خدا کا نور ہے۔ آغا خانی کلمہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ و اشھد ان محمد رسول اللّٰہ و اشھد ان علیّ اللّٰہ"

قرآن شریف کی صحیح سمجھ اور اس کے چھپے بھیدوں کے صحیح معنی اور صحیح علم امام حاضر کو ہی

ہوتا ہے۔ امام حاضر قرآن ناطق ہے اس لئے اس کے فرمانوں کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ اس کے فرمانوں پر عمل کرنے والے دنیا میں فلاح پاتے ہیں۔ امام کا ہاتھ خدا کے ہاتھ کے برابر ہے۔ امام کا چہرہ خدا کے چہرہ کے برابر ہے۔ عقیدت سے امام کا دیدار کرنے والا خدا کا دیدار کر رہا ہے۔

(شکشمن ملا نمبر ۳ منظور شدہ دری کتاب برائے ریلجس نائٹ اسکولز اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے انڈیا بمبئی)

قرآن کے چالیس سپارے ہیں جن میں تیس پارے اس دنیا میں ہیں اور دس سپارے جو باقی رہے ہیں وہ اس (امام) کے گھر میں ہیں۔ ان (دس سپارے) کو اطہر وید کہتے ہیں ست گر (امام) کی زبان بھی (دس سپارے) ہیں۔ علیؓ اور محمدؐ دونوں ایک ہی ہیں لوگ ان کو الگ الگ خیال کرتے ہیں۔ جو لوگ علیؓ کو دل سے مانیں گے ان کی آل اولاد میں اضافہ ہوگا اور وہ فلاح پائیں گے اسی وجہ سے نر علی کی اطاعت و عبادت کرنا۔ اگر آپ نر علی کو دشون (دسواں حصہ) دیتے رہیں گے۔ تو آپ کی آل اولاد اور مال میں برکت ہوگی اور وہ یعنی علی آپ کا ایمان سلامت رکھے گا۔ اس لئے کہ ہمارا یہ نر علی (پوری کائنات کا) خالق مطلق ہے۔

(گنان مومن چیتامنی۔ از سید امام شاہ "مقدس گنانوں کا مجموعہ" مطبوعہ اینچ آر اینچ دی آغا خان اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے ہند۔ بمبئی۔ بحوالہ ہفت روزہ تکبیر کراچی ۱۵ فروری ۱۹۸۸ء)

آغا خانیوں کے نزدیک ائمہ نے جتنے پیر (حجت) مقرر کئے وہ سب نبی کریم جناب محمد ﷺ کے اوتار اور نور ہدایت کے مالک ہیں۔ کبھی کبھی ائمہ پیر (حجت) کا منصب بھی اپنی ذات میں رکھتے ہیں اور ایسی صورت میں امام "شاہ" بھی ہوتا ہے۔ پیر بھی اور حجت بھی۔ اس طرح اس میں دونوں نور یعنی نور الٰہی اور نور ہدایت ہوتے ہیں اور وہ اللہ اور رسول دونوں کا اوتار ہوتا ہے۔ یہی صورت موجودہ امام کی ہے۔ جو دونوں نور کا مالک ہے اللہ اور رسول دونوں کا اوتار ہے اور اس لئے پیر شاہ کہلاتا ہے۔ مختصراً موجودہ امام آغا خان خدا بھی ہے اور رسول بھی۔

قرآن۔۔۔ قرآن پاک کتابی شکل میں صامت ہے یعنی گونگا اور بہرہ۔ جبکہ امام آغا خان قرآن ناطق ہے لہٰذا آغا خان کے فرامین کی حیثیت ایسی ہی ہے۔ جیسے قرآن پاک کی۔ اس کے علاوہ قرآن پاک جو مسلمانوں کے پاس ہے اس کا متن تحریف شدہ ہے اس میں سے دس پارے حذف کر دیئے گئے ہیں اور اس میں کافی حصہ اضافہ شدہ ہے۔

قبلہ۔۔۔ مکہ معظمہ میں بیت اللہ حقیقت میں قبلہ نہیں ہے۔ امام آغا خان ہی قبلہ ہے

کیونکہ آغا خان نور الٰہی کا حامل ہے۔ لہٰذا اس کا جسم حقیقت میں قبلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغا خان کا محض دیدار ہی تمام گناہوں کو زائل کر دیتا ہے۔ اسی لئے آغا خان کے درشن کی باقاعدہ تقریب منعقد کی جاتی ہے۔ جس کی حیثیت حج کے برابر سمجھی جاتی ہے۔

صلوٰۃ۔۔۔ ان کے نزدیک نماز داعی کی دعوت میں داخل ہونے کو کہتے ہیں۔ جب اس مذہب میں نہ قبلہ ہے اور نہ قرآن تو پھر نماز کا کیا سوال پیدا ہو سکتا ہے؟ اس لئے ان کے ہاں مساجد کی بجائے جماعت خانے تعمیر کئے جاتے ہیں۔ جو کبھی بھی قبلہ رخ نہیں بنائے جاتے۔ جو در اصل باطنی مذہب کی عبادات کے مراکز، مریدوں کی تربیت اور خفیہ سازشوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے بطور اڈے استعمال کئے جاتے ہیں۔

آغا خان سوم سر سلطان محمد شاہ کا اسماعیلی مذہب کے بارے میں فرمان ہے کہ!

اپنا اسماعیلی مذہب بہت قدیمی ہے۔ (از فرمان نمبر ۹۲ بمبئی ۸-۲-۱۹۰۸)

تمہارا دین بہت اونچا، افضل اور سچا ہے یہ آج سے نہیں بلکہ ازل سے افضل ہے۔ یہ دین تم کو پیر صدر الدین نے کھوج کر دیا ہے اس کا سنبھالنا تم پر واجب ہے۔ (فرمان نمبر ۱۰۲ ابو ۲۹-۲-۱۹۰۸)

(دین تو ازلی اور قدیم ہے مگر کھوج کر پیر صدر الدین نے نکالا ہے)

تم روح پرست ہو اس لئے ہمیشہ تمہیں روح پرست ہی رہنا چاہیے۔ (روحانی راز صفحہ ۸۷)

فرقہ اسماعیلیہ کے مختصر تعارف کے ساتھ ہی سابقہ بحث (شیعت موسیٰ کاظم کے دور میں) بھی مکمل ہو گئی۔

شیعیت امام علی رضا کے عہد میں

حضرت موسیٰ کاظم نے بعمر ۵۵ سال ۱۸۳ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ ان کی اولاد میں اٹھارہ بیٹیاں اور انیس بیٹے تھے۔ علی رضا ان میں سب سے زیادہ صاحب علم اور جامع فضل و کمال تھے۔ جو مشہور قول کے مطابق ۱۴۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۰۳ھ میں فوت ہوئے۔ ان کی والدہ ایک کنیز تھیں۔ حضرت علی رضا اپنے والد کی وفات کے بعد ۱۸۳ھ میں منصب امامت پر فائز ہوئے۔ اس وقت عباسی خلیفہ ہارون الرشید برسر اقتدار تھے۔ اس کے بعد انہوں نے وفات تک اپنی امامت کا دور امین اور مامون کے عہد میں گذارا۔

خلافت عباسیہ چونکہ "ایرانیوں" کے خصوصی تعاون سے قائم ہوئی تھی لہٰذا وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ایرانی و مجوسی اثرات غالب آتے گئے حتیٰ کہ وزارت کا منصب اعلیٰ برامکہ کے ہاتھ میں آ گیا جو شیعہ تھے۔ اس لئے برامکہ کے دور وزارت میں عباسی خلفاء شیعہ اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ برامکہ کا اصلی مقصد ابو مسلم خراسانی کی طرح ایرانی سلطنت کا احیاء تھا۔ جس میں وہ اگرچہ بظاہر مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو سکے۔ مگر پھر بھی انہوں نے مسلمانوں کی اس عظیم سلطنت میں نہ اسلام رہنے دیا اور نہ ہی عربیت۔ ان دونوں کی جگہ عجمیت اور مجوسیت نے لے لی۔ یہ ایرانی سازش کی نہایت اہم کامیابی تھی۔

برامکہ کے لقب کی وجہ تسمیہ کے متعلق روایات میں اختلافات ہیں لیکن اکثریت کا خیال یہ ہے کہ اس لفظ کی اصلیت "برماہ گاہ" ہے یعنی ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدے کا اعلیٰ ترین متولی یا پجاری۔ برامکہ کا جدّ اعلیٰ برمک "نوبہار" مندر کا متولی اور پجاری تھا۔ اس لئے خراسانی اسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب ابو مسلم نے خراسان میں عباسیہ کی دعوت شروع کی تو برمک کا لڑکا خالد بھی اس کے ساتھ ہو گیا۔ یہ بڑا صاحب علم، دانشمند، صائب الرائے، فصیح و بلیغ، عالی ہمت، شجاع اور بہادر تھا۔ اس لئے دعوت عباسیہ کی تبلیغ میں اس سے بڑی مدد ملی۔ جس کی وجہ سے خلافت عباسیہ میں اسے بڑا رسوخ حاصل ہو گیا۔ خلیفہ المہدی کے زمانہ میں خالد برمکی کو صوبہ فارس کا حاکم بنایا گیا۔ اس کے بیٹے یحییٰ کو پہلے آذر بائیجان کا حاکم اور پھر اسے ہارون الرشید کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ یہ "اتالیق" خاندان برامکہ کے لئے انتہائی عروج کا باعث بن گئی۔

فضل اور جعفر یحییٰ کے دو بیٹے۔ باپ اور دادا سے بھی زیادہ قابل ثابت ہوئے۔ اس

خاندان نے مملکت میں سیاسی سطوت ہی حاصل نہیں کی بلکہ مملکت کے ہر گوشے کو ایرانی رنگ میں رنگ دیا۔ کسی نے بغداد میں "بیت الحکمۃ" بھی قائم کیا جس سے کتب عجمی تاریخ و ادب کو عربی زبان میں منتقل کیا گیا۔ بحث و مناظرے کی مجالس بھی منعقد کی گئیں۔ ان مجالس میں ایرانی، یہودی اور نصرانی علماء اور فلاسفر، مسلمان علماء کے ساتھ "اسلامی عقائد و نظریات" کے موضوع پر بحث کرتے تھے۔

شیعہ مجتہد سید محمد طباطبائی لکھتے ہیں کہ!

مامون الرشید عقلی علوم کی طرف بہت زیادہ مائل تھا اور اس سلسلے میں علوم عقلی کے عربی میں ترجمے کرائے۔ وہ علمی مجالس بھی منعقد کیا کرتا تھا۔ جن میں مختلف مذاہب کے علماء اور دانشور جمع ہوتے تھے۔ اس طرح وہاں علمی مناظرے ہوا کرتے تھے۔ امام ہشتم بھی ان مجالس میں شرکت کیا کرتے تھے اور دوسرے مذاہب کے علماء کے ساتھ بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔ ان مجالس اور مناظروں کو بہت زیادہ شیعہ احادیث میں نقل کیا گیا ہے۔ {شیعہ صفحہ ۲۰۷}

آگے چل کر برامکہ خطرناک انجام سے دو چار تو ضرور ہوئے لیکن وہ جس مقصد کو لے کر آئے تھے۔ اس میں بڑے کامیاب ہوئے۔ انہوں نے عربی مملکت کو خالص ایرانی اور عجمی بنا دیا۔ خالد برمکی کے عہد وزارت میں ایران کے "جشن نوروز" کا آغاز ہوا۔ جبکہ جعفر برمکی نے اپنے دور میں "جشن مہرجان" کی تقریب کو عام کیا۔ یہ دونوں تقریبیں مجوسیوں کی عیدیں تھیں۔ امین اور مامون کے درمیان عداوت کا بیج بھی اسی گروہ نے بویا تھا۔ خلفائے عباسیہ میں صرف امین ہی ایک خلیفہ ہے جو نجیب الطرفین ہاشمی تھا۔ وہ ایک حسین و جمیل، فصیح و بلیغ، شجاع اور فیاض آدمی تھا۔ لیکن اس کا دور حکمرانی "عجمی سازش" کی وجہ سے بہت ہی مختصر ہوا اور وہ اپنے بھائی مامون کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ مامون کی والدہ ایک ایرانی کنیز مراجل تھی۔ اس کو تمام ایرانیوں کی دلی حمایت حاصل تھی اور ہر طرف یہ نعرہ بلند ہوتا تھا کہ مامون ہمارا بھانجہ ہے۔ امین الرشید کا قتل درحقیقت ایرانیوں کی عربوں کے مقابلہ میں اہم کامیابی تھی۔ مامون کے پورے دور میں ایرانیت ... چھائی رہی۔

رمضان المبارک ۲۰۱ھ میں مامون نے فضل بن سہل تمیمی کی تحریک پر اپنے بھائی مؤتمن عباسی کو ولی عہدی سے معزول کر کے امام ہشتم علی رضا کو نہ صرف اپنا ولی عہد مقرر کیا بلکہ اپنی لڑکی کی شادی بھی ان سے کر دی۔ اس کے بعد مامون نے سیاہ لباس جو عباسیوں کا شعار تھا ترک کر کے سبز لباس جو اس وقت علویوں کا شعار تھا پہننا شروع کر دیا اور اس کی تقلید تمام اہل

دربار نے بھی کی۔ مامون نے عمال کے نام یہ حکم نامہ بھی بھیجا کہ لوگوں سے باقاعدہ علی رضا کی ولی عہدی کی بیعت لیں اور خود اس نے ایک جشن منعقد کر کے علی رضا کی ولی عہدی کا باضابطہ اعلان کیا۔ جس میں امام ہشتم نے بھی شرکت کی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب امام مامور من اللہ اور معصوم ہوتا ہے۔ تو پھر علی رضا نے ولی عہدی قبول کر کے مامون کی نیابت کیوں اختیار کی؟ کیا یہ شیعی عقیدہ امامت سے کھلم کھلا انحراف نہیں ہے؟

اہل تشیع اپنے امام کی اس "ولی عہدی" کا انکار تو نہیں کر سکے البتہ اس تحریک کو مامون کی ایک چال قرار دیا کہ وہ اس کے ذریعے علوی بغاوتوں پر قابو پانا چاہتا تھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ ان کے امام "عالم اذہب" ہونے کے باوجود اس چال کو نہیں سمجھ سکے۔ دوسری طرف جب یہ خبر بغداد میں پہنچی تو لوگوں کو یقین ہو گیا کہ فضل بن سہل نے خلافت عباسیوں سے نکال کر علویوں کے اندر پہنچانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ آل عباس اس بات کو کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس بات کی سب سے پہلی کوشش ابو مسلم خراسانی نے کی پھر یہی کوشش خاندان برامکہ نے کی جو مجوسی النسل تھے مگر وہ ناکام و نامراد رہے۔ اب ایک اور مجوسی النسل نے اس کوشش میں کامیابی حاصل کر لی۔ چونکہ اب اہل عرب اور اہل عجم کی تفریق بہت نمایاں ہو چکی تھی اور عام اہل عرب فضل بن سہل کو اپنا مخالف اور اہل عجم کا مربی یقین کرتے تھے۔ لہذا ہر ایک عربی النسل شخص نے علی رضا کی ولی عہدی کو اہل عجم کی کامیابی اور اپنی شکست تصور کیا۔ اس تمام تر مخالفت کے باوجود مامون اپنے فیصلے پر قائم رہا اور علی رضا کے بھائی ابراہیم بن موسیٰ کاظم کو یمن کی گورنری دینے کے علاوہ انہیں امیر الحج مقرر کر کے بھی بھیجا۔ مامون نے "مرو" سے بغداد کی طرف آتے ہوئے مقام "طوس" میں ایک ماہ سے زیادہ قیام کیا اور یہیں پر امام علی رضا انگور کھانے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ مامون کو ان کی وفات کا سخت صدمہ ہوا۔ جنازہ کے ساتھ ننگے سر گیا اور اپنے باپ ہارون الرشید کی قبر کے ساتھ ہی انہیں دفن کیا۔

شیعہ مجتہد سید محمد طباطبائی نے اس واقعہ کو ایک دوسرا ہی رخ دے دیا چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ!

مگر تھوڑے ہی عرصے بعد مامون کو شیعوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور ترقی اور اپنے امام سے بہت زیادہ محبت اور عوام کے استقبال اور حتیٰ کہ اس کے سپاہیوں اور اعلیٰ عہدیداروں کی توجہ امام کی طرف زیادہ ہو جانے سے اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ اس کا سدباب کرنے

پر آمادہ ہوا۔ اسی وجہ سے اس نے آپ کو زہر دلوا کر شہید کروا دیا۔ (شیعہ صفحہ ۱۴۰)

مؤرخ اسلام اکبر شاہ خان نجیب آبادی زہر خورانی کے واقعہ کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ!

لوگوں کا یہ کہنا کہ مامون الرشید نے خود علی رضا کو انگوروں میں زہر دلوایا سراسر غلط اور نادرست معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ علی رضا کی ولی عہدی کے لئے مامون الرشید کو مجبور نہیں کیا گیا تھا۔ اس نے اپنی خوشی سے ان کو اپنا ولی عہد بنایا اور اپنی خوشی سے اپنی دو بیٹیوں کی شادی علی رضا اور علی رضا کے بیٹے محمد کے ساتھ کی۔ بلا کسی دوسرے کی تحریک کے علی رضا کے بھائی کو یمن کی گورنری دی اور امیر الحج مقرر کیا۔ جس شخص کو وہ زہر دے کر مروا ڈالنا چاہتا تھا اس کے ساتھ یہ احسانات نہیں کر سکتا تھا۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ جس شخص کو اس نے زہر دے کر مروا ڈالا تھا اس کو اپنے باپ کی قبر میں دفن نہیں کر سکتا تھا۔ ہارون الرشید کی قبر میں ان کو دفن کرنا مامون کی سچی عقیدت کا ایک زبردست ثبوت ہے۔ جس میں کسی منافقت اور بناوٹ کو دخل نہیں ہو سکتا۔ ان کی وفات پر مامون کا اظہار ملال بھی اس بات کا ایک ثبوت ہے۔ اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مامون الرشید نے آئندہ اپنی حکومت و خلافت میں علویوں کے ساتھ ہمیشہ نیک سلوک کیا اور ان کو بڑے بڑے عہدوں پر مامور کرتا رہا جو اس بات کی دلیل ہے کہ مامون الرشید کو علویوں سے کوئی نفرت نہ تھی وہ علویوں کو بہتر حالت میں لانا اور ان پر احسان کرنا چاہتا تھا۔ اگر اس نے علی رضا کو زہر دلوایا ہوتا تو وہ آئندہ علویوں کے ساتھ اس طرز عمل کو جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بنو عباس یا ان کے ہوا خواہوں میں سے کسی نے امام علی رضا کو انگوروں میں زہر دیا ہو کیونکہ بنو عباس علی رضا کی ولی عہدی کے معاملے میں مامون الرشید سے ناراض تھے۔ امام علی رضا نے بعمر ۵۵ سال ماہ صفر ۲۰۳ھ میں وفات پائی۔ ۱۴۸ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے تھے۔ (تاریخ اسلام جلد ۲ صفحہ ۲۵۰)

حضرت علی رضا کے دور امامت میں کیسانیہ، زیدیہ، اسماعیلیہ اور دیگر چھوٹے چھوٹے فرقوں کے علاوہ کچھ نئے گروہ بھی وجود میں آئے۔ موصوف کے خاندان میں سے آٹھ حضرات نے ان کے مقابلہ میں اپنی امامت کا دعویٰ کیا۔

۱۔ محمد بن ابراہیم بن اسماعیل بن ابراہیم بن حسن المثنیٰ بن حسنؓ بن علی المرتضیٰؓ (کوفہ میں دعویٰ امامت کیا)

۲۔ محمد بن سلیمان بن داؤد بن حسن بن حسنؓ بن علی المرتضیٰؓ (مدینہ میں دعویٰ امامت کیا)

۳۔ علی بن محمد بن جعفر بن محمد بن علی بن حسنؑ بن علی مرتضیٰؑ (بصرہ میں دعوائی امامت کیا)

۴۔ زید بن موسیٰ کاظم بن جعفر صادق بن محمد باقر بن علی بن حسینؑ بن علی مرتضیٰؑ (بصرہ میں دعوائی امامت کیا)

۵۔ ابراہیم بن موسیٰ کاظم بن جعفر صادق بن باقر بن علی بن حسینؑ بن علی مرتضیٰؑ (یمن میں دعوائی امامت کیا)

۶۔ محمد بن یحییٰ بن زید بن علی بن حسینؑ بن علی مرتضیٰؑ

۷۔ حسین بن حسن بن علی بن علی زین العابدین بن حسینؑ بن علی مرتضیٰؑ

۸۔ محمد بن جعفر صادق بن محمد باقر بن علی بن حسینؑ بن علی مرتضیٰؑ

(مکہ میں دعوائی امامت کیا)

ان مدعیان امامت میں مؤخر الذکر یعنی محمد بن جعفر کی شخصیت ایسی ہے کہ حضرت علیؑ اور حضرت حسینؑ کے بعد "امیر المومنین" کے لقب سے ان ہی کو پکارا گیا۔ چنانچہ ابو الفرج اصفہانی (م ۳۵۶ھ) لکھتے ہیں کہ

وظهر فی هذه الایام محمد بن جعفر بن محمد بالمدینه و دعا الی نفسه و بایع له اهل المدینه بامره المومنین وما بایعوا علیها بعد الحسین بن علی احداً سوی محمد بن جعفر بن محمد۔ (مقاتل الطالبین صفحہ ۵۲۷ بیروت طبع جدید)

ان دنوں محمد بن جعفر بن محمد نے مدینہ منورہ میں خروج کیا اور لوگوں کو اپنی بیعت کی دعوت دی۔ مدینہ منورہ کے مسلمانوں نے ان کی امارت کے لئے بیعت کی۔ حسین بن علیؑ کے بعد "امیر المومنین" کی حیثیت سے محمد بن جعفر بن محمد کے علاوہ کسی اور کی بیعت نہیں کی۔

مؤرخ مسعودی نے محمد بن جعفر کے متعلق لکھا ہے کہ!

و کان یسمیٰ بالدیباجة لحسنه و بهائه۔ (مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۴۳۹ تحت ذکر ایام المامون)

وہ اپنی خوبصورتی اور حسن و جمال کی وجہ سے "دیباج" بھی کہلاتے تھے۔

اہل بیت اور دیگر علماء کرام میں ان کی شخصیت نہایت مستند تھی۔ بڑے بڑے محدثین کرام نے ان سے حدیث روایت کی ہے۔

وقد روی الحدیث و اکثر الروایة عن ابیه و نقل عنه المحدثون۔ (مقاتل الطالبین صفحہ ۵۳۸ تذکرہ محمد بن جعفر)

ابوالفرج اصفہانی مزید لکھتے ہیں کہ محمد بن جعفر کا تذکرہ ابو طاہر احمد بن عیسیٰ بن عبداللہ کے سامنے کیا گیا۔

فسمعنا ابا الطاهر يحسن الثناء عليه و قال كان عابداً فاضلاً و كان يصوم يوماً و يفطر يوماً۔ (حوالہ مذکور)

تو ہم نے ابو طاہر سے ان کے بارے میں تعریفی کلمات سنے۔ فرمایا وہ عبادت گذار علوم دینیہ کے فاضل اور ایک دن روزہ اور دوسرے دن افطار کرنے والے تھے۔

محمد بن حسن نوبختی لکھتے ہیں کہ

محمد بن جعفر ایک مرتبہ اپنے والد گرامی امام جعفر صادق کے پاس بچپن میں دوڑتے اور قیص کھینچتے ہوئے آئے اور ان کے بالکل سامنے کھڑے ہو گئے۔ امام جعفر اٹھے اور انہیں بوسہ دیا۔ ان کے چہرہ سے مٹی جھاڑی اور اپنے سینے پر بٹھایا اور کہنے لگے کہ میرے والد نے مجھ سے فرمایا تھا کہ جب تمہارے گھر میں میرا ہم شکل کوئی بچہ پیدا ہو تو میرے نام پر اس کا نام رکھنا پس وہ میرا اور رسول اللہ کا شبیہ ہو گا۔ (فرق الشیعہ صفحہ ۷۸ مطبوعہ نجف اشرف طبع جدید)

امام ہشتم علی رضا کے مقابلے میں دیگر ممتاز حضرات کے علاوہ مذکورہ بالا اوصاف کے حامل اور حضرت جعفر صادق کے صاحبزادے محمد بن جعفر نے بھی امامت کا دعویٰ کیا۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ امام ہشتم کے دور تک اہل تشیع کا عقیدہ امامت زیر تخلیق تھا ورنہ اگر امامت "منصوص من اللہ" ہوتی تو اس شرط کا اہل بیت میں سے ایسے یگانہ روزگار حضرات کو ضرور علم ہوتا اور وہ "امام منصوص" کے مقابلے میں اپنی امامت کا دعویٰ کر کے اسلام سے خارج ہونا ہرگز گوارا نہ کرتے۔

اہل تشیع نے جس طرح دیگر ائمہ حضرات کی طرف من گھڑت عقائد و نظریات منسوب کئے اسی طرح انہوں نے امام ہشتم علی رضا کو بھی معاف نہیں کیا۔

چنانچہ شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی (م ۴۶۰ھ) ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ

ایک شخص نے امام رضا سے عورت کے ساتھ وطی فی الدبر کے متعلق حکم دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا۔

احلتها الآية من كتاب الله تعالى قول لوط عليه السلام هؤلاء بناتي هن اطهر لكم وقد علم انهم لا يريدون الفرج۔ (الاستبصار طبع جدید تہران جلد ۳ صفحہ ۲۴۳ وسائل الشیعہ جلد ۱۴ صفحہ ۱۰۳ کتاب النکاح)

بل تشیع کے نزدیک وطی فی الدبر جیسا قبیح فعل جائز ہے اور جن ائمہ نے اسے ناجائز کہا تو انہوں نے اسے تقیہ پر محمول کیا۔ (وسائل الشیعہ جلد ۱۴ صفحہ ۱۰۱)

عبداللہ بن یعفور نے حضرت جعفر صادق سے اس آدمی کے متعلق پوچھا جو عورت کے ساتھ دبر میں وطی کرتا ہے تو امام نے فرمایا۔

لَا بَأْسَ اذا رضیت جب عورت راضی ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔

میں نے عرض کیا اگر یہ درست ہے تو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللهُ کا کیا مطلب ہوگا۔

امام نے فرمایا کہ هذا فی طلب الولد فاطلبوا الولد من حیث امرکم اللہ۔ یہ ارشاد اولاد کی طلب کے لئے ہے یعنی اولاد اس جگہ اور اس طریقہ سے طلب کرو جس کا اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔ (وسائل الشیعہ جلد ۱۴ کتاب النکاح باب عدم تحریم الوطی فی الدبر)

اہل تشیع نے اسی طرح کے بیسیوں مسائل گھڑ کر اپنے معصوم، مطاع اور منصوص ائمہ کی طرف منسوب کر دیئے۔

شیعیت محمد تقی کے عہد میں

فرقہ اثنا عشریہ کے آٹھویں امام علی رضا کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے محمد (جن کا لقب تقی اور جواد ہے) ۲۰۳ھ میں بعمر سات برس امام نہم کی حیثیت سے منصب امامت پر فائز ہوئے۔ محمد تقی ۱۹۵ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ کا نام سمکہ ہے جو ایک کنیز اور نوبیہ (افریقہ کا ایک شہر ہے) کی رہنے والی تھیں جناب علی رضا کے انتقال کے وقت ان کی عمر سات سال چند ماہ تھی ان کی رحلت ماہ ذیقعدہ ۲۲۰ھ میں بعمر ۲۵ سال ہوئی۔ اس طرح ان کو مدت امامت سترہ (۱۷) سال ملتی ہے۔

امام نہم محمد تقی نے اپنی امامت کا یہ دور عباسی خلیفہ مامون اور معتصم کے عہد میں بسر کیا۔ خلیفہ مامون کو علی رضا کی طرح ان کے بیٹے محمد تقی سے بھی بہت زیادہ محبت اور عقیدت تھی۔ یہاں تک کہ خلیفہ نے اپنی بیٹی کا نکاح بھی ان کے ساتھ کر دیا۔ اہل تشیع نے امام ہشتم کے دور کی طرح اس دور میں بھی خوب ترقی کی کیونکہ ان کے امام خلیفہ وقت کے داماد تھے اور راستے کی تمام رکاوٹیں دور ہو چکی تھیں۔ اسی دور میں مامون کی ذاتی دلچسپی سے فرقہ معتزلہ خوب پروان چڑھا۔

مامون نے عیسائیوں، یہودیوں اور مجوسیوں کو تو پوری آزادی دے رکھی تھی لیکن مسلمانوں پر معتزلی مذہب اختیار کرنے کے لئے ہر قسم کی سختیاں کرتا تھا۔ اعلیٰ ملازمتوں سے ہر اس مسلمان کو نکال دیا جاتا تھا۔ جو علی الاعلان معتزلی مذہب اختیار نہ کرتا۔ جو علماء ذرا بھی معتزلہ کے خلاف زبان کھولتے ان کی طرح طرح سے تذلیل و تشہیر کی جاتی۔ انہیں کوڑوں سے پٹوایا جاتا۔ اور انہیں قید و بند کی سزائیں دی جاتیں۔ مامون کی مادری زبان فارسی تھی۔ اس لئے اس نے فارسی زبان کی بڑی سرپرستی کی خود اس کی درباری اور گھریلو زندگی تمام تر ایرانی عیش و عشرت اور ایرانی تہذیب و تمدن کا نمونہ تھی۔ اس نے اپنے وزیر کی حسین و ذہین بیٹی بوران سے شادی کر لی تھی۔ جس نے سارے ایرانی نوک پلک سے درباری اور گھریلو زندگی کو تکلف و تصنع کے ساتھ سجا دیا تھا۔ عربی سادگی کے نشانات جو ابتدائے خلافت عباسیہ سے ہی کم ہوتے جا رہے تھے اب المامون کے عہد میں اہل تشیع کی مداخلت اور دسیسہ کاری سے بالکلیہ ناپید ہو گئے۔

امام نہم چونکہ سات سال کی عمر میں مسند نشین ہوئے تھے۔ اس لئے اہل تشیع کے مابین اس مسئلہ میں اختلاف پیدا ہو گیا کہ آیا ایک نابالغ، کم سن اور نوعمر بچہ امام ہو سکتا ہے یا نہیں ایک گروہ نے نابالغ کی امامت سے اختلاف کرتے ہوئے اعلان کیا کہ امامت علی رضا پر ختم ہو گئی اور اس جماعت نے ان کے بیٹے کو امام تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ گروہ "واقفیہ" کہلایا۔ یاد رہے کہ اس سے قبل بھی اہل تشیع کے ایک گروہ نے سلسلہ امامت کو موسیٰ کاظم پر وقف کر دیا تھا۔

امام محمد تقی کے دور امامت میں دو اور شخصوں نے بھی امامت کا دعویٰ کیا ان میں سے ایک عبدالرحمٰن بن احمد بن عبداللہ بن محمد بن عمر بن علی زین العابدین بن حسینؑ بن علیؑ ہیں اور دوسرے محمد بن قاسم بن علی بن عمر بن علی زین العابدین بن حسینؑ بن علیؑ ہیں۔ مؤخر الذکر جہاں اہل بیت کے ممتاز فرد ہیں وہاں وہ شیعہ کتب کی روشنی میں بھی ایک عالم، متقی اور فقیہ تھے۔

کان من اهل العلم و الفقه و الزهد و حسن المذهب وہ صاحب علم، صاحب تقویٰ و زہد اور مذہب کے اعتبار سے بہت خوب تھے۔ (مقاتل الطالبین لابی الفرج اصفہانی ص ۴۶۴ بحوالہ محمد بن قاسم بن علی)

یہی مؤلف آگے چل کر لکھتے ہیں کہ!

مارأيت قط اشد و اجتهاد امنه ولا اعف ولا اكثر ذكر الله عزو جل مع شدة نفس و اجتماع قلب ما ظهر منه جزع و لا انكسار ولا خضوع في الشدائد التي مرت

بہ وانھم مازاؤ ۃ قط مازحا ولا ھاذلا ولا ضاحکا۔ (خلاصہ کہ صفحہ ۵۸)

راوی کہتا ہے کہ میں نے ان سے بڑھ کر کسی کو اجتہاد کرنے والا زیادہ معاف کرنے والا اور اللہ کا دل جمی کے ساتھ ذکر کرنے والا نہ پایا ان سے کبھی گریہ وزاری اور بے صبری دیکھنے میں نہ آئی اور اپنے اوپر گذرنے والی پریشانیوں اور مصیبتوں میں کبھی فریاد کرتے نہ دیکھا لوگوں میں سے کسی نے ان کو نہ مذاق کرتے دیکھا نہ فضول بات کرتے اور نہ ہی کھل کر ہنستے دیکھا۔

حیرت ہے کہ مذکورہ صفات حسنہ کے حامل کو اہل تشیع نے ایک من گھڑت شرط کی بناء پر روسیاہ جہنمی اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیا کہ موصوف نے نہ صرف امام نہم کی بیعت نہیں کی بلکہ ان کے مقابلے میں اپنی امامت کا دعویٰ بھی کیا۔

دراصل شیعہ نہ ائمہ اہل بیت کے معتقد و مطیع ہیں اور نہ ہی خاندان اہلبیت کے محب وہ جہاں ائمہ اہلبیت کے انتہائی گستاخ ہیں وہاں وہ خاندان اہلبیت کے بھی سخت دشمن ہیں۔

امام نہم محمد تقی کی طرف منسوب ایک عبارت بلا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں۔

عبدالعظیم نے امام تقی سے پاخانہ اور اس کی بدبو کے بارے میں پوچھا تو امام نے فرمایا اللہ نے آدم کو مٹی سے بنایا جو چالیس سال تک بغیر روح کے پڑا رہا فرشتے اس کے پاس سے گذرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ کس لئے پیدا کیا گیا اور شیطان اس ڈھانچہ کے منہ میں سے گھس کر دبر سے نکلتا رہا۔ اسی لئے ابن آدم کا پیٹ اندر سے بدبودار اور گندہ ہو گیا۔

(مناقب آل ابی طالب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۳۸۱ تحت فی علمہ علیہ السلام)

اہل تشیع کے نزدیک امام نہم محمد تقی کو خلیفہ معتصم باللہ کے حکم سے ان کی بیوی کے ذریعے زہر دلوا کر شہید کیا گیا۔ (شیعہ صفحہ ۳۰۸)

لیکن دنیائے شیعیت کی عظیم علمی شخصیت آیت اللہ شیخ مفید اس افسانے کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ!

آپ کو زہر دے کر شہید کیا گیا ہے۔ لیکن میرے ہاں یہ خبر ثابت نہیں ہو سکی تا کہ میں اسے شاہد بناؤں۔ (تذکرۃ الاطہار صفحہ ۴۲۷)

متاخرین شیعہ شیخ مفید کے اس قول کے ساتھ اتفاق نہیں کرتے ان کے نزدیک ائمہ اہلبیت سے یہ روایت منقول ہے کہ "ما منا الا مقتول او مسموم" ہم میں سے ہر شخص کو قتل کیا گیا یا زہر

دی گئی۔ لہٰذا اس روایت کی بنا پر امام محمد تقی کو بھی زہر کے ذریعے شہید کیا گیا۔

چنانچہ محمد بن علی شہر آشوب امام تقی کے معجزات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ!

روایت کی گئی ہے کہ امام تقی کی بیوی ام الفضل بنت مامون نے امام تقی کی شرم گاہ پر زہر لگا کر رومال لگا دیا۔ آپ نے جب اس تکلیف کو محسوس کیا۔ تو بیوی سے کہا اللہ تجھے لا علاج بیماری میں مبتلا کرے۔ لہٰذا ام الفضل کی شرم گاہ میں پھوڑا نکل آیا جس کے علاج کے لئے وہ حکیموں کے پاس جاتی وہ اس کی شرم گاہ کو دیکھتے اور اس پر دوائی لگا کر خوش ہوتے لیکن اسے کسی دوائی سے نفع نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ وہ اسی بیماری میں ہی فوت ہو گئی۔ (مناقب آل ابی طالب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۳۹۱)

یہ کسی دشمن اہل بیت کی روایت نہیں بلکہ "محب اہل بیت" کی روایت ہے جو یقیناً امام تقی اور ان کی اہلیہ محترمہ کی شان میں بدترین گستاخی ہے۔

شیعیت امام دہم علی نقی کے عہد میں

امام نہم محمد تقی نے اپنے بعد دو بیٹے (علی اور موسیٰ) اور تین بیٹیاں (فاطمہ، امامہ اور حکیم خاتون) چھوڑیں۔ ان میں سے علی اپنے والد کے بعد بعمر آٹھ سال ۲۲۰ھ میں منصب امامت پر فائز ہوئے۔ علی بن محمد تقی (جن کا لقب نقی اور ھادی ہے۔ ۲۱۲ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے اور ۲۵۴ھ میں "سر من رای" (سامرہ) میں بعمر اکتالیس برس فوت ہوئے ان کی والدہ ایک کنیز تھیں جنہیں سمانہ کہا جاتا ہے۔ ان کی امامت کی مدت ۳۳ سال ہے۔

امام دہم علی نقی نے سات عباسی خلفاء مامون، معتصم، واثق، متوکل، منتصر، مستعین اور معتز کا عہد خلافت پایا۔ متوکل اول کے دور کے علاوہ باقی تمام ادوار میں شیعیت نے بہت ترقی کی کیونکہ مامون کے دور سے ہی ایرانیوں نے خلافت عباسیہ پر تسلط حاصل کر لیا تھا اور اس تسلط کی وجہ سے انہوں نے ہر طرف شیعہ عقائد پھیلانے کی خوب کوشش کی۔

دوسری طرف ان عباسی خلفاء نے اہل سنت پر بے پناہ مظالم ڈھائے امام اہل سنت امام احمد بن حنبل کو بغداد کی سڑکوں پر گھسیٹا گیا اور ان پر کوڑے برسائے گئے۔ اس دور میں شیعیت کے فروغ پر تبصرہ کرتے ہوئے شیعہ عالم سید محمد طباطبائی لکھتے ہیں کہ!

تیسری صدی ہجری کے آغاز سے شیعوں نے تازہ سانس لیا اس کا پہلا سبب یہ تھا کہ یونانی سریانی اور دوسری زبانوں سے بہت زیادہ علمی اور فلسفی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ ہو گئی

تھیں اور لوگ استدلال اور عقلی علوم کو حاصل کرنے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ عباسی خلیفہ مامون الرشید (۱۹۵ھ تا ۲۱۸ھ) معتزلہ مذہب کا پیرو تھا اور مذہب میں عقلی استدلال کی طرف مائل تھا۔ لہٰذا اس نے مختلف ادیان اور مذاہب میں لفظی استدلال کے رواج کی عام آزادی دے رکھی تھی یہی وجہ تھی کہ علماء اور شیعہ متکلمین نے اس آزادی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور انہوں نے علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اہل بیت کے مذہب کی تبلیغ میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ دوسرے یہ کہ خلیفہ مامون الرشید نے سیاسی حالات کے پیش نظر شیعوں کے آٹھویں امام حضرت رضا علیہ السلام کو اپنا ولی عہد اور جانشین بھی بنایا ہوا تھا۔ جس کے نتیجے میں علوی خاندان اور اہلبیت کے دوست اور طرف دار ایک حد تک سرکاری عہدیداروں کے ظلم و تشدد سے محفوظ ہو چکے تھے اور کم و بیش آزاد تھے۔ (شیعہ صفحہ ۵)

شیعہ عالم کے اس اعتراف سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ خلافت عباسیہ میں شیعہ مذہب خوب پھیلا متوکل اول کے دور میں اسے پہلی مرتبہ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ متوکل نے مسند نشین ہوتے ہی اپنے پیش رو خلفاء کا طرز عمل بدل دیا۔ اس نے اہل سنت کے سینکڑوں علماء اور حاملین سنت کو جو اس وقت قید خانوں میں پڑے ہوئے تھے رہا کر دیا۔ اس نے مسئلہ خلق قرآن پر ہر قسم کے مناظروں اور مجالس پر پابندی لگا دی۔ علم حدیث کی تعلیم دینے والوں کی قدر افزائی کرتے ہوئے تمام محدثین کو دارالخلافہ سامرہ میں مدعو کیا اور بے حد تعظیم و تکریم سے پیش آیا۔ متوکل نے حکم دیا کہ محدثین مساجد میں آزادی کے ساتھ درس حدیث دیں اور صفات باری تعالیٰ کے متعلق احادیث بیان کریں۔ حالانکہ اس سے پیشتر وہ علانیہ درس نہیں دے سکتے تھے۔ متوکل کے اس طرز عمل سے مسلمان بہت ہی خوش ہوئے۔ مساجد میں درس حدیث جاری ہوئے۔ متوکل نے قبر پرستی کو مٹایا اور حضرت حسینؓ کی قبر پر شیعوں نے جو شرکیہ مراسم شروع کر دی تھیں ان کو نہ صرف موقوف کرا دیا بلکہ پہلے خلفاء کے دور میں تعمیر کردہ ان مقبروں کو بھی مسمار کرا دیا۔ اس لئے ایرانی اور عام طور پر شیعہ متوکل کے دشمن ہو گئے اور انہوں نے اسے اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش تیز کر دی۔

متوکل اپنے بعد اپنے بیٹے منتصر کو ولی عہد مقرر کر چکا تھا۔ لیکن اس پر شیعیت غالب تھی اور وہ اعتزال میں واثق اور معتصم کا ہم عقیدہ تھا۔ اس لئے متوکل نے ارادہ کیا کہ منتصر کے

بجائے اپنے دوسرے بیٹے معتز کو ولی عہد بنا دے۔ اس پر منتصر اپنے باپ کا دشمن بن گیا اور اس نے شیعوں، ایرانیوں اور ترکوں کے تعاون سے اپنے باپ کو قتل کرا کے مسند خلافت سنبھال لی لیکن یہ صرف چھ ماہ کے بعد فوت ہو گیا۔

منتصر نے مسند نشین ہوتے ہی معتزلہ، علویوں اور شیعوں پر سے پابندیاں ختم کر دیں۔ اس نے شیعوں پر بہت احسانات کیے۔ حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کے مقبروں کی دوبارہ تعمیر کرائی اور شیعہ مذہب کی اعلانیہ تبلیغ شروع ہو گئی۔ دوسری طرف منتصر ترکوں کی طاقت واقتدار کو مٹانے پر مستعد ہو گیا۔ نتیجتاً ترکوں نے طبیب ابن طیفور کو رشوت دے کر زہر آلود نشتر سے اس کی فصد کھلوا دی جس سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ منتصر نے مرتے وقت کہا تھا کہ اے میری ماں مجھ سے دین و دنیا دونوں جاتے رہے میں اپنے باپ کی موت کا باعث بنا ہوں اور اب میں بھی اس کے پیچھے جا رہا ہوں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ خاندان کسریٰ میں ایک شخص شیرویہ نامی نے اپنے باپ کو قتل کیا تھا وہ بھی منتصر کی طرح چھ ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہا۔

امام دہم علی نقی کے دور میں شیعیت پروان چڑھتی رہی صرف متوکل کے تقریباً پندرہ سالہ دور خلافت میں اسے دھچکا لگا تو متوکل کو خاندان رسالت کا دشمن قرار دے دیا گیا۔

چنانچہ شیعہ عالم سید محمد طباطبائی لکھتے ہیں کہ!

خلیفہ متوکل عباسی خاندان رسالت کی دشمنی میں دوسرے خلفاء کے مقابلے میں بے مثال تھا۔ خصوصاً حضرت علیؓ کا سخت دشمن تھا اور آپ کی شان میں کھلم کھلا توہین آمیز الفاظ کہا کرتا تھا۔ یا آپ کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ اس نے ایک شخص کو مامور کیا تھا جو بھری محفل میں آپ کی نقلیں اتارا کرتا تھا اور خلیفہ قہقہہ لگا کر ہنسا کرتا تھا۔ ۲۳۷ھ میں اس کے حکم سے کربلا میں حضرت امام حسینؓ کا مقبرہ، گنبد اور آس پاس کے کئی مکانات کو مسمار کر کے زمین کے ساتھ یکساں کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس کے حکم سے امام کے مقبرے پر پانی چھوڑا گیا پھر اس نے حکم دیا کہ امام کے مقبرہ کی جگہ پر ہل چلا کر کھیتی باڑی کی جائے تاکہ امام کے مزار کی جگہ اور آپ کا نام بالکل مٹ جائیں۔ متوکل کے زمانے میں علوی سادات کے حالات رقت بار اور ناگفتہ بہ ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی عورتوں کے پاس تن ڈھانپنے کے لئے کپڑے تک موجود نہ تھے اور بعض کے پاس

صرف ایک بوسیدہ سی چادر ہوا کرتی جس کو اوڑھ کر وہ باری باری نماز ادا کیا کرتی تھیں اس قسم کے دباؤ ان علوی خاندانوں پر بھی وارد ہوئے جو مصر میں قیام پذیر تھے۔ (شیعہ صفحہ ۱۰۶)

خلیفہ متوکل کا قصور بس اتنا تھا کہ اس نے اپنے پیش رو خلفاء کی طرف سے اہل سنت پر عائد کردہ پابندیاں ختم کر دی تھیں اور قبر پرستی اور شرکیہ رسوم کو مٹا دیا تھا نیز اس نے شیعوں کو اپنی حدود میں رہنے پر بھی پابند کر دیا تھا۔ وہ خاندان رسالتؐ اور حضرت علیؓ کا ہرگز دشمن نہیں تھا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ شیعہ خود ائمہ اہلبیت اور خاندان رسالتؐ کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔

امام علی نقی کے دور امامت میں ان ہی کے خاندان میں سے چند افراد نے امامت کا دعویٰ کیا۔

۱۔ حسن بن زید (محمد بن اسماعیل بن حسن بن زید بن حسن بن حسنؓ، بن علیؓ) طبرستان میں دعویٰ امامت کیا۔

۲۔ حسن بن اسماعیل (بن محمد بن عبداللہ بن علی زین العابدین بن حسینؓ بن علیؓ) نے قزوین میں امامت کا دعویٰ کیا۔

۳ یحییٰ بن عمر (بن حسین بن زید بن علی زین العابدین بن حسینؓ بن علیؓ) نے کوفہ میں امامت کا دعویٰ کیا۔

یہ مدعیان امامت اور ان کے پیرو شیعہ کے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو گئے کیونکہ انہوں نے امام دہم علی نقی کی نہ صرف یہ کہ بیعت نہیں کی بلکہ ان کے مقابلہ میں اپنی امامت کا اعلان بھی کیا۔

امام علی نقی رجب ۲۵۴ھ میں فوت ہوئے اور انہوں نے اپنے پیچھے چار بیٹے (حسن، حسین، محمد اور جعفر) اور ایک بیٹی (عائشہ) چھوڑی۔

شیعیت امام یازدہم حسن عسکری کے عہد میں

علی نقی کی وفات (۲۵۴ھ) کے بعد ان کے بیٹے حسن عسکری ۲۲ سال کی عمر میں منصب امامت پر فائز ہوئے ان کی ولادت ۲۳۲ھ میں اور رحلت ۲۶۰ھ میں ہوئی اس وقت ان کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ ان کی والدہ حدیثہ ایک کنیز تھیں۔ اور ان کی مدت امامت چھ سال ہے۔ حسن عسکری نے تین عباسی خلفاء المعتز باللہ المہدی باللہ اور المعتمد علی اللہ کا دور پایا یہ دور سیاسی طور پر طوائف الملوکی اور انتشار کا تھا خلیفہ معتز ترکی فوجی افسروں کے زیر تسلط رہا اور ترک امراء

بھی باہم متحد و متفق نہ تھے اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔ مصر میں احمد بن طولون نے ایک آزاد حکومت قائم کر دی۔ جس سے مصر میں "دولت طولونیہ" کی بنیاد پڑی جو ۲۶۳ھ سے ۲۹۲ھ تک قائم رہی۔ لیکن خلافت بغداد کی برتری کا اقرار کرتی رہی۔ حجاز اور عراق میں متعدد بار علویوں نے بدنظمی پیدا کی مگر انہیں ترکی امراء نے فوجی قوت سے دبا دیا۔ ملک میں عام بدنظمی تھی۔ خزانہ خالی تھا۔ فوجیوں کو کئی ماہ سے تنخواہیں نہیں ملی تھیں۔ وہ ۲۵۵ھ میں خلیفہ المعتز کے محل سامرا میں گھس گئے اور اسے گھسیٹ کر باہر لائے اور زدوکوب کر کے قید کر دیا۔ پھر اسے قید ہی میں قتل کر دیا۔ اس کے بعد ترکوں نے المہتدی باللہ کو خلیفہ بنا دیا اور سارا اختیار اپنے پاس رکھا اور گیارہ ماہ کے بعد اسے بھی قتل کر دیا۔ اس دور میں شیعہ اپنے طور پر مصروف عمل رہے لیکن ترکی امراء سے خوف کی بناء پر کوئی قابل ذکر "کارنامہ" سرانجام نہیں دے سکے۔ متعدد مواقع پر انہوں نے علویوں کے ساتھ مل کر ملک میں بدنظمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

شیعہ عالم سید محمد طباطبائی امام یازدہم حسن عسکری کے دور کے متعلق لکھتے ہیں کہ!

آپ اپنی سات سالہ امامت کے دوران خلیفہ کی سختیوں اور ظلم و ستم کے باعث تقیہ (یعنی جب بس نہ چلے تو جان کے خوف سے خاموشی اختیار کر لینا) کی حالت میں بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتے تھے۔ لہٰذا آپ عام لوگوں کو حتیٰ کہ شیعوں کو بھی اپنے پاس آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ سوائے ان خاص افراد کے جن کو آپ ذاتی طور پر جانتے تھے۔ اس طرح آپ زیادہ نظر بندی کی زندگی گذارتے رہے دوسرے یہ کہ خلیفہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ شیعہ گیارہویں امام کے بیٹے پر ایمان رکھتے ہیں اور گیارہویں امام اور اسی طرح گذشتہ ائمہ کی احادیث سے پتہ چلتا تھا کہ یہی فرزند امام مہدی موعود ہوں گے اور ان کو بارھواں اور آخری امام مانتے ہیں۔ اسی وجہ سے گیارہویں امام دوسرے تمام ائمہ سے زیادہ خلیفہ کے زیر نظر تھے اور خلیفہ وقت بھی پختہ ارادہ کر چکا تھا کہ جس طرح بھی ہو شیعہ امامت کی کہانی کو ختم کر دے اور اس دروازے کو ہمیشہ کے لئے بند کر دے اس طرح جونہی گیارہویں امام کی علالت کی خبر خلیفہ کو پہنچی تو اس نے فوراً آپ کے پاس طبیب اور حکیم بھیجے اور ساتھ ہی اپنے چند قابل اعتماد افراد کو آپ کے گھر میں متعین کر دیا۔ جو قاضی تھے وہ ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ گھر کے اندر اور باہر کے حالات پر نظر رکھتے تھے امام کی شہادت کے بعد بھی آپ کے خانہ مبارک کی تلاشی لی گئی اور دائیوں کے ذریعے آپ کی

کنیزوں کا معائنہ کرایا گیا۔ دو سال تک خلیفہ کے گماشتے آپ کے بیٹے کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بالکل ناامید اور مایوس ہو گئے۔ (شیعہ صفحہ ۳۳۷)

اس من گھڑت کہانی سے اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ شیعہ خود مسئلہ امامت کی پیچیدگیوں اور مدعیان امامت کی باہمی سر پھٹول سے تنگ آ چکے تھے اس لئے انہوں نے اس مسئلہ سے اپنی جان چھڑانے کے لئے یہ داستان وضع کی۔ حیرت ہے کہ خلیفہ (جو خود ترکوں کے زیر نظر تھا) کنیزوں کا معائنہ کرانے کے باوجود حسن عسکری کے بیٹے (بارھویں امام) کو تلاش نہ کر سکا۔ لیکن شیعوں نے اسے وجود عطا کر کے پھر ہمیشہ کے لئے غائب بھی کر دیا۔

امام یازدہم حسن عسکری کے دور میں بھی چند علویوں نے دعویٰ امامت کیا!

۱۔ حسن بن زید کا دعویٰ امامت۔۔۔ حسن بن زید علوی نے امام دہم علی نقی اور عباسی خلیفہ مستعین باللہ کے دور میں امامت کا دعویٰ کیا تھا جو حسن عسکری بلکہ ان کے بعد بھی جاری رہا۔ انہوں نے سخت قتال کے بعد طبرستان اور اس کے ساتھ جرجان پر بھی تصرف حاصل کر لیا اور ۲۷۰ھ تک ان علاقہ جات پر ان کا قبضہ رہا پھر اسی سال ان کا انتقال ہو گیا۔

(مروج الذھب جلد ۴ صفحہ ۶۸ تحت ذکر ایام المستعین باللہ)

۲۔ ابراہیم بن محمد (بن یحییٰ بن عبداللہ بن محمد بن علیؒ) نے سرزمین مصر میں ۲۵۶ھ میں دعویٰ امامت کیا۔ یہ "ابن الصوفی" کے لقب سے مشہور تھے۔ (کامل ابن اثیر جلد ۷ صفحہ ۲۳۸ تحت ۲۵۶ھ کے وقعات)

۳۔ اسی سال (۲۵۶ھ) کوفہ میں علی بن زید علوی نے امامت کا دعویٰ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا (حوالہ مذکور)

۴۔ امام دہم حضرت علی نقی ہادی کے مریدوں کا ایک گروہ محمد بن بشیر نمیری نامی ایک شخص کی نبوت پر ایمان لے آیا۔ یہ ایک ملحد شخص تھا اور اس نے محارم کے ساتھ نکاح اور مردوں کے ساتھ ہم جنس پرستی کو حلال قرار دے دیا تھا۔

۵۔ ایک گروہ امام علی نقی کے لڑکے محمد بن علی کی امامت کا قائل ہوا جن کا انتقال اپنے والد کی زندگی میں ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ محمد بن علی مرے نہیں کیونکہ ان کے والد نے ان کو امامت کے لئے نامزد کیا تھا اور اپنے مریدوں کو بتا دیا تھا کہ ان کے بعد امام محمد بن علی ہوں گے۔ امام جھوٹ نہیں بولتے لہٰذا یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کے والد نے دشمنوں سے اندیشے کی بناء پر

ان کو غائب کر دیا اور وہی امام مہدی ہیں۔ (فرق الشیعہ صفحہ ۱۳۷)

۲۔ کچھ لوگ حضرت حسن عسکری کے بھائی جعفر بن علی کی امامت کے قائل ہوئے ان کا کہنا تھا کہ امام علی نقی نے اپنے لڑکے محمد کی وفات کے بعد اپنے دوسرے لڑکے جعفر کو امامت کے لئے نامزد کیا تھا۔ (فرق الشیعہ صفحہ ۱۳۸)

یہ مدعیان امامت اور ان کے پیرو بھی شیعہ حضرات کے نزدیک "امام منصوص" حسن عسکری کی عدم بیعت اور ان کے مقابلہ میں اپنی امامت کا دعویٰ کرنے کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج ہو گئے۔

امام حسن عسکری ۸ ربیع الاول ۲۶۰ھ میں ایک ہفتہ بیمار رہنے کے بعد بعمر ۲۸ برس وفات پا گئے۔ ان کی تدفین سامرہ میں ان کے گھر کے اسی کمرے میں ہوئی جس میں ان کے والد گرامی حضرت علی نقی دفن ہیں۔

شیعہ اثنا عشریہ کے نزدیک حسن عسکری کے بعد ان کے بیٹے محمد المہدی منصب امامت پر فائز ہوئے۔

شیعیت امام دوازدہم محمد المہدی کے عہد میں

حضرت حسن عسکری (م ۲۶۰ھ) کی وفات کے بعد اہل تشیع میں سب سے زیادہ ہولناک اختلاف رونما ہوا۔

نوبختی کے قول کے مطابق گیارہویں امام نے اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ جب لوگوں نے ظاہر میں ان کا کوئی لڑکا نہ پایا تو ان کی وراثت ان کی والدہ اور ان کے بھائی جعفر کے درمیان تقسیم کر دی۔ اس اختلاف کی وجہ سے ان کے شیعہ چودہ فرقوں میں بٹ گئے۔ (فرق الشیعہ صفحہ ۱۳۹)

ایک فرقے کے نزدیک حسن عسکری فوت نہیں ہوئے بلکہ زندہ ہیں اور روپوش ہو گئے ہیں وہی امام قائم مہدی ہیں۔ چونکہ زمین امام سے کسی وقت بھی خالی نہیں رہ سکتی اس لئے ظاہری طور پر نہ ان کا لڑکا ہے اور نہ ہی وہ مر سکتے ہیں۔

ایک فرقے نے کہا حسن عسکری مر تو سکتے ہیں مگر وہ دوبارہ زندہ ہوں گے کیونکہ وہی مہدی القائم ہیں۔ ایک فرقے کے نزدیک حسن عسکری فوت ہو گئے ہیں۔ ان کے بعد ان کے بھائی جعفر امام ہیں اور ان کے لئے ہی حسن نے وصیت بھی کی ایک فرقے نے کہا حسن اور جعفر

دونوں بھائیوں کا دعویٰ امامت غلط تھا۔ امامت ان کے باپ پر ختم ہو گئی وغیرہ وغیرہ۔

ان میں سے ایک فرقہ اس امر کا قائل ہوا کہ حسن عسکری کا ایک بیٹا تھا۔ جو ۱۵ شعبان کی رات ۲۵۶ھ میں نرجس نامی کنیز کے بطن سے تولد ہوئے۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت حسن عسکری لاولد فوت ہوئے۔ حکام وقت کے ذمہ دار حضرات کی تحقیق و تفتیش کے بعد بھی یہی بات ثابت ہوئی۔ اسی بناء پر گیارھویں امام کا ترکہ شرعی قانون کے مطابق ان کے بھائی جعفر اور دیگر ورثاء میں تقسیم کیا گیا۔ خود شیعہ حضرات بھی نہ تو اس حقیقت کا انکار کر سکے اور نہ ہی لڑکے کی ولادت سے متعلق کوئی شہادت پیش کر سکے۔ اثنا عشری شیعہ کا عقیدہ یہ ہے کہ تیسرے امام یعنی حضرت حسینؓ کے بعد امام کا بیٹا ہی امام ہو سکتا ہے کوئی دوسرا خواہ کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو منصب امامت پر فائز نہیں ہو سکتا۔ لہذا گیارھویں امام حضرت حسن عسکری کے لاولد فوت ہونے پر یہ مشکل پیش آئی کہ اب سلسلہ امامت کیسے چلے اور بارہواں امام کون بنے؟

اس مشکل کو حل کرنے کے لئے یہ بات مشہور کر دی گئی کہ امام حسن عسکری کی وفات سے چار پانچ سال پہلے (ایک روایت کے مطابق ۲۵۵ھ اور دوسری روایت کے مطابق ۲۵۶ھ میں) ان کی لونڈی نرجس کے بطن سے ایک صاحبزادے پیدا ہوئے۔ جن کی نہ صرف ولادت کو مخفی رکھا گیا۔ بلکہ نومولود کو بھی لوگوں کی نظروں سے چھپا دیا گیا۔

موصوف کی ولادت سے متعلق افسانے اس کتاب میں شامل نہیں کئے جا رہے۔ خواہش مند حضرات اصول کافی، حق الیقین اور جلاء العیون میں متعلقہ ابواب کا مطالعہ فرمائیں۔ چونکہ اب اثنا عشری شیعہ کے نزدیک ان کی ولادت، امامت اور غیبت مسلمہ عقیدہ ہے اس لئے ان کے دعویٰ کو قبول کرتے ہوئے بارہویں امام کا تعارف قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

امام کلینی نے اصول کافی کتاب الحجہ میں "باب فی النہی عن الاسم" (یعنی حضرت حجۃ الاسلام کے نام لینے کی ممانعت کے بیان میں) کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے جس میں یہ حدیث لائے ہیں کہ "صاحب ھذا الامر لا یسمیہ باسمہ الا کافر" حضرت جعفر صادق نے فرمایا کہ حضرت صاحب الامر کا نام کافر کے سوا کوئی دوسرا شخص نہیں لے گا۔ اس حدیث میں بارہویں امام کا نام لینے سے منع کر دیا گیا۔ شیعیت کے ترجمان اعظم ملا باقر مجلسی اس حدیث کی

شرح میں لکھتے ہیں کہ!

حضرت صادق آل محمد نے علم امامت سے یہ جان کر کہ عہد ولادت کے بعد ہی حکومت وقت ان کے قتل کے درپے ہوگی۔ یہ ممانعت فرمادی کہ اس وقت ان کا نام جو بھی لے گا۔ یا ان کا نشان بتائے گا وہ مسلمان نہ ہوگا۔ کیونکہ نام لینے سے جان کا خطرہ ہوگا۔ (مرآۃ العقول جلد ۱ صفحہ ۲۳۳)

اس حدیث کی رو سے شیعہ بارھویں امام کا نام لینے سے اجتناب کرتے ہیں اس لئے ان کی خاص مذہبی زبان (کوڈ) میں انہیں "الحجہ، القائم، المنتظر، صاحب الزمان اور امام زمان" کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی لئے امام کلینی نے بھی ان کی ولادت کی بشارت یوں نقل کی کہ "وولد له ولد سماه (م ح م د) فی سنة ست و خمسین و مائتین"

شیعہ مجتہد سید محمد طباطبائی لکھتے ہیں کہ

حضرت مہدی موعود گیارھویں امام کے فرزند ہیں اور ان کا نام بھی پیغمبر اکرمؐ کے نام پر یعنی "محمد" ہے۔ آپ کی ولادت ۲۵۵ھ میں سامرا میں ہوئی۔ ۲۶۰ھ یعنی اپنے والد ماجد کی شہادت تک ان کے زیر تربیت زندگی گذارتے رہے لیکن لوگوں سے بالکل الگ اور ان کی نظروں سے پنہاں رہے۔ سوائے خاص شیعوں کے کسی کو آپ کے بارے میں کوئی اطلاع نہ تھی اور نہ ہی ان سے کوئی ملاقات کرسکتا تھا۔ گیارھویں امام کی شہادت کے بعد جب آپ امامت کے منصب پر فائز ہوئے تو آپ خدا کے حکم سے غائب ہوگئے اور اپنے نائبین کے سوا کسی کو نظر نہیں آتے تھے اور وہ بھی خاص حالات میں۔ (شیعہ صفحہ ۲۳۳)

شیخ مفید لکھتے ہیں کہ!

امام حسن عسکری نے اپنے بیٹے کی ولادت کو مخفی اور ان کے معاملہ کو پردہ راز میں رکھا کیونکہ اس وقت نہایت سختی ہو رہی تھی اور بادشاہ وقت اس مولود کی شدت سے تلاش اور ان کے معاملہ کی چھان بین میں لگا ہوا تھا جبکہ مذہب شیعہ میں آپ کی آمد و ولادت مشہور ہو چکی تھی اور معروف و معلوم تھا کہ سب شیعہ آپ کے ظہور کے انتظار میں ہیں لہٰذا آپ کے فرزند گرامی حضرت قائم آل محمد نہ تو والد کی زندگی میں لوگوں کے سامنے آئے اور نہ ہی ان کی وفات کے بعد جمہور مسلمین انہیں پہچان سکے۔ اور اسی لئے ابو محمد حسن عسکری کا بھائی جعفر بن علی اپنے بھائی محمد کی رحلت کے بعد آپ کے ترکہ کا وارث بن کھڑا ہوا۔۔۔۔۔۔ (تذکرۃ الاطہار صفحہ ۲۰۵)

بارہویں امام اپنے والد حسن عسکری کی وفات سے دس دن پہلے ہی غائب ہو گئے اور وہ تمام نوادرات اور تبرکات اپنے ساتھ لیتے گئے۔ جو حضرت علیؑ سے منتقل ہوتے ہوئے آخر میں حضرت حسن عسکری کے پاس آئے تھے جن میں یہ تمام اشیاء شامل تھیں۔ حضرت علیؓ کا جمع کیا ہوا اور لکھا ہوا اصلی اور مکمل قرآن اور علاوہ قدیم آسمانی کتابیں تورات، انجیل، زبور اور دیگر انبیاء کے صحیفے، مصحف فاطمہ، جفر احمر، جفر ابیض، ستر گز کا الجامعہ نامی صحیفہ، انبیائے سابقین کے معجزانہ تبرکات مثلاً عصائے موسیٰ، قمیص آدم اور سلیمان کی انگشتری وغیرہ الغرض شیعہ عقیدہ کے مطابق چار پانچ سال کی عمر والے یہ صاحبزادے تن تنہا سارا سامان لے کر اپنے شہر "سر من رای" کے ایک غار میں ہی غائب اور روپوش ہو گئے۔ امام مہدی کیوں غائب ہوئے؟

امام جعفر صادق کہتے ہیں کہ!

بے شک امام قائم کے لئے ظاہر ہونے سے قبل غائب رہنا ہے (راوی کہتے ہیں) میں نے پوچھا کیوں؟ فرمایا وہ ڈرتا ہے اور (یہ کہتے ہوئے امام جعفر صادق نے) اپنے ہاتھ سے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا یعنی قتل کے خوف سے۔ (اصول کافی کتاب الحجۃ باب فی الغیبۃ)

اصول کافی کی اس روایت سے یہ معلوم ہو گیا کہ امام مہدی کے غائب ہونے کی وجہ قتل ہو جانے کا خوف ہے۔ اسی لئے امام جعفر صادق نے ان کا نام لینے سے بھی منع کر دیا۔ بلکہ یہاں تک فرمایا کہ ان کو نام لیکر بلانے والا کافر ہے۔ بہر حال وہ غائب ہیں لیکن زندہ ہیں اور شیعہ قوم کو ان کے ظہور کا بڑی بے چینی سے انتظار ہے اسی لئے امام مہدی کو "امام منتظر" کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

غیبت صغریٰ و کبریٰ

اہل تشیع کے نزدیک "امام زمان" کی غیبت دو حصوں پر مشتمل ہے "غیبت صغریٰ" اور "غیبت کبریٰ"

غیبت صغریٰ۔۔۔ یہ غیبت ۲۶۰ھ سے شروع ہوئی اور ۳۲۹ھ تک جاری رہی اس غیبت کا عرصہ ۷۰ سال ہے۔ لیکن اس غیبت کے دوران "امام زمان" کے خاص محرم راز سفیروں کی ان کے پاس خفیہ آمد و رفت ہوتی تھی۔ اور ان سفیروں کے ذریعے شیعہ حضرات اپنے امام کی خدمت میں خطوط، درخواستیں اور قیمتی تحائف بھیجا کرتے تھے اور یہی سفیر امام صاحب کی طرف سے خطوط کے جوابات قوم تک پہنچاتے تھے۔ ان سفیروں کی تعداد چار ہے۔ جو

غیبت صغریٰ" کے زمانے میں "امام زمان" کے نائب قرار پائے۔

۱۔ ابو عمرو عثمان بن سعید ۲۔ ابو جعفر محمد بن عثمان

۳۔ ابو القاسم حسین بن روح نوبختی ۴۔ ابو الحسن علی بن محمد السمری

شیعہ مجتہد سید محمد طباطبائی لکھتے ہیں کہ!

حضرت امام مہدی علیہ السلام نے ایک مدت تک عثمان بن سعید عمری کو جو آپ کے دادا اور پھر آپ کے والد کے اصحاب میں سے تھے ثقہ اور امین بھی تھے۔ اپنا نائب مقرر کیا۔ ان کے ذریعے شیعوں کے سوالات اور درخواستوں کے جواب دیا کرتے تھے۔ عثمان بن سعید کے بعد ان کے بیٹے محمد بن عثمان امام مہدی کے نائب ہوئے۔ اور ان کی وفات کے بعد ابو القاسم حسین بن روح نوبختی۔ آپ کے نائب خاص کی حیثیت سے منصوب ہوئے۔ حسین بن روح کی وفات کے بعد علی بن محمد سمری کو امام مہدی کی نیابت حاصل ہوئی۔ ابھی علی بن محمد سمری کی وفات میں چند دن رہتے تھے (جو ۳۲۹ھ میں فوت ہوئے) کہ امام مہدی علیہ السلام کی طرف سے ایک حکمنامہ جاری ہوا جس میں علی بن محمد سمری کو کہا گیا تھا کہ وہ چھ دن بعد فوت ہو جائیں گے اور اس کے بعد خاص نیابت کا عہدہ ختم ہو جائے گا اور غیبت کبریٰ شروع ہو جائے گی اور یہ غیبت کبریٰ اس دن تک جاری رہے گی۔ جب اللہ تعالیٰ امام مہدی کے دوبارہ ظہور کا اذن فرمائے گا۔ (شیعہ صفحہ ۲۳۲)

یہ ملحوظ رہے کہ شیعہ مذہب کی سب سے زیادہ مستند کتاب "اصول کافی" (مؤلفہ، ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی) بھی اسی غیبت صغریٰ کے زمانے میں امام غائب کی خدمت میں پیش کی گئی جس پر موصوف نے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "ھذا کاف لشیعتنا" یعنی یہ ہمارے شیعہ بھائیوں کے لئے کافی ہے۔ بہر حال "امام زمان" کی غیبت کبریٰ پر تادم تحریر گیارہ سو اکسٹھ (۱۱۶۱) سال گذر چکے ہیں۔ معلوم نہیں موصوف مزید کتنا زمانہ استراحت فرمائیں گے۔ اسی لئے اہل تشیع ان کے ذکر کے ساتھ "عجل اللہ فرجہ" کا ذی طور پر کہتے اور لکھتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جلدی ان کو باہر لائے۔

چونکہ اثنا عشری عقیدہ کے مطابق امام غائب پر امامت کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ جب تک یہ دنیا قائم ہے تو اس کے ساتھ ایک امام بھی دنیا میں موجود رہے۔ ورنہ دنیا قائم نہیں رہ سکتی اور وہ امام آخر الزمان محمد المہدی ہیں جو قیامت تک زندہ

رہیں گے اور جب وہ وقت آئے گا جو ان کے ظہور کے لئے خدا مناسب سمجھے گا اس وقت وہ غار سے برآمد ہوں گے اور پھر ساری دنیا پر حکومت کریں گے۔

ظہور امام مہدی

عقیدہ ظہور مہدی اہل تشیع کے بنیادی عقائد میں سے ہے اسے عقیدہ رجعت بھی کہتے ہیں۔ ملا باقر مجلسی رجعت کے متعلق لکھتے ہیں کہ!

بدانکہ از جملہ اجماعیات شیعہ بلکہ ضروریات مذہب فرقہ محقہ حقیقت رجعت است۔

(حق الیقین جلد ۲ صفحہ ۳۳۳ در بیان اثبات رجعت)

یعنی جاننا چاہیے کہ من جملہ ان اعتقادات کے کہ جن پر تمام شیعوں کا اجماع ہے بلکہ ان کے مذہب کی ضروریات میں سے ہے وہ عقیدہ رجعت کی حقانیت کا اقرار و اعتراف ہے۔

کوئی شخص عقیدہ رجعت پر ایمان ویقین کے بغیر مذہب شیعہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔

یہی ملا باقر مجلسی بحوالہ "من لا یحضرہ الفقیہ" لکھتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا کہ

از ما نیست کسیکہ ایمان برجعت ما نداشتہ باشد"۔ (ماخذ کرہ)

جس شخص کا ایمان عقیدہ رجعت پر نہیں ہے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

یہ ملحوظ رہے کہ عقیدہ رجعت کا سب سے پہلے عبداللہ بن سبا نے تعارف کروایا تھا۔ بعد میں اس کے جانشینوں نے اس عقیدے سے خوب کام لیا۔ جب بھی امام لاولد مر گئے یا لا پتہ ہو گئے۔ یا تعین امام میں اختلاف ہو گیا اور سبائیوں کے ایک گروہ نے چاہا کہ فرقے کی زمام کار کسی خاص امام کے ہاتھ میں دے۔ تو ان تمام مواقع پر انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ فوت شدہ یا غائب شدہ امام مرے نہیں زندہ ہیں بادل میں ہیں، پہاڑ پر ہیں۔ غار میں ہیں اور عنقریب واپس آ کر قیادت و امامت کے فرائض دوبارہ سنبھالیں گے۔ تو اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ فوت شدہ یا غائب شدہ امام کی پیروی کرنے والا پورا فرقہ یا امام کے جانشین کے تعین میں سبائیوں کے باہمی اختلاف کی صورت میں فرقے کا ایک حصہ (جو نئے امام کو نہیں مانتا تھا) فوت شدہ امام کے انتظار میں بیٹھ جاتا تھا۔ اس طرح سبائیوں کے دونوں گروہ ایک ایک فرقے کے قائد ہو جاتے تھے ایک گروہ نئے امام کا پیرو ہو جاتا تھا۔ جبکہ دوسرا گروہ امام غیب کے انتظار میں مجتمع رہتا تھا اس طرح تمام سبائیوں کے حلوے مانڈے کا انتظام ہر طرف سے برقرار رہتا تھا۔ کتب تاریخ سے

معلوم ہوتا ہے کہ کئی شیعی فرقے اس عقیدہ رجعت کے سہارے اپنے غائب اماموں کا انتظار کرتے رہے اس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں۔

	فرقہ کا نام		کس امام غائب کا منتظر ہے اعتقاد
۱۔	سبائیہ	(غلاۃ شیعہ میں سے)	حضرت علی
۲۔	کربیبہ	(کیسانیہ میں سے)	محمد بن حنفیہ
۳۔	نفیسیہ	(امامیہ میں سے)	محمد بن عبداللہ بن حسن نفس زکیہ
۴۔	باقریہ	(امامیہ میں سے)	امام محمد باقر
۵۔	حاضریہ	(امامیہ میں سے)	زکریا بن محمد باقر
۶۔	ناؤسیہ	(امامیہ میں سے)	امام جعفر صادق
۷۔	مبارکیہ قرامطیہ	(امامیہ میں سے)	اسمٰعیل بن جعفر صادق
۸۔	دروزیہ	(امامیہ میں سے)	حمزہ اور الحاکم
۹۔	فطحیہ	(امامیہ میں سے)	عبداللہ بن جعفر صادق
۱۰۔	ممطوریہ	(امامیہ میں سے)	امام موسیٰ کاظم
۱۱۔	رجعیہ	(امامیہ میں سے)	امام موسیٰ کاظم
۱۲۔	اثنا عشریہ	(امامیہ میں سے)	محمد مہدی صاحب الزمان

علاوہ ازیں زیدیہ کے بعض فرقے بھی امام منتظر کے قائل ہیں کہ مختفی امام دوبارہ ظاہر ہوں گے۔ ان کے ناموں کی تعیین میں بھی یہ باہم مختلف ہیں۔

اہل تشیع کی ایک دوسری معتبر کتاب میں تحریر ہے کہ!

ایمان لانا رجعت پر بھی واجب ہے یعنی صاحب الامر علیہ السلام ظہور اور خروج فرمائیں گے اس وقت مومن خاص اور کافر و منافق مخصوص سب زندہ ہوں گے عالم کو پر از عدل و داد کریں گے۔ ہر ایک اپنی داد و انصاف کو پہنچے گا اور ظالم سزا پائیں گے۔ (تحفۃ العوام صفحہ باب پہلا اصول دین میں)

خانہ فرہنگ ایران ملتان نے ایک پمفلٹ ہزاروں کی تعداد میں شائع کیا ہے۔ جس میں امام خمینی کے خطبات کے اقتباسات درج ہیں۔ اس میں مؤلف صفحہ ۱۵، پر زیر عنوان "مہدویت پر اعتقاد" خمینی کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ!

جو نبی بھی آئے وہ انصاف کے نفاذ کے لئے آئے ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ تمام دنیا میں انصاف کا نفاذ کریں لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے یہاں تک کہ ختم المرسلین جو انسان کی اصلاح کیلئے آئے تھے اور انصاف کا نفاذ کرنے کے لئے آئے تھے انسان کی تربیت کے لئے آئے تھے لیکن وہ اپنے زمانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ وہ آدمی جو اس معنی میں کامیاب ہوگا اور تمام دنیا میں انصاف کو نافذ کرے گا۔ وہ بھی اس انصاف کو نہیں جسے عام لوگ سمجھتے ہیں کہ زمین میں انصاف کا معاملہ لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے ہو. بلکہ یہ انصاف انسانیت کے تمام مراتب میں ہو وہ چیز جس میں انبیاء کامیاب نہیں ہوئے باوجود اس کے کہ وہ اس خدمت کے لئے آئے تھے خدائے تبارک وتعالیٰ نے ان حضرت ولی عصر ارواحنا لہ الفداء کا ذخیرہ کیا ہے ان ہی معنی میں جس کی تمام نبیوں کو آرزو تھی لیکن رکاوٹوں کی وجہ سے وہ ان کو نافذ نہ کر سکے تمام اولیاء کی یہ آرزو تھی۔ لیکن وہ بھی نافذ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے. وہ اس بزرگوار کے ہاتھوں نافذ ہو جائے لہٰذا اس معنی میں حضرت صاحب ارواحنا لہ الفداء کا جشن میلاد مسلمانوں کے لئے سب سے بڑی عید ہے صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ انسان کے لئے بھی سب سے بڑی عید ہے۔

(نیمہ شعبان ۱۴۰۰ھ کے موقع پر تقریر۔ بحوالہ اتحاد و یکجہتی صفحہ ۱۵ ناشر خانہ فرہنگ ایران ملتان)

''امام خمینی'' اپنے آخری وصیت نامے میں لکھتے ہیں کہ!

ہمیں فخر ہے کہ تمام ائمہ معصومین حضرت علی بن ابی طالبؑ سے لیکر انسانیت کے نجات دھندہ حضرت مہدی صاحب الزمان علیہم آلاف التحیہ والسلام تک جو قادر مطلق کی قدرت سے زندہ اور ہمارے تمام امور کے شاہد ہیں ہمارے امام ہیں

(صحیفہ انقلاب صفحہ ۳ ناشر شعبہ نشر واشاعت تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان لاہور)

سید محمد طباطبائی ''ظہور مہدی'' کے متعلق لکھتے ہیں کہ!

انسانی معاشرے کو حقیقی کمال وخوش بختی تک پہنچائیں گے اور اس معاشرے کو ایک معنوی زندگی عطا فرمائیں گے۔ حضرت امام مہدی، حضرت امام حسن عسکری کے حقیقی فرزند ہیں جو پیدا ہوئے ہیں لیکن غیبت کبریٰ کے بعد ظاہر ہوں گے اور اس دنیا کو عدل وانصاف سے مالا مال کر دیں گے۔ کیونکہ اس وقت دنیا ظلم وجور سے بھری ہوئی ہوگی۔ (شیعہ صفحہ ۲۱۵)

مہدی کے بعد از ظہور کارنامے

شیعہ اعتقاد کے مطابق امام مہدی بالکل برہنہ اور ننگے جسم تشریف لائیں گے۔ چنانچہ شیعیت کے ترجمان اعظم ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں کہ

شیخ طوسی و نعمانی از حضرت امام رضا روایت کردہ است کہ از علامات ظہور حضرت قائم آنست کہ بدن برہنہ ای در پیش قرص آفتاب ظاہر خواہد شد و منادی ندا خواہد کرد کہ این امیر المومنین است برگشتہ است کہ ظالماں را ہلاک کند۔ (حق الیقین صفحہ ۳۴۷ در اثبات رجعت)

شیخ طوسی اور نعمانی نے حضرت امام رضا سے روایت کی ہے کہ ظہور مہدی کی علامات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ننگے جسم سورج کی ٹکیہ کے سامنے تشریف لائیں گے اور ایک آواز دینے والا آواز دے گا کہ یہ امیر المومنین ہیں اور اس لئے تشریف لائے ہیں تاکہ ظالموں کو ہلاک کریں آنحضرت ﷺ سب سے پہلے اس ننگے اور برہنہ مہدی کی بیعت کریں گے۔

ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں کہ!

نعمانی امام باقر سے روایت کرتے ہیں کہ قائم آل محمد تشریف لائیں گے تو فرشتوں کے ذریعے اللہ ان کی مدد کرے گا اور سب سے پہلے ان کی بیعت محمد کریں گے اور ان کے بعد علی

(حوالہ مذکور)

مہدی حضرت عائشہؓ پر حد جاری کریں گے۔

ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں کہ!

ابن بابویہ نے علل الشرائع میں امام محمد باقر سے روایت کی ہے کہ جب ہمارے قائم ظاہر ہوں گے۔ تو وہ عائشہ کو زندہ کر کے ان پر حد جاری کریں گے اور فاطمہ کا انتقام ان سے لیں گے۔

(حوالہ مذکور)

مہدی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو روزانہ ہزار مرتبہ زندہ کریں گے اور پھر قتل کریں گے

نعمت اللہ الجزائری لکھتے ہیں کہ!

پھر تین دن کے بعد امام مہدی حکم دے گا ابوبکر و عمر کی قبریں کھود کر باہر نکالا جائے۔ وہ باہر نکالے گا تو ان کے جسم تر و تازہ ہوں گے جیسے دنیا میں تھے۔ ان کے کفن اتارے گا پھر ایک خشک درخت پر انہیں لٹکائے گا پھر حکم دے گا کہ انہیں روزانہ ایک ہزار بار قتل کیا جائے پھر انہیں

شدید عذاب دے گا۔ پھر آگ کو حکم دے گا وہ زمین سے نکلے گی اور انہیں جلا دے گی پھر ہوا کو حکم دے گا وہ ان کی راکھ کو اڑا کر سمندر میں پھینک دے گی۔ (انوار نعمانیہ صفحہ ۱۵۳)

ملا باقر مجلسی نے تو اس واقعہ کو نہایت ہی مضحکہ خیز انداز کے ساتھ روایت کیا ہے کہ

ابوبکر و عمر کو یہ سزا ان کے ماننے والوں کی موجودگی میں دی جائے گی۔

نعمت اللہ الجزائری لکھتے ہیں کہ!

آیت "سَنَسِمُهُ عَلَى الْخُرْطُوْمِ" کی تفسیر یہ ہے کہ زمانہ رجعت میں حضرت علیؓ اپنے دشمنوں یعنی سنیوں اور اصحاب رسول ﷺ کے چہروں، ناک اور ہونٹوں پر داغ دیں گے جیسے جانوروں کو داغا جاتا ہے۔ (انوار النعمانیہ جلد ۲ صفحہ ۹۳)

موصوف مزید لکھتے ہیں کہ آیت "فان له معيشة ضنكا" کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ زمانہ رجعت میں سنیوں کی غذا شیعوں کا پاخانہ ہوگا۔ (حوالہ مذکور جلد ۲ صفحہ ۹۵)

حق الیقین اور بصائر الدرجات میں بھی یہی بات لکھی ہوئی ہے کہ سنیوں کی غذا گندگی اور پیشاب ہوگا۔ امام مہدی سنیوں اور ان کے علماء کو قتل کریں گے۔

ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں کہ!

جس وقت قائم علیہ السلام ظاہر ہوں گے تو وہ کافروں سے پہلے سنیوں اور خاص کر ان کے عالموں سے کاروائی شروع کریں گے اور ان سب کو قتل کر کے نیست و نابود کر دیں گے۔

(حق الیقین صفحہ ۵۱۷)

امام مہدی نیا دین اور نئی کتاب لائیں گے۔

۱۔ امام وہ قرآن نکالے گا جو حضرت علیؓ نے جمع کیا تھا اور جسے زبردستی خلیفہ بننے والوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

(انوار النعمانیہ فی تذکرۃ الفراد الذی لفہ امیر المومنین طبع قدیم صفحہ ۲۲۷، علامۃ الظہور صفحہ ۲۱۳)

امام مہدی خانہ کعبہ، مسجد نبوی اور سنیوں کی مساجد گرا دیں گے مفضل نے کہا کعبہ سے کیا سلوک کرے گا؟ فرمایا اس گھر کو مٹا دے گا۔ اس طرح دنیا کی تمام مساجد جو ظالموں (سنیوں) نے حق میں بنائیں گرا دے گا اور مسجد حرام اور مسجد نبوی کو بھی گرا دے گا۔ (انوار نعمانیہ جلد ۲ صفحہ ۱۵۷)

شیعہ مجتہد آقا محمد حسن لکھتے ہیں کہ!

مسجد حرام اور مسجد نبوی کو منہدم کر کے اس ہیت پر تعمیر کی جائے گی جو زمانہ حضرت رسولؐ میں تھی۔ مقام ابراہیم کو بھی بدل کر اسی مقام پر متعین کیا جائے گا جہاں زمانہ آنحضرت ﷺ میں تھا۔

(علائم الظہور بحوالہ جمع تاریخ الغیبہ، صفحہ ۳۴۳)

امام مہدی عربوں کو قتل کریں گے امام نیا اسلام، نیا قرآن، نئی سنت اور نئے احکام لائے گا۔ عربوں کو سخت سزا دی جائے گی جو قتل سے کم نہ ہوگی اور نہ ہی ان کی توبہ قبول ہوگی۔

(بصائر الدرجات صفحہ ۱۴۳، رجال کشی صفحہ ۲۴۳)

کتاب الغیبہ کے مولف نعمانی نے امام جعفرؑ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ!

اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ امام غائب اپنے ظہور کے بعد کیسا قتل عام کریں گے۔ تو شاید وہ اس کو دیکھنا پسند نہ کریں امام غائب اپنے مشن کا آغاز قریشیوں کے ساتھ تلوار کی زبان سے شروع کریں گے اور ان کا اس بھیانک طریقہ سے قتل کریں گے کہ لوگ چیخ اٹھیں گے اور کہیں گے کہ شاید یہ امام غائب آل محمد سے نہیں ہے ورنہ کچھ تو نرمی کرتا۔ (کتاب الغیبہ صفحہ ۲۳۳)

عربوں اور قریشیوں کے ساتھ یہودیوں، مجوسیوں، اور نصرانیوں کی عداوت تو پرانی اور مثالی ہے جس کا آج بھی انتہائی شدت سے اظہار ہوتا ہے اور اس عداوت کے نہایت واضح اسباب بھی ہیں مگر یہاں سوال یہ ہے کہ امام مہدی کو عربوں کے ساتھ کس وجہ سے دشمنی ہے اور انہیں یہ سخت سزائیں کیوں دی جائیں گی جو قتل سے کم نہ ہوں گی اور ان کی توبہ بھی قبول نہ کی جائے گی۔

اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ شیعہ مذہب کی تخلیق و تدوین یہودی اور مجوسی علماء اور دانشوروں کی متحدہ کوشش سے ہوئی تھی اور امام مہدی کے کردار کی تخلیق بھی ان ہی لوگوں کی تخلیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا ایسے امام مہدی کو بھی عربوں سے وہی عداوت ہونی چاہیے جو ان کے کردار کے خالقوں یعنی یہودیوں اور مجوسیوں کو تھی اور آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ امام مہدی کی رگوں میں وہ نصرانی خون بھی گردش کر رہا ہے جو انہیں اپنی والدہ "نرجس رومی" سے ملا تھا۔

بہر حال اہل تشیع کے اعتقاد کے مطابق امام مہدی کی امامت پر ایمان فرض ہے اور ان کی امامت قیامت تک جاری رہے گی۔ نیز ان کے ظہور پر ایمان رکھنا ضروریات دین میں سے ہے اور اس کا منکر دین سے خارج ہے۔ شیعہ روایات کے مطابق مہدی کے ظہور کا زمانہ ۷ھ

بتایا گیا ہے (ظاہر ہے کہ یہ مہدی حضرت حسن عسکری کے لڑکے ہرگز نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ خود ۲۳۲ھ میں پیدا ہوئے ہیں)

جب ۷۰ھ میں امام مہدی ظاہر نہیں ہوئے تو شیعوں نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اس کی وجہ یہ بتائی کہ ۶۱ھ میں قتل حسینؓ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو زمین والوں پر سخت غصہ آیا اس لئے ظہور مہدی کو ۱۴۰ھ تک مؤخر کر دیا گیا۔ جب امام مہدی ۱۴۰ھ میں بھی ظاہر نہیں ہوئے تو شیعوں نے امام جعفر صادق سے منسوب کر کے یہ روایت گھڑی کہ منصب امام مہدی میرے لئے خاص تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اسے مؤخر کر دیا اور اب اللہ تعالیٰ میری اولاد میں جو چاہے کرے گا۔ (کتاب الغیبۃ۔ مولفہ علامہ طوسی)

دوسری روایت میں ظہور مہدی کے مؤخر کرنے کی وجہ امام باقر کی زبانی یہ بتائی گئی کہ!

ہم نے یہ بات (کہ امام مہدی کا ۱۴۰ھ میں ظہور) تم (شیعوں) سے بیان کردی اور تم نے اسے مشہور کر دیا اور راز فاش ہو گیا اب اللہ تعالیٰ نے اس کا کوئی وقت نہیں بتایا۔

(اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۲۳۲)

ظہور مہدی کے متعلق شیعہ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ!

جب دنیا کے مختلف حصوں سے ۳۱۳ مخلص شیعہ جمع ہو جائیں گے تو امام کا ظہور ہوگا اور دس ہزار مخلص شیعوں کے اکٹھے ہونے پر امام جہاد شروع کر دے گا اور اللہ کے دشمنوں کو قتل کرے گا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ امام کو غائب ہوئے تا دم تحریر گیارہ سو اکسٹھ (۱۱۶۱) سال کا طویل عرصہ گذر گیا مگر دنیا میں ابھی تک ۳۱۳ مخلص شیعہ پیدا نہیں ہوئے ورنہ امام کا ظہور ہو جاتا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ محرم میں لاکھوں کی تعداد میں شیعہ گلی کوچوں میں سینہ کوبی کرتے نظر آتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافق اور محض نام کے شیعہ ہیں۔

امام مہدی کی غیبت صغریٰ کا افسانہ اس لئے تراشا گیا تا کہ اس دوران شیعہ مذہب پر مشتمل ایک ایسی بنیادی کتاب تیار کی جا سکے جو امام غائب کی مصدقہ ہو چنانچہ یہ شرف ملت جعفریہ کے سارے لٹریچر میں صرف ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی کی کتاب "اصول کافی" کو حاصل ہوا۔

الکلینی۔ کُلین کے رہنے والے تھے اور کلین علاقہ رے کا قصبہ یا قریہ ہے۔ موصوف کی تاریخ ولادت محفوظ نہیں رہ سکی اگر ان کی عمر ساٹھ ستر سال مانی جائے تو ان کی ولادت ۲۶۰ھ / ۲۷۰ھ کے مابین ہوئی ہوگی البتہ ان کی وفات ۳۲۹ھ میں ہوئی۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۷ صفحہ ۳۸۲)

یہ عجیب اتفاق ہے کہ کلینی کی ولادت تا وفات پورا دور امام مہدی کی غیبت صغریٰ کا دور ہے۔ اس غیبت کے دوران جو چار سفیر امام کے ساتھ غار میں رابطہ کرتے رہے ان میں سے آخری سفیر اور وکیل ابوالحسن علی بن محمد السمری کا سن وفات بھی ۳۲۹ھ ہے۔

کلینی نے اصول کافی کی تیس برس کی محنت شاقہ کے بعد تکمیل کی۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں ۱۔ اصول ۲۔ فروع ۳۔ روضہ

پہلا حصہ عقائد دوسرا حصہ احکام پر اور تیسرا حصہ خطب و مکاتیب اور حکم و آداب پر مشتمل ہے۔ اس کی روایات کی مجموعی تعداد سولہ ہزار ایک سو ننانوے (۱۶۱۹۹) ہے۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۶ صفحہ ۹۰۵)

اصول کافی کی افضلیت پر اثنا عشری اور جمہور شیعہ متفق ہیں۔ اسی پر اعتماد کرتے ہیں اور اس کے احکام کو کافی سمجھتے ہیں۔ اس طرح اہل تشیع نے امام مہدی کی غیبت صغریٰ سے "فائدہ" حاصل کر کے اسے قرب قیامت تک غائب کر دیا اور اسے غیبت کبریٰ کا نام دے دیا۔

امام کلینی کی وفات تک اثنا عشری شیعہ نے سیاسی اور مذہبی دونوں محاذوں پر خوب ترقی کی اور وہ ادریسیہ، مزیدیہ، قرامطہ اور عبیدیہ افاطمیہ کی طرح اپنی الگ حکومت قائم کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے جسے آل بویہ کی حکومت یا دیلمی حکومت کہا جاتا ہے۔

دیلمی حکومت

اسے "آل بویہ" کی حکومت بھی کہا جاتا ہے۔ جو ۳۲۰ھ سے ۴۴۸ھ تک قائم رہی۔ آل بویہ ان تمام حکمران خاندانوں میں اہم ترین خاندان ہے جنہوں نے پہلے ایران کی سطح مرتفع اور پھر عراق میں خراسان اور ماوراء النہر کے سامانیوں کے دوش بدوش حکومت کی جو ابتدائی اسلام کے عرب اقتدار اور پانچویں صدی ہجری کی ترکی فتوحات کے درمیانی عہد میں بقول منورسکی "ایرانی غلبے" کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس خاندان کا نام "بُویَہ" سے ماخوذ ہے۔ جو ان تین بھائیوں (علی، حسن اور احمد) کے والد کا نام ہے جو اس خاندان کے بانی ہیں۔ بعض مورخین کے نزدیک یہ سلاطین ایران کی اولاد میں سے ہیں۔ ابن ماکولا اس کو بہرام گور کی اولاد سے بتاتا ہے اور ابن مسکویہ نے فارس کے آخری تاجدار یزدگرد کی نسل سے قرار دیا ہے۔ ابن ماکولا امام الانساب ہے۔ اس لئے اس کی رائے قابل ترجیح ہے۔ چونکہ اس خاندان نے آگے چل کر بہت ترقی کی

اور عماد الدولہ، رکن الدولہ اور معز الدولہ کے نام سے صاحب حکومت و عزت ہوئے لہذا کسی نے ان کا نسب یزدجرد شاہ ایران سے ملایا اور کسی نے ان کو بہرام گور کی اولاد قرار دیا۔ ایران حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں فتح ہوا۔ اسی دن سے ایرانیوں کے دل میں انتقام کی آگ جوش مارتی رہی۔ عبداللہ بن ابی اور عبداللہ بن سبا کی ذریت البغایا نے دین اسلام اور خلافت اسلامیہ کے خلاف اپنی مذموم خفیہ سازشیں اور ریشہ دوانیاں ہمیشہ جاری رکھیں تا آنکہ دین اسلام کے مقابلے میں ایک نیا متوازی دین اور خلافت اسلامیہ کے مقابلے میں "نظریہ ولایت فقیہ" کے تحت اپنی آزاد اور خودمختار حکومت قائم کر کے دم لیا۔ مشہور ایرانی مورخ حسین کاظم زادہ اپنی کتاب "تجلیات روح ایران در ادوار تاریخی" میں لکھتے ہیں کہ!

جس دن سے سعد بن ابی وقاص نے خلیفہ دوم کی جانب سے ایران کو فتح کیا اور اس پر غلبہ پایا۔ ایرانی اپنے دل میں کینہ و انتقام کا جذبہ پالتے رہے۔ کینہ و انتقام کا یہ جذبہ متعدد مواقع پر ظاہر ہوتا رہا تا آنکہ فرقہ شیعہ کی بنیاد پڑ جانے سے یہ کلیۃً بے نقاب ہو گیا۔ ارباب علم و اطلاع اس حقیقت کو بخوبی جانتے اور مانتے ہیں کہ شیعیت کی بنیاد و ظہور میں اعتقادی مسائل اور نظری اور نقلی اختلافات کے علاوہ ایک سیاسی مسئلہ کو بھی دخل تھا۔ ایرانی اس بات کو نہ کبھی بھول سکتے تھے نہ قبول اور معاف کر سکتے تھے کہ مٹھی بھر ننگے پاؤں پھرنے والے بادیہ نشین عربوں نے ان کی مملکت پر قبضہ کر لیا اور اس قدیم مملکت کے خزانوں کو لوٹ کر غارت کر دیا۔

بہر حال یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام اور خلافت اسلامیہ کے خلاف ہر سازش میں ایرانی بالواسطہ یا بلاواسطہ شریک رہے۔ ابو مسلم خراسانی، برامکہ، ابن میمون القداح اور بابک خرمی و غیرہم ایرانیت کا جو بیج بو گئے تھے وہ پھلتا پھولتا چلا گیا اس کے نتیجے میں نہ صرف ایران میں خودمختار ریاستیں قائم ہوئیں بلکہ خود خلافت اسلامیہ کا مرکز ایران کے زیر نگین آ گیا۔ دولت طاہریہ، دولت صفاریہ، دولت سامانیہ، امرائے طبرستان اور آل زیاد کے بعد آل بویہ کو عروج و اقتدار حاصل ہوا۔ موخر الذکر ایک خالص شیعہ اثنا عشری حکومت تھی۔ جس نے مرکز اسلام بغداد پر بھی اپنا تسلط قائم کر لیا۔

بحیرہ خزر کے ساحل کا علاقہ دیلم کہلاتا ہے۔ آل بویہ کو دیلم سے نسبت تھی اسی لئے یہ لوگ دیلمی کہلائے۔ اس حکومت کی بنیاد آل زیاد کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔ سامانی حکمران نصر دوم کے زمانے میں ایک شخص علی بن اطروش نے طبرستان میں عہد علویہ کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کے

متعلق شیعہ مصنف سید محمد طباطبائی لکھتے ہیں کہ!

اسی چوتھی صدی کے آغاز میں ہی ناصر اطروش جو کئی سال تک ایران کے شمالی حصوں میں مذہب شیعہ کی تبلیغ کر رہا تھا طبرستان کے علاقے پر قابض ہو گیا تھا اور وہاں اس نے سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی جو کئی پشتوں تک جاری رہی۔ اطروش سے پہلے بھی ایک شخص بنام حسن بن زید علوی نے کئی سال تک طبرستان میں حکومت کی تھی۔ (شیعہ صفحہ ۵۷)

کچھ عرصہ بعد ۳۲۰ھ کے قریب ایک اور شخص مرداویج نے طبرستان کا علاقہ ناصر اطروش سے چھین لیا اور رفتہ رفتہ یہ شخص اصفہان اور ہمدان کے علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی زبردست ریاست و حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ شخص بھی مذہب شیعہ کا ہی پیروتھا۔ اس کی فوج میں دیلم کے رہنے والے ابوشجاع بویہ ماہی گیر کے بیٹے علی، حسن اور احمد بھی ملازم تھے جوترقی کر کے امیر الامرائی کے درجہ تک پہنچ گئے۔

آل زیاد نے کرج کی حکومت ایک شخص ابوالحسن علی بن بویہ کو اس کی خدمات کے صلے میں دی۔ علی نے اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنی حکومت کو اتنی وسعت دی کہ جنوبی ایران کا علاقہ فارس بھی ان کی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ خلیفہ بغداد نے تینوں بھائیوں کی حکومت تسلیم کر لی۔ راضی باللہ نے علی بن بویہ کو عماد الدولہ کا خطاب دے کر صوبہ فارس کی سند حکومت عطا کی۔ اس کے بھائی حسن کو رکن الدولہ اور احمد کو معز الدولہ کا خطاب دے کر اصفہان و اہواز کی حکومتیں عطا کیں۔ یہی دیلمی خاندان بالآخر خلیفہ کو شاہ شطرنج بنا کر خود امیر الامراء کے نام سے مدار المہام خلافت بن گیا۔

ربیع الاول ۳۲۹ھ میں راضی باللہ فوت ہوا اور المتقی باللہ تخت نشین ہوا۔ اس خلیفہ کے زمانے سے دیلمیوں کا ایک نیا گروہ ترقی کرنے لگا۔ ۳۳۳ھ میں المتقی باللہ کو معزول کر کے اس کی جگہ المستکفی باللہ کو خلیفہ بنایا گیا تو اس کے کاتب جعفر بن شیرزاد کو امرائے دربار نے امیر الامراء بنایا۔ یہ امیر الامراء در پردہ آل بویہ سے ملا ہوا تھا۔ اس وقت سارے ایران پر آل بویہ دیلمی قابض تھے۔ آل بویہ نسلاً ایرانی اور مذہباً شیعہ تھے اور ان دونوں باتوں میں وہ متشدد بھی تھے۔ وہ نہ ایرانی کے سوا کسی کو با اقتدار دیکھ سکتے تھے اور نہ شیعہ کے سوا کسی کو معزز شمار کرتے تھے۔ خلیفہ المستکفی نے معز الدولہ دیلمی کو امیر الامراء مقرر کر کے سلطان کا مزید ایک لقب دے دیا۔ معز الدولہ بغداد پر چھا

گیا اور اس نے ۳۳۴ھ میں خلیفہ المستکفی کو سر دربار گرفتار کر کے اندھا کر دیا۔ معز الدولہ نے المستکفی کو اندھا کرنے کے بعد چاہا کہ کسی علوی فاطمی کو تخت خلافت پر بٹھائے لیکن اس کے بعض مشیروں اور مصاحبوں نے مشورہ دیا کہ آپ کی عظمت و عزت شیعہ قوم میں جو اب ہے وہ ہرگز باقی نہ رہے گی بلکہ پھر سب لوگ اس خلیفہ ہی کی اطاعت کریں گے اور آپ کا انجام اچھا نہ ہوگا اس کے برعکس اگر عباسی خلیفہ ہوگا تو آپ کو سب اسی طرح شیعیت کا سرپرست اور اپنا سردار سمجھتے رہیں گے۔ معز الدولہ نے اس مشورہ کو پسند کیا اور مطیع اللہ عباسی کو تخت نشین کر دیا ۳۴۱ھ میں بغداد کے اندر شیعوں کے ایک خاص فرقہ نے اپنے عقائد کی اعلانیہ تبلیغ کی جو تناسخ کا قائل تھا ان میں ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ مجھ میں حضرت علیؓ کی روح ہے۔ اس کی بیوی نے کہا کہ مجھ میں جبرائیل کی روح ہے۔ لوگ ان کا بھی ادب کرنے لگے کہ اپنے آپ کو اہل بیت سے نسبت دیتے ہیں۔ معز الدولہ نے ان سے کوئی تعرض نہ کیا۔

لعنت و تبرا کا آغاز

بنی بویہ نہایت متعصب اور غالی شیعہ تھے۔ دولت عباسیہ کے بہت سے وزراء اور متوسل عجمی اور شیعہ تھے لیکن ان میں سے کسی نے اعلانیہ شیعیت کی ترویج و اشاعت کی جرأت نہیں کی تھی معز الدولہ نے خلفاء کی قوت و طاقت ختم کرنے کے ساتھ ہی بغداد میں شیعیت کی تبلیغ شروع کر دی اور ۳۵۱ھ میں جامع مسجد بغداد کے دروازے پر ایک عبارت لکھوائی جس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ پر لعنت کی گئی تھی۔ اہلسنت نے یہ عبارت مٹا دی مگر شیعہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے انہوں نے دوبارہ لکھوادی جس پر شیعہ سنی فسادات کی آگ بھڑک اٹھی اور ہزاروں اہلسنت شہید ہو گئے۔ بقول شوستری یہ فتنہ اتنا بڑھ گیا کہ معز الدولہ بغداد کے تمام سنیوں کو قتل کرنے پر آمادہ ہو گیا تو محمد بن مہلبی وزیر نے درخواست کی کہ معاویہ کے سوا کسی اور پر شخصی لعنت نہ کریں۔ چنانچہ اس مشورہ کو قبول کرتے ہوئے جامع مسجد بغداد کے دروازہ پر اب یہ لکھوایا گیا کہ!

لعن الله معاوية بن ابى سفيان و من غصب فاطمة فدكاً و من منع من دفن الحسن عند جده و من نفى اباذر و من اخرج العباس عن الشورى.

معاویہ بن ابی سفیانؓ غاصبین فدک (اس سے مراد حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ ہیں) امام حسنؓ کو

روضہ نبوی میں دفن کرنے سے روکنے والوں (اس سے مراد حضرت عائشہؓ اور حضرت مروانؓ ہیں)
حضرت ابوذرؓ کو جلاوطن کرنے والوں (اس سے حضرت عثمانؓ مراد ہیں) اور حضرت عباسؓ کو شوریٰ
سے خارج کرنے والوں (اس سے حضرت عمرؓ مراد ہیں) پر لعنت ہو۔ (تاریخ ابن اثیر جلد نمبر ۸ صفحہ نمبر ۱۹۷)

بعض کتب میں "من غصب فدکا" کی بجائے "من اغضب فاطمہؓ" تحریر ہے۔
یعنی اللہ اس پر لعنت کرے جس نے حضرت فاطمہؓ کو غضبناک کیا۔ اس طرح اس تبرائی عبارت
میں شیعہ کی خواہش پوری ہوگئی کیونکہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت عائشہؓ پر
بھی العیاذ باللہ لعنت کا دائرہ وسیع ہو گیا۔

خلیفہ میں اس کفر کو روکنے کی طاقت نہ تھی۔ کسی سنی نے رات کو یہ عبارت مٹا دی۔
معز الدولہ نے پھر لکھوانے کا ارادہ کیا تو اس کے وزیر مہلبی نے مشورہ دیا کہ صرف معاویہ کے
نام کی تصریح کی جائے اور ان کے نام کے بعد "والظلمین لآل محمد" یعنی آل محمد پر ظلم
کرنے والوں کا فقرہ بڑھا دیا جائے۔ معز الدولہ نے یہ مشورہ قبول کر کے اس کے مطابق
عبارت لکھوا دی۔

معز الدولہ دیلمی نے صحابہ کرامؓ کی بدگوئی کو باقاعدہ شعار بنایا اور اپنے مخصوص
نظریات کی بناء پر فضائل صحابہؓ بیان کرنے پر علی الاعلان پابندی عائد کر دی۔ اگرچہ علماء حق نے
اس حکم امتناعی کی کھل کر خلاف ورزی کی لیکن روافض کو حکومت آل بویہ کی وجہ سے ایسا مذہبی سہارا
ملا کہ وہ سب صحابہؓ پر دلیر ہو گئے۔ چنانچہ ایک شیعہ مصنف شاکر حسین نقوی امروہی خود اس امر کا
اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ!

فاطمی خلافت کی مصر میں بنیاد پڑی اور دیلمی خاندان کو بغداد میں عروج حاصل ہوا اس
وقت سے شیعوں نے بطور انتقام یہ طریقہ اختیار کیا پھر شیعوں میں اس کا رواج ایسا عام ہوا کہ جو
آج تک کم و بیش جاری ہے۔
(مجاہد اعظم صفحہ ۳۴۳)

معز الدولہ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بغداد میں شیعوں کے تمام مراسم بھی جاری کر دیئے۔

عید غدیر کی ایجاد

معز الدولہ نے ۱۸ ذی الحج ۳۵۱ھ کو بغداد میں عید منانے کا حکم دیا اور اس عید کا نام
"عید غدیر خم" رکھا۔ اسی کے حکم سے شہر کے بازار آراستہ ہوئے۔ رات کو آتش بازی کا مظاہرہ

کیا گیا خوب ڈھول بجائے گئے اور خوشیاں منائی گئیں. دراصل عید غدیر اس فرضی، بے اصل اور خیالی واقعے کی یاد میں ایجاد کی گئی جس میں بقول شیعہ آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع سے واپسی پر اثناء راہ "غدیر خم" کے مقام پر اپنے بعد حضرت علیؓ کے جانشین بنائے جانے کا اعلان کیا تھا۔ مگر حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ نے حضرت علی کا مفروضہ حق غصب کر لیا۔

۱۸ ذی الحج ۳۵ھ کو حضرت عثمانؓ شہید ہوئے تو حضرت علیؓ کو اپنا غصب شدہ حق مل گیا گویا سبائیوں نے حضرت علیؓ کی جانشینی کے نام پر حضرت عثمانؓ کی شہادت پر خوشی کے لئے یہ جشن (عید غدیر) ترتیب دیا۔

آپ ﷺ نے اپنا آخری حج ۱۰ھ میں ادا فرمایا تھا لیکن ۳۵۰ھ تک اس جشن اور عید کا کسی کو خیال نہ آیا. چونکہ آل بویہ انتہائی متعصب اور غالی شیعہ تھے اس لئے معزالدولہ دیلمی نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کی تاریخ کو عید کا دن قرار دیا۔

چنانچہ امام ابن کثیر لکھتے ہیں کہ!

اسی سال کی اٹھارہویں ذوالحجہ کو معزالدولہ نے حکم دیا کہ عید غدیر کی خوشی میں پورے بغداد میں آرائش کی جائے. عیدین کی طرح رات بھر بازار کھلے رہیں ڈھول اور نقارے بجائے جائیں اور امراء کے دروازوں اور چھاؤنی کے علاقوں میں آتش بازی کی جائے۔

(البدایہ والنہایہ جلد نمبر ۱۱ صفحہ نمبر ۲۴۳)

یہ آتش بازی کا حکم خود معزالدولہ کی مجوسی اور آتش پرست ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔

شیعہ کی معتبر کتاب "تحفۃ العوام" میں ایک باب قائم کیا گیا ہے. جس کا عنوان ہے. "باب چودھواں. بارہ مہینوں کی تاریخہائے سعد و نحس میں" اس میں ماہ ذی الحج کی ۱۸ تاریخ کے تحت لکھا ہے کہ "نیک یعنی سعد ہے. عید غدیر ہے. خلیفہ ثالث مقتول ہوئے"۔

فصل تیسری فضیلت عید غدیر میں اور وہ اٹھارہویں ذی الحجہ کی ہے. سب عیدوں سے عظیم تر ہے کہ اس روز کامل کیا خدا نے دین کو کہ رسول خدا نے جناب امیر المومنین کو بحکم خدا اپنا خلیفہ اور جانشین کیا اور ہزاروں آدمیوں پر جناب امیرؑ کی فضیلت ظاہر ہوئی اور یہ عید مخصوص شیعوں کی ہے. جناب امام رضاؑ سے بسند معتبر منقول ہے کہ حق تعالیٰ حکم فرماتا ہے۔

نویسندگان اعمال کو کہ شیعان علی و محبان اہلبیت کے گناہ تین روز تک نہ لکھو یعنی اٹھارہویں

سے بیسویں تک بسبب کرامت محمد علی و فاطمہ و ائمہ حدیٰ کے (کیونکہ ۱۸ تاریخ کو شیعوں نے حضرت عثمانؓ کو شہید کیا تھا اور اس کے بعد مسجد نبوی) اور ..... مدینۃ النبیؐ میں طوفان بدتمیزی، شور و غل اور اودھم مچائے رکھا۔ یہ ان کے ناقابل معافی جرم و گناہ تھے اس لیے انہوں نے اپنے امام کی وساطت سے نامہ اعمال میں درج ہی نہیں ہونے دیئے) اور اگر کوئی محب اہلبیت آج کے روز مرے گا گویا شہید مرے گا یعنی شہید کا ثواب اس کو عطا ہوگا۔ (تحفۃ العوام صفحہ ۱۶۸)

غور طلب بات یہ ہے کہ ۱۸ ذی الحج کی تاریخ میں کسی شیعہ کی موت شہادت کا درجہ کیوں اختیار کرے گی؟

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ کچھ شیعے حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش کے دوران مردار ہوئے تھے اور کچھ بعد کے ادوار میں خصوصاً جمل و صفین میں کیفر کردار کو پہنچے اس لیے ان کی موت کو شہادت کا درجہ دے دیا گیا۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ معز الدولہ دیلمی کے باقاعدہ طور پر اس تاریخ کو "عید غدیر" قرار دینے کے بعد جو شیعہ سنی مزاحمت کے دوران مردار ہو جائیں تو انہیں پہلے ہی "شہادت" کی بشارت دے دی جائے۔ کیونکہ شیعہ تو ہر حال میں "عید غدیر" منائیں گے (اور یہ ان کا مذہبی حق بھی ہے) اگر کسی سنی نے انہیں روکا تو یہ شہادت کے بلند مرتبہ سے سرفراز ہو جائیں گے۔

اس لئے کچھ "عاقبت نااندیش" سنیوں نے مزاحمت ترک کر دی کہ کہیں یہ "شہادت" کا درجہ نہ پالیں۔ بلکہ اب تو کچھ "سنی" بھی اپنے شیعہ بھائیوں کے ساتھ مل کر معز الدولہ کی جاری کردہ "عید غدیر" منانے لگے ہیں۔ چنانچہ روزنامہ اوصاف میں ایک خبر شائع ہوئی جس کی سرخی ہے کہ "لکی مروت میں شیعہ سنی نے مل کر یوم غدیر منایا ۱۸ ذی الحج کی مناسبت سے امیر المؤمنین حضرت علیؓ کے فضائل و مراتب بیان کئے گئے"۔

اس کے تحت لکھا ہے کہ!

حسب روایت امسال بھی ۱۸ ذی الحج کی مناسبت سے یوم غدیر کے نام سے امیر نواز مروت کی رہائش گاہ پر ایک بڑے جلسہ کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں سنی شیعہ حضرات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ جلسہ کا آغاز بعد از نماز عشاء غلام رسول حیدری نے تلاوت قرآن پاک سے کیا۔ مقامی ذاکرین و علمائے کرام کے علاوہ باہر سے آئے ہوئے مقررین ناصر حسنی، اقبال

حسین شاہ اور علامہ حامد علی اور علی حیدری نے امیر المومنین حضرت علیؓ کے فضائل و مراتب بیان فرمائے۔ (روزنامہ اوصاف ۱۹۹۸-۴-۱۹ء)

شیعہ تو اس دن حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خوشی میں "عید غدیر" مناتے ہیں۔ لیکن سنی کی اس بے غیرتی و بے حمیتی پر سخت حیرت ہے۔ بظاہر یہ کہا جاتا ہے کہ اس تاریخ کو حضرت علیؓ کے متعلق یہ حدیث "من کنت مولاہ فعلیّ مولاہ" ارشاد فرمائی گئی تھی اس حدیث کا روایتی و درایتی تجزیہ آگے تصوف اور شیعیت کے باب میں "مولائے کائنات" کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں صرف یہ پوچھنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ دسویں محرم کو عام مسلمان خوب دھوم دھام سے اس بات کی خوشی کیوں نہ منائیں کہ اس دن ایک جلیل القدر پیغمبر سیدنا موسیٰؑ کو ظالم فرعون اور اس کے لشکریوں سے نجات حاصل ہوئی تھی۔ حضرت حسینؓ کے غم پر پیغمبر کی خوشی کو بہر حال ترجیح حاصل ہے۔ آنحضرت ﷺ کی لخت جگر سیدہ رقیہؓ کے سانحہ رحلت پر فتح بدر کی خوشی کو اسی لئے ترجیح دی گئی تھی۔

ماتم حسینؓ کی ابتداء

شیعہ و سنی تمام مؤرخین و مؤلفین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حادثہ کربلا کے تقریباً تین سو برس گذر جانے کے بعد ۳۵۲ھ میں ایرانی النسل اور شیعہ مذہب کے امیر الامراء معز الدولہ دیلمی نے حکم دیا کہ ۱۰ محرم کو حضرت حسینؓ کی شہادت کے غم میں تمام دکانیں بند کر دی جائیں۔ خرید و فروخت بالکل موقوف رہے۔ شہر و دیہات کے لوگ ماتمی لباس پہنیں، اعلانیہ نوحہ کریں۔ عورتیں اپنے بال کھولے ہوئے۔ چہروں کو سیاہ کئے ہوئے، کپڑوں کو پھاڑے ہوئے، سڑکوں اور بازاروں میں مرثیے پڑھتی منہ نوچتی اور چھاتیاں پیٹتی ہوئی نکلیں۔

شیعوں نے بخوشی اس حکم کی تعمیل کی مگر اہلسنت دم بخود اور خاموش رہے کیونکہ شیعوں کی حکومت تھی۔ آئندہ سال ۳۵۳ھ میں پھر اسی حکم کا اعادہ کیا گیا اور اہلسنت کو بھی اس کی تعمیل کا حکم دیا گیا۔ اہلسنت اس ذلت کو برداشت نہ کر سکے۔ چنانچہ شیعہ سنی فساد برپا ہوا اور بہت بڑی خون ریزی ہوئی اس کے بعد شیعوں نے ہر سال اس رسم کو بجالانا ضروری سمجھا اور آج تک وہ اس پر عمل پیرا ہیں۔

امام ابن کثیر لکھتے ہیں۔

معز الدولہ بن بویہ قبحہ اللہ (اللہ اس کا ناس کرے) نے اسی سال کے دسویں محرم کو حکم دیا کہ بازار بند رکھے جائیں۔ عورتیں ٹاٹ کا ماتمی لباس پہنیں اور اپنے چہرے کھولے ہوئے بال

بکھیرے ہوئے اور منہ پیٹتی ہوئی نکلیں اور حسین بن علی بن ابی طالب پر ماتم کریں۔ اہل سنت کے لئے ان کو روکنا ناممکن تھا کیونکہ شیعہ کی کثرت تھی اور حاکم ان کے ساتھ تھا۔

(البدایہ والنہایہ جلد نمبر ۱۱ صفحہ نمبر ۲۴۳)

اگرچہ آل بویہ کی حکومت کو ختم ہوئے صدیاں بیت گئیں لیکن معز الدولہ دیلمی کا حکم آج بھی جوں کا توں پاکستان میں نافذ العمل ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس وقت بغداد میں شیعہ حکمران شیعہ فوج کی نگرانی میں توہین اسلام اور قدح صحابہؓ پر مشتمل ماتمی جلوس نکلواتے تھے جبکہ پاکستان (جو غالب ترین سنی اکثریت کا ملک ہے) میں سنی حکمران سنی فوج اور سنی پولیس کی نگرانی میں یہ فریضہ ادا کرتے ہیں۔ (فیا اسفا)۔

بہرحال یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ واقعہ کربلا کے تین سو سال بعد "ماتم حسینؓ" کی رسم ایجاد ہوئی۔ جس کی بنیاد کسی قریشی ہاشمی، علوی، حسنی، حسینی یا کسی عربی النسل نے نہیں بلکہ ایرانی النسل ایک شیعہ حاکم نے محض اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے ڈالی خود شیعہ مورخین و مولفین نے بھی ماتم حسینؓ کی ابتدا ۳۵۲ھ سے ہونا بیان کی ہے۔ جسٹس امیر علی شیعہ نے اپنی دونوں تالیفات "اسپرٹ آف اسلام اور تاریخ عرب" میں اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ معز الدولہ نے جو مسلکاً شیعہ تھا حادثہ کربلا کی یادگار کے طور پر دسویں محرم کو ماتم حسین کا دن مقرر کر دیا تھا۔

تلخیص مرقع کربلا کے شیعہ مولف نے بھی یہ تحریر کیا ہے کہ!

"معز الدولہ پہلا حاکم مذہب شیعہ کا تھا۔ جس نے یوم عاشورا کو بازار بند کروائے نانبائیوں کو کھانا پکانے کی ممانعت کر دی اور حکم دیا کہ عورتیں سر کھولیں، راستوں میں نکلیں اور ماتم حسین کریں"۔

(صفحہ نمبر ۷۸)

عصر حاضر کے شیعہ مصنف و مورخ شاکر حسین نقوی معز الدولہ کو "ماتم حسین" کا موجد بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ!

سلطنت بغداد کے ضعف پر دیلمی خاندان بویہ کو عروج ہوا تو ۳۵۲ھ میں معز الدولہ دیلمی کے حکم سے بغداد میں حسین مظلوم کا اعلانیہ ماتم منایا گیا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس طرح بہ تغیر نوعیت آزادانہ مجلس عزا قائم ہوئی۔ یہ رسم بغداد میں کئی برس جاری رہی۔ (مجاہد اعظم صفحہ نمبر ۲۴۲)

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ!

عاشورہ کے دن شیعہ گھروں میں مکمل سوگ ہوتا ہے اور باہر تعزیہ علم اور ذوالجناح کے جلوس نکلتے ہیں جلوس کے ساتھ سینہ زنی نوحہ خوانی اور غم انگیز مظاہرے ہوتے ہیں۔ تاریخ نے سب سے پہلا بڑا جلوس اور سرکاری طور پر منایا جانے والا یوم غم ۳۵۲ھ میں لکھا ہے۔ اس سال معزالدولہ نے حکم کے ذریعے بغداد کے بازار بند کرادیئے اور جلوس ماتم بغداد سے گزرا۔ اس کے بعد سے اختلاف واتفاق کے ساتھ یہ جلوس عام ہوتے گئے اور پاکستان و ہندوستان کے تمام شہروں میں بھی جہاں عزاداران اہلبیت موجود ہیں یہ دن جلوسوں کا دن ہے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد نمبر ۱۳ صفحہ ۱۷۶)

۳۵۶ھ میں معزالدولہ فوت ہوا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے عزالدولہ نے اقتدار سنبھالا۔ عباسی خلیفہ دیلمی حکمرانوں کے سامنے "شاہ شطرنج" سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا بلکہ اس کی حیثیت دن بدن ذلیل اور بے حقیقت ہوتی جاتی تھی۔

ممتاز محقق اور سکالر مولانا عبدالقدوس ہاشمی صاحب "لکھتے ہیں کہ!

آل بویہ دیلمی کے زمانہ تسلط میں عباسی خلفاء ذلیل تو بہت ہوئے مگر ہر بار ایک عباسی کو معزول کر کے دوسرے کسی عباسی شہزادہ کو ہی خلیفہ بنایا جاتا رہا حالانکہ اگر تھوڑی جرات سے کام لیتے تو عباسیوں کا سلسلہ ختم کر کے علویوں میں سے کسی کو خلیفہ بنا سکتے تھے اور وہ دل سے چاہتے بھی یہی تھے مگر اکثریت مطلقہ کے جذبات کو ٹھکرا دینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ (خلافت اسلامیہ صفحہ نمبر ۱۷۹)

تعجب ہے کہ ہاشمی صاحب نے دیلمیوں کی مذکورۃ الصدر خرافات، رسومات، تحریفات، اور اصحاب پیغمبر پر اعلانیہ سب وشتم کی کاروائیوں کے باوجود یہ کیوں کر لکھ دیا کہ "اکثریت مطلقہ کے جذبات کو ٹھکرا دینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا"

کیا سنی اکثریت صرف ایک ناکام اور بے اختیار خلیفہ کی موجودگی پر ہی مطمئن ہوگئی تھی؟ کیا معزالدولہ کی مذکورہ کاروائیوں سے سنی اکثریت کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچی تھی؟

اگر معزالدولہ سنی اکثریت کے جذبات کے پیش نظر عباسی خلیفہ کے بجائے علوی خلیفہ کا تقرر نہ کر سکا تو ان ہی جذبات کے پیش نظر مذکورہ مذموم کاروائیاں کیوں بند نہ کر سکا؟ معزالدولہ نے اکثریت مطلقہ کے جذبات کے پیش نظر عباسی خلیفہ کی جگہ علوی خلیفہ مقرر نہیں کیا بلکہ اپنے مشیر کے سمجھانے کے بعد اس نے یہ فیصلہ تبدیل کیا۔ اس کے مشیر نے اسے یہ رائے دی تھی کہ تم

اپنے فوجیوں کی مدد سے یہ کام تو ضرور کر سکتے ہو کیونکہ تمہارے شیعہ فوجی بھی عباسی خلیفہ کو جائز خلیفہ نہیں مانتے لیکن اگر کسی علوی کو خلیفہ بنا دیا تو پھر اسے کبھی معزول نہ کر سکو گے تمہارے فوجی اس کام میں تمہارا تعاون نہیں کریں گے۔ کیونکہ علوی کو وہ جائز خلیفہ جانتے اور مانتے ہوں گے۔

یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور خلیفہ کی تبدیلی کا خیال بھی اس نے دل سے نکال دیا۔ بہر حال بنی بویہ کے دور حکومت میں رفض وشیعیت کو ان کی پشت پناہی کی بدولت بہت فروغ حاصل ہوا۔

۳۵۷ھ میں دولت اخشیدیہ کا مصر میں خاتمہ ہوا اور یہ ملک عبیدیوں کے قبضہ میں آ گیا۔

۳۵۹ھ میں مصر کے اندر جامع ازہر کی تعمیر ہوئی جو عبیدی حاکم نے بطور فری میسن لاج اس غرض سے تعمیر کرائی کہ ممالک مشرقیہ میں شیعی دعوت کا مرکزی دفتر اور دعاۃ ونقباء کی تعلیم گاہ کا کام دے۔

۳۶۰ھ میں دمشق کے اندر بھی شیعہ حکومت قائم ہو گئی۔ افریقہ، مصر، شام، حجاز، یمن، بحرین، عراق، ایران، فارس اور خراسان وغیرہ میں شیعیت کا خوب زور شور ہو گیا۔ بغداد میں عزالدولہ نے منادی کرا دی کہ کوئی شخص نماز تراویح نہ پڑھے۔

مشہد علیؓ و مشہد حسینؓ

معزالدولہ کے بھتیجے عضدالدولہ نے اپنے زمانہ حکومت میں "ماتم حسینؓ" اور عید غدیر" کی رسموں کو دوامی حیثیت دینے کی خاطر ۳۶۹ھ میں عراق کے ایک متبرک مقام نجف اشرف میں حضرت علیؓ کی شہادت کے تین سو تیس برس بعد ایک مفروضہ قبر پر "مشہد علیؓ" کے نام سے ایک عالی شان عمارت تعمیر کرائی۔ اسی طرح ۳۷۰ھ میں حضرت حسینؓ کی شہادت کے تین سو دس برس بعد "مشہد حسینؓ" کی عمارت تعمیر ہوئی۔ اسی سال عضدالدولہ بویہی نے زیارت کے لئے حاضری دی اور مزید تعمیر، زیبائش و آرائش کا انتظام کیا اور جب ۳۷۲ھ میں خود فوت ہوا تو اسے بھی "مشہد علیؓ" کے قریب دفن کر دیا گیا۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں حضرت علیؓ کے مدفن کے متعلق عجیب و غریب روایات پائی جاتی ہیں اور مختلف مقامات میں ان کے مدفن ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے اور ہر دعویٰ اتنے شد و مد سے کیا گیا ہے کہ دوسرے دعوؤں پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور اس طرح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی دعویٰ بھی ایسا نہیں بچتا جس پر اعتماد کر کے یقینی طور پر یہ کہا جا سکے کہ آپ کا مزار واقعی فلاں مقام پر ہے اور اس قصہ سے متعلق فلاں راوی کی فلاں روایت زیادہ قابل اعتماد ہے۔ خطیب بغدادی

اور ابن کثیر نے جو روایات نقل کی ہیں۔ ان کے مطابق مختلف مقامات میں درج ذیل گیارہ مقامات پر مدفن ہونے کے دعوے کیے گئے ہیں۔

۱۔ قصر امارت کوفہ۔ ۲۔ جامع مسجد کوفہ کا پہلو۔ ۳۔ حجرہ حویلی جعدہ بن ھبیرہ کوفہ۔
۴۔ نواح کوفہ۔ ۵۔ مقام ثوبیہ۔ ۶۔ کناسہ۔ ۷۔ جنت البقیع۔
۷۔ بلاد طی۔ ۹۔ لحفہ، حیرہ۔ ۱۰۔ نجف۔ ۱۱۔ قریۃ الخیر بلخ۔

قدیم مورخین ابن قتیبہ اور طبری نے نجف میں حضرت علیؓ کی تدفین کا اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح شیعہ مورخ مسعودی (م ۳۴۶ھ) نے اپنی کتاب "التنبیہ والاشراف" میں اس نجفی مزار کا قطعاً کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ اپنی دوسری کتاب "مروج الذہب" میں آپ کے مدینہ منورہ میں مدفون ہونے کا ذکر کیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ چوتھی صدی ہجری سے قبل تک اس نجفی مشہد کا کہیں نام و نشان نہ تھا نجف میں مدفن کے ہونے کا دعویٰ سب سے پہلے عضد الدولہ دیلمی نے ۳۶۹ھ میں کیا اور اسی نے کوفہ سے سات آٹھ میل دور اسی ریگستانی مقام پر "مشہد علیؓ" کی تعمیر کرائی۔ ۳۷۰ھ میں عضد الدولہ دیلمی ہمدان کے سفر سے واپس آیا تو عباسی خلیفہ اس کے استقبال کے لئے بغداد سے باہر نکلا حالانکہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ کسی عباسی خلیفہ نے اس طرح کسی کا استقبال کیا ہو۔ ۳۷۲ھ میں عضد الدولہ فوت ہوا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا صمصام الدولہ دیلمی نائب السلطنت بغداد ہوا۔ ۳۷۳ھ میں فرقہ باطنیہ اسمٰعیلیہ نے بغداد میں ایک سیاسی انجمن قائم کی جس کے ممبر اخوان الصفاء کہلاتے تھے

۳۸۱ھ میں دیلمیوں نے عباسی خلیفہ الطائع للہ کو معزول کر کے قید کر دیا اور قادر باللہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ شمالی افریقہ میں قائم ہونے والی شیعہ اسماعیلیہ حکومت پہلے ہی مصر پر قابض ہو چکی تھی۔ الطائع کے عہد میں فاطمی حکومت نے بغیر کسی روک ٹوک کے بڑھ کر شام اور حجاز پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ دولت عباسیہ کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہوئی کیونکہ آل بویہ دیلمی کے جو امیر الامراء بغداد کی حکومت پر قابض تھے یعنی عز الدولہ، عضد الدولہ، صمصام الدولہ، شرف الدولہ اور بہاء الدولہ یہ سب ایک ہی خاندان (بویہ) کے افراد تھے۔ نسلاً ایرانی اور انتہائی متعصب اور غالی قسم کے شیعہ تھے۔ نہیں چاہتے تھے کہ شیعہ قوی تر حکومت فاطمیہ کی وسعت پذیری میں کوئی مزاحمت ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فاطمیوں کے نام کا خطبہ حرم مکہ میں پڑھا گیا۔

(اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیعہ خواہ وہ زیدی ہو یا اسماعیلی یا اثنا عشری سنیوں کے خلاف ہمیشہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار رہے)

۳۹۳ھ میں مصری شیعہ سلطنت کے گورنر دمشق نے ایک سنی امیر کو گدھے پر سوار کر کے سارے شہر میں گھمایا اور یہ اعلان کرایا کہ یہ اس شخص کی سزا ہے جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے محبت رکھے اس کے بعد اس سنی امیر کو شہید کر دیا گیا۔

۳۹۵ھ میں حاکم عبیدی نے مصر میں بہت سے علماء کو قتل کرایا اور مسجدوں کے دروازوں اور شارع عام پر صحابہ کرامؓ کو گالیاں لکھ کر لگائیں اور عمال کو حکم دیا کہ صحابہؓ کو علی رؤس الاشہاد گالیاں دی جایا کریں۔

۴۱۸ھ میں جلال الدولہ دیلمی امیر الامراء و نائب السلطنت بغداد نے حکم جاری کیا کہ نماز پنج وقتہ کے لئے مسجدوں میں اذان بندی جائے اور بجائے اذان کے نقارہ بجایا جائے۔ خلیفہ قادر باللہ نے اس بدعت کو سخت ناپسند کیا اور جلال الدولہ سے اس حکم کو منسوخ کرنے کی فرمائش کی۔ جلال الدولہ نے یہ حکم منسوخ تو کر دیا مگر خلیفہ سے ناراض ہو گیا خلیفہ جلال الدولہ کی ناراضگی سے ڈرا اور چند دن بعد دوبارہ نقارہ بجانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ جلال الدولہ نے نقارہ بجانے کا حکم دوبارہ جاری کیا اور بجائے اذان نقارہ بجنے لگا۔

۴۲۲ھ میں قادر باللہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا قائم بامر اللہ تخت نشین ہوا۔ قادر باللہ کے تمام عہد خلافت میں بغداد کے اندر شیعہ سنی ہنگامے برپا رہے۔ قائم بامر اللہ کے تخت نشین ہونے کے بعد شیعوں نے سنیوں پر مظالم کی حد کر دی اور سنیوں کی زندگی پہلے سے زیادہ تلخ ہو گئی۔ اسی زمانے میں سلطان محمود غزنوی نے وفات پائی اور سلجوقیوں نے ماوراء النہر اور خراسان میں اپنی حکومت قائم کی۔ مکہ معظمہ اور حجاز پر مصر کے عبیدیوں یعنی شیعوں کا قبضہ ہو چکا تھا اسی زمانہ میں اندلس کی خلافت کا بھی خاتمہ ہوا اور وہاں خاندان بنو امیہ کی زبردست سلطنت پارہ پارہ ہو کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تبدیل ہو گئی جو باہم دست و گریباں رہنے لگیں۔

۴۲۹ھ میں جلال الدولہ دیلمی نے عباسی خلیفہ سے "ملک الملوک" کے خطاب کی فرمائش کی اور خلیفہ کو مجبوراً یہ خطاب دینا پڑا حالانکہ وہ اس خطاب کو مذہباً شرک اور برا جانتا تھا۔

بغداد کے شیعوں نے سلجوقیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر چاہا کہ بغداد پر بھی عبیدی

شیعوں کا قبضہ کرادیں۔ دوسری طرف عبیدی شیعوں نے بحرین، بلوچستان، افغانستان، سندھ اور فارس وغیرہ صوبوں میں اپنے خفیہ ایجنٹ اور داعی پھیلا رکھے تھے اور تمام عالم اسلام میں شیعہ سلطنت قائم کرنے کی فکر میں تھے۔

دیلمیوں کا زوال

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے کہ آل بویہ ماہی گیر اور نہایت متعصب اور غالی شیعہ تھے۔ انہوں نے عباسی خلافت کا وقار خاک میں ملا دیا اور وہ تقریباً سوا سو سال تک بغداد، عراق اور فارس پر قابض رہے۔ ان کا دور اقتدار سنیوں کے لیئے نہایت دردانگیز اور سخت اذیت ناک تھا ان کے زمانے میں عربی سیادت کے تمام نقوش مٹ گئے۔ انہوں نے تمام ملک میں شیعہ، سنی فسادات کو ہوا دینے میں ہی مصلحت سمجھی۔ انہوں نے جو شرکیہ رسمیں جاری کیں وہ آج تک شیعوں کے لیے طوق لعنت بنی ہوئی ہیں۔ ان کی حکمرانی کے سوا سو برس بدنظمی، لوٹ مار، فتنہ و فساد اور قتل و غارت سے بھرے ہوئے ہیں۔

بالآخر طغرل بیگ سلجوقی نے جو متبع کتاب و سنت تھا ۴۴۷ھ میں بغداد میں فاتحانہ داخل ہو کر دیلمیوں کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ اس طرح شیعوں کے وہ تمام منصوبے بھی خاک میں مل گئے جن کے تحت وہ پورے عالم اسلام میں ایک عظیم اور مستحکم شیعہ سلطنت قائم کرنا چاہتے تھے۔

ولایت موصل دیلمی شیعوں نے آخر میں عبیدیوں کے سپرد کر دی تھی۔ ۴۵۰ھ میں سلطان طغرل سلجوقی جب ہمدان کی بغاوت فرو کرنے گیا ہوا تھا تو شیعوں نے موصل سے فوجیں لا کر دوبارہ بغداد پر قبضہ کر کے خلیفہ القائم کو معزول کر دیا اس طرح ۸ ذیقعدہ ۴۵۰ھ کو جامع مسجد بغداد میں مصر کے عبیدی خلیفہ کا خطبہ پڑھا گیا۔ مسجدوں میں شیعوں کی مخصوص اذانیں دی گئیں خلیفہ کے وزیر اعظم کو پکڑ کر صلیب پر چڑھا دیا گیا اور بغداد کے سنیوں پر ہر طرح کے مظالم ڈھانے کے علاوہ قصر خلافت کو بھی خوب لوٹا گیا۔

یہ خبر سن کر طغرل بیگ سلجوقی بغداد کی جانب روانہ ہوا اور ذیقعدہ ۴۵۱ھ کو بغداد پہنچا۔ شیعہ بغداد سے بھاگ گئے۔ سلطان طغرل بیگ نے خلیفہ کو دوبارہ تخت خلافت پر بٹھایا۔ سلجوقیوں نے ترکستان، خراسان، فارس، عراق، آذربائیجان اور شام وغیرہ کے تمام علاقے فتح کر کے ایک زبردست سلطنت قائم کر لی۔ جس سے مسلمانوں کو بہت راحت پہنچی۔ کتاب و سنت کی پیروی آزادی سے ہونے لگی اور دیلمیوں کے زمانہ کی بہت سی خرابیاں دور ہو گئیں۔ سلاطین سلاجقہ امرائے

دیالمہ سے بہت زیادہ طاقتور تھے۔ ۴۶۲ھ میں محمد بن ابی ہاشم والی مکہ نے مصر کے عبیدی شیعہ بادشاہ کا نام خطبہ سے نکال کر خلیفہ قائم بامر اللہ اور سلطان الپ ارسلان کا نام داخل کیا اور مکہ معظمہ میں شیعوں کی اذان بھی موقوف کر دی۔ اسی طرح حلب میں بھی خطبہ و اذان تبدیل ہوئی۔

بہرحال اثنا عشری شیعوں کو ان کی خفیہ ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے باعث طویل انتظار کے بعد آل بویہ کی صورت میں نہ صرف اقتدار نصیب ہوا بلکہ مذہب شیعہ کو بھی بہت فروغ حاصل ہوا۔ معز الدولہ اور آل بویہ سے تعلق رکھنے والے دیگر ارباب اقتدار اور افراد نے رفض و سبائیت کے فروغ کے سلسلہ میں جس سرگرمی سے حصہ لیا اور جس طرح کی متعصبانہ و غیر اسلامی کاروائیاں کیں ان کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے اور خود شیعہ مصنفین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔

چنانچہ علامہ سید محمد طباطبائی لکھتے ہیں کہ!

تیسری صدی ہجری کے آغاز سے شیعوں نے تازہ سانس لیا اس کا پہلا سبب یہ تھا کہ یونانی، سریانی اور دوسری زبانوں سے بہت زیادہ علمی اور فلسفی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ ہو گئی تھیں اور لوگ استدلالی، عقلی علوم کو حاصل کرنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ عباسی خلیفہ مامون الرشید معتزلہ مذہب کا پیرو تھا اور مذہب میں عقلی استدلال کی طرف مائل تھا لہٰذا اس نے مختلف ادیان اور مذاہب میں لفظی استدلال کے رواج کی تمام آزادی دے رکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ علماء اور شیعہ متکلمین نے اس آزادی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور انہوں نے علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اہلبیت کے مذہب کی تبلیغ میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ دوسرے یہ کہ خلیفہ مامون الرشید نے سیاسی حالات کے پیش نظر شیعوں کے آٹھویں امام کو اپنا ولی عہد اور جانشین بھی بنایا ہوا تھا جس کے نتیجے میں علوی خاندان اور اہلبیت کے دوست اور طرف دار ایک حد تک سرکاری عہدیداروں کے ظلم و تشدد سے محفوظ ہو چکے تھے اور کم و بیش آزاد تھے۔ چوتھی صدی ہجری کے دوران کچھ ایسے عناصر اور حالات پیدا ہو گئے تھے جو خود بخود مذہب شیعہ کی ترقی اور شیعوں کے طاقتور اور مضبوط بننے میں مدد کر رہے تھے۔ ان حالات میں سے خلافت بنو عباس کی کمزوری اور آل بویہ بادشاہوں کا ان کے مقابلے میں سر اٹھانا تھا۔ آل بویہ کے بادشاہ جو مذہبی طور پر شیعہ تھے اور خلافت کے مرکز بغداد میں اور اپنے ہی خلیفہ کے دربار میں ان کا بہت اثر و رسوخ تھا اور یہ شیعوں کے لیے ایک قابل توجہ طاقت تھی جو دن بدن ان کو زیادہ سے زیادہ جرأت مند اور طاقت ور

بنا رہی تھی تاکہ وہ اپنے مذہبی مخالفوں کے سامنے جو ہمیشہ خلافت کی طاقت پر بھروسہ اور تکیہ کیے ہوئے ان کو نیچا دکھانے کی فکر میں تھے کھڑے ہو جائیں اور ان کا مقابلہ کریں اور اس کے ساتھ ساتھ پوری آزادی سے اپنے شیعہ مذہب کی تبلیغ کریں۔ اس صدی کے دوران سارے جزیرۃ العرب یا اس کے زیادہ حصے میں بڑے بڑے شہروں کے علاوہ سب جگہ شیعہ آباد تھے لیکن ان کے علاوہ کچھ بڑے شہر بھی مثلاً ہجر عمان اور صعدہ وغیرہ شیعوں کے شہر شمار ہوتے تھے۔ شہر بصرہ میں بھی شیعوں کی قابل توجہ تعداد موجود تھی حالانکہ وہ شہر ہمیشہ سے اہلسنت کا مرکز تھا اور شہر کوفہ کے ساتھ جو شیعوں کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ مذہبی رقابت اور برابری رکھتا تھا اور اسی طرح دوسرے شہروں مثلاً طرابلس، نابلس، طبریہ، حلب اور ہرات میں بھی بہت زیادہ شیعہ زندگی گذارتے تھے۔ اس کے علاوہ اہواز، خلیج فارس کے کنارے پر بھی شیعوں کی تعداد قابل ملاحظہ تھی۔ اس صدی کے دوران فاطمیوں نے جو اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتے تھے مصر میں اقتدار حکومت سنبھال لیا اور ۲۹۸ھ سے ۵۶۷ھ تک حکومت کرتے رہے۔ {شیعہ ص ۵۲-۵۱}

یہ طویل اقتباس اس لیے نقل کیا گیا تاکہ خود شیعہ کی زبانی قارئین کرام کو اس دور میں شیعہ اور مذہب شیعہ کی ترقی کا حال معلوم ہو سکے۔

پاکستان کے معروف شیعہ مجتہد اور لیڈر مفتی جعفر حسین لکھتے ہیں کہ!

سلطنت عباسیہ کا مرکز عراق تھا اور عراق حضرت علی کا پایہ تخت رہ چکا تھا جس کی وجہ سے شیعیت ہر دور میں موجود رہی ہے اور بغداد کا محلہ کرخ خالص شیعہ آبادی پر مشتمل تھا جہاں کے علماء و فقہاء بھی کافی تعداد میں تھے۔ جو تصنیف و تالیف کے علاوہ تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ چنانچہ ابو عبداللہ شیخ مفید شیخ ابو جعفر طوسی، سید مرتضیٰ علوی الہدیٰ، سید رضی جامع نہج البلاغۃ اور دوسرے اعلام بغداد میں ہی بود و باش رکھتے تھے۔ البتہ جب مقامی ہنگامہ و فساد کے نتیجے میں بغداد کا امن و سکون رخصت ہو گیا تو شیخ ابو جعفر طوسی ۴۴۸ھ میں بغداد سے نجف چلے آئے اور اسے ایک علمی و عملی تربیت گاہ بنا دیا اور آج بھی نجف دنیائے شیعیت کا سب سے بڑا تعلیمی مرکز ہے۔ ایران میں شیعیت کی رفتار اوائل میں انتہائی سست رہی صرف قم میں شیعہ تھے جو اصلاً عرب (سبائی) تھے اور حجاج بن یوسف کے مظالم سے تنگ آ کر کوفے (جو شیعوں کا ہی ایک اہم اور بنیادی مرکز ہے) سے قم چلے آئے تھے اور تشیع کو اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کی وجہ

سے اہل قم نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا اور جب مامون الرشید کے دور میں امام علی رضا خراسان میں تشریف فرما ہوئے تو خراسان میں شیعیت تیزی سے پھیلنے لگی۔

۳۲۰ھ میں دیالمہ نے ایران کے بعض شہروں کو فتح کیا تو انہوں نے اپنے اثر و نفوذ سے مرکزی خلافت میں وزارت عظمیٰ کا درجہ حاصل کر لیا۔ یہ دیالمہ شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے شیعہ علماء کی سرپرستی کی اور شیعی عقائد کی ترویج میں نمایاں حصہ لیا۔

{اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور جلد نمبر ۱۱ صفحہ ۹۰۸}

الغرض آل بویہ کا دور حکومت (۳۲۰ھ تا ۴۴۸ھ) شیعیت کے لیئے بہت مفید ثابت ہوا۔ اس دور میں انہوں نے "ردائے تقیہ" اتار کر اہلسنت کو خوب تہ تیغ کیا۔ اپنے مذہبی عقائد اور رسومات کی سرکاری سرپرستی میں اعلانیہ تبلیغ کی اور اسی دور میں حسب ذیل شیعہ کتب حدیث بھی مدون ہوئیں جو استنباط و اخذ احکام میں ماخذ مدرک کا درجہ رکھتی ہیں اور فقہ جعفریہ کے مستند ترین ذخائر حدیث ہیں۔ اہل سنت کی کتب حدیث صحاح ستہ کے مقابلے میں انہیں اصول اربعہ اور صحاح اربعہ کہا جاتا ہے۔

۱۔ الکافی ۔۔۔ ابو جعفر محمد بن یعقوب الکلینی (م ۳۲۹ھ) اس کا ذکر پیچھے گذر چکا ہے۔

۲۔ من لا یحضرہ الفقیہ ۔۔۔ اس کے جامع شیخ ابو جعفر صدوق (م ۳۸۱ھ) ہیں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تین سو کتابیں لکھی ہیں جن میں زیادہ مشہور "من لا یحضرہ الفقیہ" ہے۔ یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے اور روایات کی جانچ پرکھ کے اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتی ہے اس میں مسند و مرسل احادیث کی تعداد چھ ہزار پانچ سو ترانوے (۶۵۹۳) ہے۔ شیخ صدوق کی دوسری کتاب "کمال الدین" ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ انہوں نے امام کے حکم سے لکھی ہے جو انہوں نے خواب میں انہیں دیا تھا اور وہ خواب انہوں نے مکہ میں دیکھا تھا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ امام قائم کی دعا کی برکت سے پیدا ہوئے ہیں اور ان کے بارے میں بحر العلوم نے لکھا ہے کہ امام نے اپنے اس خط میں جو ان کے دستخط سے ان کی مقدس جانب سے آتا تھا لکھا ہے کہ یہ مبارک فقیہ ہیں۔ {علل الشرائع ابن بابویہ}

۳۔ تہذیب الاحکام ۔۔۔ اس کے جامع شیخ الطائفہ ابو جعفر محمد بن الحسن الطوسی (م ۴۶۰ھ) ہیں۔ اس میں تیرہ ہزار پانچ سو نوے (۱۳۵۹۰) احادیث درج ہیں۔

۴۔ الاستبصار۔۔۔اس کے جامع بھی ابوجعفر طوسی ہیں اس کتاب کے تین حصے ہیں اور روایات کی تعداد چھ ہزار پانچ سو اکتیس (۶۵۳۱) ہے اہل تشیع کے نزدیک یہ چار کتابیں الکافی، من لایحضرہ الفقیہ اور تہذیبین قطعی ہیں اور جو کچھ ان میں ہے وہ صحیح اور حجت ہے۔

ان کے علاوہ آل بویہ کے دور کی ایک عظیم علمی شخصیت محمد بن نعمان (م ۴۱۳ھ) ہے۔ جن کی کنیت ابوعبداللہ اور لقب مفید ہے۔ یہ ملت جعفریہ کے جلیل عالم و بزرگ اور اپنے وقت کے قائد اور استاد تھے۔ انکے والد معلم تھے اس لیئے انہیں "ابن المعلم" بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے بعد جتنے بھی علماء ہوئے انہوں نے ان ہی سے استفادہ کیا۔ انہیں فقہ و کلام کا بادشاہ، روایت میں انتہائی موثق و معتبر اور اعلم وقت قرار دیا گیا۔

تذکرۃ الاطہار اردو ترجمہ کتاب الارشاد مؤلفہ شیخ مفید کے ناشر لکھتے ہیں کہ!

شیخ مفید چوتھی صدی ہجری کی ایک عظیم مقدس علمی شخصیت ہیں ان کے تقدس کے لیئے یہی کافی ہے کہ ایک روز آپ نے خواب دیکھا کہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اپنے دونوں بچوں کی انگلیاں پکڑے ہوئے تشریف لائی ہیں اور انہیں آپ کے حوالے کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ "شیخ انہیں دینی تعلیم دو" بیدار ہونے پر شیخ مفید انتہائی پریشان تھے۔ خواب کی کچھ تعبیر سمجھ میں نہ آتی تھی۔ دن چڑھا تو سادات کے ایک ممتاز گھرانے کی فاطمہ نامی خاتون اپنے دونوں بچوں کی انگلیاں پکڑے آئیں اور انہیں تعلیم دین کی غرض سے آپ کے حوالے کیا یہ دونوں بچے وہ تھے جو بعد میں آسمان علم کے آفتاب و ماہتاب بنے۔ یہ سید مرتضیٰ علم الہدیٰ جو اپنے دور کے سب سے بڑے فقیہ تھے اور سید شریف رضی جو سادات بغداد کے سربراہ ہوئے اور علوم اسلامیہ کی عظیم الشان کتاب فرمودات علی علیہ السلام "نہج البلاغہ" کے جامع تھے۔ (تذکرۃ الاطہار صفحہ ۹)

ابن شہر آشوب نے کہا ہے کہ امام صاحب العصر نے آپ کو "مفید" کا لقب عطا فرمایا۔ عضد الدولہ بعض اوقات آپ کی زیارت کے لیئے آیا کرتا تھا۔ آپ نے دو سو سے زیادہ کتب تصنیف کیں۔ آپ کا جنازہ دیکھنے کے قابل تھا۔ جس میں اسی ہزار شیعوں اور رافضیوں نے شرکت کی۔ آپ کی عظمت امام مہدی آخر الزمان عجل اللہ تعالیٰ فرجہ وسھل اللہ مخرجہ کے ان تین خطوط سے ہویدا ہے۔ جو تین سال کے دوران آپ کے پاس آئے۔ خط کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

"الاخ السدید والمولیٰ الرشید الشیخ المفید ابی عبداللہ محمد بن محمد بن نعمان ادام اللہ اعزازہ" سچے بھائی ہدایت

یافتہ دوست شیخ مفید ابو عبد اللہ محمد بن محمد بن نعمان خدا آپ کے اعزاز و احترام کو دوام بخشے۔

آپ کی وفات ۳ رمضان المبارک ۴۱۳ھ شب جمعہ میں ہوئی۔ نماز جنازہ آپ کے شاگرد رشید علامہ سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے میدان اشنان میں پڑھائی لوگوں کی اتنی کثرت تھی کہ یہ وسیع و عریض میدان تنگ ہو گیا۔ پہلے آپ کو گھر میں دفن کیا گیا اور کئی سال بعد کاظمین میں امام محمد تقی علیہ السلام کے قدموں میں شیخ ابو القاسم جعفر بن محمد بن قولویہ کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

(حوالہ مذکور صفحہ ۱۲-۱۱)

امام ذہبی نے لکھا ہے کہ شیخ مفید نے صحابہؓ اور سلف صالحین پر طعن کیے ہیں۔ عضد الدولہ بویہی کی حکومت میں اس کا کافی اثر تھا۔ اس کی کتابوں میں بعض کے نام یہ ہیں۔

الاعلام فیما اتفقت الامامیة علیه من الاحکام، الارشاد، الرسالة، المقنعة، الامالی، اصول الفقه۔

(الاعلام للزرکلی جلد ۷ ص ۲۴۵)

ملا باقر مجلسی نے بھی اس کی روایات اپنی کتاب میں نقل کی ہیں جن میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمرؓ کے متعلق لکھا ہے کہ!

"وہ جہنم کے ساتویں طبقہ میں ہیں ان کی گردنوں میں آگ کی زنجیریں ہیں اور ان کو اوپر کی جانب لٹکا دیا گیا ہے اور انکے سر پر دو گروہ کھڑے ہیں اور آگ کے گرز ان کے ہاتھوں میں ہیں اور وہ ان دونوں پر آگ کے وہ گرز مارتے ہیں۔ (حق الیقین صفحہ ۵۱۰)

اہل تشیع نے اپنے بارہویں امام کو چار پانچ سال کی عمر میں ۲۶۰ھ میں غائب کر دیا۔ اس کے بعد سفیروں کے ذریعے ان سے رابطہ رکھا جسے غیبت صغریٰ کا نام دیا گیا جو ۳۲۹ھ میں آخری سفیر کی وفات سے چند دن پہلے ہی ختم ہو گئی۔ ان کے بعد امام کی غیبت کبریٰ کا دور شروع ہوا جس میں سفیروں کا اپنے امام سے رابطہ ختم ہو گیا لیکن یہ امام کی شفقت و مہربانی ہے کہ اس نے سفیروں کے واسطہ کے بغیر ہی اپنے "پیاروں" کے ساتھ رابطہ اور تعلق قائم کیے رکھا۔ ان میں سے ایک شخصیت شیخ مفید کی بھی ہے جنہیں غیبت صغریٰ کا دور ختم ہو جانے کے بعد بھی امام العصر خطوط لکھتے رہے جو کسی غیبی نامعلوم طریقے سے ان کو مل جاتے تھے۔

شیعہ کی حالت سقوط بغداد تک

۴۴۷ھ میں طغرل بیگ سلجوقی نے آل بویہ کے سیاسی اقتدار کا خاتمہ کر کے جب ماتم

حسینؓ وعید غدیر کی رسموں اور سب صحابہؓ کی قطعی ممانعت کر دی تو بغداد کے شیعوں نے "ردائے تقیہ" دوبارہ اوڑھتے ہوئے اپنے رویہ میں تبدیلی پیدا کرلی۔

امام ابن کثیر ۴۴۸ھ کے تحت لکھتے ہیں کہ!

اس سال رافضیوں نے اذان میں "حی علی خیر العمل" کہنا ترک کر دیا اور اپنے موذنوں کو ہدایت کردی کہ صبح کی اذان میں "حی علی الفلاح" کے بعد دو مرتبہ "الصلوۃ خیر من النوم" بھی کہا کریں۔ مسجدوں کے دروازوں پر جو کتبے "محمد و علی خیر البشر" کے لگا رکھے تھے وہ بھی مٹا ڈالے اور شیعہ محلہ کرخ میں شعراء کے جو قصائد پڑھے جاتے تھے ان میں مدح صحابہؓ کے اشعار بھی پڑھے جانے لگے۔ سب رافضیوں کی ساری شیخی اور اکڑ کا خاتمہ ہو گیا تھا کیونکہ بنی بویہ کی حکومت جو ان کی یار و ناصر تھی نیست و نابود ہو گئی تھی ان کی جگہ سلجوقی ترک آ گئے تھے جو محب اہلسنت تھے۔ سلاجقہ کی حکومت ۵۹۰ھ تک قائم رہی۔ اس دوران بھی شیعوں نے زیر زمین اپنی مذموم کاروائیاں جاری رکھیں اور دیگر علاقوں میں باقاعدہ اپنے مذہب کی ترویج واشاعت کرتے رہے۔ مصر میں اس وقت بھی اسماعیلی شیعوں کی حکومت قائم تھی اور اثنا عشری برابر ان کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔ بلکہ دیلمیوں نے تو اپنے دور اقتدار کے آخر میں اس بات کی کوشش کی تھی کہ عبیدی شیعوں کا اقتدار پورے عالم اسلام پر قائم ہو جائے۔ جسے سلجوقیوں نے ناکام بنا دیا تھا۔ سلجوقی حکومت کے قیام کے بعد مصر میں رافضیوں کی فاطمی حکومت ہمیشہ فرنگیوں سے مدد طلب کرتی رہی اور انہیں شام پر حملہ کر کے سلجوقی اقتدار کو ختم کرنے کی ترغیب دیتی رہی۔ فرانسیسی مستشرق گوستاف لوبون جو اپنی اسلام دشمنی میں مشہور ہے وہ رافضیوں کے خلاف گواہی دیتا ہے کہ اسلامی ممالک پر صلیبیوں کے حملے مصر کی فاطمی حکومت کے مسلسل اصرار پر ہوئے اس حملے کی ہولناکیاں اور تباہ کاریاں مسلمانوں کے لیئے بغداد پر تاتاریوں کے حملے (جس کا ذکر آگے آرہا ہے) کی بربادی سے کم نہیں ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلم ممالک پر عیسائی جارحیت مصر میں رافضی حکومت کے اصرار پر ہوئی تھی۔ کیونکہ اس وقت قاہرہ کے رافضی حکام عیسائیوں کی مدد سے شام کی سلجوقی حکومت ختم کر کے پورے مشرق وسطی میں ایک رافضی شہنشاہیت کے قیام کے خواب دیکھ رہے تھے۔ مصر کی رافضی حکومت اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی بلکہ اپنے قیام کے ۲۷۰ برس بعد (۲۹۶ھ تا ۵۶۷ھ) سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں خود بھی اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

دیلمی اور مصری رافضی حکومت کے خاتمے کے بعد شیعہ نے پھر سے اپنی الگ حکومت

قائم کرنے کے لیے کوشش شروع کردی۔ جس میں وہ حسن بن صباح کی قیادت میں کامیاب ہو گئے۔ مقتدی باللہ کے دور خلافت میں حسن بن صباح نے ۴۸۳ھ میں سیستان کے قلعہ الموت میں شیعہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ جو ایک سو اکہتر (۱۷۱) سال (۴۸۳ھ تا ۶۵۴ھ) تک اسماعیلی نزاریوں کا مذہبی علمی اور سیاسی مرکز رہا۔ چونکہ تمام شیعہ "سنی دشمنی" میں متفق و متحد تھے۔ اس لیے اس دور میں بھی سنیوں کو سخت اذیتیں اور ذلتیں برداشت کرنی پڑیں۔ مصر کی شیعہ عبیدی حکومت نے کھلم کھلا اسلام دشمنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عیسائیوں کو شام و فلسطین پر حملہ آوری کی ترغیب دی جس کے نتیجے میں بیت المقدس پر قبضہ ہو گیا۔

سلاطین کے زوال (۵۹۰ھ) کے بعد تقریباً چھیاسٹھ (۶۶) سال تک بغداد میں بنو عباس کی حکومت قائم رہی۔ اگرچہ عباسی حکومت شیعہ کے تعاون سے ہی قائم ہوئی لیکن جب پوری طرح اور اپنی مرضی کے مطابق وہ شریک اقتدار نہیں کیے گئے تو انہوں نے اس خلافت کو نیست و نابود کرنے کے لیے مسلسل اپنی شرانگیز کاروائیاں جاری رکھیں۔ تقریباً پانچ سو سال کی مسلسل جدوجہد، زیرزمین سازشوں اور بغاوتوں کے بعد بالآخر مستعصم کے دور میں شیعہ کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو گئے۔ یہ خاندان عباسیہ بغداد کا آخری خلیفہ تھا۔ ۶۴۰ھ میں سریر آرائے خلافت ہوا۔ مستعصم میں ذاتی خوبیاں بہت تھیں لیکن جہانبانی کے اوصاف سے تہی دامن تھا۔ اسکی نااہلی کی یہی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اس نے ابن علقمی جیسے غالی شیعہ کو وزیر بنایا جو اس پر بہت ہی حاوی ہو گیا تھا۔ جس کا نتیجہ عباسی حکومت کی تباہی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ابن علقمی (پورا نام مؤید الدین ابوطالب محمد بن محمد علقمی ہے) نے عہدہ وزارت پر فائز ہوتے ہی خلیفہ کو کٹھ پتلی کی طرح اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کو عضو معطل بنا کر سیاہ و سفید کا مالک و مختار بن گیا۔ اس نے شیعوں کو آگے بڑھانا اور ہر قسم کی رعایتوں سے مستفید کرنا شروع کر دیا۔ دیلمیوں کے زمانے میں جو بدعات جاری تھیں ان کو پھر زندہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیعہ سنی فسادات دوبارہ شروع ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی ابن علقمی نے عباسیوں کا اقتدار ختم کر کے علویوں کا اقتدار قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے مشہور شیعہ محقق و فلسفی نصیر الدین طوسی سے رابطہ کیا جو ہلاکو خان کا محض درباری ہی نہیں بلکہ حقیقتاً مشیر المہام تھا۔ ہلاکو کے دل میں طوسی کی بہت ہی قدر و منزلت تھی اور وہ اس کے ہر مشورہ پر عمل کرتا تھا۔

بغداد پر بار بار حملہ کی دعوت کے باوجود ہلاکو جو ایک وہمی کافر تھا یہ سمجھتا تھا کہ مقدس خلیفہ پر حملہ کرنے سے کوئی آسمانی عذاب اس پر نازل ہو جائے گا۔ لیکن پانچ ماہ کی مسلسل کوششوں سے طوسی نے اسے سمجھایا کہ جب حضرت حسینؓ کے قتل سے کوئی عذاب نہ آیا تو مستعصم کے قتل سے کیا عذاب آئے گا؟ اس مشورہ کے بعد ہلاکو خان نے بغداد آ کر محاصرہ کر لیا جو پچاس دن تک جاری رہا۔ کچھ فوجی اور رضا کار اس کا مقابلہ کرنے کے لیئے باہر نکلے لیکن وہ شکست کھا گئے۔ ابن علقمی ایک سازش کے تحت علماء وفقہاء کو یہ تسلی دے کر کہ ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا ہلاکو کے پاس لایا۔ اس نے ابن علقمی کو چھوڑ کر باقی تمام علماء وفقہاء کو قتل کرا دیا اس کے بعد شہر کو آگ لگوا دی۔ بے دریغ قتل وغارت گری ہوئی۔ دریائے دجلہ کا پانی تین دن تک مقتولین کے خون سے سرخ رہا۔ کتب خانوں کو جلا دیا گیا کہ مہینوں تک کتابوں کی آگ نہیں بجھی۔ مدرسے، مساجد، شفاخانے اور مقبرے سب ہی پھونک دیئے گئے۔

ہلاکو خان نے مستعصم کے قتل کے متعلق اراکین سے مشورہ کیا۔ سب نے قتل کرنے کی رائے دی مگر نصیر الدین اور ابن علقمی نے ستم ظریفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ مستعصم مسلمانوں کا خلیفہ ہے اس کے خون سے تلوار کو آلودہ نہیں ہونا چاہیئے بلکہ نمدے میں لپیٹ کر لاتوں سے کچلوانا چاہیئے۔ چنانچہ یہ کام ابن علقمی کے سپرد ہوا اور اس نمک حرام نے اپنے آقا مستعصم باللہ کو نمدے میں لپیٹ کر اور ایک ستون سے باندھ کر اس قدر لاتیں لگوائیں کہ خلیفہ کا دم نکل گیا پھر اس کی لاش کو مغل سپاہیوں کے پاؤں سے کچلوا کر پارہ پارہ اور ریزہ ریزہ کروا دیا اور خود یہ دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہا کہ میں علویوں کے خون کا بدلہ لے رہا ہوں۔

شیخ تاج الدین السبکی لکھتے ہیں کہ!

خلیفہ کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ اگر اس کا خون زمین پر گرا تو کوئی بڑی آفت آئے گی ہلاکو کو تردد تھا نصیر الدین طوسی نے کہا کچھ مشکل بات نہیں خلیفہ کا خون نہ بہایا جائے بلکہ دوسری طرح اس کی جان لی جائے چنانچہ اس کو فرش میں لپیٹ دیا گیا اور ٹھوکروں اور لاتوں سے اس کو ختم کر دیا گیا۔ بغداد میں ایک مہینہ سے زیادہ قتل عام جاری رہا کہا جاتا ہے کہ ہلاکو نے مقتولین کو شمار کرایا تو اٹھارہ لاکھ مقتول شمار ہوئے۔ (طبقات الشافعیہ الکبریٰ جلد نمبر ۵ صفحہ ۱۱۲ بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت جلد نمبر ۱ ص ۳۶۵)

ابن علقمی کے جذبہ انتقام سے متعلق مفکر اسلام سید ابوالحسن علی ندوی نے بڑی "سادگی"

کے ساتھ اشارہ فرمایا ہے کہ!

۶۴۲ھ میں ابن علقمی کے نام خلافت عباسیہ کی وزارت عظمیٰ کا قرعہ فال نکلا۔ خلافت کے نظم و نسق میں اس وقت سے بڑی برہمی پیدا ہوئی۔ بعد [illegible]ھ میں بغداد میں شیعہ سنی کا زبردست جھگڑا ہوا یہاں تک کہ ابن علقمی کے عزیزوں کے مکانات تک لوٹ لیے گئے ان واقعات سے ان کے دل میں بیدلی کا پیدا ہونا اور جذبہ انتقام کا ابھرنا بعید از قیاس نہیں۔ (تاریخ دعوت و عزیمت جلد انمبر صفحہ ۳۰۱)

کاش کہ موصوف یہ وضاحت بھی فرما دیتے کہ ۶۵۵ھ میں شیعہ سنی کا زبردست جھگڑا کیوں ہوا؟ انہوں نے یہ تو لکھ دیا کہ "جذبہ انتقام" اس لیئے ابھرا کہ ابن علقمی کے عزیزوں کے مکانات لوٹ لیئے گئے تھے مگر وہ اہلسنت پر شیعہ کی طرف سے بربریت و سفاکیت کے مسلسل واقعات کو یکسر نظر انداز کر گئے۔ کیا ابن علقمی نے ۶۴۲ھ سے ۶۵۵ھ تک اہلسنت پر ڈھائے جانے والے مظالم میں کوئی کردار ادا نہیں کیا تھا؟

شیعہ سنی فسادات اس لیئے بھڑکے کہ ابن علقمی نے وزارت کا قلمدان سنبھالتے ہی شیعوں کو نوازنا شروع کر دیا، اعلیٰ عہدوں اور مناصب پر انہیں فائز کیا، خلیفہ کو نہ صرف عضو معطل بنا دیا بلکہ اسکی جگہ کسی علوی کو خلیفہ بنانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیئے اور دیلمیوں کے دور کی بدعات و رسومات کو پھر زندہ کیا۔ الغرض سلطنت عباسیہ اپنے سقوط (۶۵۶ھ) تک شیعوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اندرونی طور پر کھوکھلی ہو چکی تھی اور نظام سلطنت تمام کا تمام شیعوں کے ہاتھ میں تھا۔ ابن علقمی نے اپنے دیگر منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیئے ہلاکو خان کو خطوط لکھے۔ اپنے عزیزوں کو اس کے پاس بطور وفد روانہ کیا اور بالآخر نصیر الدین طوسی کے ساتھ ساز باز کر کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ ابن علقمی شیعہ اور نصیر الدین طوسی شیعہ (جسے ملا باقر مجلسی نے "خواجہ نصیر الملت والدین محمد بن حسن الطوسی الوزیر با ہلاکو خان" کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ تذکرۃ الائمہ صفحہ ۹۷ خمینی نے بھی اس کا ذکر اپنی کتاب کشف الاسرار صفحہ ۸۵ پر کیا ہے) کی سازش سے ہلاکو خان نے بغداد پر ۶۵۶ھ میں حملہ کیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ابن علقمی اور طوسی کے علاوہ کرخ اور کاظمین کے نواح میں بسنے والے شیعوں نے منگولوں کی اطاعت قبول کر لی تھی جب منگول کا فوجی دستہ حلہ میں داخل ہوا تو وہاں کے شیعوں نے من

حیث الجماعت اس کا والہانہ استقبال بھی کیا۔

اس طرح ایرانیوں نے مسلمانوں سے اپنی گذشتہ تمام شکستوں اور ناکامیوں کا بدلہ چکا دیا لیکن یہ بدلہ تو وہ تھا جو انہوں نے مسلمانوں اور عربوں سے لیا اور جو بدلہ انہوں نے خود اسلام (جس نے ان کے مذہب مجوسیت کو ختم کر دیا تھا) سے لیا اس کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔

بغداد کی تباہی اتنا اہم حادثہ ہے کہ اس نے تاریخ بدل دی، علم وہنر کا مرکز تباہ ہو گیا، علماء وفضلاء اور فقہاء قتل ہو گئے، مسلمانوں کی علمی حرکت ختم ہو گئی اور وہ کون ہو گا جو اس حادثہ پر خون کے آنسو نہ رویا ہو۔ شیعہ مورخ ابن طقطقی کا بیان ہے کہ!

تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کے قتل عام اور وحشیانہ لوٹ کا اجمالی حال سننا بھی بڑی بات ہے تفصیل سننے کی تاب کس کو ہوگی؟ اس شہر پر جو کچھ گذری وہ گذر گئی اس کا حال قلم انداز کیا جاتا ہے صرف اس کا قیاس کر لو اور اس کا حال نہ پوچھو۔ (تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی جلد ۴۔ صفحہ ۲۹۳)

مؤرخ ابن اثیر اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی قلبی کیفیت اور تاثر کو چھپا نہیں سکے وہ لکھتے ہیں کہ!

یہ حادثہ اتنا ہولناک اور ناگوار ہے کہ میں کئی برس تک اس پس وپیش میں رہا کہ اس کا ذکر کروں یا نہ کروں۔ اب بھی بڑے تردد وتکلف کے ساتھ اس کا ذکر کر رہا ہوں اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی خبر موت سنانا کس کو آسان ہے اور کس کا جگر ہے کہ ان کی ذلت ورسوائی کی داستان سنائے؟ کاش میں نہ پیدا ہوتا، کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر چکا ہوتا اور بھولا بسرا ہوتا۔۔۔ لیکن مجھے بعض دوستوں نے اس واقعہ کے لکھنے پر آمادہ کیا پھر بھی مجھے تردد تھا لیکن میں نے دیکھا کہ نہ لکھنے سے بھی کچھ فائدہ نہیں۔

یہ وہ حادثہ عظمیٰ اور مصیبت کبریٰ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اس واقعہ کا تعلق تمام انسانوں سے ہے لیکن خاص طور پر مسلمانوں سے ہے اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ از آدم تا این دم ایسا واقعہ دنیا میں نہیں پیش آیا تو وہ کچھ غلط دعویٰ نہ ہوگا۔ اس لیئے کہ تاریخ میں اس واقعہ کے پاسنگ بھی کوئی واقعہ نہیں ملتا اور شاید دنیا قیامت تک (یاجوج وماجوج کے سوا) کبھی ایسا واقعہ نہ دیکھے۔ ان وحشیوں نے کسی پر رحم نہیں کھایا۔ انہوں نے عورتوں، مردوں اور بچوں کو قتل کیا، عورتوں کے پیٹ چاک کر دیئے اور پیٹ کے بچوں کو مار ڈالا۔ یہ حادثہ عالم گیر دعالم آشوب تھا

ایک طوفان کی طرح اٹھا اور دیکھتے دیکھتے سارے عالم پر پھیل گیا۔ (الکامل ابن اثیر جلد ۱۲ صفحہ ۱۴۹)

مورخ ابن کثیر بغداد کی تباہی اور تاتاریوں کی غارت گری و خون آشامی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ!

بغداد میں چالیس دن تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا۔ چالیس دن کے بعد یہ گلزار شہر جو دنیا کا پر رونق ترین شہر تھا ایسا ویران و تاراج ہو گیا کہ تھوڑے سے آدمی دکھائی دیتے تھے۔ بازاروں اور راستوں پر لاشوں کے ڈھیر اس طرح لگے تھے کہ ٹیلے نظر آتے تھے۔ ان لاشوں پر بارش ہوئی تو صورتیں بگڑ گئیں اور سارے شہر میں تعفن پھیلا جس سے شہر کی ہوا خراب ہوئی اور سخت وبا پھیلی جس کا اثر ملک شام تک پہنچا۔ اس ہوا اور وبا سے بکثرت مخلوق مری۔ گرانی، وبا اور فناتیوں کا دور دورہ تھا۔ (البدایہ و النہایہ بحوالہ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر صفحہ ۱۶۱ از سید ابوالحسن علی ندوی)

فارسی کے مشہور شاعر شیخ سعدی شیرازی مصنف "گلستان و بوستان" نے اس حادثہ سے متاثر ہو کر عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں مرثیہ لکھا۔ فارسی کا مرثیہ زیادہ مشہور بہت دردناک اور پرسوز ہے جسکا پہلا شعر ہے۔

آسماں را حق بود گر خون ببارد بر زمیں　　بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین

(کلیات سعدی صفحہ ۵۰)

اس ساری تباہی و بربادی کے بعد ابن علقمی نے کوشش کی کہ علویوں اور شیعوں کی حکومت قائم ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے اس نے تاتاریوں کو راضی کرنے کے ہزار جتن کیے مگر کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور وہ ناکام و مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو گیا اور سقوط بغداد کے بعد جلد ہی وہ دنیا سے بھی رخصت ہو گیا۔

آٹھویں اور نویں صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت

سقوط بغداد ۶۵۶ھ کی کامیاب کاروائی کے بعد شیعہ حکومت حاصل کرنے میں اگرچہ بظاہر ناکام رہے تاہم انہوں نے اپنی مذہبی اور سیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ سقوط بغداد سے قبل ایران میں حسن بن صباح کی حکومت ان کے لیے جائے پناہ اور ممد و معاون تھی جسے تاتاریوں نے ۶۵۴ھ میں ختم کر دیا تھا۔ اس کا ذکر پیچھے فرقہ اسماعیلیہ کے تحت گذر چکا ہے۔

چنانچہ شیعہ مجتہد سید محمد طباطبائی اس دور میں شیعہ کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ!

پانچویں صدی ہجری سے لے کر نویں صدی ہجری تک شیعوں کی تعداد میں مسلسل خاطر خواہ اضافہ ہوتا رہا جیسا کہ چوتھی صدی ہجری کے دوران ان کی افزائش جاری رہی۔ اس دوران بعض ایسے بادشاہوں نے بھی حکومت کی جو شیعہ تھے اور مذہب شیعہ کو رواج دیتے رہے۔ پانچویں صدی ہجری کے آخر میں اسماعیلیہ کی تحریک اور دعوت نے "الموت" کے علاقوں میں اپنی حکومت کو مضبوط کر لیا تھا اور اس طرح اسماعیلی فرقے کے بادشاہ تقریباً ڈیڑھ صدی تک ایران کے بالکل درمیانی حصے میں مکمل آزادی کے ساتھ اور اپنی مذہبی رسومات کے مطابق زندگی گذارتے رہے۔ مرعشی سادات نے بھی کئی سالوں تک مازندران کے علاقوں پر حکومت کی تھی۔

مغلوں کے ایک بادشاہ خدا بندہ نے مذہب شیعہ اختیار کر لیا تھا اور اس کی اولاد میں سے بھی بہت زیادہ بادشاہوں نے ایران میں سلطنت اور حکومت کی تھی اور چونکہ یہ سب لوگ شیعہ تھے اس لیئے وہ سب مذہب شیعہ کی ترویج و ترقی کے لیئے کوشاں رہے تھے۔ اسی طرح آق قویونلو اور قرہ قویونلو خاندان کے سلاطین جو تبریز میں حکومت کیا کرتے تھے اور ان کی حکمرانی اور بادشاہت کی وسعت فارس، شیراز اور کرمان تک پہنچ چکی تھی مذہب شیعہ کے پیرو تھے۔ مجموعی اور کلی طور پر ان پانچ صدیوں میں شیعہ آبادی کے لحاظ سے مسلسل بڑھتے رہے اور طاقت و آزادی کے لحاظ سے اپنے وقت کے بادشاہوں کی مرضی یا مخالفت کے ماتحت رہے۔ (شیعہ صفحہ ۵۲-۵۴)

شیعہ مجتہد کے خوابیدہ اس تبصرہ سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ نویں صدی ہجری تک مذہب شیعہ کے فروغ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی اور اس دوران شیعہ کی تعداد میں بھی مسلسل اضافہ ہی ہوتا رہا۔ علاوہ ازیں اس دوران مختلف شیعہ خاندانوں کو حکمرانی کے مواقع بھی ملتے رہے۔

سلطان خدا بندہ

ان میں ایک مغل بادشاہ خدا بندہ ہے آل بویہ یعنی دیلمی حکمرانوں کے بعد یہ دوسرا بادشاہ ہے جس کے دور میں اثنا عشری نے سرکاری سرپرستی میں خوب ترقی کی۔ "خدا بندہ" فارسی لفظ ہے عربی میں اس کے معنی ہیں عبداللہ یعنی اللہ کا بندہ۔ "خدا بندہ" ایلخانی بادشاہوں میں سے آٹھواں بادشاہ اور چنگیز خان کی چھٹی پشت میں سے تھا۔ اس کا اصلی نام "اولجائتو" معروف بہ سلطان محمد خدا بندہ" (م ۷۱۶ھ) تھا۔ چنگیز خان کا لقب "ایلخان" تھا یہ سلطنت اسی کی جانب منسوب ہے۔ چنگیز خان کی اولاد میں سے سلطان غازان بن ارغون نے امیر نوروز بیگ کی رہبری و ترغیب سے شیخ

صدر الدین حموی کے ہاتھ پر دین اسلام قبول کر لیا اور اسلامی نام محمود خان رکھا۔ ابن کثیر نے بھی غازان کے اسلام لانے کا ذکر ۶۹۴ھ کے واقعات میں بڑی مسرت کے ساتھ کیا ہے۔

اس سال قازان بن ارغون تاتاریوں کا بادشاہ ہوا اور امیر توزون (آرنلڈ اور دوسرے مورخین اس کو نوروز بیگ کے نام سے یاد کرتے ہیں) کے ہاتھ پر بطلانیہ مشرف با سلام ہوا اور تاتاری کل یا بیشتر اسلام میں داخل ہو گئے اس نے اپنا نام محمود رکھا۔ جمعہ اور خطبہ میں شرکت کی بہت سے مندر اور گرجے گرا دیئے اور ان پر جزیہ مقرر کیا۔ بغداد اور دوسرے شہروں اور ملکوں کی غصب کی ہوئی چیزیں واپس کر دی گئیں۔ لوگوں نے اللہ کے فضل و احسان کا شکریہ ادا کیا۔ (البدایہ والنہایہ صفحہ ۳۴۰)

آرنلڈ لکھتا ہے کہ ۱۳۰۴ء میں غازان کا بھائی سلطان بن محمد خدابندہ کے نام سے تخت ایران پر بیٹھا اس سلطان کی ماں عیسائی تھی اور بچپن میں اسکی تعلیم و تربیت بھی عیسوی طریقے سے ہوئی تھی اور نکولس کے نام سے اس نے اصطباغ پایا تھا لیکن ماں کے مرنے پر وہ اپنی بیوی کے کہنے سے مسلمان ہو گیا۔

ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ نکولس خان یعنی سلطان خدابندہ کے مسلمان ہونے سے مغلوں میں بڑا اثر پیدا ہوا۔ غرض اس زمانہ سے قلمرو ایلخانیہ میں اسلام سب مذہبوں پر غالب آ گیا۔

(ابن بطوطہ جلد نمبر ۲ صفحہ ۷۰ بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت جلد ۱ صفحہ ۳۴۹)

مؤرخ اسلام اکبر شاہ خان نجیب آبادی لکھتے ہیں کہ:

سلطان محمد خدابندہ نے تخت نشین ہوتے ہی حکم دیا کہ شریعت اسلام کی پابندی کا تمام ملک میں خاص طور پر لحاظ رکھا جائے اور خلاف شرع تمام مراسم کو مٹا دیا جائے۔ سلطان محمد خدا بندہ کی حکومت و سلطنت کو بہت جلد قبولیت عامہ حاصل ہو گئی اور روس و خوارزم و بلغاریہ روم و شام سے لے کر قراقرم، سندھ اور عراق تک تمام ممالک میں اس کی شہنشاہی تسلیم کی گئی۔ سلطان محمد خدا بندہ کے عہد حکومت میں سلطنت مغلیہ اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی اور اس کی سلطنت و حکومت سے مخالفت و انحراف کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ آخر تیرہ سال حکومت کرنے کے بعد بعمر ۳۶ سال شب عید الفطر ۷۱۶ھ کو اس نیک دل اور با خدا سلطان نے وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان ابو سعید بہادر خان تخت نشین ہوا۔ (تاریخ اسلام جلد ۳ صفحہ ۲۷۰)

سخت حیرت ہے کہ اس متعلق نگاہ رکھنے والے مؤرخ نے ایک متعصب اور غالی شیعہ

بادشاہ کا تعارف کن الفاظ میں کرادیا۔ جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے کہ سلطان محمود غازان بن ارغون خان کی وفات ۷۰۳ھ کے بعد اس کی وصیت کے مطابق اس کا بھائی اولجایتو سلطان محمد خدابندہ تخت نشین ہو۔ غازان نے اہل سنت کا مذہب اختیار کیا لیکن جب ۷۰۳ھ میں اس کا بھائی خدابندہ اس کا قائم مقام قرار پایا تو اس نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا اس کے امراء و خواص اکثر شیعہ تھے۔ ایک واقعہ مشہور ہے کہ خدابندہ نے ایک روز اپنی بیوی سے ناراض ہو کر اسے طلاق دیدی پھر جلد ہی نادم ہو گیا اور اسے گھر میں آباد کرنا چاہا۔ اہلسنت علماء نے متفقہ فتویٰ دیا کہ دوسرے خاوند سے نکاح کیئے بغیر خانہ آبادی کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ خدابندہ کو بڑی مشکل پیش آئی اس کے شیعہ خواص و امراء نے مشورہ دیا کہ شہر حلہ کے مشہور شیعہ عالم ابن المطہر کو بلا کر مشورہ کیجیے وہ اس کا کوئی حل پیش کرے گا۔ ابن المطہر نے فتویٰ دیا کہ وہ حسب سابق اپنی بیوی کو آباد کر سکتا ہے۔ بادشاہ اس فتویٰ سے بہت خوش ہوا اور ابن المطہر کو اپنا خصوصی مصاحب بنا لیا۔ ابن المطہر کے بہکانے سے خدابندہ نے دیار و امصار میں حکم ارسال کیا کہ منبر پر خطبہ دیتے وقت بارہ اماموں کا نام لیا جائے۔ ائمہ کے نام سکوں اور مساجد کے دروازوں پر کندہ کیئے جائیں۔ اس طرح اس عہد میں پوری سلطنت میں شیعہ مذہب نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے۔

ابن المطہر کا پورا نام حسن بن یوسف بن علی ابن المطہر (التوفی ۷۲۶ھ) ہے۔ یہ نصیر الدین طوسی (م ۶۷۲ھ) کا شاگرد خاص ہے۔ ابن المطہر الحلی نے اپنی کتاب میں طوسی کا ذکر کرتے ہوئے بڑی تعظیم و تقدیس کے ساتھ ان کا نام لیا ہے اور " شیخنا الامام الاعظم خواجہ نصیر الملۃ والحق والدین محمد بن الحسن الطوسی قدس اللہ روحہ " کے الفاظ لکھے ہیں۔

مشہور ظالم و سفاک ہلاکو خان نے ۶۵۶ھ میں بغداد میں قتل عام کا جو بازار گرم کیا تھا اس کی براہ راست ذمہ داری نصیر الدین طوسی، ابن علقمی اور اس کے مشیر ابن ابی الحدید پر عائد ہوتی ہے طوسی ایک ملحد فلسفی تھا اور زوال بغداد کا اولین محرک تھا۔ زوال بغداد سے قبل یہ بلاد الجبل اور قلعہ الموت میں سکونت پذیر تھا اور فرقہ اسماعیلیہ کا طرف دار تھا۔ طوسی نے اپنی مشہور تصنیف " اخلاق ناصری " اسماعیلی سلطان علاؤ الدین محمد بن جلال حسن کے وزیر ناصر الدین کے لیئے تحریر کی تھی۔ ناصر الدین بلاد الجبل کا حاکم تھا اور بڑا ہی باطن شخص تھا۔

بہر حال نصیر الدین طوسی کا شاگرد ابن المطہر شیعہ کے علماء کبار میں سے ایک ہے اس کی

تربیت ہی صحابہ و تابعین کے بغض و عناد پر ہوئی تھی۔ ابن المطہر الحلی نے اپنے ولی نعمت اور مخدوم تاتاری بادشاہ خدابندہ کے لیے ایک کتاب اثبات شیعیت و امامت و رد سنیت و خلافت میں "منہاج الکرامۃ فی معرفۃ الامامۃ" کے نام سے لکھی۔ مولف کتاب کے مقدمہ میں سلطان کے بارے میں لکھتا ہے کہ میں نے اس کتاب میں روئے زمین کے بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی ہے جسکی حکومت دائمی ہے جو بادشاہوں کا بادشاہ، خواقین کا خاقان، بندوں کی گردنوں کا مالک، اپنے دشمنوں پر غالب جس کے ساتھ آسمان کے معبود کی نصرت شامل ہے۔ (لولؤۃ البحرین للبحرانی صفحہ ۲۲۶ بحوالہ شیعیت صفحہ ۱۰۰)

سلطان خدابندہ کے ہاں اس کا بہت اونچا مقام تھا اور سلطان سے اس کے قرب اور عزت کا یہ حال تھا کہ سلطان ذرہ بھی اسکی جدائی برداشت نہ کر سکتا تھا اس لیئے سلطان نے حکم دیا کہ حسن حلی کے لیئے ایک چلتا پھرتا خیموں کا مدرسہ بنایا جائے۔

یہ کتاب اہل سنت و شیعہ کے مابین متنازع مسائل و مباحث سے بھرپور تھی اور اس میں سابقین اولین صحابہ کرام کو جی بھر کر گالیاں دی گئی تھیں۔ اس کا بڑا حصہ حضرت علیؓ اور اہلبیت کی امامت و عصمت کے ثبوت اور ثلاثہ کی خلافت کی تردید اور ان کے اور دیگر صحابہؓ کے مطاعن پر مشتمل تھا شیعوں کو اس کتاب پر بڑا ناز تھا اور وہ اسے ناقابل تردید اور لاجواب تصنیف سمجھتے تھے۔ اہل سنت نے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) سے اس کتاب کا جواب لکھنے کے لیئے شدید اصرار کیا۔ اللہ تعالیٰ پوری امت مسلمہ کی طرف سے امام ابن تیمیہ کو جزائے خیر دیں، جنہوں نے کتاب مذکور کے جواب میں "منہاج الاعتدال فی نقض کلام اہل الرفض والاعتزال" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی جو چار جلدوں میں "منہاج السنۃ النبویۃ فی نقض کلام الشیعۃ والقدریۃ" کے نام سے چھپی۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ وھذا المصنف سمی کتابہ منہاج الکرامۃ فی معرفۃ الامامۃ وھو خلیق بان یسمی منہاج الندامۃ۔ (منہاج السنہ جلد ۱ صفحہ ۵)

اور اس کتاب کے مصنف نے اپنی کتاب کا نام "منہاج الکرامۃ" رکھا ہے حالانکہ مناسب یہ تھا کہ اس کا نام "منہاج الندامۃ" رکھا جاتا۔ در حقیقت "منہاج السنۃ" ان کی تمام تصانیف میں ایک امتیازی شان کی حامل ہے۔ ابن تیمیہؒ کے علمی تبحر و وسعت نظر، حاضر دماغی، پختگی، اتقان اور ذہانت و طباعی کا اگر صحیح نمونہ دیکھنا ہو تو اس کتاب کو دیکھنا چاہیئے۔ منہاج الکرامۃ کی عبارت نقل کرنے کے بعد جب ابن تیمیہؒ کے علم و حمیت دینی کو جوش آتا ہے اور ان کے علم کے سمندر میں

طوفان اٹھتا ہے اور تفسیر وحدیث، تاریخ وسیر کی معلومات کا شکر امنڈتا ہے تو بے اختیار ان کے فریق مخالف کی خدمت میں سورۃ النمل کی یہ آیت پیش کرنے کو جی چاہتا ہے ینا یھا النمل ادخلوا مساکنکم لا یحطمنکم سلیمان وجنوده وهم لا یشعرون ٥ (نمبر ۱۸) اے چیونٹیو! اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ بے خبری میں سلیمان اور اس کا لشکر تمہیں روند ڈالے۔

(بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت صفحہ ۳۶۲ جلد ۲)

شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن تیمیہ کی عظیم تصنیف "منہاج السنۃ" کو دیکھ کر بے ساختہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ امت مسلمہ ان کے عظیم احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

بہر حال شیعہ تصریحات کے مطابق اس دور میں شیعہ آزادی کے ساتھ اپنے مذہب کی اشاعت وترویج کرتے رہے اور ان کی تعداد میں بھی برابر اضافہ ہوتا رہا۔ سلطان محمد خدابندہ کی اولاد میں سے بھی بہت زیادہ بادشاہوں نے حکومت کی تھی اور ان کا تعلق بھی شیعہ مذہب سے تھا اس لیے وہ بدستور شیعیت کی سرپرستی کرتے رہے۔

علاوہ ازیں سلطان ابو سعید بہادر خان بن خدا بندہ کے عہد (۷۲۶ھ) میں عضدالدولہ دیلمی کی یادگار تعمیر "مشہد حسینؓ" کی رونق میں بہت اضافہ ہوا۔ ۷۴۰ھ سے ۸۲۷ھ تک ایلخانی امراء اور آل جلائر کی بغداد پر حکمرانی رہی جنہوں نے روضے کی نگہداشت کی۔

امیر تیمور کا عہد

امیر تیمور ۷۳۶ھ مطابق ۱۳۳۶ء میں سمرقند میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام ترغائی اور دادا کا نام الغائی ہے اس کا شجرہ نسب چغتائی خان سے جا ملتا ہے۔ تیمور کا باپ ترغائی گورگان قبیلے کے تاتاریوں کا سردار تھا اور گورگان ترکی قبیلہ برلاس کی ایک شاخ تھی۔ تیمور کو بچپن میں ایک شکاری کی حیثیت سے شہرت ملی اور جوانی میں جنگ جو سپاہی ہونے کی وجہ سے ناموری حاصل ہوئی۔

امیر تیمور کو "تیمور لنگ" بھی کہا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک جنگ میں ایک تیر پاؤں پر لگا اور ایسا کاری زخم آیا کہ جس کی وجہ سے تمام عمر کے لیے لنگڑا ہو گیا اور تیمور لنگ کے نام سے مشہور ہوا۔ ایشیا کے فاتحین میں سے جس نے ایشیا اور یورپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ امیر تیمور ہے۔ تیمور سکندر اور چنگیز کی آخری فاتحانہ حدود سے بھی آگے نکل گیا اور اس نے اس قدر فتوحات حاصل کیں کہ کوئی ایشیائی فاتح اس کی فتوحات کو نہیں پہنچ سکا۔ وہ ایک غیر معمولی فاتح تھا

اس نے ہر طرف لشکر کشی کی اور کہیں ناکام نہ ہوا وہ جب فوت ہوا تو روس کی وولگا وادی سے لیکر خلیج فارس تک، گنگا سے دمشق تک اور اسکے علاوہ ایشیائے کوچک اسکی مملکت میں شامل تھے۔

امیر تیمور بعمر ۷۱ سال سمرقند میں فوت ہوا جسے دنیا کے ایک عظیم اور خوبصورت مقبرے میں دفن کیا گیا۔ اس کو فوت ہوئے چھ سو سال کا عرصہ گذر چکا ہے مگر اب بھی اس مقبرہ کو مقبرہ تیمور کہنے کی بجائے امیر تیمور کہتے ہیں۔ سمرقند میں مقبرہ تیمور کی ڈیوڑھی کے کتبے پر یہ الفاظ کندہ ہیں۔

"آرام گاہ شہنشاہ دوراں، سلطان جہاں پناہ۔ صاحب سیف تیمور بادشاہ فاتح عالم"۔

اس کے جانشینوں خلیل سلطان، شاہ رخ، الغ بیگ، سلطان ابوسعید، سلطان حسین بلقرا نے ۹۰۶ھ مطابق ۱۵۰۰ء تک مختلف حصوں پر حکومت کی۔ سلطان حسین اس سلسلے کا آخری بادشاہ ہے جسے شیبانی خان نے شکست دے کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ شیبانی خان بابر اور شاہ اسماعیل صفوی کا ہم عصر تھا۔ ان دونوں کے ساتھ اسکی جنگیں ہوتی رہیں۔ بالآخر بابر اور اسماعیل صفوی نے مل کر اسے شکست دی اور قید ہو کر ۱۵۱۰ء میں قتل ہوا۔

امیر تیمور رافضی انتہائی سفاک، ظالم اور درندہ صفت شخص تھا۔ اس نے مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا اور تقریباً بارہ لاکھ مسلمانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کیئے۔ یورپ کے فاتح سلطان غازی بایزید خان اول (جنہیں دشمن پر انتہائی سرعت کے ساتھ حملہ آور ہونے کی وجہ سے "یلدرم" یعنی بجلی کا لقب دیا گیا) جو اسلام کا جھنڈا بلند کرنے اور عیسائی اقتدار کو ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے لیکن امیر تیمور کی رگ سبائیت پھڑکی اس نے قیصر روم کے ساتھ ساز باز کر کے بایزید کے ساتھ جنگ چھیڑ دی جسے تاریخ میں "جنگ انگورہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ جنگ ۱۹ ذی الحجہ ۸۰۴ھ مطابق ۲۰ جولائی ۱۴۰۲ء کو لڑی گئی۔ بایزید کی فوج ایک لاکھ بیس ہزار افراد پر مشتمل تھی جبکہ تیمور کی فوج کی تعداد عام طور پر پانچ لاکھ سے زیادہ اور بعض مورخین کے مطابق ۸ لاکھ تھی اس جنگ میں بایزید شکست کھا کر گرفتار ہو گئے اور یوں عیسائیوں کو سکھ کا سانس لینا نصیب ہوا۔

مورخ اسلام اکبر شاہ خان نجیب آبادی لکھتے ہیں کہ!

میدان انگورہ میں اگر تیمور کو شکست ہوتی تو یقیناً تیمور اور اس کے خاندان کو نقصان عظیم پہنچتا لیکن عالم اسلام کو تیمور کی شکست سے کسی نقصان کا اندیشہ نہ تھا کیونکہ مشرقی ممالک جو تیمور کے قبضے میں تھے وہ تیمور کے بعد بھی مسلمانوں ہی کے قبضے میں رہتے ان کی نسبت یہ اندیشہ ہرگز نہ تھا

کہ اسلامی ممالک کسی غیر مذہب کی حکومت میں شامل ہو جائیں گے۔ لیکن بایزید کی شکست سے عالم اسلام کو سخت نقصان پہنچا کیونکہ یورپ کی طرف اسلامی پیش قدمی رک گئی اور نیم مردہ یورپ پھر اطمینان وسکون کے سانس لینے لگا۔

تیمور کی تمام ترک وتاز اور فتح مندیاں مسلمان سلاطین کو زیر کرنے اور مسلمانوں کے شہروں میں قتل عام کرانے میں محدود رہیں اور اس کو یہ توفیق میسر نہ آسکی کہ غیر مسلموں پر جہاد کرتا یا غیر مسلم علاقوں میں اسلام پھیلاتا۔ (تاریخ اسلام جلد نمبر ۴ صفحہ ۲۵۶-۲۵۴)

موصوف کا یہ شکوہ بے جا ہے اس لیئے کہ شیعہ مذہب اسلام کے بالمقابل کفر وارتداد، الحاد و زندقہ اور نفاق وشقاق کی پہلی تحریک ہے جو اسلام کو مٹانے کے لیئے کھڑی کی گئی تو ایسے مذہب کے کسی حامل اور پیروکار سے اس بات کی توقع کیوں کر کی جاسکتی ہے کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جو اسلام یا مسلمانوں کی تقویت کا باعث بنے۔ اس مذہب کی تو ساری تاریخ ہی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازش غداری اور فریب دہی سے بھری ہوئی ہے۔

امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ!

تاریخ کے ہر دور میں شیعوں نے کفار ومشرکین کا ساتھ دیا اسلام سے بے وفائی کی اور اسلامی سلطنت کو نقصان پہنچایا۔ پھر موصوف اپنی تحقیق اور معلومات کا نچوڑ پیش کرتے ہیں کہ "فاياهم في الاسلام كلها سود" مختصر یہ کہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اسکی تاریخ میں شیعیت ایک سیاہ ترین بدنما داغ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ (منہاج السنۃ ص ۱۱ جلد ۲)

شیعہ عالم غلام احمد کاکوروی لکھتے ہیں کہ!

سب سے پہلا تعزیہ صاحب امیر تیمور نے رکھا تھا اور سکی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ تیمور کو حضرت امام حسینؓ سے بے حد عقیدت تھی اور وہ ہر سال کربلا معلیٰ روضہ اطہر کی زیارت کو جاتا تھا ایک سال جنگ وجدل میں وہ اس قدر مصروف رہا کہ وہ زیارت نہ کرسکا چنانچہ اس نے روضۂ اقدس کی شبیہ منگوا کر اس کو تعزیہ کی صورت میں بنالیا اور اسکی زیارت سے تسکین حاصل کرلی۔ (ماہنامہ المعرفت حیدرآباد ۱۳۶۹ھ)

الغرض امیر تیمور اور اس کے جانشینوں کے ایک سو چوبیس سالہ (۷۸۲ھ تا ۹۰۶ھ) دور میں شیعہ اور مذہب شیعہ نے خوب ترقی کی اور اس میں اہلسنت مظالم کا نشانہ بنے رہے۔

قراقویونلو (۷۸۰ھ-۸۷۲ھ) کا عہد

شیعہ مجتہد سید محمد طباطبائی لکھتے ہیں کہ!

اسی طرح آق قویونلو اور قرہ قویونلو خاندان کے سلاطین جو تبریز میں حکومت کیا کرتے تھے اور ان کی حکمرانی اور بادشاہت کی وسعت فارس (شیراز) اور کرمان تک پہنچ چکی تھی مذہب شیعہ کے پیرو تھے۔

(شیعہ صفحہ ۵۲)

قراقوئلی خاندان نے آذربائیجان میں نہروان کے جنوبی ملکوں میں اپنی حکومت قائم کی اور ۷۸۰ھ سے ۸۷۲ھ تک حکمران رہے۔ قراقویونلو ترکمانوں کا ایک مشہور قبیلہ تھا۔ اس خاندان کا مشہور حکمران قرا یوسف تھا۔ ان کا اپنا قومی علم تھا جس پر سیاہ بھیڑ کا نشان ہوتا تھا۔ قراقوئلی کے معنی سیاہ بھیڑ کے ہیں۔ اسی وجہ سے مؤرخین یورپ انہیں Black Sheep Dynasty لکھتے ہیں۔ آٹھویں صدی ہجری میں انہوں نے روس کی وادی وولگا میں اقتدار حاصل کیا۔ امیر تیمور کے زمانے میں یہ لوگ وطن سے نکل کر آرمینیا اور آذربائیجان میں آبسے پھر ان کے ایک رئیس بیرم خواجہ نے سلطان اویس جلائر کے دربار میں ملازمت اختیار کی جس سے انہیں کچھ استحکام حاصل ہو گیا۔ اویس فوت ہوا تو بیرم خواجہ نے موصل، سنجر اور ارجش کے علاقے فتح کیے آخر ۸۷۲ھ میں اس نے وفات پائی۔

آق قویونلو (۷۸۰ھ تا ۹۰۸ھ) کا عہد

قراقویونلو قبیلے کی طرح یہ بھی ترکمانوں کا ہی ایک قبیلہ تھا۔ اس کا اپنا الگ جھنڈا تھا جس پر سفید بھیڑ کا نشان ہوتا تھا۔ آق قویونلو کے معنی سفید بھیڑ کے ہیں۔ اس قبیلے کے اقتدار کا زمانہ بھی کم و بیش وہی ہے جو قراقویونلو کا تھا۔ اس قبیلے کا سب سے پہلا شخص جسے شہرت حاصل ہوئی بہاؤالدین قرا عثمان تھا۔ اس نے شام اور ایشیائے کوچک کی فتوحات میں مغلوں کو مدد دی تھی جس کے صلے میں امیر تیمور نے اسے دیار بکر کی حکومت دے دی۔ بعد میں ۹۰۷ھ میں شاہ اسماعیل صفوی نے ان کی سلطنت کو مٹا کر تمام ممالک پر قبضہ کر لیا۔ قراقویونلو اور آق قویونلو شیعہ فرقہ اثنا عشریہ کے ساتھ تعلق رکھتے تھے اور دوسرے علاقوں سے بھی علمائے اثنا عشری یہاں آ کر جمع ہو گئے اور سرکاری سرپرستی میں اپنے مذہب کو فروغ دینے لگے۔

صفوی خاندان

ساسانیوں کے بعد جس نے مذہبی بنیاد پر آزاد حکومت قائم کی اور سرزمین ایران کو ملی وحدت بنادیا وہ صوبہ گیلان کے شہر اردبیل کا صفوی خاندان تھا۔اس مذہبی اور ملی تحریک کا موسس اول شاہ اسماعیل صفوی ہے۔گویا اس نے ساسانیوں کے بعد ایرانی قومیت کا از سر نو آغاز کیا۔

اسماعیل کے مورث اعلیٰ شیخ صفی الدین (م ۱۳۳۴ء) جن کا سلسلہ نسب امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے۔شیخ زاہد گیلانی (م ۱۳۰۰ء) کے مرید اور داماد تھے۔انہوں نے اردبیل میں سکونت اختیار کی اور اپنی خانقاہ میں تصوف کی تعلیم دیتے رہے۔ان کے عقائد میں بجز "اہل بیت کی محبت" کے شیعی عقائد کی کوئی خاص جھلک نظر نہیں آتی۔یہی وہ بزرگ ہیں جن کے نام کی مناسبت سے "صفوی عہد" کی بنیاد قائم ہوئی۔شیعہ مذہب اور شیعی تکنیک سے باخبر لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ "شیعیت" میں داخلہ کا دروازہ ہی "حب اہلبیت" کا نعرہ ہے۔اس گروہ کے نزدیک "اہل بیت" سے امہات المومنین ازواج مطہرات خارج ہیں جو کہ اصلاً اور حقیقتاً اہل بیت کے زمرے میں داخل ہیں۔جبکہ اہل سنت تمام اہلبیت کے ساتھ محبت جزو ایمان سمجھتے ہیں۔شیعہ اصطلاح میں "حب اہل بیت" کو "تولا" اور مخالفین اہل بیت (جو شیعہ کے نزدیک ازواج مطہرات وصحابہ کرامؓ ہیں) سے اظہار بیزاری ولعن طعن کو "تبرا" کہا جاتا ہے۔شیخ صفی الدین کے متعلق یہ بات ثابت ہے کہ انکے عقائد میں 'بجز اہل بیت کی محبت" کے شیعی عقاید کی کوئی خاص جھلک نظر نہیں آتی۔ {اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد نمبر ۳ صفحہ ۷۰}

اسی مقالہ نگار کے مطابق رفتہ رفتہ محبت اہل بیت نے ہی شیعیت کا رنگ اختیار کیا۔یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ صفوی خاندان کی حکومت سات ترکی قبائل (استاجلو،تکرلو،بہارلو، ذوالقدر،شاملو،قاچار،افشار) کی بدولت قائم ہوئی اور ان لوگوں میں شیعی عقائد صوفیوں کے تبلیغی طریقے سے پھیلائے گئے تھے۔ {اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد نمبر ۳ صفحہ ۷۲۵ تحت ایران}

"حب اہل بیت" کے اس بنیادی عقیدے کے ساتھ ساتھ اگر شیعہ عقیدہ 'تقیہ شریفہ' بھی پیش نظر رکھا جائے تو معاملہ بالکل ہی صاف اور واضح ہو جاتا ہے۔علاوہ ازیں اردبیل کا شہر ماژندران کے علاقے میں شامل ہے جہاں پر خود شیعہ مجتہد کی شہادت کے مطابق "مرعشی سادات نے کئی سالوں تک حکومت کی تھی" {شیعہ صفحہ ۵۷}

امیر تیمور جو خود رافضی تھا اس نے ایک معتقد کی حیثیت سے شیخ صدالدین کے ساتھ ملاقات کی اور باقاعدہ پروگرام کے تحت قیدی آزاد کیے جنہوں نے آگے چل کر اعلانیہ شیعہ مذہب قبول کر لیا۔

پھر یہ علاقہ قراقویلو خاندان کی حکومت میں رہا جو ایک شیعہ خاندان تھا۔ شیخ صدالدین کے پڑپوتے شیخ جنید کی شادی آق قویلو قبیلے کے شیعہ حکمران حسن اوزون کی بہن کے ساتھ ہوئی پھر شیخ جنید کا لڑکا شیخ حیدر اسی شیعہ حکمران کا داماد بنا جس نے بارہ ائمہ کی یاد میں بارہ گوشوں والی سرخ ٹوپی ایجاد کی تھی۔

شیخ صفی الدین ۷۳۵ھ مطابق ۱۳۳۴ء میں فوت ہوئے تو ان کا بیٹا صدرالدین ان کا جانشین ہوا موصوف سلطان بایزید یلدرم اور تیمور کے ہم عصر تھے تیمور نے جب بایزید کو شکست دی اور گرفتار کر لیا تو اس کے ساتھ اور بھی بہت سے ترک سپاہی اس لڑائی میں قید ہوئے۔ تیمور اس فتح کے بعد اردبیل پہنچا تو وہاں عقیدتاً شیخ صدرالدین کی خانقاہ میں بھی گیا۔ اس موقع پر شیخ نے امیر تیمور سے کہا کہ وہ دیار بکر کے ترک قیدیوں کو رہا کر دے۔ اس نے فوراً تعمیل کرتے ہوئے انہیں آزاد کر دیا۔ اس پر دیار بکر کے ترک قبائل سب کے سب شیخ کے مرید ہو گئے اور اردبیل میں ہی قیام کر کے شیخ کی خدمت گزاری میں مصروف رہنے لگے۔ بالآخر یہی ترک صفوی حکومت قائم کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ صفوی خاندان کا اقتدار ۲۳۰ سال (۹۰۷ھ تا ۱۱۴۸ھ مطابق ۱۴۴۳ء تا ۱۷۳۶ء) تک قائم رہا۔ شیخ صدرالدین کے بعد انکے جانشین خواجہ علی مقرر ہوئے پھر ۸۳۰ھ مطابق ۱۴۲۶ء میں ان کے جانشین شیخ ابراہیم بنے اور ان کے بعد مسند ارشاد شیخ جنید نے سنبھالی۔ رفتہ رفتہ اگر ایک طرف محبت اہلبیت نے "شیعیت" کا رنگ اختیار کیا تو دوسری جانب علاوہ دینی وجاہت کے دنیوی اعتبار سے بھی انہوں نے اس حد تک جاہ و اقتدار حاصل کر لیا کہ انہیں اچھی خاصی فوجی طاقت بھی حاصل ہو گئی بعد میں "شیخ سلسلہ" کا لقب "شیخ" کے بجائے "شاہ" مقرر ہو گیا۔

تیمور کی وفات کے بعد تیمور کی سلطنت اس کی اولاد میں تقسیم ہو کر پارہ پارہ ہو گئی تھی۔ آذربائیجان میں ترکمانوں کے قبیلہ قراقویلو نے تیمور کے بعد ہی اپنی حکومت دوبارہ قائم کر لی تھی اسی طرح عراق کا شمالی حصہ ترکمانوں کے دوسرے حصے آق قویلو قبیلے کے قبضے میں تھا۔ شیخ جنید کی مقبولیت اور اثر و رسوخ سے ڈر کر آذربائیجان کے حکمران جہاں شاہ قراقویلو نے انہیں اردبیل سے

نکال دیا۔ شیخ یہاں سے نکل کر دیار بکر چلے گئے جہاں کے حکمران اوزون حسن آق قویلو نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور اپنی بہن خدیجہ ان کے عقد میں دے دی۔ شیخ جنید جو اب شاہی خاندان کے قریبی رشتہ دار بن چکے تھے انہوں نے اپنے مریدوں کو "درویشوں" سے سپاہیوں کی شکل میں تبدیل کر دیا اور ایک فوج ترتیب دے کر اردبیل پر حملہ کر دیا اور جس میں شیخ لڑتے ہوئے مارے گئے۔

شیخ جنید کے بعد ان کا بیٹا حیدر جو اوزون حسن کا بھانجا تھا گدی نشین اور "زہد و ارشاد" کے سلسلہ کا پیر تسلیم کیا گیا۔ شیخ حیدر ماں کی جانب سے شہزادہ اور باپ کی جانب سے درویش تھا اس طرح اس میں "امارت اور طریقت" دونوں چیزیں جمع ہو گئیں۔ اوزون حسن نے اپنی بیٹی عالم شاہ بیگم کی شادی شیخ حیدر سے کر دی۔ یہ بیٹی اوزون حسن کی اس عیسائی بیوی کے بطن سے تھی جو ترابزون کے عیسائی بادشاہ کی بیٹی تھی۔ اس سے شیخ حیدر کے تین بیٹے علی ابراہیم اور اسماعیل پیدا ہوئے۔ شیخ حیدر نے اپنے پیروؤں کو حکم دیا کہ کلاہ کے بجائے بارہ کنگروں والی سرخ ترکی ٹوپی پہنیں جو دراصل بارہ اماموں کی عقیدت کا کنایہ تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ٹوپی کے ہر کنگرے اور گوشے میں ان ائمہ کے نام لکھے جاتے تھے اور یہ ٹوپی شیعہ اور غیر شیعہ میں امتیاز کی خاطر خاص اثنا عشری شیعوں کیلئے بنائی گئی تھی۔ اس علامت کی وجہ سے شیخ کے مرید "قزلباش" (یعنی سرخ سر) کہلائے جانے لگے جو بعد میں انکا مشہور عرف ہو گیا۔ چونکہ سرخ رنگ کو ترکی میں "قزل" کہا جاتا تھا اس لیے اس ٹوپی کو اوڑھنے والے قزلباش مشہور ہو گئے۔ اوزون حسن کی زندگی میں شیخ حیدر بالکل خاموش رہے۔ لیکن اس کی وفات کے بعد جب اس کا بیٹا امیر یعقوب تخت نشین ہوا تو شیخ نے اپنے مریدوں کی ایک فوج تیار کر لی اور دوسرے لوگوں کو بھی فوج میں بھرتی ہونے کی ترغیب دی تاکہ شاہ شروان سے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لے سکا آخر شیخ حیدر بھی اپنے والد کی طرح شروان شاہ کیخلاف لڑتے ہوئے ۸۹۳ھ مطابق ۱۴۸۸ء میں مارے گئے۔

شیخ حیدر کے بعد اس کے مریدوں نے اسکے بڑے بیٹے علی کو اپنا پیر بنایا اور اس کے گرد بھی مریدوں کا ہجوم رہنے لگا۔ امیر یعقوب نے یہ دیکھ کر کہ علی بھی اپنے باپ دادا کی طرح شروان پر چڑھائی کی تیاری کر رہا ہے اور اس سے ملک میں خواہ مخواہ فتنہ پیدا ہو گا اس نے علی اور اس کے بھائیوں کو ایک قلعہ کے اندر نظر بند کر دیا اور شروان سے صلح کر لی۔ یاد رہے کہ اسی امیر یعقوب کے باپ اوزون حسن نے شیخ حیدر کے باپ شیخ جنید کا پرتپاک استقبال کیا تھا ان کے عقد میں اپنی بہن دی تھی اور شیخ حیدر کو

اپنا داماد بنایا تھا لیکن حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اس کی اولاد محض اقتدار کی خاطر اس خاندان کی دشمن بن گئی۔ تینوں بھائی چار سال سے زیادہ عرصہ تک اس قلعہ میں قید رہے جب امیر یعقوب فوت ہوا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا الوند بیگ تخت نشین ہوا تو علی مع اپنے بھائیوں کے قید سے فرار ہو گیا اور اردبیل پہنچ کر فوج کی فراہمی میں مصروف ہو گیا لیکن الوند بیگ نے حملہ کر کے قتل کر دیا۔ جبکہ دوسرے دو بھائی ابراہیم اور اسماعیل لباس بدل کر اردبیل سے گیلان کی طرف بھاگ گئے۔ ابراہیم گیلان پہنچ کر فوت ہو گیا اسماعیل جو کم عمر تھا اسے اس کے مریدوں نے اپنی حفاظت میں رکھا یا خود الوند بیگ نے اسے کم عمر اور کم حوصلہ سمجھ کر اس کے حال سے کوئی تعرض نہ کیا اور اسے آزاد رہنے دیا۔

جب اسماعیل کی عمر تیرہ برس ہوئی تو اس نے ان سات ترکی قبائل (جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) کی بدولت (جو خاندان صفوی کے ہمیشہ پشت پناہ رہے) ایک عظیم لشکر تیار کر کے شروان شاہ فرخ یسار (یسر) سے ۱۵۰۰ء میں جنگ چھیڑ دی اور اسے شکست دے کر قتل کر دیا۔ اسماعیل نے بڑی بے رحمی سے اپنے باپ کے قاتلوں کا بدلہ لیا۔ باکو فتح کرنے کے بعد اسماعیل آذربائیجان کی طرف بڑھا تو آق قویونلو افواج نے الوند بیگ کی قیادت میں اس کا مقابلہ کیا مگر انہیں بھی ہزیمت اٹھانا پڑی۔ ان پیہم فتوحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام عراق و ایران اسماعیل کے قبضہ میں آ گئے۔

شاہ اسماعیل نے (بعمر چودہ سال) ۹۰۷ھ مطابق ۱۵۰۱ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس کی رسم تاج پوشی بڑی دھوم دھام سے ادا کی گئی اور "شاہ" کے علاوہ اس نے "خاقان اسکندر شاہ" اور "شاہ دین پناہ" کے القاب اختیار کیے۔

صفوی حکمران

۱۔	اسماعیل اول۔	۹۰۵ھ تا ۹۳۰ھ مطابق ۱۴۹۹ء تا ۱۵۲۴ء
۲۔	طہماسپ اول۔	۹۳۰ھ تا ۹۸۴ھ مطابق ۱۵۲۴ء تا ۱۵۷۶ء
۳۔	اسماعیل دوم۔	۹۸۴ھ تا ۹۸۵ھ مطابق ۱۵۷۶ء تا ۱۵۷۷ء
۴۔	محمد خدابندہ۔	۹۸۵ھ تا ۹۹۶ھ مطابق ۱۵۷۷ء تا ۱۵۸۷ء
۵۔	عباس اول۔	۹۹۶ھ تا ۱۰۳۸ھ مطابق ۱۵۸۷ء تا ۱۶۲۹ء
۶۔	صفی مرزا۔	۱۰۳۸ھ تا ۱۰۵۲ھ مطابق ۱۶۲۹ء تا ۱۶۴۲ء
۷۔	عباس دوم۔	۱۰۵۲ھ تا ۱۰۷۷ھ مطابق ۱۶۴۲ء تا ۱۶۶۷ء

۸۔ سلیمان۔ ۱۰۷۷ھ تا ۱۱۰۵ھ مطابق ۱۶۶۷ء تا ۱۶۹۴ء

۹۔ حسین ۱۱۰۵ھ تا ۱۱۳۵ھ مطابق ۱۶۹۴ء تا ۱۷۱۳ء

صفوی عہد کا خاتمہ ۱۱۳۵ھ مطابق ۱۷۲۲ء

۱۰۔ طہماسپ دوم۔ (برائے نام بادشاہ اصلاً نادر شاہ کا اقتدار۔ ۱۱۴۲ھ مطابق ۱۷۲۹ء

۱۱۔ عباس سوم۔ ۱۱۴۵ھ مطابق ۱۷۳۲ء

اس کے بعد نادر قلی خان ایران کا مختار کل حکمران بن گیا۔ (۱۱۴۸ھ مطابق ۱۷۳۶ء)

تخت نشینی کے بعد اسماعیل صفوی نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ایک اعلان کے ذریعے اثنا عشری شیعیت یعنی شیعہ مذہب کو ملک کا سرکاری دین قرار دیا حالانکہ تبریز میں اسوقت مسلمانوں (سنیوں) کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی اور خطرہ تھا کہ اس اعلان سے صفوی طاقت کو نقصان پہنچے گا لیکن اسماعیل اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ اس اعلان سے جہاں دولت عثمانیہ میں بددلی کی لہر دوڑ گئی وہاں ایران کے مختلف حصے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس وقت ایران میں سنی اکثریت تھی جسے بزور شمشیر اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا۔

۱۵۰۳ء سے لیکر ۱۵۱۲ء تک شاہ اسماعیل نے ایک ایک کر کے اپنے حلیفوں کو شکست دی اور طوائف الملوکی کا خاتمہ کر دیا۔ یوں بغداد اور دیار بکر سے لیکر ھرات تک سارے علاقے صفویوں کے قبضے میں آ گئے۔

۱۵۰۶ء اور ۱۵۱۰ء کے درمیان اس نے ہمدان، بغداد، لورستان اور فارس کے صوبے فتح کیئے اور پھر مغربی اور شمال مغربی ایران پر قبضہ کر لیا۔ شمال مغرب میں عروج حاصل کرنے کے بعد شاہ اسماعیل نے محمد شیبانی خان ازبک حاکم خراسان (جو بڑا راسخ الاعتقاد سنی تھا) پر بابر خان (جس نے آگے چل کر ہندوستان میں مغل سلطنت قائم کی) کے تعاون کے ساتھ چڑھائی کر دی۔ لڑائی سے قبل شاہ اسماعیل نے شیبانی خان کے پاس ایک سفارت بھیجی جس کا مقصد شیبانی خان پر اپنی طاقت کا لوہا منوانا تھا لیکن شیبانی خان نے مرعوب ہونے کی بجائے اس کو جواب دیا کہ "اگر تمہارے جدی مال میں سے کوئی چیز گم ہوگئی ہے تو یہ عصائے فقیری اور کشکول گدائی حاضر ہے" مطلب یہ تھا کہ تم تو فقیروں اور درویشوں کی اولاد ہو آج بادشاہ بن بیٹھے ہو اپنی اصلیت کو جانچو۔ تمہارا ورثہ اور باپ دادا کی جائیداد یہی ہے۔ تم بھی گدائی کا پیشہ اختیار کرو۔

شاہ اسماعیل نے بھی جواب میں دھاگہ اور چرخہ بھیج دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے الفاظ کو ایک عورت کی باتوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی، کیونکہ یہ ہتھیار عورتوں کے ہیں۔

بالآخر ۱۵۱۰ء میں مرو کے قریب ایک بڑا خون ریز معرکہ ہوا جس میں شیبانی خان مارا گیا۔ شاہ اسماعیل نے اس کا سر کاٹ کر اس کی کھوپڑی میں جواہرات جڑوا کر پیالے کے طور پر استعمال کیا۔ (کیا گدی نشینوں کا یہی کردار ہوتا ہے؟) اس کے بعد ہرات اور بلخ پر شاہ اسماعیل کا قبضہ ہو گیا اس کے باوجود یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وسط ایشیا میں صدیوں تک ازبک سلطنت قائم رہی۔

دوسری طرف دولت عثمانیہ کا ستارہ اس وقت عروج پر تھا۔ ان کے دبدبے، طاقت اور سطوت کی یہ کیفیت تھی کہ سلطان سلیم نے جب اپنی خلافت کا اعلان کیا۔ تو انکے خلاف کسی کو بھی آواز بلند کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ سلطان سلیم اول نے ۹۲۳ھ مطابق ۱۵۱۷ء میں مصر کو فتح کر کے دولت چراکسہ مصر کا خاتمہ کر دیا اور خلیفہ المتوکل الثالث کو اپنے ساتھ قسطنطنیہ (استنبول) لے آئے۔ پھر خلیفہ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ وہ منصب خلافت سے دست بردار ہو کر خلافت کا بار امانت سلطان سلیم کے حوالے کر دیں۔ خلیفہ نے یہ تجویز رضا و رغبت سے منظور کر لی اور تبرکات خلافت سلطان سلیم اول کے سپرد کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت خلافت کر لی۔ سلطان سلیم کے خلیفہ اسلام تسلیم کرنے اور مرکز خلافت کو قاہرہ کی بجائے استنبول منتقل کرنے کے مسئلہ پر علمائے اسلام میں رائے کا اختلاف پیدا ہوا۔ آخر طویل بحث کے بعد علمائے مصر نے جامع ازہر میں مجلس منعقد کر کے اور علمائے ترکی نے قسطنطنیہ کی جامع ایوبی میں اجتماع کر کے سلطان سلیم کے خلیفہ بننے اور مرکز خلافت کے منتقل ہونے کو جائز قرار دینے کا فتویٰ صادر کر دیا اور مکہ معظمہ کے علمائے کرام نے بھی اس فتویٰ پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اس طرح ترکی کے سلطان سلیم اول خادم الحرمین الشریفین کا لقب اختیار کر کے خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین بن گئے۔ اہلسنت والجماعت کے علماء نے ہر جگہ قسطنطنیہ، قاہرہ اور مکہ معظمہ کے علمائے دین کے اس فتویٰ کو صحیح تسلیم کر لیا۔

پوری دنیا کے مسلمانوں کی نمائندہ، ترجمان، مضبوط اور مستحکم حکومت بھلا شیعوں کے لیے کیوں کر قابل برداشت ہو سکتی تھی لہٰذا اسماعیل صفوی نے اس حکومت کو ختم کرنے اور اسے شیعہ ریاست میں تبدیل کرنے کے لیے اپنے داعی اور جاسوس مختلف اطراف میں بھیج دیے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ایران میں صفوی حکومت کے قیام و استحکام کے باعث خود مملکت ترکی کے

شیعوں کے حوصلے بھی بہت بڑھ گئے تھے اور ان کی سازشیں اور سرگرمیاں ملکی امن وامان کے لیئے خطرات پیدا کرنے لگی تھیں ترکی کے شیعوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ صفوی حکومت کے ایماء پر ایشیائے کوچک میں بغاوت بھی کر دی جسے بڑی سختی سے فرو کیا گیا جس میں ہزاروں شیعہ اپنے سرغنوں سمیت کیفر کردار کو پہنچے۔ اس واقعہ پر ایران کے شاہی دربار میں ناراضگی کی لہر دوڑ گئی اور شاہ اسماعیل صفوی نے اس سخت گیری کے خلاف احتجاجی مراسلت بھیجی۔ جس کا جواب سلطان سلیم اول نے بڑے تہدید آمیز لہجے میں دیا۔ ادھر سے بھی ویسا ہی گستاخانہ اور استہزاء آمیز جواب دیا گیا۔ بالآخر وہ دن بھی آ گیا جب دونوں طاقتیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ تبریز سے بیس فرسنگ کے فاصلے پر چالدران میں ایک زبردست جنگ کے بعد شاہ اسماعیل نے بری طرح سے شکست کھائی۔ ترکی لشکر آگے بڑھ کر تبریز پر قابض ہو گیا جہاں سلطان سلیم اول نے ایک ہفتہ قیام کیا۔ شاہ اسماعیل کے دل پر اس شکست کا اثر مرتے دم تک رہا کہا جاتا ہے کہ اس حادثہ کے بعد کسی نے شاہ اسماعیل کو ہنستے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ سلطان سلیم اول واپس ہوئے تو شاہ اسماعیل پھر آذربائیجان آیا اور تبریز میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا وہ ترکوں کے خلاف جنگی تیاریوں میں مصروف ہی تھا کہ بعمر ۳۸ سال ۹۳۰ھ مطابق ۱۵۲۴ء میں اس جہان فانی کو خیر باد کہہ گیا۔

ایران بھر کے طول وعرض میں اس کا ماتم منایا گیا۔ بعد میں اس کی اولاد ترکوں کے خلاف جنگ و پیکار میں مصروف رہی صفوی خاندان نے دوسو چالیس (۲۴۰) برس (۹۰۷ تا ۱۱۴۸ھ مطابق ۱۴۹۹ تا ۱۷۳۲ء) تک حکومت کی اور اس کے تمام حکمران اسماعیل صفوی ہی کی طرح انتہا پسند اور غالی شیعہ تھے۔ پھر تاریخ نے وہ لمحہ بھی محفوظ کر لیا جس میں شاہ حسین صفوی کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ "صفوی تاج" اپنے حریف افغان محمود کی نذر کر دے۔ چنانچہ وہ عالم بصد حسرت دیاس تخت وتاج سے دست بردار ہو گیا اور ماتمی لباس پہن کر امراء کی معیت میں شہر سے باہر نکلا اور صفوی تاج محمود کے سر پر رکھ کر حکومت اس کے سپرد کر دی۔ یہ واقعہ ۱۱۳۵ھ مطابق ۱۷۲۲ کا ہے۔

ایران میں افغانوں کا پائیدار حکومت کرنا آسان نہ تھا اور نہ ہی ایرانیوں نے ان کی حکومت کو دل سے قبول کیا تھا اس لیئے وہ انتقام لینے کے لیئے در پردہ کوششیں کرتے رہے۔ سلطان حسین کے زمانے میں صفوی حکومت بظاہر ختم ہو گئی تھی لیکن سلطان حسین کا بیٹا طہماسپ دوم (جو بخش نام کا بادشاہ تھا) افغان محمود کے اصفہان پر قبضہ کرنے کے بعد مازندران (فرح آباد) میں مقیم تھا وہاں اس نے

صبار بھی قائم کر رکھا تھا فتح علی قاچار کی اسے حمایت حاصل تھی اور صفوی نام میں ابھی کشش باقی تھی کہ اچانک طالع آزما نادر قلی طہماسپ دوم سے آملا۔ نادر قلی جو فتح علی قاچار سے مطمئن نہیں تھا (کیونکہ طہماسپ پر اس کا بڑا اثر تھا) اس لیئے راستے میں موقع پا کر اس نے اسے ٹھکانے لگا دیا اور خود لشکر کا سپہ سالار بن گیا اور اس نے افغانوں کو شکست سے دوچار کر دیا۔ نادر فاتحانہ اصفہان میں داخل ہوا اور سب سے پہلے اس نے محمود خان کے مقبرے کو تباہ کیا تاکہ افغانوں کی فتح کا یہ نشان باقی نہ رہے۔ بعد میں نادر قلی نے شاہ طہماسپ کو گرفتار کر کے خراسان بھجوا دیا مگر وہ ابھی اپنے آپ کو اس قابل نہ سمجھتا تھا کہ اپنی بادشاہت کا اعلان کرے چنانچہ اس نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر ۱۱۴۵ھ مطابق ۱۷۳۲ء میں شاہ طہماسپ کے بیٹے عباس سوم کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ بعد میں اس نے عباس سوم صفوی کی موت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پورے ایران پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح ۱۱۴۸ھ مطابق ۱۷۳۶ء میں صفوی اقتدار کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔

سلاطین صفویہ کے مظالم

گذشتہ تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ صفوی حکومت دیلمی حکومت کی طرح ہی یک کٹر شیعہ اور رافضی حکومت تھی۔ البتہ تعصب، غلو اور مظالم میں یہ حکومت دیلمیوں سے بازی لے گئی۔ چنانچہ اسماعیل صفوی نے برسر اقتدار آنے کے فوراً بعد ایک اعلان کے ذریعے "مذہب شیعہ" کو ملک کا سرکاری مذہب اور رعایا کے لیئے شیعیت کو اختیار کرنا لازمی اور ضروری قرار دے دیا۔ اس کے بعض مشیروں نے یہ مشورہ دیا کہ تبریز کی دو تہائی آبادی سنی ہے اس لیئے خدشہ ہے کہ کہیں وہ متحد ہو کر بغاوت نہ کر دیں۔ اس لیئے شیعہ خطبہ (جس میں پہلے تین خلفاء حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور دیگر صحابہؓ پر تبرا ہوتا ہے) علی الاعلان نہ پڑھا جائے تو اس نے جواب دیا کہ!

"خدائے عالم با حضرات ائمہ معصومین ہمراہ اند و من از ہیچ کس باک ندارم اگر رعیت حرفے بگوید شمشیر بکشم و یک کس را زندہ نگذارم" اللہ تعالیٰ ائمہ معصومین کے ساتھ میری مدد پر ہیں اور مجھے کسی کی کچھ پروا نہیں۔ اگر رعایا میں سے کسی نے ایک لفظ بھی کہا تو میں تلوار نکال لوں گا اور ایک شخص کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ!

اسماعیل جو ایران کو جبراً شیعہ بنا رہا تھا اور اس کے ہاتھوں سنیوں پر بڑے بڑے مظالم

ہوئے۔ چنانچہ ۱۵۱۷ء میں اس نے قزلباش میں ان کے قتل عام کا حکم دیا۔ جس میں بڑے بڑے سنی علماء مارے گئے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۲ صفحہ ۴۷۸)

احسن التواریخ میں لکھا ہے کہ شاہ اسماعیل نے تخت نشین ہوتے ہی اپنی سلطنت کے تمام خطیبوں کو حکم دیا کہ خالص شیعہ کلمہ "اشہد ان علیاً ولی اللہ" کو اقرار ایمان کا جزو بنایا جائے۔

فاضل روزگار ایڈورڈ براؤن اس مضمون پر ایک مستقل سرخی قائم کرتے ہیں "عقیدہ شیعیت کی تبلیغ بزور شمشیر" اور حکومت کا یہ حکم نقل کرتے ہیں "بازاروں اور گلیوں میں پہلے تین خلفائے راشدین پر تبرا بازی کا حکم دیا اور عدول حکمی کی سزا قتل قرار دی" (تاریخ ادبیات ایران جلد نمبر ۴ صفحہ ۸۸)

مشہور مورخ ابن عماد حنبلی (م ۱۰۸۹ھ) لکھتے ہیں کہ!

اسماعیل صفوی ایران کے تمام امراء پر حاوی ہو گیا اس نے خراسان، آذربائیجان، تبریز، بغداد اور عراق عجم فتح کر لیا۔ ان علاقوں کے فرمانرواؤں کو مغلوب کر دیا۔ دس لاکھ سے زائد افراد کو اس نے قتل کیا۔ اس نے علماء کو قتل کیا۔ ان کی کتابیں اور مصاحف جلائے۔ سنی علماء اور اعیان کی قبریں کھدوا کر ہڈیاں نکلوائیں اور انہیں جلا کر خاکستر کر دیا۔ (ماہنامہ ترجمان الحدیث اپریل ۱۹۸۰ء صفحہ ۳۰-۲۹)

صفوی دور میں فرقہ اثنا عشریہ کا زور و شور ایران میں یہاں تک بڑھ گیا کہ ان میں سے ایک بادشاہ (عباس اعظم) کو علماء اثنا عشری نے صاحب الزمان کا نائب قرار دے کر اس کے لیے رسم بیعت جاری کرائی (موجودہ ایرانی انقلاب میں خمینی کو بھی نائب امام الزمان قرار دیا گیا ہے)

اہل سنت کے جمعہ و جماعات پر پابندی عائد کر دی گئی اور خطبوں میں برسر منبر حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ اور بڑے بڑے صحابہؓ پر اعلانیہ تبرا کیا گیا بلکہ بازاروں اور گلیوں میں بھی ان پر لعنت کرائی گئی۔ ہزاروں علمائے اہل سنت کو قتل کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ انکی قبریں اکھڑوا کر ہڈیاں تک جلا دی گئیں۔ جیسے شمس القضاۃ ہروانی اور قاضی ناصر الدین بیضاوی وغیرہ۔ صفوی دور میں بچے کچھے ہزاروں اہلسنت خانہ بدوش ہو کر توران میں بادشاہان ماوراء النہر کے پاس پناہ گزیں ہوئے۔ الغرض اس طرح صفوی حکمرانوں نے انتہائی ظلم و بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایران میں سنی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر دیا۔

مشہور ایرانی فاضل مورخ سعید نفیسی پروفیسر تہران یونیورسٹی لکھتے ہیں کہ!

صفوی بادشاہوں نے شیعہ مذہب کی اشاعت پر بہت زور دیا کیونکہ ان سے پہلے

ایران کی اکثریت حنفی المسلک مسلمانوں کی تھی۔
(مقدمہ ترمذی صفحہ [illegible])

یہ صفوی حکومت کی "خارجہ پالیسی" تھی جہاں تک اس کی داخلہ "پالیسی" کا تعلق ہے تو اس کے تحت انہوں نے یہود و نصاریٰ سے تعلقات اور رابطہ قائم کیئے۔ چونکہ اس وقت خلافت عثمانیہ کی صورت میں مسلمانوں کی ایک مضبوط و مستحکم حکومت قائم تھی جس سے یورپ کے عیسائی لرزاں و ترساں تھے بالخصوص سلطان محمد فاتح کا نام سنتے ہی عیسائیوں پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ یہی وہ عظیم فاتح تھا جس نے عیسائیت کے مرکزی شہر قسطنطنیہ (جسے مسلمان آٹھ سو برس تک بدبلک مساعی جمیلہ کے باوجود فتح نہیں کر سکے تھے) کو فتح کر کے پورے یورپ پر اپنی قابلیت اور عسکری مہارت کا سکہ بٹھا دیا۔ اس عظیم مجاہد اور ملت اسلامیہ کے قائد سے یورپ اس قدر مرعوب اور خوفزدہ تھا کہ اس کے انتقال پر پاپائے اعظم نے جشن مسرت منانے کا حکم دیا اور فرمان صادر کیا کہ تین روز تک مسلسل شکرانے کی "نمازیں" پڑھی جائیں۔
(تحقیق تاریخ اسلامی صفحہ [illegible] جلد [illegible])

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ صفوی شیعہ حکمرانوں نے اپنے پیش روشیعوں کی اتباع میں کفار کی حمایت کرتے ہوئے اپنے پورے دور میں خلافت عثمانیہ کے ساتھ جنگ جاری رکھی تاکہ وہ اپنی فتوحات کا سلسلہ یورپ تک نہ بڑھا سکے۔

جرمن مستشرق بروکلمان لکھتا ہے کہ!

۱۵۸۸ تا ۱۶۲۹ء صفوی حکومت کے عروج کا زمانہ تھا اس زمانہ میں شاہ عباس صفوی نے حکومت چلانے کے لیئے انگریز مشیر کاروں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ جن میں قابل ذکر مسٹر انتھونی اور سر رابرٹ چارلی تھے۔ شاہ ایران نے اپنے غیر ملکی مشیروں کی مدد سے خلافت عثمانیہ کے خلاف کامیابیاں حاصل کیں اور آسٹریا کے خلاف انگریزوں کی مکمل حمایت کی۔
(تاریخ مسلم اقوام صفحہ [illegible])

اس سے قبل صفوی حکومت کا بانی شاہ اسماعیل بھی خلافت عثمانیہ کے خلاف عیسائی حکمرانوں کے ساتھ تعاون کرتا رہا۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ!

بہر حال یہ شاہ اسماعیل تھا جس نے ایک باقاعدہ اور سوچے سمجھے ہوئے منصوبے کے ماتحت یہ کوشش کی کہ لیو (leo) دہم اور میکسملین (Maximilian) اول سے دوستانہ تعلق قائم کرے ۱۵۱۲ء یعنی چالدران کی شکست کے بعد اس نے چارلس پنجم کو بھی اپنے ساتھ ملانا چاہا تاکہ دونوں متحد ہو کر اپنے مشترکہ دشمن دولت عثمانیہ سے انتقام لیں۔
(اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد [illegible] صفحہ [illegible])

ماضی مورخین نے بھی ان تعلقات کا اقرار کیا ہے!

علاقہ میں پرتگالیوں کے بعد ایران نے برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کیئے۔ یہ تعلقات شاہ عباس اول کے عہد میں بڑھ کر سیاسی ثقافتی اور دینی تعلقات میں بدل گئے۔ ۱۵۸۷ء میں ایران کے یورپ کے ساتھ تعلقات میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ کے دربار میں پادریوں کے علاوہ یورپین تاجروں، سیاست دانوں اور کرائے کے فوجیوں کا میلہ لگا رہتا تھا اور یورپ کے کائی باشندوں نے ایران میں گھر جا گھروں کی بنیادیں رکھیں۔ (تہذیب و تمدن میں ایران کا مقام صفحہ ۳۰۰)

شیعہ مولف شیخ محمد حیات لکھتے ہیں کہ!

سر رابرٹ شرلے اپنے بھائی اور دوسرے چھبیس ہمراہیوں کے ساتھ سیاحت کی غرض سے ایران آئے ان کا مقصد یہ بھی تھا کہ ایران اور انگلستان کے مابین آزادانہ تجارت شروع کر دی جائے۔ انہوں نے اپنے آپ کو بحیثیت انگریز سرداروں کے پیش کیا اور ساتھ ہی شاہ کی خدمت میں تحائف پیش کر کے فوجی ملازمت کے لیئے درخواست کی۔ تاکہ شاہ ان کے جنگی تجربات سے فائدہ اٹھا کر ترکوں کو شکست دے۔ شاہ عباس ان کی خوشامد سے بے حد متاثر ہوا اور انہیں بیس گھوڑے مع ساز و سامان جن میں سے دو پر سونے کے جڑاؤ والی کاٹھیاں بھی تھیں عطا کیئے۔ علاوہ ازیں ٹٹو، اونٹ، خیمے اور کچھ نقدی ان کے تحائف کے بدلے میں دی۔ یہی شرلے تھا جس نے ترکوں کے خلاف شاہ کو ابھارا (کیا خود شاہ ترکوں یعنی مسلمانوں کا کم مخالف تھا جسے ابھارنے کی ضرورت پیش آئی ہو؟) اسی بدولت ایران میں عیسائیوں کو مذہبی، تجارتی اور دوسری ہر قسم کی رعایت دی گئی۔ یہ سچ ہے کہ ان بھائیوں نے ترکوں کے خلاف جنگوں میں بڑی قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ جن کے صلے میں شاہ نے انہیں طرح طرح سے نوازا ان دونوں بھائیوں کے ذریعے شاہ عباس نے بیرونی ملکوں سے بھی سیاسی رابطے کیئے۔ (تاریخ اسلامی جمہوریہ ایران صفحہ ۱۶۷-۱۶۵)

سر جان مالکم لکھتا ہے کہ!

شاہ عباس نے ایک خط یورپ کے عیسائی حکمران کی طرف لکھ کر سر انتونی شرلے کے حوالے کیا جس خط میں اس نے عیسائی بادشاہوں سے اپنے تعلقات بڑھانے اور مستحکم

کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ شاہ عباس نے ترکوں سے جن سے یورپی حکمران خوف زدہ رہتے تھے جنگ کرنے کا عزم دکھایا۔ چنانچہ شاہ عباس نے اپنے ارادہ کے مطابق قسطنطنیہ کے حکمران پر حملہ کر دیا۔

(تاریخ ایران بحوالہ الفرقان ص ۴۵ لکھنؤ اپریل ۸۵ء)

خلافت عثمانیہ کو انگریزوں کے خلاف پیش قدمی سے روکنے کی ایرانی خدمات کا اعتراف خود آسٹریائی سفیر نے بھی کیا ہے!

ہمارے اور ہماری تباہی کے درمیان اہل ایران ہی صرف ایک روک ہیں ترک ہمیں ضرور دبا تے مگر ایرانی انہیں دبوچے ہوئے ہیں۔ ایرانیوں کے ساتھ ترکوں کی اس جنگ سے ہمیں صرف مہلت مل گئی ہے مکمل نجات حاصل نہیں ہوئی ہے۔ (تاریخ ترکان عثمانی جلد ۲ ص ۱۷۱ بحوالہ الفرقان ص ۴۴ اپریل ۸۵ء)

صفوی حکمرانوں کی اس انتہا پسندی اور غداری کی وجہ سے ایران اسلامی ممالک کی صف سے خود بخود باہر ہو گیا۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ!

اسماعیل اول صفوی نے شروع ہی سے شیعی مسلک کو ایران کے سرکاری مذہب کا درجہ دے دیا۔ ان حالات میں ایران گرد و پیش کے اسلامی ممالک سے بالکل کٹ گیا۔ دوسری طرف یورپ میں دولت عثمانیہ کے دشمنوں کو امید ہو گئی کہ دولت عثمانیہ کی بیخ کنی کے مشترکہ مقصد میں ایران ایک قابل قدر شریک کار ثابت ہو گا۔ یورپی طاقتوں مثلاً وینس اور ہسپانیہ سے دوستانہ تعلقات بڑھانے کا سبب یہی تھا۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۳ صفحہ ۶۵)

ان حقائق سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ صفوی حکمرانوں نے بھی شروع سے لیکر آخر تک اپنی پالیسی کا پورا رخ اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی کی طرف موڑے رکھا اور اکثر یورپ کے عیسائی حکمرانوں سے ان کی ساز باز رہی۔ جس کی وجہ سے خلافت عثمانیہ جو یورپ میں اسلام کی اشاعت کے لیئے بہت کچھ کر سکتی تھی مگر وہ ایران کی گھناؤنی سازشوں کا سدباب کرنے میں مصروف رہی۔

صفوی دور حکومت میں شیعیت کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا اس کا اقرار ایک شیعہ مجتہد کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔ چنانچہ سید محمد طباطبائی زیر عنوان "دسویں اور گیارہویں صدی کے دوران شیعوں کی حالت" لکھتے ہیں کہ!

۹۰۶ھ قمری میں شیخ صفی الدین اردبیلی (متوفی ۷۳۵ھ) کے خاندان سے ایک تیرہ

سالہ نوجوان نے جو مذہب کے لحاظ سے شیعہ تھا اپنے آباؤ اجداد کے تین سو مریدوں اور درویشوں کو ساتھ لیکر حکومت وقت کے خلاف سر اٹھایا تا کہ ایک مستقل، خود مختار اور آزاد شیعہ ریاست کو معرض وجود میں لائے اس لیئے وہ اردبیل سے اٹھا اور کشور کشائی کرتے ہوئے طوائف الملوکی کو ایران سے ختم کر دیا۔ اس نے علاقائی بادشاہوں اور خصوصاً آل عثمان خاندان کے بادشاہوں کے ساتھ خون ریز جنگیں کیں یہاں تک کہ ایران کو جو اس وقت حصوں بخروں میں تقسیم ہو چکا تھا ایک متحدہ آزاد ملک بنا دیا اور مذہب شیعہ کو اپنی حکومت اور قلمرو میں سرکاری مذہب کا درجہ دے کر رواج دیا۔ شاہ اسماعیل صفوی کی وفات کے بعد صفوی خاندان کے دوسرے بادشاہوں نے بارہویں صدی ہجری تک ایران میں اپنی حکومت جاری رکھی اور سب نے یکے بعد دیگرے شیعہ امامیہ مذہب کو سرکاری مذہب کے طور پر تصدیق اور تسلیم کیا اور اس کو مضبوط بنانے کے لیئے کسی کوشش اور جدو جہد یا حتیٰ کہ جنگوں سے بھی دریغ نہ کیا۔ یہاں تک کہ یہ خاندان جب اپنے عروج پر تھا یعنی شاہ عباس صفوی کے زمانے میں اس نے ملکی آبادی اور وسعت کو موجودہ ایران (یعنی ۱۳۸۴ھ) سے دوگنا کر دیا تھا۔ {شیعہ صفحہ ۵۵}

شاہ عباس صفوی نے بیالیس برس تک بڑے رعب اور دبدبے سے حکومت کی تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ صفوی حکومت شاہ عباس اول کے زمانے میں انتہائی عروج کو پہنچی ہوئی تھی اس کے دور میں حکومت ایران اپنے دشمنوں (مسلمانوں) پر غلبہ پا کر بین الاقوامی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ تذکرہ نویس اسے "جدید ایرانی سلطنت کا بانی" کہتے ہیں۔ ایران کو اس مقام تک پہنچانے کی وجہ سے شاہ عباس کو "اعظم" کا لقب دیا گیا۔ اسی شاہ عباس اعظم نے مختلف قبائل میں رابطہ استوار کرنے کیلیئے "مشہد" کو مرکزیت دینے کی طرف توجہ دی اور اس خیال کی اشاعت کی کہ مشہد امام رضا کا مدفن ہونے کی وجہ سے ایک مقدس مقام ہے حقیقت میں اس نے تمام ایرانیوں کا رخ "مشہد" کی طرف موڑ کر اسے شیعہ عقیدت کا سب سے بڑا اور اہم مرکز بنا دیا۔ وہ خود ایک مرتبہ اصفہان سے آٹھ سو میل کا سفر کر کے زیارت کیلیئے مشہد آیا۔ عباس اعظم سال میں دو ہفتے تک روضہ امام رضا میں اپنے ہاتھوں سے جھاڑو دیتا تھا۔ شاہ عباس نے اپنی جو اشیاء روضہ پر نذر کیں ان میں اس کا گراں بہا خزانہ اور اسکی کمان جس پر اس کا نام کندہ ہے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شاہ عباس اعظم مشہد کے علاوہ زیارت کیلیئے نجف بھی جاتا تھا۔ جہاں وہ حضرت علیؓ کے مزار کو اپنے

ہاتھوں سے صاف کرتا تھا اس طرح وہ زندگی بھر اہل ایمان کی مذہبی عقیدت کو استوار تر کرنے کے لیے ہر طرح سے کوشش کرتا رہا۔ (ملاحظہ تاریخ ایران جلد دوم صفحہ ۳۱۲ پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی)

علاوہ ازیں صفوی حکمران مشہد حسین کی بھی خوب دیکھ بھال کرتے رہے شاہ اسماعیل صفوی نے ۹۱۶ھ میں شاہانہ حوصلے سے روضے کی تجدید کی اور ایک چاندی کی ضریح نذر کی۔

{اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۷ صفحہ ۱۴۷}

گذشتہ صفحات میں "صفوی حکومت" کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ دور اسلامی تاریخ میں ہر اعتبار سے تاریک ترین اور سیاہ ترین دور شمار ہوتا ہے۔ دنیائے شیعیت کا ترجمان اعظم ملا باقر مجلسی (م ۱۱۱۱ھ) جو بہت بڑا شیعہ محدث، مجتہد، مصنف اور دار السلطنت اصفہان میں شیخ الاسلام کے منصب پر فائز تھا اسی صفوی دور میں گذرا ہے علمائے شیعہ اسے "خاتم المحدثین" کے لقب سے یاد کرتے ہیں جناب خمینی نے بھی ان کی تصنیفات کی تعریف کی ہے اور ان کے مطالعہ کا مشورہ دیا ہے۔ {کشف الاسرار صفحہ ۱۲۱}

ملا باقر مجلسی کا کردار اس دور کی سیاہی میں مزید اضافہ کرتا ہے۔

صفوی حکومت ڈاکٹر اسرار احمد کی نظر میں

صفوی حکومت کے عقائد و نظریات اور ان کے اہلسنت پر مظالم کی تفصیل سے آگاہ ہونے کے بعد اسے "اسلامی حکومت" کا نام ہرگز نہیں دیا جا سکتا مگر معلوم نہیں کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے کن وجوہات کی بناء پر اسے "اسلام کے عروج کا دور ثانی" قرار دیا؟ صفوی دور حکومت کے بارے میں ان کی تحقیق کا نچوڑ پیش کرنے سے قبل ان کے چند دیگر فرمودات ہدیۂ قارئین کیئے جاتے ہیں!

ڈاکٹر صاحب پاکستان میں شیعہ سنی مفاہمت اور اتحاد کے لیئے سخت بے چین اور مضطرب ہیں۔ اس عنوان پر انہوں نے ایک "تحقیقی" مضمون بھی سپرد قلم کیا جو ان کے اپنے ماہنامہ میثاق اور اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں موصوف فرماتے ہیں!

"جہاں تک کتاب اللہ کا تعلق ہے تو اگرچہ اہل سنت کو اہل تشیع کے بارے میں یہ شکوک و شبہات ہیں کہ وہ قرآن کو بھی صحیح نہیں مانتے ان کی بعض کتابوں سے اس کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں اور مولانا محمد منظور نعمانی نے اسی موضوع پر بڑی مفصل کتاب لکھی ہے لیکن اہل تشیع کا عمومی موقف

یہ ہے کہ نہیں ہم اسی کتاب کو برحق مانتے ہیں اور ہمیں ظاہر بات ہے کہ ان کا وہی موقف درست تسلیم کرنا چاہیے جو ان کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ ہمیں ان ہی کے موقف پر بات طے کرنی چاہیے باقی غالی قسم کے واعظین جو باتیں کہتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے پر تکفیر کے تیر چلاتے رہتے ہیں ان کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ یہ چیزیں غالی واعظین اور مذہبی پیشہ ور قسم کے لوگوں کے اندر ہوتی ہیں۔ اہل تشیع کا مستند موقف بہر حال یہی ہے کہ ہم اسی قرآن کو تسلیم کرتے ہیں۔ (ماہنامہ حق ص ۱۸۔ اپریل ۱۹۹۵)

سخت حیرت ہے کہ موصوف نے حضرت نعمانی کی مفصل اور مدلل کتاب کو نظر انداز کر کے اہل تشیع کے "تقیہ شریفہ" کے تحت محض زبانی موقف کو مستند موقف قرار دے دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک دینی و مذہبی سکالر ہونے کے علاوہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر بھی ہیں۔ ہر ماہر ڈاکٹر کسی بھی مرض کی تشخیص کے لیئے ٹیسٹ رپورٹس کی مدد لیتا ہے۔ کوئی ڈاکٹر مرض کی علامات اور ٹیسٹ رپورٹس کو نظر انداز کر کے مریض کے محض زبانی بیان پر اعتماد کر کے بیماری کی تشخیص نہیں کرتا۔ مگر جناب اسرار احمد صاحب ایک ایسے دینی سکالر اور ڈاکٹر ہیں جو تمام علماء کے بیانات، دلائل، شواہد اور خود شیعہ علماء و مجتہدین کی تحریرات و تصنیفات کو نظر انداز کر کے محض ان کے زبانی بیان کو "مستند موقف" قرار دے رہے ہیں۔ موصوف کا یہ تیر بہدف نسخہ اگر جج صاحبان نے چوروں، ڈاکوؤں، قاتلوں اور دیگر مجرموں کے حق میں استعمال کر لیا تو ملک یقیناً "امن و امان" کا گہوارہ بن جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب مولانا حق نواز جھنگوی کی الم ناک شہادت کے موقع پر اپنے احساسات و تأثرات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں!

"جھنگ کا ضلع شیعہ جاگیرداروں کی جاگیر ہے۔ اگرچہ وہاں کے عوام کی اکثریت سنیوں پر مشتمل ہے لیکن جاگیرداروں کی شہ پر وہاں کے شیعوں کو اتنی جرأت ہوتی ہے کہ سب سے بڑھ کر اور کھلم کھلا صحابہ کرامؓ پر تبرا جھنگ میں ہوتا ہے اور ظاہر بات ہے کہ جہاں اس طرح کا عمل ہوگا وہاں اس کا ردعمل بھی انتہائی شدید ہوگا۔ جہاں تک اصل مسئلے کا تعلق ہے وہ واقعتاً ہر سنی مسلمان کے لیئے دل آزار ہے۔ بڑی کور چشمی کی بات ہوگی اگر یہ کہا جائے کہ ان میں معدودے چند صاحب ایمان تھے۔ جو بہت رعایت کرتے ہیں۔ وہ یہ کہیں گے کہ باقی سب مسلمان تھے بس مومن نہیں تھے۔ مومن تو گنتی کے چند افراد تھے اور جو ان میں زیادہ دریدہ دہن ہیں وہ آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ مومن بھی نہیں سب کے سب منافق تھے صرف چند لوگ جن سے انہیں خصوصی نسبت حاصل ہے ان کو وہ

مومن قرار دیتے ہیں یہ بھی وہ مسلمانوں کے سامنے کہتے ہیں ورنہ اپنی محفلوں میں وہ سب کو منافق کہتے ہیں۔ معاذ اللہ ان میں ابوبکرؓ بھی ہیں۔ عمرؓ و عثمانؓ بھی اور ان میں عائشہ صدیقہؓ بھی ہیں۔ تمام ازواج مطہرات ہیں سوائے ایک خدیجۃ الکبریٰؓ کے۔ چونکہ وہ حضرت فاطمہؓ کی والدہ ماجدہ ہیں۔ ورنہ ان کے علاوہ انہیں سب ازواج مطہرات پر غصہ ہے۔" {ماہنامہ میثاق صفحہ ۲۶ ۔ اپریل ۱۹۹۰ء}

اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کا وہ اصول کہاں دفن ہو گیا کہ "ہمیں ظاہر بات ہے کہ ان کا وہی موقف درست تسلیم کرنا چاہیے جو انکی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔" شیعہ کا ظاہری موقف تو اب بھی یہی ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ کی توہین و تنقیص نہیں کرتے۔ مگر یہاں تو موصوف ان کے ظاہری موقف کو رد ہی نہیں کر رہے بلکہ ان کی نجی محفلوں کی کہانی سنا رہے ہیں کہ وہ تمام صحابہ کرامؓ اور ازواج مطہرات کو منافق کہتے ہیں۔

موصوف اسی مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ!

"جہاں تک مولانا جھنگوی کے طریقۂ کار کا تعلق ہے میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں کچھ شدت تھی کچھ انتہا پسندی تھی وہ اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ شیعوں کو بھی قادیانیوں کی طرح کافر قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ اب یہ بات ایسی تھی کہ اس میں جب تک اہل سنت کے تمام سرکردہ زعماء متفق نہ ہوں کوئی ایک شخص اس کو لے کر کھڑا ہو جائے تو یہ بات درحقیقت کام کرنے کے صحیح اصول کے منافی ہے۔ ہمارے ہاں علمائے کرام نے۔ یہ تو ہمیشہ کہا ہے کہ جو شخص فلاں فلاں باتیں مانے وہ کافر ہے مثلاً سیدھی سی بات ہے جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہ قرآن محفوظ نہیں وہ کافر ہے لیکن اب اس میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی شخص کہتا ہے یا نہیں کہتا اس کا فیصلہ تو کرنا پڑے گا۔ یہ عدالت کا معاملہ ہے اور اس شخص کے قول پر طے ہو گا۔ اصولی بات تو ہمیشہ کہی جاتی رہی ہے کہ جو شخص اس طرح کی بات کہے وہ کافر ہے دائرہ اسلام سے خارج ہے لیکن یہاں ہوتا یہ ہے کہ ان حضرات کے ہاں چونکہ تقیہ کا اصول بھی ہے لہٰذا جب معاملہ پیش ہوتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ نہیں ہمارا تو یہ قول ہی نہیں لہٰذا وہ عدالت اور مفتی کے فتوے کی زد میں ذاتی طور پر نہیں آئیں گے۔ یہی مشکل ہے جس کے باعث چودہ سو سال کی تاریخ میں اس پر اجماع نہ ہو سکا۔" {حوالہ مذکور صفحہ ۲۹}

جناب ڈاکٹر صاحب! مولانا جھنگویؒ عمر بھر یہی تو فریاد کرتے رہے کہ اس معاملہ کو عدالت میں لے جائیں۔ اگر اہل تشیع اس جرأت کا مظاہرہ نہیں کر سکے تو آپ خود ہی اس معاملہ

کو عدالت میں لے جائیں۔ یہ ملت اسلامیہ پر آپ کا عظیم احسان ہوگا اور راقم کو یہ قوی امید ہے کہ عدالت آپ کی ہدایت پر عمل پیرا نہیں ہوگی کہ اس شخص کے قول پر چلے ہوگا اور وہ عدالت کی زد میں ذاتی طور پر نہیں آئے گا۔" بلکہ عدلیہ اسلامی اور بین الاقوامی قواعد و ضوابط کی بنیاد پر صرف "میرٹ" پر فیصلہ دے گی۔

آپ نے جو "چودہ سو سالہ مشکل" پیش فرمائی ہے وہ علمائے کرام کی نہیں بلکہ وہ آپ کے مربی سید مودودی صاحب اور دیگر تاریخ اور حقائق سے ناواقف لوگوں کی ہے۔ آپ کے مربی اور قائد تو یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ!

"جماعت اسلامی کے دروازے شیعہ حضرات کے لیے کبھی بند نہ تھے۔ سنی اور شیعہ ہوتے ہوئے بھی ہم مسلمان ہیں اور اسلام کی خدمت مل کر کر سکتے ہیں آپ خلافت راشدہ کو قبول نہیں کر سکتے نہ کیجیے کوئی آپ سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ آپ پہلے تین خلفاء کو مان لیں۔

(مکاتیب۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی حصہ دوم ص ۲۳۳ از عاصم نعمانی)

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مزید فرماتے ہیں کہ!

"اس دور میں البتہ ایسا ہوا ہے کہ جب ایران میں انقلاب آیا اور خمینی صاحب عالمی سطح پر نمایاں ہو کر آئے۔ تو ان کی تصانیف کے حوالے سے ہندوستان میں بہت سے علماء نے تکفیر کا فتویٰ دیا اور یہ عجیب بات ہوگی آپ شاید حیران ہوں کہ اس سے پہلے سب سے زیادہ شدت سے اہل تشیع کو کافر قرار دینے میں مولانا احمد رضا خان بریلوی کے ہاں تھی۔ ان کا فتویٰ صراحتاً موجود ہے جبکہ دیو بندی علماء میں سے کسی کا فتویٰ بھی صراحتاً موجود نہیں لیکن جیسا کہ میں نے کہا کسی ایک عالم، کسی ایک فرد یا کسی ایک مکتبہ فکر کے کہنے سے وہ بات نہیں بنتی۔

ایران کے انقلاب کے بعد کثیر تعداد میں ہندوستان کے علماء جن میں دیو بندی بھی شامل ہیں یہ فتویٰ جاری کیا لیکن جب یہ فتویٰ پاکستان میں آیا تو سوائے معدودے چند حضرات کے علمائے کرام اس پر دستخط کرنے پر راضی نہ ہوئے بلکہ دیو بندی حضرات میں بھی اتفاق رائے نہ ہوا۔"

(ماہنامہ میثاق صفحہ ۴۸ اپریل ۱۹۹۰)

ڈاکٹر صاحب خود یہ اقرار کر رہے ہیں کہ فاضل بریلوی کا فتویٰ صراحتاً موجود ہے۔ کیا کسی "بریلوی" نے اس فتویٰ سے اختلاف کیا ہے؟ کیا یہ پورے ایک مکتبہ فکر کا فتویٰ نہ سمجھا

جائے گا؟ جبکہ بیسیوں دیگر بریلوی علماء کرام کی تصدیقات بھی موجود ہیں۔ اسی طرح علماء دیوبند واہل حدیث کا فتویٰ بھی موجود ہے۔ موصوف کی اس بات کے ساتھ اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ "پاکستان میں سوائے معدودے چند حضرات کے علماء کرام اس پر دستخط کرنے پر راضی نہ ہوئے"۔ کیا فتویٰ پر جن علمائے کرام کے دستخط ہیں وہ معدودے چند ہیں؟ کیا ان کا علمی مرتبہ و مقام دستخط نہ کرنے والوں سے کم ہے؟

جناب ڈاکٹر صاحب! براہ مہربانی ان علمائے کرام کے نام بتا دیں جو دستخط کرنے پر راضی نہیں ہوئے اور یہ بھی وضاحت کر دیں کہ انہوں نے فتویٰ سے اختلاف رکھنے کی بناء پر دستخط کرنے سے انکار کیا تھا؟ اگر فی الواقع یہ بات ثابت ہو جائے تو پھر دستخط نہ کرنے والے "علماء" یقیناً "علماء سوء" اور قومی و شرعی مجرم ہیں۔ جب اسلام اور کفر اور حق و باطل کا معاملہ درپیش ہو اور ایک فرد کو ہی نہیں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں اہل تشیع کو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جا رہا ہو تو وہ "علماء" محض دستخط کرنے سے انکار کر کے گوشہ نشین ہو جائیں تو خود ایسے علماء آخر کس زمرے میں شامل ہوں گے؟ فتویٰ کے ساتھ اختلاف رکھنے والے علماء کا فرض یہ ہے کہ وہ اس فتویٰ کے جواب میں ایک دوسرا فتویٰ سامنے لائیں جس میں اہل تشیع کا اسلام ثابت کر کے یہ واضح کیا جائے کہ فرقہ اثنا عشریہ کے وہ عقائد و نظریات نہیں ہیں جو مولانا محمد منظور نعمانی نے اپنے استفتاء میں پیش کیے تھے۔

راقم جناب ڈاکٹر صاحب سے یہ پوچھنے کی بھی جسارت کر رہا ہے کہ وہ یہ وضاحت بھی فرما دیں کہ کسی فتویٰ کو صحیح سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے اس پر کتنے علماء کے دستخط ہونے چاہئیں؟ تاکہ دوسری قسط میں مطلوبہ "شرعی نصاب" پورا کیا جا سکے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے موقف (شیعہ کی عدم تکفیر) پر سختی کے ساتھ ڈٹے ہوئے ہیں کیونکہ ان کا زیر تبصرہ بیان ۱۹۹۰ء میں جاری ہوا تھا۔ ابھی حال ہی میں میاں نواز شریف صاحب نے جب موصوف کو وزیراعظم ہاؤس میں مختلف مکاتب فکر کے علماء کی موجودگی میں "فرقہ واریت کے خاتمہ کے لیے ۱۰ رکنی علماء کمیٹی کا سربراہ مقرر کیا تو انہوں نے اسی مقام پر یہ تجویز پیش کی کہ "ایک فرقہ یہاں شیعوں کو کافر قرار دیتا ہے اس کی روک تھام کے لیے کوئی قانون ہونا چاہیے۔ شیعہ رہنماؤں نے اس تجویز کی حمایت کی اور کہا کہ اگر ایسا کوئی قانون بنا ہے تو یہ ایک اچھی بات ہوگی۔" (روزنامہ اوصاف ۱۲ اپریل ۱۹۹۹ء)

ڈاکٹر صاحب نے اس تجویز میں سپاہ صحابہؓ پاکستان اور برصغیر کے ان تمام علماء کرام (جنہوں نے شیعہ کی تکفیر کے متعلق فتویٰ دیا یا اس پر دستخط کیئے) کو ایک "فرقہ" قرار دیا۔ اب اس فرقہ اور ان علمائے کرام کے متعلق جناب ڈاکٹر صاحب کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں!

"چنانچہ اختلاف تو ہر جگہ موجود ہے اور یہ کوئی ایسی بری اور انہونی شئے بھی نہیں جبکہ تفرقہ ایک الگ شئے ہے۔ اختلاف کو گوارا کرنے کی بجائے اگر "من دیگرم تو دیگری" کی نوبت آجائے اور ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگانا شروع کردیئے جائیں تو یہی تفرقہ ہے جو کفر اور شرک سے کم نہیں"۔ (ماہنامہ میثاق صفحہ ۱۱ اپریل ۱۹۹۵ء)

موصوف ایک دوسرے مضمون میں مفکر اسلام مولانا مفتی محمود صاحبؒ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ!

"اور بعض اوقات کسی نازک لمحے پر ایک آدمی بھی بڑا قیمتی ثابت ہوتا ہے جب ایک ووٹ کے فرق پر ہی سارا معاملہ موقوف ہوتا ہے۔ ایک موقع پر صدر ایوب خان نے مفتی محمود صاحب کے ایک ووٹ سے دستور میں ترمیم کی تھی اور کہا گیا تھا کہ مفتی صاحب کو اس تعاون کے عوض دس لاکھ روپے دیئے گئے تھے۔ اندازہ لگایئے اس دور کے دس لاکھ آج کے دس کروڑ سے کم نہیں ہیں۔ مفتی صاحب نے اس الزام کی تردید نہیں کی تھی البتہ یہ کہا تھا کہ ہاں میرے مدرسہ کو دیئے ہیں۔ یہ کچھ اس طرح کا معاملہ ہے جیسے بعد میں ایک ایسے ہی موقع پر کسی مذہبی سیاسی جماعت کے امیدوار نے یہ کہا تھا کہ ہم بکے نہیں ہم نے سودے بازی کی ہے۔ میرے نزدیک اس چیز نے اسلام کو بے انتہا نقصان پہنچایا ہے۔" (ماہنامہ میثاق ص ۱۲۵ اکتوبر ۱۹۹۵ء)

موصوف اسی خطاب میں مجلس احرار اسلام اور تحریک خاکسار کے بارے میں فرماتے ہیں کہ!

"شروع میں، میں نے مجلس احرار اسلام کا تذکرہ کیا تھا۔ اسی طرح ماضی میں ہمارے ہاں خاکسار تحریک کا بھی بہت بڑا شہرہ ہوا لیکن اب یہ دونوں جماعتیں تاریخ کے عجائب گھر کی زینت بن چکی ہیں البتہ ان سے وابستہ مخلص افراد کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ ایسی نئی تحریکوں میں شامل ہو جائیں جو انکے نظریات سے قریب تر ہیں اور انکی تقویت کا باعث بنیں۔" (حوالہ مذکورہ صفحہ ۳۳)

اس کے جواب میں قاطع سبائیت و قادیانیت سید عطاء المحسن شاہ صاحب بخاری تحریر فرماتے ہیں کہ!

"ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اپنے ڈھب سے دین کا کام کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے۔ ان کو اور ان کے کام کو پسند کرنے والے لوگ بھی پاکستان میں پائے جاتے ہیں اور انکے رویوں کو ناپسند کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ ان لوگوں کی بھی کمی نہیں جو ان کی تنظیمی روش کو جماعت اسلامی، مسلم لیگ اور حزب اللہ کا "مرکب اضافی" سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ اس عہد خراب میں خوبیوں کا مجموعہ ہیں۔ اور "مجموعہ عطر" کی طرح خوشبو دار بھی ہیں اور یہ کہ ان کی خوشبو پھیل کر تا حد کاشغر پہنچ جائے گی پھر وہ کاشغر سے جب واپس پلٹے گی تو پاکستان کو "مدینۃ اللہ کتوز" بنادے گی اور یہ پاکستان ہی اب مولد الاسلام اور مہد اسلام ہے اور یہ کام اس داعی خلافت کے ہاتھوں سرانجام پائے گا۔ اسی طرح کی خوش فہمیوں کا جال ڈاکٹر صاحب نے اپنے گرد بن رکھا ہے۔ اللہ کرے وہ اس خوش فہمیوں کے سیل افکار میں حقیقت تک رسائی حاصل کر لیں تا کہ وہ تمام کائی اتر جائے جو بالعموم ٹھہرے ہوئے پانی کے اوپر جم جاتی ہے۔" (ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان صفحہ ۲۸ نومبر ۱۹۹۵ء)

ڈاکٹر صاحب کے ان ارشادات واجتہادات کے مطالعہ کے بعد اب صفوی حکمرانوں کے وحشیانہ مظالم اور کافرانہ سیاہ دور کے متعلق موصوف کا حسب ذیل ارشاد ملاحظہ فرمائیں۔

"۱۲۵۸ء میں جب سلطنت یا خلافت بنی عباس کا چراغ گل ہو گیا اور عالم اسلام پورا کا پورا ایسے ضعف واضمحلال کا شکار ہوا کہ بظاہر احوال کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اسے دوبارہ بھی اٹھنا نصیب ہوگا۔ لیکن پھر اسی سنت الٰہی کا ظہور ایک عجیب شان کے ساتھ ہوا۔ بقول علامہ اقبال مرحوم

ہے عیاں فتنہ تاتار کے افسانے سے ۔ پاسبان مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اللہ نے جن کو عذاب کا کوڑا بنا کر مسلمانوں کی پیٹھ پر برسایا تھا ان ہی کو ایمان و اسلام کی توفیق عطا فرمادی۔ ان ہی کے ہاتھ میں اپنے دین کا علم تھمادیا۔ چنانچہ یہ تین ترک قبیلے ہی ہیں کہ جن کی زیر سیادت و قیادت پھر اسلام کو اپنے دوسرے عروج کا دور دیکھنا نصیب ہوا۔ ترکان تیموری نے ہندوستان میں ایک عظیم مملکت قائم کی۔ صفوی حکومت جو ایران میں قائم ہوئی اصلاً وہ بھی ایک ترک حکومت تھی۔ پھر سلطنت عثمانیہ (ترکی) قائم ہوئی اور پورا عالم عرب اور پورا شمالی افریقہ انہی کے زیر نگین آیا اور ان ہی کے ہاں پھر خلافت کا احیاء ہوا۔ چوتھی بنی امیہ کی وہ سلطنت جو اندلس میں تھی۔ ان چار عظیم مملکتوں کی صورت میں دنیا بھر میں مسلمانوں کی سطوت

کا ڈنکا بجا"۔ {رسول کامل ﷺ صفحہ ۳۰۷-۳۰۵}

پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن نے پندرھویں صدی ہجری کے پہلے ربیع الاول (یکم تا ۱۲ ربیع الاول ۱۴۰۱ھ) میں رسول کامل ﷺ کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب کا بارہ روزہ پروگرام اپنے قومی نشریاتی رابطہ پر پیش کیا جو ماہنامہ میثاق میں (جنوری ۱۹۸۲ء تا دسمبر ۱۹۸۲ء) قسط وار شائع ہوا اور بعد میں رسول کامل ﷺ کے عنوان سے اسے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ اس پروگرام کے گیارھویں خطاب بہ عنوان "امت محمدی ﷺ کی تاریخ کے اہم خدوخال" میں ڈاکٹر صاحب نے کس ڈھٹائی کے ساتھ (تقریر اور تحریر ا) یہ ارشاد فرمایا کہ جن تین ترک قبیلوں کی زیر سیادت و قیادت پھر اسلام کو اپنے دوسرے عروج (اسلام کا پہلا دور عروج دورِ نبوت سے سقوط بغداد تک ہے) کا دور دیکھنا نصیب ہوا اور ان عظیم مملکتوں کی صورت میں دنیا میں پھر مسلمانوں کی سطوت کا ڈنکا بجا، جنہیں اللہ نے اسلام کی توفیق دی اور جن کے ہاتھ میں اللہ نے اپنے دین کا علم تھما دیا ان میں "صفوی حکمرانوں" کا دور بھی شامل ہے۔

فان کنت لا تدری فتلک مصیبۃ — وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے — خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے

قارئین کرام! گذشتہ صفحات میں "صفوی عہد" ایک مرتبہ پھر ملاحظہ فرمالیں اور ڈاکٹر صاحب سے یہ ضرور استفسار کریں کہ کیا وہ "تنظیم اسلامی" کے ذریعے برسر اقتدار آکر صفوی حکمرانوں کی پیروی کرتے ہوئے اسلام کو اس کا "تیسرا دور عروج" دکھانا پسند کریں گے؟

اب یہ سوال حل طلب ہے کہ ڈاکٹر صاحب شیعہ، سنی مفاہمت اور اتحاد کے لیے کیوں بے چین ہیں اور وہ گستاخان صحابہؓ کے لیے نرم گوشہ رکھنے پر کیوں مجبور ہو ئے؟

اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ۱۹ ستمبر ۱۹۸۶ء کو اپنے جمعہ کے خطاب میں غزوہ قسطنطنیہ کے متعلق رسول اکرم کی ایک بشارت کا ذکر کیا تھا جس پر لاہور میں اہل تشیع کی جانب سے سخت احتجاج ہوا، تنظیم اسلامی کے دفتر پر حملہ کیا گیا، توڑ پھوڑ کی گئی، ان احتجاجی مظاہروں میں ڈاکٹر صاحب کا پتلا جلائے جانے کے علاوہ ان کے متعلق غلیظ زبان استعمال کی گئی اور انہیں فرقہ وارانہ فسادات کرانے کا باعث قرار دیا گیا۔ اس آگ کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک وضاحتی بیان اور سید افتخار حسین نقوی صدر تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پنجاب کی پریس کانفرنس

کے ذریعے شفقت کیا۔ ادارہ میثاق نے اس پریس کانفرنس پر سکھ کا سانس لیتے ہوئے تحریر کیا کہ "حالانکہ اگرچہ محترم نقوی صاحب نے نہایت محتاط الفاظ استعمال کیے تاہم فرقہ وارانہ کشیدگی کی جو فضا ان دنوں لاہور پر طاری تھی اس کے پیش نظر اہل تشیع کے ایک ذمہ دار فرد کی جانب سے یہ اعتراف بھی صورت حال میں یقیناً کچھ بہتری پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتا تھا۔" (ماہنامہ میثاق صفحہ ۷ اکتوبر ۱۹۸۶ء)

ڈاکٹر صاحب بڑی مشکل سے اور بڑے روابط کے بعد اپنے آپ کو اس صورت حال سے نکالنے میں کامیاب ہوئے اور اس کا "کھٹکا" تو وہ تمام زیست محسوس کرتے رہیں گے۔ موصوف کے لیے یہی ایک واقعہ کافی تھا لیکن "ناس" ہوا ایجنسیوں کا جنہوں نے مولانا حق نواز جھنگوی کی شہادت سے قبل خود ڈاکٹر صاحب کو "شہید" ہونے کی بشارت دے دی۔ اس کی تفصیل ڈاکٹر صاحب کی اپنی زبانی ملاحظہ فرمائیں!

"مولانا حق نواز جھنگوی کا قتل یقیناً لرزا دینے والا ہے۔ اس کے المناک ہونے کے بارے میں اختلاف رائے ممکن نہیں لیکن یہ قتل کیوں ہوا؟ اس سے پہلے میرے اور طاہر القادری صاحب کے بارے میں باتیں آتی تھیں۔ آئی ایس آئی کے پاس بھی اطلاع پہنچی اور اس وقت کی فضاء کی مناسبت سے وہ بات بڑی وزنی تھی کہ روس کا ناک میں دم آیا ہوا تھا اور وہ پاکستان کو destablize کرنا چاہتا تھا۔ پولیس کے ذمہ دار افراد نے کہا تھا کہ اس خبر کو Lightly نہ لیں اس لیے کہ بین الاقوامی سازش کا حصہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے افراد کو قتل کرا دیا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ مخالفین کے کھاتے میں چلا جائے گا اور پھر آپس میں فساد پھوٹ پڑے گا۔"

(ماہنامہ میثاق صفحہ ۳۳ اپریل ۱۹۹۰ء)

یہ ہے وہ اصل وجہ جس کی بناء پر ڈاکٹر صاحب شیعہ کتب میں تحریف قرآن سے متعلق روایات اور صحابہ کرامؓ کی توہین دیکھنے اور پڑھنے کے باوجود یہ کہنے اور لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ "اہل تشیع کا مستند موقف بہر حال یہی ہے کہ وہ اس قرآن کو تسلیم کرتے ہیں اور ہمیں ظاہر بات ہے کہ ان کا وہی موقف درست تسلیم کرنا چاہیے جو ان کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔"

صفوی دور حکومت کے حوالے سے یہاں ڈاکٹر صاحب کا تذکرہ ضمناً آ گیا۔ عہد صفوی کے خاتمے کے بعد نادر شاہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

نادر شاهی عهد

ننھے صفوی شہزادے عباس سوم کی وفات کے بعد نادر شاہ نے ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۵ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ نادر شاہ نے جذبہ مسلم کشی کے پیش نظر عراق، افغانستان، سندھ اور ہندوستان میں ظلم و بربریت اور قتل و غارت گری کے بازار گرم کیئے تھے بالخصوص دھلی میں تو اس سنگدل، ظالم، درندہ اور وحشی شیعہ حکمران نے قتل و غارت کی انتہا کر دی۔ گھروں کے گھر جلا ئے اور لوٹے گئے۔ جس دروازے سے قتل عام ہوا وہ "خونی دروازہ" کے نام سے موسوم ہے۔ اسی موقع کی مناسبت سے محمد شاہ نے کہا تھا کہ "شامت اعمال ما صورت نادر گرفت"۔

مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے دلی پر نادر شاہ کی قتل و غارت گری کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے!

"نادر شاہ کے جانے کے بعد شہر مُردوں سے پر تھا اور زندوں سے خالی تھا مکانوں پر ویرانی برستی تھی۔ محلے کے محلے جلے پڑے تھے۔ مُردوں کی سڑاند سے بھیجا نکلا جاتا تھا نہ کوئی کسی کو کفن دینے والا تھا اور نہ گور میں دفن کرنے والا تھا۔" (تاریخ ہندوستان صفحہ ۱۶۷ جلد ۹)

اس حملہ نے دلی کے غیرت مند شہریوں اور شریف خاندانوں کے دل و دماغ پر وہ اثر ڈالا کہ وہ زندگی سے بیزار و شرمسار اور اپنے ہاتھوں اپنی موت کا سامان کرنے کے لیئے تیار تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے ملفوظات میں ہے کہ آپ نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ!

اس قتل عام اور عزت و ناموس کی بربادی کے موقع پر پرانی دلی کے شرفاء پرانے راجپوتوں کے دستور کے مطابق "جوہر" (یعنی جب راجپوت شرفاء ہر طرف سے گھر جاتے تھے اور باعزت زندگی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا تھا۔ تو اپنے اہل و عیال کو تہ تیغ کر کے جلتی ہوئی آگ میں پھاند جاتے تھے) کا قطعی طور پر ارادہ کر چکے تھے۔ اس موقع پر والد ماجد (شاہ ولی اللہ صاحب) نے مسلمانوں کو واقعہ کربلا اور سیدنا حسینؓ کے مصائب یاد دلا کر اس ارادہ سے باز رکھا کہ انہوں نے ان لرزہ خیز اور ناقابل تصور مصائب کے باوجود صبر و رضا کی راہ اختیار کی اور خاکم بدہن خویش کشی اور خودکشی کا ارادہ نہیں کیا۔ (بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت جلد ۵ صفحہ ۲۹)

نادر شاہ نے پانچ سال کے مختصر عرصے میں بڑی مہمیں سر کیں۔ قدیم حریف ترکوں کو دوبارہ شکست دے کر دیرینہ کھوئے ہوئے علاقے واپس لیئے۔ اس طرح اس کے زمانے کی ایرانی مملکت صفویوں کے زمانے سے کہیں زیادہ وسیع ہو گئی۔ ان فتوحات کی یاد منانے کے لیئے

نادر شاہ نے "مشہد" آ کر ایک عظیم جشن بپا کیا جہاں اہل شہر نے والہانہ طور پر اس کا استقبال کیا اور خوشیاں منائیں۔ بالآخر یہ ظالم اور سفاک فاتح اپنے قبیلے کے ایک فرد کے ہاتھوں ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں قتل ہو کر اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

مذہب شیعہ کو نادر شاہ کے دور میں بھی بہت فروغ حاصل ہوا۔ ابتداء میں اس نے چالبازی اور مکاری کے تحت یہ تجویز پیش کی تھی کہ!

"اہل ایران سنی مذہب قبول کر لیں اور سب حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی مسلک اختیار کرنے کے بجائے حضرت امام جعفر صادق کی پیروی کریں جو شیعہ اور سنی دونوں کے نزدیک قابل احترام ہیں لیکن امراء نے نادر قلی کی بادشاہت کو تو دل و جان سے قبول کر لیا لیکن مذہبی تبدیلی کو نہ دل سے مانا اور نہ حکومت کے موروثی ہونے کو تسلیم کیا۔ نادر شاہ نے مذہب کا حکومت سے تعلق ختم کر کے اسلامی دنیا کو ملا کر ایک کرنا چاہا چنانچہ اہل تشیع اور اہل تسنن کے بین بین حضرت امام جعفر کے نام پر مذہب جعفریہ کی ترویج کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں اسے کامیابی نہ ہوئی۔"

(ترجمہ تاریخ ایران جلد دوم صفحہ ۳۷۸،۳۷۷ پروفیسر جمیل بیگ بدخشانی)

یہ ملحوظ رہے کہ مذہب شیعہ اور مذہب جعفریہ دونوں ایک ہی مذہب کے نام ہیں۔

شاہ اسماعیل صفوی نے ایران میں شیعہ مذہب کو مملکت کا سرکاری مذہب قرار دیا تھا۔ اس مذہب کی یہ حیثیت اس کے بعد کسی دور میں بھی ختم نہیں ہوئی اور آج تک قائم ہے۔ چنانچہ شیعہ مجتہد سید محمد طباطبائی زیر عنوان "بارہویں سے پندرہویں صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت" لکھتے ہیں کہ!

"آخری تین صدیوں کے دوران شیعوں کی مذہبی ترقی اپنی سابقہ حالت اور شکل میں جاری رہی ہے اور اب جبکہ چودہویں صدی کا آخری حصہ گذر رہا ہے مذہب شیعہ ایران میں سرکاری اور عوامی مذہب کے طور پر پہچانا جاتا ہے اور اسی طرح دوسرے بہت سے اسلامی ممالک مثلاً یمن، عراق میں شیعوں کی اکثریت ہے ان کے علاوہ تمام اسلامی ممالک میں بھی کم و بیش شیعہ افراد زندگی گذار رہے ہیں لیکن مجموعی طور پر دنیا کے مختلف ممالک اور علاقوں میں شیعہ آبادی تقریباً ایک سو ملین (دس کروڑ) نفوس پر مشتمل ہے۔"

(شیعہ صفحہ ۵۵)

نادر شاہ کے تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ نادر شاہ پیدائشی جرنیل تھا اس کی آواز

بادل کی کڑک کی طرح گونج دار تھی اور دہلی پر تمام حملہ آوروں کی نسبت سب سے زیادہ ظالم تھا حتیٰ کہ اس کے مظالم سے اس کے اپنے خاندان کے افراد بھی محفوظ نہیں رہ سکے جس کے نتیجے میں اس کے بھتیجے علی خان نے بغاوت کی۔ بالآخر محمد صالح خان اور محمد قلی خان افشاریوں نے اس کے خیمے میں داخل ہو کر اسے قتل کر دیا۔ ایک شیعہ مؤرخ لکھتا ہے کہ!

''ہو سکتا ہے کہ اس نے خواب کی وجہ سے شیعہ سنّی کا سوال مٹانے کے لئے ایسا سوچا ہو کیونکہ اس کے خیال کے مطابق اسے آئندہ عثمانی (سنّی) حکومت کا وارث ہونا تھا اس لیے اس نے یہ سوچا ہو کہ شیعہ چونکہ سنیوں کے خلاف ہیں اس لیے اسے درمیانی پالیسی اختیار کرنی چاہیے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایران میں ابھی تک یہ معمہ حل نہیں ہو سکا کہ آیا نادر شاہ سنّی تھا یا شیعہ لیکن زیادہ تر مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ وہ سنّی تھا ان مؤرخین میں سر پرسی سائیکس، ولیم ایل لنگر مصنف انسائیکلو پیڈیا، تاریخ عالم مولانا غلام رسول مہر وغیرہ ہیں''۔ (تاریخ اسلامی جمہوریہ ایران صفحہ ۱۰۵ شیخ محمد حیات)

اس شیعہ مؤلف کو نادر شاہ کو سنّی قرار دینے کے لیے کن مؤرخین کا سہارا لینا پڑا؟ معمہ ایران کا ہے اور اسے حل کرنے کے لئے غیر ایرانی بے چین نظر آتے ہیں۔ نادر شاہ کی ''سنیت'' تو دہلی کے حملے سے ہی ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سید محمد طباطبائی (جو ایک شیعہ مجتہد اور مفسر ہیں) کا حوالہ بھی اوپر گذر چکا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نادر شاہ ایک کٹر شیعہ اور انتہائی ظالم شخص تھا اگر وہ شیعہ نہ ہوتا تو اس کے امراء اسے ایک لمحے کے لیے بھی تخت ایران پر جلوہ افروز نہ ہونے دیتے۔

نادر شاہ کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا علی قلی خان ''عادل شاہ'' کے لقب سے ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں تخت نشین ہوا۔ یہ شخص بھی انتہائی ظالم تھا۔ اسی نے اپنے چچا نادر شاہ کو قتل کرایا تھا۔ پھر اس نے کلات پر حملہ کر کے بادشاہ کے لواحقین کے خون سے ہاتھ رنگین کیے۔ صرف رضا قلی مرزا کا چودہ سالہ بیٹا بچ سکا جس کی ماں صفوی بادشاہ حسین کی بیٹی تھی۔ عادل شاہ ایک ہی سال حکومت کر پایا تھا کہ اس کے بھائی ابراہیم خان نے اس کے خلاف بغاوت کی اور اسے معزول کر کے اس کی آنکھیں نکلوا دیں۔ پھر ابراہیم شاہ خود بھی کسی لشکری کے ہاتھوں مارا گیا۔

ابراہیم کے بعد شاہ رخ (جس کا ماں کی طرف سے حسب نسب سلطان حسین صفوی سے ملتا تھا) نے تخت و تاج سنبھالا لیکن مشہد کے مجتہد کا بیٹا مرزا سید محمد بادشاہت کا دعویدار بنا

کیونکہ شاہ حسین صفوی کی بہن اس مجتہد کے نکاح میں تھی اور سید محمد اس کے بطن سے تھا۔ لوگ جوق در جوق آ کر اس سے عقیدت کا اظہار کرنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے شاہ رخ کو شکست دے کر نہ صرف تخت و تاج حاصل کیا بلکہ اس کی آنکھیں بھی نکلوا دیں۔ شاہ رخ کا سپہ سالار جب مشہد واپس پہنچا تو مرزا سید محمد کو جو "سلیمان" کے لقب سے تخت نشین ہوا تھا قید کر لیا اور اس کی آنکھیں نکلوا کر شاہ رخ کا انتقام لیا۔ اس کے بعد حکومت ایران کے چار امیدوار باقی رہ گئے

۱۔ محمد حسن قاچار ۲۔ آزاد خان افغان
۳۔ علی مردان خان بختیاری ۴۔ کریم خان زند

کریم خان زند نادر شاہ کی فوج میں معمولی سپاہی کی حیثیت میں شامل ہوا لیکن ترقی کرتے کرتے سالار کے عہدے تک جا پہنچا۔ آخر قسمت نے یاوری کی اور وہ ایران کا تخت حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔

بہر حال نادر شاہ کا دور بھی عہد صفویہ میں شمار ہوتا ہے کیونکہ نادر شاہ کا قبیلہ "افشار" ان سات ترک قبائل میں سے ایک ہے جو اسماعیل صفوی کے پرچم تلے جمع ہو گئے تھے اور اس کے نام پر مر مٹنا اپنا مقدس فرض سمجھتے تھے۔

عہد زندیہ

کریم خان زند کی حکومت کا زمانہ ۱۱۶۳ھ تا ۱۱۹۳ھ / ۱۷۵۰ء تا ۱۷۷۹ء ہے۔ اس عرصے میں آخری بیس سال وہ ایران کا مختار کل حکمران رہا لیکن بادشاہ کا لقب اس نے اختیار نہ کیا اور اپنے لیے "وکیل الرعایا" کا لقب اختیار کرنا ہی مناسب سمجھا۔ شیراز اس کا دارالسلطنت تھا۔

کریم خان کی وفات کے بعد اس کے ماں جائے بھائی ذکی خان نے اقتدار سنبھالا۔ ذکی خان جنگجو اور سفاک شخص تھا اس نے کریم خان کی زندگی میں حسین قلی خان قاچار کی بغاوت فرو کرنے میں نہایت سختی کی تھی جو لوگ اس جنگ میں قید ہوئے انہیں ذکی خان نے سروں کے بل زمین میں زندہ گڑوا دیا۔ اس طرح کا سلوک اس نے بعض اور مقامات پر بھی کیا جس کی وجہ سے لوگ اس سے خوف زدہ تھے۔ ان مظالم کی بناء پر وہ تمام ایران میں بہت جلد ہلاکو ثانی مشہور ہو گیا۔ آقا محمد خان قاچار نے اپنے قبیلے کو منظم کر کے زندی حکمرانوں کے خلاف پے در پے فتوحات حاصل کیں اور آخری زندی حکمران لطف علی پر غلبہ حاصل کر کے ۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۴ء میں زندی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

زندی خاندان کے پینتالیس سالہ دور میں باہمی رقابتوں کی بناء پر خانہ جنگیاں بھی ہوتی رہیں تاہم اس دور میں بھی مذہب شیعہ کی وہی حیثیت برقرار رہی جو عہد صفوی میں تھی۔

عہد قاچاریہ

یہ ترک قبیلہ بھی ان سات قبائل میں سے تھا جن کی اعانت سے اسماعیل صفوی نے اپنا اقتدار قائم کیا تھا۔ زند خاندان کے بعد آغا محمد خان قاچار نے اپنی حکومت قائم کی۔ ایران میں قاچاری خاندان کی حکومت ۱۲۱۰ھ تا ۱۳۲۷ھ/۱۷۹۶ء تا ۱۹۲۳ء قائم رہی۔ فرقہ اسماعیلیہ کا امام آغا خان اول حسن علی شاہ (م ۱۸۸۱ء) شاہ ایران فتح علی شاہ قاچار (م ۱۸۷۴ء) کا منظور نظر تھا۔ آغا خان اول شاہ ایران کی طرف سے کرمان کا گورنر بھی رہا۔ مگر سلاطین قاچاریہ شیعہ فرقہ اثناعشریہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس عہد میں بھی مذہب شیعہ ہی مملکت کا سرکاری مذہب رہا اور ان کی زیر سرپرستی اس مذہب نے خوب ترقی کی۔ چنانچہ شیعہ مجتہد مفتی جعفر حسین لکھتے ہیں کہ!

"دولت صفویہ کے زوال کے بعد سلاطین زندیہ اور قاچاریہ شیعیت کے لیے پشت پناہ ثابت ہوئے اور اس کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اب ایران شیعیت کا سب سے بڑا مرکز ہے اور قم، مشہد، تہران، نیشاپور، نہاوند اور دوسرے شہروں میں ان کے بلند پایہ علمی مراکز اور دینی مدارس قائم ہیں"۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ صفحہ ۹۰۸ جلد ۱۱)

علاوہ ازیں جب ۱۲۱۶ھ میں عبدالوہاب نجدی کے متبعین کے حملے کے نتیجے میں "مشہد حسینؑ" کو نقصان پہنچا اور اس کے مال و اسباب لوٹ لیے گئے تو فتح علی شاہ قاچار نے اس نقصان عظیم کی شاندار تلافی کی۔ اب کی مرتبہ کربلاء کی تاریخی تعمیر و آرائش ہوئی اور ۱۲۲۷ھ میں روضۂ انور از سر نو مطلا کیا گیا۔ ۱۲۵۰ھ میں اس بادشاہ نے حضرت امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ کے روضوں کے گنبدوں پر سونا چڑھوایا۔ ۱۲۷۶ھ میں ناصر الدین شاہ قاچار نے دوبارہ زر کثیر خرچ کر کے طلاکاری کرائی۔ ۱۲۸۷ھ میں وہ خود زیارت کے لیے حاضر ہوا اور بہت سے مکانات خرید کر حرم کی توسیع کی اور اوقاف قائم کیے۔ اس کے بعد سے اب تک کم و بیش کربلا اور اس کے مقدس مزارات مسلسل دیکھ بھال کی وجہ سے محفوظ ہیں۔ (بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۱۴۹ جلد ۱۷ تحت کربلاء)

عہد قاچاریہ کا تذکرہ ایک دوسرے مقالہ نگار بالفاظ ذیل کرتے ہیں!

"انیسویں صدی میں فی الحقیقت قاچار خاندان قدیم شان و شوکت سے ایران

پر حکومت کرنے میں کامیاب رہا کیونکہ وہ مفسد قبائل اور ان کے سرداروں کے داخلی اختلافات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی سرگرمیوں کی روک تھام کرتا رہتا تھا۔ ملک کے باشندوں پر شیعی مجتہدین کا اثر چھایا ہوا تھا اور ان کی ناموری میں حکومت کو مطلق دخل نہ تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر کربلا اور نجف کے مذہبی مرکزوں میں اقامت رکھتے تھے۔ ان سے عام عقیدت کے باوجود بعض اختلافی دینی میلانات انیسویں صدی کے آغاز سے نشوونما پانے لگے تھے۔ مثلاً "فرقۂ شیخیہ" اس فرقے پر روحانیت کا غلبہ تھا اور اسی سے بالآخر ۱۸۴۴ء میں باب کے ظہور کا راستہ ہموار ہوا۔ بابی تحریک میں چند سال تک ایک مذہبی سیاسی بغاوت کا پہلو موجود رہا۔ لہٰذا حکومت کو خون ریز تدبیروں سے اسے دبانا پڑا۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۶۵۳ جلد ۳۔ تحت ایران)

اثنا عشری فرقہ شیخیہ

قاچاری عہد میں اثنا عشریہ کا ایک نیا فرقہ بنام "شیخیہ" سامنے آیا۔ جس کے متعلق سید محمد طباطبائی لکھتے ہیں کہ!

"آخری دو صدیوں کے دوران بارہ امامی شیعہ میں سے دو دوسرے فرقے بنام شیخیہ اور کریم خانیہ پیدا ہو گئے ہیں۔ اگرچہ بعض مسائل میں دوسرے فرقوں کے ساتھ ان کا اختلاف ہے لیکن یہ اختلاف صرف فقہی مسائل میں ہے نہ کہ نفی اور اثبات کے اصلی مسائل میں لہٰذا ہم ان کو اصل فرقے نہیں سمجھتے"۔

(شیعہ صفحہ ۱۲۶)

فرقہ شیخی یا شیخیہ الشیخ احمد بن زین الدین الاحسائی البحرانی سے منسوب ہے۔ شیخ احمد احسائی ۱۱۶۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴۳ھ میں فوت ہوئے۔ شیخ کے پیرو ایران اور عربستان کے کئی علاقوں میں ہیں۔ فرقے کا یہ نام خود شیخیہ نے اپنے لیے اختیار نہیں کیا بلکہ خاص و عام نے انہیں اس نام سے موسوم کر دیا۔ جو شخص شیخ احمد احسائی سے عقیدت کا اظہار کرتا ہے اسے شیخی کہہ دیتے ہیں۔

اصول مذہب اور اصول حدیث کی تشریح وہ ایک نئے انداز سے کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں تخلیق کائنات کا اصل باعث ائمہ اثنا عشریہ تھے کیونکہ وہی مشیت الٰہی کے مظہر اور منشائے ایزدی کے ترجمان ہیں۔ اگر ان کا وجود نہ ہوتا تو خدا کسی چیز کو پیدا نہ کرتا لہٰذا وہ تخلیق کی علت اولیٰ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے تمام کام انہیں کے وسیلے سے صادر ہوتے ہیں لیکن انہیں بذات خود یا اپنے بارے میں کوئی اختیار نہیں وہ محض مشیت ایزدی کی کارفرمائی کا ذریعہ یا آلہ ہیں۔ اسی

وجہ سے ... علماء ان پر تفویض (یعنی اختیارات خداوندی کو کسی اور کے سپرد کر دینے) کا الزام عائد کرتے ہیں۔ خدا کی ذات چونکہ فہم سے بالاتر ہے اور کسی ایسی ہستی کے خیال میں نہیں آتی جو مخلوق ہے لہٰذا اسے ہم صرف ائمہ ہی کے وسیلے سے سمجھ سکتے ہیں۔

جو فی الحقیقت اس اعلیٰ ترین ہستی کے مظاہر ہیں۔ ان کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔ لوح محفوظ امام کا دل ہے جس نے تمام آسمانوں اور جہانوں کا احاطہ کر رکھا ہے۔ ائمہ سب مخلوق سے افضل ہیں۔ ان کی پیدائش سب سے پہلے ہوئی۔

معاد کے سلسلے میں فرقہ شیخیہ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انہیں مادی جسم کے حشر سے انکار ہے۔ شیخی اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ انسان کے دو جسم ہیں ایک لباس کی طرح جسے انسان کبھی پہن لیتا ہے اور کبھی اتار دیتا ہے اور جو زمانی عناصر سے بنا ہے یہی جسم ہے جو قبر میں نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ دوسرا نہایت لطیف جو اس وقت بھی باقی رہتا ہے جب پہلا خاک میں مل جاتا ہے اس کا تعلق عالم غیر مرئی سے ہے (جسم ھورقلیائی) قیامت کے دن یہی جسم اٹھایا جائے گا اور پھر جنت یا جہنم میں داخل ہوگا۔ جنت عبارت ہے اہل بیت اور ائمہ کی محبت سے۔ جنت اور جہنم کی تخلیق اعمال انسانی ہی سے ہوتی ہے۔ شیخی تصوف اور وحدۃ الوجود دونوں کی مذمت اس قسم کے اقوال سے کرتے ہیں کہ یہ کیا ممکن ہے کہ ذات باری کو اپنی کنہ میں ایک کثیر الاشیاء ہستی ٹھہرا لیا جائے۔

معجزات نبوی کی تشریح وہ مادی اعتبار سے نہیں بلکہ تمثیلاً اور عقلی انداز میں کرتے ہیں۔

ناصر الدین شاہ کے آغاز حکومت میں تبریز (۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء) میں اس وجہ سے فساد ہو گیا کہ ایک شیخی کو کسی مجتہد کے فیصلے کی بناء پر عام حماموں میں جانے سے روک دیا گیا تھا۔ والی نے فساد پر قابو پالیا اور دونوں جماعتوں میں مصالحت کرا دی۔ آگے چل کر اس فرقے پر کئی بار جبر و تشدد کیا گیا۔ علمائے شیخیہ کا اس امر پر اعتقاد ہے کہ امر دین جزئی اور کلی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ امر و نہی سب اس کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر ﷺ اور اوصیاء کے وسیلے سے تمام جزئی اور کلی اور اوامر دین کو لوگوں تک پہنچایا اور انہوں نے راویان حدیث اور محدثین کے ذریعے ہم تک پہنچایا۔ علمائے شیخیہ ولایت امیر المومنین حضرت علیؑ اور آل محمد ﷺ کے علوم و آثار کی نشر و اشاعت کرتے ہیں۔

عقائد شیخیہ ... بارہ امام کہ جن میں سے پہلے امیر المومنین علیؑ اور آخری ابن الحسن العسکری

جو پردہ خفاء میں ہیں حجت خداوندی اور پیغمبر ﷺ کے جانشین ہیں۔ یہ بہترین خلق خدا ہیں اور معصوم ہیں ان کا امر خدا اور رسول ﷺ کا امر اور ان کی نہی خدا کی نہی ہے۔ حضرت پیغمبر ﷺ، فاطمہ الزہراء۔ بارہ امام مقدس و معصوم ہیں کوئی مخلوق ان سے ملحق نہیں ہو سکتی۔

شیخیہ کے بنیادی عقائد چار ہیں۔ (۱) معرفت خدا (۲) معرفت پیغمبر ﷺ (۳) معرفت امامت جو ائمہ اطہار اور محافظان دین ہیں (۴) چوتھے عقیدے میں (تولا و تبرا) دوست داروں کی دوستی اور دوست داروں کے دشمنوں سے دشمنی۔

اہل تشیع کا اجماع اس بات پر ہے کہ آل محمد ﷺ بھی نفس پیغمبر ﷺ ہیں اور ان سے ملحق ہیں اور معصومین سے امر پروردگار کے خلاف کوئی بات سرزد نہیں ہوتی۔ پس سب کام ان کے خدا سے نسبت رکھتے ہیں بلکہ ان کی مشیت کو خدا سے نسبت ہو جاتی ہے کیونکہ وہ کوئی بات ایسی نہیں کرتے جو خدا نہ چاہے۔ پس چونکہ امام معصوم تمام مراتب فعل پروردگار پر رضامند ہوتا ہے۔ پس اس کا فعل، فعل خدا بن جاتا ہے اور فعل پروردگار کے آثار و صفات اس میں جمع ہو جاتے ہیں۔ (بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۸۷۶-۸۷۷ جلد ۱۱)

پاک و ہند میں رہنے والے عام اثنا عشری شیعہ وہی عقائد رکھتے ہیں جنہیں شیخ احسائی اور سید کاظم الرشتی نے رائج کیا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو شیخیہ کی طرف منسوب نہیں کرتے۔ انہوں نے مختلف شہروں میں اپنے مراکز کھول رکھے ہیں۔ پاکستان میں ملتان اور کراچی میں ان کے بڑے مراکز ہیں۔ زیادہ تر حکومت کویت کی طرف سے ان کی مالی امداد کی جاتی ہے۔

تحریک بابیت

قاچاری عہد میں پروان چڑھنے والی ایک تحریک بابیت بھی ہے اثنا عشری فرقہ کے ضمن میں اس کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ باب خود پہلے ایک اثنا عشری شیعہ تھا اور اسی مذہب کے عقائد میں تغیر کر کے اس نے ایک نئی تحریک قائم کی۔ باب کے تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ شیعہ اثنا عشری فرقہ شیخیہ کے عقائد سے ہی بابی عقائد کا راستہ ہموار ہوا ہے۔ بلکہ مرزا محمد باقر نے اپنی کتاب "روضات الجنات" میں فرقہ بابیہ کو پیروان شیخ قرار دیا ہے۔ بعض حضرات نے اس کی ایک وجہ یہ بتائی ہے کہ چند شیخی فرقہ کے طلباء سید کاظم رشتی کی مجلس میں شامل ہوتے تھے اسی مجلس میں مرزا علی محمد باب بھی شامل تھا۔ مرزا علی محمد نے اسلامی عقائد میں اختلاف کا اظہار کیا تو ان چند شیخی طلباء

نے باب کی پیروی کر لی اور قرآن کریم کی بعض آیات اور احادیث میں تاویلیں کرنے لگے لیکن فرقہ شیخیہ من حیث الجماعت باب کے پیرو نہ تھے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۲۴۷ جلد ۳)

اس تفصیل سے اتنی بات تو واضح ہو گئی کہ "بابی عقائد" بھی شیعی عقائد کا ملغوبہ ہیں اور شیعی فرقہ شیخی کے دبستان سے ہی بابیت پیدا ہوئی اور اسی نے اس مذہب کے لیے راستہ ہموار کیا ہے کیونکہ شیخیوں کا اعتقاد ہے کہ تخلیق کائنات کی علت غائی اور اس کا اصل باعث بارہ امام ہیں وہ مشیت ایزدی کے مظہر اور الٰہی منشاء کے ترجمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے تمام کام انہی کے وسیلے سے صادر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات فہم سے بالاتر ہے اور ہم اس کا ادراک مادی وجود وں ہی کے ذریعے کر سکتے ہیں جو اس کی اعلیٰ ہستی کے مظہر ہیں۔ امام غائب کے بعد ان کے قائم مقام اور عوام کے درمیان واسطہ وہ ہستیاں ہیں جو "باب" کہلاتی ہیں۔ وہ شیعہ کامل اور واسطہ فیض ہیں یہ عقیدہ ان کے ہاں "رکن رابع" کہلاتا ہے۔ شیخی امام غائب کے ظہور کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ بعینہ امام غائب نہیں ہوں گے بلکہ ان کے مثل ہوں گے۔ شیخ احسائی نے اپنی وفات سے پہلے اپنا یہ تصور بھی پیش کیا تھا کہ اگلی صدی کے نصف میں امام منتظر پیدا ہو جائے گا اور وہی اپنے وقت کا مہدی بھی ہوگا۔ یہی تصورات ہمیں باب کے دعوے کے پس منظر میں ملتے ہیں۔

(مجلہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۲۴۲ جلد ۳)

پروفیسر محمد ابو زہرہ لکھتے ہیں کہ!

"یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ امام مستور کا عقیدہ اثنا عشری شیعہ کے اساسی عقائد میں سے ہے۔ انکے عقیدہ کے مطابق بارھواں امام "سُرَّ مَن رَای" کے شہر میں غائب ہو گیا تھا اور ابھی تک وہ اس کے منتظر ہیں۔ مرزا علی محمد باب بھی دیگر اثنا عشریہ کی طرح یہی عقیدہ رکھتا تھا۔ اکثر اہل فارس جن میں یہ نوجوان (مرزا علی محمد باب) پروان چڑھا اسی نظریہ کے حامل تھے۔ اس نے اثنا عشری فرقہ کی حمایت میں بڑی غیرت کا ثبوت دیا جس کے نتیجہ میں یہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ لوگوں کی حوصلہ افزائی کے صلہ میں مرزا علی محمد نے یہ دعویٰ کر دیا کہ وہ امام مستور کے علوم و فنون کا واحد عالم بے بدل ہے اور اس کی طرف رخ کیئے بغیر وہ علوم حاصل نہیں کیئے جا سکتے اس لیئے کہ یہ شیعہ فرقہ کے قول کے مطابق دیگر ائمہ اثنا عشریہ کی طرح امام مستور ائمہ سابقین کی وصیت کی بناء پر قابل اتباع علوم کا جامع اور مصدر ہدایت و معرفت ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ گذرنے

پر مرزا علی محمد غلو سے کام لینے لگا اور اس نے مستقل مہدی ہونے کا اعلان کر دیا جس کا ظہور غیوبت امام کے ایک ہزار سال بعد ہونے والا تھا۔ امام غائب ۲۶۰ھ میں نظروں سے اوجھل ہوئے تھے۔"

(اسلامی مذاہب صفحہ ۳۲۲)

تحریک بابیت کا بانی علی محمد ہے۔ یہ شخص شیراز کے ایک اثنا عشری شیعہ تاجر کے گھر یکم محرم ۱۲۳۶ھ/۱۹ اکتوبر ۱۸۲۰ء کو پیدا ہوا۔ والد کا نام محمد رضا اور والدہ کا فاطمہ بیگم تھا۔ گھرانے کا پیشہ بزازی تھا۔ دو سال کی عمر میں والد فوت ہو گیا۔ ماموں آغا سید علی نے یتیم بھانجے کی پرورش کی۔ چھ سال کی عمر میں علی محمد کو شیخ عابد کے مکتب "قہوہ اولیاء" میں بٹھا دیا گیا۔ جہاں اس نے پانچ سال تک ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ شیخ عابد شیخ احسائی (بانی فرقہ شیخیہ) اور کاظم رشتی کا مرید تھا۔ شروع ہی سے اس کا رجحان مذہب کی طرف تھا چنانچہ وہ مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے کربلا چلا گیا۔ وہ اکثر شدید قسم کی ریاضتیں بھی کرتا تھا بعض اوقات وہ عین گرمیوں میں گھر کی چھت پر سورج کے سامنے ننگے سر گھنٹوں کھڑا رہتا اور بعض وظائف کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ زیارت کربلا کے سفر میں یہ شیخی عقیدے کے رہنما اور شیخ احسائی کے خلیفہ کاظم رشتی سے ملا اور اس سے تعلیم پانے لگا۔ یہ سلسلہ کوئی دو سال جاری رہا۔ پھر علی محمد کاظم رشتی کے غالی مریدوں میں شامل ہو گیا۔ بائیس سال کی عمر میں شادی کی۔ ایک بچہ احمد پیدا ہوا۔ جو بچپن ہی (۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء) میں فوت ہو گیا۔ باب کی بیوہ ۱۸۸۲ء تک زندہ رہی۔ باب نے دعویٰ سے پہلے پوری جائیداد ماں اور بیوی کے نام قانوناً منتقل کر دی تھی۔

کاظم رشتی کا خیال تھا کہ امام غائب کے ظہور کا وقت قریب آ پہنچا ہے وفات سے قبل اس نے مریدوں کو ایران میں پھیلا دیا کہ مہدی منتظر کو تلاش کریں اس لیے اس نے کسی کو اپنا جانشین بھی نامزد نہ کیا۔ رشتی کی وفات کے پانچ ماہ بعد اس کا ایک سرفروش مرید ملا حسین جو "بشرویہ" کا رہنے والا اور رشتی کے مکتب میں علی محمد کے ساتھ پڑھ چکا تھا شیراز پہنچا اور اپنے پرانے ہم مکتب سے ملاقات کی۔ یہی شخص ہے جس نے اس موقع پر علی محمد کو حقانیت کا 'باب' قرار دیا۔ بابی ملا حسین کو "اول من آمن" کے لقب سے یاد کرتے ہیں خود علی محمد نے اسے "باب الباب" کا لقب دیا تھا۔

پھر علی محمد کاظم رشتی کے کچھ مریدوں کو لے کر بغرض ریاضت و مراقبہ کوفے کی ایک مسجد میں چلا گیا اور وہاں چلہ کشی کی۔ ۵ جمادی الاولیٰ ۱۲۶۰ھ/۲۳ مئی ۱۸۴۴ء کو اس نے باب ہونے کا دعویٰ

کیا اس وقت اس کی عمر چوبیس سال تھی۔ شیعہ مذہب کے ابتدائی دور میں امام وقت کے سب سے بڑے پیرومختار کو "باب" کہا جاتا ہے جس کے لفظی معنی ہیں دروازہ۔ امام کے بعد اس کا رتبہ ہے۔ وہ امام سے براہ راست فیض حاصل کرتا اور اعیان دعوت کا سردار ہوتا تھا۔ اسماعیلیوں کے ہاں بھی "باب" کی اصطلاح موجود ہے۔ شیعوں کے فرقہ نصیریہ میں بھی باب کا تصور موجود ہے۔ وہ ہر دور میں باب کا وجود مانتے ہیں۔ اثنا عشریوں کی مذہبی تصانیف میں بالعموم ائمہ کرام کے بابوں کے نام مذکور ہوتے ہیں امام غائب محمد بن حسن عسکری کے بعد یکے بعد دیگرے چار باب ہوئے یہ ابواب اربعہ اور "ھو الاول والاخر والظاھر والباطن" کے مظاہر کہلاتے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں!

۱۔ ابوعمر عثمان بن سعید عمری۔ جس نے سب سے پہلے باب ہونے کا دعویٰ کیا۔

۲۔ ابوجعفر محمد بن عثمان ۔ ۳۔ ابوالقاسم الحسین بن روح نوبختی ۔ ۴۔ ابوالحسن علی بن محمد السمری۔

شیعہ اعتقاد کے مطابق پہلے باب کو خود امام غائب نے نامزد کیا تھا پھر ہر باب بعد کے باب کی نامزدگی کرتا رہا۔ امام غائب کی غیبت کے بعد سے تقریباً ستر برس کے عرصے کو جس میں یکے بعد دیگرے ابواب اربعہ موجود رہے امام کی غیبت صغریٰ کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ علی بن محمد السمری (م ۱۵ شعبان ۳۲۹ھ) کے بعد امام کی غیبت کبریٰ کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے کیونکہ اس آخری باب نے اپنا جانشین نامزد کرنے کے بجائے کہہ دیا تھا کہ اب خود امام غائب کا ظہور ہوگا۔ اس کے بعد "باب" کا لفظ شیعوں کے ہاں امام غائب کے سب سے بڑے پیرومختار کے لیئے استعمال ہونے لگا۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا ہے کہ 'باب' کی اصطلاح اہل تشیع کے ہاں پہلے سے موجود ہے اور اسی شیعہ اصطلاح کے مطابق علی محمد نے "باب" ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ ایک ایسا دروازہ ہے جس سے گذر کر لوگ بارہویں امام کا علم حاصل کریں گے۔ آگے چل کر باب نے "مہدی" ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا۔ رفتہ رفتہ اس کے پیروؤں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ اپنے مذہب کو پھیلانے اور اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیئے بابیوں نے مسلح اقدامات بھی شروع کر دیئے۔ حتیٰ کہ شاہ ایران ناصر الدین شاہ قاچار پر قاتلانہ حملے تک سے گریز نہ کیا۔ جس کے نتیجے میں بابیوں کو سخت تشدد کا نشانہ بننا پڑا۔ باب نے چھ سال تک ایران کی سیاسی فضاء کو مکدر رکھا اور عین اس وقت جب وہ اپنے مذہب کی داغ بیل ڈال رہا تھا قتل ہو گیا۔ قتل ہونے سے ایک رات پہلے باب نے اپنے مریدوں کو "تقیہ" کی تلقین کی بلکہ یہاں تک کہا کہ کل جب

میرے متعلق تم سے پوچھا جائے تو تقیہ سے کام لینا، میرا انکار کردینا بلکہ مجھ پر لعنت بھیجنا کہ یہی تمہیں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ بالآخر باب کو ۱۸۵۰ء میں قاچاری علماء کے فتویٰ کی روشنی اور حکومت کے خلاف بغاوت کے الزام میں تبریز میں گولی کا نشانہ بنادیا گیا۔

بابی تحریک میں قرۃ العین طاہرہ نے بہت فعال حصہ لیا۔ یہ آتش بیان خطیبہ اور حسین و ذہین شاعرہ تھی۔ قرۃ العین کا اصل نام فاطمہ زرین تاج تھا۔ مشہور شیعہ عالم سید کاظم رشتی زرین تاج کے نام خطوں میں اسے ' قرۃ العین " کے لقب سے مخاطب کرتا تھا۔ سید علی محمد باب نے اسے طاہرہ کا لقب دیا۔ قرۃ العین ' ایک مشہور شیعہ عالم ملا صالح کی بیٹی تھی۔ اس کا چچا اور خسر ایران کا ایک مجتہد تھا۔ قرۃ العین کو تفسیر، حدیث اور فقہ کے علاوہ فلسفہ و الٰہیات کی بھی تعلیم دلائی گئی تھی جب اس نے کھلم کھلا بابی مذہب کی تبلیغ شروع کی تو ایک دنیا اس کی جادو بھری تقریروں پر شیدا ہوئی۔ بالآخر قرۃ العین بھی ۱۲۶۴ھ/۱۸۵۲ء میں موت کے گھاٹ اتاردی گئی۔ بہائی اس کی یاد میں تقاریب منعقد کرتے رہتے ہیں جن میں نام نہاد مسلمان دانشور بھی قرۃ العین کی یاد میں آنسو بہاتے، ٹھنڈی آہیں بھرتے اور اس کی عظمت کے گن گاتے نظر آتے ہیں۔

سید علی محمد کا جانشین مرزا یحییٰ بنا جو "صبح ازل' کے لقب سے مشہور ہوا یہ بابیوں پر ظلم وستم کی وجہ سے پہلے بغداد اور پھر "ایڈریا نوپل" چلا گیا۔ صبح ازل بہت کم آمیز اور امن پسند شخص تھا۔ اس کے بعد صبح ازل کے بھائی مرزا حسین علی نوری (جو بہاء اللہ کے لقب سے مشہور ہوا۔) نے بھی بغداد کا رخ کیا وہاں اس نے بابی مذہب میں بعض ترامیم کیں ان کی وجہ سے ایک نیا مذہب وجود میں آگیا جو بہاء اللہ کی نسبت سے "بہائی" مذہب" کہلایا۔ اب بابی دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ صبح ازل کے نام کی نسبت سے "ازلی" اور دوسرا بہاء اللہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے "بہائی" مشہور ہوا۔ "ازلی" فرقہ کو فروغ حاصل نہ ہوسکا جبکہ "بہائی مذہب" ایشیا، یورپ اور امریکہ میں خوب پھیلا۔

بابی مذہب کے عقائد

بابیوں کے نزدیک خدا ایک ہے اور باب اس کا آئینہ ہے جس میں خدا کا پرتو نظر آتا ہے ہر عقیدت منداس کے ذریعے خدا کو دیکھ سکتا ہے۔ پہلی شریعت کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اب بابی شریعت کا آغاز ہوتا ہے اس میں نماز روزے کی پابندی ختم اور روزے بھی سال کے انیس ہیں۔ باب نے آزادی نسواں کو نئے مذہب کا اہم رکن بتایا۔ اس کی ایک تصنیف "بیان" میں اس

کے مذہبی عقائد تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ان ہی عقائد کی بناء پر موسیو ہوارث نے اپنے مقالہ "بابیت" میں لکھا ہے کہ باب نے اسلام میں اصلاح کے نام سے ایک نئے دین کی تشکیل کی ہے جس کے عقائد و اصول علیحدہ ہیں اور اس کو نئی سوسائٹی اور ہیئت اجتماعیہ کے منشور کے طور پر پیش کیا ہے۔ مرزا علی محمد روز آخرت اور بعد از حساب دخول جنت و جہنم پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔اس کا دعویٰ تھا کہ روز آخرت سے ایک جدید روحانی زندگی کی جانب اشارہ کرنا مقصود ہے۔وہ بالفعل ذات خداوندی کے اس میں حلول کرانے پر اعتقاد رکھتا تھا۔رسالت محمدی ﷺ اس کے نزدیک آخری رسالت نہ تھی۔وہ کہتا تھا کہ ذات باری مجھ میں حلول ہے اور میرے بعد آنے والوں میں بھی حلول کرتی رہے گی گویا حلول الوہیت وہ اپنے لیے مخصوص نہیں ٹھہراتا تھا۔وہ ہندسوں کی تاثیر کا قائل تھا۔انیس کا ہندسہ اس کے نزدیک خصوصی مرتبہ کا حامل تھا۔اس کا دعویٰ تھا کہ وہ تمام انبیاء سابقین کی نمائندگی کرتا ہے وہ مجموعہ رسالات ہے اور اس اعتبار سے مجموعہ ادیان بھی ہے۔

بنابریں فرقہ بابیت۔یہودیت،نصرانیت،مجوسیت،باطنیہ اور شیعیت کا معجون مرکب ہے۔

بہائیت

دراصل بہائیت بھی بابیت ہی کی ایک ترمیم شدہ شکل ہے اور بابیوں کی واضح اکثریت نے بہاء اللہ کی قیادت کو تسلیم کر کے "بہائی مذہب" قبول کر لیا ہے۔جب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ "بابیت" نے شیعیت سے جنم لیا تو لازمی بات ہے کہ "بہائیت" کا سرچشمہ بھی مذہب شیعہ ہی ہے۔بلکہ اسلام میں اکثر گمراہ فرقے "باب شیعہ" ہی سے داخل ہوئے ہیں۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ!

"اسماعیلیہ،باطنیہ اور نصیریہ ایسے گمراہ فرقے اسلام میں شیعہ کے دروازہ سے داخل ہوئے ہیں۔کفار و مرتدین بھی شیعہ کی راہ پر گامزن ہو کر اسلامی دیار و بلاد پر چھا گئے۔"

علامہ محب الدین خطیب اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اگر شیخ الاسلام ابن تیمیہ عصر حاضر تک بقید حیات رہتے تو انہیں یہ ارشاد فرمانے میں کوئی باک نہ ہوتا کہ شیخیت،کشفیت اور بہائیت شیعہ مذہب کی کرشمہ سازی کا نتیجہ ہے اور یہ۔۔۔ یہ روایات ہی سے استدلال کر کے جادۂ مستقیم سے بھٹک گئے ہیں۔" (المنتقی صفحہ ۳۱)

مرزا حسین علی نوری (بہاء اللہ) بن مرزا عباس المعروف بہ مرزا بزرگ ایران کے قصبہ نور کا رہنے

والا ہے۔ اس کے پیرو اسے عام طور پر جمال قدم کے نام سے یاد کرتے ہیں اسے بہاء اللہ کا لقب اس کے مقتدا علی محمد باب نے دیا تھا۔

بہاء اللہ کی پیدائش ۲ محرم ۱۲۳۳ھ/۱۲ نومبر ۱۸۱۷ء تہران میں ہوئی جبکہ وفات ۲ مئی ۱۸۹۲ء کو عکہ (فلسطین) میں ہوئی۔ باب نے اپنے بعد ایک ایسے شخص کی بعثت کی خبر دی تھی جسے اس نے "من یظہرہ اللہ" کا نام دیا تھا اور ایک بیان میں اس کا زمانہ بہت ہی قریب بتایا تھا۔ آخر بابیوں میں سے ایک شخص "جناب دیان" "مرزا اسد اللہ خوئی" نے "من یظہرہ اللہ" کا دعویٰ کر دیا۔ لیکن مرزا یحییٰ (صبح ازل) اور مرزا حسین علی (بہاء اللہ) نے اس کی شدید مخالفت کی۔ یہ شخص سریانی اور عبرانی زبانیں بھی جانتا تھا۔ اس کے بعد یہ قتل ہو گیا۔ اس کے پیرو "اسدی" کہلاتے ہیں۔ "جناب دیان" کے بعد اور بہت سے بابیوں نے بھی "من یظہرہ اللہ" کے مصداق ہونے کا دعویٰ کیا۔ پھر ۱۸۶۷ء میں بہاء اللہ نے "من یظہرہ اللہ" کا دعویٰ کر دیا۔ صبح ازل اور دوسرے بابیوں نے اس دعوے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن بابیوں کی اکثریت نے اسے تسلیم کر لیا۔ بہاء اللہ کی وفات (۱۸۹۲ء) کے بعد تحریک دو حصوں میں بٹ گئی۔ دونوں حصوں کی قیادت بہاء اللہ کے دو بیٹوں کے ہاتھ میں آئی۔ ا۔ عبد البہاء عباس آفندی کے پیرو جنہیں ان کے مخالفین مدعین کہتے ہیں۔ ۲۔ محمد علی کے پیرو جنہیں ان کے مخالف "ناقضین" کہتے ہیں۔ یہ اختلاف اسی قسم کا تھا جس طرح باب کے بعد اس کی جماعت "ازلیوں" اور "بہائیوں" میں تقسیم ہو گئی تھی۔

عبد البہاء نے گدی سنبھالنے کے بعد امریکہ میں اپنے "مسیح اور ابن اللہ" ہونے کا اعلان کیا اور ہندوستان میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ زرتشتی مذہب کا بہرام موعود وہی ہے۔ اس کے مرید اسے بہاء اللہ کی تحریرات کا مستند شارح، ترجمان، اس کا حقیقی جانشین، میثاق کا مرکز اور بہائی زندگی کا مثالی نمونہ سمجھتے ہیں ۱۹۱۰-۱۹۱۱ء میں عبد البہاء نے مصر، پیرس، لندن، امریکہ اور یورپ کا تبلیغی دورہ کیا۔ ۱۹۲۰ء میں برطانوی حکومت نے اسے کے۔ بی۔ ای۔

(KINGHT OF THE ORDER OF BRITISH EMPIRE)

کا خطاب دیا۔ عبد البہاء نے بہاء اللہ کے بعد انتیس برس تک بہائی دنیا کی قیادت کی اور ۲۸ نومبر ۱۹۲۱ء کو حیفہ (فلسطین) میں وفات پائی اور باب کے مقبرے میں اس کی قبر کے پاس دفن ہوا۔ یہ مقبرہ ۱۹۵۷ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ عبد البہاء کی نرینہ اولاد نہ تھی صرف تین لڑکیاں تھیں چنانچہ اس

نے اپنی وصیت میں اپنے نواسے شوقی آفندی کو اپنا جانشین اور ولی امر اللہ مقرر کیا۔ ۱۹۵۷ء میں شوقی آفندی کے لاولد مرجانے کے بعد ستائیس بہائی بزرگ "ایادی امر اللہ" وارثان وولیان مقرر ہوئے۔ پھر ۱۹۶۳ء میں بہائیت کے جملہ امور کی نگرانی اور قانون سازی کا عالمی ادارہ "بیت العدل اعظم" حیفہ (فلسطین) میں قائم کردیا گیا۔

بہائی تحریک اپنے سرپرستوں کے دیس امریکہ، روس اور برطانیہ کے دورافتادہ علاقوں تک پھیل گئی۔ مختلف شہروں میں اس کے بڑے بڑے مراکز ہیں خصوصاً امریکہ میں شکاگو کا مرکز نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ چونکہ یہ تحریک ایران سے اٹھی تھی اس لیے ایران میں زیادہ کامیابی سے چلی اور شاہ ایران کے دور میں اس گروہ کو بہت عروج حاصل رہا حتی کہ وزارت عظمی سمیت بہت سے کلیدی مناصب پر اس گروہ کے افراد فائز رہے۔ شاہ کے دور میں امیر عباس ہویدہ وزیراعظم اسی مذہب کا پیرو تھا۔

بہائی عقائد

بہاءاللہ کے بارے میں بہائی کچھ اس قسم کا تصور رکھتے ہیں کہ گویا بہاءاللہ خود خدا تھا جو انسانی شکل اور انسانی حوائج کے ساتھ ظہور پذیر ہوا۔ بہائی لٹریچر میں پہلے انبیاء کو بھی "ظہور الٰہی" قرار دیا گیا ہے اور خود بہاءاللہ بھی خدا تھا جس نے انسانیت کا جامہ پہن لیا۔ بہاءاللہ نے "لوح اشراقات" میں معصومیت کی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دوسری قسم کی معصومیت وہ ہے جس کے بارے میں قرآن مجید میں ہے "لا یُسْـَٔلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْـَٔلُوْنَ" (الانبیاء ۲۳) قرآن مجید میں اسے صفات الٰہیہ میں سے قرار دیا گیا ہے اور بہاءاللہ کو یہی معصومیت حاصل تھی کیونکہ بہاءاللہ کو "من یظهره الله" ہونے کا دعویٰ تھا اور باب نے "من یظهره الله" کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ "لا یسئل عما یفعل" کا مصداق ہوگا، وہ زندگی کا میدان ہے، وہ اللہ ہے، تمام الٰہی صفات واسماء کا وہ منبع ہے، وہ خود ہی ذاکر اور خود ہی مذکور تھا۔ اسی طرح بہاءاللہ نے خود کو مکلم طور (جو طور پر بولا) کہا ہے۔ بہائیوں کی بہت بڑی تعداد اس کا یہی مقام مانتی ہے۔

امریکہ میں بہائی مذہب کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا مبلغ ڈاکٹر ابراہیم جارج خیر اللہ جسے عبدالبہاء نے بہاءاللہ کا پطرس اور دوسرا کولمبس قرار دیا۔ ڈاکٹر خیر اللہ کے نزدیک بہاء اللہ خود خدا تھا۔ (BAHA WAS GOD HIMSELF) ڈاکٹر خیر اللہ نے بتایا کہ ۱۸۵۲ء میں خدائے مجسم یعنی بہاءاللہ ظاہر ہوا۔ امریکہ میں بہائی بننے کے لیے جو "بیعت فارم"

شائع کیا گیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"اے اعظم (عبدالبہاء) خدا کا نام لے کر میں بڑی عاجزی کے ساتھ اپنے خالق برتر و توانا خدا کی توحید کا اقرار کرتا ہوں اور خدا کے انسانی شکل میں ظاہر ہونے پر میرا ایمان ہے۔"

بہائیوں کے نزدیک باب اور بہاء اللہ کی آمد پر بعثت انبیاء کا دور جو آدم سے شروع ہوا تھا ختم ہو گیا۔ بہائی مذہب کے مطابق نجات اب گذشتہ شریعتوں پر عمل کرنے سے نہیں بلکہ بہائی مذہب پر عمل کرنے سے ملے گی۔ بہائیوں میں اجتماعی عبادت کی کوئی صورت نہیں پائی جاتی لیکن کتاب المقدس میں "مشرق الاذکار" (وہ جگہ جہاں صبح صادق کے وقت اسم الٰہی کا ذکر کیا جائے) تعمیر کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ اس کے نقشے کے بارے میں یہ ہدایت موجود ہے کہ وہ مدور ہو جس کے اوپر نو حصوں پر مشتمل ایک بڑا گنبد بنایا جائے۔ ۱۰ مئی ۱۹۱۲ء کو عبدالبہاء نے شکاگو کے قریب جھیل مشی گن کے کنارے ولمیا میں ایک "مشرق الاذکار" کا سنگ بنیاد رکھا جس کا افتتاح ۲ جون ۱۹۵۳ء کو ولی امر اللہ شوقی آفندی کی امریکن بیوی کی موجودگی میں ہوا۔ اس سے پہلے ۱۹۰۲ء میں بھی عشق آباد (روس) میں ایک "مشرق الاذکار" تعمیر ہوا تھا۔

بہائی شریعت کے مطابق بلا امتیاز مذہب و ملت بلکہ مشرکین سے بھی شادیاں جائز ہیں۔ قبلہ عکہ (فلسطین) ہے، روزے انیس جو طلوع شمس سے غروب شمس تک ہوتے ہیں۔ انیس کے عدد کو بڑی اہمیت، عظمت اور تقدس حاصل ہے۔ بہائی تعلیمات میں اخفائے راز کو ہمیشہ اہمیت دی گئی ہے۔ "ذهبك، ذهابك و مذهبك" یعنی اپنی دولت، اپنے سفر کی منزل مقصود اور اپنے مذہب کے چھپانے کی تلقین پائی جاتی ہے۔

بابی مذہب میں ولی امر اللہ کا عہدہ موروثی ہے لیکن باب کے بعد لازماً اس کے بڑے بیٹے کو اس کا جانشین نہیں بنایا جاتا بلکہ وہ اپنی زندگی میں اپنے خاندان کے کسی فرد کو اس عہدے کے لیے نامزد کر دیتا ہے۔ بہر حال یہ ضروری ہے کہ بہائی مذہب کا رئیس اعلیٰ ہمیشہ بانی مذہب بہاء اللہ کی اولاد میں سے ہو اور اس خاندان کا اقتدار اعلیٰ ہمیشہ قائم رکھا جائے۔ وہ نظم و نسق سے اس پورے نظام کو "منزل من اللہ" خیال کرتے ہیں اور "بیت العدل" کے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں کام کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ایسے امور میں جو بہائی مذہب میں موجود نہیں اللہ تعالیٰ "بیت العدل" کو الہام کریگا۔ گویا "بیت العدل" شریعت بھی بنا سکتا ہے

اور ضرورت کے مطابق ترمیم و تنسیخ بھی کر سکتا ہے۔

بہائی عقائد کے مطابق بہاء اللہ خدا کا مظہر مکمل ہے۔ بہاء اللہ تمام سابقہ انبیاء کے موعود و ظہور الٰہی ہیں۔ بہاء اللہ پر وحی نازل ہوتی رہی جس کا مجموعہ "ایقان" ہے۔ بہاء اللہ دیگر انبیاء کی طرح معصوم ہے۔ بہاء اللہ کی نماز مطالعہ ایقان ہے جو دن میں دو بار لازمی ہے۔ بہائی شریعت میں گیارہ سال سے بیالیس سال تک انسان احکام شرعی کا مکلف رہتا ہے پھر پابندیاں اٹھ جاتی ہیں۔ وضو فرض نہیں ہے۔ مستحب ہے۔ عورتوں پر نظر جائز ہے کوئی پردہ نہیں۔ جس گھر میں بانی مذہب کی ولادت ہوئی ہے اس کی زیارت واجب ہے۔ جماعت کی نماز صرف جنازہ میں مشروع ہے۔ ایمان کے بعد کوئی چیز نجس نہیں بلکہ محض مذہب بابی کی پیروی سے انسان طاہر ہو جاتا ہے پھر کبھی گندہ نہیں ہوتا بلکہ جس چیز کو اس کا ہاتھ لگ جاتا ہے وہ بھی طاہر ہو جاتی ہے پانی ہمیشہ طاہر و مطہر رہتا ہے بہائیوں کا قانون میراث بھی علیحدہ ہے۔ گویا بہائیت کی شکل میں انہوں نے ایک نئی شریعت وضع کی ہے۔

{بحوالہ تاریخ اسلامی جمہوریہ ایران، تاریخ ایران از مقبول بیگ بدخشانی، تاریخ دعوت و عزیمت جلد اول}

بہائی مذہب کی عیدیں

بہائی سال میں پانچ عیدیں مناتے ہیں۔

۱۔ ظہور بہاء اللہ پر عید رضوان یہ باغ جس میں بہاء اللہ نے قسطنطنیہ جاتے ہوئے بارہ دن قیام کیا "باغ رضوان" کے نام سے مشہور ہے۔ ان ہی ایام میں بہاء اللہ نے "من یظهره اللہ" کا دعویٰ کیا تھا اور یہ ایام ان کے ہاں عید رضوان کہلاتے ہیں۔

۲۔ عید بعثت باب۔ ۳۔ عید میلاد بہاء اللہ ۴۔ عید میلاد باب۔

(ممکن ہے کہ اہل بدعت نے "عید میلاد النبیؐ" کی اصطلاح بھی بہائیوں سے اخذ کی ہو)

۵۔ عید نوروز۔۔۔ بہائیوں کو انیس دن کے روزے رکھنے کے لیے کہا گیا ہے یعنی بابی تقویم کے ماہ اعلیٰ میں جو ۲ مارچ سے شروع ہو کر ۲۱ مارچ کو ختم ہو جاتا ہے جب بہائیوں کی عید نوروز ہوتی ہے۔ {بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد نمبر ۵ تحت بہاء اللہ اور بہائیت}

گویا اہل تشیع اور بہائی دونوں گروہ ان ہی ایام میں عید نوروز مناتے ہیں۔

عید نوروز کی حقیقت

لغت میں نوروز کے معنی ہیں۔۱۔سال کا پہلا دن ۲۔ایرانیوں کا قومی جشن۔(فیروز اللغات اردو صفحہ ۱۴۰۱) جبکہ فیروز اللغات فارسی میں "نوروز" کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ "ماہ فیروز" کی پہلی تاریخ جس روز سورج نقطہ حمل پر آتا ہے۔یہ ۲۱ مارچ کے مطابق ہوتی ہے اور یہ ایرانیوں کا عید کا دن ہے۔ (فیروز اللغات فارسی ۵۱۴)

"نوروز" کے معنی نیا دن یا روز نو کے ہیں یعنی وہ دن جس سے نیا سال شروع ہوتا اور آفتاب برج حمل میں آتا ہے۔مارچ کی بیسویں یا اکیسویں تاریخ۔مگر فارس والے دونوں روز مانتے ہیں۔ایک نوروز عامہ اور دوسرا نوروز خاصہ۔

نوروز عامہ!

فارسی فیروردین مہینے کا پہلا روز ہے کیونکہ اس روز آفتاب برج حمل کے اول نقطہ میں آتا ہے۔موسم بہار کا شروع ۔ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اسی دن دنیا کو پیدا کیا اور اسی روز ساتوں سیارے اوج تدویر میں تھے اور سب اوج حمل کے نقطہ اول میں تھے اس روز سیاروں کو حکم ہوا کہ دورہ اور حرکت شروع کریں اور اسی روز خدا تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا کیا۔پس اسی وجہ سے اس روز کو "نوروز" کہتے ہیں۔

بعض لوگوں کا بیان ہے کہ جمشید (شاہ ایران) جسے پہلے صرف "جم" کہتے تھے دنیا کی سیر و سیاحت کر رہا تھا جب آذر بائیجان میں پہنچا تو اس نے حکم دیا کہ ایک مرصع و زرنگار تخت کسی اونچی جگہ پر شرق رو بچھائیں۔چنانچہ جب وہ تخت بچھا تو خود تاج مرصع پہن کر اس پر بیٹھا جوں ہی آفتاب نکلا اس کا عکس تاج و تخت پر پڑا جس کے سبب سے وہ تاج و تخت جگمگا اٹھے لوگ یہ کیفیت دیکھ کر خوش ہوئے اور کہا یہ "روز نو" ہے۔چونکہ پہلوی زبان میں "شید" کا معنی شعاع آتا ہے پس "جم" کے نام میں "شید" کا لفظ اور بڑھا دیا اور اب شاہ ایران کو بجائے "جم" کے "جمشید" کہنے لگے۔شاہ ایران نے اس دن بڑا بھاری جشن کیا چنانچہ اس روز سے مجوسیوں میں یہ رسم پڑ گئی اور ہمیشہ کے واسطے آج کا دن یوم عید تصور ہونے لگا۔

نوروز خاصہ!

وہ دن ہے جسے یوم خرداد کہتے ہیں یہ فارسی فیروردین مہینے کی چھٹی تاریخ ہوتی ہے۔اس

دن بھی جمشید تخت پر بیٹھا اور خاصان شاہی کو بلا کر عمدہ عمدہ رسمیں جاری کیں اور کہا کہ خدا تعالیٰ نے آج ہی کے روز تمہیں پیدا کیا ہے۔ مناسب ہے کہ پاکیزہ پانی سے غسل کرو اور خوب نہاؤ دھوؤ اور اس کے شکر میں نماز و سجود سے مشغول ہو اور ہر سال اسی طرح سے آج کے دن عمل کیا کرو پس اسی وجہ سے اس روز کا نام "نوروز خاصہ" رکھا گیا کہتے ہیں کہ اکاسرہ (کسریٰ کی جمع) یعنی نوشیروان کی اولاد اور اس کے خاندان والے ہر سال نوروز عامہ سے نوروز خاصہ تک۔ جس کے چھ روز ہوتے ہیں لوگوں کی مرادیں پوری کرتے، انعام و اکرام دیتے، قیدی چھوڑتے، مجرموں کے گناہ معاف کرتے اور عیش و نشاط میں مشغول رہ کر عید منایا کرتے تھے۔ دہلی کے شاہان مغلیہ بھی آج کے روز خوشی مناتے اور انڈے لڑایا کرتے تھے۔

ستائے گی بہت اب کے برس ہم کو شب فرقت سنا ہے کہ چڑھ کے پشت فیل پر نوروز آیا ہے

{بحوالہ فرہنگ آصفیہ صفحہ ۶۰۰ جلد ۴ از مولوی سید احمد دہلوی}

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ عید نوروز کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ ایران کا ایک قومی تہوار ہے جو شروع میں ساسانی بادشاہ کی تاج پوشی کی خوشی میں منایا گیا تھا اور بعد میں مجوسیوں نے اسے ہر سال یوم عید قرار دے دیا۔ جسے اب اہل تشیع نے باقاعدہ مذہبی لبادہ اوڑھا دیا۔ چنانچہ شیعہ کی مقبول اور مستند کتاب "تحفۃ العوام" میں ایک باب قائم کیا گیا ہے جس کا عنوان ہے کہ "باب اٹھائیسواں بیان میں اعمال نوروز کے" اس کے تحت مؤلف لکھتا ہے کہ!

"منقول ہے کہ نوروز کے دن روزہ رکھنا، غسل کرنا، پاکیزہ کپڑے پہننا اور خوشبو لگانا سنت ہے اور جب نماز ظہر و عصر سے فارغ ہو چار رکعت نماز پڑھے۔ ہر دو رکعت میں ایک سلام اگر یہ نماز امکان میں نہ ہو تو دعا پڑھ لے اور جب نماز و دعا پڑھے تو گناہانِ پنجاہ سالہ بخشے جائیں گے۔"

{تحفۃ العوام صفحہ ۲۷۰}

اہل تشیع اور بہائی پاکستان میں بھی یہ دن بڑی دھوم دھام کے ساتھ مناتے ہیں بالخصوص صوبہ سرحد میں۔ ہنگو میں اس موقع پر فسادات بھی رونما ہوتے رہتے ہیں۔ عید نوروز کے سلسلے میں روزنامہ پاکستان کی ایک خبر ملاحظہ فرمائیں۔

"ٹانک میں جشن نوروز عقیدت و احترام سے منایا گیا"

تحریک جعفریہ کے زیر اہتمام جشن نوروز عالم افروز نہایت عقیدت و احترام سے منایا

ایسی جماعت کی مذہبی تقریب میں شرکت کی جس کا کفر قادیانیوں کی طرح اظہر من الشمس اور غیر مختلف فیہ ہے۔ بہائی فرقہ کے مذہبی عقائد مختصراً پیچھے گذر چکے ہیں لیکن اسی شمارہ کا ایک مزید اقتباس ملاحظہ فرمائیں!

"اسلام کی مقدس کتاب قرآن مجید چھ ہزار چھ سو کے قریب آیات پر مشتمل ہے جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ نے تیئس سال کے عرصہ میں نازل فرمایا۔ لیکن بہاءاللہ کے دور میں نوع بشر کے لیئے وحی الٰہی اس کثرت کے ساتھ نازل ہوئی کہ لگ بھگ ایک گھنٹہ کے دوران حضرت بہاءاللہ کوئی ایک ہزار آیات لکھوا دیتے۔" {نجات صفحہ ۱۷۔ دسمبر ۱۹۹۷ء}

بہائی اپنی مذہبی کتاب "کتاب الاقدس" کو قرآن کریم کی جگہ مذہبی کتاب مانتے ہیں اور اس کے کلمات کو "آیات" کہتے ہیں بہاءاللہ کی شان میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہر شے میں آج نور بہاء کا ظہور ہے ہر ذرہ آفتاب ہے ہر کوہ طور ہے
دنیا کے گوشے گوشے میں ہے گونج ہر طرف آوازہ جمال قدم نفخ صور ہے
برکات کا مخزن ہے کیا نام بہاءاللہ توحید کا مرکز ہیں احکام بہاءاللہ
مشعل ہے محبت کی مصدر ہے محبت کا آغاز بہاءاللہ، انجام بہاءاللہ
تفریق مشارب کو عالم سے مٹا ڈالا اب گردش پیہم میں ہے جام بہاءاللہ
آزادی نسواں ہے انعام بہاءاللہ ہو صبح بہاءاللہ یا شام بہاءاللہ
جاری ہیں زمانے میں ہر فرد بشر پہ کیا افضال بہاءاللہ اکرام بہاءاللہ

{ماہنامہ نجات۔ اگست ستمبر ۱۹۹۴ء}

بہاءاللہ کی تصانیف میں سے ایک کتاب "کتاب الایقان" بھی ہے ایک پنجابی شاعر اپنی نظم بعنوان "ایقان دے جلوے" میں اسے یوں خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

ملی انسانیت نوں روشنی کامل محبت دی
تعصب چھڈ کے دیکھے تے کوئی انسان دے جلوے
دکھاوے برکتاں والی اور بارض قدس دی
مقدر بن گئے جس دا تیرے فیضان دے جلوے

جمال اقدس بہائی دی بعثت ہے ظہور حق
کہ اس چہرے تھیں چمکے نیں رخ رحمان دے جلوے
بنی آدم دے سب روگاں دا دارو بن کے آئے نیں
بہائی دین دی صورت خدائی شان دے جلوے
ریاض اجڑے ہوئیاں نوں بخش دے نیں زندگی تازہ
کدے قرآن دے جلوے کدے ایقان دے جلوے

(ماہنامہ نجات اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴)

اس تفصیل سے بہائی مذہب اور بہائیوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بہائیت نے "شیعیت" کی کوکھ سے جنم لیا۔ باب کی تعلیم و تربیت شیعہ مراکز و مدارس ہی میں ہوئی۔ بالفاظ دیگر بہائی تحریک بھی شیعیت کی طرح ایک صیہونی تحریک ہے۔ جس طرح صیہونیت کو عبداللہ بن سباء نے اسلامی لبادہ اوڑھا کر شیعیت کی شکل میں پیش کیا اور بڑی تیاری سے اس کی بنیاد صیہونی افکار و عقائد پر رکھی یہی وجہ ہے کہ شیعیت کے تمام تر عقائد مثلاً امامت، بارہ امام، تورات و زبور کی تعلیم کی اتباع و تبلیغ، تابوت سکینہ، انبیائے بنی اسرائیل کا ترکہ، باغ فدک، امام مہدی کی رجعت اور تورات کے احکام کی روشنی میں یوم حشر تک دنیا پر حکمرانی وغیرہ صیہونیت ہی سے ماخوذ ہیں اور اسی یکسانیت اور ہم آہنگی کا یہ نتیجہ ہے کہ ایران اور اسرائیل کے درمیان عالم اسلام کے خلاف ہمیشہ گہرے روابط رہے ہیں۔

بہائیت کے آغاز، محرکات، عقائد و اعمال اور سرگرمیوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض مذہبی لبادے میں اسلام اور عالم اسلام کے خلاف صیہونی منصوبوں کی تکمیل کی ایک کڑی ہے یہ صیہونی منصوبے ہی ہیں جو ایک طرف تو عالمی تنظیم فری میسن، روٹری کلب، لائنز کلب، این جی اوز، غیر مسلم مشنری اداروں، فحش جنسی لٹریچر اور استشراق و تحقیق کے نام نہاد اداروں کی شکل میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا باعث بن رہے ہیں اور دوسری طرف سبائیت، بہائیت، قادیانیت، شیعیت اور کئی دیگر فرقوں کی صورت میں اسلام کے بالمقابل اور ایک متوازی دین و شریعت متعارف کرا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں بہائیت کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا اور ان ممالک نے اس تحریک کی اس لیئے حمایت کی کہ اس سے اسلامی اصول و قواعد کی تخریب

ہوئی ہے کیونکہ انہیں ہر اس بات اور کام سے دلچسپی ہوتی ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہو۔

۱۹۷۵ء میں عرب لیگ نے بھی ایک قرارداد کے ذریعے اسلامی ممالک کی توجہ بہائیت کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کی طرف مبذول کرائی تھی جس میں یہ کہا گیا ہے کہ "بہائی فرقہ کے بارے میں ایسے قطعی شواہد مل چکے ہیں کہ وہ درپردہ عالم عرب اور مسلمانوں کے خلاف اسرائیل اور صیہونیت کا آلہ کار ہے اور اسرائیل میں قائم کردہ اپنے مرکز کے ذریعے پورے عالم عرب میں سازشوں کا جال بچھا رہا ہے۔ یہ لوگ اسرائیل کی مالی مدد بھی کرتے ہیں۔ قرارداد میں بہائیت کو قطعی غیر اسلامی صیہونی فرقہ قرار دیتے ہوئے "بلیک لسٹ" میں شامل کر دیا گیا ہے اور عرب ممالک میں اس کی تمام سرگرمیوں پر پابندی لگانے کا کہا گیا ہے۔ عرب پریس اور علمی و سیاسی شخصیتوں نے اس قرارداد کا بجا طور پر زبردست خیر مقدم کیا ہے۔ سعودی عرب اور رابطہ عالم اسلامی نے اس بروقت تنبیہ پر عرب لیگ کے جنرل سیکرٹری اور برسر پیکار عرب اداروں کو مبارکباد دی ہے۔

اس سے قبل پچھلے سال مکہ مکرمہ میں دنیا بھر کی اسلامی تنظیموں نے بھی اپنے اجلاس اپریل ۱۹۷۴ء میں بہائیت کے بارہ میں ایسی ہی واضح اور غیر مبہم قرارداد میں مسلمانوں سے مطالبہ کیا تھا کہ بہائی تنظیم کے تمام مراکز، لٹریچر اور سرگرمیوں پر پابندی لگائی جائے۔ اس اجلاس میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت اور ان سے کلی مقاطعہ کرنے کی وہ تاریخی قرارداد بھی پاس ہوئی تھی جو بعد میں قادیانی تحریک کے دوران مسلمانوں کے کاز کو تقویت پہنچانے کا باعث بنی۔ عرب پریس بہائیت کے بارہ میں اس قرارداد پر بحث کرتے ہوئے اس فرقہ کی بہت سے صیہونی اور اسلام دشمن سرگرمیوں سے پردہ اٹھا رہا ہے۔" (اسلام اور عصر حاضر صفحہ ۳۲۸)

چند سال قبل جناب بشیر احمد صاحب کی ایک کتاب "بہائیت اسرائیل کی خفیہ سیاسی تنظیم" شائع ہوئی ہے اس کتاب پر محترم پروفیسر سید ذوالکفل بخاری صاحب زوردار اور جاندار مبنی بر حقیقت تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ!

"بہائیت اس وقت ایک عالمی تحریک ہے اور ایک مستقل مذہبی وحدت جس کے اپنے شرعی، اعتقادی، فکری، عملی اور تنظیمی دوائر ہیں اور اپنے ہی نظامات جو باہمی اور داخلی طور پر حد درجہ مربوط اور اپنی اپنی جگہ حد درجہ فعال ہیں۔ قادیانیت اور بہائیت میں پائی جانے والی گہری مماثلت، فکر اشتراک، زمانی اور مکانی قرب، طریقہ واردات میں یکسانیت، باہمی رابطہ و تعاون

اور مشترک سرپرستوں کی طرف سے ان کی مسلسل اور مکمل سرپرستی ایسے حقائق ہیں جو ہمیں بعض متعین، قطعی اور حتمی نتائج تک لے جاتے ہیں۔ روس، برطانیہ اور فرانس کی ساختہ پرداختہ بہائیت نے اپنے آقاؤں کے مفادات کا تحفظ کیوں کر کیا؟ اسرائیل کے قیام کی راہ کیونکر ہموار کی؟ پوری دنیا میں اپنی سرگرمیوں کو کس انداز میں منظم کیا؟ بہائیت کن کن داخلی اور خارجی بحرانوں سے دوچار ہوئی؟ آج کل پاکستان سمیت دنیا کے کس کس ملک میں بہائی سرگرم عمل ہیں؟ ان سب سوالوں کے جواب اس ایک کتاب میں آ گئے ہیں۔ (ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان صفحہ ۴۷ ستمبر ۱۹۹۴ء)

علاوہ ازیں روزنامہ خبریں لاہور نے بھی ۸ مارچ ۱۹۹۸ء کے اداریتی نوٹ میں بہائی گروہ کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کا نوٹس لیا ہے اور بتایا ہے کہ ایران کے مذہبی انقلاب کے بعد بہائیوں کے بہت سے خاندان وہاں سے ترک وطن کر کے پاکستان کے مختلف حصوں میں آباد ہو گئے تھے جو رفتہ رفتہ منظم شکل اختیار کر گئے ہیں اور متعدد شہروں میں مراکز تعمیر کر کے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کرتے جا رہے ہیں حتیٰ کہ اس سال انہوں نے اپنی مذہبی کتاب "کتاب اقدس" کی رونمائی کی تقریبات بعض بڑے شہروں میں منعقد کی ہیں۔ جن میں پاکستان کی کچھ شخصیات نے بھی شرکت کی ہے۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بہائیوں نے انقلاب ایران سے بہت پہلے پاکستان میں اپنے مراکز قائم کر رکھے ہیں اور ایرانی انقلاب کے بعد شیعیت اور بہائیت دونوں کی سرگرمیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ اس پس منظر میں پاکستان جیسے ملک میں بہائیوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیاں فی الواقع باعث تشویش ہیں۔ سخت حیرت ہے کہ ملک کے دینی اور مذہبی حلقوں نے سادہ لوح مسلمانوں اور نوجوان نسل کو گمراہی سے بچانے کے لئے اس کا سنجیدگی سے کوئی نوٹس نہیں لیا اور نہ ہی اس کے انسداد اور تدارک کے لئے کوئی لائحہ عمل تجویز کیا ہے۔ فیا اسفا

عالی جاہ محمد کی تحریک

اوپر بہائیت کے عنوان کے تحت یہ ذکر گذر چکا ہے کہ یہ تحریک اپنے سرپرستوں کے دیس میں خوب پھیلی اور یورپی ممالک میں اس کے بڑے بڑے مراکز قائم ہوئے۔ امریکہ میں بہائی مذہب کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا مبلغ ڈاکٹر ابراہیم جارج خیر اللہ جسے عبدالبہاء (م ۱۹۲۱ء) نے بہاء اللہ کا پطرس اور دوسرا کولمبس قرار دیا ہے۔ اس کی مساعی اور کوششوں سے کثیر تعداد میں لوگوں نے بہائی مذہب قبول کر لیا اور شکاگو میں ایک بڑا مرکز قائم کرنے کے علاوہ

''مشرق الاذکار'' کے نام سے اپنی عبادت گاہ کا سنگ بنیاد (بدست عبدالبہاء) بھی رکھدیا۔ امریکہ میں اس جماعت کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ عبدالبہاء کے جانشین اور ولی امر اللہ شوقی آفندی نے ایک امریکی خاتون ''میری میکسویل'' (Mary Max Well) سے شادی بھی کرلی۔

اس طرح بابیت و بہائیت کے عقائد جو یہودیت، نصرانیت، مجوسیت، باطنیت اور شیعیت کا معجون مرکب ہیں امریکہ میں بھی پھیلنے لگے۔ ان عقائد میں ظہور مہدی، مظہر الٰہی اور نبوت کا جاری رہنا وغیرہ شامل ہیں۔ اس لئے ایک امریکی کو بھی یہ شوق چرایا کہ وہ بھی ان عقائد کا ملغوبہ پیش کر کے ایک نئی تحریک کی بنیاد رکھے۔ چنانچہ امریکہ میں اس نئی تحریک کا بانی عالی جاہ محمد ہے۔

یہ صاحب امریکہ میں مسلم سیاہ فام باشندوں کے رہنما مانے جاتے ہیں اور دنیا کے مشہور باکسر محمد علی کلے اسی مذہب کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ عالی جاہ محمد ۱۰۔ اکتوبر ۱۸۹۷ء میں جارجیا کے ایک پادری کے گھر پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۳ء تک وہ ایک پادری کی حیثیت سے عیسائیت کی تبلیغ کرتے رہے۔ ۱۹۲۵ء میں وہ ''ڈیٹرائٹ'' آئے جہاں انہوں نے تموتھی اور فارڈ کی تعلیمات کا مطالعہ کیا اور پھر اس فرقہ میں شامل ہو گئے۔ یہ فرقہ تموتھی کو ''نبی اور مظہر خدا'' مانتا ہے جبکہ ''فارڈ'' کو امام مہدی۔ ان کی مقدس کتاب وہ قرآن مقدس ہے جو تموتھی نے انجیل اور قرآن کو ملا کر مرتب کی تھی البتہ یہ لوگ نماز، روزہ، اور حج وغیرہ کے معتقد ہیں لیکن اسلام کی صحیح تعلیمات سے محروم ہیں۔

اس فرقہ کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ امریکہ میں سیاہ فام باشندوں کو غلام کی حیثیت سے یورپ والوں نے ۱۶۰۹ء میں لانا شروع کیا اور جب چالیس لاکھ کے قریب ہو گئے تو آبادکاری کا مسئلہ پیدا ہو گیا اور پھر ان کی درآمد بند کر دی۔ اب ان کی تعداد ایک کروڑ ہے۔ ان کو گورے باشندوں نے سیاسی اور اقتصادی غلامی کے سوا کچھ نہ دیا۔ ان کو کبھی برابر تصور نہ کیا جس کی وجہ سے سیاہ باشندوں نے تحریکیں چلائیں ۱۸۸۶ء میں تموتھی نے جو ایک قبیلہ کے سردار تھے۔ نبوت کا دعویٰ کیا اور سیاہ باشندوں کو ''مسلمان'' ہونے کی دعوت دی۔ انہوں نے انجیل اور قرآن کے واقعات کو جمع کر کے ایک کتاب تالیف کی جس کا نام قرآن مقدس رکھا۔ لیکن انہوں نے دعویٰ کیا کہ خدا نے یہ کتاب وحی کے ذریعے ان پر نازل کی ہے۔ انہوں نے اپنا نام بدل کر ''نوبل ڈریو علی'' رکھا۔ ان کی تبلیغ جاری تھی کہ ایک سیاہ فام ''کلاڈ گرین'' نامی نے بھی نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ دونوں میں لڑائیاں ہوتی رہیں۔ تموتھی کو کلاڈ گرین کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ جس روز تموتھی رہا

ہوئے اسی روز وہ "غائب" ہو گئے۔ پھر دونوں کے نظریات کو ہم آہنگ کر کے سیاہ فاموں۔
ایک نیا رہنما "ایس ڈبلیو فارڈ" کو بنایا انہوں نے ایک مسجد بھی بنائی۔ ۱۹۳۳ء میں وہ بھی اچانک
غائب ہو گئے۔ لوگوں نے ان کو "مہدی" کی طرح مان لیا کہ وہ واپس آئیں گے۔ فارڈ کی غیبت
یا گمشدگی کے بعد سیاہ باشندوں نے عالی جاہ محمد کو اپنا مذہبی رہنما مان لیا۔

(ماخوذ از کتاب محمد علی کلے بحوالہ ادیان عالم اور فرقہ ہائے اسلام کا تقابلی مطالعہ صفحہ ۱۲۹-۱۳۰)

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ عالی جاہ محمد کی تحریک بھی شیعیت اور بہائیت
کی ایک شکل ہے۔ ان کے عقائد و نظریات (مظہر الٰہی، نبوت، غیبت مہدی، ظہور مہدی اور رجعت)
شیعیت، باطنیت، بہائیت، یہودیت، مجوسیت اور بہائیت ہی سے ماخوذ ہیں۔

پہلوی عہد

پہلوی عہد ۱۹۲۵ء سے حالیہ ایرانی و خمینی انقلاب ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء تک شمار ہوتا ہے
اس عہد کے پہلے تخت نشین ہونے والے بادشاہ رضا شاہ پہلوی (۱۹۲۵ء تا ۱۹۴۱ء) ہیں
قاچاریوں کے برعکس رضا خان خالص ایرانی النسل تھے۔ وہ ۱۸۷۸ء میں صوبہ مازندران کے
ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد اور دادا ایرانی فوج میں ذمہ دار عہدوں پر فائز تھے۔ دادا
نے افغانوں کے خلاف جنگ میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں اور والد مازندران میں مقیم فوج
کے کمانڈنگ افسر تھے۔ قاچاری دور کے آخر میں ملک میں افراتفری کا عالم تھا اور یہ ملک اب کسی
"مرد غیب" کا منتظر تھا۔ آخر یہ مرد غیب اعلیٰ حضرت رضا شاہ پہلوی کی صورت میں ظاہر ہوا۔
دوسری جنگ عظیم کے موقع پر انگریز اور روس کے اتحادیوں نے اپنے مفاد کی خاطر
رضا شاہ کو اپنے بیٹے کے حق میں دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں رضا شاہ اپنے
بیٹے کے حق میں دست بردار ہو کر جانسبرگ (جنوبی افریقہ) جلاوطن کر دیئے گئے۔ جہاں
انہوں نے ۱۹۴۴ء میں وفات پائی۔

اس کے بعد ہمایوں محمد رضا شاہ پہلوی تخت نشین ہوئے۔ جو فروری ۱۹۷۹ء میں ایرانی
انقلاب کے نتیجے میں جلاوطن ہو گئے۔ ہمایوں محمد رضا شاہ کو ملک کو ترقی دینے اور قوم (شیعہ) کو
سربلند کرنے کے اعتراف میں ایرانی پارلیمنٹ نے ۱۹۶۷ء میں "آریامہر" کا قومی اعزاز پیش
کیا۔ جس کا لفظی مطلب "آریائی خورشید" ہے۔ اس اعزاز کے ملنے کے بعد جبکہ وہ ۲۶ سال

تک حکومت کر چکے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں پہلی مرتبہ ان کا جشن تاج پوشی منایا گیا۔

ایران میں جشن تاج پوشی کی رسم ازمنہ قدیم سے چلی آتی ہے۔ سب سے پہلے ہخامنشی حکومت (۵۵۰-۳۳۰ ق م) کے مؤسس (اس دور میں ایرانی تہذیب کا باقاعدہ آغاز ہوا) کورش اعظم کا جشن تاج پوشی منایا گیا۔ اس کے بعد ایرانی بادشاہوں کے جشن تاج پوشی کا سلسلہ باقاعدہ جاری رہا۔

پہلوی حکومت کے چون سالہ دور میں بھی شیعہ اور مذہب شیعہ کو برابر فروغ حاصل ہوتا رہا اور اس مذہب کی سرکاری حیثیت میں کوئی فرق نہ آیا۔ یہ شیعہ حکومت بھی اپنی پیش رو شیعہ (صفوی، افشاری، زندی اور قاچاری) حکومتوں کی طرح مشرق وسطیٰ مسلم عرب دنیا کے لیے بڑی نقصان دہ ثابت ہوئی۔ مغربی طاقتوں نے اسے مسلم عرب دنیا اور خلیجی ملکوں کے خلاف پوری طرح مسلح کر کے خوب استعمال کیا۔ یہی وہ شیعہ حکومت ہے جس نے اسرائیل کو سرکاری طور پر تسلیم کیا اور ابتدا ہی سے اس کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کر کے تجارتی معاہدے بھی کئے۔ اس دور میں اہلسنت پر بدستور مظالم ڈھائے جاتے رہے۔ چنانچہ شیعہ مؤرخ شیخ محمد حیات اس دور کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ!

"اہلسنت بھائیوں کو ایران میں محترم اور مسلم قوم کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور ان کو وہی مقام حاصل ہے جو ایک شیعہ کو حالانکہ شاہ ایران کے دور میں اہلسنت حضرات سے نہایت ہی برا سلوک کیا جاتا تھا۔ اور وہ مختلف طریقوں سے مسائل کا شکار تھے۔ مثلاً

۱۔ چونکہ ملک میں شیعوں کی اکثریت تھی۔ اس لئے شاہ اقلیت کو نظر انداز کر کے اکثریت کو سہولیات فراہم کیا کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے سنیوں کے ساتھ کافی اہانت آمیز رویہ اختیار کیا جاتا تھا۔

۲۔ گزشتہ حکومت میں اہلسنت کو حکومت میں کوئی اہم عہدہ نہیں دیا جاتا تھا۔

۳۔ سنی طلبہ کو زبردستی شیعہ نصاب پڑھایا جاتا تھا بلکہ حکومت سنیوں پر بھی بے جا ظلم ڈھاتی تھی۔

۴۔ انقلاب سے پہلے سنی مدارس کی تعداد بہت کم تھی اور جو مدارس تھے ان کو مذہبی و تبلیغی سرگرمیوں کی اجازت نہیں تھی۔ اب اگر سنی اپنے مذہب کی خاطر آواز بلند کرتے تو ان کو ختم کیا جاتا یا ان کو جیلوں میں ڈال دیا جاتا۔

۵۔ البتہ اہل سنت کے سرمایہ داروں کو مکمل طور پر آزادی تھی۔ چونکہ وہ تجارت اور دولت

سے غرض رکھتے تھے اور دین و مذہب کی بات تک نہ کرتے تھے۔ اس لئے ان کو ہر قسم کی آزادی تھی اور ان کو تمام سہولیات بہم پہنچائی جاتی تھیں۔ لیکن سنیوں کا غریب طبقہ نہایت کسمپرسی اور غربت کی زندگی بسر کرتا اور مذہبی لحاظ سے بھی وہ بے چارے ظلم و استبداد کا شکار تھے۔

۶۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سنی طلباء بہت کم داخل ہو پاتے تھے۔ یہاں تک کہ پارلیمنٹ میں کوئی سنی نہیں جا سکتا تھا۔ شاہ کے دور میں سنیوں کے خلاف اس قدر پروپیگنڈہ کیا گیا کہ اکثر شیعہ سنیوں سے نفرت کرتے تھے لیکن اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد فضا یکسر بدل گئی۔ اہلسنت کو ایران میں مساوی درجہ دیا گیا ہے چونکہ انہوں نے باہمی اشتراک سے اسلامی انقلاب کو کامیاب کیا تھا۔ اس لئے ان کو وہی مقام حاصل ہے جو دوسرے عوام کو ہے بلکہ شیعہ و سنی کا تصور بھی ختم ہو چکا ہے۔"

(تاریخ اسلامی جمہوریہ ایران صفحہ ۵۲۲)

یہ تو ایک عام، سیکولر اور لبرل شیعہ حکمران کے دور کی داستان ہے۔ جو خود ایک شیعہ مؤرخ کی زبانی بیان ہوئی۔ لیکن اہلسنت پر جو مظالم شیعہ "علماء، مجتہدین، صلحاء اور اتقیاء" کے دور میں ڈھائے گئے ان کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

انقلاب ایران

اس انقلاب کی قیادت و سیادت جناب خمینی کے ہاتھ میں تھی جنہوں نے ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء کو شاہ ایران کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور طویل عرصہ کے بعد "عہد صفوی" کی یاد ایک دفعہ پھر تازہ ہی نہیں کی بلکہ اس کے نامکمل منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے "پاسداران انقلاب" کے نام سے باقاعدہ ایک منظم فورس بھی قائم کر دی۔

جناب خمینی ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو ایران کے شہر "خمین" میں سید مصطفیٰ موسوی کے گھر پیدا ہوئے ان کا نام سید روح اللہ ہے۔ یہ ایرانی نژاد نہیں بلکہ اصلاً ہندوستانی کشمیری ہیں۔ ان کے دادا سید احمد موسوی کشمیر سے آ کر بسلسلہ تعلیم و تدریس نجف میں قیام پذیر تھے۔ ایک مرتبہ ایران کے شہر خمین سے کچھ لوگ نجف اشرف کی زیارت اور علماء وقت سے اکتساب فیض کے لئے حاضر ہوئے۔ جب انہیں سید احمد موسوی کی مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا تو وہ ان کے وعظ و نصیحت سے بہت متاثر ہوئے اور ان سے خمین میں حلقہ درس اور مرکز قائم کرنے کی درخواست کی۔ معتقدین و مریدین کی خواہش و اخلاص سے متاثر ہو کر آپ نے نجف اشرف

سے نقل مکانی کر لی اور خمین شہر کو اپنا مرکز بنا لیا۔

دادا سے اوپر خمینی صاحب کا "شجرہ نسب" کسی کو بھی معلوم نہیں خود انہوں نے بھی اس کی کوئی وضاحت نہیں کی اور خاموشی وسکوت ہی میں مصلحت مناسب سمجھی۔ لہٰذا محققین حضرات کو بھی اس سے آگے نہیں جانا چاہیے۔

اس سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ خمینی صاحب تیسری نسل کے ایرانی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے ایرانی دستور میں صدارتی امیدوار کے لئے یہ شرط عائد کر دی گئی ہے کہ وہ تیسری نسل کا ایرانی ہونا چاہیے اور اس شرط پر پورا نہ اترنے کی وجہ سے ایک ایرانی عالم جلال الدین فارسی کو بطور صدارتی امیدوار مسترد کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ وہ تیسری نسل کے نہیں بلکہ دوسری نسل کے ایرانی تھے۔

امیر جماعت اسلامی پاکستان قاضی حسین احمد صاحب کو یہ توفیق تو حاصل نہ ہو سکی کہ وہ خمینی کے کفریات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے لیکن اس شق کے تحت ایک عالم کو بطور صدارتی امیدوار مسترد کرنے کی وجہ سے وہ احتجاج کرنے پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے ایرانی علماء سے استفسار بھی کیا کہ "کیا قرآن و سنت اور شریعت میں کوئی ایک بھی ایسی دلیل ہے جس سے ایک ملک کے شہریوں میں اس طرح کی تفریق ثابت کی جا سکے"۔ (تحقیب ختم نبوت ملتان صفحہ فروری ۱۹۹۰ء)

خمینی صاحب خمین، اراک اور قم کے شیعہ مراکز میں مختلف علوم میں مہارت حاصل کر کے مجتہد بنے، پھر آیت اللہ، یہ لقب صرف شیعہ اعلم اور مرجع کے نام کے ساتھ لکھا اور بولا جاتا ہے اور اس خطاب سے اس کے علم و عمل اور زھد و تقویٰ کو متعین کیا جاتا ہے۔ یعنی "آیت اللہ" زمین پر خدا کی علامت ہوتا ہے۔ پھر موصوف "آیۃ اللہ العظمیٰ" کے درجہ پر فائز ہوئے۔ چنانچہ ایرانی دستور کی پہلی ہی دفعہ میں یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں کہ "المرجع الدینی الکبیر آیۃ اللہ العظمیٰ الامام الخمینی" ایران میں ایک وقت میں ایک آیۃ اللہ العظمیٰ ہو سکتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے آئین کی رو سے ان کو گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔ جب خمینی صاحب صرف آیۃ اللہ تھے تو شاہ کے لئے ان کو گرفتار کرنا آسان کام تھا۔ لیکن جب انہیں آیۃ اللہ العظمیٰ کا درجہ حاصل ہو گیا تو شاہ کے لئے ان کی گرفتاری مشکل ہو گئی اس لیے اس نے انہیں جلا وطن کر دیا۔ خمینی صاحب کو "آیت اللہ العظمیٰ" کے درجے پر اس وقت ترقی دی گئی جب انہوں نے اپنا مقالہ بعنوان "تحریر الوسیلہ" لکھا۔

اس کے بعد موصوف مسلمانوں (کردوں جن کو وہ طاغوتی کہتے ہیں اور عراقیوں)

کے خلاف "جہاد" کرنے کے نتیجے میں "اولی الامر" بنے پھر مزید ترقی کرتے ہوئے نظریہ ولایت فقیہ کے تحت امامت کے منصب پر فائز ہوگئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد موصوف درس و تدریس میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ اس شغل کے ساتھ ساتھ انہوں نے علماء و عوام کو منظم کر کے شاہ ایران کے مدمقابل سیاسی زندگی کا بھی آغاز کر دیا جس کے نتیجے میں موصوف پہلے قید کیئے گئے اور پھر جلاوطن کر دیئے گئے۔ انہوں نے ترکی، عراق اور فرانس میں اپنی جلاوطنی کا دور گذارا لیکن وہ زیادہ عرصہ تقریباً پندرہ سال تک نجف اشرف (عراق) میں ہی مقیم رہے۔ اس طویل مدت میں وہ روزانہ حضرت علیؑ کے روضہ پر حاضر ہوکر "زیارت" پڑھتے اور ہر رات دعائے کمیل پڑھتے اور ہر جمعہ کی رات نجف سے کربلا جاکر روضۂ امام حسینؑ کی زیارت کرتے تھے۔

اس جلاوطنی کے دور میں بھی انہوں نے شاہ کے خلاف اپنی تحریک جاری رکھی اور علماء و عوام کو ایک بنیادی انقلاب کے لیئے تیار کرتے رہے۔ اسی دور میں انہوں نے اسلامی حکومت کا مکمل خاکہ پیش کیا جو اسی زمانے میں "حکومت اسلامی" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوگیا تھا۔ اس تحریک کے نتیجے میں شاہ ایران ملک چھوڑنے پر مجبور ہوگیا اور ۱۴ جنوری ۱۹۷۹ء کو ملک سے فرار ہوگیا۔

خمینی صاحب یکم فروری ۱۹۷۹ء کو فاتحانہ طور پر واپس اپنے وطن لوٹے لیکن ابھی شہر میں بعض مقامات پر پولیس اور فوج کے ساتھ لوگوں کی کش مکش جاری تھی اور چند ہی دنوں میں مسلح دستوں نے نئے رہنما کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ بالآخر ۱۱۔ فروری ۱۹۷۹ء کو ایران میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ موصوف اپنے ترتیب دیئے ہوئے خاکے کے مطابق دس سال تک "بے مثال" حکمرانی کرنے کے بعد ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ/۳ جون ۱۹۸۹ء ہفتہ کے دن رات دس بج کر بیس منٹ پر رحلت کر گئے۔ ۷ جون ۱۹۸۹ء کو ان کی نماز جنازہ ایران کے مشہور مرجع تقلید آیت اللہ العظمٰی گلپائے گانی کی امامت میں ادا کی گئی لیکن تدفین سے پہلے ماتمی عوام کے زبردست ہجوم کے باعث خمینی کا تابوت نیچے گر گیا اور لوگوں نے ان کا کفن اور اسکے اوپر پڑا ہوا ایرانی پرچم پھاڑ ڈالا۔

ایران کے سابق وزیر داخلہ علی اکبر ناطق نوری جو اس موقع پر تابوت کے ہمراہ تھے اپنے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں کہ!

"چونکہ سوگوار عوام کا ہجوم امام کے پیکر مطہر کو چومنا چاہتا تھا لہٰذا لوگ پیکر کو نیچے کی جانب کھینچ رہے تھے۔ اس دباؤ کی وجہ سے حضرت امام کا کفن تبرک کے طور پر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور آپ کے چہرے، ہاتھوں اور پاؤں کا کچھ حصہ کفن سے باہر آ گیا تھا (یہ بھی امام کی کرامت ہے کہ عزاداروں کو دیکھ کر امام کا کفن خود بخود بطور تبرک ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور امام کا صرف چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کا کچھ حصہ برہنہ ہوا۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقتدیوں نے اپنے مقتدا کا کفن نوچ کر اسے برہنہ کر دیا) چنانچہ میں مجبور ہو گیا تھا کہ اپنی عبا کو حضرت امام کے بدن پر ڈال دوں۔ یہ اتفاق شاید تاریخ میں پہلی بار ہی ہوا ہے کہ کسی شخصیت کا اتنے جوش و خروش کے ساتھ اس کے گھر سے باہر لے جا کر جلوس جنازہ نکالیں اور دوبارہ پھر اس کو گھر واپس لے آئیں۔ امام کے بدن مطہر کو دوبارہ پھر "بردیمانی" کے کفن میں لپیٹا جسے جناب خامنہ ای نے بھیجا تھا۔ ہم دوسری بار حضرت امام کے جنازے کو بہشت زہراء لے گئے۔ جیسے ہی ہم نے مطہر جنازے کو ہیلی کاپٹر سے اتارا وہ پاسدار بھائی جو انتظامات کے ذمہ دار تھے۔ تابوت کو دیکھتے ہی بے اختیار ہو گئے پھر سے نظام درہم برہم ہو گیا اور لوگ ٹوٹ پڑے۔ بہر حال میں اور دوسرے دو تین آدمی بڑی مشکل سے حضرت امام کے جنازے کو قبر کے اندر رکھنے اور دفن کرنے میں کامیاب ہو سکے اور جناب اربابی نے جنہوں نے اب تک بڑی شخصیتوں کے غسل، کفن اور دفن کا کام کیا ہے سخت دباؤ کے باوجود حضرت امام کے بدن پر تلقین پڑھی"۔ (امام خمینی کے حالات زندگی صفحہ ۱۵۹۔۱۶۰ مولفہ موسیٰ خان جلال زئی)

خمینی صاحب کی موت پر عالمی لیڈروں، سیاست دانوں اور دانش وروں نے بھی تعزیتی پیغامات جاری کئے۔ جبکہ نماز جنازہ میں صدر پاکستان غلام اسحٰق خان کے علاوہ کسی ملک کے سربراہ نے شرکت نہیں کی۔

موصوف کی وفات سے سب سے زیادہ شیعہ قوم متاثر ہوئی اور انہوں نے بجا طور پر یہ لکھا کہ "شیعہ قوم یتیم ہو گئی۔ گزشتہ دس سال میں امام خمینی نے اسلام اور شیعیت کا جو نام بلند کیا ہمیشہ سے برقرار رکھا جائے گا" (ہفت روزہ شیعہ لاہور کم تا ۸ جون ۱۹۸۹ء)

بعض سنی حلقے بھی اپنے شیعہ بھائیوں کے غم میں برابر کے شریک تھے۔ ان میں سے بعض رہنماؤں کے تعزیتی پیغامات ہدیہ قارئین کئے جاتے ہیں۔

قاضی حسین احمد صاحب۔۔۔۔۔امیر جماعت اسلامی پاکستان جناب قاضی

حسین احمد صاحب یہ روح فرسا خبر سن کر سید ھے (لاہور) ایرانی قونصل خانے تشریف لے گئے ان سے تعزیت کی اور غم زدہ لوگوں سے خطاب کیا۔ایک بیان میں انہوں نے فرمایا کہ "ایرانی قوم نے جس طرح امام خمینی کی قیادت میں متفق اور متحد ہو کر اسلامی انقلاب کے لئے جانی و مالی لازوال قربانیاں پیش کی تھیں۔ان کی کوئی مثال ماضی قریب کی تاریخ میں نہیں ملتی وہ اس موقع پر ایرانی قوم کے غم میں پوری طرح شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایرانی قوم کی صحیح رہنمائی فرمائے اور آیت اللہ خمینی کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسے اپنے فضل خاص سے پُر فرمائے"۔

(ہفت روزہ صادق لاہور ۸۔۱۴ جون ۱۹۸۹ء)

مسلک اہل حدیث کے ترجمان مولانا عبدالقادر روپڑی۔۔۔"ہر وہ طاقت جو اسلام کے لیے تقویت کا باعث ہو اس سے کفر کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔امام خمینی نے اسلام کے نام پر جو کچھ اپنے ملک کے لئے کیا ہے اس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی"۔

(نوائے وقت اشاعت خاص ۸ جون ۱۹۸۹ء)

جناب مفتی محمد حسین نعیمی بریلوی۔۔۔"موجودہ دور میں امام خمینی نے ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے۔اس گئے گذرے زمانے میں بھی علماء حق کا عوام پر اتنا اثر ہے کہ وہ بڑی سے بڑی حکومت کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟

(حوالہ مذکورہ)

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری۔۔۔"امام خمینی نے حضرت علیؑ کی سی زندگی گذاری اور حضرت امام حسینؑ کی طرح دنیا سے رخصت ہوئے۔امام خمینی خود تو زمین کے پیٹ میں چلے گئے مگر زمین کی پیٹھ پر چلنے والے لاکھوں انسانوں کو جینے کا طریقہ سکھا گئے"

(روزنامہ جنگ لاہور ۸۔جون ۱۹۸۹ء)

مولانا کوثر نیازی۔۔۔تحریک تحفظ ناموس رسالت کے رہنما مولانا کوثر نیازی گذشتہ روز تحریک کے ایک وفد کے ساتھ ایرانی سفیر کے گھر گئے اور ان سے امام خمینی کی وفات پر تعزیت کی اور اس موقع پر انہوں نے تعزیتی کتاب میں درج ذیل شعر تحریر کیا!

حال ما در ہجر رہبر کم تر از یعقوب نیست
او پسر گم کردہ بود ما پدر گم کردہ ایم

(ہفت روزہ شیعہ لاہور ۱۶ جون ۱۹۸۹ء)

مولانا محمد خان شیرانی ۔۔۔امام حسین کونسل کے زیر اہتمام منعقدہ ایک تعزیتی تقریب میں جمعیت علمائے اسلام کے ممتاز رہنما اور ممبر قومی اسمبلی مولانا محمد خان شیرانی نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "امام خمینی اس صدی کے سب سے بڑے عالم، باعمل مسلمان اور سیاسی رہبر تھے۔ انہوں نے سادگی اور دور اندیشی سے دنیائے اسلام کو اپنی اہمیت کا احساس دلایا"۔ (نوائے وقت راولپنڈی ۱۵۔ جون ۱۹۸۹ء)

مولانا سمیع الحق صاحب۔۔۔ امام خمینی نے جو انقلاب برپا کیا اس سے ڈھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کی دیواریں ہل گئی ہیں۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ اسلامی معاشرہ میں دین اور اسلام کا علم لے کر اب بھی انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ خمینی صاحب کے جانے کے بعد انتظامی ڈھانچہ بہر طور اسی طرح موجود ہے اور ایران کے اسلامی انقلاب کو ان کی رحلت کے بعد کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ (نوائے وقت ۸ جون ۱۹۸۹ء)

مولانا محمد اجمل خان۔۔۔ "آیت اللہ خمینی نے ڈھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کا خاتمہ کر کے ثابت کر دیا کہ اسلام کا علم بلند کر کے ہی انقلاب لایا جا سکتا ہے"۔

سخت حیرت ہے کہ حضرت موصوف کو ابھی تک حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں ایرانی شہنشاہیت کے خاتمے کا یقین نہیں آ رہا۔

مولانا عبدالروف صاحب ربانی ڈپٹی سیکرٹری جمعیت علمائے اسلام پنجاب۔۔۔ "مجموعی طور پر وہ ایک مرد مجاہد تھے اور ان کی غیرت ایمانی ہر قسم کے خوف و ہراس سے بالاتر تھی"۔ (ہفت روزہ چٹان لاہور۔ صفحہ ۴۲۔ ۹ جون ۱۹۸۹ء)

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر چیئرمین شعبہ عربی پنجاب یونیورسٹی لاہور زیر عنوان "امام خمینی کا اصل کارنامہ" لکھتے ہیں کہ:

"امام خمینی کی وفات کو بجا طور پر عالم اسلام کا نقصان عظیم قرار دیا گیا ہے ایک ایسا نقصان عظیم جس کی تلافی ناممکنات میں سے ہے۔ ہمارا تو یہ ایمان ہے کہ "موت العالم موت العالم" اس ارشاد نبوی ﷺ کی رو سے امت کے لئے امام کی وفات بلاشبہ بہت بڑا خسارہ ہے لیکن وہ محض عالم دین نہیں تھے بلکہ امام دوراں اور فقیہ وقت بھی تھے۔ وہ محض سیاسی قائد ہی نہیں تھے بلکہ ایک زوردار سیاسی تحریک تھے جس نے دنیا کی تاریخ کا دھارا بدل دیا۔ وہ محض ایک

مصلح ہی نہیں تھے بلکہ ایک اصلاحی تحریک تھے جو جراحت کے ساتھ مرہم رکھنے اور مواد فاسد نکالنے کے بعد صحت و توانائی بھی عطا کیا کرتی ہے۔ خمینی ایک فولادی ستون کا نام تھا۔ جس پر بے شمار تحریکات کی عمارت کھڑی تھی۔ جس سے زمانے کی آندھیاں اور وقت کی گردشیں ٹکراتی اور سر پٹختی رہیں مگر اس کی ہمت و عزیمت میں سرمو بھی فرق نہ آیا۔ ایک ایسی شخصیت کا اٹھ جانا یقیناً نقصان عظیم اور ناقابل تلافی خسارہ ہے۔

امام خمینی کا اصل کارنامہ یہی ہے کہ ایران کی قیادت مکمل طور پر اور محفوظ طریقے سے علماء کے ہاتھ میں ہے مگر ان علماء میں سے ہر ایک یکتائے روزگار ہے علم کا تربیت یافتہ اور ارادت مند ہے۔ امام خمینی نے ایک عالم دین اور بوریا نشین ہو کر یہ سب کچھ کیا۔ یہی امام موصوف کا سب سے بڑا کارنامہ ہے ہم امام خمینی کی جرأت و ہمت اور درویشانہ تدبر کو سلام کرتے ہیں اور اپنے ایرانی بھائیوں کے ساتھ ہیں"۔ (نوائے وقت راولپنڈی ۳۔جولائی ۱۹۸۹ء)

ڈاکٹر صاحب نے اس طویل مضمون میں خمینی صاحب کو جن الفاظ اور جس انداز میں خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ ان کا ذاتی معاملہ ہے لیکن موصوف نے "موت العالم موت العالم" کو حدیث نبویؐ کے طور پر پیش کر کے "تحقیق" کا حق ادا کر دیا ہے۔ حضرت جی! یہ ارشاد نبوی ﷺ نہیں بلکہ ایک بزرگ کا قول ہے اس کے برعکس کتب حدیث میں یہ ارشاد ضرور موجود ہے "جس شخص نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولا تو اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنا لے

(جامع ترمذی۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب العلم)

سابق چیف جسٹس آف پاکستان ڈاکٹر نسیم حسن شاہ نے خوشامد کی انتہا کرتے ہوئے خمینی صاحب کو پیغمبر قرار دے دیا۔ روزنامہ اوصاف کے مطابق خانہ فرہنگ ایران لاہور کے زیر اہتمام حقانی ہوٹل میں امام خمینی کی "گیارہویں برسی کے موقع پر منعقدہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے نسیم حسن شاہ امام خمینی کی تعریفیں کرتے ہوئے اور ان کی شاندار و انقلابی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے جذباتی ہو گئے اور یہاں تک کہہ گئے کہ امام خمینی کی ذات کسی پیغمبر سے کم نہ تھی"۔ (روزنامہ اوصاف ۷۔جون ۲۰۰۰ء)

خمینی کی موت پر تعزیتی پیغامات جاری کرنے والے علماء کرام میں سے زیادہ تر مولانا کوثر نیازی ہی ہدف تنقید بنے اور اس وقت رسائل و جرائد میں ان کا خوب تعاقب کیا گیا بلکہ

ایک بزرگ مولانا حافظ ارشاد احمد صاحب دیوبندی نے تو اپنے مضمون کا عنوان ہی یہی رکھا کہ "مولانا کوثر نیازی کا باپ گم ہو گیا ہے" اس طرح علمائے حق نے ببانگِ دہل کلمۂ حق بلند کر کے اپنا فرض ادا کر دیا لیکن حیرت ہے کہ وہ دیگر اہم مذہبی شخصیات کے تاثرات کے خلاف لب کشائی کو "سوءِ ادب" سمجھتے ہوئے یکسر نظر انداز کر گئے۔ مولانا محمد عبدالحق چوہان یہ "مصلحت بلکہ مداہنت" برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے اپنے قلبی تاثرات پر مبنی ایک مضمون بہ عنوان "این گنا ہیست کہ در شہر شما نیز کنند" شائع کر دیا۔ اس میں موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ!

"اس وقت نقیب ختم نبوت ملتان ماہ ذوالحج ۱۴۰۲ھ / جولائی ۱۹۸۹ء پیش نظر ہے اس میں ایک مضمون بہ عنوان "امام خمینی کے انتقال پر مولانا کوثر نیازی کا شعر" خادم حسین شیخ اور ایک مضمون بہ عنوان "مولانا کوثر نیازی کا باپ گم ہو گیا ہے" محترم جناب حافظ ارشاد احمد دیوبندی ظاہر پیر کی طرف سے شریک اشاعت ہے۔ دونوں مضامین کا تعلق جناب کوثر نیازی کے اس فعل پر ہے کہ اس نے ایرانی سفیر کے پاس جا کر خمینی کی موت پر تعزیت کی اور تعزیتی کتاب میں یہ شعر تحریر کیا ہے۔

حال مادر ہجر رہبر کم تر از یعقوب نیست
او پسر گم کردہ بود ما پدر گم کردہ ایم

ظاہر ہے ان دونوں حضرات کی یہ تحریر حمیت اسلامی کے تحت ہے۔ کیونکہ ان حضرات کو کوثر نیازی کے ساتھ کوئی مخاصمت نہیں اس لئے ان حضرات کا یہ جذبہ مستحسن صد تحسین ہے۔ خدا کرے مزید توفیق ہو اس کے ساتھ ہی ہم چند معروضات پیش کرنے کی جسارت کرتے ہیں کوثر نیازی کے عمل پر آپ کی تنقید صحیح اور بجا ہے لیکن کوثر نیازی کی شخصیت کوئی ایسی اہم شخصیت نہیں کہ جو تصلب دینی کے باعث نمایاں رتبہ پر فائز ہو بلکہ وہ عام سیاسی مولوی ہے جس کی لچک دار شخصیت میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ہر حکومت وقت کے اقتدار میں جذب ہو جاتا ہے اس کے ساتھ ہی اگر آپ ان دیوبندی علماء کے تاثرات پر تنقید کرتے جنہوں نے خمینی کی موت پر اس کے انقلاب کو اسلامی انقلاب سے تعبیر کیا ہے اور اس کو مرد مجاہد جیسے رفیع الفاظ سے تعبیر کیا ہے اس طرح کے جذبات کا اظہار کرنے والے کوئی ہما شما نہیں بلکہ وہ حضرات ہیں کہ جن کو جمعیت علمائے اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان حضرات کے ان لایعنی تاثرات

کے اظہار پر آپ کا جذبہ احساس کیوں موجزن نہیں ہوتا۔ یہ بے حسی صرف اس لئے کہ آپ کے نام کے ساتھ بھی "دیوبندی" کا لاحقہ ہے اور وہ حضرات بھی اپنے آپ کو دیوبندی علمائے مجاہدین کی طرف منسوب کرتے ہیں اگرچہ ان کے اعمال اس نسبت کی نفی کرتے ہیں "ایں گنا ہیست کہ در خانہ شما نیز کنند"۔

اب ہم شیخ صاحب کے سوال کو دہراتے ہوئے شیخ صاحب ہی سے خود سوال کرتے ہیں کہ ان اکابرین کے نزدیک اگر یہ اسلام ہے تو تم بتاؤ ضد اسلام کیا ہے؟ یہ اسلامی انقلاب ہے تو صیہونی انقلاب کیا ہوتا ہے؟ اسی طرح ہم حافظ دیوبندی صاحب سے بھی ان ہی کے الفاظ میں سوال کرتے ہیں۔ قارئین محترم! کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ عبداللہ بن سبا سے خمینی تک شیعیت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں مگر مولانا اجمل خان اور مولانا ربانی صاحب کو بجائے خمینی کی کونسی ادا پسند آگئی کہ اسے اسلامی انقلاب برپا کرنے والا مجاہد قرار دے ڈالا اور حال ہی میں جمعیت (فضل الرحمن گروپ) کے نمائندہ نے بھی خمینی کے چہلم کے موقع پر ایران میں منعقدہ تقریب میں شرکت کی بہادر اسے زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ (ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان صفحہ ۵ دسمبر ۱۹۸۹ء)

آیت اللہ علی خامنہ ای نئے رہبر کبیر، جانشین امام خمینی

خمینی کی رحلت کے ایک دن بعد اور قبل از تجہیز و تکفین ۴۔ جون ۱۹۸۹ء مجلس خبرگان (ماہرین کی کونسل) کی سربراہی کمیٹی نے ایک اعلامیہ جاری کیا کہ "کونسل نے فوری طور پر ایک ہنگامی اجلاس میں کثرت رائے سے صدر مملکت آیت اللہ سید علی خامنہ ای کو حکومت اسلامی جمہوریہ ایران کا رہبر منتخب کر لیا ہے" اس طرح ۴ جون ۱۹۸۹ء سے خامنہ ای "رہبر کبیر یا جانشین امام خمینی" کی حیثیت سے امور مملکت چلا رہے ہیں اور ان کا دور ابھی تک جاری ہے۔

خامنہ ای ۱۹۳۹ء میں صوبہ خراسان کے صدر مقام اور امام رضا کے مدفن شہر مقدس کے ایک شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۸ سال کی عمر میں نجف اشرف چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد واپس آئے اور حوزہ علمیہ قم میں آیت اللہ حائری، آیت اللہ بروجردی اور آیت اللہ خمینی سے کسب فیض کیا۔

موصوف ۱۹۶۲ء میں خمینی کی تحریک کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور ۱۹۶۳ء میں دوران گرفتار بھی ہوتے رہے۔ رہائی کے بعد انہوں نے خفیہ سیاسی اشتراکی تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۷۱ء میں نظر بندی

تعلیم کی خفیہ کلاسیں لیتے رہے اس دوران مسلح جدوجہد کی فضا وجود میں آئی۔

۱۹۷۷ء میں "مجاہد علماء" کے تعاون سے "جامعہ روحانیت مبارز" کا منصوبہ بنایا۔

۱۹۷۸ء میں انہوں نے دیگر انقلابی ساتھیوں کے تعاون سے "جمہوریہ اسلامی" پارٹی کا ابتدائی ڈھانچہ تیار کیا۔ اسی سال شہید مطہری کی تجویز پر انقلابی کونسل کے رکن بنے۔ اگست ۱۹۷۹ء میں انقلابی امور کے لئے وزیر دفاع کے مشیر کی ذمہ داری سنبھالی اور اسی سال یکم دسمبر کو سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی کے کمانڈر بنے۔

ان ہی ایام میں خمینی کی طرف سے تہران کے امام جمعہ مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۱ء کے اوائل میں ملک کے جنوبی جنگی محاذوں کی طرف روانہ ہوئے۔ پھر اعلیٰ فوجی وفد کی قیادت کرتے ہوئے چین اور بھارت کا دورہ کیا۔ اگست ۱۹۸۱ء میں تہران کی مسجد ابوذر میں خطاب کے دوران ایک دھماکہ میں زخمی ہوئے اور بیالیس دن تک ہسپتال میں زیر علاج رہے لیکن ان کا دایاں ہاتھ ناکارہ ہو گیا۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء میں ایران کے صدر منتخب ہوئے۔ پھر اگست ۱۹۸۵ء میں نئے صدارتی انتخاب میں دوسری مرتبہ کامیاب ہوئے۔ ۴ ستمبر ۱۹۸۵ء کو خمینی نے "تقدیر ثم" کے مبارک دن ان کے صدارتی حکمنامے پر دستخط کیے۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل مناصب بھی انکے پاس رہے۔ اعلیٰ دفاعی کونسل، ثقافتی انقلاب کی سپریم کونسل، تشخیص مفادات کے بورڈ کی سربراہی، مجلس خبرگان کی رکنیت، قانون اساسی پر نظرثانی کونسل کی نیابت، ملکی پالیسی ساز کونسل کی سربراہی اور تہران کی امامت جمعہ۔

خامنہ ای کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ انہوں نے اسلامی علوم اور تاریخ کے موضوعات پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں ان میں سے کچھ تو ان ہی کی تصانیف ہیں اور بعض کتابیں دوسری زبانوں سے ترجمہ شدہ ہیں، مغربی تہذیب پر ایک ناقدانہ نظر، صلح امام حسن اور مستقبل، اسلام کی فرمانروائی، قرآن میں اسلامی فکر کا نظریہ عمومی، نماز کا گہرا مطالعہ، برصغیر کی آزادی میں مسلمانوں کا کردار، امام جعفر صادق کی زندگی، اسلام کی بہتر شناخت، تقریروں کے مجموعے امامت اور ہمارے مواقف۔

خمینی صاحب کی وفات کے بعد مجلس خبرگان کے اکثریتی فیصلے کے مطابق خامنہ ای کو بحیثیت رہبر منتخب کیا گیا۔ اس فیصلے کا مکمل متن حسب ذیل ہے۔

"مجلس خبرگان اسلامی جمہوریہ ایران کے رہبر و بانی حضرت امام امت کی جانگداز

رحلت پر اظہار تعزیت کرتی ہے۔ اسلامی جمہوریہ ایران کے نظام میں رہبر کے بلند اور حساس مقام سے آگاہی رکھتے ہوئے مجلس خبرگان کو اپنی تاریخی ذمہ داری کا شدید احساس ہے۔ رہبری کے سلسلے میں اسلامی جمہوریہ ایران کے بانی حضرت امام امت رضوان اللہ تعالیٰ علیہ نے کئی بار بڑے اہتمام سے اپنے پیغامات، بیانات، احکامات اور ارشادات جاری فرمائے ہیں۔ مجلس خبرگان نے بنیادی قانون کے مطابق مقدس اسلامی نظام کے مستقبل کے سلسلے میں ملکی و غیر ملکی غاصبوں اور دشمنان اسلام کی سازشوں سے آگاہی رکھتے ہوئے ملکی و بین الاقوامی حالات کو سامنے رکھ کر ہر قسم کے حادثے سے نمٹنے کی ضروری تیاری کے لئے حضرت امام امت کے نہایت اہم سیاسی الٰہی وصیت نامے کے مطالب کی روشنی میں مورخہ ۴ جون ۱۹۸۹ء کو اپنے ہنگامی اجلاس میں حاضر اراکین کی ۴/۵ سے بھی زیادہ اکثریتی رائے کے مطابق حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای کو اسلامی جمہوریہ ایران کے نظام کا رہبر منتخب کیا ہے۔ اجلاس میں موجود ۷۳ ارکان میں سے ۶۰ کی متفقہ رائے یہی تھی۔

سید علی خامنہ ای کا قوم کے نام پیغام

"ایران کی شریف و عزیز قوم، سربلند اور مجاہد امت، باخبر اور کبھی نہ جھکنے والے عوام، میرے ہم وطن اور مسلمان بہن بھائیو۔ مجلس خبرگان نے اپنے ایک ہنگامی اجلاس میں مجھے اسلامی جمہوریہ ایران کے نظام حکومت کا رہبر منتخب کیا ہے یہ ایک عظیم ذمہ داری، بھاری امانت اور کڑا امتحان ہے جسے صرف خدا کی تائیدات اور حضرت ولی عصر (روحی فداہ) کی توجہ اور دعا سے قبول کیا جا سکتا ہے اسے منزل تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ امام خمینی اتنی عظیم شخصیت تھے کہ انبیاء اور اولیائے معصومین علیہم السلام کے سوا کسی اور اتنی خصوصیات کی مالک اور ہمہ جہت شخصیت کا تصور بھی بہت مشکل ہے۔ ان کی ذات والا صفات میں قوت ایمانی بھی تھی اور عمل صالح بھی، آہنی عزم و ارادہ بھی تھا اور ہمت بلند بھی، شجاعت اخلاقی بھی تھی اور عزم و حکمت بھی، صراحت لہجہ بیان بھی تھی اور ہوش مندی بھی، تقویٰ و ورع بھی تھا اور نرمی و مہربانی بھی۔ ان کی ذات میں وہ تمام نفیس اور نادر خصوصیات جمع تھیں جو صدیوں میں بھی شاذ و نادر ہی کسی ایک انسان میں موجود ہوتی ہیں۔ بلاشبہ اس بے مثال عزیز کی شخصیت ایسی تھی جو کبھی نہیں مل سکتی اور ان کا بلند انسانی مرتبہ و مقام تصور سے بالاتر اور ناقابل یقین داستانوں جیسا تھا۔

وہ ایرانی قوم کے رہبر، باپ، معلم، مرشد اور محبوب تھے اور دنیا بھر کے مستضعفین خصوصا مسلمانوں کی روشن امید تھے۔ انہوں نے اسلام کو عزت بخشی۔ دنیا میں قرآن کا پرچم لہرایا، ایرانی قوم کو غیروں کی غلامی سے نجات دلائی۔ انہیں وقار، تشخص اور خودانحصاری عطا کی۔ انہوں نے دین، روحانیت اور اخلاقی اقدار کی بنیادوں پر ایک نظام تشکیل دیا اور اسلامی سیاست و حکومت کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے دس سال تک خوف ناک طوفانوں اور تاریخ ساز حوادث کے باوجود بڑے حوصلے سے اسلامی جمہوریہ کا نظام چلایا اور اس کی حفاظت و ہدایت کا فریضہ انجام دیا اور اسے قابل اطمینان مقام پر پہنچا کر دم لیا۔ ان کی دس سالہ رہبری عوام اور ہمارے ارباب اختیار کے لیے ایک ناقابل فراموش یادگار اور بے حد گراں بہا ذخیرہ ہے۔ امام خمینی وہ اولین شخصیت تھے جن کا کوئی ثانی نہیں۔ میں اپنے آپ کو اس روح خدا کا ایک متواضع شاگرد، فرماں بردار شاگرد، فرمانبردار فرزند اور عاشق مرید سمجھتا ہوں۔ وطن آمد کے بعد اس روح ملکوتی کے راہی عالم بالا ہو جانے تک دس سال اور چند ماہ کے سارے عرصے میں اپنے سارے وجود کے ساتھ اس ہدایت الٰہی کے بہاؤ کا لحہ لحہ محسوس کیا ہے۔ ان کی باتیں اور اشارے، ان کا فکر اور تدبر اور نصیحتیں، ان کے احکام اور مشورے، اور سب سے بڑھ کر ان کا طرز عمل اور کردار یہ وہ طرح طرح کے عطیے تھے جو بڑی فیاضی سے اس معنوی چشمے سے پھوٹتے رہتے تھے اور ان کے چند ساتھیوں کو جو ان کی خدمت میں رہتے تھے ہمیشہ سیراب کرتے رہتے تھے۔ ان کا درس صرف وہ نہیں تھا جو ہم نے حوزہ علمیہ میں ان سے حاصل کیا ہے جدوجہد کے سولہ سالہ عرصے میں ہم دور و نزدیک سے بدل و جان سنا۔ ان کا عظیم ترین اور پائندہ ترین درس وہ تھا جسے ہم نے ان دس سالوں میں آیات حکمت کی طرح جان و دل کے عوض خریدا اور لوح ضمیر پر ثبت کر لیا۔ میری اس نئی اور عظیم ذمہ داری کے بعد مجھ پر فرض ہے اور میں نے اس کا تہیہ کر رکھا ہے کہ ان خدائی درسوں کے ایک ایک لفظ پر عمل کروں۔" (تاریخ اسلامی جمہوریہ ایران صفحہ ۲۹۱-۲۹۳)

ایرانی انقلاب کی نوعیت

بیسویں صدی کو انقلابات کی صدی کہا جا سکتا ہے ۱۹۱۷ء میں روس میں انقلاب آیا۔ ۱۹۲۲ء میں مصر برطانیہ کے تسلط سے آزاد ہوا۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے ۱۹۲۳ء میں ترکی میں انقلاب برپا کر دیا۔ ۱۹۴۷ء میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں نے طویل جدوجہد کے بعد

پاکستان کے نام سے ایک الگ ملک حاصل کیا۔ اسی سال پونچھ کے مسلمانوں نے ڈوگرہ مہاراجہ کی ظالمانہ روش کے خلاف جہاد حریت کا علم بلند کر کے کشمیر کا ایک حصہ "آزاد کشمیر" کے نام سے آزاد کرالیا۔ ۱۹۴۹ء میں یمن، اردن اور انڈونیشیا نے آزادی حاصل کی۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ء کو لیبیا کی آزاد اسلامی مملکت معرض وجود میں آئی۔ الغرض اس بیسویں صدی میں دنیا میں بہت سے انقلابات آئے اور کئی اسلامی ممالک نے بھی آزادی حاصل کی۔ لیکن ۱۹۷۹ء کا ایرانی انقلاب مذکورہ تمام انقلابات سے مختلف اور منفرد ہے یہ انقلاب عام انقلابات کی طرح نہیں جس میں ایک سربراہ کا تختہ الٹ کر دوسرا شخص اقتدار پر قبضہ کر لیتا ہے یہ ایک خالص نظریاتی اور شیعی انقلاب ہے اس انقلاب کے برپا ہوتے ہی پوری دنیا میں اس بات کا ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ یہ ایک "اسلامی انقلاب" ہے اور امام خمینی عالم اسلام کے ایک عظیم لیڈر ہیں اس مقصد کے لئے باقاعدہ ایک منظم و بھرپور تحریک چلائی گئی جس میں تمام سرکاری اور غیر سرکاری وسائل استعمال میں لائے گئے۔ پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا، ذرائع ابلاغ، ریڈیو، ٹی وی، اخبارات و اشتہارات، رسائل و جرائد، لٹریچر، جلسوں، جلوسوں، کانفرنسوں، سیمیناروں اور سالگرہوں کے ذریعے دنیا کو یہ باور کرایا گیا کہ یہ "اسلامی انقلاب" ہے اس سبائی پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اکثر مسلمان اسے "اسلامی انقلاب" سمجھنے لگے اور آج تک سمجھے چلے آرہے ہیں۔ اس انقلاب کی صحیح نوعیت اور حقیقت کیا ہے؟ اسے سمجھنے کے لئے خمینی صاحب کی اس تصنیف کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے جو اس خاص مقصد کے لئے جلاوطنی کے دوران لکھی گئی۔ اس تصنیف لطیف کا نام "اسلامی حکومت یا ولایت فقیہ" ہے۔

نظریہ ولایت فقیہ

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ خمینی کا برپا کردہ انقلاب خالص ایک نظریاتی انقلاب ہے جس کی بنیاد "نظریہ ولایت فقیہ" پر رکھی گئی ہے اس نظریہ کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

امام مہدی کی غیبت کبریٰ کے زمانے میں فقہاء شیعہ کی یہ مذہبی ذمہ داری ہے کہ وہ امام غائب کے نائب کی حیثیت سے حکومت کا نظام اپنے ہاتھ میں لینے کی جدوجہد کریں اور جب کوئی باصلاحیت فقیہ اس مقصد کے لئے جدوجہد کا آغاز کر دے تو معاشرے اور حکومت کے جملہ معاملات میں وہ امام، نبی اور رسول ہی کی طرح واجب الاطاعت ہوگا۔

چنانچہ خمینی صاحب لکھتے ہیں کہ!

جب کوئی عالم و عادل فقیہ حکومت کی تشکیل کے لئے اٹھ کھڑا ہو تو وہ معاشرے اور اجتماعی معاملات میں ان تمام امور و اختیارات کا مالک ہوگا جو نبی کے زیر اختیار تھے اور تمام لوگوں پر اس کی سمع و طاعت واجب ہوگی اور یہ صاحب اقتدار فقیہ نظام حکومت، سماجی مسائل اور امت کی سیاست کے جملہ معاملات کا اسی طرح مالک و مختار ہوگا جس طرح نبی پاکﷺ اور امیر المؤمنین (حضرت علیؓ) مالک و مختار تھے"۔ (الحکومۃ الاسلامیہ صفحہ ۴۹)

موصوف اسی کتاب میں آگے چل کر اس نظریہ کی تشریح یوں کرتے ہیں!

"یقیناً فقہاء (یعنی مجتہدین) ائمہ کی عدم موجودگی اور ان کی غیبت کے زمانہ میں رسولﷺ کے وصی ہیں اور ان تمام امور کی انجام دہی کے مکلف ہیں جس کے ائمہ مکلف تھے"۔ (حوالہ مذکور صفحہ ۷۵)

خمینی کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کے ائمہ کائنات کے ذرے ذرے پر متصرف ہیں اور پوری دنیا ان کے زیر اقتدار ہے نیز ائمہ رسول ہی کی طرح مفترض الاطاعت اور معصوم ہیں ہر فرد بشر پر ان کی پیروی اور فرمانبرداری فرض اور ضروری ہے جب کہ "ولایت فقیہ" کے نظریہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ائمہ کی عدم موجودگی یا ان کی غیبت کے زمانہ میں فقیہ عالم و عادل ائمہ کے نائب ہونے کی حیثیت سے ان کے تمام اختیارات کا مالک ہوگا تو اس نظریہ کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ فقیہ عادل کا اقتدار کائنات کے ذرے ذرے پر ہے اور اس کی اطاعت و پیروی بھی خدا اور رسول کی اطاعت کی طرح فرض ہے اور اس کی اطاعت سے انحراف کرنے والا خدا اور رسول کی اطاعت سے انحراف کرنے والا متصور ہوگا۔ اسی طرح فقیہ سے محبت خدا اور رسول اور ائمہ سے محبت ہے اور ان سے بغض خدا اور رسول اور ائمہ سے بغض ہے یہی وجہ ہے کہ ایران میں "حب خمینی حسنة لاتضرمع سیئة" کے نعرے کے علاوہ یہ نعرہ بھی درو دیوار پر لکھا گیا کہ "دشمن خمینی کافر است"۔

خمینی نے پہلے اپنے ائمہ کو خدا اور رسول کے درجے پر پہنچایا اور اب نظریہ ولایت فقیہ کے تحت خود اپنے آپ کو بلکہ ہر فقیہ عالم و عادل کو یہ اختیارات سونپ رہے ہیں۔ چنانچہ ایران کے سرکاری ترجمان "کیہان" نے اپنے شمارے نمبر ۸۲-۳۳ جمادی الاولی ۱۴۰۸ھ میں سید علی

خامنہ ای کے نام امام خمینی کے پیغام کو بڑی سرخی میں شائع کیا ہے کہ

"حکومت مساجد کو معطل یا منہدم کر سکتی ہے اور حکومت نماز روزہ پر مقدم ہے حکومت براہ راست ولایت رسول اللہ کی شاخ اور دین کے بنیادی و اولین احکام میں سے ہے اس کو تمام فروعی احکام پر ترجیح حاصل ہے یہاں تک کہ نماز، روزہ اور حج پر بھی وہ مقدم ہے والی حکومت کے لئے ضرورت کے وقت مساجد کو معطل کرنا بھی جائز ہے اور اس کے لئے یہ بھی روا ہے کہ کسی مسجد کو سرے سے منہدم کر دے اور وہ اسلامی احکام جو اس وقت اسلام کے مفاد کے مخالف ہوں خواہ عبادات میں ہوں یا ان کے علاوہ سب کو کالعدم کر سکتی ہے اور اگر مملکت اسلامی کے مفاد کا تقاضا ہو تو یہ حکومت حج کو بھی معطل کر سکتی ہے جو کہ اسلام کے اہم ترین فرائض میں ایک فریضہ ہے کیونکہ یہ حکومت بجائے خود ایک آزاد ولایت الٰہی ہے"۔ (بحوالہ المرتضیٰ صفحہ ۳۳۰ مولفہ سید ابوالحسن علی ندوی)

چونکہ خمینی صاحب نے ایران میں یہ انقلاب نائب امام زماں کی حیثیت سے برپا کیا ہے اس لئے اس کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ اپنا انقلاب دیگر ملکوں میں بھی برآمد کریں اور تمام عالم اسلام بلکہ پوری دنیا کو اپنے زیر حکومت لانے کی کوشش کریں۔ چنانچہ انہوں نے شیعہ ریاست کی توسیع اور پوری مسلم دنیا پر شیعیت کو مسلط کرنے کے لئے دیگر ملکوں میں اپنے شیعوں کے ذریعے سازشوں اور تحریکوں کے جال پھیلا دیئے۔ عراق کے ساتھ طویل محاذ آرائی، پاکستان اور افغانستان کے اندرونی معاملات میں کھلی مداخلت اور حرمین شریفین میں مظاہرے اس بات کا بین ثبوت ہے ۶ ذی الحج ۱۴۰۷ھ ۳۱ جولائی ۱۹۸۷ء کو اہل تشیع نے حرم کعبہ اور مسجد الحرام کی حرمت کو پامال کرنے کے علاوہ اس ماہ حرام میں مہمانان حرم کے خون سے اپنے ہاتھ بھی رنگین کیے۔ حرم پاک کی توہین کا یہ سلسلہ ناپاک ۱۹۷۹ء کے ایرانی انقلاب سے شروع ہوا جو بڑھتا ہی چلا گیا۔ ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء کو خمینی حکومت قائم ہوئی اور اسی سال ایک مسلح گروہ نے حرم کعبہ اور حرم نبوی پر بیک وقت دھاوا بول دیا۔ قتل و غارت کے علاوہ تمام مسلمانوں کو دو ہفتے سے زیادہ عرصہ تک عمرہ، طواف کعبہ اور بیت اللہ میں نماز سے محروم رکھا۔ مجبوراً اس شیعہ گروہ کے خلاف فوجی طاقت استعمال کی گئی اور حرم پاک کو ناپاک قبضے سے آزاد کرایا گیا۔ پھر ۱۹۸۶ء میں خمینی کے پیروکاروں نے سارے حرم شریف کو بارود سے اڑانے کی سازش کی۔ ۳ ذی الحج ۱۴۰۶ھ / ۷ اگست ۱۹۸۶ء کو ایرانی تخریب کار اکیاون کلو (تقریباً ڈیڑھ من) دھماکہ خیز مادے کے ساتھ جدہ ائیر پورٹ پہنچے

اور تلاشی پر وہیں پکڑے گئے۔ ان دہشت گردوں کا گروحسن علی دمنوی تھا جس نے پوچھ گچھ پر اقبال جرم کرلیا۔ ۱۹۸۷ء میں ایک اور مسلح مہم کے ذریعے مکہ مکرمہ کونشانہ بنایا گیا۔ خمینی کے دور حکومت میں حرمین شریفین پر قبضہ کرنے کے لئے ان کی حرمت مسلسل پامال ہوتی رہی۔ علاوہ ازیں خمینی حکومت نے امام مہدی کے یوم ولادت ۱۵ شعبان کی مناسبت سے ۷ جون ۱۹۸۲ء کو "مستضعف ڈے کانفرنس" کا انعقاد کیا جس میں مختلف ملکوں کے ۳۵۰ نمائندہ وفود شامل تھے۔ اس کانفرنس میں یہ اعلان کیا گیا کہ امام غائب کے یوم ولادت کو ہر سال "مستضعفین ڈے" کے طور پر منایا جائے گا۔ تہران کے مہمان خانہ بزرگ استقلال ہوٹل پر جہاں یہ وفود ٹھہرائے گئے تھے ایک بینر آویزاں تھا جس میں یہ عبارت درج تھی کہ

سَنَتَّحِدُ وَ سَنَتَلَاحِمُ حَتّٰى نَسْتَرِدُّ مِنْ اَيْدِى الْمُغْتَصِبِيْنَ اَرَاضِيْنَا الْمُقَدَّسَةَ الْقُدْسَ وَ الْكَعْبَةَ وَالْجُوْلَانَ۔

"ہم متحد ہوں گے اور جنگ آزما ہوں گے یہاں تک کہ غاصبوں کے قبضے سے اپنی مقدس زمینیں بیت المقدس، کعبہ اور گولان واپس لے لیں۔ (ایرانی انقلاب۔ امام خمینی اور شیعیت صفحہ ۴۳)

اس تفصیل سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ موجودہ ایرانی و انقلابی حکومت دیگر ممالک میں اپنے شیعہ انقلاب کو برآمد کرنے کے لئے مسلسل کوشاں ہے خمینی صاحب نے یہ بات بھی بڑی وضاحت کے ساتھ لکھ دی ہے کہ اس نظریہ کی بنیاد پر صرف وہ شیعہ فقیہ و مجتہد ہی امت کا امام سربراہ حکومت ہو سکے گا جو عقیدہ امامت اور امام آخر الزماں کی غیبت کبریٰ کے زمانے میں "ولایت فقیہ" کے نظریہ کو بھی تسلیم کرتا ہو۔ موصوف اپنے اس نظریہ کی تائید میں لکھتے ہیں کہ "ولایت فقیہ کوئی نیا موضوع نہیں ہے کہ جس کو میں نے بیان کیا ہے بلکہ شروع ہی سے یہ مسئلہ محل بحث رہا ہے مرحوم مرزائے نائینی کا تمباکو کی حرمت کا حکم چونکہ حکومتی حکم تھا اس لئے دوسرے فقہاء پر بھی واجب الاتباع تھا اور ایران کے تمام بزرگ علماء نے (چند کو چھوڑ کر) اس حکم کی پابندی بھی کی تھی۔ مرزا محمد تقی شیرازی نے جو جہاد کا حکم دیا تھا البتہ اس کا نام دفاع تھا اور تمام علماء نے اس کی متابعت کی تھی خود کاشف الغطاء بھی بہت سے ان مطالب کے قائل تھے متاخرین میں سے علامہ نراقی مرحوم بھی تمام شؤون رسول خدا کو فقہاء کے لئے ثابت جانتے تھے۔ آقائے نائینی مرحوم بھی فرماتے تھے کہ "مقبولہ عمر بن حنظلہ" سے یہ مطلب ثابت ہوتا ہے بہر حال یہ

بحث نئی نہیں ہے میں نے موضوع پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور حکومت کے شعبوں کا ذکر کر کے آپ حضرات کے ہاتھوں میں دے دیا ہے"۔ (حکومت اسلامی صفحہ ۵۶)

خمینی کے ساتھ عقیدت و محبت اور تعاون کرنے کے باوجود بعض شیعہ علماء نے ان کے اس نظریہ سے اختلاف کیا ہے جیسے آیت اللہ شریعت مداری اور امام طباطبائی قمی وغیرہ خمینی کے نظریہ ولایت فقیہ کو دینی ضلال سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی وجہ سے انہیں خمینیوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بھی بننا پڑا۔

ڈاکٹر موسیٰ موسوی (جنہوں نے تہران یونیورسٹی سے قانون اسلامی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ بعد ازاں پیرس یونیورسٹی سے فلسفہ میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد تہران یونیورسٹی میں اقتصادیات کے پروفیسر بھی رہے اور دو مرتبہ اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہو چکے ہیں یہ شاہ کے خلاف خمینی کی تحریک میں شامل تھے) لکھتے ہیں کہ!

"ولایت فقیہ کا موضوع خمینی کی ان بدعتوں میں سے ایک بدعت ہے جو انہوں نے دین اسلام میں ایجاد کی ہیں اور دین کے نام پر اس موضوع کو استبداد مطلق کے لئے ایک بنیاد بنایا ہے۔ دنیا کے تمام مسلم و غیر مسلم کو یہ جان لینا ضروری ہے کہ ایران کے علمائے کبار اور عظیم دینی شخصیتوں کا خمینی کے نظریہ ولایت فقیہ سے شدید ترین اختلاف ہے اور ان تمام حضرات نے اعلان کر دیا ہے کہ دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہ نظریہ بدعت و گمراہی ہے"۔ (الثورۃ البائسۃ صفحہ ۴۹-۵۱)

خمینی صاحب نے اس شدید اختلاف کے باوجود اپنے نظریہ ولایت فقیہ پر مبنی ۱۷۵ دفعات اور بارہ اماموں کی مناسبت سے بارہ ابواب پر مشتمل ایک دستور کی منظوری دے دی۔ دستور کے مقدمہ میں بعنوان "الحکومۃ الاسلامیہ" تحریر کیا گیا ہے کہ امام خمینی نے نظریہ ولایت فقیہ کی بنیاد پر اسلامی حکومت قائم کی ہے۔ دستور کی دفعہ نمبر ۲ میں درج ہے کہ اسلامی جمہوریہ کا نظام حکومت توحید، رسالت، آخرت، عدل اور امامت کی بنیاد پر قائم ہوگا۔ دستور کی دفعہ نمبر ۵ میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ امام مہدی کی غیبت کے زمانے میں عجل اللہ تعالیٰ فرجہ اسلامی جمہوریہ ایران میں امور مملکت اور امت کی امامت ایک عادل، متقی، باخبر اور جرأت مند فقیہ کے ہاتھ میں ہوگی جسے امت کی اکثریت جانتی اور قائد مانتی ہو۔ ان صفات کا حامل فرد واحد میسر نہ ہو تو قیادت مذکورہ شرائط کی بناء پر "مجلس فقہاء" کے ذمہ ہوگی مجلس فقہاء کی تشکیل کا طریقہ قانون

کے ذریعہ متعین ہوگا۔

دستور کی دفعہ نمبر ۱۲ میں تحریر ہے کہ ایران کا سرکاری مذہب جعفری اثنا عشری اسلام ہے اور یہ ابدی اور نا قابل تبدیل ہے اس دفعہ کا مفہوم یہ ہے کہ ایران کا سرکاری مذہب اسلام نہیں بلکہ اسلام کی وہ تعبیر ہے جو فقہ جعفریہ اثنا عشریہ کے نزدیک صحیح ہے اور ایرانی دستور کی یہ دفعہ نا قابل تبدل اور ابدی ہے یعنی سارا دستور تبدیل ہوسکتا ہے لیکن دستور کی یہ اساسی دفعہ تبدیل نہیں ہوسکتی۔

دستور کی دفعہ نمبر ۷۲ میں درج ہے کہ اسمبلی ملک کے سرکاری مذہب کے خلاف کوئی قانون نہیں بنا سکتی آگے چل کر یہ تصریح بھی کر دی گئی ہے کہ اسمبلی کے منظور کردہ تمام قوانین علماء کی نگران کونسل کو بھیجے جائیں گے جو یہ جائزہ لے گی کہ قوانین سرکاری مذہب کے مطابق ہیں یا نہیں۔

دستور کی دفعہ نمبر ۱۱۵ میں درج ہے کہ صدر مملکت ایران کے سرکاری مذہب اثنا عشریہ پر ایمان و اعتقاد رکھنے والے ہی ہونگے یعنی کوئی غیر شیعہ صدارت کے منصب پر فائز نہیں ہوسکتا۔

دستور کی دفعہ ۱۲۱ میں صدر کے حلف نامے میں یہ الفاظ شامل ہیں کہ میں ریاست کے سرکاری مذہب اثنا عشریہ کا تحفظ کروں گا اس دستور کے نفاذ کے بعد ایران کا دانشور اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ خود اپنے ہی وطن میں ایک دوراہے پر کھڑا ہے وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ وہ کس طرح فقیہ کے نظریہ "ولایت فقیہ" (جو خالص کیتھولک مسیحی نظریہ پاپائیت ہے) کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرے۔ کیونکہ اس نظریہ پر مبنی موجودہ ایرانی دستور سنگین اغلاط کی ایک ایسی دستاویز ہے جس نے پورے ملک کو "خمینی پاپائیت" کی آہنی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔

ڈاکٹر سبطین لکھنوی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ!

ڈاکٹر عزت ۔ ایک معروف ایرانی عالم ہیں جو خمینی صاحب کی مقرر کردہ اس کمیٹی کے ایک رکن بھی رہ چکے ہیں جو ایرانی آئین و دستور کا مسودہ تیار کرنے کے لئے منتخب کی گئی تھی انہوں نے تہران کے صحافیوں کو ایک انٹرویو میں بتایا کہ!

"ولایت فقیہ پر مبنی ایرانی دستور کی دفعہ نمبر ۵ اسلام (مذہب شیعہ) کے لئے ایک زبردست خطرہ ہے" انہوں نے اس دفعہ کی خرابیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے بتایا کہ "حکومت اگر غلطی کرے گی تو اس کی اصلاح کی جاسکتی ہے لیکن اگر ولایت فقیہ سے غلطی سرزد ہوئی تو عوام کا اسلام اور علماء دونوں پر سے اعتماد اٹھ جائے گا"۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ انکشاف بھی کیا کہ آیت اللہ طلیعانی مرحوم جو انقلابی کونسل کے صدر تھے وہ بھی اس دفعہ کو آئین میں شامل کرنے کے سخت خلاف تھے اس بناء پر انہوں نے گذشتہ چار ماہ سے اسلامی انقلابی کونسل کا احتجاجاً مقاطعہ کر رکھا تھا۔ جناب سبط حسن ایران کے دستور کی دفعہ نمبر ۵ پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ!

"ایران کا دستور فرانس کے دستور کو مشرف بہ اسلام کرنے کی ایک کوشش ہے ایران کے آئین کے اس مسودے کا موازنہ جو صدارتی اور پارلیمانی طرز حکومت کا ملغوبہ ہے فرانس کے آئین سے کیجئے تو صاف معلوم ہوگا کہ فرانسیسی آئین کو مشرف بہ اسلام کرنے کی کوشش کی گئی ہے البتہ اس کوشش میں فرانسیسی آئین کی خوبیوں پر تو سیاہی پھیر دی گئی ہے مگر اس میں جو خامیاں ہیں ان کو برقرار رکھا گیا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ خمینی صاحب نے اپنی ذات کو پیش نظر رکھ کر یہ مسودہ تیار کیا ہے"۔

دستور کی یہ دفعہ نافذ ہوتے ہی جدید تعلیم یافتہ طبقے کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ آئین کی یہ دفعہ لامحدود قسم کی صورتیں اختیار کر سکتی ہے اس دفعہ کے تحت مہدی آخر الزماں کے اختیارات کو ولایت فقیہ کے حقیقی یا خیالی فوائد پر قربان کر دیا جائے گا اس دفعہ کی رو سے ریاست کے سربراہ کو سابق شاہ ایران سے بھی زیادہ اختیارات حاصل ہو گئے کیونکہ شاہ نے کبھی روحانی پیشوا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا جب کہ نئے آئین کے تحت ریاست کا سربراہ دنیاوی اور روحانی دونوں امور کا پیشوا ہوگا۔ حضرت علیؓ کے بعد یہ اعلیٰ مقام خمینی صاحب ہی کو نصیب ہوگا شیعہ مذہب کی پوری تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اثنا عشری مامور من اللہ اصول امامت کا ٹکراؤ فلسفہ "ولایت فقیہ" سے دو بدو ہوا"۔

(ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان صفحہ ۲۹۔ کتوبر ۱۹۹۲ء)

ایرانی انقلاب اسلامی یا شیعہ

ایرانی انقلاب کے بانی اور قائد خمینی صاحب شاہ ایران کی طرح صرف شیعہ ہی نہیں تھے بلکہ ایک غالی، متعصب، امام، فقیہ، مجتہد، آیت اللہ العظمیٰ اور نائب امام الزماں تھے لیکن اس کے باوجود جب انہوں نے تقیۃً "اسلامی انقلاب" کا نعرہ لگایا تو سنی علماء اور عوام نے بھی کردستان کے ایک بڑے عالم مفتی احمد زادہ کی قیادت میں اس تحریک کا بھرپور ساتھ دیا اور جانی و مالی قربانیاں پیش کیں اہلسنت ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی اہل تشیع سے دھوکہ کھا گئے۔ انقلاب

کی کامیابی کے بعد مفتی صاحب نے خمینی کے سامنے اپنی تجاویز پیش کیں لیکن خمینی نے اس کے برعکس اپنے نظریہ "ولایت فقیہ" پر مبنی دستور نافذ کر دیا جس کی چند اہم دفعات پیچھے گزر چکی ہیں۔ چنانچہ مفتی صاحب نے دوبارہ خمینی سے ملاقات کی اور کہا کہ جب ہم اسے شیعہ انقلاب کے بجائے اسلامی انقلاب کہتے ہیں تو پھر آپ نے دستور میں مذہب شیعہ کو سرکاری مذہب کیوں قرار دیا ہے؟ یہاں سے اطمینان بخش جواب نہ پا کر موصوف اہلسنت کے حقوق کے تحفظ کے لئے میدان میں آ گئے۔ پہلے مرحلے میں انہوں نے تہران میں ایک مسجد بنانے کی کوشش کی کیونکہ تہران میں پانچ لاکھ سے زائد سنی ہیں لیکن ان کے لئے ایک مسجد بھی نہیں ہے جب کہ تہران میں عیسائیوں کے کلیسا، آتش کدے اور دیگر عبادت گاہیں ہیں لیکن سنیوں کے لئے مساجد بنانے پر پابندی ہے کہ اس سے تفرقہ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ مفتی صاحب نے مسجد کی تعمیر کے لئے رقم اکٹھی کی لیکن حکومت نے اس رقم پر قبضہ کر لیا اور انہیں دیگر ارکین شوریٰ سمیت پابند سلاسل کر دیا۔ دنیا بھر کے مسلمان رہنماؤں نے بار ہا اپیل کی کہ انہیں رہا کیا جائے مگر بے سود۔ آخری خط میاں طفیل صاحب نے خامنہ ای کو لکھا تو انہوں نے کہا یہ ہمارا داخلی مسئلہ ہے اور ہماری خواہش ہے کہ آپ اس میں مداخلت نہ کریں اسی طرح ایرانی بلوچستان میں بھی بہت سے علماء گرفتار اور زیر عتاب ہیں۔ انقلابی حکومت نے صرف گرفتاریوں پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ بہت سے سنی علماء اور افراد کو پھانسی پر بھی لٹکا دیا۔

اہلسنت کے ساتھ اس سلوک کے باوجود خمینی اور اس کے پیروکار مسلسل "ثورة اسلامية لا شيعية ولا سنية" (اسلامی انقلاب نہ شیعہ نہ سنی) کا نعرہ بڑے زور کے ساتھ بلند کرتے رہے اور اب تک کر رہے ہیں جب کہ ایرانی دستور خود یہ گواہی دے رہا ہے کہ یہ ایک خالص شیعی اور طاغوتی انقلاب ہے۔ ایرانی انقلاب کی حقیقت بروایت جناب اختر کاشمیری صاحب ملاحظہ فرمائیں۔

"انقلاب ایران کیا ہے کیسا ہے؟ ایران میں ہم سے بار ہا یہ سوال ہوا ہم نے بار ہا جواب دیا۔ ایک کربوں عمامہ دیکھ کر ہم نے بھی سوال داغ دیا۔ مگر اس کا جو جواب سننا پڑا وہ یہ تھا کہ "انقلاب ایران شیعہ ہے نہ سنی یہ صیہونی انقلاب ہے" وہ پھڑک کر بولا۔ اتنی بات تو تم بھی جانتے ہو یہ انقلاب سنی نہیں۔ ہم نے دلچسپی لیتے ہوئے عرض کیا جی ہاں جانتے ہیں ارشاد ہوا۔

پھر شیعہ نقطہ نظر سے بھی دیکھ لو۔ شاہ کے خلاف تحریک میں مرنے والے شیعہ، انقلاب کے بعد مختلف اختلافات میں مارے جانے والے شیعہ، پاسداروں کے ہاتھوں قتل ہونے والے شیعہ، مجاہدین خلق سے تعلق کے باعث موت سے ہم آغوش ہونے والے شیعہ، بنی صدر کی حمایت کے جرم میں گولی کھانے والے شیعہ، محاذ جنگ پہ شہید ہونے والے شیعہ، ایرانی فوج شیعہ، عراقی فوج شیعہ، ملک کے اندر، ملک سے باہر تمام مرنے والے شیعہ، اب تک مرنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے یہ سارے کے سارے لوگ شیعہ ہیں یہ کیسا اسلامی انقلاب ہے جو شیعہ قوم کی نسل مٹانے پر تلا ہوا ہے؟

ایران کے قائد انقلاب کے کام کو تمام انبیاء کے کام پر ترجیح دینا خدا کے نام کے بعد صرف ان کا نام لینے کی تعلیم دینا، اقوال رسول ﷺ اور اقوال امیر علیہ السلام کی جگہ قائد انقلاب کے اقوال لکھنا، پڑھنا، بولنا، سننا اور سنانا۔ کلمہ اسلام کے دوسرے جزو کو مٹا کر پیغمبر اسلام کے نام نامی اسم گرامی کی جگہ قائد انقلاب کا نام لینا اور اس طرح ایک نیا کلمہ وضع کرنا، اپنے سوا ساری دنیا کے مسلمانوں کو کافر سمجھنا۔ عالم اسلام کے موجودہ نقشے کو بدلنے کے لئے جدوجہد کرنا۔ کعبۃ اللہ پر قبضہ کے لئے لوگوں کو تیار کرنا اور اس عمل کو جہاد کا نام دینا۔ تمام مسلم سربراہان حکومت کو کافر قرار دے کر ان کا تختہ الٹنے اور ان کی حکومتوں کو ختم کرنے کے لئے قوم کو آمادہ کرنا۔ مسجدوں میں کیمرے نصب کرنا، تصویریں اتارنا، مسجدوں میں جوتوں سمیت جانا اور محراب مسجد میں تصویریں بنانا یا چسپاں کرنا، مسجدوں میں بیٹھ کر سگریٹ نوشی کرنا، اپنے مخالفوں کو کافر کہہ کر ان کی قبریں اکھاڑنا اور لاشوں کو غیر مسلموں کے قبرستان میں ڈالنا، اختلاف رائے کا اظہار کرنے والوں کو مقدمہ چلائے بغیر گولی مار دینا، نماز میں امام کا مقتدیوں سے الگ ہو کر مسلح افراد کی نگرانی میں قیام کرنا، امام کی حفاظت کرنے والوں کے اس عمل کو نماز کا بدل قرار دے کر ان کو خدا کے فرض سے سبکدوش کرنا۔ امام کا ایسے شخص کی آواز پر رکوع و سجود کرنا جو نماز میں شریک نہیں ہوتا۔ زنا جیسی قبیح بدکاری کو مذہبی تحفظ دینا، ولدیت کی جگہ اسم مادر کو لازمی قرار دینا، نمازیوں کی جماعت پر اس لئے گولی چلانا کہ وہ سرکاری مولوی کی اقتداء میں کیوں نہیں کھڑے ہوتے؟ قائد انقلاب کی تصویر کی پوجا کرنا۔ ان کے سامنے ان کے نام کا کلمہ پڑھنا، اگر یہ اسلام ہے تو تم بتاؤ ہندو اسلام کیا ہے؟ یہ اسلامی انقلاب ہے تو صیہونی انقلاب کیا ہوتا ہے؟ (آتش کدہ ایران صفحہ ۱۰۳)

جناب اختر کاشمیری صاحب نے اس ایرانی بزرگ کی زبانی انقلاب ایران کی اصل حیثیت واضح کر دی ہے کہ یہ انقلاب نہ سنی ہے نہ شیعہ بلکہ صیہونی ہے۔ بھلا جس مذہب کا بانی ہی یہودی ہو تو اس مذہب کے تحت برپا کردہ انقلاب کو "صیہونی انقلاب" کا نام کیوں نہیں دیا جا سکتا؟

اب حل طلب بات یہ ہے کہ پھر اتنی تعداد میں شیعہ کا قتل کیوں ہوا؟ یہ سوال تو وہی کر سکتا ہے جسے خمینی صاحب کی حیثیت اور ان کے مقام و مرتبہ کا علم نہ ہو۔ جناب خمینی صاحب امام غائب کے نائب ہیں ان کی غیبت میں ان کے تمام امور و اختیارات کے مالک ہیں مزید برآں ان کی اطاعت و پیروی بھی خدا اور رسول اور ائمہ ہی کی اطاعت کی طرح فرض ہے اور ان کی اطاعت سے انحراف کرنے والے کا حکم بھی وہی ہے جو خدا اور رسول اور ائمہ کی اطاعت سے انحراف کرنے والے کا ہے (یعنی کافر و فاسق) اور ایسے لوگوں کی سزا وہی ہے جو خمینی صاحب نے دی ہے۔

ایران میں خمینی صاحب جو انقلاب لائے اسے ایران میں ظہور مہدی کا پیش خیمہ ثابت کیا گیا اور پھر اس کے لئے ایران کے آئین میں "ولایت فقیہ" کا منصب رکھا گیا۔ اس منصب پر فائز شخص ایران کے وزیر اعظم اور صدر سے ہی فائق نہیں اور محض امام غائب کا نمائندہ ہی نہیں بلکہ وہ نبی کے اختیارات کا حامل بھی ہے تو ایسے رفیع الرتبت شخص کا مخالف اور حکم عدول اگر کوئی شیعہ ہے تو وہ صرف کافر ہی نہیں بلکہ مرتد بھی ہے اور مرتد کی سزا قتل ہی ہے اب یہ مقام جانشین خمینی جناب خامنہ ای کو بھی حاصل ہے۔

ایک شیعہ خاتون نے ایک دفعہ ایک قصائی سے مرغی کا ایک کلو گوشت خریدا۔ سالم مرغا ایک کلو سے کچھ اوپر ہو گیا۔ قصائی نے اس کا پر کاٹ کر برابر کر دیا۔ ایرانی شیعہ عورت ازراہ مذاق کہنے لگی کہ یہ تو خامنہ ای بن گیا ہے (خامنہ ای کا ایک بازو ایک دھماکے میں شل ہو گیا تھا) اس مناسبت سے اس عورت نے مرغ کو خامنہ ای سے تشبیہ دے دی۔ قصائی فوراً اٹھا اور اس نے پاسداران انقلاب کو فون کر کے یہ اطلاع کر دی۔ تھوڑی دیر بعد پولیس آ گئی عورت کو پکڑ کر لے گئی اور پھر اسے فائرنگ سکواڈ کے سامنے گولیوں سے بھون دیا گیا اس کا خاوند لاش لینے آیا تو اسے کہا گیا کہ اتنے پیسے بنک میں جمع کراؤ رسید لو اور پھر آ کر لاش لے جاؤ۔ یعنی ولایت فقیہ کے دشمن اور مرتد عورت کی سرکوبی پر جو خرچ اٹھا ہے وہ بھی حکومت نے [illegible] پر ڈال دیا۔ (بحوالہ ماہنامہ الدعوۃ صفحہ ۱۸ اپریل ۱۹۹۷ء)

چونکہ خمینی انقلاب کو [illegible] ظہور مہدی" کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے اس لئے ایرانی کردوں

کی صورت میں دعا کی طرح ہاتھ اٹھا کر بڑے سوز بھرے آہنگ میں یہ دعائی نغمے بلند کرتے ہیں۔

الٰہی الٰہی تا انقلاب مہدی خمینی را نگہ دار
الٰہی الٰہی حتی ظہور مہدی احفظ لنا الخمینی

یعنی اے اللہ اے اللہ امام مہدی کا انقلاب آنے تک خمینی کو سلامت رکھ۔ اے اللہ مہدی کے ظہور تک ہمارے لئے خمینی کی حفاظت فرما۔ پھر جب خمینی موت سے نہ بچ سکے تو اب اس دعائیہ نغمے کو اس طرح تبدیل کر دیا گیا ہے کہ:

"خدایا خدایا تا انقلاب مہدی نہضت خمینی را نگاہ دار"۔

اے اللہ اے اللہ خمینی کی تحریک کو انقلاب مہدی تک سلامت رکھ۔

اس دوسرے نعرے سے انقلاب ایران کا انجام بھی خود بخود معلوم ہو گیا کہ نہ شیعہ کے امام مہدی کا ظہور ہو گا اور نہ ہی خمینی کا انقلاب باقی رہے گا۔

خمینی اپنی تحریرات کے آئینے میں

عصر حاضر میں پوری شیعی دنیا میں خمینی صاحب ایک مجتہد، امام اور نائب امام الزماں کی حیثیت سے مانے جاتے ہیں کیونکہ شیعہ اور مذہب شیعہ کے فروغ کے لئے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اس کا اندازہ ان کی وفات کے بعد تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان کے تاثرات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ تحریک کی طرف سے خمینی صاحب کا آخری وصیت نامہ طبع کرا کر ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیا گیا ناشر کی طرف سے خمینی صاحب کو بالفاظ ذیل خراج عقیدت پیش کیا گیا!

"امام۔ ہدایت کے مہر درخشاں۔ اے امام! آپ نے ہمیں غلامی کے کنوئیں سے نکلنے اور راستہ تلاش کرنے کی تدبیر سکھائی۔ اے امام! اعدائے کعبہ و محمد ﷺ نے گزشتہ سالوں میں آپ کی قوم کا بہت سخت امتحان لیا ہے اس عظیم امتحان کی اسناد آپ کے وہ شہداء ہیں جن کے نام دفتر عشق میں ثبت ہو چکے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے ابھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو خدا سے کئے ہوئے وعدے پر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ کب انہیں محبوب کی طرف سے وصال کا بلاوا آئے اور وہ لبیک کہتے ہوئے اپنی جانیں قربان کر دیں۔

اے امام! آپ مخلوق کے لئے رب العالمین کی حجت بالغہ تھے ابدی جنت آپ کا ٹھکانہ ہو آپ نے کتنے مجاہدانہ انداز میں تبلیغ بلیغ کی۔ خدا آپ سے راضی ہو اور آپ کو اس دنیا کا اجر عظیم بھی عطا فرمائے اور کروڑوں مسلمانوں کے دلوں کو آپ کے افکار عالیہ کا محفوظ ٹھکانہ بنا دے۔ آو اے ہمارے امام۔ اے ہمارے رہبر۔ اے خمینی۔ اے خدا کے بندہ صالح آپ نے تالیف قلوب کی۔ خزاں کے مارے ہوئے منحوس کووں، ویرانہ نشین الوؤں، شب پرست چمگادڑوں اور مردہ خور بجوؤں کی توقعات کے برعکس خورشید اسلام نے آپ کی آنکھوں کے افق سے طلوع کیا۔ آپ نے زندگی کی افسردہ خزاں میں بہار قرآن کا جلوہ دکھایا۔ آپ نے خدائی افکار کی ویرانی کے زمانہ میں اندیشہ توحید کے بلند و بالا محلات کی بنیاد رکھی۔ آپ نے ان لوگوں کے معاشرے کو جو کھانے پینے، سونے غم و غصہ اور شہوت ہی کو زندگی سمجھتے ہیں خالص محمدی اسلام کے دائمی کوثر زلال، ثقلین، کتاب اور عترت کے لازوال چشمہ خورشید اور حب ولایت کے منبع سے سیراب کیا۔ اے سرزمین عشق کے مظلوموں کے ملجاء و ماویٰ آپ کے کلام نے تاریخ کے کوڑے کھانے والوں کو یہ خدائی تحفہ پیش کیا آو اے مظلوموں کے حامی اور اے جدوجہد کرنے والوں کے لئے ستارہ ہدایت۔ آپ نے خدا کے لئے کیا کیا؟ اور اس نے آپ کے ساتھ کیا کیا؟ جب آپ تشریف لا رہے تھے تو گلاب اور چنبیلی کے پھولوں پر آپ نے طلوع کیا تھا اور آج آپ جا رہے ہیں نہیں نہیں سرشاری کی ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہو رہے ہیں ملکوت کی ایک بلندی سے دوسری بلندی پر جا رہے ہیں آپ عروج حاصل کر رہے ہیں کروڑوں عشاق کے دل آپ کی معراج کی سیڑھیاں ہیں۔ آسمان کے ستاروں جتنے آپ کے والہ و شیفتہ مرید اپنی آنکھوں کے آب زم زم اور اپنی پلکوں سے آپ کے راستے کی خاکروبی کر رہے ہیں۔ ہم ایک بار پھر فریاد کرتے ہیں اے روح خدا۔ اے زندہ جاوید۔ اے چشمہ الہٰی آپ کے پیروکار خدا کے پرستار ہیں ان کے دلوں میں سکون سے محو خواب ہو جائیں کہ آپ کے راستے، آپ کے اہداف و مقاصد اور آپ کے خدائی انقلاب کو آپ کے مریدین ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ آپ کے بتائے ہوئے اسلامی پیغام کی ترویج کے لئے خون کا نذرانہ تک دے دیں گے وہ پیغام جس کا ذکر آپ نے اپنے آخری سیاسی الہٰی وصیت نامے میں بھی کیا ہے۔ اے اللہ تیرے لئے بے پناہ شکر و سپاس اور بے شمار حمد و ثناء ہے کہ تو نے اپنے بندوں کو امام اور پیشوا کی شناخت کی نعمت عطا فرمائی

اور امام نے بھی کتنے اخلاص سے اپنے معتقدین اور جان نثاروں کو پہچانا۔ (صحیفہ انقلاب صفحہ ۱۰۷)

اس طویل اقتباس سے ثابت ہوتا ہے کہ خمینی صاحب پاکستانی شیعوں کے بھی امام ہیں اگر یہ انہیں نہ پہچان سکتے تو یقیناً جاہلیت کی موت مرتے یہ الگ بات ہے کہ تحریک کے دوران جب ہزاروں شیعہ امام کے فرمان پر لبیک کہتے ہوئے قربان ہو رہے تھے تو پاکستانی شیعوں کی ہمدردیاں شاہ ایران کے ساتھ تھیں چنانچہ جماعت اسلامی کے ممتاز رہنما حافظ محمد ادریس صاحب لکھتے ہیں کہ

"انقلاب ایران کی جدوجہد کے دوران بد قسمتی سے پاکستانی شیعہ برادری شاہ کے حق میں اور امام خمینی کے خلاف تھی اور بعض دیگر افراد، ادارے اور جماعتیں سنی ہونے کے باوجود انقلابی قوتوں کے حامی تھے۔ ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے کہ انقلاب کی کامیابی کے بعد شیعہ برادری انقلابیوں کی منظور نظر ہے اور ان کے پرانے حامی دشمن نہیں تو کم از کم مخالفوں کے زمرے میں شمار کیے جاتے ہیں"۔ (ہفت روزہ زندگی لاہور ۱۵ مارچ ۱۹۹۰ء)

اب خمینی صاحب کی اپنی تصانیف میں سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں تاکہ ان کے انقلاب کی حقیقت سمجھنے میں مزید آسانی ہو۔ اثنا عشریہ کے عقائد و نظریات آگے مستقل عنوان کے تحت آ رہے ہیں۔

جناب خمینی صاحب مذہب شیعہ سے اپنی وابستگی کا بایں الفاظ اظہار کرتے ہیں۔

"ہمیں فخر ہے کہ ہم ایسے مذہب کے پیرو ہیں جس کی بنیاد خدا کے حکم پر رسول کریمؐ نے رکھی تھی اور امیر المومنین علی بن ابی طالب جیسا تمام قیود سے آزاد بندۂ خدا انسانوں کو تمام زنجیروں اور غلامیوں سے رہائی دلانے پر مامور ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ کتاب نہج البلاغۃ جو قرآن کے بعد مادی و روحانی زندگی کا عظیم ترین دستور، انسانیت کو آزادی عطا کرنے والی بلند ترین کتاب ہے اور جس کے روحانی اور حکومتی احکام سب سے بڑی راہ نجات ہیں وہ ہمارے امام معصوم کا کلام ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ تمام ائمہ معصومین حضرت علی بن ابی طالب سے لے کر انسانیت کے نجات دہندہ حضرت مہدی صاحب الزماں علیھم الالف التحیۃ والسلام تک جو قادر حق کی قدرت سے زندہ اور ہمارے تمام امور کے شاہد ہیں ہمارے امام ہیں۔

ہمیں فخر ہے کہ زندگی بخش دعائیں جنہیں "قرآن صاعد" (آسمان کی طرف اٹھنے

قرآن) کہتے ہیں ہمارے ائمہ معصومین کی ہیں ائمہ کی "مناجات شعبانیہ" حضرت حسین بن علی کی "دعائے عرفات"، "صحیفہ سجادیہ" جو آل محمد ﷺ کی زبور ہے اور "صحیفہ فاطمیہ" جو حضرت زہرا مرضیہ پر خدا کی طرف سے القا اور الہام شدہ ہے یہ سب ہماری ہیں اور ہمارے لئے باعث افتخار ہیں۔

ہمیں فخر ہے کہ باقر العلوم ہمارے ہیں جو تاریخ کی عظیم ترین شخصیت ہیں اور خدا، رسول اور ائمہ معصومین کے سوا کسی نے ان کا مقام نہیں پہچانا اور ان کے سوا نہ کوئی ان کے مقام کا ادراک کر سکتا ہے اور ہمیں فخر ہے کہ ہمارا مذہب جعفری ہے اور ہماری فقہ جو ایک بے پایاں سمندر ہے ہمارے مذہب کے آثار میں سے ہے ہمیں تمام ائمہ پر فخر ہے اور ہم نے ان سب کی پیروی کا عہد کر رکھا ہے۔

ہمیں فخر ہے کہ ہمارے ائمہ معصومین نے دین اسلام کی سربلندی اور قرآن کریم کے عملی نفاذ کے لئے جس کا ایک پہلو حکومت عدل کی تشکیل ہے قید و بند اور جلا وطنی کی صعوبتیں جھیلیں اور آخرکار اپنے زمانے کی ظالم اور طاغوتی حکومتوں کے خاتمے کی کوششوں میں شہید ہو گئے اور آج ہمیں فخر ہے کہ ہم قرآن و سنت کے احکام کو نافذ کر رہے ہیں۔

میں انتہائی سنجیدگی اور عاجزی کے ساتھ تمام مسلمان اقوام سے یہ خواہش کرتا ہوں کہ وہ ائمہ اطہار اور دنیائے انسانیت کے ان عظیم رہنماؤں کی سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور فوجی تعلیمات کی تہہ دل سے پیروی کریں اور اس سلسلے میں جان و مال اور عزیزوں کی قربانی کی پرواہ نہ کریں۔ ان سب میں روایتی فقہ سے سرمو انحراف نہ کریں کہ یہ روایتی فقہ رسالت و امامت کے مکتب کی آئینہ دار اور قوموں کی عظمت اور ان کی رشد و ہدایت کی ضامن ہے۔

اسی طرح عزاداری ائمہ اطہار خصوصاً سید الشہداء مظلوم کربلا حضرت ابی عبداللہ الحسین کے مراسم عزاداری سے کبھی غفلت نہ کریں کہ یہ بھی تعلیمات ائمہ کا حصہ ہیں۔

مکتب رسالت و امامت کے دشمنوں پر نفرین پوری تاریخ کے ظالموں کے خلاف اقوام کی مردانہ وار فریاد ہے اور جان لیں کہ تاریخ اسلام کی اس داستان شجاعت کی تجلیل کے لئے ائمہ اطہار کا جو حکم ہے اور آل بیت پر ظلم کرنے والوں پر جو لعنت و نفرین ہے وہ ابد تک کے لئے پوری تاریخ کے ظالموں کے خلاف مختلف اقوام کی مردانہ وار فریاد ہے اور جان لیں کہ بنی امیہ لعنۃ اللہ علیہم کے ظلم و ستم کے خلاف لعنت و نفرین اور فریاد باوجودیکہ وہ ختم ہو گئے ہیں اور جہنم

داخل ہو چکے ہیں دنیا بھر کے ظالموں کے خلاف فریاد اور اس ظلم شکن فریاد کی جھلکی ایک کوشش ہے اور ضروری ہے کہ نوحوں، مرثیوں اور ائمہ حق کے مدحیہ اشعار میں پوری شدت کے ساتھ ہر زمانے اور ہر ملک کے ظالموں کے ظلم و ستم اور ان کی بداعمالیوں کا ذکر کیا جائے۔ خدا کے عظیم حرم کے غاصب آل سعود بھی ان ہی ظالموں میں شامل ہیں ان سب پر خدا اس کے ملائکہ اور اس کے رسولوں کی لعنت ہو پوری شد و مد کے ساتھ ان کا ذکر کیا جائے اور ان پر لعنت و نفرین کی جائے ہم سب کو جان لینا چاہیے کہ یہی سیاسی رسومات وحدت مسلمین کا سبب ہیں اور مسلمانوں خصوصاً ائمہ اثنا عشریہ کے شیعوں کی قومیت کے محافظ ہیں اور ضروری ہے کہ میں یاد دہانی کرا دوں کہ میرا یہ سیاسی اور الٰہی وصیت نامہ صرف ایران کی عظیم قوم کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ تمام اسلامی اقوام اور دنیا کے ہر مذہب و ملت کے مظلوموں کے لئے ہے۔

(وصیت نامہ امام خمینی۔ مجلہ انقلاب صفحہ ۲۰-۲۵ مطبوعہ تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان)

خمینی صاحب نے اپنے آخری وصیت نامے میں شیعی رسومات کی ادائیگی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان پر لعنت و نفرین کو "وحدت مسلمین" کا سبب قرار دیا ہے۔ خانہ فرہنگ ایران ملتان نے موصوف کے تقریری اقتباسات پر مبنی ایک کتابچہ "اتحاد و یک جہتی" شائع کیا ہے اس میں "اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے والے عوامل" کے تحت ایک جزو "مہدویت پر اعتقاد" کا ذکر بھی کیا گیا ہے یعنی "ظہور مہدی" پر اعتقاد و ایمان سے مسلمانوں کے درمیان اتحاد و یک جہتی پیدا ہوگی۔ اس حصے میں خمینی صاحب فرماتے ہیں کہ!

"جو نبی بھی آئے وہ انصاف کے نفاذ کے لئے آئے۔ ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ تمام دنیا میں انصاف کا نفاذ کریں لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ ختم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام جو انسان کی اصلاح کے لئے آئے تھے اور انصاف کا نفاذ کرنے کے لئے آئے تھے۔ انسان کی تربیت کے لئے آئے تھے لیکن وہ اپنے زمانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ وہ آدمی جو اس معنی میں کامیاب ہوگا اور تمام دنیا میں انصاف کو نافذ کرے گا۔ خدائے تبارک و تعالیٰ نے ان حضرت ولی عصر ارواحنا لہ الفداء کا ذخیرہ کیا ہے ان ہی معنی میں جس کی تمام نبیوں کو آرزو تھی لیکن رکاوٹوں کی وجہ سے وہ ان کو نافذ نہ کر سکے تمام اولیاء کی یہ آرزو تھی لیکن وہ بھی نافذ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے وہ اس بزرگوار کے ہاتھوں نافذ ہو جائے لہٰذا اس معنی میں (حضرت صاحب

ورواحسنہ الفقہاء) کا جشن میلاد مسلمانوں کے لئے سب سے بڑی عید ہے صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ انسان کے لئے بھی سب سے بڑی عید ہے۔

(اتحاد یک جہتی صفحہ ۱۵-۱۵ شعبان ۱۴۰۰ھ کے موقع پر تقریر)

خمینی صاحب نیشنل ٹیلی ویژن کے دوسرے حصے کے افتتاح کے موقع پر ارشاد فرماتے ہیں کہ!

"امام زمان معاشرتی انصاف کے پیغام کے حامل ہوں گے اور پوری دنیا کو عدل مہیا کریں گے یہ ایسا فریضہ ہے جس میں پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ بھی پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے۔ اگر حضور علیہ السلام کا جشن ولادت پوری دنیائے اسلام کے لئے پر عظمت ہے تو امام زمان کا جشن منانا تمام دنیا کے انسانوں کے لئے زیادہ پر عظمت ہے میں اس کو لیڈر نہیں کہہ سکتا کیونکہ ان کی حیثیت اس سے زیادہ ارفع ہے میں اس کو اول بھی نہیں کہہ سکتا کیونکہ اس کے بعد دوسرا کوئی نہیں ہے"۔ (تہران ٹائمز ۲۹ جون ۱۹۸۰ء)

کویت کے ایک اخبار نے ریڈیو تہران کے حوالے سے یہ الفاظ بھی لکھے ہیں کہ

"ہم انہیں رئیس اور سردار نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ اس سے بالاتر ہیں ہم انہیں پہلا آدمی بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان کا کوئی ثانی و مثیل بھی نہیں ہے ان ہی وجوہ سے "مہدی منتظر موعود" کے علاوہ کسی اور لفظ سے ہم ان کی تعریف و توصیف بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتے"۔ (الرای العام ۲۰ مئی ۱۹۸۰ء)

شیعہ مذہب کی تمام تر بنیاد "عقیدہ امامت" پر قائم ہے اس لئے خمینی صاحب نے بھی اس پر بہت زور صرف کیا ہے یہاں تک کہ اسے ایران کے دستور کی دفعہ نمبر ۲ میں "الایمان بالامامة و القيادة المستمرة" کے تحت باقاعدہ تحفظ دیا ہے۔ موصوف نے اپنی کتاب کشف الاسرار میں "نبوت و امامت جزء دین است" کا عنوان قائم کیا ہے پھر قرآن کی بہت سی آیات میں تحریف معنوی کا ارتکاب کرتے ہوئے ائمہ کی امامت ثابت کی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ "من مات ولم يعرف امام زمانه مات ميتة الجاهلية" یعنی جو شخص اس حالت میں مر گیا کہ اس نے اپنے امام زمانہ کو نہیں پہچانا تو وہ عہد جاہلیت کی موت مرا۔ (کشف الاسرار صفحہ ۱۴۸-۱۴۷)

خمینی صاحب لکھتے ہیں کہ! "رسول خدا نے اپنے بعد کے لئے امیر المومنین علی کو

لوگوں پر ولی نامزد کیا اور امامت کا یہ منصب ایک امام سے دوسرے امام کے سپرد ہوتا رہا یہاں تک کہ یہ سلسلہ اثنا عشر امام پر پہنچ کر ختم ہو گیا"۔ (الحکومۃ الاسلامیہ صفحہ ۹۸)

"تمام لوگوں کو امامت کی حقیقت سمجھاؤ اور ان سے کہہ دو کہ ہم امامت پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اس بات پر بھی ہمارا عقیدہ ہے کہ رسول ﷺ نے اللہ کے حکم سے اپنا خلیفہ نامزد کیا تھا"۔

{حوالہ مذکور صفحہ ۲۳}

"ہم امامت کا عقیدہ رکھتے ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ نبی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے بعد کے لئے خلیفہ متعین کریں اور آپ نے متعین کیا اور اپنے بعد کے لئے خلیفہ کا متعین کر جانا وہ عمل ہے جو آپ ﷺ کے فریضہ رسالت کو مکمل اور پورا کرنے والا ہے۔ اگر اپنے بعد کے لئے خلیفہ مقرر نہ کر جاتے تو سمجھا جاتا کہ رسول ﷺ نے فریضہ رسالت کی تبلیغ نہیں کی"۔

{حوالہ مذکور صفحہ ۱۸، ۱۹، ۲۳}

خمینی اعتقاد میں یہ ائمہ خاکی نہیں بلکہ نوری مخلوق ہیں جو اپنی پیدائش سے پہلے عرش کا احاطہ کئے ہوئے تھے امام کو وہ اعلیٰ مقام و بلند درجہ اور تکوینی حکومت حاصل ہوتی ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ان کے حکم و اقتدار کے سامنے سرنگوں ہوتا ہے اور ہمارے مذہب کے ضروری اور بنیادی عقائد میں سے یہ عقیدہ بھی ہے کہ ہمارے امام مقام و مرتبہ کی جس بلندی پر فائز ہیں وہاں تک کوئی مقرب فرشتہ اور نبی مرسل بھی نہیں پہنچ سکتا"۔ {حوالہ مذکور صفحہ ۵۲}

ائمہ وہ ہستیاں ہیں کہ ان کے بارے میں سہو و غفلت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ائمہ کی تعلیمات قرآنی تعلیمات کی طرح ہیں وہ کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہیں بلکہ وہ ہر زمانہ اور ہر علاقہ کے لوگوں کے لئے ہیں اور تا قیامت ان کی تنفیذ اور ان کی اتباع واجب ہے۔

{حوالہ مذکور صفحہ ۹۱، ۱۱۳}

خمینی صاحب سورہ مائدہ کی آیت "يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ" کے تحت لکھتے ہیں کہ یہ آیت غدیر خم کے دن حضرت علی کے بارے میں نازل ہوئی۔ نبی اکرم ﷺ حضرت علی کی امامت کی تبلیغ و اعلان میں لوگوں سے خائف تھے اور اگر کوئی شخص کتب تاریخ و روایات کی طرف رجوع کرے تو وہ جان لے گا کہ پیغمبر ﷺ کا خوف بجا تھا۔ (کشف الاسرار صفحہ ۱۴۹)

موصوف یہی بات ایک دوسری کتاب میں یوں نقل کرتے ہیں

"کہ اور حجۃ الوداع میں غدیر خم کے مقام پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو اپنے بعد حاکم مقرر کر دیا اور اسی وقت سے قوم کے دلوں میں مخالفت کا سلسلہ شروع ہو گیا"۔

(حکومت اسلامیہ صفحہ ۲۷)

خمینی اعتقاد کے مطابق نبی اکرم ﷺ پر اپنے بعد کے لئے امام و خلیفہ کا مقرر کرنا واجب اور فرائض نبوت میں سے ہے اگر آپ ﷺ خلیفہ مقرر نہ کرتے تو آپ ﷺ فریضۂ رسالت میں کوتاہی کرنے والے ہوتے مگر آپ ﷺ نے اپنی وفات سے ستر دن پہلے حجۃ الوداع سے واپس لوٹتے ہوئے غدیر خم کے مقام پر اس فریضہ کی تکمیل فرمائی اور اپنے بعد کے لئے نہ صرف یہ کہ حضرت علیؓ کو خلیفہ و امام مقرر کیا بلکہ اس موقع پر موجود تمام صحابہؓ سے ان کی خلافت و امامت پر بیعت بھی لی۔

واقعہ غدیر مذہب شیعہ کی اساس اور بنیاد ہے اور اس پر تمام شیعوں کا ایمان ہے خواہ وہ کیسانی ہوں، زیدی ہوں، اسماعیلی ہوں یا اثنا عشری اس واقعے کو درست مان لینے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حضور علیہ السلام کی رحلت کے بعد جب تمام صحابہؓ نے حضرت علیؓ کی امامت کے بارے میں آپ ﷺ کے عہد و پیمان کو پس پشت ڈال کر حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا تو سب نے آپ ﷺ کے ساتھ بے وفائی اور غداری کی بالخصوص حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ نے تو بد عہدی کی انتہا کر دی کہ حضرت علیؓ کو اس منصب سے بے دخل کر کے خود مسند خلافت پر قبضہ جما لیا۔ لہٰذا ان تمام حضرات کو اس غداری کی بناء پر کافر اور مرتد قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ شیعہ محدث ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی امام باقر کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ

"رسول اللہ کی وفات کے بعد سب لوگ مرتد ہو گئے سوائے تین کے (راوی کہتا ہے) میں نے عرض کیا کہ وہ تین کون تھے؟ تو انہوں نے فرمایا مقداد بن الاسود، ابوذر غفاری اور سلمان فارسی ان پر اللہ کی رحمت ہو اور برکات۔ (فروع کافی کتاب الروضہ صفحہ ۱۱۵ جلد ۳)

یہی روایت خمینی صاحب کے ممدوح ملا باقر مجلسی نے اپنی کتاب عین الحیوۃ صفحہ ۱۳ پر نقل کی ہے۔

خمینی صاحب نے اپنی کتاب کشف الاسرار میں "گفتار دوم۔ در امامت" کے تحت مسئلہ امامت پر طویل بحث کی ہے یہ ساری بحث اس سوال کے جواب میں ہے کہ "اگر اصول

مذہب میں سے چوتھی اصل امامت ہے اور بقول مفسرین قرآن کی اکثر آیات سے امامت کا ثبوت ملتا ہے تو خدا نے قرآن میں اس اہم ترین اصل کا ایک بار بھی کیوں صراحتاً کیوں نہیں ذکر کیا تاکہ اس مسئلہ کی وجہ سے جو جھگڑے اور خونریزیاں ہوئی ہیں پیش نہ آتیں۔ (کشف الاسرار صفحہ ۱۰۵)

موصوف نے اس سوال کے جواب سے پہلے ایک طویل تمہید ذکر کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

"خدائے جہاں نے جس کا ہر کام عقل کی مضبوط بنیاد پر قائم ہے اپنے رسول ﷺ کو بھیج کر دین توحید اور بعد ازاں آہستہ آہستہ قانون خداوندی کے مطابق ایک حکومت عادلہ کی تعمیر و تکمیل کرائی جب یہ عمارت مکمل ہو گئی تو عقل کا تقاضا یہی ہے کہ جس خدا نے دین کی اس عمارت کی تعمیر و تکمیل کرائی وہی اس کی بقاء کا بھی انتظام کرے اور اپنے پیغمبر ﷺ کے ذریعے اس کے بارے میں ہدایت دے بالفرض اگر خدا ایسا نہ کرتا تو یہ تقاضائے عقل کے خلاف ہوتا اور وہ اس کا مستحق نہ ہوتا کہ ہم اسے معبود مان کر اس کی طاعت و عبادت کریں ہم ایسے خدا کو جانتے اور اس کی پرستش کرتے ہیں جس کے سارے کام عقل کی بنیاد پر قائم ہیں اور عقل کے خلاف وہ کوئی کام نہیں کرتا نہ کہ ایسے خدا کی جو خدا پرستی عدالت اور دینداری کی بلند عمارت تیار کر کے خود اس کی ویرانی کے درپے ہو جائے اور یزید، معاویہ اور عثمان جیسے بدقماشوں کو امارت و حکومت سپرد کر دے۔

(حوالہ مذکور صفحہ ۱۰۷)

موصوف اسی تمہید میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"ابھی ہم شیخین سے کوئی سروکار نہیں رکھتے (ان کے متعلق گفتگو آگے ہوگی ورنہ) ان کی قرآن پاک سے مخالفت، احکام خدا کے ساتھ کھلواڑ کرنا اور اپنی جانب سے حلال و حرام ٹھہرانا، دختر پیغمبر ﷺ فاطمہؓ اور ان کی اولاد پر ان کے ظلم و ستم اور احکام خدا و دین سے ناواقفیت۔

اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی احکام دین سے ناواقفیت کی چند مثالیں بیان کرنے کے بعد حضرت عمرؓ کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"عمر کے اعمال و افعال تو اس سے بھی کہیں زیادہ ہیں کہ اس نے امیر المؤمنین حضرت علیؓ کے منع کرنے کے باوجود حاملہ اور دیوانی عورت کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ خدا اور پیغمبر ﷺ کے حکم کے برخلاف متعہ حج اور متعہ زن کو حرام قرار دیا اور پیغمبر ﷺ کے گھر میں آگ

نکالی۔ لیکن عثمان، معاویہ اور یزید کے افعال کو تو سارا عالم جانتا و پہچانتا ہے اس قسم کے جاہل، بے وقوف، بدقماش اور ظالم لوگ امامت اور اولو الامری کے لائق نہیں ہیں ایسے خلاف شرع امور کے مرتکبین کو امام و خلیفہ تسلیم کرنا اور اللہ کی طرف سے ان کی اطاعت کا واجب ہونا از روئے عقل و شرع کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے؟

اس کے بعد انہوں نے "گفتار شیعہ در باب امامت" کے عنوان کے تحت امامت کے بارے میں شیعہ، سنی اختلاف کا ذکر کر کے شیعی نقطہ نظر پیش کیا ہے کہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت علی اور حسن و حسین، سلمان فارسی، ابوذر غفاری، مقداد، عمار اور عباس و ابن عباس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ امامت کے بارے میں اللہ اور پیغمبر ﷺ کے حکم پر عمل کیا جائے (جس میں حضرت علیؓ کو آپ ﷺ کا وصی، جانشین، امام اور ولی الامر مقرر کیا گیا تھا) لیکن وہ پارٹی بندی اور طمع و ہوس جس نے ہمیشہ حقیقت کو پامال کیا ہے اور غلط کام کرائے ہیں اس موقع پر بھی اپنا کام کیا اور معتبر تاریخی شہادت کے مطابق یہ حضرات پیغمبر کی تدفین کے کام میں مشغول تھے کہ سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع میں حکومت کے لئے ابوبکر کو منتخب کر لیا گیا اور یہ عمارت خلافت کی پہلی اینٹ تھی جو ٹیڑھی رکھی گئی یہیں سے اختلاف شروع ہو گیا۔ شیعہ کہتے ہیں۔ کہ امام کا تعین خدا کی طرف سے ہونا چاہیے اور خود خدا و پیغمبر ﷺ نے علیؓ اور ان کی اولاد میں سے ائمہ معصومین کو امام اور اولو الامر متعین کیا ہے۔

اس طویل اور دلخراش تمہید کے بعد یہ سوال کیا ہے کہ اگر حضرت علی اور ان کی اولاد میں سے ائمہ معصومین کی امامت کا مسئلہ شیعی نقطہ نظر سے از روئے عقل، قرآن اور اسلام کے اہم اصولوں میں سے ہے تو پھر خدا نے قرآن میں امام کا ذکر کیوں نہیں کیا؟! اگر قرآن میں صراحتاً امام کا ذکر کر دیا جاتا تو اس مسئلہ میں اختلاف پیدا نہ ہوتا اور یہ ساری خون ریزیاں نہ ہوتیں۔

خمینی صاحب نے اس سوال کے پانچ جواب دیئے ہیں جن میں سے آخری تین جوابوں میں صحابہ کرامؓ پر دل کھول کر لعن طعن کیا ہے۔

جواب ۳۔ اگر بالفرض قرآن میں صراحتاً امام کا نام ذکر کر دیا جاتا تو اس سے یہ کیوں کر سمجھ لیا جاتا کہ مسئلہ امامت میں مسلمانوں کے درمیان باہمی اختلاف واقع نہ ہوتا۔ کیوں کہ جن لوگوں نے ریاست کی طمع میں برسوں سے اپنے آپ کو دین پیغمبر ﷺ سے چپکا رکھا تھا اور پارٹی بازی میں

لگے ہوئے تھے ان سے ممکن نہیں تھا کہ قرآن کے فرمان پر اپنے منصوبے سے دست بردار ہو جاتے بلکہ ہر ممکن تدبیر کو کام میں لا کر اپنے مقصد کو حاصل کرتے بلکہ قرآن میں امام کی تعیین کی صورت میں مسلمانوں میں ایسا خطرناک اختلاف رونما ہو جاتا جو اسلام کی بنیاد کے انہدام ہی پر ختم ہوتا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جو لوگ حصول ریاست کے درپے تھے جب یہ دیکھتے کہ اسلام کے نام سے وہ مقصد تک نہیں پہنچ سکتے تو اعلانیہ اسلام کے خلاف پارٹی بنا لیتے۔

جواب ۴۔۔۔ اسلام کا نام قرآن میں ذکر کر دینے کی صورت میں عین ممکن تھا کہ وہ لوگ جو دنیا اور اقتدار کے علاوہ اسلام اور قرآن سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے اور قرآن کو اپنے اغراض فاسدہ کے حصول کا ذریعہ بنا رکھا تھا ان آیات کو (جن میں امام کا نام مذکور ہوتا) قرآن سے نکال دیتے اور کلام الٰہی میں تحریف کر دیتے۔

جواب ۵۔۔۔ بالفرض اوپر مذکور امور میں سے اگر ایک بھی پیش نہ آتا جب بھی اس مسئلہ میں مسلمانوں کے باہمی نزاع کا تصفیہ نہ ہو پاتا۔ کیونکہ یہ اقتدار پسند پارٹی جس کے لئے اپنے منصوبے سے دست بردار ہو جانا ممکن نہ تھا فوراً پیغمبر اسلام کی جانب منسوب کرتے ہوئے ایک حدیث گھڑ کر پیش کر دیتی کہ آپ ﷺ نے رحلت کے وقت فرمایا تھا کہ تمہاری امارت کا مسئلہ باہمی مشورے سے طے ہوگا۔ علی بن ابی طالب کو خدا نے منصب امامت سے معزول کر دیا ہے۔

(کشف الاسرار صفحہ ۱۱۳-۱۱۴)

اس کے بعد خمینی صاحب نے "مخالفتہائے ابوبکر بانص قرآن" اور "مخالفتہائے عمر با قرآن" کے دو عنوان قائم کر کے حضرات شیخین کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا۔ پھر آخر میں "حدیث قرطاس" کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کے بارے میں یہاں تک لکھ دیا کہ یہ بے ہودہ کلام جو کفر و زندقہ کی بناء پر ظاہر ہوا ہے قرآن کی آیات کے مخالف ہے آگے چل کر اسی بات کو یوں دہرایا کہ چنانچہ کتب حدیث و تاریخ کی طرف مراجعت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کفر آمیز گفتگو کرنے والا عمر تھا اور بعض دوسروں نے اس بات میں اس کی متابعت کی ہے (کشف الاسرار صفحہ ۱۱۹-۱۲۰)

زیر نظر کتاب کی تالیف کا مقصد شیعی عقائد و نظریات اور اہل تشیع کے ہفوات و بکواسات کا جواب دینا نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد تو فقط شیعیت کا تعارف اور اس کی اجمالی تاریخ سے قارئین کو روشناس کرانا ہے لیکن یہاں اس کا ذکر کرنا مناسب نہیں ہوگا کہ خمینی صاحب نے

حضرت عمرؓ کے جس کلام کو کفر و زندقہ اور بے ہودہ کلام کا نام دیا ہے اسی کلام کو ایک دوسرے عظیم فلسفی شاعر مشرق علامہ محمد اقبال نے "اسلام کی روح" قرار دیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

"آج جو مسئلہ ترکوں کو درپیش ہے کل دوسرے بلاد اسلامیہ کو پیش آنے والا ہے اور اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی قانون میں کیا فی الواقع مزید نشوونما اور ارتقاء کی گنجائش ہے۔ لیکن اس سوال کے جواب میں ہمیں بڑی زبردست کاوش اور محنت سے کام لینا پڑے گا گو ذاتی طور پر مجھے یقین ہے کہ اس کا جواب اثبات ہی میں دیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہم اس مسئلہ میں وہی روح برقرار رکھیں۔ جس کا اظہار کبھی حضرت عمرؓ کی ذات میں ہوا تھا۔ وہ امت کے اولین دل و دماغ ہیں جو ہر معاملے میں آزادی رائے اور تنقید سے کام لیتے تھے اور جن کی اخلاقی جرأت کا یہ عالم تھا کہ حضور رسالت مآب ﷺ کی حالت نزع میں یہاں تک کہہ دیا کہ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے"۔ (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ صفحہ ۲۶۹ ترجمہ سید نذیر نیازی۔ بزم اقبال لاہور)

اس کے بعد جناب خمینی صاحب اپنی اس بحث کا خلاصہ بہ عنوان "نتیجہ سخن مادریں بارہ" پیش کرتے ہیں کہ!

"ان تمام حوالوں سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ مسلمانوں کے سامنے شیخین کا قرآن کی مخالفت کرنا کوئی اہم بات نہیں تھی کیونکہ مسلمان (جملہ صحابہ کرامؓ) یا تو خود ان کی جماعت میں شامل تھے اور حصول اقتدار کے مقصد میں ان کے شریک کار تھے یا اگر ان کے شریک اور ہم نوا نہیں تھے تو ایسے ستم پیشہ افراد کے مقابلہ میں جو خود رسول خدا ﷺ اور آپ ﷺ کی لخت جگر فاطمہ کے ساتھ ظالمانہ سلوک کر چکے تھے ایک حرف بھی زبان پر لانے کی جرأت نہیں رکھتے تھے یا اگر کبھی ہمت کر کے کسی نے کچھ کہہ بھی دیا تو یہ (شیخین) اس کی بالکل پرواہ نہیں کرتے تھے حاصل کلام یہ کہ اگر قرآن میں بحیثیت امام کے حضرت علیؓ کے نام کی صراحت کر دی گئی ہوتی جب بھی یہ لوگ اپنے منصوبہ سے دست بردار نہ ہوتے اور خدا کے کہنے سے ریاست طلبی سے باز نہ آتے اور ابوبکر جنہوں نے پہلے ہی سے خفیہ منصوبہ تیار کر رکھا تھا ایک حدیث گھڑ کے پیش کر دیتے اور معاملے کو ختم کر دیتے جیسا کہ آیت وراثت کے بارے میں انہوں نے کیا اور عمر سے بھی یہ بعید نہ تھا کہ وہ یہ کہہ کر معاملہ ختم کر دیتے کہ یا تو خدا سے اس آیت کے نازل کرنے میں یا جبرائیل یا رسول خدا سے اس کی تبلیغ میں غلطی ہو گئی اس وقت سنی لوگ بھی ان کی تائید میں کھڑے

ہو جاتے اور خدا کے مقابلے میں ان ہی کی بات مانتے جیسا کہ عمر کی ان ساری تبدیلیوں کے بارے میں جو انہوں نے قرآن و سنت میں کی ہیں سنیوں کا یہی رویہ ہے" (کشف الاسرار صفحہ ۱۱۹-۱۲۰)

خمینی صاحب کی اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں دین اسلام کو مسخ کرتے رہے مگر کسی صحابی نے ان کے عمل پر نکیر نہیں کی۔ کیونکہ تمام صحابہؓ یا تو حضرات شیخینؓ کے ہم نوا تھے یا ان کے ظلم و تشدد سے خائف تھے اور اگر کبھی کسی نے جرأت و ہمت کر کے کوئی بات کہہ بھی دی تو شیخینؓ نے اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ اس لئے اگر حضرت علیؓ کا نام بحیثیت وصی و امام قرآن میں ذکر کر بھی دیا جاتا تو یہ لوگ ضرور اسے حذف کر دیتے اور اگر حذف نہ بھی کرتے تو اس کے مقابلے میں کوئی حدیث گھڑ کر پیش کر دیتے یا یہ کہہ دیتے کہ اس آیت کے نازل کرنے میں خدا سے غلطی ہو گئی ہے یا اس کی تبلیغ میں جبرائیل یا پیغمبر ﷺ سے بھول چوک ہو گئی ہے اور تمام سنی بھی قرآن و حدیث کے مقابلے میں شیخینؓ ہی کے احکام کو قبول کرتے اور ان ہی کی پیروی و اتباع کرتے۔ خمینی صاحب کی ان ہفوات کو تسلیم کر لینے کے بعد قرآن و حدیث پر جو امت کا اعتماد ہے کیا وہ برقرار رہ سکتا ہے؟

موصوف نے اسی بحث امامت میں آگے چل کر حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کی پاکیزہ سیرت پر ان الفاظ میں کیچڑ اچھالا ہے۔

"ہر قانون گذار قانون کو دنیا میں جاری کرنے اور عمل کرنے کے لئے چھوڑ کر جاتا ہے نہ کہ صرف لکھنے اور پڑھنے کے لئے اور لازمی طور پر معلوم ہے کہ دینی قوانین اور خدائی احکامات صرف رسول خدا کے زمانے ہی کے لئے نہیں تھے بلکہ آپ ﷺ کے بعد بھی ان قوانین کا اجرا مطلوب ہے جیسا کہ واضح ہے اور ہم بعد میں اسے ثابت بھی کریں گے۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ رسول خدا کے بعد کے لئے خدائے دو جہاں ان قوانین کو جاری و نافذ کرنے کے لئے ایسے شخص کو متعین کرے جو خدا اور رسول خدا کے ایک ایک فرمان کو بلا کم و کاست جانتا ہو اور خدا کے قانون کے جاری کرنے میں خطا کار، خائن، جھوٹا، ظلم پیشہ، مفاد پرست، لالچی، اقتدار پرست نہ ہو اور نہ خود احکام خداوندی کی مخالفت کرے اور نہ کسی کو مخالفت کرنے دے۔ خدا اور دین کے راستے میں اپنے مفاد اور اپنی ذات کو ترجیح نہ دے اور ان اوصاف کا مالک رسول خدا کے بعد پوری امت میں بشہادت تاریخ و اخبار علی بن ابی طالب کے علاوہ کوئی نہیں تھا"۔

خمینی نے "غیر از علی بن ابی طالب" پر حسب ذیل حاشیہ بھی لکھا ہے کہ "اس سے قبل ابو بکر و عمر کی مخالفت قرآن کا مختصر تذکرہ میں کر چکا ہوں جو شخص اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہے وہ فصول المہمہ کی طرف مراجعت کرے"۔ (کشف الاسرار صفحہ ۱۲۲)

خمینی صاحب اپنی اس طویل عبارت میں بتا رہے ہیں کہ حضرت علیؓ کے علاوہ پوری جماعت صحابہ خدا اور رسول ﷺ کی تعلیمات سے نا آشنا، خطا کار، غلط انداز، خائن، دروغ گو، ظلم پیشہ، مفاد پرست، لالچی، اقتدار پسند، جاہ پرست، خدا اور دین خدا کے مقابلے میں اپنی ذات اور اپنے نفع کو ترجیح دینے والی تھی۔

موصوف کی بیان کردہ اس فہرست میں وہ کون سی اخلاقی خرابی باقی رہ گئی ہے جو صحابہؓ جیسی مقدس جماعت کے سر نہیں منڈھی گئی خمینی صاحب نے اسی کتاب میں حضرت عثمانؓ اور حضرت معاویہؓ کا نام لے کر انہیں "جاہل، بے وقوف، بد قماش اور ظالم کہا ہے"۔ (کشف الاسرار صفحہ ۱۰۷)

موصوف ایک دوسری کتاب میں صحابی اور کاتب وحی حضرت معاویہؓ کے متعلق لکھتے ہیں کہ "معاویہ کی حکومت اسلامی حکومت کے ساتھ نہ قریب کی مشابہت و مماثلت رکھتی تھی اور نہ بعید کی" (الحکومۃ الاسلامیہ صفحہ ۷۱)

"معاویہ نے اپنی قوم پر چالیس سال حکومت کی لیکن اپنے لئے دنیا کی لعنت اور آخرت کے عذاب کے سوا کچھ حاصل نہ کیا"۔ (الجہاد الاکبر صفحہ ۱۸)

خمینی صاحب کے نزدیک موجودہ ایرانی قوم صحابہؓ سے افضل ہے

"موجودہ ایرانی قوم صدر اسلام کی حجازی، کوفی اور عراقی اقوام سے بہتر ہے میں جرأت کے ساتھ دعویٰ کرتا ہوں کہ آج کی ایرانی قوم اور اس کی کروڑوں کی آبادی آج کے دور میں رسول اللہ کے دور کی حجازی اور امیر المومنین علیؓ و حسین ابن علیؓ کے دور کی کوفی و عراقی اقوام سے بہتر ہے۔ دور رسول اللہ ﷺ کے حجاز میں مسلمان بھی ان کی اطاعت نہیں کرتے تھے اور مختلف بہانے بنا کر محاذوں پر نہیں جاتے تھے۔ لیکن آج دیکھتے ہیں کہ ایرانی قوم، مسلح افواج، پولیس، سپاہ پاسداران، قبائل اور رضا کاروں کی عوامی طاقتوں اور محاذوں پر موجود افواج سے لے کر محاذ کے پیچھے موجود عوام تک انتہائی جذبہ و شوق سے کس طرح کی قربانیاں دے رہے ہیں اور کتنی رزمیہ داستانیں تخلیق کر رہے ہیں"۔ (صحیفہ انقلاب صفحہ ۲۶)

اس مکروہ عبارت میں خمینی صاحب نے حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کو بھی معاف نہیں کیا۔ حضرت علیؓ نے ثلاثہؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کے وزیر و مشیر رہے۔ لیکن خمینی صاحب نے ثلاثہؓ کا جو کردار پیش کیا ہے اس کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے کردار کے حاملین کے ساتھ تعاون اور بیعت کرنے والا خود کس سیرت و کردار کا حامل ہوگا؟ اسی دلیل سے لا جواب ہو کر اہل تشیع نے حضرت علیؓ کی طرف "تقیہ" کی نسبت کر کے ان کے کردار کو مزید داغدار کیا ہے اس کے علاوہ خمینی صاحب نے حضرت علیؓ کو ایک ناکام خلیفہ کی حیثیت سے بھی پیش کیا ہے

"علیؓ اپنے دور خلافت میں بدعتوں کو ختم کرنا چاہتے تو لوگ "واعمراہ و اعمراہ" کی صدا بلند کرتے تھے اور حضرت علیؓ ان بدعتوں کے ختم کرنے کا ارادہ ترک کر دیتے تھے اس عبارت پر انہوں نے یہ حاشیہ تحریر کیا ہے کہ

"نافلہ ماہ رمضان در رمضان رسول خدا و ابو بکر و اوائل خلافت عمر فرادی خواندہ میشد عمر امر کرد کہ بجماعت بخوانند و گفت ایں خوب بدعتی است۔ و علی بن ابی طالب خواست آں را تغیر دہد و ایں بدعت را بر دارد صدائے مردم واعمراہ بلند شد"۔ (کشف الاسرار صفحہ ۱۲۲)

موصوف اس سے پہلے یہ بھی لکھ آئے ہیں کہ "علی بن ابی طالب حق خود را غصب میدانست و خلفاء را باطل و ناحق میدانست" یعنی علی بن ابی طالب اپنے حق کو مغصوب سمجھتے تھے اور خلفاء کو باطل اور ناحق جانتے تھے۔ (حوالہ مذکور صفحہ ۱۴۳)

موصوف ایک دوسری کتاب میں لکھتے ہیں کہ "حضرت علیؓ شریح سے فرماتے ہیں تم ایسی جگہ پر بیٹھے ہو جہاں نبی یا وصی نبی یا شقی کے علاوہ کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔ ظاہر ہے کہ شریح نہ تو نبی تھے نہ وصی لہٰذا شقی تھے۔ شریح وہ شخص ہے جو پچاس ساٹھ سال کوفے میں منصب قضاء پر فائز رہا اور ان کا شمار ان میں ہوتا ہے جنہوں نے معاویہ سے تقرب کی خاطر ایسے فتوے جاری کئے ہیں جو حکومت اسلامی کے برخلاف تھے۔ حضرت علیؓ بھی دوران حکومت میں اسے معزول نہ کر سکے کیونکہ یہ شیخین کے معین کردہ تھے لہٰذا لوگوں نے ان کو معزول نہیں ہونے دیا"۔ (حکومت اسلامی ۔۔۔ صفحہ ۷۲)

بہر حال خمینی صاحب نے یہ نقشہ اس ۔۔۔ جماعت ۔۔۔ پیش کیا ہے جو قرآن و حدیث کی اولین راوی ہے جو رسول ﷺ اور امت کے درمیان پہلی کڑی کی حیثیت رکھتی ہے جس نے براہ راست صاحب خلق عظیم کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا ہے اور جس کا تزکیہ تطہیر اور تعلیم و

تربیت اس معلم اخلاق کی زیر نگرانی تکمیل کو پہنچی ہے جو دنیا میں اپنی تشریف آوری کا مقصد ہی یہ بیان کرتا ہے "بعثت لا تمم مکارم الاخلاق" "میں اخلاق حسنہ کی تکمیل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ کیا تلامذہ کی اس اخلاقی پستی و گراوٹ کا الزام خود استاد کی محترم و معصوم ذات پر نہیں آئے گا؟ کیا پوری جماعت صحابہؓ کے علم و اخلاق کی زبوں حالی کا یہ لازمی نتیجہ نہ ہوگا کہ ہادی اعظم اپنے مقصد بعثت کو پورا نہیں کر سکے اور اس دنیا سے ناکام گئے؟ کیا خمینی کی پیش کردہ اس تصویر کو صحیح تسلیم کر لینے کے بعد قرآن و حدیث کی حقانیت اور سچائی قابل اعتماد رہ سکتی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ خمینی اپنی ان ہفوات اور ہرزہ سرائیوں کے ذریعے نہ صرف جماعت صحابہ کو بے وقعت بنانا چاہتے ہیں بلکہ خود قصر رسالت کو بھی منہدم کرنے کے درپے ہیں تاکہ اس کے ملبہ پر "خمینیت" کی منحوس عمارت کھڑی کر سکیں۔

خمینی صاحب "تقیہ" کے تحت لکھتے ہیں کہ: "تقیہ (یعنی جھوٹ اور منافقت) عقل کے روشن ترین احکام میں سے ہے اور تقیہ کے معنی یہ ہیں کہ انسان کسی حقیقت کے خلاف کچھ کہے یا کوئی کام قانون شریعت کے خلاف کرے۔ ہر وہ شخص جس کے پاس معمولی عقل بھی ہو وہ سمجھ سکتا ہے کہ تقیہ اللہ کے قطعی احکام میں سے ہے جیسا کہ روایت میں ہے کہ جو آدمی تقیہ نہ کرے تو اس کا کوئی دین نہیں ہے۔ (کشف الاسرار صفحہ ۱۲۸۔۱۲۹)

موصوف آگے چل کر تقیہ باز مجتہد قاضی نور اللہ شوستری کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"یہ بزرگ شیخ بہائی اور صفویہ کے ہم عصر تھے اور اکبر آباد ہند میں رہتے تھے اور تقیہ کے کمال کے ساتھ زندگی گذارتے تھے یہاں تک کہ اکبر بادشاہ ان کا ہم عقیدہ ہو گیا اور ان کو سنیوں میں سے سمجھتے تھے انہیں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز کیا اور انہوں نے خفیہ طور پر تصنیف کا کام شروع کر دیا یہاں تک کہ اکبر بادشاہ فوت ہو گیا اور اس کا لڑکا جہانگیر بادشاہ ہوا لیکن یہ برابر قاضی القضاۃ کے منصب پر کام کرتے رہے یہاں تک کہ مخالفین سمجھ گئے کہ وہ شیعہ ہے پھر بعد میں انہیں قاضیوں اور سلطان کے حکم سے اتنا مارا پیٹا گیا کہ وہ مر گئے"۔ (حوالہ مذکور صفحہ ۱۵۶)

خمینی صاحب نے اپنی کتاب تحریر الوسیلہ جلد اول کتاب الصلوٰۃ میں ایک عنوان قائم کیا ہے کہ "القول فی مبطلات الصلوٰت" یعنی ان چیزوں کا بیان جن سے نماز باطل ہو جاتی ہے اس کے تحت لکھتے ہیں کہ:

"دوسرا فعل جو نماز کو باطل کر دیتا ہے وہ نماز میں ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھنا ہے جس طرح ہم شیعوں کے علاوہ دوسرے لوگ کرتے ہیں۔ ہاں تقیہ کی حالت میں کوئی مضائقہ نہیں یعنی از راہ تقیہ یہ بالکل جائز ہے"۔　　(تحریر الوسیلہ صفحہ ۱۸۶ جلد ۱)

اور نویں چیز جس سے نماز باطل ہو جاتی ہے وہ ہے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے بعد بالقصد آمین کہنا۔ البتہ تقیہ کے طور پر جائز ہے کوئی مضائقہ نہیں۔　　(تحریر الوسیلہ صفحہ ۱۹۰ توضیح المسائل اردو صفحہ ۲۰۷ـ۱۲۸)

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مولانا محمد جان شیرانی اور دیگر "علماء حق" نے ساجد نقوی کی اقتداء میں جو نماز ادا کی تھی اس میں امام صاحب نے تقیۃً ہاتھ باندھے تھے یا کھلے چھوڑے تھے۔ دونوں صورتوں میں امام کی نماز میں کوئی فرق نہیں آتا۔ البتہ جناب شیرانی صاحب کے کثرت مطالعہ اور تبحر علمی کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے نقوی صاحب کو امامت کے لئے آگے کر کے شیعہ خمینی فقہ کی ایک اہم شرط کو پورا کر دیا۔ جناب خمینی صاحب زیر عنوان "پیش نماز کے شرائط لکھتے ہیں کہ:

"امام جماعت کو بالغ، عاقل، شیعہ اثنا عشریہ، عادل، حلال زادہ ہونا چاہیے اور یہ کہ نماز صحیح پڑھتا ہو۔　　(توضیح المسائل صفحہ ۲۰۷)

"نماز عید الفطر اور عید قربان امام علیہ السلام کے زمانہ ظہور میں جماعت کے ساتھ واجب لیکن اس زمانہ میں جب کہ امام علیہ السلام پردہ غیبت میں ہیں مستحب ہے"۔

(جو آدمی نزع کی حالت میں ہو) اس کو شہادتین کی اور بارہ اماموں کی امامت کے اقرار کی تلقین کرنا مستحب ہے اور مستحب ہے کہ کفن کی چادروں کے کنارے پر یہ لکھا جائے کہ یہ (میت) فلاں ابن فلاں شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ایک ہی ہے کوئی اس کا شریک نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور یہ کہ علی، حسن اور حسین اور آگے بارہویں امام تک سب کا ذکر کیا جائے یہ اس کے امام، آقا اور قائد ہیں۔ میت کو دفن کرنے کے بعد با آواز بلند توحید، رسالت اور ائمہ معصومین کی امامت کے اقرار کی تلقین کی جائے"۔　(تحریر الوسیلہ صفحہ ۷۵، ۷۶، ۹۲ جلد ۱)

"جو سید عادل نہیں ہے اسے خمس دیا جا سکتا ہے البتہ وہ سید جو اثنا عشری نہیں اس کو خمس نہیں دینا چاہیے۔ جو شخص زکوٰۃ لے رہا ہے وہ شیعہ اثنا عشری ہو۔ اگر زکوٰۃ فطرہ کو ان آٹھ مصارف میں سے کسی ایک میں صرف کیا جائے تو کافی ہے البتہ احتیاط مستحب یہ ہے کہ صرف

شیعہ فقراء کو دیا جائے"۔ (توضیح المسائل ص ۲۷۵،۲۷۶،۲۷۵)

"اپنی بیوی کی اجازت کے بغیر بیوی کی بھانجی اور بھتیجی سے نکاح نہیں کر سکتا البتہ اگر اس کی اجازت کے بغیر عقد کرے اور بعد میں وہ کہہ دے کہ میں اس عقد پر راضی ہوں تو پھر کوئی اشکال نہیں"۔ (حوالہ مذکور صفحہ ۳۴۲)

خمینی صاحب نے حضرت عمرؓ کے خلاف جو الزامات لگائے تھے ان میں سے ایک "متعہ" کو حرام قرار دینا تھا۔ متعہ مذہب شیعہ کا مشہور مسئلہ ہے۔ جو نہ صرف یہ کہ جائز اور حلال ہے بلکہ نماز، روزہ اور حج سے بھی افضل اور اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے اور بلاشبہ یہ شیعہ مذہب کی خصوصیات اور امتیازات میں سے ہے تفسیر منہج الصادقین میں رسول خدا ﷺ کی طرف نسبت کر کے یہ حدیث لکھی گئی ہے کہ:

"جو ایک دفعہ متعہ کرے وہ امام حسینؑ کا درجہ پائے گا جو دو دفعہ متعہ کرے وہ امام حسنؑ کا درجہ جو تین دفعہ متعہ کرے وہ امیر المؤمنین کا درجہ پائے گا اور جو چار دفعہ متعہ کرے وہ میرا (یعنی رسول پاک ﷺ کا) درجہ پائے گا۔ (منہج الصادقین صفحہ ۴۹۲ جلد ۱)

متعہ ایک مرد اور ایک غیر شادی شدہ عورت کے درمیان میاں بیوی کی حیثیت سے زبانی معاہدے کا نام ہے اس میں گواہ، قاضی، کسی وکیل یا کسی اعلان حتیٰ کہ کسی تیسرے آدمی کے باخبر ہونے کی بھی ضرورت نہیں چوری چھپے بھی یہ سب کچھ ہو سکتا ہے متعہ کرنے والے مرد پر عورت کے نان نفقہ اور لباس رہائش وغیرہ کی کوئی ذمہ داری بھی عائد نہیں ہوتی بس صرف مقررہ اجرت ہی ادا کرنی پڑتی ہے اور اس معاہدے کے لئے وقت کی بھی کوئی قید نہیں۔

چنانچہ خمینی صاحب لکھتے ہیں کہ:

"عقد غیر دائم وہ ہے کہ جس میں نکاح کی مدت معین ہوتی ہے مثلاً عورت کے ساتھ ایک گھنٹہ، ایک دن، ایک مہینہ، ایک سال یا اس سے زیادہ مدت کے لئے عقد کیا جائے اور جس عورت سے اس قسم کا عقد ہوا ہو اسے متعہ اور صیغہ کا نام دیتے ہیں۔ مسلمان عورت کافر کے عقد میں نہیں آ سکتی اور مسلمان مرد بھی کافر عورتوں سے عقد دائمی نہیں کر سکتا البتہ یہود و نصاریٰ جیسی اہل کتاب عورتوں سے متعہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کسی عورت سے متعہ کرنا اگرچہ لذت حاصل کرنے کے لئے نہ ہو تو بھی صحیح ہے۔ متعہ والی عورت اگرچہ حاملہ ہو جائے خرچ کا حق نہیں

رضاعی۔ باپ یا دادا محرم بننے کے لئے ایک دو گھنٹہ کے لئے اپنے نابالغ بچے سے کسی عورت کا متعہ پڑھ سکتے ہیں اور اسی طرح محرم بننے کے لئے اپنی نابالغ لڑکی کا متعہ کسی شخص سے کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ متعہ لڑکی کے لئے نقصان دہ نہ ہو۔

نکاح متعہ پڑھنے کا طریقہ۔ اگر خود عورت و مرد عقد متعہ کا صیغہ پڑھنا چاہیں تو بعد اس کے کہ مدت اور مہر معین کر لیں اگر عورت کہے "زوّجت نفسی فی المدة المعلومة علی المهر المعلوم" اور اس کے بعد مرد بلا فصل کہے "قبلت" تو صحیح ہے۔ اگر کسی دوسرے شخص کو وکیل کریں اور پہلے عورت کا وکیل کہے "متعت موکلتی موکلك فی المدّة المعلومة علی المهر المعلوم" پھر مرد کا وکیل فوراً بغیر کسی فاصلے کے کہے "قبلت لموکلی هکذا" تو صحیح ہے۔ جس عورت کا متعہ ہو جائے مثلاً ایک مہینہ یا ایک سال کے لئے اس سے کوئی عقد (متعہ) کرے تو اس کے لئے کوئی طلاق نہیں اور اس کی آزادی اس میں ہے کہ اس کی مدت پوری ہو جائے یا مرد اسے مدت بخش دے اور اس طرح کہے کہ میں نے مدت تجھے بخشی۔ گواہ بنانا اور عورت کا حیض سے پاک ہونا ضروری نہیں۔ زنا کار عورت سے متعہ کرنا جائز ہے مگر کراہت کے ساتھ خصوصاً جب کہ وہ مشہور پیشہ ور زانیات میں سے ہو"۔ (توضیح المسائل صفحہ ۳۰۰-۳۰۲ تحریر الوسیلہ صفحہ ۲۹۰ جلد ۲)

یہ ہے وہ متعہ شریف جس کے حرام قرار دینے پر خمینی صاحب نے حضرت عمرؓ کو مخالف قرآن قرار دیتے ہوئے ان کی طرف کفر و زندقہ کی نسبت کی تھی۔ (کشف اسرار صفحہ ۱۱۷)

یہ ملحوظ رہے کہ یہاں صرف خمینی صاحب کی کتب میں سے چند اقتباسات پیش کئے گئے ہیں۔ جہاں تک اہل تشیع کے دیگر عقائد و نظریات کا تعلق ہے تو ان کی ایک جھلک کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر صاحب چیرمین شعبہ عربی پنجاب یونیورسٹی لاہور خمینی صاحب کو ایران میں اسلامی انقلاب برپا کرنے پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ!

"قرآن کریم کا ایک فلسفہ انقلاب ہے جس کی رو سے قدرت ربانی فرعونوں، نمرودوں اور ہامانوں سے اقتدار چھین کر مستضعفین اور کمزوروں کو عطا کرتی رہتی ہے اللہ کے چھوٹے چھوٹے بظاہر حقیر لشکر بڑی بڑی قوتوں کا سر کچل دیتے ہیں۔ یہ فلسفہ انقلاب بھی امام خمینی کے ظہور سے زندہ ہو گیا دنیا بھر کے کمزوروں اور مستضعفین کو حوصلہ ملا ممولے شاہین سے لڑا

دیئے گئے۔ امریکہ جیسی سامراجی و مغرور طاقت کو بے بس ہونا پڑا، امام نے نہ صرف امریکی گماشتہ کو ذلیل و رسوا کر کے بھگایا بلکہ نام نہاد بڑی طاقتوں کا رعب بھی خاک میں ملا دیا۔ آج بہت سے کمزور جو کل تک ان طاقتوں کے سامنے آنکھ بھی نہیں اٹھا سکتے تھے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہے ہیں یہ کارنامہ بھی خمینی کا ہے"۔ (روزنامہ نوائے وقت ۳ جولائی ۱۹۸۹ء)

ڈاکٹر صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات کی خدمت میں مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی شہید کے یہ نرم اور ناصحانہ الفاظ پیش کر کے اس بحث کو سمیٹا جاتا ہے جو انہوں نے ایک سائل کے جواب میں لکھے تھے۔

"آنجناب کا خمینی انقلاب کو "اسلامی انقلاب" کہنا اس امر کی دلیل ہے کہ آنجناب کو خمینی صاحب کے عقائد و نظریات کا علم نہیں۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ مولانا محمد منظور نعمانی کی کتاب ایرانی انقلاب کا مطالعہ فرمالیں یا کم سے کم ماہنامہ بینات کراچی ربیع الاول اور ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ کے شماروں میں اس ناکارہ نے جو کچھ لکھا ہے اس کو دیکھ لیں بشرط انصاف آپ کی غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ کیسا "اسلامی انقلاب" ہے جس میں حضرات خلفائے راشدینؓ اور اکابر صحابہؓ کو کافر و منافق اور مکار و خود غرض کہہ کر تبرا کیا جائے اور جس میں چالیس فیصد سنی آبادی کو کچل کر رکھ دیا جائے نہ انہیں اپنے مسلک کے مطابق زندگی گذارنے کی اجازت ہو اور نہ آواز اٹھانے کی۔ اگر اس کا نام "اسلامی انقلاب" ہے تو شاید ہمیں "اسلامی انقلاب" کی تعریف بدلنی پڑے گی"۔ (ماہنامہ اقراء ڈائجسٹ صفحہ ۱۷، جولائی ۱۹۸۹ء)

شیعیت برصغیر میں

برصغیر میں اسلام کی اشاعت کا آغاز پہلی صدی ہجری میں محمد بن قاسم کے حملے کے ساتھ ہی ہو گیا تھا پھر یہ علاقہ مسلمانوں ہی کے زیر قبضہ رہا۔ جب کہ بعض مؤرخین نے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، اور حضرت معاویہؓ کے عہد میں بھی بعض مہمات کا ذکر کیا ہے۔

(سلاطین ہند جلد اول صفحہ ۱۵-۱۸)

اس کے بعد چوتھی صدی ہجری کے آخر اور پانچویں صدی کے شروع میں جب سلطان محمود غزنوی نے پنجاب اور ملتان کو اپنی حکومت میں شامل کیا تو سندھ سے مسلمانوں کی حکومت مٹ چکی تھی اور سازشی سرگرمیوں کی یادگار صرف اس قدر باقی تھی کہ ملتان قرامطہ کی

تحریک کا ایک مشرقی مرکز تھا اور سندھ و گجرات کے بہت سے ہندو، قرامطہ کی تحریک میں شامل اور اس سے دلچسپی رکھتے تھے۔

اہل تشیع کا دعویٰ یہ ہے کہ شیعیت بھی اسی وقت سے برصغیر بلکہ پاکستان میں موجود تھی کیونکہ سندھ اب پاکستان میں شامل ہے چنانچہ سید حسین عارف نقوی لکھتے ہیں کہ:

"یوں تو پاکستان میں شیعیت اسی وقت سے موجود تھی جب سے مسلمانوں نے سندھ پر حملہ کیا تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ملتان میں آل محمد ﷺ کے تذکروں کا آغاز ۶۰ ھ سے ہوا اور یہاں سب سے پہلے شیعہ مبلغ علی آئے۔ عبداللہ بن محمد جن کا سلسلہ نسب پانچ پشتوں پر حضرت علی سے جا ملتا ہے سندھ میں تبلیغ کے لئے آئے۔ ابن اثیر نے ۱۵۱ ھ میں منصور کے گورنر عمر بن حفص کو شیعہ بتایا ہے ان علماء نے ان علاقوں میں کچھ اس انداز سے تبلیغ کی کہ ملتان اور سندھ میں شیعہ ہی شیعہ نظر آنے لگے اور شیعہ حکومت قائم ہو گئی۔ مگر افسوس کہ محمود غزنوی نے مال کے لالچ میں ان کو قرامطہ قرار دیا اور علماء نے فتویٰ دیا کہ یہ سب واجب القتل ہیں چنانچہ محمود غزنوی نے ملتان کی اس حکومت کو تہس نہس کر دیا اور یوں شیعیت کو بزور شمشیر سنیت میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس بات کے آثار کہ کسی زمانے میں اس علاقے میں شیعوں کی اکثریت تھی آج بھی موجود ہیں"۔

{تذکرہ علمائے امامیہ صفحہ ۲۲ مطبوعہ امامیہ دار التبلیغ اسلام آباد}

شیعہ مجتہد و مؤرخ علامہ محمد حسین مظفر نے بھی اپنی کتاب میں شیعیت کا وجود و فروغ بنو عباس کے دور میں وقتاً فوقتاً ان "والیان و فرمانروایان و فرماندھان و سپاھیان" کے ذریعے ثابت کیا ہے جو ہند میں مقرر ہو کر آتے رہے اور "ولاء اہل بیت علیہم السلام در دلہای آنہا جای داشت" ان کے دل میں محبت اہل بیت جڑ پکڑ چکی تھی۔ {تاریخ شیعہ صفحہ ۲۱۸ تحت شیعہ در سند}

یہ ملحوظ رہے کہ "ولاء اہل بیت" شیعہ کا اساسی عقیدہ ہے جس کی رو سے نبی اکرم ﷺ کے بعد خلافت و امامت کا حق ائمہ اہل بیت کا ہے شیعہ مجتہد مفتی جعفر حسین لکھتے ہیں کہ "پاکستان و ہندوستان میں شیعیت ان علماء و مبلغین کے ذریعے پھیلی جو وقتاً فوقتاً برصغیر میں آتے رہے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے"۔ {اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۹۰۸ جلد ۱۱}

اہل تشیع کی بیان کردہ مذکورہ بالا تصریحات سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ برصغیر میں شیعیت پہلی صدی ہجری میں داخل ہو چکی تھی اس سلسلے میں انہوں نے منصور عباسی کے گورنر

عمر بن حفص کی مثال بھی دی ہے مؤرخ اسلام اکبر شاہ خان نجیب آبادی لکھتے ہیں کہ ۱۴۲ھ میں خلیفہ منصور عباسی نے عمر بن حفص کو سندھ کا گورنر مقرر کیا تھا۔ یہ عمر بن حفص بباطن شیعیت کی جانب زیادہ مائل تھا"۔ (آئینہ حقیقت نما صفحہ ۱۴۶)

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ شیعیت اس سے بھی بہت پہلے ہندوستان میں داخل ہو چکی تھی۔ جب ۱۱ھ میں ایرانی شہنشاہیت بعہد فاروقی صحابہؓ و تابعینؒ کے ہاتھوں پارہ پارہ ہوئی تو اس وقت سندھ میں بدھ مذہب کے راجہ حکمران تھے۔ اس موقع پر بعض ایرانی سردار و امراء فرار ہو کر سندھ، ترکستان اور چین میں پناہ گزین ہو گئے جہاں انہوں نے خلافت راشدہ کے خلاف معاندانہ سرگرمیاں شروع کر دیں۔

ایرانیوں کے لئے سرزمین ہند ایک بہترین پناہ گاہ تھی کیونکہ ہندوستانی بھی ایرانیوں کی طرح آریہ نژاد ہیں اور ہندوستان ایران کے ساتھ اس رشتہ پر فخر کرتا ہے لفظ "ایران" آریانہ سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے آریاؤں کی سرزمین یہ ساسانیوں کی سلطنت کے مرکزی حصے کا نام تھا جو اپنے آپ کو شاہان ایران سے ملقب کرتے تھے تاریخی تحقیقات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ فارس کے باشندے اور آریا ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ آریاؤں کا ایک گروہ شمالی ایران کے میڈیا میں آباد ہوا اور اس نسبت سے وہ میڈیا کہلائے جب کہ دوسرا گروہ جنوبی ایران کے علاقہ پارس میں آباد ہو گیا جس سے وہ اہل پارس یا پارسی کہلائے اور آریاؤں نے ہی اس ملک کو ایران کا نام دیا۔ چنانچہ اہل ہند اور اہل ایران دونوں کے درمیان اس رشتے میں منسلک ہونے کی وجہ سے دیرینہ تعلقات قائم ہیں۔

اس کے علاوہ ایرانی سرداروں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عبداللہ بن سبا اور دوسرے منافقوں کی سازشوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا بالآخر وہ عجمی عصبیت کے تحت خلفائے راشدین کو شہید کرنے اور بنو امیہ کی خالص عربی و اسلامی حکومت ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے ان سازشوں، ریشہ دوانیوں اور ایرانیوں کی مسلسل کامیابیوں سے ان ایرانیوں کے منصوبوں میں جو سندھ، کابل، چین اور تبت وغیرہ میں جلاوطن ہو کر مقیم اور مخالف اسلام کوششوں میں مصروف تھے از سر نو جان پڑ گئی اور یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کو ایرانیوں کی بدولت کوفہ، بصرہ، ایران اور خراسان کے علاقوں میں بھی بارہا مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان سازشوں کا

مفصل ذکر کتاب کی ابتداء میں ان ادوار کے تحت گذر چکا ہے۔

سندھ کا علاقہ چونکہ بصرہ و کوفہ یعنی عراق سے نسبتاً قریب تھا اور ایرانی حکومت کی سرحد اس سے ملتی تھی لہٰذا زیادہ تر ایرانی مفسدین کا ٹھکانہ یہی علاقہ بنا ہوا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسلامی فتوحات کے سیلاب کو دیکھ دیکھ کر سندھ کا راجہ خود بھی ایرانیوں کی بربادی سے نہایت پریشان تھا اور اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح ایرانی اپنی سلطنت پھر قائم کر سکیں۔ چنانچہ ایران کے آخری بادشاہ نے معرکۂ نہاوند کے بعد کئی مرتبہ فوجیں جمع کر کے مسلمانوں کا مقابلہ کیا تو ان مقابلوں اور معرکوں میں سندھ کی امدادی فوج بھی اس کے ساتھ شانہ بشانہ حصہ لیتی تھی پھر جب عہد عثمانی میں ایرانی سلطنت تباہ و برباد ہوئی تو سندھ کے راجہ نے اپنے سرحدی ایرانی صوبوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور مغلوب و مفتوح ایرانیوں نے کرمان و بلوچستان وغیرہ کے صوبوں کو بخوشی سندھ کے راجہ کے حوالے کر دیا تا کہ وہ مسلمانوں کے قبضے میں نہ جا سکیں اور اس کے بدلے میں سندھ کے راجہ کی حمایت انہیں حاصل رہے۔

حجاج بن یوسف نے ان سرگرمیوں کا نوٹس لیا اور عبداللہ اسلمی کو چھ ہزار فوج کے ساتھ سندھ کی طرف روانہ کیا لیکن راجہ داہر کے مقابلے میں یہ مہم ناکام ہوگئی اسی طرح دوسری مہم بھی ناکام ہوئی یہ خبر سن کر حجاج کو اور بھی زیادہ ملال ہوا۔ تیسری مرتبہ اس نے محمد بن قاسم کو چھ ہزار شامی فوج کے ساتھ سندھ کی طرف روانہ کیا۔ محمد بن قاسم کے ساتھ اس دفعہ شامی سپاہی اس لئے بھیجے گئے کہ حجاج کو اس کا شبہ تھا کہ عراقی و ایرانی سپاہی سندھیوں سے ساز باز رکھتے ہیں۔ اس مہم میں راجہ داہر مقابلے میں مارا گیا اور محمد بن قاسم نے تمام ملک سندھ اور ملتان بھی فتح کر لیا۔

اس کے بعد ایرانیوں نے خلافت اسلامیہ کے خلاف مختلف لبادوں اور بھیسوں میں کام شروع کیا اور مختلف علاقوں میں اپنی حکومتیں قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جن میں سے اسماعیلی شیعی فرقے کی ایک اہم شاخ ''قرامطہ'' ہے اس کا تفصیلی ذکر پیچھے گذر چکا ہے اس نے مصر کی عبیدی حکومت کے تعاون سے بحرین و فارس میں اپنی مستقل حکومتیں قائم کیں اور مسلمانوں پر بے پناہ مظالم توڑے۔

قرامطہ بحرین کی حکومت کے مٹنے کے بعد قرامطہ کی تمام تعلیم یافتہ اور ہوشیار جماعت داعیوں کے لباس میں تبدیل ہوگئی۔ دراصل یہ ایک سیاسی تحریک تھی جس کا مقصد دنیا سے اسلام کو

مٹانا اور عربوں کی فوقیت و برتری کو نیچا دکھانا تھا۔ آگے چل کر ابوالفتح نے ملتان میں جو اس تحریک کا مرکز بن گیا تھا۔ ہندوؤں کے تعاون سے اپنی مستقل حکومت قائم کر کے مسلمانوں کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جو اس کے پیش رو کرتے رہے اکبر شاہ خان نجیب آبادی لکھتے ہیں کہ

"ہندوؤں کی اس غلطی کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے مسلمانوں کے دشمن قرامطہ اور ملاحدہ کو اپنے پہلو میں بٹھالیا اور ان کے حامی بن کر مسلمانوں کو لڑائی کا چیلنج دیا"۔

(آئینہ حقیقت نما صفحہ ۳۰۳)

قرامطہ اگر مسلمانوں کے دشمن تھے تو ہندو کون سے دوست تھے؟ دونوں مسلمانوں کے دشمن تھے اس لئے باہم متحد تھے محمود غزنوی نے ملتان پر حملہ کرنا چاہا تو راجہ انند پال نے اس کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کیں لیکن اسلامی فوج کا مقابلہ نہ کر سکا اور شکست کھا کر کشمیر کی طرف بھاگ گیا۔

مؤرخ الفی بیان کرتا ہے کہ جب ابوالفتح کو محمود کی روانگی کی خبر ہوئی تو اس نے گھبرا کر راجہ انند پال کو محمود کے عزائم سے باخبر کیا اور مدد کی درخواست کی۔ انند پال نے اس بار بھی جاہلانہ دلیری سے کام لیتے ہوئے لاہور سے پشاور پہنچ کر اپنے لشکر کو اسلامی فوج کے روکنے کے لئے روانہ کیا۔ اس لشکر نے بھی ہزیمت اٹھائی۔ بالآخر سلطان محمود غزنوی نے ابوالفتح حاکم ملتان کو اس کی نمک حرامیوں اور سازشوں کا مزہ چکھانے کا عزم کر لیا اور ۴۰۱ھ میں اس نے ملتان کو فتح کر کے بہت سے قرمطیوں اور کافروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور داؤد بن نصیر کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ غزنی لے گیا جہاں وہ ایک قلعے میں نظر بندی کے دوران ہی مر گیا۔

مؤرخین نے حاکم ملتان ابوالفتح کو قرمطی اور باطنی قرار دیا لیکن شیعہ مؤلف سید حسین عارف نقوی نے اس الزام کی تردید کرتے ہوئے لکھا کہ وہ شیعہ حکومت تھی "محمود غزنوی نے مال کے لالچ میں ان کو قرامطہ قرار دیا اور اس نے ملتان کی اس (شیعہ) حکومت کو تہس نہس کر دیا اور یوں شیعیت کو بزور شمشیر سنیت میں تبدیل کر دیا گیا"۔ (تذکرہ علماء امامیہ صفحہ ۲۲)

ابوالفتح اگر قرمطی تھا تو بھی وہ شیعہ ہی تھا لیکن نقوی صاحب نے تو اسے اثنا عشری شیعہ ثابت کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے سابق وزیر داخلہ و قانون اور پیپلز پارٹی کے ممتاز رہنما چوہدری اعتزاز احسن صدیوں بعد بھی محمود غزنوی کے اس عظیم مجاہدانہ کارنامے کو برداشت نہ

کر سکے۔ جنرل محمد ضیاء الحق کے دور میں موصوف گرفتار ہو کر سنٹرل جیل ملتان پہنچے تو وہاں سے انہوں نے اپنی کتاب "سندھ ساگر" کی تالیف کا آغاز کیا۔ چوہدری صاحب اس کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

"محمود غزنوی نے ہندو ریاستوں کے ساتھ ساتھ مسلمان ریاستوں پر بھی حملے کئے اور اس سلسلے میں ملتان کی ایک اسماعیلی ریاست کا حوالہ دیا ہے جسے محمود غزنوی نے فتح کر لیا تھا"۔

جناب حامد میر صاحب اپنے کالم "قلم کمان" میں "سندھ ساگر کے آنسو" کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ "یہاں میں چوہدری صاحب کے ساتھ بڑے ادب سے اختلاف رائے کی گستاخی کرتے ہوئے عرض کروں گا کہ ملتان کا حکمران ابوالفتح اپنے بزرگوں کا اسماعیلی عقیدہ چھوڑ کر قرمطی مذہب اختیار کر چکا تھا جس میں کعبہ کی بجائے صرف بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا گیا، نماز کو چار رکعتوں تک محدود کیا گیا، جمعہ کی بجائے اتوار کو مقدس دن قرار دیا گیا اور دیگر خرافات کو اختیار کیا گیا۔ ابوالفتح ایک مرتد تھا لہٰذا اس کی حکومت کو اسلامی نہیں کہا جا سکتا"۔

{روزنامہ اوصاف ۵ اکتوبر ۱۹۹۹ء}

راقم بھی حامد میر صاحب کے ساتھ اختلاف رائے کی گستاخی کرتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ حاکم ملتان ابوالفتح نے اپنے بزرگوں کا اسماعیلی عقیدہ ہرگز نہیں چھوڑا تھا اور شیعہ امامیہ اسماعیلیہ ہی کی اہم شاخ "قرامطہ" کے ساتھ وابستہ ہو گیا تھا۔ ایرانی شیعہ مجتہد سید محمد طباطبائی نے بھی قرامطہ کا ذکر "اسماعیلیہ شیعہ اور ان کے مختلف فرقے" باطنیہ کے ذیل میں کیا ہے (شیعہ صفحہ ۶۳) جب کہ پاکستانی شیعہ سکالر سید حسین عارف نقوی صاحب نے اسے اثناعشری شیعہ قرار دیا ہے۔

بہر حال محمود غزنوی نے پانچویں صدی کے آغاز ہی میں ملتان کی شیعہ حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد شیعوں نے دیگر علاقوں میں پر پرزے نکالنے شروع کئے اور اپنی علیحدہ ریاست قائم کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ رضیہ سلطانہ (جو ۶۳۴ھ میں تخت نشین ہوئی) کے دور میں قرامطہ شیعوں کا ایک گروہ اطراف ہند گجرات، سندھ اور دوآبہ گنگا و جمنا وغیرہ سے آ کر دہلی میں جمع ہو گیا اور ماہ رجب ۶۳۴ھ میں ہزاروں (شیعوں) قرامطیوں نے تلوار، خنجر اور تیر و کمان کے ساتھ مسلح ہو کر نماز جمعہ میں مشغول ہزار ہا اہلسنت کو تہ تیغ کر دیا۔ بعد میں جوابی

کاروائی میں کچھ حملہ آور بھی اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

سلطنت بہمنیہ کا قیام

ایران جو ابتدا ہی سے شیعیت کا مرکزی ہیڈ کوارٹر رہا اور جسے خمینی صاحب نے امام غائب کا ملک قرار دیا ہے ساتویں صدی ہجری میں وہاں کے حالات میں بھی ایک عارضی تبدیلی پیدا ہوئی وہ یہ کہ حسن بن صباح کی قائم کردہ حکومت (۴۸۳ھ تا ۶۵۴ھ) جو شیعوں کے لئے جائے پناہ تھی جب وہ ۶۵۴ھ میں تاتاریوں کے ہاتھوں ختم ہو گئی تو ایران میں مقیم بعض شیعہ سادات نے برصغیر کا رخ کیا اور پھر یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ چنانچہ شیعہ مجتہد مفتی جعفر حسین لکھتے ہیں کہ:

"پاکستان و ہند میں شیعیت ان علماء و مبلغین کے ذریعے پھیلی جو وقتاً فوقتاً برصغیر میں آتے رہے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ۶۱۷ھ میں جب چنگیز خان ایران پر حملہ آور ہوا اور فتنوں اور ہلاکتوں کا دروازہ کھلا تو جو سادات اموی حکمرانوں کے مظالم سے تنگ ہو کر ایران میں آباد ہو چکے تھے انہوں نے بھی ادھر کا رخ کر لیا اور پھر یہیں پر مستقل ڈیرے ڈال دیے۔ جب حسن گنگو بہمنی ۷۴۷ھ میں دکن کا فرمانروا ہوا اور سلطنت بہمنیہ کی بنیاد رکھی"۔

{اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۹۰۸ جلد ۱۱}

ہندوستان میں تغلق خاندان کی حکومت کے دوران حالات یہاں تک پہنچ چکے تھے کہ اہل تشیع نے "تقیہ" بھی ترک کر دیا تھا۔ یہاں فیروز تغلق کے رسالہ "فتوحات فیروز شاہی" سے ایک اقتباس بغیر ترجمہ کے نقل کیا جاتا ہے اس کے ترجمہ کی جرأت اس لئے نہیں ہوئی کہ بعض الفاظ فحش اور خلاف تہذیب معلوم ہوتے ہیں البتہ ان الفاظ سے اس زمانہ کے ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوستان کی عام اسلامی حالت کا اندازہ کرنے میں ضرور مدد مل سکتی ہے۔

"قوے بلباس دہریہ و ترک و تجرید مردمان را گمراہ میکردند و مریدی ساختند و کلمات کفر می گفتند طائفہ ملحداں و اباحتیان جمع شدہ بودند و خلق را بالحاد و اباحت دعوت می کردند و در شبے بمقام معین جمع می شدند از مردمان محرم و غیر محرم و طعام و شراب درمیان می آوردند و می گفتند ایں عبادت است و زنان و مادران و خواہران یک دیگر کہ دراں شب جمع می آوردن جامۂ ہر کہ بر دست کے از ایشاں می افتاد بے باو زنا کر دے۔ پیراں ایشاں شیعہ بودند، شیعی مذہباں کہ ایشاں را روافض

میگویند بسبب رفض و شیعہ مرداں را دعوت میکردند در سالہ ہلو کتابہا دریں مذہب پرداختہ و تعلیم و تدریس پیشہ ساختہ بودند و جناب خلفائے راشدین ام المومنین عائشہ صدیقہؓ و جمیع صوفیائے کبار را سب صریح و شتم قبیح می گفتند و لواطت میکردند و قرآن مجید را ملحقات عثمانی میخواندند۔ رسم و عادتے کہ در دین اسلام جائز نیست در شہر مسلمانان جبلت شدہ بود کہ عورات در ایام متبرکہ جماعت پالکی سوار و گردوں سوار ڈولہ سوار و اسپ سوار و ستور سوار فوج فوج جوق جوق پیادہ از شہر بیرون می آمدند و عوار بابی رفتند"۔ {تاریخ زوال ملت اسلامیہ صفحہ ۱۶۶-۱۶۷}

سلاطین ہند میں سے علاوہ دیگر سلاطین محمد بن تغلق نے کربلا میں "مشہد حسینؑ" کی خدمت کے لئے اڑھائی لاکھ روپے بھیجے۔ {اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۱۴۹ جلد ۳}

ہندوستان میں جب خاندان تغلق کا زوال شروع ہوا اور سلطنت کا شیرازہ منتشر ہوا تو جنوبی ہندوستان میں ایک شخص علاؤ الدین حسن گنگو بہمنی نامی نے "بہمنی سلطنت" کی بنیاد رکھی حسن گنگو چونکہ ایران کے بہمنی شیعہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس لئے اس کی سلطنت بھی بہمنی کہلائی۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ "در دکن سلاطین بہمنیہ و عادل شاہی کہ در نہایت مرتبہ غلو تشیع داشتند" دکن میں بہمنی سلاطین اور عادل شاہی حکمران شیعیت میں انتہائی غلو رکھتے تھے یعنی وہ انتہائی غالی شیعہ تھے"۔

شیعہ عالم و مورخ محمد حسین مظفر نے شاہ صاحب کا یہ قول نقل کر کے بحوالہ محمد قاسم فرشتہ اس کی تغلیط کی ہے اور کہا ہے کہ حسن کانگو بہمنی اہل سنت میں سے تھا" ایں سخن کجا و نسبت تشیع بہ بہمنیا کجا"؟ پھر خود یہ اقرار بھی کرتا ہے کہ "حکومت بہمنیا۔ بہ پنج امارت تقسیم شد، عادل شاہیہ و نظام شاہیہ و قطب شاہی ایں حکومت ہائے سہ گانہ شیعی بودہ اند۔ و بریدشاہیہ عماد شاہیہ دولت و حکومت ایں دو سنی بودہ است"۔ {تاریخ شیعہ تحت شیعہ در ہند صفحہ ۳۲۳}

بہمنی سلطنت پانچ سلطنتوں میں تقسیم ہو گئی۔ عادل شاہی، نظام شاہی اور قطب شاہی یہ تین شیعہ سلطنتیں تھیں جب کہ بریدشاہی اور عماد شاہی سنی حکومتیں تھیں۔

بہمنی سلاطین کا دور اقتدار

سلطنت بہمنیہ میں مندرجہ ذیل حضرات نے حکومت کی ان میں سے بعض سلاطین کا دارالحکومت احسن آباد گلبرگہ تھا اور بعض کا دارالحکومت محمد آباد بیدر تھا۔

۱	علاؤالدین حسن بہمنی شاہ	۲۴ ربیع الثانی ۷۴۸ھ/۳ اگست ۱۳۴۷ء
۲	محمد شاہ اول	۳ ربیع الاول ۷۵۹ھ/۱۴ فروری ۱۳۵۸ء
۳	علاؤالدین مجاہد شاہ	۱۹ ذیقعدہ ۷۷۶ھ/۲۱ اپریل ۱۳۷۵ء
۴	داؤد شاہ اول	۱۷ ذی الحج ۷۷۹ھ/۱۶ اپریل ۱۳۷۸ء
۵	محمود شاہ (یا محمد شاہ ثانی)	۲۳ محرم ۷۸۰ھ/۲۱ مئی ۱۳۷۸ء
۶	غیاث الدین تہمتن شاہ	۲۱ رجب ۷۹۹ھ/۲۰ اپریل ۱۳۹۷ء
۷	شمس الدین داؤد شاہ ثانی	۱۷ رمضان ۷۹۹ھ/۱۴ جون ۱۳۹۷ء
۸	تاج الدین فیروز شاہ	۲۳ صفر ۸۰۰ھ/۱۶ نومبر ۱۳۹۷ء
۹	شہاب الدین احمد شاہ اول	۵ شوال ۸۲۵ھ/۲۲ ستمبر ۱۴۲۲ء
۱۰	علاؤالدین احمد شاہ ثانی	۲۹ رمضان ۸۳۹ھ/۱۷ اپریل ۱۴۳۶ء
۱۱	علاؤالدین ہمایوں شاہ	۲۴ جمادی الثانیہ ۸۶۲ھ/۷ مئی ۱۴۵۸ء
۱۲	نظام الدین احمد شاہ ثالث	۲۸ ذیقعدہ ۸۶۵ھ/۴ ستمبر ۱۴۶۱ء
۱۳	شمس الدین محمد شاہ ثالث لشکری	۱۳ ذیقعدہ ۸۶۷ھ/۳۰ جولائی ۱۴۶۳ء
۱۴	شہاب الدین محمود شاہ	۵ صفر ۸۸۷ھ/۲۶ مارچ ۱۴۸۲ء
۱۵	احمد شاہ رابع	۳ ذی الحج ۹۲۴ھ/۷ دسمبر ۱۵۱۸ء
۱۶	علاؤالدین شاہ	۱۷ محرم ۹۲۷ھ/۲۸ دسمبر ۱۵۲۰ء
۱۷	ولی اللہ شاہ	۱۷ ربیع الثانی ۹۲۹ھ/۴ مارچ ۱۵۲۳ء
۱۸	کلیم اللہ شاہ	۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء

(بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۱۵۰ جلد ۵)

سلطنت بہمنیہ کا بانی علاؤالدین بہمنی گانگو ایرانی نژاد بہرام گور کی اولاد میں سے ہے جب کہ بہرام گور ساسان کی نسل سے اور ساسان بہمن بن اسفندیار (جو کیانی خاندان کا حکمران

تھا) کی یادگار ہے۔علاؤالدین حسن اور اس کی اولاد کو بہمنی کہنا یہی معنی رکھتا ہے کہ یہ خاندان نسل بہمن بن اسفندیار سے ہے۔ یہ سلسلہ نسب مؤرخ فرشتہ نے احمد نگر میں نظام شاہیہ کتب خانہ کے ایک رسالہ سے نقل کیا ہے

لیکن مؤرخ فرشتہ کے خیال میں یہ رائے غلط ہے اور قرین قیاس یہ ہے کہ چونکہ گانگو بہمنی کا نام علاؤالدین حسن کے نام کا ایک حصہ ہو گیا تھا اس لئے خود علاؤالدین اور اس کے بعد اس کی اولاد بہمن کے نسب سے مشہور ہو گئی۔ خوشامد کرنے والے شعراء اور مداحوں اور تاریخ دانوں نے مبالغے سے کام لے کر حقیقت کو بالکل مسخ کر ڈالا" ۔(تاریخ فرشتہ حصہ اول ص ۷۵۲)

تعجب ہے کہ مؤرخ فرشتہ نے محض قیاس کی بنیاد پر حسن گانگو کا نسب نامہ (جو اس کی خاندانی لائبریری میں تحریری طور پر محفوظ ہے) مسترد کر دیا جب کہ حقیقت یہ ہے کہ موصوف خود اپنے سلسلہ نسب سے آگاہ نہیں۔ ان کا پورا نام ملا محمد قاسم ہندو شاہ ہے اور تخلص فرشتہ، ہندو شاہ کی اصل کیا ہے؟ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے باپ کا نام مولانا غلام علی ہندو شاہ تھا۔ بیٹے کی طرح باپ کے حالات بھی پردہ خفاء میں ہیں شیعہ مجتہد مفتی جعفر حسین کے حوالے سے اوپر یہ بات گذر چکی ہے کہ ایران پر تاتاری حملے کے بعد ان لوگوں نے "وہاں سے نقل مکانی کر کے برصغیر میں مستقل طور پر ڈیرے ڈال دئے تھے" ان ہی میں سے ایک حسن گانگو بانی سلطنت بہمنیہ بھی تھا جس نے یکم ربیع الاول ۷۵۹ھ میں بعمر سرسٹھ برس وفات پائی۔

حسن گانگو کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمد شاہ بہمنی تخت نشین ہوا۔ اس کا معمول یہ تھا کہ دربار میں آ کر پہلے اپنے باپ کے تخت کو سجدہ کرتا اور اس کے بعد خود تخت پر بیٹھ جاتا۔ بادشاہ نے یہ حکم بھی جاری کیا تھا کہ سونے کا سکہ تیار کیا جائے اور روزانہ پانچ بار نوبت بجائی جائے اور جو بھی شخص دربار میں داخل ہو وہ دو زانو ہو کر بیٹھے اور پھر زمین بوس ہو۔

محمد شاہ نے اپنی والدہ ملکہ جہاں کو دیگر عملے کے علاوہ ملکہ کی رشتہ دار اور محتاج و نادار تقریباً آٹھ سو عورتوں کے ہمراہ حج کے لئے روانہ کیا اور تمام اخراجات شاہی خزانہ سے ادا کئے۔ ملکہ جہاں مدینہ منورہ میں روزانہ سیدہ فاطمہؑ کے مزار پر زیارت کے لئے جاتی تھیں۔ ایک دن ملکہ نے پوچھا کہ حضرت امام حسینؑ کا مزار کہاں ہے تا کہ اس کی زیارت کی جا سکے صدر اشریف نے جواباً کہا کہ سید الشہداء کا مدفن کربلا میں ہے۔ ملکہ جہاں نے اس کا سبب پوچھا کہ حضرت

فاطمہؑ کا مزار تو مدینہ منورہ میں ہے پھر حضرت امام حسینؑ کو کربلا میں کیوں دفن کیا گیا؟ اس پر صدرا شریف نے حضرت حسینؑ اور یزید کا قصہ بیان کیا اس پر ملکہ نے بہت گریہ وزاری کی اور کہا کہ چھوٹا بیٹا ماں کو ہمیشہ پیارا ہوتا ہے لہٰذا مجھے حضرت امام حسینؑ کے مزار کی زیارت بھی کرنا ضروری ہے تا کہ حضرت بی بی ناراض نہ ہوں یہ سوچ کر ملکہ جہاں نے کربلا جانے کی تیاری شروع کی۔

وہ مدینہ منورہ سے چلنے ہی والی تھیں کہ انہیں خواب میں حضرت فاطمۃ الزہرا کی زیارت نصیب ہوئی اور انہوں نے آپ سے فرمایا کہ تجھے مزار حسینؑ پر حاضری دینے کی کوئی ضرورت نہیں میں تیرے اچھے اخلاق سے بہت ہی متاثر ہوں اور یہ بشارت دی کہ تو اپنے گھر چلی جا کیونکہ تیرے بیٹے تیری دید کے مشتاق ہیں۔ ملکہ نے اس کے بعد بہت سا مال اسباب، زروجواہر ایک قابل اعتماد آدمی کے ذریعے کربلائے معلیٰ بھیجا تا کہ یہ سب علی علیہ السلام اور حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے فرزندان عالی قدر کے نام سے سیادات اور زائرین میں بانٹ دیا جائے۔

تلنگانہ کے راجہ نے ایک بیش قیمت اور مرصع تخت محمد شاہ بہمنی کو تحفۃً دیا۔ سلطان نے اس تخت کو "تخت فیروزہ" کے نام سے موسوم کیا کیونکہ یہ فیروزی کانچ کا بنا ہوا تھا (شیعوں بالخصوص ایرانیوں کو قاتل عمر فاروقؓ ابولولؤ فیروز کے ساتھ بڑی عقیدت ہے) اور "نوروز" کے دن "ساعت تحویل" (وہ وقت جب سورج سارے سال کا دور ختم کر کے برج حمل میں داخل ہوتا ہے) میں اس پر قدم رنجہ فرمایا۔ بہمنی خاندان کا ہر حکمران سلطان محمد شاہ کی پیروی کرتا تھا اور "درفش کاویانی" (یہ ایران کے ساسانی بادشاہوں کا جنگی علم تھا جو لاکھوں روپے کے صرف سے تیار ہوا تھا اور ہر بادشاہ اپنے عہد میں اس کی زینت اور سجاوٹ میں ہر سال کوئی نہ کوئی اضافہ برابر کرتا رہتا تھا) کی طرح تخت فیروزہ میں بھی ہر دور میں ہیرے اور جواہرات کا اضافہ کیا جاتا تھا۔ بادشاہ جس سال تخت فیروزہ پر بیٹھا تھا اس سال چالیس روز تک عیش وطرب کی محفلیں رہیں۔ کسی شہری سے کوئی باز پرس نہ کی گئی ہر ایک کو اختیار دے دیا گیا جو مرضی ہو وہ کرے نیز تمام امرائے سلطنت اور اراکین دولت بھی دن کو عید اور شب کو شب برات منانے لگے۔

محمد شاہ بہمنی سترہ برس اور نو ماہ حکومت کرنے کے بعد ۹ ذیقعدہ ۷۷۶ھ کو فوت ہو گیا۔

محمد شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مجاہد شاہ بعمر انیس برس تخت نشین ہوا اور ۷ ذی الحج ۷۷۹ھ کو اپنے چچا داؤد شاہ کے ہاتھوں قتل ہو گیا چونکہ مجاہد شاہ کی کوئی اولاد نہ تھی اس لئے اس کا

قاتل چچا داؤد شاہ اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔ مجاہد شاہ کی بہن "روح پرور آغا" کے دل میں بھائی کے انتقام کی آگ بھڑکتی رہی جس میں وہ بہت جلد کامیاب ہوگئی اور اپنے ایک فدائی یا کسنائی کے ذریعے اس کا کام تمام کرا دیا۔ داؤد شاہ نے ایک ماہ اور پچیس دن حکومت کی۔

داؤد شاہ کے بعد ملکہ روح پرور نے اس کے بھائی محمود شاہ کو اقتدار دلوا دیا اور وہ ۲۲ محرم ۷۸۰ھ میں تخت نشین ہو گیا اس نے انیس سال ۹ مہینے اور بیس دن حکمرانی کر کے ۲۱ رجب ۷۹۹ھ کو تپ محرقہ کی بیماری سے رحلت کی محمود شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا غیاث الدین عمر سترہ برس مسند نشین ہوا اور ۱۷ رمضان ۷۹۹ھ کو اس کے ایک مصاحب تغلچین نے اس کی آنکھیں نکلوا دیں اور اسے اقتدار سے الگ کر دیا۔

اس کے بعد اس کا بھائی سلطان شمس الدین بن سلطان محمود شاہ عمر پندرہ برس تخت نشین ہوا اور تقریباً دو ماہ کے بعد اسے بھی اقتدار سے الگ کر دیا گیا۔ اس کے بعد سلطان فیروز شاہ بن سلطان داؤد شاہ حکمران بنا۔

۸۰۲ھ میں جب فیروز شاہ کو معلوم ہوا کہ امیر تیمور نے دہلی کو فتح کر لیا ہے تو اس نے امیر تقی الدین (داماد میر فضل اللہ شیرازی) اور مولانا لطیف اللہ شیرازی کے ذریعے ایک سفارت ہدایا و تحائف کے ساتھ اس کی خدمت میں بھیجی اور اسے یقین دلایا کہ وہ "آستانہ تیموری" کا خیر خواہ ہے امیر تیمور فیروز شاہ کے خلوص اور محبت کا بہت شکر گذار ہوا اور دکن و مالوہ کی بادشاہی فیروز بہمنی کو عطا کر دی اور تاج سلطنت اور دیگر لوازمات شاہی عطا کئے۔ اس کے ساتھ اس نے فیروز شاہ کے نام ایک عریضہ بھی بھیجا جس میں اسے "فرزند خیر خواہ" کے نام سے یاد کیا۔ بالآخر فیروز شاہ پچیس سال سات ماہ اور پندرہ دن کی حکمرانی کے بعد بجبر اپنے بھائی احمد شاہ کے حق میں دست بردار ہو گیا اور شوال ۸۲۵ھ میں رحلت کر گیا۔

فیروز شاہ کے بعد اس کا بھائی احمد شاہ دہلی کے ایک ولی حضرت گیسو دراز (جو دکن میں مقیم ہو گئے تھے) کی دعا اور توجہ سے تخت نشین ہو گیا۔ احمد شاہ نے حضرت گیسو دراز کی رہائش کے لئے ایک بہت عظیم الشان عمارت تیار کرائی۔ دکن کے باشندے حضرت گیسو دراز کے بہت معتقد ہیں ایک بار کسی دکنی سے سوال کیا گیا کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ زیادہ اونچا ہے یا حضرت گیسو دراز کا" اس نے جواباً کہا "آنحضرت پیغمبر ہیں مگر حضرت گیسو دراز کچھ چیز ہی اور ہیں"

آذری اسفرائنی مصنف "بہمنی نامہ" احمد شاہ کے بہت قریب آ گئے اور سلطان نے انہیں کہا کہ "گیسو دراز کے بعد جو خلا پیدا ہو گیا تھا اس کو تم نے کسی حد تک پر کر دیا ہے۔ شیخ آذری اپنے دور کے بہترین شاعر تھے اور شیخ صدر الدین اور الغ بیگ مرزا کی ملاقات کے لئے "مشہد مقدس" بھی جاتے رہے۔ اس کے زمانے میں شاہ نعمت اللہ ولی اور ان کی کرامات کی بہت دھوم تھی۔ بادشاہ نے انکی خدمت میں شیخ حبیب اللہ جنیدی اور میر شمس الدین قمی کے ذریعے بہت سے ہدیے اور تحفے بھیجے۔ انہوں نے تحائف کی بہت قدر کی اور ایک سبز تاج بارہ گوشوں کا بنوا کر ملا قطب الدین کے سپرد کیا اور کہا کہ یہ بادشاہ کی امانت ہے یہ ملحوظ رہے کہ "کلاہ اثنا عشریہ" اہل تشیع کا شعار ہے چنانچہ علامہ محمد حسین مظفر لکھتے ہیں کہ "کلاہ اثنی عشریہ۔ بہ نشانہ شمار ائمہ دوازدہ زاویہ داشت وایں کلاہ شعار صوفیہ در تشیع بودہ است"۔ (تاریخ شیعہ صفحہ ۳۲۴)

اس کے بعد بادشاہ کی درخواست پر شاہ نعمت اللہ ولی نے اپنے پوتے میر نور اللہ کو دکن بھیج دیا۔ میر نور اللہ جب بیدر کے گرد و نواح میں پہنچے تو بادشاہ نے اپنے تمام فرزندوں کے ساتھ نہایت عزت و احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ میر نور اللہ کو اس زمانہ کے تمام علماء و فضلاء پر فوقیت دی گئی حتیٰ کہ حضرت گیسو دراز کی اولاد سے بھی بڑھ کر ان کا رتبہ سمجھا گیا۔ ان کو "ملک المشائخ" کا لقب دینے کے علاوہ بادشاہ نے انہیں اپنا داماد بھی بنا دیا۔

احمد شاہ بارہ سال اور دو ماہ تک حکومت کرنے کے بعد ۸۳۸ھ میں انتقال کر گیا۔ احمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا علاؤ الدین بہمنی تخت نشین ہوا۔ یہ انتہائی عیش پرست بادشاہ تھا اس نے اپنے محل میں ایک ہزار خوبصورت ترین عورتیں جمع کیں اور دریائے نعمت آباد کے کنارے ایک عظیم الشان باغ لگوایا۔ اسی باغ میں اس نے بزم مے و ساقی آراستہ کی۔ عیش و عشرت کے اس زمانے میں لوگوں کو چار یا پانچ مہینے میں صرف ایک مرتبہ سلام عام کی اجازت ہوتی تھی۔ اسی اثناء میں دکنیوں کو ہر طرح کا اقتدار حاصل ہو گیا اور میاں منّ اللہ دکنی مستقل شاہی وکیل بن گیا۔ بالآخر بادشاہ تیئس سال نو ماہ اور بیس دن امور سلطنت انجام دینے کے بعد ۸۶۲ھ میں فوت ہو گیا۔

اس کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں شاہ تخت نشین ہوا جو ظالم کے لقب سے مشہور تھا۔ اس کے دور میں ظلم و ستم کا بازار گرم رہا اور تین سال چھ ماہ حکومت کرنے کے بعد ۲۸ ذیقعدہ ۸۶۵ھ کو

رحلت کر گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا نظام شاہ بعمر آٹھ سال تخت نشین ہوا امور سلطنت کی دیکھ بھال اس کی ماں کرتی رہی یہ نظام سلطان ۱۳ ذی قعدہ ۸۶۸ھ کو فوت ہو گیا۔

نظام شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بھائی محمد شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ اسی دور میں یوسف عادل خان (جس نے آگے چل کر بیجاپور میں مستقل شیعہ ریاست عادل شاہی قائم کی) سلطان کے مقرب امراء کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ بعد میں ترقی کرتا ہوا دولت آباد کا امیر لشکر مقرر ہوا اور خلعت فاخرہ سے نوازا گیا۔ یہ منصب بہت ہی بلند ہے۔ خاندان بہمنی میں اس سے زیادہ بڑا منصب کوئی نہیں ہوتا تھا۔ محمد شاہ ثانی بیس سال تک حکومت کرنے کے بعد ۷ صفر ۸۸۷ھ کو فوت ہو گیا۔

محمد شاہ ثانی کے بعد اس کا بیٹا محمود شاہ تخت نشین ہوا۔ اسی کے دور میں یوسف عادل خان نے ۸۹۵ھ میں بیجاپور میں باقاعدہ شیعہ سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔ سلطان محمود شاہ یوسف عادل کی درخواست پر بیجاپور گیا جہاں یوسف عادل نے دل کھول کر بادشاہ کی خاطر داری اور تواضع کی۔

اسی سلطان محمود شاہ نے قطب الملک ہمدانی (جو ایک دوسری شیعہ سلطنت قطب شاہیہ کا بانی ہے) کو ۹۰۱ھ میں سارے تلنگانہ کا امیر لشکر مقرر کیا۔ اس طرح سلطان محمود شاہ کے دور میں دو شیعہ ریاستیں مستقل طور پر وجود میں آ گئیں۔ پھر یہ سلطان سینتیس سال حکمرانی کرنے کے بعد ۹۲۴ھ میں فوت ہو گیا۔

محمود شاہ کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ ثانی محمود خطبے میں برائے نام بادشاہ مقرر ہوا۔ امور سلطنت امیر برید سرانجام دیتا رہا اور ۹۲۷ھ میں یہ بادشاہ بھی زہر یا طبعی موت کی وجہ سے دنیا کو خیر باد کہہ گیا احمد شاہ کی موت کے بعد امیر برید نے بظاہر اس کی عزاداری میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ کی۔ تقریباً دو ہفتے تک امور مملکت کو معطل رکھا اور پھر خود تخت پر بیٹھنے کی بجائے احمد شاہ کے بیٹے علاؤالدین شاہ کو تخت نشین کر دیا اور دو سال کے بعد پہلے اسے معزول کر کے نظر بند کیا اور پھر اسے قتل کر دیا۔

اس کے بعد امیر برید نے شاہ ولی اللہ بن سلطان محمود شاہ کو تخت نشین کیا پھر تین سال کے بعد اسے قتل کر کے اس کی بیوی سے شادی کر لی۔

ولی اللہ کے بعد اس کا بھائی کلیم اللہ تخت نشین ہوا۔ یہ یوسف عادل کا نواسا تھا۔ اسے

بھی امیر برید کی بدولت برائے نام بادشاہت ملی۔ دوسری طرف حالات میں ایک نئی تبدیلی پیدا ہوئی۔ وہ یہ کہ بابر نے کابل سے ہندوستان پر لشکر کشی کر کے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اس کی فتوحات کی سارے ہندوستان میں شہرت پھیل گئی۔ اسماعیل عادل اور سلطان قلی قطب شاہ نے بابر کے پاس ... محبت آمیز خطوط روانہ کئے۔ کلیم اللہ شاہ نے بھی بابر کو خط لکھ کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ہوا پر خط کا راز فاش ہونے پر جان بچانے کے لئے راہ فرار اختیار کی۔ وہ ۹۳۴ ... بیدر سے نکل کر بیجاپور گیا۔ یہاں شاہ نے لالچ میں اس کی آؤ بھگت کی لیکن جلد ہی ... موت سے ہمکنار ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی سلطنت بہمنیہ کا بھی خاتمہ ہو گیا اور ... میں پانچ ... حکومتیں قائم ہو گئیں۔

۱۔ عادل شاہی، ۲۔ نظام شاہی، ۳۔ عماد شاہی، ۴۔ قطب شاہی، ۵۔ برید شاہی،

بہمنی خاندان نے تقریباً دو سو برس تک (۷۴۸ھ سے ۹۳۴ھ) حکومت کی اور یکے بعد دیگرے ... بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ ان سلاطین میں سلطان محمود شاہ ابن علاؤالدین حسن گانگو کا کردار سب سے بہتر رہا۔ سلطنت بہمنیہ کے آخری دور میں ایران میں صفویوں کی ایک زبردست اور طاقتور شیعہ سلطنت بھی قائم ہو گئی۔ سلاطین بہمنیہ کے حالات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس قسم کی حکومت تھی۔ اس میں نوروز، درفش کاویانی، آستانہ تیموری کے ساتھ عقیدت اور دیگر رسومات سے واضح ہوتا ہے کہ ان سلاطین پر مجموعی طور پر ایرانیت اور شیعیت کا رنگ چھایا ہوا تھا اس پر "تقیہ شریفہ" کا سہارا مستزاد تھا جس کے نتیجے میں مستقل طور پر باقاعدہ تین شیعہ ریاستیں قائم ہو گئیں۔ خود شیعہ علماء بھی سلطنت بہمنیہ کو مذہب شیعہ کے فروغ کا ایک وسیلہ قرار دیتے ہیں حیرت ہے کہ اکبر شاہ خان نجیب آبادی بھی اس حقیقت کو فراموش کر گئے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ

"لیکن جنوبی ہند میں سلطان محمود شاہ بہمنی نے کتاب و سنت کی اشاعت میں بہت کوشش کی جو نویں صدی کے وسط تک موجب ملک دکن کی روشنی کا موجب رہی۔ البتہ دکن میں وزیر السلطنت خواجہ محمود گاوان کی مساعی جمیلہ سے علم دین کا چرچا ہوا اور بعض دینی مدارس بھی جاری ہوئے"۔ {تاریخ زوال ملت اسلامیہ ص ۱۰۱}

مورخ فرشتہ اس دور کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"اس عہد میں شرع کی بہت پابندی کی جاتی تھی جو لوگ احکام شرعی سے سر مو تجاوز

کرتے تھے انہیں سخت سزا ملتی تھی۔ ہر شخص خدا اور رسول کے احکام پر چلتا تھا۔ ایک دفعہ محمود شاہ کے عہد میں ایک عورت زنا کے جرم میں پکڑی گئی اور اس کو دارالقضاۃ میں پیش کیا گیا۔ قاضی کے سوال کرنے پر اس نے جواب دیا کہ شرع میں ایک مرد چار عورتوں سے تعلق پیدا کر سکتا ہے لہٰذا عورت کو بھی شاید یہ حق حاصل ہو کہ وہ چار مردوں سے تعلق رکھ سکے۔ اب مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ بات شرع میں جائز نہیں لہٰذا اب میں توبہ کرتی ہوں اس عورت نے اس طرح اپنا دامن بچا لیا اور قانون کی زد سے باہر نکل گئی"۔ (تاریخ فرشتہ صفحہ ۹۴ جلد ا)

یہ درست ہے کہ محمود شاہ کا دور نسبتاً بہتر رہا۔ تاہم اہل تشیع بھی " کچھ بے کار بیٹھے ہوئے نہیں تھے" اور وہ مذہب شیعہ کے فروغ میں برابر کوشاں رہے۔ مورخ فرشتہ کے بیان کردہ مذکورہ بالا واقعہ سے "احکام شرع" پر پابندی کا بھی بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

محمود شاہ بہمنی محمود گاوان کی بہت عزت کرتا تھا اس نے اسے خلعت خاص سے سرفراز کیا۔ بادشاہ کی والدہ نے بھی اسے "برادر" کے لقب سے یاد کیا۔ محمد شاہ نے محمود گاوان کے لقب میں بھی اضافہ کیا اور حکم دیا کہ تمام فرمانوں اور مشوروں میں اس کا نام اس طرح لکھا جائے۔ "حضرت مجلس کریم، سید عظیم، ہمایوں اعظم، صاحب السیف والقلم، مخدوم جہانیاں، معتمد درگاہ شاہان آصف جم نشان، امیر الامراء، الملک نائب، مخدوم الملک التجار محمود گاوان المخاطب بہ خواجہ جہاں"۔ بادشاہ کی نگاہ میں تو محمود گاوان کا یہ مقام تھا لیکن اس "عظیم المرتبت انسان کی" مساعی جمیلہ میں سے ایک "نیک کوشش" یہ بھی ہے کہ اس نے خاندان بہمنی کا سب سے بڑا منصب یوسف عادل کو دلوایا جس نے مستقل طور پر "عادل شاہی" شیعہ سلطنت قائم کی۔ اس کے علاوہ اس نے یوسف عادل کو اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا بعد میں یہی محمود گاوان بادشاہت کے خواب بھی دیکھنے لگا جس کے نتیجے میں محمد شاہ بہمنی کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔

مورخ فرشتہ بہ عنوان "خواجہ کا کردار" لکھتے ہیں کہ:

"خواجہ گاوان مذہبی امور میں بہت ہی محتاط انسان تھا وہ دین کا پکا اور عقیدے کا پکا تھا۔ حضرات شیخین کا تذکرہ بہت تعظیم و تکریم کے ساتھ کرتا تھا"۔ (تاریخ فرشتہ صفحہ ۹۵ جلد ا)

اس عبارت میں خواجہ گاوان کی مذہبی حیثیت اور "تقیہ شریف" پر عمل بھی ظاہر ہو رہا ہے۔

عادل شاہی سلطنت

خواجہ محمود گاواں کے چہیتے فرزند یوسف عادل خان نے ۸۹۵ھ میں ملک دکن کے علاقہ بیجاپور میں ایک آزاد شیعہ حکومت قائم کی۔ یوسف عادل شاہ کی طبیعت میں ایران کے دوروں اور خاندان صفویہ کے بانی شیخ صفی کے خاص معتقدین کے ساتھ روابط کے نتیجے میں "تشیع" کی گرم جوشی بیٹھ گئی تھی۔ لہٰذا اس نے اسی مذہب کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دیا۔ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ یوسف عادل سلطان محمود شاہ بہمنی کا مقرب خاص بن گیا تھا اور اس نے یہاں تک قرب حاصل کر لیا کہ آزاد سلطنت قائم کرنے کے باوجود سلطان محمود شاہ نے ۹۰۳ھ میں اس سے اپنے بیٹے شہزادہ احمد کے لئے (جس کی عمر اس وقت چار سال تھی) اس کی ایک سالہ بیٹی "ستی بی بی" کا رشتہ مانگا جو باقاعدہ طے ہو گیا۔ یوسف عادل شاہ ایک کٹر اثنا عشری شیعہ تھا۔ دوسری طرف ایران میں اس وقت شاہان صفوی برسر اقتدار تھے۔ ان ہی کے تعاون اور امداد سے عادل شاہی سلطنت قائم رہی۔

شیعہ مجتہد و مورخ علامہ محمد حسین مظفر نے یوسف عادل شاہ کو شاہ اسماعیل صفوی کے والد شاہ حیدر صفوی کا مخلص عقیدت مند قرار دیا ہے (تاریخ شیعہ صفحہ ۲۳۶)

یہی وجہ ہے کہ یوسف عادل نے اپنی سلطنت کے آغاز ہی میں مذہب اثنا عشریہ کو رائج کیا۔ شیعہ مورخین کے مطابق یوسف عادل کو جب معلوم ہوا کہ اسماعیل صفوی نے ایران میں مذہب جعفری کو سرکاری مذہب قرار دیا ہے اور خطبہ جمعہ میں بارہ اماموں کے نام شامل کر دیے ہیں تو یوسف عادل بہت خوش ہوا کیونکہ اسے اسماعیل صفوی کے اس اعلان سے تقویت حاصل ہوئی۔ یوسف عادل نے ۹۰۴ھ میں اذان میں شہادتین کے ساتھ ساتھ "شہادت علی" کا بھی اضافہ کر دیا۔

اس پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ایران میں اسماعیل صفوی کی حکومت ۹۰۵ھ میں قائم ہوئی جب کہ یوسف عادل نے ۸۹۵ھ میں اپنی سلطنت میں شیعی امور و مراسم نافذ کیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یوسف عادل اسماعیل صفوی کے والد حیدر شاہ کا عقیدت مند تھا اور اس کے ساتھ اس کے باقاعدہ روابط تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسماعیل صفوی نے اچانک انقلاب برپا نہیں کیا بلکہ وہ آہستہ آہستہ علاقے فتح کرتا رہا اور ان مفتوحہ علاقوں میں مذہب شیعہ کا نفاذ کرتا رہا

تا آنکہ ۹۰۵ھ میں اسے مکمل کنٹرول حاصل ہو گیا تو اس نے پورے ملک میں اس کو نافذ اور رائج کر دیا۔ (اس کے حالات پیچھے "عہد صفوی" کے تحت گذر چکے ہیں)۔

یوسف عادل نے ایک شیعہ عالم سید احمد ہروی کو شاہ اسماعیل صفوی کے پاس بھیج کر اس سے حمایت اور مدد کی درخواست کی جسے اس نے بصد خوشی قبول کر لیا۔ یہ بشارت سلطنت عادل شاہی کے استحکام کا باعث بنی اور اس نے یکسو ہو کر مذہب شیعہ کی خوب تبلیغ کی اور ائمہ اہل بیت کے علوم و معارف اور احکام رائج کئے۔ یوسف عادل نے تقریباً اکیس برس تک حکومت کی اور ۹۱۶ھ میں رحلت کر گیا۔

یوسف عادل شاہ کے بعد اس کا بیٹا اسماعیل عادل شاہ تخت نشین ہوا مذہب شیعہ کی اشاعت میں اس نے اپنے باپ سے بھی زیادہ سرگرمی دکھائی۔ اس کے لئے اس نے ایک دستور مرتب کیا۔ اپنی فوج کے لئے "کلاہ اثنا عشریہ" کو لازمی قرار دیا۔ بارہ اماموں کی مناسبت سے بارہ گوشوں والی یہ ایک سرخ ٹوپی تھی جسے شاہان صفویہ بھی اوڑھا کرتے تھے جو سپاہ شیعہ کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

اسماعیل عادل نے پوری ریاست میں انتہائی سختی کے ساتھ "تبرا" کا حکم نافذ کیا کہ تمام گلی کوچوں میں آل محمد کے دشمنوں سے اعلان برأت کیا جائے۔ بالآخر اسماعیل عادل شاہ ۹۴۱ھ میں انتقال کر گیا۔ اسماعیل عادل شاہ نے اپنے بڑے بیٹے ملوخان کو نامزد کر دیا تھا اس لئے امراء نے ملوخان کو جانشین مقرر کر کے شہزادہ ابراہیم عادل کو نظر بند کر دیا تاکہ کسی قسم کا کوئی جھگڑا پیدا نہ ہو۔ یہ امرد پرست، عیاش اور ظالم شخص تھا چھ ماہ کے بعد ملوخان کو گرفتار کر کے معزول کر دیا گیا۔

ملوخان عادل شاہ کے بعد اس کا بھائی ابراہیم عادل شاہ ۹۴۲ھ میں تخت نشین ہوا۔ انہوں نے اپنے آباء کے مذہب کو ترک کر دیا۔ خطبہ جمعہ سے ائمہ اثنا عشر کے نام خارج کئے اور سرخ ٹوپی کا اوڑھنا ممنوع قرار دیا جو "کلاہ دوازدہ ترک" کہلاتی تھی اور سپاہ شیعہ کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اسی دوران وہ مختلف امراض کی وجہ سے صاحب فراش ہو گئے لیکن رعایا اور اس کے عمال یہ نئی تبدیلی کب برداشت کر سکتے تھے؟ لہٰذا ان کی بیماری کے دوران ہی انہوں نے شیعی رسومات کو دوبارہ جاری کر دیا اور ابراہیم عادل شاہ ۹۶۵ھ میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ابراہیم عادل شاہ کے بعد ان کا ناخلف لڑکا علی عادل شاہ تخت نشین ہوا۔ خواجہ عنایت اللہ شیرازی اور ملا فتح اللہ شیرازی نے اس کی تعلیم و تربیت شیعہ مذہب کے مطابق کی تھی اور رعایا و دیگر عمال بھی اسی مذہب پر کاربند تھے۔ اس کے علاوہ شاہان صفوی بھی اپنے "فرض" سے غافل نہیں تھے لہٰذا اس حاکم نے برسر اقتدار آتے ہی خطبہ جمعہ میں بارہ اماموں کا نام شامل کیا اور اذان میں علی ولی اللہ کا اضافہ کیا۔ ابراہیم عادل شاہ کے دور میں جن شیعوں نے تقیہ اختیار کیا تھا انہیں حکم دیا کہ ردائے تقیہ اتار کر علی الاعلان سر عام گلیوں اور بازاروں میں اعلان برائت و تبرا کریں علی عادل شاہ نے دولت صفویہ کے ساتھ دوبارہ تعلقات استوار کیے اس کے دور میں شیعہ اور مذہب شیعہ کو بہت فروغ حاصل ہوا تا آنکہ ۹۷۴ھ اور بقول مورخ فرشتہ ۹۸۹ھ میں فوت ہو گیا۔

علی عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا ابراہیم عادل شاہ ثانی بن طہماسپ بعمر دس سال تخت نشین ہوا۔ اس کے دور میں بھی شیعی رسومات اور طور طریقے جاری رہے۔ عادل شاہی اور نظام شاہی سلطنتوں کے مابین دوستانہ اور برادرانہ تعلقات قائم تھے جو قرابت داری اور رشتہ داری میں تبدیل ہو گئے۔ ابراہیم عادل شاہ نے اب تیسری شیعہ ریاست "قطب شاہی" کے ساتھ بھی رشتہ داری کی خواہش کا اظہار کیا اور چاند بی بی دختر قطب شاہ جو اپنے بھائی محمد قلی قطب شاہ کے سایہ عاطفت میں پرورش پا رہی تھی کے رشتہ کا پیغام بھیجا جسے قبول کر لیا گیا۔

عادل شاہی سلطنت ایک سو سال سے زیادہ عرصہ تک قائم رہی اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کی بادشاہت پر ختم ہو گئی چنانچہ شیعہ مورخ علامہ محمد حسین مظفر لکھتے ہیں۔

"و با کمال تاسف حکومت عادل شاہیہ با پایان یافتن حکومت ابراہیم عادل شاہ دوم۔ منقرض شد۔"

(تاریخ شیعہ صفحہ ۳۲۰)

قطب شاہی سلطنت

یہ حکومت گولکنڈہ دکن اور حیدر آباد میں قائم ہوئی اس کا بانی اور موسس سلطان قلی قطب شاہ ہے قلی قطب شاہ ایران میں ہمدان کے علاقہ اسعد آباد میں پیدا ہوا اور سلطان محمود بہمنی کے دور میں ہندوستان آیا۔ سلطان نے اسے مرتبہ امارت سے سرفراز کیا اور "قطب الملک" کا لقب عطا کیا۔ ۹۱۸ھ میں اس نے گولکنڈے میں ایک آزاد اور خود مختار شیعہ ریاست (قطب شاہی) کی بنیاد رکھی اور قلی قطب سے قطب شاہ بن گیا۔ اس نے اپنی سپہ سالاری اور امارت کے

زمانہ ہی سے ائمہ اثنا عشریہ کے نام خطبات جمعہ میں شامل کئے تھے اور بادشاہ بننے کے بعد شاہ اسمٰعیل صفوی اور یوسف عادل کی پیروی میں اس نے اپنی ریاست میں تمام شیعی رسوم وطریقے جاری کردیئے۔ اس نے مذہب شیعہ کے فروغ میں بہت کوشش کی۔ اس کی حکومت میں حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ پر اعلانیہ تبرا کیا جانے لگا۔

مؤرخ فرشتہ اس دور کے متعلق لکھتا ہے کہ:

"بے ادب اور نامعقول اشخاص نے تبرا بازی کو اپنا شعار بنایا۔ قصہ مختصر یہ کہ آج تک جب کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی حکومت ہے تلنگانہ میں شیعہ مذہب کا رواج ہے اور بارہ اماموں کے ناموں کا خطبہ پڑھا جاتا ہے۔ منبروں پر سب سے پہلے بادشاہ ایران شاہ عباس صفوی کی بہبودی وخوش حالی کی دعا مانگی جاتی ہے خدا کا شکر ہے کہ ان فرمانرواؤں کو مشائخ صفویہ کے ساتھ جو تعلق خاطر قائم تھا اس میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی"۔ (تاریخ فرشتہ صفحہ ۲۵۹ جلد ۲)

قطب شاہ ۹۵۰ھ میں تینتیس سال حکومت کرنے کے بعد اپنے بیٹے جمشید کی حصول اقتداری خواہش کی بھینٹ چڑھ گیا اور اس کی سازش سے قتل ہو گیا قطب شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا جمشید قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کے دور میں بھی وہی طور طریقے جاری رہے اس نے عنان حکومت ہاتھ میں لے کر اپنے باپ کی پیروی کی اور مذہب شیعہ کے فروغ میں کوشاں ہوا۔ برہان نظام شاہ نے جمشید کو مبارک باد دینے کے لئے شاہ طاہر کو گولکنڈہ بھیجا۔ شاہ طاہر یہ وہی ایرانی عالم ہے جس کی تبلیغ سے برہان نظام شاہ نے سنی مذہب ترک کر کے شیعہ مذہب اختیار کیا تھا) جب گولکنڈہ کے قریب پہنچا تو بادشاہ نے خود چھ کوس کے فاصلے پر اس کا استقبال کیا اور بڑی عزت کے ساتھ شاہ صاحب کو شہر میں لایا۔ جمشید شاہ سات سال اور چند ماہ حکومت کرنے کے بعد تپ محرقہ کا شکار ہو کر ۹۵۷ھ میں رحلت کر گیا۔ جمشید قطب شاہ کے بعد ابراہیم قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ انتہائی چالاک اور ہوشیار شخص تھا۔ اس فرمانروا نے بھی شیعہ مذہب کی اشاعت وترویج میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بتیس سال کی طویل حکمرانی کے بعد ۹۸۹ھ میں رحلت کر گیا۔

ابراہیم قطب شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمد قلی قطب شاہ ثانی عمر بارہ سال تخت نشین ہوا۔ یہ عقل مند اور بردبار شخص تھا اسی بردباری کے باعث "سلطان حلیم" کے نام سے مشہور

تھا۔ اس نے بہت سے نئے علاقے فتح کئے اور حیدرآباد شہر کی بنیاد رکھی۔ مملکت میں بہت سے
شیعہ مدارس قائم کئے۔ اس کے دور اقتدار میں ہند کے دوسرے اطراف میں مذہب شیعہ خوب
پھیلا۔ اس بادشاہ نے مذہب جعفری کے شعائر کو جاری کیا اور حکم دیا کہ عاشورہ کے دن پوری مملکت
میں مجالس عزائے حسینی برپا کی جائیں۔ اس کے ایرانی بادشاہ عباس صفوی کے ساتھ گہرے
تعلقات تھے۔ عباس صفوی نے محمد قلی قطب شاہ سے اپنے بیٹے کے لئے رشتہ بھی طلب کیا۔ جس کا
اس نے مثبت جواب دیا اور اپنی بیٹی عباس شاہ صفوی کے بیٹے کے لئے ایران بھیج دی۔

مورخ فرشتہ لکھتا ہے کہ "محمد قلی قطب شاہ کو اہل بیت کی محبت کا پورا پورا احساس کیا
قارئین کرام بخوبی جانتے ہیں کہ جب سے برعظیم ہندوستان میں اسلام پھیلا ہے اس وقت سے
تمام مسلم فرمانرواؤں کو ایرانی بادشاہوں کا قرب حاصل رہا لیکن یہ اعزاز صرف محمد قلی قطب شاہ ہی کے
حصے میں آیا کہ شاہ ایران شاہ عباس نے اپنے بیٹے کی شادی کا پیغام قطب شاہ کی بیٹی کے لئے دیا
ہے محمد قلی اس پیغام کو باعث فخر سمجھنے لگا اور شادی کے انتظامات میں پوری طرح مشغول ہوتا کہ
اپنی بیٹی کو ایران روانہ کر کے سعادت دارین حاصل کرے"۔ (تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۳۴۳)

محمد قلی قطب شاہ کے بعد اس کا بیٹا محمد قطب شاہ تخت نشین ہوا اس نے بہت سی شیعہ
مساجد اور مدارس بنائے۔ حیدرآباد میں جامع مسجد جو "مکہ مسجد" کے نام سے مشہور ہے اس کی
ایک اہم یادگار ہے اس میں "اہل بیت" کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اس کا شمار مذہب
شیعہ کے دفاع کرنے والوں میں سے ہوتا ہے۔ سلطان ۱۰۳۵ھ میں دنیا سے رحلت کر گیا۔

محمد قطب شاہ کے بعد اس کا بیٹا عبداللہ قطب شاہ تخت خلافت پر جلوہ گر ہوا جس نے
اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مذہب امامیہ کی نشر و اشاعت میں بڑی سرگرمی سے
حصہ لیا۔ اس کے دور میں شیعہ علماء و مجتہدین مختلف اطراف سے اکٹھے ہو کر تصنیف و تالیف میں
مصروف رہے۔ اس نے بھی شیعہ مدارس قائم کئے اور عاشورہ محرم میں مجالس عزائے حسینی کی
حقیقی رونقیں دوبالا کیں۔ عبداللہ قطب شاہ نے محرم ۱۰۸۳ھ میں وفات پائی۔

عبداللہ قطب شاہ کے انتقال کے بعد ابوالحسن قطب شاہ المعروف "تانا شاہ" تخت
نشین ہوا اس کے عہد ہی میں قطب شاہی سلطنت تقریباً دو سو سال تک جاری رہ کر مغل بادشاہ
اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھوں ۱۱۱۵ھ میں ختم ہو گئی۔

نظام شاہی سلطنت

نظام شاہی حکومت کی بنیاد احمد نگر میں سلطان حسن نے رکھی تھی (جو سنی المذہب تھا)
اس کے بعد اس کا بیٹا برہان نظام شاہ بعمر سات برس تخت نشین ہوا۔ جس نے طاہر شاہ دکنی حسینی کی تبلیغ سے ۹۴۳ھ میں مذہب اثنا عشریہ اختیار کیا۔ طاہر شاہ ایران کا ایک مذہبی عالم اور صاحب سیاست شخص تھا۔ یہ ۹۲۶ھ میں ہندوستان آیا اور احمد نگر کے سلطان برہان نظام شاہ (۱۵۰۸ء تا ۱۵۵۳ء) کے محکمہ سیاسی میں ملازم ہو گیا اور یہیں ۹۵۲ھ اور ۹۵۶ھ/ ۱۵۴۵ء اور ۱۵۴۹ء کے مابین کسی سال اس کا انتقال ہو گیا۔ اسے غیر معمولی کامیابی یہ حاصل ہوئی کہ اس نے برہان شاہ کو جو سنی المذہب تھا شیعہ اثنا عشری فرقے میں داخل کر لیا اور اس پر طرہ یہ کہ سنہ ۱۵۳۰ء میں اس نے اعلان کر دیا کہ ریاست کا سرکاری مذہب بھی یہی ہوگا۔ (بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۲ صفحہ ۳۸)

اکبر شاہ خان نجیب آبادی لکھتے ہیں کہ: "دسویں صدی ہجری کا ربع اول ختم ہوتے ہی یہ مصیبت نازل ہوئی کہ شاہ طاہر اسماعیلی باطنی نے آکر دکن کے سلاطین کو گمراہ اور شریعت اسلام کو خراب کرنا شروع کیا۔ یہ شاہ طاہر، شاہ جعفر قزوینی کا بھائی اور ملاحدہ الموت کے عقیدہ کا آدمی تھا۔ اس نے قزوین میں اپنی پیری مریدی کے مخصوص طریقہ پر عامل ہو کر وہاں ملاحدہ کی ایک زبردست جماعت تیار کر لی تھی۔ اس کا حال جب ایران کی صفوی سلطنت کو معلوم ہوا تو اس کی تحقیقات شروع ہوئی ۔ شاہ طاہر اپنی جماعت کو منتشر کر کے کاشان چلا گیا اور وہاں ایک مدرسہ میں بحیثیت مدرس کام کرنے لگا۔ آخر کاشان میں بھی وہ اپنے خاص کام سے باز نہ رہا۔ صفوی دربار سے اس کے قتل کا حکم جاری ہوا۔ شاہ طاہر کی جماعت کے آدمی دربار شاہی میں بھی موجود تھے انہوں نے عین وقت پر شاہ طاہر کو آگاہ کر دیا اور وہ ۹۲۶ھ میں وہاں سے فرار ہو کر بندر گوا میں آیا۔ گوا سے بیجاپور پہنچا۔ بیجاپور کے بادشاہ کو شیعہ بنا لینے میں کامیاب ہوا لیکن اس نے دکن میں آکر اثنا عشری شیعیت کی دعوت دی جو ایران کا شاہی مذہب تھا۔ اسماعیلی اور باطنی شیعیت کا اس نے دکن میں مطلق تذکرہ نہیں کیا۔ شاہ طاہر بہت ذہین اور کثیر المطالعہ شخص تھا۔ اس نے بیجاپور کی عادل شاہیہ سلطنت کو سب سے پہلے شیعہ بنایا۔

۹۴۱ھ تک بیجاپور میں شیعوں کا خوب زور شور رہا لیکن ۹۴۱ھ میں جب ابراہیم عادل شاہ تخت نشین ہوا تو اس نے تخت نشین ہوتے ہی شیعہ مذہب ترک کر کے سنی طریقہ اختیار کیا اور

۹۶۵ھ تک یعنی جب تک زندہ رہا شیعوں کی مخالفت پر کمر بستہ رہا۔ شاہ طاہر بھی ۹۴۱ھ میں بیجا پور سے احمد نگر کی جانب چل دیئے۔ احمد نگر کا شاہی خاندان سید محمد جونپوری کے مہدوی مسلک کا پیرو اور کتاب و سنت پر عامل تھا شاہ طاہر نے دربار شاہی میں رسوخ حاصل کر کے بہت جلد اپنا اثر قائم کر لیا اور تین سال کی مسلسل کوشش کے بعد ۹۴۴ھ میں برہان نظام شاہ فرمانروائے احمد نگر کو شیعہ بنا لینے میں کامیاب ہو گیا۔ برہان نظام شاہ نے شیعہ مذہب اختیار کر کے خلفائے راشدین کے ناموں کو خطبہ سے خارج کر کے بارہ اماموں کے نام داخل کیے۔ تبرا کرنے والوں کے لئے شاہی خزانہ سے وظیفے مقرر ہوئے۔ مہدوی طریقہ پر قائم رہنے والوں کو قتل یا جلاوطن کیا گیا اور بہت جلد حدود ریاست احمد نگر میں شیعہ مذہب پھیل گیا۔ یہ خبر جب طہماسپ صفوی کو پہنچی تو اس نے ۹۵۱ھ میں ایران سے نہایت قیمتی تحفے اپنے سفیروں کے ذریعے برہان نظام شاہ کے پاس الگ اور شاہ طاہر کے پاس الگ روانہ کئے اور نظام شاہی سلطنت کے نہایت مخلصانہ تعلقات ایرانی سلطنت کے ساتھ قائم ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہمایوں ایران میں طہماسپ صفوی کا مہمان تھا اور غالباً اسی لئے شیر شاہ کا ارادہ تھا کہ دکن کی اس شیعہ ریاست کو فتح کرنے کے بعد ایرانیوں کے خلاف سلطان روم سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری کیا جائے۔ شاہ طہماسپ صفوی نے ایک سفارت گجرات کے دربار میں بھیجی تھی آخر شاہ طاہر ۹۵۲ھ یا ۹۵۶ھ میں بمقام احمد نگر فوت ہوا۔ اس کے بعد ۹۶۵ھ میں بیجاپور کی سلطنت عادل شاہی بھی ابراہیم عادل شاہ کی وفات کے بعد پھر شیعہ ہو گئی"۔ (تاریخ زوال ملت اسلامیہ صفحہ ۱۷۷-۱۷۸)

مؤرخ موصوف کی یہ بات بالکل ہی خلاف حقیقت ہے کہ شاہ طاہر نے سب سے پہلے بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کو شیعہ بنایا۔ اس کا ذکر پیچھے گذر چکا ہے۔ مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ شاہ طاہر ۹۲۶ھ میں وارد ہند ہوا جب کہ عادل شاہی سلطنت ۸۹۵ھ میں قائم ہو چکی تھی۔ اسی طرح قطب شاہی سلطنت بھی ۹۱۸ھ میں قائم ہو گئی تھی۔ بہمنی سلطنت اور قطب شاہی سلطنت کے مؤسس و بانی بھی ایرانی النسل تھے اس لئے ان کے درباروں میں ایرانی علماء کی آمد کا سلسلہ جاری رہا اور شیعہ مؤلفین کی تصریحات کے مطابق انہوں نے یہاں مستقل ڈیرے ہی ڈال دیئے تھے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔

شیعہ مؤرخ و مجتہد علامہ محمد حسین مظفر لکھتے ہیں کہ:

"شاہ اسماعیل صفوی عالم بزرگوار شاہ طاہر رابہ دکن فرستاد تا مردم آں دیار را بہ ولا اہل البیت علیہم السلام و پذیرفتن مذہب تشیع فراخواند"۔ (تاریخ شیعہ صفحہ ۳۲۹)

یعنی شاہ اسماعیل صفوی نے خود شاہ طاہر کو ولاء اہل البیت اور مذہب شیعہ کے فروغ و پذیرائی کے لئے دکن کی طرف روانہ کیا تھا۔

البتہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نظام شاہی سلطنت ابتداء میں ایک سنی سلطنت تھی جو شاہ طاہر کی محنت و تبلیغ کے نتیجے میں شیعہ سلطنت میں تبدیل ہوگئی اور جو شیعی رسوم و شعائر عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنت میں رائج تھے وہ نظام شاہی سلطنت میں بھی انتہائی سختی کے ساتھ رائج اور نافذ کر دیے گئے۔

اس کے علاوہ برہان نظام شاہ کے عادل شاہی سلطنت کے ساتھ بھی اچھے اور خوش گوار تعلقات قائم تھے۔ چونکہ وہ ایک شیعہ سلطنت تھی اس لئے اس کے اثرات اس پر بھی مرتب ہوئے۔ شاہ طاہر کی کوشش سے یوسف عادل شاہ نے اپنی لڑکی بی بی مریم کی شادی برہان نظام شاہ کے ساتھ کر دی تھی۔

مؤرخ فرشتہ برہان نظام شاہ کے تبدیلی مذہب کے متعلق لکھتا ہے کہ: "ایک روز برہان نظام شاہ نے کہا کہ مذہب شیعہ کی تعلیمات کے بارے میں کچھ بیان کیجئے۔ شاہ طاہر نے بارہ اماموں کے اسمائے گرامی مع ان کے مناقب کے بیان کیئے اور کہا اس مذہب کی یہ خصوصیت ہے کہ اہل بیت کے ساتھ محبت کی جائے اور ان کے دشمنوں سے نفرت، برہان نظام شاہ نے اسی روز مذہب شیعہ اختیار کرلیا۔ بادشاہ کے ساتھ ہی شاہی خاندان کے دوسرے تمام مردوں اور عورتوں نے بھی مذہب اختیار کرلیا۔ اس کے بعد برہان نظام نے بارہ اماموں کے نام کا خطبہ جاری کرنے کا ارادہ کیا اور تینوں خلفاء کے ناموں کو خطبے سے نکال دینے کا خیال ظاہر کیا۔ شاہ طاہر نے اس سے بادشاہ کو منع کیا اور کہا فوراً ایسا کرنا مناسب نہیں ہے بہتر یہی ہے کہ سب سے پہلے ہر فرقے کے علماء کو جمع کیا جائے آپ ان سب سے یہ کہیے کہ میں حق مذہب کا طلب گار ہوں تم سب آپس میں غور و فکر سے کوئی ایسا مذہب اختیار کر دو تا کہ میں بھی اس کو اپناؤں برہان نظام شاہ نے شاہ طاہر کے مشورہ پر عمل کیا اور تمام علماء کو جو احمد نگر میں مقیم تھے جمع کیا۔ ان علماء میں ملا پیر محمد، استاد افضل خان ثانیہ اور ملا داؤد دہلوی بھی تھے۔ ہر جمعہ کو قلعے کے اندر شاہ طاہر کے

مدرسے میں علماء جمع ہوتے اور آپس میں بحث مباحثہ کرتے۔ ہر عالم کی یہ کوشش ہوتی کہ وہ اپنے مذہب کے زیادہ سے زیادہ فضائل بیان کرے اور حریف عالم کے مذہب کی تردید کرے۔ علماء کی ان مجلسوں میں اکثر و بیشتر برہان نظام خود بھی شرکت کرتا رہتا تھا۔ چھ مہینے تک اسی طرح بحث ہوتی رہی اور اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر برہان نظام شاہ نے ایک روز شاہ طاہر سے کہا "حیرت کی بات ہے کہ علماء کرام کسی نتیجے پر نہیں پہنچے ہر شخص اپنے مذہب کی تعریف کرتا ہے اور دوسرے کے مذہب کی برائی۔ اگر ان لوگوں کے مذہب کے علاوہ کوئی اور مذہب ہو تو بتاؤ تاکہ میں اسے اپنا لوں" شاہ طاہر نے جواب دیا کہ ایک مذہب اور ہے اور وہ مذہب ہے اثنا عشری اگر آپ حکم دیں تو اس مذہب کی کتابیں آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

مذہب اثنا عشری کے ایک عالم شیخ احمد نجفی کو بادشاہ نے بلوایا اور اسے بقیہ علماء سے بحث کرنے کے لئے کہا اس عالم نے تمام علماء سے مناظرہ کیا۔ شاہ طاہر اس کی مدد اور اس کے دلائل کی تائید کرتے جاتے تھے جب علماء کو یہ معلوم ہوا کہ شاہ طاہر خود شیعہ ہیں تو انہوں نے مخالفانہ بحث شروع کردی۔ اکثر ایسا تھا کہ سنی علماء لاجواب ہو کر محفل سے اٹھ جاتے تھے (اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مورخ فرشتہ بھی تقیہ باز شیعہ تھا) برہان نظام شاہ نے جب یہ دیکھا کہ سنی علماء شاہ طاہر کے دلائل کا جواب نہیں دے پاتے اور آئیں بائیں شائیں کرنے لگتے ہیں اور لاجواب ہو کر مجلس سے اٹھ جاتے ہیں تو برہان نظام نے کھلے بندوں شیعہ مذہب قبول کرنے کا اعلان کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً تین ہزار افراد نے جن میں شاہی مصاحب، ہندی، ترکی اور حبشی غلام، امراء منصب دار، جاروب کش اور فراش، الغرض ہر طبقے کے لوگ شامل تھے مذہب اثنا عشری قبول کر لیا۔ برہان نظام نے تینوں خلفاء کے نام خطبے سے نکال دیئے اور ائمہ اہل بیت کے نام کا خطبہ جاری کیا۔

برہان نظام شاہ نے شیعہ مذہب کی ترویج و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ تمام وظائف جو اہل سنت کے نام جاری کر دیئے تھے شیعوں کے لئے وقف کر دیئے گئے۔ قلعہ احمد نگر کے سامنے ایک چاردیواری کھنچوائی اور اس میں ایک عمارت تعمیر کروا کے اسے "لنگر خانہ دوازدہ امام" کے نام سے موسوم کیا اس لنگر خانے کے اخراجات کے لئے کئی قصبے وقف کئے گئے یہاں روزانہ کھانا پکا کر تقسیم کیا جاتا تھا۔

شاہ طاہر نے نظام شاہی خاندان کی بہت خدمت کی اور اس خاندان کی فلاح و بہبود کے کئی کام سرانجام دیے انہوں نے یہ کوشش بھی کی کہ خاندان رسالت کے تمام پرستار ساری دنیا سے کھینچ کر احمد نگر میں جمع ہو جائیں۔ شاہ صاحب نے شاہی خزانہ سے روپیہ حاصل کر کے عراق، خراسان، فارس، روم، گجرات اور آگرہ روانہ کیا اور شیعہ عالموں اور فاضلوں کو احمد آباد آنے کی دعوت دی۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے سے عرصہ ہی میں احمد نگر میں عالموں اور فاضلوں کی ایک عظیم الشان جماعت جمع ہو گئی۔

خواجہ معین الدین ساعدی کے ساتھ اسماعیل صفوی احمد نگر میں آئے۔ شاہ حسن انجو کو احمد نگر میں بلا کر بادشاہ کے مقربین میں شامل کیا گیا۔ ان کے علاوہ شاہ جعفر، ملا محمد نیشاپوری، ملا علی گل استر آبادی، ملا رستم جرجانی، ملا مازندرانی، ایوب ابو البرکات، ملا عزیز اللہ گیلانی، ملا محمد امامی استر آبادی اور دوسرے بہت سے علماء و فضلاء احمد نگر میں آ گئے اور یہ شہر علم کی جنت بن گیا۔ اسی زمانے میں شاہ اسماعیل صفوی کو یہ اطلاع ملی کہ برہان نظام شاہ نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا ہے اس نے اپنے مقرب خاص آقا سلیمان طہرانی کو احمد نگر روانہ کیا کہ وہ برہان نظام شاہ کو مبارک باد دے اسماعیل کی طرف سے ایک ترکی غلام مسمی شاہ قلی بھی برہان نظام شاہ کے پاس آیا اور اس نے شہنشاہ ایران کی طرف سے ایک زمرد جو ہمایوں بادشاہ سے ملا تھا اور جس پہ مستعصم باللہ کا نام کندہ تھا (یہ وہی عباسی خلیفہ ہے جسے ابن علقمی اور نصیر الدین طوسی کے مشورے سے ہلاکو خان نے ہلاک کر کے خلافت عباسیہ کا خاتمہ کیا تھا) مع دیگر تحفوں کے برہان نظام کو پیش کیا۔ شاہ اسماعیل صفوی نے متذکرہ تحائف کے علاوہ عقیق کی ایک انگوٹھی بھی روانہ کی جس پر "التوفیق من اللہ" کندہ تھا۔ یہ انگوٹھی ایک طویل مدت تک خود اسماعیل صفوی کے ہاتھ میں رہ چکی تھی"۔

{تاریخ فرشتہ حصہ دوم صفحہ ۳۱۲-۳۱۸}

بہر حال برہان شاہ اپنی سلطنت میں ایرانی و ہندوستانی اہل تشیع کی مدد و تعاون سے مذہب شیعہ کو رائج و نافذ کرنے کے بعد ۹۶۱ھ میں رحلت کر گیا۔ اسے "باغ روضہ" میں اس کے باپ کی قبر کے قریب ہی دفن کیا گیا کچھ عرصہ بعد احمد نظام اور برہان شاہ کے تابوت کربلا معلی روانہ کر دیئے گئے اور ان کو امام حسینؑ کے مزار مبارک کے باہر ایک گز کے فاصلے پر سپرد خاک کر دیا گیا۔ برہان شاہ کی وفات کے بعد حسین شاہ تخت نشین ہوا اور گیارہ سال حکومت

کرنے کے بعد ۹۷۶ھ میں رحلت کر گیا۔ حسین شاہ کے بعد اس کا بیٹا مرتضیٰ نظام شاہ المشہور بہ "دیوانہ" مسند نشین ہوا۔ اس کے تخت نشین ہوتے ہی سلطنت کی وسعت میں بڑا اضافہ ہوا اس حکمران نے مذہب شیعہ کی ترویج اور اشاعت میں اپنے آباؤ اجداد سے بھی بڑھ کر حصہ لیا اور شیعہ علماء و فضلاء کے وظائف میں بہت اضافہ کیا۔ اس نے حکومتی سکوں کو شیعہ سکوں میں ڈھالنے کے لئے جگہ جگہ ٹکسال قائم کر کے سونے چاندی کے ایسے سکے تیار کرائے جن میں حضرات ائمہ اہل بیت کے اسمائے گرامی اور نظام شاہ کا نام کندہ ہوتا۔ مرتضیٰ نظام شاہ ۱۸ رجب ۹۹۶ھ میں اپنے انجام کو پہنچا۔ شیعہ علماء نے اپنے مذہب کے مطابق اس کی تجہیز و تکفین کی اور امانتاً اسے "روضہ باغ" میں دفن کر دیا۔ پھر نظام شاہ ثانی نے اس کی لاش اپنے بزرگوں کے پہلو میں دفن کرنے کے لئے کربلائے معلیٰ روانہ کر دی۔

مرتضیٰ نظام شاہ کے بعد اس کا بیٹا میراں حسین تخت نشین ہوا۔ اپنے امیر مرزا خان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے۔ اپنے باپ کو قتل کر کے برسر اقتدار آیا تھا تو انجام کار خود بھی اسی مرزا خان کی سازش سے قتل ہو گیا۔ بعد میں ایک امیر جمال خان نے میراں حسین کے قتل کا بدلہ لیتے ہوئے مرزا خان کو پہلے گرفتار کیا پھر اسے گدھے پر سوار کر کے چاروں طرف گھمایا اور بعد میں اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

میراں شاہ کی مدت حکومت دو ماہ تین دن ہے۔ میراں حسین کے بعد نظام شاہی خاندان میں ابراہیم اور اسماعیل کے علاوہ تخت و تاج کا کوئی وارث موجود نہ تھا ان کا باپ برہان شاہ بن حسین نظام شاہ اکبر بادشاہ کے پاس مقیم تھا لہٰذا اسماعیل نظام شاہ کو بادشاہ مقرر کر دیا گیا لیکن اصل قوت و طاقت جمال خان کے پاس تھی جو سید محمد جونپوری کی تحریک مہدویت (جس کا ذکر آگے آرہا ہے) کے ساتھ تعلق رکھتا تھا۔ اس نے نئے بادشاہ کی کم سنی اور نو عمری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے بھی اپنا ہم عقیدہ بنا لیا اور بارہ اماموں کے نام خطبے سے نکال دیئے۔ جب اکبر بادشاہ نے اسماعیل نظام شاہ کی تخت نشینی کی خبر سنی تو اس نے برہان شاہ سے کہا "احمد نگر کے حقیقی وارث تم ہی ہو اس لئے میں یہ ملک تمہیں عطا کرتا ہوں اس ملک کو فتح کرنے کے لئے جتنا لشکر بھی درکار ہو اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو جاؤ اور اپنے بیٹے کو معزول کر کے حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے لو' چنانچہ برہان نظام شاہ نے دکن میں آکر اپنے بیٹے کو معزول و مغلوب کر کے

اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسماعیل شاہ نے دو سال تک حکمرانی کی۔

برہان شاہ نے تخت نشین ہو کر "مہدوی مذہب" کو نیست و نابود کر دیا اور حکم دیا کہ اس مذہب کے پیرو جہاں کہیں بھی نظر آئیں تو انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے اس اقدام کا یہ نتیجہ نکلا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ مذہب احمد نگر میں بالکل ختم ہو گیا اور برہان شاہ نے حسب سابق شیعہ مذہب کو رواج دیا۔ ائمہ کے اسمائے گرامی خطبے میں شامل کیے وہ شیعہ امراء جو ملک سے فرار ہو گئے تھے دوبارہ احمد نگر آئے اور یہ شہر ایک دفعہ پھر شیعہ علماء کا مرکز بن گیا۔

برہان نظام شاہ ثانی نے ۱۰۰۱ھ میں سونے کا سکہ جاری کر دیا اور اس پر ائمہ اہل بیت کے نام کندہ کرائے۔ بالآخر برہان نظام شاہ ۱۸ شعبان ۱۰۰۳ھ میں فوت ہو گیا۔

برہان نظام شاہ ثانی کے بعد اس کا بڑا لڑکا ابراہیم نظام شاہ تخت نشین ہوا اور چار ماہ کے بعد مخالفین کے ساتھ معرکہ آرائی کے دوران قتل ہو گیا۔

ابراہیم نظام شاہ کے بعد اس کے امراء نے اس کے شیر خوار بچے کو ایک قلعہ میں نظر بند کر کے نظام شاہی خاندان کے ایک بارہ سالہ لڑکے احمد شاہ کو عید الاضحیٰ کے دن ۱۰۰۳ھ میں تخت پر بٹھا دیا۔ اس کے دور میں شیعی رسوم و طور طریقے جاری رہے پھر یہ معلوم ہوا کہ احمد شاہ کا تعلق نظام شاہی خاندان سے نہیں ہے تو اس کے امراء نے آٹھ ماہ کے بعد اسے معزول کر کے بہادر شاہ کو چاند بی بی کی زیر نگرانی تخت پر بٹھا دیا۔ اس طرح اصل اقتدار چاند بی بی کے پاس رہا۔ بعض مورخین نے اسے مستقل ملکہ بھی تسلیم کیا ہے۔

چاند بی بی برہان نظام شاہ کی بیٹی تھی اس کی شادی عادل شاہی سلطنت کے شیعہ حکمران علی عادل شاہ کے ساتھ ہوئی تھی جب کہ علی عادل کی بہن ہدیہ کی شادی چاند بی بی کے بھائی مرتضیٰ نظام شاہ اور ابراہیم عادل ثانی کی بہن خدیجہ کی شادی مرتضیٰ شاہ کے بیٹے میراں شاہ کے ساتھ ہوئی۔ یعنی عادل شاہی اور نظام شاہی دونوں شیعہ خاندانوں میں سلسلہ مناکحت جاری رہا۔

مغلوں کے ساتھ معرکہ آرائی میں "چاند بی بی" نے بڑی جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کیا اور وہ چاند بی بی سے "چاند سلطان" کے لقب سے یاد کی جانے لگی۔ بالآخر قلعہ احمد نگر کے محاصرے کے دوران جب چاند بی بی نے تجویز دی کہ قلعہ شہزادہ دانیال کے سپرد کر کے اپنی عزت اور جان بچانی چاہیے تو اس کے امیر جیتہ خان نے تمام اہل قلعہ کو جمع کر کے کہا کہ چاند بی بی

نے اکبری امراء سے ساز باز کر کے قلعہ شہزادہ دانیال کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے اہل دکن یہ سنتے ہی مشتعل ہو گئے اور حرم سرا میں داخل ہو کر بڑی بے رحمی سے چاند بی بی کو قتل کر دیا اس طرح چاند بی بی اپنے ہی شیعوں کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچی۔

اس کے بعد نظام شاہی امیروں نے مرتضیٰ نظام شاہ بن علی برہان شاہ اول کو تخت نشین کر دیا لیکن ۱۰۱۶ھ میں مغل بادشاہ "شاہ جہاں" نے نظام شاہی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ برصغیر میں بہمنی، عادل شاہی، قطب شاہی اور نظام شاہی اقتدار کے دوران ایران کی صفوی حکومت کے تعاون سے مذہب شیعہ کو بہت فروغ اور عروج حاصل ہوا ان ریاستوں کے علاوہ شیعہ علماء و حکمران دوسرے علاقوں میں بھی شیعیت کی نشر و اشاعت میں کوشاں رہے جس کے نتیجے میں عماد شاہی سلطنت جو نئی ریاست سمجھی جاتی تھی وہاں بھی شیعیت کو استحکام حاصل ہو گیا۔ اس سلطنت کے بانی علاؤ الدین عماد الملک شاہ کے بعد جب اس کا بیٹا دریا عماد الملک تخت نشین ہوا تو اس نے نظام شاہی خاندان کے ساتھ اچھے تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی اور اپنی بیٹی "دولت شاہ" کی شادی حسین نظام شاہ کے ساتھ کر کے نظام شاہیوں سے دوستی اور خلوص کا رشتہ قائم کیا۔

اسی طرح برید شاہی سلطنت میں بھی اہل تشیع کا عمل دخل جاری رہا اور علی برید کے جشن تاج پوشی میں شرکت کے لئے شاہ طاہر نے احمد نگر سے احمد آباد کا سفر کیا۔

بالآخر یہ تمام خود مختار ریاستیں باہمی اختلافات اور اندرونی خلفشار کی وجہ سے کمزور ہو گئیں اور مغلوں نے انہیں ایک ایک کر کے ختم کر دیا۔

سید محمد جونپوری کی تحریک

اس عہد کی سب سے زلزلہ انگیز تحریک "مہدوی تحریک" تھی جس کے بانی سید محمد جونپوری ہیں جو ۸۴۷ھ میں جونپور میں پیدا ہوئے۔ یہ ظاہری اور باطنی علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے انہوں نے ۹۶۰ھ میں علانیہ اپنے مہدی ہونے کا اعلان کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کثیر تعداد میں لوگ ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے جن میں بڑے بڑے سردار، سپہ سالار اور فرمانروا بھی پائے جاتے ہیں۔ اس تحریک کی دعوت جونپور سے لے کر راجپوتانہ، سندھ، گجرات اور دکن تک پھیل گئی۔

سید محمد جونپوری دسویں صدی کی ابتداء ۹۱۰ھ میں افغانستان پہنچے اور قندھار ہوتے ہوئے مقام فراہ پہنچے اور یہیں فوت ہوئے۔ ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں میں شیخ خضر ناگوری، سید محمود اور شیخ عبداللہ نیازی نے اس سلسلہ کو جاری رکھا اور آخر میں شیخ علاء بن حسن علیانوی (م ۹۵۷ھ) نے اس خدمت کو سب سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ انجام دے کر اس کام میں اپنی زندگی کو تمام کر دیا۔

شیخ علائی نے سلطان سلیم شاہ ابن شیر شاہ سوری کے دربار میں دعوت و تذکیر کا فرض انجام دیا اور آداب شاہی کو ملحوظ رکھنے کے بجائے سلام مسنون پر اکتفا کیا اور دوسری مرتبہ بیماری کی حالت میں کوڑے کھائے۔ اسی تشدد کے باعث وہ رحلت کر گئے اور ان کے جسم کو ہاتھی کے پاؤں سے باندھ کر لشکر میں پھرایا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے شیخ علائی کی دل دوز داستان مفصل اور مؤثر طریقہ پر بیان کی ہے۔ (ملاحظہ تذکرہ صفحہ ۵۳-۹۱)

سید محمد جونپوری کے دعویٰ مہدویت کے متعلق صحیح کیفیت کا معلوم ہونا بے حد دشوار ہے کیونکہ بہت سے غالی صوفیوں اور شدید ریاضت کرنے والے عابدوں نے ان سے بہت سے ایسے دعوے اور اقوال نقل کیے ہیں جن کی تاویل اور توجیہ ممکن نہیں ہے۔ ان اقوال کی روشنی میں مہدوی تحریک اہل سنت سے بالمقابل اور مخالف تحریک سمجھی جاتی ہے۔ بعد میں آنے والوں اور غالی معتقدین نے ان میں مزید اضافہ کیا اور ان کی تقدیس و تعظیم میں اتنے غلو سے کام لیا کہ ان کو انبیاء کا ہمسر اور بعض سے افضل اور برتر بنا دیا حتیٰ کہ بعض انتہا پسندوں نے انہیں خود نبی اکرم ﷺ سے بھی ہمسری و مساوات کے عقیدہ تک پہنچا دیا۔ ان کے غلو کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک "اگر کتاب و سنت جونپوری کے کسی قول و فعل کے مخالف ہوں تو کتاب و سنت کا اعتبار نہیں" اس طرح یہ بھی کہا گیا کہ "جو مسلمان خود الٰہی کا مشاہدہ اپنی آنکھ یا دل سے سوتے یا جاگتے کبھی نہ کرے وہ مومن نہیں ہے"

دسویں صدی ہجری کے وسط تک اس جماعت کے اثرات ہندوستان اور افغانستان پر قائم رہے اور دکن میں اس کے پیروؤں کی کئی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ دسویں صدی کے آخر میں مہدویوں کی طاقت اور تعداد میں اضافہ کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اسماعیل نظام شاہ بن برہان نظام شاہ ثانی کے دور اقتدار (۹۹۶ھ-۹۹۸ھ) میں جمال خان مہدوی نے احمد نگر میں

مہمات شاہی کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اور اسماعیل نظام شاہ کو بھی اپنے مذہب میں لے آیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوستان کے اطراف و جوانب سے جمال خان کے ارد گرد دس ہزار کے قریب مہدوی جمع ہو گئے اور اس نے احمد نگر کی سلطنت پر پورا تسلط حاصل کر لیا۔ جسے برہان نظام شاہ نے ۹۹۸ھ میں واپس آ کر ختم کیا اور مہدوی مذہب کے بجائے اثنا عشری مذہب رائج کیا۔ دسویں صدی ہجری کے آخر میں تحریک مہدویت کے داعیوں اور غالی معتقدین کے تشدد سے اسلامی عقائد میں ایک تزلزل اور مسلم معاشرہ میں ایک انتشار اور اضطراب پیدا ہو رہا تھا جس کی وجہ سے اس عہد کے علماء حق سخت پریشان اور فکرمند تھے اور انہوں نے تحریک مہدویت کو ایک بڑی ضلالت اور گمراہی قرار دیا۔ چنانچہ اس عہد کے سب سے بڑے عالم حدیث و سنت علامہ محمد طاہر پٹنی (۹۱۳ھ-۹۸۶ھ) مصنف "مجمع بحار الانوار" نے اس کی تردید اور انسداد کا بیڑا اٹھایا اور یہ عہد کیا کہ جب تک اس بدعت کا (جس کے اثر میں پورا گجرات آ گیا تھا) خاتمہ نہیں ہو جاتا وہ اس وقت تک پگڑی نہیں باندھیں گے۔ اکبر نے ۹۸۰ھ میں جب گجرات فتح کیا اور علامہ موصوف کی اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے اپنے ہاتھ سے دستار باندھی اور کہا کہ اس فرقہ کا استیصال میرے ذمہ ہے۔

مرزا عزیز الدین (جو اکبر کا رضاعی بھائی تھا) حاکم گجرات کے دور میں مہدویوں کا زور کم ہو گیا لیکن اس کے بعد عبدالرحیم خان خاناں (ایک شیعہ) کی عمل داری میں انہیں پھر طاقت حاصل ہو گئی اور وہ دوبارہ میدان میں آ گئے۔ علامہ محمد طاہر نے پھر پگڑی اتار دی اور دارالحکومت کی طرف چل دیئے۔ مہدویوں کی ایک جماعت نے ان کا تعاقب کر کے راستے ہی میں انہیں شہید کر دیا۔ (نزہۃ الخواطر جلد نمبر ۴۔ بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت صفحہ ۷ جلد ۴)

بلوچستان اور خاص طور پر ضلع مکران میں جو ذکری فرقہ پایا جاتا ہے وہ بھی فرقہ مہدویہ ہی کی ایک شاخ ہے۔ مختلف علاقوں میں اس کے مختلف نام ہیں کہیں یہ لوگ "مہدوی" کہلاتے ہیں کہیں "دائرہ والے"، کہیں "مصدق" کہیں "ذکری"، کہیں "داعی" اور کہیں "طائی" کے نام سے موسوم ہیں۔ (مہدوی تحریک صفحہ ۵)

ذکری سید محمد جونپوری کو مہدی آخر الزماں اور رسول تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن مجید کی وہی تفسیر معتبر ہے جو سید محمد جونپوری سے بواسطہ سید محمد اٹکی منقول ہو عبادات

اسلامیہ نماز، روزہ، حج بیت اللہ سب منسوخ ہو چکے تھے ذکر تمام عبادات کا قائم مقام ہے اور کوہ مراد حج کا قائم مقام ہے۔ تحریک مہدویت جس کا آغاز کتنے ہی صحیح جذبے کے ساتھ کیوں نہ ہوا ہو) کے ڈانڈے بھی شیعیت ہی کے ساتھ ملتے ہیں۔ مذہب شیعہ میں ائمہ کا درجہ و مرتبہ دیگر انبیاء سے اعلیٰ و افضل اور نبی اکرم ﷺ کے برابر ہے اسی طرح عقیدہ ظہور مہدی پر بھی ان کا ایمان ہے اور یہی عقائد و نظریات تحریک مہدویت میں بھی ملتے ہیں بہر حال تحریک مہدویت آگے چل کر شیعیت کی ایک انتہائی بگڑی ہوئی شکل اختیار کر گئی۔

شیعیت شاہان مغل کے عہد میں

گذشتہ تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ شیعیت برصغیر میں بہت پہلے داخل ہو چکی تھی جس نے مسلسل ترقی کرتے ہوئے آہستہ آہستہ ایران کے صفوی حکمرانوں کی مدد سے اپنی الگ آزاد اور خود مختار سلطنتیں قائم کر لیں۔ پھر اسی دور میں ہندوستان میں مغلیہ حکومت بھی قائم ہو گئی ایران کی شیعہ صفوی حکومت نے مرکزی (مغلیہ) اور علاقائی ریاستوں (بہمنی، عادل شاہی، قطب شاہی، نظام شاہی) کی خوب سرپرستی کی اور ہندوستان پر اپنے گہرے مذہبی اور ثقافتی اثرات چھوڑے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ "جس طرح ہندوستان پانچویں صدی ہجری سے سیاسی اور فوجی حیثیت سے ترکستان و افغانستان کے زیر اثر رہا ہے اسی طرح وہ علمی، ادبی، ثقافتی، تہذیبی اور فکری حیثیت سے کم و بیش ایران کے زیر اثر رہا ہے وہاں کا ادب و شاعری، تصوف کے سلاسل و طرق اور آخر میں وہاں کا نصاب درس اور طریقہ تعلیم اور وہاں کے علماء اور اساتذہ فن کی تصنیفات ہندوستان کے ذہن و دماغ پر سایہ فگن رہی ہیں بالخصوص ہمایون کے ایران جانے اور وہاں کی مدد سے سلطنت ہندوستان کے دوبارہ حصول کے بعد سے پھر دور اکبری میں امیر فتح اللہ شیرازی اور حکیم علی گیلانی کی آمد کے بعد ہندوستان اپنے نصاب، طریقہ تعلیم، معیار فضیلت کے تعین اور معقولات و علوم حکمت کے میدان میں ایران کا کلیتہً خوشہ چین بلکہ باج گذار اور حاشیہ بردار بن گیا اور اس سلسلہ میں حقیقتاً ایران کا ہندوستان پر "اقتدار اعلیٰ" قائم ہو گیا۔ (تاریخ دعوت و عزیمت صفحہ ۱۹ جلد ۵)

شیعیت بابر کے عہد میں

اکثر مورخین نے ہندوستان میں شیعیت کا آغاز ہمایوں کے عہد سے کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شیعیت کے فروغ میں بہمنی، عادل شاہی، قطب شاہی اور نظام شاہی سلطنتوں کے علاوہ بابر کا حصہ بھی شامل ہے کیونکہ وہ بھی "تیموری شہزادہ" ہونے کی وجہ سے شیعیت کے جراثیم سے پاک نہیں تھا۔

بابر عمر شیخ مرزا (جو فرغانہ کا فرمانروا تھا) کے ہاں ۶ محرم ۸۸۸ھ/ ۱۴ فروری ۱۴۸۳ء کو پیدا ہوا۔ وہ والد کی طرف سے تیموری اور والدہ کی جانب سے چنگیز خان کی نسل سے تھا۔ بابر کا سلسلہ نسب امیر تیمور صاحبقران گورگانی تک اس طرح پہنچتا ہے "بابر مرزا ابن عمر شیخ مرزا ابن ابو سعید مرزا ابن سلطان محمد مرزا ابن میران شاہ مرزا ابن امیر تیمور صاحبقران زمان" بابر اپنے والد کی وفات کے بعد بعمر بارہ سال تخت نشین ہوا۔ اراکین سلطنت کے مشورہ سے اپنے آپ کو "ظہیر الدین" کے لقب سے شہرت دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں تمام افغانستان پر قابض ہو گیا۔

ہندوستان پر مغل تاتاریوں نے بہت حملے کیے لیکن وہ افغانستان کے بادشاہوں سے شکست کھاتے رہے۔ ۱۳۹۸ء میں انہوں نے امیر تیمور کی قیادت میں ہندوستان کا رخ کیا اور دہلی کو خوب لوٹا۔ مغلوں کا سب سے زیادہ اہم اور آخری حملہ بابر کی سرکردگی میں کیا گیا جس نے ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دے کر ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی لکھتے ہیں کہ

"بابر تو ایران میں پیدا ہوا تھا مزاجاً بھی اس کا ایرانی تھا وہ اس برعظیم میں آیا تو اس کے ساتھ ایرانی جمعیت کے علاوہ تین شاعر عبدالواحد فارغی، نادر سمرقندی اور طاہر خواندی بھی تھے۔ اس نے مغلیہ سلطنت قائم کی تو دونوں ملکوں کے تعلقات اور بھی بڑھے۔ ایران کے صفوی دور کے حکمرانوں نے بھی اپنی ہمسایہ اسلامی سلطنت کے ساتھ تعلقات برقرار رکھے۔ یہاں تک کہ جب شہنشاہ ہمایوں کو شیر شاہ سوری کی مہم میں وطن چھوڑنا پڑا تو صفوی تاجدار طہماسپ اول نے ۹۵۱ھ/ ۱۵۴۴ء میں اس کا شاہانہ استقبال کیا اور ہمایوں کو دوبارہ تخت و تاج حاصل کرنے میں فوجی امداد بھی دی ... ہمایوں کے وطن واپس آنے پر ایران کے متعدد علماء اور شعراء

پاکستان وہند آئے۔ایسے علماء کی آمد کے لئے اکبر اعظم، جہانگیر اور شاہجہاں کا دربار خاص طور سے نمایاں ہے یہ سلسلہ اورنگ زیب عالمگیر بلکہ بعد تک بھی قائم رہا۔مغلیہ دور میں فارسی زبان کو جو عروج حاصل ہوا اس میں ایرانی علماء کو بھی بہت بڑا دخل ہے" (تاریخ ایران جلد دوم صفحہ ۵۹۷)

بہر حال بابر کے جد امجد امیر تیمور خان نے ہندوستان پر یلغار کی جو بنیاد رکھی تھی۔بابر نے اس پر اپنی سلطنت کی عمارت تعمیر کر دی۔

دوسری طرف تیموری شاخ کے آخری بادشاہ سلطان حسین کو شیبانی خان (جو ایک راسخ الاعتقادی تھا) نے شکست دے کر اپنی حکومت قائم کر لی۔شیبانی خان بابر اور اسماعیل صفوی کا ہم عصر تھا۔اس کی حکومت اتنی وسیع ہو گئی کہ اس کی سلطنت اور اسماعیل صفوی شاہ ایران کی حکومت کے ڈانڈے آپس میں مل گئے۔چونکہ شیبانی خان نے ترکستان میں تیموریوں کو شکست دی تھی اس لئے تیموری شہزادہ بابر اپنے خاندان کا اقتدار بحال کرنے میں مصروف ہو گیا اور اس کی شیبانی خان کے ساتھ جھڑپیں شروع ہو گئیں۔۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء تک شیبانی خان ماوراء النہر فرغانہ اور حصار پر قابض ہو گیا اور ۱۵۰۷ء میں اس نے سلطان حسین بایقراء تیموری کے بیٹوں کو شکست دے کر ہرات کا شہر بھی سر کر لیا اور خراسان کا مالک بن گیا۔

شیبانی خان کی ان فتوحات نے اسماعیل صفوی کو بے چین اور پریشان کر رکھا تھا اس لئے اس نے بابر کے ساتھ ساز باز کر کے شیبانی خان پر ۱۵۱۰ء میں چڑھائی کر دی جس کے نتیجے میں شیبانی خان قتل ہو گیا۔

بابر (جو اس وقت کابل میں اپنا اقتدار مستحکم کر چکا تھا) کے دل میں شیبانی خان کی شکست کے بعد اپنے آبائی وطن کو حاصل کرنے کی خواہش ایک دفعہ پھر پیدا ہوئی لہٰذا اس نے لشکر لے کر اسماعیل صفوی کے ایماء پر ماوراء النہر میں یلغار کر دی اور ازبکوں کو شکست دے کر فاتحانہ حیثیت سے سمرقند میں داخل ہو گیا۔اس کامیابی اور فتح کے صلے میں ایران کے شیعہ بادشاہ اسماعیل صفوی نے اسے داد تحسین اور خلعت سے نوازا۔ترکستان کے لوگ جو راسخ العقیدہ سنی المذہب تھے یہ حال دیکھ کر بابر کی طرف سے برگشتہ ہو گئے انہیں بابر کا شیعوں سے مدد لینا اور ایران کے شیعہ بادشاہ کے زیر حمایت بن جانا بہت ناگوار گزرا۔

ازبکوں کے امراء امیر عبیداللہ کی سرکردگی میں دوبارہ اکٹھے ہو کر ۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء میں

بخارا پر حملہ آور ہوئے اور صرف تین ہزار ازبکوں نے بابر کے چالیس ہزار کے لشکر جرار کو شکست سے دو چار کر دیا۔ بابر سمرقند اور حصار کی طرف پسپا ہوا اور اس نے دوبارہ اپنا اقتدار بحال کرنے کے لئے اسماعیل صفوی سے مدد طلب کی۔ چنانچہ ساٹھ ہزار ایرانی سپاہی میر نجم ثانی کی قیادت میں بابر کی مدد کے لئے آئے۔ بابر اور میر نجم نے مل کر دوشنی تک سنیوں کے ملک ماوراء النہر کو تاراج کیا اور کارشی میں قتل عام کے بعد خوب لوٹ مار کی۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ بابر نے شیعوں کے ساتھ مل کر اہلسنت کو سیاسی، جانی اور مالی نقصان سے دوچار کیا۔ بابر کا اہل تشیع کے ساتھ اتحاد وقتی نہیں تھا بلکہ آگے اس کی نسل میں بھی صدیوں تک جاری رہا۔

مؤرخ فرشتہ بابر کے کردار کے دوسرے پہلو "عیش کوشی و حسن پرستی" پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"بابر کی ساری زندگی اگرچہ میدان جنگ میں گذری اور اس کا بیشتر حصہ معرکہ آرائیوں ہی میں بسر ہوا لیکن وہ عیش و عشرت سے مجتنب نہ رہا۔ اس کی محفل میں پری چہرہ حسینوں کا ہجوم رہتا تھا بابر نے کابل میں ایک جنت مثال مرغزار میں پتھر کا ایک حوض بنوایا تھا اسے شراب ناب سے پر کروادیا۔ وہ اس حوض کے کنارے اپنے خوش مزاج اور ذوی عقل دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر عیش و عشرت کی محفلیں منعقد کرتا تھا۔ اس نے اپنا ایک شعر اس حوض پر کندہ کروایا تھا جو یہ ہے"۔

نوروز و نو بہار و مے دلبری خوش است ۔ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

(تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۱۰)

شیعیت ہمایوں کے عہد میں

بابر کے بعد اس کا بیٹا نصیرالدین ہمایوں بعمر تیس برس ۱۵۳۰ء میں تخت نشین ہوا۔ لیکن ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ سوری سے شکست کھانے کے بعد ایران بھاگ گیا جہاں شاہ ایران طہماسپ صفوی نے اس کا شاہانہ اور والہانہ استقبال کیا۔ ہمایوں اپنے قیام ایران کے دوران صفوی امراء کے مشوروں سے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کی بحالی کے منصوبے بناتا رہا۔ ہمایوں میں اپنے باپ کی طرح موروثی شیعیت کے جراثیم تو پہلے ہی سے موجود تھے لیکن یہاں شیعیت کے عالمی مرکز

(ایران) میں رہنے سے وہ تقریباً مکمل طور پر شیعی سانچے میں ڈھل گیا۔ اسے یہاں تک پہنچانے میں شاہ طہماسپ کی بہن سلطانہ بیگم، قاضی جہاں قزوینی، ناظر دیوان اور حکیم نور الدین جیسے امراء نے اہم کردار ادا کیا ہمایوں کی حسب ذیل رباعی جب شاہ طہماسپ صفوی کو سنائی گئی۔

ہستیم ز جان بندۂ اولاد علی ہستیم ہمیشہ شاد با یاد علی

چوں سر ولایت ز علی ظاہر شد کردیم ہمیشہ ورد خود ناد علی

تو شاہ ایران یہ رباعی سن کر بہت خوش ہوا اور کہنے لگا کہ اگر ہمایوں مذہب شیعہ قبول کر کے اس بات کا وعدہ کرے کہ اپنے ملک کے تمام منبروں پر دوازدہ اماموں کے نام کا خطبہ جاری کرنے کے علاوہ وہ قندھار کا علاقہ بھی ایران کو واپس کر دے گا تو میں اس کی مدد کر کے کھویا ہوا ملک واپس دلا دوں گا۔ سلطانہ بیگم نے ہمایوں کو ان شرائط سے آگاہ کیا تو ہمایوں نے جواب دیا کہ "بچپن سے لے کر آج تک خاندان رسالت کی محبت میرے دل میں رہی ہے چغتائی امیروں اور کامران مرزا کی ناراضگی کا بھی یہی سبب ہے"۔

اس کے بعد شاہ طہماسپ نے بیرم خان کو تنہائی میں بلایا اور ہر پہلو پر گفتگو کی اور تمام انتظامات مکمل کر کے ہمایوں کو روانہ کیا ایران چھوڑنے سے پہلے ہمایوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میرا دل شیعہ مراکز تبریز اور اردبیل کی زیارت کے لئے بے چین ہے تا کہ شیخ صفی (صفوی خاندان کے سربراہ) اور ان کی اولاد کی ارواح سے دشمن کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے مدد مانگوں۔ شاہ ایران نے اس خواہش کے احترام میں ان علاقوں کے حاکموں کے نام اطاعت گزاری کی ہدایات جاری کیں کہ وہ ہمایوں کی تعظیم و تکریم میں کوئی کمی نہ کریں۔

چنانچہ ہمایوں ان شہروں اور مشائخ کے مزارات کی زیارت کر کے شہزادہ مراد اور قزلباش امیروں کی قیادت میں دس ہزار افراد پر مشتمل ایک لشکر کے ہمراہ مشہد مقدس کے راستے سے قندھار روانہ ہو گیا۔ اس طرح اس نے ۱۵۴۵ء میں ایرانی فوج کی مدد سے کابل اور قندھار پر قبضہ کر لیا پھر اس نے کابل میں بیٹھ کر اپنی تمام تر توجہ ہندوستان کو دوبارہ فتح کرنے پر مرکوز کر دی لیکن شیر شاہ سوری (م ۹۵۲ھ/۱۵۴۵ء) کے بعد اس کا لڑکا جلال خان ملقب بہ اسلام شاہ (جو بعد میں عام و خاص کی زبان میں سلیم شاہ مشہور ہو گیا) تخت نشین ہو گیا تھا اس کی مستعدی کی وجہ سے ہمایوں کو سوری سلطنت پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اسلام شاہ کی وفات کے بعد افغانستان

میں باہمی انتشار و خلفشار کے باعث جب یہ سلطنت کمزور ہو گئی تو ہمایوں نے موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے ایرانی فوج کی مدد سے دہلی کی طرف پیش قدمی کی اور پندرہ سال کی جلاوطنی کے بعد ۲۰ جولائی ۱۵۵۵ء کو دوبارہ نہایت شان و شوکت سے دہلی میں داخل ہوا۔ اس طرح اس نے کھویا ہوا تخت اور چھنی ہوئی سلطنت کے کچھ حصہ پر قبضہ کر لیا اس کے کچھ ہی عرصہ (سات ماہ) بعد ۱۵ ربیع الاول ۹۶۳ھ/ ۲۶ جنوری ۱۵۵۶ء کو رحلت کر گیا۔

ہمایوں کو چونکہ ایران کی شیعہ صفوی حکومت کی مدد سے یہ کامیابی حاصل ہوئی تھی اس لئے اس کے دور میں شیعیت نے بہت فروغ حاصل کیا ہمایوں اور اس کے بعد تمام مغل بادشاہوں نے ایران سے آنے والے علماء و امراء کو بڑی قدر و منزلت کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیا اور بڑے بڑے عہدوں پر حتیٰ کہ صوبہ داریوں اور گورنریوں پر بھی ان کا تقرر کیا۔ مولانا عبدالحکیم شرف قادری بریلوی کی کتاب "تذکرہ اکابر اہلسنت" میں بہ عنوان "تقریب" حکیم محمد موسیٰ امر تسری لکھتے ہیں کہ:

"ہمایوں نے شیعہ علماء و فضلاء کی بڑی قدر و منزلت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں اہل اسلام کے مقابل ایک اور مستقل علیحدہ دین کی بنیاد پڑ گئی غرض یہ کہ متحدہ ہندوستان میں ابن عبدالوحاب نجدی کی تعلیمات پہنچنے تک یہاں صرف سنی اور شیعہ دو مذہب ہی نظر آتے ہیں جو فی الحقیقت دو مذہب نہیں دو دین ہیں"۔ (تذکرہ اکابر اہلسنت صفحہ ۳)

ہمایوں کی فوج میں "گدا علی، مسکین علی، بندہ علی، زلف علی، پنجہ علی اور کشف علی" وغیرہ کی اکثریت تھی۔ شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں کہ:

جب ہمایوں سفر ایران کے بعد ہندوستان واپس آیا تو اس کے ساتھ بے شمار ایرانی سپاہی، امراء اور علماء تھے اور اس وقت سے ایران اور ہندوستان کے زیادہ قریبی تعلقات کا آغاز ہوا جن کی وجہ سے ہندوستان کی اسلامی تہذیب میں ایرانی اثرات، تورانی اور عرب اثرات سے بھی زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں۔ ایران کے بڑے بڑے شاعر مثلاً عرفی، نظیری، علی مردان، آصف خان وغیرہ ہمایوں کے جانشینوں کے عہد میں ہندوستان آئے۔ مغلیہ حکومت کے استحکام اور قرار میں بھی ایرانی ذہانت اور تدبر کو بڑا دخل تھا۔

مؤرخ لکھتے ہیں کہ ہمایوں ایران جا کر شیعہ ہو گیا تھا اور اسے شیعہ ایران سے مدد ملی۔

وعدہ پر لی تھی کہ وہ اپنی مملکت میں شیعہ عقائد کی ترویج کرے گا۔ یہ تو غالباً غلط ہے (بغیر کسی دلیل کے) لیکن اتنا قرین قیاس ہے کہ ہمایوں نے حضرت علیؓ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہوگا اور ذیل کی رباعی اس سے منسوب کی جاتی ہے (اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) اس کے علاوہ جب وہ ہندوستان واپس آیا تو شیعہ عمال کا زیادہ عمل دخل ہو گیا اور انہیں اپنے مذہبی معاملات میں زیادہ آزادی مل گئی۔ ہمایوں کا وزیر با تدبیر بیرم خان خود شیعہ تھا اور شیخ گدائی جنہیں عہد اکبری میں سب سے پہلے شیخ الاسلام کا عہدہ ملا شیعہ عقائد کے تھے۔" (رود کوثر صفحہ ۳۲-۳۳)

ہمایوں نے شاہ طہماسپ صفوی کو جو رباعی سنائی تھی اس کا آخری مصرعہ یہ ہے کہ "کردیم ہمیشہ ورد خود نادعلی" اس کے تحت سلطنت میں "یا علی مدد" کا نعرہ عام ہو گیا۔ "نادعلی" اہل تشیع کا شعار ہے۔ شیعہ مجتہد غلام حسین نجفی لکھتا ہے کہ:

"ایک جنگ میں لوگ نبی کریم ﷺ کو چھوڑ کر بھاگ گئے پس جبرائیل آئے اور عرض کی اللہ نے آپ کو اختیار دیا ہے تم چاہو تو فرشتے تمہاری مدد کے لئے بھیج دے اور اگر تم چاہو تو علی کو مدد کے لئے بلا لو۔ پس نبی کریم ﷺ نے اپنی مدد کے لئے حضرت علیؓ کو اختیار کیا۔ جبرائیل نے عرض کی کہ آپ اپنا منہ مدینے کی طرف پھیریں اور یوں پکاریں "اے ابا الغیث" میری مدد کو پہنچو۔ یا علی میری مدد کو پہنچو۔ سلمان فارسی کہتے ہیں کہ میں مدینے میں ایک کھجور کے نیچے کھڑا تھا اور حضرت علیؓ کھجور کے درخت پر تھے میں نے سنا کہ ایک مرتبہ کہا لبیک اور کھجور کے درخت سے اتر آئے اور جناب پر غم ظاہر تھا اور آنسو ٹپک رہے تھے میں نے پوچھا اے ابو الحسن کیا ہوا؟ فرمایا اے سلمان لوگ پیغمبر کو چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں اور حضرت مجھ کو بلا رہے ہیں پھر حضرت علیؓ مدد کے لئے چلے گئے۔ یا علی مدد کہنے سے قرآن پاک میں اللہ نے منع نہیں فرمایا اور نہ ہی کسی حدیث سے منع ثابت ہے بلکہ مشکلات میں علیؓ کو پکارنا سنت ہے۔ یہ الفاظ شیعوں کا مذہبی شعار ہیں اور مومن اسے سن کر خوش ہوتا ہے اور مومن کو خوش کرنا بھی عبادت ہے (نجفی نے بحوالہ بحار الانوار از ملا باقر مجلسی "نادعلی" کا یہ ورد نقل کیا ہے)

نَادِ عَلِیًّا مَظْهَرَ الْعَجَائِبِ ‏ ‏ تَجِدْهُ عَوْنًا لَكَ فِی النَّوَائِبِ

كُلُّ هَمٍّ وَغَمٍّ سَیَنْجَلِی ‏ ‏ بِوِلَایَتِكَ یَا عَلِی یَا عَلِی یَا عَلِی

پکار تو علی کو جو عجائبات کا مظہر ہے تو اسے ہر مصیبت میں مددگار پائے گا ہر دکھ اور غم دور ہو جاتا ہے

تیری ولایت کے صدقے میں یا علی یا علی"۔ {کرم سہیم صفحہ ۷۵-۷۴}

شیعہ سکالر عبدالکریم مشتاق لکھتا ہے کہ:

"باقی دشمن جلے یا مرے میں تو یا علی مدد کہہ کر رزق، اولاد، صحت، فتح، حاجت برآری مولا مشکل کشا سے چاہوں گا۔ میں اسے شرک نہیں سمجھتا۔ علی سے مدد مانگنا میرے نزدیک سنت انبیاء ماسبق ہی نہیں سنت خاتم الانبیاء ہے"۔ {ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور صفحہ ۱۰ جلد ۲}

یہی "ناد علی" ہمایوں کا بھی ہمیشہ کا ورد اور وظیفہ رہا ہے شیعہ مصنف و مؤرخ جسٹس امیر علی لکھتے ہیں کہ:

"ہمایوں کے زمانہ تک شیعہ مذہب گولکنڈہ اور بیجاپور کی ریاستوں تک محدود تھا مگر ۱۵۵۵ء میں جب ہمایوں شاہ ایران سے مدد لے کر واپس لوٹا اس کے ساتھ ایران سے جو شیعہ آئے تھے انہوں نے اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا اور مذہب شیعہ شائع ہونا شروع ہوا"۔

{جامع الاحکام فی فقہ الاسلام بحوالہ حقیقت مذہب شیعہ صفحہ ۳۴۴}

ان حقائق کے باوجود مؤرخ فرشتہ لکھتا ہے کہ:

"بادشاہ (ہمایوں) کا مذہب حنفی تھا لیکن کامران اور دوسرے چغتائی امیر ہمایوں کو ہمیشہ شیعہ سمجھتے رہے۔ ان کی بدگمانی کی وجہ یہ تھی کہ شہزادگی کے عالم سے عراقی اور خراسانی شیعہ بادشاہ کے گرد جمع تھے۔ بادشاہ ان کی پوری خاطر داری کرتا تھا۔ دوسرے بادشاہ کا رفیق بھی امامیہ فرقے کا شیدائی تھا۔ ہمایوں نے اپنے عہد حکومت میں بہت سے قزلباشوں اور عراقیوں کو شاہانہ نوازشوں سے مالا مال کیا اور انہیں اراکین سلطنت میں داخل کیا در حقیقت ہمایوں سنی المذہب تھا"۔ {تاریخ فرشتہ صفحہ ۶۷۶ جلد ۱}

مؤرخ فرشتہ نے خاندان صفویہ کا مداح اور نظام شاہی شیعہ سلطنت کا باقاعدہ وظیفہ خوار ہونے کے باوجود یہ تسلیم کیا ہے کہ "کامران اور دوسرے چغتائی امیر ہمایوں کو ہمیشہ شیعہ سمجھتے رہے" اور پھر اس "بدگمانی" کی وجہ بھی بتلا دی ہے حالانکہ موصوف نے اسی کتاب میں چند صفحات پہلے ہمایوں کا شاہ طہماسپ صفوی کے پاس ایران میں طویل قیام، ہمایوں کی وہ مشہور رباعی (جس کا پیچھے ذکر ہو چکا ہے) اور صفوی خاندان کے مراکز تبریز اور اردبیل میں شیخ صفی اور ان کی اولاد کی ارواح سے مدد کی درخواست کا مفصل ذکر کیا ہے۔ {ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ حصہ اول ۶۶۵-۶۶۶}

یہی وجہ ہے کہ ہمایوں کے ساتھ رہنے والے سنی امراء اسے ہمیشہ شیعہ ہی سمجھتے رہے اس کی سنیت ابتداہی سے مختلف فیہ رہی۔ اس کے علاوہ ہمایوں کے لقب "نصیر الدین" سے بھی اس کا مذہب واضح ہوتا ہے کہ اس نے زندگی بھر مذہب شیعہ ہی کی نصرت کی جس طرح شیعہ فلسفی نصیر الدین طوسی کو "نصیر الملۃ و نصیر الدین" کا لقب دیا گیا ہے اسی طرح ان خدمات کے عوض ہمایوں کو بھی "نصیر الدین" کے لقب سے نوازا گیا۔

شیعیت اکبر کے عہد میں

ہمایوں کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر بعمر ۱۳ سال ۲ ربیع الثانی ۹۶۳ھ / ۱۴ فروری ۱۵۵۶ء کو تخت نشین ہوا۔ اس کی کم سنی کی وجہ سے مغلیہ سلطنت کے تمام اختیارات اس کے شیعہ امراء بیرم خان، علی قلی خان، بہادر خان اور عبدالرحیم خان خانخاناں کے پاس تھے۔ بیرم خان ایک غالی شیعہ تھا جو ترکمان سپہ سالاری اور اتالیقی کے عہدے پر پہلے ہی فائز تھا لیکن اب اسے وکیل السلطنت بھی بنا دیا گیا جس کی وجہ سے تمام مالی اور ملکی مہمات اس کے سپرد کردی گئیں گویا اس دور میں عملاً مغلیہ سلطنت شیعہ سلطنت میں تبدیل ہوگئی۔

بیرم خان کی وجہ سے شیعوں کا خوب زور ہوگیا۔ اس نے شیعوں کو خصوصی مراعات سے نوازا، انہیں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا اور شیخ گدائی شیعہ عالم کو شیخ الاسلام اور صدر الصدور کے عہدے پر فائز کیا۔ اکبر کے دور میں شیعہ مجتہد ملا محمد یزدی کا بھی امور سلطنت میں بے پناہ عمل دخل رہا ہے۔ اسی دور میں ایک دوسرا شیعہ مجتہد قاضی نور اللہ شوستری جسے اہل تشیع "شہید ثالث" کے لقب سے یاد کرتے ہیں وارد ہند ہوکر "قاضی القضاۃ" کے منصب پر فائز ہوا۔

آگے چل کر اکبر لامذہبی کی لعنت میں مبتلا ہوکر اسلام اور مسلمانوں کا تمسخر اڑانے لگا جس کے نتیجے میں ۹۸۵ھ میں "دین الٰہی" کے نام سے ایک نیا مذہب جاری کردیا گیا۔ اکبر اس جدید مذہب کا پیشوا قرار پایا اور "کفر شائع شد" اس کی تاریخ ہوئی۔

اس نئے دور میں بھی مذہب شیعہ برابر فروغ پاتا رہا کیونکہ اکبر کا دربار شاہی ہندوؤں، ملحدوں اور شیعوں سے ہی آباد تھا۔ ان لوگوں کے سوا کسی صحیح مسلمان کی دربار شاہی میں مطلق گنجائش نہ تھی۔ یہی لوگ شہروں اور صوبوں کی حکومت اور فوجوں کی سپہ سالاری پر مامور تھے شیعہ مجتہد میر فتح اللہ شیرازی ہندوستان کے صدر الصدور مقرر ہوئے نور اللہ شوستری، حکیم ہمام،

حکیم ابوالفتح وغیرہ ایرانی امراء کا اثر واقتدار عروج کو پہنچا۔ اکبر نے ایرانی تہوار "جشن نوروز" کو نئے دین میں بھی بحال رکھا۔ چنانچہ آئین اکبری میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ پہلا جشن "جشن نوروز" کے نام سے موسوم ہے جب آفتاب سال کا دورہ پورا کر کے برج حمل میں داخل ہوتا ہے اور اپنی برکات سے اہل عالم کو مستفید کرتا ہے تو انیس روز کامل عشرت ونشاط کی ہنگامہ آرائی ہوتی ہے اس زمانہ میں دو روز عید کا تہوار منایا جاتا ہے اور بے شمار نقد اور طرح طرح کی اشیاء بطور صدقہ اور تحفہ اور ہدیہ تقسیم کی جاتی ہیں یکم فروردین اور انیس فروردین جو یوم شرف ہیں عید کے لئے مخصوص ہیں پارسیوں کا دستور ہے کہ وہ اس روز جشن عشرت منعقد کر کے بے حد تفنن نوازی و سامان ضیافت وغیرہ کرتے ہیں" قبلہ عالم نے بھی اس رسم کی تقلید کی اور ہر شمسی ماہ ایک خاص جشن کے لئے مخصوص ہو گیا"۔ (آئین اکبری صفحہ ۳۰ جلد ۱)

ان ایام میں ایرانی بادشاہوں کی پیروی میں جشن منعقد ہوتا ہے اور ہر جشن میں انواع و اقسام کی زیب وزینت وآرائش کی جاتی ہے حاضرین فرط مسرت سے بے اختیار ہو کر نعرہ ہائے نشاط بلند کرتے ہیں ہر پہر کے آغاز پر نقارہ نوازی ہوتی ہے اور ارباب نشاط اپنی نغمہ سرائی اور اپنے ساز سے ہنگامہ عیش برپا کرتے ہیں۔ (بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت حصہ چہارم صفحہ ۱۵۹)

اسلام میں تاریخ ہجری کا آغاز خلیفہ دوم سیدنا عمر فاروقؓ کے دور میں ہوا۔ اکبر کو اس تاریخ ہجری سے بھی نفرت تھی۔

"عرصہ دراز سے قبلہ عالم کا ارادہ تھا کہ ملک ہندوستان میں جدید سال وماہ جاری فرما کر دقتیں رفع کریں اور سہولتیں بہم پہنچائیں۔ جہاں پناہ سن ہجری کو بوجہ اس کے نقائص کے پسند فرماتے لیکن ناعاقبت اندیش وکم فہم افراد کی کثرت کی وجہ سے جو تاریخ وسن کے اجراء کو بھی ایک دینی مسئلہ سمجھتے ہیں۔ حضرت کی خاطر پرور طبیعت نے گوارہ نہ کیا کہ اس گروہ کی دل شکنی فرمائیں اور یہی وجہ تھی کہ قبلہ عالم ابتداء میں اپنے خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکے"۔ (آئین اکبری صفحہ ۱۲۶ جلد ۱)

مؤلف آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "۹۹۲ھ میں شہنشاہی تنویر عقل ودانش نے علم وکمال کی وہ نورانی شمع جلائی جس نے اپنی بابرکت روشنی سے تمام عالم کو تاباں ودرخشاں کر دیا۔ خوش نصیب وحق پسند گروہ نے بالین ناکامی سے سر اٹھایا اور بیہودہ گو وپست رائے افراد نے گوشہ گمنامی میں منہ چھپایا۔ قبلہ عالم کے نیک ارادہ نے عملی جامہ پہنا اور یادگار حکماء میر فتح اللہ شیرازی (شیعہ) نے

اس کام کو انجام دینے پر کمر ہمت باندھی۔ علامہ شیرازی نے جدید زیچ گورگانی کو پیش نظر رکھ کر جہاں پناہ کے سال جلوس کو "سن الٰہی" کی ابتداء قرار دی۔

(آئین اکبری صفحہ ۵۷۶ جلد اول اردو ترجمہ فدا علی طالب حیدر آباد)

الغرض اکبری دور میں بھی شیعہ اور مذہب شیعہ خوب پھلتا اور پھولتا رہا اور یوں شیعیت کے زہریلے اثرات دکن کے محدود علاقوں سے نکل کر ہندوستان کی وسیع و عریض سلطنت کے کونے کونے تک پھیل گئے۔

جہاں تک اکبر کا دکن کی شیعہ ریاستوں پر حملے کا تعلق ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ علاقائی ریاستیں مرکزی حکومت کی بالادستی تسلیم نہیں کرتی تھیں اور ٹیکس ادا کرنے سے انکاری تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب چاند بی بی نے مغل امراء سے معاہدہ کر لیا تو اکبر نے اس کے کم سن بھتیجے بہادر شاہ کو احمد نگر کا حکمران تسلیم کر لیا۔ بعد میں اندرونی خلفشار کی وجہ سے چاند بی بی قتل ہو گئی اور مغل احمد نگر پر قابض ہو گئے۔

شیعیت جہانگیر کے عہد میں

اکبر کی وفات کے بعد (۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) کے بعد اس کا لڑکا سلیم نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ جہانگیر نے بھی امور سلطنت اپنے باپ اکبر کے خطوط پر چلائے اور اعلیٰ عہدوں پر اپنے باپ کے مقرر کیے ہوئے اہل کاروں کو بحال رکھا۔ جہانگیر کی چہیتی بیوی مہر النساء جسے شادی کے وقت "نور محل" اور بعد ازاں "نور جہاں" کا خطاب دیا گیا تمام حکومتی اختیارات کی مالک تھی۔

نور جہاں مرزا غیاث الدین ایرانی (وزیر شاہ طہماسپ صفوی) کی لڑکی تھی۔ نور جہاں نے اپنے رشتہ داروں خصوصاً اپنے والد اور بھائیوں پر عنایات کی بارش کر دی۔ جہانگیر کے ساتھ سکوں پر بھی اس کا نام کندہ کیا جاتا تھا۔ شاہی فرمانوں پر بھی بادشاہ کے نام کے ساتھ نور جہاں کا نام لکھا ہوا ہوتا تھا۔ وہ اکثر اپنے محل کی بالکونی پر بیٹھ کر امراء اور وزراء کے نام احکامات جاری کیا کرتی تھی۔ اسے اس قدر اختیارات حاصل تھے کہ جہانگیر عضو معطل ہو کر رہ گیا تھا۔

نور جہاں کا باپ مرزا غیاث الدین جسے "اعتماد الدولہ" کا خطاب دیا گیا تھا وزیر اعظم مقرر ہوا۔ اس نے اپنے دونوں بھائیوں کو "اعتماد خان" اور "آصف جاہ" کے القاب دے کر اعلیٰ

عہدوں پر مقرر کیا۔ مرزا غیاث الدین کے رشتہ دار بھی بڑی تعداد میں خراساں سے ان کی خوش بختی کا سن کر ہندوستان میں آ گئے تھے نور جہاں نے انہیں بھی اچھے اچھے عہدے عطا کیے۔

مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ برمکیوں کے بعد کسی بھی خاندان نے اس قدر اچانک اور جلد مرزا غیاث الدین کی طرح اقتدار حاصل نہیں کیا ہندوستان میں نور جہاں کے خاندان کی آمد کے علاوہ حسب سابق دیگر ایرانی علماء اور شعراء کا بھی تانتا بندھا رہا۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ:

"ادھر مغل درباروں سے مالی منفعت کی زیادہ توقع تھی اس لئے شعراء کربلا کا رخ کرنے کے بجائے دہلی کا رخ کرتے تھے۔ اکبر اعظم اور جہانگیر اور ان کے امراء بالخصوص بیرم خان اور خانخاناں کی فیاضیوں کی وجہ سے شعراء وعلماء ایران برعظیم پاک وہند میں آنا شروع ہوئے۔ صرف اکبر کے دربار میں آنے والے ایرانی شعراء کی تعداد بقول شبلی نعمانی پچاس ہے"۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۶۸ جلد ۱)

نور جہاں نے تسلط واقتدار کی وجہ سے صفوی حکمرانوں کے ساتھ تعلقات میں مزید اضافہ ہوا جو اسماعیل صفوی اور بابر کے دور سے چلے آ رہے تھے جہانگیر کے عہد میں ایران میں شاہ عباس صفوی حکمران تھا۔ اس نے جہانگیر کی خدمت میں بیش بہا تحائف بھیجے۔ نور جہاں کے توسط سے جہاں دیگر ایرانی علماء و امراء فیض یاب ہوئے وہاں عباس صفوی نے بھی اس بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھوئے۔ اس نے قندھار پر قبضہ کر کے اپنا حصہ وصول کیا۔ قندھار کی ایک مرکزی حیثیت تھی وہ ہندوستان میں داخلے کا واحد دروازہ تھا۔ وسطی ایشیا یا ایران سے آنے والے حملہ آور اسے فوجی اڈے کے طور پر بڑی آسانی سے استعمال کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ برصغیر پاک و ہند، وسط ایشیا، اور ایران اور ترکی کے درمیان بری تجارت کی بہت بڑی منڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شاہ طہماسپ صفوی نے ہمایوں کو دوبارہ اقتدار دلانے کے لئے قندھار کو ایران کے حوالے کرنے کی شرط عائد کی تھی۔ بہر حال ایرانی شیعہ خاتون ملکہ نور جہاں نے شاہی اختیارات کو اپنے خاندان، ملک ایران اور مذہب شیعہ کے مفادات کی خاطر نہایت ہی "فراخ دلی" سے استعمال کیا۔ اس کے رشتہ دار بڑے سرکاری عہدوں پر فائز کئے گئے۔ اس کا باپ مرزا غیاث الدین "اعتماد الدولہ" اور بھائی "آصف جاہ" دربار کی چند مقتدر شخصیتوں میں شمار ہونے

گئے۔ اس کی حد سے زیادہ کنبہ پروری اور خود غرضی نے مغلیہ دربار کو سازش کا اڈا بنا دیا۔ اس نے پندرہ برس تک جہانگیر کو انگلیوں پر نچایا۔

سر طامس رو نے لکھا ہے کہ "وہ (نور جہاں) شاہی حرم میں سب سے زیادہ اختیارات کی حامل عورت تھی اس نے مکاری سے شادی کے ذریعے یا دوسرے طریقوں سے ان تمام خواتین کو حرم سے باہر نکلوا دیا تھا جن کی طرف سے اسے مخالفت کا خطرہ تھا۔ نیز مغل دربار میں پرانے افسروں کی بجائے نئے افسر مقرر کر دیے تھے جن کی اکثریت اس کے اپنے رشتہ داروں اور بہی خواہوں پر مشتمل تھی"۔

این۔ سی۔ رائے کے قول کے مطابق دراصل نور جہاں سلطنت کی حقیقی حکمران تھی اور شہنشاہ اس کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا وہ جھروکے میں بیٹھ کر لوگوں کی شکایات سنا کرتی تھی اور اس ایرانی شہزادی کا جہانگیر پر اس قدر اثر تھا کہ جہانگیر نے سکوں پر بھی اپنے ساتھ اس کا نام کندہ کروایا"۔

نور جہاں اور اس کے بھائی آصف جاہ کی شہ پر قاضی نور اللہ شوستری (جو تقیہ کے لبادے میں دور اکبری سے ہی قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز چلا آ رہا تھا) نے اب تقیہ کی چادر اتار کر کھلم کھلا امامیہ مذہب کے مطابق فتوے دینے اور اپنے مذہب کی نشر و اشاعت شروع کر دی۔ وہ مذہب شیعہ کے فروغ کے لئے تصنیف و تالیف میں بھی مصروف رہا۔ اس سلسلے میں "مجالس المؤمنین" اس کی ایک اہم تالیف ہے۔ علاوہ ازیں اس نے جہانگیر کے پیر شیخ سلیم چشتی کی شان میں بھی گستاخی کی۔ علماء کے احتجاج پر شوستری کو درے لگائے گئے بعد میں وہ انتقال کر گیا۔ جس پر اہل تشیع نے اسے "شہید ثالث" کا لقب دے دیا۔

شیعیت شاہ جہاں کے عہد میں

جہانگیر کی وفات (۱۰۳۷ھ/۱۶۲۸ء) کے بعد اس کا لڑکا شاہ جہاں ۴ فروری ۱۶۲۸ء تخت نشین ہوا۔ اس کی جانشینی کا راستہ نور جہاں کے بھائی اور شاہ جہاں کے خسر آصف جاہ نے کمال مستعدی سے ہموار کیا اسی سال شاہ جہاں نے ایرانی تہوار "جشن نوروز" سرکاری طور پر منایا۔ اس تہوار کی عظمت و تقدیس میں اضافے کی خاطر اس نے ذاتی طور پر دلچسپی لی۔ چاروں شہزادے دارا، شجاع، اورنگزیب اور مراد تخت کے چاروں کونوں پر کھڑے ہوئے۔ شاہی خاندان

کے افراد کو بیش بہا تحائف دیئے گئے۔ آصف جاہ کے منصب میں ایک ہزار ذات اور ایک ہزار سوار کا بھی اضافہ کیا گیا۔

شاہ جہاں کی شادی نور جہاں کی وساطت سے اس کی بھتیجی اور آصف جاہ کی بیٹی ارجمند بانو (جس کا تاریخی نام ممتاز محل ہے) کے ساتھ ۱۶۱۲ء میں ہوئی تھی شیعہ مورخ علامہ محمد حسین مظفر نے ممتاز محل کو مرزا غیاث الدین وزیر شاہ طہماسپ صفوی کی لڑکی قرار دیا" (تاریخ شیعہ صفحہ ۲۴۲) جو صحیح نہیں ہے ممتاز محل آصف جاہ کی لڑکی اور مرزا غیاث الدین ایرانی کی پوتی ہے۔ یہ خاتون بھی اپنی پھوپھی نور جہاں کی طرح بڑی بیدار مغز تھی جب ۱۶۲۸ء میں شاہ جہاں نے مملکتی نظم ونسق سنبھالا تو اسے اپنی پوشیدہ انتظامی صلاحیتوں کے اجاگر کرنے کا موقع ملا۔ شاہ جہاں اس کے مشورے کے بغیر کوئی سرکاری کام نہیں کیا کرتا تھا اور شاہی مہر بھی اسی کے پاس رہا کرتی تھی۔ ۱۶۳۱ء میں "ممتاز محل" فوت ہوگئی اس کی یاد میں شاہ جہاں نے "تاج محل" تعمیر کرایا جو دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔

یہ دور بھی شیعیت کے لئے بڑا ساز گار ثابت ہوا۔ شاہ جہاں کے چار لڑکے دارا شکوہ۔ شجاع اور نگزیب اور مراد اور دو لڑکیاں جہاں آراء، اور روشن آراء تھیں۔ جہاں آراء دارا کی طرف دار اور روشن آراء اپنے تیسرے بھائی اورنگزیب کی حامی تھی اور وہ اسے شاہی محل میں ہونے والی سازشوں سے آگاہ کرتی رہتی تھی۔

شاہ جہاں کے یہ چاروں بیٹے ممتاز محل کے بطن سے تھے ان میں سے کوئی بھی تخت نشینی سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھا شاہ جہاں کو دارا پر بڑا اعتماد تھا۔ دارا نے باپ کی علالت کے دوران شہنشاہ کے نام سے امور سلطنت انجام دینے بھی شروع کر دیے تھے دارا کے عقائد اکبر کے دین الٰہی اور باطنیوں و قرامطیوں کے عقائد کا ملغوبہ تھے دوسرا بیٹا شجاع اثنا عشری مذہب پر کاربند تھا۔

شیعیت اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں

تخت نشینی کی سخت جنگ کے بعد اہلسنت کی حمایت اور بھرپور تعاون سے اورنگزیب عالمگیر نے ۱۶۵۸ء میں زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد اپنی تمام صلاحیتیں عہد اکبری کے مخالف اسلام اثرات کو مٹانے اور شیعیت کے بڑھتے ہوئے اثر کو کم کرنے کے لئے وقف کر

دیں۔ اس وقت شیعیت کا بڑا مرکز دکن کی شیعہ ریاستیں تھیں جو اورنگزیب عالمگیر کے خلاف بطور اڈہ استعمال ہو رہی تھیں اس لئے عالمگیر نے اپنی زندگی اور توانائی کا بڑا حصہ اس مرکز کی تسخیر میں صرف کر دیا تا کہ ان علاقوں میں سلطنت کے خلاف باغیانہ سرگرمیاں دوبارہ پروان نہ چڑھیں اورنگزیب کی کوششوں کے نتیجے میں نہ صرف چنگیزی آئین وقوانین منسوخ ہوئے بلکہ ہندوانی اثر بھی بہت کچھ کم ہو کر اشاعت اسلام کے لئے مناسب فضا پیدا ہوئی۔ بالآخر مغلیہ خاندان کا عظیم القدر بادشاہ پچاس برس کی شاندار حکمرانی کے بعد ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء میں وفات پا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ اورنگزیب کے دور میں مذہب شیعہ کے فروغ میں نسبتاً کمی واقع ہوئی تاہم اہل تشیع اس دور میں بھی اقتدار میں برابر کے شریک رہے اس کے امراء و مصاحبین میں اہل تشیع کی ممتاز تعداد نظر آتی ہے۔ فوج کے اہم مناصب پر شیعہ فائز تھے جو اس کے لئے ابن علقمی اور طوسی ثابت ہوئے نیز گورنری کے عہدے شیعوں کے پاس تھے۔ اس کے علاوہ خود اورنگزیب کے گھر میں شیعیت پروان چڑھتی رہی شیعہ عالم محمد سعید اشرف مازندرانی اس کی بیٹی زیب النساء کا اتالیق تھا۔ مازندرانی صفوی دور کے مشہور شیعہ عالم ملا باقر مجلسی کا نواسہ تھا اورنگزیب کے دربار کا سب سے کامیاب نثر نگار اور شاعر نعمت خان عالی شیعہ تھا اور اس زمانے کے متعدد ممتاز شعراء کا یہی مذہب تھا۔ علامہ شبلی نعمانی نے مضامین عالمگیر میں بڑے شکایت آمیز لہجے میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ عہد عالمگیری کے سب سے برگزیدہ مورخ شیعہ تھے اور انہوں نے اس زمانے کے واقعات جس انداز سے لکھے ہیں ان کی بناء پر عالمگیر سے انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ (موج کوثر صفحہ ۱۱۹ مؤلفہ شیخ محمد اکرام)

علاوہ ازیں اورنگزیب کے دور میں دہلی میں محرم کے مہینے میں شیعی مراسم میں "تعزیہ" کا بھی اضافہ ہوا۔ دہلی کے ریذیڈنٹ "چارلس مٹکاف کے زمانے (۱۸۲۵۔۱۸۲۷ء) میں تعزیہ داری کے موقع پر جھگڑا ہو گیا تو اس نے مفتی اکرام الدین صدر الصدور دہلی (م ۱۲۶۰ھ) سے اس کے آغاز و ابتدا کے متعلق استفسار کیا تو مفتی صاحب نے جواب دیا کہ:

"ماہ محرم تو مدتوں سے چلا آ رہا ہے مگر اس میں تعزیہ داری نہ تھی۔ جس وقت بادشاہ دہلی اورنگزیب عالمگیر ملک دکن گئے تو شاہی لشکریوں نے عبداللہ پیرزادہ دکن سے جو وہاں تعزیہ داری کرتے تھے یہ رسم تعزیہ داری سیکھ لی اور اس طرح وہیں سے دہلی میں بھی تعزیہ داری کی رسم جاری

ہوگئی"۔

اورنگزیب عالمگیر کے وزیر نعمت خان عالی نے ایک محفل میں سنا کہ "فلاں بن فلاں رافضی بود" ظریف مجلس نے جواب دیا "بر پدرش لعنت" تو نعمت خان نے کہا "محمد بن ابوبکر رافضی بود" اہل مجلس نے وہی فقرہ چست کیا یعنی "بر پدرش لعنت" نعمت خان عالی نے کہا "آمین بیش باد" بعد میں اہل مجلس بہت نادم ہوئے"۔ (تفریح العوام صفحہ ۴۳ بحوالہ دبستان نجم صفحہ ۲۲۳)

اورنگزیب عالمگیر نے ایک دن اپنے وزیر باتدبیر نعمت خان عالی سے پوچھا کہ "تم شیعہ ہو یا سنی" تو اس نے جواب دیا کہ:

بارہا گفتم بتوائے شہریار   چاریارم، چاریارم، چاریار

نعمت خان نے اس جواب میں "تقیہ شریفہ" کا ثواب بھی حاصل کیا اور بڑی عیاری سے چار یارم تین دفعہ استعمال کر کے (۴+۴+۴=۱۲) اپنے اثنا عشری ہونے کا بھی اعلان کر دیا۔

شیعیت بہادر شاہ اول کے عہد میں

اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد اس کا بڑا لڑکا شہزادہ معظم ملقب بہ بہادر شاہ اول بعمر تریسٹھ برس اپنے بھائیوں کے ساتھ تخت نشینی کی تخت جنگ کے بعد اہل تشیع بالخصوص شیعہ گورنر پنجاب منعم خان کی مدد اور بھرپور تعاون سے برسر اقتدار آیا۔ اس نے آتے ہی اپنے شیعہ ہونے کا اعلان کر کے مذہب شیعہ کو فروغ دینے کی کوششیں شروع کر دیں شیعہ مورخ غلام حسین طباطبائی لکھتے ہیں کہ:

"چوں بہ تحقیق خود مذہب شیعہ امامیہ را حق می دانست ہمیں مسلک اختیار نمودہ و در ترویج و تقویت مذہب شیعہ می کوشید" (سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۳۶۱)

چونکہ وہ اپنی تحقیق کے اعتبار سے مذہب شیعہ امامیہ کو اپنی دانست میں صحیح سمجھتا تھا اس لئے یہ مسلک اختیار کیا اور اس کی اشاعت اور استحکام کے لئے کوشاں رہا۔

بہادر شاہ نے تخت سنبھالتے ہی منعم خان کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا اور خطبہ جمعہ میں "علی ولی اللہ وصی رسول اللہ" کے اضافے کا حکم دیا اس حکم سے اہل سنت میں اشتعال پیدا ہوا اور اس پر تنازعہ پیدا ہونے کی وجہ سے احمد آباد (گجرات) میں ایک خطیب مارا گیا۔ لاہور میں جہاں بادشاہ مقیم تھا سخت بلوہ ہوا۔ بہادر شاہ نے علماء لاہور کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ جو انا یار محمد کی

قیادت میں مولوی محمد مراد دوسرے تین علماء کے ہمراہ بادشاہ کے پاس حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے خود مباحثہ و مناظرہ کیا مگر مولانا یار محمد نے نہایت جرأت اور استقامت سے کلمہ حق بلند کیا اور اپنے موقف پر ثابت قدم رہے۔ بادشاہ نے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ "تو بادشاہوں کے غضب سے نہیں ڈرتا" تو اس مرد مجاہد نے جواب دیا "میں اپنے اللہ سے چار چیزوں کی آرزو رکھتا تھا اول تحصیل علم دوم حفظ کلام اللہ۔ سوم حج، چہارم شہادت۔ الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے تین نعمتیں عطا کیں۔ آرزوئے شہادت باقی ہے امیدوار ہوں کہ بادشاہ کی توجہ سے وہ بھی حاصل ہو جائے۔

اس مباحثہ کے متعلق غلام حسین طباطبائی لکھتے ہیں کہ:

"بادشاہ بدستور اس بات پر اصرار کرتا رہا اور مذہب شیعہ کی ترویج و تقویت میں ساعی و سرگرم رہا۔ مدتوں تک علماء کے ساتھ مباحثہ کا دروازہ کھلا رہا لیکن اس سے کچھ فائدہ مرتب نہیں ہوا"۔

(سیر المتاخرین جلد دوم ۳۶۱)

شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں کہ:

"اورنگزیب کے امراء کی اکثریت اس فرقہ سے تعلق رکھتی تھی اگرچہ اپنے عقائد پر بعضوں نے احتیاط و مصلحت کوشی کا پردہ ڈال رکھا تھا جب عالمگیر کی آنکھیں بند ہوئیں تو اس احتیاط کی بھی ضرورت نہ رہی۔ نئی روش میں پہل اورنگزیب کے بیٹے اور جانشین نے کی جس نے حکم دیا کہ خطبہ جمعہ میں "علی ولی اللہ وصی رسول اللہ" کے الفاظ اضافہ کئے جائیں"۔ (رود کوثر صفحہ ۶۱۷)

شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ دہلوی لکھتے ہیں کہ:

"بادشاہ نے حاجی یار محمد اور دو اور فاضلوں کو جن سے وہ آشفتہ خاطر تھا ایک قلعہ میں بھیج دیا۔ تیسرا کام اس نے اپنے آئین کے خلاف یہ کیا کہ علماء پر عتاب و خطاب کیا اور جا بجا محبوس کیا"۔

(تاریخ ہندوستان صفحہ ۳۰۶،۳۰۷ جلد ۹)

بہادر شاہ اول ۱۱۲۴ھ / ۱۷۱۲ء میں لاہور میں بعمر (۷۱) برس انتقال کر گیا۔

شیعیت جہاندار شاہ کے عہد میں

بہادر شاہ اول کی وفات کے بعد اس کے چار بیٹوں جہاں دار شاہ، عظیم الشان، جہاں شاہ اور رفیع الشان (جو اپنے والد کے ہمراہ تھا) کے درمیان تخت نشینی کی جنگ چھڑ گئی۔ عظیم الشان کو قتل کر دیا گیا۔ جہان شاہ اور رفیع الشان اگلی لڑائی میں مارے گئے۔ اس طرح جہاں دار شاہ

۱۷۱۲ء میں ذوالفقار خان کی مدد سے (جواب سلطنت کے سیاہ وسفید کا مالک تھا) فتح یاب ہو کر تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں دو شیعہ سید بھائیوں حسین علی نائب صوبہ دار پٹنہ اور عبداللہ گورنر الہ آباد نے بہت زور پکڑا۔ انہوں نے عظیم الشان کے لڑکے فرخ سیر کو تخت نشین کرنے کے لئے جہاں دار شاہ کو گیارہ ماہ کے بعد قتل کروادیا۔ شیعیت کے فروغ اور اہل تشیع کی قوت وطاقت کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ شیعہ اپنی خواہش کے مطابق جسے چاہتے تخت نشین کردیتے اور جسے چاہتے معزول کردیتے تھے۔

شیعیت فرخ سیر کے عہد میں

جہاں دار شاہ کے قتل کے بعد بہادر شاہ اول کا پوتا فرخ سیر "سید برادران" کی مدد سے ۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء میں تخت نشین ہوا۔ چونکہ فرخ سیر کی کامیابی دو شیعہ بھائیوں کی رہین منت تھی اس لئے فرخ سیر کے عہد میں ان دو بھائیوں کا اقتدار خود بادشاہ اور پوری سلطنت پر قائم ہو گیا اور بادشاہ ان کے سامنے "شاہ شطرنج" ہو کر رہ گیا۔ فرخ سیر برائے نام فرمانروا تھا۔ اصل اختیارات سید برادران کے پاس تھے۔

فرخ سیر نے حسن علی عبداللہ خان کو "یمین الدولہ، سید عبداللہ، خان بہادر، قطب الملک ظفر جنگ، سپہ سالار، یار وفادار، کے القابات کے ساتھ وزیر اعظم مقرر کیا اور حسین علی کو "عمدۃ الملک بہادر، فیروز جنگ، امیر الامراء" کے القاب کے ساتھ سپہ سالار اعلیٰ بنایا۔

سید برادران

یہ دو بھائی حسین علی اور حسن علی قطب الملک تھے اول الذکر بہار کا گورنر اور موخر الذکر الہ آباد کا حاکم تھا اورنگزیب عالمگیر کے بعد جب اس کا بیٹا بہادر شاہ اول تخت نشین ہوا تو اس نے تقیہ کی چادر اتار کر علانیہ شیعہ مذہب قبول کر لیا اور سختی کے ساتھ سلطنت میں شیعی مراسم نافذ کر دیں۔ اسی دور میں "سید برادران" نے بھی خوب ترقی کی ان کے خاندانی حالات کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ سید ابوالفرج واسطی کی اولاد میں سے ہیں جو بغداد کے قریب شہر واسط کے رہنے والے تھے ان کا شجرہ نسب سترھویں پشت میں زید شہید کے واسطہ سے حضرت علیؑ سے ملتا ہے۔ یہ ساتویں صدی ہجری/تیرہویں صدی عیسوی میں اپنے بارہ بیٹوں کے ساتھ ترک وطن کر کے ہندوستان آئے تھے اور دہلی کی سرہند سرکار میں پٹیالے کے قریب چار گاؤں میں

آباد ہو گئے تھے ان کے چار بڑے بڑے خاندان ان ہی چار گاؤں کے نام سے موسوم ہوئے۔ سید داؤد تھن پور میں، سید ابوالفضل چھت بنور (چت بانور) یا چھتروری میں، سید ابوالفضائل کوندلی میں اور سید نظم الدین حسین جگ نیر یا مجیری میں آباد ہو گئے بعد میں یہ سادات اس علاقہ سے نکل کر گنگا اور جمنا کے دو آبے میں ضلع مظفر نگر چلے گئے۔ لفظ "بارھہ" کا اشتقاق غیر یقینی ہے بعض لوگ اسے "باہر" سے مشتق قرار دیتے ہیں کہ ان لوگوں نے شہر سے باہر رہنے کو ترجیح دی۔ دوسروں نے لفظ "بارہ" کی یہ توجیہ و تعبیر کی کہ یہ سادات شیعہ تھے اور بارہ اماموں پر عقیدہ رکھتے تھے۔ (بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۳ ص ۹۱۸)

اور بعض حضرات نے اس کی یہ توجیہ پیش کی کہ چونکہ یہ بارہ گاؤں میں آباد ہیں اس لئے مختلف گاؤں میں آباد ہونے کی وجہ سے انہیں سادات "بارہ گانواں" یا "سادات بارہ" بھی کہا جاتا ہے۔

سادات بارہ اگرچہ وطناً ایرانی نہ تھے لیکن ان کا مذہب و مسلک وہی تھا جو ایرانیوں کا تھا اس لئے ان کے دور اقتدار میں شیعیت و شیعہ کا غلبہ رہا۔ سید برادران اپنے غیر محدود اختیارات اور غیر معمولی قوت و طاقت کے باعث برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں "بادشاہ گر" کے لقب سے بھی مشہور ہوئے انہیں شہزادہ عظیم الشان بن بہادر شاہ اول کی ملازمت میں بہت عروج حاصل ہوا۔

"سید برادران" نے سرکاری خزانے کو خوب لوٹا اور قیمتی ہیرے ازا کر لے گئے۔ اس اقتدار کے نشے میں وہ بہت مغرور ہو گئے حسین علی کے غرور کا تو یہ عالم تھا کہ وہ کہا کرتا تھا کہ "جس کے سر پر اس کے جوتے کا سایہ پڑے گا وہ تخت دہلی پر متمکن ہوگا"

یہ دونوں بھائی انتہائی غالی شیعہ تھے انہوں نے اپنے عقائد و نظریات کا کھلم کھلا پرچار کیا جس سے مذہب شیعہ کو بہت فروغ حاصل ہوا امیر الامراء حسین علی خان ہر مہینے کی گیارہ اور بارہ تاریخ کو مجلس منعقد کرتا تھا۔

صمصام الدولہ شاہنواز خان لکھتے ہیں کہ "گیارہویں اور بارہویں کی مجلس ہر مہینے حیدر آباد دکن میں شروع ہو گئیں کہ آج تک (۱۱۶۰ھ) جاری ہیں"۔ (مآثر الامراء جلد اول صفحہ ۳۲۸)

فرخ سیر کے دور میں خان دوران خان کے بھائی خواجہ محمد جعفر ایک متصوف تھے۔ ان

کے۔ میں تحریر ہے کہ ان کے گھر میں ائمہ طاہرین کی منقبت میں قوالیاں گائی جاتی تھیں۔ بعض مریدین ومعتقدین سلام کی بجائے زمین بوس آداب کرتے تھے اور ائمہ اثنا عشریہ کی منقبت گاتے تھے شیخ عبداللہ ملتانی نے دہلی کی جامع مسجد میں خطبہ جمعہ میں اس کی تردید کی تو مغل نوجوانوں کا ایک گروہ کربلا کی تسبیحیں گردن اور بازو میں ڈالے ہوئے قتل کے ارادے سے مسجد میں داخل ہوگیا۔ نمازیوں نے فرخ سیر سے درخواست کر کے بڑی مشکل سے اس گروہ پر قابو پایا اور شیخ عبداللہ کو واپس ملتان بھیج دیا۔

دہلی میں عزاداری اور مرثیہ خوانی بڑے زوروں سے ہوتی تھی جس طرح دہلی میں "قدم شریف" اور "نعل شریف" کے نام سے مجاوروں نے ایک فرضی زیارت گاہ قائم کر رکھی تھی اور یہ مشہور کر دیا کہ یہ "نقش قدم" رسول اکرم ﷺ کا ہے اسی طرح اہل تشیع نے دہلی میں "شاہ مرداں" اور "پنجہ شریف" کی زیارتیں بنائیں اور مشہور کر دیا کہ یہ حضرت علیؓ کا نقش قدم ہے۔

"پنجہ شریف" کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ وہاں حضرتؓ کی انگلیوں کے نشان ہیں اور دہلی میں یہ شیعوں کا مشہور قبرستان ہے۔ ہندوستانی شیعوں نے اپنے پاکستانی بھائیوں کو بھی اس نعمت سے محروم نہیں کیا۔ پاکستانی شیعوں نے اپنے ہندوستانی بھائیوں کی پیروی میں اوچ شریف (بہاول پور) اور حیدر آباد میں حضرت علیؓ کے نقش قدم اور ٹھٹھہ میں حضرت حسینؓ کے نقش قدم مشہور کر دیئے۔ نواب درگاہ قلی خان، زائرین کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"بروز شنبہ زائرین اور حاجت مندوں کا بڑا ہجوم ہوتا ہے اور ۲ المحرم کو (بروز زیارت خامس اہل عباء) خصوصیت سے اہل عزا برسم پرسہ داری گریاں و نالاں حاضر ہو کر مراسم تعزیت بجالاتے تھے اس روز کوئی متنفس ایسا نہ ہوتا تھا کہ زیارت سے محروم رہے۔ (مرقع دہلی صفحہ ۳۲)

موصوف مرثیہ خوانی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"مرثیہ کی بنیاد نہایت سوز وگداز رکھتی ہے اور غم ومصائب آلام والم کا خزانہ ہے اور مجلس عاشورہ کا اہتمام وانتظام کے سربراہ جاوید خان ہوتے ہیں جو تعزیہ داروں اور زیارت کرنے والوں کے لئے آرام وآسائش بہم پہنچاتے ہیں۔ تعزیہ داروں میں میر عبداللہ جناب حضرت حسینؓ کی شان میں ندیم وعنبرین (شعراء) کے مرثیے نہایت دردناک انداز میں پڑھتے ہیں کہ سامعین پر بہت ہی رقت طاری ہو جاتی ہے ان کے دل سے آہ و فغان نکلتی ہے اور نوحہ وفریاد سے گویا آسمان

کے کان بہرے ہو جاتے ہیں۔ محرم کے مہینے کی آمد ہر جگہ پر واجب الاحترام ہے۔ عمائدین کے تعزیے اور نوبت خانوں میں عزاداری کی مجلس کے مراسم بڑے احترام کے ساتھ ادا کی جاتی ہیں اور ان مقامات پر ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں اور جوق در جوق شرکت کرتے ہیں"۔

{حوالہ نوکری ۵۰-۵۲}

سید برادران کی سرپرستی میں دہلی کی طرح دیگر علاقوں میں بھی شیعی رسوم رائج کر دی گئیں۔ مغل بادشاہ فرخ سیر کے عہد ہی میں انگریزی کمپنی کو کئی ایک تجارتی محصولات سے چھٹکارا ملنے کے علاوہ دیگر بہت سی تجارتی مراعات بھی مل گئیں۔ یہ سب مراعات سید برادران کے مشورے سے ایک انگریز طبیب ہملٹن کی شاہی خدمات کے عوض دی گئیں۔

۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء میں سید برادران کے ایماء پر بادشاہ کو ننگے سر اور ننگے پاؤں تخت سے اتار کر خوب پیٹا گیا پھر اسے قید میں ڈال کر بھوکا رکھا گیا۔ بعد ازاں اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر اسے اندھا کر دیا گیا اور پھر اسے زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ بعض تذکرہ نگاروں کے نزدیک فرخ سیر کے بعد نیکو سیر کو تخت پر بٹھایا گیا لیکن بہت جلد اسے بھی معزول کر دیا گیا۔ سید برادران نے نیکو سیر کے بعد ۲۸ فروری ۱۷۱۹ء کو رفیع الدرجات بن رفیع القدر شہزادے کو تخت نشین کیا۔ نئے بادشاہ کی عمر اس وقت بیس سال تھی اور وہ تپ دق کا مریض تھا وہ بھی سید برادران کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ گیا۔ رفیع الدرجات تین ماہ کے بعد ۴ جون ۱۷۱۹ء کو وفات پا گیا۔

رفیع الدرجات کی وفات کے بعد اس کا بڑا بھائی اور اسی کی طرح تپ دق کا مریض رفیع الدولہ تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی سید برادران کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر برائے نام حکومت کی اور ۱۷ ستمبر ۱۷۱۹ء کو رحلت کر گیا۔

رفیع الدولہ کے انتقال کے بعد سید برادران نے بہادر شاہ اول کے پوتے روشن اختر ن جہاں شاہ کو محمد شاہ کے لقب سے ۱۷۱۹ء میں تخت پر بٹھایا۔ ایک سال بعد سید برادران میں سے ایک بھائی امیر الامراء حسین علی خان کو ۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء میں دکن سے دہلی آتے ہوئے راستے ں ہلاک کر دیا گیا۔

حسین علی خان کی ہلاکت کے بعد اس کا دوسرا بھائی وزیر اعظم عبداللہ بھی ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۰ء میں ایک معرکہ میں شکست کھانے کے بعد گرفتار ہو گیا جسے بعد ازاں زہر دے کر ہلاک

کردیا گیا یہ تمام کارروائی شیعہ گورنر اودھ سعادت خان (بانی شیعہ ریاست اودھ) کی قیادت اور محمد شاہ کی خفیہ سرپرستی میں سید برادران کی مخالف ایک شیعہ جماعت کے ہاتھوں مکمل ہوئی۔ اس "کار خیر" میں تورانی امیر آصف جاہ اوران کے رفقا کا کردار بھی ان کی دینی غیرت وحمیت کا مظہر ہے۔

"آصف جاہ" حیدر آباد دکن کے فرمانرواؤں کا لقب ہے۔ آصف جاہ اول خواجہ عابد خان پہلے نظام دکن تھے۔ شاہ جہاں کے عہد میں سمرقند سے دکن آئے۔ فرخ سیر کے عہد میں سید برادران کی دشمنی کے باعث دکن کا رخ کیا اور حکومت کی بنیاد ڈالی اور ۱۷۴۷ء میں انتقال کر گئے۔ بعد میں حیدر آباد کی اس سلطنت پر بھی اہل تشیع کا تسلط ہو گیا۔ میر نظام علی خان کے بعد نواب میر عثمان علی خان ۱۹۱۲ء میں تخت نشین ہوئے۔ جنگ عظیم میں انگریزوں کی بیش بہا خدمات کی بناء پر گورنمنٹ برطانیہ سے "ہز ایگزالٹڈ ہائی نس" کا خطاب ملا۔ ان کی سب سے بڑی یادگار عثمانیہ یونیورسٹی ہے۔ علماء، مشائخ، مساجد، مدارس اور ہر مذہب کے عبادت خانوں کو آپ کے دربار میں معقول امداد ملتی تھی تقسیم ہند کے بعد بھارت نے ریاست حیدر آباد کے خلاف پولیس ایکشن کر کے اسے بھارت میں مدغم کر لیا۔ (بحوالہ شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا صفحہ ۲۲۸)

شیعہ عالم ومؤرخ سید حسین مظفر نے آصف جاہ سابع نواب میر عثمان علی کو شیعہ قرار دیتے ہوئے اس کی حکومت کو شیعہ حکومت میں شمار کیا ہے موصوف اس کے تشیع پر دلائل دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اظہار حزن واندوہ درروز عاشوراء، برپائی مجالس عزا برائے امام حسین علیہ السلام و جلوس اودرایں مجالس وبہ رسمیت شناختن روز غدیر بہ عنوان روز عید مانند ہمہ شیعان کہ آنرا روز عید بزرگ می شمارند، وامثال آنہا"۔ (تاریخ شیعہ صفحہ ۳۲۹)

یعنی عاشوراء کے دن نواب عثمان علی کا دکھ اور غم کا اظہار کرنا۔ حضرت امام حسینؑ کے لئے مجالس عزا کا برپا کرنا اور اس کا خود ان مجالس میں شریک ہونا۔ تمام شیعوں کی طرح غدیر کے دن کو عید غدیر قرار دینا اور اس طرح کی دیگر مثالیں۔

سید برادران کے انتقال کے بعد جب روہیلوں نے ۱۷۴۷ء میں جانسٹھ کو تاراج کیا تو انہوں نے سید برادران کی اولاد کو قتل اور منتشر کر دیا پھر اس طرح سید برادران کے غیر محدود اختیارات کا عبرتناک اختتام ہو گیا۔ جس سے بالخصوص تورانیوں (سنیوں) نے سکھ اور اطمینان کا سانس لیا۔

محمد شاہ کی جان میں بھی دوبارہ جان آئی لیکن بادشاہ پھر جلد ہی ایرانیوں کے زیر اثر چلا گیا۔

سید برادران کے خاتمے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس سے مغلیہ دربار میں شیعیت کا اثر بھی ختم ہو گیا کیونکہ سید برادران کے وجود میں اب بھی ہزاروں شیعہ دربار میں موجود رہنے کے ساتھ ساتھ دیگر اعلیٰ عہدوں پر بھی برقرار تھے جو مرہٹوں اور سکھوں کے ساتھ ساز باز کر کے سلطنت کے لئے مشکلات اور مسائل پیدا کرتے رہے۔

دوسری طرف بادشاہ محمد شاہ بڑا ہی عیش پرست واقع ہوا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے تمام عیش پسندوں کو بھی مات کر دیا۔ اسی لئے وہ محمد شاہ "رنگیلا" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ محمد شاہ نے تقریباً تیس برس حکومت کی اور بھر ساٹھ سال ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں رحلت کر گیا۔

محمد شاہ کے طویل عہد میں بھی شیعہ اور مذہب شیعہ برابر فروغ پاتے رہے۔ اس کے عہد میں اکثر صوبے آزاد ہو گئے۔ علی وردی خان بنگال میں، سعادت علی خان اودھ میں اور نظام الملک دکن میں خود مختار حکمران بن گئے۔ علاوہ ازیں اسی مغل بادشاہ کے عہد میں ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۰ء میں اہل تشیع کے ایماء پر نادر شاہ ایرانی نے دہلی پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نادر شاہ جو صفوی حکومت کے زوال کے بعد برسر اقتدار آیا تھا اس کی حکومت کو محمد شاہ نے تسلیم نہیں کیا تھا اور نادر شاہ کے مخالفین جو ایران سے بھاگ کر ہندوستان آرہے تھے کو پناہ نہ دینے کے وعدے کے باوجود محمد شاہ انہیں پناہ بھی دے رہا تھا۔ پھر جب نادر شاہ نے اس وعدہ شکنی کی شکایت کرنے کے لئے اپنا ایک سفیر ہندوستان بھیجا تو اسے بھی روک لیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں انگریزوں کے ساتھ ساز باز کے نتیجے میں اہل تشیع کی پالیسی یہ تھی کہ وسیع مغلیہ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایرانیوں کو سید برادران کے خاتمے سے جو زخم اور نقصان پہنچا تھا اس کی آگ بھی اندر اندر سلگ رہی تھی۔ جس کو بجھانے کے لئے نادر شاہ دہلی پر حملہ آور ہوا۔ تاریخ کی عام کتب میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ آصف شاہ دوسرے دن نادر شاہ سے مقابلے کی تیاریاں کر رہے تھے لیکن ایک سازش کے تحت برہان الملک (بانی سلطنت اودھ) نے ان کی منشاء کے خلاف تنہا لڑائی چھیڑ دی اور خود اپنے آپ کو نادر کے ہاتھ گرفتار کرا کے نادر کو دہلی لے گیا جہاں اس نے علاوہ خزانہ لوٹنے کے خوب خون ریزی بھی کی۔ (اس کا ذکر نادر شاہی عہد میں گزر چکا ہے)

نادر شاہ کے رعب کا اندازہ لگائیں کہ اس قدر ذلت وخواری اور تباہی و بربادی کے باوجود محمد شاہ نے نادر شاہ کی باضابطہ ہفتوں مہمان نوازی کی۔ دربار کے بڑے بڑے امراء نادر شاہ کی خدمت پر مامور ہوئے عمدۃ الملک جیسا امیر و کبیر نادر کو قہوہ پلانے پر مامور ہوا تھا اور بات اسی پر ختم نہیں ہوئی بلکہ نادر شاہ نے شاہ جہاں کی ایک پوتی کا نکاح اپنے چھوٹے لڑکے نصر اللہ مرزا (جو اس کے ساتھ ایران سے ہندوستان آیا ہوا تھا) کے ساتھ کر دیا۔

"آقا خوش آمدید" کے نعرے کے ساتھ ہر ایرانی کا ہندوستان میں استقبال ہونے لگا، ان کی کتابیں شوق سے پڑھی جانے لگیں اور لوگ ان کے علماء کی باتیں توجہ اور دلچسپی سے سننے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام وامراء کے علاوہ علماء بھی ایرانی علوم ونظریات سے بری طرح متاثر ہو گئے۔ علماء حق کی احتیاط کے باوجود اب بھی "شیعی آثار" درس نظامی کی کتب میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

نادر شاہ کے ایران واپس جانے کے بعد فوری طور پر سلطنت دہلی سے تین زرخیز صوبے بنگال، بہار، اڑیسہ علیحدہ ہو گئے اور ان میں علی وردی خان کی ایک الگ، آزاد اور خود مختار شیعہ ریاست قائم ہو گئی۔

محمد شاہ کو مغلیہ خاندان کا آخری بادشاہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے بعد بادشاہت محض برائے نام رہ گئی تھی۔ محمد شاہ کے بعد احمد شاہ (۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء)، عالمگیر ثانی (۱۷۵۴ء تا ۱۷۵۹ء)، شاہ عالم ثانی (۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء)، اکبر ثانی (۱۸۰۶ء تا ۱۸۳۷ء) اور بہادر شاہ ظفر (۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۷ء) یکے بعد دیگرے برسر اقتدار آئے۔ یہ مغل بادشاہ اپنے وزراء اور امراء کے ہاتھوں مجبور اور بے بس تھے۔ احمد شاہ اندھا کر کے قید کر دیا گیا۔ عالمگیر ثانی کو قتل کر کے اس کی لاش شاہی محل کی ایک کھڑکی سے باہر پھینک دی گئی جو بعد میں جمنا کے کنارے برہنہ حالت میں پائی گئی۔ شاہ عالم ثانی اپنے طویل دور حکومت میں اپنے وزراء اور مرہٹوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا رہا اس نے انگریزوں کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی عطا کی۔ اسی کے دور میں دہلی پر ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کا قبضہ ہو گیا احمد شاہ ابدالی نے ان مشکلات سے نکالنے کے لئے اور اصل اقتدار بحال کرنے کے لئے بہت مدد دی اور مرہٹوں کو شکست فاش سے دوچار کیا لیکن یہ مغل بادشاہ اپنی نااہلی کی بناء پر مرہٹوں کی شکست [illegible] اٹھا سکا۔

اسی کے عہد میں ذوالفقار الدولہ نجف خان (شیعہ) امیر الامراء حکومت کے سیاہ و سفید کا مالک بنا ہوا تھا۔ ۱۷۷۱ء میں جب شاہ عالم دہلی میں آیا تو انگریزوں نے نجف خان کو سپہ سالار فوج کی حیثیت سے بادشاہ کے ساتھ بھیجا جو سب پر بازی لے گیا۔ مرزا احمد علی لکھتے ہیں کہ:

"نجف خان جو اپنے عہد کے بڑے امراء میں سے تھے اور شیعان ائمہ اطہار میں تھے"۔

(نجوم السماء صفحہ ۳۵۲)

شیخ غلام علی ہمدانی لکھتے ہیں کہ "شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں امیر الامراء ذوالفقار الدولہ بہادر کی وجہ سے علوی شیعہ حضرات دلی میں بہت ہوئے"۔

(مقدمہ زیا صفحہ ۵۵)

ذوالفقار الدولہ نجف خان کا گیارہ سال تک دہلی میں استیلاء اور غلبہ رہا۔ اس کے زمانے میں شیعہ مذہب کو بڑا فروغ اور سنیوں کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناں لکھتے ہیں کہ:

"جس دن سے نجف خان بے اس شہر میں امیر و غریب سب تباہ حال ہیں"۔ (کلمات طیبات صفحہ ۷۹)

اس کے دور میں تبرا عام تھا۔ حضرت مرزا جان جاناں کی موجودگی میں بھی اس پر عمل جاری تھا۔ حضرت موصوف نے شیعیت کے اس طوفان کو بڑی پامردی سے روکا اور بالآخر نجف خان کے ایک سپاہی کے ہاتھوں جام شہادت نوش کر گئے۔ اس ظالم نجف خان کی امیر الامرائی میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں جیسے اجل شیخ قتل ہو گئے جن کے ہزاروں مریدین معتقدین پاک و ہند میں پھیلے ہوئے تھے خود دہلی میں ان کا بڑا حلقہ اثر تھا اور پھر بھی اس ظلم صریح کی داد نہ فریاد؟

خود شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان کو نجف خان کے زمانے میں شدائد و مصائب برداشت کرنے پڑے حتیٰ کہ شاہ صاحب کی جائیداد اور املاک بھی ضبط ہوئیں۔

بالآخر ۱۷۸۸ء میں شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نوک خنجر سے نکال لی گئیں اور ۱۸۰۶ء میں رحلت کر گیا۔ شاہ عالم ثانی کے بعد اس کا بیٹا اکبر شاہ ثانی ایک برائے نام پنشن خوار تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوا۔ یہ مغل خاندان کا آخری تاج دار تھا۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے اس پر مقدمہ چلایا پھر اسے اسیر سلطانی بنا کر رنگون بھیج دیا جہاں وہ ۱۸۶۲ء میں انتقال کیا اور اس کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے برصغیر پاک و ہند میں مغلیہ خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

متاخرین مغل کے زمانہ میں غیر مسلم طاقتیں پوری قوت سے ملک میں ہنگامہ آراء

تھیں۔ پنجاب میں سکھوں، آگرہ اور بھرت پور میں جاٹوں اور تمام ملک میں مرہٹوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ اس بہتی گنگا میں شیعوں نے بھی خوب ہاتھ دھوئے۔ بنگال میں علی وردی خان اور اودھ میں برہان الملک سعادت خان نے اپنی الگ الگ حکومتیں قائم کر لیں۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں جونئی ریاستیں اور حکومتیں قائم ہوئیں ان میں بھاری اکثریت شیعہ حکمرانوں کی تھی۔ ان میں پہلی ریاست مرشد آباد کی تھی جس کی بنیاد عالم گیر کے معتمد اور محبوب دیوان بنگالہ مرشد قلی خان نے رکھی۔ اس وسیع حکومت کے بڑے تہذیبی مرکز مرشد آباد، عظیم آباد اور جہانگیر نگر (ڈھاکہ) تھے۔ شاہان اودھ کے مورث اعلیٰ برہان الملک سعادت خان کے خاندان کی پشت پناہی نظامت مرشد آباد نے کی۔ برہان الملک کے بھائی میر محمد باقر کو نظامت کی طرف سے باقاعدہ وظیفہ ملتا تھا۔

اودھ کی شیعہ حکومت کے ذکر سے پہلے حکومت بنگال کا مختصر حال پیش کیا جاتا ہے۔

نوابان بنگال

بنگال میں خودمختار شیعہ حکومت کا بانی "علی وردی خان" ہے یہ ترکی مہم جو ۱۷۲۶ء میں یہاں وارد ہوا تھا اور ۱۷۴۰ء میں مغل بادشاہ محمد شاہ رنگیلا کے عہد حکومت میں اس نے سلطنت مغلیہ سے اپنی علیحدگی کا اعلان کر دیا تھا۔ علی وردی خان اپنی غیر معمولی چالاکی کے باعث بہت شہرت رکھتا تھا۔ مرہٹے اس کے لئے ایک مستقل فتنے کی حیثیت رکھتے تھے لیکن شیعوں کے ساتھ مرہٹوں کا اتحاد پہلے ہی سے چلا آرہا تھا یہ مرہٹے غارت گری کر کے دکن کی شیعہ ریاست ہی میں پناہ لیتے تھے۔ علی وردی خان نے ان کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا جس کے مطابق اڑیسہ ان کے حوالے کرنے کے علاوہ بارہ لاکھ روپے سالانہ چوتھ کی شکل میں ادا کیا جانا شامل ہے۔ دوسری طرف انگریزوں کے ساتھ بھی اس کے تعلقات نہایت ہی خوش گوار تھے۔ اس کے علاوہ علی وردی خان نے ہندوؤں کی بھی بڑی سرپرستی کی۔ انہیں حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا اور ان کی تجارتی سرگرمیوں کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ ہندو ہر محکمے پر چھائے ہوئے تھے اور ان کی صلاحیت کا یہ عالم تھا کہ کوئی ضروری معاملہ ان کی شرکت اور علم کے بغیر طے نہیں ہوتا تھا۔ ہندوؤں اور انگریزوں کے ساتھ اس کے حسن سلوک کا یہ عالم ہے تو شیعہ اور مذہب شیعہ کے فروغ میں اس کی دلچسپی کا کیا عالم ہوگا؟

تھی۔ نظامت مرشد آباد کے بانی مرشد قلی خان ایک شیعہ امیر تھے "مرشد آباد" مغربی بنگال کے ایک ضلع اور شہر کا نام ہے۔

بنگال کے ناظم نوابوں کی قیام گاہ ہونے کی وجہ سے اسے تاریخی حیثیت حاصل تھی اس کا قدیمی نام مقصود آباد تھا۔ پھر نواب مرشد قلی خان (م ۱۷۲۵ء) جو نسباً برہمن اور مذہباً شیعہ تھا کی قیام گاہ کی نسبت سے اس کا نام مرشد آباد ہوا۔ اس میں نوابوں کا قدیمی محل موجود ہے جس کا نام قلعہ نظامت ہے محل کے احاطے میں امام باڑہ ہے جو ۱۸۴۷ء میں تعمیر ہوا تھا۔ قدیمی عمارتوں میں اب علی وردی خان کے بھتیجے اور داماد کی مسجد شہادت جنگ اور میر جعفر کی بارہ دری کے آثار بھی قائم ہیں۔ (بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد نمبر ۲۰ صفحہ ۳۵۲)

مرشد آباد کے اس شیعہ مرکز پر جب علی وردی خان کی بالادستی قائم ہوئی تو مرشد آباد اور عظیم آباد میں اس تحریک کے دو خاص مرکز قائم ہو گئے علی وردی خان نے ان رجحانات کی اشاعت میں بہت حصہ لیا۔ اس کے زمانے میں فضلائے ایران جوق در جوق بنگال و بہار پہنچے اور حکومت کی سرپرستی میں اپنے عقائد و افکار کی تبلیغ و اشاعت میں نہایت سرگرمی کے ساتھ مصروف ہو گئے۔ نواب علی وردی خان خود بھی روزانہ بعد عصر ان ایرانی فضلاء کے ساتھ مجلس مذاکرہ منعقد کرتے تھے۔ ان مجالس میں سید الافاضل میر محمد علی فاضل، تقی قلی خان، حکیم ہادی خان، مرزا محمد حسین صفوی وغیرہ شریک ہوتے۔ شیعہ کی مستند کتاب اصول کافی سے دو احادیث روزانہ پڑھی جاتیں اور محمد علی فاضل اس کی شرح کرتے تھے۔

(ملاحظہ ہو سیر المتاخرین از غلام حسین طباطبائی ص ۶۰۹ - ۶۱۰)

موصوف نے اپنی اس کتاب کی ایک فصل میں ان فضلائے ایران کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جو علی وردی خان کے زمانے میں وارد بنگال و بہار ہوئے تھے۔ ان مبلغین میں سے ایک طباطبائی کی نانی کے حقیقی چچا شاہ حیدری کربلائی حاری ہیں جو "در تشیع نہایت دبے باک و درکمال استغناء بود" اپنے شیعی عقائد میں نہایت نڈر اور بہت بے پرواہ تھے۔

شاہ حیدری بھاگل پور (بہار) میں مقیم تھے وہاں کے ایک رئیس محمد غوث خان بیمار ہوئے تو اس موقع پر شاہ صاحب کی تبلیغ کا انداز ملاحظہ فرمائیں۔

"محمد غوث خان اتفاقاً بیمار ہو گئے اور بیماری نے شدت اختیار کر لی جس سے زندگی کی

کوئی امید باقی نہ رہی اس وقت شاہ حیدری جنہیں غوث خان کے مذہبی عقائد سے نفرت تھی لیکن ان کی بہادری سے وہ راضی اور خوش تھے ان کے پاس گئے اور ان کے شیعہ مذہب قبول کر لینے کی شرط پر شفا کی ضمانت دی جسے انہوں نے قبول کر لیا اور اتفاق سے وہ تندرست ہو گئے۔ اس کے بعد وہ عقیدت مندی کے ساتھ شاہ حیدری کے معتقد ہو گئے اور بال بچوں سمیت ان کی پیروی کرنے لگے"۔ (سیرالمتاخرین صفحہ ۱۱۳)

علی وردی خان سولہ برس تک حکومت کرنے کے بعد ۱۷۵۶ء میں رحلت کر گیا علی وردی خان کے انتقال کے بعد اس کا چوبیس سالہ ناتجربہ کار مگر دور اندیش نواسہ "سراج الدولہ" بنگال کا نواب مقرر ہوا۔ اس کی مسند نشینی کے وقت سے ہی اس کی خالہ گھسیٹی بیگم کا دیوان راج بلبھ اور چچازاد بھائی باعث آزار رہے۔ مؤخر الذکر مرشد آباد کی مسند کے لئے مدمقابل تھا۔

نواب سراج الدولہ کے تعلقات انگریز کے ساتھ کشیدہ ہو گئے تو اس نے ہر جائز اور ناجائز طریقے سے اس کی نوابی ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انگریز نے علی وردی خان کے بہنوئی اور سراج الدولہ کے سپہ سالار میر جعفر کو بنگال کی نوابی کے سبز باغ دکھا کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ انگریز کے ساتھ جنگ کے دوران سراج الدولہ مرشد آباد کی طرف بھاگ گیا پھر وہاں سے پٹنہ پہنچا لیکن پکڑا گیا اور میر جعفر کے لڑکے میرن نے اسے قتل کر دیا۔ اس طرح ایک شیعہ نواب اپنے شیعہ رشتہ دار کی غداری کی بھینٹ چڑھ گیا۔ میر جعفر کی غداری کے متعلق علامہ اقبال کا یہ شعر زبان زد خاص وعام ہے۔

جعفر از بنگال وصادق از دکن ننگ آدم، ننگ دین، ننگ وطن

سراج الدولہ کے قتل کے بعد حسب معاہدہ میر جعفر تخت نشین ہوا اصل اختیارات انگریز کے پاس تھے۔ کچھ عرصہ بعد اسے بھی معزول کر دیا گیا۔ میر جعفر کی معزولی کے بعد انگریز نے اس کے داماد میر قاسم کو بنگال کا نواب مقرر کیا لیکن اسے بھی جلد ہی معزول کر کے دوبارہ میر جعفر کو ۱۷۶۳ء میں نواب بنا دیا۔

میر قاسم معزولی کے بعد اودھ کے شیعہ نواب شجاع الدولہ کے پاس پہنچا۔ ان دنوں مغل بادشاہ، شاہ عالم ثانی بھی وہیں مقیم تھا چنانچہ شاہ عالم اور شجاع الدولہ نے اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا اور تینوں نے مل کر بنگال پر چڑھائی کی۔ انگریز سپہ سالار نے ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام

پر ان کا مقابلہ کیا اور انہیں شکست فاش دی۔ میر قاسم بھاگ گیا شاہ عالم اور شجاع الدولہ نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

اگلے سال ۱۷۶۵ء میں بنگال کے نواب میر جعفر کا انتقال ہو گیا میر جعفر کی رحلت کے بعد اس کے بیٹے نجم الدولہ کو تخت نشین کیا گیا یہ بھی برائے نام اور کٹھ پتلی نواب تھا اور اصل اقتدار انگریز کے پاس تھا۔ مغل بادشاہ، شاہ عالم ثانی (جو خود انگریزوں کے رحم و کرم پر تھا) نے عہد نامہ الہ آباد ۱۲ اگست ۱۷۶۵ء کی رو سے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی یعنی حکومت کے اختیارات باضابطہ طور پر انگریزوں کی طرف منتقل کر دیئے۔ اس کے علاوہ بطور جاگیر، بنارس اور غازی پور کے علاقے بھی انہیں عطا کر دیئے۔

بادشاہ نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ ہی انگریزوں کو ان تمام علاقوں کا مالک و مختار بھی بنا دیا جو انہوں نے زبردستی یا عیاری سے ہندوستانی فرمانرواؤں سے چھینے تھے۔ چنانچہ "کرناٹک" جو سلطنت حیدر آباد کا ایک ماتحت صوبہ تھا حیدر آباد سے جدا کرنے کے بعد انہیں دے دیا گیا۔ اس معاہدہ کی رو سے شجاع الدولہ کو پچاس لاکھ روپے کے عوض اودھ کا صوبہ واپس کر دیا گیا۔ لیکن "کرا" اور "الہ آباد" کے اضلاع اس سے لے لئے گئے۔

سلطنت میسور

جنوبی ہند میسور میں سلطان ٹیپو کی قیادت میں ایک نئی ریاست ابھری جو نظام الملک نظام علی خان (نظام حیدر آباد شیعہ) اور انگریز دونوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی انگریز کو خدشہ لاحق ہو گیا کہ میسور پر حملہ کرنے کی صورت میں شاہ افغانستان زمان شاہ اس کا دفاع کرے گا۔ چنانچہ ولزلی نے زمان شاہ کے حملے کو روکنے کے لئے مراد آباد کے ایک شیعہ مہدی حسن کو ایران بھیجا۔ اس نے وہاں جا کر عباس شاہ صفوی شاہ ایران کے گوش گذار کیا کہ افغانستان میں شیعوں پر حد درجہ ظلم و ستم ہو رہا ہے ان کے جان و مال محفوظ نہیں، ان کے عقائد پر پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں اور سینکڑوں شیعہ ہر روز تہ تیغ کئے جا رہے ہیں۔ یہ سن کر عباس صفوی نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ ایرانیوں کے حملے کی خبر سن کر زمان شاہ جو اس وقت ہندوستان کی سرحد پر تھا کابل واپس چلا گیا۔ اگر اس وقت ایران مہدی حسن کی وجہ سے افغانستان سے جنگ نہ چھیڑتا تو ۱۷۹۹ء میں ہی ہندوستان انگریز کے تسلط سے آزاد ہو گیا ہوتا۔

الغرض ریاست میسور کے خلاف انگریز، ایران کے شیعہ حکمران، ارکاٹ کا نواب محمد علی والا جاہ، نظام الملک نظام خان اور دیگر اہل تشیع باہم متحد ہو گئے اس کے علاوہ انگریزوں نے سلطان ٹیپو کے کچھ فوجی افسران اور دیگر عہدیداران بھی خرید لئے جنہوں نے سلطان کو اصل حقائق سے آخر تک بے خبر رکھتے ہوئے غداری کا ارتکاب کیا۔

یقیناً غداری ایک ناقابل معافی جرم ہے اور غداروں کا وجود ہی کسی ملک کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے اسی غداری کی وجہ سے حضرت عیسیٰ جیسے پیغمبر بھی مصائب کا شکار ہوئے۔ مستعصم باللہ کے خلاف ہلاکو خان سے ساز باز کرنے والا اور اس کو بغداد پر حملہ کرنے کی دعوت دینے والا اس کا اپنا وزیر ابن علقمی تھا۔ بنگال میں سراج الدولہ کی تباہی اور انگریز کے اقتدار کے قیام کا باعث خود اس کا اپنا ہم مذہب اور رشتہ دار میر جعفر تھا اپنوں کی معمولی سی معمولی غداری وہ کام کرتی ہے جو دشمن کی بڑی سے بڑی قوت بھی سرانجام نہیں دے سکتی۔ غداری خواہ کسی رنگ میں ہو نتائج کے اعتبار سے ایک چیز ہے۔

ہندوستان کی پوری تاریخ غداری کی داستان ہے۔ علامہ محمد اقبال نے اس حقیقت کو حسب ذیل اشعار میں واضح کیا ہے

کے شب ہندوستان آید بروز   مردہ جعفر زندہ روح او ہنوز
ملتے را ہر کجا غارت گرے است   اصل او از صادقے یا جعفرے است
الاماں از روح جعفر الاماں   الاماں از جعفران ایں زماں

(بحوالہ جاوید نامہ صفحہ ۱۲۵ کلیات فارسی)

جب کسی قوم میں غداروں کی کثرت ہو جاتی ہے تو اس قوم کو مٹانے کے لئے کسی بیرونی طاقت کی ضرورت نہیں رہتی وہ قوم خود بخود موت کی آغوش میں چلی جاتی ہے۔ ٹیپو سلطان کی اولوالعزمی، دلیری اور بہادری دیکھئے کہ ان حالات کے باوجود وہ اپنے بلند مقصد کے حصول کے لئے آخری وقت تک لڑتا رہا۔ اس کے بہترین دوست انگریزوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے اس کے مصاحب اور حاشیہ نشین اس کی جان لینے کے درپے تھے اس کے وزراء اندرونی طور پر اس کے دشمن ہو گئے تھے۔ غرض کہ اس کی سلطنت کا کوئی گوشہ غداروں سے خالی نہ تھا۔ سلطان کے ان نام نہاد دوستوں کی غداری اور نمک حرامی کا ذرہ ذرہ گواہ تھا مگر سلطان خود اس تمام منصوبے

سے لاعلم اور بے خبر تھا اور جب اس کو اس کا علم ہوا تو اس وقت غداری اپنا کام کر چکی تھی اس وقت اس کا یہ علم اس کو اس غداری کے نتائج سے نہیں بچا سکتا تھا۔ غداروں کی فہرست میں میر صادق غلام علی لنگڑا، میر معین الدین، میر قمر الدین، بیدر اثر اس ناظہ اور میر قاسم علی بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔

میر نظام علی خان والی حیدر آباد اپنی ریاست کی بقا و استحکام کے لیے میسور کے خلاف ہمیشہ سازشوں کی پشت پناہی اور حوصلہ افزائی کرتا تھا میر صادق کی وجہ سے سلطان کی تمام اطلاعات حیدر آباد، ارکاٹ مدراس اور کلکتہ پہنچتی رہتی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ دشمن کو سلطان کی تیاریوں کا قبل از وقت علم ہو جایا کرتا تھا جس کی وجہ سے اس کے تمام منصوبے ناکام ہو جاتے تھے۔ سلطان جس وقت انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لئے آخری بار نکلا تو اس شیطان صفت شخص نے قلعے کا دروازہ بند کر لیا تاکہ سلطان زندہ واپس نہ آسکے۔

سلطان مردانہ وار لڑ رہا تھا اور انگریز اسے شناخت کرنے سے قاصر تھے مگر اس بد بخت ازلی کی اطلاع دی پر ہندوستان کا یہ مایہ ناز سپوت محصوری کی حالت میں داد شجاعت دیتا ہوا ۱۷۹۹ء میں جام شہادت نوش کر گیا۔

نوابان اودھ

اودھ بھارت کا ایک علاقہ ہے جو پہلے صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ کی ایک انتظامی وحدت شمار ہوتا تھا اور اب اتر پردیش (دارالحکومت لکھنؤ) کا ایک حصہ ہے زمانہ قدیم ہی سے اودھ اور اس کے مضافات شمالی ہندوستان کے وسیع اور زرخیز میدان کا حصہ رہے ہیں اور یہ ہندو تہذیب کا بڑا مرکز بھی رہا۔ قطب الدین کے عہد (بارہویں صدی کے آخری عشرے) میں مسلمان فاتحین اودھ پر قابض ہو گئے تھے اور انہوں نے اس صوبے کو سلطنت دہلی میں شامل کر لیا تھا۔ ۱۵۲۷ء میں جب بابر وسط ہند سے واپس آیا تو اس نے لودھی خاندان کے افغانوں کو شکست دے کر اودھ کو سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا۔ پھر متاخر مغل بادشاہوں کے عہد میں جب ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں معرض وجود میں آگئیں اور ان کے حکمران تقریباً خود مختار ہو گئے تو ایسی ریاستوں میں اودھ کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔

اودھ کا علاقہ گزشتہ کئی صدیوں سے اہل تشیع کا مسکن چلا آرہا ہے مشہور شیعہ سکالر سید مرتضیٰ حسین برصغیر میں شیعی تاریخ اور اس کی تفسیری خدمات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"پاکستان و ہندوستان میں شیعہ تاریخ جتنی قدیم ہے اتنی ہی غیر مربوط بھی ہے۔ غیروں کی اکثریت، اسلام و کفر کا مقابلہ، اپنوں کا ظلم و ستم کچھ ایسا سانحہ ہے کہ ہمیں سر اٹھانے سر جوڑ کر بیٹھنے، اپنی کہنے اور دوسرے سے مقابلہ کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ غزنوی آئے تو انہوں نے ہمیں قرمطی و باطنی و روافض کہہ کر کچل دیا۔ غلام اور تغلق آئے تو انہیں ہمارے معابد و مکاتب نہ بھائے۔ ہم سندھ سے دکن پہنچے وہاں ابھی جم کر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ اکھاڑ دیئے گئے۔ سات سو برس اودھ میں سر چھپایا مگر پھیلنے سے پہلے بادِ سموم نے گلہائے نوشگفتہ کو زرد کر دیا۔ علماء نے تفسیریں لکھیں مگر ناپید۔ ملا مبارک نے منبع عیون المعانی مغل دور یا شیر شاہی عہد میں لکھی تو اسے زمانے نے ضائع کر دیا۔ فیضی نے سواطع الالہام لکھی تو بے چارہ یہ نہ کہہ سکا کہ وہ شیعہ ہے یا سنی ملا فتح اللہ شیرازی نے لاہور میں درس دیا۔ حکیم نعمت خان نے تفسیر قرآن لکھی مگر کون ہے جو ان شیعوں کے دفتروں کو دفتروں سے ڈھونڈے۔ جب تاریخ لکھنے والا شیعہ ملا احمد ٹھٹھوی اور شیعہ عقائد پر اتہامات کا دفعیہ کرنے والا نور اللہ شوستری عوام اور حکومت کے ہاتھوں سخت ترین تکلیفیں برداشت کر کے خونی شہادت پا گئے تو قیاس کیجئے کہ ملک میں کیا کیا جا سکتا تھا؟ زندگی گذارنا مشکل تھا۔ شیعہ خون خوار، وحشی، اکفر، گردن زنی شب و روز الزامات و اتہامات کی بھرمار تھی۔ ہمارے علماء تشیع کے تعارف و تحفظ میں مصروف ہو گئے اور جب عقائد کی توضیح سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ ان کے برادران یوسف نے قرآن کی تفسیروں میں بھی انہیں معاف نہیں کیا اس لئے فقہ و تاریخ کو الگ موضوع قرار دے کر آیات کے بارے میں اپنی روایات و اعتقادات کے پیش نظر حریفوں کے استدلال کا جواب، اپنے نظریات کا اثبات، آل محمد کے فضائل کا بیان، قرآن مجید کے روایتی مفہوم کی تشریح کی۔ جہاں جہاں چھیڑ چھاڑ کی گئی تھی وہاں "البادی اظلم" کے طور پر جواب دیئے۔ اصول عقائد کو براہ راست بیان کیا اور چونکہ اب تک احادیث کے اس ضخیم مجموعے کو بالکل نظر انداز قرار دیا گیا تھا جو آل محمد سے متعلق ہیں اس لئے ان کی طرف توجہ دلائی گئی۔" (القرآن المبین۔ تفسیر المبین صفحہ ۲)

بہر حال اہل تشیع کو اودھ میں طویل قیام کے علاوہ ایک سو بتیس (۱۳۲) برس تک مستقل طور پر مکمل اقتدار بھی حاصل رہا۔ اس دوران انہوں نے شیعہ اور مذہب شیعہ کے فروغ کے لئے جو خدمات انجام دیں ان کا مختصر تذکرہ آگے آرہا ہے۔

نواب سعادت خان

محمد امین کو "سعادت خان" اور "برہان الملک" کے القاب سے مغل بادشاہ محمد شاہ کی طرف سے اودھ کا صوبے دار مقرر کیا گیا۔ اس کی ولادت ایک شیعہ سید گھرانے (جو امام موسیٰ کاظم کی طرف منسوب ہے) میں نیشاپور میں ہوئی۔ چونکہ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا قیام شاہ ایران کے تعاون سے ہی ممکن ہوا تھا اس لئے ہندوستان ایرانیوں کا دوسرا گھر تھا وہ بلا روک ٹوک جب چاہتے آجاتے تھے سعادت خان کے متعلق یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کب وارد ہند ہوئے۔

نواب سعادت خان نے دکن کی شیعہ ریاستوں کے خاتمے کے بعد اودھ میں ۱۷۲۴ء میں ایک نئی شیعہ ریاست قائم کی جو ۱۳۲ سال کے بعد ۱۸۵۶ء میں انگریزوں کے ساتھ الحاق کی صورت میں ختم ہوئی۔

نواب برہان الملک سعادت خان نیشاپوری نے اپنی ریاست کی حدیں اتنی وسیع کر لیں کہ اس میں بنارس، غازی پور، جونپور، اور چنار بھی شامل ہو گئے۔ ایران میں اس وقت غالی شیعوں کی صفوی حکومت قائم تھی۔ اس کی پیروی میں یہاں بھی شیعی رسوم نافذ کر دی گئیں اس کے علاوہ اہلسنت پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے اور ان کے وہ مدارس بھی بند کر دیئے گئے جو قدیم سے علم و فضل کے مخزن تھے۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار کے مطابق "سعادت خان میں حب جاہ اور مطلب پرستی بے انتہا تھی حسین علی خان جیسے شخص کو جس کا حاشیہ نشین اور مورد عنایت رہا تھا اس کو بھی نہ بخشا اور باوجود سید اور شیعہ ہونے کے اسے قتل کر دیا"۔ (صفحہ ۱۳۲ جلد ۱۔ بحوالہ مذہب شیعہ صفحہ ۵۰۶)

نواب سعادت خان کو مرشد قلی خان (شیعہ) ناظم مرشد آباد کی سرپرستی بھی حاصل رہی اس کی پیشانی پر سب سے بڑا داغ ہے کہ اس نے (نیم شیعہ) مغلیہ سلطنت کو مکمل طور پر شیعہ ریاست میں تبدیل کرنے کے لئے نادر شاہ ایرانی کے ہاتھوں دہلی کو تباہ و برباد کرایا۔ حکیم نجم الغنی خان تاریخ مظفری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"دوسرے دن بادشاہ نے نظام الملک فتح جنگ کو میر بخشی کی خلعت دی حالانکہ سعادت علی خان برہان الملک اس کے امیدوار تھے وہ نہایت رنجیدہ ہو گئے اور نادر شاہ کو دارالخلافہ (دہلی) جانے کی ترغیب دی اور اس طرح نمک حرامی کا حق ادا کر دیا اور وہاں کے

پوشیدہ خزانوں اور دفینوں کی نشان دہی کی"۔ (تاریخ اودھ صفحہ ۸۱ جلد ۱)

برہان الملک نے ۱۷۳۹ء میں وفات پائی اس کی تاریخ وفات ایک حرف کے اضافے سے بنتی "بے سعادت نمک حرام مرد"۔

نواب صفدر جنگ خان

برہان الملک سعادت علی خان کے بعد اس کا بھانجا اور داماد ابو المنصور صفدر جنگ خان ۱۷۳۹ء میں اس کا جانشین مقرر ہوا۔ اس نے اپنے خسر کی نسبت زیادہ عروج حاصل کیا۔ سلطنت مغلیہ کا وزیر اور اودھ کی صوبیداری کے علاوہ صوبہ جات کشمیر اور الہ آباد کا انتظام بھی اس کے سپرد ہوا۔ صفدر جنگ اس قدر غالی شیعہ تھا کہ اسے نہ صرف اودھ بلکہ ہندوستان بھر کے شیعوں کا پیشوائے اعظم کہا جاتا ہے۔

صوبہ اودھ سے ملحقہ فرخ آباد اور روہیل کھنڈ کی ریاستیں اہل سنت کے زیر اقتدار تھیں جن کے حکمران بنگش اور روہیلہ پٹھان تھے اختلاف مذہب کی وجہ سے ان دونوں ریاستوں کا وجود صفدر جنگ کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا اور ان دونوں مسلم ریاستوں کو ختم کرنے کے لئے وہ زندگی بھر کوشاں رہا۔ اس کی اس خواہش و آرزو کی تکمیل اس کے بیٹے شجاع الدولہ اور اس کے پوتے آصف الدولہ کے ہاتھوں ہوئی اس نے انگریز اور مرہٹوں سے لڑنے کی بجائے بنگشوں اور پٹھانوں کے خلاف جنگ شروع کر دی بلکہ اس نے روہیلوں کے مقابلے میں مرہٹوں سے امداد بھی طلب کی اور اسی بناء پر بعد میں مرہٹوں نے روہیل کھنڈ پر اپنے حقوق کا دعویٰ کیا تھا۔

صفدر جنگ نے احمد خان بنگش سے شکست کھانے کے بعد دو آبے پر مرہٹوں کو مسلط کرایا، دہلی میں مغل شہنشاہ احمد شاہ سے بغاوت کی۔ سنی ا شیعہ تصادم کرایا اور اس تصادم میں سنی ا شیعہ میں پہچان کے لئے ایک نعرہ وجود میں آیا جو ان کا لقب اور مابہ الامتیاز بن گیا۔ یعنی سنی "دم چار یار" اور شیعہ "دم پنجتن" کا نعرہ بلند کرتے تھے۔ اودھ و روہیل کھنڈ کے درمیان جس قدر لڑائیاں ہوئیں ان کا اصل سبب یہی مذہبی اختلاف تھا۔ نجیب الدولہ فرمانروائے نجیب آباد اور حافظ رحمت خان حاکم بریلی متبع کتاب و سنت اور شیعیت سے سخت متنفر تھے نجیب الدولہ نے دارانگر میں برلب دریائے گنگ ایک عالیشان مدرسہ تعمیر کر کے دینی تعلیم کو روہیل کھنڈ میں خوب رواج دیا جب کہ حافظ رحمت خان حاکم بریلی نے مذہب شیعہ کی تردید میں ایک کتاب لکھی۔

صفدر جنگ نے اپنے سنی ہمسایوں سے انتقام لینے اور فرخ آباد اور روہیل کھنڈ کو تباہ کرنے کے لئے مرہٹوں کو شمالی ہند میں فوجیں لانے کی ترغیب دی جس کے نتیجے میں دہلی پر مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا۔ احمد شاہ درانی کی آمد اور پانی پت کی تیسری عظیم الشان جنگ نے مرہٹوں کا زور توڑا اور وقتی طور پر چند روز کے لئے اودھ کے شیعوں اور صفدر جنگ کے جانشین شجاع الدولہ کو مرعوب و خاموش ہونا پڑا۔ برہان الملک سعادت علی خان اور صفدر جنگ کے عہد میں بہت سے ایرانی اودھ آئے اور حکومت کے نظم و نسق میں ہاتھ بٹایا۔ چنانچہ نجم الغنی خان لکھتے ہیں کہ:

"ان (صفدر جنگ) کی سرکار میں سواران مغلیہ بیس ہزار تھے لیکن اکثر ہندوستانی بھی صفدر جنگ کا دھر میلان پاکر ان کا سا لباس پہن کر بات چیت کرتے تھے اور تنخواہ پاتے تھے"۔

(تاریخ اودھ صفحہ ۲۹۸ جلد ۱)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوج کی ملازمت کے لئے ایرانی زبان و لباس ضروری امور تھے اختلاف مذہب کی وجہ سے ان حکمرانوں کے زمانے میں سنی علماء و مشائخ کی بہت سی جائیدادیں ضبط ہو گئیں میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ:

"۱۱۳۰ھ کے زمانہ تک بلگرام کی سرزمین میں علم و علماء کی خوب چہل پہل تھی یہاں تک کہ برہان الملک سعادت خان نیشاپوری محمد شاہ کی تخت نشینی کے آغاز میں ہی اودھ کا حاکم ہو گیا اور اکثر الہ آباد کے بڑے بڑے علاقے اور جون پور، بنارس، غازی پور، کڑہ، مانک پور اور کوڑہ جہاں آباد کو اپنی حکومت کا حصہ بنالیا۔ پرانے خاندانوں کے وظائف اور مراعات وغیرہ کو یک قلم ضبط کر لیا۔ شریف و نجیب خاندانی لوگوں کا حال خراب ہو گیا اور اس پریشانی نے لوگوں کو حصول علم سے باز رکھا۔ وہ مدارس جو پرانے زمانے سے علم و فن کے معدن تھے ایک دم تباہ ہو گئے اہل کمال کی انجمنیں اکثر درہم برہم ہو گئیں برہان الملک کے مرنے کے بعد حکومت اس کے بھانجے ابوالمنصور خان صفدر جنگ کو ملی۔ اس کے زمانے میں بھی وظیفے اور جاگیریں بدستور ضبط رہیں۔ ۱۱۵۹ھ میں الہ آباد کی صوبیداری بھی صفدر جنگ کو ملی اور اس صوبے کے تھوڑے بہت وظائف جو ضبط ہونے سے محفوظ تھے وہ بھی ضبط کر لئے گئے"۔ (مآثر الکرام صفحہ ۲۲۳ جلد ۱)

جائیداد اور املاک کی واگذاری کے لئے بہت سے قدیم خاندانوں نے اپنے آبائی مذہب کو خیر باد کہہ دیا۔ اس سلسلہ میں مآثر الکرام کے مقدمہ میں بابائے اردو مولوی

عبدالحی لکھتے ہیں کہ:

"ایک بات تاریخی حیثیت سے اس تذکرہ میں خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ ان علماء و فضلاء بلگرام میں سے جن کا اس میں ذکر ہے ایک بھی اہل تشیع میں سے نہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب شیعہ نے وہاں بعد کے زمانے میں رواج پایا"۔ (حوالہ مذکور صفحہ ۱۳)

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سادات بلگرام نے معاشی اور معاشرتی مجبوریوں سے پہلے تفضیلیت اور پھر شیعیت اختیار کی اور آخر میں تو یہ رنگ بہت پختہ ہو گیا یہاں کی تعزیہ داری نے دور و نزدیک شہرت پائی۔ بلگرام کے صرف ایک محلہ میدان پورہ کی تعزیہ داری کا حال ملاحظہ فرمائیں۔

"دس محرم کو گیارہ بجے تک کل محلہ میدان پورہ کے تعزیے جن کی فہرست درج ذیل مع بنانے والوں کے ہے جو تعداد میں چوبیس، پچیس کے ہوتے اور ہمراہ سفید تعزیہ کے گشت میں شامل رہ کر کربلا جاتے۔ قریب پانچ بجے دن کے جب کہ تعزیہ متصل مکان مولوی محمد عالم صاحب پہنچتا تو شیخ مظہر حسین مرثیہ "قتل جب رن میں ہوا سبط رسول الثقلین" خاص اپنے چیدہ بازوں کے ساتھ بہت شان سے پڑھتے۔ اس مرثیے کے سننے کے واسطے تمام بلگرام کے معززین اہل ہنود اور حکامان تحصیل و تھانہ آتے تھے مجمع نہایت کثیر اور پر رونق ہوتا تھا۔ بعدہ واپسی تعزیہ از کربلا تمام بزرگوار واہلیان محلہ امام بارہ میں موجود ہو کر غم امام علیہ السلام میں شریک ہوتے اور مجلس شربت کی ہوتی اور یہی مجلس سوم اور جہلم کو کربلا میں ہوا کرتی تھی"۔

(تاریخ خطہ پاک بلگرام صفحہ ۱۵۸)

اودھ اور روہیل کھنڈ میں تعزیہ داری کا یہ رنگ بھی نوابان اور شاہان اودھ کی ترغیب و تحریص اور ان کی سرپرستی کی وجہ سے پیدا ہوا۔ صفدر جنگ کے دور میں شیعہ اور مذہب شیعہ کو بہت فروغ حاصل ہوا ابوالحسن مانکپوری لکھتے ہیں کہ:

"سادات موضع بق، پرگنہ سہوہ اور فتح پور خاص میں مقیم ہوئے۔ مدت تک اولادان کی بہ مذہب آبائی (اہل سنت) قائم رہی لیکن بعہد ریاست ابوالمنصور خان صفدر جنگ مذہب امامیہ اختیار کرتے گئے"۔ (آئینہ اودھ صفحہ ۱۱۹ بحوالہ مسلم فرقہ واریت صفحہ ۲۱۵)

بالآخر صفدر جنگ ۱۷۵۴ء میں ایک سرطانی پھوڑے کے باعث رحلت کر گیا۔

نواب شجاع الدولہ

صفدر جنگ کے بعد اس کا بیٹا شجاع الدولہ مسند نشین ہوا۔ وہ مذہبی پالیسی میں اپنے باپ صفدر جنگ سے بھی دو قدم آگے بڑھ گیا۔ شجاع الدولہ نے فرخ آباد کے بنگش اور روہیل کھنڈ کے روہیلہ حکمرانوں کا مکمل طور پر استیصال کیا اور انگریزی فوج کو اپنی مدد کے لئے بلایا۔ مرزا نجف خان شیعہ (جو شجاع الدولہ کا تربیت یافتہ تھا) نے دہلی میں بادشاہ پر اپنا اثر قائم کیا اور شاہی فوجیں لے کر دہلی سے نجیب آباد کی طرف روانہ ہوا اور چند دن کے بعد شجاع الدولہ انگریزی لشکر کے ساتھ بریلی کی طرف بڑھا۔ اس کی فوجیں روہیلہ بستیوں میں داخل ہوئیں۔ مدرسوں، خانقاہوں اور مسجدوں کی بے حرمتی کے علاوہ اس نے سنیوں کی بستیوں کی بستیاں جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیں اور تمام روہیل کھنڈ کو روند ڈالا۔ اس طرح پٹھانوں کی بربادی کے ساتھ ہی سنی ریاست کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ بارہویں صدی ہجری کے آخر میں روہیل کھنڈ کے سنی پٹھان انگریزوں اور اودھ کے شیعوں کی متفقہ و مشترکہ کوشش سے تباہ و برباد ہوئے۔ پیچھے بہ عنوان "نوابان بنگال" میر قاسم کے حالات میں یہ بات گزر چکی ہے کہ میر قاسم حاکم بنگال انگریزوں سے شکست کھا کر اودھ کے حکمران نواب شجاع الدولہ کے پاس پناہ گزین ہوا تھا اور اس وقت مغل بادشاہ عالم گیر ثانی بھی اودھ میں ہی مقیم تھا۔ ان تینوں نے باہم مل کر "بکسر" کے میدان میں جنگ لڑی تھی جس میں انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا اور شجاع الدولہ نے بطور تاوان الہ آباد اور کورا کے علاقے انگریزوں کے حوالے کر دیئے۔ اس کے علاوہ اسے انگریزوں کے ساتھ دفاعی معاہدہ کر کے انگریز فوج رکھنے پر بھی رضامند ہونا پڑا بالفاظ دیگر شجاع الدولہ نے اقتدار پسندی کی لالچ میں انگریز فوج کو روہیل کھنڈ پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دے کر دراصل اودھ میں برطانوی حکومت کو قدم جمانے کا موقع فراہم کیا تھا۔

اگرچہ حریت پسند مسلمان روہیلے تباہ کر دیئے گئے اور ان کے سردار حافظ رحمت خان بھی جام شہادت نوش کر گئے لیکن جلد ہی اودھ پر بھی زوال کی گھٹائیں چھانی شروع ہو گئیں۔ انگریز نے اودھ پر اپنا تسلط و اثر قائم کرنے کے بعد ۱۷۶۵ء کے معاہدہ الہ آباد کی رو سے کانپور، فتح پور اور الہ آباد کے سوا اودھ کا باقی علاقہ شجاع الدولہ کو واپس دے دیا اور اس سے سالانہ پچاس لاکھ روپے کمپنی کو ادا کرنے کی شرط پر بھی دستخط لے لئے۔

شجاع الدولہ نے فرخ آباد کی سنی ریاست پر احمد خان بنگش کے لڑکے نواب ولیہ ہمت خان مظفر جنگ (م ۱۷۹۶ء) کے عہد میں ۱۷۷۳ء میں قبضہ کیا پھر اسی سال نواب مظفر جنگ نے خود بھی ضلع علی گڑھ میں شیعوں کی ایک بستی قصبہ جلالی میں حاضر ہو کر نواب شجاع الدولہ کے ہاتھ پر باقاعدہ مذہب شیعہ اختیار کر لیا۔ اس طرح یہ سنی ریاست بھی شیعہ ریاست میں تبدیل ہوگئی۔

شجاع الدولہ نے قصبہ جلالی میں حکیم خیرات علی کے امام باڑے کے لئے چار گاؤں مال پور، کمال پور، نورتھ اور نزولی وقف کئے۔ اس کے عہد میں دو نامور فاضل علامہ عبدالعلی بحر العلوم (م ۱۸۲۰ء) اور علامہ محمد حسن فرنگی محلی (م ۱۷۸۴ء) اختلاف عقائد کی وجہ سے خارج البلد کئے گئے اور ان ہستیوں کو پھر کبھی اپنا وطن دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ عبدالعلی بحر العلوم نے ساری عمر شاہ جہاں پور، رام پور، بنگلی اور مدراس میں غریب الوطنی میں گذاری اور مدراس میں ہی سپرد خاک ہوئے جبکہ محمد حسن فرنگی محلی نے رام پور میں سکونت اختیار کر لی اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

شجاع الدولہ کی بیگم نواب بہو بیگم نے اپنے وقف نامے میں ایک لاکھ روپے سالانہ کربلا و نجف کے لئے وقف کیا تھا۔

نجم الغنی خان روہیل کھنڈ کی تباہی اور شیعوں کے مظالم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"مسجدوں، مدرسوں، خانقاہوں اور مقبروں میں تلنگے گوبر سے چوکا دیتے اور کھانا پکاتے ہیں۔ آنولہ نواب محمد علی خان کے عہد میں دارالسلام تھا اور نواب ممدوح نے بڑی کوشش کے ساتھ قلعہ اور مسجدیں تعمیر کرائی تھیں۔ آنولہ کی دین داری پر بلاد اسلام کو رشک تھا۔ شجاع الدولہ کی فتح کے بعد اس شہر کی یہ نوبت پہنچی کہ آخون محمد رحیم کی مسجد میں رنڈیاں اور فاحشہ عورتیں رہنے لگیں اور اعلانیہ ان میں بیٹھ کر کسب کراتیں، بدفعلی میں مشغول رہتیں ان سے کوئی تعرض نہ کرتا کہ تم مسلمانوں کے مقدس مقام میں ایسا کیوں کرتی ہو؟" (تاریخ اودھ صفحہ ۲۰ جلد ۱)

بالآخر یہ عیاش اور ظالم نواب ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء میں عمر پینتالیس (۴۵) برس انتقال کر گیا۔

نواب آصف الدولہ

شجاع الدولہ کے بعد اس کا بیٹا نواب آصف الدولہ تخت نشین ہوا چونکہ فتح روہیل کھنڈ کے بعد جلد ہی شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا تھا لہٰذا نظم و نسق کی تمام پالیسی آصف الدولہ کو وضع ... نے بڑی حد تک اپنے باپ دادا کی روایات کو برقرار رکھا۔ قدیم جاگیرداروں

کی جاگیریں ضبط ہوئیں۔ روہیلوں کے مرکزی مقامات کے محلات اور سرائیں ضبط ہو کر ان شیعہ عمال اور افسران کو ملیں جو آصف الدولہ کی طرف سے ان مقامات پر مقرر ہوئے۔ آنولہ میں نواب علی محمد خان کے قلعہ میں شیعہ سادات آباد کئے گئے یہ لوگ ۱۹۴۷ء تک قلعہ کے ایک حصہ چوبرجی میں قابض ودخیل رہے سید الطاف علی بریلوی لکھتے ہیں کہ

"شاہان اودھ کے عہد میں حکومت میں اہل تشیع حضرات کی مہذب وذی علم آبادی کا کافی اضافہ ہوا۔ روہیل کھنڈ کے ہر ایک ضلع میں ہمارے ان بھائیوں کے مشہور خاندان آکر سکونت پذیر ہو گئے اور حکومت کی جانب سے ان کو معقول زمینداریاں اور جاگیریں عطا کی گئیں بریلی میں حسینی باغ، گنذری کی مسجد اور آصف الدولہ کا کالا امام باڑہ وغیرہ اسی عہد کی مشہور یادگاریں ہیں"۔

(حیات حافظ رحمت اللہ خان صفحہ ۳۱۹)

بسولی میں نواب دوندے خان کا تعمیر کردہ شیش محل تھا اس کی ایک پرانی محل سرا میں میر مشرف علی (جو شجاع الدولہ کے زمانے میں ایران سے لکھنؤ وارد ہوئے تھے) نے آباد کیا۔ اسی طرح اوجھیانی کا قلعہ جو نواب عبداللہ خان بن نواب علی محمد خان کا تعمیر کردہ تھا وہ بھی شیعہ سادات کو ملا۔ آصف الدولہ کے زمانے میں اوجھیانی میں ایک وسیع اور عالی شان امام باڑہ بھی تعمیر کیا گیا۔ نواب نے خادم حسین خان متولی کو امام باڑہ کے لئے چھ گاؤں وقف کئے۔

آصف الدولہ نے لکھنؤ میں دس لاکھ روپے کی لاگت سے ایک بڑا امام باڑہ تعمیر کرایا اور نجف اشرف میں دریائے فرات سے ایک نہر نکلوائی جس سے زائرین کو پانی کی سہولت حاصل ہوئی۔ نجف کی نہر آج تک اس کے نام سے منسوب ہے یعنی "نہر آصفی" اس کے علاوہ اس نے کربلا و نجف میں متعدد عمارتیں بھی تعمیر کروائیں۔

آصفی دور کی سب سے اہم دریافت "درگاہ حضرت عباس" ہے فقیر بیگ نامی ایک شخص نے ایک علم دریائے گومتی کے کنارے پوشیدہ طور پر دفن کر دیا اور مشہور یہ کیا کہ مجھے خواب میں بتایا گیا ہے کہ "حضرت عباس کے ہاتھ میں جو علم معرکہ کربلا میں تھا وہ فلاں مقام پر دفن ہے تو اس کو نکال لے"۔ چنانچہ اس کے بعد وہ چند آدمیوں کے ہمراہ وہاں پہنچا تو علم برآمد ہوا جسے اس نے اپنے گھر میں نہایت تعظیم کے ساتھ رکھا۔ نواب آصف الدولہ اس علم کی زیارت کے لئے اس کے گھر گیا اس کی پیروی میں لوگ بھی جوق در جوق جانے لگے۔

نجم الغنی لکھتے ہیں کہ: "نواب آصف الدولہ ہزار جان و دل سے شہدائے کربلا کے جان نثار تھے اس علم کی زیارت کے لئے آنے لگے اور ایک گنبد اینٹوں کا وہاں تعمیر کرا دیا یہ گنبد اور بھی موجب ترقی ہوا"۔ (تاریخ اودھ صفحہ ۳۰۰ جلد ۳)

مغلیہ سلطنت کے آخری ایام میں اودھ کے دارالحکومت لکھنؤ کی سیاسی، مذہبی اور ثقافتی اہمیت دہلی سے بھی بڑھ گئی تھی نوابان اودھ نے شیعہ مذہب کی نشر و اشاعت میں بہت کوشش کی بالخصوص آصف الدولہ کے زمانے میں اس مذہب نے سب سے زیادہ فروغ حاصل کیا۔ نظام حکومت پر اگرچہ انگریزوں کی گرفت مضبوط ہوتی گئی مگر مذہب شیعہ کی بنیادیں بھی خوب مستحکم ہو گئیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں کہ:

"نواب وزیر اور ان کے خاص محل کے ذاتی اثر نے اس عقیدے کو لکھنوی تمدن کا ایک نمایاں عنصر بنا دیا"۔ (لکھنؤ کا دبستان شاعری صفحہ ۴۹)

آصف الدولہ کی طرف سے اس مذہب کی نشر و اشاعت میں تحریص و ترغیب اور تہدید و تخویف کے حربے بھی استعمال کئے گئے جس کی وجہ سے بہت سے لوگ اس نئے مذہب میں داخل ہو گئے۔ گزیٹر مراد آباد کے مطابق "اکبر کے عہد سے (نوابان) اودھ کے تسلط و حکومت کے ابتدائی زمانہ تک امروہہ کے تمام سید مؤخر الذکر مذہب (اہلسنت والجماعت) کے پابند تھے نوابان اودھ چونکہ بذات خود غالی شیعہ تھے اس لئے امروہہ کے بہت سے سیدوں نے اپنا قدیم مذہب (شیعیت) پھر اختیار کر لیا اور اس طرح مذہب تبدیل کرنے سے انہیں بہت سے دنیوی فوائد بھی صحرائی و سکنائی جائیداد و املاک کی صورت میں حاصل ہو گئے"۔ (گزیٹر مراد آباد صفحہ ۱۸۴)

بدایوں میں مذہب شیعہ کی ترویج و اشاعت کے متعلق مولوی محمد سلیمان بدایونی (م ۱۹۶۳ء) اپنے ایک مقالہ "بدایوں کے اہل تشیع" میں لکھتے ہیں کہ:

"صورت سنگھ نے بدایوں کا چارج لے کر اندازہ کیا کہ عوام کی تالیف قلوب عطیات سے کی جاوے اور علماء میں سے بھی انتخاب کر کے مخالفت کی آواز کو بالکل اٹھنے نہ دیا جائے۔ چنانچہ اس کی نظر انتخاب مفتی محمد علی صدیقی حمیدی اور مولوی محمد علی عثمانی پر پڑی۔ مولوی صاحب (محمد علی عثمانی) نے موضع شادی پور تحصیل داتا گنج میں معافی کی اراضی لے کر سکوت اختیار کر لیا۔ مفتی صاحب نے علاوہ ہدایا اور عطایا کے حکومت کا مذہب بھی اختیار کر لیا اور ان کی اولاد اس

وقت تک شیعیت پر قائم ہے۔ مفتی جی کی ترویج شیعیت سے ان کے اکثر عم زادوں نے شیعیت اختیار کی۔ مفتی جی کے بیٹے مفتی مظہر علی نے "عروج الشیعہ فی البدایوں" لکھی ایک امام بارہ تعمیر کرایا جو بڑا امام بارہ کہلاتا ہے اس امام باڑے کے نام موضع خیر پور تحصیل بدایوں میں معافی عطیہ نواب آصف الدولہ کا ہے"۔

{بدایوں کے اہل تشیع صفحہ ۶}

اس امام باڑے کے لئے خیر پور میں ۱۲۴۱ ایکڑ اراضی وقف تھی۔ اسی زمانے میں بدایوں کے مشہور شاعر ظہور اللہ خان نے بھی اثناعشری مذہب اختیار کر لیا تھا۔

نواب آصف الدولہ نے ۱۷۹۴ء میں رام پور پر چڑھائی کی اور ریاست کا ایک حصہ ضبط کر لیا اس واقعہ کی تہہ میں بھی مذہبی جذبہ کارفرما تھا۔ نواب فیض اللہ خان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند نواب محمد علی خان مسند نشین ریاست ہوئے چونکہ وہ آصف الدولہ کے دربار میں لکھنؤ میں قیام پذیر رہے تھے اس لئے نواب کی ترغیب سے انہوں نے بھی شیعہ مذہب اختیار کر لیا۔ انہوں نے اقتدار سنبھالنے کے بعد لکھنؤ کا آئین وقانون روہیل پٹھانوں پر جاری کیا۔ پٹھانوں نے غلام محمد خان کو ساتھ ملا کر محمد علی خان کو ختم کر دیا۔ اس پر آصف الدولہ سخت مشتعل ہوا اور انگریزوں کو ساتھ لے کر ان پر حملہ آور ہوا اور مقتول کے لڑکے احمد علی خان کو مسند نشین کیا۔ اسی زمانے سے رام پور میں شیعیت کا زور ہوا۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر رام پور کے تمام نواب اثناعشری ہو گئے۔ نواب سید محمد سعید خان بن نواب سید غلام محمد خان نواب سید یوسف علی خان اور نواب سید حامد علی خان یہی مذہب رکھتے تھے۔ نواب سید محمد سعید خان کے زمانے میں ایک عالی شان امام بارہ تیار ہوا۔ آصف الدولہ کے زمانے میں ہی شیعہ کی نماز جمعہ جماعت کا آغاز ہوا۔

سید غلام علی نقوی لکھتے ہیں کہ:

"اثناعشری شیعوں میں نماز جمعہ و جماعت کی بنیاد حسن رضا خان نے لکھنؤ میں رکھی ورنہ ہندوستان کے کسی دوسرے شہر میں نماز جمعہ و جماعت امامیہ مذہب میں رائج نہ تھی"۔

{عماد السعادت صفحہ ۱۳۷}

آصف الدولہ نے اپنے نائب سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خان کی وجہ سے بھی مذہب شیعہ کے فروغ میں زیادہ دلچسپی لی۔ کیونکہ حسن رضا خان اسی کی تحریک وایماء پر نجف سے سند اجتہاد لے کر آیا تھا۔ مولوی سید عبدالحیٔ لکھتے ہیں کہ:

"نواب آصف الدولہ کے زمانے کا یہ کارنامہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لہو ولعب میں مشغول ہونے کے ساتھ مذہب شیعہ کی اشاعت میں انہوں نے دل سے کوشش کی۔ ان کے نائب حسن رضا خان بھی مذہبی آدمی تھے وہ بھی اس کوشش میں لگے رہتے تھے۔ ان کی کوششوں سے ہزاروں خاندان سنی سے شیعہ ہو گئے اور ان کو جاگیریں ملیں اور جو اپنی ضد پر قائم رہے ان کی جاگیریں جو شاہانِ مغلیہ کے وقت سے چلی آتی تھیں ضبط کی گئیں۔ شاہ اکبر علی چشتی مودودی کے مشورہ اور ملا محمد علی فیض آبادی کی تحریک سے نواب حسن رضا خان نے جمعہ و جماعت قائم کر کے سب سے پہلے مولوی سید دلدار علی نصیر آبادی کی اقتداء میں ۱۳ رجب ۱۲۰۰ھ کو نماز ادا کی۔ یہ پہلا دن ہے کہ وسط ھند میں شیعوں نے اپنا جمعہ و جماعت علیحدہ کر لیا۔ نائب امام کی حیثیت سے مجتہدین کے ہاتھ میں زمامِ مذہب دے دی"۔

(گل رعنا صفحہ ۱۵۲، ۱۵۴ بحوالہ ہندوستان میں مسلم فرقہ واریت صفحہ ۴۶)

میر تقی میر اور سید محمد میر سوز لکھنو آئے اور دربار سے وابستہ ہو گئے۔ بالآخر آصف الدولہ ۱۷۹۷ء میں انتقال کر گیا اور وہ اپنے تعمیر کردہ امام باڑے میں دفن ہوا۔ اس کا ایک دیوان یادگار ہے جس میں غزلیں، رباعیاں، مخمس اور ایک مثنوی شامل ہے

نواب سعادت علی خان

آصف الدولہ کے انتقال کے بعد اس کا متبنیٰ وزیر علی خان تخت نشین ہوا۔ جسے بعد میں سر جان شور کی مداخلت سے معزول کر کے اس کی جگہ متوفی کے بھائی سعادت علی خان کو ۱۷۹۸ء میں تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اس نے یہ نیت کی تھی کہ اگر آصف الدولہ کے بعد مجھے اقتدار مل گیا تو میں علمِ جناب عباس کی درگاہ کو رونق دوں گا۔ چنانچہ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے درگاہ کے گنبد کو مطلا کیا اور درگاہ کو مزید وسعت دی۔ اس میں دو درجے زنانے اور مردانے قائم کئے جس سے درگاہ کی رونق بہت بڑھ گئی۔ اس کے بعد غازی الدین حیدر نے بلند نقار خانہ بنوایا۔ نوبت اور گھڑیال رکھے گئے۔ اندرون درگاہ دروازہ اور منبر چاندی کے بنائے گئے اور آرائش کا سامان رکھا گیا۔ نواب سعادت علی خان سولہ برس حکومت کرنے کے بعد ۱۸۱۴ء میں رحلت کر گیا۔

نواب غازی الدین حیدر شاہ

سعادت علی خان کے انتقال کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا غازی الدین حیدر ۱۸۱۴ء میں تخت نشین ہوا۔ یہ پہلا حکمران تھا جس نے شاہ اودھ کا لقب اختیار کیا۔ اس کے متعلق شیعہ عالم و مورخ علامہ محمد حسین مظفر لکھتے ہیں کہ:

"او مردی متصلب ور دین وسخت پای بند تشیع بودہ است؟ (تاریخ شیعہ ص ۳۳۵)

یعنی وہ دین شیعہ میں انتہائی غالی اور شیعی رسوم کا سخت پابند تھا۔

غازی الدین حیدر شاہ اپنے آباء و اجداد کی طرح انتہائی غالی اور متعصب شیعہ تھا۔ اس کے دور میں چند بدعات کا مزید اضافہ ہوا۔ اس کی بیوی بادشاہ بیگم نے ہندوؤں کی پیروی میں اپنے امام مہدی کی "چھٹی" کی رسم شروع کی۔ مولوی محمد نجم الغنی خان رام پوری لکھتے ہیں کہ:

"بادشاہ بیگم زوجہ غازی الدین حیدر والی اودھ نے اپنی طبیعت سے ایک چھٹی صاحب الزمان کے واسطے ایجاد کی۔ چھٹی یہ ہے کہ عورت زچہ جننے کے چھ دن بعد مع بچہ غسل کرتی ہے اور عمدہ لباس پہن کر جلسہ کرتی ہے۔ بادشاہ بیگم اس رسم کو اس امام عالی مقام کی طرف منسوب کر کے ہر سال ماہ شعبان (۱۵ شعبان امام غائب کی تاریخ ولادت ہے) میں ادا کرتیں اور بہت سا روپیہ خرچ کرتی تھیں اور اشرافوں کی دوشیزائیں اور خوبصورت لڑکیاں روپیہ خرچ کر کے یا کسی دوسری تدبیر سے بہم پہنچا کر ائمہ اثنا عشریہ کی ان کو ازواج بناتیں اور ان ائمہ کی ازواج کا نام ان کو دیتی نام ان لڑکیوں کے رکھتیں اور ان لڑکیوں کا لقب اچھوتی مقرر کیا تھا۔ اچھوتی اس چیز کو کہتے ہیں جو چھونے کے قابل نہ ہوتا کہ آلودہ و نجس نہ ہو جائے۔ مگر حضرت فاطمہؓ کی پاسداری کی وجہ سے حضرت علیؓ کے لئے عورت تجویز نہیں کرتی تھیں۔ اگر ان میں سے کوئی جوان ہو جاتی اور دل اس کا مناکحت کو چاہتا تو مانع آتیں اور کہتیں کہ بعد زوجیت ائمہ اطہار کے دوسرے کے ساتھ تزویج اور عقد کرنا اور اس سے ہم بستر ہونا ملت پاس و ادب اور رعایت قانون اسلام میں حرام ہے"۔

(مذاہب اہل اسلام صفحہ ۲۸۶)

ایک دن ایک اچھوتی نے رات کو رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ بادشاہ بیگم کے استفسار پر اس نے بتایا کہ مجھے امام نے طلاق دے دی ہے۔ اس پر بیگم نے اسے مع اسباب والدین کے گھر بھیج دیا۔

اودھ چونکہ ایک شیعہ ریاست تھی اس لئے اس ریاست کے زمانہ قیام سے اختتام تک تشیع میں بڑا غلو رہا۔ اس کا ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ میر حیدر بخش نائب آفرین علی خان نے صحابہؓ کے نام لکھ کر فرش کے نیچے بچھوائے تھے۔ تاکہ پامال ہوں۔ لکھنؤ کی کربلائے تال کٹورہ میں اب تک یہ بات موجود ہے (حوالہ مذکورہ صفحہ ۳۸۴)

بادشاہ بیگم زوجہ غازی الدین حیدر نے اپنے محل میں ہر امام کے نام کا الگ الگ مقبرہ تیار کرا رکھا تھا۔

حضرت عباس کا مقبرہ الگ تیار کیا گیا تھا۔ اماموں کی فرضی بیویوں کو زچگی کے تمام دور سے گذارا جاتا اور سونے کی گڑیا بنا کر بچے کی شکل دی جاتی۔ بادشاہ بیگم نے غازی الدین حیدر کے زمانے میں مذہب شیعہ کی نشر و اشاعت میں اپنے خاوند سے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بالآخر ۱۸۲۷ء میں غازی الدین حیدر کا انتقال ہو گیا

نواب نصیر الدین حیدر شاہ

غازی الدین حیدر شاہ کے بعد اس کا بیٹا نصیر الدین حیدر شاہ ۱۸۲۷ء میں مسند نشین ہوا۔ شیعہ مورخ علامہ محمد حسین مظفر اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"وی شدیداً یای بند اہل البیت علیہم السلام و حامی و مدافع شیعہ بودہ است و در نشر و ترویج تشیع کوششہائے عظیمی مبذول می داشت و مراکز خیریہ بنیاد کرد و مبالغ ہنگفتی در عزاء سید الشہداء علیہ السلام صرف کرد و شبیہ ضریح آنحضرت را در ہند نمود"۔ (تاریخ شیعہ صفحہ ۳۳۵)

نصیر الدین حیدر مذہب اہل بیت کا سخت پابند تھا۔ اور شیعوں کا زبردست حامی اور ان کا دفاع کرنے والا تھا۔ اس نے مذہب شیعہ کے فروغ اور اس کی ترویج میں سخت کوشش کی۔ اس نے شیعہ مراکز، مدارس اور امام باڑے بنائے۔ اس نے ہندوستان میں سید الشہداء امام حسینؓ کی مجالس عزا میں بہت تگ و دو کی اور ان کے مزار کی شبیہ عام کی۔

چھٹی اور اچھوتی کی رسم میں بھی اپنے باپ غازی الدین حیدر سے بڑھ کر حصہ لیا۔ اس نے بھی گیارہ اماموں کے لئے گیارہ بیویاں جمع کیں اور دیگر ائمہ حضرت قاسم اور حضرت عباس کے لئے بھی اچھوتیاں اکٹھی کیں۔ اس کی مذہبی عقیدت کا عالم یہ تھا کہ جب کسی امام کی ولادت کا دن آتا تو بادشاہ خود بتکلف حاملہ عورت بن کر زچہ خانے میں جا بیٹھتا۔ چہرے اور

حرکات سے وضع حمل کی تکلیف ظاہر کرتا۔ پھر ایک فرضی امام جنتا اور اس کے بعد اپنے آپ کو حالت نفاس میں مبتلا کر دیتا تھا۔ بچے کی جگہ ایک مرصع گڑیا بادشاہ کے سامنے رکھ دی جاتی تھی۔ بادشاہ خود زچہ خانہ میں رہتا اور زچہ ہی کی طرح کھانا کھاتا تھا۔ چھٹے دن بادشاہ زچہ کی طرح غسل کرتا اور اس مصنوعی بچے کو گود میں لے کر لنگڑاتے ہوئے صحن میں نکلتا تا کہ آسمان کے تاروں کو دیکھے۔ گیارہ اماموں میں سے ہر امام کی زوجہ کو بچے کی طلائی مورت اور دوسرے ائمہ (عباس و قاسم) کی بیویوں کو نقرئی مورت دی جاتی تھی۔

یہ تقریبات اس قدر زیادہ تھیں کہ بادشاہ بے چارے کو ان سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی تو وہ امور سلطنت کی طرف توجہ کیوں کر دیتا؟ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ امور سلطنت کی انجام دہی حتیٰ کہ جانشینوں کی تقرری بھی انگریزوں کے ہاتھ میں تھی اس لئے بادشاہ کی تمام تر توجہ مذہب شیعہ کے فروغ پر ہی مبذول رہتی

نواب نصیر الدین حیدر شاہ دس سال حکومت کرنے کے بعد ۱۸۳۷ء میں رحلت کر گیا۔

نواب محمد علی شاہ

نصیر الدین حیدر شاہ کے بعد اس کا چچا نواب محمد علی شاہ بن نواب سعادت علی خان تخت نشین ہوا۔ اس کے دور میں اقتدار عملاً شیعہ مجتہدین کے پاس رہا۔ بقول شیعہ مورخ علامہ محمد حسین مظفر:

> او مردی پارسا و باتقویٰ بود و زمام حکومت را بدست مجتہد زماں خود سلطان العلماء سید محمد ابن علامہ دلدار علی "غفران مآب" سپرد۔ ایں دانشمند از مجددین مذہب جعفری ھند در رأس سدۂ سیزدہ ہجری بہ شمار می رود"
>
> (تاریخ شیعہ صفحہ ۳۲۵)

یہ ایک نیک اور متقی شخص تھا۔ اور زمام حکومت سلطان العلماء اور مجتہد زماں سید محمد ابن علامہ دلدار علی غفران مآب کے سپرد کر دی۔ یہ دانش مند ہندوستان میں تیرھویں صدی کے آغاز پر مذہب شیعہ کے مجددین میں شمار ہوتا ہے۔

علامہ دلدار علی کو بعد از موت ملت جعفریہ کی طرف سے "غفران مآب" کا لقب عطا کیا گیا۔ یہ ملحوظ ہے کہ مولوی دلدار علی آبائی طور پر سنی تھے۔ اور مرزا حسن رضا نائب آصف الدولہ کی تحریک پر نجف سے سند اجتہاد لے کر آئے تھے

نواب محمد علی شاہ نے شیعہ مدارس اور امام باڑوں پر خاص توجہ دی۔ ان کے لئے باقاعدہ جاگیریں وقف کیں۔ ان موقوفات کا نام "حسین آباد مبارک" رکھا گیا۔ "الجامعۃ السلطانیۃ" کے نام سے ایک یونیورسٹی اس کے عہد کی یادگار ہے۔ نواب محمد علی شاہ کی اہلیہ ملکہ جہاں (م ۱۲۹۸ھ) جب "مشہد علیؑ" اور "مشہد حسینؑ" کی زیارت کو گئیں تو اپنے مرحوم شوہر کا تاج اور شمشیر مرصع روضہ حضرت علیؑ کی نذر کر کے لاکھوں روپے اہل کربلا و نجف پر خرچ کر کے واپس آئیں اور بہت بڑی املاک وقف کی۔ (بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۱۴۶ جلد ۱۷)

نواب محمد علی شاہ ۱۸۴۲ء میں انتقال کر گیا

نواب امجد علی شاہ

نواب محمد علی شاہ کے بعد اس کا بیٹا امجد علی شاہ ۱۸۴۲ء میں تخت نشین ہوا۔ یہ اپنے پیش رو نوابان اودھ کے طریقے پر نہایت سختی سے کار بند رہا۔ یہ مذہب اثنا عشریہ میں نہایت غلو رکھتا تھا۔ اس کے عہد میں مذہب شیعہ نے خوب رونق اور ترقی پائی۔ یعنی تبرا متعہ، تعزیہ، مرثیہ گوئی، فحاشی، بے حیائی اور جنسی آوارگی میں پہلے کی نسبت خوب ترقی ہوئی۔

نواب امجد علی شاہ نے ۱۸۴۷ء میں وفات پائی۔ اس کے زمانہ میں شیعیت کے فروغ کی وجہ سے اہل سنت والجماعت کا شمار ہنود میں ہوتا تھا۔ اس کا ہر کام مجتہد العصر سید حسن بن سید دلدار علی شاہ کے مشورہ سے ہوتا تھا۔ اور خود مجتہد صاحب کا حال یہ تھا کہ وہ سنیوں کے عروج کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اسی کے مشورہ سے سنیوں کو دیئے گئے وظائف اور جاگیریں ضبط کر کے شیعوں کی طرف منتقل کر دی گئیں۔ انہیں کے مشورے سے پوری حکومت میں اعلان کر دیا گیا کہ کسی بھی سرکاری دفتر میں کوئی ہندو یا سنی مسلمان اسماء مبارکہ خالق کائنات، پنجتن پاک و ائمہ اطہار اپنے ہاتھ سے نہیں لکھ سکتا۔ اس کام کے لئے ہر دفتر میں شیعوں کی تقرری کی گئی۔ اگر کوئی ہندو یا سنی سرکاری کاغذ مرتب کر رہا ہے اس میں یہ نام جتنی بار آئے وہ ہر بار کسی شیعہ سے اس نام کو لکھوا کر آگے کی تحریر لکھتا تھا۔ اس جبر و تشدد کی وجہ سے جو سرکاری ملازم، ہندو یا سنی تھے وہ سب کے سب شیعہ ہو گئے۔

یہ قانون کچھ عرصہ تک جاری رہا کہ اتفاقاً ایک واقعہ کی وجہ سے اسے منسوخ کر دیا گیا۔ مولوی نجم الغنی رام پوری لکھتے ہیں کہ:

"اتفاقاً ایک دن آدھی رات کے وقت پرچا اخبار سے خبر آئی کہ راجہ بردت سنگھ تعلق دار بونڈی متعید نظامت بہرائچ فرار ہو گیا۔ امجد علی شاہ ... قرب بود و باش راجہ بال کرشن بہادر کو طلب کیا اور شقہ لکھنے کا حکم دیا۔ مہاراجہ مذکور تعمیل ارشاد میں معروف ہوئے اور کئی بار اسماء خدا و رسول ﷺ حسب عرض مہاراجہ صاحب بہادر امجد علی شاہ نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیے۔ جب ہر شقہ میں یہی نوبت آئی تو اسی وقت اس حکم سابق کو منسوخ فرمایا۔ اور ہر کچہری اور دفتر میں علی الصباح احکام روانہ ہوئے اور مومنین نو بہرتی کا رزق جاتا رہا۔" {تاریخ اودھ جلد پنجم صفحہ ۲۴}

نواب واجد علی شاہ

امجد علی شاہ کے بعد اس کا لڑکا واجد علی شاہ ۱۸۴۷ء میں تخت نشین ہوا۔ یہ نوابان اودھ کے سلسلے کا آخری حکمران تھا۔ یہ رنگیلا مزاج اور بدکردار ہونے کے باوجود شیعیت پر سختی سے کاربند رہا۔ لڑکیوں کی محبت کے علاوہ شیعہ علماء و مجتہدین کی عقیدت و محبت میں بھی گرفتار رہا۔ شعر و شاعری اسے ورثے میں ملی ہوئی تھی۔ اس نے مذہب شیعہ کی خوب نشر و اشاعت اور ترویج کی۔ بہت سے اہل سنت کو ترغیب و تحریص کے ذریعے سلطان العلماء۔ مولوی سید محمد مجتہد وقت کی خدمت میں بھیج دیا جہاں انہوں نے مذہب شیعہ اختیار کر لیا۔ مجتہد العصر سید محمد کا وہی مرتبہ تھا جو بعض سنی ممالک میں "شیخ الاسلام" کا ہوتا ہے۔ شاہان اودھ کی رسم تاج پوشی کے وقت "سلطان العلماء" ہی ان کے سر پر تاج رکھتا ہے۔ مملکت کے تمام شرعی اور مذہبی امور اسی کی رائے سے طے پاتے تھے۔ بادشاہ بھی اس کی رائے کا بڑا پاس کرتے تھے۔ سلطان العلماء اپنا تمام اثر و رسوخ شیعہ ضرورت مندوں کی حاجت پوری کرنے اور مذہب شیعہ کی اشاعت و ترویج کے لئے استعمال کرتا تھا۔

غالب کے فارسی خطوط پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اسے شاہان اودھ سے عطیہ اس وقت وصول ہوا۔ جب اس نے سلطان العلماء کو اپنا واسطہ و ذریعہ بنایا۔ پھر جب سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ نے غالب سے ایک فارسی مثنوی لکھ کر اپنی شیعیت کی تردید کروائی تو غالب کو مجتہد العصر سلطان العلماء سید محمد کے سامنے جواب دہ ہونا پڑا۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے متعلق یہ مشہور ہو گیا تھا کہ اس نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا ہے۔ سنی علماء و اکابر کے مواخذہ کرنے پر اس نے مرزا غالب سے فارسی مثنوی لکھا کر عوام و خواص کو اپنے سنی ہونے کا یقین

دلایا۔ یعنی ایک شیعہ کے ذریعے اس نے اپنے "سنی" ہونے کا اعلان کیا۔ بہادر شاہ کے سنی ہونے کے متعلق مثنوی لکھنے پر شیعہ مجتہد نے باضابطہ طور پر مرزا غالب سے جواب طلب کیا۔

مجتہد العصر کے خاندان کے ساتھ مرزا غالب کے خاص مراسم تھے۔ جب سلطان العلماء کے بھائی "سید العلماء سید حسین" نے وفات پائی تو غالب نے ایک بڑا پر درد مرثیہ لکھا

گشت داغِ غم حسین علی　　　　تازہ در ماتم حسین علی

مرزا غالب (جو رئیس امروہی کی طرح پکا رافضی تھا) اپنے دوست اور شاگرد حاتم علی بیگ مہر کو لکھتا ہے کہ

"صاحب بندہ اثنا عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمے پر ۱۲ کا ہندسہ کندہ کرتا ہوں۔ خدا کرے میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو۔ ۱۲ منہ" (خطوط غالب صفحہ ۲۲۲)

"۱۲ منہ" کی علامت اکثر دینی کتابوں، فقہ، حدیث اور تفسیر کے حاشیہ جات کے اختتام پر لکھی ہوئی ہوتی ہے۔ جو شیعی اثر کا نتیجہ ہے۔ اکثر علماء تو اس راز سے بے خبر ہیں لیکن بعض متاثر علماء یہ جواب دیتے ہیں کہ "سلف سے عبارت کے ختم ہونے کی علامت چلی آتی ہے" اور اس سے مراد "خاتمہ کلام" ہے۔ منہ سے مراد یہ ہے کہ سابق عبارت جس شخص کی تحریر ہے یہ حصہ جس کے بعد "۱۲ منہ" لکھا ہوا ہے یہ بھی اسی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا خاتمہ کلام کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی علامت مقرر نہیں کی جا سکتی؟ مرزا غالب نے تو ۱۲ منہ کی حقیقت واضح کر دی ہے مگر اس کے باوجود علماء اہلسنت اس راز سے آگاہ نہیں ہو سکے اور مسلسل اپنی کتب میں اہل تشیع کی پیروی کرتے ہوئے یہ علامت استعمال کر رہے ہیں۔ فیا اسفا!

"۱۲ منہ غفرلہ" یعنی اثنا عشر منہ غفرلہ۔ کہ لکھنے والا بارہ امامی شیعہ ہے۔ اللہ اس کی مغفرت کرے اس کی دوسری توجیہہ یہ ہے کہ ۱۲ کا مطلب ہے اثنا عشر جو رافضیوں کے امام ہیں اور منہ کا مطلب ہے یہ من جانب اللہ تھے۔

بہر حال اسد اللہ خان غالب اثنا عشری شیعہ تھا۔ شیعہ مجتہد العصر کی سفارش پر شاہان اودھ کی طرف سے اس کا وظیفہ وعطیہ جاری ہوا۔ اس خاندان کے ساتھ اس کے گہرے مراسم تھے۔ بعض ادیب اسے سنی قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا جواب شیعہ مولوی پروفیسر خواجہ محمد لطیف انصاری اس طرح دیتے ہیں کہ:

"اردو زبان کے عہد ساز شاعر جناب اسد اللہ خان غالب کو اہلسنت والجماعت بنانے کی بعض ادیبوں نے سعی ناکام کی ہے۔ حالانکہ ان کا حیدری شیعہ ہونا اظہر من الشمس ہے۔ غالب کا شعر ہے۔

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست مشغول حق ہوں بندگی بوتراب میں

یعنی بندگی بوتراب ہی دراصل حق کی بندگی ہے معلوم نہیں کہ الطاف حسین حالی نے کیوں ان کو مسلمان اور موحد ثابت کرنے کی کوشش کی تھی جبکہ غالب خود اپنے امامی شیعہ ہونے کا اعلان کرتے رہے۔

(مجالس المومنین صفحہ ۱۴۷)

یہاں غالب کا ذکر اس لئے آ گیا کہ ان کا تعلق واجد علی شاہ کے عہد کے "سلطان العلماء" شیعہ مجتہد العصر سید محمد صاحب کے ساتھ تھا جن کی توجہ سے اس پر عنایات کا سلسلہ جاری ہوا۔

جب واجد علی شاہ عیش و عشرت میں مبتلا ہوا تو مجتہد صاحب اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے لیکن واجد علی شاہ نے اصرار کیا کہ یا تو خود یہ فرائض بجا لائیں یا اپنے خاندان میں سے کسی دوسرے کو نامزد کریں۔ اور فرقہ امامیہ کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی۔ جس پر مجتہد صاحب نے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا۔

واجد علی شاہ صاحب تصنیف و تالیف نواب تھا اس کی ایک تالیف "مجموعہ واجدیہ" ہے اس میں "اسمائی ملعونان و ملعونات کہ تا قیامت بر آنہا لعنت باید کرد" کا عنوان قائم کیا گیا ہے اس میں تین صفحے صحابہ کرامؓ کے اسماء سے بھر دیئے ہیں جن میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عائشہؓ اور دیگر حضرات شامل ہیں۔

دوسری طرف سیاسی صورت حال یہ تھی کہ انگریز پورے ہندوستان پر قابض ہو چکا تھا۔ نوابان اودھ جو ہمیشہ برطانوی حکو[مت] کے وفادار رہے اور اسی کی امداد و تعاون سے انہ[وں] نے اپنا اقتدار قائم رکھا۔ بے وفائی، بدعہدی، سازش اور غداری کا جذبہ انگریز اور شیعہ دونوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

لارڈ ولزلی کے زمانے سے لکھنو کے دربار میں انگریزوں کا اثر رفتہ رفتہ بڑھتا رہا۔ وہ مسئلہ مسند نشینی میں مداخلت کرتے رہے اور دربار کی حکمت عملی بھی ان کی مرضی کے مطابق چلتی رہی تھی کہ لارڈ ڈلہوزی نے حکومت پر نظم و نسق کی خرابی کا الزام عائد کر کے نواب واجد علی شاہ کو

بھرے دربار میں معزولی کا حکم سنایا اور ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو اودھ کو برطانوی سلطنت میں شامل کرنے کا اعلان کر دیا۔ جس کے ساتھ ہی اودھ کی شیعہ سلطنت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

یہ صرف قیادت کی تبدیلی تھی (یعنی نوابوں کی بجائے انگریزوں کی قیادت) جہاں تک شیعہ اور مذہب شیعہ کا تعلق تھا اس پر اس تبدیلی کی وجہ سے مطلقاً کوئی اثر نہ پڑا اور اہل تشیع برابر اپنے مذہب کی نشر و اشاعت میں مصروف رہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی جاری رکھی اور اس سلسلے میں قتل، قید و بند اور جلاوطنی تک کی سزائیں برداشت کیں لیکن شیعہ کے کسی نواب، عالم یا لیڈر کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ کیونکہ انہوں نے اپنی پالیسی تبدیل کر کے اب برطانوی حکومت کو اپنے لئے سایہ رحمت سمجھ لیا اور مذہبی آزادی کی آڑ میں دیگر مراعات کے علاوہ اپنے جلوسوں کے لئے باقاعدہ لائسنس اور اجازت نامے حاصل کر لئے۔ یہ تعزیے ذوالجناح اور دلدل وغیرہ کے جلوس برطانوی دور کی پیداوار ہیں۔

مفتی جعفر حسین حکومت اودھ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"بارہویں صدی ہجری میں سلطنت اودھ کی بنیاد قائم ہوئی۔ اودھ کے فرمانروا شیعہ تھے جن کے دور میں مسجدیں اور عزا خانے تعمیر ہوئے۔ شیعہ کتب کی اشاعت کے لئے مطبع سلطانی قائم ہوا اور مدارس دینیہ کی تاسیس عمل میں آئی۔ علمائے شیعہ میں سے سید دلدار علی غفران مآب اور ان کے اخلاف و تلامذہ نے اصلاح رسوم، ترویج علم اور تبلیغ مذہب کے سلسلے میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۹۰۰ جلد ۱۱)

واجد علی شاہ کے دور حکومت میں صحابہ کرامؓ پر سب و شتم اور تبرا کا قانونی طور پر شیعوں کو حق حاصل تھا۔ اور دارالسلطنت لکھنو میں باقاعدہ تبرا کرتے ہوئے جلوس گشت کرتا تھا۔

مجتہد العصر اہل تشیع کو یہ قانونی حق ملنے پر واجد علی شاہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"آپ نے اپنے عہد مبارک میں اجراء تبرا پر خصوصی توجہ فرمائی ہے اور مراسم تعزیہ داری بہ اطمینان و شان و شوکت سے ادا کی جانے لگیں جس کی وجہ سے تمام سادات اور مومنین ترقی درجات اور ازدیاد جاہ و سلطنت و عمر و دولت میں مصروف دعا ہیں۔ خداوند کریم حضور والا جیسے

شاہ دین پناہ مروج دین مبین، شیعانِ آلِ طٰہٰ و یٰسین کی عمر دراز فرمائے کہ حضور کے حکم اور حکومت کی اعانت سے پوری قوت کے ساتھ تبرا کا ہم کو اختیار حاصل ہوا"۔ (تاریخ اودھ صفحہ ۱۶۵ جلد ۵)

اس کے بعد اس معروضہ میں تبرا کے ایک جلوس کا تذکرہ کیا گیا ہے جو شیعوں نے سنی محلوں میں نکالا اور جب برملا صحابہ کرام پر سب و شتم کی گئی تو سنیوں کی طرف سے مزاحمت ہوئی اور مار پیٹ کی نوبت آئی۔ چنانچہ مجتہد العصر نے اس واقعہ کی تفصیل لکھ کر واجد علی شاہ سے سنیوں کو گرفتار کرنے اور سزا دینے کی درخواست کی ہے اور درخواست کے آخر میں یہ لکھا ہے کہ:

"حضور والا جیسے عظیم المرتبت بادشاہ جو ترویج دین مبین اور اجراءِ تبرا و عزاداری از شرق تا غرب مشہو ہیں۔ شیعوں کی بے حرمتی کیوں کر گوارا فرمائی۔ ہمیں یقین ہے کہ اس طرح کے واقعات کا اس طرح سد باب فرمایا جائے گا کہ آئندہ مراسم عزاداری اور تبرا یوماً فیوماً ترقی پذیر رہے"۔

(حوالہ مذکور صفحہ ۱۶۶ جلد ۵)

واجد علی شاہ کے عہد میں مجتہد العصر کا ایک فتویٰ شائع ہوا جس میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ "اس زمانہ میں برملا تبرا کہنا اذان اور گاؤ کشی کی طرح ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ تبرا شعار ایمان میں سے ہے اور اذان و گاؤ کشی شعائر اسلام میں سے ہیں۔ اگر تشیع تبرا کے ترک سے ختم نہیں ہو جاتا تو اذان اور گاؤ کشی کے بند ہونے سے اسلام بھی ختم نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ اسلامی شہروں میں بشرط قدرت شعائر اسلام کا اعلان ضروری ہے۔ اسی طرح ایمانی شہروں میں ایمانی شعائر کا اعلان ضروری ہے اور جب قدرت نہ ہو تو دونوں امور ترک کیے جائیں گے۔ تقیہ تو دار التقیہ میں ہوتا ہے۔ شیعہ حکومت میں نہیں۔ جیسا کہ مشرکین کی عملداری میں شعائر اسلام کے اعلان کا حکم نہیں ہے۔ اسی طرح غیر شیعہ کا تسلط و غلبہ ہو تو تبرا جو شعائر ایمان ہے۔ اس کا اعلان نہیں کیا جائے گا۔ فساد کے ڈر سے تبرا ترک نہیں ہوگا۔ فساد کی ذمہ داری حکام انتظامیہ پر ہے شعائر ایمان کے ترک کرنے پر موقوف نہیں ہے"۔

(تاریخ اودھ صفحہ ۱۶۷ جلد ۵ مؤلفہ مولوی نجم الغنی رام پوری)

قضیۂ بابری مسجد

مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان "بابری مسجد" کا تنازعہ بھی شیعوں اور انگریزوں کا پیدا کردہ ہے۔ بیکو نکر ممکن ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کسی سازش میں یہودی اور شیعہ

شریک رہے ہوں؟ آیئے بابری مسجد کے تنازعے میں "شیعہ سازش" تلاش کرتے ہیں:

ہے عمارت جس میں یقیناً کسی کا ہاتھ چھوں پہ انگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں میں

برصغیر میں سلطنت مغلیہ کے بانی ظہیر الدین بابر کے دورِ حکومت میں اجودھیا کی فتح کے بعد سید میر باقی اصفہانی حاکم اودھ نے ۱۵۲۸ء میں فیض آباد سے پانچ کلومیٹر دور یہ مسجد تعمیر کرائی جو بابر بادشاہ کے نام سے منسوب ہو کر "بابری مسجد" کہلائی۔ مسجد میں نصب کتبوں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ جبکہ ہندوؤں کا موقف یہ ہے کہ بابر نے اس مقام پر ہندوؤں کے مندر کو گرا کر مسجد تعمیر کی تھی۔ تمام مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے اور خود بابر کی سوانح حیات "تزک بابری" کے صفحات بھی اس کی شہادت دے رہے ہیں کہ بابر کبھی اجودھیا نہیں گیا اور نہ ہی اس نے کبھی کسی کی عبادت گاہ کو نقصان پہنچایا۔ بلکہ ہندوستان کے صدر رام چندر پرشاد، پروفیسر سری رام چندر شرما مصنف "مغل ایمپائر ان انڈیا" اور مشہور مصنف رام پرشاد کھوسہ اور پنڈت لال جواہر نہرو نے بابر کی رواداری کی تعریف کی ہے۔ اس کے برعکس یہ سیاہ تاریخ ہندوؤں کی ہے کہ انہوں نے موقع ملنے پر ہمیشہ مساجد مسمار کیں۔

بابری مسجد کی تعمیر (۱۵۲۸ء) سے لے کر واجد علی شاہ کے دور تک ہندوؤں کی طرف سے کوئی تنازعہ سامنے نہیں آیا۔ سب سے پہلے انگریزوں نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی کے تحت یہ شوشہ چھوڑا تھا اور ایک نجومی کے ذریعے اعلان کر دیا تھا۔ کہ رام جی کے جائے ولادت اور سیتا دیوی کا باورچی خانہ مسجد کے احاطے میں ہے اور ہندوؤں کو اشتعال دیا کہ اسے حاصل کرو۔ اس طرح بابری مسجد کی تعمیر کے تین سو ستائیس (۳۲۷) سال بعد ۱۸۵۵ء میں پہلی مرتبہ یہ اختلاف سامنے آیا جس سے سخت بے چینی اور بدامنی پھیل گئی۔

بعد میں ایک انگریز خاتون مسز بیورج نے "تزک بابری" کے انگریزی ترجمے کے حاشیہ پر یہ بات تحریر کر دی کہ (معاذ اللہ) محمد ﷺ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو مسمار کیا کرتے تھے۔ اور بابر نے بھی اپنے نبی کی اتباع میں "رام چندر بھومی" کو مسمار کر کے بابری مسجد کی بنیاد ڈالی تھی"۔

چونکہ اودھ کے متاخر نوابوں کے دور میں انگریز ہی اصل اختیارات کے مالک تھے اس لئے انہوں نے شیعہ وزیر علی نقی خان کے ذریعے نواب واجد علی شاہ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ

بابری مسجد کے احاطے میں رام جنم استھان کے لئے کچھ جگہ ہندوؤں کو الاٹ کر دے۔ چنانچہ شیعہ حاکم اودھ نواب واجد علی شاہ نے اپنے شیعہ وزیر علی تقی خان کی سفارش اور انگریز کے ایماء پر یہ جگہ ہندوؤں کو عنایت کر دی اور انہوں نے وہاں ایک چبوترہ بنالیا۔ اس طرح طویل عرصہ کے بعد پہلی مرتبہ شیعوں اور انگریزوں کی سازش اور ملی بھگت سے بابری مسجد کا قضیہ پیدا ہوا۔ جس کے بعد ہندوؤں نے بابری مسجد کو مسمار کرنے اور اس کے ساتھ نواب واجد علی شاہ کی طرف سے عطا کردہ پلاٹ میں مندر کی تعمیر کے لئے کوششیں تیز کر دیں۔

چنانچہ ۱۸۸۵ء میں ایک ہندو نے سب جج کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا کہ اس احاطے میں عمارت کی تعمیر کی اجازت دی جائے لیکن جج نے دعویٰ خارج کر دیا۔

بابری مسجد میں ۱۵۲۸ء سے ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء تک بغیر کسی رکاوٹ کے پنج وقتہ نماز ادا کی جاتی رہی اور باقاعدہ "سنی وقف ایکٹ" کے تحت اس کی رجسٹریشن ہوئی۔ ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء سے یکم فروری ۱۹۸۶ء تک عدالت کے حکم سے تالا لگا رہا۔ لیکن مقدمہ عدالت میں ہونے کے باوجود ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے سازش اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت مندر کی تعمیر کا فیصلہ کرایا گیا۔ مسلمانوں کے شدید احتجاج اور عدالت کے حکم امتناعی کے باوجود متعصب ہندوؤں نے ۹ نومبر ۱۹۸۹ء کو پچیس کروڑ کی لاگت سے "رام جنم بھومی مندر" کا سنگ بنیاد پولیس کی موجودگی میں تلواریں لہراتے ہوئے اور اشتعال انگیز تقریریں کرتے ہوئے مسجد کی ملحقہ خالی زمین پر رکھا۔

پھر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بارہ بجے سے کچھ قبل لاکھوں جنونی ہندوؤں نے ہتھوڑوں، ڈنڈوں اور تلواروں سے مسلح ہو کر مسلمانوں کی سولہویں صدی کی عظیم اور تاریخی عبادت گاہ پر دھاوا بول کر اسے شہید کر دیا۔ جس پر تمام مسلمان سراپا احتجاج اور خون کے آنسو رو رہے ہیں۔

مسلمان چونکہ ہندو ذہنیت اور کردار سے آگاہ تھے اس لئے وہ اس انتہائی اقدام سے پہلے بھارتی حکومت کو ہر ذریعے سے اپنا احتجاج نوٹ کراتے رہے۔ اہل تشیع نے بھی اپنے آپ کو اس اجتماعی دائرے میں رکھنے کی خاطر اور محض سیاسی مصلحت کے تحت مجبوراً یہ آواز بلند کی کہ بابری مسجد کو شہید نہ کیا جائے۔ چنانچہ روزنامہ جنگ نے اس موقع پر ایک خبر شائع کی جس کی سرخی یہ ہے۔

"کانگریس بابری مسجد شہید کرنے نہیں دے گی۔ آل انڈیا شیعہ کنونشن میں رام یادیو

کی یقین دھانی۔

یو پی کے سابق وزیر اعلیٰ اور کانگریس کے مقتدر رہنما رام نریش یادیو نے یقین دلایا ہے کہ کانگریس بابری مسجد کو شہید کرنے کی اجازت نہیں دے گی وہ آل انڈیا شیعہ کانگریس کے ۵۱ ویں اجلاس سے خطاب کر رہے تھے۔ اودھ کے مرحوم حکمران واجد علی شاہ کے پڑپوتے اور شیعہ لیڈر پرنس انجم قدر نے اپنے صدارتی خطبہ میں راجیو گاندھی کے بہیمانہ قتل کی مذمت کی"۔

(روزنامہ جنگ راولپنڈی ۱۹۹۱ جنوری ۱۹۹۱ء)

شیعوں کی بابری مسجد کے ساتھ جو دلچسپی ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی نہیں۔ اسی آل انڈیا کنونشن کے صدر پرنس انجم قدر کے پردادا نواب واجد علی شاہ نے ہی مسجد کے ساتھ ملحقہ خالی زمین ہندوؤں کو الاٹ کی تھی۔ جس کا منطقی انجام بابری مسجد کی شہادت کی صورت میں ظاہر ہوا۔

قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَ مَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ (آل عمران آیت نمبر ۱۱۸)

ان کی عداوت تو خود ان کی زبان سے بھی ظاہر ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے سینوں میں پوشیدہ ہے وہ بہت ہی زیادہ ہے۔

ریاست بنگن پلے

نوابان اودھ کے بعد ریاست ہائے رام پور اور خیر پور کے فرمانرواؤں اور راجہ ہائے محمود آباد، سلیم پور، متو پور، پیر پور، دیورکان، حسن پور، اصغر آباد، گشن گنج، بھتو مؤ اور بلھوا نے نہ صرف مذہب شیعہ کی ترویج اور نشر و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔ بلکہ انہوں نے بڑی دریا دلی اور فیاضی سے مشہد حسینؑ کی بھی خدمت کی۔ ان کے اوقاف اور مقابر و عمارات اب تک کربلائے معلّٰی میں باقی ہیں۔ شیعہ مجتہد مفتی جعفر حسین لکھتے ہیں کہ:

"شیعی تعلیمات کے نشر اور عزاداری کے قیام میں رام پور، بنگن پلی جاورہ، مرشد آباد وغیرہ شیعہ ریاستوں اور نوابین بنگال، میران تالپور (سندھ) اور قزلباشان لاہور نے بھی نمایاں حصہ لیا"۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۹۰۹ جلد ۱۱)

رام پور، نوابان بنگال اور مرشد آباد کا ذکر پیچھے گذر چکا ہے۔ اب زیر بحث عنوان "شیعیت برصغیر میں" کا آخری حصہ "بنگن پلے" اور خیر پور ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ:

بنگن پلے ۱۹۴۸ء میں صوبہ مدراس میں ضم ہو جانے سے پہلے جنوبی ہند کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے اس ریاست کا یہ خصوصی امتیاز تھا کہ تنگا بھدار کے جنوب میں یہ واحد ریاست تھی جس کا فرمانروا مسلمان (شیعہ) تھا۔ اس کا فرمانروا اپنا سلسلہ نسب باپ کی طرف سے شاہ عباس ثانی (صفوی) کے ایک وزیر اور ماں کی طرف سے شاہ عالم گیر سے ملاتا ہے۔ خاندان کے جد اعلیٰ میر طاہر علی ترک وطن کر کے ایران سے بیجاپور آئے۔ کچھ خاندانی جھگڑے پیدا ہوئے۔ اور وہ انہیں میں مارے گئے۔ اس کے بیٹوں میں سے ایک نے بنگن پلے کے جاگیردار کی پوتی سے شادی کر لی۔ بنگن پلے مختلف وقتوں میں مختلف لوگوں کے قبضے میں آتا جاتا رہا۔ مغلیہ سلطنت کے تحت آصف جاہی حکومت قائم ہوئی پھر جاگیردار حسین علی نے شاہ میسور حیدر علی کی اطاعت قبول کر لی۔ حسین علی کی وفات کے بعد اس کی بیوہ نے نظام حیدرآباد دکن کے یہاں جا کر پناہ لی۔

بعد ازاں اس خاندان کے ایک شخص نے ۱۷۹۰ء میں سلطان ٹیپو کے فوجدار کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ سرنگاپٹم کے معاہدے کی رو سے جاگیر مذکور ۱۸۰۰ء میں برطانیہ کے زیر اقتدار آ گئی۔ ۱۸۶۷ء کو جاگیردار کو نواب کا خاندانی لقب دیا گیا اور اسی سال ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کی نقرئی جبلی کے موقع پر نواب مذکور کو "ہز ہائی نس" کے الفاظ سے خطاب کیا گیا۔ آخری فرمانروا نواب میر فضل علی خان ریاست کے مدغم ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد فوت ہو گئے اور خطاب ان کے بڑے لڑکے غلام علی خان کو مل گیا۔ {اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد پنجم ص ۲۹۹ ملخصاً}

خیر پور

خیرپور کا علاقہ اب اگرچہ پاکستان کا ایک حصہ ہے لیکن تقسیم سے پہلے یہ برصغیر کی ایک شیعہ ریاست متصور ہوتی تھی اس لئے اس کا ذکر برصغیر کے حالات کے تحت ہی کیا جا رہا ہے۔

خیرپور ریاستوں کے ادغام سے پہلے یہ خیرپور میرس کا دارالحکومت تھا۔ اس ریاست کی تاریخ کا آغاز ۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۳ء میں ہوتا ہے جب کلہوڑہ خاندان کے خاتمے کے بعد تالپور برسر اقتدار آئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ تالپور قبیلے کا مورث اعلیٰ "تالہ" (طلحہ؟) حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کی اولاد میں سے تھا۔ چودھویں صدی ہجری میں بلوچستان آیا اور تقریباً ڈیڑھ سو سال میں اس قبیلے کے افراد نے وسط سندھ میں اپنی کئی بستیاں بنا لیں۔

ان کے تین سرداروں نے کلہوڑوں کی حکومت کا تختہ الٹ کر سندھ کو آپس میں تقسیم کر لیا اور میر فتح علی خان نے حیدر آباد میں، میر ٹھارا خان نے میر پور خاص میں اور میر سہراب خان نے خیر پور میں اپنا صدر مقام قائم کر لیا۔ یہ حکمران عصری تاریخوں میں "میران سندھ" کے نام سے موسوم ہیں۔

ریاست خیر پور کی حدود ابتداء میں خیر پور کے شہر اور اس کے مضافات پر مشتمل تھیں لیکن سہراب خان نے انہیں شمال میں کاشمور، مشرق میں جیسلمیر اور مغرب میں کنڈا دا تک وسعت دی۔

۱۸۰۹ء میں میران سندھ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دریائے سندھ کے راستے اپنا مال تجارت گذارنے کی اجازت دی تھی اور انگریزوں نے وعدہ کیا تھا۔ کہ وہ سندھ میں کسی قسم کی فوجی کاروائی نہیں کریں گے۔ ۱۸۳۸ء میں انگریزوں نے اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی فوج سندھ کے راستے افغانستان بھیجی۔ "میران سندھ" نے ان کی فوجی نقل و حرکت میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی بلکہ ان کی مالی اعانت بھی کی۔ اس احسان کا بدلہ انہیں یہ ملا کہ انگریز نے زیریں سندھ پر چڑھائی کر دی اور اس کے بعض شہروں پر قبضہ کر لیا۔

حیدر آباد اور میر پور کے حکمرانوں نے اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے ہتھیار اٹھائے لیکن میر مراد علی والی خیر پور اپنے بھائی بندوں کو چھوڑ کر انگریزوں کا معاون بن گیا اور ۱۸۴۳ء میں سندھی فوج کو تہس نہس کر کے سندھ کو کمپنی کی ملکیت میں شامل کر لیا گیا۔ لیکن والی خیر پور کو انگریز کے ساتھ وفاداری اور تعاون کرنے کی وجہ سے ایک مختصر علاقے کی دیسی ریاست کا حکمران بنا دیا گیا۔

انگریزوں نے ملک گیری کے سلسلے میں شاید اس سے زیادہ مذموم اور مجرمانہ حرکت کبھی نہ کی ہو اس کا اعتراف وہ خود بھی کرتے ہیں۔ ۱۸۴۷ء میں یہ علاقہ صوبہ بمبئی سے ملحق کر دیا گیا۔

میران تالپور مذہباً غالی شیعہ تھے انہوں نے اپنے دور میں شیعی شعائر کو اجاگر کیا اور مذہب شیعہ کو فروغ دیا۔ مفتی جعفر حسین ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"شیعی تعلیمات کے نشر اور عزاداری کے قیام میں رام پور، بیگن پلے، جاورہ، مرشد آباد وغیرہ شیعہ ریاستوں اور نوابین بنگال، میران تالپور (سندھ) اور قزلباشان لاہور (پنجاب) نے بھی نمایاں حصہ لیا۔ تقسیم ہند سے پہلے جونپور، حیدر آباد، لکھنؤ وغیرہ میں شیعوں کو عروج حاصل

رہا (اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۸۷۷ جلد ۹، صفحہ ۸۸۸ جلد ۵، صفحہ ۹۰۹ جلد ۱۱)

برصغیر میں شیعیت کا اجمالی جائزہ

ریاست بنگن پلے اور خیر پور کے تعارف کے ساتھ ہی یہ بحث (شیعیت برصغیر میں) مکمل ہو گئی ہے۔ اس طویل بحث سے پوری طرح یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ شیعیت کس طرح برصغیر میں وارد ہوئی اور اس کے فروغ و ترویج میں کن کن حکمرانوں اور شخصیات نے حصہ لیا۔ البتہ یہاں شیعیت کے فروغ کے ایک اہم اور خاموش ذریعے "تصوف" پر بحث مؤخر کی جاتی ہے۔ اس کا ذکر آگے "شیعیت کشمیر میں" کے تحت آ رہا ہے۔

شیعیت اگرچہ پہلی صدی ہجری ہی میں برصغیر میں داخل ہو گئی تھی لیکن اس نے سلاطین بہمنی، عادل شاہی، قطب شاہی، نظام شاہی، مغل بادشاہوں، فرمانروایان رام پور، خیر پور، بنگن پلے، نوابان بنگال و اودھ، راجہ ہائے محمود آباد، سلیم پور، ستو پور، پیر پور، دیورکان، حسن پور، اصغر آباد، گلشن گنج، بھتو مو، بلسوا، میران تالپور (سندھ) اور قزلباشان لاہور (پنجاب) کے زیر سایہ خوب ترقی کی اور پورے برصغیر میں اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑ لیے۔ حتیٰ کہ سلطنت مغلیہ اپنے آخری دور میں شیعہ گردی اور ان کی سازشوں کی آماج گاہ بن گئی سید برادران King Maker یعنی بادشاہ گر کے طور پر ابھرے۔ شیعی وزراء اور روافض کا حکومت پر غلبہ تھا۔ نجف علی خان کا دہلی پر مکمل تسلط تھا۔ اس نے شاہ ولی اللہ دہلوی کے پہنچے اتروا کر ہاتھ بیکار کر دیئے تاکہ وہ کوئی کتاب اور مضمون نہ لکھ سکیں۔ مرزا مظہر جان جاناں کو شہید کرا دیا۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی اور شاہ رفیع الدین دہلوی کو اپنی قلمرو دہلی سے شہر بدر کروا دیا۔ (علاوہ ازیں [illegible] صفحہ ۵ جلد ۴)

یہ دونوں حضرات مع مستورات شاہدرہ تک پیدل آئے۔ شاہ رفیع الدین تو دہلی سے پیدل لکھنؤ گئے اور شاہ عبدالعزیز جون پور چلے گئے کیونکہ نجف علی خان کی طرف سے دونوں کو سوار نہ ہونے اور ساتھ نہ رہنے کا حکم تھا۔ اس واقعہ سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ اگر دہلی میں اہل حق کے ساتھ یہ سلوک تھا تو ان علاقوں میں جہاں بلاشرکت غیرے شیعہ حکمران تھے وہاں اہل حق کے ساتھ انہوں نے کیا سلوک کیا ہو گا؟

لکھنؤ کی شیعی حکومت تقریباً ایک سو تیس سال تک قائم رہی۔ اس حکومت میں رواداری کا رجحان کم اور جبر و تشدد زیادہ کار فرما رہا۔ مراسم تعزیہ داری کی اشاعت و فروغ میں

حکومت کا ہر کارندہ دل و جان سے لگا ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی سے لے کر اتر پردیش کی آخری حدود تک ہی نہیں بلکہ بہار و بنگال تک اس کے اثرات پھیلے ہوئے تھے۔ اس طرح شیعہ عقائد کے اثرات پورے برصغیر میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئے اور خود سنی مسلمان ان مراسم کو دین و مذہب سمجھ کر ادا کرنے لگے۔

ایک زمانے تک پورے ہندوستان کا یہی حال تھا۔ مراسم تعزیہ داری، عقیدت و احترام، ماتم زنی، سینہ کوبی، مرثیہ خوانی، شہادت حسینؓ کی شیعی روایات کی روشنی میں گھڑی ہوئی فرضی کہانی سے جذباتی تعلق رکھنے میں سنی شیعوں سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں تھے۔ ہر شہر میں سنی تعزیہ دار اور شیعہ تعزیہ دار الگ الگ تھے۔ حد یہ ہے کہ امام باڑوں اور تعزیوں کے چوک کے بارے میں شیعہ سنی میں کبھی کبھی جھگڑے کی نوبت آ جاتی تھی۔ عدالت میں مقدمات چلتے۔ دونوں طرف سے شہادتیں فراہم کی جاتیں کہ یہ سنیوں کا امام باڑہ ہے یا شیعوں کا امام باڑہ ہے۔ اس کی ایک تازہ مثال بنارس میں محلہ دوسی پورہ کا مقدمہ ہے جو پوری ایک صدی تک عدالتوں میں چلتا رہا اور ۱۹۸۴ء میں شیعوں کے حق میں اس کا فیصلہ ہوا لیکن سنی مسلمانوں نے امام باڑہ کے لئے جان کی بازی لگا دی اس لئے ڈگری ہونے کے باوجود پولیس امام باڑہ پر شیعوں کو قبضہ دلانے میں ناکام ہو گئی۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سنی مسلمانوں میں بھی شیعی عقائد کتنی گہرائی تک پیوست کر دیئے گئے۔ محرم کے ایام میں پورے ہندوستان میں اس دھوم دھام سے تعزیہ داری ہوتی تھی کہ شاید ایران میں بھی نہ ہوتی ہو۔ اس معاملہ میں شیعہ اور سنی مسلمانوں میں کوئی امتیاز اور فرق نہیں ہے۔ اس طرح رسم تعزیہ داری شیعوں سے گذر کر عام سنی مسلمانوں کے دلوں میں رچ بس گئی تھی۔ یہاں تک کہ تمام مسجدوں میں تعزیے رکھے جاتے تھے اور تمام سنی مسلمان خوشی خوشی مسجد کے ایک گوشے میں ان تعزیوں کے رکھنے کی جگہ بنا دیتے تھے۔ اور پورے سال تک یہیں مسجد میں تعزیے رکھے جاتے۔ محرم کے دنوں میں پھر تعزیوں کی مرصع کاری کر کے گشت کرائے جاتے اور پھر اسی مسجد میں واپس لا کر رکھ دیئے جاتے۔ گویا ہر مسلمان یہ سمجھتا تھا کہ تعزیہ مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا ایک لازمی عنصر ہے۔ اگر کوئی مسجد میں تعزیہ رکھنے پر نکیر کرے تو خود سنی مسلمان اس کے دشمن ہو جاتے تھے۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے جب شیعی اثرات کو

جانے کی مہم شروع کی تو سب سے پہلے آپ کو دیوبند میں اپنے عزیز و اقارب سے تعزیے کے مسئلہ میں بگڑ لینے کی نوبت آئی۔

دیوبند میں ایک بزرگ حاجی محمد یٰسین عرف دیوان جی تھے ان کی مسجد کانی مسجد مشہور تھی۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اسی مسجد میں نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ اس مسجد میں تعزیہ رکھا جاتا تھا اور اسی مسجد سے اٹھتا تھا تعزیہ اٹھانے والے سب کے سب سنی تھے۔ شیعہ تو اس محلہ میں ایک دو گھر شیعوں کے تھے جب اصلاح کا آغاز اسی مسجد سے ہوا دیوان جی نے اعلان کر دیا کہ اس سال مسجد سے تعزیہ نہیں اٹھایا جائے گا۔ یہ اعلان بجلی بن کر گرا شیعوں کی بات تو الگ رہی خود سنی مسلمانوں میں بڑی بے چینی پیدا ہو گئی۔ محلہ کے شیوخ بگڑ گئے اور کہا کہ ہم ختم ہو جائیں گے مگر تعزیہ ضرور اٹھے گا۔ دیوان جی نے کہا کہ اگر تعزیہ گذرا تو میری لاش پر سے گذرے گا۔ یہ یاد رہے کہ تعزیہ داری ختم کرنے والے چند افراد کے خلاف پورے قصبہ دیوبند کے تمام مسلمان ایک محاذ بنا کر کھڑے ہو گئے شیعیت کا جادو سر پر چڑھ کر بول رہا تھا۔ حضرت نانوتوی کو مسلمانوں کے اشتعال اور تعزیہ نکالنے کی ضد کو دیکھ کر یہ احساس ہوا کہ اس مشرکانہ رسم کو مٹانے کے لئے قربانی کی ضرورت ہے اور خود میدان میں آ گئے۔

آپ نے دیوبند کے بہت سے بر آوردہ لوگوں کی مجلس میں اعلان کیا کہ تعزیہ اٹھانے والے سن لیں کہ دیوان جی کی لاش کے ساتھ قاسم کی لاش پر سے بھی تعزیہ کو گذرنا ہو سکتا ہے۔ جب تک دونوں زندہ رہیں گے تعزیہ نہیں نکالا جا سکتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعزیہ داری کی حمایت کرنے والوں کے حوصلے پست ہو گئے اور پھر کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ اس مسجد سے تعزیہ اٹھانے کے لئے آئے۔ جب قصبہ کے دوسرے مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ علماء حق اس مشرکانہ رسم تعزیہ داری کے مخالف ہیں تو انہوں نے بھی اپنے اپنے محلوں کی مسجدوں سے تعزیوں کے ڈھانچے نکال کر باہر پھینک دیئے۔ اس طرح دیوبند کی تمام مسجدوں سے تعزیوں کے رکھنے اور وہاں سے اٹھانے کی رسم بد کا خاتمہ ہو گیا۔ (سوانح قاسمی صفحہ ... جلد دوم صفحہ ۱۰ ... مناظر احسن گیلانی)

مولانا اسیر ادروی لکھتے ہیں کہ:

صرف اسی ایک واقعہ سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ شیعیت کے کتنے مہلک جراثیم اسلامی معاشرے میں سرایت کئے ہوئے تھے۔ کہ تعزیہ داری جو بت پرستی اور مشرکانہ طور طریق

کا سب سے کھلا ہوا مظہر تھا اس کو روکنے کے لئے اکابر علماء حق کو سر کی بازی لگانی پڑی تھی۔ اس رسم تعزیہ داری کے پیچھے کیسے کیسے عقیدے ان کے دل و دماغ میں پیوست کر دیے گئے تھے نہیں کہا جا سکتا کہ تعزیہ اٹھا لینا۔ عشرہ محرم میں سوگ منانا، ماتم کرنا، مرثیوں کی مجلس میں شریک ہونا حضرت معاویہ اور یزید کو برا بھلا کہنا، سب و شتم کرنا۔ خلفائے راشدین کو غاصب سمجھنا، حضرت علیؓ کو وصی رسول ﷺ ماننا۔ ان کے رتبے کو تمام صحابہؓ سے بلند و بالا جاننا۔ حضرت علیؓ کا دنیا میں دوبارہ آنا اور کاروبار نبوت میں شریک ہونا۔ قرآن کا بڑا حصہ صرف ان کے پاس ہونا وغیرہ وغیرہ فاسد خیالات و عقائد جو شیعوں کے مذہب کی بنیاد ہیں ان میں سے کتنے عقیدے شیعوں نے نفسیاتی سرنگ سے اہل السنت والجماعت مسلمانوں کی مذہبی رگوں میں داخل کر دیے تھے اس کی مکمل نشان دہی نہیں کی جا سکتی۔

اگر تعزیوں کے پیچھے فاسد عقیدوں کی یہ شدت نہ ہوتی تو لکڑیوں اور بانس کی پھچیوں اور کاغذ کے ان کھلونوں کو دریا برد کر دینے میں ایک توحید پرست مسلمان کو کتنی دیر لگتی ہے لیکن دیوبند کا پورا قصبہ مشتعل ہو جاتا ہے اور محاذ بنا کر تعزیہ داری کی حمایت میں سنی مسلمان لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے پیچھے مسلمانوں کے دلوں میں شیعی عقائد کے جراثیم نہ ہوتے تو یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ (دارالعلوم دیوبند احیائے اسلام کی عظیم تحریک صفحہ ۲۲۳)

موصوف زیر عنوان "روزمرہ کی زندگی میں شیعی جراثیم" لکھتے ہیں کہ:

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ پورے اسلامی معاشرہ میں ناخواندہ عوام سے لے کر تعلیم یافتہ طبقہ تک شیعی عقائد کے جراثیم پھیلے ہوئے تھے اور اس طرح دلوں پر ان کے اثرات چھا گئے تھے کہ یہ احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہ محبت نا جنس کے غلط اور دین و شریعت اسلامیہ کی حقیقی تعلیمات و روایات کی منشاء کے خلاف ہیں۔

آج ہر شخص حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بجائے "امام حسین علیہ السلام" بلا تکلف کہتا ہے۔ لغوی معنی کے لحاظ سے اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن شیعوں کے اثر سے یہ لفظ ہماری زبانوں پر آیا ہے۔ امام کا لفظ خاص شیعوں کی ایجاد کردہ اصطلاح ہے اور ان کے بنیادی عقیدہ کا حقیقی ترجمان ہے۔

حضرت حسینؓ کے نام کے ساتھ شیعوں کے یہاں "علیہ السلام" کا اضافہ بھی ایک

معنی رکھتا ہے جبکہ لغوی اور معنوی اعتبار سے اس کا استعمال ہر مسلمان پر کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ایام عزا میں "یا حسین" کی صدا سنائی دے گی۔ اسی طرح "مولیٰ علی" اور "علی مشکل کشا" ہر خاص و عام کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ جوش و جذبے کے اظہار کے موقع پر اکھاڑے میں اترنے والے پہلوانوں کی زبان سے "یا علی" کا نعرہ لگوایا گیا جب وبائیں چلتی تھیں تو دعا و استغفار کے بجائے ان کو تلقین کی جاتی تھی کہ یہ شعر لکھ کر اپنے گھروں میں لگا دیا جائے تو گھر وباؤں سے محفوظ رہے گا۔

لی خمسة أطفي بها حرّ الوباء الحاطمه

المصطفیٰ و المرتضیٰ و ابناهما و الفاطمه

ہر سال لاکھوں کی تعداد میں ایسے کلنڈر شائع کیے جاتے رہے جن کو "پنجتن پاک" کا کلنڈر کہا جاتا ہے۔ مسلمان اس کو اسلامی کلنڈر سمجھتے ہیں اور عام و خاص کے گھروں کی زینت بنتے ہیں۔

"پنجتن پاک" فارسی لفظ ہے اور شیعوں کی خاص اصطلاح ہے اور یہ شیعیت کے عقائد کی فیکٹری میں ایران سے ڈھل کر ہندوستان آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی زبان میں اس کا بدل نہیں ہے۔ (اس اصطلاح کی مزید تفصیل راقم کی کتاب "اہل بیت رسول ﷺ کون؟" میں ملاحظہ فرمائیں)

شیعوں ہی کے اثر سے اہل سنت والجماعت مسلمانوں کے یہاں بھی شادی بیاہ اور کوئی خوشی کی تقریب ماہ محرم میں ہرگز نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ غم اور عزاداری کا مہینہ ہے اور صفر کے مہینے بھی ۲۰ تاریخ تک انہیں ممنوع ایام میں شمار کرتے ہیں۔ کیونکہ "امام حسین" کا چالیسواں اسی مہینہ میں ۲۰ صفر کو پڑتا ہے۔ اس طرح پورے ہندوستان میں سنی مسلمانوں کے یہاں ان دونوں مہینوں میں کوئی تقریب ناممکن ہے اور شیعیت کا یہ اثر آج تک کچھ نہ کچھ پایا جاتا ہے۔

یکم محرم سے دس محرم تک ہندوستان کے بڑے شہروں میں دس روزہ محرمی اجلاس بلائے جاتے ہیں۔ جن میں علمائے اہلسنت کو صرف شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے واقعہ کو بیان کرنے کے لئے کہا جاتا ہے اور واہی تباہی روایتوں کے ذریعے اس واقعہ کو اسلامی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ ثابت کیا جاتا ہے اور اس شہادت کو تمام شہید ہونے والے صحابہ کرام کی شہادتوں سے بلند و بالا مقام ثابت کیا جاتا ہے اور تمام شیعی روایتوں سے اس واقعہ کو دنیا میں اسلام کی حفاظت و بقاء

واحد ذریعہ بتایا جاتا ہے اور یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اسلام میں اگر شہادت کا ارفع ترین مقام ہے تو وہ صرف کربلا کے میدان میں ہونے والی شہادت ہے اور نعوذ اللہ پوری اسلامی تاریخ میں تمام جلیل القدر صحابہ کرامؓ کی قربانیاں، جانثاریاں اور فداکاریاں اور اس واقعہ کی عظمت کے سامنے گرد ہیں اور عظیم الشان قربانی کے مقابل میں ہیچ ہیں اور اسی قربانی وشہادت ہی کی وجہ سے دنیا میں اسلام زندہ رہا۔

اسی واقعہ کربلا کے تذکرے میں حضرت معاویہؓ کی ذات کو بھی ہدف ملامت بنانے کی جسارت کی جاتی ہے جبکہ وہ صحابی کاتب وحی اور حضور اکرم ﷺ کی بہت سی دعائیں ان کے لئے حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ یہ ساری گمراہی کی باتیں شیعوں کے اثر سے مسلمانوں میں سرایت کر گئی ہیں۔ حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ اور اہل بیت کے فضائل ومناقب کے سلسلہ میں صحیح روایتوں کے علاوہ ابتدائی دور میں روافض نے جتنی واہی تباہی روایتیں گھڑ کر عالم اسلام میں پھیلائی تھیں۔ اتفاق سے یہ رطب ویابس اور جھوٹی اور موضوع روایتیں کسی نہ کسی مجموعہ حدیث میں درج ہوگئی ہیں۔ انہیں فرضی اور جھوٹی روایتوں کا نتیجہ ہے کہ ہر شخص اپنا سلسلہ نسب اہل بیت تک پہنچانے کے خبط میں مبتلا ہے اور آج عالم یہ ہے کہ ایران، عراق، شام اور ہندوستان اور دوسرے ممالک میں صرف سیدوں کی تعداد پندرہ بیس کروڑ سے کم نہیں جو مختلف نسبتوں سے موسوم ہیں ان تمام کا سلسلہ نسب حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ پر ختم ہوتا ہے۔ اسی طرح چودہ سو سال میں دو نفر سے بیس کروڑ اولاد پیدا ہوگئی۔ یہ تاریخ عمرانیات کا انتہائی حیرت ناک واقعہ بن گیا ہے۔ یہ سب اسی شیعی اثرات کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔

اس تفصیل سے میرا مقصد یہ بتانا ہے کہ آپ اندازہ کر سکیں کہ شیعوں نے اپنے دور عروج میں اسلامی ہند کو اپنے مراسم تعزیہ داری، اپنے مشرکانہ عقائد سے کس طرح متاثر کر رکھا تھا اور اس کی کتنی گہری چھاپ اسلامی معاشرہ پر ڈال دی تھی اور اس کے اثرات کہاں تک پہنچے ہوئے تھے اور اہل سنت والجماعت مسلمانوں سے ان کے دلوں میں کتنی نفرت وعداوت بھری ہوئی تھی۔ جہاں ان کو طاقت کے استعمال کا موقع ملا انہوں نے حق پرستوں کی زبانوں پر تالے لگوائے، اہل قلم کے ہاتھ قلم کروائے، کبھی پنجے اتروائے، اہل علم مسلمانوں کو شہر بدر کرایا اور جہاں عوام کو متاثر کرنا ہوا وہاں لالچ، ترغیب تحریص اور پروپیگنڈہ سے کام لے کر اپنے لئے سینکڑوں

مشرکانہ عقیدوں کا زہر عام مسلمانوں کی رگوں میں پیوست کر دیا اور اس طرح کہ ان کو یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ میرے صالح خون میں زہر ملا دیا گیا۔ ان کو پتہ ہی نہیں کہ یہ شیعہ عقائد ہیں۔ ان کو اسلامی عقیدہ سمجھ کر اس پر مرتے اور عملی طور پر شیعوں کے تمام مراسم میں اس عقیدت و احترام سے حصہ لیتے رہے جو روافض اور شیعوں کے ساتھ خاص ہے۔

(دار العلوم دیوبند احیائے اسلام کی عظیم تحریک صفحہ ۳۰۶-۳۰۷)

واجد علی شاہ کے دور میں شیعوں کو صحابہ کرامؓ پر تبرا کا قانونی طور پر حق حاصل تھا اور اہل تشیع دار السلطنت میں باقاعدہ تبرا کرتے ہوئے جلوس نکالتے تھے۔

بعد میں اہل تشیع نے کانگری حکومت کے ذریعے اہلسنت والجماعت کے بنیادی حق "مدح صحابہؓ" پر پابندی لگوا دی۔ مسلمانوں کے سخت احتجاج کے نتیجہ میں یو۔پی کی حکومت نے تبرا اور مدح صحابہ کی شرعی حیثیت کے ثبوت کے لئے ۲۰ اپریل ۱۹۳۷ء میں ایک کمیشن مقرر کیا جس کے دو ممبر تھے ایک الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج مسٹر جسٹس السپ اور دوسرے علی گڑھ کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ایچ۔ ایس راس تھے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نے جمعیت علمائے ہند کے صدر کی حیثیت سے کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے فرمایا:

"خلفائے راشدین کی تعریف مستحب ہے لیکن اس سے روکا جائے تو فرض ہے۔ محرم کی دسویں کو اگر شہداء کربلا کا ذکر کیا جائے تو لازم ہے کہ اس کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی تعریف بھی کی جائے تاکہ مخالف فرقوں کے ساتھ مشابہت نہ ہو۔ مدح صحابہؓ جلوس اور جلسے بدعت نہیں ہیں۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی برائی کی تو حضور انور ﷺ نے حکم دیا کہ مجمع عام میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مدح سرائی میں قصیدہ پڑھا جائے"

اس کمیشن سے پہلے بھی حکومت نے کاغذی طور پر اہل سنت والجماعت کا یہ حق تسلیم کر لیا تھا مگر اس پر عمل درآمد کرنے سے روک دیا جاتا تھا۔ امام اہل سنت حضرت مولانا عبد الشکور لکھنوی نے ۱۵ نومبر ۱۹۳۸ء کو سول نافرمانی کا فیصلہ کر لیا۔ حکومت نے مولانا عبد الشکور، مولانا ظفر الملک، مولانا عبد السلام وغیرہ کو صرف جلسہ کا اعلان کرتے ہی گرفتار کر لیا اور ایک ایک سال کی سزا دے دی۔ جمعیت علمائے ہند نے اپنے دسویں سالانہ اجلاس میں حکومت کی مذمت اور تحریک کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ آخر حکومت نے ان حضرات کو رہا کر دیا۔

حضرت مدنی مدح صحابہؓ کے وجوب پر دلائل پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

"مگر شہر لکھنؤ کی اندھیر نگری میں تقریباً ۳۰/۳۲ برس سے یہ حکم نافذ ہے کہ اہل سنت و الجماعت کو اپنے پیشوایان مذہب صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ کی مدح و ثنا کی اجازت نہیں ہے۔ بار بار اس پر قید و بند اور جرمانہ و تکلیف کی نوبت آ چکی ہے۔ حکومت نے اگرچہ ۳۰ مارچ ۱۹۳۸ء کے اعلان میں یہ الفاظ شائع کر دیے تھے:

"گورنمنٹ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ پہلے تین خلفاء کی مدح پڑھنا خواہ عام مقام پر ہو۔ خواہ کسی شخصی مقام پر زیر بحث نہیں۔ یہ حق سنیوں کو بلاشک حاصل ہے"۔

مگر افسوس ہے کہ باوجودیکہ تقریباً ایک سال گذر چکا ہے۔ یہ مقالہ مثل سابق گورنمنٹوں کے مقالوں کے اور ۱۸۵۸ء کے اعلانات وکٹوریہ اور ۱۹۱۴ء کے لارڈ جارج کے وعدوں ہی کی طرح ثابت ہوئے۔ یہی نہیں ہوا کہ اس پر عمل نہیں کیا گیا بلکہ نیم پبلک مقامات چوراہوں اور مساجد وغیرہ میں بھی مدح صحابہؓ سے روکا گیا اور سنیوں کو سزائیں دی گئیں بہت زیادہ مطالبے پر ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو بمشکل خصوصی مقامات پر یا خصوصی حالات میں مدح صحابہؓ کے جلسے کی اگرچہ اجازت دی گئی مگر پبلک مقامات پر جلسہ مدح صحابہؓ کو اس نام سے ممنوع ہی قرار دیا گیا اور جلوس کی تو کسی صورت میں بھی اجازت نہیں دی گئی۔

ظاہر ہے کہ اہل سنت والجماعت کے لئے اس سے بڑھ کر تذلیل و توہین اور حق تلفی کا کیا مظاہرہ ہوسکتا ہے۔ اس سرزمین میں تمام قومیں اور تمام مذاہب تو اپنے مذہبی جلسوں اور جلوسوں سے بلا قید وقت و مکان نفع اٹھائیں اور سنیوں کو امن کے بہانہ سے روکا اور گرفتار کیا جائے۔ بوالعجبی یہ ہے کہ صاحب حق کو امن و امان کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے اور غیر صاحب حق، معتدی، حق چھیننے اور غصب کرنے والا امن توڑنے کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جاتا۔ صاحب مال کی سرزنش کی جائے اور ڈاکو اور چور کی ہمت افزائی کی جائے۔ کیا اس کی مثال بجز برطانوی حکومت کے کہیں دنیا میں پائی جاتی ہے؟

بہرحال اب تمام اہل سنت والجماعت کو لازم ہے کہ اپنے اس مذہبی، انسانی، اخلاقی، شہری حق حاصل کرنے کے لئے پورے تیقظ کو کام میں لائیں اور مردانہ وار ہر قسم کی جاں سپاری کو میدان عمل میں پیش کر دیں۔ اسی سلسلہ میں چار پانچ مرتبہ قانون شکنی اور گرفتاریوں کی نوبت بھی آ

چکی ہیں۔ مگر اصل مقصد کے اعتبار سے وہ بالکل ہی بے فائدہ ثابت ہوئیں۔ بنا بریں اس مرتبہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس میدان میں اپنی زندگی اور ثابت قدمی کا ثبوت پیش کریں اور یہ دکھلا دیں کہ مسلمان اپنے مذہبی امور میں حتی الوسع ذرہ بھر بھی مداخلت گوارا نہیں کریں گے اور نہ کر سکتے ہیں۔

آج ۳۱ مارچ ۱۹۳۹ء کو مسلمانوں کو چاہیے کہ بعد نماز جمعہ جلسہ کریں اور اس میں گورنمنٹ کے اس فعل پر کہ اس نے مسلمانوں کے مذہبی، انسانی، شہری حق مدح صحابہ میں ناجائز مداخلت کر کے ان کے صحیح جذبات کو ناقابل برداشت ٹھیس لگائی ہے۔ جس کی وجہ سے ہزاروں مسلمان پروانہ وار جیل کی کوٹھریوں میں بند ہو چکے ہیں۔ صدائے احتجاج بلند کریں اور مطالبہ کریں کہ جلد از جلد مدح صحابہؓ کے جلسوں اور جلوسوں پر سے ہر قسم کی پابندیاں اٹھالے اور جس طرح دوسری اقوام اور مذاہب کے لئے آزادی ہے کہ وہ اپنے پیشواؤں کے جلسے اور جلوس پبلک مقامات پر عمل میں لا سکتے ہیں اسی طرح سنیوں کا بھی حق تسلیم کرے اور اگر کوئی شخص یا قوم سنیوں کو اس حق پر عمل کرنے سے روکے تو اس کو قرار واقعی سزا دے اور ان مجاہدین ملت کو مبارک باد دیں۔ جنہوں نے ملت اور مذہب اور حق قومی کے لئے اپنے آرام و راحت کو تجتے ہوئے قانون شکنی اور سول نافرمانی اختیار فرمائی ہے اور اسی طرح ان کے اعزہ اور اقارب کو بھی اس کی مبارک باد پیش کریں۔ اس تاریخ کو ہر جگہ زیادہ سے زیادہ سول نافرمانی کے لئے رضا کار بھرتی کئے جائیں"۔ (مکتوبات شیخ الاسلام صفحہ ۔۔ جلد ۳ بحوالہ چراغ محمد ﷺ صفحہ ۵۵۰-۵۵۲ مؤلف قاضی زاہد الحسینی صاحب)

مولانا ظہور احمد بگوی اس وقت کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"مدح صحابہؓ کے معاملہ میں بھی ان لوگوں کی روش بے حد دل آزار اور قابل اعتراض ہے۔ مدح صحابہ کو غیر ضروری قرار دے کر تبرا بازوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ مدح صحابہؓ اور تبرا کو ایک درجہ دے کر اسے کانگریس اور لیگ کا اختلاف ظاہر کیا جاتا ہے۔ غریب سنی ۳۰ سال سے جس حق کے حصول کے لئے ہر قسم کی جدوجہد کر رہے تھے۔ اس حق سے ان کو محروم کرنے کے لئے شملہ کی بلندیوں سے سر سکندر حیات و دیگر زعماء کی طرف سے اعلان شائع ہو رہے ہیں کہا جاتا ہے کہ اسلام کے بقا کے لئے "سنی و شیعہ اتحاد" ضروری ہے اور سنی شیعہ اتحاد کے لئے مدح صحابہ اور تبرا دونوں کو ختم کر دینا چاہیے۔ گویا شیعوں کے ساتھ اتحاد کے لئے سنی یہ اقرار کریں کہ

آئندہ وہ ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کا نام کسی پبلک جگہ پر نہ لیں۔ ہم ان ملک کے لیڈران سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ "ہندو مسلم اتحاد" کے لئے اگر ہندوؤں کی طرف سے کوئی ایسی ہی شرط پیش ہو تو کیا اس کا قبول کر لینا ملک کی ترقی کے لئے مفید نہ ہوگا۔ مثلاً ہندو یہ کہیں کہ اللہ اکبر کے نعرہ سے ہماری دل آزاری ہوتی ہے۔ مرزائی کہیں کہ آنحضرت کی ختم نبوت کا اعلان ہمیں پسند نہیں۔ یہودی کہیں کہ مسیح کو علیہ السلام اور پیغمبر کہنے سے ہمارا دل آزردہ ہوتا ہے۔ عیسائی اپنا یہ مطالبہ پیش کر دیں کہ توحید کی عام تبلیغ سے ہمارے دلوں کو ٹھیس لگتی ہے تو کیا فرماتے ہیں مفتیان لیگ و ہادیانِ شرع سیاست دریں مسئلہ کہ اللہ اکبر کہنا یا آنحضرت ﷺ کی ختم نبوت، مسیح علیہ السلام کی رسالت اور توحید کی تبلیغ کرنا جائز ہوگا یا نہیں۔ غالباً ان لوگوں کا جواب ایسی صورت میں یہی ہوگا کہ یہ امور جائز نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کے لیڈر سر سکندر حیات صاحب کی "اسلامی حکومت" نے قادیان کے علاقہ میں اسلامی جلسوں پر دفعہ نمبر ۱۴۴ نافذ کر کے اپنی سیاست دانی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ شیعہ تبرا بازی کریں۔ مرزائی اسلامی شجر پر کلہاڑا چلائیں اور خاکسار اس شجر کو بیخ و بن سے اکھاڑنا چاہیں آریہ سماجیوں کے غول حیدرآباد پر چڑھائی کریں تو ان پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ ہو۔ ان کے خلاف ملامت و نفرت کا اظہار نہ کیا جائے مگر غریب سنی اگر مدح صحابہ کریں تو مجرم، قادیان میں جلسہ کر کے وہاں کے غریب مسلمانوں کے عقائد کی حفاظت کرنا چاہیں تو قابل دار..............

غریب سنیوں کی حالت اس وقت قابل رحم ہے ان کے ووٹ پر منتخب ہو جانے والے ممبران اسمبلی ان کے مذہبی جذبہ سے بے اعتنائی برت رہے ہیں مگر تمام شیعہ لیڈر اور شیعہ ممبران اسمبلی تبرا کی حمایت اور شیعیت کی تبلیغ کے لئے سرگرم رہتے ہیں۔ مرزائیوں کا ہر بڑا لیڈر علانیہ اپنے فرقہ کی حمایت کا دم بھرتا ہے۔ مگر سنیوں میں سے جو شخص اپنے مذہب کی حمایت میں آواز بلند کرے اسے مفسد سمجھا جاتا ہے۔ شیعوں نے سنیوں کو کچلنے کے لئے لکھنؤ میں ہندو مہا سبھا سے رشتہ اتحاد استوار کیا۔ گائے کی قربانی کے حق سے دست برداری ظاہر کی اور مساجد کے سامنے ہر وقت باجہ بجانے کی اجازت عطا کر کے ان سے گالی ایجی ٹیشن میں ہمدردی و اعانت حاصل کرنے کی سعی کی۔ ملک کے تمام شیعہ لیڈروں نے متفقہ طور پر گالی ایجی ٹیشن کی تائید کی۔ مگر ہمارے نام نہاد سنی زعماء اور ارکان مسلم لیگ کو ان سے باز پرس کی توفیق حاصل نہ

ہوئی۔ کسی نے ان کے اعمال سے عبرت حاصل نہیں کی۔ جس قوم نے میر جعفر، میر صادق اور ابن علقمی جیسے غدار پیدا کیے ہوں۔ جس قوم کے غدارانہ کارناموں سے تیرہ سو سال کی تاریخ بھری ہوئی ہو ان سے دوبارہ کسی معقولیت کی توقع رکھنا بے سود ہے۔

ذیل میں ہم پنجاب کی "اسلامی" حکومت کے پانچ "شاندار" کارنامے پیش کرتے ہیں تا کہ غافل سنیوں کو معلوم ہو سکے کہ جدید دستور کی رو سے صوبہ جاتی آزادی حاصل ہونے کے بعد ہمیں کس قدر آزادی حاصل ہوئی ہے۔

دوم۔۔۔ لکھنو کی گالی ایجی ٹیشن کے لئے بھی پنجاب کے شیعوں کی سرگرمیاں زوروں پر ہیں۔ اگر پنجاب کے شیعہ اس موقع پر عقل مندی و تدبر سے کام لیتے تو اب تک گالی ایجی ٹیشن کا خاتمہ ہو گیا ہوتا مگر شیعوں نے بڑے پیمانے پر اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے مکروہ پروپیگنڈا جاری رکھا ہے۔ شیعہ جرائد میں علانیہ بزرگان اسلام کو گالیاں دی جا رہی ہیں۔ بڑے بڑے شیعہ زمیندار و روساء اپنے مزارعین کو لے کر تبرابازی کے لئے لکھنو پہنچ کر گرفتار ہو رہے ہیں۔ مگر پنجاب کی "اسلامی حکومت" نے آج تک شیعوں کی اس جتھہ بازی اور شیعہ جرائد کی مفسدانہ و امن سوز تحریروں کے انسداد کی طرف توجہ نہیں کی۔ شیعوں کی حرکات سے صوبہ کا امن و امان خطرہ میں ہے۔ کیا حکومت کا فرض نہیں کہ امن کے قیام کے لئے جلد از جلد شیعوں کی جتھہ بازی کو روکنے اور ان کے جرائد پر پابندیاں عائد کرنے کا اقدام کرے۔ اخبار احسان سے مرزائیوں کے خلاف ایک نظم شائع کرنے پر ضمانت طلب کر لی گئی تھی مگر آج شیعوں سے کسی قسم کی باز پرس نہیں ہوتی"۔

(ماہنامہ شمس الاسلام بھیرہ صفحہ ۴۹-۵۰ ستمبر ۱۹۸۶ء)

شیعیت افغانستان میں

جن علاقوں اور خطوں میں شیعہ اور مذہب شیعہ فروغ پاتے رہے ان کا مفصل ذکر اب تک کی سابقہ بحث میں آچکا ہے۔ اگرچہ ان میں سے بعض علاقوں میں آگے چل کر کئی ملک مختلف ناموں سے معرض وجود میں آئے لیکن شیعیت ان میں بدستور موجود چلی آ رہی ہے مثلاً:

سعودی عرب میں مدینہ منورہ کے محلہ نخاولہ اور قریب کی ایک بستی عوالی میں شیعوں کی بڑی تعداد موجود ہے اور قطیف اور احساء میں برابر کی آبادی ہے۔

دمشق، لبنان، بیروت اور بعلبک میں بکثرت شیعہ آباد ہیں۔ جبل عامل کے شہر

"صیدا" اور "صور" شیعوں کے علمی مرکز ہیں اور تقریباً تمام آبادی شیعہ ہے۔ یمن میں زیدیہ کے علاوہ شیعہ اثنا عشریہ بھی کثیر تعداد میں آباد ہیں اور بحرین قطر اور کویت میں شیعہ اکثریت میں ہیں۔
مسقط میں خوارج کی اکثریت ہے مگر سندھ سے منتقل ہونے والی "خوجہ" جماعت شیعہ ہے۔ مشرقی افریقہ میں زنجبار، یوگنڈا، کینیا، تانگانیکا، کانگو، مڈغاسکر وغیرہ میں شیعہ کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ روس کے مقبوضہ شہر ایروان میں تمام آبادی شیعہ ہے۔ بادکوبہ میں ان کی اکثریت ہے اور بخارا میں بھی ان کی تھوڑی بہت تعداد موجود ہے۔
(وسطی ایشیاء کی آزاد ہونے والی ریاستوں ترکمانستان، قازقستان، تاجکستان، قرغزستان، ازبکستان، اور آذربائیجان میں ایرانی حکومت نے مذہب شیعہ کے فروغ کے لئے لٹریچر اور مبلغین کا جال پھیلا رکھا ہے)
ترکستان کے شہر شرابیان، مامغان، تبریز، آذربائیجان اور شیروان میں شیعہ اکثریت میں ہیں۔ برما، ملایا اور سنگاپور میں بھی شیعہ خاصی تعداد میں آباد ہیں۔ ۱۹۶۰ء تک شیعوں کی مجموعی تعداد دس کروڑ بتائی جاتی ہے۔ (بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۹۰۹ جلد ۱۱)
جہاں تک افغانستان کا تعلق ہے تو قرامطہ کے حوالے سے کچھ ایسے اشارے بھی پائے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں شیعیت سندھ اور ملتان کے بعد داخل ہو چکی تھی لیکن اس کا باقاعدہ اور کھلم کھلا آغاز ایران کی شیعہ صفوی حکومت کے دور سے ہوتا ہے۔ ان صفوی حکمرانوں کی کوشش اور محنت سے شیعیت افغانستان میں پہنچی اور اب ہرات، کابل، غزنی، اور قندھار میں قزلباش، ہزارہ اور بربر قبائل شیعہ ہیں۔

فرقہ قزلباش

قزلباش کا معنی ہے "سرخ سر" شیعہ اور غیر شیعہ میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے سرخ رنگ کی ایک ٹوپی استعمال کی جاتی تھی جس پر ائمہ کے نام تحریر کیے جاتے تھے۔ اس علامت کی وجہ سے شیخ حیدر صفوی کے مرید "قزلباش" کہلائے جانے لگے جو بعد میں ان کا مشہور عرف ہو گیا۔ قزلباش دراصل ایک شیعی فرقے کا نام ہے جو سارے ایشیائے کوچک میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کا شام کے "نصیریہ" فرقے سے گہرا تعلق ہے۔ اس کے پیرو اپنے آپ کو "علوی" یعنی پیروان علیؓ کہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کرد ہیں لیکن بیشتر ترک ہیں۔ وہ نہ نماز پڑھتے ہیں نہ وضو

کرتے ہیں، شراب پیتے ہیں، ماہ رمضان میں روزہ نہیں رکھتے البتہ ماہ محرم کے پہلے بارہ دن روزے سے ہوتے ہیں اور ماتم حسینؓ کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک حضرت علیؓ اللہ کا اوتار ہیں۔ ان سے پہلے بھی اللہ عیسیٰؑ کے روپ میں روئے زمین پر آیا تھا۔ خدا ایک ہے مگر اس میں تین شخصیتیں ہیں۔ اس کے بعد پانچ بڑے فرشتے ہیں جو ذات باری اور انسان کے درمیان واسطے کا کام دیتے ہیں۔ پھر بارہ عامل ہیں اور چالیس اولیاء۔

قزلباش مریم عذراء کا بے حد احترام کرتے ہیں اور ان کی شان میں مناجاتیں پڑھتے ہیں۔ رات کے وقت ان کے ہاں عشائے ربانی کی تقریب ہوتی ہے۔ انکا سرکردہ ملا علیؓ، عیسیٰؑ موسیٰؑ اور داؤدؑ کی شان میں مناجاتیں گا کر پڑھتا ہے اور اس کے ساتھ ساز بجتے ہیں۔ اس کے ہاتھ میں بید کی ایک چھڑی ہوتی ہے جسے وہ پانی میں ڈبو دیتا ہے اس کے بعد یہ مقدس پانی گھروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ تقریب کے دوران حاضرین اپنے اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں اور ملا ان پر کفارے عائد کرتا ہے۔ اس کے بعد روشنی گل کر دی جاتی ہے۔ یہیں سے ان کا ترکی نام "چراغ سوندران" وضع ہوا۔ یعنی مشعلیں بجھانے والے۔ فرقہ قزلباش کا مذہب مشرکانہ عہد کے بچے کچھے اعتقادات پر مشتمل معلوم ہوتا ہے جس میں مسیحی تعلیمات کی آمیزش ہو گئی ہے اور جسے اسلام کا لباس پہنا دیا گیا ہے۔ بظاہر ان کی تعداد دس لاکھ سے متجاوز ہے۔

افغانستان میں ترکی نسل کے وہ تارکین وطن اس نام سے مشہور ہیں یہ لوگ نادر شاہ کے ساتھ ایران سے آئے تھے۔ درباری اور سرکاری ملازمین انہیں میں سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ ہرات میں یہ لوگ تجارت پیشہ اور اہل حرفہ ہیں۔ فارسی بولتے ہیں لیکن آپس میں بات چیت ترکی میں کرتے ہیں۔ ان کی تعداد ۷۵ ہزار بتائی جاتی ہے۔ (بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۱۸۹ جلد ۱۶-۲)

فرقه علی اللهی

شیعہ فرقہ قزلباش سے ہی ملتا جلتا ایک شیعہ فرقہ "علی اللّٰھی" بھی ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ قزلباش ہی علی اللّٰھی ہیں۔ شیعہ مجتہد سید محمد طباطبائی لکھتے ہیں کہ:

"ایک فرقہ علی اللّٰھی کے نام سے بھی موجود ہے جو بارہ امامی شیعہ سے جدا اور الگ ہوا ہے۔ اس فرقے کو "غلاۃ" (غلو کرنے والا۔ مبالغہ کرنے والا) کہا جاتا ہے اور باطنیہ اور اسماعیلیہ کی طرح یہ فرقہ بھی صرف باطن پر ایمان رکھتا ہے۔ اور چونکہ اس فرقے کے پاس کوئی منظم اور

مرتب منطق موجود نہیں ہے اس لئے ہم اس فرقے کو شیعہ فرقوں میں شمار نہیں کرتے" (شیعہ صفحہ ۴۶)

بہر حال شیعہ مجتہد کے اس قول سے اتنی بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ فرقہ قزلباش یا علی اللّٰھی کے پیرو بنیادی طور پر شیعہ اور ایرانی ہی تھے۔ یہی لوگ نادر شاہ کے ساتھ افغانستان میں داخل ہوئے۔ سر جن مجر ایچ ڈبلیو لکھتے ہیں کہ:

"عرصہ دراز ہوا کہ ختک لوگوں پر مغرب سے ایک ایرانی قوم نے حملہ کیا جو کہ چکانی یا چمانی کہلاتی تھی۔ چکانی لوگ اسی ملک میں رہ گئے۔ یہ ایک فرقہ تھا جو علی اللّٰھی کہلاتا تھا۔ کیونکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت علیؓ خدا ہیں۔ ان کی انوکھی مذہبی مراسم کے متعلق عجیب عجیب قصے بیان کئے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں یہ رسم تھی کہ ایک چراغ جلایا جاتا تھا۔ اور مرد اور عورتیں سب بلا مغائرت و بلا حجاب اس میں شریک ہوتے تھے اور مراسم کی ادائیگی کے دوران میں ایک مقررہ حد تک پہنچ کر وہ مذہبی بزرگ جوان مراسم کی ادائیگی کا صدر ہوتا روشنی کو گل کر دیتا تمام مجلس شراب خوری اور مخرب اخلاق افعال میں مشغول ہو جاتی تھی۔ اس عجیب رسم کے باعث ایرانی ان کو "چراغ کش" کہتے تھے اور پٹھان لوگ ان کو "اور مڑ" کہتے تھے جس کے معنی آگ بجھانے والے کے ہیں۔ اس علاقے میں ان کا بڑا سردار امیر لوبان تھا لیکن اس کے متعلق سوائے اس کے نام کے ہمیں کوئی تاریخی معلومات نہیں۔

افغانستان کی روایات کے بموجب یہ لوگ اس علاقے سے قریب پانچ سو برس گذرے منتشر ہو گئے کیونکہ ان کے علاقے میں ایک زبردست قحط تین چار سال تک مسلسل پڑا"۔ (اقوام افغانستان۔ بحوالہ مذاہب اسلام صفحہ ۷۴)

فرقہ قزلباش بھی اسی جیسے عقائد و نظریات اور رسومات کا قائل ہے۔ اس فرقے کے لوگ نادر شاہ کے ساتھ افغانستان میں وارد ہوئے تھے اور اعلیٰ مناصب پر فائز رہے اور آج تک یہ لوگ افغانستان میں موجود ہیں۔

بہر حال قزلباش کی طرح علی اللّٰھی بھی بنیادی طور پر ایک شیعہ فرقہ ہے جس کا اعتراف خود شیعہ مجتہد سید محمد طباطبائی کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں قبیلہ قزلباش صفوی خاندان کا مرید و عقیدت مند تھا آگے چل کر ان کے عقائد میں غلو پیدا ہو گیا جس سے یہ نصیریہ کی طرح ایک مستقل فرقہ بن گیا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے بیشتر افراد شیعہ فرقہ اثنا عشریہ کے ساتھ ہی وابستہ

ہیں۔ یہ لوگ مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی ایک شاخ لاہور میں بھی آباد ہے۔

افغانستان ماضی میں ایرانی حکومت کے ماتحت رہا ہے۔ کابل اور قندھار پر بار بار یورشیں ہوئیں۔ مغل بادشاہ ہمایوں نے ایرانی فوج کی مدد سے قندھار فتح کیا تھا جس پر بعد میں ایران نے دوبارہ قبضہ کر لیا تھا ان حکمرانوں نے اس دوران شیعیت کی بھی خوب نشر و اشاعت اور ترویج کی۔

ایرانی دعویٰ کے مطابق نادر شاہ کے قتل کے بعد افغانستان کو ایران سے علیحدہ کرنے کی سازش ہوئی لیکن فتح علی شاہ قاچار کے زمانے تک افغانی حکمران ایرانی بادشاہوں کے وفادار رہے اور باقاعدگی سے ان کو سالانہ خراج ادا کرتے رہے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ شاہ محمود خان کی زیر قیادت تقریباً سات سال تک افغانوں نے ایران پر حکمرانی کی لیکن جلد ہی نادر شاہ نے نہ صرف ایران سے ان کا قبضہ ختم کروایا بلکہ آگے بڑھ کر کابل و قندھار کو بھی اپنے دائرہ اقتدار میں لے آیا جسے احمد شاہ ابدالی نے آزاد کرایا۔

بہر حال یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت و صداقت ہے کہ ایران ہمیشہ افغانستان کے معاملات میں مداخلت کرتا رہا لیکن خمینی انقلاب کے بعد اس کی سیاسی اور مذہبی مداخلت کے سابقہ تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ افغانستان میں "طالبان" کے برسر اقتدار آنے سے جہاں روس، بھارت اور دیگر کافر طاقتیں پیچ و تاب کھا رہی ہیں وہاں سب سے زیادہ مروڑ ایران کے پیٹ میں اٹھے۔ ایک طرف اس کی ۷۰ ہزار سے زائد فوج نے افغانستان کی سرحد پر فوجی مشقیں شروع کیں تو دوسری طرف اس نے شمالی افغانستان کو ایران کا ایک باقاعدہ صوبہ سمجھتے ہوئے وہاں اپنے فوجی اڈے قائم کیے۔

طالبان کے شمالی افغانستان کے بعض علاقوں پر قبضے کے بعد وہاں سے ملنے والے ایرانی اسلحہ کے بے تحاشا انبار، گولہ بارود کے زمین دوز بے پناہ ذخائر اور مشہد اور تہران سے شمالی اتحاد کے لئے فوجی و اقتصادی امداد لانے والی پروازوں کی بھرمار نے ایران کے چہرے پر تہہ بہ تہہ پڑے ہوئے تقیہ کے پردے چاک کر ڈالے ہیں۔

افغانستان سے ملنے والی تمام ایرانی اسلحہ کی پیٹیوں پر "ساخت ایران، وزارت دفاع ایران، جمہوری اسلامی ایران، سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی، راہ قدس از کربلا می گذرد، یا ابا عبداللہ الحسینؑ، خمینی راہبر اور یا مہدی ادرکنی" جیسے نعرے لکھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ شمالی

افغانستان کے تمام تعلیمی اور ثقافتی مراکز سے مذہب شیعہ کے فروغ کے لئے کثیر تعداد میں ایرانی لٹریچر بھی برآمد ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے طالبان کی مساعی جمیلہ اور بے پناہ قربانیوں کی بدولت ایران کے مکروہ اور ناپاک عزائم خاک میں مل گئے۔ اللہ تعالیٰ طالبان حکومت کو تمام داخلی وخارجی دشمنوں اور سازشوں سے محفوظ رکھے اور اسے استحکام ودوام عطا فرمائے۔ آمین۔

افغانستان میں اسماعیلی شیعوں کا "واخان" کے علاقے کو آغا خانی ریاست بنانے کے منصوبے کا ذکر پیچھے زیر عنوان "آغا خانی" گذر چکا ہے۔ اب طالبان کے برسر اقتدار آنے کے باوجود اہل تشیع کو وہاں پوری مذہبی آزادی حاصل ہے اور وہ اپنے علاقوں میں شیعی رسومات پر عمل پیرا ہیں۔ اس مذہبی آزادی کے علاوہ امیر المومنین ملا عمر نے تین شیعہ رہنماؤں کو باقاعدہ افغان حکومت میں شامل کرنے کا اعلان بھی کیا ہے۔ جس پر مدیر اوصاف نے طالبان کو اپنے "اوراق نوٹ" میں خراج تحسین پیش کیا۔

"اس فیصلے کے نتیجے میں جہاں ایک طرف اسلامی تحریک طالبان کا غیر فرقہ وارانہ اسلامی تشخص مزید تیزی سے ابھر کر سامنے آئے گا وہاں تفرقہ بازی کو ہوا دیتے ہوئے مسلمانوں کو آپس میں لڑانے والی قوتیں بھی پوری طرح سے بے نقاب ہو جائیں گی۔ ہم افغانستان کے امیر ملا محمد عمر مجاہد کو اس مستحسن اقدام پر مبارک باد پیش کرتے ہیں جو افغانستان میں طالبان کی قیادت میں ایک ایسی وسیع البنیاد حکومت کے لئے کوشاں ہیں جس کی جڑیں تمام افغان عوام کے دلوں، دماغوں اور روحوں میں پیوست ہوں گی اور جو نسلی، لسانی اور فرقہ وارانہ امتیازات سے بالاتر رہتے ہوئے تمام افغان مسلمانوں کی ایسی نمائندہ حکومت ہوگی کہ اس کے بعد استعمار طاقتوں کی طرف سے افغانستان میں نام نہاد وسیع البنیاد حکومت قائم کرنے کا مضحکہ خیز مطالبہ خود بخود بے جواز ہو کر رہ جائے گا"۔ (روزنامہ اوصاف یکم ستمبر ۱۹۹۸ء)

مجاہدین اسلام کے ترجمان رسالہ "المسعود" کے نمائندہ نے کابل سے مندرجہ ذیل رپورٹ بھیجی ہے۔

امارت اسلامی افغانستان کے امیر ملا محمد عمر المجاہد نے حال ہی میں طالبان مخالف دھڑوں سے اختلاف کر کے طالبان کی حمایت کرنے والے تین اہم کمانڈروں کو اسلامی حکومت

کی انتظامی مشنری میں شامل کر کے افغانستان کو فرقہ پرستی کی آگ میں جھونکنے کے خواہش مند عناصر کی امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ قبل ازیں حزب وحدت کے ایک اہم استاد محمد اکبری ایک شیعہ کمانڈر خداداد عرفانی اور جنبش ملی کے لیڈر تسیم مہدی اپنی قیادت سے اختلاف کر کے ہزاروں افراد کے ہمراہ طالبان اسلامی تحریک کی حمایت کر چکے ہیں، تینوں رہنماؤں کا تعلق شیعہ مسلک سے ہے۔

طالبان حکومت کی طرف سے ان حضرات کو حکومت میں شامل کرنے کی پالیسی سے جہاں بیرونی ہاتھوں کو مداخلت کا موقع نہیں ملے گا وہاں افغانستان میں اقلیتی فرقوں میں بیرونی پروپیگنڈہ سے جو عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو چلا ہے اس کا خاتمہ ہوگا۔ اسلام کے زریں اصولوں میں سے ایک اصول یہ ہے کہ ہر اس اقلیت کا تحفظ کیا جائے جو اسلامی حکومت کی مزاحم نہ ہو اور اس کے قواعد وضوابط اور مذہبی شعائر کا احترام کرے۔ طالبان کے حالیہ اقدام سے عملاً اس کا اظہار ہو چکا ہے اور اسلامی حکومت کا غیر فرقہ وارانہ تشخص ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔

جہاں طالبان کے اس اقدام سے متعدد فوائد حاصل ہوں گے وہاں خطرات بھی موجود ہیں لیکن طالبان کی زیرک قیادت اور مدبر انتظامیہ سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ انتہائی دانشمندی اور حکمت عملی کے ساتھ ان افراد کی ذاتی صلاحیتوں اور افرادی قوت سے بھرپور استفادہ کرے گی اور اگر خدانخواستہ یہ مزار شریف کی فتح اول کی طرح کوئی چال ہو تو اپنی فراست ایمانی اور تدبر کے ساتھ اسے ناکام بنانے کی کوشش کرے گی اور انشاء اللہ ایسی ہر کوشش خداوند تعالیٰ کی مدد و نصرت سے ناکام ثابت ہوگی۔ (المسعود۔ راولپنڈی۔ نومبر، دسمبر ۱۹۹۸ء، صفحہ ۳۲)

زیر نظر کتاب کی نظر ثانی کے موقع پر آج ۲۱ رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ مطابق ۷ دسمبر ۲۰۰۱ء بروز جمعۃ المبارک یہ بات انتہائی قلق، اضطراب بحد سے، افسوس اور نم ناک آنکھوں کے ساتھ تحریر کی جا رہی ہے کہ کفار اور منافقین پر مشتمل عالمی اتحاد نے پانچ سال کی مسلسل سازشوں، ریشہ دوانیوں، تخریبی کارروائیوں اور طالبان کا میڈیا ٹرائل پھر دو ماہ تک لگاتار اور شب و روز آہن و آتش کی بارش برسانے کے بعد بالآخر بچے کھچے زخمی دل اور زخموں سے چور طالبان کو اپنے آخری گڑھ اور امارت اسلامیہ کے مرکز قندھار سے بھی انخلاء پر مجبور کر دیا۔ فیا اسفا!

امارت اسلامیہ افغانستان کے سقوط کی روح فرسا خبر پر دل کو یقین نہیں آتا لیکن یہ دنیا

دارالامتحان ہے اور یہ بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہے کہ طالبان کی قائم کردہ امارت اسلامیہ روز اول سے ہی کفار و منافقین اور یہود و مجوس کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ انہیں اس بات کا غم ہلکان کیئے جارہا تھا کہ کرہ ارضی پر ایک ایسی حکومت و امارت کا وجود کیوں قائم ہو گیا جو خالص اسلامی شرعی اصولوں پر قائم ہے اور جس کے اثرات دیگر ملکوں میں بھی پھیل رہے ہیں۔ اس لیے کفار و منافقین کے عالمی اتحاد نے عالمی تہذیب کو طالبان کی خالص دینی، اسلامی اور شرعی تحریک سے لاحق خطرات سے بچانے کی خاطر اور اسلامی تہذیب و تمدن کے آثار مٹانے کے لیے افغانستان کے جہادی مراکز، دینی مدارس اور مساجد پر کارپٹ بمباری کی حتیٰ کہ ہسپتال، جیل اور قبرستان بھی ان کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے۔

انسانی طاقت اور وسعت میں جو کچھ تھا وہ طالبان نے پیش کر دیا باقی یہ دین اللہ کا ہے وہی اس کا والی و نگہبان ہے اور وہی اپنی حکمتوں کو زیادہ بہتر جاننے والا ہے۔ ہمارے دل اس کی رضا پر راضی اور زبانیں صبر و استقامت کے ساتھ مرتے دم تک اپنے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیے جدوجہد جاری رکھنے کی توفیق طلب کر رہی ہیں۔ یارب! تیری مشیت اور مرضی اگر اسی میں ہے تو ہمیں اس پر سکینت عطا فرما یا رب العلمین، یاارحم الراحمین، یا حنَان یا منَان، یا صریخ المستصرخین، یا غیاث المستغیثین، یا مفرج کرب المکروبین، یا مجیب دعوۃ المضطرین، یا خیر المسؤلین و یا خیر المعطین تا قیامت اپنے کلمے کو سر بلند کرنے کی جدوجہد جاری رکھنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین یا اللہ العالمین۔

شیعیت کشمیر میں

یہ وسیع اور حسین ترین وادی ہمالیہ کے دامن میں واقع ہے۔ ریاست جموں و کشمیر پر مسلمانوں کا اقتدار پانچ صدیوں کو محیط ہے۔ اس ریاست پر تین قسم کے مسلمان بادشاہوں نے حکومت کی۔

۱۔ خودمختار سلاطین ۱۳۲۰ء تا ۱۵۸۶ء اس سلسلہ حکومت میں چک خاندان کی حکومت بھی شامل ہے جو مذہبا شیعہ تھا۔

۲۔ مغل ۱۵۸۶ء تا ۱۷۵۳ء ۳۔ پٹھان ۱۷۵۳ء تا ۱۸۱۹ء

۱۸۱۹ء میں پنجاب کے سکھ حکمران رنجیت سنگھ نے ریاست پر قبضہ کر لیا اور پھر ۱۸۴۶ء

میں بیع نامہ امرتسر کے ذریعے انگریزوں نے اس علاقہ کو ڈوگرہ حکمران کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ ۱۹۴۷ء میں طویل جدوجہد اور جانی و مالی قربانیوں کے نتیجے میں ریاست جموں و کشمیر کا ایک حصہ "آزاد کشمیر" کے نام سے آزاد ہو گیا۔

سرزمین کشمیر میں اسلام اور مسلمان کب داخل ہوئے؟ مورخین اس بارے میں مختلف الخیال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ کشمیر میں داخل ہونے والا پہلا مسلمان شام کا باشندہ حمیم نامی ایک شخص تھا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ سوات کے ایک بزرگ شاہ مرز ۱۳۶۵ء میں کشمیر کے راجہ سنگھ دیو کے ہاں ملازم ہوئے اور بہت تیزی سے ترقی کرتے ہوئے ۱۳۴۳ء میں شمس الدین شاہ کے نام سے تخت نشین ہو گئے۔ شاہ میر نے کشمیر سے اسلام کے سیاسی تعلقات کی بنیاد ڈالی۔ لیکن اس خطہ جنت نظیر میں اسلام کے پہلے کامیاب مبلغ حضرت بلال شاہ یا بلبل شاہ تھے۔ ان کا اصلی نام سید شرف الدین تھا جو صوفیاء کے مشہور سلسلے سہروردیہ کے شیخ نعمت اللہ فارسی کے شاگرد اور مرید تھے۔ ۱۳۲۴ء میں رنچن شاہ حاکم کشمیر کے عہد میں وہ کشمیر آئے۔ راجہ بدھ مذہب کا پیرو تھا۔ لیکن اس کی طبیعت اپنے مذہب سے مطمئن نہ تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ بدھ مت چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرے۔ بالآخر اس نے شاہ میر کی ترغیب سے یہ فیصلہ کیا کہ کل علی الصبح سب سے پہلے جو شخص مجھے نظر آئے گا اسی کا مذہب اختیار کر لوں گا۔ چنانچہ اگلے روز اس کی نظر ایک مسلمان فقیر بلبل شاہ پر پڑی اور اس نے اپنے فیصلے کے مطابق اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد اس کے اہل خانہ اور امرائے دربار مسلمان ہوئے۔ بادشاہ نے اپنا اسلامی نام صدر الدین رکھا اور یہی شخص کشمیر میں پہلا مسلمان حکمران تصور کیا جاتا ہے۔ پھر کشمیر میں ایران کے سادات سید علی ہمدانی کی قیادت میں وارد ہوئے جنہوں نے کشمیر کو اپنا مستقل تبلیغی مرکز بنا لیا۔

سید علی ہمدانی

امیر کبیر علی ثانی سید علی ہمدانی ۱۲ رجب ۷۱۴ھ / ۱۲۱ اکتوبر ۱۳۱۴ء کو ایران کے شہر ہمدان میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ کا نام فاطمہ اور والد کا نام سید شہاب الدین تھا جو ہمدان کے حاکم تھے۔ شاہ ہمدان کا شجرہ نسب سولھویں پشت میں حضرت علیؑ سے جا ملتا ہے۔ وہ "امیر کبیر" اور "علی ثانی" کے لقب سے مشہور ہیں۔ گھر میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے شیخ شرف الدین محمود مزدقانی کی فرمائش پر انفس و آفاق کی سیر پر نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے تین مرتبہ دنیا

بھر کی سیاحت کی جس کی مجموعی مدت اکیس برس بیان کی جاتی ہے۔

احمد رازی کی کتاب "ہفت اقلیم" کے مطابق شاہ ہمدان کو چودہ سو اولیائے کرام سے ملاقات کا موقع ملا۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے تین بار مشرق سے مغرب کا سفر کیا اور بحر و بر میں بے شمار عجائبات دیکھے۔ اسی طرح کشمیر میں بھی تین مرتبہ آئے۔ یہاں پہلی بار آنے سے پہلے انہوں نے حالات کا جائزہ لینے کے لئے اپنے دو رفقائے کار تاج الدین اور سید حسین سمنانی پر مشتمل ایک وفد بھیجا یہ وفد اپنے مقصد میں اس حد تک کامیاب رہا کہ سلطان شہاب الدین خود بھی سید حسین سمنانی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا۔ چنانچہ اس کی اطمینان بخش رپورٹ پر امیر کبیر نے ۷۷۴ھ / ۱۳۷۲ء اور بقول بعض ۷۶۹ھ / ۱۳۶۹ء میں پیر پنجال کے راستے سر زمین کشمیر پر قدم رکھا۔

سری نگر میں سید علی ہمدانی نے اپنے قیام کے لئے دریائے جہلم کے دائیں کنارے پر واقع خوشگوار اور وسیع قطعہ زمین کو منتخب کیا۔ بعد میں یہ جگہ خانقاہ "معلّٰی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ شاہ ہمدان نے اپنے چار ماہ کے قیام کے دوران کشمیر کی سیر و سیاحت کے علاوہ یہاں کے سیاسی، معاشی اور تمدنی حالات کا مفصل جائزہ لیا۔

دوسری بار ۷۸۳ھ میں سات سو ایسے سادات کے ہمراہ تشریف لائے جنہیں علم و فضل اور مختلف فنون میں کمال حاصل تھا۔ امیر کبیر تو خود اڑھائی برس کے قیام کے بعد لداخ کے راستے ترکستان روانہ ہو گئے لیکن سادات نے وادی کے طول و عرض میں اشاعت دین کے مختلف مراکز (جو امیر کبیر کی رہنمائی میں قائم ہو چکے تھے) پر درس و تدریس، تبلیغ اور دیگر سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ ان کا تیسرا دورہ ۷۸۵ھ میں ہوا لیکن جلد ہی انہیں بوجہ علالت براستہ پکھل واپس جانا پڑا (پکھل ہزارہ اس وقت کشمیر کا حصہ تھا) یہاں کے حاکم سلطان خضر محمد کی درخواست پر دس دن قیام کیا۔ پھر کنہار سے ہوتے ہوئے کافرستان پہنچے اور اسی مقام پر ۵ ذی الحج ۷۸۶ھ / ۱۳۸۶ء میں بعمر بہتر (۷۲) برس رحلت کر گئے۔ ان کی نعش کو سنگلاخ چٹانوں اور دشوار گذار گھاٹیوں پر سے اٹھا کر لے جاتے ہوئے چھ ماہ میں ترکستان کے شہر ختلان پہنچایا گیا جہاں اس مقام پر انہیں سپرد خاک کیا گیا جو انہوں نے خود اپنی زندگی ہی میں اس مقصد کے لئے خرید رکھا تھا۔

شاہ ہمدان کے ساتھ جو سادات ایران سے کشمیر آئے تھے انہوں نے یہیں مستقل

سکونت اختیار کر لی اور "اسلام" اور ایرانی علوم و فنون کی نشر و اشاعت میں ہمہ تن معروف ہو گئے۔ ان سادات کی محنت کے نتیجے میں کشمیر اور ایران میں دینی، تاریخی، تمدنی، لسانی اور ثقافتی لحاظ سے کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ محمد اقبال نے کشمیر کو "ایران صغیر" کا نام دیا ہے۔

سید سادات سالار عجم | دست او معمار تقدیر امم
تا غزالی درس اللہ ہو گرفت | ذکر و فکر از دودمان او گرفت
مرشد آن خطہ مینو نظیر | میر درویش و سلاطین را مشیر
آفرید آں مرد ایران صغیر | باہنر ہائے غریب و دلپذیر

اہل تشیع کشمیر کو ایک دور افتادہ خطہ سمجھ کر یہاں اپنی الگ ریاست کی تشکیل کے خواہاں تھے جس میں انہیں تقریباً ہر دور میں جزوی کامیابی حاصل رہی مگر چک خاندان کے برسر اقتدار آنے سے ان کا دیرینہ خواب پورا ہو گیا جو پینتیس (۳۵) سال کے بعد چکنا چور ہو کر پھر جزوی میں تبدیل ہو گیا۔

ایران میں خمینی انقلاب کے بعد اہل تشیع برابر اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اسے دیگر ممالک میں بھی برپا کیا جائے۔ اس سلسلہ میں پاکستان اور کشمیر ان کا خصوصی ہدف ہے۔ چنانچہ مفتی کفایت حسین نقوی صدر تحریک نفاذ فقہ جعفریہ آزاد کشمیر اپنے مطبوعہ عید کارڈ میں لکھتے ہیں کہ "ملکی و بین الاقوامی حالات سے آپ بخوبی آگاہ ہیں۔ اسلام دشمن قوتیں اپنی ناپاک کاروائیوں کے ذریعے حقیقی اسلام اور قرآن کے نظام کو مسخ اور نابود کرنے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ ماضی قریب میں استعماری سازشوں کے قلع قمع کے لئے امام خمینی رضوان اللہ علیہ کی عظیم قیادت میں ملت ایران نے طاغوت کو نابود کرتے ہوئے عظیم اسلامی انقلاب برپا کیا جس کے اثرات پوری دنیا میں محسوس کئے جا رہے ہیں۔ اسی انقلاب کی بازگشت ایران صغیر کشمیر میں سنائی دے رہی ہے۔ خطہ کشمیر کے مجبور و مقہور مسلمان ... استبداد کے ... اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ارض کشمیر پر طلوع ہونے والا ہر دن "کل ارض کربلا و کل یوم عاشوراء" کا حسینی پیغام ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایران صغیر (کشمیر) کو ایرانی انقلاب کے سایہ سے بھی محفوظ رکھے کیونکہ اس کی آزادی کی خاطر عالم اسلام بالخصوص پاکستان کے مسلمان بے پناہ قربانیاں دے چکے ہیں۔

اب بھی مسلسل ہو رہے ہیں۔

بہر حال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کشمیر میں اسلام امیر کبیر علی ثانی سید علی ہمدانی اور ان کے ہمراہ ایران سے آنے والے سات سو سادات کی مساعی سے پھیلا۔ یہ ملحوظ رہے کہ کشمیر میں وارد ہونے والا یہ عظیم ایرانی تبلیغی لشکر ان ایرانیوں کے علاوہ تھا جو بعد میں کشمیر وارد ہوئے (ان کا ذکر آگے آ رہا ہے) خواجہ غلام احمد پنڈت شاہ ہمدان کے "چند یادگار واقعات" کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اسی طرح ایک دلچسپ اور حیرت انگیز روایت للہ عارفہ کے قبول اسلام سے تعلق رکھتی ہے۔ للہ کشمیر کی تاریخ میں ایک بڑا محترم نام ہے۔ وہ ہندو گھرانے کی ایک مجذوبہ اور شاعرہ تھیں اور ستر پوشی سے بے نیاز ہو کر گلی کوچوں میں بیٹھی گیان دھیان میں مگن رہتی تھیں۔ لوگ عام طور پر اسے پردے کی تلقین کرتے اور تن ڈھانکنے کے لئے کپڑوں کی پیش کش بھی کرتے لیکن وہ ان مشوروں اور پیش کشوں کو رد کرتے ہوئے اپنے آپ کے ساتھ بڑبڑاتی ہوئی کہتی سنائی دیتیں "پردہ، پردہ، پردہ، پردہ آخر کس سے؟"

اسی ہیت کذائی میں دن بیتتے چلے جا رہے تھے کہ ایک دن اچانک مجذوبہ پر عجیب و غریب حال طاری ہو گیا اور وہ گھبراہٹ اور سراسیمگی کی حالت میں "مرد، مرد، مرد، کپڑا لاؤ، کپڑا لاؤ، جلدی کرو" پکارتی ہوئی ادھر ادھر دوڑنے لگی۔ وہ مرد بلکہ "مرد مومن" جس کی آمد کی وجہ سے اس نے پردے کی ضرورت محسوس کی وہ حضرت شاہ ہمدان تھے۔ جنہوں نے کشمیر میں ورود فرمایا تھا۔ چنانچہ ان ہی کے دست بابرکات پر اس نے بیعت کر کے اسلام قبول کیا اور "اکشوری" سے "للہ عارفہ" کہلائیں۔

بات چلی ہے تو اس سلسلے میں ایک اور روایت بھی ہو جائے۔ وہی حضرت شاہ ہمدان کے ورود مسعود کا سماں ہے اور مجذوبہ سراسیمگی کی حالت میں "مرد آیا، مرد آیا اور کپڑا لاؤ، کپڑا لاؤ" پکارتی جا رہی ہے مگر کوئی اس کی بات پر دھیان نہیں دیتا تھا وہ گلی کوچوں میں دوڑتی اور ہانپتی چلی گئی یکا یک اس کی نظر ایک نانبائی کے تنور پر پڑی جس کے تنور سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے اس کا ماتھا ٹھنکا اور اس نے اپنے قدم روک لئے قبل اس کے کہ لوگ مجذوبہ کے ارادوں کو بھانپ سکتے اس نے آن واحد میں تنور میں چھلانگ لگا دی

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق   عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

عین اسی وقت حضرت شاہ ہمدان موقع پر پہنچ گئے اور انہوں نے تنور کا ڈھکن اٹھانے کو کہا اور اپنا خرقہ نانبائی کی طرف پھینکتے ہوئے فرمایا "لو اسے تنور کے اندر ڈال دو"۔ نانبائی حیران تھا لیکن جب اس نے ڈھکن اٹھایا تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ دہکتا ہوا تنور ایک چمن زار میں تبدیل ہو چکا ہے اور اس میں ایک خاتون وہی چادر اوڑھے بیٹھی ہے "باہر آ جاؤ بیٹی" شاہ ہمدان نے پکارا "ہم خود تمہیں لینے آئے ہیں"۔

للہ عارفہ جواب مجذوبہ نہ تھیں۔ صحیح و سلامت تنور سے باہر نکل آئیں اور حضرت شاہ ہمدان کے دست مبارک پر بیعت کر کے مشرف بہ اسلام ہو گئیں۔ ان دونوں روایتوں سے ایک تو شاہ ہمدان کی شخصیت کا اعجاز اور اثر و نفوذ مترشح ہوگا اور دوسری طرف للہ عارفہ کی قدر و منزلت کا کچھ نہ کچھ پتہ چلے گا"۔   (اوراق پارینہ صفحہ ۲۲-۲۳)

یہ ملحوظ رہے کہ اس کتاب کے آغاز میں "تعارفی کلمات" سردار سید محمد خان چیف جسٹس سپریم کورٹ آزاد جموں و کشمیر نے تحریر کئے ہیں۔ مؤلف نے شاہ ہمدان پر یہ مقالہ بو علی سینا یونیورسٹی ہمدان ایران میں ۱۵ تا ۱۷ اگست ۱۹۹۱ء کو منعقد ہونے والے ایک سیمینار کے لئے لکھا ہے۔ موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

"اس لحاظ سے کشمیر اور ایران میں قدرتی مناسبتوں کے علاوہ یکساں طور کے علوم و فنون کی ترقی نے بھی یک رنگی اور ہم آہنگی پیدا کر دی اور مذہب و تاریخ نے شیرازہ بندی کر کے انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناقابل تقسیم رشتوں میں وابستہ کر دیا۔ حضرت علامہ اقبال کے اس مشہور شعر سے واضح ہوتا ہے کہ کشمیر کو "ایران صغیر" ہونے کا مرتبہ انیسویں صدی سے پہلے دیا گیا ہے

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر   کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایران صغیر

پس اگر یہ حقیقت ہے کہ کشمیر "ایران صغیر" ہے تو یہ عین حقیقت ہے کہ اس "ایران صغیر" کے معمار صرف اور صرف شاہ ہمدان ہیں"۔   (حوالہ مذکور صفحہ ۲۶)

شاہ ہمدان کی وفات کے بعد اشاعت دین کے اس سلسلہ کو ان کے سب سے بڑے فرزند اور جانشین میر سید محمد ہمدانی نے جاری رکھا جو ۷۹۶ھ / ۱۳۹۳ء میں بعمر بائیس برس کشمیر وارد ہوئے۔ شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں کہ:

"حضرت امیر کبیر کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے میر محمد ہمدانی کئی سو ہمراہیوں کے ساتھ کشمیر تشریف لائے اور بارہ سال تک (بلکہ بقول بعض بائیس سال تک) اشاعت اسلام میں سرگرم رہے۔ حاکم وقت سلطان سکندر بت شکن ان کا بڑا معتقد تھا۔ اور وزیر شاہ سہا بھٹ بھی جو آپ کی آمد کے بعد مسلمان ہوا اور ملک سیف الدین کے لقب سے ملقب ہوا۔ آپ کا بے حد پاس کرتا تھا۔ اس نے آپ سے اپنی بیٹی بیاہ دی تھی۔ آپ نے بادشاہ کے ایماء پر کئی کتابیں لکھیں"۔ (آب کوثر صفحہ ۴۷۹)

نوجوان سلطان سکندر کے اکثر رفقاء اور مشیر بیہقی سادات پر مشتمل تھے جو سید محمود بیہقی کی قیادت میں "سبزوار" سے کشمیر آگئے تھے۔ وادی کے قدرتی حسن اور پرسکون و خوشگوار ماحول نے ان کو سمرقند، بخارا اور ایران کے تقریباً سبھی جغرافیائی فوائد فراہم کر دیے تھے لہٰذا وہ نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ تبلیغ اسلام میں مصروف ہو گے۔

سید میر محمد ہمدانی نے خانقاہ معلیٰ سری نگر کی توسیع و تزئین میں بہت دلچسپی لی اور اسے تبلیغ و تدریس کا وسیع مرکز بنا دیا۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس مرکز میں مسلمانوں کے علاوہ کشمیری پنڈت (ہندو) مرد و زن بھی عقیدت کے پھول لے کر حاضر ہوتے اور اپنے مخصوص انداز میں کسب فیض کرتے تھے۔

سید میر محمد ہمدانی بائیس برس کے قیام کے بعد ختلان واپس چلے گئے۔ جہاں ۸۵۴ھ / ۱۴۵۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اور انہیں ان کے والد کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ کشمیر میں "اسلام" کی اشاعت امیر کبیر علی ثانی سید علی ہمدانی، ان کے صاحبزادے سید میر محمد ہمدانی اور سینکڑوں ایرانی سادات (جو ان کے ہمراہ کشمیر وارد ہوئے تھے) کی مساعی جمیلہ کی مرہون منت ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان ایرانی سادات نے خاص نبی اکرمؐ کے لائے ہوئے اسلام کی تبلیغ کی تھی۔ یا ایران کے وضع کردہ اسلام کی؟ کیونکہ بقول شخصے "تسخیر ایران کا نتیجہ یہ نہ نکلا کہ ایران اسلام کا حلقہ بگوش بن گیا بلکہ یہ نکلا کہ اسلام ایرانیت کے رنگ میں رنگا گیا۔" لہٰذا یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ امیر کبیر سید علی ہمدانی اور ان کے رفقاء نے تفضیلیت۔ اور تقیہ کے لبادے میں شیعیت کی بنیاد رکھی جس پر آگے چل کر ان کے جانشینوں نے مذہب شیعہ کی بلند و بالا عمارت کھڑی کر دی۔

سید علی ہمدانی اور شیعیت

یہ ایک انتہائی نازک اور حساس عنوان ہے مگر زیر بحث عنوان یعنی "شیعیت کشمیر" کے تحت اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا اور بعض حضرات نے اسے باقاعدہ موضوع بحث بھی بنایا ہے۔ چنانچہ خدا بخش لائبریری پٹنہ نے برصغیر میں تصوف کے نام سے تصوف سے متعلق غیر مطبوعہ تحریروں پر مشتمل ایک مجموعہ مقالات شائع کیا۔ اس میں پروفیسر حکیم سید کمال الدین چشتی کا بھی ایک مقالہ شامل ہے۔ جس میں انہوں نے سید علی ہمدانی کو زمرہ شیعہ میں شمار کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ شیعہ علماء کو اپنے خصوصی افکار و نظریات کی اشاعت و ترویج کے لئے کیوں تصوف کا سہارا لینا پڑا؟ اس مقالے کے جواب میں مولانا عبدالحمید نعمانی صاحب (جمعیت سنٹرل آفس نئی دہلی) نے چھ صفحات پر مشتمل ایک مضمون بہ عنوان "حضرت سید میر علی ہمدانی اور شیعیت" لکھا جو ماہنامہ دارالعلوم (دیوبند دسمبر ۱۹۹۳ء) میں شائع ہوا۔

لیکن موصوف انتہائی کوشش کے باوجود سید علی ہمدانی پر "شیعیت" کے لگے ہوئے داغ نہ دھو سکے بلکہ انہوں نے حضرت کے "سنی" ہونے پر جو دلائل پیش کیے خود ان سے بھی آں محترم کا شیعہ ہونا ہی ثابت ہوتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کے مضمون کی تلخیص پیش کردی جائے تاکہ قارئین کرام خود بھی غور فرما سکیں:

"سید میر علی ہمدانی کی تحریروں میں بلاشبہ کہیں کہیں شیعی فکر و نظر کی جھلک نظر آتی ہے اور یہ کوئی ان ہی کے ساتھ مخصوص و محدود نہیں ہے بلکہ دیگر صوفیانہ تحریروں کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے۔ علاوہ ازیں رفض و سبائیت کی زرخیز سرزمین عراق کا خطہ ہمدان جس کی ہوا تک میں شیعیت شامل ہوگئی تھی اس ماحول و فضا میں پروان چڑھنے والا آدمی اگر شیعی افکار سے کسی حد تک متاثر ہو جائے تو کوئی حیرت انگیز اور تعجب خیز بات نہیں ہے اور حضرات صوفیاء کو ہر اچھے برے آدمی سے جو حسن ظن ہوتا ہے اس کی موجودگی میں تو یہ بات اور بھی قرین قیاس ہو جاتی ہے۔ اس لئے شاہ ہمدان کے

گر مہر علی و آل بتولت نبود | امید شفاعت رسول نبود
گر طاعت حق جملہ آری بجاں | بی مہر علی ہیچ قبولیت نبود
کہ سید عزیزی کہ علائی نہ کجائی | گفتم بولایت علی کز ہمدانم

پیمانہ شمار سے ان کی شیعیت پر بھی استدلال کیا گیا ہے۔ ایسی ہی حضرت ہمدانی نے اپنی کتاب مودۃ القربیٰ میں حدیث، اقربویں اور بعض امیریہ میں آنحضرتؐ، حضرت علی، حضرت فاطمہ اور ہمدانیہ سیدنا حسنؓ و حسینؓ کے متعلق جن جذبات و خیالات اور والہانہ تعلقات و عقیدت کا اظہار کیا ہے کسی بنیاد پر صوفیہ لامیہ اور ہمدان کو شیعہ میں شمار کرنا زیادہ مضبوط بات نہ ہوگی۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ بعض صوفیاء کرام کے یہاں اہل بیت سے اظہار محبت و عقیدت میں مطلوبہ احتیاط کی بجائے غلو کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ یہی بات حضرت ہمدانی کے سلسلے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ وہ سلسلہ کبرویہ سے تعلق رکھتے تھے جس کا اہل تشیع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل توجہ و غور ہے کہ سید امیر کبیر علی ہمدانی سے قربت رکھنے والے حضرات اور سوانح نگار ان کو شافعی المسلک بتاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ہمدانی کے مرید جعفر بدخشی رقم طراز ہیں "موصوف پہلے حنفی تھے لیکن بعد میں شافعی ہو گئے لیکن اپنے کسی مرید کے حنفی رہنے پر ان کو اعتراض نہ تھا اور نہ انہوں نے کشمیر میں حنفی قانون کی مخالفت کی۔ ڈاکٹر غلام محی الدین نے انہیں مسلکاً حنبلی بتایا ہے"۔

کشمیر میں شیعیت کو فروغ سید علی ہمدانی کی آمد کے دو سو سال بعد ہوا ہے۔ ان کی آمد کشمیر میں سلطان شہاب الدین آٹھویں صدی ہجری مطابق چودھویں صدی عیسوی کے عہد میں ہوئی۔ اس لحاظ سے زمانہ آمد سے متصلاً کشمیر میں شیعی اثرات ملنے چاہئیں لیکن دو سو سال تک یعنی آٹھویں نویں صدی میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا البتہ دسویں صدی ہجری کے آخر وسط سے تاریخ کشمیر میں شیعوں کا ذکر آنا شروع ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ سید میر علی ہمدانی کے اہل سنت والجماعت میں سے ہونے کی ایک بین دلیل یہ بھی ہے کہ انہوں نے ذخیرۃ الملوک میں سیدنا ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور عمر بن عبدالعزیز کے دور حکومت کو عہد زرین اور طرز حکمرانی کو مثالی قرار دیا ہے۔ لہٰذا انہیں شیعہ اکابرین صوفیاء میں شمار کرنا، باور کرنا، کرانا خلاف واقعہ اور علمی دیانت کے منافی ہے۔ البتہ ان کے افکار و نظریات اور تحریروں میں دیگر صوفیانہ تحریروں کی طرح شیعہ اثرات سے انکار نہیں ہے اور اس امکان کو بھی بالکل غلط نہیں کہا جا سکتا ہے کہ دیگر بہت سارے مصنفین کی طرح ان کی تصانیف میں بھی شیعی افکار کی آمیزش کر دی گئی ہو۔ اس طرح کی سبکدستی اس فرقہ کا طرہ امتیاز ہے"۔

(ماہنامہ دارالعلوم دیوبند صفحہ ۳۰ تا ۲۲ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۸۵ء و نومبر ۱۹۸۵ء)

سید علی ہمدانی کے متعلق میں لکھے گئے اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مضمون نگار نے انصاف سے کام نہیں لیا اور نہ ہی انہوں نے شیعیت کا بنظر عمیق مطالعہ فرمایا ہے۔ موصوف یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکے کہ شاہ ہمدان حنفی تھے یا شافعی تھے ہو سکتا ہے کہ سید علی ہمدانی حنفیت، شافعیت اور حنبلیت سے ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے شیعیت میں داخل ہو گئے ہوں۔ کیونکہ موصوف نے تین مرتبہ دنیا کی سیاحت کی تھی جس کی مجموعی مدت اکیس برس بنتی ہے اور اس دوران وہ حنفیوں، شافعیوں اور حنبلیوں کے ہاں بھی قیام پذیر رہے۔ یا پھر وہ ابتداء سے ہی شیعہ ہوں اور ان علاقوں کی سیاحت کے دوران انہوں نے تقیہ مذکورہ مسالک اختیار کر لئے ہوں۔ خود مضمون نگار کے دلائل سے ظاہر ہوتا ہے کہ علی ثانی سید علی ہمدانی نے بعض اوقات تقیہ بھی ترک کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں غلو اور شیعی افکار و نظریات کی جھلک پائی جاتی ہے۔

علاوہ ازیں ان کا تعلق بھی ایک ایسے خطے سے تھا جس کی ہوا تک میں شیعیت داخل ہو گئی تھی۔ موصوف اگر تقیہ کو ترک نہ کرتے تو پھر بھی ان کے افکار و نظریات کی وجہ سے ان کی سنیت مشکوک تھی۔

شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں کہ:

"اسلامی ہند کی تاریخ میں شیعہ اور سنی شخصیتوں کو علیحدہ کرنا بڑا مشکل ہے کیونکہ ایک تو بعض شیعہ حضرات افشائے مذہب کے معاملے میں تقیہ اور احتیاط کے قائل ہیں دوسرے پاکستانی و ہندوستانی اہلسنت والجماعت میں بھی تفضیلیوں کی کوئی کمی نہیں۔ چنانچہ متعدد ممتاز ہستیوں مثلاً میر سید علی ہمدانی، خواجہ محمود گاوان اور حضرت گیسو دراز کی نسبت اختلاف ہے کہ وہ شیعہ تھے یا سنی۔ عام طور پر اب مذہبی عقائد کی یہ حالت ہے کہ کسی بحث کے وقت یا ضد اور سینہ زوری کی وجہ سے کوئی اختلاف ظاہر ہو تو ہو ورنہ عموماً شیعہ اور سنی شیر و شکر ہو کر رہتے ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے تمیز کرنا مشکل ہے۔" (رود کوثر صفحہ ۲۲۵)

فاضل مضمون نگار کی یہ دلیل بھی بڑی عجیب ہے کہ "علی ہمدانی نے باوجود شافعی ہونے کے کشمیر میں حنفی قانون کی مخالفت نہیں کی۔"

کشمیر میں اس وقت حنفی قانون نافذ ہی کب ہوا تھا؟ وہاں تو اسلام کی نشر و اشاعت کا

آغاز ہی شاہ ہمدان کی آمد کے ساتھ ہوتا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے اس سے بھی زیادہ دلچسپ دلیل یہ پیش کی کہ "کشمیر میں شیعیت کو فروغ سید ہمدانی کی آمد کے دو سو سال بعد ہوا۔ دسویں صدی ہجری کے آخر وسط سے تاریخ کشمیر میں شیعوں کا ذکر آنا شروع ہوتا ہے۔"

دسویں صدی ہجری میں تو شیعوں نے کشمیر میں اپنی مستقل حکومت قائم کر لی تھی۔ کیا یکایک انہیں حکومت مل گئی تھی؟ یہ بات بالکل ہی غلط ہے کہ کشمیر میں شیعیت کو فروغ سید ہمدانی کی آمد کے دو سو سال بعد ہوا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ شیعیت کا آغاز حضرت کی آمد کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ موصوف کی کتب میں شیعی افکار و نظریات کی جھلک موجود ہے جس کا اعتراف خود مضمون نگار نے بھی کیا ہے۔

علاوہ ازیں سید علی ہمدانی کے مرید اور شاگرد خواجہ اسحٰق ہیں اور خواجہ صاحب کے مرید سید محمد نور بخش ہیں جو خیر سے مذہب شیعہ میں ایک نئے فرقے "نور بخشیہ" کے بانی ہیں (اس فرقے کا ذکر آگے آرہا ہے) ان کی ولادت ۷۹۵ھ میں ہوئی جبکہ شاہ ہمدان ۷۸۶ھ میں فوت ہوئے۔ کیا یہ دو سو سال کا عرصہ بنتا ہے؟

فاضل مضمون نگار نے یہ دلیل بھی دی ہے کہ شاہ ہمدان نے حضرات شیخینؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد کو زرین عہد قرار دیا ہے۔ کاش موصوف اس ضمن میں شیعہ فاضل جسٹس امیر علی اور دیگر شیعہ علماء کی تحریرات کا بھی مطالعہ کر لیتے جنہوں نے تقیۃً خلفائے ثلاثہؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ کی خوب مدح سرائی کی ہے۔ کیا امیر علی اور ان کے ہم خیال حضرات کو بھی سنی تسلیم کر لیا جائے؟

ملا باقر مجلسی جیسے منہ پھٹ شیعہ مجتہد نے اپنی کتاب میں عمر بن عبدالعزیز کی مدح کی ہے {تذکرۃ الائمہ صفحہ ۷۵}

فاضل مضمون نگار نے اپنے مضمون کے آخر میں یہ دلیل بھی دی ہے کہ ممکن ہے کہ شاہ ہمدان کی تصانیف میں شیعی افکار و نظریات کی آمیزش کر دی گئی ہو اگر ان شیعی افکار کو الحاقی بھی تسلیم کر لیا جائے تو پھر بھی دشمنان اسلام تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے جبکہ اہلسنت اپنے بزرگوں کی تعلیمات محفوظ رکھنے میں ناکام رہے۔ پھر جب آپ کو "الحاقیات" کا علم ہو گیا تو آپ نے کبھی انہیں اصل کتب سے حذف کرانے کی کوئی کوشش کی؟

اس مقصد کے حصول کے لئے کس "اتھارٹی" کی منظوری درکار ہے اگر شیعہ کی دست

بڑے آپ کے اکابرین کی کتب بھی محفوظ نہیں رہیں تو پھر جو گل انہوں نے اپنے طور پر کھلائے ہیں ان کا اندازہ کیوں کر لگایا جا سکتا ہے؟

شیعہ مجتہد قاضی نور اللہ شوستری (جو تقیہ کی چادر اوڑھ کر قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز ہو گئے تھے) نے مجالس المومنین میں، ڈاکٹر محمد معین الدین نے اعیان الشیعہ میں اور ڈاکٹر صفا نے تاریخ ادبیات ایران میں سید علی ہمدانی کو شیعہ قرار دیا ہے۔

شیعہ مجتہد مفتی جعفر حسین لکھتے ہیں: "کشمیر میں سید علی ہمدانی اور میر شمس عراقی کے دور میں شیعیت نے ترقی کی اور اب آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر دونوں میں شیعہ آباد ہیں۔"

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۹۰ جلد ۱۱)

فاضل مضمون نگار۔ پروفیسر سید کمال الدین چشتی کے مقالے پر اپنے شدید رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "سب سے اہم ایک بات یہ ہے کہ مقالہ نگار نے اہل سنت کے جن مسلمہ ائمہ و دعاۃ اور نامور ہستیوں کو زمرہ شیعہ میں شمار کیا ہے۔ ان میں مشہور داعی اور صوفی باصفا سید امیر کبیر علی ہمدانی علیہ الرحمۃ والرضوان بھی ہیں یہ وہی سعی نامشکور ہے جو عہد جہانگیری کے مشہور شیعہ عالم جناب قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں ماضی میں کی تھی اور ماضی قریب میں جناب ڈاکٹر محمد معین الدین مؤلف اعیان الشیعہ اور ڈاکٹر صفا مؤلف تاریخ ادبیات ایران نے کی ہے۔"

(ماہنامہ دار العلوم دیو بند صفحہ ۳۹، ۴۰ دسمبر ۱۹۹۳ء)

حضرت محترم! جب خود آپ کے بقول "سید ہمدانی کی تحریروں میں بلا شبہ کہیں کہیں شیعی فکر و نظر کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کے اہل بیت سے اظہار محبت و عقیدت میں مطلوبہ احتیاط کی بجائے غلو کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ ان کے افکار و نظریات اور تحریروں میں دیگر صوفیانہ تحریروں کی طرح شیعی اثرات سے انکار نہیں ہے۔" اس کے علاوہ شیعہ مورخین اور مجتہدین نے بھی سید علی ہمدانی کو شیعہ کے مسلمہ دعاۃ اور مبلغین میں شمار کیا ہے۔ تو پھر آپ ایسی متنازعہ شخصیت کو اہل سنت کے اکابرین میں شامل کرنے پر کیوں اصرار کر رہے ہیں؟ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہل تشیع مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ عبد العزیز اور امام اہلسنت مولانا عبد الشکور لکھنوی کو زمرہ شیعہ میں کیوں نہیں شمار کرتے؟ یہ الگ بات ہے کہ بعض "غالی" سنیوں نے شاہ ولی اللہ اور شاہ عبد العزیز کو بھی شیعہ قرار دے دیا ہے۔ چنانچہ شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں کہ:

"اسلامی ہندوستان کی مذہبی زندگی میں شاہ ولی اللہ کی عظمت اور اہمیت زیادہ تر تو ان کی علمی اور دینی خدمات کی وجہ سے ہے لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ علماء یا متصوفین کے کسی خاص گروہ کی ترجمانی نہیں کرتے بلکہ اپنے وسیع علم اور تیز قوت ادراک کی مدد سے مختلف فریقین کے نقطہ نظر کو سمجھ کر ان کو باہم تطبیق دیتے ہیں اور ہندوستان میں اشاعت اسلام کے حالات کچھ ایسے تھے کہ یہاں اس کی بڑی ضرورت ہے۔

شیعہ سنی خیالات کی تطبیق: ہندوستان کے مسلمان بیشتر سنی ہیں لیکن ان پر شیعہ اثرات بھی کثرت سے کارفرما ہے۔ اسلامی ہندوستان کی دفتری اور ادبی زبان فارسی ہے اور ایران میں شیعہ مذہب اختیار ہونے کے بعد وہاں سے متعدد شیعہ علماء، شعراء، فلسفی ہندوستان آتے رہے اور بعد میں خود ہندوستان میں پیدا ہوئے جن کا اثر ان کی تعداد کے تناسب سے بہت زیادہ ہے۔ اب اگر شیعہ، سنی مسئلہ میں کوئی عالم اسی طرح غلو کرے جس طرح نجد یا ماوراء النہر میں کیا جاتا ہے اور دوسرے فریق کا نقطہ نظر سمجھے بغیر ایک فریق کے خیالات پر شدت سے مصر ہو تو وہ قوم میں اختلاف بڑھ جائے گا۔ خوش قسمتی سے شاہ ولی اللہ نے اس معاملے میں ایک احسن طریق عمل اختیار کیا۔ جس کو خواہ دونوں فرقوں کے غالی طرف دار پسند نہ کریں لیکن اہل انصاف اس کی ضرور قدر کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے ان مسائل پر جن کی وجہ سے شیعہ سنی اختلافات پیدا ہوئے کئی سیر حاصل کتابیں لکھیں۔ ازالۃ الخفاء میں انہوں نے بالتفصیل مختلف خلفاء کے خصائل اور ان کے حق خلافت پر تبصرہ کیا اور اپنی رائے یہ ظاہر کی کہ رسول کریم ﷺ کے قطعی اشاروں کے مطابق خلفاء کی ترتیب وہی ہونی چاہئے تھی جو فی الواقع ہوئی۔ لیکن حضرت علیؓ کے فضائل گننے میں آپ کسی شیعہ سے پیچھے نہیں رہے۔ بلکہ فیوض الحرمین میں کہتے ہیں کہ میری طبیعت اور میری فکر کو جب اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ دونوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فضیلت دیں اور دونوں کو حضرت سے شدید محبت ہے۔ اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ تفضیل شیخین کا عقیدہ ایک ایسی چیز ہے کہ میرے ذاتی میلانات کے خلاف مجھے اس کے ماننے کا حکم ہوا۔ افسوس ہے کہ مجھ میں اس طرح کی متناقض اور متضاد باتیں ہیں لیکن مجھ میں جو شدید جامعیت (یعنی تمام باتوں کو دھیان میں رکھنے کی خاصیت) ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے۔

ایک انتہا پسند سنی نے آپ (شاہ ولی اللہ) سے پوچھا کہ کیا شیعوں کو کافر سمجھا جائے تو

آپ نے نہ مانا اور کہا کہ اس معاملے میں حنفی علماء میں اختلاف ہے وہ برہم ہو گیا اور کہنے لگا یہ تو شیعہ ہے۔ یہ روایت خود شاہ عبدالعزیز کی ہے۔ شاہ عبدالعزیز کا حافظ آفتاب نامی ایک پٹھان شاگرد تھا جو ہمیشہ حاضر درس ہوتا تھا۔ ایک دن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ذکر ہو رہا تھا۔ اور شاہ صاحب نے ان کے بجان و دل فضائل و مناقب بیان کیے تو وہ اتنا بگڑا کہ شاہ صاحب کو شیعہ سمجھا اور ان کے درس میں شریک ہونا بند کر دیا۔"

(رود کوثر صفحہ ۵۷۰،۵۷۹)

مولانا مناظر احسن گیلانی بعنوان "شیعہ سنی نزاع کے متعلق شاہ صاحب کا کام" لکھتے ہیں کہ:

"ہندوستان میں پہلے تورانی سنی، پھر ایرانی شیعہ اور آخر میں متشدد سنی روہیلوں کی شکل میں داخل ہوئے۔ ان تینوں عناصر کے امتزاج سے تسنن و تشیع کے سلسلہ میں عجیب افراط و تفریط کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں بھی بڑا کام کیا بڑی محنت سے ہزار ہا ہزار صفحات کو پڑھ کر آپ نے چاروں خلفاء کے واقعی حالات ازالۃ الخفاء میں ایسے دلنشین طریقہ سے مرتب فرمائے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اگر شیعوں کی غلط فہمی کا ازالہ ہو جاتا ہے تو اسی کے ساتھ ان غالی سنیوں کی شدت و تیزی میں بھی کمی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو محض اس لئے کہ شاہ عبدالعزیز نے تنہا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مناقب کیوں بیان کیے؟ یا شاہ ولی اللہ نے شیعوں کی تکفیر میں فقہاء حنفیہ کے اختلاف کو کیوں بیان کیا؟ ان پر بھی شیعیت کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں۔"

(تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ صفحہ ۳۳۶)

شاہ صاحب کا دور ۱۱۱۴ھ تا ۱۱۷۶ھ ہے۔ اس دور کے حالات مغلیہ سلطنت کے تحت پیچھے گذر چکے ہیں اورنگزیب عالمگیر کے لڑکے بہادر شاہ اول نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے شیعہ ہونے کا اعلان کر دیا تھا اور اس کے بعد بھی جو حضرات برسر اقتدار آتے رہے وہ بے چارے شاہ شطرنج کی حیثیت رکھتے تھے۔

اسی دور میں نہ صرف دہلی بلکہ پورے ہندوستان پر "سید برادران" کا غلبہ رہا۔ شاہ عبدالعزیز کے دور میں شیعہ امراء نجف خان، مزین العابدین برادر مرزا نجف خان، نجف قلی خان، محمد بیگ ہمدانی اور اسماعیل بیگ ملکی سیاست پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے۔

ان لوگوں کے اقتدار، تشیع کے عام غلبہ اور نوابان اودھ کے سیاسی اثر و استیلاء کی وجہ

سے شاہ عبدالعزیز نے تحفہ اثنا عشریہ میں بحیثیت مصنف اپنا نام لکھنا مناسب نہ سمجھا اور انہوں نے مصنف کی حیثیت سے اپنا غیر معروف (تاریخی) نام غلام حلیم بن شیخ قطب الدین احمد (شاہ ولی اللہ کا نام قطب الدین احمد بھی تھا) لکھا ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنی کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" کی وجہ تالیف ہی یہ بتائی ہے کہ ہمارے زمانے اور ہمارے شہروں میں شیعہ مذہب کی اشاعت کی اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ شاید ہی کوئی گھر ہوگا جس میں ایک دو آدمی اس مذہب کے قائل اور شیعہ خیالات سے متاثر نہ ہوں"۔ شاہ صاحب کے اپنے گھر میں ان کے قریبی عزیز اور مشہور فارسی شاعر میر قمر الدین منت نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔

بیہقی وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۲۲۵ھ) لکھتے ہیں کہ "اس وقت دیار ہند میں مذہب اثنا عشریہ ظاہر ہو رہا ہے۔ جہالت و حماقت کی وجہ سے بہت لوگ خصوصاً پانی پت کے بعض افراد جن کے باپ دادا، سنت و ایمان کے حامل تھے گمراہ ہو گئے ہیں۔"

{السیف المسلول، للسنة العلیا علی الذین فرقوا دینهم و کانوا شیعاً صفحہ ۱۲}

ایسے نازک دور میں تحفہ اثنا عشریہ کی تالیف شاہ صاحب کا عظیم کارنامہ ہے۔ یہ کتاب شیعہ سنی مسائل کا ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اہل تشیع کے متعلق شاہ صاحب کا نقطہ نظر پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ ان بزرگوں کے دور میں شیعہ لٹریچر عام نہیں تھا اور اس مذہب کی امہات کتب تک اکابرین کی رسائی نہیں تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ اہل تشیع تقیہ کی چادر بھی زیب تن کیے ہوئے تھے مگر اس کے باوجود شاہ ولی اللہ صاحب انہیں عقیدہ عصمت ائمہ کی رو سے منکر ختم نبوت قرار دیتے ہیں اور حضرات شیخین کو اہل جنت میں سے نہ ماننے والوں کو زندیق اور واجب القتل قرار دیتے ہیں۔ اس کی تفصیل آگے بعنوان "شیعہ اکابرین امت کی نظر میں" ملاحظہ فرمائیں۔

بہر حال اہل تشیع نے مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی اور دیگر اکابرین کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ بھی شیعہ تھے۔ سوال یہ ہے کہ انہوں نے سید علی ہمدانی کے متعلق ایسا دعویٰ کیوں کیا؟ اس کا صاف اور آسان جواب یہ ہے کہ

شاہ ہمدان کے عقائد میں شیعی افکار و نظریات کی آمیزش پائی جاتی ہے اور ان کی "مساعی جمیلہ" سے کشمیر میں شیعیت کو فروغ حاصل ہوا۔ جس کا اعتراف مفتی جعفر حسین نے بالفاظ ذیل کیا ہے کہ:

"کشمیر میں سید علی ہمدانی اور میر شمس عراقی کے دور میں شیعیت نے ترقی کی۔"

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۹۰ جلد ۱۱ پنجاب یونیورسٹی لاہور)

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ سید علی ہمدانی نے کشمیر میں "تصوف" کے لبادے میں شیعیت کو فروغ دیا تھا اور آج بھی ان کی پیروی میں بے شمار اہل تصوف اور گدی نشین حضرات شیعیت کے پرچار میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ ان سنی نما رافضی پیروں کے چہروں پر سے نقاب الٹنے کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ تاہم اس ضرورت کو کافی حد تک پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے اپنی مایہ ناز کتاب "تاریخ تصوف" میں پورا کر دیا ہے۔

دیکھنے میں تم ہو صوفی تو عقائد میں سبائی
یہ بنی ہیں جنہیں دیکھ کر شرمائیں بہائی

تصوف اور شیعیت

تصوف کی اہمیت، اس کی حقیقت اور اس کی تاریخ موضوع سے خارج ہے یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ بعض صوفیاء نے تصوف کے لبادے میں بھی شیعیت کو تقویت پہنچائی۔ اہل تشیع نے مختلف ادوار میں تصوف کی آڑ میں اپنے مذہب کی خوب نشر و اشاعت کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج تصوف میں شیعی افکار و نظریات بکثرت سرایت کئے ہوئے ہیں۔

اسلام دشمن تحریکات میں سے تحریک رفض و سبائیت سب سے زیادہ منظم، مربوط، طاقتور اور خطرناک ہے۔ اس نے مسلم معاشرے کے مختلف شعبہ ہائے زندگی پر زبردست اثرات چھوڑے ہیں مگر تاریخ اور تصوف پر اس کی زد دیگر شعبوں سے کچھ زیادہ پڑی ہے۔ جس کے اثرات و نتائج بہت ہی دوررس اور مضر برآمد ہوئے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تصوف کے جبہ میں اپنے مزاج کے لحاظ سے سبائیت، باطنیت اور شیعیت کو اپنا اثر و رسوخ بڑھانے میں سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تاریخ و تصوف میں علم حدیث کی طرح زین رجال فن کی سخت پہرہ داری اور جانچ پڑتال کا اہتمام نہیں تھا اس لئے شیعیت کو مختلف سمتوں سے تاریخ و تصوف میں گھس بیٹھنے کا موقع بآسانی مل گیا۔ جس سے بعض صوفیا تو کلی طور پر اور بعض حضرات جزوی طور پر متاثر ہو گئے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: "صوفیہ کی کتابوں میں رجعنا من الجهاد الا صغر الی الجهاد الاکبر" کو صحیح حدیث کہا گیا ہے لیکن عسقلانی کا قول ہے کہ امام نسائی نے اسے ابراہیم بن عیسلہ کا کلام بتایا ہے۔ الفاظ کی رکاکت زبردست قرینہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا قول نہیں ہو سکتا اور نہ حدیث کی متداول کتابوں میں شاہ عبدالعزیز جیسے متبحر محدث نے دیکھا ہے۔ پس احادیث اور غیر احادیث کا فیصلہ محدثین کے اصول و قواعد کی رو سے کیا جائے گا۔ کیونکہ ہر فن میں صاحب فن کی رائے اگر تسلیم نہ کی جائے تو امان اٹھ جائے گا اور شریعت کا بھرم جاتا رہے گا۔ بے چارے صوفیہ جن پر حسن ظن کا غلبہ ہوتا ہے۔ بھلا ان حضرات کو تنقید و تفتیش کی کہاں فرصت اور انہیں نہ اس کی عادت ہے بس جو سن لیا یا دیکھ لیا اسے باور کر لیا۔ ان کے حسن ظن سے کسی قول کا حدیث رسول ﷺ ہونا ثابت نہیں ہو جائے گا۔" (مکتوبات شیخ الاسلام صفحہ ۳۰۰ جلد ۱)

جس زمانہ میں قرامطہ نے اپنی تبلیغی سرگرمیاں شروع کیں تو اس وقت مسلمانوں میں تصوف کا آغاز ہو چکا تھا۔ قرامطہ نے صوفیوں کے حلقوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو صوفی ظاہر کیا یعنی تصوف کے لبادے میں لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کیا اور اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش کر کے ایران میں اس غیر اسلامی تصوف کی بنیاد رکھ دی۔ جو رفتہ رفتہ تمام مسلمانوں میں شائع ہو گیا۔ اس سلسلے میں صوفیوں کے "بیکتاشی فرقے" کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔

اس سلسلے کا بانی حاجی بیکتاش ولی جو ۶۸۰ھ /۱۲۸۱ء میں خراسان (اسماعیلی دعاۃ کے مرکز) سے اناطولیا میں آیا تھا۔ بیکتاشی فرقے کے عقائد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اللہ حقیقت واحدہ ہے ۲۔ محمد ﷺ اور علیؓ دونوں اللہ کے مظاہر خاص ہیں۔

۳۔ اللہ، محمد ﷺ اور علیؓ تینوں میں عینیت کا علاقہ ہے

۴۔ محمد ﷺ اور علیؓ درحقیقت ایک ہیں یا ایک شخص کے دو نام ہیں۔

حضرت علیؓ کے بارے میں اس سلسلے کے صوفیوں کے جو عقائد ہیں اس کا اندازہ "خطبۃ البیان" سے ہو سکتا ہے۔ جو اس سلسلہ کی بہت معتبر کتاب ہے۔ اس میں تحریر ہے کہ حضرت علی فرماتے ہیں: کہ

۱۔ میرے پاس مفاتیح الغیب ہیں جن کو محمد ﷺ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ نیز عزرائیل میرا تابع فرمان ہے۔

۲۔ میں لوح محفوظ ہوں، میں جنۃ اللہ ہوں، میں جنۃ الانبیاء ہوں۔

۳۔ میں قسیم النار والجنۃ ہوں، میں اللہ کا ول ہوں، میں نوح اول ہوں۔

۴۔ میں ذوالقرنین ہوں۔ میں عالم ما کان وما یکون ہوں۔ میں قیوم اسماء ہوں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اہل تشیع تصوف کے لبادے میں بھی اپنے مذہب کو فروغ دیتے رہے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے اسماعیلی شیعوں نے پیری مریدی کے ذریعے اپنے قدم جمائے پھر اثنا عشری شیعوں نے ان کی پیروی کی۔ چنانچہ ذاکر حسین رقم طراز ہیں کہ:

"ہندوستان میں جن حضرات نے تصوف کے پردہ میں تبلیغ دین فرمائی ان کو تمام تر سنی المذہب قرار دینا غلط ہے۔ اس لئے کہ اثنا عشری اور اسماعیلی شیعہ بھی تصوف کے بھیس میں ایران سے ہندوستان آتے رہے ہیں اور اپنے اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے رہے ہیں۔ نزاری اور مستعلی اسماعیلیوں کی تبلیغ تمام تصوف کے پردے میں ہوئی ہے۔ چنانچہ نزاریوں کے پیر صدر الدین اور حسن کبیر الدین اس سلسلے میں کافی شہرت رکھتے ہیں اثنا عشری علماء و مبلغین بھی تصوف کے پردے میں ہندوستان میں تبلیغ کرتے رہے۔ جن کا ایک واضح اشارہ ابوالفضل نے بھی آئین اکبری میں کیا ہے۔" (اردو شیعہ اور شاہی سرپرستی بحوالہ ہندوستان میں مسلم فرقہ واریت صفحہ ۲۵)

اہل تشیع اور اہل تصوف دونوں حضرت علیؓ کو شاہ ولایت تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ولایت کا درجہ خلافت اور بعض کے نزدیک نبوت سے بھی افضل ہے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں کہ:

"اس میں گفتگو ہے کہ نبوت افضل ہے یا ولایت مگر اس پر اتفاق ہے کہ ولی سے نبی افضل ہے کیونکہ وہ نبوت و ولایت کے جامع ہوتے ہیں۔ جو حضرات نبوت کی افضلیت کے قائل ہیں وہ نبی کی افضلیت سے استدلال کرتے ہیں اور جو ولایت کی افضلیت کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ ولایت میں توجہ الی الحق (صرف خدا کی طرف توجہ) ہے اور نبوت میں توجہ الی الخلق (مخلوق کی طرف توجہ) ہے۔ چونکہ خدا کی طرف توجہ مخلوق کی طرف توجہ کرنے سے افضل ہے پس ولایت افضل ہوئی۔ مگر دونوں فریق میں نزاع لفظی ہے۔" (شریعت و طریقت صفحہ ۳۰۶)

حضرت علیؓ کو "شاہ ولایت، سید الاولیاء، امام اولیاء اور سید الاوصیا" کا درجہ حاصل ہے۔ جب عام ولی کا درجہ بقول بعض نبی سے افضل یا بقول بعض برابر یا یا بالفرض نبی سے کم بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس کا درجہ "بالاتفاق" خلافت سے تو افضل ہی سمجھا جائے گا۔

اسی لئے تصوف کے تمام سلاسل کے شجروں کا اختتام بعد از نبی اکرم ﷺ شاہ ولایت حضرت علیؓ پر ہوتا ہے۔ خلفائے ثلاثہؓ کے اسمائے گرامی اس فہرست میں شامل نہیں کئے گئے صرف سلسلہ نقشبندیہ میں بعض حضرات کے نزدیک حضرت ابوبکرؓ کا نام موجود ہے۔ حضرت امداد اللہ مہاجر مکی نے اس سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ کی بجائے حضرت علیؓ کا نام ہی شامل کیا ہے۔ (کلیات امدادیہ صفحہ ۹۹)

اسی طرح مولانا حسین احمد مدنیؒ نے بھی شجرہ نقشبندیہ میں حضرت ابوبکرؓ کا ذکر نہیں کیا۔ (سلاسل طیبہ صفحہ ۲۲) سلسلہ نقشبندیہ کی جس ایک روایت میں حضرت ابوبکرؓ کو شامل کیا گیا ہے وہ بھی اصول درایت کے خلاف ہے۔ انجمن خدام الدین لاہور نے خلیفہ غلام محمد صاحب دین پوریؒ کی سوانح حیات "ید بیضاء" شائع کی ہے اس میں یہ شجرہ یوں تحریر کیا گیا ہے:

"حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیقؓ، حضرت خواجہ سلمان فارسیؓ، امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ" (ید بیضاء صفحہ ۳۶)

اس میں حضرت ابوبکرؓ کے بعد سیدنا سلمان فارسیؓ کے نام کے ساتھ "خواجہ" کا لاحقہ بھی عجیب ہے۔ نیز یہ بزرگ بعہد عثمانؓ ۳۳ھ میں مدائن میں فوت ہوئے اور قاسم بن محمد کی ولادت ۲۹ھ میں مدینہ منورہ میں ہوئی۔ اول تو ان کے مابین ملاقات ہی ثابت نہیں اور اگر بالفرض ثابت بھی ہو تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سلمان فارسیؓ نے صدیق اکبرؓ کا سارا روحانی اور باطنی "علم چار سالہ صغیر السن قاسم کو منتقل کر دیا۔ فیا للعجب! جبکہ محمد بن ابی بکر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رحلت کے وقت عالم شیر خوارگی میں تھے۔

تفضیلیت

تفضیلیت کا عقیدہ (حضرت علیؓ کو خلفائے ثلاثہؓ سے افضل سمجھنا) تقریباً اہل تصوف کا شعوری یا غیر شعوری طور پر شعار بن گیا ہے۔ کیونکہ اہل تشیع نے مذہب شیعہ کے فروغ کے ساتھ ساتھ اہل سنت کی صفوں میں سنی بن کر تقیہ کے لبادے میں تفضیلیت کا بھی باقاعدہ

پرچار کیا جو شیعیت میں داخل ہونے کا پہلا زینہ ہے اس مقصد کے لئے انہوں نے دیگر صوفیاء کی خدمات بھاری نذرانوں کے عوض حاصل کیں جنہوں نے بطریق احسن یہ فریضہ سرانجام دیا۔ تصوف کی ابتدائی تاریخ سے قطع نظر علی ہمدانی ... یہ علی ہمدانی نے اس کی بنیاد رکھی جس پر ان کے وفادار اور مخلص مریدوں (خواجہ اسحٰق، نور بخش اور میر شمس الدین وغیرہ) نے شیعیت کی ایک بلند و بالا عمارت تعمیر کر دی۔

شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں تفضیلی عقائد کی نشر و اشاعت میں حضرت شاہ فخر الدین دہلوی (م ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء) نے سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ باقاعدہ شیعہ حضرات کو بیعت کرتے تھے۔ امام باڑے جاتے۔ ایک روپیہ نذر کرتے اور پانی کی سبیل لگاتے یہاں تک شیعہ لوگ انہیں شیعہ اور سنی ان کو سنی سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ شاہ عبدالعزیز نے شیعوں کے بیعت کرنے پر شاہ فخر الدین پر اعتراض کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ شیعہ اس طرح (بیعت کرنے سے) سب و شتم اور تبرا سے باز آجاتے ہیں۔ {بحوالہ ملفوظات شاہ عبدالعزیز صفحہ ۱۱۶۔۷۹}

اسی اختلاط کی وجہ سے شیعہ معتقدات کی اشاعت عوام اہل سنت میں ہوئی اور وہ "پنج تن پاک، یا علی مدد، ائمہ معصومین، چہاردہ معصومین، بارہ امام، ائمہ طاہرین، بی بی کی صحنک، امام ضامن اور دیگر شیعی شعائر و معتقدات اور رسومات سے متاثر ہو گئے۔

"امام ضامن" کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ عراق کے ساتھ جنگ کے دوران خمینی صاحب اپنے فوجیوں کو امام ضامن باندھتے اور ان میں "تذکر غفران" تقسیم کرتے تھے۔ آج اکثر شیعہ اور نیم شیعہ کے ہاتھ میں "مولائی کڑا" بندھا ہوا ہوتا ہے۔ جو شیعیت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ کچھ جاہل سنی لاشعوری طور پر بھی یہ کڑا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت آئی۔ ایس۔ آئی کے سابق سربراہ، سابق جنرل، جدید تعلیم یافتہ اور مشہور اسلام پسند لیڈر جنرل حمید گل صاحب کے "کڑا" پہننے پر ہوئی۔ ایک مشہور کالم نگار جناب راجہ محمد انور صاحب لکھتے ہیں کہ:

"سابق چیف جسٹس سید سجاد حسین شاہ کے اعزاز میں اسلام آباد میں ایک عشائیہ دیا جس میں ریٹائرڈ جنرل حمید گل جو ابھی شام ایران کے دورے سے واپس آئے تھے۔ بھی شامل ہوئے ان کے ہاتھ میں "مولائی کڑا" لگا ہوا تھا۔ جو اہل تشیع کے ساتھ محبت کی علامت

تھی۔ جون ۱۹۹۸ء میں دائیں کلائی میں "مولائی کڑا" موجود تھا۔ جو موصوف نے غالباً تشیع کی محبت میں ایران میں پہنا ہوگا۔ (روزنامہ اوصاف ۲۱ فروری ۱۹۹۹ء ص)

حضرت شاہ فخر الدین دہلوی کے خلیفہ شاہ نیاز احمد بریلوی (م ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء) روہیل کھنڈ میں تفضیلی عقائد کے سب سے بڑے مبلغ ہیں۔ ان کے افکار سمجھنے کے لئے صرف ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے:

"ایک روز ایسا ہوا کہ آپ وقت معین پر خانقاہ میں تشریف نہیں لائے۔ ظہر کا وقت گذر گیا اور عصر کا وقت قریب آ گیا اس وقت خادمان و غلامان موجود خانقاہ اس خلاف معمول امر سے سخت پریشان ہوئے۔ اور زنانہ مکان کی ڈیوڑھی پر حاضر ہو کر سبب عدم تشریف آوری کا دریافت کرنے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ میرے خانقاہ نہ آنے کا یہ باعث ہے کہ تم خانقاہ میں ایک کتاب لائے ہو جس میں مولا علی کی شان میں طریق گستاخانہ کا استعمال کیا ہے۔ اس کتاب کو ہماری خانقاہ سے باہر کرو جب خانقاہ میں آئیں گے۔ یہ سن کر حاضرین میں سے ایک صاحب نے معذرت کی کہ فی الحقیقت یہ خطا مجھ سے ہوئی ہے۔ آج دوپہر کو میں ایک دوست سے کتاب تحفہ اثناعشریہ پڑھنے کے لئے خانقاہ میں لے آیا تھا۔ اب فوراً کتاب واپس کرتا ہوں۔"

(راز و نیاز صفحہ ۹ جلد احوالات و ملفوظات شاہ نیاز احمد بریلوی)

شاہ نیاز احمد کے بعد شاہ دلدار علی (م ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء) مشہور تفضیلی بزرگ گذرے ہیں۔ انہوں نے روہیل کھنڈ میں سب سے پہلے حضرت علیؑ کا میلاد شریف "میلاد مصطفوی مرتضوی" لکھا اور مروج کیا۔ اسی طرح حضرت علیؑ کا ایک سہرا لکھا جو اکثر شادی کے موقع پر جاتا ہے۔ اس سہرے کا پہلا شعر یہ ہے:

علی نوشہ بنا سہرا بندھا مشکل کشائی کا ملا خلعت نبی سے خلق کی حاجت روائی کا

اودھ میں تفضیلیت کی اشاعت تکیہ کاکوری کے مشہور قلندر یہ مشائخ کے ذریعہ ہوئی۔ سہارن پور، میرٹھ، مظفر نگر اور بلند شہر میں بھی تفضیلی عقائد تیزی سے پھیلے ان میں بعض شیعہ ہو گئے۔ نانوتہ کے صدیقی شیخ زادگان میں شیخ تفضل حسین بن شیخ علی محمد شیعہ ہو گئے تھے

(حوالہ مذکور صفحہ ۳۲ جلد ۱)

اس معاشرتی اختلاط کے علاوہ شیعہ اور سنی کے مابین سلسلہ مناکحت بھی جاری تھا

مولانا محمد قاسم نانوتوی لکھتے ہیں کہ:

"وہ علاقہ جو میری جنم بھومی اور وطن ہے وہاں شیعوں اور سنیوں میں بڑا اختلاط ہے قرابت و رشتہ داری باہم مضبوط و مستحکم ہیں۔"

(خطوط تحریر صفحہ)

دیوبند کے ایک عثمانی شیخ زادے شیخ احمد بن مولوی محمد وجیہ الدین عثمانی نے تفضیلیت کے بعد شیعہ مسلک اختیار کیا اور اس کی تبلیغ کے لئے ایک کتاب "انوار الہدیٰ" لکھی۔ اس میں موصوف لکھتے ہیں کہ:

"خاکسار ذرۂ بے مقدار شیخ احمد بن جناب مولانا مولوی محمد وجیہ الدین صاحب عثمانی ساکن دیوبند۔ خدمت ارباب تحقیق میں عرض کرتا ہے کہ سن شعور سے از روئے عقیدہ آبائی یہ عاجز متمسک طریقہ اہل سنت والجماعت کا تھا اور اس مذہب کے حق ہونے پر نہایت درجہ غلو رکھتا تھا۔ اور فرقہ شیعہ سے بالخصوص ایک قسم کی نفرت تھی مگر خارج از مذہب ایک یہ عقیدہ کہ جناب علی مرتضیٰ جمیع صحابہؓ سے افضل ہیں حقیقت ورثہ پدری میں پہنچا تھا اور اگرچہ متمسکان طریقہ امامیہ سے ایک کاوش تھی لیکن اس عقیدہ پر نہایت مستقل طور سے قائم تھا اب بالکل یقین اس بات کا ہو گیا کہ مذہب اہلسنت والجماعت کسی طرح مذہب حق نہیں ہے بلکہ مذہب امامیہ اثنا عشریہ برحق ہے اور معلوم ہوا کہ میاں جعفر زٹلی کا یہ قول صحیح ہے کہ "اسنی متمسک مذہب ناحق بزور مجادلہ"

(انوار الہدیٰ صفحہ)

یہ حضرات بعض اوقات امام مسجد بن کر بھی اہلسنت کی مساجد میں امامت کے فرائض انجام دیتے اور اس طرح اپنے مسلک کی تبلیغ کرتے رہے ہیں۔

ایک مشہور شیعہ مشنری لقا حیدری بدایونی لکھتے ہیں کہ:

"رنگون کی مجالس کے سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پہلے دن چاند و صاحب (مہتمم مجالس) نے فرمایا کہ بنگالی مسجد کے امام چاہتے ہیں کہ آپ کی تقریر سے پہلے کچھ بیان کریں میں نے منظور تو کر لیا لیکن یہ اندیشہ ہوا کہ اگر انہوں نے کچھ ہمارے عقیدے (شیعی مسلک) کے خلاف بیان کیا تو مجبوراً جواب دینا پڑے گا۔ بہرحال وہ جناب مجلس میں تشریف لائے سن کا حلیہ یہ تھا بہت لمبی داڑھی عمامہ و جبہ ملبوس عصا ہاتھ میں متعدد رنگ برنگ کی تسبیحیں گلے میں ڈالے۔ لوگ تعظیم کو کھڑے ہوئے۔ میں نے بھی تعظیم کی۔

دعا کی۔ چند منٹ کے بعد منبر پر تشریف لے گئے۔ پہلے ایک قاری قصیدہ حضرت امیر المومنین کی شان میں شمس تبریز یا کسی دوسرے نامی صوفی کا پڑھا پھر چند منٹ کچھ فضائل اہل بیت اور خاتمہ پر جناب علی اصغر کی شہادت بیان کی۔ تقریر کے بعد کہنے لگے میں تقریر کرنے نہیں آیا تھا صرف حیدری صاحب کا بیان سننے آیا ہوں۔ وہ منبر سے اترے اور میں نے ایک گھنٹے کے قریب فضائل و مصائب حضرات اہل بیت اطہار بیان کیے۔ لوگ بے حد متاثر ہوئے۔ ختم تقریر کے بعد مجھ سے گلے ملے اور میرے کان میں کہا: "نجم الحسن سے کہہ دینا کہ علی حسین ملا تھا۔" جب میں نے لکھنؤ پہنچ کر قبلہ و کعبہ سے یہ سارا واقعہ بیان کیا بے ساختہ کھل کھلا کر ہنس پڑے اور فرمایا یہ مفتی صاحب اعلی اللہ مقامہ کے شاگرد ہیں۔"

(سرگزشت مولانا علی حیدری صفحہ ۳۵ تا ۳۷ بحوالہ ہندوستان میں مسلم فرقہ واریت ۳۴)

اس طرح کی بیسیوں مثالیں موجود ہیں یہاں صرف دو مثالیں مزید ہدیہ قارئین کی جاتی ہیں۔

۱۔ خواجہ حسن نظامی چشتی دہلوی ایک مشہور بزرگ گذرے ہیں انہوں نے جریدہ "پیشوا" دہلی کے علی نمبر کے لئے ایک مضمون بہ عنوان "علی ولی اللہ" تحریر کیا۔ جس میں یہ بتایا گیا کہ حضرت ابوبکر صدیق غار ثور میں دشمنان دین کی آمد کی آہٹ سن کر حزن میں مبتلا ہوئے اس سے ان کا کمال ولایت ثابت نہیں ہوتا اور حضرت علی شب ہجرت میں بے خوف و حزن بستر رسول ﷺ پر لیٹے رہے اور بموجب آیہ کریمہ "اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" بیان کے کمال ولایت پر واضح دلیل ہے۔

مولانا ظہور احمد بگوی نے اس کے جواب میں ایک مضمون بہ عنوان "افضل البشر بعد الانبیاء" لکھا جو ماہنامہ شمس الاسلام بھیرہ شمارہ جنوری ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں موصوف فرماتے ہیں کہ:

"خواجہ صاحب نے اپنی تصانیف "طمانچہ بر رخسار یزید، محرم نامہ، یزید نامہ" وغیرہ میں بھی اہلسنت کے مسلک کے خلاف روش اختیار کی ہے۔ دراصل خواجہ صاحب غالی تبرائی اور تقیہ باز رافضی ہیں۔ ہم بھی چشتی نظامی ہیں اور حضرت سیدنا علیؓ ہمارے روحانی پیشوا ہیں مگر حضرت سیدنا علیؓ کے ارشادات کی بناء پر سیدنا ابوبکر صدیقؓ کو افضل البشر بعد الانبیاء ماننے پر مجبور ہیں۔ علامہ ابن میثم بحرانی نے شرح نہج البلاغہ میں سیدنا علیؓ کا ایک اعلان نقل کیا ہے۔ جو کہ آپ نے

اپنی خلافت کے زمانے میں تمام بلاد اسلامیہ میں کیا تھا۔ جس کے الفاظ درج ذیل ہیں:

"من فضلنی علی ابو بکر جلدہ حد المفتری" "جو مجھے ابو بکر پر فضیلت دے گا میں اسے مفتری کی حد (اسی درّے) لگاؤں گا۔

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ازالۃ الخفاء میں اسی سندوں سے حضرت علی کا یہ قول نقل کیا ہے:

"خیر الامۃ بعد نبیھا ابی بکر ثم عمر" اس امت میں نبی کے بعد سب سے بہتر ابو بکر پھر عمر ہیں۔

حضرت علی کا یہ فرمان تواتر کا درجہ اختیار کر چکا ہے اور سنی و شیعہ ہر دو مذاہب کی کتب میں موجود ہے۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ میں نہ شیعہ ہوں نہ سنی۔ بس خواجہ آئندہ اپنے آپ کو چشتی نظامی وغیرہ نہ لکھا کریں۔ جو شخص نبی اکرمؐ کے طریقہ یعنی اہلسنت کے خلاف ہو وہ چشتی نہیں ہو سکتا۔ آپ تقیہ کی چادر کو اتار کر بے خوف ہو کر اپنے عقیدہ کا اعلان کر دیجئے۔ آپ نے سنیت کی چادر اوڑھ کر آج تک اپنے زہریلے لٹریچر کے ذریعے رفض کی ترقی و اشاعت کے لئے خاص کوشش کی ہے۔ شکر ہے کہ آج آپ نے اپنے سنی نہ ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ سادہ لوح سنی بھائی آپ کے دام فریب میں نہ آئیں گے۔ (شمس الاسلام بھیرہ صفحہ ۲۴ شمارہ ۲ جون ۱۹۸۶ء)

اسی شمارے کے صفحہ نمبر ۲۸ پر مولانا ظہور احمد بگوی کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے:

"آج غزالی و رازی، رومی و عطار کی جانشینی کا منصب حسن نظامی جیسے سرکاری دوئی کو حاصل ہے۔"

۲۔ دوسری مثال پیر سید محمود شاہ محدث ہزاروی کی ہے جو بقول خود تین صد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں موصوف کے جو القاب درج کیے گئے ہیں ان میں چند حسب ذیل ہیں:

"امام اہلسنت والجماعت، مفتی اہلسنت والجماعت، محقق اہلسنت والجماعت، صدر تنظیم اہلسنت والجماعت، مفتی اسلام، امیر ملت، حکیم ملت، حکیم الامت، فقیہ ملت، امام وقت، حجۃ الاسلام، محدث پاکستان، فخر احناف، بقیۃ السلف، حجۃ الخلف، داعی خلافت، امیر تحریک خلافت، نقیب السادات، نقیب الاشراف، قطب العالم، ناشر خیر و برکت، سراپا رشد و ہدایت، مجاز ہر چہار سلسلہ طریقت، مودب انبیاء و اولیاء، عارف باللہ، فدائے مصطفیٰ، محقق عالم کتاب و سنت،

آستانہ وقت و سیر، ماہر اسرار شریعت و طریقت، شیخ سنت و طریقت، رہبر شریعت، مجدد دوراں، پیر خوش خصال، اسلام کا کمال، صدیق کا جمال، فاروق کا جلال، عثمان کا خیال، حیدر کا نوال، علم ہدایت، مصطفوی کے مجسمہ، مصطفیٰ کی آل، بکفر پر وبال، عالم و فقیر، سید و عارف، دانائے وقت حال، جلّ بے مثال، درویش باکمال، اسلام کی ڈھال"

اثنا عشری شیعہ ڈائجسٹ میں شاہ صاحب کا تعارف حسب ذیل القاب کے ساتھ کرایا گیا۔

"فرید العصر، وحید الدہر، غزالی وقت، رازی دوراں، فقیہ اعظم، مفسر قرآن، وطن پاک کے معمر ترین عالم دین، دنیا بھر کے دس لاکھ معتقدین کے پیر و مرشد، مفکر خلافت اسلامیہ، سینکڑوں کتب کے مصنف، صاحب کمالات و بانی مہتمم جامعہ حنفیہ قادریہ، مجدد ماۃ حاضرہ حضرت علامہ ابو مسعود السید محمود شاہ، المعروف محدث ہزاروی"

(اثنا عشری شیعہ ڈائجسٹ کراچی صفحہ ۵۰ - ۲۰ جولائی ۱۹۹۱ء)

محمود شاہ صاحب تفضیلیت میں بھی پر سبقت لے گئے ہیں اور انتہائی غالی واقع ہوئے ہیں موصوف کے عقائد و نظریات کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيماً۔ اس آیت میں "و علی آلہ" کا لفظ بھی نازل ہوا تھا۔

۲۔ وسلام علیٰ الیاسین کی ایک تفسیر آل یاسین ہے اور آل یاسین سے مراد آل محمد ہے۔

۳۔ آزر کو حضرت ابراہیم کا والد کہنا اور کنعان کو نوح کا بیٹا کہنا کفر ہے۔

۴۔ حضرت علی معصوم ہیں۔

۵۔ جس بخاری میں ایسے ایسے جہنمیوں کی روایات ہوں آنکھ پر پٹی باندھ کر سب کچھ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

۶۔ محبوبان خدا سے تولا اور اہل غضب و ضلالت سے تبرا پر مداومت و ہمیشگی اختیار کرنی چاہیے ایمان ثابت اور کفر ثابت مومن سے متعلق ہے اس کا دوسرا نام تولا و تبرا ہے۔

۷۔ حضرت عثمان کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی صاحبزادیوں کا نکاح بحالت ضرورت شرعیہ لابدیہ اور بصورت عدم استحقاق کل اولیاء ہوئے جیسے نکاح اولاد آدم میں درمیان بہن بھائی کے مروی ہیں ایسے ہی نکاح رقیہ و کلثوم کا عثمان غنی کے ساتھ ہے نہ پہلے ہونے پر اعتراض

ہوسکتا ہے اور نہ وہ اب کے لئے سند جواز بنائے جاسکتے ہیں۔

۸۔ ام کلثوم بنت علیؑ کے حضرت عمرؓ کیساتھ عقد کا افتراء تبرائے ناپاک، واقعہ کاذبہ، غیر صحیح، توہین اہلبیت، تنقیص وایذا و دشنام اہلبیت، بہتان عظیم شرمناک، حیاسوز، تبرائی منقول نا مقبول، علامت رفض و خروج اور قابل صد تردید ہے۔

۹۔ سیدہ کا نکاح کسی غوث، قطب، ولی، بادشاہ، عربی، عجمی، قریشی، مطلبی، عباسی، صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی غیر فاطمی کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ جو اسے جائز کہے وہ اشد حرام کا مستحل ہے اور یہ ایسا کفر ہے جو اس کے مرتکب کے عذاب و کفر میں شبہ و توقف بھی کرے باجماع اہل اسلام اس کے کفر میں بھی کوئی کلام نہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی الحاقی اور عارضی بیویوں کے ساتھ نکاح کرنا ابدی حرام ہے تو ان کی ذاتی، حقیقی اور ابدی نسبت والی بیٹیوں کے ساتھ نکاح کیسے جائز ہوسکتا ہے۔ غیر سیدہ منکوحہ سید کے ساتھ بھی نکاح کرنا حرام ہے۔

۱۰۔ آیت تطہیر میں ازواج مطہرات تبعاً فرعاً داخل ہیں جبکہ اولاد رسول ﷺ اصلاً اور بالذات داخل ہیں۔ اولاد رسول ﷺ کی نسبت رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ذاتی حقیقی اور ابدی ہے جبکہ ازواج مطہرات کی نسبت آپ ﷺ سے الحاقی اور عارضی ہے۔

۱۱۔ اہلبیت و اولاد رسول ﷺ کے ساتھ ایمان لانا افراد امت پر وہ واجب و ضرورت و فریضہ دینی ایمانی ہے کہ اگر یہ نہ پایا جاوے تو سرے سے ایمان ہی ندارد۔ ہر مومن مسلمان سے قرآن اور اولاد رسول ﷺ کے متعلق سوال حق و ثابت ہے۔

۱۲۔ اگر کوئی جائز و مباح و مشروع و درست امر بھی کسی وجہ سے ایذاء اہلبیت اولاد رسول ﷺ کا موجب بنے تو اس کے کرنے کی اجازت نہیں بلکہ وہ ناروا و منع و حرام ٹھہرتا ہے۔ اگرچہ اس کے مشروع ہونے کی نصوص کتاب و سنت تک سے نمایاں ہوں۔

۱۳۔ بلاشبہ سادات حسنی حسینی جو عالم میں موجود ہیں حضور علیہ السلام کی اولاد و عترت ہیں اور یقیناً سادات حسنی حسینی کو حضور سید العلمین کی اولاد ہونے سے بجز انبیاء کے سارے عالم کے لوگوں پر فضیلت و شرف و امتیاز ہے اور کوئی بھی ان کے شرف کو نہیں پہنچ سکتا۔ تبھی تو وہ سید کہلاتے ہیں۔ باقی تمام اہل اسلام جن اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب و درجات کو پہنچتے ہیں قرب الٰہی میں زہد و ریاضت کما کما کر اور کسب تقویٰ سے وہ سب کے سب کہیں نیچے ہیں درجات و مراتب سادات آل

رسول علیہ السلام سے تعلقاً۔

۱۴۔ شاہ صاحب کے نزدیک نبی اکرمؐ کے ساتھ اسلامی نسبت رکھنے والوں کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلبیت (سادات) ۲۔ ازواج مطہرات ۳۔ صحابہ کرامؓ

اول کا تعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذاتی، حقیقی اور ابدی ہے۔ دوم سے الحاقی اور عارضی، اور سوم درجہ والے آپ کی ملازمت و خدمت گاری کی وجہ سے محترم ہیں اس طرح شاہ صاحب نے ازواج مطہرات اور صحابہ کرامؓ پر تا قیامت ہر قسم کے "سید" اور "سیدہ" کا درجہ اور فضیلت بڑھادی ہے۔

۱۵۔ محمود شاہ صاحب زندگی بھر برادر نسبتی رسول صلی اللہ علیہ وسلم، کاتب وحی اور خلیفہ راشد و برحق سیدنا معاویہ کو (العیاذ باللہ) ظالم، باغی، طاغی، منافق، کافر، مرتد، اور شر الملوک کہتے اور کہلاتے رہے اور جو انہیں کافر نہ کہے یا انہیں صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم تسلیم کرے اور ان کے نام کے ساتھ "رضی اللہ تعالیٰ عنہ" کا لاحقہ استعمال کرے تو اسے بھی موصوف نے کافر قرار دیا ہے۔

تفضیلیت کی اس مختصر بحث سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ اس نے کیا کیا رنگ اختیار کئے اور کیا کیا گل کھلائے۔ بلاشبہ یہ شیعیت کا پہلا زینہ ہے جس پر قدم رکھے بغیر کوئی شخص شیعہ نہیں بن سکتا۔ بلکہ علمائے اسلام کے نزدیک تفضیلیت کا قائل دراصل شیعہ ہی ہے۔ شیعیت کی تعریف کتاب کے آغاز میں گزر چکی ہے تفصیل وہاں ملاحظہ کرلی جائے۔

تفضیلیت اور تصوف کا باہمی گہرا ربط اور تعلق ہے اس لیے یہ شعبہ بحیثیت مجموعی شیعیت کے فروغ کا ذریعہ بنا۔ اسی طرح شیعیت نے بھی تصوف کے چشمہ صافی کو خوب گدلا کیا اور اس میں اپنے افکار و نظریات داخل کر دیئے جس کے نتیجے میں حق کے مدعی صوفیاء نے بھی حضرت علیؓ کو "مولائے کائنات، باب مدینۃ العلم اور مشکل کشا تسلیم کرلیا۔ فیا اسفا!

حضرت علیؓ مشکل کشا

حضرت علیؓ کو مشکل کشا کہنا بھی تصوف پر شیعی اثرات کا نتیجہ ہے جس سے بعض علماء حق بھی شعوری یا لاشعوری طور پر متاثر ہو گئے ہیں اور انہوں نے اپنے شجروں میں یہ لکھ دیا ہے کہ

دور کر دل سے حجاب جہل و غفلت میرے رب
کھول دے دل میں در علم حقیقت میرے رب
ہادی عالم علی مشکل کشا کے واسطے

{کلیات امدادیہ صفحہ ۱۰۳، سلاسل طیبہ صفحہ ۱۷، شریعت و طریقت صفحہ ۵۵۵}

ایک پیر طریقت اپنے مریدین و معتقدین کو ہدایت و تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ
"چونکہ دعوات میں توسل کرنا اجابت دعا میں بہت زیادہ مفید اور موثر اور سلف صالحین کا معمول بہ امر ہے اس لئے ان شجروں کو اسی طریق توسل پر ترتیب دیا گیا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ احباب روزانہ کم از کم ایک مرتبہ جونسا بھی شجرہ پسند خاطر ہو پڑھ لیا کریں۔ امید قوی ہے کہ اس طریقہ پر دعا قبول ہوگی۔"
{سلاسل طیبہ صفحہ ۱۷}

ان تمام شجروں میں مذکورہ بالا مصرعہ درج ہے یعنی "ہادی عالم علی مشکل کشا کے واسطے"

حالانکہ قرآن کا واشگاف اعلان ہے کہ

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ {النمل آیت نمبر ۶۲}

بھلا وہ کون ہے جو بے قرار کی پکار سنتا ہے اور مشکل کشائی کرتا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کے سوائی کوئی ایسا نہیں)

آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکل کشائی فرما کر بے قرار کو ہم کنار قرار کرنا اللہ تعالیٰ ہی کا وصف ہے لہٰذا کسی دوسرے کو مشکل کشا سمجھنا شرک ہے۔ بعض صوفیاء حق اپنے اس غلط نظریہ کی یہ توجیہہ کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے شریعت کے بعض مشکل مسائل کو حل کر دیا تھا۔ اس لئے "علی مشکل کشا کے واسطے" سے انہیں علمی و دینی مشکلات حل کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت قاضی مظہر حسین صاحب لکھتے ہیں کہ:

اگر کسی اہلسنت بزرگ نے حضرت علی المرتضیٰؓ کے لیے مشکل کشا کا لفظ استعمال کیا ہے تو دینی و علمی مشکلات حل کرنے والا کے معنی میں نہ کہ اس معنی میں کہ نعوذ باللہ حضرت علی ہماری دنیاوی مشکلات حل کرنے والے، بیماریاں دور کرنے والے اور رزق و اولاد دینے والے ہیں۔
{بشارت الدارین بالصبر علی شہادۃ الحسین صفحہ ۱۵۱، بر حاشیہ}

حضرت علیؓ کیلئے "مشکل کشا" کی اصطلاح کے استعمال پر جب ایک غیر مقلد نے

حضرت قاضی صاحب کی گرفت کی تو جناب حافظ عبدالحق خان بشیر صاحب حضرت قاضی صاحب کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"لفظ مشکل کشا فارسی زبان سے ہے جس کا مفہوم مشکل کھولنے والا، آسان کرنے والا۔ مشکل کشائی کے دو مفہوم ہیں۔ ایک ماتحت الاسباب مشکل کشائی جیسے کسی کو علمی یا مالی وغیرہ مشکل پیش آ گئی اور دوسرے شخص نے معاونت و مشاورت کے ذریعہ اس کی یہ مشکل آسانی کر دی۔

اور دوسرا مافوق الاسباب مشکل کشائی جیسے کسی سے اولاد طلب کرنا، مصائب و آلام سے نجات مانگنا، بیماری سے شفا کا سوال کرنا۔ پہلے مفہوم کے اعتبار سے کسی کو مشکل کشا کہنا شرک نہیں جبکہ دوسرے مفہوم کے اعتبار سے غیر اللہ کو مشکل کشا قرار دینا صریح شرک ہے۔ حضرت علیؓ کے بارے میں اہل تشیع مشکل کشائی کا دوسرا مفہوم مراد لیتے ہیں جبکہ اہل سنت والجماعت کے ہاں اگر یہ لفظ کہیں استعمال ہوا ہے تو اس سے مراد پہلا مفہوم ہے۔

(ماہنامہ حق چار یار صفحہ ۲۰۔۲۱ اکتوبر ۲۰۰۰ء)

موصوف کی اس "توضیح" سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت قاضی صاحب اہل تشیع والا مفہوم مراد نہیں لیتے بلکہ وہ اہلسنت والا پہلا مفہوم یعنی "ماتحت الاسباب مشکل کشا" مراد لیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ سیدنا علیؓ کو شہید ہوئے اب تک تیرہ سو اکیاسی (۱۳۸۱) سال گذر چکے ہیں۔ ان کی شہادت کے بعد انہیں کس مفہوم میں "مشکل کشا" سمجھا جائے گا؟

ظاہر ہے کہ آں محترمؓ کو اب پہلے مفہوم میں تو ہرگز مشکل کشا نہیں سمجھا جا سکتا۔ اگر "تصوف" کی رو سے یا "علم باطن" کے زور سے کسی گنجائش کا امکان بھی ہوتا تو پھر بھی یہ اصطلاح اہل تشیع کے ساتھ مشابہت کی بناء پر قابل ترک ہی نہیں بلکہ واجب الترک بھی جاتی۔ لہٰذا خطاء و غلطی پر تاویلات فاسدہ کے "ردے" چڑھانے کی بجائے رجوع اور توبہ و استغفار ہی اس کا شرعی حل ہے۔

جہاں تک اس تاویل و توجیہ کا تعلق ہے کہ "مشکل کشا" سے مراد علمی و دینی مشکلات دور کرنے والا ہے تو یہ تاویل بالکل ہی غلط، فاسد، باطل اور مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور ہے کیونکہ کتنے ہی صحابہؓ ایسے تھے جنہوں نے علمی اور دینی مشکلات حل کی تھیں پھر انہیں "مشکل کشا"

کیوں نہیں کہا جاتا؟ اس بارے میں حضرت علیؓ کو کوئی امتیاز حاصل نہیں۔ پھر اس میں صحابہؓ کی بھی کوئی خصوصیت نہیں۔ ہر دور میں بکثرت ایسے افراد پائے جاتے رہے جنہوں نے شریعت کے بعض مشکل مسائل حل کیے۔ اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان سب حضرات کو بھی مشکل کشا سمجھا جائے۔ کیا حضرت علیؓ کے سوا کسی دوسرے شخص کیلئے "مشکل کشا" کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر کیا یہ "شیعی اور سبائی" انداز فکر نہیں ہے؟

حضرت علیؓ کو علی الاطلاق اور مافوق الفطرت مشکل کشا سمجھنا اہل تشیع کا عقیدہ اور شعار ہے اسی لئے وہ اٹھتے بیٹھتے اور سلام کی جگہ بھی "یا علی مدد" کا نعرہ لگاتے ہیں۔ جامعہ المنتظر کے پرنسپل سید صفدر حسین نجفی نے اپنے کتابچے کے ٹائٹل پر یہ شعر لکھا ہے۔

زمانہ بر سر جنگ است یا علی مددوی   کمک بغیر تو ننگ است یا علی مددوی

شیعہ سکالر عبدالکریم مشتاق لکھتا ہے: "باقی دشمن جلے یا مرے میں تو یا علی مدد کہہ کر رزق، اولاد، صحت، فتح، حاجت برآری مولا مشکل کشا سے چاہوں گا میں اسے شرک نہیں سمجھتا۔ علی سے مدد مانگنا میرے نزدیک سنت انبیاء ماسبق ہی نہیں سنت خاتم الانبیاء ہے۔"

(ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور صفحہ ۱۱ جلد ۲)

دسمبر ۱۹۹۵ء میں اہل تشیع کے زیر اہتمام "یا علی مدد کانفرنس" منعقد ہوئی جس کے مہمانان خصوصی لیفٹیننٹ جنرل سہیل عباس جعفری اور اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن علامہ عرفان حیدر عابدی تھے۔ ایک سنی نما رافضی پیر آصف گیلانی نے بھی کانفرنس کو رونق بخشی۔

کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے عقیل ترابی نے کہا کہ علیؑ کا نعرہ ہماری پہچان اور روح کا سرمایہ ہے۔ عرفان حیدر عابدی نے کہا علیؑ سے مدد مانگنے کا حکم حضورؐ نے دیا ہے یہ شرک نہیں عبادت ہے۔ (روزنامہ پاکستان ۵ دسمبر ۱۹۹۵ء)

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ حضرت علیؓ سے مدد مانگنا اور ان کے نام کے ساتھ "مشکل کشا" کا لاحقہ لگانا اہل تشیع کا شعار ہے۔ کوئی حقیقی مومن "ایاك نعبد وایاك نستعین" کے اقرار سے انحراف اور نبی اکرمؐ کے فرمان "اذا استعنت فاستعن باللہ" کی خلاف ورزی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس حقیقت کا کوئی صوفی انکار نہیں کر سکتا کہ "غائبانہ حاجات میں مدد مانگنا عبادت ہے" اگر اللہ تعالیٰ کو غائبانہ حاجات میں مختار کل سمجھ کر "یا اللہ مدد" کہے گا تو یہ اللہ کی عبادت

ہوگی اور اگر "یا علی مدد" یا "علی مشکل کشا" پکارے گا تو یہ حضرت علی کی عبادت ہوگی اور غیر اللہ کی عبادت کرنے والے کے متعلق شرعی حکم بالکل واضح ہے۔

یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت علی خود اپنی اور اپنے گھر والوں کی مشکلات دور نہ کر سکے تو وہ دوسروں کی کیا مشکلات دور کریں گے؟ شیعہ اعتقاد کے مطابق ان سے امامت و خلافت کا حق چھین لیا گیا ان پر مظالم و مصائب کے پہاڑ توڑے گئے، بنت رسول ﷺ کو باغ فدک کی وراثت سے محروم کر دیا گیا، بنت رسول ﷺ پر دروازہ گرا لیا گیا انہیں زخمی کیا گیا ان کے گھر کو نذر آتش کیا گیا، ان کے لخت جگر محسن تک کو شہید کر دیا گیا۔

خود حضرت علیؓ اپنے پورے دور خلافت میں مشکلات و مصائب میں گھرے رہے، ایک دن بھی چین و سکون کا سانس نہیں لیا، مدینہ منورہ کی رہائش چھوٹ گئی اپنے عہد خلافت میں ایک مرتبہ بھی حج و عمرہ کی سعادت حاصل نہیں کر سکے، جمل و صفین میں اور اس کے علاوہ بھی ان کے ہزاروں احباب شہید ہو گئے۔

حضرت حسنؓ کے نیچے سے مصلیٰ کھینچ لیا گیا، انہیں زخمی کر دیا گیا، خلافت چھین لی گئی، انہیں مذل المومنین اور عار المومنین کے الفاظ سے پکارا گیا یہاں تک کہ انہیں زہر خورانی کے ذریعے شہید کر دیا گیا۔

حضرت حسینؓ بمع احباب خاک و خون میں تڑپا دیے گئے، جسموں پر گھوڑوں کی ٹاپیں دوڑائی گئیں، سر کاٹ کر نیزوں کی انیوں میں پرو دیے گئے، معصوم بچے اور خواتین پیاس سے تڑپتی رہیں، عباس علم دار کے بازو کٹ گئے، عون و محمد جنگل میں بھٹکتے رہے، خیموں کو آگ لگا دی گئی، عورتیں چیختی ہوئیں بال بکھیرتی ہوئیں بغیر دوپٹوں کے خیموں سے باہر آ گئیں ان سب حادثات اور سانحات کے باوجود حضرت علیؓ نہ "ما تحت الاسباب" ان کی مشکل کشائی کر سکے اور نہ ہی "مافوق الاسباب"

معمولی عقل و دانش رکھنے والا بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ جو شخص اپنی، اپنے گھر والوں کی، اپنے جگر گوشوں کی، اپنی عفت مآب بیٹیوں کی، اپنی رفیقہ حیات دختر پیغمبر کی اور اپنے جاں نثاروں کی مشکلات دور نہ کر سکا وہ آج چودہ صدیاں گذرنے کے بعد "علی مشکل کشا" کا وظیفہ اور "شجرہ" پڑھنے والے صوفیوں کی مشکل کشائی کیوں کر کرے گا؟

حدیث انا مدینة العلم وعلی بابها

اس حدیث کی بناء پر اہل تشیع اور صوفیاء نے حضرت علیؓ کو افضل قرار دیا ہے تصوف کے عربی شجرے میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں۔

"و بحاہ سیدنا باب مدینة العلم امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب کرّم اللہ وجهه"

{سلاسل طیبہ صفحہ ۸}

جبکہ فارسی شجرے میں یہ اشعار ملتے ہیں:

بحق شیر یزداں شاہ مرداں	در علم لدنی فیض رحماں
خلیج بحر رحمت منبع فیض	تجلی گاہ یزداں مطلع فیض
علی بن ابی طالب کہ خورشید	بنور خاک پائے اوور خشید

{سلاسل طیبہ صفحہ ۱۸}

بہر حال حدیث "انا مدینة العلم و علی بابها" صحاح ستہ میں سے صرف جامع ترمذی میں پائی جاتی ہے اور اس میں "انا مدینة العلم" کے بجائے یہ الفاظ ہیں: "انا دار الحکمة و علیّ بابها" "میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں۔

{جامع ترمذی۔ ابواب المناقب۔ باب مناقب علی بن ابی طالب}

اس حدیث کی سند یہ ہے "حدثنا اسمٰعیل بن موسیٰ نا محمد بن عمر الرومی نا شریك عن سلمة بن کهیل عن سوید بن غفلة عن الصنابحی عن علی قال قال رسول الله صلّی الله علیه وسلم"۔

امام ترمذی اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد اس کی روایتی حیثیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "هذا حدیث غریب منکر روی بعضهم هذا الحدیث عن شریك ولم یذکروا فیه عن الصنابحی ولا نعرف هذا الحدیث عن احد من الثقات غیر شریك" یہ حدیث غریب اور منکر ہے بعض راویوں نے اسے صرف شریک سے روایت کیا ہے۔ اور صنابحی کا اس میں ذکر نہیں کیا اور ہم نہیں جانتے کہ شریک کے سوا ثقہ راویوں میں سے کسی اور نے بھی اس کو روایت کیا ہو۔

غریب علم حدیث کی اصطلاح میں اس حدیث کو کہتے ہیں جس کا مدار سند کے کسی

مرحلے میں صرف ایک راوی پر رہ جائے اور منکر اس روایت کو کہتے ہیں جو نری غریب ہی نہ ہو بلکہ اس کا راوی بھی ضعیف ہو۔ اس سے ترمذی کی زیر بحث روایت کا پایہ سند بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ پھر اس طرح کی روایت پر سارے دین کی بنیاد رکھ دینا کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟

محمد بن علی الشوکانی نے اپنی کتاب "الفوائد المجموعة فی الاحادیث الموضوعة" میں اس حدیث پر طویل بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ امام ابن جوزی اور امام ذہبی نے اسے جھوٹی اور موضوع روایت قرار دیا ہے۔ ابو الصلت عبدالسلام بن صالح الہروی، ہرات کے ایک جعل ساز نے یہ روایت وضع کر کے پھیلا دی ہے۔ اس حدیث کے غریب اور منکر ہونے کے علاوہ اس کے بعض رواۃ میں تشیع بھی پایا جاتا ہے۔

جامع ترمذی کے بعد اس مضمون کی روایت کا سارا دار و مدار امام حاکم کی مستدرک پر رہ جاتا ہے جو بجائے خود بھی حدیث کی معتبر کتاب نہیں ہے اس میں کہا گیا ہے کہ:

"انا مدینة العلم وعلی بابها فمن اراد المدینة (وفی روایة فمن اراد العلم) فلیأت الباب" (المستدرک علی الصحیحین ص ۱۲۷، ۱۲۶ الجزء الثالث طبع بیروت)

امام حاکم نے اپنی مستدرک میں ابن عباسؓ اور جابر بن عبداللہؓ سے دو روایتیں مختلف الفاظ میں نقل کی ہیں۔ ابن عباسؓ کی روایت میں حسب ذیل الفاظ آئے ہیں: "انا مدینة العلم و علی بابها فمن اراد المدینة فلیات الباب" میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں پس جو شخص شہر میں آنا چاہے وہ اس کے دروازے سے آئے۔

جبکہ جابر بن عبداللہ کی روایت کا آخری حصہ یہ ہے: "فمن اراد العلم فلیأت الباب" یعنی جو علم حاصل کرنا چاہے اسے دروازہ پر آنا چاہیے۔

امام حاکم نے ان دونوں روایتوں کے صحیح ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ لیکن علم حدیث کے بڑے بڑے ناقدین کی رائے میں نہ صرف یہ دونوں بلکہ اس مضمون کی ساری روایات ساقط الاعتبار ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے متعلق امام ذہبی کہتے ہیں کہ صحیح ہونا تو درکنار یہ تو موضوع ہے اور جابر بن عبداللہؓ کی روایت کے متعلق ان کی یہ رائے ہے کہ "العجب من الحاکم و جرأته فی تصحیحه هذا و امثاله من البواطیل، و احمد هذا دجال کذاب" امام حاکم پر سخت تعجب ہے کہ کس جرأت کے ساتھ وہ اس روایت اور ایسی ہی دوسری

روایتوں کو صحیح کہہ دیتا ہے۔ یہ احمد (احمد بن عبد اللہ بن یزید الحرانی جس کی سند سے یہ روایت حاکم نے نقل کی ہے) دجال اور سخت جھوٹا ہے۔ {حوالہ گزشتہ صفحہ}

یحیٰ بن معین اس حدیث کے متعلق کہتے ہیں کہ "لا اصل لہ" اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ امام بخاری کی رائے ہے کہ "انہ منکر ولیس لہ وجہ صحیح" یہ منکر روایت ہے اور اس کی نقل کا کوئی طریقہ بھی صحیح نہیں ہے۔ امام نووی اور جزری اس کو موضوع کہتے ہیں ابن دقیق العید کے نزدیک بھی یہ ثابت نہیں ہے۔ ابن جوزی نے مفصل بحث کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ انا مدینۃ العلم والی روایت جتنے طریقوں سے بھی مروی ہے سب کے سب موضوع ہیں۔

قابل غور بات یہ ہے کہ جس حدیث کا سند کے اعتبار سے یہ حال ہے۔ اس پر اتنے بڑے فیصلے کی بنا مد کھ دینا کیوں کر درست ہو سکتا ہے؟ کہ "جو علم حاصل کرنا چاہے وہ (علیؓ کے) دروازہ پر آئے"۔

قرآن مجید کے بعد ہمارے لئے ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ نبی اکرم ﷺ کا اسوہ حسنہ ہے جو صحابہ کرامؓ کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے اب اگر ہم اس حدیث پر اعتماد کر کے اس علم کے لئے صرف حضرت علیؓ پر انحصار کر لیں تو لامحالہ ہمیں علم کے اس بہت بڑے حصے سے محروم ہونا پڑے گا۔ جو دیگر صحابہؓ کے ذریعے سے منقول ہوا ہے۔ کیونکہ کتب حدیث میں حضرت علیؓ کی مرویات کی تعداد پانچ سو چھیاسی (۵۸۶) ہے۔ کیا حدیث کا کل ذخیرہ یہی ہے؟ حدیث کا باقی سرمایہ بھی تو "باب علم" سے ہی مروی ہونا چاہیے تھا اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو اتنے بڑے فیصلے پر مبنی رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد مبارک ہم تک بہت زیادہ قوی اور معتبر ذریعے سے پہنچنا چاہیے تھا۔

علاوہ ازیں اس حدیث کا ظاہری مفہوم آپؐ کے بکثرت ارشادات اور زندگی بھر کے عمل سے بھی متصادم ہے۔ آپؐ نے بہت سے صحابہؓ کو اپنی حیات طیبہ میں فوج کا افسر بنا کر مہمات پر بھیجا۔ مختلف صحابہؓ کو مختلف علاقوں پر عامل مقرر کیا۔ انہیں تحصیل صدقات کے منصب پر مامور کیا۔ انہیں امام صلوٰۃ مقرر کیا اور تعلیم و تبلیغ کے لئے روانہ فرمایا۔ یہ تاریخی حقائق ہیں جنہیں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب خدمات علم دین کے بغیر ہی انجام دی جاتی تھیں؟ یا یہ سارے صحابہ نبی اکرم ﷺ کے نہیں بلکہ حضرت علیؓ کے شاگرد تھے؟ اگر یہ دونوں باتیں غلط ہیں تو

صحیح صرف یہ بات ہو سکتی ہے کہ ان صحابہؓ نے "مدینۃ العلم" یا "دار الحکمۃ" سے براہ راست علم و حکمت کی تعلیم حاصل کی تھی اور یہ سب صحابہ حضرت علیؓ ہی کی طرح مدینۃ العلم اور دار الحکمۃ کے دروازے تھے۔

نبی اکرم ﷺ منصب نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد سے حیات دنیوی کی آخری ساعت تک خود دین کی تعلیم و تبلیغ فرماتے رہے اور صحابہؓ دینی مسائل براہ راست اور بلا واسطہ آپ ﷺ ہی سے پوچھتے رہے۔ قرآن مجید اس بات کی شہادت دے رہا ہے "یسئلونک عن الاھلّۃ، یسئلونک عن الشھر الحرام، یسئلونک عن المحیض، یسئلونک عن الخمر و المیسر، یسئلونک عن الساعۃ" وغیرہ۔ نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ ﷺ نے دینی احکام صرف حضرت علیؓ کو بتائے ہوں اور انہیں دوسروں تک پہنچانے کی تنہا ذمہ داری سونپی ہو یا کسی سائل سے آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہو کہ علیؓ کے توسط سے میرے پاس آیا کرو۔ خود حضرت علیؓ نے بھی کبھی اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ پھر معلوم نہیں کہ اہل تصوف نے دیگر صحابہ کو نظر انداز کر کے اپنے تمام شجروں اور سلسلوں کا اختتام حضرت علیؓ (یا حادی عالم علی مشکل کشا کے واسطے) پر کیوں کیا؟ کیا یہ شیعیت و باطنیت کا اثر نہیں؟

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ زیر بحث حدیث ان تمام احادیث کے بھی خلاف ہے جو آپ ﷺ نے دیگر صحابہ کرامؓ کے بارے میں ارشاد فرمائی تھیں۔ مسند احمد اور ترمذی کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت زید بن ثابتؓ کے متعلق "افرضہم" فرمایا۔ یعنی صحابہ میں سے وہ علم میراث کے سب سے بڑے ماہر ہیں۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کے متعلق فرمایا "اعلمہم بالحلال و الحرام" حلال و حرام کو وہ سب سے زیادہ جانتے ہیں۔

حضرت ابی بن کعبؓ کے متعلق فرمایا "اقرئہم" وہ قرآن کے سب سے بڑے قاری ہیں۔

حضرت ابو بکرؓ کے متعلق فرمایا "لو کنت متخذاً من امتی خلیلا لاتخذت ابا بکر خلیلا" اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابو بکرؓ کو ہی خلیل بناتا۔

حضرت عمرؓ کے متعلق فرمایا "لو کان بعدی نبی لکان عمر" اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔

جن کے متعلق فرمایا: یا ابن الخطاب و الذی نفسی بیدہ ما لقیک الشیطان سالکا فجا قط الا سلک فجا غیر فجک "اے ابن خطاب قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے جس راستے پر شیطان کی تجھ سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ اس کو چھوڑ کر وہ کسی ایسے راستے پر چلا جاتا ہے جہاں تو اس کے سامنے نہ ہو۔

جن کے متعلق فرمایا: ان اللہ وضع الحق علیٰ لسان عمر یقول بہ "اللہ نے حق حضرت عمرؓ کی زبان پر رکھ دیا ہے اسی کے مطابق وہ بات کرتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ لوگ میرے سامنے پیش کیے گئے اور وہ قمیص پہنے ہوئے تھے ان میں سے بعض کی قمیص سینے سے زیادہ لمبی تھی۔" و عرض علیٰ عمر بن الخطاب و علیہ قمیص یجرّہ۔ قالوا ما اوّلت ذلک یا رسول اللہ قال۔ الدین "اور عمرؓ میرے سامنے پیش کیے گئے ان پر ایک قمیص تھی جو زمین پر گھسٹتی ہوئی تھی۔

صحابہؓ نے دریافت کیا کہ اس کی کیا تعبیر ہے؟ فرمایا دین۔

ایک دوسرے خواب میں نبی اکرم ﷺ نے اپنے بچے ہوئے دودھ کا پیالہ عمرؓ کو دے دیا اور اس کی تعبیر "العلم" سے فرمائی۔

حضرت عثمانؓ کے متعلق فرمایا۔ لکل نبیّ رفیق و رفیقی فی الجنۃ عثمان "ہر نبی کا ایک رفیق ہے اور میرا رفیق جنت میں عثمان ہے۔ حضرات ثلاثہؓ اور دیگر صحابہؓ کے فضائل و مناقب کتب حدیث میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

وائے افسوس! اہل تصوف نے ان میں سے کسی صحابی کو (بنام) اپنے روحانی و علمی شجروں میں شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا اور نہ ہی ان سے "باطنی علم" حاصل کرنے کی کوئی کوشش کی۔

شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں کہ "چونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے شیعہ حضرات کی عقیدت و محبت کی ایک اہم بنیاد ان کا "باب مدینۃ العلم" ہونا ہے۔ اس لئے اس فرقے میں علم کی محبت ایک مذہبی فریضہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے" (رود کوثر صفحہ ۲۴۰)

اس حدیث کا مفصل تجزیہ اوپر گزر چکا ہے۔ جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ حدیث موضوع اور من گھڑت ہے۔ اس لئے موصوف کا اخذ کردہ یہ منطقی نتیجہ بھی خود بخود غلط قرار پاتا ہے

کہ "شیعہ فرقے میں علم کی محبت ایک مذہبی فریضہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے"۔

اگر زیر بحث حدیث صحیح ہے تو محولہ بالا کثیر التعداد احادیث کے متعلق کیا کہا جائے گا جو دوسرے صحابہ کرامؓ کے متعلق اس سے بہت زیادہ قوی اور معتبر سندوں کے ساتھ منقول ہوئی ہیں؟ کیا کسی دلیل سے زیر بحث ضعیف، منکر بلکہ موضوع حدیث کے مقابلے میں ان سب احادیث صحیحہ اور تاریخی حقائق کی تکذیب کی جا سکتی ہے؟

مولائے کائنات

بعض صوفیاء کرام شیعی پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ "مشکل کشا" کے لاحقے کے علاوہ "مولائے کائنات" کا سابقہ بھی لگاتے ہیں۔ یہ بھی اہل تشیع کی اصطلاح ہے۔ مشہور شیعہ مناظر ثقۃ الاسلام محمد بشیر صاحب آف ٹیکسلا لکھتے ہیں:

"جب ہم حضورؐ کی بیعت کر چکے ہم حضورؐ کے عبد بن گئے اور حضورؐ ہمارے مولا بن گئے۔ یعنی حضورؐ کو حق حاصل ہے کہ ہماری جان جہاں چاہیں خرچ کریں۔ مال و اولاد کو جہاں چاہیں خرچ کریں۔ جب انہیں اختیارات حاصل ہو چکے تو جب تک حضورؐ زندہ رہے ہمارے مولا۔ اور اب حضورؐ اللہ کے دربار میں جانا چاہتے تھے تو آپ ﷺ کو حکم ہوا کہ اپنے بعد انتظام کر جاؤ آپ ﷺ نے لوگوں کو جمع کر کے وہ حق مولا جو آپ کو حاصل تھا اس کو آپ ﷺ نے غدیر خم میں کہہ دیا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علی مولا ہے۔ جس کا میں مولا ہوں اب میرے بعد علی اس کا مولا ہے۔ یعنی جو بھی حقوق اختیارات مجھ کو حاصل تھے۔ اب وہ علی کو حاصل ہیں اگر میں کائنات کا مولا ہوں اگر میں فرشتوں کا مولا ہوں تو یہ فرشتوں اور کائنات کا مولا ہے۔ اگر میں جان و مال، اولاد و نفوس وغیرہ کا مولا ہوں تو یہ تمہارے جان و مال، اولاد و نفوس وغیرہ کا مولا ہے۔ یعنی کل اختیارات اب علی کے حوالے مثل میرے"۔ (مقام اہلبیت صفحہ ۱۵۱، ۱۵۲)

لفظ "مولیٰ" لغت میں حسب ذیل معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

"آقا، صاحب، مالک، والی، سردار، سلطان، بادشاہ، راجا، آزاد شدہ غلام، دوست محب، حبیب، مددگار، ممد، معاون، ناصر، یاور، شریک، ساتھی، رفیق، سنگی، ہمسایہ، پڑوسی۔" (قاموس مترادفات تحت مولیٰ)

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

"أنت مولٰنا فانصرنا علی القوم الکٰفرین" (البقرۃ نمبر ۲۸۶)

اور "بل اللہ مولٰکم و ھو خیر النٰصرین" (آل عمران نمبر ۱۵۰)

ان آیات اور ان کے علاوہ دیگر آیات میں بھی لفظ "مولٰی" بمعنی مالک و آقا جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے آیا ہے۔

نزول قرآن کے زمانے میں یہ لفظ بکثرت "غلام" کے معنی میں استعمال ہوا ہے مثلاً نافع مولی ابن عمرؓ، عکرمہ مولی ابن عباسؓ، ابو رافع مولی رسول اکرم ﷺ، سفینہ مولی رسول اکرم ﷺ، بلکہ وہ غلام جنہیں آزاد کر دیا گیا انہیں بھی مولی کے لفظ سے پکارا جاتا رہا۔

جبکہ اہل تشیع لفظ مولی بمعنی مالک، آقا اور ناصر استعمال کرتے ہیں حضرت مولانا عبدالحمید سواتی صاحب سے ایک سائل نے دریافت کیا کہ حضرت علیؓ کو مولا علی کہنا کہاں تک درست ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: "بھائی مولا کا معنی ساتھی، رفیق یا آقا ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے۔ من کنت مولاہ علی مولاہ" یعنی جس شخص کا میں ساتھی، رفیق یا آقا ہوں۔ حضرت علیؓ بھی اس کا رفیق، ساتھی یا آقا ہے۔ یہ حدیث کے الفاظ ہیں اور درست ہیں لہٰذا مذکر لفظ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے"۔ (ماہنامہ نصرت العلوم صفحہ ۳۶ مئی ۱۹۹۹ء)

موصوف نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ امام ترمذی نے اس طرح نقل کی ہے:

"حدثنا محمد بن بشار نا محمد بن جعفر نا شعبة عن سلمة بن كهيل قال سمعت ابا الطفيل يحدث عن ابی سريحة او زيد بن ارقم شك شعبة عن النبي صلى الله عليه وسلم قال من كنت مولاه فعلي مولاه۔ هذا حديث حسن غريب وروى شعبة هذا الحديث عن ميمون ابي عبدالله عن زيد بن ارقم عن النبي صلى الله عليه وسلم نحوه" (جامع ترمذی۔ باب المناقب۔ باب مناقب علی بن ابی طالب)

یہ حدیث حسن غریب ہے۔ شعبہ نے یہ روایت میمون ابو عبداللہ کے واسطے زید بن ارقم سے روایت کی ہے۔ شعبہ کو اس میں شک واقع ہوا ہے کہ یہ روایت ابو سریحہ حذیفہ بن اسید سے مروی ہے یا زید بن ارقم سے۔ دوسرا شک یہ ہے کہ شعبہ نے یہ حدیث سلمہ بن کہیل سے روایت کی یا میمون ابو عبداللہ سے۔ اس طرح اس روایت میں اضطراب پایا جاتا ہے اور مضطرب روایت ضعیف اور ناقابل قبول ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ میمون ابو عبداللہ جس پر اس حدیث کا دارو مدار

ہے۔ وہ محدثین کے نزدیک لاشی ہے۔ حافظ زیلعی (م ۷۶۲ھ) بسم اللہ بالجہر کی بحث میں لکھتے ہیں کہ نماز میں بسم اللہ اونچی آواز سے پڑھنے کی روایات اگرچہ بہت ہیں لیکن وہ سب کی سب ضعیف ہیں اور بہت سی روایات ایسی ہیں کہ ان کے راوی بہت ہیں اور ان کے طرق یعنی اسناد متعدد ہیں مگر وہ حدیثیں ضعیف ہیں جیسے حدیث طیر، افطر الحاجم و من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔ آخر میں لکھتے ہیں "بل قد لا یزید کثرۃ الطرق الا ضعفا" یعنی بعض اوقات کثرت طرق بجائے اس کے کہ نقصانِ ضعف کو پورا کرے اس ضعف کو اور بھی بڑھا دیتی ہے۔ (نصب الرایہ جلد ۱ صفحہ ۳۶۰)

دیگر اکابر علماء و محدثین مثلاً امام بخاری، ابن ابی حاتم رازی، ابراہیم الحربی، ابن ابی داؤد اور ابن حزم ظاہری وغیرہ کو حدیث موالاۃ کی صحت میں کلام ہے۔

قطع نظر اس حدیث کے ضعف کے جو علماء اس حدیث سے حضرت علیؓ کی فضیلت پر استدلال کرتے ہیں ان کے نزدیک بھی "مولا" آقا کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ وہ اس سے دوست کا معنی مراد لیتے ہیں۔ ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

"اللھم من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ و عاد من عاداہ"

(مشکوٰۃ باب مناقب علی بن ابی طالب)

چونکہ "مولیٰ" کا لفظ بہت سے معانی میں مشترک ہے لہٰذا کسی ایک معنی کی تخصیص کیلئے قوی قرینہ چاہئے اور وہ خود اس حدیث کے اندر ہی موجود ہے (اللھم وال من والاہ) ثابت ہوگیا کہ یہاں "مولیٰ" سے دوست مراد ہے نہ کہ آقا، ناصر، حاکم اور خلیفہ بلافصل۔

اگر لفظ مولیٰ بمعنی رفیق اور ساتھی استعمال کیا جائے تو پھر اس کا اطلاق جملہ صحابہ کرامؓ پر بھی ہو سکتا ہے۔ کیا صوفیائے کرام نے یہ لفظ کبھی کسی دوسرے صحابی کے لئے استعمال کیا ہے؟ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ علماء اہل سنت بھی حضرت علیؓ کے لئے لفظ مولیٰ بمعنی "آقا" استعمال کر رہے ہیں۔ یہ تصور بھی اہل تشیع کا ہے۔

حضرت علیؓ کے لئے لفظ مولیٰ (بمعنی آقا اور مالک) کا استعمال واضح شرک ہے۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ کائنات یعنی عالم کا حاکم اور آقا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔ اور اگر مولیٰ کا لقب بمعنی ناصر یعنی مددگار کے استعمال کیا جائے تو بھی اس کا شرک اور ضلال ہونا واضح ہے کیونکہ پوری کائنات کے ناصر صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔ ان کے سوا کوئی اور ناصر نہیں۔

بہر حال اہل تشیع نے اس جیسی بیسیوں اصطلاحات اہلسنت والجماعت میں پھیلا دی ہیں جن کے استعمال سے بعض "اہل حق" بھی اپنا دامن نہیں بچا سکے۔ فیا اسفا!

معروف نقشبندی پیر طریقت مولانا ذوالفقار احمد مجددی تصوف کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بعض لوگ ڈھونگی پیروں کی باتیں سن کر متنفر ہو جاتے ہیں یہ نہیں سوچتے کہ آج تو ہر معاملے میں کھوٹا کھرے سے ملا ہوا ہے نکھارنا تو ہمارا کام ہے۔ علماء میں بھی بعض نفس پرست دنیادار لوگ شامل ہو جاتے ہیں اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ علم حاصل کرنا بند کر دے۔ تصوف پر اعتراض کرنے والوں کی مثال ہندہ کی سی ہے جسے آکل الاکباد کہتے ہیں۔ مسلمان ہونے سے پہلے کتنی پکی دشمن تھی مسلمان ہونے کے بعد کہنے لگی۔ یا رسول اللہ اب آپ سے بڑھ کر کسی چیز سے محبت نہیں۔ معترضین پر تصوف کی حیثیت کھل جائے تو ان کا بھی حال ہو۔"

(تصوف و سلوک صفحہ ۲۲۵، ۲۲۶)

قارئین کرام! سیدہ ہندہ کاتب وحی سیدنا معاویہؓ کی والدہ اور رسول کریم ﷺ کی ساس ماں ہیں آپ ﷺ نے ان کے قبولیت اسلام کے وقت "مرحبا بك" کے الفاظ سے استقبال فرمایا اور اس کے بعد "وابصاء فدی نفسی بیدہ" فرما کر ان کی عزت و عظمت کی بلندی کی تمنا فرمائی۔ ایسی قابل احترام شخصیت کے لئے "آکل الاکباد" جیسی خالص شیعی اصطلاح کا استعمال کیا کسی "پیر طریقت" کو زیب دیتا ہے؟ راقم الحروف نے اپنی کتب "تذکرہ سیدنا معاویہؓ" اور "سیدنا معاویہؓ پر اعتراضات کا علمی تجزیہ" میں اس واقعہ پر مفصل بحث کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ آں محترمہؓ پر الزام و اتہام ہے جسے اہل تشیع نے وضع کر کے اہلسنت میں عام کر دیا ہے۔ سیدہ ہندؓ ایک مجاہدہ اور نبی اکرم ﷺ کی ساس ماں ہونے کی حیثیت سے عزت و احترام کی مستحق تھیں مگر موصوف آں معظمہؓ کا ذکر ان الفاظ سے کرتے ہیں کہ "مسلمان ہونے کے بعد کہنے لگی" جبکہ اسی کتاب میں انہوں نے اپنے پیروں کا ذکر نہایت احترام کے ساتھ کیا ہے۔ حالانکہ ان جیسے کروڑوں پیر سیدہ ہندؓ کی خاک پا کے بھی برابر نہیں ہیں۔

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ لکھتے ہیں کہ:

"بے چارے صوفیہ جن پر حسن ظن کا غلبہ ہوتا ہے بھلا ان حضرات کو تنقید و تفتیش کی

کہاں فرصت اور انہیں نہ اس کی عادت ہے بس جو سن لیا یا دیکھ لیا اسے باور کر لیا ان کے حسن ظن سے کسی قول کا حدیث رسول ﷺ ہونا ثابت نہیں ہو جائے گا۔" (مکتوبات شیخ الاسلام صفحہ ۹ جلد ۲)

صوفیاء کے اس "حسن ظن" کے تو ہم بھی قائل ہیں مگر یہ حضرات اموی صحابہ و صحابیات یا مخصوص خاندان معاویہ کا ذکر کرتے ہوئے "سوء ظن" میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ صوفیاء کے "حسن ظن" کا ذکر چل پڑا ہے تو اس کی ایک مثال مزید ملاحظہ فرمائیں۔

تلک الغرانیق العلی

چنانچہ یہی معروف پیر صاحب (جن کا سیدہ ہندؓ کے حوالے سے اوپر ذکر ہوا) اپنے جذبہ حسن ظن سے مغلوب ہو کر زنادقہ و ملاحدہ کی موضوعہ ایک مہلک اسلام روایت کی توثیق کر بیٹھے۔ حضرت موصوف ارشاد فرماتے ہیں۔

"ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نماز میں سورۃ النجم کی تلاوت کرتے ہوئے جب اس جگہ پہنچے "اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی ۝ وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی ۝" (النجم نمبر ۱۹-۲۰) بھلا تم نے لات عزیٰ اور تیسرے منات کے حال میں غور بھی کیا ہے۔

تو صحابہؓ کو ایسے محسوس ہوا کہ جیسے آپ ﷺ نے اس سے آگے یہ کہا کہ ان کی بھی عبادت کرو اور اللہ کی بھی۔ صحابہ کرامؓ بہت حیران ہوئے۔ نماز سے فراغت پر عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ یہ نئی آیتیں اتری ہیں جو آپ ﷺ نے پڑھی ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا میں نے تو نہیں پڑھیں چنانچہ جبرائیل نازل ہوئے اور آیات اتریں "اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْ اُمْنِیَّتِہٖ" (الحج نمبر ۵۲) شیطان نے اپنی گفتگو (وقف کے دوران) حضور ﷺ کی قرأت سے ملا دی تھی۔

پھر پتہ چلا کہ شیطان نے اپنی آواز نبی علیہ السلام کی مبارک آواز کی مانند بنا کر یہ عبارت پڑھی تاکہ صحابہ کرامؓ کو دھوکہ دے سکے۔ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی موجودگی میں بحالت نماز کی یکسوئی میں صحابہ کرامؓ جیسے پاکیزہ حضرات کو دھوکہ دینے سے شیطان باز نہیں آیا تو پھر ہم کس کھیت کی گاجر مولی ہیں کہ بلند و بانگ دعویٰ کریں۔"

(تصوف سلوک صفحہ ۷۵-۷۶)

- کاش حضرت پیر طریقت اس واقعہ کو نقل کرنے سے پہلے تفاسیر کا تحقیقی مطالعہ فرما لیتے۔ ان کی تشریح سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نفس واقعہ کی صحت پر یقین رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں کہ:

"قریش کعبہ کا طواف کرتے ہوئے یہ الفاظ کہتے تھے" وَالّٰاتِ وَ الْعُزّٰی وَ مَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰی هٰؤُلَاءِ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَ اِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰی "کتب تفسیر میں اس موقع پر ایک قصہ نقل کیا گیا ہے جو جمہور محدثین کے اصول پر درجہ صحت کو نہیں پہنچتا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ نبی ﷺ کی زبان پر شیطان کو ایسا تسلط کب ہو سکتا ہے اور جس چیز کا ابطال آگے کیا جا رہا ہے اس کی مدح سرائی کے کیا معنی؟ (تفسیر عثمانی صفحہ ۶۹۹ سورۃ النجم آیت ۱۹-۲۰)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب" لکھتے ہیں:

"کتب حدیث میں اس جگہ ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے جو "غرانیق" کے نام سے معروف ہے یہ واقعہ جمہور محدثین کے نزدیک ثابت نہیں ہے بعض حضرات نے اس کو موضوع اور ملحدین و زنادقہ کی ایجاد قرار دیا ہے اتنی بات بالکل واضح ہے کہ اس آیت قرآن کی تفسیر اس واقعہ پر موقوف نہیں بلا وجہ اس کو اس آیت کی تفسیر کا جزء بنا کر شکوک و شبہات کا دروازہ کھولنا اور پھر جواب دہی کی فکر کرنا کوئی مفید کام نہیں اس لئے اس کو ترک کیا جاتا ہے۔"

(معارف القرآن صفحہ ۲۷۷ جلد ۶ سورۃ الحج آیت نمبر ۵۲)

حضرت مفتی صاحب تو اس واقعہ کو ملحدین و زنادقہ کی ایجاد قرار دے رہے ہیں لیکن پیر صاحب نے "علم باطن" کے زور پر انتہا کر دی کہ نماز کی حالت میں شیطان نے نبی ﷺ کی آواز میں "تلك الغرانیق العلیٰ" کے الفاظ شامل کر دیئے۔ نماز کے بعد جب صحابہؓ نے حیرت کا اظہار کیا تو جبرائیل سورۃ الحج کی آیت نمبر ۵۲ (القی الشیطان فی امنیته) لے آئے کہ شیطان نے اپنی گفتگو وقف کے دوران نبی ﷺ کی آواز سے ملا دی تھی۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ موصوف اس واقعہ کی صحت پر یقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی موجودگی میں پھر حالت نماز کی یکسوئی میں صحابہ کرامؓ جیسے پاکیزہ حضرات کو دھوکہ دینے سے شیطان باز نہیں آیا تو پھر ہم کس کھیت کی گاجر مولی ہیں کہ بلند و بانگ دعویٰ کریں"۔

حضرت عثمانیؒ اور جناب مفتی صاحب کی وضاحت کے بعد اس واقعہ کے موضوع اور غلط ہونے کے بارے میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی مگر پھر بھی پیر صاحب کے غالی معتقدین کے بھٹکنے کا خطرہ ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود موصوف بھی اپنے مریدین کی تسکین

دشمنی کے لئے قلم اٹھا تے ہیں انتہا اس نے یہ بحث علامت کی مزید وضاحت تصحیح سے خالی نہیں ہوگی۔

ابن جریر طبری اور علامہ سیوطی نے حضرت سعید بن جبیر کی ایک روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے مکہ میں اس آیت کی تلاوت فرمائی کہ "افرءیتم اللات و العزی و مناة الثالثة الاخری" تو شیطان نے آپ ﷺ کی زبان مبارک سے کہلوایا۔ "تلك الغرانيق العلی و ان شفاعتهن لترتجی" جب آپ ﷺ کی زبان مبارک سے یہ جملے ادا ہوئے تو مشرکوں نے آپس میں کہا کہ ہمارے معبودوں کے بارے میں یہ کلمہ خیر کہا گیا اس لئے وہ سب سجدے میں گر گئے اور آپ ﷺ نے بھی سجدہ کیا۔ اس پر سورۃ الحج کی آیت "القی الشیطان فی امنیته" نازل ہوئی۔

یہ روایت دوسری سندوں سے بھی مروی ہے لیکن وہ تمام طرق یا تو ضعیف ہیں یا منقطع ہیں جو لوگ اس واقعہ کو صحیح مانتے ہیں جیسے ابن جریر طبری اور سیوطی وہ لوگ سعید بن جبیر کی اسی روایت کو اسی سند کے ساتھ اور دوسری دو اور مرسل روایتوں کو حجت بناتے ہیں۔

جہاں تک نفس واقعہ کا تعلق ہے وہ ہرگز ثابت نہیں ہے نہ تو نقل صحیح سے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے اور نہ عقل و نظر ہی سے اس کی تائید ہوتی ہے امام بیہقی کہتے ہیں کہ یہ واقعہ ثابت نہیں ہے کیونکہ کوئی صحیح روایت ایسی نہیں ہے جسے واقعہ کی صحت کے لئے دلیل بنایا جائے۔

امام ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ روایت ہر سند سے مرسل ہے یا منقطع ابن جریر نے جو روایت کی ہے وہ بھی مرسل ہے ابن ابی حاتم نے جو دو سندوں سے اس روایت کو ذکر کیا ہے وہ دونوں مرسل ہیں۔

قاضی عیاض نے اس واقعہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جن محدثین نے صحیح حدیثوں کا التزام کیا ہے ان میں سے کسی نے بھی اس حدیث کو بیان نہیں کیا اور نہ کسی ثقہ راوی نے درست اور متصل سند سے اس کی روایت کی ہے یہ روایت وہی مفسرین و مورخین لکھتے ہیں جو عجائب و غرائب کے نقل کرنے کے دلدادہ ہیں۔ روایت کے اکثر طرق ضعیف اور واہی ہیں ایک روایت کی سند میں "کلبی" صاحب تشریف فرما ہیں۔ جن کے متعلق علماء رجال نے یہ صراحت کی ہے کہ "یہ غیر معتبر، ضعیف و متروک، قصہ گو، اخباری، رافضی اور آگ لگانے والا شیعہ ہے" قاضی ابوبکر ابن العربی نے بھی واقعہ کی صحت سے انکار کیا ہے اور روایتوں میں طعن کیا ہے۔ ابن اسحاق نے کہا کہ "هذا من وضع الزنادقة" یہ ملحدوں اور بے دینوں کا گڑھا ہوا افسانہ ہے

امام ابو منصور ماتریدی نے اس پورے واقعہ کو موضوع قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ منافقوں کی گھڑی ہوئی بات ہے تاکہ کمزور ایمان والوں کو اسلام کی طرف سے شک اور بدگمانی میں مبتلا کر دیا جائے۔ علامہ محمود آلوسی نے اس سلسلہ کی تمام روایتوں کو ذکر کرنے کے بعد اصل واقعہ کے متعلق لکھا ہے کہ "قد انکر کثیر المحققین هذا القصة" علماء محققین کی اکثریت نے واقعہ کی صحت سے انکار کیا ہے تمام روایتوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ کی جزئیات میں سخت اختلاف ہے ایک راوی کہتا ہے کہ یہ واقعہ نماز کا ہے کہ حضور ﷺ نے نماز میں قرات کرتے ہوئے "تلك الغرانيق العلى" والا جملہ کہا۔ دوسرا راوی کہتا ہے کہ مشرکین مکہ کی ایک مجلس میں یہ واقعہ ہوا ہے تیسرا راوی کہتا ہے کہ آپ ﷺ نے بھول کر کہا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ شیطان نے آپ ﷺ کی زبان سے ادا کرایا ہے اور جب حضور ﷺ نے جبرئیل کے سامنے دہرایا تو جبرئیل نے کہا کیا اسی طرح میں نے آپ ﷺ کو بتایا تھا؟ ایک اور راوی نے کہا شیطان نے مشرکوں کو یہ بتایا تھا۔ روایات میں اس اختلاف اور اضطراب سے باسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ زیر بحث روایت کا مقام کیا ہے؟ اور اس پر کس قدر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ اگر بقول پیر صاحب اس واقعہ کو صحیح اور درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیطان اپنی مرضی سے نبی اکرم ﷺ سے جو چاہے کہلا سکتا ہے (نعوذ باللہ من ذلك) یہ بھی قطعاً محال اور ناممکن ہے کہ آپ ﷺ قرآن میں اپنی طرف سے اضافہ فرمائیں۔ اسی طرح بھول چوک سے بھی آپ ﷺ وحی الٰہی پر اضافہ نہیں کر سکتے اور پھر جو بات عقیدہ توحید کے منافی ہو وہ ایک رسول یا نبی ﷺ کی زبان سے کیونکر نکل سکتی ہے؟

اگر سہو و نسیان کی راہ سے بھی اس واقعہ کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر سارا سلسلہ رسالت ہی بے وزن اور ناقابل اعتبار ہو جاتا ہے اور دین کے ہر پہلو میں اہل باطل سہو و نسیان کی گنجائش نکال سکتے ہیں اسی شک و ارتیاب کی بیخ کنی کے لئے عصمت انبیاء کا بنیادی عقیدہ لازمی قرار دیا گیا ہے اس لئے کہ دین کی بنیادی تعلیم میں سہو و خطا کی راہ سے بھی لغزش نہیں ہو سکتی۔ جو ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے موصوف کی اس تاویل کو بھی درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ شیطان نے وقف کے دوران آپ ﷺ کے لب و لہجہ میں بات کہہ دی۔ یہ تاویل بھی اس لئے قابل قبول نہیں کہ اس صورت میں بھی نبی ﷺ پر ایک گونہ شیطان کا تسلط سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ تسلط ہی کیا کم ہے

کہ وہ نبی ﷺ کی ہو بہو نقل اتار سکتا ہے یہ تو ایسا ہی تسلط ہوا کہ جیسے اس نے نبی ﷺ کی زبان سے کہلوا دیا ہو یہ دونوں صورتیں ناممکن ہیں کیونکہ اس تسلط کو تسلیم کرنے کی صورت میں رسالت پر اعتمادی خطرے میں پڑ جاتا ہے علاوہ ازیں اللہ کے مخصوص بندوں پر شیطان کا تسلط اختیار کر لینا خود قرآن کے منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

"ان عبادی لیس لک علیھم سلطان الا من اتبعک من الغوین" (الحجر نمبر ۴۲)

یقیناً جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا (یعنی شیطان کا کوئی تسلط نہیں ہوگا سوائے ان کے جو گمراہ ہونے والوں میں سے تیری پیروی کریں۔

انبیاء کرام اور خود آنحضرت ﷺ سے زیادہ مخصوص بندہ اور کون ہو سکتا ہے؟ قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ یہ فرمایا گیا ہے کہ "انہ لیس لہ سلطان علی الذین امنو و علی ربھم یتو کلون" (سورہ النحل نمبر ۹۹)

یعنی شیطان کو مومن اور متوکل علی اللہ بندوں پر کوئی تسلط واختیار نہیں دیا گیا ہے کیا نبی اکرم ﷺ سے بڑھ کر کوئی صادق الایمان اور متوکل علی اللہ ہو سکتا ہے؟ خود شیطان نے یہ اقرار کیا ہے کہ "فبعزتک لا غو ینھم اجمعین الا عبادك منھم المخلصین" (ص نمبر ۸۲-۸۳) پس تیری عزت کی قسم! ضرور میں ان سب کو گمراہ کروں گا سوائے ان میں سے تیرے مخلص بندوں کے۔

لہٰذا قصہ "الغرانیق العلیٰ" جہاں تصریحات قرآنی کے خلاف ہے وہاں اس واقعہ کی تمام تاویلات حقائق دینیہ سے متصادم ہونے کی وجہ سے مردود و نا مقبول ہیں اس واقعہ کے واضعین (زنادقہ، ملاحدہ و سبائیہ) کا واحد مقصد دین میں فساد پیدا کرنا اور نبی ﷺ کی تعلیمات کو مشکوک بنانا ہے وائے افسوس ان موضوعہ، مکذوبہ اور سبائی ٹکسال میں تیار کردہ روایات کو ہمارے صوفیاء نے سینے سے لگا کر اپنے سادہ لوح مریدین و معتقدین میں پھیلا رکھا ہے اللہ تعالیٰ ان سبائی روایات کے مفاسد سے امت مسلمہ کو محفوظ رکھے۔ آمین۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ اہل تشیع نے جہاں تصوف میں اپنے افکار و نظریات داخل کیے وہاں خود بھی تقیۃً پیری کے منصب پر فائز ہو کر مذہب شیعہ کو فروغ دیتے رہے۔ ایک اسماعیلی شیعہ کا اقرار ملاحظہ فرمائیں۔

"۱۲۵۷ء میں ہلاکو خان کی فوجوں نے امام رکن الدین خورشاہ کو شکست دے کر

"الموت" پر قبضہ کر لیا تو اسماعیلیوں کو ایک دفعہ پھر مظالم اور دور ستر کا سامنا ہوا۔ اس کے باوجود ایران، شام اور ہندوستان میں اسماعیلی دعوی جوش اور ولولے کے ساتھ زندہ رہا ان حالات میں تقیہ کے ایک نئے انداز کے طور پر اسماعیلیوں نے ایران میں صوفیانہ طور طریقے پر اپنا دعوی جاری رکھا"۔

(اسماعیلی تاریخ اور عقائد پر ایک نظر صفحہ ۲۲)

اسلامی تصوف میں غیر اسلامی، سبائی، شیعی اور باطنی نظریات کی آمیزش معلوم کرنے کے لئے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کی کتاب "تاریخ تصوف" کا مطالعہ فرمائیں۔

بہر حال یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ دیگر علاقوں کی طرح کشمیر میں بھی شیعیت کو تصوف کے روپ میں فروغ حاصل ہوا جس کی بنیاد امیر کبیر علی ثانی سید علی ہمدانی نے رکھی۔ پھر ان کے صاحبزادے میر محمد ہمدانی اور ان کے مریدین بالخصوص خواجہ اسحٰق نے اس سلسلے کو آہستہ آہستہ آگے بڑھایا۔ پھر خواجہ اسحٰق کے مرید سید محمد نور بخش نے اثنا عشریہ میں ایک نیا فرقہ بنام "نور بخشیہ" متعارف کرایا۔

شیعہ فرقہ نور بخشیہ

اس فرقے کا بانی سید محمد بن عبد اللہ تھا جو ۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء میں قاوین (کوہستان) میں پیدا ہوا۔ جوانی میں خواجہ اسحٰق ختلانی کے ہاتھ پر بیعت کی جو امیر کبیر سید علی ہمدانی کے مرید و خلیفہ تھے۔ موصوف نے سید محمد کو "نور بخش" کا لقب عطا کیا اور اظہار خوشنودی کے طور پر انہیں سید علی ہمدانی کا آخری "خرقہ" عنایت کیا۔

نور بخش نے اب امام کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا اور یہ دعوی کیا کہ مجھے امام جعفر صادق سے روحانی فیض حاصل ہوا ہے اور وہ تمام دینی اور دنیوی علوم میں کامل دستگاہ رکھتا ہے۔

نور بخش کی تعلیمات میں شیعہ عقائد کا رنگ نمایاں ہے اس کے مرید خلفائے ثلاثہ کی شان میں گستاخی کیا کرتے تھے۔ نور بخش پر ایک دن حال طاری ہوا جس میں ایک شخص اسے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ "انت مہدی" تو مہدی ہے، جس کے بعد وہ ایک عرصہ تک دعوی مہدویت پر قائم رہا پھر اس نے اپنے دعوی کی یہ توجیہ پیش کی کہ میں بایں معنی مہدی ہوں کہ ہدایت یافتہ ہوں۔ نور بخش نے ۱۴۶۵ء میں، بعمر بہتر سال وفات پائی۔ شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں کہ:

"واقعہ یہ ہے کہ حضرت علی ہمدانی اور ان کے صاحبزادے اور رفقاء کار کی سرگرمیوں نے کشمیر میں

ایک روحانی ہلچل پیدا کر دی تھی اور اب مقامی اولیاء اور مبلغین کا ایک ایسا گروہ برسرکار آیا جنہیں بابا۔ یا مسلمان رشی (یا ریشی) کہتے تھے۔ یہ لوگ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے اور ہندو اور مسلمان دونوں انہیں نگہ احترام سے دیکھتے۔ ان میں سے سب سے زیادہ شہرت شیخ نورالدین نے پائی جنہیں ہندو نندہ رشی کہتے ہیں"۔ (آب کوثر صفحہ ۳۸۱)

سید محمد نور بخش نے تصوف کے بھیس میں فرد کی اہمیت اور صوفیانہ عقیدہ وحدت الوجود پر زور دیا ہے۔ اس کا مرشد خواجہ اسحاق (مرید خاص سید علی ہمدانی) شیعہ عقائد کا حامل تھا اس نے قانون و احکام پر "فقہ احوط" کے نام سے ایک رسالہ بھی قلم بند کیا تھا (بعض تذکرہ نگاروں کے نزدیک فقہ احوط شمس الدین عراقی کی تالیف ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے) اس رسالے میں شیعہ عقائد بیان کئے گئے ہیں اور امام مہدی پر خاص توجہ دی گئی ہے جسے متعدد فضائل کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کی نسل سے ہونا چاہیے اور جو نکاح موقت یعنی متعہ کو قانونی حیثیت دے سکے۔

مرزا حیدر دغلت (جو مغل بادشاہ ہمایوں کے خاندان میں سے تھا اور اس نے کشمیر پر حکومت بھی کی) کے مطابق بدخشان اور کشمیر میں نور بخشیہ تعلیمات پر مختلف طریقے سے عمل ہوتا تھا۔ مرزا مزید لکھتا ہے کہ شیعوں اور نور بخشیوں کے متفقہ عقائد میں سے ایک اصحاب ثلاثہ اور حضرت عائشہ کو سخت سست کہنا ہے۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"شاہ ہمدان نے فی الواقع کشمیر میں ذہنی، فکری اور نظری انقلاب پیدا کیا اور اسے علم، صنعت، تہذیب اور دین کا عطیہ دیا وہ حقیقی معنوں میں کشمیر کے ولی، صوفی اور رہنما ہیں۔ شاہ ہمدان اور ان کے پاکیزہ سیرت ہمراہیوں کی وجہ سے چودہویں صدی عیسوی (بالخصوص اس کے ربع آخر میں) ایک عجیب مذہبی فضا پیدا ہوئی ان ایام میں ایک مشہور صوفی خاتون للہ عارفہ کی بڑی شہرت ہوئی۔ اسی زمانے میں نورالدین ریشی جیسے تارک الدنیا بزرگ بھی پیدا ہوئے جو کشمیر میں نند رشی کے نام سے مشہور ہیں اور کشمیر کے محافظ ولی سمجھے جاتے ہیں۔ روایت ہے کہ انہوں نے للہ عارفہ کا دودھ پیا تھا۔ ریشی نامہ اور نور نامہ میں ان کا ذکر اور ان کے ملفوظات موجود ہیں۔ انہوں نے ۸۴۲ھ / ۱۴۳۸ء میں بعہد سلطان زین العابدین وفات پائی اور سری نگر سے

میں میل جنوب مغرب میں چراڑ کے مقام پر مدفون ہوئے۔ کشمیر میں ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ افغان صوبیدار عطا محمد خان نے ان کے نام کے سکے ضرب کرائے۔ دنیا بھر کے اولیائے کرام میں غالباً شیخ نورالدین ریشی واحد بزرگ ہیں جن کے نام کے سکے رائج ہوئے۔

ان کے بعد ان کے اتباع میں ریشی بزرگوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جو ان کی طرح تارک الدنیا تھے اور عوام وخواص ان سے نور ایمان حاصل کرتے تھے۔ ان بزرگوں کی تقدیس اور نفس کشی کا ذکر ابوالفضل اکبرنامہ میں کرتا ہے اور جہانگیر اپنی توزک میں کہتا ہے کہ اس کے زمانے میں اس قسم کے دو ہزار بزرگ کشمیر میں موجود تھے لوگ گروہ در گروہ اسلام قبول کرتے تھے اور نئے مذہب نے ان کے دلوں میں جو ولولہ اور جوش پیدا کیا تھا اس کی وجہ سے اپنے مندروں کو گراتے تھے"۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۳۰۳ جلد ۱۷)

پیچھے شاہ ہمدان کے حالات کے تحت "للہ عارفہ" کا ذکر گزر چکا ہے کہ موصوفہ ہندو گھرانے کی ایک مجذوبہ اور شاعرہ تھی اور ستر پوشی سے بے نیاز ہو کر (یعنی بالکل برہنہ اور عریاں) گلی کوچوں میں بیٹھی گیان دھیان میں مگن رہتی تھی۔ اسے سید علی ہمدانی نے بطور کرامت اپنا خرقہ پہنایا اور دائرہ اسلام میں داخل کیا۔ شیخ نورالدین نے ایک مجذوبہ، شاعرہ اور تارک الدنیا خاتون کا دودھ پیا۔ شیخ کے عقائد و نظریات میں اس دودھ کی تاثیر کے آثار ملتے ہیں اور ان میں شاہ ہمدان اور ان کے خلیفہ شیخ اخی کی تعلیمات اور کرامات کا عکس بھی صاف نظر آتا ہے اسی لئے ان عقائد و نظریات کے حامل بزرگ کشمیر کے "محافظ ولی" سمجھے جاتے ہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کے عہد میں اس قسم کے دو ہزار بزرگ کشمیر میں موجود تھے دیگر ایرانی بزرگوں کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔ اب کوئی بہت ہی بدقسمت کشمیری ہوگا جو ان بزرگوں کے "فیض" سے محروم ہوا ہوگا۔

میر شمس الدین عراقی

سید محمد نوربخش کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سید شاہ قاسم انوار گدی نشین ہوا۔ میر شمس الدین عراقی شاہ قاسم کا شاگرد اور مرید تھا۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۴۸۲ء (بقول بعض ۱۴۸۷ء) میں خراسان کے گورنر سلطان حسین مرزا (۱۴۷۲-۱۵۰۶ء) (جو سید محمد نوربخش کے بیٹے اور خلیفہ شاہ قاسم انوار کے زیر اثر تھا) کے سفیر کی حیثیت سے کشمیر آیا تھا جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ نوربخشیہ

عقائد کی تبلیغ کا مشن لے کر آیا تھا کیونکہ کشمیر و بلتستان میں اس سلسلہ کو اسی نے شائع اور عام کیا تھا۔ میر شمس الدین عراقی کی دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں کشمیر کے چک خاندان نے مذہب شیعہ قبول کیا جس نے آگے چل کر کشمیر کے اقتدار پر بھی باقاعدہ قبضہ کر لیا۔

کشمیر، شمس الدین عراقی کی آمد سے بہت پہلے سے ہی ایران، خراسان، عراق، سمرقند، بخارا، اور تقریباً مغربی ایشیا کی خوش حال ریاستوں کے تمام سیاسی و مذہبی تارکین وطن کی پناہگاہ بن چکا تھا اس سلسلے میں سینکڑوں افراد پر مشتمل پہلا قافلہ سید علی ہمدانی کی زیر قیادت وادی میں پہنچا جنہوں نے اہل کشمیر پر اپنے گہرے مذہبی اثرات چھوڑے۔ شمس الدین عراقی نے اس مذہبی فضا اور سیاسی زعماء کی باہمی کش مکش سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اس نے کشمیر میں اسلام کے ایک بااثر اور پر جوش مبلغ اسماعیل کبروی کے ساتھ میل جول بڑھایا جس نے اس کی خوب سرپرستی کی۔

شمس الدین عراقی نے اسی کے پلیٹ فارم سے اپنے عقیدہ کی تبلیغ شروع کی اس طرح وہ مسلمانان کشمیر میں نفرت و عداوت کا بیج بو کر اور ایک بااثر کشمیری لیڈر بابا علی نجار کو خلیفہ بنا کر واپس چلا گیا۔ بابا علی نجار ایک مقتدر مذہبی رہنما بن گیا اور لوگ بکثرت اس کے حلقۂ ارادت میں اور مریدوں میں شامل ہو گئے۔ اس دوران میر شمس الدین عراقی اپنے مریدوں کے ذریعے کشمیر کے حالات معلوم کرتا رہا جب اس نے فضا خوش گوار پائی تو وہ دوبارہ کشمیر میں داخل ہوا اب اس نے یہاں مستقل رہائش اختیار کر لی اس وقت فتح شاہ دوسری مرتبہ (۱۵۰۵ء تا ۱۵۱۶ء) حکومت کر رہا تھا اور اس کا وزیر اعظم موسیٰ رینہ تھا جو بابا علی نجار کا سب سے بڑا اور سرگرم پیروکار تھا۔ اس طرح شمس الدین عراقی کو علانیہ اپنے عقائد پھیلانے کا موقع مل گیا۔ اس نے "فقہ احوط" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی بعض مورخین نے اسے سید علی ہمدانی کے مرید و خلیفہ خواجہ اسحٰق کی تالیف قرار دیا ہے۔ بہرحال "فقہ احوط" نوربخشی سلسلے کی ایک اہم کتاب ہے اس کتاب میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ "ان اللہ امرنی ان ارفع الاختلاف من بین ھذہ الامۃ ولا فی فروع السنن الشریعۃ المحمدیۃ کما کانت فی زمانہ من غیر زیادۃ و نقصان و نفیا فی الاصول من بین الامم و کافۃ اھل العلم بالیقین" یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ اس امت میں جو اختلاف ہے اس کو دور کروں اور اول شریعت محمدی کا اختلاف دور کر کے ویسے قائم کروں جیسے

خاص آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں تھی۔ اس میں جو کچھ کمی بیشی ہے اس کو مٹا دوں اور پھر وہ اختلاف مٹا دوں جو تمام امتوں اور سب مخلوقات کے عقائد میں ہے" (بحوالہ مذاہب الاسلام صفحہ ۷۰)

شمس الدین عراقی سری نگر میں ۱۵۲۶ء میں فوت ہوا اسے زڈی بل میں سپرد خاک کیا گیا۔ شیعان کشمیر اس مزار کی بڑی تعظیم کرتے ہیں قاضی نور اللہ شوستری کا خیال یہ ہے کہ شیعہ عقیدہ شمس الدین عراقی کے مبلغانہ جوش کے باعث بڑی تیزی سے پھیلا۔ شیعہ مجتہد مفتی جعفر حسین بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"کشمیر میں سید علی ہمدانی اور میر شمس الدین عراقی کے دور میں شیعیت نے ترقی کی اور اب آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر دونوں میں شیعہ آباد ہیں" (اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۹۰۹ جلد ۱۱)

سید حسین عارف نقوی لکھتے ہیں کہ "میر شمس الدین عراقی نے کشمیر و بلتستان میں شیعیت کی خوب تبلیغ کی۔ الحمد للہ بلتستان میں شیعوں کی آج بھی اکثریت ہے" (تذکرہ علمائے امامیہ صفحہ ۲۴)

دراصل شمس الدین عراقی نے پہلی مرتبہ کشمیر کو نوربخشیہ عقائد سے روشناس کرایا لیکن اس کے ساتھ شیعہ عقائد کی بھی تبلیغ کرتا رہا جس کے نتیجے میں بلتستان میں نوربخشی اور اثنا عشری فرقے کو فروغ حاصل ہوا۔ شمس الدین عراقی کی وفات کے بعد اس کے دو بیٹوں میر مختار اور میر یحییٰ نے نوربخشیہ سلسلے کو مقبول بنایا۔

اس خیال میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ شمس الدین عراقی نے ملک میں نوربخشیہ کی اشاعت کی یا شیعہ عقائد کی۔ اس سے کوئی بنیادی فرق نہیں پڑتا کیونکہ نوربخشیہ اور مذہب شیعہ دونوں کا سرچشمہ و منبع ایک ہی ہے جب خود شیعہ مجتہدین و مؤرخین اسے اپنا رہنما و مبلغ تسلیم کرتے ہیں تو دیگر مؤرخین کے قول کا کیا اعتبار ہے۔ محمد اعظم مؤلف "تاریخ اعظمی" کے مطابق اس نے بابا علی نجار کے تعاون سے شیعہ عقیدہ پھیلایا اور زڈی بل میں اپنی خانقاہ بھی تعمیر کروائی لارنس رقم طراز ہے کہ "شیعہ عموماً سری نگر کے زڈی بل محلّہ میں اور ضلع کامراز میں رہتے ہیں ویسے وہ وادی کے دیگر مقامات میں بھی پائے جاتے ہیں۔ شیعہ سلسلہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۱۴۵۰ء میں شمس الدین عراقی کے ذریعے پھیلا لیکن چکوں کے مختصر دور کو چھوڑ کر اسے وادی میں کبھی پورا پورا تسلط حاصل نہ ہوا۔ شروع سے ہی شمس الدین عراقی کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے زڈی بل میں دفنایا گیا اس کی قبر کی (جس کو کئی بار سنیوں نے مٹا دیا تھا) شیعان کشمیر بے حد

تعظیم کرتے ہیں"۔ (الاارنس صفحہ ۱۸۲ بحوالہ تاریخ کشمیر صفحہ ۳۴۳)

اہل سنت کے اس رد عمل سے شمس الدین عراقی کی تبلیغ شیعیت کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صابر آفاقی لکھتے ہیں کہ:

میر شمس الدین عراقی (۱۴۸۴ء-۱۵۳۶ء) کو کشمیر میں اپنی فتح کے لئے سالہا سال قربانیاں دینا پڑیں کیونکہ کشمیر کے کوتاہ اندیش اور لالچی لیڈروں نے ۱۴۸۴ء سے لے کر ۱۵۴۰ء کے عرصہ میں ملک کو بدنظمی و انتشار کے سپرد کر دیا تھا۔ اسی زمانہ میں شمس الدین عراقی کی تحریک شروع ہوئی۔ شمس الدین عراقی شیعوں کا بہت بڑا سرپرست اور کشمیر میں نور بخشیہ کا بانی ہوا ہے وہ ۱۴۸۴ء میں کشمیر آیا تو اس نے اپنے مشن کی تبلیغ کے لئے حالات کو سازگار پایا۔ اس نے شیعہ اور نور بخشیہ عقائد کو طاقت کے بل بوتے پر پھیلایا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس نے کشمیر کے سنی و شیعہ مسلمانوں کے درمیان دائمی تعصب و نفرت کے بیج بو دیئے۔ ان کے آپسی تعلقات تلخی، کینے اور لڑائی کی ایک طویل کہانی بن گئے۔ چکوں کے عہد (۱۵۰۰ تا ۱۵۸۶ء) میں شیعوں کے وارے نیارے تھے چند مغل اور پٹھان گورنروں نے بھی ان کو اپنی پوزیشن مضبوط کرنے میں مدد دی۔ ایک چھوٹی سی اقلیت ہونے کی وجہ سے یہ لوگ سرکاری اور سماجی لحاظ سے ملک کے لئے شدید خطرہ بنے رہے"۔ (تاریخ کشمیر اسلامی عہد میں صفحہ ۲۱۵-۲۲۱)

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ:

"سلطان زین العابدین کی وفات کے بعد کشمیر میں بڑی کھلبلی مچی ۱۴۸۷ء میں عراق سے میر نور بخش کا مرید شمس الدین کشمیر میں آیا اور اس ملک میں نور بخشی عقائد کی اشاعت شروع کی (اسماعیلی خوجوں کی تاریخ نور المبین میں نور بخشیوں کو اسماعیلی بتایا گیا ہے) ابتداء میں خلقت نے اس پر بڑا اعتماد کیا۔ اس کے مریدوں کے لئے دیہات وقف ہوئے اور خانقاہیں رہنے کو ملیں۔ یہ لوگ میر نور بخش کو مہدی آخر الزماں سمجھتے ہیں اور باقی اکثر عقیدوں میں شیعوں سے ملتے جلتے ہیں۔ تھوڑے عرصے میں چک قوم کے لوگوں نے جو بعد میں کشمیر کے حکمران ہوئے یہ مذہب اختیار کر لیا اور کشمیر میں اس شیعہ سنی مسئلے کا آغاز ہوا جس نے بعض اوقات بڑی تلخ صورت اختیار کر لی۔ آخر میں اس ملک میں شیعوں کی ایک کثیر تعداد ہو گئی لیکن شیعوں نے فقط سنی مسلمانوں میں ہی اپنے خیالات کی تلقین نہیں کی بلکہ ہندوؤں میں بھی بڑے جوش سے اپنے

عقائد پھیلائے میر شمس الدین کی نسبت مشہور ہے کہ انہوں نے ایک ایک دن میں بیس ہزار ہندوؤں کو مسلمان (شیعہ) کیا اور بہت سے ہندو شیعہ مبلغین اور حکام کی بدولت پہلے پہل مسلمان (شیعہ) ہوئے ۱۵۸۶ء تک کشمیر حکومت دہلی سے آزاد رہا لیکن جب شیعہ چکوں نے سنیوں پر کثرت سے مظالم شروع کئے تو بابا داؤد خاکی اور شیخ یعقوب صرفی وغیرہ کا ایک وفد اکبر کے پاس فریاد لے کر گیا اور اکبر نے اسی سال یہ ملک فتح کر کے اسے مقبوضات مغلیہ میں داخل کیا"۔ (آب کوثر ۳۶۲)

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ کشمیر میں شیعیت کو فروغ علی ثانی امیر کبیر سید علی ہمدانی (جو بظاہر سہروردیہ سلسلے کی کبرویہ شاخ سے اپنا تعلق ظاہر کرتے تھے) ان کے خلیفہ و مرید شیخ اسحٰق، ان کے خلیفہ شیخ نوربخش، ان کے خلیفہ شاہ قاسم انوار، ان کے خلیفہ میر شمس الدین عراقی اور ان کے ہزاروں پیروکاروں کے ذریعے حاصل ہوا، جنہوں نے نہ صرف تقیہ اور تصوف کے لبادے میں بلکہ ردائے تقیہ اتار کر بھی شیعی افکار و نظریات عوام و خواص میں خوب پھیلائے جبکہ مقامی حکمرانوں نے ان کی خوب سرپرستی کی تا آنکہ چک خاندان (جس نے شمس الدین عراقی کی تحریک پر شیعہ مذہب اختیار کیا تھا) نے برسر اقتدار آ کر بزور مذہب شیعہ کی نشر و اشاعت کی۔

چک خاندان کی حکومت

مرزا حیدر دوغلت کے خلاف کامیاب بغاوت کر کے چک خاندان نے ۱۵۵۲ء میں کشمیر کا اقتدار سنبھال لیا۔ اس خاندان کا اقتدار ۱۵۸۶ء تک قائم رہا۔ چک مذہباً غالی شیعہ تھے۔ ۱۵۵۱ء میں دولت چک نے دس ماہ کے برائے نام اقتدار کے بعد نازک شاہ کو موقوف کر کے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس نے محمد شاہ کے پوتے اسماعیل شاہ دوم کو حکومت سونپ دی لیکن اپنی وفات یعنی ۱۵۵۴ء تک وہ خود تاج پہناتا رہا۔ بہارستان شاہی کا مؤلف مرزا حیدر دغلت کی مذہبی حکمت عملی کی مذمت کرتا ہے لیکن دولت چک کی تعریف میں وہ زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے وہ لکھتا ہے کہ اس نیکوکار آدمی نے حکم جاری کیا کہ اس کی حدود سلطنت کے اندر ہر شخص کو اس مذہب کی پیروی کی اجازت ہے جسے وہ پسند کرے اور کسی کو مذہبی امور میں دق کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے دولت چک کا رجحان ہمیشہ شیعہ مذہب اور نوربخشیہ عقائد کی طرف رہا۔ اس نے نوربخشیہ عقائد کے احیاء کی بھرپور

کوشش کی۔ زڈی بل میں شمس الدین عراقی کا مزار تعمیر کرایا جسے مرزا حیدر دغلت نے مسمار کرادیا تھا۔ اس نے شیخ دانیال اور بابا علی نجار کی یاد میں نئی قبریں بنوائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے سید علی ہمدانی اور شمس الدین عراقی کے صوفیانہ سلسلوں کو دوبارہ زندہ کیا۔ اس نے حکم دیا کہ شیعوں کے بارہ اماموں کا نام خطبہ میں پڑھا جائے۔

۱۵۵۴ء میں اسماعیل شاہ دوم فوت ہوگیا اور حبیب شاہ اس کا جانشین مقرر ہوا۔ دولت چک نے ایک بہادر اور سنگ دل نوجوان غازی چک کی ماں سے شادی کر لی جس پر غازی خان برا فروختہ ہوگیا اور ۱۷۔ اکتوبر ۱۵۵۵ء کو دولت چک پر قابو پا کر اس کی آنکھیں نکال دیں تا کہ وہ ایک سیاسی حریف کی حیثیت سے بھی کام نہ کر سکے۔ غازی خان نے ناصر الدین محمد غازی شاہ کا لقب اختیار کر کے ۱۵۵۵ء میں سلطان کشمیر ہونے کا اعلان کر دیا اور شاہ میریوں کے جانشین کی حیثیت سے چک خاندان کی بنیاد رکھی۔ اس طرح غازی خان کشمیر کا پہلا چک بادشاہ بن گیا۔ ۱۵۶۲ء میں غازی خان چک اپنے بھائی حسین خان چک کے حق میں حکومت سے دست بردار ہوگیا۔

ناصر الدین محمد غازی شاہ کے بعد اس کا بھائی حسین خان چک محمد نصیر الدین حسین شاہ غازی کے لقب سے تخت نشین ہوا اور سات سال حکومت کرنے کے بعد ۱۵۶۹ء میں اپنے بھائی علی خان کے حق میں دست بردار ہوگیا۔

نصیر الدین حسین شاہ کی دست برداری کے بعد علی خان ظہیر الدین محمد علی بادشاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ ۱۵۷۳ء میں سلطان علی شاہ نے اکبر بادشاہ کو حاکم اعلیٰ تسلیم کر لیا۔ اس کے نام کا خطبہ پڑھا اور سکہ جاری کیا۔ جب ۱۵۷۹ء میں اکبر کا سفیر کشمیر سے روانہ ہوا تو اس نے بادشاہ کے لئے بہترین تحائف، زعفران، کستوری، اور شال وغیرہ بھیجے اور مستقل اطاعت کے ثبوت کے طور پر اس نے محمد قاسم کو مغل دربار میں نمائندہ بنا کر بھیجا اور اپنی بھتیجی کی منگنی بھی شہزادہ سلیم سے کروادی علی شاہ عیدگاہ گراؤنڈ میں پولو کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر ۱۵۷۹ء میں فوت ہوگیا اس نے نو برس حکومت کی۔

اس کے بعد اس کا بیٹا یوسف شاہ نصیر الدین محمد یوسف بادشاہ غازی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ یوسف شاہ چک کشمیر کی تاریخ میں سب سے بڑا عاشق مزاج بادشاہ گذرا ہے اس کا عہد حکومت خانہ جنگی سے شروع ہوا اور کشمیر میں شیعہ حکومت کے خاتمہ اور اکبری سلطنت کے

ساتھ الحاق پر ختم ہوا۔

یوسف شاہ کو اپنے عہد میں اپنے حریف سید مبارک شاہ کے ہاتھوں ملک سے فرار بھی ہونا پڑا۔ اس دوران تقریباً ڈیڑھ سید مبارک شاہ اور ایک سال تک یوسف شاہ کے چچازاد بھائی لوہر شاہ چک نے حکومت کی پھر ۱۵۸۰ء میں لوہر شاہ چک کو شکست دے کر یوسف شاہ دوبارہ بر سر اقتدار آ گیا۔ ۱۵۸۵ء میں وہ تاج و تخت کے دعویٰ سے دست بردار ہو گیا تو اس کے بیٹے یعقوب خان نے ناصر الدین محمد یعقوب بادشاہ غازی کے لقب سے اپنی سلطنت کا اعلان کر دیا۔ اسے مختلف عادات اپنے والد سے ورثہ میں ملی تھیں وہ ایک بہادر جنگجو تھا لیکن اس کے ساتھ وہ ایک متعصب اور غالی شیعہ بھی تھا۔ خوشامدیوں نے اسے شاہ اسماعیل کا لقب اختیار کرنے کا مشورہ دیا پھر جلد ہی اس نے سنیوں کے خلاف انتہائی مکروہ طور طریقے اپنا لئے اور ظلم و ستم کی وجہ سے عوام کے دلوں میں اپنے خلاف نفرت پیدا کر لی دنیا کے کاروبار سے اسے کوئی سروکار نہ رہا۔ وہ شیعہ سنی اختلاف کو ہوا دینے کے لئے مذہبی جھگڑوں میں الجھا رہا اس نے سنیوں کے رہنما اور عمر رسیدہ شخص قاضی موسیٰ کو قتل کروا کر ان کے گھر اور سامان کو غارت کروا دیا۔

(بحوالہ تاریخ کشمیر اسلامی عہد میں ملخصاً صفحہ ۱۶۲-۱۹۰)

شیعہ چکوں نے جب اہل سنت پر مظالم کی انتہا کر دی تو ان کا ایک وفد اکبر بادشاہ کے پاس فریاد لے کر گیا۔ اکبر کو جو سنیوں کے ساتھ ہمدردی یا دلچسپی تھی وہ اس کے عہد حکومت کے تحت پیچھے گذر چکی ہے البتہ اس نے اپنی سلطنت کی توسیع کے جذبہ کے پیش نظر کشمیر کو فتح کر کے اسے مقبوضات مغلیہ میں داخل کر لیا۔ لیکن شیعہ سنی تنازعہ و عداوت کا جو مستقل بیج سید نور بخش اور شمس الدین عراقی نے بویا تھا وہ ۱۸۷۲ء تک فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں برابر جاری رہا۔ ۱۸۷۲ء میں کشمیر کا دھرا ڈوگرہ حکمران مہاراجہ رنبیر سنگھ جو وقتی طور پر بظاہر دونوں متحارب گروہوں کے درمیان صلح و صفائی کرانے میں کامیاب ہو گیا مگر ان کے دلوں میں پرانے زخم ہرے ہی رہے۔

سید محمود آزاد حکومت چک کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

”مرزا حیدر دوغلات کے بعد کشمیر کی حکومت چک خاندان کے پاس چلی گئی اس خاندان کا عہد ۱۵۵۲ء تا ۱۵۸۶ء ہے چک مذہباً شیعہ تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے دور حکومت میں کشمیر کی وادی شیعہ سنی فسادات کی لپیٹ میں آ گئی بالآخر چک خاندان کے حکمران حسین شاہ

چک۔ علی شاہ چک اور یعقوب چک کے عہد میں سیاسی افراتفری اور شیعہ سنی مناقشات حد سے بڑھ چکے تھے ان کی زیادتیوں کی تاب نہ لا کر کشمیری زعما کا ایک وفد شیخ یعقوب صرفی دداؤد خا کی کی قیادت میں اکبر بادشاہ کے پاس گیا اور ایک معاہدے کے بعد ۱۵۸۶ء میں اکبری لشکر نے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح کشمیر کی وادی سے اہل کشمیر (شیعہ) کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا" (تاریخ پونچھ ص ۴۴)

یہ ملحوظ رہے کہ مؤلف "تاریخ پونچھ" چک خاندان کا ہم مذہب ہے۔

پونچھ میں انجمن جعفریہ کا قیام

محمد دین فوق لکھتے ہیں کہ:

"سید محمد امیر علی شاہ بن سید علی اصغر شاہ (جو اثناعشری شیعہ ہیں) نے ۱۹۷۸ء بکری میں شیعہ قوم کے حال زار کا موازنہ کرتے ہوئے "انجمن جعفریہ" کی بنیاد ڈالی۔ جس کے تحت بارہ چودہ انجمنیں باہر مضافات میں کھولی گئیں آج شیعہ قوم کی آبادی پونچھ کے علاقہ میں انیس بیس ہزار کے قریب ہے وہ سب آپ کی خدمات کی معترف ہے علمائے شیعہ لکھنو نے آپ کو "منظیر قوم" کا خطاب دیا اور ایک سند بھیجی جس پر تمام علمائے شیعہ و مجتہدین جعفریہ کے دستخط ہیں یہ سند راجہ صاحب پونچھ نے ایک عام اجلاس میں آپ کو اپنے ہاتھ سے عطا کی۔ اس کے علاوہ مہاراجہ محمود آباد، ہز ہائی نس نواب محمد حامد علی خان والی رام پور، نواب فتح علی خان قزلباش لاہور نواب محمد علی خان قزلباش لاہور اور ہز ہائی نس میر خیر پور سندھ اور دیگر شیعہ رؤسا نے آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے اجلاس میں ایک خاص ریزولیشن آپ کی دینی خدمات اور آپ کے خاندانی وقار کے متعلق پاس کر کے راجہ صاحب پونچھ کی خدمت میں روانہ کیا۔

شورش ۱۹۸۸ء ب کے دوران میں آپ نے جس وفاداری سے خدمات سرانجام دیں ان کا اعتراف سرکاری طور پر ایک بھرے جلسہ میں کیا گیا اور اسی صلہ میں سری راجہ جگت دیو سنگھ جی موجودہ فرمانروا نے آپ کو دو سو چالیس روپے کا وظیفہ تا حیات عطا فرمانے کے علاوہ ساٹھ کنال اراضی اور چار سو روپے کی سالانہ جاگیر دوامًا عنایت کی۔ علاوہ ازیں آپ کو ساڑھے چار سو روپے سالانہ تنخواہ و الاؤنس کی صورت میں ملتا ہے اس خاندان کے پاس چک جسو تحصیل سانبہ میں چالیس کنال اراضی ہے اور پونچھ کے موضع جہنیار میں تین چار سو کنال اراضی اس کے علاوہ ہے۔

سید محمد امیر علی شاہ جعفری ایک زبردست اور فصیح و بلیغ مقرر ہیں آپ کے چچا سید شاہ حسین کتب خانہ

میں کئی قلمی (غیر مطبوعہ) کتابیں بیان کی جاتی ہیں آپ نے سری جگت دیو لائبریری کو صحیح معنوں میں لائبریری بنا دیا ہے۔ پونچھ کے علاوہ اس خاندان کے افراد گورداسپور، سیالکوٹ اور جموں کے اضلاع میں پھیلے ہوئے ہیں اور وہ سب پونچھ کی اس برادری کو عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں"۔

(تاریخ اقوام پونچھ صفحہ [illegible])

مشہور شیعہ سکالر سید مرتضیٰ حسین لکھتے ہیں کہ:

"۱۹۳۲ء میں ریاست پونچھ کے ہز ہائنس مہاراجہ جگت دیو سنگھ نے انجمن جعفریہ کے جلسوں کی صدارت اس شرط پر منظور فرمائی کہ مولانا امداد حسین صاحب تقریر کریں گے۔ مولانا کی تینوں تقریریں سن کر وہ اور عام مسلمان اور احمدی اس قدر متاثر ہوئے کہ انجمن اہلسنت (پونچھ) کی طرف سے تین جلسے اور ہوئے اور مہاراجہ بنفس نفیس تشریف لاتے رہے مہاراجہ نے شاہی مہمان اور شاہی اعزاز کے ساتھ آپ کو رکھا۔ باقاعدہ اکیس توپوں کی سلامی، شاہی سواری، شاہی خلعت فاخرہ اور "ابوالفضل ثانی" کا خطاب دے کر معاصرین میں معزز فرمایا جس پر اس زمانے کے شیعہ اخبارات نے بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا"۔ (القرآن المبین۔ تفسیر المتقین صفحہ ۷)

یہ ملحوظ رہے کہ "تفسیر المتقین" جسے شیعہ جنرل بک ایجنسی لاہور نے شائع کیا ہے ابوالفضل ثانی سید امداد حسین کاظمی المشہدی کی مرتب کردہ ہے۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ کشمیر کے دور دراز علاقوں میں مذہب شیعہ کے فروغ میں اہل تشیع نے انفرادی، جماعتی اور سرکاری سرپرستی میں کس قدر محنت و مشقت برداشت کی۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جب پونچھ کے مسلمانوں نے ڈوگرہ مہاراجہ کی ظالمانہ روش کے خلاف جہاد حریت کا علم بلند کر کے کشمیر کا ایک حصہ "آزاد کشمیر" کے نام سے آزاد کرالیا تو شیعہ علماء وذاکرین نے مقبوضہ کشمیر سے "ہجرت" کر کے اس آزاد خطے میں ڈیرے ڈال دیئے اور شیعیت کی نشر و اشاعت میں علانیہ طور پر بھی اور تقیہ و تصوف کے لبادے میں بھی ہمہ تن مشغول و مصروف ہو گئے اس سلسلے میں بعض خانقاہوں بالخصوص سائیں سہیلی سرکار کے شیعہ مجاوروں نے بھی اپنا کردار خوب ادا کیا۔ اس کے علاوہ تمام حکمرانوں نے بھی اپنے پیش رو مہاراجہ سری جگت دیو سنگھ کی طرح اہل تشیع کی سرکاری طور پر خوب سرپرستی کی جس کی وجہ سے آزاد کشمیر کے اہم شہروں اور

بعض دیہات میں بھی ان کے اہم مراکز قائم ہو گئے۔ آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفر آباد اور ضلع باغ میں "وال چاکنگ" سے اندازہ ہوتا ہے کہ پورے خطے میں ان کا تسلط ہے۔ مظفر آباد میں چند سال قبل مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی سرپرست اعلیٰ سپاہ صحابہؓ پاکستان کی تقریر کا اعلان ہوا جس کے جواب میں اہل تشیع نے اعلان کیا کہ وہ یہاں تقریر نہیں کر سکتے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت فاروقی کے جلسہ گاہ میں پہنچنے سے پہلے ہی فائرنگ اور پتھراؤ کے ذریعے جلسہ کو درہم برہم کر دیا اور موصوف بغیر تقریر کئے واپس تشریف لائے۔

راقم الحروف کو مظفر آباد میں ایک سنی خطیب نے ایک ضلع مفتی سے متعارف کرایا۔ بعد میں بتایا کہ یہ شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اس تیزی کے ساتھ شیعہ اور مذہب شیعہ کے فروغ کو دیکھ کر مفتی کفایت حسین نقوی ممبر اسلامی نظریاتی کونسل وصدر تحریک نفاذ فقہ جعفریہ آزاد کشمیر پورے خطے میں خمینی انقلاب درآمد کرنے کی سرتوڑ کوشش میں مصروف ہیں۔ اس کا حوالہ پیچھے "سید علی ہمدانی" کے حالات کے تحت گذر چکا ہے۔

شیعیت پاکستان میں

سید حسین عارف نقوی لکھتے ہیں کہ "یوں تو پاکستان میں شیعیت اسی وقت سے موجود تھی جب سے مسلمانوں نے سندھ پر حملہ کیا تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ملتان میں آل محمد علیہم السلام کے تذکروں کا آغاز ۶۰ے سے ہوا اور یہاں سب سے پہلے شیعہ مبلغ علی آئے۔ عبداللہ بن محمد جن کا سلسلہ نسب پانچ پشتوں پر حضرت علی علیہ السلام سے جا ملتا ہے سندھ میں تبلیغ کے لئے آئے۔ ابن اثیر نے ۱۵۱ھ میں منصور کے گورنر عمر بن حفص کو شیعہ بتایا ہے ان علماء نے ان علاقوں میں کچھ اس انداز سے تبلیغ کی کہ ملتان اور سندھ میں شیعہ ہی شیعہ نظر آنے لگے اور شیعہ حکومت قائم ہو گئی۔ مگر افسوس کہ محمود غزنوی نے مال کے لالچ میں ان کو قرامطہ قرار دیا اور علماء نے فتویٰ دیا کہ یہ سب واجب القتل ہیں چنانچہ محمود غزنوی نے ملتان کی اس حکومت کو تہس نہس کر دیا اور یوں شیعیت کو بزور شمشیر سنیت میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس بات کے آثار کہ کسی زمانے میں اس علاقے میں شیعوں کی اکثریت تھی آج بھی موجود ہیں"۔ (تذکرہ علماء امامیہ صفحہ ۲)

محمود غزنوی کے ہاتھوں ملتان کی اس شیعہ اقرامطہ حکومت کے خاتمہ کا ذکر پیچھے زیر عنوان "شیعیت برصغیر میں" گذر چکا ہے اسی عنوان کے تحت مذہب شیعہ کے فروغ کا بھی ذکر

کیا گیا ہے اس دور میں ہندوستان کے ساتھ ساتھ سرزمین پاکستان میں بھی شیعیت کی اشاعت ہوتی رہی۔ سندھ، ملتان اور لاہور اس تحریک کے اہم مراکز رہے۔ پاکستان کا علاقہ اس وقت بر صغیر کا ہی ایک حصہ تھا ملتان کی شیعہ حکومت کے خاتمے کے بعد اہل تشیع نے ردائے تقیہ اوڑھ کر تصوف کے لبادے میں مذہب شیعہ کی اشاعت شروع کر دی جس کے نتیجے میں بعض مشہور خانقاہیں، دربار اور مزار شیعیت کے اڈے بن گئے جن میں سے صرف چند درباروں کا تعارف ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے۔

شاہ جیونہ

شاہ جیونہ کا مزار ضلع جھنگ میں واقع ہے اور یہ خالصۃً ایک شیعہ گدی ہے اس کے باوجود ہزاروں جاہل سنی "روحانی فیض" حاصل کرنے اور اپنی "مرادیں" پانے کے لئے حاضری دیتے ہیں۔

سید محبوب عالم المعروف حضرت شاہ جیونہ کا شجرہ نسب حضرت علیؓ سے ملتا ہے ان کے والد کا نام سید احمد کبیر ثانی تھا ان کی ولادت ۸۹۵ھ میں بمقام قنوج ہوئی جہاں ان کا خاندان اوچ شریف بہاولپور سے منتقل ہو کر آباد ہوا تھا۔ یہ اکیس برس تک والدین کے ہمراہ رہے پھر مختلف علاقوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے کرتے لاہور پہنچے جہاں ان کے جد امجد حضرت شیر شاہ جلال سرخ بخاری نے خواب میں ان کو اشارہ دیا کہ جھنگ جا کر تبلیغ کا کام سرانجام دیں چنانچہ شاہ جی ۹۲۱ھ کے لگ بھگ جھنگ پہنچے اور جس جگہ قیام کیا اس جگہ کا نام بھی ان کے نام پر "شاہ جیونہ" مشہور پڑ گیا۔

"شاہ جیونہ" کے لقب کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سینہ بسینہ روایات کے مطابق شاہ جی "مستجاب الدعوات" تھے۔ زہد و تقویٰ، تولا و تبرا اور "روحانی علوم" کے لحاظ سے اہم مقام پر متمکن تھے لاعلاج مریض ان کی دعا سے صحت یاب ہو جاتے۔ اسی وجہ سے لوگوں نے ان کو "شاہ جیون" (یعنی زندگی دینے والا) کے نام سے پکارنا شروع کر دیا جو بعد میں "شاہ جیونہ" بن گیا۔

تذکرہ نگاروں کے مطابق انہوں نے ایک مرتبہ دریائے چناب کی تند موجوں میں کھڑے ہو کر ایک کروڑ دفعہ سورۃ مزمل کا ورد کیا جس سے آپ کو "کروڑی" کا خطاب ملا۔

مضمون نگار نے شاہ جی پر بڑا ظلم کیا کہ دریائے چناب کی تیز موجوں میں انہوں نے

کھڑے ہوکرایک کروڑ دفعہ سورۃ مزمل کاورد کیا۔انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ سورۃ مزمل دو رکوع اور بیس آیات پر مشتمل ہے اگر بالفرض ایک مرتبہ اس سورۃ کے پڑھنے پر کم از کم دو منٹ بھی لگتے ہوں تو ایک کروڑ دفعہ پڑھنے پر دو کروڑ منٹ لگے ہوں گے ان کے گھنٹے، دن مہینے اور سال بنائیں تو اڑتیس سال اور سات ماہ کا عرصہ بنتا ہے اس کے علاوہ طبعی اور شرعی تقاضوں پر وقت بھی شامل کرلیا جائے تو اس مدت میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے اگر یہ روایت صحیح ہے تو پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف پہلی ہی مرتبہ چلہ کشی کے لئے دریا میں تشریف لے گئے لیکن اس کی تند و تیز موجوں نے انہیں واپسی کا موقع ہی نہیں دیا۔

بہرحال شاہ جیونہ نے تبلیغ کے ذریعے بے شار لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل کیا جن کی اولاد آج بھی شاہ جیونہ اور ان کی اولاد کو اپنا روحانی پیشوا مانتی ہے شاہ جیونہ کا انتقال ۱۰۷۱ھ بعمر چھہتر ۷۶ برس ہوا۔

شاہ جیونہ کی اولاد کا سلسلہ کچھ اس طرح ہے۔شاہ جیونہ، یحیٰ حبیب، جلال شاہ اول، عبدالرحمٰن اول، جلال شاہ ثانی، عبدالرحمٰن ثانی، صالح شاہ اول، مبارک شاہ، غوث محمد ثانی، یحیٰ صالح شاہ، مخدوم حضرت شاہ اور محمود حیات محمد غوث شاہ۔

مؤخرالذکر ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم کے بعد ایچی سن کالج اور بعد ازاں اسلامیہ کالج سول لائنز سے گریجویشن کی انہیں دو مرتبہ قائداعظم محمد علی جناح سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔۱۹۵۸ء میں اپنے والد مخدوم حضرت حیات شاہ کی وفات کے بعد بعمر اکتیس برس دربار شاہ جیونہ کے گدی نشین بنے۔ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے لڑکے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے ممتاز رہنما مخدوم فیصل صالح حیات گدی نشین ہوئے۔۵ مئی ۱۹۹۰ء کو ان کی دستار بندی کی رسم ادا کی گئی اور وہ دربار شاہ جیونہ میں "بوریا" یعنی کرسی پر بیٹھے۔مخدوم محمد غوث شاہ اپنے آباؤاجداد کی طرح اپنے مذہب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے ان کے مرید ملک کے طول وعرض کے علاوہ ایران، عراق، کشمیر، ہندوستان اور افغانستان میں بھی موجود ہیں۔

مخدوم محمد غوث شاہ نے گدی نشین ہونے کے بعد مریدین میں اپنے مذہبی افکار و نظریات راسخ کرنے کے لئے ان سے قریبی رابطوں کو استوار کیا۔سندھ، سرحد اور پنجاب کے کئی علاقوں میں امام باڑے تعمیر کرائے۔موصوف ذوالجناحوں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے وہ

دربار پر شیعی رسوم کی پوری پوری ادائیگی کرواتے تھے اور اپنے بزرگوں کے اصولوں کی سختی سے پابندی کرتے تھے ان کے مریدین اور عقیدت مندوں میں ہر فرقہ کے لوگ شامل تھے۔

موضع کوٹلہ رحمان اور موضع قطب میں ۱۲۵ مربع زرخیز زرعی اراضی دربار شاہ جیونہ کے نام وقف ہے جس کی آمدنی سے ضلع سرگودھا میں ایک یتیم خانہ اور ایک مذہبی درس گاہ کا انتظام چل رہا ہے۔ شاہ جیونہ کے خاندان کے افراد پر مشتمل ایک کمیٹی اس ٹرسٹ کا نظم ونسق چلا رہی ہے۔

سادات شاہ جیونہ کے گدی نشینوں میں موت سے پہلے موت کی آگاہی کی روایت قائم ہے ہر سال میلہ کے موقع پر ایک چراغ ایک سو بیس فٹ اونچے نشان (پائپ) پر رسیوں کی مدد سے چڑھایا جاتا ہے جسے "انگاسی" کہتے ہیں اگر انگاسی راستے میں بجھ جائے تو باور کیا جاتا ہے کہ گدی نشین اس جہان فانی سے رخصت ہو جائے گا۔ اس وقت تک تین سجادہ نشین چراغ بجھ جانے کی بناء پر اس دنیا سے رحلت کر گئے۔ ۱۹۰۷ء میں سید صالح شاہ پھر مخدوم خضر حیات اور ۱۹۸۹ء میں مخدوم سید محمد غوث شاہ اور دربار کا ایک ملنگ سائیں "خاک علی" بھی فوت ہو گیا۔

مخدوم سید محمد غوث شاہ کی وفات کے بعد ان کے بڑے لڑکے مخدوم سید فیصل صالح حیات گدی نشین مقرر ہوئے۔ عرس کے موقع پر لاکھوں مریدین کی موجودگی میں ان کی دستار بندی کی گئی اور وہ ایک ہفتہ کے لئے دربار میں داخل ہو کر کڑی (بوریا) پر جا بیٹھے دربار شاہ جیونہ کے زائرین کے لئے کوئی معقول انتظام نہیں تھا چنانچہ سرکاری خزانے سے پیپلز پارٹی کی حکومت نے پیپلز پروگرام کے تحت بیالیس لاکھ روپے کے کثیر سرمایہ سے زائرین کے لئے کمرے، لیٹرین، غسل خانے بجلی اور پانی کے خصوصی انتظامات کئے ہیں۔

{بحوالہ روزنامہ جنگ ۹ مئی ۱۹۹۰ء ملخصاً}

شاہ جیونہ ایران کے صفوی حکمرانوں کے ہم عصر تھے تمام سادات جیونہ نے مذہب شیعہ کے فروغ میں نمایاں طور پر حصہ لیا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران جب برصغیر میں مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے تو اس وقت بھی ملتان، جھنگ، ساہیوال اور مظفر گڑھ کے روسا شیعہ کی ہمدردیاں انگریزوں کے ساتھ تھیں۔

{تاریخ جھنگ صفحہ ۳۲۵ مولفہ بلال زبیری}

بری سرکار

بری امام کا نام عبداللطیف کاظمی مشہدی ہے اور بری امام کے لقب سے مشہور ہیں۔ والد کا نام سید محمود شاہ بن سید بودلہ شاہ والدہ کا نام فاطمہ اور دیگر دو بھائیوں کے نام سید مراد شاہ اور سید چھوٹے شاہ تھا ان کا شجرہ نسب ستائیس واسطوں سے امام موسیٰ کاظم سے ہوتا ہوا حضرت علیؑ سے جاملتا ہے۔ ان کا قبیلہ مشہد (ایران) سے نقل مکانی کر کے براستہ سبون اور ملتان خطہ پوٹھوہار میں پہنچا۔ بری سرکار کی ولادت ۱۰۲۶ھ/۱۶۱۷ء میں تحصیل و ضلع چکوال کے موضع کرسال میں ہوئی۔ پھر وہ بچپن میں اپنے والدین کے ہمراہ سید کسراں گوجر خان آگئے یہاں پر سادات کاظمیہ کے بابا شاہ مندر اور سید دیوان شاہ کے مزارات ہیں۔

موضع سید کسراں کو سادات کے گھرانوں کی وجہ سے مرکزیت حاصل ہے اس قصبے میں آباد تمام سادات حضرت موسیٰ کاظم کی اولاد ہیں اور فقہی لحاظ سے حضرت جعفر صادق کے پیروکار ہیں یعنی غالی شیعہ ہیں۔ بری امام نے اسی شیعی ماحول (سید کسراں) میں اپنا بچپن گذارا۔ ان کے والد سید محمود شاہ حوزہ علیہ نجف اشرف کے فارغ التحصیل تھے۔ بری امام نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور مزید اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر والدین کی اجازت و رضامندی سے ایران و عراق کا پاپیادہ سفر اختیار کیا اور مختلف مقامات پر تحصیل علوم میں مصروف رہے جن میں مشہد مقدس، نجف اشرف، کربلائے معلیٰ اور سامرہ شامل ہیں۔ یہاں سے دینی علوم کے علاوہ روحانی فیض بھی حاصل کیا۔ یہ ملحوظ رہے کہ اس وقت ایران میں صفوی خاندان کی ایک ظالم اور غالی شیعہ حکومت قائم تھی۔

بری امام ایران و عراق میں بارہ سال حصول علم میں صرف کرنے کے بعد واپس سید کسراں وارد ہوئے اور اپنے مذہب کی نشر و اشاعت میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اس کے بعد بسلسلہ تبلیغ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ہمراہ راولپنڈی کے شمالی جانب چند میل کے فاصلے پر باغ کلاں (آبپارہ مارکیٹ اسلام آباد) کے مقام پر اقامت پذیر ہوئے۔ یہاں کے باشندوں نے عزت و احترام کے ساتھ خیر مقدم کیا اور کچھ اراضی بطور نذرانہ عقیدت پیش کی۔ بری امام کے والدین، ہمشیرہ اور بھائی کے مزارات بھی یہیں واقع ہیں۔

بعد میں بری امام چور پور (موجودہ نور پور شاہان) منتقل ہو گئے حضرت شہباز قلندر کا

زبان زد عام نغمہ "لولال میری پت رکھیوں بال جھولے لالن۔ دمادم مست قلندر۔ حق علی دا پہلا نمبر" بھی امام بری کا تحریر کردہ ہے۔

ایک روایت کے مطابق بری امام سندھ کے عظیم صوفی شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مرشد ہیں شاہ عبداللطیف (۱۱۰۱ھ/۱۱۶۵ھ) کے تذکرہ نگاروں نے متفقہ طور پر یہ ذکر کیا ہے کہ ان کے والد شاہ حبیب اولاد نرینہ سے محروم تھے ان کے مرشد جن کا نام شاہ عبداللطیف تھا انہوں نے دعا کی اور کہا کہ آپ کے گھر ایک بچہ پیدا ہوگا اس کا نام میری نسبت سے عبداللطیف رکھا جائے۔ چنانچہ عبداللطیف بھٹائی کی پیدائش پر شاہ حبیب نے اپنے بیٹے کا نام مرشد کے ارشاد کے مطابق عبداللطیف رکھا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی سیہون شریف اور ملتان کی زیارت کے بعد اس خطہ میں بھی آئے اور بری امام کی خانقاہ پر انہوں نے چلہ کشی کی اورنگ زیب عالمگیر جب سندھ کے گورنر تھے تو ان سے بری امام کی ملاقات ہوئی لیکن ان سے زیادہ شاہ جہاں، دارا شکوہ اور بہادر شاہ اول آپ کے عقیدت مند تھے یہ ملحوظ رہے کہ اورنگزیب عالمگیر کے بعد بہادر شاہ اول نے تخت نشین ہوتے ہی علانیہ شیعہ مذہب اختیار کرلیا اور تمام خطباء کو خطبہ جمعہ میں ائمہ اثنا عشر کے نام شامل کرنے کا حکم جاری کیا تھا۔

حضرت شہباز قلندر کی رضا کار فوج میں سب سے بڑا منصب امام بری کا ہوتا تھا جس میں توشہ خانہ وغیرہ کے انتظامات شامل ہوتے تھے بری امام ۱۱۱۷ھ/۱۷۰۸ء میں بعمر اکانوے برس فوت ہوئے اور نورپور شاہان میں دفن کیے گئے۔ پہلے بری امام کا میلہ بارہ دن جاری رہتا تھا پھر محمد ایوب خان کے دور میں محکمہ اوقاف کی تحویل میں آنے کے بعد یہ میلہ پانچ روزہ ہوگیا۔

{بحوالہ روزنامہ پاکستان ۲ مئی ۱۹۹۷ء روزنامہ خبریں ۷ مئی ۱۹۹۷ء روزنامہ اوصاف ۱۹ اپریل ۱۹۹۸ء}

بری امام کے حالات زندگی اور ان کی تعلیم و تبلیغ سے یہ واضح ہوگیا ہے کہ موصوف نے ایک شیعہ گھرانے میں آنکھ کھولی، انہوں نے شیعی ماحول میں پرورش پائی، شیعی مدارس میں شیعہ مجتہدین سے علمی و روحانی، ظاہری و باطنی فیض حاصل کیا اور پھر انہوں نے اسی مذہب کی تبلیغ اور نشر و اشاعت میں زندگی بسر کردی۔ شیعہ مجتہد عبدالکریم مشتاق کی اعانت سے کراچی کے اہل تشیع نے "اثنا عشری شیعہ ڈائجسٹ" کا تعارفی شمارہ شائع کیا۔ اس میں صوبائی دفتر صوبہ سرحد، اسلام آباد و آزاد کشمیر کے لئے ذوالفقار علی صاحب کو اعزازی نمائندہ مقرر کیا گیا اس کے ساتھ

رابطہ کے لئے یہ پتہ درج ہے۔ "سجادہ نشین بری امام نور پور شاہاں۔ اسلام آباد"

{اثنا عشری شیعہ ڈائجسٹ ص ۲۵ نومبر ۱۴۰۲ھ / جولائی ۱۹۸۲ء}

شاہ جیونہ اور بری سرکار کے علاوہ بھی بہت سے دربار اور مزار ایسے پائے جاتے ہیں جو اہل تشیع کے مراکز ہیں شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں کہ

"مغربی پاکستان بالخصوص سندھ اور جنوب مغربی پنجاب میں کئی صوفی خانوادے ایسے ہیں جن کے بزرگ شیعہ خیالات کے ہیں"۔

{رود کوثر صفحہ ۳۳۶}

پاکستان اور آزاد کشمیر میں ایسے مراکز، اداروں اور خانقاہوں کی کوئی کمی نہیں جہاں سے علانیہ شیعی افکار و نظریات کا پرچار ہو رہا ہے مگر جن خانقاہوں اور مزاروں میں تقیہ اور تفضیلیت کے لبادے میں مذہب شیعہ کی ترویج ہو رہی ہے ان کا تو شمار ہی نہیں کیا جا سکتا ۔ سید ریاض حسین نقوی سربراہ تحریک اتحاد اسلامی پاکستان نے واشگاف الفاظ میں دعویٰ کیا ہے کہ بری سرکار اہل تشیع تھے وہ نجیب الطرفین کاظمی تھے اور ان کے اہل و عیال چکوال میں رہائش پذیر تھے جو اہل تشیع ہی تھے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ صوفی یا درویش اپنے آپ کو کسی ایک مسلک میں منحصر نہیں کرتے کیونکہ ان کے عقیدت مندوں میں ہر مسلک اور مشرب کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ صوفیاء کرام کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ محبت اور پیار کے ذریعے لوگوں تک امن اور حق کا پیغام پہنچائیں لہٰذا ایسی روحانی شخصیات کو مسلکوں کی قید میں پابند نہیں کرنا چاہیے"۔ •

{روزنامہ اوصاف ۱۴ اپریل ۱۹۹۸ء}

اہل تشیع کے اپنے اقرار و اعتراف سے بھی یہ ثابت ہو گیا ہے کہ بری سرکار شیعہ تھے ان صوفیاء نے کبھی علانیہ اور کبھی تقیہ کے پردے میں شیعی افکار و نظریات پھیلائے۔ دونوں صورتوں میں انہوں نے "امن" اور "حق" کا دامن نہیں چھوڑا۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی (م ۱۱۶۵ھ) جو سندھی شاعر اور صوفی بزرگ کی حیثیت سے مشہور ہیں ان کی آباد کردہ بستی "بھٹ شاہ" میں حضرت عمر فاروقؓ کا پتلا تک جلایا گیا۔ ان کا دربار بھی سندھ میں مذہب شیعہ کے فروغ کا ایک اہم مرکز ہے۔

حضرت بلھے شاہ

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ایک ہم عصر شاعر بلھے شاہ (۱۰۸۱ھ-۱۱۷۱ھ) نے بھی اپنے رنگ اور انداز میں شیعیت کو تقویت پہنچائی۔ بلھے شاہ حسنی حسینی قادری سید تھے جب کہ ان کے مرشد شاہ عنایت ارائیں خاندان سے تعلق رکھتے تھے اہل خانہ اس رابطہ کو بھی اپنے خاندانی وقار کے خلاف سمجھتے تھے جیسا کہ موصوف خود فرماتے ہیں کہ

بلھے نوں سمجھاون آیاں بھیناں تے بھر جائیاں
آل نبی، اولاد علی دی توں کیوں لیکاں لائیاں

بلھے شاہ کے مرشد شاہ عنایت کا مقام ملاحظہ فرمائیں

"حضرت بلھے شاہ کو ایک دفعہ حب رسول اکرم ﷺ نے اتنا بے تاب کیا کہ ان کا جی چاہا یک دم مدینہ منورہ جا کر روضۂ اقدس سے جا لپٹوں۔ آخر مرشد کامل شاہ عنایت کی خدمت میں اپنا مدعا بیان کیا۔ آپ نے پوچھا کیوں جاتے ہو؟ حضرت بلھے شاہ نے جواب دیا کہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے جس نے میری قبر کی زیارت کی گویا اس نے مجھے زندہ دیکھا۔ مرشد نے فرمایا۔ تین دن کے بعد جواب دیں گے۔ حضرت بلھے شاہ مرشد کی خدمت میں ٹھہر گئے تیسرے روز خواب میں سرور دو عالم ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اپنے مرشد کو لاؤ آپ فوراً بلا لائے۔ حضرت محمد مصطفی ﷺ نے حضرت شاہ عنایت کو اپنے دائیں پہلو میں بٹھا لیا۔ حضرت بلھے شاہ نے نظر اٹھائی تو مرشد کو بھی حضرت رسول اکرم ﷺ کا ہم شکل پایا اور بالکل تمیز نہ کر سکے کہ ان میں سے مرشد کون ہے؟ اور آنحضرت ﷺ کون ہیں؟ اسی حیرت میں آنکھ کھل گئی گھبرائے ہوئے مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ نماز تہجد ادا کر کے مراقبہ میں بیٹھے ہوئے تھے ایک لمحہ کے بعد سر اٹھایا اور فرمایا اب تمہارا مقصد حل ہو گیا۔ حضرت بلھے شاہ نیاز مندانہ مرشد کے قدموں میں گر پڑے۔ حضرت مرشد سے عقیدت کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

بلھا شوہ دی ذات نہ کائی میں شوہ عنایت پایا ہے

یعنی اے بلھا اللہ کی کوئی ذات نہیں ہے اور مجھے اپنے پیر عنایت شاہ میں اللہ کا جلوہ نظر آتا ہے

عنایت دم دم نال چتاریا سانوں آمل یار پیاریا

ہر سانس کے ساتھ ہم نے پیر عنایت کا نام لیا اے محبوب میرے پاس آ جا حضرت بلھے شاہ علم کے متعلق فرماتے ہیں

علم نہ آوے وچ شمار اکو الف تیرے درکار
جاندی عمر نہیں اتبار علموں بس کریں اویار
بہتا علم عزازیل نے پڑھیا جھگا جھا اوسے دا سڑیا
گل وچ طوق لعنت دا پڑیا آخر گیا اوہ بازی ہار

زیادہ علم پڑھنا چھوڑ دو علم کی کوئی حد نہیں تیرے لیے صرف الف ہی کافی ہے عمر بھی جا رہی ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں اس لئے زیادہ علم نہ سیکھ میرے دوست، کثرت علم گمراہی کا موجب ہوسکتا ہے۔ شیطان نے زیادہ علم سیکھا اس کا خانہ خراب ہوا اس کے گلے میں رسوائی کا طوق ڈالا گیا آخر وہ نامراد ہوا۔ اس لئے زیادہ علم نہ سیکھ میرے دوست۔

عمر گنوائی وچ مسیتی اندر بھریا نال پلیتی
کدے نماز توحید نہ نیتی ہن کیہ کرنائیں شور پکار

ساری عمر مسجد میں نماز پڑھ کر گنوادی لیکن دل بدی کی غلاظت سے بھرا ہوا تھا کبھی یکسوئی سے نماز ادا نہ کی اب شور و پکار کا کیا فائدہ ہے؟

بلھے نوں لوگ متیں دیندے بلھیا توں جا بوہ مسیتی
وچ مسیتاں کیہ کجھ ہندا جے دلوں نماز نہ نیتی
باہروں پاک کیتے کیہ ہندا جے اندروں نہ گئی پلیتی
بن مرشد کامل بلھیا تیری اینویں گئی عبادت کیتی

یعنی بلھے کو لوگ نصیحت کرتے ہیں کہ اے بلھیا تو مسجد میں ڈیرا لگا دے لیکن مسجد میں بیٹھنے سے کیا حاصل ہوگا۔ اگر خلوص سے نماز ادا نہ کی گئی تو بیرونی جسم پاک کرنے سے کیا ملے گا اگر دل سے گندگی دور نہ کی جائے۔

ریاض حسین نقوی نے صوفیاء کی جس دعوت حق اور امن اور محبت کا حوالہ دیا ہے اس کی جھلک بلھے شاہ کے کلام میں ملاحظہ فرمائیں۔

بلھیا چیری مسلمان دی ہندو توں قربان
دوہاں توں پانی وار پی جو کرے بھگوان

یعنی بلھیا مسلمان دی پگڑی ہندو پر قربان ہے دونوں کے سر پر پانی وار کر پی پھر دیکھ اللہ کیا کرتا ہے عشق الٰہی مذہبی حدود سے بالاتر ہے۔

مینوں عشق ہلا رے دیندا — منہ چڑھیا یار بلیندا
کتے شیعہ اے کتے سنی اے — کتے جٹا دھاری کتے منی اے
میری سب سے فارغ کنی اے — جو کہاں سو پا منیندا

یعنی میں عشق کے جھولے میں جھول رہا ہوں میری زبان پر جو نام جاری ہے وہ مجھے بلا رہا ہے کہیں شیعہ ہے کہیں سنی ہے کہیں لمبے بالوں والا سادھو ہے کہیں کس کا سر منڈا ہوا ہے لیکن میری ہنڈیاں ان سے الگ ہے جو اللہ سے طلب کرتا ہوں وہ مجھے دے دیتا ہے۔

{بحوالہ بلھے شاہ مؤلفہ محمد شریف گلزار}

ریاض حسین نقوی کا یہ کہنا بجا ثابت ہوا کہ صوفی یا درویش اپنے آپ کو کسی ایک مسلک میں منحصر نہیں کرتے یعنی اگر وہ پکا شیعہ نہیں بن سکتا تو کم از کم سنی بھی نہ رہے جس طرح بلھے شاہ نے اہل سنت سے برأت کا اعلان کیا ہے جب کہ کوئی اصلی صوفی، بزرگ یا پیر نبی کریم ﷺ کی سنت اور جماعت (یعنی صحابہ کرامؓ) سے برات کا اعلان نہیں کر سکتا۔

تحریک پاکستان اور شیعہ

شیعہ مؤلف ابومصعب جوادی رقم طراز ہیں:

"برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی آمد و اشاعت مسلمانوں کی بیداری اور تحریک پاکستان کا لمحہ لمحہ گواہ ہے کہ شیعان حیدر کرار ہی تھے کہ جنہوں نے برصغیر پاک و ہند میں ایک عظیم نظریاتی اسلامی مملکت کے قیام کو ممکن بنایا۔ سر محمد علی خان مہاراجہ صاحب آف محمود آباد، راجہ امیر محمد خان، راجہ صاحب آف محمود آباد، راجہ صاحب آف سلیم پور، نواب سر فتح علی خان قزلباش، جسٹس سید امیر علی، سید محمد مہدی، خان بہادر سید آل نبی ﷺ، راجہ غضنفر علی خان، سید محمد محسن آف ڈھاکہ، نواب محمد اسماعیل خان پسر سید علی امام، سید رضا علی، ابوالحسن اصفہانی آف ڈھاکہ، سمیت لاکھوں شیعہ علماء، رہنما اور کارکنان نے مسلم لیگ اور تحریک پاکستان میں اپنی زندگیاں وقف کر

دیں اور مسلمانان برصغیر کے دیرینہ خواب کو عملی تعبیر بخشی"۔ (تحقیق دستاویز صفحہ ۱۴)

موصوف نے حقائق کو نظر انداز کر کے یہ بیان داغا ہے کہ "شیعان حیدر کرار نے برصغیر میں ایک عظیم نظریاتی اسلامی مملکت کے قیام کو ممکن بنایا" اگر موصوف اپنی تعداد پر غور کر لیتے تو انہیں اپنے بیان کا خلاف حقیقت ہونا خود ہی معلوم ہو جاتا لیکن ان کا "تلاش حق" سے کیا سروکار ہے؟

پاکستان کی بنیاد تو اس دن رکھی گئی جب شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا تھا پھر بعد میں ان کے متبعین نے مال و جان کے نذرانے پیش کر کے برطانوی حکومت کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ مزید برصغیر پر اپنا اقتدار قائم نہیں رکھ سکتی اس کے قیام کو یقین میں بدل دیا بھلا تحریک پاکستان میں ان لوگوں کا کیا کردار ہو سکتا ہے۔ جنہوں نے برصغیر میں برطانوی سامراج کو استحکام بخشا۔ ان کے لئے جاسوسی کے فرائض سرانجام دیئے اور اس کے صلے میں ان سے بے پناہ مراعات حاصل کیں اور اب تک کر رہے ہیں نوابان اودھ و بنگال، میر جعفر و صادق، میران سندھ و تالپور، نوابان قزلباش اور راجوں مہاراجوں کا کردار کس سے مخفی ہے۔

کس کس سے چھپاؤ گے تحریک ریاکاری محفوظ ہیں تحریریں مرقوم ہیں تقریریں
اک پردہ وفاداری صد سازش غداری تعمیر کی آوازیں تخریب کی تدبیریں

اس طبقے کو جب یہ یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کی عظیم قربانیاں رنگ لائیں گی اور برصغیر تقسیم ہو کر رہے گا تو وہ اپنے مخصوص مفادات کے حصول کے لئے قادیانیوں کی طرح انگریز سے ساز باز کر کے مسلمانوں کی صفوں میں گھس گیا۔

لہٰذا اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ یہ مسلمانان اہلسنت والجماعت ہی تھے جن کی بے لوث، انتھک، مخلصانہ جدوجہد اور لازوال قربانیوں کے نتیجے میں برصغیر پاک و ہند میں ایک عظیم نظریاتی مملکت معرض وجود میں آئی جو بدقسمتی سے اسی اسلام دشمن طبقے کے ہاتھوں "ہائی جیک" ہو گئی۔

کیا محمد علی جناح شیعہ تھے؟

اہل تشیع اور اہل سنت دونوں انہیں اپنا ہم مذہب قرار دیتے ہیں اور دونوں طبقے اپنے موقف کے حق میں دلائل رکھتے ہیں۔ اہل سنت کے پاس دیگر قرائن کے علاوہ ایک ہی وزنی

دلیل ہے کہ آں محترم کی نماز جنازہ مولانا شبیر احمد عثمانی کی امامت میں ادا کی گئی تھی اور موصوف کی دو بہنوں رحمت بی اور مریم بی کی شادیاں سنی خوجہ لڑکوں کے ساتھ ہوئیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ "خوجوں" میں تین گروہ پائے جاتے ہیں

۱۔ اسماعیلی خوجے ۲۔ اثنا عشری خوجے ۳۔ سنی خوجے

یہ باہم قرابت دار تھے اور ان کے مابین سلسلہ مناکحت بھی جاری رہا اس کی تفصیل پیچھے زیر عنوان "خوجے" گزر چکی ہے

ان دونوں دلیلوں میں بظاہر کوئی وزن نظر نہیں آتا کیونکہ سنی اور شیعہ خاندانوں میں اس وقت باہم شادیوں کا رواج تھا بلکہ آج بھی بعض گھرانوں میں یہ سلسلہ جاری ہے اور جہاں تک نماز جنازہ کی امامت کا تعلق ہے تو اس میں بھی تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ جب نکاح اور شادی جائز ہے تو نماز جنازہ بھی جائز ہے پھر اس وقت اتنا "تعصب" بھی نہیں تھا۔ مولانا عبیداللہ انور مرحوم نے مشہور شیعہ وکیل مولانا اظہر علی کی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔

ذیل میں محمد علی جناح صاحب کے ذاتی اور خاندانی حالات پر مشتمل ایک خاکہ پیش کیا جاتا ہے جس سے ان کے مذہبی نظریات کا بھی کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قائد اعظم محمد علی جناح کے آباؤ اجداد ساہیوال پنجاب کے تجارت پیشہ لوہانہ راجپوت تھے جو حضرت عبدالقادر جیلانی کے خاندان کے ایک بزرگ پیر عبدالخالق کے ہاتھ پر بیعت کر کے مشرف بہ اسلام ہوئے ان کے ایک جد گجرات کاٹھیاواڑ میں جا کر آباد ہو گئے اور وہاں ایک اسماعیلی خوجہ کی بیٹی سے شادی کر کے اس کے خاندان سے مل گئے جو ہز ہائی نس آغا خان کو اپنا پیر و مرشد سمجھتا تھا۔

قائد اعظم کے دادا پونجا بھائی اپنا کاروبار بڑھانے کی غرض سے ۱۸۶۱ء کے لگ بھگ اپنی بیوی، بیٹی مان بی اور تین بیٹوں والجی، ناتھو اور جینا کو ساتھ لے کر کراچی پہنچ گئے۔ یہاں پر انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کے نام پر ایک تجارتی ادارہ "والجی پونجا بھائی اینڈ کمپنی" قائم کر لیا اور مچھلی، گوند، چمڑے وغیرہ کا کاروبار کرنے لگے پونجا بھائی کے کاروبار کو ترقی دینے میں ان کے چھوٹے بیٹے "جینا پونجا" نے اہم کردار ادا کیا۔

قائد اعظم کے والد جینا بھائی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۷۴ء میں ان کی شادی

آغا خان اول کے وزیر موسیٰ جمعہ کی لڑکی "شیریں بائی" عرف "مٹھی بائی" سے ہوئی شادی کے بعد انہوں نے اپنے نام میں تبدیلی پیدا کی یعنی "جینا" (گجراتی زبان میں بمعنی دبلا پتلا) کے بجائے "جناح" (عربی میں بمعنی بازو) اور "پونجا" کی جگہ "پونجاہ" لکھنے لگے۔

جناح پونجا کے چار بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں

۱۔ محمد علی ۱۸۷۶ء	۲۔ رحمت بی ۱۸۷۸ء	۳۔ بندہ علی ۱۸۸۰ء
۴۔ مریم بی ۱۸۸۲ء	۵۔ احمد علی ۱۸۸۶ء	۶۔ شیرین بی ۱۸۸۸ء
۷۔ فاطمہ بی ۱۸۹۱ء	۸۔ بچو ۱۸۹۳ء	

جس کا انتقال عقیقے سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔

قائداعظم کی شادی ۱۸۹۲ء میں بعمر سولہ برس کا ٹھیاواڑ میں اپنے ایک قریبی رشتہ دار "کھیم جی" کی بیٹی ایمی بائی سے ہوئی۔ اسکے بعد وہ مزید تعلیم کے حصول کے لیئے انگلستان چلے گئے۔ وہاں سے قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ۱۸۹۲ء میں واپس آئے اور اگلے سال بمبئی جا کر وکالت شروع کر دی اور جلد ہی برصغیر کے چوٹی کے قانون دانوں میں شمار ہونے لگے۔

ان کی سیاسی زندگی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۰۶ء میں ہوا جب وہ انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں اس کے صدر مشہور پارسی لیڈر دادا بھائی ناروجی کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ محمد علی جناح شروع ہی سے ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ ۱۹۱۰ء میں ہندو مسلم اتحاد کے لیئے جو کانفرنس الہ آباد میں منعقد ہوئی اس میں وہ شریک ہوئے اور ہندو مسلم اتحاد کی خاطر انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیئے کوشاں رہے۔ ۱۹۱۳ء میں وہ مولانا محمد علی اور سید وزیر حسن مشہور شیعہ لیڈر کی دعوت پر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اس طرح وہ انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ دونوں کے سرگرم رکن ہونے کی حیثیت سے باہمی اتحاد کے لیئے موثر کوشش کرنے کے قابل ہو گئے۔

پہلی جنگ عظیم کے حالات کے پیش نظر وزیر ہند مانٹیگو نے ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو برطانوی حکومت کی طرف سے ہندوستان کو تدریجاً خودمختاری دینے کا اعلان کیا جس کا ملک بھر میں خیر مقدم کیا گیا۔ اس مقصد کے لیئے مانٹیگو نے مختلف وفود اور سیاسی رہنماؤں سے ملاقات کی۔ اس نے محمد علی جناح کی ذہانت اور سیاسی فراست سے متاثر ہو کر اپنی ڈائری میں لکھا کہ یہ

تنی زیادتی کی بات ہے کہ ایسے شخص کو ہندوستان کے نظم و نسق میں شامل نہیں کیا گیا۔

جناح صاحب ۱۹۲۰ء میں کانگریس سے الگ ہو کر آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ اس حسن انتخاب پر کسی نے کیا خوب کہا۔

آغا امام اور محمد علی ہے باب — اس دین میں ہے ترک سوادِ حرم مباح
بشریٰ لکم کہ منتظرِ ما رسیدہ است — یعنی ز حجاب غیرت کبریٰ دریدہ است

یہاں آغا سے مراد سر آغا خان اور محمد علی سے مراد قائد اعظم ہیں اور اشارہ ۱۹۳۱ء میں محمد علی جناح کی لندن سے واپسی اور مسلم لیگ کی قیادت سنبھالنے کے اعلان کی طرف ہے۔ تلمیح قابل توجہ اور طنز کی بلاغت قابل داد ہے"۔ (بحوالہ نقیب ختم نبوت ملتان صفحہ ۲۸ ستمبر ۱۹۹۳ء)

اسی دور میں جنگ عظیم کے دوران برطانوی حکومت کے خلافت عثمانیہ کے ساتھ ناروا سلوک کی وجہ سے برصغیر میں شدید ردعمل ہوا جو پہلے "تحریک ہجرت" (۱۹۲۰ء) پھر "تحریک خلافت" کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جناح صاحب سیاست میں کسی طرح کے تشدد کے قائل نہ تھے۔ ان کے نزدیک ہندوستان کے تمام سیاسی اور خصوصاً اقلیتی مسائل کا حل ہندو مسلم اتحاد میں مضمر تھا۔

جب تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون کا زور ٹوٹا تو محمد علی جناح نے ہندو مسلم اتحاد کے لیئے اپنی مساعی کا از سر نو آغاز کر دیا۔ ۱۹۲۹ء میں وہ ہندوستان کے مجموعی حالات اور کانگریس کے رویے سے انتہائی برگشتہ خاطر ہو گئے۔ اسی سال ان کی رفیقہ حیات بھی فوت ہو گئی۔ ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس کے بعد انھوں نے اپنی ہمشیرہ فاطمہ جناح اور بیٹی "دینا جناح" کے ساتھ انگلستان میں ہی رہائش اختیار کر لی۔ لندن میں ان کا مستقل قیام ۱۹۳۵ء تک رہا۔ ۱۵ فروری ۱۹۳۳ء کو مسلم کانفرنس کے ایک اجلاس میں سر آغا خان نے تجویز پیش کی کہ قائد اعظم کو مسلم لیگ کا صدر منتخب کر لیا جائے۔ چنانچہ ۴ مارچ کو مسلم لیگ نے اپنا داخلی انتشار ختم کر کے قائد اعظم کی عدم موجودگی ہی میں انہیں صدر منتخب کر لیا۔ یہ ملحوظ رہے سر آغا خان سوم اسماعیلی شیعہ فرقہ کے ۴۸ ویں امام ہیں۔ یہ مسلم لیگ کے بانیوں میں سے ہیں جو ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۶ء تک اس کے مستقل صدر رہے اور انھوں نے مسلم لیگ کے تمام اخراجات کی کفالت بھی کی۔ مشہور شیعہ لیڈر مہاراجہ سر محمد علی بھی مسلم لیگ کے صدر رہے۔ یہ مسلم لیگ کی واحد شخصیت ہیں جنھیں تین

مرتبہ مسلم لیگ کا صدر منتخب ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

انہوں نے پہلی عالمی جنگ میں انگریزوں کی مدد کی۔ ان کے مفصل حالات پیچھے فرقہ اسماعیلیہ کے تحت گذر چکے ہیں۔ سر آغا خان ہی کی تجویز پر قائد اعظم کو مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۔

آغا خان قائد اعظم کی فراست اور قانون دانی کے ہمیشہ معترف رہے اور انکے ساتھ خاندانی وذاتی روابط قائم رکھے۔ اس کے علاوہ قائد اعظم آغا خان کے ہمیشہ قانونی مشیر رہے۔ موصوف قائد اعظم کے متعلق اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ! "میں اپنی زندگی میں چرچل، لائیڈ جارج، مسولینی اور گاندھی ایسے بڑے بڑے سیاسی قائدین سے ملا ہوں لیکن میں نے جناح کو ان سب سے زیادہ اہم پایا۔" (اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۹ صفحہ ۳۸۸)

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اس موقع پر کانگریس نے جنگ کے بعد ہندوستان کی مکمل آزادی کا اعلان کر دیا۔ مسلمانوں کی اکثریت نے محسوس کیا کہ اس طرح مسلمان انگریز کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کر کے ہندو کی غلامی میں چلے جائیں گے۔ اس وقت قائد اعظم (جو ہندو مسلم اتحاد کے زبردست اور پرجوش حامی تھے) نے الگ مملکت کے حصول کے لیے کوششیں شروع کر دیں اور کلکتہ کے مسلم اخبار "عصر جدید" نے انہیں "زعیم الملة" کا خطاب دیا۔ بیورلی نکلز نے انہیں "ایشیا کی سب سے زیادہ قابل توجہ شخصیت" قرار دیتے ہوئے لکھا تھا کہ! "برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں قائد اعظم سے زیادہ کسی رہنما کو عوام نے اپنی عقیدت اور اطاعت کا مرجع نہیں بنایا حالانکہ بظاہر ان میں عوامی لیڈروں والی کوئی بات نہ تھی، وہ کبھی قید نہیں ہوئے، انہوں نے زہد و تقویٰ کا دعویٰ نہیں کیا، عوامی بہروپ نہیں بھرا، اسلام نمائی کو اپنا شعار نہیں بنایا، تملق اور ظاہری انکسار سے کام نہیں لیا تاہم یہ ان کے کردار کی بلندی اور پاکیزگی تھی کہ مسلم عوام محض ان کے ایک ارشاد پر سب کچھ قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے اور وہ بھی ایسے حالات میں کہ سیاست کے تمام کہنہ مشق کھلاڑی ان کے مخالف تھے اور ان کے ہم رکاب آرام طلب اور گمنام قسم کے افراد تھے۔" (اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۹ صفحہ ۳۸۸)

۱۹۳۸ء میں ایک تبلیغی وفد نے جس میں متعدد حضرات شامل تھے قائد اعظم سے ملاقات کی۔ ان حضرات نے دوران گفتگو قائد اعظم سے کہا کہ آپ مسلم لیگ کے جلسوں کے لئے اس قدر وسیع وعریض پنڈال کھڑے کرتے ہیں، لاکھوں کی تعداد میں لوگ جمع کرتے ہیں

اس سے آپ کا مقصد کیا ہوتا ہے؟

قائد اعظم نے فرمایا "علاوہ دیگر امور کے اس سے غیر مسلموں کے دل پر ملت اسلامیہ کے اتحاد اور وحدت اجتماعیہ کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے" اس پر علماء حضرات نے قائد اعظم سے کہا کہ اس کے لیے ہم آپ کو اس سے زیادہ مؤثر طریق بتاتے ہیں کہ آپ نماز کے وقت اس پنڈال میں باجماعت نماز ادا کرنے کا اہتمام کیا کریں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ "نماز کی اہمیت سے مجھے انکار نہیں لیکن آپ کی تجویز میں مجھے ایک خطرہ نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ نماز باجماعت میں ایک امام کا ہونا ضروری ہے اگر میں خود امامت کے لیے کھڑا ہو جاؤں تو شاید تمام حاضرین میرے پیچھے نماز پڑھ لیں لیکن میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ اس کے بعد سوال یہ پیدا ہو گا کہ امام کسے بنایا جائے؟ اگر امام دیوبندی ہو گا تو بریلوی حضرات اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کر دیں گے اور یہی صورت دوسرے امام کے پیچھے پڑھنے میں پیدا ہو گی۔ لہٰذا اس صورت حال میں یہ ہو گا کہ ایک پنڈال میں مختلف جماعتیں کھڑی ہو جائیں گی اس سے غیر مسلموں کے سامنے امت مسلمہ کے اختلاف نمایاں ہو جائیں گے اور وہ کہیں گے کہ جو قوم ایک امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتی وہ ایک متفق علیہ اسلامی ریاست کیسے قائم کرے گی؟ اس وقت تو آپ مجھے معاف فرمائیں آئندہ دیکھا جائے گا۔"

(بحوالہ مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی صفحہ ۷۷)

اس مختصر خاکے سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ موصوف نے کس خاندان میں آنکھ کھولی، کہاں تعلیم و تربیت پائی، عملی زندگی میں کن لوگوں کے ساتھ ان کی مجالست و مشاربت رہی اور کن لوگوں کی دلچسپی، رہنمائی اور سرپرستی میں سیاسی منزل حاصل کی؟

قائد اعظم کے خاندانی حالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس خاندان میں اسماعیلی اور اثنا عشری دونوں رجحانات پائے جاتے ہیں۔ خود ان کے والدین اسماعیلی شیعہ تھے۔ موصوف کی ایک بہن "شیریں بائی" کی شادی ایک اسماعیلی شیعہ کے ساتھ ہوئی تھی۔ قائد اعظم خود ایک شیعہ کھوجہ تھے۔ انہوں نے ۱۸۹۴ء میں اسماعیلی عقیدہ چھوڑ کر شیعہ مسلک اختیار کیا تھا۔ انہوں نے "رتی بائی" کے ساتھ نکاح بھی شیعہ روایات کے مطابق کیا اور نکاح خواں بھی شیعہ تھا۔ ان کی وفات کے بعد سید انیس الحسنین نے فاطمہ جناح کی ہدایت پر انہیں غسل بھی شیعہ روایات کے مطابق دیا تھا۔

شیخ محمد اکرام صاحب اس وقت کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آنریبل سید امیر علی کی زندگی بڑی کامیاب زندگی تھی۔ انہوں نے ذاتی قابلیت کے سہارے وہ بلند مدارج حاصل کیے جن پر ابھی تک کوئی ہندوستانی نہ پہنچا تھا۔ ایک امریکن لکھتا ہے کہ! "اس شخص کی زندگی اور سیرت دیکھ کر ایک منصف مزاج انسان ان باتوں پر شک کرنے لگتا ہے جو عام مسلمانوں کے متعلق یورپ اور امریکہ میں پھیلائی جاتی ہیں اور اس مذہب کو بہ نظر احترام دیکھنے لگتا ہے جس کا ایک فرد اس قدر پاکیزہ سیرت اور روحانی و اخلاقی خوبیوں کا مجموعہ ہو۔"

سید صاحب شیعہ تھے لیکن جس طرح ہندوستان کے سنی مسلمانوں نے اپنی تمدنی اور سیاسی زندگی میں شیعہ سنی کا کوئی خیال نہیں رکھا اور اپنی زندگی کے کئی اہم مرحلوں پر اپنی قسمت کی باگ آغا خان، مسٹر محمد علی جناح، مہاراجہ صاحب محمود آباد اور دوسرے شیعہ حضرات کو سونپ دی۔ اسی طرح شیعہ طبقہ کی بہترین اور قابل فخر ہستیوں نے اپنی زندگی اور اپنے سیاسی و تمدنی مشاغل میں فرقہ وارانہ اختلافات کو کوئی جگہ نہیں دی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے عام قومی مسائل میں تو شیعہ سنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" (موج کوثر صفحہ ۱۷۱)

شیخ محمد اکرام صاحب کی اس شہادت سے قائداعظم کا شیعہ ہونا ثابت ہو گیا اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس وقت سنی شیعہ اختلاط کی وجہ سے قومی مسائل میں ان کے مابین مسلکی و مذہبی امتیاز کرنا مشکل تھا۔ یہ مشکل اہل تشیع کے لیے نہیں تھی کیونکہ وہ اپنے اکابر اور بزرگوں کو بخوبی جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پچاس سال بعد خمینی کا پیروکار شیعہ بھی قائداعظم کے مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے پاکستانی شیعوں کے شانہ بشانہ کام کر رہا ہے۔ ملاحظہ ہو ماہنامہ وحدت اسلامی صفحہ ۳ خانہ فرہنگ ایران اسلام آباد۔

مملکت ایران کے سفیر آقائے علی اصغر حکمت نے قائداعظم کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا! "ایسے عظیم الشان انسان آسمان کے ان ستاروں کی طرح ہیں جن کی روشنی ہم تک بعید از قیاس فاصلے طے کر کے پہنچتی ہے اور اگر چہ وہ انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن ان کے نور سے ہمیشہ کسب فیض کیا جا سکتا ہے۔ قائداعظم کی شخصیت آئندہ نسلوں کے لیے مینارۂ نور کا کام دے گی۔" (مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی صفحہ ۳۲)

مولانا حکیم انیس احمد صاحب صدیقی لکھتے ہیں کہ! "شیعہ حضرات میں ایسے حضرات

بھی ہیں جو اہلسنت والجماعت اور شیعوں کو دو آنکھوں کی طرح سمجھتے ہیں جیسا کہ حضرت قائد اعظم محمد علی جناح، حضرت مجاہد ملت غازی دین متین علامہ آیت اللہ خمینی دامت برکاتہم سربراہ حکومت ایران اور جسٹس سید امیر علی مرحوم جنھوں نے انگریزی میں تاریخ اسلام لکھی ہے"۔

(اسلام اور فرقہ بندی صفحہ ۸ مطبوعہ صدیقی ٹرسٹ کراچی)

موصوف کا یہ مضمون ان ہی الفاظ کے ساتھ ہفت روزہ خدام الدین لاہور (۲۱ نومبر ۱۹۸۰ء) میں بھی شائع ہوا۔

شیعہ مصنف علامہ اثیر جاڑوی لکھتے ہیں کہ! "اگر اہالیان پاکستان مملکت خداداد میں بسنے والے شیعہ کے متعلق بھی یہ بتادیں کہ کسی بھی عالم دین نے تحریک پاکستان سے لے کر آج تک کسی جگہ اور کسی قدم پر مملکت پاکستان کی مخالفت کی ہو بلکہ دیوبندی مکتب فکر کی زبان درازی اور جسارت آشنا قلم کی وجہ یہی ہے کہ جب سے شیعہ فکر و دولت نے پاکستان کو وجود دیا ہے اس وقت سے ہر قدم پر شیعہ تلخی کا جواب نرمی سے دیتے ہیں۔ ورنہ شیعہ کے قلم سے زیادہ کوئی قلم اور شیعہ کے بیان سے زیادہ کسی میں قوت بیان نہیں۔ ہم آج بھی مسلمانان مملکت خداداد کی خدمت میں دردمندانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ خود بھوک ننگے مولویوں کے منہ میں لگام، ناک میں نکیل اور گلے میں پٹے ڈالیں جن کی زبانیں کترنی کی طرح شیعہ معتقدات اور تاریخی مسلمات کو کاٹتی رہتی ہیں۔

بڑی غلط فہمی ہوگی اگر ہمارے صبر کو بزدلی سمجھ لیا گیا اور ہماری حب الوطنی کو قلت مواد پر محمول کیا گیا۔ یہ گستاخ قلم جو آل محمد ﷺ سے بڑھ کر اب خود سرور کونین کی عبائے عظمت میں شگاف ڈالنے لگے ہیں اگر رد کے نہ گئے تو پھر مجبور ہو کر۔ بدر و حنین کے بھگوڑوں، خیبر و خندق کے شکست خوردہ ذہنوں، فتح مکہ کے نو مسلم فتنہ پردازوں، جنازہ رسول ﷺ کو چھوڑ کر سقیفہ بنی ساعدہ میں پناہ لینے والے اختلاف پروروں، سرور کونین کے مرض الموت میں گستاخ زبانوں، عم رسول کا جگر چبانے والی ماں کے بیٹوں اور پوتوں کے ایجنٹوں تخت و تاج کے مالک مسلمان نما مشرکوں، دروازہ بنت رسول ﷺ کو نذر آتش کرنے والے سرپھروں، ترتیب قرآن کو بدل کر ترتیب نزولی قرآن کے مطابق جمع کردہ قرآن کو جلا دینے والے سنگدلوں، پہلوئے زہرا پر تازیانے لگانے والے بدمعاشوں، قرآن کریم کو نیزوں پر اٹھا کر اسلام کا مذاق اڑانے والے بزدلوں اور

حادثہ کربلا کے بانیوں کا پوسٹ مارٹم کریں گے" ([illegible])

اس اقتباس کے پڑھنے کے بعد اس بات میں ذرہ بھر شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں کہ "شیعہ کے قلم سے زیادہ گستاخ کوئی قلم اور شیعہ کی زبان سے زیادہ غلیظ کوئی زبان نہیں۔" اس جارحانہ انداز اور انتہائی دل آزار کلمات کے اظہار کے باوجود مؤلف موصوف اہلسنت کا محض اس لیے لحاظ کر رہے ہیں کہ "شیعہ فکر و دولت نے پاکستان کو جو عطا کیا ہے" علامہ اثیر جاڑوی نے "دیوبندی مکتب فکر" کو پاکستان کا مخالف قرار دیا ہے حالانکہ اسی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب، ان کے دیگر رفقاء و احباب اور لاکھوں مریدین و معتقدین نے نہ صرف پاکستان کا بھرپور ساتھ دیا بلکہ پورے برصغیر میں اپنے طوفانی دوروں سے مسلم رائے عامہ کو بیدار بھی کیا جس کے نتیجے میں ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کو کامیابی حاصل ہوئی۔ بریلوی اور سلفی مکاتب فکر کی تائید و حمایت اس کے علاوہ ہے اگر علماء دیوبند اور دیگر مذہبی قوتیں تحریک پاکستان میں اپنا کردار ادا نہ کرتیں تو اس کا خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا۔

ورنہ موصوف ہی کی زبان و انداز میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بشیعہ کی ساری تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس نے ہمیشہ اسلام کے مقابلے میں کفر اور مسلمانوں کے مقابلے میں مجوس و نصاریٰ اور یہود و ہنود کا ساتھ دیا اس طبقہ کا دامن تو ابن بیوں، سبائیوں، واقدیوں، کلبیوں، ابن علقمیوں، طوسیوں، دیلمیوں، صفویوں، مجلسیوں، میر جعفروں، میر صادقوں، خمینیوں، نقویوں اور نجفیوں سے بھرا ہوا ہے اور شیعیت کی صورت میں "یہودیت، سبائیت، مجوسیت، نصرانیت اور فرنگیت کے دودھ سے پلا ہوا یہ وہی طویل العمر زہرناک، خوفناک اور خونی اژدھا ہے جس نے ہر دور میں اہلسنت کی بے شمار نسلوں کو موت کی نیند سلایا۔

علامہ اثیر جاڑوی کے خرافات، الزامات اتہامات اور ہذیانات کے جواب کا یہ موقع نہیں اسے کسی دوسرے موقع کے لئے اٹھا رکھا جاتا ہے۔ یہاں یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ قائد اعظم شیعہ ہیں یا سنی۔

قائد اعظم کی رحلت (۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء) کے چند دن بعد ۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ان کی ہمشیرہ فاطمہ جناح اور وزیر اعظم لیاقت علی خان نے کراچی ہائی کورٹ میں ایک مشترکہ درخواست دائر کی

جس میں یہ استدعا کی گئی کہ جناح شیعہ کھوجہ مسلمان تھے لہٰذا ان کی وصیت و وراثت پر شیعہ وراثتی قانون کے مطابق عمل کیا جائے۔ اس کے ساتھ انہوں نے اپنا "بیان حلفی" بھی داخل کیا۔

۱۹۶۸ میں فاطمہ جناح کا انتقال ہوا تو ان کی بہن شیریں بائی نے ہائی کورٹ میں درخواست دائر کی کہ فاطمہ جناح کی جائیداد کا فیصلہ شیعہ وراثتی قانون کے تحت کیا جائے۔ کچھ عرصہ بعد حسین علی گانجی والجی نے سندھ ہائی کورٹ میں شیریں بائی کی درخواست کو چیلنج کرتے ہوئے کہا کہ فاطمہ جناح شیعہ نہیں بلکہ سنی تھیں اور درخواست میں کہا گیا کہ فاطمہ جناح کے ساتھ ساتھ محمد علی جناح بھی سنی تھے۔

جناب حامد میر صاحب لکھتے ہیں کہ درخواست دہندہ کے دعوے کو آسانی سے مسترد کرنا آسان نہ تھا کیونکہ وہ رشتے میں محمد علی جناح کے چچا لگتے تھے۔ "موصوف کا یہ دعویٰ محل نظر ہے کہ حسین علی گانجی والجی" قائداعظم کے چچا تھے۔ قائداعظم کے والد جینا پونجا اپنے باپ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے ان کے دادا "پونجا بھائی" ۱۸۶۱ء میں اپنی بیوی، بیٹی اور تین بیٹوں "والجی، ناتھی، جینا" کے ہمراہ کراچی آئے تھے اور انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کے نام پر ایک تجارتی ادارہ "والجی پونجا بھائی اینڈ کمپنی" قائم کیا تھا۔ لہٰذا ۱۹۷۰ء میں شیریں بائی کی درخواست کو ہائی کورٹ میں چیلنج کرنے والے حسین علی گانجی والجی ان کے چچا نہیں ہو سکتے۔ تاریخی اعتبار سے حامد میر صاحب کا یہ بیان صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

بہرحال مقدمے کی سماعت کے دوران شریف الدین پیرزادہ نے عدالت کو بتایا کہ جناح نے ۱۹۰۱ء میں اسماعیلی عقیدہ چھوڑ دیا تھا کیونکہ ان کی دو بہنوں رحمت بائی اور مریم بائی کی شادی سنی خاندانوں میں ہوئی تاہم جناح نے کبھی خود کو شیعہ یا سنی نہیں کہا تھا۔ شیریں بائی (قائداعظم کی چھوٹی بہن) نے اسماعیلی عقیدہ برقرار رکھا کیونکہ ان کے خاوند بھی اسماعیلی تھے۔ فاطمہ جناح کی وفات کے بعد شیریں بائی نے بمبئی چھوڑا اور پاکستان آ کر شیعہ بن گئیں۔

عدالت میں آئی ایچ اصفہانی نے کہا کہ وہ ۱۹۳۶ء میں جناح کے پرائیوٹ سکریٹری تھے اور جناح نے انہیں خود بتایا تھا کہ ہمارے خاندان نے ۱۸۹۴ء میں اسماعیلی عقیدہ چھوڑ کر شیعہ مسلک اختیار کر لیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ جناح نے "رتی بائی" کے ساتھ نکاح بھی شیعہ روایات کے مطابق کیا اور نکاح خواں بھی شیعہ تھا۔

ایک اور شیعہ گواہ سید انیس الحسنین نے عدالت کو بتایا کہ میں نے فاطمہ جناح کی ہدایت پر محمد علی جناح کو شیعہ روایات کے مطابق غسل دیا لیکن وہ اس حقیقت سے انکار نہ کر سکے کہ بانی پاکستان کی نماز جنازہ ایک دیوبندی عالم دین مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھائی تھی۔

حسین علی گانجی والجی کے گواہ شریف الدین پیرزادہ کا مؤقف تھا کہ وہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۴ء تک جناح کے سیکرٹری تھے۔ انہوں نے عدالت میں ایسی دستاویزات پیش کیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ جناح فرقہ واریت پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

۲۳ فروری ۱۹۷۰ء کو سندھ ہائی کورٹ کے جسٹس عبدالقدیر شیخ نے فاطمہ جناح اور لیاقت علی خان کا وہ حلف نامہ مسترد کر دیا جس میں محمد علی جناح کو شیعہ کہا گیا تھا۔ عدالت نے فاطمہ جناح کی جائیداد پر شیریں بائی کے حق کو قائم رکھا لیکن یہ بھی کہا کہ جناح نہ شیعہ تھے نہ سنی تھے وہ ایک سادہ سے مسلمان تھے۔

اس عدالتی فیصلے پر تبصرہ کرتے ہوئے حامد میر صاحب لکھتے ہیں کہ! "عدالتی فیصلہ محمد علی جناح کو اسی مقام پر لے آیا جو ان کے نظریات کے عین مطابق تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ محمد علی جناح اپنے پیارے نبی حضرت محمد کے ایک ادنیٰ سے پیروکار تھے اور صرف مسلمان تھے کیونکہ اللہ کے آخری نبی بھی شیعہ تھے نہ سنی بلکہ صرف ایک مسلمان تھے"۔ (روزنامہ اوصاف۔ ۲۶ اپریل ۱۹۹۸ء)

کتاب کی نظر ثانی کے موقع پر حامد میر صاحب کا ایک کالم بہ عنوان "قائداعظم کو بچاؤ" نظر سے گذرا جس میں انہوں نے قائداعظم کو شیعہ تسلیم کر لیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

"قائداعظم نہ سیکولر تھے نہ مذہبی انتہا پسند تھے وہ ایک لبرل مسلمان تھے جو فرقہ واریت سے کوسوں دور تھے۔ جس کا تعلق ایک شیعہ خاندان سے تھا لیکن ان کا نکاح ایک بریلوی عالم دین مولانا نذیر احمد صدیقی (شاہ احمد نورانی کے چچا) نے پڑھایا۔ ان ہی کے پیچھے وہ بمبئی میں نماز جمعہ بھی پڑھتے تھے اور ان کی نماز جنازہ ایک دیوبندی عالم دین مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھائی فرقے کے معاملے میں قائداعظم لبرل تھے لیکن دین کے معاملے میں بہت پختہ تھے"۔

(روزنامہ اوصاف ۱۳ اگست ۲۰۰۱ء)

راقم الحروف کا مقصد جناب قائداعظم کو سنی یا شیعہ ثابت کرنا ہرگز نہیں ہے۔ چونکہ اہل تشیع کا دعویٰ تھا کہ وہ شیعہ تھے اس لیئے چند دلائل پیش کر دیئے گئے ہیں جن کی رو

سے قارئین کرام کوئی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔

عدالت نے مقدمہ دائر ہونے کے بائیس سال بعد جبکہ فاطمہ جناح اور لیاقت علی خان دونوں وفات پا چکے تھے ان کا بیان حلفی مسترد کرتے ہوئے قائداعظم کی دونوں بہنوں فاطمہ جناح اور شرین بائی کو تو شیعہ قرار دے دیا لیکن محض فرقہ ورایت پر یقین نہ رکھنے کی وجہ سے قائداعظم کو شیعیت اور سنیت دونوں سے لاتعلق قرار دے دیا۔ حالانکہ عقل و نقل کسی اعتبار سے بھی کوئی شخص محض فرقہ ورایت پر عدم یقین کی وجہ سے اپنے مسلک و مذہب سے خارج قرار نہیں پاتا۔ کتنے ہی سنی ایسے ہیں جو فرقہ ورایت پر یقین نہیں رکھتے لیکن وہ اپنے آپ کو سنی کہلانے پر فخر محسوس کرتے ہیں اور لاتعداد شیعہ بھی ایسا ہی جذبہ رکھتے ہیں۔

حامد میر صاحب بحیثیت مفتی

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ "شیعیت" کو صحیح طور پر سمجھنا آج کے کسی رسمی فارغ التحصیل عالم کے بس کی بات بھی نہیں تو اسے حامد میر صاحب جیسا ایک عام صحافی کیوں کر سمجھ سکتا ہے؟ موصوف نے کس قدر کمزور، غلط اور فاسد دلیل دی کہ "قائداعظم نہ سنی تھے نہ شیعہ کیونکہ نبی اکرم بھی نہ شیعہ تھے اور نہ سنی"۔

موصوف اگر اپنے دائرہ صحافت کے اندر ہی رہتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا لیکن وہ اس پر اکتفا نہ کر سکے بلکہ ترقی کرتے ہوئے "افتاء" کے عظیم دینی اور شرعی منصب پر بھی فائز ہو گئے۔ ان کے فتاویٰ جات کی فہرست تو بہت طویل ہے جن پر تبصرہ ایک مستقل کتاب کا متقاضی ہے یہاں صرف چند "فتوے" بلا تبصرہ ہدیہ قارئین کیے جاتے ہیں۔

چند سال قبل موصوف نے روزنامہ جنگ کے جمعہ میگزین میں بہ عنوان "زہر کے پیالے سے پھانسی کے پھندے تک" ایک مضمون لکھا تھا جس میں صحابی رسول ﷺ کاتب وحی، خال المومنین، خلیفۃ المسلمین، لسانِ نبوت سے جنت کے بشارت یافتہ اور اسلام میں بحری جنگ کے بانی مجاہد فی سبیل اللہ سیدنا معاویہؓ کے خلاف زہر اگلتے ہوئے یہ گھناؤنا الزام عائد کیا کہ انہوں نے سیاسی مخالفت کی بناء پر انوکھے طریقے سے سزائے موت دی۔ جب ابوذر غفاریؓ نے سیدنا معاویہؓ کے ایک فعل کو خیانت، فضول خرچی اور منافی اسلام قرار دیا تو انہوں نے سیدابو ذر غفاریؓ کو ایک ایسے اونٹ پر سوار کرایا جس کی پشت پر کھردری لکڑی کا کجاوہ رکھا گیا تھا جس

سے ان کی رانوں کا گوشت ادھڑ گیا، وہ بے ہوش ہو گئے اور بعد میں چل بسے۔ سیاسی مخالفت کی بناء پر ایک صحابی کو سزائے موت دینے کا یہ واقعہ تاریخ اسلام میں منفرد حیثیت کا حامل ہے۔

(بحوالہ روزنامہ جنگ جمعہ میگزین صفحہ ۱۲-۳۰ جون تا ۶ جولائی ۱۹۸۹ء)

راقم الحروف اپنی کتاب "سیدنا معاویہؓ پر اعتراضات کا علمی تجزیہ" میں اس اعتراض کا مدلل جواب دے چکا ہے۔

پیپلز پارٹی کے ممتاز رہنما چوہدری اعتزاز احسن نے اپنی کتاب "سندھ ساگر" میں محمود غزنوی پر الزام عائد کیا کہ اس نے ملتان میں ایک مسلمان اسماعیلی ریاست کو بھی ختم کر دیا تھا۔ حامد میر صاحب اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ "یہاں میں چوہدری صاحب کے ساتھ بڑے ادب سے اختلاف رائے کی گستاخی کرتے ہوئے عرض کروں گا کہ ملتان کا حکمران ابوالفتح اپنے بزرگوں کا اسماعیلی عقیدہ چھوڑ کر قرمطی مذہب اختیار کر چکا تھا جس میں کعبہ کی بجائے صرف بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا گیا، نماز کو چار رکعتوں تک محدود کیا گیا، جمعہ کی بجائے اتوار کو مقدس دن قرار دیا گیا اور دیگر خرافات کو اختیار کیا گیا۔ ابوالفتح ایک مرتد تھا لہٰذا اس کی حکومت کو اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔" (روزنامہ اوصاف ۵۔ اکتوبر ۱۹۹۹ء)

اس کی وضاحت پیچھے زیر عنوان "شیعیت برصغیر میں" گزر چکی ہے۔ تاہم اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ابوالفتح اگر اپنے بزرگوں کا اسماعیلی عقیدہ نہ چھوڑتا تو پھر وہ مسلمان ہی سمجھا جاتا اور اس کی حکومت ایک اسلامی حکومت قرار پاتی۔

تحریک نفاذ شریعت محمدی کے سربراہ مولانا صوفی محمد نے "جمہوریت کو کفر اور پیشہ وکالت کو حرام" قرار دیا تو حامد میر صاحب کو انتہائی تشویش لاحق ہو گئی کہ اس طرح تو پھر وہ سارے زعماء، علماء اور وکلاء کافر قرار پاتے ہیں۔ "قائداعظم کا پیشہ وکالت تھا لیکن قائداعظم کی نماز جنازہ معروف عالم دین مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھائی۔ مولانا صوفی محمد بتائیں کہ کیا مولانا شبیر احمد عثمانی نے ایک کافر کی نماز جنازہ پڑھائی تھی؟ جمہوریت اور وکالت کو کفر قرار دینا لوگوں کو اسلام سے خوفزدہ کرنے کے مترادف ہے۔ اس قسم کے فتوؤں سے اسلام کے متعلق وہی تاثر پیدا ہوتا ہے جو اسلام دشمن مغربی طاقتیں پھیلانے میں مصروف ہیں۔ کفر کے غیر ضروری فتوے لگا کر لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کرنا بھی دراصل کافروں کی خدمت ہے۔"

{روزنامہ اوصاف ۸ فروری ۱۹۹۹ء قلم کمان بہ عنوان: ہمارا کون ہے؟}

موصوف عالم اسلام کے عظیم رہنما مجتہد العصر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کے رسالہ "الفرقان" کے متعلق رقم طراز ہیں: "بھارت میں ایسا لٹریچر بھی شائع کیا جا رہا ہے جو دو دھاری تلوار کا کام دے رہا ہے۔ اس لٹریچر سے ایک طرف اہل تشیع کو اہل سنت سے بدگمان کرنے کی کوشش ہوتی ہے اور اہل سنت کو اہل تشیع کے علاوہ ایران کے خلاف بھڑکانے کی سازش بھی کی جاتی ہے۔ ان دنوں پاکستان کے دینی حلقوں میں ماہنامہ الفرقان لکھنؤ کے اکتوبر ۱۹۹۸ء کے شمارے کی نقول پھیلائی جا رہی ہیں۔ الفرقان کے نام پر پھیلایا جانے والا یہ لٹریچر ایرانی حکومت کی مبینہ منصوبہ بندی پر مشتمل ہے اور اس میں اہل سنت کے خلاف ناقابل زبان بیان استعمال کی گئی ہے۔ ایرانی حکومت کے حوالے سے یہ لکھا گیا ہے کہ وہابی اور سنی ہمارے اصل دشمن ہیں لہٰذا پاکستان، افغانستان، عراق، ترکی اور بحرین کو اندر سے کمزور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان ممالک میں انقلاب ایران کو برآمد کیا جا سکے۔ الفرقان لکھنؤ کے نام پر پھیلائے جانے والے لٹریچر کی زبان اتنی زہریلی اور غیر محتاط ہے کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے مجھے یقین ہے کہ یہ زبان کسی مسلمان کی تحریر کردہ نہیں ہے اور اس کا مقصد صرف اور صرف پاکستانی معاشرے کو فرقہ وارانہ بنیادوں پر تقسیم کرنا ہے۔ فرقہ واریت کے خاتمہ کے لیے تمام مکاتب فکر کے نمائندہ علماء پر مشتمل کمیٹی کو چاہیے کہ اپنی سفارشات میں یہ ضرور واضح کر دے کہ ہم جس نبی ﷺ کی امت ہیں وہ نہ شیعہ تھے نہ سنی، نہ وہابی اور نہ ہی بریلوی تھے بلکہ وہ صرف اور صرف مسلمان تھے۔"

{روزنامہ اوصاف ۱۳ اپریل ۱۹۹۹ء قلم کمان بہ عنوان "فرقہ واریت پھیلانے والے خفیہ ہاتھ"}

راقم الحروف کو "فرقہ وارانہ دہشت گردی اور قتل و غارت گری" سے متعلق حامد میر صاحب کے احساسات، خیالات اور جذبات کے ساتھ مکمل اتفاق ہے لیکن موصوف جذبات کی رو میں بہہ کر نفس مسئلہ کو نظر انداز کر کے خود فتویٰ بازی پر اتر آتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"ہم سید کاظم رضا اور ان کے مہمان کے بہیمانہ قتل کی شدید مذمت کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کریں گے کہ وہ فرقہ وارانہ منافرت اور فرقہ وارانہ دہشت گردی پر قابو پانے کے لیے تمام مسالک سے تعلق رکھنے والے علماء حق کی مشاورت سے آئین میں ایسی ترمیم تجویز کرے جس کی رو سے مسلمانوں کے کسی بھی فرقے کے خلاف نفرت پھیلانے اور کسی بھی فرقہ سے

وابستہ مسلمان بھائیوں کے خون میں ہاتھ رنگنے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جائے۔
ہم سمجھتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو مختلف مسلک رکھنے والے مسلمان بھائی کو قتل کرتا ہے اسے مسلمان کہلوانے کا قطعی طور پر کوئی حق نہیں پہنچتا لہٰذا ہر وہ نام نہاد سنی مسلمان جو اپنے کسی مسلمان شیعہ بھائی کو قتل کرتا ہے وہ کافر ہے۔

وحشیو! درندو! اسلام کے دشمنو! پاکستان کی مانگ میں انگارے بھرنے والو! اگر تم میں مسلمانی کی ذراسی بھی رمق باقی ہے تو بند کرو یہ وحشت اور درندگی کا کھیل۔ تم میں سے اگر کوئی واقعی سنی ہے تو وہ احترام کرے اپنے شیعہ بھائی کا اور اگر کوئی واقعی شیعہ ہے تو وہ احترام کرے اپنے سنی بھائی کا ورنہ تم مسلمان نہیں، پاکستانی نہیں، انسان نہیں بلکہ بدروحیں ہو شیطان کی اور اگر تمہارے دلوں اور دماغوں پر کفر و جہل کی مہریں نہیں لگ چکیں تو اپنے ہتھیار پھینک کر خود کو اللہ کی عدالت میں پیش کردو۔" (روزنامہ اوصاف ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۸ اداریہ بعنوان "فرقہ وارانہ دہشت گرد مسلمان نہیں ہو سکتے")

مدیر اوصاف اپنے ایک دوسرے اداریہ میں فرقہ واریت کے خاتمہ کے لیے تشکیل کردہ دس رکنی کمیٹی کو تجویز پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ! اگر کمیٹی اس ذمہ داری سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہوگئی تو چودہ کروڑ پاکستانی تو اس کے ممنون ہوں گے ہی اس کے ارکان اللہ کے ہاں بھی سرخرو ہوں گے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ محمد ﷺ کے امتیوں پر سے شیعہ اور سنی کا لیبل ہٹ جائے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نام لیواؤں کو صرف مسلمان کے نام سے پہچانا جائے۔ یہ دیو بندی، وہابی، بریلوی اور شیعہ جیسے الفاظ اسلام کی خوبصورت اور مضبوط دیوار میں پڑنے والی وہ دراڑیں ہیں جو اس کے تمام تر حسن کو غارت کر رہی ہیں۔ ہمیں ان دراڑوں کو تم کر کے اتحاد و یک جہتی کی ایک ایسی مضبوط اور پائیدار دیوار قائم کرنا ہوگی جس سے ٹکرا کر ہمارا مشترکہ دشمن لہولہان ہوتا رہے۔" (روزنامہ اوصاف ۳۔ اپریل ۱۹۹۹ء بعنوان فرقہ واریت کے خاتمے کے لیے حکومت کا عملی قدم)

حامد میر صاحب نے "الفرقان" کے حوالے سے جو یہ کہا ہے کہ یہ زبان کسی مسلمان کی تحریر کردہ نہیں اور نیز یہ کہ یہ لٹریچر بھارت تقسیم کر کے اہل سنت، اہل تشیع اور ایران کے مابین نفرت پیدا کرنا چاہتا ہے اور ایران بے چارے کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔

اس کے جواب میں موصوف کے ایک سابقہ کالم سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:
"چند روز پہلے میں نے "پاک ایران تعلقات نازک موڑ پر" کے عنوان سے اپنے کالم

میں ایران کی طرف سے افغانستان میں مداخلت کا ذکر کیا تھا اور ایرانی اخبارات کی طرف سے پاکستان کے خلاف پراپیگنڈے کی طرف اپنے قارئین کی توجہ دلائی تھی۔ اس کالم پر مجھے بہت سے خطوط آ چکے ہیں لیکن میں بعض ایسے خطوط پر حیران ہوا جن میں ایران کے خلاف "علم جہاد" بلند کرنے پر مجھے مبارک باد دی گئی۔ میرے اس کالم کا مقصد ایرانی حکومت کی متضاد پالیسی پر تنقید تھی ایران کے عوام سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ راجن پور سے صحابہ کرامؓ کی ناموس کے لیے لڑنے والے ایک "مجاہد" نے طویل خط میں مجھ پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے ہیں اور آخر میں لکھا ہے کہ میں اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتا ورنہ قاری محمد یوسف کی طرح ایرانی دہشت گردی کا شکار بن جاؤں گا۔

قربان جاؤں میں اس "مجاہد" کی جرأت و بہادری پر جو نام ظاہر کرنے کی بھی جرأت نہیں رکھتا۔ ایک اور خط اسلام آباد سے محمد اکرم صاحب نے لکھا ہے۔ انہوں نے ایران پر تنقید کا سخت برا منایا اور دھمکی دی ہے کہ میں اپنے تحفظ کا بندوبست کر لوں۔

محمد اکرم صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ "اگر ایرانی اخبارات پاکستان کی سلامتی کو تباہ کرنے کی دھمکیاں دیں گے تو میں ان پر ضرور تنقید کروں گا۔ آپ بے شک مجھے گولی مار دیں۔ میری وفاداری پاکستان کے ساتھ ہے ایران کے ساتھ نہیں ہے۔" باغبانپورہ لاہور سے سید جی دار حسین شاہ لکھتے ہیں "جب تک برصغیر میں شیعہ قوم زندہ ہے افغانستان میں طالبان کی حکومت نہیں آسکتی"۔ یہ ڈائیلاگ نہ تو شیعہ قوم کے مفاد میں ہے نہ ہی ایران کے مفاد میں۔"

{روزنامہ پاکستان ۲۲ جون ۱۹۹۷ء بعنوان دشمن کی پہچان}

موصوف نے اپنے کالموں میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا کہ کسی طرح شیعہ، سنی کی تفریق مٹ جائے اور اسی بنیاد پر انہوں نے حقائق کے برعکس قائداعظم کے متعلق بھی یہ لکھ دیا کہ وہ نہ سنی تھے اور نہ شیعہ کیونکہ ان کے نبی ﷺ بھی نہ سنی تھے اور نہ شیعہ۔

معلوم نہیں کہ حامد میر صاحب نے قائداعظم اور اپنے آپ سے سنی شیعہ کی نفی کر کے انہیں اور خود اپنے آپ کو کس مقام پر پہنچا دیا ہے؟ شیعہ سنی اختلاف کی بنیاد نبی اکرم ﷺ کی رحلت کے فوراً بعد پڑی ہے۔ سنی وہ ہیں جنہوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو مضبوطی سے تھام کر خلفائے راشدینؓ اور جملہ صحابہ کرامؓ "سبیل المومنین" کی اتباع و پیروی کی اور

شیعہ وہ ہیں جو کتاب و سنت اور "سبیل المومنین" سے اختلاف کر کے حضرت ابو بکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کو ظالم، غاصب، منافق اور کافر کہہ کر الگ ہو گئے۔ اب وہ لوگ خود ہی فیصلہ کر لیں (جو نہ شیعہ ہیں اور نہ سنی) کہ وہ کس زمرے میں شامل ہیں؟

حامد میر صاحب کو سنی، شیعہ، دیوبندی، بریلوی اور وہابی کے الفاظ سے بہت ہی چڑ ہے اور وہ انہیں اسلام کی خوبصورت اور مضبوط دیوار میں "دراڑیں" قرار دیتے ہیں لیکن "سنیت" جو صحیح، سچے، اصلی اور حقیقی اسلام کی واحد تعبیر ہے اسے "دراڑ" قرار دینا اور اس کے لیبل کے ہٹانے کا مطالبہ کرنا خود اسلام کی نفی اور امت مسلمہ کی شدید ترین توہین ہے۔

"اہلسنت والجماعت" کا اطلاق ان اشخاص پر ہوتا ہے جن کے اعتقادات، اعمال اور مسائل کا محور پیغمبر اسلام کی سنت صحیحہ اور صحابہ کرامؓ کا اثر مبارک ہے۔ یا یوں کہیے کہ جنہوں نے اپنے عقائد، اصول حیات اور عبادات و اخلاق میں اس راہ کو پسند کیا جس پر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم عمر بھر چلتے رہے اور آپؐ کے بعد آپؐ کے صحابہؓ اس راہ پر چل کر منزل مقصود کو پہنچے۔ ان تصریحات کی روشنی میں "اہلسنت والجماعت" کی تعریف یہ ہوئی کہ جو لوگ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور جماعت صحابہؓ کی پیروی اور اتباع کریں اور یہی لوگ حدیث "ما انا علیہ واصحابی" کا مصداق ہیں۔

محترم جناب حامد میر صاحب! اگر آپ کے "حکم" کے مطابق "سنیت" کے لیبل کو ہٹا کر اپنے آپ کو صرف مسلمان کہلوایا جائے تو پھر یہ بات تو ضرور آپ کے علم میں ہو گی کہ مسلمان ہونے کے دعوے دار کچھ اور گروہ بھی ہیں مثلاً پرویزی، مرزائی (احمدی۔ قادیانی) بہائی، ذکری، اثنا عشری اور اسماعیلی وغیرہ۔ جو اسلام کی الگ الگ تشریح و تفسیر بیان کرتے ہیں۔ تو کیا آپ کے نزدیک ان میں سے ہر ایک گروہ کی تشریح صحیح ہے؟ اور کیا ان میں سے ہر مذہب و مسلک سچا ہے؟ اور اگر (معاذ اللہ) اس کا جواب آپ کے نزدیک اثبات میں ہے تو پھر "اہلسنت" کا امتیاز ہی کیا باقی رہ جاتا ہے؟ اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ متناقض باتیں بھی ایک ساتھ صحیح ہو سکتی ہیں۔ گویا معاذ اللہ توحید بھی صحیح ہے اور شرک بھی صحیح اس کا قائل کوئی پرلے درجے کا احمق ہی ہو سکتا ہے۔

جناب حامد میر صاحب! "سنی" کے جس نام و لقب سے آپ کو تخبہ؟ ہی نہیں چڑ اور نفرت ہے

اس نام و لقب سے تو دوسرے مذاہب کی "تشریحات اسلام" میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ ہم اسلام کی صرف اس تشریح کو صحیح سمجھتے ہیں جس کا نام "اہل سنت والجماعت" ہے اور یہ وہی اصلی اور خالص اسلام ہے جسے نبی اکرم ﷺ لے کر مبعوث ہوئے جو صحابہ کرامؓ کے واسطے سے ہم تک پہنچا۔ اہلسنت والجماعت کا لقب اسی اسلام کی سچی صحیح اور واحد تعبیر و تشریح ہے۔ اس کے علاوہ "سنی" کا لقب اختیار کر کے اہلسنت اپنے اسلام کا تعارف کراتے ہیں کہ ہم کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور جماعت صحابہؓ کی پیروی کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کی جتنی تعبیرات و تشریحات پائی جاتی ہیں انہیں باطل سمجھتے ہیں۔ آپ صرف اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں تو اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ آپ اسلام کی کس تعبیر و تشریح کو صحیح سمجھتے ہیں؟ اسلام کا نعرہ اس کی تشریح کی بغیر بالکل بے معنی ہے۔ آج مذاہب باطلہ یعنی شیعیت، اسماعیلیت، بہائیت اور قادیانیت وغیرہ کی اشاعت و ترویج کھلم کھلا ہو رہی ہے تو اصلی حقیقی اسلام کی حفاظت کی خاطر مسلک "اہلسنت والجماعت" کی حفاظت، حمایت اور اشاعت بھی ہر مسلمان کا شرعی فریضہ ہے۔

حامد میر صاحب اپنے مؤقف کی تائید میں یہ دلیل بھی پیش کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ بھی نہ شیعہ تھے اور نہ سنی۔

موصوف کثیر المطالعہ ہیں اور ان کی اہل تشیع کے ساتھ اکثر "اٹھک بیٹھک" بھی رہتی ہے اگر وہ ان کی کسی بنیادی کتاب کا مطالعہ کر لیتے یا خود ان سے ہی استفسار کر لیتے تو انہیں یہ دلیل دینے کی زحمت بالکل گوارہ نہ کرنا پڑتی کہ "نبی اکرم ﷺ نہ شیعہ تھے اور نہ سنی"۔

اہل تشیع کے ترجمان ابو مصعب جوادی لکھتے ہیں کہ! "قرآن مجید میں خدا کے ایک عظیم اور اولوالعزم پیغمبر حضرت ابراہیم کو شیعہ کہا گیا ہے چنانچہ ارشاد رب العباد ہے" وان من شیعتہ لا براھیم " (الصافات نمبر ۸۳) ہمارے رسول حضرت محمد بھی ملت ابراہیمی کے پابند ہیں" قل بل ملة ابراھیم حنیفا " (البقرہ نمبر ۱۳۵) شریعت اسلامی کے بانی حضرت نوحؑ تھے اس شریعت کے متبع کو اللہ تعالیٰ نے شیعہ کہا ہے لہذا حضرت ابراہیمؑ شیعہ نوح کہلائے۔ اسی طرح سورة قصص کی آیت نمبر ۱۵ میں حضرت موسیٰ کے گروہ کو شیعہ کہا گیا ہے کیونکہ حضرت موسیٰ شیعہ تھے اور انکے ماننے والے بحکم قرآن شیعہ تھے"

(تحقیق دستاویز صفحہ ۱۶-۱۷)

اہل تشیع کے اس استدلال کا جواب کتاب کے آغاز میں زیر عنوان "لفظ شیعہ قرآن

مجید میں" گذر چکا ہے۔

پاکستان کے حکمران ایک نظر میں

گورنر جنرل صاحبان

۱۔محمد علی جناح۔ ۱۵۔اگست ۱۹۴۷ء ۱۱ستمبر ۱۹۴۸ء انتقال ہوا۔

۲۔خواجہ ناظم الدین۔ ۱۴ستمبر ۱۹۴۸ء ۱۷۔اکتوبر ۱۹۵۱ء وزیراعظم بن گئے۔

۳۔ملک غلام محمد۔ ۱۹۔اکتوبر ۱۹۵۱ء ۱۵۔اکتوبر ۱۹۵۵ء برطرف کیئے گئے۔

۴۔میجر جنرل سکندر مرزا۔ ۶۔اکتوبر ۱۹۵۵ء ۲۳مارچ ۱۹۵۶ء صدر مملکت بن گئے۔

صدر صاحبان

۱۔میجر جنرل سکندر مرزا۔ ۲۳مارچ ۱۹۵۶ء ۲۷۔اکتوبر ۱۹۵۸ء برطرف کیے گئے۔

۲۔جنرل محمد ایوب خان۔ ۲۷۔اکتوبر ۱۹۵۸ء ۲۵مارچ ۱۹۶۹ء مستعفی ہوگئے۔

۳۔جنرل محمد یحیٰ خان ۲۵مارچ ۱۹۶۹ء ۲۰دسمبر ۱۹۷۱ء مستعفی ہوگئے۔

۴۔ذوالفقار علی بھٹو۔ ۲۰دسمبر ۱۹۷۱ء ۱۳۔اگست ۱۹۷۳ء وزیراعظم بن گئے۔

۵۔چوہدری فضل الٰہی ۱۴۔اگست ۱۹۷۳ء ۱۶ستمبر ۱۹۷۸ء ریٹائر ہوگئے۔

۶۔جنرل محمد ضیاء الحق ۱۶ ستمبر ۱۹۷۸ء ۱۷۔اگست ۱۹۸۸ء شہید ہوگئے۔

۷۔غلام اسحٰق خان ۱۷۔اگست ۱۹۸۸ء ۱۸جولائی ۱۹۹۳ مستعفی ہوگئے۔

۸۔وسیم سجاد ۱۸جولائی ۱۹۹۳ء ۱۳نومبر ۱۹۹۳ء اقتدار منتخب صدر کے سپرد

۹۔فاروق احمد خان لغاری۔ ۱۳نومبر ۱۹۹۳ء ۲دسمبر ۱۹۹۷ء مستعفی ہوگئے

۱۰۔وسیم سجاد ۲دسمبر ۱۹۹۷ء ۳۱دسمبر ۱۹۹۷ء اقتدار منتخب صدر کے سپرد

۱۱۔محمد رفیق تارڑ یکم جنوری ۱۹۹۸ء ۲۰جون ۲۰۰۱ء معزول کئے گئے

۱۲۔جنرل پرویز مشرف ۲۰جون ۲۰۰۱ء تاحال (جاری ہے)

وزیر اعظم صاحبان

۱۔لیاقت علی خان ۱۵۔اگست ۱۹۴۷ء ۱۶۔اکتوبر ۱۹۵۱ء قتل کردیئے گئے

۲۔خواجہ ناظم الدین ۱۷۔اکتوبر ۱۹۵۱ء ۱۷۔اپریل ۱۹۵۳ء برطرف کئے گئے

۳۔محمد علی بوگرہ اپریل ۱۹۵۳ء ۱۱۔اگست ۱۹۵۵ء برطرف کئے گئے

۴۔ چودھری محمد علی	۱۱۔ اگست ۱۹۵۵ء	۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء	مستعفی ہو گئے
۵۔ حسین شہید سہروردی	۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء	۱۸۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء	مستعفی ہو گئے
۶۔ ابراہیم اسماعیل چندریگر	۱۸۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء	۱۶ دسمبر ۱۹۵۷ء	معزول ہو گئے
۷۔ ملک فیروز خان نون	۱۸ دسمبر ۱۹۵۷ء	۷۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء	معزول ہو گئے
۸۔ نور الامین	۷ دسمبر ۱۹۷۱ء	۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء	معزول ہو گئے۔
۹۔ ذوالفقار علی بھٹو	۱۴۔ اگست ۱۹۷۳ء	۵ جولائی ۱۹۷۷ء	معزول ہو گئے
۱۰۔ محمد خان جونیجو	۲۳ مارچ ۱۹۸ ۵ء	۲۹ مئی ۱۹۸۸ء	برطرف کیے گئے
۱۱۔ بے نظیر بھٹو	۲ دسمبر ۱۹۸۸ء	۶۔ اگست ۱۹۹۰ء	برطرف کی گئی
۱۲۔ غلام مصطفیٰ جتوئی	۶۔ اگست ۱۹۹۰ء	۶ نومبر ۱۹۹۰ء	اقتدار منتخب وزیر اعظم کے سپرد
۱۳۔ محمد نواز شریف	۶ نومبر ۱۹۹۰ء	۱۸۔ اپریل ۱۹۹۳ء	برطرف کیے گئے
۱۴۔ بلخ شیر مزاری	۱۸۔ اپریل ۱۹۹۳ء	۲۶ مئی ۱۹۹۳ء	عدالت عظمیٰ کی طرف سے نواز شریف کی بحالی
۱۵۔ محمد نواز شریف	۲۶ مئی ۱۹۹۳ء	۱۸ جولائی ۱۹۹۳ء	مستعفی ہو گئے
۱۶۔ معین قریشی	۱۸ جولائی ۱۹۹۳ء	۱۹۔ اکتوبر ۱۹۹۳ء	اقتدار منتخب وزیر اعظم کے سپرد
۱۷۔ بے نظیر بھٹو	۱۹۔ اکتوبر ۱۹۹۳ء	۵ نومبر ۱۹۹۶ء	برطرف کی گئی
۱۸۔ ملک معراج خالد	۶ نومبر ۱۹۹۶ء	۱۷ فروری ۱۹۹۷ء	اقتدار منتخب وزیر اعظم کے سپرد
۱۹۔ محمد نواز شریف	۱۷ فروری ۱۹۹۷ء	۱۲۔ اکتوبر ۱۹۹۹ء	معزول کیے گئے
۲۰۔ چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف	۱۲۔ اکتوبر ۱۹۹۹ء		تا حال (جاری ہے)

پروفیسر مقبول بدخشانی لکھتے ہیں کہ:

"۱۹۴۷ء میں پاکستان آزاد ملک کی حیثیت میں وجود میں آیا تو سب سے پہلا ملک جس نے پاکستان کو تسلیم کیا ایران ہی تھا۔ اب اگرچہ جغرافیائی حدود کے لحاظ سے ایران و پاکستان جدا جدا ملک ہیں لیکن سیاسی، مذہبی، ثقافتی اور نسلی رشتوں کی بناء پر وہ ایک ہی ہیں۔ آریا مہر شہنشاہ ہمایوں محمد رضا شاہ پہلوی کو پاکستان اپنے وطن ہی کی طرح عزیز ہے۔"

(تاریخ ایران صفحہ ۲۹۸ حصہ ۱)

قیام پاکستان کے بعد ایران کے ساتھ اس کے تعلقات کس قدر اچھے رہے ہیں کا

اندازہ پاکستان کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر ایران کے تاثرات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

چنانچہ علی ذوعلم رقم طراز ہیں کہ

"قیام پاکستان کے زمانہ میں ایرانی قوم وہ پہلی ملت تھی جس نے پاکستان کے معرض وجود میں آنے پر جشن منایا اور تاسیس پاکستان کا نہایت جوش و خروش سے استقبال کیا۔ قیام پاکستان کے حوالے سے ایرانی شعراء نے اشعار کہہ کر، اہل قلم نے مقالات تحریر کر کے اور خطباء حضرات نے تقاریر کے ذریعے اظہار مسرت کیا جب کہ سرکاری طور پر بھی ایران وہ پہلا ملک تھا جس نے پاکستان کو سب سے پہلے تسلیم کیا اور اپنے ہمسایہ ممالک میں پاکستان کو ایک قانونی ملک قرار دیا۔ سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ قیام پاکستان کے حوالے سے تمام مسلمانوں کا نقطہ نظر ایک تھا اور سب مسلمان باہمی طور پر متحد تھے۔ خدانخواستہ اگر اس زمانے میں برصغیر کے مسلمانوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کو کافر قرار دینے لگتا اور مسلمانوں کے درمیان دہشت گردی کی کارروائیوں کو فروغ دینے کی مذموم کوششیں کی جاتیں تو اس صورت میں نہ تو مسلمان برطانوی سامراج کے مقابلے میں کامیابی و کامرانی سے ہم کنار ہو سکتے تھے اور نہ ہی پاکستان کے قیام کے تصور کو شرمندہ تعبیر کر سکتے تھے۔

آج بھی ہر زمانے کی نسبت امت مسلمہ کو چاہے وہ دنیا کے کسی حصے میں ہو خصوصاً پاکستان میں اسلامی وحدت و یکجہتی کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ تا کہ یہاں کے لوگ علامہ اقبال اور قائداعظم جیسی بزرگ شخصیتوں کے اعلیٰ مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں۔ قیام پاکستان کی پچاسویں سالگرہ کی مناسبت سے ہم اپنے اسلامی ملک پاکستان کے تمام مسلمانوں کو خصوصاً نوجوان نسل کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں اور اسی مناسبت سے زیر نظر شمارے کے علاوہ اگلے پانچ شماروں کو بھی قیام پاکستان کی پچاسویں سالگرہ (گولڈن جوبلی) کے حوالے سے خصوصی گولڈن جوبلی قرار دے رہے ہیں۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ امت مسلمہ اپنی مکمل وحدت اور یکجہتی کے ذریعے دشمنان اسلام کی آنکھوں کا کانٹا بن جائے گی۔" (ماہنامہ وحدت اسلامی اسلام آباد اپریل مئی ۱۹۹۷ء)

لیاقت علی خان

پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان (جنہوں نے فاطمہ جناح کے ساتھ مل کر قائداعظم کے شیعہ ہونے کے متعلق ایک مشترکہ درخواست اپنے بیان حلفی کے ساتھ سندھ ہائی کورٹ میں دائر کی تھی) قائداعظم کے دست راست اور آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے۔ یہ کرنال مشرقی پنجاب کے ایک متمول زمیندار خاندان میں ۱۸۹۵ء کو پیدا ہوئے۔ یہ رکن الدولہ شمشیر جنگ نواب رستم علی خان کے دوسرے بیٹے تھے جن کے مورث اعلیٰ پانچ سو برس قبل ایران سے ہندوستان چلے آئے تھے اور ان کا شجرہ نسب ایران کے مشہور فرمانروا "انوشیروان" سے جا ملتا ہے۔

لیاقت علی خان کی پہلی شادی ان کی عم زاد جہانگیرہ بیگم کے ساتھ ہوئی جن کے بطن سے نوابزادہ ولایت علی خان پیدا ہوئے۔ انہوں نے دوسری شادی بیگم رعنا سے کی۔

۱۹۲۶ء میں لیاقت علی خان یوپی کی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے اور انہوں نے اس رکنیت کو ۱۹۴۰ء تک برقرار رکھا۔ قائداعظم نے قیام پاکستان کے بعد جب آل انڈیا مسلم لیگ کی تقسیم کا اعلان کیا تو انہیں پاکستان مسلم لیگ کا کنوینر نامزد کیا جبکہ بھارت کی مسلم لیگ کے کنوینر نواب محمد اسماعیل خان نامزد ہوئے۔ یہ بھی شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔

۱۹۴۹ء میں حکومت ایران کی دعوت پر لیاقت علی خان نے ایران کا دورہ کیا جہاں ان کا انتہائی پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ سپاسنامے کے جواب میں لیاقت علی خان نے ارشاد فرمایا! "ہمارے برادرانہ روابط کا سلسلہ دنیا بھر کے اسلامی ممالک کے ساتھ قائم ہے لیکن ایران ہم سے ہر لحاظ سے قریب تر ہے"۔

۱۹۵۰ء میں شاہ ایران رضا شاہ پہلوی نے پاکستان کا دورہ کیا اور چند معاہدے کیے جن کا سلسلہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا۔ پھر ۱۹۵۶ء میں ایک معاہدہ طے پایا۔ جس کی رو سے دونوں ملکوں میں ثقافتی سرگرمیاں بڑھانا، علمی ادارے قائم کرنا، اساتذہ، پروفیسروں اور طلبہ کے تعلیمی دوروں کے لیے سہولتیں فراہم کرنا، دونوں ملکوں کے طلباء کو اپنے اپنے ملک میں علوم و فنون کی تعلیم کے لیے وظائف دینا شامل ہے۔ جس پر دونوں ملکوں میں نہایت گرم جوشی سے عمل شروع ہوا اور حکومت ایران [illegible] کے طور پر کراچی، لاہور، راولپنڈی اور کوئٹہ میں

بانے بنگ قائم کیئے۔ یہ ادارے تو ۱۹۵۶ء کے معاہدے کے تحت قائم ہوئے تھے لیکن پاکستان ابتداہی سے ایرانیوں کا دوسرا گھر تھا۔ ان اداروں میں آگے چل کر کس قدر اضافہ ہوا؟ یہ کن مقاصد کے لیئے قائم کیئے گئے؟ انہوں نے کیا گل کھلائے؟ اور انہوں نے پاکستان کو ایرانیت کے رنگ میں کس طرح رنگا؟ یہ ایک مستقل عنوان ہے جس پر بحث کی یہاں گنجائش نہیں۔ یہاں صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ہندوستان میں مغل بادشاہ ہمایوں کے ساتھ جس طرح ایران کی غالی شیعہ صفوی حکومت نے تعاون کیا تھا بالکل اسی طرح کا تعاون پاکستان کے ساتھ بھی کیا گیا۔ ایسا کیوں نہ ہوتا۔ یہاں کے گورنر جنرل، وزیر اعظم اور انتظامیہ کے دیگر اہل عہدے دار ہمایوں بادشاہ سے بھی بڑھ کر ایران کو عزیز تھے۔

اہل سنت کے لئے پاکستان میں پہلے سے مقیم شیعہ افراد، شیعہ حکمران اور پھر ایرانیوں کی یلغار کسی "کمر توڑ" حادثہ سے کم نہیں تھی اس پر مستزاد یہ کہ ہندوستان سے بھی شیعہ مجتہدین، واعظین، ذاکرین اور شیعہ افراد مہاجرین کے روپ میں جوق در جوق منتقل ہو کر پاکستان میں آباد ہو گئے۔ کیونکہ انہیں جو مراعات یہاں حاصل ہو سکتی تھیں کسی دوسری جگہ اس کی کوئی توقع نہیں تھی۔ مفتی جعفر حسین صاحب لکھتے ہیں کہ!

"تقسیم کے بعد جہاں اور مسلمانوں نے ہجرت کی وہاں شیعوں کی بھی ایک بڑی تعداد ترک وطن کر کے پاکستان میں آباد ہو گئی ہے اور کراچی، حیدر آباد، خیر پور، ملتان، لاہور اور سرگودھا میں ان کے معیاری مدارس دینیہ بھی قائم ہو چکے ہیں۔" (اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۱ صفحہ ۹۰۹)

خطیب ملت، بطل حریت، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے ۱۹۴۹ء میں ملتان کی ایک مجلس میں فرمایا! "جب پاکستان بنا تھا ہم تو اسی وقت بھانپ گئے تھے کہ اب حکومت دو گروہوں کے قبضہ و تسلط میں ہو گی "شیعہ و مرزائی" شیعہ زیادہ ہیں اور مرزائی کم مگر خطرہ ان ہی سے زیادہ ہے باقی یہ خیال دل سے نکال دو کہ شیعہ کسی بھی گوشہ میں تم سے رعایت برتیں گے یا تمہاری مدد کریں گے۔ وہ صرف اپنے ہیں اور کسی کے نہیں ہیں۔ صوبوں سے لے کر مرکز تک وہی قابض ہیں۔ کرامت علی غضنفر علی، محمد علی یہ لوگ اگرچہ سیاسی لیڈر ہیں اور بظاہر وسیع المشرب مگر شیعہ ازم میں وہ بہت متشدد و مضبوط ہیں جہاں تک ان کا بس چلے گا اسلام اور قرآن کو نا قابل عمل بنا کر دم لیں گے۔ غضنفر علی نے گذشتہ برس راولپنڈی میں کہا" وہ زمانہ گیا جب

بخاری قرآن سنا سنا کر لوگوں کو الو بنایا کرتا تھا اب پاکستان بن گیا ہے اب یہاں ان باتوں کی گنجائش نہیں۔" میں نے جواباً کہا تھا کہ پاکستان میں حکمرانوں کے ہاتھوں دین کا جو انجام ہو گا وہ تمہارے سامنے ہے۔ میں نے تو پہلے بھی کہا تھا کہ ہندوستان میں مسلمان نہیں رہنے دیا جائے گا اور پاکستان میں اسلام نہیں رہنے دیا جائے گا۔ پاکستان میں دین کا بس اللہ ہی حافظ ہے۔ یہاں فرنگی کے جانشین فرنگی سے زیادہ دشمن ہیں۔ شاید کچھ مدت بعد اس ملک میں دین اسلام کا لفظ بھی لوگوں کی سمجھ میں نہ آ سکے۔ آثار اچھے نہیں ہیں"۔ (پاکستان میں کیا ہوگا؟ صفحہ ۲۲-۲۳)

قائداعظم کی زندگی میں تمام اختیارات خود ان کے پاس تھے اور لیاقت علی کی حیثیت ثانوی تھی۔ ان کی وفات کے بعد مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل مقرر ہوئے یہ طبعاً کمزور اور کٹھ پتلی تھے۔ بقول راجہ غضنفر علی خان ان کے متعلق قائداعظم کی رائے یہ تھی:

HE IS THE WEAKEST OF ALL OUR WEAKNESSES.

یعنی وہ ہماری تمام کمزوریوں کی کمزور ترین کمزوری ہیں۔ خواجہ ناظم الدین کے گورنر جنرل بننے کے بعد تمام اختیارات اور حکومت کا نظم و نسق عملاً وزیر اعظم لیاقت علی خان کے ہاتھ میں آ گیا۔ پھر لیاقت علی خان کے قتل کے بعد خواجہ ناظم الدین نے گورنر جنرل کا عہدہ لیاقت علی کی کابینہ کے وزیر خزانہ ملک غلام محمد کے سپرد کر دیا اور خود وزیر اعظم بن گئے۔

ملک غلام محمد بد کردار، شرابی اور جسمانی طور پر معذور تھا۔ اس نے اپنا دل بہلانے کی خاطر واشنگٹن کی ایک نیم امریکن، نیم سوس، طرح دار، نازک اندام اور خوبصورت لڑکی مس روتھ بورل کو اپنا پرسنل پرائیویٹ سیکرٹری مقرر کر رکھا تھا۔

اسی دور میں تحریک ختم نبوت شروع ہوئی جو پنجاب سے شروع ہو کر ملک کے دوسرے علاقوں تک پہنچ گئی جسے فوجی قوت کے ذریعے کچل کر پاکستانی حکمرانوں نے بالکل ابتدا ہی میں اپنے "نظریہ پاکستان" کی وضاحت کر دی۔ ملک غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر کے مشرقی پاکستان کے ایک گمنام لیڈر محمد علی بوگرہ (جو اس وقت امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے) کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ بعد میں ملک غلام محمد نے آئین ساز اسمبلی توڑ دی۔ بوگرہ مستعفی ہو کر اپنی سابقہ پوسٹ پر امریکہ واپس چلے گئے۔ اب وزیر داخلہ سکندر مرزا تمام اختیارات کا مالک تھا۔ اس نے ملک غلام محمد کو برطرف کر کے گورنر جنرل کا عہدہ خود سنبھال لیا۔

میجر جنرل سکندر مرزا

سکندر مرزا کا تعلق بدنام زمانہ شیعہ گھرانہ مرشد آباد سے تھا جو شمال ہندوستان میں پہلا اہم شیعہ ثقافتی مرکز تھا۔ ابتداء میں اس کا نام "مخصوص آباد" تھا لیکن جب مرشد قلی خان دیوان بنگال نے ۱۷۰۴ء میں شہزادہ عظیم الشان ناظم بنگالہ سے چپقلش کی بناء پر صوبائی دارالحکومت ڈھاکہ کو خیر باد کہا اور نئے مقام میں ٹکسال اور دفاتر قائم کر کے اسے دیوانی کا صدر مقام بنایا تو اس کا نام بھی اپنے نام پر "مرشد آباد" رکھا۔ اس مرکز نے حکومت برطانیہ کو ہندوستان میں قدم جمانے میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

سکندر مرزا شاہی کمیشن یافتہ فوجی افسر تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد وہ میجر کے رینک کا افسر تھا پھر اس نے برٹش انڈیا کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں عہدہ حاصل کیا۔ اس ڈیپارٹمنٹ میں اس کے "بزرگوں" کی خدمات کا لحاظ بھی کیا جاتا تھا کیونکہ وہ "بزرگ" بنگال کو مسلمانوں کے ہاتھ سے نکال کر انگریز کے پاؤں میں لاڈالنے کے سلسلہ میں برطانوی حکومت کی گراں قدر خدمات سرانجام دے چکے تھے۔ اس لیئے انگریز نے سکندر مرزا کو صوبہ سرحد میں اپنی "فارورڈ پالیسی" کے لیئے اچھا مہرہ خیال کرتے ہوئے اس کو پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کر دیا۔ آگے چل کر یہ ملک غلام محمد کا رفیق خاص بن گیا اس نے ایک خفیہ پلان کے ذریعے گورنر جنرل سے پاکستان کے سب سے اعلیٰ نمائندہ ادارہ یعنی دستور ساز اسمبلی کو ختم کرایا۔ ۱۹۵۵ء کے اواخر میں غلام محمد پر فالج کا شدید حملہ ہوا تو سکندر مرزا نے اسے ریٹائر ہونے کا مشورہ دیا اور خود گورنر جنرل بن گیا۔

مرزا نے ارکان اسمبلی کو ۱۹۵۴ء سے اسلامی طرز کے دستور سے انحراف کرنے پر آمادہ کرنے کی کوششیں جاری رکھیں لیکن سخت عوامی دباؤ کی بناء پر ارکان اسمبلی کے لیئے مرزا کی خواہشات کے سامنے جھکنا ممکن نہ رہا اور اسمبلی نے ایک اسلامی دستور تیار کر لیا مگر ایک مصالحتی فارمولے کے تحت مجبوراً ارکان اسمبلی مرزا کو صدر بنانے پر رضامند ہو گئے۔ یوں ایک اسلام دشمن، بدقماش اور غالی شیعہ سکندر مرزا ۱۹۵۶ء کے پہلے اسلامی دستور کے تحت اسلامی جمہوریہ پاکستان کا صدر منتخب ہو گیا۔ پاکستان اور ہندوستان کو آزادی ہند کے قانون کے تحت آزادی حاصل ہوئی۔ اس قانون کا مسودہ ۴ جولائی ۱۹۴۷ء کو برطانوی پارلیمان میں پیش کیا گیا جو منظوری کے بعد ۱۸ جولائی کو قانون بنا۔ اس قانون کے تحت پاکستان کو مستقرانی وجہ حاصل ہوا۔ ۲۳ مارچ

۱۹۵۶ء تک پاکستان کی یہی حیثیت رہی۔

۱۹۵۶ء کے آئین کی رو سے پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔ اس سے پیشتر پاکستان کے سربراہ مملکت کا تقرر جسے گورنر جنرل کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا ملکہ انگلستان کی طرف سے ہوتا تھا آئین کے نفاذ کے بعد صدر مملکت کے تقرر کے سلسلے میں تاج دار برطانیہ کے اختیارات ختم ہو گئے۔

سکندر مرزا نے اپنے مذہبی، خاندانی اور سیاسی پس منظر میں ۱۹۵۶ء کے آئین کو ناکام بنانے کے لیئے وہی حربے استعمال کیئے جو وہ سرحد میں غیور پٹھانوں کو انگریزی راج کی برکتوں سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب میں استعمال کرنے کا عادی تھا لیکن چونکہ اس کی نمائندہ حیثیت کچھ بھی نہ تھی اس لیئے اس نے سیاسی لیڈروں کی زد سے بچنے کے لیئے فوج کو استعمال کرتے ہوئے جنرل محمد ایوب خان کو وزیر دفاع مقرر کر دیا۔

سکندر مرزا نے فوج میں جرأت و بہادری کا مظاہرہ کرنے والے کے لیئے سب سے بڑا تمغہ "نشان حیدر" جاری کیا جبکہ کسی سنی جرنیل یا حکمران کو اس کی توفیق نہیں ہوئی کہ وہ کسی دوسرے صحابی کی طرف منسوب کسی "نشان" کا اعلان کرتا۔

سکندر مرزا نے ۱۹۵۶ء کے اسلامی دستور سے مستقل طور پر چھٹکارا حاصل کرنے کی خاطر ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو مارشل لاء کے نفاذ کا اعلان کرتے ہوئے دستور کو منسوخ کر دیا اور کابینہ و اسمبلی کو برخاست کر دیا۔ پھر مارشل لا لگانے کے بیس دن بعد ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو اس کے رفیق خاص چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر محمد ایوب خان نے اسے صدارت سے برطرف کر کے جلاوطن کر دیا۔ چند سال بعد یہ اسلام اور ملک دشمن سازشی لندن میں اپنے انجام کو پہنچ گیا لیکن حکومت ایران نے اسے عزت بخشی اور اسے سرکاری اعزاز کے ساتھ ایران میں دفن کر دیا۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

سکندر مرزا کی وفات پر لندن ٹائمز نے ۱۴ نومبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں لکھا کہ "مرزا ۱۳ نومبر ۱۸۹۹ء کو بمبئی کے ایک ایسے ایرانی النسل "ارسٹوکریٹ خاندان" میں پیدا ہوا جو ایک عرصے سے بھارت میں مقیم تھا۔ (بحوالہ تاریخ پاکستان صفحہ ۱۴۳ مولفہ منہاج الدین ظفر)

سکندر مرزا کی بیوی ناہید مرزا بھی ایرانی تھی۔ اس کی پہلی شادی پاکستان میں ایران

کے ملٹری اٹیچی کے ساتھ ہوئی تھی پھر اس سے طلاق حاصل کر کے اس نے سکندر مرزا سے شادی کر لی۔مرزا اس وقت ڈیفنس سیکرٹری تھے۔

سکندر مرزا کے دور (اگست ۱۹۵۵ء تا اکتوبر ۱۹۵۸ء) میں چودھری محمد علی، حسین شہید سہروردی، اسماعیل ابراہیم چندریگر اور فیروز خان نون نے بحیثیت وزیر اعظم کام کیا۔ سکندر مرزا کے شیطانی کرتوتوں کی ایک مثال وہ جارحانہ اور ظالمانہ اقدام تھا جو اس نے ریاست قلات کے خلاف کیا جہاں ریاستی طور پر اسلامی شرعی قوانین کا عملی نفاذ ایک عرصہ سے جاری تھا۔ چونکہ سکندر مرزا کی وفاداریاں ہمسایہ شیعہ ریاست ایران سے وابستہ تھیں اس لیئے اس نے بلا جواز مذاکرات کے ڈھونگ کے نتیجے میں بلوچستان کا تین ہزار مربع میل کا سرحدی علاقہ ایران کے حوالے کر دیا۔

دراصل سکندر مرزا کے اس پاکستانی علاقے ملحقہ ایران کی یک طرفہ سودے بازی کی دو وجوہات تھیں ایک یہ کہ اسے اس طرح ایران عظمیٰ کی شیعہ سکیم کے سلسلہ میں اپنی جانب سے ایک نذرانہ پیش کرنا مقصود تھا اور دوم یہ کہ اس علاقہ میں تیل نکلنے کے قوی امکانات کی رپورٹ خبر رساں ایجنسیوں نے وہاں کام کرنے والی ایک امریکن ڈرلنگ کمپنی کے توسط سے دی تھی لیکن اچانک وہاں نامعلوم وجوہات کی بناء پر تیل نکالنے کا کام روک دیا گیا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ امریکہ اور ایران کی ہدایت پر سکندر مرزا نے پراسرار طور پر ڈرلنگ کا کام رکوادیا تھا اور پھر گفت وشنید کا ڈھونگ رچا کر پاکستان کی سرزمین کے اس بے بہا خزانے کو ایرانی آقاؤں کی نذر کر کے اپنی شیعیت کا ثبوت فراہم کیا۔

ایرانی ہر دور میں "ایران عظمیٰ" کے لیئے کوشاں رہے۔ پاک فوج کے سابق سربراہ جنرل ریٹائرڈ مرزا اسلم بیگ سے یہ سوال کیا گیا کہ! ایران، افغانستان، پاکستان اور ترکی میں دفاعی اتفاق رائے کا تصور بھی مختلف مواقع پر ابھرتا رہتا ہے آپ خود اس کے پرجوش پرچارک رہے ہیں جبکہ ایران کے رویّوں پر گہری نظر رکھنے والے بعض دانشوروں کے خیال میں اس اشتراک عمل کے سلسلے میں بہت زیادہ توقعات وابستہ نہیں کی جاسکتیں؟

ج۔ اس بات میں خاصا وزن ہے۔ اپنا انقلاب دوسرے ممالک میں برآمد کرنے کے ایرانی جذبے نے متعدد مسلمان ملکوں میں ایران کے متعلق ایک طرح کے مزاحمتی رویے کو جنم دیا۔

میرے خیال میں ایک اور مسئلہ بھی ہے یہ کہ آج کے ایرانیوں میں بھی قبل مسیح کی ایرانی سلطنت۔ پرشین امپائر۔ کا تصور موجود ہے۔ میرے دور میں ایران کے کمانڈر انچیف محسن رجائی پاکستان آئے تو ان کے پاس اس پرشین امپائر کے نقشے بھی تھے وہ مجھے بتاتے رہے کہ ماضی میں پاکستان، کشمیر، افغانستان اور وسط ایشیا کے کون کون سے علاقے ایرانی سلطنت کا حصہ رہے ہیں۔

ایرانیوں کی یہ سوچ علاقائی تعاون کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بن سکتی ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ ایرانی دعوے تو بہت کرتے ہیں لیکن عمل کا وقت آتا ہے تو آگے نہیں بڑھتے۔ ہم نے دفاعی میدان میں پیش قدمی کی کوشش کی لیکن ایک خاص حد پر جا کر وہ رک گئے۔

{بحوالہ ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان صفحہ ۳۶۔ اگست ۱۹۹۲ء}

پیچھے قائد اعظم اور لیاقت علی خان کے حالات میں پاکستانی قیادت کی ایرانیوں کے ساتھ مذہبی و نظریاتی ہم آہنگی و مطابقت اور باہمی دوستانہ تعلقات کا ذکر ہو چکا ہے۔ سکندر مرزا کے دور اقتدار میں دونوں ملکوں کے مابین ان تعلقات میں مزید اضافہ ہوا۔ چنانچہ قدرت اللہ شہاب صاحب لکھتے ہیں کہ!

" آزادی کے بعد پاکستان کا پہلا سرکاری دورہ کرنے والے غیر ملکی سربراہ مملکت ایران کے شہنشاہ رضا شاہ پہلوی تھے۔ سکندر مرزا صاحب کی صدارت کے دوران شاہ ایران کے ساتھ یہ دوستانہ مراسم خاص طور پر گہرے ہو گئے۔ دونوں حضرات بلا تکلف فارسی میں گفتگو کرتے تھے اور بیگم ناہید سکندر مرزا کا تعلق بھی ایک معروف ایرانی قبیلے اور خاندان سے تھا۔ شاہ ایران اور سکندر مرزا کے باہمی ذاتی اور سرکاری مراسم اس قدر گہرے نظر آتے تھے کہ ان کے جلو میں وقتاً فوقتاً طرح طرح کی افواہیں جنم لیتی تھیں۔ اس زمانے میں اس افواہ نے بھی سر اٹھایا تھا کہ شاہ ایران کی سربراہی میں پاکستان اور ایران کی ایک متحدہ کنفیڈریشن بنانے کا منصوبہ تیار ہو رہا ہے"۔

{شہاب نامہ صفحہ ۹۸۰}

یہ محض ایک افواہ ہی نہیں تھی بلکہ مکمل منصوبہ تھا جو اکتوبر ۱۹۵۸ء کے شروع میں سکندر مرزا کی تہران میں موجودگی کے دوران زیر غور تھا کہ سکندر مرزا کو اچانک کراچی بلا لیا گیا اور چند دنوں کے بعد ایوب خان کے برسر اقتدار آ جانے کی وجہ سے کنفیڈریشن کی تجویز آگے نہ بڑھ سکی۔

بہر حال سکندر مرزا جہاں ملک و قوم کا اولین اور بدترین غدار تھا وہیں شیعیت اور ایران کے لیے

اس کی وفاداریاں اور خدمات بے شمار تھیں جن کے صلے میں اسے اپنے روحانی مرکز ایران میں سرکاری اعزاز کے ساتھ تدفین کا شرف حاصل ہوا۔

صدر محمد ایوب خان

سکندر مرزا کے بعد محمد ایوب خان کرسی صدارت پر براجمان ہوئے۔ انہوں نے برِّ صغیر میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے دوران بالخصوص دوسری جنگ عظیم میں برطانوی حکومت کے لیئے قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ موصوف ۱۹۵۰ء میں افواج پاکستان کے کمانڈر انچیف مقرر ہوئے اور اس طرح انہوں نے پاکستانی فوج کے سب سے پہلے سپہ سالار ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔

جنرل محمد ایوب خان اگرچہ سرزمین ہزارہ کے باسی تھے لیکن ان کی اسلام سے محبت کا اندازہ "شہاب نامہ" کے درج ذیل اقتباس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں کہ:

"اس نئے دور میں کام شروع کرتے ہی میرے دل میں یہ بات کھٹکی کہ مارشل لاء نافذ ہونے کے بعد اب تک جتنے سرکاری اعلانات، قوانین اور ریگولیشن جاری ہوئے ہیں ان میں صرف حکومت پاکستان کا حوالہ دیا ہے۔ حکومت اسلامی جمہوریہ پاکستان کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ شاید ڈرافٹنگ میں غلطی سے ایک آدھ بار یہ فروگذاشت ہو گئی ہوگی لیکن جب ذرا تفصیل سے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ جس تواتر سے یہ فروگذاشت دہرائی جارہی ہے وہ سہواً کم اور التزاماً زیادہ محسوس ہوتی ہے اس پر میں نے ایک مختصر سے نوٹ میں صدر ایوب کی خدمت میں تجویز پیش کی کہ اگر وہ اجازت دیں تو وزارت قانون اور مارشل لاء ہیڈ کوارٹر کی توجہ اس صورت حال کی طرف دلائی جائے اور انکو ہدایت دی جائے کہ جاری شدہ تمام اعلانات اور قوانین کی تصحیح کی جائے اور آئندہ کے لیئے اس غلطی کو نہ دہرایا جائے۔ صدر میرے نوٹ کا پرچہ ہاتھ میں لیئے میرے کمرے میں آئے۔ وہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ تھے آتے ہی انہوں نے میرا نوٹ میرے حوالے کیا اور کہا "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے ڈرافٹنگ میں کسی نے کوئی غلطی نہیں کی بلکہ میں نے سوچ سمجھ کر یہی طے کیا کہ اسلامک ری پبلک آف پاکستان سے اسلامک کا لفظ نکال دیا جائے۔" یہ فیصلہ ہو چکا ہے یا ابھی کرنا ہے؟ میں نے پوچھا۔

صدر ایوب نے کسی قدر غصے سے مجھے گھورا اور سخت لہجے میں کہا" ہاں یہ فیصلہ ہو گیا ہے۔کل صبح پہلی چیز مجھے ڈرافٹ ملنا چاہئے اس میں دیر نہ ہو"۔ (شہاب نامہ صفحہ ۷۹۰)

بعد میں قدرت اللہ شہاب صاحب کی حکمت عملی کی وجہ سے موصوف کے موقف میں تبدیلی آ گئی تھی ورنہ سوچا جا سکتا ہے کہ جس کی ابتدا اس طرح ہو تو اس کی انتہا کیا ہو گی؟ ایسی سوچ اور فکر رکھنے والوں کا انجام لوگوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور تاریخ نے اسے اپنے صفحات میں محفوظ کر لیا۔

ایوب خان کے برسر اقتدار آنے سے شاہ ایران برہم ہو گئے کیونکہ سکندر مرزا شاہ ایران کے ایک گورنر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ایوب خان نے بہت جلد اسے باور کرا دیا کہ حضور! صرف نام کا فرق ہے آپ کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔چنانچہ ۹۔نومبر ۱۹۵۹ء کو موصوف خود بنفس نفیس ایران تشریف لے گئے اور تعلقات کی استواری کا یہ نتیجہ فوری طور پر سامنے آیا کہ ایران و پاکستان کی باہمی سرحد ایک معاہدے کے تحت معین ہو گئی یعنی جو رقبہ سکندر مرزا نے ایران کو عطا کیا تھا اس پر انہوں نے مہر تصدیق ثبت کر دی۔

ایوب خان کے طویل دور اقتدار میں ایران کے ساتھ "ہر قسم" کے تعلقات میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔جناب نذیر احمد صاحب لکھتے ہیں کہ!" صدر ایوب نے ۱۹۵۹ء میں ایران کا دورہ کیا۔شاہ ان کی شخصیت، ہمدردی اور خلوص سے بہت متاثر ہوا۔اس کے بعد انکے شخصی تعلقات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔یہاں تک کہ ولی عہد کی پیدائش پر عام ایرانی یہ کہتا پایا گیا کہ یہ جنرل ایوب کا بیٹا ہے"۔ (ایران افکار و مراسم صفحہ ۵۰)

ایوب خان بھی ۱۹۵۶ء کے اسلامی دستور کا مخالف تھا جسے سکندر مرزا نے منسوخ کر دیا تھا اور اس نے اس کی جگہ امور حکومت چلانے کے لیے ۱۹۶۲ء کا ایک دستور نافذ کر دیا۔ایوب خان نے کرسی صدارت سنبھالنے کے بعد ۱۹۵۸ء میں ایک غالی شیعہ جنرل محمد موسیٰ کو کمانڈر انچیف مقرر کر دیا خیر سے اس کی بیگم صاحبہ بھی ایران سے تعلق رکھتی تھیں۔یہ جنرل صاحب زندگی بھر پاکستان میں اقتدار کے مزے لوٹتے رہے۔فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد مغربی پاکستان کے گورنر اور پھر آخر میں بلوچستان کے گورنر رہے۔مرتے وقت وصیت کی کہ مجھے ایران میں اپنی بیوی کے پہلو میں دفن کیا جائے جب وہ فوت ہوئے تو انہیں پہلے "امانتاً" بلوچستان

میں دفن کیا گیا پھر تقریباً چالیس دن بعد ان کے تابوت کو ان کی وصیت کے مطابق ایران لے جا کر ان کی وصیت کے مطابق دفن کر دیا گیا۔

جنرل موسیٰ کے بعد ستمبر ۱۹۶۶ء میں صدر ایوب نے ایک دوسرے غالی شیعہ آغا یحییٰ خان کو تیرہ چودہ سینئر افسروں کو نظر انداز کر کے کمانڈر انچیف مقرر کر دیا۔ جب ایوب خان کے خلاف عوامی تحریک عروج پر پہنچی تو اس نے اقتدار یحییٰ خان کے حوالے کر دیا۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ یحییٰ خان نے ایوب خان کو پستول دکھا کر اقتدار چھین لیا تھا یہ خیال صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ ایوب اور یحییٰ دونوں میں آخر تک باہمی مفاہمت موجود تھی اور شاہ ایران کا مشورہ و اصرار بھی یہی تھا۔ اس طرح سکندر مرزا سے اقتدار چھیننے کی تلافی بھی ہو گئی اور بالآخر ایرانی سفیر جنرل پاکروان، جنرل موسیٰ گورنر مغربی پاکستان، جنرل یحییٰ خان اور ذوالفقار علی بھٹو کے گٹھ جوڑ کے نتیجے میں ایوب خان ایوان صدر سے رخصت ہوتے وقت اقتدار ایک دوسرے غالی رافضی شیعہ یحییٰ خان کے حوالے کر گیا۔ اس طرح اس نے اپنے ہی بنائے ہوئے آئین کو خود اپنے ہاتھوں اور اپنے قلم سے توڑ کر رکھ دیا۔

ایوب خان کے دور میں مشہور شیعہ عالم سید محمد دہلوی کی سربراہی میں جداگانہ شیعہ حقوق کے لیئے ملک بھر میں ایک مہم چلی تھی جس میں حکومت پاکستان سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ شیعہ بچوں کے لیئے تعلیمی تدریسی نصاب، اوقاف اور دیگر امور میں علحدہ انتظامات کیئے جائیں۔ اس کے جواب میں مولانا محمد علی جالندھری نے موچی دروازہ میں سنی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ شیعہ اجتماعی دھارے سے علیحدگی کا راستہ اختیار نہ کریں۔ عجیب بات ہے کہ قادیانیوں کو ہم الگ کرنا چاہتے ہیں مگر وہ الگ ہونے کو تیار نہیں ہیں اور تمہیں ہم ساتھ رکھنا چاہتے ہیں مگر تم علیحدگی کے لیئے بے تاب نظر آتے ہو۔ اس موقع پر مولانا جالندھری نے یہ بھی کہا تھا کہ علیحدگی صرف الفاظ کا نام نہیں اس کے کچھ منطقی نتائج بھی ہیں جو بہر حال قبول کرنا ہوں گے۔ اگر علحدگی چاہتے ہو تو صرف نصاب اور اوقاف تک محدود نہیں رہے گی بلکہ علحدگی کی یہ تقسیم زندگی کے ہر شعبے میں ہوگی پھر آبادی کا تناسب شمار ہوگا اور اسمبلیوں کی سیٹوں سے لے کر فوج اور سول ملازمتوں کے کونے تک ہر چیز تقسیم ہو جائے گی"۔ (بحوالہ ماہنامہ نصرت العلوم صفحہ ۶۰ مارچ ۱۹۹۸ء)

سید محمد دہلوی کی پریس کانفرنس میں شیعہ رہنما مظفر علی شمسی نے کہا "اگر حکومت میں

ایک شیعہ نمائندہ بھی ہو تو بہت سے مذہبی معاملات بخوبی طے پا جایا کریں۔" اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مدیر ہفت روزہ دعوت لاہور جناب ارشد رشیدی (یہ رسالہ اہلسنت کا ترجمان رسالہ تھا جو علامہ خالد محمود صاحب اور علامہ دوست محمد صاحب کی سرپرستی میں شائع ہوتا رہا ہے) بہ عنوان "خدا کے لیئے پاکستان پر رحم کرو۔ وزارتوں کا فیصلہ شیعہ سنی ناموں پر کرانا ایک خطرناک منصوبہ ہے۔"

لکھتے ہیں: "سواد اعظم اہلسنت کی رواداری! اہلسنت ملکی اور انتظامی معاملات کے ہمیشہ روادار رہے ہیں۔ سکندر مرزا کے دور اقتدار میں صاحب موصوف پر انتظامی اور سیاسی لے دے تو ہوتی رہی لیکن سواد اعظم اہلسنت نے اس پر کبھی احتجاج نہ کیا تھا کہ ایک ایسی اسلامی مملکت میں جس کا منہاج حکومت حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے نام سے پیش کیا گیا تھا مرکزی اقتدار ایک شیعہ کے پاس نہیں ہونا چاہیے۔ اہلسنت نے ایسا کبھی نہیں کہا اور نہ ان کی روایتی رواداری اس کی اجازت دیتی تھی۔ اس طرح جب مسٹر مظفر علی قزلباش وزیر اعلیٰ تھے تو ایسا تو بسا اوقات کہا جاتا تھا کہ صاحب موصوف پاکستان کے مخالف اور یونی نیسٹ پارٹی کے رکن رکین تھے ان سے پاکستان کی کسی بنیادی خیر خواہی کی توقع نہیں لیکن ایسا کبھی سننے میں نہیں آیا کہ اہل سنت کی اتنی عظیم اکثریتی آبادی میں ایک شیعہ وزیر اعلیٰ ہرگز مناسب نہیں۔ یہ اہلسنت کی تاریخی وسیع النظری کے وہ ناقابل انکار شواہد ہیں جن کے پیش نظر شیعہ حضرات کی روایتی تنگ نظری اور سیاسی اور انتظامی معاملات میں بھی شیعہ سنی امتیاز پیدا کرنے کی تعصب پرور کوششیں نہایت خطرناک انداز اختیار کرتی نظر آتی ہیں۔ جہاں تک مذہبی معاملات ہیں ان کا تعلق اسلامی مشاورتی کونسل سے ہے گورنر مغربی پاکستان کی وزارتی کابینہ سے نہیں۔ وزارتیں فرقہ وارانہ تصورات سے نہایت دور اور انتظامی اور سیاسی امور میں مصروف رہتی جائیں انہیں شیعہ سنی نقطہ نگاہ سے دیکھنا ملک و ملت کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ جہاں تک اسلامی مشاورتی کونسل کا تعلق ہے اس میں شیعہ حضرات کی نمائندگی پوری طرح موجود ہے۔ مولوی کفایت حسین صاحب اسلامی مشاورتی کونسل کے باقاعدہ رکن ہیں۔ ہم اپنے شیعہ بھائیوں سے بصد خلوص عرض کرتے ہیں کہ خدارا پاکستان پر رحم کرو۔ اسے فرقہ وارانہ تعصبات کی آماجگاہ نہ بناؤ۔ اہلسنت آپ کو ایک علیحدہ اقلیت نہیں بلکہ اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔ اسمبلیوں اور وزارتوں میں علیحدہ نمائندگی

کے سوالات صرف اقلیتوں میں اٹھتے ہیں۔ ہندو، عیسائی اور اچھوت علیحدہ نمائندگی کا مطالبہ کریں تو انہیں زیب دیتا ہے۔ شیعہ حضرات کے لیئے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ وہ ہندوؤں، عیسائیوں اور اچھوتوں کی طرح اپنے آپ کو ملت سے بالکل کٹا ہوا سمجھیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے مذہبی افکار اہلسنت سے اصولی طور پر مختلف ہیں۔ شیعہ حضرات کو وسیع تر ملی نظریات میں جناب راجہ غضنفر علی خان کے ہم خیال ہونا چاہیئے جنہوں نے حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی سے مطالبہ پاکستان کی حمایت حاصل کرتے ہوئے نہایت واضح الفاظ میں کہا تھا "ہم مسلمانوں کے لیئے ایسا علیحدہ خطہ مملکت چاہتے ہیں جہاں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے طرز حکومت کے مطابق عدل و انصاف کے تقاضے پورے ہوں اور جہاں ایک غریب بھی بھوکا نہ سوتا ہو"۔ ہمارے شیعہ بھائیوں کے تعصب اور فرقہ پرستی کے جذبات یہاں تک ختم ہو جائیں کہ وہ ملکی، انتظامی اور سیاسی معاملات کو اپنے مخصوص فرقے کے نام سے نہیں اسلام اور پاکستان کے وسیع تر عنوانات کے ساتھ سوچنے کی رب العزت سے توفیق پائیں۔"

(ہفت روزہ دعوت لاہور۔ ۲۳ مارچ ۱۹۶۴ء)

کاش مدیر "دعوت" شیعہ کے عقیدہ تقیہ کا کچھ مطالعہ کر لیتے۔ انہیں ۱۹۶۴ء میں راجہ غضنفر علی خان کا قیام پاکستان سے پہلے کا قول تو یاد آ گیا لیکن قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں راولپنڈی میں ان کا علانیہ یہ قول یاد نہ آیا کہ "وہ زمانہ لد گیا جب بخاری قرآن سنا سنا کر لوگوں کو الو بنایا کرتا تھا اب یہاں ان باتوں کی گنجائش نہیں"

اہلسنت "رواداری" کا مظاہرہ کرتے رہے جبکہ اہل تشیع تمام امور میں ہر قسم کی مصلحت سے بے نیاز ہو کر اپنے حقوق بزور حاصل کرتے رہے کیونکہ ان کا مقصد ہی پاکستان کو "شیعہ ریاست" میں تبدیل کرنا تھا۔ بہر حال ایوب خان کے بعد یحییٰ خان نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ ان کے کارہائے نمایاں ملاحظہ فرمائیں۔

صدر یحییٰ خان

آئین کے مطابق صدر کے مستعفی ہونے کی صورت میں اقتدار قومی اسمبلی کے سپیکر کو منتقل کیا جانا ضروری تھا مگر ایوب خان نے آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک غالی شیعہ یحییٰ خان کے سپرد کر دیا تا کہ جو شیعی اور ایرانی مشن ادھورا رہ گیا تھا وہ پایہ تکمیل کو پہنچ جائے۔

علاوہ ازیں اس وقت سپیکر کا تعلق مشرقی پاکستان کے ساتھ تھا اور اہل تشیع اس کے ہاتھ میں اقتدار برداشت نہیں کر سکتے تھے اس لیئے یحییٰ خان بحیثیت صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ملک کے اقتدار پر قابض ہو گیا۔

اس عیاش اور بدکار و بدکردار صدر نے ہر بات سے بے پرواہ ہو کر غیر محتاط انداز میں حکومت کا آغاز کیا۔ دوران اقتدار اس نے مرکزی شیعہ ہیڈکوارٹر ایران کے بار بار کے نجی دوروں میں اپنے مرتبے اور ملکی وقار کو بالائے طاق رکھ دیا۔ یحییٰ خان شاہ ایران کی ہدایات پر ایک وفادار غلام اور ایجنٹ کیطرح عمل پیرا تھا۔ عوامی دباؤ سے مجبور ہو کر اسے ۱۹۷۰ء میں عام انتخابات منعقد کرانے پڑے جس کے نتیجے میں پاکستان عوامی لیگ کو اکثریت حاصل ہوئی جبکہ مغربی پاکستان میں یحییٰ خان کی اعانت سے ایران کے چہیتے اور داماد ذوالفقار علی بھٹو نے اکثریت حاصل کی۔

قانون اور انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ اقتدار بلا تاخیر عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیا جاتا لیکن یحییٰ خان نے ایرانی آقاؤں کے ایماء پر ایک دوسرے شیعہ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ ساز باز کر کے شیخ مجیب الرحمٰن کو انتقال کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سے پہلے ایوب خان نے بھی اقتدار یحییٰ خان کے دباؤ کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے سپیکر کو منتقل کرنے سے انکار کیا تھا۔

۱۸ فروری ۱۹۷۱ء کو بھٹو نے کہا کہ آج ملک میں صرف تین طاقتیں ہیں۔ عوامی لیگ، پیپلز پارٹی اور فوج جس کے پاس ملک کی باگ ڈور ہے۔ ۲۸ فروری ۱۹۷۱ء کو اقبال پارک لاہور میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے بھٹو نے کہا کہ جو ارکان مغربی پاکستان سے اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیئے ڈھاکہ جائیں گے تو اس کی ذمہ داری خود ان پر عائد ہو گی۔ ہماری پارٹی کا اگر کوئی رکن ڈھاکہ گیا تو اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی اور جو لوگ ڈھاکہ جا رہے ہیں وہ ایک طرف کا ٹکٹ لے کر جائیں اور واپسی کا ٹکٹ نہ لیں اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے "اِدھر ہم اُدھر تم" کا نعرہ لگایا۔

چنانچہ یحییٰ خان نے بھٹو کے ساتھ طے شدہ منصوبے کے مطابق اسمبلی کا اجلاس غیر معینہ مدت کے لیئے ملتوی کر دیا جس سے مشرقی پاکستان کے عوام پر انتہائی منفی اثر پڑا اور وہ سخت مشتعل ہو گئے۔

یحییٰ خان نے اپنی نشری تقریر میں عوامی لیگ کی تمام سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرتے ہوئے فوجی کاروائی کا اعلان کر دیا۔ جس پر عمل درآمد کرتے ہوئے شیخ مجیب کو گرفتار کر لیا گیا اور گورنر ٹکا خان نے عوامی احتجاج کو طاقت سے کچلتے ہوئے لاکھوں بنگالیوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کیے۔ یہی جنرل ٹکا خان ریٹائرمنٹ کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو کر اقتدار کے حرے لوٹتے رہے۔ بہر حال ذوالفقار علی بھٹو واحد شخص تھا جس نے فوجی کاروائی کو صحیح قدم قرار دیا اور یحییٰ خان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ "شکر ہے کہ ملک بچ گیا" فوجی کاروائی کے دوران قوم پر مایوسی اور غم کے بادل چھائے ہوئے تھے اس سے بے نیاز ہو کر یحییٰ خان نے "یوم سارس" یعنی ایرانی شہنشاہیت کی ڈھائی ہزار سالہ تقریب منانے کے سلسلہ میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو قومی سطح پر عام تعطیل اور ملک بھر میں یوم سارس کی تقریب سرکاری طور پر منانے کا اعلان کیا۔ چنانچہ یوم سارس کی یہ تقریب ایران، اسرائیل اور پاکستان میں ایک ہی تاریخ کو سرکاری طور پر منائی گئی۔ لیکن یحییٰ خان بذات خود مرکزی سارس تقریب میں شرکت کرنے کے لیے تہران پہنچ گیا۔

تہران سے واپسی پر اس نے مشرقی پاکستان میں فوجی کاروائی تیز کر دی۔ یحییٰ خان نے یہ انتہائی اقدام اس لیے اٹھایا کہ اس یقینی ناکام فوجی کاروائی کے نتیجے میں مشرقی پاکستان الگ ہو جائے گا۔ فوجی کاروائی کی ناکامی اس لیے یقینی تھی کہ مشرقی پاکستان کی سرحدیں تینوں اطراف سے بھارت کے ساتھ ملتی تھیں چوتھی طرف خلیج بنگال میں بھارتی بحری بیڑے کا کنٹرول تھا۔ علاوہ ازیں مغربی پاکستان کے فوجی ہیڈ کوارٹر سے مشرقی بازو تقریباً بارہ سو میل دور واقع تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ کروڑوں عوام کے خلاف جنگی اور فوجی کاروائی کی کامیابی قطعاً ناممکن تھی۔ یحییٰ خان ایک فوجی ہونے کے ناطے ان تمام کمزوریوں اور عوامل سے پوری طرح آگاہ تھا۔

دوسری طرف بھارت نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ذوالفقار علی بھٹو نے طے شدہ منصوبے کے مطابق احمقانہ طور پر سلامتی کونسل کی دستاویزات کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستانی فوج نے جنرل نیازی کی قیادت میں بھارتی جنرل اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اس طرح یحییٰ بھٹو ایک خالص شیعہ ایرانی سازش کے نتیجے میں قائداعظم محمد علی جناح کا اسلامی جمہوریہ

پاکستان دس لاکھ مسلمانوں کے قتل عام کے بعد دو حصے میں تقسیم ہو گیا اور اس کا مشرقی بازو "بنگلہ دیش" کے نام سے دنیا کے نقشے پر نمودار ہو گیا۔ یہ اس عہد کا سب سے بڑا المیہ اور سانحہ تھا جس میں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کا نصف سے زیادہ حصہ کٹ گیا۔ بھٹو نے عوامی جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیئے اس سانحہ کی تحقیقات کے لیئے حمود الرحمن کی سربراہی میں ایک کمیشن مقرر کیا۔ جب اسے پچاس صفحات پر مشتمل رپورٹ کا خلاصہ برائے اشاعت دیا گیا تو وہ اسے شائع کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ حال ہی میں جنرل مشرف نے اسے شائع کر کے قومی مجرموں اور غداروں کے خلاف کاروائی نہ کرنے کا اعلان کیا اور قوم کو یہ عظیم المیہ بھول جانے کا مشورہ دیا۔ جبکہ جنرل مشرف مالی بے ضابطگیوں کے مرتکب افراد کے خلاف کاروائی میں بظاہر معروف ہیں۔ فیا للعجب

یحیٰی خان نے مشرقی پاکستان میں وہی کردار ادا کیا جو اس کے مورث اعلیٰ میر جعفر نے سراج الدولہ کے بنگال کے خلاف کیا تھا۔ دوسری طرف اس کے دور اقتدار میں قادیانی پوری طرح چھائے رہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کا پوتا ایم ایم احمد نہ صرف یحیٰی خان کا اقتصادی مشیر تھا بلکہ اس کی عدم موجودگی میں ملک کا سربراہ بھی مقرر کیا گیا۔ لیکن ایک غیرت مند مسلمان حافظ محمد اسلم نے اس پر حملہ کر کے اسے ایوان صدر کی بجائے ہسپتال میں پہنچا دیا۔

ذوالفقار علی بھٹو

سقوط ڈھاکہ کے چند دن بعد یحیٰی خان نے ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مغربی پاکستان کا اقتدار غیر قانونی طور پر بھٹو کے حوالے کر دیا۔ اس طرح بھٹو پاکستان کا صدر اور پہلا سول چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن گیا۔

بھٹو کو سکندر مرزا "زلفی" کے نام سے پکارتا تھا۔ اس نے اسے اپنی کابینہ میں وزیر تجارت مقرر کیا پھر وہ ایوب خان کی کابینہ میں وزیر خارجہ مقرر ہوا۔ سکندر مرزا، جنرل موسیٰ اور یحیٰی خان کی طرح بھٹو کا بھی ایران کے ساتھ بڑا گہرا روحانی، مذہبی اور قرابت داری کا تعلق قائم تھا۔ اسکی بیوی نصرت بھٹو کا تعلق بھی ایران سے تھا۔ اس لیئے یہ بھی سکندر مرزا اور یحیٰی خان کے ایجنڈے پر عمل پیرا رہا۔ بھٹو کے دور میں ہی قادیانیوں اور احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا کیونکہ قادیانیوں کے خلاف پیپلز پارٹی کے مسلمان کارکنوں سمیت پوری قوم متحد ہو گئی تھی اور بھٹو

کے لیئے اقتدار بچانے کی خاطر قومی اسمبلی سے یہ فیصلہ کرانا ناگزیر ہو گیا تھا۔

علاوہ ازیں قادیانیوں کو اسمبلی میں اپنا موقف پیش کرنے کی مکمل آزادی بھی دی گئی اور عدل و انصاف کے تمام تقاضے پورے کیئے گئے۔ بھٹو کے دور میں شیعہ طلباء کے لیئے علیحدہ دینیات کا دیرینہ مطالبہ پورا ہوا۔ اس طرح جناب بھٹو صاحب کو پاکستان میں باقاعدہ شیعہ سنی فرقہ واریت کی آگ بھڑکانے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ اس کے علاوہ ایران نے بھی اپنے داماد سے خوب مفادات حاصل کیئے۔

بھٹو ابتداء ہی سے تحریک شیعیت کا آلہ کار تھا اور اس کی منصوبہ بندی میں وہ یحیی اور سکندر مرزا کے نقش قدم پر گامزن تھا۔ شاہ ایران کی نظریں بلوچستان پر تھیں بلکہ اس نے اعلان بھی کر دیا تھا کہ اگر یہی حالات رہے تو وہ اس پر قبضہ کر کے اسے ایرانی قلمرو میں شامل کر لے گا۔ اس دھمکی کے باوجود بھٹو نے ایران کو پاکستان کا "برادر کبیر" کہہ کر شاہ ایران کی مدح سرائی شروع کر دی اور بلوچستان میں عوام کی منتخب حکومت کو ختم کر کے وہاں فوجی کاروائی شروع کر دی۔ اس طرح وہ بلوچستان کو بھی مشرقی پاکستان کی طرح اغیار کے لیئے لقمہ تر بنانے کے لیئے کوشاں رہا لیکن خوش قسمتی سے ایران کے اپنے اندرونی حالات ناسازگار ہو گئے اور بلوچستان دشمن کے چنگل سے بچ گیا۔ بالآخر بھٹو ساڑھے پانچ سال تک برسر اقتدار رہنے کے بعد ۴ اور ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی درمیانی شب کو جنرل محمد ضیاء الحق کے ہاتھوں اپنے اقتدار کا خاتمہ کرا بیٹھا۔ پھر ۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو قتل کے ایک مقدمے میں سزایاب ہو کر تختہ دار پر لٹک گیا۔

جنرل محمد ضیاء الحق

جنرل محمد ضیاء الحق نے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو بھٹو کا تختہ الٹ کر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے حکومت کی باگ دوڑ سنبھال لی اور آگے چل کر ۱۶ ستمبر ۱۹۷۸ء کو فضل الہی چودھری کے عہد صدارت کی میعاد ختم ہونے کے بعد کرسی صدارت پر بھی براجمان ہو گئے۔ ان کا طویل دور حکومت ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء تک قائم رہا۔

ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالنے کے بعد شاہ ایران کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیئے اسلام آباد کی ایک سڑک کا نام "رضا شاہ پہلوی ایوینیو" رکھ دیا۔ انہوں نے ۱۱۵ کتوبر ۱۹۷۷ء تک دو مرتبہ تہران کا دورہ کیا۔ اسی سال انہوں نے ولی عہد کی سالگرہ پر مبارکباد کا پیغام اور ایک فوجی

جینڈ تہران بھیجا۔ پھر ستمبر ۱۹۷۸ء میں سخت خلفشار اور بدامنی کے دور میں وہ ایران گئے اس طرح وہ خمینی کی نگاہ میں مبغوض ہو گئے۔ اسی دور میں ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء کو ایران میں خمینی کی قیادت میں ایک خالص شیعی انقلاب برپا ہو گیا یہ انقلاب اور نظریاتی حکومت خمینی کے انتقال کر جانے کے بعد بھی بدستور قائم چلی آ رہی ہے لیکن پاکستان میں اس دوران مختلف حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں۔ ان میں محمد خان جونیجو، بے نظیر بھٹو، نواز شریف (بے نظیر بھٹو اور نواز شریف دو دو مرتبہ برسر اقتدار آئے) اور جنرل پرویز مشرف کا عہد حکومت شامل ہے۔

قیام پاکستان سے لے کر بھٹو کے دور حکومت تک پاکستان اور ایران کے درمیان روابط و تعلقات کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جا چکا ہے۔ چونکہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں خمینی نے شاہ ایران کی حکومت کا تختہ الٹ کر ایک خالص کٹر مذہبی اثنا عشری شیعہ حکومت قائم کر دی تھی اس لیئے انہوں نے اپنا انقلاب دیگر ملکوں بالخصوص پاکستان میں برآمد کرنے کے لیئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ اس انقلابی حکومت کی پاکستان کے داخلی معاملات میں مسلسل مداخلت سے پاکستان ایران کا ایک ماتحت صوبہ معلوم ہوتا ہے۔

انقلاب کے شروع میں تہران کے ایک مشہور چوراہے پر دنیا کے تین مشہور سربراہوں کی قد آور تصاویر آویزاں کی گئیں جن پر بڑے حروف میں لکھا تھا "امریکی کتے" ان میں مصر کے انوار السادات اور عراق کے صدام حسین کے علاوہ پاکستان کے جنرل ضیاء الحق بھی تھے۔ ایران کو ضیاء الحق کے ساتھ اس لیئے بھی بغض تھا کہ اس نے بھٹو کو تختہ دار پر لٹکایا تھا۔ ایرانی وزیر خارجہ کریم سنجابی نے اس واقعہ پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ یہ پاکستان کے فوجی جرنیلوں کی غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ پاکستانی شیعوں نے بھی ردائے تقیہ اتار کر پھینک دی اور وہ یہاں پر بھی ایرانی حکومت کے تعاون سے شیعہ حکومت کے قیام کے خواب دیکھنے لگے۔

پاکستانی شیعہ ایرانی دولت اور انقلابی حکومت کی پشت پناہی کی وجہ سے اس قدر دلیر، جری، بے باک اور احسان فراموش ہو گئے تھے کہ وہ کسی چیز کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اس طبقہ نے شمالی و قبائلی علاقہ جات اور خیبر سے کراچی تک ایک طوفان بدتمیزی بپا کر رکھا تھا کیونکہ خمینی نے انہیں باقاعدہ تھپکی دے رکھی تھی۔

تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کا قیام

انقلاب ایران کے فوراً بعد جب ایک پاکستانی شیعہ وفد مبارک باد دینے کے لیئے ایران گیا تو خمینی نے اس کو اپنے حقوق حکومت پاکستان سے زبردستی چھین لینے کا حکم دیا اور انہیں یقین دلایا کہ "تمہارا امام تمہارے ساتھ ہے"۔ چنانچہ اس وفد نے واپس آ کر اپریل ۱۹۷۹ء (اسی مہینے میں بھٹو کو پھانسی دی گئی تھی) میں "تحریک نفاذ فقہ جعفریہ" کی بنیاد رکھ دی جو باقاعدہ ایران کی سرپرستی میں کام کر رہی ہے۔

اس تنظیم نے اپنے قیام کے ایک ہی سال بعد ایک ایسا "کارنامہ" انجام دیا جس نے ساری دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ ملک بھر کے شیعہ اسلام آباد میں جمع ہو گئے اور شیعہ افسران کی ملی بھگت سے انہوں نے وفاقی سیکرٹریٹ کا محاصرہ کر لیا بالآخر تین دن کے بعد فوجی حکومت نے اہل تشیع کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔

آغا مرتضیٰ پویا انقلاب ایران کے دوران خمینی کے ساتھ ساتھ رہے اور انہوں نے اسلام آباد سے مئی ۱۹۷۹ء میں انگریزی روزنامہ "مسلم" کا اجراء ان ہی کی خواہش کے تحت کیا۔ پاکستانی شیعوں کے حرکت میں آنے کے بعد ایک مشہور ایرانی اخبار "کیہان" نے اپنے طویل مضمون بہ عنوان "پاکستانی شیعوں پر ایرانی انقلاب کے اثرات" میں لکھا کہ "اس انقلاب نے پاکستان اور ان کے شمالی علاقوں کے شیعوں میں جان ڈال دی ہے اور ان کو اس حد تک فعال بنا دیا کہ وہ اب اپنے حقوق کے لیئے ہر قربانی دینے کے لیئے تیار ہیں" تحریک نفاذ فقہ جعفریہ نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ وہ پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب لانے کے لیئے اپنے کارکنوں کو ضروری تربیت دے رہی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ملک کے مختلف شہروں میں فرقہ وارانہ فسادات کرانے کے علاوہ بم دھماکے بھی کرائے جن میں بیسیوں مسلمان جام شہادت نوش کر گئے۔ پاکستان میں شیعہ بربریت اور سفاکی کی داستان ایک مستقل کتاب کی متقاضی ہے۔

پاکستان میں شیعوں کی آبادی زیادہ سے زیادہ اڑھائی فیصد ہے اس قدر اقلیت میں ہونے کے باوجود انہیں یہاں وہ اقتدار اور قوت حاصل ہے جس کا ایران میں اہلسنت چالیس فیصد ہونے کے باوجود تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اہل تشیع کی بالادستی کی چند وجوہات حسب ذیل ہیں

۱۔ ملکی انتظامیہ اور ارباب اقتدار میں اہل تشیع کو بے حساب اور ناجائز نمائندگی حاصل رہی ہے۔

۲۔ ابلاغ عامہ ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات و جرائد وغیرہ کا غالب ترین حصہ شیعوں کے زیر اثر ہے لہٰذا ان کا پورا زور شیعہ معتقدات و نظریات کی اشاعت و تشہیر پر صرف ہوتا ہے۔

۳۔ گذشتہ ترین سالوں کے دوران شیعہ ملکی دولت کے ایک بڑے حصے پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور اس کثیر دولت کو وہ مذہب شیعہ کے فروغ و ترویج میں صرف کر رہے ہیں۔

۴۔ حکومتوں کی بے حسی اور غفلت سے شیعوں کا دائرہ کار وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔

۵۔ سنی عوام کی غفلت اور انکے اکثر علماء کی مداہنت نے پاکستان میں شام جیسے حالات پیدا کر دیئے ہیں جہاں شیعہ اقلیت برسوں سے سنی اکثریت پر حکمرانی کر رہی ہے۔

۶۔ ایرانی سفارت خانہ اور نصف درجن سے زائد ایرانی ثقافتی مراکز (خانہ ہائے فرہنگ ایران) نے شیعیت کے فروغ اور اس کی ترویج کے لیئے تمام بین الاقوامی ضابطوں اور اخلاقی حدود و قیود کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پاکستان میں جو شیعہ تنظیمیں کام کر رہی ہیں ان میں سے صرف چند کے نام ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ تحریک جعفریہ ۲۔ تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان، ۳۔ انجمن جاں نثاران اہلبیت، ۴۔ انجمن غلامان پنجتن، ۵۔ امامیہ قرآت کمیٹی، ۶۔ شیعہ نماز کمیٹی، ۷۔ ادارہ درس عمل ۸۔ شیعہ محافل و مجالس کمیٹی، ۹۔ انجمن غلامان اہلبیت، ۱۰۔ انجمن غلامان بتول، ۱۱۔ تنظیم غلامان آل عمران (ابو طالب کا نام)، ۱۲۔ تنظیم غلامان سید الساجدین ۱۳۔ مرکزی تنظیم ماتمیان سید الشہداء ۱۴۔ انجمن سپاہ شہزادہ علی اکبر ۱۵۔ مجلس عمل علماء ۱۶۔ جمیعت علمائے امامیہ ۱۷۔ تنظیم الواعظین ۱۸۔ انجمن اثنا عشریہ ۱۹۔ مجلس تحقیق اسلامیہ ۲۰۔ امامیہ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن ۲۱۔ انجمن عسکریہ ۲۲۔ جمیعت طلباء جعفریہ ۔ ۲۳۔ انجمن سپاہ محمد ۲۴۔ امامیہ وکلائے پاکستان ۲۵۔ امامیہ ٹیچرز آرگنائزیشن پاکستان ۲۶۔ امامیہ ایمپلائز ویلفیئر آرگنائزیشن ۲۷۔ اصغریہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن ۲۸۔ پاکستان شیعہ فیڈریشن ۔ ۲۹۔ انجمن تحفظ حقوق شیعہ ۳۰۔ تحریک اخوت اسلام ۳۱۔ مختار فورس ۳۲ سپاہ اولیاء ۳۳۔ اہل ملیشیا۔ ۳۴۔ حسینی فورس ۳۵۔ شیعہ یوتھ فورس ۳۶۔ شورائے وحدت ۳۷۔ مرکز مطالعات اسلامی پاکستان وغیرہ۔

جنرل ضیاء الحق نے ۱۹۸۰ء میں جب زکوٰۃ اور عشر کا قانون نافذ کیا تو تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے قائد نے خمینی کی ہدایات کے مطابق ضیاء الحق پر دباؤ بڑھانے کی غرض سے اس

قانون کے خلاف باقاعدہ ایک منظم اور ملک گیر تحریک چلانے کا اعلان کیا۔ جس کے نتیجے میں گلی گلی۔ کوچہ کوچہ تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے دفاتر اور بینرز آویزاں نظر آنے لگے۔ جلسے جلوسوں اور بے ہنگم نعرہ بازی کا ایک نہ تھمنے والا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ بالآخر شیعہ لیڈروں نے اسلام آباد کی طرف لانگ مارچ کی کال دے دی اور پھر دارالحکومت اسلام آباد کو اپنے نرغے میں لیتے ہوئے سیکرٹریٹ کا گھیراؤ کر لیا جو تین دن تک جاری رہا۔ اس باغیانہ کاروائی کے سامنے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی سربراہی میں اپنے وقت کی مضبوط فوجی حکومت گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئی۔ چنانچہ دونوں فریقوں کے درمیان مذاکرات کے نتیجے میں "معاہدہ اسلام آباد" طے پا گیا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے

(روالپنڈی ۶ جولائی ۱۹۸۰ء صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی دعوت پر شیعہ رہنماء کے ایک وفد نے مفتی جعفر حسین کی قیادت میں آج سی ایم ایل اے سیکریٹریٹ میں صدر سے ملاقات کی۔ ان کے ہمراہ وفد کے دوسرے ارکان کے نام یہ تھے۔

ا۔ مولانا گلاب شاہ صاحب، ۲۔ مولانا سید صفدر حسین صاحب نجفی، ۳۔ لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) سید فدا حسین نقوی، ۴۔ سید شبیر حسین نقوی ایڈووکیٹ

شیعہ وفد کا نقطہ نظر سننے کے بعد صدر نے اپنی سابقہ یقین دہانی کو دہرایا کہ ملک کے ہر شہری کے مذہبی عقائد کا پورا احترام کیا جائے گا اور کسی ایک فرقہ کی فقہ دوسرے فرقے پر مسلط نہیں کی جائے گی۔ شیعہ لیڈروں کے خدشات رفع کرتے ہوئے صدر مملکت نے کہا کہ وہ اہل تشیع سے کئے گئے وعدے پر قائم ہیں اور وہ اسے اس کی روح و معانی کے مطابق عملی جامہ پہنانے کے لئے ضروری اقدامات کریں گے۔ صدر مملکت نے مزید کہا کہ اگر کوئی قانون ان کے اس وعدے کے منافی نافذ ہو چکا ہے۔ تو اس میں ضروری ترمیم کر دی جائے گی تاکہ وہ اہل تشیع کے لئے فقہ جعفریہ سے ہم آہنگ ہو جائے۔ انہوں نے یہ بھی یقین دلایا کہ مستقبل میں اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ ہر نئے قانون میں اہل تشیع کے لئے فقہ جعفریہ ملحوظ رہے۔ اس سلسلے میں ضروری قانون ۱۵ ستمبر ۱۹۸۰ء تک بنا دیا جائے گا۔ مفتی جعفر حسین نے صدر مملکت کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اپنے سابقہ وعدے کا اعادہ کیا۔ مفتی صاحب نے یہ بھی یقین دلایا کہ اسلام آباد میں جو اہل تشیع جمع ہوئے ہیں وہ انہیں مشورہ دیں گے۔ وہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔"

دستخط۔ مفتی جعفر حسین۔ دستخط محمود اے ہارون وزیر مذہبی امور

روزنامہ جنگ لاہور نے مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۸۳ء کے اداریہ میں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان کے قائد مفتی جعفر حسین کا ایک انٹرویو شائع کیا جس میں موصوف نے فرمایا "شیعہ سنی اختلافات طبعی ہیں ان کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ہاں زکوٰۃ مخصوص چیزوں پر عائد ہوتی ہے۔ جبکہ دوسری فقہ میں ایسا نہیں۔ زکوٰۃ کے طریق کار پر بھی ہمیں اختلاف ہے ہمارے اور اہل سنت والجماعت کے ہاں اصول یہ ہے کہ زکوٰۃ اموال ظاہر پر لی جاتی ہے اموال باطنہ پر نہیں روپیہ چونکہ اموال باطنہ میں شامل ہے لہٰذا حکومت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس پر زکوٰۃ لے"۔

مدیر نوائے وقت نے اپنے ۲۶ اگست ۱۹۸۳ء کے اداریے میں کہا کہ "جناب مفتی صاحب ہی کے ایماء پر جنرل ضیاء صاحب کی حکومت نے شیعہ حضرات کو فقہ جعفریہ کے مطابق زکوٰۃ اور عشر سے مستثنیٰ قرار دیا"۔

عشر کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مفتی جعفر حسین نے کہا کہ "حکومت صرف سرکاری زمین پر عشر لے سکتی ہے نجی ملکیت کی زمین پر حکومت کو عشر لینے کا کوئی حق نہیں ہے"

سکول میں اسلامیات کے نصاب کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ "یہ الگ ہونا چاہیے۔ شیعوں کیلئے شیعہ دینیات اور سنیوں کے لئے سنی دینیات۔ اگر دونوں کو ملا کر ایک کر دیا جائے تو وہ کبھی دینیات نہیں رہے گی۔ نہ سنی رہے گی نہ شیعہ کچھ بھی نہیں رہے گی"

جب ان سے کہا گیا کہ آیا اس سے پاکستانی بچوں کے اندر شروع ہی سے فرقہ وارانہ احساسات پیدا نہیں ہو جائیں گے۔ تو انہوں نے کہا۔ "شیعہ بچہ شیعہ ہے اور شیعہ ہی رہے گا۔ سنی بچہ سنی ہے اور وہ سنی ہی رہے گا"۔

انہیں بتایا گیا کہ ایک تجویز یہ ہے کہ ایک متفق علیہ فقہ مرتب کی جائے جسے فقہ پاکستان کہا جا سکتا ہے۔ اس پر آپ کی رائے کیا ہے؟ مفتی صاحب نے کہا کہ کوئی نئی فقہ مرتب نہیں کی جا سکتی اور ایسا کرنا نادانی ہوگی۔ یہ بے معنی تجویز ہے۔ عالم اجتہاد تو کر سکتے ہیں۔ لیکن بالکل نئی فقہ مرتب نہیں کی جا سکتی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ "مذہبی اداروں مثلاً اسلامی نظریاتی

کونسل، وفاقی شرعی عدالت، شریعت فیکلٹی وغیرہ میں جہاں اسلام کا کام ہوتا ہے اور قوانین کے لئے سفارش ہوتی ہے۔ وہاں ہم اپنا حصہ مانگتے ہیں۔" (روزنامہ جنگ ۶ جولائی ۱۹۸۳ء)

جنرل ضیاء الحق کے دور میں اہل تشیع ایرانی حکومت کی شہ پر پاکستان میں مسلسل اپنے "اسلاف" کے کارنامے دہراتے رہے اور اس دوران انہوں نے سینکڑوں مسلمانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کیے۔ سانحہ کوئٹہ ان کی سفاکی اور بربریت و بہیمیت کی واضح مثال ہے۔ اس کے ذکر سے پہلے یہ بات ذہن میں رہے کہ ہر حکومت اور خود مسلمانان اہلسنت والجماعت بھی اہل تشیع کی ناز برداری بلکہ ضد اور ہٹ دھرمی برداشت کرتے رہے حکمران ان کا ہمیشہ خیال رکھتے رہے۔ بالخصوص بھٹو کے دور حکومت میں انہیں بہت ہی زیادہ پذیرائی ملی۔ ان کی توقع کے خلاف ان کے معمولی مطالبے پر تعلیمی اداروں میں ان کے لئے شیعہ دینیات بطور نصاب منظور کر کے فرقہ واریت کا بیج بویا گیا۔ اس نصاب کے نفاذ سے ملک کی غالب ترین اکثریت اہلسنت والجماعت کو اڑھائی فیصد آبادی کے برابر لا کھڑا کر دیا گیا۔ اس نصاب دینیات کے ذریعے دو کلمے، دو اذانیں، دو تکبیریں، دو نمازیں اور دو عبادت گاہیں تسلیم کر لی گئیں جس سے تقسیم و تفریق کے نہ بند ہونے والے دروازے کھل گئے۔

تعلیمی اداروں میں دینیات کی وحدت دولخت ہونے کے بعد اس فرقہ کے حوصلے مزید بڑھے تو انہوں نے فقہ جعفریہ کے نفاذ کا صرف مطالبہ ہی نہیں کیا بلکہ اس کے لئے ایک خونی تحریک بھی شروع کر دی۔ جنرل ضیاء الحق نے جب زکوۃ و عشر کا قانون نافذ کیا تو اس دہشت گرد طبقے نے مارشل لاء کے ضابطوں کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے وفاقی سیکرٹریٹ پر قبضہ کر لیا اور اس وقت وہ وہاں سے چلے جب ان کا مطالبہ منظور کرتے ہوئے یہ حکم جاری کیا گیا کہ "اہل تشیع کے لئے جداگانہ زکوۃ آرڈیننس نافذ کر دیا گیا ہے۔"

اس طرح ایک ہی ملک میں دو اذانوں، دو کلموں اور دو دینیاتوں کی طرح زکوۃ کے بھی دو قانون تسلیم کر لئے گئے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ملکی قانون کے مطابق انہیں زکوۃ دینے سے تو مستثنیٰ کر دیا گیا۔ مگر ان کے زکوۃ لینے پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ اس طرح شیعوں کا حوصلہ بڑھتا رہا۔ اس کے بعد اہل تشیع کراچی میں آگ اور خون کی ہولی کھیلنے کے بعد بلوچستان کی طرف متوجہ ہوئے اور صوبائی دارالحکومت کوئٹہ کو اپنے نرغے میں لے لیا۔

۶ جولائی ۱۹۸۵ء کو کوئٹہ شہر میں اس فرقے کی طرف سے احتجاجی مظاہرے کا اعلان کیا گیا۔ جس میں ایرانی کمانڈوز اور پاسداران انقلاب کا ایک خصوصی دستہ بھی شامل ہوا۔ پولیس نے اس غیر قانونی مظاہرے کو روکنے اور اسے جلسہ واجتماع میں تبدیل کرنے کی درخواست کی تو ان غنڈوں نے ان پر فائر کھول دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے گولیوں کی بوچھاڑ میں لاشیں تڑپنے لگیں۔ کچھ باوردی پولیس والوں کو ذبح کر دیا گیا۔ ان کی لاشیں امام باڑوں اور کھمبوں پر لٹکا دی گئیں اور بعض لاشوں کے سروں کو فٹ بال کے طور پر کھیل کے لئے استعمال کیا گیا۔ بلوائیوں اور مفسدوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا اور قریب ہی ایک تعلیمی ادارے میں گھس کر نوجوان لڑکیوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے۔ انہیں ننگا نچایا گیا اور انہیں پولیس کے سامنے بطور ڈھال استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے دوکانوں اور بنکوں کو نذر آتش کرنا شروع کر دیا۔ ۶ جولائی کا دن اس علاقے کے لئے کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ سرکاری اطلاعات کے مطابق اس سانحے میں انتیس ۲۹ افراد لقمۂ اجل بن گئے۔

۹ جولائی کو اس گروہ اور حکومت کے درمیان دوبارہ شدید تصادم ہوا اور سارا کوئٹہ شہر فائرنگ کی آواز سے گونجتا رہا اور بالآخر فوج کو مداخلت کرنا پڑی اور ۹ جولائی کی شام کو کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ تلاشی کے دوران دس ٹرک سے زائد مقدار میں ایرانی اسلحہ برآمد ہوا اور بعض گھروں سے بھی ایک ایک ٹرک کی مقدار اسلحہ برآمد کیا گیا جو کمروں اور تہہ خانوں میں چھپا دیا گیا تھا۔

اس گروہ نے کچھ جنازے قبرستان لے جا کر دفن کیے۔ بعد میں جب انہیں شک کی بناء پر چیک کیا گیا تو وہ انسانی لاشوں کی بجائے گولہ بارود پر مشتمل آتشیں اسلحے کے ذخیرے تھے۔

اس فساد میں دوسو اکتیس ایرانی پکڑے گئے جو چھپ گئے یا فرار ہو گئے وہ اس تعداد کے علاوہ تھے۔ قانون اور انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ گرفتار کیے گئے ان ایرانی غنڈوں پر ملکی قانون کے مطابق مقدمہ چلا کر انہیں کیفر کردار تک پہنچایا جاتا لیکن خمینی کی محض ایک دھمکی پر ضیاء الحق کی "مضبوط" فوجی حکومت ایک بار پھر شیعہ جارحیت و بربریت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئی۔ اس "مضبوط ترین" فوجی حکومت میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ حکومت ایران سے اس ننگی جارحیت کے خلاف کوئی احتجاج کرتی۔ بلکہ اس کے برعکس پاکستانی حکام نے ان گرفتار شدگان دوسو اکتیس قاتلوں اور غنڈوں کو باعزت طور پر این ایل سی کے ٹرکوں میں لاد کر

انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات ظفر اللہ خان کی نگرانی میں تفتان میں ایرانی حکام کے حوالے کر دیا۔
کوئٹہ کے اس فساد کے دوران پولیس کے ہاتھوں کچھ شیعہ بھی "جام شہادت" نوش کر گئے تھے اس کے ردعمل میں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان نے ملک بھر میں احتجاج کی کال دے دی۔ روزنامہ جنگ کے مطابق تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان نے وفاقی حکومت کی نامزد کردہ سولہ رکنی کمیٹی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ تحریک کی سیاسی کمیٹی کے ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ اس کمیٹی کی تشکیل کا کوئی جواز نہیں کیونکہ اہل تشیع کے مطالبات بالکل واضح ہیں اور ان میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ اس کمیٹی نے کہا ہے کہ ملت جعفریہ کا مطالبہ ہے کہ حکومت ۶ جولائی ۱۹۸۰ء کے معاہدہ اسلام آباد پر عمل کرے۔ دریں اثنا تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان نے کوئٹہ کی صورت حال سے موثر طور پر عہدہ برآ ہونے کے لئے فوری طور پر ایک ایکشن کمیٹی تشکیل دے دی ہے۔ ایکشن کمیٹی کے ایک ترجمان نے اسلامیان پاکستان سے اپیل کی ہے کہ وہ ۱۹ جولائی کو ملک بھر میں منعقد ہونے والے تعزیتی اور احتجاجی مجالس میں بھاری تعداد میں شریک ہو کر شہدائے کوئٹہ کو عملاً خراج تحسین پیش کریں۔ تحریک کی لاہور شاخ کے پریس ریلیز کے مطابق آج سہ پہر چار بجے کربلا گامے شاہ میں ایک تعزیتی و احتجاجی تقریب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ (بحوالہ مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی صفحہ ۸۳)

کوئٹہ کے علاوہ اہل تشیع نے کراچی کو بھی نشانہ بنایا۔ اس منصوبے میں انہیں ایرانیوں کی جانی و مالی بھرپور مدد حاصل تھی۔ لاکھوں کی تعداد میں ایرانی "غیر قانونی" طور پر پاکستان میں داخل ہو گئے جس کا اعتراف محمد خان جونیجو حکومت کے وزیر داخلہ نے اسمبلی میں کیا تھا۔ ایرانی مداخلت اس قدر بڑھی کہ وہ اہل تشیع کے مظاہروں اور دھرنوں میں اپنے سفارت خانہ کے عملہ کے ہمراہ شریک ہونے لگے۔

کراچی میں گودھرا کیمپ میں شیعوں نے قرآن جلایا اور پھر خود ہی تین دن تک بند روڈ پر دھرنا دے کر بیٹھ گئے۔ جس کے نتیجے میں بے حس حکومت نے ایک دفعہ پھر ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے جس پر کراچی کے مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا۔ پھر بشریٰ زیدی کیس میں شیعوں نے پورے کراچی میں جس طرح آگ لگائی وہ ریکارڈ بھی محفوظ ہے۔ کراچی میں شیعوں کی اس بڑھتی ہوئی جارحیت کے خلاف مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے اور شیعوں کے ناپاک عزائم خاک میں ملانے کے لئے انہوں نے تحریک چلائی جب شیعوں کو شکست و موت سامنے نظر آنے

گئی تو انہوں نے دوسری چال چلی اور مسلمانوں کو آپس میں مہاجر پٹھان، مہاجر پنجابی اور اس طرح کے قومی اور لسانی جھگڑوں میں الجھا دیا۔ اس وقت کے اخبارات کے فائل گواہ ہیں کہ ان ہنگامہ آرائی کرنے والوں میں جعفری، رضوی اور بوترابی قسم کے لوگ شامل تھے۔

اسلحہ کی حمل ونقل میں باقاعدہ ایرانی ملوث پائے گئے ہیں۔ اس ہنگامہ آرائی سے ان کا بڑا مقصد ہمیشہ کی طرح مسلمانوں کی قوت و طاقت اور ان کی مرکزیت و اجتماعیت کو ختم کرنا تھا۔ اس طوفان بدتمیزی کے دوران انہوں نے مدارس و مساجد کو بھی اپنی تخریب کاری کا نشانہ بنایا۔ ان پر حملے کئے گئے اور انہیں نذر آتش بھی کیا گیا۔

ان مدارس میں جامعۃ العلوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن ان کا اہم ہدف تھا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے جامعہ علوم اسلامیہ کے قریب مارٹن کوارٹرز (جہاں کی اکثر آبادی سنی ہے) میں ایک چھوٹے سے امام باڑے "شاہ نجف" کو خصوصی اہمیت دی اور اسے اسلحہ ڈپو میں تبدیل کر دیا گیا۔ شیعہ قیادت نے کراچی کے تمام غنڈوں اور غالی شیعوں کو وہاں سے برآمد ہونے والے جلوس میں شرکت کا لازمی حکم جاری کیا جنہوں نے جامعہ کے سامنے سے گزرتے وقت اشتعال پیدا کرنے کے لئے "لعنت برابوبکر"، "لعنت برعمر" کے نعرے بلند کئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہاں ہنگامہ آرائی بھی کی۔ اردگرد کی دوکانوں کو لوٹ کر املاک کو شدید نقصان پہنچایا۔ پولیس نے بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا اور طلباء و اساتذہ جامعہ کے اندر بھی ریاستی دہشت گردی سے محفوظ نہ رہ سکے۔

جامعہ کی انتظامیہ نے حکومت وقت سے بہت درخواستیں کیں لیکن حکومت حسب سابق ٹس سے مس نہ ہوئی بالآخر وہ وقت بھی آیا کہ جامعہ کے درویش صفت مہتمم جناب مفتی احمد الرحمٰن صاحب اپنے رفقاء کے ہمراہ پولیس اور فوج کے سخت محاصرے کے باوجود اس جلوس کو روکنے کے لئے تمام رکاوٹوں کو توڑتے ہوئے سڑک پر آگئے اور للکار کر کہا کہ جلوس کا راستہ تبدیل کرو۔ بریگیڈیئر ذوالفقار نے پستول تانتے ہوئے کہا کہ یہاں لاشیں گر جائیں گی۔ آپ ہٹ جائیں ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔ مفتی صاحب مرحوم اپنے رفقاء کے ہمراہ لائن بنا کر کلمہ کا ورد کرتے ہوئے سینے نکال کر کھڑے ہو گئے۔ پھر انتظامیہ انہیں گرفتار کر کے لے گئی۔ طلباء کو چھتوں سے اتار کر فوج نے قبضہ کر لیا اور یوں اپنی نگرانی میں فوج نے اس جلوس کو گذار کرایا

"قومی اور مذہبی" فریضہ ادا کیا۔

سپاہ صحابہؓ پاکستان کی بنیاد

اہل تشیع نے ملک میں لوٹ مار، دنگا وفساد اور قتل وغارت کے علاوہ توہین صحابہؓ پر مبنی لٹریچر بھی کثیر تعداد میں ملک کے طول وعرض میں پھیلا دیا۔ جب حکومت وقت بھی اس ننگی شیعی جارحیت وبربریت کے سامنے بالکل بے بس ولاچار ہوگئی تو علماء اہلسنت نے شیعیت کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے بند باندھنے کے لیے ۱۴ اگست ۱۹۸۵ء کو جامعہ اسلامیہ راولپنڈی صدر میں ایک "سنی کنونشن" کے انعقاد کا اعلان کر دیا جس میں مولانا سمیع الحق صاحب، مولانا اسفندیار خان صاحب، مولانا عبدالستار تونسوی صاحب اور مولانا حق نواز جھنگوی سمیت ملک بھر کے جید اور ممتاز علمائے کرام نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ راقم الحروف کو بھی اس کنونشن میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

اس کنونشن کے انعقاد کے ایک ماہ بعد امیر عزیمت مولانا حق نواز جھنگوی نے ناموس صحابہ واہلبیتؓ کے تحفظ اور اس ننگی شیعی جارحیت وبربریت کو روکنے کی خاطر ۲۰ ذی الحج ۱۴۰۵ھ مطابق ۶ ستمبر ۱۹۸۵ء بروز جمعۃ المبارک جامع مسجد پیپلیانوالی جھنگ صدر (جواب مسجد حق نواز شہید کے نام سے موسوم ہے) میں چند نوجوانوں پر مشتمل "سپاہ صحابہؓ پاکستان" کی بنیاد رکھ دی۔ پھر انہوں نے اسے ملک گیر بنانے اور اس کا مؤقف ملک کے کونے کونے تک پہنچانے کے لئے ۱۰ جنوری ۱۹۸۶ء مطابق ۲۸ ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ بروز جمعۃ المبارک "آل پاکستان دفاع صحابہؓ کانفرنس" کے انعقاد کا اعلان کیا جو بعد میں ہندوستان میں "شیخ الہند" سیمینار کی وجہ سے ملتوی ہوگئی پھر ۷ فروری ۱۹۸۶ء مطابق ۲۶ جمادی الثانیہ ۱۴۰۶ھ (بروز جمعۃ المبارک) اس کانفرنس کی نئی تاریخ مقرر ہوئی۔ راقم الحروف نے مولانا حق نواز جھنگوی کی خصوصی دعوت پر اپنے رفقاء مولانا الطاف الرحمٰن صاحب اور پروفیسر سید افسر علی شاہ صاحب کی معیت میں اس کانفرنس میں شرکت کی۔

شہید ملت اسلامیہ مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی نے اس کانفرنس کی تاریخ ۱۰ فروری ۱۹۸۶ء تحریر کی ہے۔ ملاحظہ ہو خلافت راشدہ سپاہ صحابہ نمبر ص ۲۹، ستمبر ۱۹۹۶ء، اسی خصوصی اشاعت کے اداریہ میں صفحہ ۵ پر بھی یہی تاریخ درج ہے۔ حضرت فاروقی کی شہادت کے بعد فاروقی شہید اکیڈمی کی طرف سے ایک کتابچہ بعنوان "فاروقی شہید کا پیغام سپاہ صحابہؓ کے نام"

شائع کیا گیا اس کے صفحہ ۱۵ پر بھی ۱۰ فروری کی تاریخ لکھی گئی ہے۔ حیات اعظم طارق صفحہ ۶۲ پر بھی کانفرنس کی یہی تاریخ درج ہے۔ جو خلاف واقعہ ہے۔ یہاں محض ریکارڈ کی درستگی کے لئے اس کی وضاحت ضروری سمجھی گئی۔

اس کانفرنس میں مولانا خان محمد صاحب، مولانا حافظ غلام حبیب نقشبندی صاحب، مولانا فضل الرحمن صاحب (جمعیت علمائے اسلام)، مولانا فداء الرحمن درخواستی صاحب، مولانا عبدالستار تونسوی صاحب، مولانا ضیاء القاسمی صاحب، مولانا عبدالغفور حقانی صاحب اور مولانا ضیاء الرحمن فاروقی صاحب (جو شرکاء کانفرنس کے سخت دباؤ اور مطالبہ کی وجہ سے اسی دن عدالتی تعطیل کے باوجود رہا کئے گئے) کے علاوہ سینکڑوں علماء نے شرکت کی جبکہ عوام اہلسنت کی تعداد ایک لاکھ سے بھی متجاوز تھی۔ اس کانفرنس میں مولانا عبدالستار تونسوی نے مولانا حق نواز جھنگوی کو "شیر اسلام" کا لقب دینے کے علاوہ خمینی کو مناظرے کا چیلنج بھی دیا اور حکومت سے درخواست کی کہ اگر وہ پاکستان نہیں آسکتے تو پھر مجھے ایران بھجوا دیا جائے۔

اس کانفرنس کے اثرات پورے ملک میں مرتب ہوئے اور مختلف مقامات پر سپاہ صحابہؓ کے یونٹ قائم ہونا شروع ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں سپاہ صحابہؓ نے ایرانی انقلاب اور خمینی افکار و نظریات کے سامنے ایسا مضبوط بند باندھ دیا جس میں شگاف ڈالنا دنیائے شیعیت کے بس میں نہیں رہا۔ امیر عزیمت مولانا حق نواز جھنگوی نے اپنی تمام خداداد صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے جارح شیعہ کو ایک دفعہ پھر "دفاعی حکمت عملی" اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ کہ سپاہ صحابہؓ کا قیام ایرانی انقلاب اور شیعی جارحیت کے خلاف ایک غیرت مندانہ، جرأت مندانہ اور مؤمنانہ ردعمل کا نام ہے۔ چنانچہ مولانا زاہد الراشدی صاحب لکھتے ہیں:

"ہمیں سپاہ صحابہؓ کے طریق کار سے کبھی اتفاق نہیں رہا اور ہر موقع پر ہم نے اس کا برملا اظہار کیا ہے حتیٰ کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم نے کئی سال قبل سپاہ صحابہؓ کے راہنماؤں کے نام مطبوعہ مکتوب میں شدت پسندانہ طرز عمل کو نقصان دہ قرار دیتے ہوئے انہیں اس پر نظر ثانی کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سپاہ صحابہؓ پاکستان ایک ردعمل کا نام ہے جو جداگانہ شیعہ تشخص کی مسلسل محنت کے نتیجے میں

نمودار ہوا اور جسے فطری طور پر کسی نہ کسی شکل میں بہرحال سامنے آنا ہی تھا۔"

(ماہنامہ نصرۃ العلوم صفحہ ۶، مارچ ۱۹۹۸ء)

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ "شدت پسندانہ طرز عمل" بھی اگر کہیں نظر آتا ہے تو وہ بھی صرف ردعمل اور دینی غیرت وحمیت کا ہی مظہر ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا زاہد الراشدی صاحب اپنا وہ بیان بھول گئے جو انہوں نے ۱۱ جنوری ۱۹۸۸ء کو فلیٹیز ہوٹل لاہور میں "قومی سنی کنونشن" کے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ "نہ صرف پاکستان بلکہ جنوبی ایشیا اور مشرق وسطیٰ کی تمام مسلم ریاستوں کو ایرانی دہشت گردی کا سامنا ہے اور اس کے سدباب کے لیے مشترکہ جدوجہد وقت کا اہم تقاضا ہے۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور صفحہ ۱۰، ۲۲ جنوری ۱۹۸۸ء)

کاش موصوف اس مسلح دہشت گردی کے سدباب کا کوئی طریقہ بھی تجویز فرما دیتے۔

اہل تشیع سپاہ صحابہؓ کے مؤقف کو بدلائل رد کرنے کی ہمت تو نہیں کر سکتے تھے اس لئے وہ اپنے "اسلاف" کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پرانے ہتھکنڈے استعمال کرنے پر اتر آئے۔ امیر عزیمت کو مختلف جعلی مقدمات میں الجھا دیا گیا۔ جن کے نتیجے میں وہ گرفتار ہو کر پابند سلاسل ہو گئے۔ ان کی رہائی اور مقدمات کے خاتمہ کے لئے مولانا خان محمد صاحب نے ۱۱ جولائی ۱۹۸۷ء کو ملتان میں "سنی کنونشن" کے انعقاد کا اعلان کیا جس میں تمام اہم دینی جماعتوں کے نمائندے شریک ہوئے اور مشترکہ جدوجہد کے لئے ایک "سنی کمیٹی" قائم کر دی گئی۔ دوسری طرف شیعہ کی جارحیت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ ان کشیدہ حالات میں جمعیت علمائے اسلام متحرک ہو گئی اور اس نے ۱۰، ۱۱ جنوری ۱۹۸۸ء کو لاہور میں "قومی سنی کنونشن" طلب کر لیا۔ راقم الحروف بھی والد محترم مولانا قاضی چمن پیر الہاشمیؒ کی معیت میں اس کنونشن میں شریک ہوا جس کی مکمل روئیداد ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور میں شائع ہوئی جو حسب ذیل ہے۔

ملک میں اہلسنت کے خلاف فرقہ وارانہ دہشت گردی، علمائے اہلسنت کے خلاف جھوٹے مقدمات اور گرفتاریوں اور مختلف شہروں میں ایک درجن سے زائد سنی کارکنوں کی المناک شہادت سے پیدا شدہ صورت حال پر غور کرنے کے لئے جمعیت علمائے اسلام پاکستان کی دعوت پر ۱۰، ۱۱ جنوری ۱۹۸۸ء کو لاہور میں "قومی سنی کنونشن" منعقد ہوا جس میں ملک کی اہم

دینی تنظیموں اور سرکردہ شخصیات نے شرکت فرمائی۔ کنونشن میں شریک ہونے والی جماعتوں کے نمائندوں اور دیگر شخصیات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

جمعیت علمائے اسلام پاکستان: حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی، حضرت مولانا محمد اجمل خان، حضرت مولانا سمیع الحق، مولانا میاں محمد اجمل قادری، مولانا زاہد الراشدی، مولانا فداء الرحمٰن درخواستی، مولانا علاؤالدین، مولانا قاضی عبدالطیف، مولانا بشیر احمد شاد، مولانا حمید اللہ خان، مولانا سیف الرحمٰن ارائیں، علامہ ڈاکٹر خالد محمود۔ سواد اعظم اہلسنت پاکستان: حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن، حضرت مولانا سلیم اللہ خان، حضرت مولانا اسفندیار خان، مولانا محمد جمیل خان جمعیت اشاعت التوحید والسنۃ پاکستان، حضرت مولانا قاضی احسان الحق، حضرت مولانا قاضی عصمت اللہ، مولانا حافظ محمد صدیق، تنظیم اہلسنت پاکستان: حضرت مولانا عبدالستار تونسوی، مولانا قاضی عبدالطیف شجاع آبادی، مولانا محمد اسماعیل۔ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت: مولانا عزیز الرحمٰن جالندھری، مولانا نذیر احمد بلوچ، مولانا محمد اشرف ہمدانی، مولانا ضیاء الدین آزاد مجلس تحفظ حقوق اہلسنت پاکستان مولانا عبدالحی جام پوری، مولانا سید عبدالمجید ندیم، مولانا عبدالباقی تحریک خدام اہلسنت پاکستان مولانا مفتی محمد شریف عابد، حافظ عبدالوحید حنفی، مولانا شیر محمد، مولانا حافظ محمد طیب، انجمن سپاہ صحابہؓ پاکستان: مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی، قاری ایثار احمد قاسمی، قاری محمد منور آل جموں و کشمیر جمعیت علمائے اسلام: مولانا قاری سعید الرحمٰن تنویر، مولانا مفتی محمد یونس میر پوری، مولانا مفتی عبدالشکور کشمیری، انجمن اتحاد قبائل اہل سنت کوہاٹ مولانا شیر محمد، حاجی جاوید ابراہیم پراچہ، کرنل سلطان علی شاہ، میجر حکم خان، مجلس علمائے اہلسنت پاکستان، مولانا عبدالحق مجاہد اور ان کے رفقاء مرکزی تحریک احیائے سنت پاکستان، جناب غلام رسول، مولانا محمد نواز بلوچ، جمعیت طلباء اسلام پاکستان، میاں انور علی دہلوی، خالد محمود ڈو، محمد اکبر، حافظ سمیع اللہ، ممتاز شخصیات، مولانا محمد ضیاء القاسمی، مولانا قاضی چمن پیر الہاشمی حویلیاں (راقم الحروف کے والد ماجد) مولانا عبدالمجید کہروڑپکا، مولانا محمد حنیف جالندھری ملتان، قاری نور الحق قریشی ایڈووکیٹ، مولانا مفتی محمد انور شاہ ملتان، میاں محمد عارف ایڈووکیٹ گوجرانوالہ۔

ان سرکردہ شخصیات کے علاوہ ملک کے چاروں صوبوں اور آزاد کشمیر سے کم و بیش تین سو سے زائد حضرات نے "قومی سنی کنونشن" میں شرکت کی۔

سربراہی اجلاس: پروگرام کے مطابق ۱۰ جنوری کو بعد نماز عشاء مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ گیٹ لاہور میں کنونشن میں شرکت کرنے والے سربراہوں کا اجلاس حضرت مولانا محمد اجمل خان نائب امیر اول جمعیت علمائے اسلام پاکستان کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ جس میں طویل بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ اس سلسلہ میں پہلے سے قائم شدہ "متحدہ سنی محاذ پاکستان" کو از سر نو منظم و متحرک بنایا جائے اور ملک کی ممتاز علمی شخصیت مولانا مفتی احمد الرحمٰن صاحب مہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کو اس کا امیر مقرر کیا جائے۔

حضرت نے مسلسل انکار اور معذرت کے بعد بالآخر ہاؤس کے اس متفقہ فیصلہ کو قبول فرمالیا۔

قراردادیں: متحدہ سنی محاذ پاکستان کے ڈپٹی رابطہ سیکریٹری مولانا محمد حنیف جالندھری نے کنونشن میں قراردادیں پیش کیں جنہیں متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔ قراردادوں کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

۱۔ محرم الحرام اور صفر کے دوران بدامنی اور فساد کا باعث بننے والے جلوسوں پر مکمل پابندی عائد کی جائے۔

۲۔ چونکہ شیعہ حکومت کو زکوٰۃ نہیں دیتے اس لئے زکوٰۃ عشر کمیٹیوں اور متعلقہ محکموں سے شیعہ ارکان و افسران کو فی الفور الگ کیا جائے اور جب وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تو شیعہ اداروں اور افراد کو بھی زکوٰۃ نہ دی جائے بالخصوص شیعہ ادارہ فاطمیہ ٹرسٹ کے لئے زکوٰۃ فنڈ سے مخصوص کی گئی ایک کروڑ روپے کی امداد منسوخ کیجائے۔

۳۔ اعلیٰ ملازمتوں اور کلیدی اسامیوں میں شیعہ ملازمین کو ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق جگہ دی جائے۔

۴۔ زکوٰۃ و عشر کی جگہ شیعہ آبادی پر متبادل ٹیکس عائد کیا جائے

۵۔ صحابہ کرامؓ کی توہین اور تنقید پر مشتمل لٹریچر ضبط کر کے مولفین، مترجمین اور ناشرین کے خلاف کاروائی کی جائے اور تحفظ ناموس صحابہ و اہلبیتؓ آرڈیننس کو مؤثر طور پر نافذ کیا جائے۔

۶۔ قرآن کریم کی حفاظت اور اشاعت کی کمیٹیوں سے شیعہ ارکان کو الگ کیا جائے۔

۷۔ عالم اسلام، ایرانی عازمین حج کی طرف سے حرمین شریفین میں خون ریزی اور بدامنی کی کاروائیوں کا نوٹس لے اور حرمین شریفین میں فسادیوں کا داخلہ ممنوع قرار دیا جائے۔

۸۔ بنوری ٹاؤن کراچی، رحیم یار خان، خیرپور ٹامیوالی، جھنگ، فیصل آباد، چکوال،

حویلیاں، اٹک، کوہاٹ، پاراچنار، ڈیرہ کوٹلہ، لیہ، اوکی ضلع سیالکوٹ اور دیگر مقامات پر اہلسنت کے علماء اور کارکنوں کے خلاف وحشیانہ تشدد اور انتظامیہ کے جانب دارانہ طرز عمل کے بارے میں ہائی کورٹ کے جج کے ذریعے عدالتی تحقیقات کرائی جائے اور علماء اور کارکنوں کے خلاف جھوٹے مقدمات واپس لئے جائیں۔ بالخصوص مولانا حق نواز جھنگوی، حاکم علی، محمد یوسف مجاہد، طارق افضال، اور دیگر اسیر رہنماؤں کو فی الفور رہا کیا جائے۔ اور ان کے خلاف جھوٹے مقدمات درج کرنے والے افسران کے خلاف کاروائی کی جائے۔

۹۔ قیام پاکستان کے بنیادی مقصد کی تکمیل اور نفاذ اسلام کے لئے ملک کی اکثریتی سنی آبادی کے حقوق کا تحفظ کرتے ہوئے فقہ حنفی کو بطور واحد پبلک لا نافذ کر کے جمہوری اصولوں کا احترام کیا جائے۔

۱۰۔ انجمن سپاہ صحابہؓ کے مرکزی راہنما مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی کو سمندری کی جامع مسجد کی خطابت سے معطل کرنے کے سلسلہ میں محکمہ اوقاف کی کاروائی معاندانہ ہے اسے فی الفور واپس لیا جائے۔

شرکاء کے اعزاز میں استقبالیہ: ۱۱ جنوری کو شام چار بجے فلیٹیز ہوٹل لاہور میں حضرت مولانا محمد اجمل خان لاہور اور حضرت مولانا میاں محمد اجمل قادری کی طرف سے "قومی سنی کونشن" کے شرکاء کے اعزاز میں استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا جس میں علماء اور کارکنوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

استقبالیہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے متحدہ سنی محاذ کے سرپرست مولانا عبدالستار تونسوی نے کہا کہ ہمارا مقصد کسی کے مذہب پر حملہ آور ہونا نہیں بلکہ اپنے مذہب کا دفاع ہے جو ہمارا جائز حق ہے۔

محاذ کے نومنتخب امیر مولانا مفتی احمد الرحمٰن نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم اپنے جائز حقوق مانگ رہے ہیں اور کسی قسم کا تشدد نہیں کرنا چاہتے۔ تشدد ہمارے خلاف ہو رہا ہے جسے حکومت کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اس لئے اگر حکومت نے روش تبدیل نہ کی تو حالات کی ذمہ داری اس پر ہوگی۔

متحدہ سنی محاذ کے رابطہ سیکریٹری مولانا زاہد الراشدی نے استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ شیعہ جارحیت کا مسئلہ اب فرقہ وارانہ مسئلہ نہیں رہا بلکہ خالص سیاسی مسئلہ بن گیا

ہے۔ کیونکہ ایرانی انقلاب کے بعد ایران کی مذہبی قیادت اردگرد کے ممالک میں شیعہ اقلیت کو منظم و مسلح کر کے ہنگامے کروا رہی ہے اور ایرانی انقلاب کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے تشدد اور دہشت گردی کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا نہ صرف پاکستان بلکہ جنوبی ایشیا اور مشرق وسطی کی تمام مسلم ریاستوں کو ایرانی دہشت گردی کا سامنا ہے اور اس کے سد باب کے لئے مشترکہ جدوجہد وقت کا اہم تقاضا ہے۔

میاں محمد اجمل قادری نے استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اہلسنت کے حقوق و مفادات کو مجروح کرنے کے لئے ایک عرصہ سے جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ عالمی استعماری قوتیں اس خطہ میں اسلام کی بالادستی کو روکنا چاہتی ہیں اور اس مقصد کے لئے اس قسم کے فتنے کھڑے کئے جا رہے ہیں۔

مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی جماعت اور مجلس احرار اسلام کے سواد یوبندی کہلانے والے تمام معروف حلقے اور جماعتیں کونشن میں شریک ہو کر "متحدہ سنی محاذ" کے پلیٹ فارم پر متحد ہو گئی ہیں۔ جہاں تک مجلس احرار اسلام کا تعلق ہے اس کی عدم شرکت کو ہم کسی اختلاف کے حوالے سے نہیں دیکھتے کیونکہ مجلس احرار اسلام پہلے سے "متحدہ سنی محاذ" کا حصہ ہونے کی حیثیت سے اس جدوجہد میں مکمل طور پر شریک ہے اور آئندہ بھی وہ انشاء اللہ بھرپور کردار ادا کرے گی البتہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنے رویہ پر نظر ثانی فرمائیں۔ یہ درست ہے کہ ان کی سیاسی اڑان بہت اونچی ہے اور ہم اختلافی امور سے قطع نظر ان کے لئے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اڑان کو اور زیادہ بلندیوں سے آشنا کرے لیکن دینی و مسلکی تقاضوں کو نظر انداز کر دینا کسی طور پر بھی ان کے لئے مناسب نہیں ہے۔ ہمارے اکابر و اسلاف نے ہمیشہ قومی سیاست اور دینی مقاصد کے درمیان توازن قائم رکھا ہے اور آج بھی حالات کا تقاضا یہی ہے۔ "قومی سنی کونشن" کے انعقاد یا "متحدہ سنی محاذ" کو از سر نو متحرک اور فعال بنانے کا مقصد اہل سنت کے ساتھ ہونے والی مسلسل زیادتیوں اور فرقہ وارانہ دہشت گردی کا سد باب ہے اور اس مشن میں ہم حضرت مولانا فضل الرحمٰن اور ان کے رفقاء کے تعاون کے اب بھی خواستگار ہیں۔ امید ہے کہ وہ اس سلسلہ میں "متحدہ سنی محاذ" اور ملک کے دینی و مسلکی حلقوں کو مایوس نہیں کریں گے۔ (ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور صفحہ ۲، ۲۲ جنوری ۱۹۸۸ء)

قومی سنی کنونشن کی اس مفصل روئیداد سے اس وقت کے حالات کی سنگینی کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دین و مسلک کا درد رکھنے والے تمام دیوبندی حلقے باہمی سیاسی اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے کس طرح ملک کے کونے کونے سے ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مشکل کی اس گھڑی میں "قومی سنی کنونشن" سے تمام دینی و مسلکی تقاضوں کو نظر انداز کر کے الگ تھلگ رہنے والی شخصیت "خدمات دارالعلوم دیوبند کانفرنس" کے انعقاد پر "مجبور" ہو گئی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت "قومی سنی کنونشن" کا انعقاد نہ صرف خدمات دارالعلوم دیوبند کا تسلسل تھا بلکہ "دفاع اسلام اور دفاع دارالعلوم دیوبند" کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔

بہر حال اسی سال جولائی ۱۹۸۸ء میں خمینی کے پاکستان میں اہم ترین ایجنٹ اور تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان کے سربراہ سید عارف الحسینی کو قتل کر دیا گیا۔ پھر صرف ایک ماہ بعد امریکی اور ایرانی سازش کے تحت جنرل محمد ضیاء الحق کا طیارہ ہوا میں ہی اڑا دیا گیا جس میں وہ خود اور پاک فوج کے اعلیٰ افسران جام شہادت نوش کر گئے۔ اس طرح بے نظیر بھٹو اور آصف علی زرداری شیعہ کے اقتدار کا راستہ ہموار ہو گیا۔

بے نظیر بھٹو کا دور اول

۱۹۸۸ء کے انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو نے اقتدار سنبھال لیا۔ اس الیکشن میں بیالیس شیعہ ارکان قومی اسمبلی کے لئے منتخب ہوئے جن میں سے بیس ارکان مرکزی کابینہ میں بحیثیت وزیر و مشیر شامل کئے گئے۔ سینٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں شیعہ ارکان کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ یوں خمینی کی عین خواہش کے مطابق پاکستان میں ایک بار پھر شیعہ حکومت قائم ہو گئی اہل تشیع اور خانہ ہائے فرہنگ ایران نے بے نظیر اور زرداری کی سرپرستی میں اپنی جارحانہ کاروائیوں میں اضافہ کر دیا اور ملک بالخصوص کراچی دوبارہ فرقہ وارانہ فسادات کی لپیٹ میں آ گیا ہفت روزہ تکبیر کراچی کے رپورٹر کے مطابق:

"شہر کے مختلف علاقوں میں صرف ایک ہفتے کے دوران اتنے وسیع پیمانے پر ہونے والی خون ریزی کی وارداتوں کے باوجود وزیر اعظم صاحبہ کا اس جانب متوجہ نہ ہونا اور کسی بھی قسم کے ہمدردانہ تاثر کا اظہار نہ کرنا بعض باخبر شہری حلقوں کے مطابق اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس تمام خونی ڈرامے کے پس منظر میں حکمران پارٹی کا اپنا ایک اہم کردار ہے۔ جو اس سے قبل بھی

مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنے تربیت یافتہ تخریبی عناصر کے ذریعے ایک طویل عرصہ سے شروع کر رکھا ہے۔

کراچی کے باخبر حلقوں کی جانب سے دیئے جانے والے دلائل میں اولین نکتہ یہ ہے کہ اس شہر میں ماضی قریب کی تاریخ میں ہونے والی تمام تر لڑائی جھگڑوں میں سرفہرست شیعہ سنی فرقہ وارانہ فساد ہوا کرتا تھا اور اس کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب سنی آبادیوں میں شیعہ فرقہ کی سن ملی کاروائیاں اور مذہبی دل آزاریاں ہوتی تھیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کی مذہبی انتہا پسندی میں شدت اور وسعت آتی گئی جس کی نشاندہی اس بات سے ہوتی ہے کہ پیپلز پارٹی کے اولین دور حکومت میں اس فرقہ نے سکولوں کی نصابی کتب میں شیعہ فقہ کی تعلیم شامل کرنے کا مطالبہ کیا اور وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھوں اس کی منظوری حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں اگلا مرحلہ وہ آیا جب انہوں نے ضیاء الحق کے نافذ کردہ نظام زکوۃ میں شیعہ فقہ کے مطابق استثنیٰ کا مطالبہ منظور کروانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک قدم مزید آگے بڑھاتے ہوئے پورے ملک میں شیعہ فقہ کے نفاذ کا مطالبہ کیا جس کی تکمیل کے لئے ایک باقاعدہ سیاسی جماعت تحریک نفاذ فقہ جعفریہ وجود میں آئی۔ ملکی سطح پر ناکامی کے باوجود کراچی کی حد تک یہ جماعت بے حد کامیاب رہی جس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ گذشتہ تین چار برسوں کے دوران اس شہر میں شیعہ سنی فساد کا کوئی بڑا واقعہ رونما نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس جماعت نے اپنی فقہ یا اپنے طرز عمل میں کوئی تبدیلی پیدا کی بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ اس نے اپنی بالادستی مستحکم کرنے اور اپنے مخالفین کو تقسیم کرنے پر اپنی توجہ مبذول کی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج کراچی پر حکومت کرنے والی دونوں سیاسی جماعتوں پاکستان پیپلز پارٹی اور مہاجر قومی موومنٹ میں ان کے ہم خیال عناصر کی اکثریت چھائی ہوئی ہے"

(ہفت روزہ تکبیر کراچی صفحہ ۲۳، ۲۵، ۱۲۱ اگست ۱۹۸۹ء)

ملک میں دہشت گردی کے ان واقعات کے علاوہ بے نظیر بھٹو نے کلیدی اسامیوں پر بھی غالی روافض کا تقرر کر دیا جس کی وجہ سے ذرائع ابلاغ اور تعلیمی نصاب میں بھی شیعی افکار و نظریات داخل کر دیئے گئے۔ پنجاب میں اس وقت نواز شریف کی حکومت تھی۔ جو اپنے آپ کو سنی کہلاتا تھا۔ یہ حالات دیکھ کر جناب خادم حسین صاحب تڑپ گئے اور ایک مضمون بعنوان

"نو مسلمات کی حکومت اور سنی حکمرانوں کی بے حسی" کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"۹ مارچ ۱۹۹۰ء جمعہ کے دن پاکستان ٹی وی کے پروگرام "رشان" میں ایک گیت سنایا گیا "سخی شہباز قلندر ۔دمادم مست قلندر علی دا پہلا نمبر" پنجاب ٹیکسٹ بورڈ نے حال ہی میں آٹھویں جماعت کے لئے اردو کی جو کتاب چھپوائی ہے اس میں خلیفہ دوم حضرت عمرؓ اور ٹیپو سلطان پر مضامین کو نکالا گیا ہے۔ یہ بات آج یہاں تعلیم کی وزیر مملکت بیگم شہباز وزیر علی (رافضیہ) نے سینٹ میں ایک سوال کے جواب میں بتائی

قارئین یوں تو سرکاری ذرائع ابلاغ (ٹی وی۔ریڈیو۔نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات) پر پہلے ہی رافضیوں کی اجارہ داری ہے۔ ہر اردو ڈیپارٹمنٹ۔ اردو اکیڈمی۔ اقبال اکیڈمی پر اکثریت رافضیوں کی نظر آتی ہے۔ ٹیکسٹ بورڈ کی سرپرستی میں پرنٹ ہونے والی اردو کورس کی کتابوں پر بھی آپ کو اکثر نام رافضیوں کے نظر آئیں گے۔ اکثر لٹریچر کا چناؤ ایسے مصنفین کا ہے۔ جو کمیونسٹ دہریئے، نام نہاد ترقی پسند دین بیزار اور دشمن صحابہ قسم کے لوگ ہیں جب سے یہ عقدہ کھلا ہے کہ خدا نخواستہ جتنے شیعہ ہیں کمیونسٹ ہوئے جاتے ہیں موجودہ دور حکومت میں احمد فراز جیسے بد باطن شاعر کو ادارہ ادبیات پاکستان کا ہیڈ بنایا گیا۔ فہمیدہ ریاض جیسی بھارتی ایجنٹ اور مادر پدر آزاد ننگی شاعرہ کو بھارت سے بلا کر اچھے عہدہ پر فائز اسی حکومت نے کیا۔

کیا رسول پاک ﷺ کے پاکیزہ موضوع کے مقابلے میں محمد حسین آزاد (رافضی) کا مضمون "ایران کے موسم" کا سنی طلبہ کو بھی پڑھانا بہت ضروری ہے۔ صرف اس لئے کہ یہ ملک اسلام کے خلاف ہمیشہ سے سازشوں کا گہوارہ چلا آرہا ہے...... یہ سب کچھ ایک سازش کے تحت کیا جا رہا ہے کہ ٹیکسٹ بک بورڈ پنجاب کا موجودہ چیئرمین سید فضل حسین (رافضی) ہے اور اسے جان بوجھ کر مقرر کیا گیا ہے نویں، دسویں، گیارھویں، بارھویں جیسی اہم کلاسوں کی اردو کتابوں کا نگران ادارت وطباعت دانستہ طور پر سید سجاد رضوی (رافضی) کو تعینات کرنا موجودہ حکومت کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ اقبال اکیڈمی پنجاب یونیورسٹی کا چیئرمین شہرت بخاری (رافضی) اسی حکومت میں مقرر کیا گیا ہے۔ انگریزوں کے دور سے لے کر اب تک

سی۔ آئی۔ ڈی میں اکثریت رافضیوں کی رہی ہے۔ جو ایک مقصد کے تحت سنیوں کے بارے میں غلط رپورٹنگ کر کے ان کے خلاف جھوٹے مقدمات قائم کرتے اور انہیں زک پہنچاتے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کی ایک تقریر پر کراچی میں بغاوت کا ایک مقدمہ قائم ہوا۔ آپ کے خلاف بھی رپورٹنگ کرنے والا سرکاری گواہ "لخت حسین" (رافضی) تھا۔ محمد علی جوہر نے عدالت سے کہا کہ میں اپنی صفائی میں تو کچھ نہیں کہوں گا کہ میرے خلاف فیصلہ پہلے ہی لکھا جا چکا ہے صرف اس سرکاری گواہ کو خطاب کر کے یہ شعر کہنا چاہتا ہوں

محمد کا دشمن علی کا عدو — نہ کہہ لخت حسین اپنے کو تو

ہر دور میں مسلمان بن کر مسلمانوں سے غداری کرنے والوں کی نسل کا سرا آخر خیسان عجم سے جا ملتا ہے۔ ابولولو سے لے کر سلمان رشدی تک۔ حسن بن صباح سے لے کر خمینی تک اور مالک الاشتر سے لے کر خلخالی تک کڑی بہ کڑی۔ لڑی بہ لڑی اسلام کے خلاف سازش کرنے والے مکروہ چہروں کی ایک قطار ہے کہ اب تک چلی آ رہی ہے۔ ٹی، وی پر حضرت علیؓ کا پہلا نمبر قرار دینا۔ طلبہ کی نصابی کتابوں میں سے حضرت رسول اکرم ﷺ، حضرت عمرؓ اور سلطان ٹیپو کا نام نکالنا۔ خانہ فرہنگ ایران کا بھتہ کھانے والے خمینی ایجنٹوں اور عجمی سازشیوں کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ شیعہ لابی کی سوچی سمجھی سکیم ہے اقلیت کی جھوٹی من گھڑت بات کو اکثریت کی سچی اور کھری بات پر زبردستی مسلط کرتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ وزیر اعظم شیعہ ہے۔ اس کی ماں سنیئر وزیر شیعہ ہے۔ سنی وڈیرہ اور حکمران طبقہ بے غیرت ہو چکا ہے۔ شیعہ وڈیرہ خوفناک متعصب ہے۔ عقل و شعور کا اس کے قریب سے بھی گذر نہیں ہوا۔ خانہ فرہنگ ایران کے تمام دفاتر پاکستان میں "قمیوں اور تجیوں" کے سازشی اڈے ہیں۔ ایرانی ایجنٹ وہاں سے سور کی بوٹی کھاتے اور سنیوں کے خلاف سازشیں تیار کرتے ہیں۔ ان ایرانی گماشتوں کو موجودہ حکومت کی پوری پوری سرپرستی حاصل ہے۔ ورنہ کیا بات ہے کہ پاکستان جس میں بیوہ کو بیوہ کہنے پر اسمبلی میں ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہاں شیعہ سر عام صحابہ کو گالیاں دیتے ہیں۔ سنیوں اور سنی اکابر کے خلاف دل آزار لٹریچر کھلے عام چھپ رہا ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔

(ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان ملخصاً۔ جولائی ۱۹۹۰ء)

امیر عزیمت مولانا حق نواز جھنگوی کی شہادت

بے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت ہی میں جناب خمینی ۔۳ جون ۱۹۸۹ء کو دنیا بھر کے شیعوں کو داغ مفارقت دے گیا لیکن جاتے جاتے بے نظیر حکومت کو امیر عزیمت مولانا حق نواز جھنگوی کے قتل کا ہدف بھی دے گیا۔اس واردات سے قبل گرفتار کیے گئے چار سفاک قاتلوں میں سے دو قاتل ایک وفاقی وزیر کے ہمراہ ایران کا دورہ کر چکے تھے اس منصوبے کو وفاقی حکومت کے علاوہ صادق گنجی ڈائریکٹر خانہ فرہنگ ایران لاہور کی زیر نگرانی پایہ تکمیل تک پہنچایا گیا۔جس کے نتیجے میں ۲۶۔رجب المرجب ۱۴۱۰ھ مطابق ۲۲ فروری ۱۹۹۰ء۔شب جمعہ آٹھ بجے اپنی رہائش گاہ کے دروازے پر اہلسنت کا بے تاج بادشاہ امیر عزیمت، شیر اسلام، وکیل صحابہ و اہلبیت اور سپاہ صحابہؓ پاکستان کے بانی و سرپرست اعلیٰ مولانا حق نواز جھنگوی ظالم اور سفاک قاتلوں کی گولیوں کا نشانہ بن کر جام شہادت نوش کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد روئے گل سیر ندیدیم بہار آخر شد

سپاہ صحابہ کی بنیاد رکھتے وقت یہ "انجام" حضرت شہید کے پیش نظر تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہر تقریر زندگی کی آخری تقریر سمجھ کر کی اور ہر تقریر کے آخر میں اس شعر کے ذریعے کارکنوں کو زندگی کے راز سے بھی آگاہ کرتے رہے۔

فنا فی اللہ کی تہہ میں بقا کا راز مضمر ہے جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آتا

آج امیر عزیمت اگرچہ ہم میں موجود نہیں ہیں اور وہ ایک مقدس اور عظیم مشن کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے خالق حقیقی کے حضور سرخرو ہو چکے ہیں لیکن تحفظ ناموس صحابہؓ کے جس مقدس مشن کی خاطر انہوں نے شب و روز محنت کی اور آگ اور خون کے سمندر سے گذر کر ایثار و قربانی کی جن عظیم روایات کو زندہ کیا۔وہ مشن یقیناً زندہ ہے اور جب تک یہ مشن زندہ ہے امیر عزیمت کا نام، خدمات اور ایثار و قربانی کی روایات بھی زندہ رہیں گی۔

ہزار ڈھونڈ زمانے چراغ لے کر اسے تیرے جہاں سے فطرت کا شاہکار گیا
آج کہیں کرنہ چراغاں ہو صنم خانے میں آج یاران محمدؐ کا وفادار گیا
آتی رہے گی تیرے انفاس کی خوشبو گلشن تیری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا

قارئین کرام! یہ عجیب اتفاق ہے کہ مسودہ تین چار ماہ پہلے مکمل ہو چکا تھا۔لیکن جب

اس کی تحریض کا کام یہاں تک پہنچا تو آج بھی تاریخ ۲۲ فروری ۲۰۰۱ء مطابق ۲۸ ذیقعدہ ۱۴۲۱ھ) ہی ہے۔ آج سے گیارہ سال قبل اسی تاریخ کو حضرت امیر عزیمت سفاک قاتلوں کی گولیوں کا نشانہ بنے تھے۔

امیر عزیمت کا اہل سنت کے نام پیغام

آج کی تاریخ نوٹ کیجئے اگر سنیت بیدار نہ ہوئی تو وہ دن آنے والا ہے جب تم اقلیت میں ہوگے اور شیعہ اکثریت میں ہوگا۔ تاریخ کا مطالعہ کیجئے۔ ایران فاروق اعظمؓ نے فتح کیا تھا لیکن آج وہاں شیعہ اکثریت میں ہے۔ ہائے سنیت مٹ گئی۔ شیعیت چھا گئی۔ آپ بتلائیں۔ خدارا دیوبندیت بتلائے، بریلویت بتلائے، غیر مقلدیت بتلائے اور سنیت کے نام سے پلنے والی نسل تم بتلاؤ رب ذوالجلال کی قسم یہ بتلاؤ تم میں غیرت کتنی ہے۔ تمہاری زندگی میں ابوبکرؓ و عمرؓ کا شیطان سے بڑا جہنمی ہونا لکھا جائے اور تم زندہ ہو۔ وہ قوم دھنس کیوں نہیں جاتی اور آسمان ٹوٹتا کیوں نہیں؟ اس زمین میں یہ قوم غرق کیوں نہیں ہوتی جس کی زندگی میں یہ بکواس ہو اور وہ کوئی لائحہ عمل تیار نہ کرے۔

میں آج اپنی سنی قوم کو غیرت دلانے کے لئے آیا ہوں۔ سنی بچے تجھے تیری ماں کے دودھ کا واسطہ دے کے تیری غیرت کو للکارتا ہوں کہ سر پر کفن باندھ۔ میدان میں آ اور اس کفر کا راستہ روک لے۔

صوفیو! مولویو! مرشدو! تم بتلاؤ کہ اس کفر کے خلاف زبان بند کرنا بے غیرتی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ تمہاری مائیں محفوظ، تمہاری بہنیں محفوظ، تمہاری بیٹیاں محفوظ ہائے یارو۔ صحابہؓ لاوارث رہ گئے کہ چودہ سو سال بعد ان کی ماں کو گالی اور تم لمبی چادریں تان کر سو جاؤ۔ سنی بچو! یا ہم مٹ جائیں یا صحابہؓ کے دشمن سے دھرتی کو پاک کردیں۔ (خطبات جلد دوم صفحہ ۱۷۷ تا ۱۸۱)

پسیجا اک تیرا دل نہ اے سنی کبھی اس پر جگر پانی ہوا جھنگوی کی باتوں سے پتھر کا

بہر حال یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بے نظیر بھٹو کے دور میں شیعہ اور مذہب شیعہ کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ شیعہ قتل و غارت کے بعد کھلے عام دندناتے رہے۔ ملکی تاریخ میں پہلی مرتبہ ساجد نقوی اسلحے سمیت وزیر اعظم ہاؤس میں بے نظیر بھٹو سے ملنے کے لئے گیا۔ یہ حالات جاری تھے کہ غلام اسحق خان نے ۶ اگست ۱۹۹۰ء کو بے نظیر کی حکومت کو کرپشن کے الزامات کے

تحت بہ طرف کر دیا۔

نواز شریف کا دور اول

۱۹۹۰ء کے انتخابات کے نتیجے میں میاں نواز شریف نے ۶ نومبر ۱۹۹۰ء کو پہلی مرتبہ وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ اس کے وزارت اولیٰ کے دور میں علامہ احسان الٰہی ظہیر، امیر عزیمت مولانا حق نواز جھنگوی اور بیسیوں علماء و کارکنان اہلسنت شیعی درندگی کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ اب اس کے وزارت عظمیٰ کے دور میں قتل و غارت میں مزید اضافہ ہوا اور اس نے اپنے قول عمل اور کردار و گفتار سے صحیح معنوں میں اپنے آپ کو خمینی کا سچا وفادار ثابت کر دکھایا۔

امیر عزیمت کی شہادت کے بعد اہلسنت کے تعزیتی پیغامات اور احتجاجی مظاہرے چند دن تک جاری رہے مگر سازش میں ملوث اصل کردار ایرانی سفیر، صادق گنجی اور تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے سربراہ ساجد علی نقوی سے باز پرس یا انہیں شامل تفتیش کرنے کا حوصلہ پاکستان کی حکومت میں نہیں تھا۔ لہٰذا وہ اپنے اگلے ہدف (یعنی سپاہ صحابہؓ کی قیادت کا مکمل خاتمہ) کے حصول میں سرگرم عمل ہو گئے۔

دسمبر ۱۹۹۰ء میں ایک سازشی کردار صادق گنجی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ محترم جناب سید محمد کفیل بخاری اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"دسمبر ۹۰ء کے آخری عشرہ میں خانہ فرہنگ ایران لاہور کے ڈائریکٹر جنرل صادق گنجی قتل کر دیئے گئے۔ چونکہ مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہے۔ اس لئے اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ قاتل کون ہیں؟

لیکن اس کے محرکات و اسباب اور اس واقعہ کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال پر ارباب قضا و قدر کو توجہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اخبارات کے ذریعے منظر عام پر آنے والی باتوں سے صرف نظر ممکن نہیں۔ اس سے قبل پاکستان میں جتنے سیاسی قتل ہوئے نہ تو آج تک کسی کے قاتل پکڑے گئے اور نہ سازشیں منظر عام پر آئیں۔ یہاں لیاقت علی خان سے ضیاء الحق تک اور مولانا شمس الدین سے مولانا حق نواز جھنگوی تک سب کے لاشے لاوارث قرار دیئے گئے۔ صادق گنجی پاکستان میں ایک ہمسایہ ملک کے سفارت کار تھے۔ کسی بھی ملک کا سفارت کار قابل احترام ہوتا ہے اور اس کی ذمہ داریوں کا ایک دائرہ کار ہوتا ہے۔ وہ اپنے ملک کے مفاد کا

تحفظ کرتا ہے اور میزبان ملک کے ضوابط کی پابندی کرتا ہے لیکن صادق گنجی کے متعلق جو باتیں اخبارات کی وساطت سے سامنے آرہی ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ پاکستان میں شیعہ سنی فسادات کے پیچھے سرگرم تھے۔ خانہ ہائے فرہنگ ایران پاکستان میں شیعہ مکتب فکر کو ایرانی انقلابی خطوط پر منظم کرنے کے لئے قائم کئے گئے جس کے ذریعے شیعہ لابی کی تربیت کرنے کے ساتھ ساتھ ہر سطح پر ان کی ہمہ قسم کی امداد بھی کی گئی جو ہنوز جاری ہے۔ ان باتوں کی حقیقت حکومت سے بھی پوشیدہ نہیں مگر یہ تو سب جانتے ہیں کہ ان کی سرگرمیاں سفارت کاری کی حیثیت سے کم اور پاکستان میں ایک مخصوص گروہ کے سرپرست کی حیثیت سے زیادہ تھیں۔ بے گناہ قتل ہر معاشرے میں نا قابل معافی جرم ہے۔ صادق گنجی کے قتل کی ہر مکتبہ فکر نے مذمت کی ہے۔ غفلت کی اصل ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے کہ اس نے غیر ملکی سفراء پر کوئی چیک کیوں نہیں رکھا؟ وہ جو کرنا چاہیں کر سکتے ہیں اور جہاں جانا چاہیں جا سکتے ہیں۔ ان کی سرگرمیوں سے کسی کے دینی حقوق پامال ہوں یا جذبات مجروح ہوں۔ مگر انہیں روکنے والا کوئی نہیں خاص طور پر ایران اور پاکستان کے تعلقات شروع سے ہی حساس نوعیت کے ہیں اور اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکومت پاکستان ایران سے بہت زیادہ مرعوب اور خوف زدہ ہے۔ مثلاً گنجی کے قتل کے بعد ایرانی نائب وزیر خارجہ نے پاکستان میں بیٹھ کر اپنے بیان کے ذریعے اس قتل کی ذمہ داری مومنین اہل سنت کی ایک تنظیم پر ڈال دی اور اس تنظیم پر پابندی کا مطالبہ بھی کیا۔ ان کا یہ الزام پاکستان کے اندرونی معاملات میں واضح مداخلت اور عدلیہ پر عدم اعتماد کا کھلا اظہار تھا مگر حکومت نے یہ سب کچھ خاموشی سے سن لیا آخر ایسا کیوں ہے؟ حکومت کو بہر حال اپنا رویہ بدلنا چاہیے۔ غیر ملکی سفیروں کی نقل و حمل پر مکمل نگرانی ہونی چاہیے۔ انہیں اپنے دائرہ کار سے تجاوز کی ہرگز اجازت نہیں دینی چاہیے تاکہ وہ پاکستان میں آکر اپنے سفارتی فرائض اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں نہ کہ اپنے مخصوص نظریات کے مبلغ بن کر سواد اعظم کے مسلمہ دینی عقائد کی پامالی کا فریضہ ادا کریں۔ اسی صورت میں ہی وطن عزیز امن و آشتی کا گہوارہ بن سکتا ہے۔"

{ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان صفحہ ۳،۴۔ جنوری ۱۹۹۸ء}

گنجی کے قتل کے بعد ایران کے ڈپٹی وزیر خارجہ علی محمد بشارت نے لاہور میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے۔ سپاہ صحابہ کو اس قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا اور کہا کہ اگر اس تنظیم پر

پابندی نہ کی تو پاک ایران تعلقات متاثر ہوں گے۔ انہوں نے تحقیقات پر بھی عدم اعتماد کا اظہار کیا اور کہا کہ ایران تحقیقات سے مطمئن نہ ہوا تو وزیر اعظم پاکستان کے دورہ ایران پر اثر پڑ سکتا ہے۔

(اداریہ روزنامہ جنگ ۲۱۔ دسمبر ۱۹۹۰ء)

ایرانی سفارت خانے کی طرف سے گنجی کی تعزیت کے سلسلے میں دیئے گئے ایک اشتہار کی عبارت ملاحظہ فرمائیں۔

"اسلام اور مسلمین کے ازلی دشمن اور محرومین عالم کے قاتل استعمار کی شہ پر سامراجی ایجنٹوں نے گلستان مصطفوی کے ایک پھول اور خالص محمدی اسلام کے مجاہد سپوت، شہید راہ وحدت مسلمین صادق گنجی کو بزدلانہ طور پر شہید کر کے کاروان فدائیان راہ سید الشہداء امام حسین میں ایک اور فدائی کا اضافہ کر دیا۔" (سفارت جمہوری اسلامی ایران اسلام آباد۔ روزنامہ جنگ ۲۳۔ دسمبر ۱۹۹۰ء)

اس عبارت میں سپاہ صحابہ کو "اسلام اور مسلمین کا ازلی دشمن" اور گنجی کو "گلشن مصطفوی کا ایک پھول اور خالص محمدی اسلام کا مجاہد سپوت" قرار دیا ہے۔ اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ اہل تشیع اور حکومت ایران نے سپاہ صحابہ کو گنجی کے قتل میں ملوث ٹھہرایا اور پاکستان کے اندرونی معاملات میں کھلی مداخلت کرتے ہوئے دھمکی دی کہ اگر ایران تحقیقات سے مطمئن نہ ہوا تو وزیر اعظم نواز شریف کا دورہ ایران متاثر ہو سکتا ہے۔ حکومت پاکستان جو پہلے سے ہی ایرانی حکومت (خواہ شاہ کی ہو یا خمینی کی) سے سخت مرعوب اور خوف زدہ تھی وہ اس تازہ واقعہ کا سامنا کیوں کر کر سکتی تھی؟ چنانچہ ایرانی حکومت اور وزیر اعظم نواز شریف کے درمیان گٹھ جوڑ کے نتیجے میں ۱۰ جنوری ۱۹۹۱ء کو جرنیل سپاہ صحابہ مولانا ایثار القاسمی ایم۔ این۔ اے ایرانی "پاسداران انقلاب" اور پاکستانی "آس داران انقلاب" کی سفاکی و درندگی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ جرنیل سپاہ صحابہؓ نے متعدد مرتبہ حکومت وقت کو آگاہ کیا تھا کہ ایرانی دہشت گرد میری جان کے درپے ہیں۔ حتیٰ کہ جس دن وہ قتل کیے گئے اس دن کے اخبارات میں بھی یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ دہشت گرد جھنگ میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس طرح گنجی کے قتل کے چند دن بعد وزیر اعظم نواز شریف جناب ایثار القاسمی کو ماورائے عدالت قتل کرا کے ایران کے دورے پر تشریف لے گئے جس سے دونوں ملکوں کے تعلقات پھر "مستحکم" ہو گئے۔

مولانا ایثار القاسمی کے سانحے پر ابن امیر شریعت سید عطاء المحسن شاہ صاحب بخاری

لکھتے ہیں کہ:

"جنوری کا شمارہ چھپ چکا تھا کہ جھنگ میں سبائی سازش مولانا ایثار القاسمی کو اپنا لقمہ تر بنا چکی تھی۔ قضاء و قدر کے فیصلوں کو تبدیل کرنا ہر چند کسی کے بس میں نہیں مگر ملک میں ہونے والے سبائیوں کے اعمال خبیثہ کا جائزہ تو لیا جا سکتا ہے۔ ان کا احاطہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

ضلعی و صوبائی حکام اگر اپنی چرب زدہ آنکھیں کھول کے دیکھیں تو ان موذیوں کو کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ ضلعی انتظامیہ پہلے ہی مولانا حق نواز جھنگوی کے قتل کے سلسلہ میں مورد الزام ہے اور اب دوسرا قتل کیا انتظامیہ اب بھی اپنی غفلت، بے پروائی اور روایتی جانب داری کی کوئی تاویل کر سکتی ہے؟

یہ بات تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ پنجاب بھر کی انتظامیہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے زیر اثر ہے اور جاگیرداروں میں اکثریت سبائیوں کی ہے۔ جو بھیڑ کی چوری سے لے کر انسانوں کو اپنی راہ سے ہٹانے تک کے تمام مراحل بآسانی طے کر جاتے ہیں جدید دور میں ریموٹ کنٹرول بھی ان ہی رئیسانِ پنجاب کے قبضہ میں ہے جو ۱۸۵۷ء کے زلہ رباؤں کے مکروہ وارث ہیں بلکہ نقش ثانی نقش اول سے بدتر اور بھیانک ہے۔

مولانا ایثار القاسمی کا قتل یا مولانا حق نواز جھنگوی کا قتل ایک ہی سلسلہ کی کڑی ہے۔ اس اٹل حقیقت کے سامنے ایک ہزار تاویل بھی غلط ہے۔ حکومت اپنا فرض پہنچانے اور اس پر پوری قوت سے عمل کرے ایک ہی مسلک کے علماء کا یہ ساتواں قتل ہے۔ آخر کیوں؟

مسلک اہلسنت کے لوگوں کا وہ کونسا گناہ ہے جس کی پاداش قتل ہے۔ حکومت کو اپنی پوزیشن واضح کرنا ہوگی ورنہ ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ حکومت میں گھسے ہوئے سبائی درندے اس سارے دھندے کا مرکزی کردار ہیں"۔ (ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان صفر، فروری ۱۹۹۱ء)

سبائی درندگی جاری ہی تھی کہ صدر غلام اسحٰق خان اور نواز شریف کی باہمی چپقلش کی بناء پر دونوں کسی "غیر مرئی" طاقت کے فیصلے کے تحت ۱۸ جولائی ۱۹۹۳ء کو مستعفی ہو گئے۔

بے نظیر بھٹو کا دور ثانی

اکتوبر ۱۹۹۳ء کے الیکشن کے نتیجے میں اہل تشیع کی حکمت عملی سے بے نظیر بھٹو دوبارہ برسر اقتدار آ گئی جسے بالواسطہ اور بلاواسطہ بعض "علماء حق" کی بھی باقاعدہ اور اعلانیہ حمایت حاصل تھی جو اس کے زوال ۶ نومبر ۱۹۹۶ء تک تسلسل کے ساتھ جاری رہی (فما ربحت تجارتهم و ما كانوا مهتدين) (البقرہ نمبر ۱۶)

بے نظیر کے افکار و نظریات پیچھے گذر چکے ہیں۔ موصوفہ کے اس دوسرے دور حکومت میں بھی اہل تشیع نے ملک بھر میں اہلسنت کا قتل عام جاری رکھا۔ چکوال، لاہور، جھنگ، ملتان اور کراچی کے واقعات اس پر شاہد ہیں۔ ملک میں بڑھتی ہوئی اس مذہبی دہشت گردی پر قابو پانے کے لئے کچھ "مخلصین" متحرک ہوئے جن کی مساعی جمیلہ کے نتیجے میں مختلف الخیال مذہبی جماعتیں "ملی یکجہتی کونسل" کے نام سے ایک ادارہ تشکیل دینے میں بظاہر کامیاب ہو گئیں پھر بہت جلد یہ ادارہ اپنے "مقاصد" اور "اہداف" حاصل کرنے کے بعد اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔ ملی یکجہتی کونسل (جو دراصل ملی بھگت کونسل تھی) کی تشکیل اور اس کا قیام ۲۳ مارچ ۱۹۹۵ء کو عمل میں آیا۔ اس ادارے کے ساتھ تمام جماعتوں کے "مفادات" وابستہ تھے اور انہوں نے اس بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھوئے۔ ان میں سے بعض دینی جماعتیں نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کے مفادات کے تحفظ بلکہ ان ہی کے ایماء پر اس کونسل میں شامل ہوئیں جبکہ بعض "ایرانی بھتہ خور" حضرات بھی اس ادارے کا حصہ بن گئے۔

شروع شروع میں کونسل کے اجلاس نہایت جوش و خروش کے ساتھ منعقد ہوتے رہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع ابلاغ نے بھی اس کے "مقاصد" کی خوب تشہیر کی لیکن جلد ہی کونسل میں شامل بعض مؤثر رہنماؤں نے اسے "پاکستان قومی اتحاد" (پی این اے) کا نعم البدل قرار دے کر اسے سیاسی پلیٹ فارم میں تبدیل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ بالآخر ڈیڑھ سال کے اندر ہی یہ کونسل انتشار و خلفشار کا شکار ہو گئی البتہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اہل تشیع اس ادارے کی تشکیل سے اپنے مقاصد کے حصول میں توقعات سے بھی بڑھ کر کامیاب ہوئے انہیں پہلی اور عظیم ترین کامیابی کونسل کے پہلے اجلاس میں اس وقت حاصل ہوئی جب تمام شرکاء نے متفقہ طور پر اس کا نام "ملی یکجہتی کونسل" تجویز کیا۔ اس نام پر اتفاق کے ساتھ

ہی اہل تشیع پر "کفر کا فتویٰ" کالعدم اور غیر مؤثر ہو گیا کیونکہ سپاہ صحابہ "سمیت دیگر "اصحاب دستار وجبہ" نے انہیں اپنا ہم مذہب تسلیم کر لیا۔ بعد ازاں اہل تشیع نے ضابطہ اخلاق میں اپنے آپ کو مسلمہ "اسلامی فرقہ" بالخصوص شق نمبر ۲ اور ۴ میں اپنی من پسند ترمیم شامل کرا کر عظیم کامیابی حاصل کر لی شق نمبر ۴ ملاحظہ فرمائیں۔

عظمت اہل بیت اطہار و امام مہدی، عظمت ازواج مطہرات اور عظمت صحابہ کرامؓ ایمان کا جزو ہے۔ (ہفت روزہ زندگی لاہور ص ۲۳۔ ۱۲ تا ۱۸ مئی ۱۹۹۵ء)

اس کے بعد کوئٹہ میں "ملی یکجہتی کونسل" کے بند کمرے کے اجلاس میں جو قرار داد منظور کی گئی وہ بھی اہل تشیع کی عظیم کامیابی ہے اس میں یہ کہا گیا ہے کہ

"کوئی جماعت اس ضابطہ اخلاق کی کسی شق کی تقریر یا تحریر میں کوئی ایسی تشریح نہ کرے، جس سے کسی فریق کے بنیادی عقائد و نظریات کی نفی ہو یا کسی کی فتح یا شکست کا تاثر ابھرے"

(روزنامہ خبریں یکم جولائی ۱۹۹۵ء)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ضابطہ اخلاق میں شامل "خلفائے راشدین" کے الفاظ سے سنی اور شیعہ کی اپنی اپنی تشریح مراد معتبر ہوگی اور شیعہ کے نزدیک ان سے "ائمہ اہل بیت" مراد ہیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ اہل تشیع کو مزید عظیم کامیابی یہ حاصل ہوئی کہ انہوں نے اپنے مفروضہ بارہویں "امام مہدی" کی عظمت کو ایمان کا جزء اور ان کی تکفیر، توہین و تنقیص کو قابل تعزیر، قابل مذمت، حرام اور کفر تسلیم کرالیا۔ ملی یکجہتی کونسل میں سپاہ صحابہ سمیت شامل تمام "علمائے اہلسنت" نے اس پر اپنے توثیقی، تائیدی اور تصدیقی دستخط ثبت فرمائے ہیں۔

مولانا ضیاء القاسمی صاحب ترجمان سپاہ صحابہؓ نے تو "عظمت امام مہدی" کے "جزء ایمان" ہونے کو بالفاظ ذیل تسلیم کیا ہے کہ

"اسی طرح یہ بھی جان لینا چاہیے کہ حضرت امام مہدی کو ہم اپنے ایمان کا مرکز و محور سمجھتے ہیں ان کا ظہور اور وجود ہمارے عقیدے کا حصہ ہے وہ تشریف لائیں گے اور امت مسلمہ کی راہنمائی فرمائیں گے" (ماہنامہ خلافت راشدہ صفحہ ۴۷۔ جون، جولائی ۱۹۹۵ء)

ان الفاظ پر غور فرمائیں اور انہیں بار بار پڑھیں کیا یہ شیعی "تصور مہدی" نہیں ہے؟ مہدی کا "ظہور اور وجود" خالص شیعی عقیدہ و نظریہ ہے جسے موصوف اپنے ایمان کا "مرکز و محور" اور

"اپنے عقیدے کا حصہ" بنا رہے ہیں۔ فیا اسفا۔

سپاہ محمد کے سالار اعلیٰ مرید عباس یزدانی نے جس جرأت و بہادری کے ساتھ امام مہدی کے "وجود اور ظہور" کو ایمان کا جزء اور ان کی توہین و تنقیص کو کفر خود "علمائے اہل سنت" کی اسمبلی سے منظور کرایا ہے اس کی مثال بعد از غیبت امام مہدی (۲۶۱ھ) گزشتہ ساری تاریخ میں نہیں ملتی۔

مرید عباس یزدانی نے شق نمبر ۴ میں امام مہدی کی عظمت کو اس لیے بھی شامل کرایا ہے کہ امام خمینی کے نزدیک "مہدویت پر اعتقاد" کے بغیر "اتحاد و یک جہتی" پیدا ہی نہیں ہو سکتی خانہ فرہنگ ایران ملتان نے خمینی صاحب کے تقریری اقتباسات پر مشتمل ایک کتابچہ "اتحاد و یک جہتی" شائع کیا ہے اس میں "اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے والے عوامل" کے تحت ایک جزء "مہدویت پر اعتقاد" بھی شامل ہے۔ ملاحظہ ہو (اتحاد و یک جہتی صفحہ ۱۵ مطبوعہ خانہ فرہنگ ایران ملتان)

یعنی مہدویت پر اعتقاد کے بغیر اتحاد و یک جہتی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے ملی یکجہتی کونسل میں شامل علمائے اہل سنت ضابطہ اخلاق میں امام مہدی سے متعلق سپاہ محمد کی ترمیم بطیب خاطر شامل کرنے پر رضامند ہو گئے۔ ملی یکجہتی کونسل میں شامل علمائے اہل سنت نے اس مہدی کی عظمت کو ایمان کا جزء اور اس کی توہین و تنقیص کو کفر قرار دیا ہے جو بالکل برہنہ جسم تشریف لائے گا، اس ننگے اور برہنہ مہدی کے ہاتھ پر سب سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر حضرت علیؓ بیعت کریں گے، جبرائیل امین جس کے ہاتھ پر بوسہ دیں گے جو ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ طیبہ طاہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو زندہ کر کے ان پر حد جاری کرے گا، جو سنیوں کی موجودگی میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کو روزانہ ہزار مرتبہ زندہ کرے گا اور پھر انہیں قتل کرے گا، جو سنیوں اور ان کے علماء کو قتل کرے گا۔ (شاید اسی لیے ملی یکجہتی کونسل کے علماء نے مہدی کو اپنے ایمان کا حصہ قرار دیا ہے) جو نیا دین اور نئی کتاب لائے گا، جو خانہ کعبہ، مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور سنیوں کی مساجد کو مسمار کرے گا اور جو عربوں کا قتل عام کرے گا۔ امام مہدی کے متعلق مزید تفصیل اور حوالہ جات پیچھے زیر عنوان "مہدی کے بعد از ظہور کارنامے" ملاحظہ فرمائیں

یہ ہے وہ مہدی جس کی تکفیر، توہین اور تنقیص کو ملی یکجہتی کونسل نے قابل مذمت، قابل تعزیر، حرام، کفر اور اس کی عظمت کو ایمان کا جز قرار دیا ہے

یہاں یہ تاویل بھی نہیں کی جا سکتی کہ اس سے مراد "سنی مہدی" ہے کیونکہ یہ ترمیم

اہل تشیع کے پرزور اصرار پر شامل کی گئی ہے اور اس نے "شیعہ مہدی" تی مراد ہے اور نہ ہی کسی موقع پر علمائے اہل سنت نے اس قسم کی کسی تاویل کا اظہار کیا۔

اس کے برعکس اہل تشیع نے ضابطہ اخلاق کی منظوری کے وقت یہ اعلان کر دیا تھا کہ ہم ثلاثہؓ کو خلفائے راشدین تسلیم نہیں کرتے بلکہ صرف ائمہ اہل بیت ہی کو خلفائے راشدین تسلیم کرتے ہیں۔ قائدین سپاہ صحابہؓ نے ملی یکجہتی کونسل کو ایک سایہ دار درخت سے تشبیہ دی تھی یہ کیسا سایہ دار درخت ہے جس کے سائے تلے پناہ لینے والی ملت اسلامیہ کی عزت و آبرو اور جان و مال، جس کے نبی ﷺ اور صحابہؓ و اہل بیت کا ناموس اور جس کے دینی شعائر خود اس میں شامل ایک جماعت (تحریک نفاذ فقہ جعفریہ) کے ہاتھوں غیر محفوظ ہیں۔

اس موضوع پر مکمل تفصیل جاننے کے خواہش مند حضرات راقم الحروف کی کتاب "ملی یکجہتی کونسل، ایک تحقیقی جائزہ" کی طرف مراجعت کریں۔

بہر حال ملی یکجہتی کونسل کی تشکیل کے وقت اس کا اہم ترین مقصد قیام امن تھا مگر اس ادارے کی تشکیل کے باوجود علماء کرام کو مساجد میں عین درس قرآن دینے اور نماز پڑھانے کی حالت میں شہید کر دیا گیا۔ بعض حضرات کو شاہراہ عام پر دن دیہاڑے گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ سانحہ چوبرجی گراؤنڈ، سانحہ جامعہ عثمانیہ رسول پارک، سانحہ مسجد الخیر ملتان اور سانحات کراچی و دیگر علاقہ جات کو کیوں کر فراموش کیا جا سکتا ہے؟

لاہور کے قاسم چوہدری اور طاہر کبوہ کو اغواء کر کے جس درندگی اور بے دردی کے ساتھ شہید کیا گیا۔ اس نے تو حسن بن صباح اور صفویوں کے مظالم کی یاد تازہ کر دی۔ زبیر بٹ کو جیل کے اندر شہید کر دیا گیا۔ لاہور کے یوسف مجاہد کو اغوا کر کے گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ بعد میں جب قاتلوں کو معلوم ہوا کہ وہ زخمی حالت میں جناح ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں زیر علاج ہے تو ان سفاک قاتلوں نے ہسپتال کے اندر ڈاکٹروں کی موجودگی میں دوبارہ حملہ کر کے قتل کر دیا۔ ان کے علاوہ سینکڑوں کارکن شیعہ جارحیت کی بھینٹ چڑھ گئے۔

مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی، مولانا محمد اعظم طارق و دیگر علماء کرام اور سینکڑوں کارکن ملک کی مختلف جیلوں میں بند کر دیے گئے جس کی تفصیل ایک مستقل کتاب کی متقاضی ہے۔

بہر حال شیعی بربریت و بہیمیت عروج پر تھی کہ اسی دوران فاروق احمد خان لغاری نے

۵ نومبر ۱۹۹۶ء کو بے نظیر بھٹو کی حکومت کو رخصت کر دیا اور اس کی جگہ معراج خالد کی قیادت میں ایک نگران حکومت قائم کر دی۔

علامہ ضیاء الرحمٰن فاروقی کی شہادت

اس نگران حکومت نے ایرانی حکومت کے ایماء پر سابقہ حکومت کے تیار کردہ منصوبے پر عمل درآمد کرنے اور خمینی کی روح کو تسکین پہنچانے کے لئے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ جن کے نتیجے میں اس نے ملت اسلامیہ کو "سانحہ سیشن کورٹ" کی صورت میں ایک ناقابل فراموش "تحفہ" عنایت کر دیا۔ یہ سانحہ "بستی لال کمال" بہاولپور کے واقعہ کے بعد پاکستان کی تاریخ کا دوسرا بڑا سانحہ تھا جس میں پیکر جرأت و عزیمت علامہ ضیاء الرحمٰن فاروقی کے علاوہ تقریباً تیس افراد جام شہادت نوش کر گئے اور مولانا محمد اعظم طارق سمیت بیسیوں افراد زخمی ہو گئے اور اس سے بھی بڑا سانحہ یہ ہے کہ سازش کے اصل کردار حسب سابق پھر "گول" کر دیئے گئے اور ایک "چوہدری" محرم علی کو تختہ دار پر لٹکا کر عدل و انصاف کا خون کر دیا گیا۔

لاہور سیشن کورٹ میں ہونے والے بم دھماکے نے ملت اسلامیہ کو لرزا کر رکھ دیا ہے پاکستان کا عام شہری یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ اگر ایک مجبور شخص انصاف فراہم کرنے والی عدالتوں کے احاطے میں بھی محفوظ نہیں تو پھر امن و امان کا اللہ ہی حافظ ہے۔ لاہور میں یہ خون آشام دن ۸ رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۸ جنوری ۱۹۹۷ء کو چڑھا۔ قائدین سپاہ صحابہؓ مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی اور مولانا محمد اعظم طارق کو پولیس مقدمات کے سلسلے میں عدالت میں پیشی کے لئے لا رہی تھی۔ جیسے ہی ان کی گاڑی اپنی جگہ پر رکی تو وہاں پارک کی گئی تین موٹر سائیکلوں میں سے ایک میں دو کلو وزنی بم کو جو موٹر سائیکل کی بیٹری والی جگہ نصب کیا گیا تھا۔ ایک ریموٹ کنٹرول بم کے ذریعے آپریٹ کر دیا گیا۔ جس سے ناقابل تلافی، عظیم قومی اور ملی نقصان ہوا۔

متعلقہ عدالت کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج میاں خالد نے اس المناک حادثے کے فوراً بعد اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے اس مقدمے کی سماعت پہلے ہی آئندہ تاریخ تک ملتوی کر دی تھی اور عدالت میں موجود ڈی ایس پی رینک کے افسران کو بلا کر کہا تھا کہ مجھے چونکہ دیگر فرائض کی ادائیگی کے لئے آج عدالت سے باہر جانا ہے اس لئے آج سماعت نہیں ہو سکتی۔ خالد میاں یہ احکامات جاری کر کے ۱۰ بج کر ۲۵ منٹ پر

... سے باہر چلے گئے جبکہ دھماکہ ۱۱ بج کر ۵۸ منٹ پر ہوا اور پولیس کی جو گاڑی قائدین کو ... ن وہ قریباً ۱۱ بج کر ۵۰ منٹ پر عدالت کے احاطے میں پہنچی۔ یہ سوچا جا سکتا تھا کہ ایک روز پہلے ہی فرقہ وارانہ عصبیت کے حوالے سے غیر ملکی (ایرانی) سفارت کار کا اہم بیان اخبارات میں شائع ہو چکا تھا۔ اس دھماکے میں زخمی ہونے والے اے، ایس، آئی محمد سلیم نے بتایا کہ کافی عرصہ سے سپاہ صحابہؓ کے رہنماؤں کی عدالت میں پیشی کے وقت تخریب کاری کے خطرے کی اطلاع مل رہی تھی اور اس حادثہ فاجعہ کی تخریب کاری کی اطلاع بھی مل چکی تھی۔

ایس، ایس، پی طارق سلیم ڈوگر نے کہا کہ انہوں نے پندرہ روز پہلے آئی، جی کو لکھ دیا تھا کہ اس کیس کی سماعت جیل میں ہونی چاہیے کیونکہ سیکورٹی کا مسئلہ ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ ان تمام واقعات کے باوجود دو گھنٹے پہلے جج صاحب کی طرف سے ڈی، ایس، پی صاحبان کو اطلاع مل جانے کے باوجود کہ آج سماعت نہیں ہوگی۔ پولیس قائدین کو عدالت میں کیوں لے کر آئی؟ یہ بھی ملحوظ رہے کہ جیل سے عدالت تک کا فاصلہ بمشکل ایک گھنٹہ کا بھی نہیں تھا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ حکومت وقت سازش میں پوری طرح شریک و ملوث تھی ورنہ مقدمہ کی سماعت جیل میں بھی ہو سکتی تھی۔ پھر جب جج نے قبل از وقت آگاہ کر دیا تھا۔ تو انہیں جیل سے ہی نہ لایا جاتا اور اگر وہ بالفرض روانہ ہو ہی چکے تھے تو انہیں راستے سے ہی واپس بھی کیا جا سکتا تھا۔

علاوہ ازیں تخریبی کاروائی کی پیشگی اطلاع مل جانے کے باوجود پولیس گاڑی جہاں کھڑی کی جانی تھی۔ وہاں پارک کیے گئے موٹر سائیکلوں کو بم سکواڈ کے ذریعے چیک یا پھر انہیں اس جگہ سے ہٹایا بھی جا سکتا تھا۔ اس وقت کے لاہور کے کور کمانڈر (اور آج کے وزیر داخلہ) معین الدین حیدر نے اعلان کیا کہ "دھماکہ میں کوئی غیر ملکی طاقت ملوث نہیں اور انکشن ہو کر رہیں گے"۔ لیکن اس کے برعکس سازشی عناصر کا ایوان صدر میں ایک اعلیٰ سطحی اجلاس زیر صدارت صدر پاکستان فاروق احمد خان لغاری منعقد ہوا جس میں نگران وزیر اعظم، نگران وزرائے اعلیٰ، وفاقی وزیر قانون، وزیر داخلہ اور سیکریٹری داخلہ کے علاوہ حساس اداروں کے اہلکاروں نے شرکت کی۔ اجلاس میں سانحہ سیشن کورٹ کے حوالے سے صدر کو بتایا گیا کہ یہ دھماکہ بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کی کارستانی ہے۔ یہ رپورٹ گورنر پنجاب اور وزیر اعلیٰ کی طرف

سے پیش کی گئی۔

جبکہ موقع سے گرفتار ہونے والے ملزم محرم علی نے پولیس کے سامنے اقرار جرم کرتے ہوئے کہا کہ "میں ان لوگوں کو ہلاک کرنے کے لئے پیدا ہوا ہوں جو میرے فرقے کا مذاق اڑاتے ہیں اور آئندہ بھی اگر مجھے دوسرا موقع ملا تو میں اپنا مشن جاری رکھنے میں نہیں ہچکچاؤں گا"۔

حکومت پنجاب کی متعلقہ بم دھماکے کے بارے میں رپورٹ اور پولیس کے سامنے مجرم کا یہ اقرار کہ اس نے ایک سیاست دان کے کہنے پر دھماکہ کیا ہے دراصل دو متضاد چیزیں ہیں۔ مدیر نوائے وقت لکھتے ہیں کہ:

"ہم اپنے ہمسایہ ملک ایران کا ایک برادر ملک کی حیثیت سے بڑا احترام کرتے ہیں ہماری حکومت ایران سے درخواست ہے کہ جو کام حکومتوں کے درمیان ہو سکتا ہے وہ منظر عام پر نہیں لانا چاہئے کیونکہ اس طرح کی بیان بازی سے حالات خراب ہو سکتے ہیں اور ایسے ہی بیانات کے باعث بعض مشتعل افراد نے خانہ فرہنگ ایران لاہور پر حملہ کیا۔ حکومت ایران کو آئندہ کسی بھی شکایت پر حکومت پاکستان سے براہ راست رابطہ کر کے خفیہ مراسلت کے ذریعے احتجاج ریکارڈ کروانا چاہئے تاکہ حالات خراب کرنے والے عناصر اپنے عزائم میں کامیاب نہ ہو سکیں اور دونوں ملکوں کی دوستی متاثر نہ ہو سکے"۔ (روزنامہ نوائے وقت ۲۱ جنوری ۱۹۹۷ء)

مدیر نوائے وقت نے اپنے تجربہ کی روشنی میں مشورہ دیا ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایرانی حکومت "منافقت و تقیہ" کی پالیسی پر انقلاب سے پہلے گامزن تھی۔ خمینی کے انقلاب کے بعد ایرانی "پاسداران انقلاب" اور "پاکستانی آسداران انقلاب" نے "آزاد" پاکستان و ایران کا ایک صوبہ سمجھ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انقلابی حکومت نے اسلام آباد اور تہران میں پاکستانی صدور اور وزرائے اعظم سے متعدد مرتبہ باز پرس کی ہے۔ ایران میں متعین پاکستانی تو اس حکومت کے ایک "بٹ مین" کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ ابھی حال ہی میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے فیصلے پر ایرانی ردعمل ملاحظہ فرمائیں:

"ایران کی خبر رساں ایجنسی "ارنا" کے مطابق تہران میں پاکستانی سفیر کو وزارت خارجہ میں طلب کیا گیا اور ان کے سامنے سپریم کورٹ کے فیصلہ پر تشویش کا اظہار کیا گیا جس میں ایرانی شہری سید محمد علی رحیمی کے قتل میں ملوث افراد کو بے گناہ قرار دیا گیا ہے۔ ایک ایرانی

اخبار نے حکومت کو مشورہ دیا ہے کہ وہ پاکستان کے ساتھ اپنے تعلقات پر نظر ثانی کرے"۔

اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے مدیر "اساس" لکھتے ہیں کہ:

"ایران پاکستان کا ہمسایہ اسلامی ملک ہے۔ ہمسائیگی اور اسلام کے ساتھ تعلق کی وجہ سے دونوں ملکوں کے تعلقات میں ایک قربت ہے لیکن بدقسمتی سے ایرانی حکومت اور پریس جو پوری طرح سرکاری نگرانی میں ہے۔ ان کا رویہ پاکستان کے بارے میں کچھ زیادہ دوستانہ نہیں رہا۔ ریڈیو تہران اکثر پاکستانی حالات پر جس طرح تبصرہ کرتا ہے اسے محتاط لفظوں میں پاکستان کے داخلی معاملات میں مداخلت ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح پاکستان کے سفیر کو یوں طلب کرنا بھی اس اسلامی اخوت کے جذبات کو مجروح کرنے کے مترادف ہے جس کا خود ایران دعویدار رہا ہے۔ پاکستان میں ایک مؤثر گروہ ایسا ہے جس کی یہ رائے ہے کہ ایران پاکستان کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرتا رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں ملک میں فرقہ وارانہ فسادات میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن پاکستان کی کسی حکومت نے اس رائے پر کبھی توجہ نہیں دی اور کبھی ایران سے اعلانیہ احتجاج نہیں کیا ہم سمجھتے ہیں کہ ایران اور پاکستان کے تعلقات میں قربت اور دونوں ممالک کے عوام کے درمیان محبت کا تعلق وقت کی ضرورت ہے اور امت مسلمہ کی بھی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ایرانی حکومت اپنے مخصوص نظریات سے باہر نکلتے ہوئے امت کے وسیع تر مفاد میں سوچے اور ایسے اقدامات پر توجہ دے جو پاکستان اور ایران کے تعلقات کو مستحکم بنائیں"

(روزنامہ اساس ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۰ء)

سید محمد کفیل شاہ صاحب بخاری سانحہ سیشن کورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"۷ جنوری کے اخبارات میں ایرانی حکومت کی طرف سے پاکستان میں شیعہ مکتب فکر پر مظالم کے حوالے سے ایک دھمکی آمیز بیان شائع ہوا تو اس کے جواب میں مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی اور مولانا اعظم طارق نے جیل سے مشترکہ بیان جاری کیا جو ان کی شہادت کے روز ۱۸ جنوری کے اخبارات میں شائع ہوا۔

مولانا ضیاء الرحمٰن اور مولانا اعظم طارق گذشتہ کئی ماہ سے مسلسل اسی خدشے کا اظہار کر رہے تھے کہ ہمیں قتل کرنے کی سازش ہو رہی ہے۔ سیشن جج لاہور نے ۱۰ بجے صبح مطلع کیا کہ آج سماعت نہیں ہوگی اور مولانا فاروقی اور مولانا اعظم طارق کو عدالت میں لانے کی ضرورت نہیں۔

اس کے باوجود انہیں عدالت میں لایا گیا اور بارہ بجے دوپہر یہ سانحہ پیش آ گیا۔ ان سوالات کا اب تک کوئی معقول جواب نہیں دیا گیا کہ جب عدالت نے تاعت ملتوی کر دی تھی تو مولانا کو کورٹ میں کیوں لایا گیا؟ اور مولانا کی طرف سے مبینہ دہشت گردی کے خدشات کے اظہار کے باوجود ان کے لئے حفاظتی انتظامات کو سخت کیوں نہ کیا گیا؟ اس حادثہ کے نتیجے میں پورے ملک میں عدم تحفظ کی فضا قائم ہوئی ہے اور یہ بات طے ہے کہ اب پاکستان میں کوئی بھی شخص محفوظ نہیں۔ سپاہ صحابہؓ پاکستان کے بانی مولانا حق نواز، مولانا ایثار القاسمی اور دیگر علماء و کارکنوں اور دوسرے درجہ کی قیادت کے بہت سے افراد گذشتہ پانچ برسوں میں مبینہ دہشت گردی کا نشانہ بنے اور شہید کر دیے گئے جس کا ردعمل یقیناً اچھا نہیں ہوگا۔ ہم انہی صفحات میں بار بار لکھ چکے ہیں کہ ہمسایہ ملک ایران پاکستان میں شیعہ فرقہ کی ہر حوالے سے بھرپور مدد کر رہا ہے۔ ایران اپنا انقلاب پاکستان میں برپا کرنا چاہتا ہے۔ خانہ فرہنگ ایران کی سرگرمیاں خطرناک اور قابل تشویش ہیں۔ ایران پاکستان میں مذہب کے نام پر کھل کر مداخلت کر رہا ہے اور حکومت اس کا کوئی سدباب نہیں کر رہی۔ فرقہ وارانہ فسادات اس کا منطقی نتیجہ ہے"۔

(ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان صفحہ ۲۱۔ فروری ۱۹۹۷ء)

ملک معراج خالد کی نگران حکومت کے اس "تحفے" کے بعد نئے انتخابات منعقد ہوئے جس میں نواز شریف کو بھاری اکثریت حاصل ہوئی۔

نواز شریف کا دور ثانی

نئے انتخابات کے نتیجے میں میاں نواز شریف نے ۱۷ فروری ۱۹۹۷ء کو دوسری مرتبہ وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا جبکہ ان کے چھوٹے بھائی میاں شہباز شریف پنجاب کے وزیر اعلیٰ "منتخب" ہو گئے۔ "میاں برادران" نے برسر اقتدار آتے ہی سپاہ صحابہؓ پر مظالم کا سلسلہ پھر شروع کر دیا۔ اس کے قائدین اور کارکنوں کو بدنام زمانہ تفتیشی مرکز "چوہنگ سنٹر" لاہور میں منتقل کر کے سخت ترین اذیت پہنچائی۔

۱۹۹۷ء کے انتخابات میں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ مسلم لیگ کی اتحادی جماعت تھی۔ بے نظیر بھٹو کے متعلق اہل سیاست بخوبی جانتے تھے کہ وہ دوبارہ ایوان اقتدار میں داخل نہیں ہو سکتی اس لئے اہل تشیع نے باخبر حلقوں اور "مقتدر طبقے" کے ایماء پر نواز شریف کے ساتھ اتحاد کر لیا۔

نواز شریف نے اپنے اس دوسرے دور میں بھی تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے ایجنڈے پر عمل پیرا رہے۔ حسب سابق سنی علماء، وکلاء، ڈاکٹرز اور کارکنوں کے قتل عام کا سلسلہ جاری رہا۔ کراچی کے علماء کے علاوہ ڈاکٹر سیف اللہ خالد، ڈاکٹر مطیع الرحمٰن ہمراہ خلیل احمد خان ایڈوکیٹ، مفتی غلام مرتضی، محمد اقبال صدیقی، علامہ شعیب ندیم، مولانا حبیب الرحمٰن صدیقی، مولانا عبداللہ اسلام آباد اور دیگر بیسیوں علماء و کارکن جام شہادت نوش کر گئے۔

مولانا محمد عبداللہ شہید

مولانا عبداللہ شہید تو کافی عرصہ سے اہل تشیع کی ہٹ لسٹ پر تھے وہ وفاقی دارالحکومت میں ایسے شخص کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ۱۹۹۰ء میں جعفریہ کونسل راولپنڈی اور اسلام آباد کے ایک مشترکہ اجلاس میں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے اراکین نے وفاقی علاقہ کی انتظامیہ کو یقین دلایا ہے کہ دارالحکومت میں فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے والے عناصر کے خلاف کاروائی کی مکمل تائید وحمایت کی جائے گی۔ اجلاس میں شریک مقامی علماء سیاسی کارکنوں اور اکابرین نے مولانا محمد عبداللہ کی گرفتاری کی حمایت کرتے ہوئے حکومت پر زور دیا کہ تعصب پھیلانے والے عناصر کے خلاف اقدامات کیئے جائیں۔ (روزنامہ جنگ ۲۱ مئی ۱۹۹۰ء)

اہل تشیع کے ترجمان ابومصعب جوادی لکھتے ہیں کہ

”باقی رہا سپاہ صحابہ کے کسی رہنما یا کارکن کی طرف سے یزید کی تعریف کا مسئلہ تو دیوبندی مولوی محمد عظیم الدین صدیقی کی کتاب ”حیات سیدنا یزید“ کے ابتدائی صفحات کا مطالعہ ہی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے کہ جس میں ۱۱ دیگر علمائے دیوبند کے ساتھ ساتھ سپاہ صحابہ کا مرکزی رہنما اور مرکزی جامع مسجد (لال مسجد) اسلام آباد کا خطیب محمد عبداللہ اپنے اور شیخ القرآن (مولوی غلام اللہ خان دارالعلوم تعلیم القرآن راجہ بازار راولپنڈی) کے بارے میں لکھتا ہے کہ ”آج ہی شیخ القرآن سے بات کی۔ کتاب حیات سیدنا یزید ان کو ابھی تک نہیں ملی۔ تبصرہ اور رائے کی درخواست بھی کی انہوں نے قبول فرمالیا۔ ویسے وہ بھی حضرت امیر یزید کے بارے میں وہی عقیدہ رکھتے ہیں جو ہمارا ہے۔

اور یہ مولوی محمد عبداللہ وہ ہے جس کے بارے میں تاریخی دستاویز میں لکھا ہے کہ علماء دیوبند اور سپاہ صحابہ کی طرف سے مولانا محمد عبداللہ اسلام آباد اور جس مسجد میں مولوی عبداللہ

خطیب ہے۔ ان کے بارے میں ستمبر ۱۹۹۱ء کے خلافت راشدہ میں لکھا ہے کہ "ماہ آخر کیم جون کو جماعت کا ایک اہم وفد وزیر داخلہ چودھری شجاعت حسین اور میاں شہباز شریف کو ملا۔ کافی بحث وتمحیص کے بعد جامع مسجد لال اسلام آباد کے متعلق کانفرنس کرنے کی اجازت مل گئی"۔ علاوہ ازیں سپاہ صحابہ کے بیشتر پروگرام اسی لال مسجد میں ہی منعقد ہوتے ہیں۔ (تحقیقی دستاویز صفحہ ۱۱۔۱۲)

وفاقی دارالحکومت میں جھنگوی شہید کی یاد میں یہ پہلی عظیم الشان کانفرنس تھی جو مولانا عبداللہ شہید کی مساعی جمیلہ سے کامیابی وکامرانی سے ہم کنار ہوئی۔ حضرت عبداللہ شہید زندگی بھر اعلائے کلمۃ اللہ، تحفظ ناموس رسول اور ناموس صحابہ و اہلبیتؑ کے لئے کوشاں رہے۔

موصوف کو سپاہ محمد کے سربراہ مرید عباس یزدانی کے قتل میں بھی ملوث کیا گیا تفتیش کے بعد خود شیعہ ہی یزدانی کے قاتل ثابت ہوئے۔

۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۳ ستمبر ۱۹۹۸ء کو جب علامہ شعیب ندیم اپنے رفقاء سمیت شیعی جارحیت کا شکار ہوئے تو مولانا عبداللہ پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ رات بھر اور اگلے دن شعیب ندیم اور مولانا حبیب الرحمٰن صدیقی کا جسد خاکی لال مسجد کے ایک کمرے میں پڑا رہا۔ وہیں دن بھر علمائے کرام احتجاجی و تعزیتی جلسہ سے خطاب کرتے رہے ۱۴ ستمبر ۱۹۹۸ء کو بعد از نماز ظہر شہداء کی نماز جنازہ ادا کرنے کے لئے ان کی لاشیں پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے لے جائی گئیں اور انہوں نے ہی شہداء کی نماز جنازہ پڑھائی۔

اہل تشیع یہ سب کچھ بآسانی ہضم نہیں کر سکتے تھے اس لئے انہوں نے ایک ماہ بعد ۲۵ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو بارہ بجے دن مولانا عبداللہ کو ان کی مسجد اور گھر کے درمیان قتل کر کے اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کی اسی تاریخ کو بعد از نماز عشاء ان کی نماز جنازہ ان کے صاحبزادے مولانا عبدالعزیز کی امامت میں ادا کی گئی۔ راقم الحروف کو بھی مولانا شفیق الرحمٰن خطیب ہزارہ کی معیت میں شہید اسلام کی نماز جنازہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

برادر محترم سید محمد کفیل بخاری سانحہ (لال مسجد) اسلام آباد پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"۱۷ اکتوبر (۱۹۹۸ء) کی دوپہر ممتاز عالم دین اور رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین حضرت مولانا محمد عبداللہ کو لال مسجد اسلام آباد کے احاطے میں دہشت گردوں نے فائرنگ کر کے

شہید کر دیا۔ ان کے ہونہار اور صالح فرزند مولانا عبدالعزیز بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ان پر بھی حملہ کیا گیا۔ مگر وہ محض اللہ کے فضل و کرم سے محفوظ رہے۔

مولانا محمد عبداللہ ایک فقیر منش، درویش، خدامست اور مخلوق سے محبت کرنے والے انسان تھے۔ وہ کئی برس سے دارالحکومت میں دین کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ وہ مرکزی لال مسجد کے خطیب اور جامعہ فریدیہ کے مہتمم تھے۔ فرقہ وارانہ منافرت سے کوسوں دور اور بالکل الگ تھلگ رہنے والے انسان تھے۔ وہ ایک حق گو اور حق پسند عالم باعمل تھے۔ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے خطبات میں ہمیشہ حکمرانوں کی غلط پالیسیوں پر شدید ترین مگر انتہائی مثبت اور سنجیدہ تنقید کرتے۔ اپنا موقف پوری جرأت کے ساتھ بیان کرتے۔ مختلف حکومتوں نے انہیں اسی جرم کی پاداش میں لال مسجد کی خطابت سے الگ کیا مگر لوگوں نے وہاں کسی اور کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جبکہ کسی اور عالم نے بھی مولانا کی مسجد میں ان کی جگہ لینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ایک ملنسار، مہمان نواز، خوش طبع و خوش مزاج، امن پسند و امن کا پیغام بر، صلح جو اور خلیق انسان تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ عمر بھر دین حق کی تبلیغ و تعلیم میں مصروف رہے۔ ہزاروں مسلمانوں نے ان کے خطبات سن کر اپنے اعمال کی اصلاح کی اور سینکڑوں طلباء نے خود ان سے اور ان کی یادگار جامعہ فریدیہ میں رہ کر علم دین حاصل کیا۔ وہ کسی جماعت کے رکن نہیں تھے۔ مگر ہمیشہ حق کی حمایت کی۔

مولانا کا قتل کوئی معمہ نہیں۔ سیدھی بات ہے کہ جو لوگ گذشتہ دس برسوں سے ملک میں فرقہ وارانہ قتل و غارت گری کر رہے ہیں وہی اس قتل کے ذمہ دار ہیں۔ جنہوں نے مولانا حق نواز جھنگوی، ایثار القاسمی، ضیاء الرحمن فاروقی، شعیب ندیم اور دیگر رہنماؤں کو قتل کیا وہی مولانا عبداللہ کے قاتل ہیں۔ اس گروہ خبیثہ کی صرف ایک ہی ترجیح ہے کہ جو کام کا آدمی ہو اسے راستے سے ہٹا دیا جائے اور بس۔ کیا اس سے مسائل حل ہو جائیں گے؟ یہ حکومت کی واضح ناکامی ہے جب ملک کی بڑی شخصیات دہشت گردوں سے محفوظ نہیں تو عام شہری تو بالکل ہی غیر محفوظ ہے اور معاشرے میں عدم تحفظ کا احساس عام ہے۔

اراکین نقیب ختم نبوت مولانا کے قتل پر غمگین ہیں اور ان کے اہل خانہ کے علاوہ اہل مدرسہ اور تمام مداحوں کے غم میں شریک ہیں"۔ (ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان صفحہ ۲ نومبر ۱۹۹۸ء)

۱۹۹۹ء میں نواز شریف نے امریکہ کی خوشنودی کی خاطر طالبان حکومت پر دہشت گردوں کی پشت پناہی کا الزام عائد کرتے ہوئے کہا کہ اس نے پاکستان میں تخریبی کاروائیوں کے لئے افغانستان میں باقاعدہ تربیتی کیمپ کھول رکھے ہیں اس مقصد کے لئے آئی۔ایس۔آئی کے سابق سربراہ جنرل ضیاء الدین بٹ نے افغانستان کا دورہ کر کے یہ بیان داغا کہ طالبان حکومت دہشت گردوں کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ اس کے بعد کراچی، لاہور، راولپنڈی، پشاور، اور دیگر شہروں میں ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت چند شیعہ افراد اور سنی رہنماؤں کو قتل کرا کے فرقہ وارانہ منافرت کی آگ بھڑکا دی گئی۔ دوسری طرف فوج کے ساتھ بھی نواز شریف نے ایک نیا محاذ کھول دیا اور اس کے ایک بے وقت، بے موقع اور غلط فیصلے کے نتیجے میں ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو پاکستان آرمی نے ملک کا نظم و نسق سنبھال لیا۔

جنرل پرویز مشرف

اس نئے نظم و نسق کے تحت چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف نے مارشل لاء لگانے کی بجائے درمیانی راہ اختیار کرتے ہوئے اپنے لیے "چیف ایگزیکٹو" کا منصب قبول کیا۔ اس دور کے ابھی تک چودہ ماہ گذرے ہیں چند شہروں میں بم دھماکے ہوئے جبکہ مجموعی طور پر ملک میں سکوت اور سناٹا طاری ہے۔ الحاد، بے دینی، دہریت، فحاشی، بے حیائی، عریانی، شیعیت اور قادیانیت کے فتنے نکتہ عروج پر ہیں۔ اقلیتوں کے لئے "آرمی" کی چھتری تلے اپنا مشن جاری رکھنا زیادہ سازگار ہوتا ہے لیکن شیعہ اقلیت کو تو کسی دور میں کبھی کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ جنرل مشرف کے دور میں شیعی تحریک حسب سابق نہایت سرگرمی اور جوش و خروش کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ اہم حکومتی مناصب اس کے زیر قبضہ ہیں۔

"قومی تعمیر نو بیورو" کے چیئرمین جنرل ریٹائرڈ تنویر حسین نقوی ملک کے ہر شعبے میں نئی اصلاحات نافذ کرانے میں ہمہ تن شب و روز معروف ہیں۔ اہل تشیع نے طریقہ واردات تبدیل کر لیا ہے اب وہ اپنے مخصوص اہداف کے حصول میں پوری طرح جتے ہوئے ہیں۔ جن میں سے ایک اہم ترین ہدف فقیہ العصر حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی کا المناک قتل ہے جنہیں حریف "علمی محاذ" پر اپنے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ سمجھتا تھا۔

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی کی شہادت

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے نائب امیر، مہتمم جامعہ ذکریا الخیریہ و خانقاہ یوسفیہ چشتیہ، جید عالم دین، مصنف و فقیہ اور ممتاز سکالر حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی ۱۴ صفر ۱۴۲۱ھ مطابق ۱۸ مئی ۲۰۰۰ء بروز جمعرات اپنی مسجد "الفلاح" کے عین سامنے اپنے خادم اور ڈرائیور کے ہمراہ شہید کر دیئے گئے۔

مرحوم و مغفور کا قلم ہمیشہ سبائیت و قادیانیت کی سرکوبی کے لئے وقف رہا۔ انہوں نے ہمیشہ دلیل کی طاقت، علم کی ثقاہت اور عمل کی وجاہت سے اپنا لوہا منوالیا۔ ان کی شہادت سے علماء کی صف میں یقیناً ایک نہ پُر ہونے والا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ گذشتہ دس برسوں میں جس کثرت کے ساتھ علماء قتل ہوئے ہیں ان کی مثال نہیں ملتی اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان کے قاتلوں پر ہاتھ ڈالنے سے سول اور فوجی دونوں حکومتیں ہمیشہ عاجز اور بے بس رہی ہیں۔

مولانا مرحوم کے قاتلوں کے متعلق مختلف قیاس آرائیاں ہوتی رہیں لیکن راقم الحروف کے نزدیک یہ سبائیوں ہی کی کارستانی ہے۔ موصوف ان کی نظروں میں مولانا محمد منظور نعمانی کی تحریک "ردِ شیعیت" کی پرجوش حمایت کرنے کی وجہ سے مسلسل خار کی طرح کھٹک رہے تھے۔ ان کی کتابیں "شیعہ سنّی اختلافات اور صراط مستقیم، ترجمہ فرمان علی پر ایک نظر" اور دیگر مضامین اس بات کا واضح ثبوت ہیں۔ ماہنامہ بینات اور اقراء ڈائجسٹ کے "شیعیت نمبر" میں موصوف کے درج ذیل اقتباس سے دنیائے شیعیت سخت بے چین اور مضطرب تھی۔ حضرت لدھیانوی ان نمبروں میں بہ عنوان "تجدیدی کارنامہ" لکھتے ہیں:

"حضرت خاتم النبیین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین کا نام اسلام ہے جو شخص اسلام کے تمام متواترات و مسلّمات کو مانتا ہو وہ مسلمان کہلاتا ہے جو شخص ضروریات اسلام میں کسی ایک کا منکر ہو وہ پورے دین کا منکر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکذب ہے اس لئے دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

عام غلط فہمی ہے کہ شیعہ مذہب بھی اسلام کے اندر مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ ہے۔ یہ غلط فہمی اس لئے ہوئی کہ شیعہ مذہب پر تقیہ کی سیاہ چادر تنی رہی ورنہ شیعہ مذہب نہ صرف یہ کہ بے شمار ضروریات دین اور متواترات اسلامی کا منکر ہے بلکہ اس کا کلمہ بھی جو دین کی اولین اساس

ہے۔ مسلمانوں سے الگ ہے اور قرآن کریم جو دین کا سرچشمہ ہے یہ اس کی تحریف کا بھی قائل ہے جس گروہ کا کلمہ اور قرآن تک مسلمانوں سے الگ ہو ان کو مسلمان کہنا خود اسلام کی نفی ہے۔

شیعہ مذہب اسلام کے بالمقابل کفر و ارتداد، الحاد و زندقہ اور نفاق و شقاق کی وہ پہلی تحریک ہے جو اسلام کو مٹانے کے لئے کھڑی کی گئی اور چاہا گیا کہ اس کے ذریعے بعد کی امت کا رابطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم سے اور "السابقون الاولون من المھاجرین و الانصار" سے کاٹ دیا جائے تاکہ بعد کی امت کو اسلام کی کسی بات پر اور قرآن کریم کے کسی حرف پر اعتماد نہ رہے اور نظریہ "امامت" پیش کیا گیا تاکہ مسلمانوں کا قبلہ ایمان تبدیل ہو جائے۔

شیعیت اپنی اسلام دشمنی اور نفاق پروری کے باوجود ہمیشہ تقیہ کے سیاہ دبیز پردوں میں مستور رہی۔ جب اس نے نمود و ظہور کی ذرا بھی کوشش کی اس کے کفریہ عزائم ہر کس و ناکس کے سامنے کھل گئے اور وہ فوراً دوبارہ تقیہ کی نقاب سیاہ اوڑھنے پر مجبور ہو گئی۔ یہی حادثہ شیعیت کو ہمارے دور میں امام خمینی کے ذریعے پیش آیا۔

امام خمینی نے مرکز شیعیت۔ ایران۔ میں اقتدار حاصل کیا تو نظریہ "ولایت فقیہ" کے تحت شیعیت نے پر پرزے نکالنے شروع کئے۔ ہمارے مخدوم حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ العالی (جو اس وقت بقید حیات تھے) نے ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت لکھ کر خمینی و شیعی تحریک کے اصل خط و خال اجاگر کر دیئے اور اب اس موضوع پر یہ ان کی دوسری کتاب ہے جو "الفرقان لکھنؤ" کے خاص نمبر کی شکل میں آئی ہے۔ اس ناکارہ کا احساس یہ ہے کہ یہ پندرھویں صدی کے اوائل میں وہ خاص تجدیدی کارنامہ ہے جس کی توفیق حق تعالیٰ شانہ نے حضرت موصوف کو ارزانی فرمائی ہے۔"

(ماہنامہ اقرأ ڈائجسٹ صفحہ ۷ فروری ۱۹۸۸ء شیعیت نمبر)

جناب حامد میر صاحب اپنے کالم قلم کمان میں بہ عنوان "ایک اور سازش" لکھتے ہیں کہ:

"دوسری اطلاع یہ ہے کہ کچھ دن پہلے ایک نوجوان نے کراچی میں مولانا یوسف لدھیانوی کے لواحقین سے رابطہ قائم کیا اور تحفظ کے وعدے پر مولانا شہید کے قاتلوں کو گرفتار کرانے کی پیش کش کی اس نوجوان کو انتظامیہ کے حوالے کر دیا گیا۔ نوجوان نے بتایا اس کا تعلق ایم، کیو، ایم، سے ہے۔ کافی دن پہلے اس کے ایک ساتھی یاور عباس کے والد سردار علی جعفری کو کراچی میں نامعلوم دہشت گردوں نے ہلاک کر دیا۔ یاور عباس نے اپنے والد کے جنازے پر

بدلہ لینے کی قسم کھائی تھی۔ نوجوان نے بتایا کہ یاور عباس نے مولانا یوسف لدھیانوی کو قتل کیا کیونکہ واردات کے دن اسے بھی مذکورہ کاروائی میں شامل ہونے کے لئے کہا گیا۔

نوجوان نے بتایا کہ اس کے پاس مولانا لدھیانوی کے قتل میں الطاف حسین کے ملوث ہونے کا کوئی ثبوت نہیں لیکن یاور عباس ضرور ملوث ہے۔ مولانا لدھیانوی کے اہل خانہ کو تین روز قبل پتہ چلا کہ انہوں نے جس نوجوان کو انتظامیہ کے حوالے کیا تھا اس پر زبردست تشدد کیا گیا۔ اس نے اپنا بیان تبدیل کر دیا اور پھر اسے غائب کر دیا گیا۔

مزید اطلاع یہ ہے کہ ایک منصوبے کے تحت یاور عباس کے والد کو قتل کروا دیا گیا اور پھر اسے کہا گیا کہ قتل میں مولانا لدھیانوی ملوث ہیں تا کہ وہ نفرت و انتقام میں اندھا ہو جائے یہ ساری منصوبہ بندی ایک ایسے مکتبہ فکر نے کی جس کے خلاف مولانا لدھیانوی تمام عمر سرگرم عمل رہے اور جس کے بھارت و اسرائیل سے تعلقات ڈھکے چھپے نہیں۔" (روزنامہ انصاف ۲ جون ۲۰۰۰ء)

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ مولانا محمد یوسف لدھیانوی کے قتل میں اہل تشیع پوری طرح ملوث ہیں۔ اس طبقے کی پشت پناہی حکومت ایران بھرپور طریقے سے کر رہی ہے جس کی وجہ سے حکومت پاکستان مولانا مرحوم کے قاتلوں کو گرفتار کرنے میں بری طرح ناکام ہو گئی ہے۔ کتاب کی پروف ریڈنگ کے دوران یہ خبر نظر سے گذری کہ مولانا کے قاتل گرفتار ہو گئے۔ اسے ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے:

"راولپنڈی سے مولانا یوسف لدھیانوی کا قاتل گرفتار، اعتراف جرم کر لیا۔ بی کے علاقے سے ملزم حسن علی کو مقامی پولیس نے گرفتار کرنے کے بعد کراچی پولیس کے حوالے کر دیا۔ راولپنڈی پولیس نے کراچی میں دہشت گردی کے واقعہ میں شہید ہونے والے معروف عالم دین مولانا یوسف لدھیانوی اور ان کے ڈرائیور عبدالرحمٰن کے قاتلوں کی تلاش کے لئے "مڈنائٹ" آپریشن کرتے ہوئے بی کے علاقہ رنگ پورہ سے ایک دہشت گرد تنظیم کے رہنما کو گرفتار کر لیا۔ ملزم کا نام اور پتہ حسن علی عرف محمد ولد غلام میر سکنہ مکان نمبر ایف۔آئی سی مجاہد ٹاؤن کشمیری امام بارگاہ کراچی بتایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایس ایس پی راولپنڈی نے آن لائن کو بتایا کہ خفیہ ذرائع سے اطلاع ملی تھی کہ کراچی پولیس کو دہشت گردی کے ایک واقعہ میں مطلوب خطرناک ملزم حسین جعفری کے پاس قیام پذیر ہے۔ حسن علی کا تعلق کالعدم دہشت گرد تنظیم سپاہ محمد

سے بتایا جاتا ہے جس نے کراچی جوہر آباد تھانے کے علاقے میں ۱۸ مئی ۲۰۰۰ء کو فائرنگ کر کے معروف عالم دین مولانا یوسف لدھیانوی اور ان کے ڈرائیور عبدالرحمٰن کو شہید کر دیا تھا۔

اس اطلاع پر ایک خصوصی ٹیم تشکیل دی گئی۔ پولیس کی بھاری نفری نے منگل اور بدھ کی درمیانی شب دو بجے چھاپہ مار کر ملزم کو مذکورہ بالا مکان سے گرفتار کر لیا۔ ابتدائی معلومات کے مطابق ملزم نے واردات سے تعلق کا اعتراف کیا ہے جسے بدھ کے روز کراچی سے آنے والی پولیس کی خصوصی ٹیم کے حوالے کر دیا گیا۔ ایس ایس پی نے بتایا کہ ملزم خواہ کتنا بااثر اور کہیں بھی روپوش ہو قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکتا"۔ (روزنامہ اسلام۔ کراچی ۲۹۔۱۱۔۲۰۰۰ء)

اگر علماء اسلام اور مسلمان شیعیت کی روک تھام اور سرکوبی کے لئے اس قدر قربانیاں پیش کر چکنے کے بعد اب بھی بیدار اور متحد نہ ہوئے تو (اللہ نہ کرے) پاکستان میں عنقریب خمینی انقلاب برپا ہو جائے گا۔

غیر ممکن ہے کہ حالات کی گتھی سلجھے اہل تشیع نے بہت سوچ کے الجھائی ہے

اس کے ساتھ ہی شیعیت کی طویل تاریخ زمانہ بزمانہ ابتداء سے آج (یعنی ۲۶ دسمبر ۲۰۰۰ء مطابق ۲۹ شوال المکرم ۱۴۲۱ھ) تک مکمل ہو گئی ہے۔ (فالحمدللہ علیٰ ذٰلک حمداً کثیرا)

فرقہ اثنا عشریہ کے عقائد و نظریات

گذشتہ صفحات میں شیعیت کی تاریخ، اس کے مختلف فرقے اور ان کے عقائد و نظریات پر بحث گذر چکی ہے اب شیعیت کے مرکزی اور سب سے بڑے فرقے اثنا عشریہ کے عقائد و نظریات کی فقط ایک جھلک (بلا تبصرہ) ہدیۂ قارئین کی جا رہی ہے۔ عقیدہ رجعت، تقیہ و متعہ کا اجمالی تعارف پیچھے "امام مہدی" اور "خمینی" کے حالات کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

اہل تشیع مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ہر فرقے کے الگ الگ عقائد و نظریات ہیں لیکن بمصداق "الکفر ملۃ واحدۃ" یہ تمام فرقے آپس کے فروعی اختلافات کے ی دائرہ میں ہیں جسے بانیان شیعیت عبداللہ بن ابی اور عبداللہ بن سبا نے تیار کیا تھا۔ یہ تمام ۔رقے نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی تشکیک اور قرآن کریم کی تحریف میں وہی نقطہ نظر رکھتے ہیں جو ن سبا کا تھا۔ یہ تمام فرقے صحابہ کرامؓ پر اسی طرح سب و شتم کرتے ہیں جس طرح ان کا معلم ل کرتا تھا۔ اہل تشیع کے تمام فرقوں نے نہ صرف مسلمانوں اور ان کے حکمرانوں کے خلاف

سازشوں، ریشہ دوانیوں اور بغاوتوں کے ذریعے اپنی شکستوں کا بدلہ لیا بلکہ انہوں نے اسلام کے بالمقابل اور متوازی عقائد وضع کر کے خود اسلام سے بھی انتقام لے لیا ہے۔

شیعہ کلمہ

مذہب شیعہ کے موجد تو کلمہ کی تبدیلی کی طرف توجہ نہیں دے سکے البتہ اس فریضہ کو متاخرین شیعہ نے بطریق احسن ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیعیت کی امہات الکتب اس کے ذکر اور وجود سے خالی ہیں۔

شیعہ کلمہ کے الفاظ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰهِ وَصِیُّ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ خَلِیْفَتُهٗ بِلَا فَصْلٍ۔

(ادیان عالم اور فرقہ ہائے اسلام صفحہ ۱۸۵ از سید علی حیدر نقوی، شیعہ مذہب حق ہے صفحہ ۲۳ از عبد الکریم مشتاق، علی ولی اللہ صفحہ ج از عبد الکریم مشتاق، نماز جعفریہ صفحہ ۱۶، نماز امامیہ صفحہ ۴، رہنمائے اساتذہ اسلامیات برائے جماعت نہم و دہم مطبوعہ قومی ادارہ نصاب و درسی کتب حکومت پاکستان۔ اسلام آباد)

شیعہ اصول دین و فروع دین

اصول دین پانچ ہیں۔ ا۔ توحید ۲۔ عدل ۳۔ نبوت ۴۔ امامت ۵۔ قیامت

فروع دین چھ ہیں۔ ا۔ نماز ۲۔ روزہ ۳۔ زکوٰۃ ۴۔ خمس ۵۔ حج ۶۔ جہاد

عراق کے مجتہدوں خصوصاً سرکار مرزا محمد حسن شیرازی کے نزدیک فروع دین دس ہیں۔ چھ تو یہی جو اوپر مذکور ہوئے اور باقی چار یہ ہیں۔ ۷۔ امر بالمعروف ۸۔ نہی عن المنکر ۹۔ تولا (یعنی اہلبیت سے اور ان کے دوستوں سے دوستی رکھے) ۱۰۔ تبرا (یعنی اہلبیت کے دشمنوں سے اور ان کے دشمنوں کے دوستوں سے بیزاری رکھے)

(تحفۃ العوام حصہ اول صفحہ ۳۔ ۷، جاگیر فدک صفحہ ۲۰۳ از غلام حسین نجفی، مصباح الظلام صفحہ ۹۔ ۸۷ از مرزا حسن الحائری، اصل و اصول الشیعہ صفحہ ۶۹، ۱۱۳ از شیخ الاسلام محمد حسین آل کاشف الغطاء، ادیان عالم اور فرقہ ہائے اسلام صفحہ ۷۶۔ ۱۸۲ از سید علی حیدر نقوی، اردو دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۸۹۹، ۹۰۲ جلد ۱۱)

شیعہ ارکان اسلام: بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ عَلَی الصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ وَالصَّوْمِ وَالْحَجِّ وَالْوَلَایَۃِ وَلَمْ یُنَادَ بِشَیْءٍ۔ کَمَا نُوْدِیَ بِالْوَلَایَۃِ۔ (اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۱۸ کتاب الایمان والکفر باب دعائم الاسلام)

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور ولایت اور اس

شان کے ساتھ کسی چیز کو نہیں پکارا گیا جتنا ولایت کو

شیعہ ایمانیات

اللہ تعالیٰ پر ایمان، اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر ایمان، قیامت پر ایمان، مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان، عدل پر ایمان۔ (مذہب جعفریہ صفحہ ۔۔ نماز امامیہ صفحہ ۔۔ شیعہ نماز مع ضروریات دین صفحہ ۔۔)

اس سے معلوم ہوا کہ شیعہ ایمانیات سے فرشتوں، تقدیر اور کتب پر ایمان خارج ہے۔ جب قرآن پر ایمان ہی نہ ہو تو دیگر "ایمانیات" کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟

عقیدہ بداء

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مغالطہ لاحق ہوتا رہتا ہے۔ "یقال بدا له اذا ظهر له رای مخالف للرای الاول"۔ جب پہلی رائے کے مخالف رائے ذہن میں آئے اس وقت "بداء" کہا جاتا ہے۔

شیعہ مفسر علامہ طبرسی کے نزدیک بداء کی یہی تعریف ہے لیکن اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے جائز نہیں۔ (تفسیر مجمع البیان صفحہ ۱۸۹ جلد ۲)

موصوف کا اللہ تعالیٰ کے لئے "بداء" کا انکار ائمہ معصومین کے عقیدہ کے خلاف ہے۔ امام کلینی روایت کرتے ہیں کہ:

۱۔ مَا عُبِدَ اللّٰهُ بِشَیْءٍ مِثْلِ الْبَدَاءِ وَفِیْ رِوَایَةٍ۔ مَا عُظِّمَ اللّٰهُ بِمِثْلِ الْبَدَاءِ

(اصول کافی، کتاب التوحید، باب البداء، صفحہ ۳۳۰ جلد ۱)

یہ ملحوظ رہے کہ اصول کافی اہل تشیع کے نزدیک امام غائب کی مصدقہ اور مستند ترین کتاب ہے۔ آقای سید جواد مصطفوی خراسانی لکھتے ہیں کہ "معتبر ترین کتاب بعد از قرآن"

(اصول کافی مقدمہ مترجم صفحہ نمبر ج)

امام جعفر صادق فرماتے ہیں کہ خدا کی بندگی اقرار بداء کے ساتھ جیسی ہوتی ہے کسی اور عقیدہ سے نہیں ہوتی اور ایک روایت میں ہے کہ عظمت الٰہی کا بداء کے برابر کسی اور چیز سے اظہار نہیں ہوا۔

۲۔ لَوْ عَلِمَ النَّاسُ مَا فِی الْقَوْلِ بِالْبَدَاءِ مِنَ الْاَجْرِ مَا فَتَرُوْا عَنِ الْکَلَامِ فِیْهِ۔ (حوالہ مذکور صفحہ ۳۰۲)

امام جعفر صادق فرماتے ہیں کہ اگر لوگوں کو عقیدہ بداء کی تشہیر کے اجر و ثواب کا علم ہو

جائے تو وہ اس کی تشہیر میں غفلت نہ کریں۔

۳۔ مَا تَنَبَّأَ نَبِيٌّ قَطُّ حَتَّى يُقِرَّ لِلّٰهِ بِخَمْسِ خِصَالٍ۔ بِالْبَدَاءِ وَالْمَشِيئَةِ وَالسُّجُودِ وَالْعُبُودِيَّةِ وَالطَّاعَةِ۔ (حوالہ مذکورہ ۱۵۰)

امام جعفر صادق فرماتے ہیں کہ کوئی نبی کبھی ایسا نہیں ہوا یہاں تک کہ وہ اللہ کے لئے پانچ چیزوں کا اقرار کرے۔ بداء، مشیت، سجود، عبودیت اور اطاعت

۴۔ مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا قَطُّ إِلَّا بِتَحْرِيمِ الْخَمْرِ وَ أَنْ يُقِرَّ لِلّٰهِ بِالْبَدَاءِ (حوالہ مذکور)

امام رضا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس نے شراب کو حرام نہ ٹھہرایا ہو اور بداء کا اقرار نہ کیا ہو۔

جناب خمینی نے عقیدہ بداء پر مفصل بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو (کشف الاسرار صفحہ ۸۵-۸۴)

عقیدہ امامت

عقیدہ امامت شیعیت کے تمام فرقوں کی اصل بنیاد اور مذہب شیعہ کا اصل الاصول اور نقطہ ماسکہ ہے۔ دیگر فرقوں کے عقیدہ امامت کا ذکر پیچھے اپنے اپنے مقام پر گذر چکا ہے۔ یہاں صرف اثنا عشریہ کا عقیدہ امامت ہدیۂ قارئین کیا جارہا ہے۔

اہل تشیع کا عقیدہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت عدل اور حکمت ورحمت کے لازمی تقاضے سے نبوت ورسالت کا سلسلہ جاری فرمایا تھا اور لوگوں کی ہدایت ورہنمائی اور ان کی قیادت وسربراہی کے لئے اس کی طرف سے انبیاء ورسل مبعوث ہو کر آتے تھے اور ان کی بعثت ودعوت ہی سے بندوں پر اللہ کی حجت قائم ہوتی تھی اور وہ ثواب یا عذاب کے مستحق ہوتے تھے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انبیاء ورسل کے بعد بندوں کی ہدایت ورہنمائی اور قیادت وسیادت کے لئے اور ان پر حجت قائم کرنے کے لئے "امامت" کا سلسلہ قائم کر کے قیامت تک کے لئے بارہ امام نامزد کر دیئے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت علیؓ (م ۴۰ھ)، ۲۔ حضرت حسنؓ (م ۵۰ھ)، ۳۔ حضرت حسینؓ (م ۶۱ھ) ۴۔ حضرت زین العابدینؒ (م ۹۵ھ)، ۵۔ حضرت محمد باقرؒ (م ۱۱۴ھ)، ۶۔ حضرت جعفر صادق (م ۱۴۸ھ)، ۷۔ حضرت موسیٰ کاظم (م ۱۸۳ھ)، ۸۔ حضرت علی رضا (م ۲۰۳ھ)، ۹۔ حضرت محمد تقی (م ۲۲۰ھ)، ۱۰۔ حضرت علی نقی (م ۲۵۴ھ)، ۱۱۔ حضرت حسن عسکری (م ۲۶۰ھ)

۱۲۔ محمد مہدی، امام العصر و امام زمانہ

یہ بارہ امام انبیاء و رسل ہی کی طرح اللہ کی حجت، معصوم اور مفترض الطاعت ہیں اور مرتبہ و درجہ میں نبی اکرم ﷺ کے برابر اور دوسرے تمام انبیاء و رسل سے افضل اور اعلیٰ ہیں۔ ان اماموں کی امامت کو ماننا اور اس پر ایمان لانا اسی طرح نجات کی شرط ہے جس طرح انبیاء و رسل کی نبوت و رسالت کو ماننا اور ان پر ایمان لانا شرط نجات ہے۔ یہ سب ائمہ صاحب معجزات ہیں۔ ان کے پاس ملائکہ آتے تھے، ان کو معراج بھی ہوتی تھی، ان پر وحی اترتی تھی، ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتابیں نازل ہوتی تھیں۔ یہ سب حضرات عالم ماکان وما یکون تھے۔ تمام انبیاء کے علوم کے جامع تھے۔ ان کے پاس تورات، زبور، انجیل، اور دیگر صحف سماوی اپنی اصل ہیئت میں موجود تھے اور وہ ان کو ان زبانوں میں پڑھتے تھے جن میں وہ نازل ہوئے۔ ان کو اختیار حاصل تھا کہ جس چیز یا جس عمل کو چاہیں حلال یا حرام قرار دیں۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنی موت کا وقت بھی معلوم تھا اور ان کی موت خود ان کے اپنے اختیار میں تھی۔

اہل تشیع کا عقیدہ ہے کہ عالم ارواح میں تمام انبیاء و رسل، تمام فرشتوں اور تمام مخلوق سے عقیدہ امامت پر عہد و پیمان لیا گیا۔ (عین الحیٰوۃ صفحہ ۳۹۔ ۴۰ ملا باقر مجلسی)

شیعہ مجتہد آقا محمد محسن لکھتے ہیں کہ:

"جو کوئی اس حالت میں مر جائے کہ اپنے زمانہ کے امام کو نہ پہچانا ہو تو وہ شرک کی موت مرا۔ بلکہ معرفت امام زمانہ بقدر وسعت و استطاعت حاصل کر کے ارشاد باری تعالیٰ "لا تموتن الا و انتم مسلمون" "تم ہرگز نہ مرو مگر اس حالت میں کہ تم اسلام پر ہو۔" کا مصداق قرار پائیں۔

معرفت امام کے لئے وسعت و استطاعت کے لفظ اس لئے اضافہ کیے گئے کہ حقیقی معرفت اور کنہہ ذات امام کا جاننا ہمارے لئے دشوار ہے۔ چنانچہ جناب امیر علیہ السلام طارق سے فرماتے ہیں۔

کیا کوئی اس امام کا وصف بیان کر سکتا ہے اور معرفت حاصل کر سکتا ہے جو کائنات کے لئے نقطہ اور دائرات کے لئے قطب کی منزلت رکھتا ہو جو جلال کبریا کی شعاع اور ارض و سما کا شرف ہو۔

یا جیسا کہ امام رضا علیہ السلام نے فرمایا۔ معرفت امام تک کس کی رسائی ہو سکتی ہے؟

کون اس کو انتخاب کر سکتا ہے؟ یہ وہ مقام ہے جہاں دانائیاں سرگرداں، خردمندان پریشان، عقل حیران ہے۔ صاحبان عظمت پست، اہل حکمت متحیر، بولنے والوں کی زبانیں بند، صاحبان علم نادان، شعراء گنگ، ادیب عاجز، بلیغ قاصر ہیں کہ امام کی کسی ایک شان کو یا اس کے فضائل سے کسی ایک فضیلت کو بیان کر سکیں۔

اپنے عجز و قصور کا اعتراف کر لیا تو پھر کون اس کا وصف کلی اور توصیف کیہ کر سکے یا اس کے امر سے کسی شی کو سمجھ میں لا سکے۔ شانِ امام وصف واصفین سے ایسی بعید ہے جیسے ہاتھ بڑھانے والوں سے ستاروں کو دوری حاصل ہے۔ یہ امامت آل رسول ﷺ اولاد علی و بتول کے سوا اور کہیں نہ ملے گی۔

البتہ امام کے اوصاف و خصائص کی ایک حد تک معرفت حاصل ہو سکتی ہے اور اسی معرفت کی تکلیف بھی ہے۔ یہی ضروری و لازمی ہے تا کہ امام و ماموم کا فرق ظاہر ہو جائے، خلیفۃ اللہ اور اس کی رعیت میں امتیاز ہو سکے، امام برحق و مدعی باطل میں اشتباہ والتباس باقی نہ رہے۔ از انجملہ بطور مثال امام کی چند صفات و خصوصیات یہاں ذکر کی جاتی ہیں:

امام روئے زمین پر خدا کا امین ہے۔ اس کے بندوں پر اس کی حجت اور اس کے شہروں میں اس کا خلیفہ۔ خدا کی طرف بلانے والا اور حرم خدا کی حفاظت کرنے والا ہے۔ امام امت کے حق میں باوفا دوست، رحم دل باپ، مہربان بھائی اور پشت پناہ ہوتا ہے۔ امام حلال خدا کو حلال اور حرام خدا کو حرام اور حدود الٰہی کو قائم کرتا ہے۔ دین خدا کو پناہ دیتا ہے اور اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف حکمت اور نیک موعظت کے ساتھ بلاتا ہے۔ امام پیاسے کے حق میں خوش گوار ٹھنڈا پانی، راہ ہدایت دکھانے والا اور ہلاکت سے بچانے والا ہوتا ہے۔ امام معصیت سے گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ عمداً، سہواً، نسیاناً از روئے جہل یا علم آشکار اور پوشیدہ ہر طرح ہر حیثیت سے پاک و پاکیزہ ہوتا ہے۔ ہر قسم کے عیب سے بری ہوتا ہے۔ خواہ وہ عیب خلقی ہو جیسے اندھا، لنگڑا، لولا، کانا، ترچھا، گونگا و بہرا، یا اخلاقی ہو مثلاً بخیل، خسیس، بزدل، فحش کہنے والا۔ اسی طرح دنی پیشہ قصابی، حجامی، حلوائی، جولاہا پن وغیرہ سے بری رہتا ہے۔

امام علم و حلم سے آراستہ رہتا ہے۔ امام یکتائے زمانہ ہوتا ہے۔ کوئی اس کے مماثل نہیں ہوتا۔ امام کا نہ کوئی جواب ہوتا ہے نہ اس کا کوئی بدل وہ بے مثل و بے نظیر ہوتا ہے۔ مانگے اور

حاصل کئے بغیر وہ تمام فضل کا مالک ہوتا ہے اور پروردگار عالم اپنے فضل کے ساتھ اس کو مختص فرماتا ہے۔ امام ایسا عالم ہوتا ہے جو کسی طرح کا جہل نہیں رکھتا اور وہ بہادر و جواں مرد ہوتا ہے جو کبھی پست ہمت نہیں ہوتا۔ وہ تقدس و طہارت، زہد و ریاضت اور علم و عبادت کا معدن ہوتا ہے۔

امام اپنے زمانہ کے تمام افراد سے علم و حکم، تقویٰ، حلم، شجاعت، سخاوت و عبادت میں سب سے بہتر و اعلیٰ ہوتا ہے۔ امام ختنہ شدہ اور طاہر پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح سامنے سے دیکھتا ہے اسی طرح پس پشت سے بھی ملاحظہ کرتا ہے۔ امام کا سایہ نہیں ہوتا۔ امام جب متولد ہوتا ہے تو زمین پر اپنی ہتھیلیوں کو رکھ دیتا ہے اور بلند آواز سے شہادتین ادا کرتا ہے۔ امام محتلم نہیں ہوتا۔ نیند کی حالت میں بھی قلب امام بیدار رہتا ہے۔ آنحضرت کی زرہ اس کے جسم پر برابر برابر آتی ہے۔ امام کا بول و براز نظر نہیں آتا اس لئے کہ بحکم خدا زمین اس کو نگل جاتی ہے۔ امام مستجاب الدعوات ہوتا ہے۔ امام کے پاس آنحضرت ﷺ کے ہتھیار اور آپ ﷺ کی تلوار ذوالفقار ہوتی ہے اور ایک صحیفہ بھی ہوتا ہے جس میں تمام دشمنوں کے نام لکھے ہیں جو قیامت تک ہوں گے اور الجامع بھی امام کے پاس رہتا ہے یہ وہ صحیفہ ہے جس کا طول ستر ہاتھ ہے اس میں تمام وہ چیزیں ہیں جن کی اولاد آدم علیہ السلام محتاج ہے اور امام کے پاس جفر اکبر اور اصغر اور مصحف فاطمہ بھی ہوتا ہے۔

امام رضا نے فرمایا بقدر ایک چشم زدن بھی اگر زمین حجت سے خالی ہو جائے تو مع اہل زمین کے زمین فنا ہو جائے اور فرمایا ہم زمین پر خدا کی حجت اور اس کے خلیفہ ہیں اور اس کے اسرار کے رازدار و امین ہیں۔ ہم کلمہ تقویٰ اور ہم عروۃ الوثقیٰ ہیں۔ ہم خدا کی طرف سے نگران اور اس کی مخلوق میں اس کی علامتیں ہیں۔ ہمارے سبب سے زمین و آسمان قائم ہیں۔ ہمارے ہی باعث بارش ہوتی ہے اور رحمت نازل ہوتی ہے۔ ہم میں سے کسی قائم سے خواہ وہ ظاہر ہو یا مخفی زمین خالی نہیں رہتی اگر ایسا ہو تو روئے زمین پر اس طرح تباہی آئے جیسے سمندر میں طوفان سے ہوا کرتی ہے۔ ان کا نور حضرت رسول ﷺ کے نور سے مشتق ہے۔ ان کے نور سے خدا نے عرش، کرسی، لوح، قلم، بہشت، شمس، قمر، کوثر، انبیاء اور اوصیاء کی روحیں اور دوسرے تمام انوار کو خلق کیا ہے۔ نطفۂ معصوم کوثر یا اس نہر سے ہوتا ہے جو عرش کے دونوں طرف جاری ہے پس ایک فرشتہ اس کا پانی لاتا ہے ان کے باپ کو پلاتا ہے اس سے نطفہ ارحام مطہرہ میں ترتیب پاتا ہے۔ اپنی ماں کے شکم میں ائمہ اظہار ذکر خدا کرتے ہیں اور بحالت جنین کلام کرتے ہیں۔ ائمہ ان اشیاء پر

دانا و بینا ہیں جو کہ آسمان اور زمین میں ہیں۔ کوئی عمل نیک و بد ان سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تمام زبانوں کو جانتے ہیں۔ یہاں تک کہ حیوانات کی زبان بھی اور ملائکہ کی صدا سنتے ہیں۔ خداوند عالم ائمہ کے آثار کو زمین سے محو نہیں فرماتا۔ ان کا گوشت جانور نہیں کھاتے اور ان کے جسم پاک دفن کے بعد بھی متغیر نہیں ہوتے۔

ائمہ اطہار زندہ و مردے کی بالین پر از روئے حقیقت تشریف لاتے ہیں۔ ہر ایک امام کی تشریف آوری بوقت نزع و موت بہت سی معتبر کتابوں میں درج ہے۔ ائمہ انہیں بدن عنصریہ سے قیامت کے قبل اپنے حقوق کا بدلہ لینے کے لئے رجعت فرمائیں گے۔"

(علائم الظہور مطبوعہ حق برادرز لاہور صفحہ ۱۳-۱۵-۱۸)

سید الطاف حسین شاہ ہمدانی لکھتے ہیں کہ:

خدا گر علی کو جو پیدا نہ کرتا تو مشکل میں مشکل کشائی نہ ہوتی

اگر علی نہ ہوتے تو۔ اللہ ہوتا عین اللہ نہ ہوتا، اللہ ہوتا لسان اللہ نہ ہوتا۔ اللہ ہوتا تو ید اللہ نہ ہوتا، اللہ ہوتا اسد اللہ نہ ہوتا، اللہ ہوتا وجہ اللہ نہ ہوتا، اللہ ہوتا سیف اللہ نہ ہوتا، اللہ ہوتا صبغۃ اللہ نہ ہوتا، اللہ ہوتا مرضات اللہ نہ ہوتا، اللہ ہوتا کرم اللہ وجہہ نہ ہوتا، خدا ہوتا شیر خدا نہ ہوتا، یزدان ہوتا شیر یزدان نہ ہوتا، رحمٰن ہوتا مظہر رحمٰن نہ ہوتا، "حق" ہوتا "وعلی مع الحق" نہ ہوتا، حق ہوتا حق نمائی نہ ہوتی، محمد ہوتے نائب محمد نہ ہوتا، احمد ہوتے وکیل احمد نہ ہوتا، نبی ہوتے وصی نبی نہ ہوتا، رسول ہوتے نفس رسول نہ ہوتا، خاتم الانبیاء ہوتے خاتم الاولیاء نہ ہوتا، موسیٰ ہوتے جلوہ طور نہ ہوتا، موسیٰ و ہارون کی مثال ہوتی تمثیل منزلت محمد و علی نہ ہوتی، بسم اللہ ہوتی نقطۂ زیبائے بائے بسم اللہ نہ ہوتا، سورۃ یٰسین ہوتی "وکل شیء احصینٰہ فی امام مبین" نہ ہوتا، سورۃ براءۃ ہوتی تبلیغ احکام خداوندی نہ ہوتی، قرآن صامت ہوتا قرآن ناطق نہ ہوتا، قرآن مبین ہوتا امام مبین نہ ہوتا، قرآن ہوتا تفسیر و تاویل قرآن نہ ہوتی، قرآن ہوتا "وعلی مع القرآن" نہ ہوتا، کتاب اللہ ہوتی وارث کتاب نہ ہوتا، کتاب اللہ بقلم قدرت قلب رسول مقبول پر لکھی جاتی مگر بصورت قرآن منصہ شہود پر نہ آتی، نور اول ہوتا کسی کے لئے "من و واحد" کا اعلان نہ ہوتا، نور ہوتا "نور علیٰ نور" نہ ہوتا، اعلان نبوت ہوتا تصدیق نبوت نہ ہوتی، مہر نبوت ہوتی علی بر دوش احمد نہ ہوتا، نظام مصطفیٰ ہوتا انتظام مرتضیٰ نہ ہوتا، شہر علم ہوتا باب علم نہ ہوتا، میدان غدیر خم ہوتا اعلان "من کنت مولاہ"

نہ ہوتا، دعوت ذوالعشیرہ ہوتی اعلان اخوت، وزارت، وصایت اور خلافت نہ ہوتا، انصاف ہوتا "اقضاکم علی" کا اعلان نہ ہوتا، اسلام ہوتا عروج اسلام نہ ہوتا، دین ہوتا یعسوب الدین نہ ہوتا، دین ہوتا تکمیل دین نہ ہوتی، ہجرت ہوتی بستر رسول خالی ہوتا، امام ہوتے امام جن وانس نہ ہوتا، متقی ہوتے امام المتقین نہ ہوتا، حسبنا ہوتا حدیث ثقلین نہ ہوتی، سفینہ نوح گرداب بلا میں ہوتا نجات کا ساماں نہ ہوتا، انصار ہوتے سلطانا نصیرا نہ ہوتا، عالم ہوتے خطیب منبر سلونی نہ ہوتا، نصیری ہوتے نصیری کا خدا نہ ہوتا، کعبہ ہوتا مولود کعبہ نہ ہوتا قبلہ ہوتا قبلہ نما نہ ہوتا، لات وھبل کی خدائی ہوتی وحدت کی جلوہ نمائی نہ ہوتی، بت ہوتے بت شکن نہ ہوتا، جنت ہوتی قسیم الجنت نہ ہوتا، دوزخ ہوتا قسیم النار نہ ہوتا، پل صراط ہوتی پروانہ جنت نہ ہوتا، کوثر ہوتی ساقی کوثر نہ ہوتا، علم ہوتا حامل لوائے علم نہ ہوتا، خیبر ہوتا فاتح خیبر نہ ہوتا، مرحب وعنتر ہوتے حیدر نہ ہوتا، کفار ہوتے قاتل الکفار نہ ہوتا، کلمہ ناد علی کی پکار ہوتی لبیک یا رسول اللہ کی للکار نہ ہوتی، کل کفر ہوتا کل ایمان نہ ہوتا، عمرو بن عبدود کی سپر کا تذکرہ ہوتا ضربت علی کا چرچا نہ ہوتا، فراری ہوتے حیدر کرار نہ ہوتا، ہلاکت ہوتی لولا علی کا اعلان نہ ہوتا، کلمہ ہوتا علی ولی اللہ نہ ہوتا، اذان ہوتی حی علی خیر العمل نہ ہوتا، نماز ہوتی بحالت رکوع زکوٰۃ نہ ہوتی، باطنی وظاہری خلافت ہوتی خلافت بلافصل نہ ہوتی، صدق ہوتا صدیق نہ ہوتا، فرق ہوتا فاروق نہ ہوتا، غالب ہوتے غالب علی کل غالب نہ ہوتا، جبرائیل ہوتا استاد جبرائیل نہ ہوتا، کائنات ہوتی مولائے کائنات نہ ہوتا، جناب سیدہ پاک ہوتیں ہم کفو جناب بتول نہ ہوتا، ارض وسما ہوتے زینت فرش اور زیبائی عرش نہ ہوتی، کشف و شہود کے اسرار ہوتے عقدہ کشائی نہ ہوتی، شمس ہوتا رجعت شمس نہ ہوتی، ضلالت وگمراہی ہوتی ہدایت ورہنمائی نہ ہوتی، حاجتیں ہوتیں حاجت روا نہ ہوتا، مشکلیں ہوتیں مشکل کشا نہ ہوتا، تلوار ہوتی ذوالفقار نہ ہوتی، شاہ ہوتے شاہ مرداں نہ ہوتے، شجاع ہوتے اعلان لافتی نہ ہوتا، سوار ہوتے شاہ سوار دلدل نہ ہوتا، مرد ہوتے مرد میدان نہ ہوتا، چہرے ہوتے ان کی دید عبادت نہ ہوتی، کفار کا لشکر جرار ہوتا حسبنا اللہ ونعم الوکیل کا فرمان نہ ہوتا، حضرت بوعلی شاہ قلندر ہوتے "بندہ مرتضیٰ علی ہستم" نہ ہوتا۔ حضرت لعل شہباز قلندر ہوتے "سگ کوئے شیر یزدانم" نہ ہوتا، نعرے ہوتے نعرہ حیدری نہ ہوتا، مدد ہوتی یا علی مدد نہ ہوتا، دین محمد مصطفیٰ کے باقی ۷۲ فرقے جو حسد (علی) کی پیداوار ہیں ہوتے فرقہ شیعہ (حیدر کرار) نہ ہوتا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ صرف ایک واحد شیعہ فرقہ ہی ہے جس کو دین محمد مصطفیٰ سے خاص مناسبت ہے جس کے باعث وہ صراط مستقیم پر گامزن اور ناجی ہونے کا دعوےدار ہے۔

دین مصطفیٰ کے اگر علی وآلہ بالحق حامی وناصر نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔

حسن وحسین نہ ہوتے گر زمانے میں نبی تو خیر خدا کا بھی نام کیا ہوتا

بخدا اگر علی نہ ہوتے تو دین الٰہی مٹ جاتا۔ سگ در مرتضیٰ الطاف ہوتا مگر محروی قسمت کو نسبت سے بدلنے والا یا علی نہ ہوتا

ہر کس وسیلہ دارد ما بے وسیلہ ایم ما را وسیلہ نیست بجز یا علی علی

(اثنا عشری شیعہ ڈائجسٹ صفحہ ۷۰۰ جولائی ۱۹۸۲ء باہتمام عبدالکریم مشتاق کراچی)

جناب خمینی صاحب عقیدہ امامت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"ہمیں فخر ہے کہ تمام ائمہ معصومین حضرت علی بن ابی طالب سے لے کر انسانیت کے نجات دھندہ حضرت مہدی صاحب الزمان تک جو قادر مطلق کی قدرت سے زندہ اور ہمارے تمام امور کے شاھد ہیں ہمارے امام ہیں"۔ (صحیفہ انقلاب صفحہ ۳۰)

اس عقیدے کی اہمیت کے پیش نظر اسے ایرانی دستور کی دفعہ نمبر ۲ میں "الایمان بالا مامة و القیادة المستمرة" کے تحت شامل کیا گیا ہے۔

خمینی صاحب نے اپنی کتاب میں "نبوت و امامت جزو دین است" کا عنوان قائم کر کے قرآن کی بہت سی آیات میں تحریف معنوی کا ارتکاب کرتے ہوئے ائمہ کی امامت ثابت کی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ "جو شخص اس حالت میں مر گیا کہ اس نے اپنے امام زمانہ کو نہیں پہچانا تو وہ عہد جاہلیت کے مُردوں کی طرح ہے"۔ (کشف الاسرار صفحہ ۱۴۸-۱۴۷)

"امام کو وہ اعلیٰ مقام، بلند درجہ اور تکوینی حکومت حاصل ہوتی ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ان کے حکم واقتدار کے سامنے سرنگوں ہوتا ہے اور ہمارے مذہب کے ضروری اور بنیادی عقائد میں سے یہ عقیدہ بھی ہے کہ ہمارے امام مقام ومرتبہ کی جس بلندی پر فائز ہیں وہاں تک کوئی مقرب فرشتہ اور نبی مرسل بھی نہیں پہنچ سکتا"۔ (الحکومة الاسلامیہ صفحہ ۵۲)

خمینی صاحب کے عقیدہ امامت کی تفصیل پیچھے زیر عنوان "خمینی اپنی تحریرات کے آئینے میں گذر چکی ہے۔

حضرت باقر نے فرمایا: اِنَّ الْحُجَّةَ لَا تَقُوْمُ لِلّٰهِ عَلٰی خَلْقِهٖ اِلَّا بِاِمَامٍ حَتّٰی یُعْرَفَ

(اصول کافی، کتاب الحجۃ، باب ان الحجۃ لاتقوم لله علی خلقه الا بامام صفحہ ۲۱۵ جلد ۱)

خدا کے لئے (رسول خدا کے بعد) مخلوق پر ایسے امام معصوم کے بغیر جو پہچوایا گیا ہو حجت قائم اور تمام نہیں ہوتی۔

حضرت جعفر صادق نے فرمایا:

اَلْحُجَّةُ قَبْلَ الْخَلْقِ وَمَعَ الْخَلْقِ وَبَعْدَ الْخَلْقِ (حوالہ مذکور)

حجت کا وجود خلق کائنات سے پہلے بھی تھا اور تخلیق کے وقت (میثاق کی منزل میں) بھی تھا اور (اختتام) خلقت کے بعد (قیامت میں) بھی رہے گا۔

سید مجم الحسن کراروی ان احادیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"رسول خدا کے بعد امام معصوم کے بغیر خدا کی حجت مخلوقات پر تمام نہیں ہوتی اسی لئے اس نے رسول کے بعد کا انتظام عہد حیات رسول خدا میں بموقعہ غدیر خم فرمادیا تھا۔

اور حدیث نمبر ۲ میں یہ بتایا گیا ہے کہ کوئی عہد حجت خدا سے خالی نہ تھا وہ چاہے خلقت آدم سے پہلے کی منزل ہو یعنی عالم نور ہو یا خلقت آدم کے بعد عالم ذر ہو یا عالم میثاق ہو یا عالم ارواح ہو یا خلقت ارضی ہو۔

علامہ طریحی لکھتے ہیں کہ ایک شخص نے امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مولا میں آپ کے ماننے والوں میں سے ہوں۔ حضرت نے فرمایا میں نے تو تجھے عالم ارواح میں اپنا محب نہیں پایا۔ معلوم ہوا کہ یہ حضرات عالم ارواح میں بھی حجت خدا تھے اور مخلوقات کی نقل و حرکت اور ان کی نیت و عمل سے اسی طرح واقف تھے جس طرح اس عہد ارضی میں ہوتے ہیں"۔ (تصحیح الجعفری صفحہ ۹۹)

حضرت باقر نے فرمایا کہ:

جو شخص اللہ کی اطاعت میں اپنے خیال کے مطابق لگا رہے اور اس کی بے پناہ عبادت کرے لیکن اس کے پاس کوئی ایسا امام نہ ہو جو منصوص من اللہ ہو تو اس کی تمام عبادت اور ہر قسم کی اطاعتی سعی بے کار رائیگاں اور غیر مقبول ہوگی اور وہ شخص گمراہ اور متحیر اور تباہ و برباد ہوگا اور اللہ ایسے شخص کے اعمال کا دشمن ہوگا۔ وَاِنْ مَاتَ عَلٰی هٰذِهِ الْحَالَةِ مَاتَ مِیْتَةَ کُفْرٍ وَنِفَاقٍ۔ وَاعْلَمْ

یَا مُحَمَّدُ اِنَّ اَئِمَّۃَ الْجَوْرِ وَ اَتْبَاعَھُمْ لَمَعْزُوْلُوْنَ عَنْ دِیْنِ اللّٰہِ قَدْ ضَلُّوْا وَ اَضَلُّوْا فَاَعْمَالُھُمُ الَّتِیْ یَعْمَلُوْنَھَا کَرَمَادِ اشْتَدَّتْ بِہِ الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ لَا یَقْدِرُوْنَ مِمَّا کَسَبُوْا عَلٰی شَیْئٍ ذٰلِکَ ھُوَ الضَّلَالُ الْبَعِیْدُ اور اگر وہ اسی حالت میں مر جائے تو کفر اور نفاق کی موت مرے گا۔ اے محمد اچھی طرح جان لو کہ ظلم و جور کے سربراہ اور ان کے ماننے والے دین خدا سے معزول اور دھتکارے ہوئے ہیں۔ بے شک وہ گمراہ ہیں اور لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں اور ان کے وہ اعمال جو وہ بجالا رہے ہیں ان کی مثال اس راکھ جیسی ہے جو تیز ہوا کے جھونکے سے اڑ کر گم ہو جائے اور وہ اس میں سے کچھ نہ بچا سکیں۔ یہی کھلی ہوئی گمراہی ہے۔

(اصول کافی، کتاب الحجۃ، باب معرفۃ الامام و الرد الیہ صفحہ ۳۶۰ جلد ۱)

حضرت جعفر صادق نے فرمایا کہ:

نَحْنُ الَّذِیْنَ فَرَضَ اللّٰہُ طَاعَتَنَا مَنْ عَرَفَنَا کَانَ مُؤْمِنًا وَ مَنْ اَنْکَرَنَا کَانَ کَافِرًا وَ مَنْ لَمْ یَعْرِفْنَا وَلَمْ یُنْکِرْنَا کَانَ ضَالًّا۔ (اصول کافی، کتاب الحجۃ، باب فرض طاعۃ الائمہ صفحہ ۳۷۹ جلد ۱)

ہم ہی وہ ہیں جن کی اطاعت کو اللہ نے فرض قرار دیا ہے۔ جس نے ہمیں پہچانا وہ مومن ہے اور جس نے ہمارا انکار کیا وہ کافر ہے اور جس نے نہ ہمیں پہچانا اور نہ ہی انکار کیا وہ گمراہ ہے۔

حضرت جعفر صادق مزید فرماتے ہیں مَا جَاءَ بِہٖ عَلِیٌّ عَنْ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ اٰخُذُ بِہٖ وَمَا نَھٰی عَنْہُ یُنْتَھٰی عَنْہُ جَرٰی لَہٗ مِنَ الْفَضْلِ مَا جَرٰی لِرَسُوْلِ اللّٰہِ۔

جو کچھ علی بن ابی طالب سے معلوم ہوا سے قبول کرنا چاہیے اور جس چیز سے انہوں نے منع کیا ہو اس سے باز رہنا چاہیے۔ جو فضیلت رسول کریم ﷺ کو حاصل ہے وہی فضیلت حضرت علی کو بھی حاصل ہے۔

رسول کریم ﷺ کو تمام مخلوقات پر فضیلت حاصل ہے۔ حضرت علی پر کسی امر میں عیب لگانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے خدا اور رسول ﷺ پر عیب لگایا جائے اور ان کی چھوٹی یا بڑی بات کو رد کرنا شرک کا درجہ رکھتا ہے۔ حضرت علی اللہ تک پہنچنے کا دروازہ ہیں بغیر ان کے کوئی خدا تک نہیں پہنچ سکتا اور وہ اللہ تک پہنچنے کا راستہ ہیں ان کے بغیر اگر کوئی خدا تک پہنچنا چاہے تو ہلاک ہو جائے گا اور یہی حال تمام ائمہ اہلبیت کا ہے۔ خدا نے ان حضرات کو زمین کا ایسا رکن قرار دیا ہے کہ ان کے بغیر زمین قائم نہیں رہ سکتی وہ اللہ کی حجت بالغہ ہیں۔ زمین کے اوپر اور زمین کے نیچے تری

تک۔ اس کے بعد امام جعفرؑ نے فرمایا کہ حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا کہ میں خدا کی طرف سے قسیم النار والجنت ہوں (جسے چاہوں جنت میں بھیجوں اور جسے چاہوں جہنم میں دھکیل دوں) اور میں ہی فاروق اکبر ہوں اور میں ہی صاحب عصا اور میسم ہوں (یعنی میں ہی بعد رسول اس امت کا نگران ہوں اور یہ جانچنے والا ہوں کہ کون اطاعت کرتا ہے اور کون نہیں کرتا) میرے لئے روح اور تمام ملائکہ نے (یوم میثاق) اسی طرح اقرار کیا ہے جس طرح سرکار دو عالم کے لئے کیا ہے۔ میرے اوپر وہی بار رکھا گیا ہے۔ جو سرکار دو عالم کے اوپر رکھا گیا ہے اور وہ بار خلاق عالم کی طرف سے رکھا گیا ہے۔ وہ قیامت میں لباس نبوت پہنے ہوں گے اور میں لباس امامت سے آراستہ ہوں گا وہ بھی شفاعت اور شہادت کے لئے تکلم کریں گے اور میں بھی۔ مجھے ایسی خصلتیں دی گئی ہیں جو مجھ سے قبل کسی کو نہیں دی گئیں۔ مجھے لوگوں کی موتوں کی حدود کا علم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کس سے کون سا امتحان لیا جائے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ کون حلالی ہے کون نہیں ہے۔ مجھے حق اور باطل کے فاصلہ کا علم ہے۔ مجھ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ جو مجھ سے پہلے گذر گئی اسے بھی جانتا ہوں اور جو ہونے والی بات ہے اس سے بھی واقف ہوں۔ میں اللہ کی طرف سے بشارت دینے والا ہوں۔ یہ تمام باتیں جو میں کہہ رہا ہوں ان سب پر خدا کے حکم سے قادر ہوں اور اسی نے یہ سب قدرت مجھے دی ہے۔

(اصول کافی، کتاب الحجۃ، باب ان الائمۃ ھم ارکان الارض صفحہ ۱۸ جلد ۱)

امام باقرؑ اللہ تعالیٰ کے قول "وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كُلِّهَا" کے متعلق فرماتے ہیں کہ آیات خدا میں "آیاتنا" سے مراد تمام اوصیاء ہیں۔

ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے جب حضرت مصطفیٰ اور ان کے اوصیاء کے آنے کی اپنی امت کو بشارت دی اور انہیں ہدایت کی کہ تم ان پر ایمان لانا تو ان لوگوں نے اس کی تکذیب کی۔ ایک روایت میں ہے کہ جس نے ایک امام کی تکذیب و مخالفت کی اس نے تمام ائمہ کی مخالفت کر دی۔

مطلب یہ ہے کہ ائمہ طاہرین خدا کی نشانیاں ہیں ان میں سے کسی ایک کی تکذیب کل ائمہ کی تکذیب کے مترادف ہے
(صحیح البصری صفحہ ۱۳۰)

امام باقرؑ آیت "هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ" کے متعلق فرماتے ہیں

ہم ہی وہ ہیں جو جانتے ہیں اور ہمارے ہی دشمن وہ ہیں جو کچھ نہیں جانتے اور ہمارے ہی شیعہ صاحبان عقل ہیں۔ (اصول کافی، کتاب الحجۃ، باب فی من وصفہ اللہ تعالیٰ فی کتابہ بالعلم ہم الائمۃ علیہم السلام جلد ۱ صفحہ ۳۰۹)

باقر مجلسی لکھتے ہیں کہ یہاں پر استفہام انکاری ہے یعنی عالم اور جاہل ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔ ائمہ طاہرین ہی وہ ہیں جو ہر اس چیز کو جانتے ہیں جس کی طرف امت محمد محتاج ہوتی ہے اور اولوالالباب سے صاحبان عقل مراد ہیں جو بلاشبہ اہل تشیع ہیں کیونکہ یہی علم و امامت کی فضیلت سے واقف ہیں اور انہوں نے ہی اعلم زمانہ اور افضل کائنات کو امام مانا ہے یہ آیت ائمہ اثنا عشر کی امامت پر بھی دلالت کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ائمہ ہر زمانے میں ان لوگوں سے اعلم تھے جو خلافت کے ناحق مدعی رہے ہیں۔ (الصحیح البخری صفحہ ۱۲۷)

امام باقر آیت "یَوْمَ نَدْعُوا کُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ" کے متعلق نبی ﷺ کا فرمان نقل کرتے ہیں کہ میں اللہ کا رسول ہوں تمام لوگوں کی طرف لیکن (جب میں دنیا سے بظاہر چلا جاؤں گا تو) اللہ کی طرف سے میرے اہلبیت میں سے لوگوں کے لئے امام میرے بعد رہبری اور رہنمائی کے لئے (یکے بعد دیگرے قیامت تک) ہوں گے۔ (سنو پھر ایسا ہوگا کہ) "فَیُکَذِّبُوْنَ وَیَظْلِمُهُمْ اَئِمَّةُ الْکُفْرِ وَالضَّلَالِ وَاَشْیَاعُهُمْ" جو کفر اور گمراہی کے پیشوا ہوں گے اور ان کے ماننے والے خدائی پیشواؤں کی تکذیب کریں گے اور ان پر ظلم ڈھائیں گے۔ پس جو ائمہ اہلبیت کو دوست رکھے گا اور ان کی پیروی و تصدیق کرے گا تو وہ مجھ سے ہے اور میرے ساتھ ہوگا اور عنقریب ہی مجھ سے ملے گا۔ "اَلَا وَمَنْ ظَلَمَهُمْ وَکَذَّبَهُمْ فَلَیْسَ مِنِّیْ وَلَا مَعِیْ وَاَنَا مِنْهُ بَرِیْءٌ" آگاہ ہو کہ جو ہمارے اہلبیت پر ظلم کرے گا اور ان کی تکذیب کرے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور نہ وہ آخرت میں میرے ساتھ ہوگا اور میں اس سے بالکل بیزار اور بری ہوں گا۔
(الصحیح البخری صفحہ ۱۳۳)

حضرت جعفر صادق نے فرمایا کہ تین قسم کے لوگ ایسے ہیں کہ قیامت کے دن خدا نہ ان سے بات کرے گا۔ نہ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا اور ان کے لئے بڑا دردناک عذاب ہوگا (۱) وہ شخص جو اللہ کی طرف سے ناحق امامت کا دعویٰ کرے (۲) وہ شخص جو کسی بھی امام برحق کی امامت سے انکار کرے (۳) وہ شخص جو پہلے (مدعی امامت) اور دوسرے (یعنی منکر امامت)

کے بارے میں یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ (ایسے غلط) لوگوں کا بھی اسلام میں کچھ حصہ ہے۔

(الصحیح الصغری صفحہ ۲۱۸)

حضرت جعفر صادق آیت "فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ" کے متعلق فرماتے ہیں کہ خداوند عالم نے لوگوں کو ہماری ولایت کے ذریعے سے اسی وقت آزما اور پہچان لیا تھا کہ کون مومن ہے اور کون کافر؟

(حوالہ مذکور صفحہ ۳۲۱)

حضرت جعفر صادق نے آیت "وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَى اللَّهِ" کے متعلق فرمایا کہ

كُلُّ مَنْ زَعَمَ أَنَّهُ إِمَامٌ وَلَيْسَ بِإِمَامٍ. قُلْتُ وَإِنْ كَانَ فَاطِمِيًّا عَلَوِيًّا؟ قَالَ وَإِنْ كَانَ فَاطِمِيًّا عَلَوِيًّا۔ اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جس نے امام نہ ہوتے ہوئے امامت کا دعویٰ کیا۔ میں نے کہا خواہ وہ حضرت فاطمہ اور حضرت علی کی اولاد سے ہو؟ فرمایا۔ ہاں اگرچہ فاطمی علوی ہو۔ (اصول کافی۔ کتاب الحجۃ۔ باب من ادعی الامامۃ ولیس لھا باھل صفحہ ۱۹۹ جلد ۲)

ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں کہ مرتبہ امامت نظیر درجہ نبوت ہے، امام نبی ﷺ کی طرح معصوم ہے، قبر میں امامت کے متعلق سوال ہوگا اور انکار امامت کفر ہے۔ (حق الیقین صفحہ ۲۷، ۴۰، ۳۹۹، ۵۱۹)

موصوف اپنی ایک دوسری کتاب میں لکھتے ہیں کہ: عبادت ائمہ کی امامت کے اعتقاد کے ساتھ مشروط ہے۔ عالم ارواح میں جملہ انبیاء و مخلوق سے امامت علی و ائمہ کا اقرار لیا گیا، نبی اکرم ﷺ سے باز پرس ہوگی کہ آپ نے بعد کے خلیفہ بنایا تھا تو وہ کہیں گے علی بن ابی طالب کو، افعال صلوٰۃ بدن ہے اور روح صلوٰۃ ولایت علی وائمہ ہے بغیر ولایت علی کے نمازی عذاب سے نہیں بچ سکتا۔ (عین الحیات صفحہ ۱۰۹، ۱۳۰، ۱۸۷، ۳۰۳)

موصوف کے نزدیک امامت کا درجہ نبوت سے بالاتر ہے "کہ امامت بالاتر از رتبہ پیغمبری است" (حیات القلوب صفحہ ۱۰ جلد ۳)

"وحق ایں است کہ در کمالات و شرائط و صفات فرق میان پیغمبر و امام نیست" اور حق بات یہ ہے کہ کمالات و شرائط و صفات میں پیغمبر اور امام کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا۔

جناب خمینی صاحب نے "نظریۂ امامت" کو مزید وسعت دی ہے اور نبی و امام کی خصوصیات و اختیارات ان کے نائبین یعنی فقہاء و مجتہدین میں بھی ثابت کیے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے

ہیں کہ:

"جب کوئی عالم و عادل فقیہ حکومت کی تشکیل کے لیے اٹھ کھڑا ہو تو وہ معاشرے اور اجتماعی معاملات میں ان تمام امور و اختیارات کا مالک ہوگا جو نبیؐ کے زیر اختیار تھے اور تمام لوگوں پر اس کی سمع و طاعت واجب ہوگی اور یہ صاحب اقتدار فقیہ نظام حکومت سماجی مسائل اور امت کی سیاست کے جملہ معاملات کا اسی طرح مالک و مختار ہوگا جس طرح نبیؐ اور امیر المومنین (حضرت علیؓ) مالک و مختار تھے"۔ (الحکومۃ الاسلامیہ صفحہ ۴۹)

خمینی صاحب کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کے ائمہ کائنات کے ذرے ذرے پر متصرف ہیں اور پوری دنیا ان کے زیر اقتدار ہے نیز ائمہ رسولؐ ہی کی طرح مفترض الطاعت اور معصوم ہیں ہر فرد بشر پر ان کی پیروی اور فرمانبرداری فرض اور ضروری ہے جبکہ "ولایت فقیہ" کے نظریہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ائمہ کی عدم موجودگی یا ان کی غیبت کے زمانہ میں فقیہ، عالم و عادل ائمہ کے نائب ہونے کی حیثیت سے ان کے تمام اختیارات کا مالک ہوگا تو اس نظریہ کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ فقیہ عادل کا اقتدار کائنات کے ذرے ذرے پر ہے اور اس کی اطاعت و پیروی بھی خدا اور رسول کی اطاعت کی طرح فرض ہے اور اس کی اطاعت سے انحراف کرنے والا خدا اور رسول کی اطاعت سے انحراف کرنے والا متصور ہوگا۔ اسی طرح فقیہ سے محبت خدا، رسول اور ائمہ سے محبت ہے اور اس سے بغض خدا، رسول اور ائمہ سے بغض ہے۔ ان اقتباسات سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ اہل تشیع کا عقیدہ امامت اور نظریہ ولایت فقیہ ختم نبوت کے منافی اور نبوت و الوہیت کا مرکب ہے جس کا اسلام کے ساتھ کوئی دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔

عقیدہ تحریف قرآن

قرآن کریم کے متعلق پہلے اسماعیلی شیعوں کا عقیدہ ملاحظہ فرمائیں:

اس فرقہ کے ایک محقق ڈاکٹر زاہد علی (سابق پروفیسر عربی اور وائس پرنسپل نظام کالج حیدر آباد دکن) کی تالیف "ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام" کے مطابق ان کا عقیدہ قرآن کے متعلق یہ ہے کہ:

"جس طرح یہود و نصاریٰ نے اصلی تورات اور انجیل کو چھوڑ کر اپنی رائے اور قیاس سے علیحدہ کتابیں جمع کر لیں مسلمانوں نے بھی اسی طرح کیا۔ رسول خدا نے کلام اللہ جمع کر کے

اسے اپنے اصحاب کے سامنے اپنے وصی کے سپرد فرمایا یہ لوگ اس سے بے پروا ہو گئے اور اپنی رائے اور قیاس سے ایک الگ قرآن جمع کیا۔ اس کے بعد خلیفہ ثالث نے شیخین کا جمع کیا ہوا نسخہ جلا ڈالا اور ایک دوسرا نسخہ تیار کیا پھر حجاج آیا اور اس نے خلیفہ مذکور کے نسخے کو لے کر آگ میں جھونک دیا اس کے بعد اس نے جو چاہا نکال دیا اور اپنی کتاب تالیف کی جواب ان کے پاس موجود ہے۔" (ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام مقدمہ "سیز ہم)

ڈاکٹر زاہد علی نے ان اختلافات کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں جو مسلمانوں کے مروجہ قرآن اور حضرت علیؓ کے مرتب کردہ قرآن میں پائی جاتی ہیں مثلاً سورۃ مائدہ کی آیت "یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ" (حضرت علیؓ کے قرآن کی رو سے) یوں تھی "یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ فِیْ عَلِیٍّ۔ (حوالہ مذکور صفحہ ۵۲۷)

ان کے ہاں تاویل سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید کا صحیح مفہوم اس کے ظاہری الفاظ میں نہیں ہوتا ان الفاظ کے باطنی معانی ہوتے ہیں جن کا علم ائمہ ہی کو ہوتا ہے۔ قرآن کا حقیقی مفہوم ان ہی باطنی معانی (یا تاویل) کی رو سے متعین ہو سکتا ہے اسی بناء پر نبی ﷺ کو رسول ناطق (یعنی ظواہر پر حکم کرنے والا) اور وصی کو رسول صامت (یعنی باطن پر حکومت کرنے والا) کہا جاتا ہے۔ تاویل کی بین مثال "لا الٰہ الا اللہ" کے باطنی معانی ہیں یعنی "لا امام الا امام الزمان"

(حوالہ مذکور صفحہ ۴۰۸)

یا مثلاً وضوء سے مراد حضرت علیؓ ہیں کیونکہ وضو اور علی ہر ایک میں تین تین حرف ہیں اور صلوٰۃ سے مراد آنحضرتؐ ہیں کیونکہ صلوٰۃ اور محمد ہر ایک میں چار حرف ہیں لہٰذا "لا صلوٰۃ الا بوضوء" کے معنی ہیں مولانا علی کی وصایت کے اقرار کے بغیر آنحضرت کی نبوت کا اقرار بے معنی ہے۔

(حوالہ مذکور صفحہ ۴۳۳)

یا مثلاً قرآن کریم میں جو آیا ہے اللہ تعالیٰ نے آدم کو شجر ممنوعہ کے استعمال سے منع کیا تھا تو اس سے مراد یہ ہے کہ "امام مستقر مولانا ابو طالب نے آنحضرت ﷺ کو منع فرمایا تھا کہ تم (علم) تاویل کسی کو نہ بتانا۔ یہ صرف مولانا علی کا حق ہے۔ ظالم اول (ابلیس) نے دھوکے سے کچھ علم باطن آنحضرت ﷺ سے سیکھ لیا یہ آپ کا پہلا گناہ ہے۔ آپ کا پچھلا گناہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی ایک بیوی سے یہ راز کہہ دیا کہ تمہارے باپ میرے وصی کا حق ظلم سے چھین

لیں گے جس طرح قابیل نے ہابیل کا حق چھین لیا۔ (حوالہ مذکورہ صفحہ ۳۰۴)

یا مثلاً "الٓمٓ ذلك الكتاب لا ريب فيه" میں ذٰلک الکتاب سے اشارہ مولانا علی کی طرف ہے۔ "ولئن اجتمعت الانس و الجن علىٰ ان ياتوا بمثل هذا القرآن" یہاں قرآن سے مراد مولانا علی اور ائمہ ہیں (حوالہ مذکورہ صفحہ ۵۵۱)

غرضیکہ ان کے ہاں قرآن کریم کی تمام آیات کا مفہوم اس طرح تاویل کی رو سے متعین کیا جاتا ہے اور یہ تاویلات بھی بدلتی رہتی ہیں۔ اس کتاب میں قرآن مجید کی سورتوں، آیتوں اور حروف کی تاویلات کی بیسیوں مثالیں پائی جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو "ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام" فصل نمبر ۱۶ تا نمبر ۲۳ صفحہ نمبر ۲۷۶ تا صفحہ نمبر ۵۶۱"

شیعہ اثنا عشری اور عقیدہ تحریف قرآن

اثنا عشریہ کا عقیدہ ہے کہ موجودہ قرآن محرف ہے اس میں اسی طرح تحریف ہوئی ہے جس طرح اگلی آسمانی کتابوں تورات، انجیل وغیرہ میں ہوئی تھی۔ شیعہ کی کتب حدیث میں ان کے ائمہ معصومین کی روایات جمع کی گئی ہیں (جن پر مذہب شیعہ کا دارومدار ہے) خود ان کے اکابر محدثین و مجتہدین کے بیان کے مطابق دو ہزار سے زیادہ ائمہ معصومین کی وہ روایات ہیں جن سے قرآن کا محرف ہونا ثابت ہوتا ہے۔

ان روایات کے بارے میں شیعہ علماء و مجتہدین نے یہ اقرار بھی کیا ہے کہ روایات متواتر ہیں اور تحریف قرآن پر ان کی دلالت صاف اور صریح ہے اور یہی ان کا عقیدہ ہے۔ پوری شیعی دنیا میں حسب ذیل صرف چار افراد نے مصلحتاً اور تقیۃً عقیدہ تحریف کا انکار کیا ہے:

۱۔ صدوق ابن بابویہ قمی (م ۳۸۱ھ) ۲۔ شریف مرتضی (م ۴۳۶ھ)

۳۔ شیخ ابوجعفر طوسی (م ۴۶۰ھ) ۴۔ ابوعلی طبرسی (م ۵۴۸ھ)

لیکن شیعی دنیا نے ان چار حضرات کے موقف کو قبول نہیں کیا بلکہ ائمہ معصومین کی متواتر اور صریح روایات کے خلاف ہونے کی وجہ سے اسے رد کر دیا۔ اس سلسلے میں اہل تشیع کے عظیم المرتبت محدث و فقیہ سید نعمت اللہ الموسوی الجزائری لکھتے ہیں کہ:

"اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ہمارے ان حضرات نے یہ بات (قرآن میں عدم تحریف) بہت سی مصلحتوں کی وجہ سے اپنے عقیدے اور ضمیر کے خلاف کہی ہے۔ یہاں کا عقیدہ

کیسے ہو سکتا ہے جبکہ خود انہوں نے اپنی کتابوں میں بڑی تعداد میں وہ حدیثیں روایت کی ہیں جو بتلاتی ہیں کہ قرآن میں ہر طرح کی تحریف ہوئی ہے اور یہ کہ فلاں آیت اس طرح نازل ہوئی تھی پھر اس میں یہ تبدیلی کر دی گئی ہے"

(الانوار النعمانیہ صفحہ ۳۵۸)

موصوف واضح الفاظ میں یہ اقرار کر رہے ہیں کہ ان چار حضرات کے مذہب کا صحیح ہونا تو درکنار خود ان کا اپنا مذہب بھی یہ نہ تھا۔ انہوں نے تقیۃً قرآن کے غیر محرف ہونے کا اعلان کیا اگر ان کا واقعی یہ عقیدہ ہوتا تو وہ اپنی کتابوں میں ان سینکڑوں روایات کی کو تخریج نہ کرتے جو تحریف پر دلالت کرتی ہیں۔

اہل تشیع کا دعویٰ ہے کہ قرآن میں پانچ قسم کی تحریف ہوئی ہے۔ (۱) بعض سورتیں، سورتوں میں سے بعض آیات اور آیات میں سے بعض الفاظ خارج کر دیے گئے۔ (۲) بعض سورتوں میں کچھ آیات اور آیات میں بعض الفاظ کا اضافہ۔ (۳) الفاظ میں تبدیلی کا دعویٰ۔ (۴) حروف میں تبدیلی۔ (۵) سورتوں، آیتوں اور لفظوں میں ترتیب کی تبدیلی۔

شیعی دنیا کے عظیم مجتہد اور خاتم المحدثین علامہ حسین بن محمد تقی نوری طبرسی (م ۱۳۲۰ھ) نے "فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الارباب" کے نام سے ایک مستقل کتاب اسی موضوع پر تصنیف کی ہے جسے اہل تشیع نے ایک عظیم کارنامہ قرار دیتے ہوئے مصنف کو "مجلسی ثانی" کا بہت بڑا اعزاز الاٹ کیا

(تذکرہ محدثین شیعہ صفحہ ۱۹۷)

اور مصنف کی وفات کے بعد انہیں بڑے احترام و اعزاز کے ساتھ سب سے بڑے مقدس مقام "مشہد مرتضوی" میں دفن کیا۔

چنانچہ شیعہ مجتہد عباس قمی (م ۱۳۵۹ھ) لکھتا ہے کہ!

"و دفن فی حجرۃ امیر المومنین فی الصحن الشریف"

حسین نوری امیر المومنین کے بالکل قریب مشہد مرتضوی کے صحن میں دفن کیے گئے ہیں۔

(الکنی والالقاب صفحہ ۲۳۸ جلد ۳)

یہ ملحوظ رہے کہ "مشہد مرتضوی" اہل تشیع کے نزدیک "اقدس البقاع" یعنی روئے زمین کا مقدس ترین مقام ہے۔ نوری طبرسی نے اپنی کتاب میں ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید میں ہر طرح کی تحریف ہوئی ہے جو جمہور شیعہ محدثین کا مذہب ہے۔ نوری طبرسی نے اپنی اس کتاب

میں ایک سو صفحات میں (از صفحہ نمبر ۱۵۳ تا نمبر ۲۵۱) سورۃ فاتحہ سے لے کر آخر قرآن تک ان تمام مقامات کی نشاندہی کی ہے جن میں تبدیلی کردی گئی ہے اور ائمہ معصومین کی روایات کے ذریعے بتایا ہے کہ فلاں آیت اس طرح نازل ہوئی تھی اور منافقوں نے اس کو اس طرح بدل دیا۔ اگر کوئی چاہے تو ائمہ معصومین کی ان روایات کی روشنی میں قرآن کریم کا ایک صحیح نسخہ تیار کرسکتا ہے جو ائمہ معصومین کے ارشادات کے مطابق قرآن کریم کا صحیح نسخہ کہلانے کا مستحق ہوگا۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مذہب شیعہ کی بنیاد قرآن کی عداوت پر رکھی گئی ہے۔ جس شخص نے بھی غور وانصاف کے ساتھ مذہب شیعہ اور اس کی کتب اصول وفروع کا مطالعہ کیا ہے وہ ضرور اس بات کی شہادت دے گا کہ اہل تشیع کی رگ رگ میں قرآن کریم کی عداوت بھری ہوئی ہے۔ لہٰذا موجودہ قرآن پر کسی شیعہ کا ایمان نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ ان کے قرآن پر عدم ایمان کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ موجودہ قرآن کے جامعین، محافظین، ناقلین اور ناشرین خلفائے ثلاثہؓ اور صحابہ کرامؓ ہیں جو نہ صرف یہ کہ غیر معصوم ہیں بلکہ (العیاذ باللہ) وہ منافق، کافر اور مرتد ہیں۔ اس لئے ان کے نزدیک موجودہ قرآن بعینہٖ وہ قرآن نہیں جو نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوا تھا اور جسے چھوڑ کر آپ ﷺ دنیا سے رخصت ہوئے تھے بلکہ یہ منافقوں اور مرتدوں کا ترمیم کردہ ہے۔

امام اہلسنت مولانا عبدالشکور لکھنوی لکھتے ہیں کہ:

۱۔ تمام شیعہ اس بات پر متفق ہیں کہ یہ قرآن شریف جو اس وقت دنیا میں موجود ہے اور ہر وقت یہی قرآن مجید مسلمانوں کے پاس رہا۔ یہ قرآن خلفائے ثلاثہؓ کے اہتمام وانتظام سے جمع ہوا اور انہیں کے ذریعے سے تمام عالم میں پھیلا

۲۔ اس قرآن کی کوئی قابل وثوق تصدیق شیعوں کی کتابوں میں ان کے ائمہ معصومین سے منقول نہیں۔

۳۔ حضرات خلفائے ثلاثہؓ کے متعلق شیعوں کا بلا اختلاف یہ اعتقاد ہے کہ وہ نہ صرف مخالف دین بلکہ معاذ اللہ دشمن دین تھے اور خلاف فطرت سازش کرنے میں ایسے مشاق تھے کہ ناممکن کاموں کو بھی بہ آسانی کرڈالتے تھے۔ علاوہ ازیں اس مافوق الفطرت طاقت کے تینوں خلیفہ ایک بڑی شوکت وباقوت سلطنت اور بڑے باعظمت تاج وتخت کے مالک بھی رہے ان

تینوں باتوں کو غور کرنے کے بعد انصاف سے بتاؤ کہ قرآن مجید کا کیا اعتبار رہ گیا۔ دین کی اتنی بڑی چیز اس دین کے دشمن کے ہاتھ سے ملے اور دشمن بھی کیسا طاقتور اور پھر اس کے بعد کاذب و خائن بھی ہو کسی دوسرے کے ذریعے سے اس کی تصدیق بھی نہ ہو تو کیا وہ چیز لائق اعتبار ہو سکتی ہے؟ اور کس طرح یہ اطمینان ہو سکتا ہے کہ اس دشمن نے اس میں کچھ تصرف نہ کیا ہوگا؟ حاشا ثم حاشا ہرگز نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ کسی شیعہ کا ایمان قرآن شریف پر نہیں ہو سکتا۔

(پارہ نمبر ۱ صفحہ ۱۰ تحت "عقیدۃ اہل السنۃ فی الشیعۃ تحریف القرآن)

امام باقر فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے نبی اکرم ﷺ کی وفات کے ساتویں دن عوام سے خطاب فرمایا اور یہ خطاب اس وقت کیا گیا جب آپ قرآن کریم کے جمع کرنے اور اس کو اکٹھا کرنے سے فارغ ہوئے تھے۔ (یہ جمع شدہ قرآن حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کو پہنچایا تو انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اس وقت حضرت علیؓ نے فرمایا)

"فَاِنَّ الذِّکْرَ الَّذِیْ عَنْہُ ضَلَّ وَ السَّبِیْلَ الَّذِیْ عَنْہُ مَالَ وَالْاِیْمَانَ الَّذِیْ بِہٖ کَفَرَ وَ الْقُرْآنَ الَّذِیْ اِیَّاہُ ھَجَرَ وَ الدِّیْنَ الَّذِیْ بِہٖ کَذَّبَ" بے شک ذکر وہی تھا جس سے وہ گمراہ ہو گیا اور راستہ وہی تھا جس سے وہ پھر گیا اور ایمان وہی تھا جس سے اس نے انکار کر دیا اور قرآن وہی تھا جس کو اس نے قبول نہ کیا اور دین وہی تھا جس کی اس نے تکذیب کی۔

(کتاب الروضۃ من الکافی صفحہ ۱۸ جلد ۸ خطبۃ الوسیلۃ بحوالہ حدیقہ جعفریہ صفحہ ۱۵۵ جلد ۲)

حضرت باقر نے فرمایا کہ

"مَا ادَّعٰی اَحَدٌ مِنَ النَّاسِ اَنَّہٗ جَمَعَ الْقُرْآنَ کُلَّہٗ کَمَا اُنْزِلَ اِلَّا کَذَّابٌ وَمَا جَمَعَہٗ وَحَفِظَہٗ کَمَا نَزَّلَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی اِلَّا عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ عَلَیْہِ السَّلَامُ وَالْاَئِمَّۃُ مِنْ بَعْدِہٖ"

(اصول کافی۔ کتاب الحجۃ باب انہ لم یجمع القرآن کلہ الا الائمۃ وانہم یعلمون علمہ کلہ۔ صفحہ ۲۲۸ جلد ۱)

کوئی آدمی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے سارے قرآن کو جمع کر لیا ہے جیسا کہ اتارا گیا مگر وہی آدمی کہے گا جو بہت بڑا جھوٹا ہوگا اور نہیں جمع کیا قرآن کو اور نہ ہی یاد کیا اس کو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نازل کیا سوائے حضرت علیؓ اور اماموں کے جو ان کے بعد ہوئے ہیں۔

اسی باب کی دوسری حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ:

"مَا یَسْتَطِیْعُ اَحَدٌ اَنْ یَّدَّعِیَ اَنَّ عِنْدَہٗ جَمِیْعَ الْقُرْآنِ کُلِّہٖ ظَاہِرِہٖ وَبَاطِنِہٖ غَیْرَ

الاوصیاء (حوالہ مذکور)

کوئی آدمی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے پاس ظاہر اور باطن کے اعتبار سے پورا قرآن ہے سوائے اوصیاء یعنی ائمہ کرام کے

حضرت جعفر صادق نے فرمایا کہ:

حضرت علیؓ نے جب وہ نسخہ تحریر کر لیا اور اس کی کتابت سے فراغت پائی تو آپ نے لوگوں سے فرمایا یہ ہے اللہ تعالیٰ کی کتاب جس کو اس نے اپنے پیغمبر محمد ﷺ پر نازل فرمایا۔ میں نے اسے دو تختیوں سے جمع کیا۔ لوگوں نے یہ سن کر کہا کہ نبی اکرم ﷺ پر اترنے والا قرآن تو یہ ہمارے پاس ہے اور اس صحیفہ میں موجود ہے ہمیں آپ کے جمع کردہ قرآن کی کوئی ضرورت نہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا:

"اَمَا وَاللّٰهِ مَا تَرَوْنَهُ بَعْدَ يَوْمِكُمْ هٰذَا اَبَدًا اِنَّمَا كَانَ عَلَيَّ اَنْ اُخْبِرَكُمْ حِيْنَ جَمَعْتُهُ لِتَقْرَؤُهُ"

اللہ کی قسم اس دن کے بعد ہمیشہ کے لئے تم اس قرآن کو نہ دیکھ سکو گے۔ مجھ پر لازم تھا کہ جمع کرنے کے بعد تم کو اس کی اطلاع کرتا تاکہ تم اسے پڑھتے۔

(اصول کافی۔ کتاب فضل القرآن۔ باب ۳ و صفحہ ۶۳۳ جلد ۲)

حضرت علیؓ نے یہ قرآن مصحف فاطمہؓ سے نقل کیا۔

حضرت جعفر صادق فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس حضرت فاطمہؓ کا مصحف بھی ہے اور وہ کیا جانیں کہ مصحف فاطمہؓ کیا ہے (راوی کہتا ہے کہ) میں نے عرض کیا وہ مصحف فاطمہؓ کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا:

"مُصْحَفٌ فِيْهِ مِثْلُ قُرْآنِكُمْ هٰذَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَ اللّٰهِ مَا فِيْهِ مِنْ قُرْآنِكُمْ حَرْفٌ وَاحِدٌ" وہ قرآن ہے تمہارے قرآن جیسے تین قرآن اس میں آ جائیں۔ اللہ کی قسم تمہارے قرآن کا ایک حرف بھی اس میں نہیں ہے۔

(اصول کافی، کتاب الحجۃ، باب فیہ ذکر الصحیفۃ و الجفر و الجامعۃ و مصحف فاطمۃ صفحہ ۲۳۹ جلد ۱)

اس باب کی دوسری حدیث میں حضرت جعفر صادق فرماتے ہیں کہ:

مصحف فاطمہ میں ہے کہ فرقہ زنادقہ ۱۲۸ھ میں ظاہر ہوگا (راوی نے کہا کہ) میں

نے عرض کیا مصحف فاطمہؑ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو دنیا سے اٹھایا تو حضرت فاطمہؑ کو اس واقعہ سے ایسا غم و رنج لاحق ہوا جس کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے غم سے تسلی دینے کے لئے ان کے پاس ایک فرشتہ بھیجا جو ان سے باتیں کرے۔ حضرت فاطمہؑ نے حضرت علیؑ کو اس سے آگاہ کیا تو انہوں نے فرمایا کہ جس وقت آپ کو اس فرشتہ کے آنے کا احساس ہو تو مجھے اطلاع کرنا۔ چنانچہ حضرت فاطمہؑ نے فرشتہ کے آنے پر ان کو آگاہ کیا۔ حضرت علیؑ نے فرشتہ کی باتوں کو لکھنا شروع کیا یہاں تک کہ انہوں نے ایک مصحف تیار کرلیا۔ (حوالہ مذکور)

حضرت حسن عسکری فرماتے ہیں کہ قرآن کو "اہل قرآن سے حاصل کرنا چاہیے نہ کہ غیر سے۔ قرآن اور اس کی تاویل کو ہم اہلبیت سے یا ہمارے وکیلوں سے جو ہمارے اور ہمارے شیعوں کے درمیان واسطہ ہیں اور ہمارے احکام ان کو پہنچاتے ہیں اخذ کرے۔ نہ کہ مجادلہ کرنے والوں کی راؤں اور قیاس کرنے والوں کے قیاسوں سے حاصل کرے۔ جو کوئی قرآن کے معنی اپنی رائے سے بیان کرے اور وہ اتفاق سے درست بھی ہوں تو بھی اس نے غیر اہل سے اس کے اخذ کرنے میں جہالت اور نادانی کی"۔ (آثار حیدری صفحہ ۷۰)

حضرت جعفر صادق نے فرمایا کہ:

"اِنَّ الْقُرْآنَ الَّذِیْ جَاءَ بِہٖ جِبْرَئِیْلُ عَلَیْہِ السَّلَامُ اِلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَبْعَۃَ عَشَرَ اَلْفَ آیَۃٍ۔" (اصول کافی، کتاب فضل القرآن، باب النوادر صفحہ ۲۳۲ جلد ۲)

بے شک وہ قرآن جو جبرئیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر لے کر نازل ہوئے تھے سترہ ہزار آیات پر مشتمل تھا۔

موجودہ قرآن میں چھ ہزار دو سو چھتیس (۶۲۳۶) آیات ہیں۔ اس طرح شیعہ اعتقاد کے مطابق اس میں سے دس ہزار سات سو چونسٹھ (۱۰۷۶۴) آیات ساقط کردی گئی ہیں۔ اصول کافی میں بیسیوں ایسی روایات پائی جاتی ہیں جو صراحتاً تحریف قرآن پر دلالت کرتی ہیں۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں کہ:

اثنا عشری مذہب کی بنیادی اور مستند کتابوں میں شیعوں کے ائمہ معصومین کے ارشادات اور ان کے اکابر و اعاظم علماء مجتہدین کی تصنیفات کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت آفتاب

نیمروز کی طرح سامنے آجاتی ہے کہ شیعہ اثنا عشریہ کا عقیدہ یہی ہے کہ موجودہ قرآن محرف ہے۔ اس میں ہر طرح کی تحریف اور قطع و برید ہوئی ہے۔

علاوہ ازیں ان کے لیے از روئے عقل بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس کو یقین کے ساتھ تحریف و تبدیل سے محفوظ بعینہ وہ کتاب اللہ مان سکیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے نبی کریم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔ حضرات خلفائے ثلاثہؓ اور ان کے رفقاء تمام اکابر صحابہؓ کے بارے میں ان کے عقیدہ نے قرآن پر ایمان ان کے لئے ناممکن بنادیا ہے۔ لہٰذا اب جو شیعہ علماء و مجتہدین تحریف کے عقیدہ سے انکار اور موجودہ قرآن پر ہم اہلسنت ہی کی طرح ایمان کا اظہار کرتے ہیں ان کے اس رویہ کی کوئی معقول اور قابلِ قبول توجیہ اس کے سوا نہیں کی جاسکتی کہ یہ ان کا تقیہ ہے۔ جو شیعہ مذہب میں ان کے امام غائب کے ظہور کے وقت تک فرض و واجب اور گویا جزءِ ایمان ہے۔ اس کی ایک روشن دلیل یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مشائخ متقدمین میں سے "الجامع الکافی" کے مؤلف ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی اور ان کے استاد علی بن ابراہیم قمی اور "الاحتجاج" کے مؤلف احمد بن علی بن ابی طالب طبرسی وغیرہ ان سب مشائخ متقدمین کو جن کا ذکر "فصل الخطاب" میں علامہ نوری طبرسی نے مدعیان تحریف کی حیثیت سے کیا ہے اور اسی طرح اپنے علمائے متاخرین میں ملا باقر مجلسی، سید نعمت اللہ الجزائری، علامہ قزوینی شارح اصول کافی اور علامہ نوری طبرسی جیسے ان سب حضرات کو اپنا مذہبی پیشوا مانتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ موجودہ قرآن کے محرف ہونے کے قائل ہیں بلکہ اس عقیدہ کے علمبردار ہیں اور جنہوں نے اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں حالانکہ ظاہر ہے کہ جو شخص قرآن کے محرف ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے وہ قرآن پر ایمان سے محروم ہے اس کا شمار تو مؤمنین میں بھی نہ ہونا چاہیے۔

(ماہنامہ بینات کراچی صفحہ ۳۶ جنوری ۱۹۸۷ء)

ایران چونکہ صدر اول سے ہی شیعیت کا گڑھ اور مرکز رہا ہے اس لئے دشمنان اسلام نے اس مضبوط پناہ گاہ میں بیٹھ کر اسلام کے ماخذ اول قرآن مجید میں تحریف کی کوششیں جاری رکھیں پھر ان کی جرأت یہاں تک بڑھ گئی کہ انہوں نے خمینی کے دور میں تحریف شدہ قرآن طبع کرا کر مختلف ممالک میں پھیلا دیا۔ اس سلسلہ میں روزنامہ جنگ کی ایک خبر ملاحظہ فرمائیں:

"حکومت نے ایک ایرانی ادارے "سازمان چاپ و اشتہارات جاء ال ایران" کے

شائع کردہ قرآن پاک کے نسخوں کی ملک میں درآمد اور تقسیم پر بھی پابندی لگا دی ہے اور انہیں ضبط کرنے کا حکم دیا ہے۔ وزارت نے چھان بین کے بعد اس امر کی توثیق کر دی ہے کہ قرآن پاک کے مذکورہ نسخوں کے متن میں تحریف ہوئی ہے جو اشاعت قرآن پاک کے ایکٹ مجریہ ۱۹۷۳ کی خلاف ورزی ہے"۔ (روزنامہ جنگ لاہور ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۶)

اس ضبطی کے حکم کے باوجود اہل تشیع اس کی نشر و اشاعت اور تقسیم میں برابر مصروف رہے جس کا حکومت پنجاب نے اپنے طور پر نوٹس لیتے ہوئے قرآن مجید کے اس تحریف شدہ نسخے کو ضبط کرنے کا حکم جاری کیا:

"حکومت پنجاب نے ادارہ سازمان چھاپ جاودان ایران کے شائع کردہ قرآن پاک کے تمام نسخے فوری طور پر ضبط کر لئے ہیں کیونکہ اس کے متن میں الفاظ یا اعراب میں تحریف پائی گئی جو قرآن پاک کے مسلمہ متن کے خلاف ہے اور جس سے مسلمانان پاکستان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچ سکتی ہے" (روزنامہ جنگ راولپنڈی ۱۲ دسمبر ۱۹۸۷ء)

وفاقی حکومت نے جب اس تحریف شدہ قرآن کو ضبط کرنے کا حکم دیا تو اس خبر سے تمام شیعوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی چنانچہ اسلام آباد کے ایرانی سفارت خانہ کی جانب سے ایک وضاحتی اشتہار تمام بڑے اخبارات میں شائع کیا گیا جس کا متن درج ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ

ہم نے قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں (سورۃ الحجر نمبر ۹)

بعض جرائد میں یہ خبر چھپی ہے اور اس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ ایران میں چھپنے والے قرآن مجید کے بعض نسخے، قرآن مجید کے دوسرے نسخوں سے ناروا طور پر مختلف ہیں اس لئے محترم مسلمانوں کی توجہ مندرجہ ذیل نکات کی جانب مبذول کرائی جاتی ہے۔

۱۔ اسلام کے آغاز سے آج تک، عام مسلمان، خاص طور پر دینی پیشواؤں اور مذہبی علماء نے خدا کے فضل و کرم سے اپنی ساری کوششیں قرآن مجید کو ہر قسم کی تحریف یا اختلاف سے پاک اور محفوظ رکھنے میں صرف کی ہیں اور اس کتاب مقدس کو جس طرح بلا تحریف اپنے اسلاف سے حاصل کیا اسی طرح صحیح و سالم شکل میں آنے والی نسلوں تک پہنچایا۔

۲۔ کافی مدت سے اسلام کے دشمنوں کی یہ کوشش رہی ہے کہ قرآن کریم میں تحریف کا

الزام اور بہتان کسی ایک اسلامی مذہبی فرقہ پر لگا کر امت اسلامیہ میں تفرقہ کے بیج بوئیں اور اس سلسلہ میں جعلی حوالہ فراہم کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔

۳۔ اسلامی جمہوریہ ایران میں قرآن مجید کی طباعت کے سلسلہ میں بہت احتیاط برتی جاتی ہے تا کہ اس میں کسی قسم کی غلطی باقی نہ رہے اور اگر قرآن مجید کے کچھ نسخے اغلاط کے ساتھ کسی ایرانی طباعتی ادارہ کے نام سے شائع ہوئے ہیں تو بلاشبہ یہ دشمنان اسلام کی سازش ہے اور جو لوگ اس بات کو اچھالتے ہیں ہماری نظر میں وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر اسلام کے دشمنوں کے ایجنٹ ہیں۔

۴۔ ظاہر ہے کہ تحریف شدہ قرآن مجید کے نسخوں کی تقسیم کے بارے میں جو بھی خبر شائع ہوئی ہے وہ اسلام کے دشمنوں کی منظم سازش کے تحت عمل میں لائی گئی ہے اور اسلامی جمہوریہ ایران اس کی بڑی شدت سے مذمت کرتا ہے۔ ربنا افتح بیننا و بین قومنا بالحق

(رائزنی فرہنگی سفارت کار جمہوری اسلامی ایران۔ اسلام آباد۔ روزنامہ جنگ ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۶ء)

اس کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۹۳ء میں ایران سے سیب درآمد کیے گئے تو اس کی پیٹیوں میں گھاس پھونس کی جگہ قرآن مجید کے اوراق کی کترنیں رکھی گئیں۔ جس پر ملک میں احتجاج ہوا تو ایرانی قونصل خانے کی طرف سے ایک مرتبہ پھر منافقت آمیز ایک وضاحتی بیان اخبارات کو جاری کر دیا گیا۔ "سادہ لوح" مدیر نوائے وقت کے کچھ تبصرے کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں:

ایرانی قونصل خانے کی وضاحت

اسلامی جمہوریہ ایران کے کراچی میں مقیم قونصل جنرل کی جانب سے ایک پریس ریلیز میں ایران سے درآمد کی جانے والی سیب کی پیٹیوں میں گھاس پھونس کی جگہ قرآن کریم کے مقدس اوراق کی کترنیں ڈالنے کے واقعات کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے اور اس سے ایرانی حکومت کی لاتعلقی کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اسلام دشمن قوتوں کی سازش ہے اور ایسے واقعات ہر سال حج کے موقع پر ہی سامنے آتے ہیں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ قرآن کریم مسلمانوں کے لئے نہ صرف قابل احترام کتاب ہے بلکہ عزیز از جان بھی ہے اور کوئی بھی سچا مسلمان پیغمبر آخر الزمان اور تا قیامت شمع ہدایت قرآن مجید کی توہین کو برداشت نہیں کر سکتا۔ تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ سیب کی ایران سے درآمد کی جانے والی پیٹیوں میں قرآن کریم کے مقدس اوراق کی کترنیں گھاس پھونس کی جگہ ڈالی گئی تھیں جو صریحاً قرآن کریم

کی بے حرمتی ہے۔ ایرانی قونصل جنرل کی وضاحت کے بعد اس مذموم سازش سے ایرانی حکومت کی لاتعلقی تو سامنے آ گئی ہے لیکن قابل غور امر یہ ہے کہ اس سازش کو عملی جامہ کہاں پہنایا جا رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں سرزمین ایران یا پاکستان میں کہیں نہ کہیں ایسا ہو رہا ہے اور ان نسخوں کی ایران سے پاکستان منتقلی کے دوران اسلام دشمن ہاتھ اس حرکت قبیحہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ جب یہ سازش طشت از بام ہو گئی ہے تو یہ صرف حکومت پاکستان ہی کا نہیں بلکہ خود حکومت ایران کا بھی فرض ہے کہ وہ پاکستان کو برآمد کئے جانے والے سامان کی منتقلی کے مختلف مراحل پر کڑی نظر رکھے اور اگر کہیں مسلمان اور اسلام دشمن ہاتھ موجود پائے جائیں تو ان کو کاٹنے میں اپنا فرض ادا کرے۔ اسی طرح درآمدات کی پاکستان آمد کے بعد مارکیٹ میں آنے تک جن ہاتھوں سے یہ سامان گزرتا ہے ان کی سخت سے سخت نگرانی ہونی چاہیے اور مشتبہ عناصر کو فوراً گرفتار کرنا چاہیے۔

(روزنامہ نوائے وقت ۲۷ مئی ۱۹۸۷ء)

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ مذہب شیعہ کی بنیاد قرآن مجید کی عداوت پر رکھی گئی ہے اس لئے قرآن دشمنی اہل تشیع کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن جلانے، توہین قرآن اور تحریف قرآن کے تمام واقعات میں وہ پوری طرح ملوث اور شریک ہیں جن کا وہ ایرانی سفارت کار اور قونصل جنرل کی طرح کبھی کبھی دبے الفاظ میں اقرار بھی کر لیتے ہیں "قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ" (آل عمران نمبر ۱۱۸) یقیناً ان کی زبانوں سے ان کا بغض ظاہر ہو گیا ہے اور جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں وہ بہت بڑا ہے۔

ایرانی اشاعتی ادارے کی طرف سے مطبوعہ تحریف شدہ قرآن مجید کے متعلق ایرانی سفارت خانے کی طرف سے جو وضاحتی اشتہار شائع ہوا ہے اس کا مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید نے نہایت ہی مدلل اور دندان شکن جواب دیا ہے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے قارئین کے استفادے کے لئے نقل کر دیا جائے۔ موصوف کا یہ جواب ماہنامہ بینات (جنوری ۱۹۸۷ء) میں "بصائر و عبر" کے تحت بہ عنوان "دزدے بکف چراغ" شائع ہوا ہے ملاحظہ فرمائیں:

ایرانی سفارت خانہ کا یہ اشتہار شیعوں کے روایتی تقیہ و کتمان کا مرقع "دزدے بکف چراغ" کی بہترین مثال اور مشق بے وفا کی کہہ مکرنی ہے۔ ایران میں قرآن مجید کا ترمیم شدہ

نسخہ چھپایا جاتا ہے اور جب مسلمانوں کو اس کی خبر ہوتی ہے کہ شیعہ قرآن کریم کے اول درجہ کے دشمن ہیں تو بڑی معصومیت سے فرمایا جاتا ہے کہ یہ حرکت ہم نے نہیں کی بلکہ کسی دشمن اسلام نے یہ حرکت کی ہوگی حالانکہ شیعوں سے بڑھ کر دشمن اسلام کون ہے؟ مختصراً اس اشتہار کے ایک ایک نکتہ کا بھی تجزیہ کر دیکھئے:

اس اشتہار کی بسم اللہ آیت کریمہ "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ" سے کی گئی ہے۔ بلاشبہ اہل اسلام کے نزدیک یہ آیت شریفہ اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے اس لئے اس میں کوئی تبدیلی اور کوئی تحریف نہیں ہو سکتی۔ لیکن شیعوں کے نزدیک یہ آیت قرآن کی محفوظیت کی دلیل نہیں بلکہ آیت کا مطلب صرف یہ ہے کہ قرآن کریم کا صرف ایک نسخہ صحیح سالم رہے گا اور وہ امام غائب کے پاس غار میں محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے جتنے نسخے ہیں ان میں شیعوں کے بقول منافقوں نے ردوبدل کر دیا ہے۔ چنانچہ شیعوں کے عظیم مجتہد و محدث علامہ نوری طبرسی نے اس آیت کے جو متعدد جوابات دیئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ:

"نیز قرآن کریم کا محمد وآل محمد صلوات اللہ علیہم کے پاس محفوظ ہونا آیت کا مفہوم صادق آنے کے لئے کیوں کافی نہیں؟ اور اس صورت میں دوسرں کے پاس جو قرآن ہے اگر اس میں ردوبدل کر دیا گیا ہو تو اس سے کوئی مانع نہیں"۔ (فصل الخطاب صفحہ ۳۶۰)

ٹھیک یہی بات ہندوستان کے ایک شیعہ مفسر فرمان علی نے اپنے حاشیہ قرآن میں لکھی ہے:

"ذکر سے ایک تو قرآن مراد ہے۔ تب اس کی نگہبانی کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کو ضائع و برباد ہونے نہ دیں گے۔ پس اگر تمام دنیا میں ایک نسخہ بھی قرآن مجید کا اپنی اصلی حالت پر باقی ہو تب بھی یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ محفوظ ہے۔ اس (آیت) کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ اس (قرآن) میں کسی قسم کا کوئی تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اس زمانہ تک قرآن مجید میں کیا کیا تغیرات ہو گئے ہیں۔ کم سے کم اس میں تو شک ہی نہیں کہ ترتیب بدل دی گئی"

(ترجمہ فرمان علی صفحہ ۴۲۹)

واضح رہے کہ شیعہ مفسر فرمان علی کے ترجمہ و حواشی پر گذشتہ صدی کے بڑے بڑے مجتہدین کے تصدیقی دستخط ثبت ہیں گویا متقدمین شیعہ کی طرح چودھویں صدی کے تمام مجتہدین

شیعہ بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں کہ قرآن کریم کا ایک "صحیح نسخہ" امام غائب کے پاس محفوظ ہے اور باقی تمام نسخوں میں تغیر و تبدل کر دیا گیا ہے۔ اب قارئین انصاف فرمائیں کہ اس آیت کریمہ کے حوالہ سے ایرانی سفارت خانے کا یا کسی اور شیعہ کا یہ تاثر دینا کہ وہ قرآن کریم کے اس نسخہ کو جو امت کے ہاتھوں میں موجود ہے صحیح سمجھتے ہیں۔ محض دجل و تلبیس اور تقیہ و کتمان نہیں تو اور کیا ہے؟

اشتہار کے پہلے نکتے میں کہا گیا ہے کہ "مسلمانوں نے ہر دور میں قرآن کریم کی حفاظت پر اپنی ساری کوششیں صرف کی ہیں اور جس طرح انہوں نے قرآن کریم کو اپنے اسلاف سے لیا ہے بغیر کسی تحریف کے صحیح و سالم شکل میں آنے والی نسلوں تک پہنچایا ہے"۔

ایرانی سفارت خانے کا یہ نکتہ اہل اسلام کے اصول پر تو بالکل صحیح ہے لیکن ایران کے قائد اعظم علامہ خمینی کے شیعی عقیدے کے مطابق بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ قرآن کا جو نسخہ امت کے ہاتھ میں ہے وہ حضرات خلفائے راشدینؓ (ابوبکرؓ، عثمانؓ) کی جمع و تدوین اور صحابہ کرامؓ کی تعلیم کے ذریعے بعد کی امت تک پہنچا ہے۔ صحابہ کرامؓ ہی قرآن کریم کے اولین راوی ہیں۔ وہی رسول اللہ ﷺ کے درمیان اور بعد کی امت کے درمیان واسطہ ہیں۔ یہی صحابہ مسلمانوں کے "اسلاف" ہیں۔

شیعہ عقیدہ کے مطابق یہ اسلاف دو چار کے سوا سب کے سب منافق، کافر اور مرتد تھے جنہوں نے شیعوں کے بقول حضرت علیؓ کو جو رسول اللہ ﷺ کے نامزد کردہ خلیفہ بلا فصل اور وصی رسول ﷺ تھے خلیفہ نہ بنا کر عہد رسول ﷺ کو توڑ ڈالا آل رسول ﷺ کا حق غصب کر لیا۔ ان پر مظالم ڈھائے، قرآن کریم میں من مانی تبدیلیاں کر ڈالیں اور امیر المومنین (حضرت علیؓ) نے قرآن کریم کا جو "صحیح نسخہ" مرتب فرمایا تھا اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

جناب خمینی صاحب نے اپنی کتاب "کشف الاسرار" میں حضرات خلفائے راشدینؓ اور عام صحابہ کرامؓ کے بارے میں جو گل افشانیاں کی ہیں ان کا خلاصہ مولانا محمد منظور نعمانی کے الفاظ میں یہ ہے:

۱۔ شیخین ابوبکر و عمر دل سے ایمان ہی نہیں لائے تھے۔ صرف حکومت اور اقتدار کی طمع و ہوس میں انہوں نے بظاہر اسلام قبول کر لیا تھا اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اپنے کو چپکا رکھا تھا۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد حکومت و اقتدار حاصل کرنے کا ان کا جو منصوبہ تھا اس کے

لئے وہ ابتدا ہی سے سازش کرتے رہے اور انہوں نے اپنے ہم خیالوں کی ایک طاقتور پارٹی بنالی تھی ان سب کا اصل مقصد اور مطمح نظر رسول اللہ ﷺ کے بعد حکومت پر قبضہ کر لینا ہی تھا۔ اس کے سوا اسلام سے اور قرآن سے ان کو کوئی سروکار نہیں تھا۔

۳۔ اگر بالفرض قرآن میں صراحت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے بعد امامت و خلافت کے لئے حضرت علیؓ کی نامزدگی کا ذکر بھی کر دیا جاتا تب بھی یہ لوگ ان قرآنی آیات اور خداوندی فرمان کی وجہ سے اپنے اس مقصد اور منصوبہ سے دست بردار ہونے والے نہیں تھے جس کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو اسلام سے اور رسول ﷺ سے چپکا رکھا تھا۔ اس مقصد کے لئے جو حیلے اور داؤ پیچ ان کو کرنے پڑتے وہ سب کرتے اور فرمان خداوندی کی کوئی پرواہ نہ کرتے۔

۴۔ قرآنی احکام اور خداوندی فرمان کے خلاف کرنا ان کے لئے معمولی بات تھی انہوں نے بہت سے قرآنی احکام کی مخالفت کی اور خداوندی فرمان کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

۵۔ اگر وہ اپنا مقصد (حکومت واقتدار) حاصل کرنے کے لئے قرآن سے ان آیات کو نکال دینا ضروری سمجھتے (جن میں امامت کے منصب پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نامزدگی کا ذکر کیا گیا ہوتا) تو وہ ان آیتوں ہی کو قرآن سے نکال دیتے یہ ان کے لئے معمولی بات تھی۔

۶۔ اگر وہ ان آیات کو قرآن سے نہ نکالتے تب وہ یہ کر سکتے تھے اور یہی کرتے کہ ایک حدیث اس مضمون کی گھڑ کے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے لوگوں کو سنا دیتے کہ آخری وقت میں آپ نے فرمایا تھا کہ امام و خلیفہ کے انتخاب کا مسئلہ شوریٰ سے طے ہوگا اور علی جن کو امامت کے منصب کے لئے نامزد کیا گیا تھا اور قرآن میں بھی اس کا ذکر کر دیا گیا تھا ان کو اس منصب سے معزول کر دیا گیا۔

۷۔ اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ عمر ان آیات کے بارے میں یہ کہہ دیتے یا تو خود خدا سے ان آیتوں کے نازل کرنے میں، یا جبرئیل یا رسول خدا سے ان کو پہنچانے میں اشتباہ ہو گیا یعنی غلطی اور چوک ہو گئی۔

۸۔ خمینی صاحب نے حدیث قرطاس کا ذکر کرتے ہوئے بڑے دردناک نوحہ کے انداز میں (حضرت عمرؓ کے بارے میں) میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے آخری وقت میں اس نے آپ ﷺ کی شان میں ایسی گستاخی کی جس سے روح پاک کو انتہائی صدمہ پہنچا اور آپ ﷺ

دل پر اس صدمہ کا داغ لے کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ عمر کا یہ گستاخانہ کلمہ دراصل اس کے باطن اور اندر کے کفر و زندقہ کا ظہور تھا۔ یعنی اس سے ظاہر ہو گیا کہ (معاذ اللہ) وہ باطن میں کافر و زندیق تھا۔

۹۔ اگر یہ شیخین (اور ان کی پارٹی والے) دیکھتے کہ قرآن کی ان آیات کی وجہ سے (جن میں امامت کے لئے حضرت علیؓ کی نامزدگی کی گئی ہوتی) اسلام سے وابستہ رہتے ہوئے ہم حصول حکومت کے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اسلام کو ترک کر کے اور اس سے کٹ کر ہی یہ مقصد حاصل کر سکتے ہیں تو یہ ایسا ہی کرتے اور (ابو جہل و ابولہب کا موقف اختیار کر کے) اپنی پارٹی کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو جاتے۔

۱۰۔ عثمان و معاویہ اور یزید ایک ہی طرح کے اور ایک ہی درجہ کے ”چچا و لچی“ (ظالم و مجرم) تھے۔

۱۱۔ عام صحابہؓ کا یہ حال تھا کہ یا تو وہ ان (شیخین) کی خاص پارٹی میں شریک شامل۔ ان کے رفیق کار اور حکومت طلبی کے مقصد میں ان کے پورے ہمنوا تھے یا پھر وہ تھے جو ان لوگوں سے ڈرتے تھے اور ان کے خلاف ایک حرف زبان سے نکالنے کی ان میں جرأت و ہمت نہیں تھی۔

۱۲۔ دنیا بھر کے اولین و آخرین اہلسنت کے بارے میں خمینی صاحب کا ارشاد ہے کہ:

سنیوں کا معاملہ یہ ہے کہ ابو بکر و عمر قرآن کے صریح احکام کے خلاف جو کچھ کہیں یہ لوگ قرآن کے مقابلہ میں اسی کو قبول کرتے اور اسی کی پیروی کرتے ہیں۔ عمر نے اسلام میں جو تبدیلیاں کیں اور قرآنی احکام کے خلاف جو احکام جاری کئے سنیوں نے قرآن کے اصل حکم کے مقابلے میں عمر کی تبدیلیوں کو اور ان کے جاری کئے ہوئے احکام کو قبول کر لیا اور وہ انہی کی پیروی کر رہے ہیں۔

(ایرانی انقلاب صفحہ ۱۰۷)

الغرض جب مسلمانوں کے اسلاف (صحابہ کرام اور خلفائے راشدینؓ) شیعوں کے بقول ایسے تھے جس کی تصویر ”کشف الاسرار“ میں خمینی صاحب نے کھینچی ہے تو ان کے ہاتھوں سے آئے ہوئے قرآن پر ایرانی سفارت خانے کو کیوں کر ایمان ہو سکتا ہے؟ جبکہ ائمہ معصومین کے دو ہزار سے زیادہ ارشادات شیعہ کی کتابوں میں موجود ہیں کہ منافقوں نے قرآن کریم میں بہت سا ردوبدل کر ڈالا اور سب جانتے ہیں کہ شیعہ قرآن کو تو چھوڑ سکتے ہیں مگر اپنے ائمہ

معصومین کے متواتر ارشادات سے انحراف ان کے نزدیک کفر سے کم نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیعہ کا قرآن کریم پر ایمان نہیں ہو سکتا۔ جو شخص شیعہ کہلا کر "ایمان بالقرآن" کا دم بھرتا ہے اس کا دعویٰ سراسر کذب و خداع اور دروغ بے فروغ ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ روایت وہی سچی کہلاتی ہے جس کے راوی سچے ہوں۔ جھوٹے راویوں کی روایت کو سچا کہنا خود بہت بڑا جھوٹ ہے۔ پس اگر ایرانی سفارت خانے کا یہ نکتہ کہ "ہر دور میں مسلمانوں نے قرآن کریم کی حفاظت کی" مبنی بر صداقت ہے اور خمینی کی شیعہ حکومت واقعۃً قرآن کریم پر ایمان رکھتی ہے تو ایرانی سفارت خانے کو صاف صاف اعلان کر دینا چاہیے کہ قرآن کے راویان اولین، خلفائے راشدین اور صحابہ کرامؓ سب کے سب پکے سچے مسلمان تھے، مومن مخلص تھے، عادل اور امین تھے، تمام دینی امور میں ثقہ اور لائق اعتماد تھے۔ جس طرح قرآن کریم کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں اس طرح قرآن کریم کے راویان اولین کی سچائی و دیانت داری، ان کا ایمان و اخلاص اور ان کی عدالت وثقاہت بھی ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے اور یہ اعلان بھی کر دینا چاہیے کہ شیعہ راویوں نے ان اکابر کے خلاف جو ہزاروں داستانیں گھڑ کر شیعہ کتابوں میں پھیلا دی ہیں یہ تمام داستانیں جھوٹ کا پلندہ ہیں اور یہ اسلام اور قرآن کے خلاف دشمنانِ اسلام کی سازش تھی جس کا مقصد قرآن کے راویان اولین کو مجروح کر کے قرآن کریم سے امت کو برگشتہ کرنا تھا۔ وہ تمام شیعہ مصنفین جنہوں نے یہ من گھڑت اور خود تراشیدہ روایات اپنی کتابوں میں درج کیں وہ سب اسلام کے ازلی دشمن تھے۔

اور یہ اعلان بھی کر دینا چاہیے کہ روح اللہ خمینی صاحب نے اپنی کتاب "کشف الاسرار" میں خلفائے ثلاثہؓ کو جو منافق و بے ایمان اور ظالم و جابر لکھا ہے خمینی صاحب اب اس سے توبہ کرتے ہیں (اس وقت وہ بقید حیات تھے۔ لہٰذا اب اس کے پیروکاروں اور جانشینوں کو یہ اعلان کر دینا چاہیے کہ خمینی گمراہ اور کافر ہو کر مرے ہیں) اور تمام صحابہ کرامؓ خصوصاً خلفائے راشدین کو عادل و امین اور مومن مخلص سمجھتے ہیں۔

۲۔ دوسرے نکتے میں ایرانی سفارت خانے کی جانب سے کہا گیا ہے کہ "کافی مدت سے دشمنان اسلام کی یہ کوشش رہی ہے کہ قرآن کریم کی تحریف کا الزام اور بہتان کسی ایک مذہبی اسلامی فرقہ پر لگا کر امت اسلامیہ میں تفریق کے بیج بوئیں اور اس سلسلہ میں جعلی حوالہ فراہم کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا گیا"۔

ایرانی سفارت خانے کا یہ نکتہ حرف بحرف صحیح ہے مگر اس کی نشاندہی نہیں کی گئی کہ یہ دشمنان اسلام کون تھے؟ اور انہوں نے قرآن کریم کی تحریف کا الزام اور بہتان کس اسلامی فرقہ پر لگایا اور وہ کون سے جعلی حوالے تھے جن کے فراہم کرنے میں دریغ نہیں کیا گیا۔

ہم ایرانی سفارت خانے کی اطلاع کے لئے ان دشمنان اسلام کی نشاندہی کرتے ہیں سنیئے۔

یہ دشمنان اسلام شیعہ مصنفین اور مجتہدین ہیں جنہوں نے دوسری صدی سے لے کر چودھویں صدی تک مسلسل تیرہ سو سال یہ پراپیگنڈہ کیا اور مسلمانوں کے سب سے پہلے طبقہ (صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ) پر یہ الزام اور بہتان لگایا کہ انہوں نے قرآن کریم میں تحریف کر دی اور جعلی حوالے کے طور پر ایک دو نہیں، سو پچاس نہیں بلکہ دو ہزار سے زیادہ روایتیں ائمہ معصومین کی طرف منسوب کر دیں اور اگر ایرانی سفارت خانے کو ان دشمنان اسلام کی فہرست مطلوب ہو تو علامہ حسین بن محمد تقی نوری طبرسی نے "فصل الخطاب" میں (صفحہ نمبر ۲۶ سے نمبر ۳۲ تک) ان اسلام دشمنوں کی فہرست بھی درج کر دی ہے۔ یہ چند ناموں کی فہرست ہے اور یہ بھی بطور نمونہ ہے ورنہ یہ فہرست ہزاروں سے متجاوز ہو سکتی ہے۔ ہم ایرانی سفارت خانے کی وساطت سے ایرانی حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ موجودہ ایران کے قائد اعظم جناب خمینی (یا موجودہ ولایت فقیہ جناب خامنہ ای) کا اس مضمون کا فتویٰ ساری دنیا میں شائع کیا جائے کہ:

۱۔ وہ تمام شیعہ راوی جنہوں نے تحریف قرآن پر دو ہزار سے زیادہ روایتیں گھڑ کر ائمہ معصومین سے منسوب کر ڈالیں۔

۲۔ وہ تمام شیعہ مصنفین جنہوں نے بغیر تردید کے ان روایات کو اپنی کتابوں میں جگہ دی اور اس پر ہزاروں صفحات سیاہ کئے اور

۳۔ وہ تمام شیعہ مجتہدین علماء اور عوام جو تحریف قرآن کا عقیدہ رکھتے تھے یا اب بھی رکھتے ہیں یہ سب کے سب اسلام کے دشمن یہودی اور مجوسی تھے اور ہیں۔ تاکہ امت ان اسلام دشمنوں کے فتنہ تحریف سے پوری طرح محفوظ ہو سکے۔

تیسرے اور چوتھے نکتے میں جو کہا گیا ہے کہ "یہ کسی دشمن کی شرارت ہے"۔ یہ دراصل ایرانی سفارت خانے کی جانب سے اپنے جرم کو چھپانے اور اس پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش

ہے۔ ٹھوس اور قطعی دلائل کی روشنی میں ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ تحریف شدہ نسخہ ایران ہی میں چھپا ہے اور ایرانی سفارت خانے کو بھی اس کا بخوبی علم ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ شیعہ مذہب کی وہ بنیادی کتابیں جن میں عقیدہ تحریف درج کیا گیا ہے جن میں ائمہ معصومین کی دو ہزار سے زائد روایتیں اس مضمون کی نقل کی گئی ہیں کہ منافقوں (خلفائے راشدین العیاذ باللہ) نے قرآن میں رد و بدل کر دیا تھا۔ جن میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ قرآن کا اصلی نسخہ امام غائب کے پاس غار میں محفوظ ہے اور وہ جب تشریف لائیں گے تو دنیا میں "اصلی قرآن" رائج کریں گے اور موجودہ قرآن دنیا سے نابود کر دیا جائے گا۔ جن کتابوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ تیسری صدی تک تمام متقدمین شیعہ تحریف قرآن کا عقیدہ رکھتے ہیں اور بعد کی صدیوں کے بڑے بڑے مجتہدین شیعہ کا بھی یہی عقیدہ ہے اور جن معدودے چند شیعوں نے اس کا انکار کیا وہ محض مصلحت اندیشی پر مبنی ہے ورنہ اندر سے وہ بھی عقیدہ تحریف قرآن پر ہی ایمان رکھتے تھے اور جن کتابوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ فلاں سورت کی فلاں آیت دراصل اس طرح نازل ہوئی تھی اور منافقوں نے اس کو اس طرح بدل دیا۔

یہ کتابیں جن میں عقیدہ تحریف کو ائمہ معصومین کے ارشادات سے ثابت کیا گیا ہے آج بھی ایران میں چھپ رہی ہیں۔ ایرانی حکومت ان کتابوں کو ساری دنیا میں پھیلا رہی ہے اور ایسی کتابوں کا گویا ایک سیلاب ہے جو ایران سے اٹھ کر دنیا کے کناروں سے ٹکرا رہا ہے۔ ایران کے شیعہ مؤمنین ان کتابوں کو پڑھ پڑھ کر موجودہ قرآن اور جامعین قرآن کے خلاف آگ بگولہ ہو رہے ہیں۔ مثلاً علامہ کلینی کی "اصول کافی" جو شیعوں کے نزدیک اصح الکتب کہلاتی ہے، "تفسیر قمی، تفسیر عیاشی، احتجاج طبرسی، ملا باقر مجلسی کی کتابیں حیات القلوب، جلاء العیون، حق الیقین، بحار الانوار، اور مرآۃ العقول، سید نعمت اللہ الجزائری کی کتاب الانوار النعمانیہ وغیرہ۔

یہ کتابیں نہ صرف ایران میں چھپ رہی ہیں بلکہ علامہ خمینی اپنے معتقدین کو ان کے مطالعے کی ترغیب دیتے ہیں۔ الغرض تحریف قرآن کے عقیدے کا مرکز آج بھی ایران ہے اور ان کتابوں کے نتیجے میں ایران کے ہر فرد کی خواہش و تمنا ہے کہ موجودہ قرآن جو خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کے ذریعے امت تک پہنچا ہے اس کو دنیا سے نابود کر دیا جائے اور ائمہ معصومین کے مقدس ارشادات کی روشنی میں قرآن کا صحیح نسخہ رائج کر دیا جائے۔ ان حقائق کی

روشنی میں انصاف کیجئے کہ قرآن کا محرف نسخہ ایران کے سوا اور کون شائع کر سکتا تھا؟

اگر علامہ خمینی اور ان کی حکومت کا موجودہ قرآن پر ایمان ہوتا تو کیا ایران میں ایسی کتابوں کی اشاعت ممکن تھی؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ تمام کتابیں جن میں تحریف قرآن کا گمراہ کن عقیدہ ائمہ معصومین کے حوالے سے درج کیا گیا ہے اور جن پر شیعہ مذہب کا دارومدار ہے۔ ان کو ایران میں نذر آتش کیا جاتا۔ ان کے مصنفین کو ملعون و کافر سمجھا جاتا ملکہ ایسے ملعون مصنفین کو مجتہد ماننے والوں کے بھی کفر کا اعلان کیا جاتا اور ان کی کتابوں کی اشاعت کرنے والوں کو بھی اسی طرح تختہ دار پر لٹکایا جاتا جس طرح خمینی کے باغیوں اور مخالفوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ ایران کے قائد اعظم خمینی اور ان کی شیعی حکومت موجودہ قرآن پر ایمان نہیں رکھتی بلکہ ائمہ معصومین کے ارشادات کی روشنی میں اس کی اصلاح و ترمیم کو ضروری سمجھتی ہے اور ایران سے ترمیم شدہ نسخے کی اشاعت کر کے انہوں نے قرآن کریم کے بارے میں اپنے اصل عقیدہ کا اظہار کیا ہے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ایران کے قائد اعظم جناب خمینی صاحب بھی وہ کام کر سکتے ہیں جو امام غائب کو دنیا میں ظاہر ہو کر کرنا ہے۔ خمینی ہی کا کیا ذکر یہ کام تو "ولایت فقیہ" کے منصب پر فائز ہر مجتہد کر سکتا ہے کیونکہ وہ امام غائب کا نائب سمجھا جاتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ شیعہ قرآن کا بدترین دشمن ہے اور ہر دور میں اس نے کبھی تقیہ کی چادر زیب تن کر کے اور کبھی ردائے تقیہ اتار کر قرآن کریم کی تحریف لفظی و معنوی کا ارتکاب کیا ہے۔ لہٰذا اہل تشیع کے لئے موجودہ قرآن پر اپنا ایمان ثابت کرنا از روئے عقل و نقل محال و ناممکن ہے۔

توہین انبیاء کرام علیہم السلام

پیچھے بتایا جا چکا ہے کہ اہل تشیع کا عقیدہ امامت "الوہیت و نبوت" کا مرکب ہے۔ انہوں نے ائمہ کرام کو اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک ٹھہرا کر اور اللہ تعالیٰ کی طرف "بداء" کی نسبت کر کے اللہ تعالیٰ کی شدید ترین توہین کا ارتکاب کیا۔ اسی طرح انہوں نے اوصاف نبوت (وحی، عصمت، اطاعت اور مامور من اللہ وغیرہ) ائمہ میں تسلیم کر کے اور عقیدہ امامت کو جزء دین اور برتر از نبوت قرار دے کر مقام نبوت و رسالت کی بھی توہین و تنقیص کی ہے۔

اس کے علاوہ بھی انہوں نے انبیاء کرام کی شان میں شدید ترین گستاخیوں کا ارتکاب

کیا۔ صرف چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

انبیاء کرام سے بارہ اماموں کی امامت کا عہد لیا گیا شیعیت کا ترجمان اعظم ملا باقر مجلسی لکھتا ہے:

امام جعفر صادق نے ارشاد باری تعالیٰ "واذ اخذ ربك من بنی آدم من ظهورهم ذریتهم و أشهدهم على انفسهم ألست بربكم" (اور جب نکالا تیرے رب نے آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب) کی تفسیر کرتے ہوئے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کی پیٹھ سے قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کو ننھی چیونٹیوں کی صورت میں نکالا اور انہیں اپنی ذات کی معرفت عطا کی اور اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی بھی اپنے رب کو نہ پہچانتا اور پوچھا کیا نہیں ہوں میں تمہارا رب۔ (سب بیک زبان) بولے ہاں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور علی ان کے وصی ہیں۔ (بحار الانوار صفحہ ۲۸۰ جلد ۲۶)

موصوف مزید لکھتے ہیں کہ:

امام ابوالحسن سے روایت ہے کہ تمام آسمانی صحیفوں میں "ولایت علی" (پر ایمان کا حکم) درج ہے اور اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو مبعوث نہیں فرمایا مگر محمد ﷺ کی نبوت اور آپ ﷺ کے وصی علی صلوٰت اللہ علیہما کے ساتھ (حوالہ مذکور)

شیعہ کے نزدیک انبیاء کرامؑ کو نبوت اقرار ولایت کی وجہ سے ملی۔ چند روایات ملاحظہ فرمائیں:

ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ اے علی اللہ نے ہر نبی علیہ السلام کو مبعوث کرنے سے پہلے طوعاً و کرہاً تیری ولایت کا اس سے اقرار کرلیا۔

(حوالہ مذکور)

حذیفہ بن اسید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عالم ارواح میں کسی نبی کو اس وقت تک نبوت نہیں دی گئی جب تک اس کے سامنے میری اور میرے اہل بیت کی ولایت پیش نہیں کی گئی پس انہوں نے ان کی ولایت واطاعت کا اقرار کیا (تب ان کو نبوت ملی)

(حوالہ مذکور صفحہ ۲۸۱ جلد ۲۶)

امام صادق نے فرمایا کہ کسی بھی نبی کو اس وقت تک نبوت نہیں ملی جب تک اس نے ہمارے حق (ولایت وامامت) کا اقرار نہیں کرلیا اور دیگر سب لوگوں پر ہماری فضیلت کو تسلیم نہیں کرلیا۔ (حوالہ مذکور)

جابر نے ابو جعفر علیہ السلام سے روایت کیا ہے کہ ہماری ولایت درحقیقت ولایت اللہ ہے اس کا اقرار کیے بغیر کسی نبی کو بھی مبعوث نہیں کیا گیا۔ (حوالہ مذکور)

قیامت کے دن حضرت علیؓ تمام انبیاء سے آگے ہوں گے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ "مجھ سے آگے صرف احمد ہوں گے۔ تمام رسل، ملائکہ اور روح القدس ہمارے پیچھے ہوں گے رسول ﷺ کو بلایا جائے گا تو آپ ﷺ بات کریں گے اور مجھے بھی پکارا جائے گا تو میں بھی اتنی ہی بات کروں گا۔ (حوالہ مذکور جلد ۲۶ صفحہ ۲۶۷)

بحار الانوار میں کتاب الامامۃ کے تحت ایک باب کا عنوان ہے "ان دعاء الانبیاء استجیب بالتوسل والاستشفاع بھم صلوات اللہ علیھم اجمعین" (حوالہ مذکور جلد ۲۶ صفحہ ۳۱۹)

بے شک انبیاء کرامؑ کی دعائیں اماموں کے وسیلہ اور سفارش کی بناء پر ہی قبول ہوئیں: اس باب کی دو روایتیں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ امام رضا فرماتے ہیں کہ جب نوحؑ ڈوبنے لگے تو اللہ کو ہمارے وسیلہ سے پکارا تو اللہ نے ان کو ڈوبنے سے بچا لیا اور جب ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکا گیا تو انہوں نے بھی اللہ کو ہمارے حق کا واسطہ دیا تو اللہ نے اس پر آگ کو ٹھنڈی اور سلامتی والی بنا دیا۔ موسیٰ نے جب سمندر سے راستہ لینے کے لئے اس پر عصا مارا تو اللہ سے ہمارے وسیلہ سے دعا کی لہٰذا اللہ نے اس کو خشک کر دیا اور عیسیٰ کو جب یہود نے قتل کر ڈالنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے ہمارے ہی وسیلہ سے اللہ کو پکارا چنانچہ اللہ نے ان کو بچا لیا اور اپنی طرف اٹھا لیا۔

۲۔ امام موسیٰ کاظم سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا ہمارے ہی وسیلے سے آدمؑ کو معافی ملی اور ہمارے ہی سبب سے ایوبؑ مصیبت میں مبتلا ہوئے۔ یعقوبؑ کو صدمہ فراق برداشت کرنا پڑا اور یوسفؑ قید ہوئے اور ہمارے ہی وسیلہ سے ان کے مصائب دور ہوئے۔ سورج ہمارے ہی طفیل روشن ہوتا ہے اور ہمارے اسمائے گرامی ہمارے رب کے عرش پر کندہ ہیں۔

(بحار الانوار صفحہ ۳۲۵ جلد ۲۶ بحوالہ شیعہ سنی اختلافات اور صراط مستقیم صفحہ ۱۵۸)

شیعہ مجتہد سید نعمت اللہ الجزائری لکھتے ہیں کہ:

ابو حمزہ الثمالی نے کہا کہ ایک دفعہ عبداللہ بن عمر امام زین العابدین کے پاس آئے اور کہا اے ابن الحسین۔ آپ یہ کہتے ہیں کہ حضرت یونسؑ مچھلی کے عذاب میں اس لئے مبتلا کئے

گئے کہ انہیں آپ کے دادا حضرت علیؓ کی ولایت پیش کی گئی تو انہوں نے توقف کیا۔ امام زین العابدین نے فرمایا۔ تمہاری ماں تمہیں گم کرے۔ یہ بات حق ہے۔ اس پر ابن عمر نے کہا آپ مجھے اس بارے میں کوئی نشانی دکھلائیں اگر آپ سچے ہیں۔ امام زین العابدین نے کہا کہ میری اور اپنی آنکھیں پٹی سے باندھ لو جب باندھ دیں تو ایک ساعت کے بعد فرمایا کھول دو۔ جب کھولا تو دیکھا کہ ہم تو ٹھاٹھیں مارتے دریا کے کنارے کھڑے ہیں۔ ابن عمر نے کہا یا سیدی میرا خون آپ کی گردن پر ہے۔ پھر امام زین العابدین نے مچھلی کو بلایا تو فوراً ایک مچھلی نے پانی میں سے پہاڑ کی طرح سر نکالا اور کہنے لگی میں وہی مچھلی ہوں جس نے یونس کو نگلا تھا۔ آدم سے لے کر تمام انبیاء حتیٰ کہ آپ کے جد امجد حضرت محمد ﷺ کا زمانہ آیا۔ ان تمام پر اللہ تعالیٰ نے اہل بیت کی ولایت پیش کی جس نے وہ قبول کر لی سلامتی میں رہا اور جس نے اس کے قبول کرنے میں توقف کیا تو اسے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ حضرت آدمؑ کو پریشانی نوحؑ کو ڈوبنے کا خطرہ ابراہیمؑ کو نار نمرود سے واسطہ، یوسفؑ کو اندھے کنوئیں میں گرانا ایوبؑ کو تکالیف کا سامنا داؤدؑ کو غلطی اور گناہ سے واسطہ پڑنا۔ یہاں تک کہ یونسؑ کی طرف اللہ تعالیٰ نے وحی کی کہ امیر المومنین علیؓ اور ان کی پشت سے آنے والے ائمہ راشدین کی ولایت کا اقرار کرو تو انہوں نے کہا یا اللہ میں نے جسے دیکھا نہیں جسے جانتا نہیں اس سے کیسے پیار کروں۔ پھر غصہ ہو کر چل پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو کہا یونس کو نگل جا لیکن اس کی ہڈیاں نہ ٹوٹنے پائیں۔ میں نے نگل لیا وہ چالیس دن میرے پیٹ میں رہے۔ میں انہیں تین اندھیروں میں مختلف سمندروں میں لئے پھرتی رہی وہ "لا الٰہ الّا انت سبحٰنک انّی کنت من الظّلمین" پڑھتے رہے اور جب یہ کہا کہ میں نے حضرت علیؓ اور ائمہ راشدین کی ولایت کو قبول کیا تو اللہ نے مجھے حکم دیا اسے اگل دو تو میں نے دریا کے کنارے اسے اگل دیا۔

(انوار النعمانیہ صفحہ ۸ بحث تعداد حروف اعظم بحوالہ عقائد جعفریہ صفحہ ۹۹ جلد ۱)

شیعہ اصول کفر میں سے ایک اصول کفر "حرص" آدمؑ میں تھا۔ امام جعفر نے فرمایا کفر کے اصول تین ہیں۔ حرص، تکبر اور حسد، بہرحال حرص تو جب آدمؑ کو درخت سے منع کیا گیا تو حرص نے ہی انہیں اس کے کھانے پر مجبور کیا۔

(اصول کافی ص ۲۸۹ جلد ۲، کتاب الایمان و الکفر، باب فی اصول الکفر و ارکانہ)

اس کے بعد دوسرا اصول کفر "حسد" بھی ملاحظہ فرمائیں:

امام رضا نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے سجدہ کروا کے اور جنت میں رہنے کی اجازت دے کر آدمؑ کو خصوصی اکرام سے نوازا تو ان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ "کیا اللہ نے مجھ سے افضل کسی بشر کو پیدا کیا ہوگا"؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے آدمؑ اپنے سر کو اوپر اٹھا اور میرے عرش کے پائے کی طرف دیکھ تو اس پر یہ تحریر تھا کہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی بن ابی طالب امیر المومنین، ان کی بیوی فاطمہ سیدہ نساء العٰلمین اور حسن و حسین نوجوانان جنت کے سردار"۔ آدمؑ نے کہا اے پروردگار یہ کون ہیں؟ فرمایا۔ یہ تیری اولاد میں سے ہیں لیکن تجھ سے اور میری تمام مخلوق سے بہتر اور بلند مرتبہ ہیں "ولولاهم ماخلقتك ولا خلقت الجنّة والنّار ولا السماء والارض فاياك ان تنظر اليهم بعين الحسد فاخرجك عن جوارى" اور اگر یہ نہ ہوتے تو میں نہ تجھ کو پیدا کرتا اور نہ جنت و دوزخ کو اور نہ آسمان و زمین کو وجود میں لاتا۔ پس تو انہیں حسد کی نظر سے مت دیکھنا ورنہ اپنے قرب سے تجھے نکال باہر کروں گا۔

مگر آدمؑ نے نظر حسد سے ان کو دیکھا اور ان کے مرتبہ کی تمنا کی تو شیطان ان پر مسلط ہو گیا یہاں تک کہ وہ درخت کھا لیا جس سے ان کو منع کیا تھا اور حوا پر بھی شیطان غالب آیا کیونکہ اس نے فاطمہؑ کو نگاہ حسد سے دیکھا تھا جس کے نتیجے میں اس نے بھی "شجرہ ممنوعہ" کو کھا لیا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو جنت سے نکال دیا اور زمین پر اتار دیا۔

{بحار الانوار صفحہ ۱۶۵ جلد ۱۱، صفحہ ۳۲۷ جلد ۲۶، حیات القلوب صفحہ ۵۰ جلد ۱، معانی الاخبار صفحہ ۱۰۹، عیون اخبار الرضا صفحہ ۳۰۹ جلد ۱}

ان شیعی روایات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شیطان ایک اصل کفر "تکبر" کی پاداش میں مردود ہوا جبکہ حضرت آدمؑ دو اصول کفر حرص اور حسد کے مرتکب ہوئے۔

حضرت امام رضا نے فرمایا کہ سفید رنگ کے مرغ میں پانچ خصلتیں نبیوں کی پائی جاتی ہیں ۱۔ نماز کے وقتوں کی پہچان ۲۔ غیرت ۳۔ سخاوت ۴۔ شجاعت ۵۔ کثرت جماع۔

{کتاب الخصال از شیخ صدوق صفحہ ۲۹۹ جلد ۱}

توہین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت جعفر صادق نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے قول "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِيْٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا" میں حضرت علیؓ کی مثال بیان کی گئی ہے وہ اس طرح ہے۔ فَالْبَعُوْضَةُ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ فَمَا فَوْقَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ "مچھر امیر المومنین حضرت علیؓ ہیں اور مچھر سے بھی کمتر رسول اللہ ﷺ ہیں۔ {تفسیر قمی صفحہ ۳۱ سورۃ البقرۃ تحت الآیۃ، تفسیر حسن عسکری آغا حیدری صفحہ ۱۸۲}

حضرت جعفر صادق نے فرمایا:

جو امیر المومنین حکم دیں وہ مانو اور جس سے منع کریں اس سے باز رہو۔ علیؓ کو وہی فضیلت حاصل ہے جو رسول اللہ ﷺ کو ہے۔

{اصول کافی، کتاب الحجۃ، باب ان الائمۃ ہم ارکان الارض صفحہ ۱۱۸ جلد ۱}

حضرت علیؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا کو کہتے سنا ہے کہ میں اور علی اس امت کے دو باپ ہیں اور ہمارا حق ان والدین سے جو ان کی ہستی کا باعث ہیں بہت زیادہ ہے۔

شیعہ سکالر عبدالکریم مشتاق لکھتے ہیں کہ: اسی طرح "ابوتراب" زبان پر آتے ہی دل و ذہن حضرت علی بن ابی طالب کی طرف رجوع کر جاتے ہیں اور جب ہم "ابوتراب" کے معنی کرتے ہیں تو یہ "مٹی کا باپ" ہوتے ہیں اور ظاہر ہے باپ اسی وقت ہوگا جب پیدا کرے گا۔

پس ثابت ہوا کہ "تراب سے پیدا کرنے والے" سے مراد صاحب ولایت علی ولی اللہ ہے۔

صفت دوم یہ کہ "نطفے سے بنانے والا"۔

اللہ تبارک و تعالیٰ اور نطفہ کے درمیان سوائے خالق و مخلوق کے اور کوئی رشتہ نہیں اور یہ بات کسی جرح کے قابل نہیں کہ نطفہ محتاج ہے باپ کا اور خدا کسی کا باپ نہیں۔ لہٰذا نطفے سے جانے والے کے لئے ضروری ہے وہ باپ ہو۔ اسی لئے تو رسولؐ نے "ابوتراب" کی کنیت سے نواز کر یہ اعزاز مولا علیؑ کو بخشا کہ آپ سب کے باپ ہیں۔ دو الفاظ کے مرکب سے شہر علم نے خالق و مخلوق کے مابین خلقت کے تمام مسائل حل کر دیئے۔ خدا ذات صمد کی توحید بھی قائم رہے اور ولایت بھی۔ تبھی تو حضرت امیر المومنین کے بارے میں ارشاد فرمایا "مسلمانوں پر علیؑ کا حق ایسا ہے جیسے کہ باپ کا اولاد پر" اور فرمایا "علیؑ کا اس امت پر ایسا حق ہے جیسے والد کا اپنے بچے پر۔ {علی ولی اللہ صفحہ ۹۶-۹۷}

شیخ صدوق کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تین چیزیں دی گئیں اور ان میں علی میرے ساتھ شریک ہے اور علی کو تین اور چیزیں دی گئیں جن میں میں شریک نہیں ہوں۔
عرض کیا گیا یا رسول اللہ وہ تین چیزیں کیا ہیں جن میں حضرت علی آپکے ساتھ شریک ہیں؟ فرمایا

۱۔ لواء الحمد مجھے دیا گیا اور علی اس کے اٹھانے والا ہے۔
۲۔ کوثر مجھے عطا ہوئی اور علی اس کا ساقی ہے۔
۳۔ جنت و دوزخ مجھے دی گئی اور علی ان کا تقسیم کرنے والا ہے۔

اور وہ تین چیزیں جو علی کو دی گئیں۔ لیکن میں ان میں شریک نہیں۔

۱۔ علی کو شجاعت ایسی ملی جیسی مجھے نہیں ملی۔
۲۔ علی کو فاطمہ جیسی بیوی ملی اس جیسی مجھے نہ ملی۔
۳۔ علی کے دو فرزند حسن و حسین ہیں مجھے ان دونوں جیسے بیٹے نہیں ملے۔

(انوار النعمانیہ صفحہ ۱۷ جلد ۱، امالی طوسی صفحہ ۳۵۴ جلد ۱، مناقب ابن شہر آشوب صفحہ ۲۶۲ جلد ۳)

اہل تشیع کے قائد اعظم جناب خمینی صاحب لکھتے ہیں کہ: رسول اکرم ﷺ حضرت علی کی امامت کا اعلان کرنے سے قوم سے ڈرتے تھے اور جس شخص نے بھی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ آپ ﷺ اس (خوف) میں حق بجانب تھے۔ (کشف الاسرار صفحہ نمبر ۱۶۵)

ترجمان شیعیت ملا باقر مجلسی لکھتا ہے کہ:

جب امام مہدی ظاہر ہوں گے خدا ان کی مدد فرشتوں کے ذریعے کرائے گا اور سب سے پہلے ان کی بیعت محمدؐ اور پھر علی کریں گے۔ (حق الیقین صفحہ نمبر ۳۴۷)

جناب خمینی لکھتے ہیں:

جو نبی بھی آئے وہ انصاف کے نفاذ کے لئے آئے ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ تمام دنیا میں انصاف کا نفاذ کریں لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے یہاں تک کہ ختم المرسلین جو انسان کی اصلاح کے لئے آئے اور انصاف کا نفاذ کرنے کے لئے آئے تھے۔ انسان کی تربیت کے لئے آئے تھے لیکن وہ اپنے زمانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ (اتحاد و یک جہتی صفحہ ۱۵، خانہ فرہنگ ایران ملتان)

حضرت علی نے فرمایا کہ وہ رحم جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے مشتق کیا ہے اس سے رحم آل محمد ﷺ مراد ہے اور محمد کی تعظیم اللہ جل جلالہ کی تعظیم ہے اور محمد ﷺ کے خویش و

اقارب کی تعظیم خود محمد ﷺ کی تعظیم ہے اور تمام مومنین و مومنات جو ہمارے شیعہ ہیں رحم آل محمد میں داخل ہیں اوران کی تعظیم وتوقیر بعینہ محمد ﷺ کی تعظیم وتوقیر ہے۔ پس عذاب ہے ایسے شخص کے لیئے جوذرا بھی حرمت محمد ﷺ کو خفیف اور حقیر سمجھے۔ (آثار حیدری صفحہ ۳۲)

شیعہ مفسر ملا فتح اللہ کاشانی لکھتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

جس نے ایک بار متعہ کیا اسے حسینؓ کا، جس نے دو دفعہ متعہ کیا اسے حسنؓ کا، جس نے تین دفعہ متعہ کیا اسے علیؓ کا درجہ مل گیا اور جس نے چار مرتبہ متعہ کیا اس کا درجہ میرے برابر ہوگا۔

(تفسیر منہج الصادقین صفحہ ۴۹۳ جلد ۲)

شیعہ سکالر عبدالکریم مشتاق لکھتا ہے کہ: باقی دشمن جلے یا مرے میں تو یا علی مدد کہہ کر رزق، اولاد، صحت، فتح، حاجت برآری مولا مشکل کشا سے چاہوں گا میں اسے شرک نہیں سمجھتا۔ علیؓ سے مدد مانگنا میرے نزدیک سنت انبیاء ماسبق ہی نہیں سنت خاتم الانبیاء ہے۔

(ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور صفحہ ۱۰ جلد ۲)

توہین امہات المؤمنینؓ

سیدہ ام حبیبہؓ کی توہین:

غلام حسین نجفی لکھتا ہے کہ: بنوامیہ کی صفائی میں یہ عذر بھی قبول نہیں ہے کہ اگر بنوامیہ لعنتی درخت ہے تو نبی پاک ﷺ نے بنوامیہ کی ایک خاتون معاویہ کی بہن ام حبیبہ سے شادی کیوں کی ہے؟ اس کمزور بات کا جواب یہ ہے کہ حضرت لوط اور نوح کا ذکر اور ان کی ازواج کا دوزخی ہونا قرآن پاک میں صاف لکھا ہے۔ پس قرآن پاک نے اس مشکل کو یوں حل کر دیا کہ غیر مومنہ عورتیں کسی ضرورت کی خاطر نبیوں کی بیویاں رہ سکتی ہیں۔ ام حبیبہ کے رشتہ والا رعب ہم شیعوں کو نہ دیا جائے کیونکہ قرآن پاک قصہ لوط اور نوح میں صاف لکھا ہے کہ ان کی بیویاں دوزخی تھیں۔ پس کسی امویہ عورت سے کسی مجبوری کے باعث نبی کریم ﷺ کے شادی کر لینے سے اس عورت کے بدکار باپ، دادا اور ظالم بھائی بھتیجوں کی صفائی حاصل نہیں ہو سکتی۔

(حقائق بنی امیہ صفحہ ۱۴۲)

ام المومنین سیدہ حفصہؓ کی توہین:

بی بی حفصہ جیسی عورت کو حضور ﷺ نے قبول کر لیا تھا درانحالیکہ وہ بیوہ بھی تھی اور شکل

کی بھی پوری سوری تھی۔

(حقیقت فقہ حنفیہ صفحہ ۱۴۳)

ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ کی توہین:

ملا باقر مجلسی لکھتا ہے کہ "جب ہمارے امام قائم (امام مہدی) ظاہر ہوں گے تو عائشہ کو زندہ کریں گے تاکہ اس پر حد لگائیں اور اس سے فاطمہ کا بدلہ لیں"۔ (حق الیقین صفحہ ۳۴۷)

غلام حسین نجفی لکھتا ہے کہ:

"بی بی عائشہ کوئی امریکن میم یا یورپین لیڈی تو نہیں تھی کہ بہت دور رہتی تھی۔ مکہ کی زلیخا بی بی عائشہ میں کیا رکھا تھا کہ حضور پاک ﷺ نے اپنی ہم عمر بیویوں کے ہوتے ہوئے یا دوسری جوان عورتوں کے ملنے کے باوجود چھ سالہ ننھی اماں جی سے اپنے پچاس برس کے سن میں شادی رچائی"۔

(حقیقت فقہ حنفیہ صفحہ ۶۴)

"یہ (عائشہ) آپ کی مفتی اور مجتہد اماں جی آپ کے امام اور خلیفہ عثمان کی قاتل بھی ہے اور آپ کی حدیث کی راوی بھی ہے۔ اگر عثمان مومن تھا تو مومن کا قاتل دوزخی ہے پھر آپ کی اماں جی کا کیا بنے گا"؟

(فقہ حنفیہ صفحہ ۳۰)

"عائشہ مومنوں کی ماں ہے۔ ہم نے ان کے ماں ہونے کا کب انکار کیا ہے؟ مگر اس سے ان کا مومنہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ماں ہونا اور ہے اور مومنہ ہونا اور ہے"۔

(تجلیات صداقت صفحہ ۸۱۷ از محمد حسین ڈھکو)

"عائشہ نے یہ دیکھ کر زمین سے تھوڑی سی مٹی اٹھائی اور یہ کہہ کر حضرت علی کے لشکر کی طرف پھینکی "شاہت الوجوہ" یہ چہرے سیاہ ہو جائیں۔ اس حرکت پر ایک شخص نے بڑھ کر جواب دیا "وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ الشَّيْطٰنَ رَمٰى" یہ تم نے نہیں پھینکی بلکہ شیطان نے پھینکی ہے۔ مالک اشتر نے بڑھ کر اونٹ کا ایک پیر قطع کر دیا مگر اونٹ کھڑا رہا۔ پھر دوسرا پیر قطع کر دیا مگر اونٹ اپنے حال پر قائم رہا اتنے میں حضرت علی تشریف لے آئے اور فرمایا۔ یہ اونٹ شیطان پر رکا ہوا ہے اس کا تیسرا پیر بھی قطع کر دو"۔ (وقائع عائشہ صفحہ ۲۹۹ از مرزا یوسف حسین قبلہ)

"پس معلوم ہوا کہ جو اونٹ پر سوار ہو کر نبی پاک ﷺ یا ان کی اولاد اور حضرت علی کے مقابلہ میں آئے وہ بھی حکم لعنت میں ابو سفیان کے ساتھ شریک ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ کو اپنے گھر میں بیٹھنے کا حکم دیا تھا لیکن بی بی جی نے حکم خدا اور رسول ﷺ کی نافرمانی کی اور

گھر سے نکل کر سینکڑوں میل دور بصرہ میں محاذ جنگ گرم کیا۔ نیز نبی کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ تو میرے بعد علیؑ سے جنگ کرے گی اور تو ہی ظالم ہو گی۔"

{بغاوت بنی امیہ صفحہ ۸۸، صفحہ ۱۲۲، ۲۲۳ از غلام حسین نجفی}

"حضرت علیؑ سے تین معاویوں نے جنگ کی ہے۔ پہلا معاویہ بناء بر مشہور ہے۔ ابن ابی سفیان ہے۔ دوسرا طلحہ وزبیر مل کر ایک معاویہ ہیں۔ تیسرا حضرت عائشہ بھی معاویہ سے کم نہیں ہے۔ برائی کی ابتدا کرنے والا زیادہ گناہ گار ہوتا ہے۔ خاندان نبوت سے جنگ کرنے کی حضرت عائشہ نے ابتدا کی ہے اور ان کی اسی جنگ نے معاویہ کی حوصلہ افزائی کی ہے پس دنیا میں جتنی اولاد نبی جنگوں میں خصوصاً جنگ کربلاء میں شہید ہوئی ہے۔ تمام کے خون کی ذمہ داری حضرت عائشہ پر آتی ہے۔ پس مذکورہ تین معاویوں میں جناب عائشہ زیادہ مجرم ہیں"۔

{حوالہ مذکورہ صفحہ ۳۹۹}

"خاندان نبوت کے خلاف جناب عائشہ کا بغاوت کرنا اس کے دل کی ہانڈی کا حضرت علیؑ کی دشمنی سے کھولنا اور پھر ابل پڑنا اور کناروں سے بہنے لگنا اور پھر جناب امیر کے خلاف خروج کر کے جنگ جمل میں حضرت علیؑ کے خلاف لڑنا یہ سب سے بڑا فتنہ ہے۔ یہی کفر کا سرا ہے"۔ {حوالہ مذکورہ صفحہ ۳۶۸}

"خاندان رسالت کے بارے میں کینہ کی آگ تو حضرت عائشہ کے دل میں اسی دن سے پیدا ہو گئی تھی جس دن سے اس کی ڈولی ہاشمیوں کے گھر آئی تھی اور پھر قتل عثمان کے بعد ایسی بھڑکی کہ جس کے شعلے جنگ جمل کی صورت میں ظاہر ہوئے اور ان کی تپش اب تک محسوس ہوتی ہے"۔ {حوالہ مذکورہ صفحہ ۳۲۹}

"بوقت موت جناب عائشہ بہت گھبرائیں اور بے چین و بے قرار ہوئیں پوچھا گیا "اماں جی کیا بات ہے" بی بی جی فرمانے لگیں۔ میرے حلق میں جنگ جمل کا دن اٹک اور پھنس گیا ہے۔ جنگ جمل کا وقت موت بی بی جی کے گلے میں پھنس جانا اس بات کی ٹھوس دلیل ہے کہ یہ جنگ جناب عائشہ کی ایسی غلطی ہے جس کی معافی انہیں خدائے رحیم نے وقت موت تک نہیں دی اور وقت موت کسی غلطی سے توبہ قبول نہیں ہوتی۔ {حوالہ مذکورہ صفحہ ۳۳۳}

"معاویہ کی بغاوت سے طلحہ اور زبیر اور جناب عائشہ کی بغاوت سخت ہے۔ پس جن

لوگوں نے ہمارے مولا علیؑ کی حکومت کو ناکام کرنے کی کوشش کی تھی ہماری زبان پر چھالے پڑ جائیں کہ ہم ان کو "رضی اللہ عنہ" کہیں۔ جن لوگوں نے ہمارے مولا علیؑ کے خلاف بغاوت کی ہے اور ناصبیت کی حوصلہ افزائی کی ہے اور لوگوں کے دلوں میں خاندان نبوت سے نفرت کے بیج بوئے ہیں اگر ہمارے جسموں کو قیمہ قیمہ کر دیا جائے تو بھی ہم ان لوگوں کو عقیدت کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے"۔

(حوالہ مذکور صفحہ ۱۴۳)

"صحابہ کرام میں ایسے بے حیا لوگ تھے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی بوڑھی بیویوں کو چھوڑ کر آنجناب کی محبوبہ اور جوان بیوی سے غسل جنابت کا طریقہ سیکھتے تھے اور اگر اس شریعت کی ٹھیکیدار بیوی سے کوئی نبی کریم ﷺ کے جماع کرنے کا طریقہ پوچھ لیتا تو پھر کیا وہ لیٹ جاتی اور نقشہ دکھا کر عملی دنیا میں اپنا نام روشن کرتی"۔

(تحفہ حنفیہ صفحہ ۲۷۰ از غلام حسین نجفی)

شیعہ مجتہد مرزا یوسف حسین لکھتے ہیں کہ:

"بی بی عائشہ کو اولاد علیؑ و فاطمہؑ سے بغض و حسد: آپ کو یہ بھی گوارہ نہ تھا کہ سرور عالم اپنے نواسوں حسنؑ اور حسینؑ سے کیوں اس قدر محبت کرتے ہیں یا پیار و اخلاص سے پیش آتے ہیں جس پر وہ اکثر حیات رسول ﷺ میں اعتراض کرتی رہیں اور آنحضرت ﷺ سے جھگڑا کرتی رہیں اور جس کی کسر انہوں نے وفات رسول ﷺ کے بعد نکالی۔ امام حسنؑ کی شہادت کے بعد ان کی میت روضۂ رسول ﷺ میں دفن نہ ہونے دی بلکہ کہنے لگیں کہ یہ میرا گھر ہے میں ان کے دفن کی اجازت نہیں دیتی مجھے اختیار ہے۔ حالانکہ امام حسنؑ نے وصیت کی تھی کہ انہیں نانا کے پاس دفن کیا جائے۔ بلکہ خود خچر پر سوار ہو کر نکل آئیں جس پر معرکے کی نوبت آئی اور دشمنوں نے اتنے تیر برسائے کہ ستر تیر امام حسنؑ کے جنازے میں چبھ گئے اور مروان بن حکم ان کا شریک کار تھا۔ آخر آپ ﷺ کو جنت البقیع میں دفن کیا گیا (محرم نامہ خواجہ حسن نظامی۔ ۱۴۳ اکتوبر ۱۹۸۲)

کسی شاعر نے ایک شعر میں واقعہ کی سچی تصویر کھینچی ہے۔

تجملت تبغلت ولو عشت تفیلت   لک التسع من الثمن و بالکل تملکت

اے عائشہ تم اونٹ پر چڑھیں، خچر پر چڑھیں اور اگر زندہ رہیں تو ہاتھی پر چڑھ ہو لی۔ بحیثیت حق زوجیت کے مکان کے آٹھویں حصہ کا نواں حصہ تمہارا مال ہے مگر تم کل کی مالک بن بیٹھیں"

(وفات عائشہ صفحہ ۱۳)

شیعہ سکالر عبدالکریم مشتاق لکھتا ہے کہ

"جب حضرت علیؓ نے ایک ایسی خاتون کے خلاف جنگ فرمائی جو حکم خدا اور رسول ﷺ کے خلاف گھر سے باہر آ گئیں اور میدان جنگ میں کود پڑیں۔ انہوں نے خلافت حقہ کے خلاف جارحانہ طرز پر فوجی بغاوت کر کے مرکز کو کمزور کیا۔ ایک ماں نے اپنی اولاد پر قاتلانہ حملہ کیا۔ رسول ﷺ کے متنبہ کرنے کے باوجود اس جگہ تشریف لائیں جہاں ان پر کتے بھونکے اور کتوں نے ان کو یاد دلایا کہ وہ برسر حق نہیں ہیں لیکن انہوں نے جس طرح اللہ کے حکم کی نافرمانی کرتے ہوئے میدان جنگ میں کودنا گوارا کر لیا اسی طرح حکم رسول ﷺ کو پس پشت ڈال کر اس شخص سے لڑائی کی جس سے لڑنا رسول ﷺ سے لڑنا ہے۔ پس ایسی حکم عدول خاتون کی باغیانہ مفسدانہ اور شریرانہ حرکات سے چشم پوشی کرنا گناہ عظیم تھا لہٰذا خلیفہ برحق نے اطاعت خدا اور رسول ﷺ میں اس فتنہ کی سرکوبی کی"۔　　(آگ خانہ بتول پر صفحہ ۷۸،۷۷)

ترجمان شیعیت ملا باقر مجلسی نے سیدہ عائشہ صدیقہؓ کو "غدارہ، منافقہ اور کافرہ قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو تذکرۃ الائمہ صفحہ ۸۳،۵۵ حیات القلوب صفحہ ۶۱۰ جلد ۲

یہی ملا باقر مجلسی اپنی کتاب حق الیقین میں لکھتا ہے کہ: (یہ ملحوظ رہے کہ خمینی نے اپنی کتاب کشف الاسرار صفحہ ۱۲۱ پر اہل تشیع کو مجلسی کی کتب پڑھنے کی تاکید کی ہے)

"تبرا کے بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ چار بتوں ابوبکر، عمر، عثمان، معاویہ اور چار عورتوں یعنی عائشہ، حفصہ، ہند اور ام الحکم اور ان کے تمام احباب اور پیروکاروں سے اظہار بیزاری کیا جائے اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں بدترین لوگ ہیں ان سے بے زاری کئے بغیر اللہ و رسول ﷺ اور ائمہ پر ایمان مکمل نہیں ہو سکتا"۔ (حق الیقین صفحہ ۵۱۹)

موصوف ایک دوسری کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

"بسند معتبر منقول ہے کہ حضرت جعفر صادق اپنی نماز کی جگہ سے نہیں اٹھتے تھے جب تک کہ وہ چار ملعون مردوں اور چار ملعون عورتوں پر لعنت نہ کر لیتے۔۔۔۔ پس چاہیے کہ ہر نماز کے بعد کہیں۔ "اللّٰھم العن ابابکر و عمر و عثمان و معاویہ و عائشہ و حفصہ و ھند و ام الحکم" ــــ اے اللہ ابوبکر، عمر، عثمان، معاویہ، عائشہ، حفصہ، ہند، ام الحکم پر لعنت کر۔

(عین الحیات صفحہ ۵۹۹ باب ۳۰ کار عیسیٰ کے عقب ہر نماز باید خواند)

سیدہ فاطمہ کی توہین

کتب شیعہ میں سیدہ فاطمہؓ کی توہین پر مبنی بہت سی روایات پائی جاتی ہیں کہ انہوں نے حضرت علیؓ کی پاک دامنی پر شک کیا، وہ حضرت علیؓ کے ساتھ نکاح ہونے پر ان کی تنگ دستی کی وجہ سے ناخوش تھیں اور اس پر سخت روئیں، وہ آنحضرت ﷺ سے حضرت علیؓ کے رویہ کے متعلق اکثر شکایت کرتی رہیں، انہوں نے حضرت عمرؓ کا گریبان پکڑ کر کھینچا اور انہوں نے حضرت حسینؓ کو بادل نخواستہ جنا (اصول کافی فروع کافی ملا ابی للشیخ الصدوق جلاء العیون عین الحیوۃ وغیرہ)

اس سلسلے کی صرف ایک روایت دل پر جبر کر کے ہدیہ قارئین کی جاتی ہے:

"جب شب زفاف آئی جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل مع ستر ہزار فرشتوں کے زمین پر آئے اور جناب فاطمہؓ کے لئے دلدل لائے۔ جبرائیل نے اس کی لگام پکڑی اور اسرافیل نے رکاب تھامی اور میکائیل دلدل کے پہلو میں تھے اور حضرت رسول ﷺ سیدہ فاطمہؓ کے کپڑے تھامے ہوئے تھے۔ پس جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور تمام فرشتوں نے تکبیر کہی، اس طرح ملاپ والی رات کو تکبیر کہنا قیامت تک سنت ہو گیا...... حضرت جعفر صادق سے روایت ہے کہ حلال چیزوں میں غیرت کرنی جائز نہیں ہے اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے شب زفاف جناب علیؓ اور فاطمہؓ سے فرمایا کہ "کاری نکنید تا من نزد شما بیایم" جب تک میں نہ آؤں کام نہ کرنا۔ (جلاء العیون صفحہ ۱۹۳، ۱۹۲ از ملا باقر مجلسی)

سیدہ اسماء بنت ابی بکرؓ کی توہین

"ابن عباسؓ نے ابن زبیرؓ سے کہا تھا کہ متعہ کے حلال ہونے سے تو ناراض کیوں ہوتا ہے؟ اپنی ماں سے پوچھ۔ تیرے باپ اور اس میں کس طرح انگیٹھیاں گرم ہوئیں۔ ابن زبیر نے اپنی ماں اسماء بنت ابی بکر صدیق سے پوچھا۔ ماں نے بتایا کہ میں نے تجھے متعہ سے جنا ہے"۔ (قول مقبول صفحہ ۵۵۸ از غلام حسین نجفی)

"دنیا میں سب سے پہلے متعہ کی انگیٹھی جو روشن ہوئی وہ آل زبیر کی انگیٹھی ہے کیونکہ جناب اسماء بنت ابی بکر نے جناب زبیر سے متعہ فرمایا اور اس سے ان کا بیٹا عبداللہ پیدا ہوا"۔ (خلافت بنی امیہ صفحہ ۱۱۱ از غلام حسین نجفی)

حضرت عمرؓ کی دادی کی توہین

"کوئی عورت خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتی ہو اپنے بیٹے سے ہم بستری نہیں کرے گی۔ لیکن جناب عمر کی دادی وہ باہمت خاتون ہے جس نے پہلے تو عمر کے دادا کی زوجیت کا شرف حاصل کیا پھر نفیل کے مرنے کے بعد اس محترمہ نے اپنے بیٹے عمرو بن نفیل سے نکاح کیا"۔　　　(سہم مسموم صفحہ ۱۰۰ از غلام حسین نجفی)

والدہ عمر فاروقؓ کی توہین

"ضحاکہ ہاشم بن عبد مناف کی باندی تھی اور چرمی لنگوٹی پہن کر اونٹ چرایا کرتی تھی اور جناب نفیل سے معاشقہ ہو گیا تھا اور اسی دوستی کا نتیجہ ہے خطاب (والد عمر)۔ جب نفیل مر گیا اور جناب خطاب جوان ہو گیا۔ پھر ضحاکہ سے خطاب کی دوستی ہو گئی اور اس محبت کے نتیجے میں حنتمہ پیدا ہوئی جس کو ولادت کے بعد باہر پھنکوا دیا گیا۔ ہشام بن مغیرہ اس کو اٹھا کر لے گیا جب وہ جوان ہوئی تو پھر اس کا نکاح خطاب سے ہوا۔ خطاب بن نفیل قریشی تھا۔ نفیل کے مرنے کے بعد عمر بن نفیل نے اپنی ماں اور خطاب کی ماں سے نکاح کیا تھا اور زید پیدا ہوا۔ وہ زید جو سعید کا باپ تھا جو عشرہ مبشرہ میں داخل ہوا"۔　　　(قول مقبول صفحہ ۵۳۰ از غلام حسین نجفی)

حضرت عثمانؓ کی دادی کی توہین

"اسلام کے ٹھیکیدارو یہ بتاؤ کہ موجودہ قرآن جس نے جمع کرایا تھا وہ بے شک زرقاء خاتون کی اولاد ہے لیکن آپ کا محبوب رہنما ہے۔ عثمان صاحب کا داماد رسول ﷺ ہونا سفید جھوٹ نظر آتا ہے کیونکہ ایک تو وہ اولاد زرقاء سے تھے۔ بنو زرقاء کے نسب پر جو بدنما داغ ہے وہ کسی پانی سے دھل نہیں سکتا۔ جناب عفان عثمان کا باپ اور حکم مروان کا باپ یہ دونوں بھائی تھے۔ باپ دونوں کا ابوالعاص اور ماں زرقاء تھی"۔　　　(قول مقبول صفحہ ۷، صفحہ ۲۸۱،۱۱۹)

"زرقا بنت موہب مروان کی دادی ہے اور مکہ شریف میں جھنڈے والی مشہور زانیہ تھی۔ اس کے تعارف کے لئے کچھ نامعقول لوگوں نے یہ شعر بھی پیش کیا ہے

رحلها مرفوعة للفاعلين　　　بابها مفتوحة للداخلين

یعنی زرقاء کی ٹانگیں فاعلین کی خاطر اٹھی رہتی تھیں اور تشریف لانے والوں کے لئے اس کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا"۔　　　(ابجات بنی امیہ صفحہ ۶۷، صفحہ ۱۰۹ از غلام حسین نجفی)

والدہ عثمان غنی کی توہین

"یہ اروی بنت کریز جو حضرت ولید بن عتبہ کی ماں ہے جناب عثمان کی بھی یہی اروی بنت کریز ماں ہے جناب عثمان اور حضرت ولید دونوں مادری بھائی ہیں۔ پس جس خاتون کے ایک لڑکے کا مذکورہ نسب شریف ہے اس کی اولاد کے بارے میں آپ خود سوچ لیں۔ جو خاتون ایک بچہ غلط طریقے سے جنے گی وہ کسی امام، نبی ﷺ کی یا کسی خلیفہ رسول ﷺ کی ماں نہیں ہو سکتی۔ پس اروی بنت کریز کو اگر جناب عثمان کی ماں مان لیا جائے تو پھر حضرت عثمان امام برحق اور خلیفہ رسول نہیں ہو سکتے اور اگر مذکورہ خاتون کو ان کی ماں تسلیم نہ کیا جائے تو مثل مشہور ہے کہ آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا۔ پھر سوال پیدا ہو جائے گا کہ عثمان عفان کے گھر آئے کیسے؟ پس یک نہ شد دو شد ادھر ان کی ماں اور باپ دونوں کی تلاش ضروری ہو جائے گی۔"

(قول مقبول صفحہ ۵۰۱ از غلام حسین نجفی)

قارئین کرام! یہ ملحوظ رہے کہ حضرت عثمانؓ کی والدہ اروی بنت کریز رسول اکرم ﷺ کی حقیقی پھوپھی زاد بہن ہیں۔ نجفی ملعون کا یہ اتہام براہ راست خاندان رسالت ﷺ پر عائد ہوتا ہے۔

والدہ سعد بن ابی وقاصؓ کی توہین

"سعد بن ابی وقاص کی والدہ کے دو نام مشہور ہیں ایک ہے حمیہ یہ لفظ حمناء سے لیا گیا ہے اور لغت میں حمناء کتے کی چچڑی کو کہتے ہیں۔ شاید ہند چار یاری کی طرح یہ بھی اپنے دوست کو ہر وقت چمٹی رہتی تھی اسی مناسبت سے اسے حمیہ کہتے تھے۔ دوسرا لقب اس کی ماں کا عفراء لکھا ہے۔ یہ نام بھی سونے پر سہاگہ ہے۔ کیونکہ عفراء مادہ خنزیر کو کہتے ہیں۔ مادہ خنزیر کو جب شہوت آتی ہے تو کئی عدد نر اس کی حاجت پوری کرتے ہیں۔ مذکورہ عفراء بھی شاید شہوت زیادہ رکھتی ہو گی جس طرح ہند چار یاری یزید خبیث قاتل امام حسینؑ کی دادی تھی اسی طرح عفراء بھی عمرو بن سعد قاتل امام حسینؑ کی دادی ہے۔"

(قول مقبول صفحہ ۵۰۲ از غلام حسین نجفی)

والدہ طلحہ (یکے از عشرہ مبشرہ) کی توہین

"جناب طلحہ کی والدہ گرامی کے بارے میں لکھا ہے کہ زمانہ کفر و جاہلیت میں۔ چکلے والی عورتوں سے خاتون معظمہ بی بی صعبہ بنت الحضرمی بھی تھی اور اس نے بھی اللہ کے پڑوس

میں اپنا جھنڈا گاڑا ہوا تھا۔ کسی نامعقول نے بی بی صعبہ کے خوب صورت ہونے کی جناب ابو سفیانؓ سے تعریف کر دی۔ پس جناب ابو سفیان نے بھی اس کے شہد کا ذائقہ چکھا اور پھر فوراً ہی بی بی صعبہ کی شادی جناب عبیداللہ بن عثمان سے ہوئی اور شادی کے چھ ماہ بعد حضرت طلحہ پیدا ہوئے۔ نیز کتاب مثالب میں یہ بھی لکھا ہے کہ جن لوگوں سے تخنث کا کام لیا گیا تھا وہ جناب عبیداللہ ابو طلحہ بھی تھے۔ پھر نادان شیعہ ان باتوں کو پڑھ کر کھسر پھسر کرتے ہیں کہ جس کی ماں جھنڈے والی ہو اور باپ مخنث ہو اور وہ والدہ کی شادی کے چھ ماہ بعد پیدا ہوا ہو تو وہ عشرہ مبشرہ میں کیسے داخل ہو گیا"۔ (حوالہ مذکور صفحہ ۲۹۳)

والدہ زبیرؓ (یکے از عشرہ مبشرہ) کی توہین

"دیکھیے چھٹے خلیفہ عبداللہ بن زبیر کی دادی کا حلیہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ جھنڈے والی تھی کا حلیہ خاتون جناب ابن زبیر کی کوئی دادی تھی اور ایک مجہول النسب قبطی عوام نامی ان کا والد مرحوم تھا۔ پس اسی لئے تو زبیر کو عشرہ مبشرہ میں شامل کیا گیا ہے" (حوالہ مذکور صفحہ ۲۹۶، ۲۱۰)

رسول اکرم ﷺ کی ساس (ماں) کی توہین

"ہند نے معاویہ کو نکاح جماعت سے جنا ہے۔ جناب معاویہ اپنی ولادت میں چار مردوں کی طرف منسوب تھے۔ ابی عمرو بن مسافر ملی العارہ بن ولید عباس بن عبدالمطلب اور صباح حبشی ڈوم وغیرہ۔ زمانہ کفر میں ہند کی چار مردوں سے یاری تھی انہیں چار سے نکاح جماعت کیا اور معاویہ ان چار مردوں کے نطفے سے پیدا ہوئے۔ پس نعرہ "حق چار یار" بالکل درست ہے۔ محترم قارئین ہم کو مرنا ہے اور خدا کے حضور جواب دہ ہونا ہے۔ مذکورہ تحقیق بالکل غلط ہے۔ کیونکہ دیانت داری کے ساتھ تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہند کے دوستوں کی تعداد چار نہیں بلکہ زیادہ ہے۔ ان آٹھ لوگوں کے نام ہند کے دوستوں میں جب ملتے ہیں تو ہند چار یاری نہیں بلکہ تاریخ کی روشنی میں ہشت یاری تھی"۔ (الجعفریہ صفحہ ۱۶ مصنفہ غلام حسین نجفی)

فاتح مصر حضرت عمرو بن عاصؓ کی والدہ کی توہین

"نابغہ جو کہ مشہور بدکار عورت تھی جس نے زنا کی خاطر اپنے مکان پر جھنڈا لگایا ہوا تھا اور یہ کنجری معاویہ کے وزیر عمرو بن عاص کی ماں ہے۔ حاکم شام کو حکومت اجماع سے نہیں ملی تھی بلکہ عمرو کی دبر کے صدقے میں ملی تھی۔ دبر ننگی کرنا ابن عاص کی مادری وراثت تھی۔ اس کی

ماں نابغہ بنت حرملہ کی شان میں کسی شاعر نے ایک نعت شریف لکھی تھی جس کا ایک بیت ملاحظہ ہو ۔

رجلها مرفوعة للفاعلين بابها مفتوحة للداخلين

کہ نابغہ کی ٹانگیں گاہکوں کی زیادتی کی وجہ سے ہر وقت اٹھی رہتی ہیں اور اس کا دروازہ آنے والے حاجت مندوں کے لئے ہر وقت کھلا رہتا ہے" (اجتماعی مباحث صفحہ ۳۲۷ قول مقبول صفحہ ۴۹)

والدہ انس بن مالک کی توہین

"شیعہ عورتیں حافظ اور قاری قرآن کیوں نہیں جنتیں اس لئے کہ مردہ جس رات گھر میں رکھا ہو وہ اپنے شوہر سے ہم بستری نہیں کرتیں اور اہل حدیث وہابی عورتیں اللہ ان کو سلامت رکھے اور ان کی شہوت میں زیادتی عطا کرے آمین ثم آمین ۔ وہ بچوں کی موت کی پرواہ نہیں کرتیں جس رات میت گھر میں رکھی ہو وہ ضرور ایک مرتبہ خاوند سے انگیٹھی گرم کرواتی ہیں تاکہ سنت ام سلیم مادر انس بن مالک اور سنت جناب عثمان تا قیامت زندہ رہے ۔ مذہب اہل حدیث زندہ باد اور سنت عثمان پائندہ باد" ۔ (قول مقبول صفحہ ۴۲۸)

چونکہ غلام حسین نجفی شیعیت کا ترجمان اعظم ہے اس لئے اس کا مختصر تعارف ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے ۔ سید حسین عارف نقوی لکھتے ہیں کہ:

"غلام حسین ۱۹۳۹ء میں جلال پور ننگیانہ ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے ۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد مدرسہ محمدیہ جلال پور ننگیانہ میں داخل ہو گئے جہاں قرآن پاک مولانا سید محمد نواز شاہ سے پڑھا اور پھر استاذ العلماء سید محمد یار شاہ نجفی کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے ۔ کچھ عرصہ باب النجف جاڑا ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں حضرت حسین بخش نجفی سے اخذ فیض کرتے رہے ۔ ۱۹۵۸ء میں جامع المنتظر لاہور تشریف لے آئے اور حضرت اختر عباس نجفی اور حضرت سید صفدر حسین نجفی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور درس نظامی کی تکمیل کی ۱۹۶۳ء میں آپ نجف اشرف تشریف لے گئے اور حجۃ الاسلام آقای شیخ ہ اوترک سے درس سطحی حاصل کیا ۔ علم فلسفہ حضرت علامہ سید مسلم حلی اور حضرت علامہ شیخ کوچیالی سے حاصل کیا ۔ کچھ عرصہ استاذ العلماء حضرت علامہ محمد علی مدرس کی خدمت اقدس میں بھی حاضر رہے ۔ اصول فقہ کا درس خارج آیت اللہ العظمیٰ سید قاسم خوئی سے اور مکاسب کا درس خارج آیت اللہ العظمیٰ سید روح اللہ خمینی سے حاصل کیا ۔ ۱۹۷۰ء میں وطن واپس تشریف لے آئے ۔ ایک سال تک سندھ کے تبلیغی

دورے پر رہے اور پھر جامع المنتظر لاہور تشریف لے آئے جہاں علوم آل محمد علیہم السلام سے طلبہ کو بہرہ ور کر رہے ہیں اور جامعہ المنتظر ہی میں خطابت و امامت کے فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔

تصانیف: برصغیر ہند و پاک میں کثرت مذاہب کی وجہ سے مناظرہ اور مناظرانہ کتابیں عام ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد اہل سنت نے ان کتابوں کو جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے قبل ہندوستان میں شائع ہو چکی تھیں دوبارہ شائع کرنا شروع کر دیا ہے جن کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ وہ کتابیں ہیں جن کا شیعہ آج تک جواب نہیں دے سکے۔ حالانکہ یہ کذب صریح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کذب بیانی پر ایسے افراد پر مقدمہ چلایا جانا چاہیے۔

جامعہ سلفیہ اہل حدیث کے ناظم مولانا محمد صدیق نادلیانوالوی نے ایک کتاب بنام "سیدہ ام کلثوم سیدنا عمر کے نکاح میں" لکھی تھی محمد سلیمان اظہر سلفی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر شیعہ علماء نے ذوق تالیف ہی کو پورا کرنا تھا تو وہ مذکورہ بالا کتاب کا جواب لکھتے جس کا جواب ابھی تک واجب الادا چلا آ رہا ہے (صفحہ ا)

مولانا موصوف (غلام حسین نجفی) نے اس کتاب کا جواب "سہم مسموم" نامی کتاب میں دیا جو ضبط ہو چکی ہے اور جس کی وجہ سے مولانا مذکور کو انیس دن جیل میں رہنا پڑا۔

آپ نے مسئلہ فدک کے بارے میں "جاگیر فدک" نامی کتاب لکھی ہے۔

دیوبندیوں کے مشہور مناظر مولانا عبدالستار تونسوی نے "حقیقت فقہ جعفریہ" اور ملک امان اللہ ملک ایڈووکیٹ گجراتی نے "نفاذ فقہ جعفریہ" نامی کتابچے بھی لکھے تھے۔ مولانا مدظلہ نے "حقیقت فقہ حنفیہ" لکھ کر دندان شکن جواب دیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا کی دیگر تصنیفات درج ذیل ہیں۔

ماتم صحابہ، قول مقبول فی اثبات وحدۃ بنت الرسول ﷺ۔ مولانا موصوف ملک کے مشاہیر مقامات پر خطاب فرما چکے ہیں۔ خداوند عالم آپ کو عمر طویل عنایت فرمائے راقم آثم کی کئی مرتبہ حضرت علامہ مدظلہ سے ملاقات ہوئی ہے"۔ (تذکرہ علمائے امامیہ صفحہ ۲۱۰، ۲۱۱ مطبوعہ علامیہ دارالتبلیغ۔ اسلام آباد)

حجۃ الاسلام علامہ سید رضی جعفری نقوی اس کتاب کے متعلق بعنوان "گفتار مقدم" لکھتے ہیں:

"بڑی ضرورت تھی کہ ان علمائے حق کے مکمل حالات زندگی قوم کے سامنے آتے رہیں جنہوں نے غیر ... کے زمانے میں ہر دور میں حق و صداقت کے پرچم کو بلند رکھا ہے۔"

ان کے حالات آنے والی نسل کے لئے سرمایہ ہدایت ثابت ہوں شکر ہے کہ "امامیہ دار التبلیغ" کے معزز اور انتھک کار پردازوں نے اس خدمت کا بیڑہ اٹھایا اور اس سلسلہ میں پاکستان کے ان چیدہ چیدہ علماء کے حالات زندگی قوم کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی جو اپنے دور میں دین مبین کی خدمت سرانجام دیتے رہے۔ خوابیدہ انسان کو جھنجوڑ کر بیدار کرتے رہے اور سوئے ہوئے ضمیر کو پکار پکار کر آواز دیتے رہے اور یہ ان ہی علمائے حق کی بصیرت تھی جس نے اس برصغیر کے ظلمت کدے میں حق کا چراغ روشن کیا اور اس صنم کدے میں توحید باری کی آواز بلند کی"

(حوالہ مذکورہ صفحہ ۹)

جامعہ المنتظر اہل تشیع کا ایک مسلمہ اور اہم مرکز ہے۔ یہاں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے مذہبی امور کے علاوہ سیاسی امور بھی طے پاتے ہیں۔ امامیہ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آئی، ایس، او) کے کنونشنز بھی یہاں منعقد ہوتے ہیں۔ ۱۹۹۷ء میں پولیس نے بعض دہشت گردوں کی گرفتاری کے لئے جامعہ المنتظر پر چھاپہ مارا تو تحریک جعفریہ پاکستان بلبلا اٹھی۔ اس سلسلے میں ایک خبر ملاحظہ فرمائیں:

"تحریک جعفریہ پاکستان کی سپریم کونسل کا اہم اجلاس گذشتہ روز تحریک کے سربراہ علامہ سید ساجد علی نقوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سپریم کونسل کے اجلاس میں اراکین سپریم کونسل، مرکزی کابینہ، چاروں صوبوں سمیت آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات کے صدور اور اراکین پارلیمنٹ نے شرکت کی۔

تحریک جعفریہ کی سپریم کونسل نے دہشت گردی، حکومت کا رویہ اور تحریک جعفریہ کے اقدامات پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ تحریک جعفریہ نے مسلم لیگ کی کامیابی میں فیصلہ کن اور کلیدی رول ادا کیا ہے تاکہ پاکستان کو استحکام مل سکے اور وطن عزیز کو دہشت گردی سے نجات مل جائے۔ لیکن جونہی حکومت برسر اقتدار آئی اہل تشیع کا قتل عام کیا گیا۔ تحریک جعفریہ کے صوبائی دفاتر جو کہ عوامی وفلاحی خدمت کے مراکز ہیں پر دھاوا بولا گیا۔ اہل تشیع کی جامعہ المنتظر جیسی عظیم علمی درس گاہ پر ریاستی دہشت گردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈاکہ ڈالا گیا جس سے ملت تشیع کے جذبات کو شدید ٹھیس پہنچی۔ اس مسئلہ پر سپریم کونسل نے بڑی بے چینی اور سخت تشویش کا اظہار کیا کہ حکومت تحریک جعفریہ جیسی پرامن اور قانون پسند جماعت کو دہشت گردوں کے

ساتھ بٹھا کر بیلنس کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔" (روزنامہ اساس ۲۷ اگست ۱۹۹۷ء)

اوپر اہل تشیع کی "جامع المنتظر" جیسی عظیم علمی درس گاہ کے صرف ایک مبلغ، استاذ اور خطیب و امام اور شیعیت کے ترجمان اعظم غلام حسین نجفی کی کتب سے چند اقتباسات پیش کیے گئے ہیں جن سے ملت جعفریہ کے عقائد و نظریات اور اس کے عزائم کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

توہین صحابہ کرام

اہل تشیع کا عقیدہ تو یہ ہے کہ:

انبیائے کرامؑ کو نبوت ائمہ اہلبیت کی ولایت کے اقرار کی بدولت نصیب ہوئی اور جنہوں نے ان کی امامت میں شک یا توقف کیا وہ عذاب میں مبتلا ہوئے۔ جب وہ طبقہ بھی عذاب سے دوچار ہوا جس نے ائمہ کو دیکھا تک نہ تھا تو وہ لوگ جنہوں نے ائمہ کو دیکھنے کے باوجود انہیں "امامت و خلافت" کے قریب تک نہ آنے دیا اور ان پر دیگر مظالم ڈھانے کے علاوہ ان کا حق خلافت بھی غصب کر لیا کیوں نہ خارج از اسلام ہو کر مبتلائے عذاب ہوتے۔ یہ عنوان ایک مستقل کتاب کا متقاضی ہے یہاں اختصار کے پیش نظر صرف چند حوالہ جات ہدیہ قارئین کیے جاتے ہیں:

(نوٹ: خمینی کے صحابہ کرامؓ کے بارے میں ہذیانات، ہفوات، بکواسات اور مغلظات پیچھے زیر عنوان "خمینی اپنی تحریرات کے آئینے میں" گزر چکے ہیں۔ یہ ہفوات اور آگے نقل کیے جانے والے بکواسات دل پر انتہائی جبر کر کے اللہ تعالیٰ سے ہزار ہا بار معافی طلب کرنے کے ساتھ ساتھ ملت اسلامیہ سے بھی معذرت چاہتے ہوئے "نقل کفر، کفر نہ باشد" کے تحت محض اس لئے پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ امت مسلمان کے کفریہ عقائد و نظریات اور عزائم سے آگاہ ہو جائے)

امام باقر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد سب لوگ مرتد ہو گئے سوائے تین کے (راوی کہتا ہے) میں نے عرض کیا وہ تین کون ہیں؟ تو فرمایا: مقداد بن الاسود، ابو ذر غفاری اور سلمان فارسی ان پر اللہ کی رحمت ہو اور اس کی برکتیں۔ (فروع کافی، کتاب الروضہ صفحہ [illegible] جلد ۳)

شیعیت کے ترجمان اعظم ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں کہ:

"ائمہ اطہار سے بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں کہ حضرت رسول ﷺ کی وفات کے بعد تمام صحابہ مرتد ہو گئے تھے اور دین سے پھر گئے تھے سوائے تین یعنی سلمان، ابوذر اور مقداد کے" ([illegible])

"حضرت علی بن حسین (امام زین العابدین) سے ان کے آزاد کردہ غلام نے ابو بکر و عمر کے متعلق پوچھا۔ تو حضرت نے فرمایا "ہر دو کافر بودند و ہر کہ ایشاں را دوست دارد کافر است" "وہ دونوں کافر تھے اور جو ان کو دوست رکھے وہ بھی کافر ہے۔" {حق الیقین صفحہ ۵۲۲}

"فرعون وھامان سے مراد ابوبکر و عمر ہیں۔" {حوالہ مذکورہ صفحہ ۳۴۳}

"شیخ مفید (جو امام غائب کے معتمدین میں سے تھے اور امام انہیں غیبت کے بعد بھی خط لکھتے رہے) نے کتاب اختصاص میں حضرت جعفر صادق سے روایت کیا ہے کہ امیر المؤمنین نے بیان فرمایا کہ ایک دن میں شہر کوفہ کے پیچھے باہر گیا اور قنبر (خادم و غلام) میرے تک گ جا رہا تھا کہ اچانک ابلیس میرے سامنے آ گیا میں نے اس سے کہا عجیب گمراہ بدبخت ہے تو۔ اس نے کہا اے امیر المؤمنین آپ یہ بات کیوں کہتے ہیں خدا کی قسم کھا کے میں آپ کو ایک بات سناتا ہوں جو میرے اور خداوند عزوجل کے درمیان ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ جب اللہ نے میری خطاء کی بناء پر مجھے زمین پر بھیج دیا تو جب میں چوتھے آسمان پر پہنچا تو میں نے خداوند سے عرض کیا کہ اے میرے خدا میں گمان نہیں کرتا کہ تو نے مجھ سے زیادہ شقی اور بدبخت کوئی مخلوق پیدا کی ہو گی تو اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی کہ میں نے ایسی مخلوق پیدا کی ہے جو تجھ سے بھی زیادہ شقی اور بدبخت ہے تو جہنم کے داروغہ کے پاس جاتا کہ وہ تجھ کو اس مخلوق کی صورت اور اس کی جگہ دکھلا دے۔ تو میں جہنم کے داروغہ کے پاس گیا اور میں نے اس سے کہا کہ مجھے وہ آدمی دکھا جو مجھ سے بھی زیادہ بدبخت اور شقی ہے تو وہ مجھے جہنم کی طرف لے گیا اور جہنم کے اوپر سرپوش تھا وہ اس نے اٹھایا اس میں سے سیاہ رنگ کی ایسی آگ باہر نکلی میں نے گمان کیا کہ یہ آگ مجھے اور داروغہ جہنم کو بھی کھا جائے گی۔ داروغہ جہنم نے اس سے کہا۔ ساکن ہو جا۔ تو وہ ساکن ہو گئی۔ پھر وہ مجھے جہنم کے دوسرے طبقہ میں لے گیا تو اس میں سے ایسی آگ نکلی جو پہلی والی آگ سے بھی زیادہ سیاہ اور گرم تھی۔ داروغہ جہنم کے کہنے پر وہ بھی ساکن ہو گئی۔ پھر داروغہ مجھے جہنم کے مختلف طبقات میں لے جاتا رہا جن کی آگ پہلے سب طبقوں کی آگ سے زیادہ گرم ہوتی یہاں تک کہ وہ مجھے جہنم کے ساتویں طبقہ میں لے گیا جس کی آگ سب سے زیادہ گرم تھی۔ اس ساتویں طبقہ میں دو آدمیوں کو دیکھا کہ ان کی گردنوں میں آگ کی زنجیریں ہیں اور ان کو اوپر کی جانب لٹکا دیا گیا ہے اور ان کے سر پر دو گروہ کھڑے ہیں اور آگ کے گرز مارتے ہیں۔ میں نے

کہا اے داروغہ جہنم یہ دونوں کون ہیں؟ اس نے کہا تو نے وہ نہیں پڑھا جو عرش کے پایہ پر لکھا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ خدا نے دنیا کے یا آدم کے پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے لکھ دیا تھا کہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ایدتہ و نصرتہ بعلی" یہ دونوں آدمی علی کے دشمن اور ان پر ظلم و ستم کرنے والے ہیں یعنی ابوبکر و عمر" (حق الیقین صفحہ ۵۰۹، ۵۱۰)

"مفضل نے امام جعفر صادق سے عرض کیا کہ اے میرے آقا! صاحب الامر (امام مہدی) مکہ معظمہ کے بعد دوسرے کس مقام کا رخ کریں گے؟ آپ نے فرمایا کہ ہمارے نانا رسول خدا کے شہر مدینہ جائیں گے۔ وہاں ان سے ایک عجیب بات کا ظہور ہوگا جو مومنین کے لئے خوشی و شادمانی کا اور کافروں و منافقوں کے لئے ذلت و خواری کا سبب بنے گی۔ جب وہ اپنے نانا رسول خدا کی قبر کے پاس پہنچیں گے تو وہاں کے لوگوں سے پوچھیں گے کہ لوگو بتلاؤ کیا یہ قبر ہمارے نانا رسول خدا کی ہے؟ لوگ کہیں گے ہاں یہاں ہی کی قبر ہے۔ پھر امام پوچھیں گے کہ یہ کون لوگ ہیں جو ہمارے نانا کے پاس دفن کر دیئے گئے ہیں؟ لوگ بتلائیں گے کہ یہ آپ کے خاص مصاحب ابوبکر و عمر ہیں۔ پھر تین دن کے بعد صاحب الامر حکم دیں گے کہ دیوار توڑی جائے اور ان دونوں کو ان کی قبروں سے باہر نکالا جائے۔ چنانچہ دونوں کو قبروں سے نکالا جائے گا۔ ان کا جسم تازہ ہوگا۔ پھر حکم دیں گے کہ ان کا کفن اتار کر انہیں ایک سوکھے درخت پر لٹکا دیا جائے۔ پھر امام اعلان کرے گا کہ جو لوگ ان دونوں سے محبت و عقیدت رکھتے ہوں وہ ایک طرف الگ کھڑے ہو جائیں۔ امام ان الگ کھڑے ہونے والے سنیوں سے کہیں گے کہ ان سے بیزاری کا اعلان کرو۔ ان کے انکار پر کالی آندھی کے ذریعے انہیں ہلاک کر دیا جائے گا۔

پھر ابوبکر و عمر کو زندہ کر کے حکم دیں گے کہ تمام مخلوق جمع ہو۔ پھر دنیا کے آغاز سے اس کے ختم تک جو بھی ظلم اور جو بھی کفر ہوا اس سب کا گناہ ان دونوں پر لازم کیا جائے گا اور ان ہی کو اس کا ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔ خاص کر سلمان فارسی کو پیٹنا، امیر المومنین و فاطمہ زہرا و حسن کو زہر دینا، حسین ان کے بچوں، چچازاد بھائیوں اور ان کے ساتھیوں و مددگاروں کو کربلا میں قتل کرنا اور رسول خدا کی اولاد کو قید کرنا اور ہر زمانے میں آل محمد کا خون بہانا اور ان کے علاوہ جو بھی ناحق خون کیا گیا ہو اور کسی عورت کے ساتھ جہاں کہیں بھی زنا کیا گیا ہو اور جو سود یا جو بھی حرام کا مال کھایا گیا ہو اور جو بھی گناہ اور جو ظلم و ستم قائم آل محمد کے ظہور تک دنیا میں کیا گیا ہو اس

سب کو ان دونوں کے سامنے گنوایا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ یہ سب تمہارے سبب سے اور تمہاری وجہ سے ہوا ہے؟ وہ دونوں اقرار کریں گے کیونکہ اگر پہلے ہی دن خلیفہ برحق (علی) کا حق یہ دونوں مل کر غصب نہ کرتے تو ان گناہوں میں سے کوئی بھی نہ ہوتا۔ پھر امام حکم فرمائیں گے کہ جو لوگ حاضر و موجود ہیں وہ ان دونوں سے قصاص لیں۔ پھر حکم کریں گے کہ ان دونوں کو درخت پر لٹکا دیا جائے اور آگ کو حکم دیں گے کہ زمین سے نکلے اور ان دونوں کو درخت سمیت جلا کر راکھ کر دے اور ہوا کو حکم دیں گے کہ ان کی راکھ کو دریاؤں پر چھڑک دے۔

مفضل نے عرض کیا اے میرے آقا! یہ ان لوگوں کو آخری عذاب ہوگا؟ امام جعفر صادق نے فرمایا کہ اے مفضل ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم سید اکبر محمد رسول اللہ اور صدیق اکبر امیر المومنینؑ (علی) اور سیدہ فاطمہ زہراء اور حسن مجتبیٰ اور حسین شہید کربلا اور تمام ائمہ معصومین سب زندہ ہوں گے اور جو خالص مومن ہوں گے اور جو خالص کافر ہوں گے سب زندہ کیے جائیں گے اور تمام ائمہ اور تمام مومنین کے حساب میں ان دونوں کو عذاب دیا جائے گا یہاں تک کہ دن رات میں ان کو ہزار مرتبہ مار ڈالا جائے گا اور زندہ کیا جائے گا۔ اس کے بعد خدا جہاں چاہے گا ان کو لے جائے گا اور عذاب دیتا رہے گا"۔ (حق الیقین صفحہ ۳۶۰-۳۶۳)

"کسی صاحب عقل کے لیے گنجائش نہیں ہے کہ وہ عمر لعین کے کفر میں شک کرے اور اس شخص کے کفر میں جو عمر کو مسلمان جانتے" (جلاء العیون صفحہ ۴۵)

"قرآن مجید کا اٹل فیصلہ ہے اور مسلمانوں کا اس مسئلہ پر اتفاق ہے کہ کتے جیسا نجس جانور جب سکھا دیا جائے اور پھر اللہ کا نام لے کر کچھ دیگر شرائط کے ساتھ کسی جنگلی جانور کے پیچھے چھوڑا جائے اور وہ کتا اس جانور کو پکڑ لے تو مسلمان کے لیے اس جانور کا کھانا جائز ہے لیکن کتا پاک نہیں ہوگا۔ وہ نجس کا نجس ہی رہے گا۔ وہ ملاں جو فضول مسئلے چھیڑ کر ہمارے جگر میں سوراخ کرتے ہیں ان سے گزارش ہے کہ مذکورہ مسئلے کی روشنی میں جناب عمر کے زمانے کا مال غنیمت شیعوں کے امام کے لیے جائز تھا مگر ہم نے زیادہ تفصیل دی تو ہماری طوائف برادری کو تکلیف ہو گی" (سہم مسموم از غلام حسین نجفی صفحہ ۳۰۴)

"مخنث کا معنی کیا ہے؟ مخنث (فتح النون) وہ ہے جس کی کون مارتے ہیں۔ مخنث وہ ہوتا ہے جس کو پیچھے سے کیا جائے" (سہم مسموم صفحہ ۲۲۳ از قول مقبول صفحہ ۲۸۸ غلام حسین نجفی)

"تزنیم وہ شخص ہے جس میں مرض ابنہ پائی جائے اور مابون وہ شخص ہے جس میں مفعولیت کی بیماری ہو۔ پس معلوم ہوا کہ مرض ابنہ جس طرح ولید بن مغیرہ میں تھی اسی طرح حضرت عمر میں بھی تھی۔ ان دونوں کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ یہ دونوں لنگوٹیے یار یقیناً صفات میں ایک دوسرے کے شریک تھے۔ مرض ابنہ کو علمائے اہلسنت کی اصطلاح میں علتہ المشائخ بھی کہا جاتا ہے۔ اہلسنت بھائیو! آپ کا فاروق اعظم اور اس کا اعمال نامہ آپ کو مبارک رہے دنیا کا ہر غیور دوزخ میں جانا گوارہ کرے گا لیکن اعلیٰ حضرت عمر فاروق کی طرح علتہ المشائخ کے مرض میں مبتلا ہونے کی آرزو نہیں کرے گا۔ یہ مرض حضرت عمر میں تھی۔ پس شرم و حیا کرو حضرت عمر کے اس عمل کی آرزو تو کوئی سنی بھی نہیں کرے گا"۔ {سم مسوم صفحہ ۳۴۴، ۳۴۶، ۳۶}

"شریعت میں حکیم کے مشورہ کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ایک صحابی کو ان کے معالج نے مروانے کی اجازت دے دی اور اجازت بھی اس دلیل کے ساتھ بوقت مجبوری بیماری کی وجہ سے شرفا کو ربڑ کی نلکی سے حقنہ کرنے کی طب اور شریعت نے اجازت دی ہے۔ پس اسی طرح بوقت مجبوری ابنہ کی بیماری کی وجہ سے گوشت کی نلکی سے بھی حقنہ کروانا جائز ہے۔ مذکورہ عبارت میں لفظ صحابہ آیا ہے پس شیعہ صاحبان اس جگہ اس طرح محقق بننے کی کوشش نہ فرمائیں کہ یہ اجازت صرف صحابہ کے لئے خاص ہے کیونکہ بے شک اس کی اجازت حاصل کرنے میں صحابہ کی محنت اور معالجین کی بڑی کوشش ہے لیکن احکام عقل و شریعت سب لوگوں کے لئے برابر ہیں پس حقنہ کی اجازت صحابہ کرام اور مشائخ الحدیث اور تمام شرفاء کے لئے ہے۔ شیعہ صاحبان کو بھی عقل کے ناخن لینا چاہئیں وہ ایک اعلیٰ حضرت (عمر فاروق) کے بارے میں ابنہ کی بیماری کی وجہ سے کافی کیچڑ اچھالتے ہیں۔ علم سے دوری، دینی مدارس سے نفرت ان کو جناب ابوبکر سے بھی بدگمان کردے گی۔ صاف بات ہے کہ جب حقنہ کی عام صحابہ کے لئے شرعاً جائز ہے تو پھر ایک اعلیٰ حضرت کو اس اجازت سے محروم رکھنا بہت بڑی بے انصافی ہے۔ وہ دوا جو ابنہ کے بیماروں کو نفع بخشتی ہے اور خلیفہ دوم اس دوا کو زیادہ استعمال فرماتے تھے۔ اس کی دوا ماء الرجال تھی۔ ماہرین علم خواص الحیوانات نے اس زمانے میں یہ تحقیق پیش کی ہے کہ حیوانات کا دودھ، گوشت، چربی، خون، پسینہ، کھال، ہڈی، ناخن بلکہ ان کا گوبر اور پیشاب انسان کی بیماریوں میں دوا کے طور پر استعمال ہو سکتے ہیں اور برسوں سے اطباء دوائیوں میں استعمال فرما رہے ہیں پس

جس طرح باقی حیوانات کے تمام اجزائے بدن دواؤں میں استعمال ہوتے ہیں اسی طرح انسان کے بھی بعض اجزائے بدن دواؤں میں استعمال ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ماء رجال کے دوا ہونے سے انکار کرنا سراسر بے انصافی ہے اور حضرت فاروق سے کھلی دشمنی ہے"۔ (سہم مسموم صفحہ ۱۰۲)

یہ وہ شیعہ مجتہد اور عالم ہے جس کے حالات آپ پیچھے "تذکرہ علماء امامیہ" کے حوالے سے پڑھ چکے ہیں جو عصر حاضر میں شیعیت کا مبلغ اعظم اور ترجمان اعظم سمجھا جاتا ہے اور تحریک جعفریہ کی سپریم کونسل نے اس کا بھرپور دفاع کیا ہے۔ اس نے تمام سنیوں کو ایک ایسی گالی دی ہے جو ساری تاریخ انسانیت میں کسی بڑے سے بڑے کنجر کے حاشیۂ ذہن میں بھی نہ آئی ہوگی گالی پر مشتمل وہ عبارت بغیر ترجمہ کے ملاحظہ فرمائیں کیونکہ قلم میں اس کا ترجمہ کرنے کی ہمت نہیں ہے:

"کچھ نواصب (سنی) بے شرم گالیاں لکھ کر بھی مجھے خطوط کے ذریعے ارسال کرتے ہیں لہٰذا میں اپنے کرم فرماؤں کی خدمت میں نہایت ہی ادب سے یہ جواب پیش کرتا ہوں کہ "السماء والارض و مافیهما فی فروج امهاتکم و بناتکم و اخواتکم و عماتکم و خالاتکم" (کردار یزید صفحہ ۹)

"السلام علیکم یا سرکار نبیوں کے سردار۔ ارے تو کون ہے؟ اجی میں آپ کا پہلا یار بلکہ یار غار۔ تو کون ہے میاں؟ آجی میں دوسرا یار حاضر دربار فاروق تاج دار۔ ارے تو کون ہے؟ اجی خاکسار عثمان بن عفان جو تین دن سے فرار لیکن اس وقت ہوشیار اور خبردار، تنخواہ کا حق دار، مال غنیمت میں حصہ دار، خلاصہ نبی کریمؐ کے زمانے میں جتنی فتوحات ہوئی ہیں ثلاثہ کا جنگ سے بھاگنے میں نمبر فسٹ رہا ہے"۔ (قول مقبول صفحہ ۳۸۲)

"عثمان نے پہلی بیوی رقیہ کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ دوسری بیوی ام کلثوم کو بوقت جماع کے مار ڈالا تھا اور پھر خلیفہ ولید کی طرح اس کے مردہ سے ہم بستری کرتا رہا اور پوری دنیا میں یہ پہلا خلیفہ ہے جس نے شرم و حیا کا باڈر توڑ کر اپنی بیوی کے مردہ سے ہم بستری کی ہے اور نبی کریم کو اذیت دینے والا رحمت خدا کا حق دار نہیں ہے"۔ (قول مقبول صفحہ ۳۰۳)

"جو دیو بندی اپنی دائیں ران پر آدم اور بائیں ران پر حوا کا نام لکھے گا اس کو احتلام نہ ہوگا نوٹ اور اگر خصیتین پر ثلاثہ کا نام لکھ کر ہم بستری کی جائے تو انزال نہ ہوگا" (تحفہ حنفیہ صفحہ ۱۵۰)

"ابوبکر و عمر و عثمان کی خلافت کے بارے میں جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ یہ خلافت حق

ہے وہ عقیدہ بالکل گدھے کے عضو تناسل کی مثل ہے کیونکہ جیسی خلافت ہو اس کے لئے ویسا ہی عقیدہ چاہئے۔ پس کسی دشمن خدا و رسول کو بھی روضہ رسول میں دفن کر دینے سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔"

(حقیقت فقہ حنفیہ صفحہ ۱۰۷، صفحہ ۱۱۲)

جناب عثمان نے قرآن جلائے تھے۔ پس اسی بے ادبی کی وجہ سے عثمان صاحب جب اصحاب نبی کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ تو کتے اس کی ٹانگ لے گئے۔ ٹانگوں کا جرم یہی تھا کہ میدان جنگ میں رسول ﷺ کو چھوڑ کر بھاگ جاتی تھیں اور جن کتوں نے ٹانگ اٹھائی تھی انہوں نے عثمان صاحب کی اور بھی بہت کچھ خاطر کی تھی جس کے بیان سے آدمی کو شرم آتی ہے۔ فقہ نعمان بلے بلے۔ خدا کی اپنی تو کوئی ٹانگ نہیں ہے البتہ وہ مجرم جس کی ایک ٹانگ کتے مدینے میں لے گئے تھے جب تک اس ٹانگ کو خدا جہنم میں نہ ڈالے گا جہنم کہتا رہے گا ھل من مزید"

(حقیقت فقہ حنفیہ صفحہ ۳۹، ۲۵۔ بغاوت بنوامیہ صفحہ ۳۸۵)

"ایک حدیث میں آیا ہے کہ جہنم میں ایک کنواں ہے جس کا نام فلق ہے اس کی گرمی سے جہنم بھی پناہ مانگتی ہے۔ اس کنوئیں میں ایک آتشی صندوق ہے کہ اس کنوئیں والے اس صندوق سے بھی پناہ مانگتے ہیں۔ یہ وہ تابوت ہے جس میں چھ شخص پہلی امتوں کے اور چھ اس امت کے بند ہیں۔ پہلے چھ یہ ہیں آدم کا بیٹا، نمرود، فرعون، سامری، وہ یہودی جس نے دین عیسوی کو خراب کر کے لوگوں کو گمراہ کیا۔ دوسرے چھ یہ ہیں ابوبکر، عمر، عثمان، معاویہ"

(حق الیقین صفحہ ۲۷۶ جلد ۲، عین الحیوۃ صفحہ ۳۷۶)

"امیر المومنین صرف لقب ہے حضرت علیؑ کا اور آنجناب کے علاوہ جن لوگوں نے یہ لقب غاصبانہ طور پر اپنے لئے استعمال کیا ہے وہ سب علتہ جنسیہ اور مفعول بہ کے مریض تھے"۔

(قول مقبول صفحہ ۳۸۲)

حضرت علیؓ کی توہین

حضرت کے گلے میں رسی ڈال کر بیعت لی گئی۔ "پس وہ کافر امیر المومنین کے گلے میں رسی ڈال کر مسجد کی طرف کھینچ لے گئے"۔ (جلاء العیون صفحہ ۱۹۹ جلد اتحت زندگانی فاطمہ)

"جب حضرت علیؑ کا گریبان لوگوں نے پکڑا اور انہیں اٹھا کر ابوبکر کی بیعت کے لیے مسجد میں لے گئے۔ راستہ میں قبر رسول ﷺ پر کھڑے ہو کر انہوں نے وہ کہا جو حضرت موسیٰ کے

سخت لہجہ کے وقت حضرت ہارون نے کہا تھا۔ یعنی اے میرے بھائی۔ بے شک قوم نے مجھے کمزور اور بے بس کر دیا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیتے"۔ (حوالہ مذکورہ صفحہ ۳۲۳ جلد ۱)

سیدہ فاطمہ حضرت علیؓ سے فرماتی ہیں:

"رحم میں پڑے ناپختہ بچے کی طرح تم پردہ نشین ہوئے بیٹھے ہو اور خیانت کرنے والوں کی طرح گھر بھاگ آئے ہو اور دنیا کے بہادروں کو خاک ہلاکت میں گرانے کے بعد خود ان نامردوں (صحابہ کرامؓ) سے مغلوب ہو گئے ہو"۔ (حق الیقین صفحہ ۲۰۳ جلد ۱)

"پس عمر ایک گروہ کے ساتھ اسید اور سلمہ سمیت حضرت فاطمہ کے گھر گئے اور کہا کہ آؤ بیعت کرو۔ انہوں نے انکار کیا۔ زبیر نے تلوار نکالی اور باہر آیا۔ عمر نے کہا اس کتے کو پکڑو۔ سلمہ بن اسلم نے تلوار پکڑ کر دیوار پر ماری اور اس کو اور علیؓ کو پکڑ کر ابوبکر کے پاس لے گئے۔ بنو ہاشم بھی علیؓ کے ساتھ تھے" (حوالہ مذکور صفحہ ۱۸۰ جلد ۱)

"جب رات ہوئی تو حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کو گدھے پر سوار کیا اور حسنؓ و حسینؓ کے ہاتھ پکڑے اور جنگ بدر میں شریک ہر ایک مہاجر اور انصار کے گھر گئے اور اپنی امامت و خلافت کا حق ان کو جتلایا اور ان سے مدد طلب کی" (حوالہ مذکور صفحہ ۲۲۳ جلد ۱)

"منکرین خلافت علیؓ، پیشاب و پاخانہ کی ضروریات کو رفع کرنے لگے تب وہ عذاب میں مبتلا ہوئے اور ان کا دفعیہ ان کے لئے متعذر ہوا اور ان کے پیٹوں اور آلائے تناسل نے آواز دی کہ ہمارے ہاتھ سے خلاصی پانا تم کو حرام ہے جب تک ولایت علی بن ابی طالب کا اقرار نہ کر لو۔ اس وقت انہوں نے اس ولی خدا کی ولایت کا اقرار کیا" (آثار حیدری صفحہ ۵۵۷)

"حضرت علیؓ اپنے دور خلافت میں بدعتوں کو ختم کرنا چاہتے تو لوگ "واعمراہ واعمراہ" کی صدا بلند کرتے تھے اور حضرت علیؓ ان بدعتوں کے ختم کرنے کا ارادہ ترک کر دیتے تھے"۔ (کشف الاسرار صفحہ ۱۲۶ از خمینی)

"حضرت علیؓ شریح سے فرماتے ہیں "تم ایسی جگہ پر بیٹھے ہو جہاں نبی یا وصی نبی یا شقی کے علاوہ کوئی نہیں بیٹھ سکتا"۔ ظاہر ہے شریح نہ تو نبی ﷺ تھے نہ وصی لہذا شقی تھے۔ شریح وہ شخص ہے جو پچاس ساٹھ سال تک کوفے میں منصب قضاء پر فائز رہے اور ان کا شمار ان میں ہوتا ہے جنہوں نے معاویہ سے تقرب کی خاطر ایسے فتوے جاری کئے ہیں جو حکومت اسلامی کے

خلاف تھے۔ حضرت بھی دوران حکومت میں اس کو معزول نہ کر سکے کیونکہ یہ شیخین کے معین کردہ تھے۔ لہٰذا لوگوں نے ان کو معزول نہیں ہونے دیا۔" (حکومت اسلامی اردو صفحہ ۳ جلد ۲ از خمینی)

حضرت معاویہؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ کی توہین

"مخلوق خدا میں بدترین پانچ آدمی ہیں۔ ابلیس، قابیل، فرعون اور ایک شخص بنی اسرائیل کا اور اس امت کا ایک شخص کہ کفر پر شام میں اس کی بیعت ہوئی۔ یعنی معاویہ"

(حیات القلوب صفحہ ۲۷ جلد ۱ از ملا باقر مجلسی)

"امام زین العابدین سے روایت ہے کہ معاویہ بن ابی سفیان۔ وہ کافر خدا اور قیامت اور آنحضرت ﷺ کی نبوت پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور اس کا کفر اور نفاق تمام لوگوں پر ظاہر تھا۔"

(جلاء العیون صفحہ ۲۳۷)

"معاویہ چالیس سال تک قوم کی سرداری کرتا رہا مگر اس دوران اس نے اپنے لئے دنیا کی لعنت اور عذاب آخرت کے سوا کچھ نہیں کمایا"۔ (جہاد اکبر صفحہ ۲۸ از خمینی)

"حضرت خالد بن ولید نے مالک بن نویرہ کو ناحق قتل کیا تھا اور اس کی بیوہ سے زنا کیا تھا" (قول جمیل صفحہ ۳۳۲)

اکابرین اہلسنت کی توہین

اہل تشیع عام طور پر اہل سنت کے لئے "عامہ" یا "ناصبی" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اہلسنت والجماعت دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ کتے سے زیادہ پلید مخلوق ہیں اور یہود و نصاریٰ سے بھی بدتر ہیں۔

امام محمد باقر سے پوچھا گیا کہ کسی معروف شیعہ عورت کا نکاح کسی ناصبی (سنی) سے کر دوں؟ فرمایا۔ نہیں "لِاَنَّ النَّاصِبَ کَافِرٌ" کیونکہ ناصبی کافر ہیں۔ (الاستبصار صفحہ ۱۸۳ جلد ۳)

"امام محمد باقر کے سامنے ناصبی کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا۔ ان سے نہ نکاح کرو۔ نہ انہیں نکاح دو نہ ان کا ذبح کیا ہوا جانور کھاؤ اور نہ ہی ان کے ساتھ رہائش اختیار کرو" (حوالہ مذکور)

امام جعفر صادق نے فرمایا کہ کسی یہودی اور عیسائی عورت سے شادی کرنا افضل ہے یا فرمایا کہ کسی سنی مرد یا عورت سے شادی کرنے سے یہودی اور نصرانی سے شادی کرنا اچھا ہے"۔

(فروع کافی ۲۵۱)

"حضرت جعفر صادق نے فرمایا۔ حضرت نوح نے کشتی میں کتا اور خنزیر تو سوار کر لیا لیکن حرامی کو اس میں داخل نہ کیا۔ ناصبی (سنی) تو حرام زادے سے بھی زیادہ برا ہے" (جامع لاخبار صفحہ ۱۸۵)

"حضرت جعفر صادق نے فرمایا۔ خبردار اپنے آپ کو حمام کے پانی سے دور رکھنا کہ جس میں یہودی۔ نصرانی اور مجوسی کے غسل کا پانی جمع ہوتا ہو اور ناصب کا غسالہ تو ان سے بھی کہیں زیادہ ناپاک اور گندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات میں سے کتے سے زیادہ نجس کوئی دوسرا پیدا نہیں کیا اور ہم اہلبیت کا ناصب تو کتے سے بھی زیادہ نجس ہے" (الملۃ المستفیہ صفحہ ۲۳ جلد ۵)

شیعہ مجتہد سید نعمت اللہ الجزائری لکھتے ہیں کہ:

"جو لوگ اہلبیت رسول سے عداوت رکھیں ان کو ناصبی کہنا غلط ہے بلکہ ناصبی وہ لوگ ہیں جو شیعان اہلبیت سے عداوت رکھیں۔ حضرت جعفر صادق نے فرمایا۔ ناصبی وہ ہے جو اے شیعہ تمہیں اچھا نہ سمجھتا ہو اور بغض و عداوت رکھتا ہو۔ ناصبی کی علامت یہ ہے کہ وہ حضرت علی پر دوسروں کو فضیلت دیتا ہو" (انوار النعمانیہ صفحہ ۳۰۷ جلد ۲ بحوالہ تحفہ جعفریہ صفحہ ۲۰۵، ۲۰۶ جلد ۲)

"جس جگہ حرامی غسل کرے اس جگہ غسل نہ کرو اور نہ اس جگہ غسل کرو جہاں ناصبی غسل کرتا ہے کیونکہ وہ ولد الزنا سے بھی بدتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سب سے ذلیل کتے کو پیدا کیا ہے اور ناصبی کتے سے زیادہ ذلیل ہے"۔ (حق الیقین صفحہ ۵۱۶ از ملا باقر مجلسی)

امام علی نقی سے سوال کیا گیا کہ: "ہم ناصبی کی تعریف جاننے میں محتاج ہیں ہم اس سے زیادہ نہیں جانتے کہ جو ابو بکر و عمر کو حضرت امیر المومنین پر فضیلت دیتا ہو اور ان کی خلافت و امامت پر اعتقاد رکھتا ہو۔ حضرت امام علی نقی نے فرمایا۔

"ہر کہ ایں اعتقاد داشتہ باشد او ناصبی است" کہ جو بھی یہ اعتقاد رکھتا ہو وہ ناصبی ہے" (حق الیقین صفحہ ۵۱۶)

"جب ہمارے امام ظاہر ہوں گے کفار سے پہلے ابتدا سنیوں سے کریں گے اور ان کے علماء سے اور ان کو ذبح کریں گے" (حوالہ مذکور صفحہ ۵۱۷)

ائمہ اربعہ (ابو حنیفہ، مالک، شافعی، احمد بن حنبل) کے متعلق ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں کہ:

"اور لوگ ان چار کتوں کے فتووں کو حق سمجھتے ہیں اور ان کے فرمان کو دل و جان سے قبول کرتے ہیں۔ خاص کر لوگوں کو امام ابو حنیفہ کے پاس جانے کی ترغیب دیتے ہیں اور وہ ملعون (ابو حنیفہ) اپنے ساتھیوں سمیت اور یہ فقہاء حکمرانوں کے کہنے پر ابو بکر و عمر کی محبت کی طرف

لوگوں کو دلائل کے ساتھ راغب کرتے ہیں اور جو واقعات خلفائے ثلاثہ، تمام منافقین صحابہ، بنو امیہ اور دین کے دشمنوں سے اہل بیت کے ساتھ سرزد ہوئے مارنے، باندھنے، جلانے، قتل کرنے، مجبور کرنے، بہتان لگانے اور ان کے حقوق کو غصب کرنے میں ان کے حق ہونے پر دلائل دیتے ہیں اور پیغمبر کی زبان سے جھوٹ کہلواتے ہیں اور اس کے دین میں بدعت ایجاد کرتے ہیں اور ان سب کو حق جانتے ہیں"۔ (تذکرۃ الائمہ صفحہ ۱۰)

"دین اسلام کو سب سے زیادہ نقصان ابوحنیفہ نے پہنچایا ہے ابوحنیفہ کا فتنہ ابلیس کے فتنہ سے سخت ہے۔ ابوحنیفہ کا فتنہ دجال کے فتنہ سے بڑا ہے ابوحنیفہ نے اسلامی مشین کے پیچ ڈھیلے کیے ہیں"۔ (حقیقت فقہ حنفیہ صفحہ ۲۷-۲۹)

"جو ذلیل ملاں شیعان حیدر کرار کو کافر کہتے ہیں ہم ان اولادِ حلالہ پر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ میرے مولا علی کے شیعہ کافر نہیں ہیں۔ کافر تو وہ ملاں ہیں جو بخاری جیسی رسوائے زمانہ کتاب کو قرآن پاک کے بعد اصح الکتب کا درجہ دیتے ہیں حالانکہ یہ وہ بدترین کتاب ہے"

(تحفہ حنفیہ ص ۳۶۹)

"اگر شیعہ کافر ہیں تو اہلسنت بھی کائنات کے بدترین کافر ہیں۔ علمائے اہل سنت خود کائنات کے بدترین اور غلیظ ترین کافر ہیں"۔ (حوالہ مذکور صفحہ ۳۵۲، صفحہ ۲۶۱)

اولیائے برصغیر

"تمام حرامی لوگ امام اعظم کا شکریہ ادا کریں کیونکہ نعمان نے ان کی لاج رکھ لی۔ لوگوں میں مشہور ہے کہ ایک بوڑھی عورت نے پیر غوث الاعظم کی گیارھویں دینے میں کچھ کوتاہی کی تھی پس پیر نے ناراض ہو کر اس بڑھیا کے بچے کی بارات جو ایک کشتی میں جا رہی تھی کشتی سمیت دریا میں غرق کر دی پھر وہ بوڑھی چالیس سال تک عاجزی کرتی رہی پھر غوث الاعظم نے وہ بارات کشتی سمیت دریا سے نکال دی۔ جب باراتی چالیس سال کے بعد گھر آئے تو ان کی بیویوں نے دوسری شادیاں کر کے کئی درجن بچے بھی جن دیئے تھے

پس ان باراتیوں نے اپنی بیویاں تو واپس لے لیں اور چونکہ وہ سارے حنفی تھے انہوں نے فقہ نعمان کے مطابق ان بچوں کے لینے کا بھی مطالبہ کیا لیکن وہ دوسرے شوہر جن سے ۔۔۔ شافعی اور حنبلی تھے انہوں نے کہا ہم فقہ نعمان کو نہیں مانتے۔ خون پسینہ ایک کر کے ہم نے محنت کی

ہے لہٰذا بچے ہمارے ہیں پس جھگڑا ہو گیا۔ پھر یہ مل کر بغداد کے محلہ اعظمیہ میں امام اعظم کی قبر پر آئے اور اپنا اپنا رونا رویا۔ امام اعظم کی قبر سے آواز آئی کہ تم جا کر غوث الاعظم عبدالقادر جیلانی کی عدالت میں یہ کیس پیش کرو۔ پھر فریقین غوث الاعظم کی سپریم کورٹ میں حاضر ہو گئے۔ غوث الاعظم نے فریقین کے بیان سن کر فیصلہ سنایا کہ یہ بچے نہ تو پہلے شوہروں کے ہیں اور نہ ہی دوسرے شوہروں کے بلکہ یہ سب بچے میرے ہیں اور پھر ان بچوں کو حکم دیا کہ تم عرب شریف میں مت رہو کیونکہ یہاں کے لوگ تو رسول کو بھی جادوگر سمجھتے تھے۔ میں آپ کو ولایت دیتا ہوں تم سب ہندوستان چلے جاؤ وہاں کے لوگ بدھو اور الو کے پٹھے ہیں وہاں تمہاری کافی آؤ بھگت ہوگی اور جب تم مرو گے تو تمہاری گدیاں بنیں گی اور ہند کے بدھو لوگ تمہاری قبروں کی خوب پوجا کریں گے۔"

(حقیقت فقہ حنفیہ صفحہ ۳۲۱،۳۲۰)

"شاہ عبدالعزیز فرزند فاروق دہلوی دجال کے اس عذر کو پڑھ کر قوم معاویہ بغلیں بجاتی ہے۔ شاہ عبدالعزیز کی ہرزہ سرائی۔ اس کہاوت کو دہلوی مکار نے اہل تشیع پر فٹ کیا ہے۔ یہ کہاوت خود دہلوی کذاب پر فٹ آتی ہے۔ دہلوی کذاب جیسا جو کتا بھی بھونکتا ہے۔"

(عجائبات خواجہ صفحہ ۲۳ بحوالہ فدک صفحہ ۴۸)

اہل تشیع کے مذکورہ عقائد و نظریات پڑھنے کے بعد ان کی دینی و مذہبی حیثیت بھی از خود ہی واضح ہو جاتی ہے۔ دراصل مذہب شیعہ، یہودیت، نصرانیت اور مجوسیت کا معجون مرکب ہے جو اسلام سے انتقام لینے کے لیے اس کے متوازی اور بالمقابل وضع کیا گیا۔ نیز شیعی عقائد و نظریات سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین بنیادی اور اصولی اختلاف ہے نہ کہ فقہی اور فروعی۔

ایسے عقائد و نظریات کے حاملین کے متعلق شرعی حکم اکابرین امت کی آراء اور فتاویٰ کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیں:

شیعہ اکابرین اہلسنت کی نظر میں

مذہب شیعہ کی حقیقت سے واقف علمائے کرام نے ہر دور میں "مسئلہ تکفیر" پر احتیاطی پہلو بتانے کے باوجود اہل تشیع کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کیا ہے۔ ان علماء نے بھی عجلت سے کام نہیں لیا اور نہ ہی انہوں نے فقہی اور فروعی اختلاف کی بنیاد پر کبھی کسی کی تکفیر کی۔ چنانچہ امام غزالی فرماتے ہیں کہ "تکفیر میں جلدی کرنا انہی طبیعتوں پر غالب ہوتا ہے جن پر جہل کا غلبہ ہے"

(الفرق بین الاسلام والزندقہ)

علامہ انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں:

"ادخال الکافر فی الملة و اخراج المومن عنها عظیم فی الدین"

(اکفار الملحدین فی ضروریات الدین صفحہ ۲)

کسی کافر کو ملت اسلامیہ میں داخل کرنا اور کسی مومن کو اس سے خارج کرنا اسلام میں عظیم جرم ہے۔ ملا علی قاری نے بھی تقریباً اسی طرح کے الفاظ نقل کیے ہیں:

"ادخال کافر فی الملة الاسلامیة او اخراج مسلم عنها عظیم فی الدین"

(شرح شفا فصل تحقیق القول فی اکفار المتاولین)

کسی کافر کو اسلام میں داخل سمجھنا یا کسی مسلمان کو اسلام سے خارج سمجھنا دونوں وبال عظیم ہیں۔

فخر المحدثین حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری "المہند علی المفند" میں "بارہویں سوال" کے جواب میں فرماتے ہیں کہ

"باقی رہا سلف اہل اسلام کو کافر کہنا۔ سو حاشا۔ ہم ان میں سے کسی کو کافر کہتے یا سمجھتے ہوں بلکہ یہ فعل ہمارے نزدیک رفض اور دین میں اختراع ہے۔ ہم تو ان بدعتیوں کو بھی جو اہل قبلہ ہیں جب تک دین کے کسی ضروری حکم کا انکار نہ کریں کافر نہیں کہتے۔ ہاں جس وقت دین کے کسی ضروری امر کا انکار ثابت ہو جائے گا تو کافر سمجھیں گے اور احتیاط کریں گے۔ یہی طریقہ ہمارا اور ہمارے جملہ مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ کا ہے"

(عقائد علمائے دیوبند صفحہ ۳۹)

یہ ملحوظ رہے کہ "المہند علی المفند" پر اس وقت کے تمام مشاہیر دیوبند مثلاً شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، مولانا حافظ محمد

احمد ابن حجہ الاسلام حضرت نانوتویؒ، مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحبؒ، مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ صاحبؒ کے علاوہ حجاز، مصر اور شام وغیرہ اسلامی ممالک کے مقتدر علماء و مشائخ نے بھی اپنی تصدیقات تحریر فرمائیں۔ گویا "المہند علی المفند" اکابر دیوبند کی ایک ایسی متفقہ تاریخی دستاویز ہے جس میں دیوبندی مسلک اصولی طور پر محفوظ کر دیا گیا اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اہل تشیع "ضروریات دین" کے منکر ہیں جبکہ علمائے دیوبند کے نزدیک دین کے کسی ایک ضروری حکم کا منکر بھی بالاتفاق کافر ہے

فخر المحدثین مولانا خلیل احمد سہارنپوری (جن کی تالیف لطیف "المہند علی المفند" پر تمام مشاہیر دیوبند نے اپنے تصدیقی دستخط ثبت فرمائے) نے اپنے مرشد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے ایماء پر رد شیعیت میں "ہدایات الرشید الی افحام العنید" کے نام سے ایک مدلل، مفصل اور ضخیم کتاب تحریر فرمائی۔ مولانا اسیر ادروی صاحب حضرت سہارنپوری کی رد شیعیت میں جدوجہد کا ذکر بعنوان "ردّ روافض کی لگن" بالفاظ ذیل کرتے ہیں:

"حضرت گنگوہی کے بعد مولانا خلیل احمد صاحب کا نام لینا ازبس ضروری ہے۔ آپ کو نوجوانی ہی سے جب آپ بہاولپور میں مدرس تھے شیعوں سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ اس لئے ردّ شیعیت کا آپ کے دل میں شدید جذبہ موجزن تھا اور ردّ شیعیت میں صرف کتابیں لکھ کر آپ نے کام ختم نہیں کر دیا بلکہ شیعہ مناظرین کو فساد عقیدہ پھیلانے کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے ان کا منہ بند کرنے کی جدوجہد فرماتے۔ آپ نے امروہہ ضلع مراد آباد میں شیعوں مجتہد اعظم کو میدان مناظرہ میں پکڑا تو آپ نے اس وقت تک اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی جب تک کہ اپنی موجودگی میں امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی کو متکلم بنا کر کھڑا نہیں کر دیا اور پے در پے سوالات اور شیعی مذہب کے پوست کندہ عقائد کا پوسٹ مارٹم کر کے شیعوں کو اتنا رسوا نہیں کر دیا کہ وہ امروہہ چھوڑ کر راتوں رات چلے جائیں۔ جب وہ فرار ہو گئے تب آپ امروہہ سے ہٹے۔ حالانکہ اسی دوران حضرت شیخ الہندؒ کا دہلی میں انتقال ہو جاتا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اسی روز امروہہ سے جنازہ اور تجہیز و تکفین میں شرکت کے لیے دیوبند جاتے ہیں اور مولانا خلیل احمد صاحب جن کے حضرت شیخ الہند سے گوناگوں تعلقات تھے اس کے باوجود محض اس لیے امروہہ سے نہیں ہٹے کہ شیعہ مناظرین کو غلط پروپیگنڈہ کا موقع مل جائے گا

اس جوش و جذبہ سے آپ نے شیعیت کا مقابلہ کیا" (دارالعلوم دیوبند۔ احیاء اسلام کی عظیم تحریک صفحہ ۳۳۶)

اس ایک واقعہ سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علماء دیوبند شیعیت کو اسلام کے خلاف کس قدر خطرناک فتنہ سمجھتے تھے۔ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ جب شروع میں مولانا خلیل احمد صاحب نے ایک شیعہ مجتہد سید فرزند حسین کی کتاب کا جواب دینا اسے "فعل عبث" سمجھتے ہوئے مناسب نہ سمجھا اور اپنا قلم روک دیا تو مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے انہیں خط لکھا:

"جس کام کی ابتدا نیک نیتی کے ساتھ بغرض حمایت اسلام کی گئی اس کا انجام بخیر ہے۔ اس تحریر کو پورا کر دینا ہی مناسب ہے" (حوالہ مذکور صفحہ ۳۳۷)

اس لیے علمائے اسلام نے ہمیشہ اسلامی حدود کی حفاظت سب سے بڑھ کر کی اور کفر کو اسلامی حدود میں داخل ہونے سے روکے رکھا۔

مسئلہ تکفیر کی غرض و غایت یہ ہے کہ اسلام اور کفر کی حدود ملتبس نہ ہونے پائیں اور اللہ تعالیٰ کے مطیع اور باغی، مسلم اور کافر، دوست اور دشمن، طیب اور خبیث ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز ہو جائیں۔ لہٰذا جو شخص بلا دلیل کسی مسلمان کو کافر اور ضروریات دین کے منکر کو مسلمان بتاتا ہے وہ اسلام کو کفر کی حدود میں اور کفر کو اسلام کی حدود میں داخل کرنا چاہتا ہے۔ جبکہ تمام انبیاء کرام کی بعثت اور جملہ کتب سماویہ کے نزول کا اعلیٰ اور اہم مقصد ایمان و کفر کی حد بندی اور امتیاز ہے تاکہ نہ تو کسی مسلم کو کافر اور نہ ہی کسی کافر کو مسلم قرار دیا جا سکے۔ کیونکہ کسی مسلم کو کافر قرار دینے سے "ایمان" کو کفر کہنا اور کسی کافر کو مسلم کہنے سے "کفر" کو اسلام تسلیم کرنا لازم آتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ایمان کو کفر یا کفر کو ایمان قرار دینا خود کفر اور بعثت انبیا و نزول کتب سماویہ کے مقصد کو فنا کرنا ہے۔

مزید برآں: کسی کافر کو مسلم تسلیم کر لینا پوری ملت اسلامیہ پر ظلم عظیم ہے کیونکہ اس سے پوری ملت کا معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔ اس میں ذرا سی بے احتیاطی ایک حقیقی مسلمان کو اسلام سے خارج بھی کر سکتی ہے اور ایک دشمن اسلام کو اسلامی برادری (ملی یکجہتی کونسل) کا مارِ آستین بھی بنا سکتی ہے۔

کفر کے احکام

۱۔ کفر کی سزا جہنم کا دائمی عذاب ہے۔

۲۔ ایمان کی پہلی شرط یہ ہے کہ کفر اور کافروں سے بیزاری اور نفرت کا اظہار اور انہیں

اللہ کا دشمن اور باغی سمجھا جائے۔

۳۔ کافروں سے مناکحت حرام ہے۔

۴۔ کافر مسلمان کا اور مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا۔

۵۔ مسلمان کے جنازہ میں کافر کو شرکت کی اجازت نہیں وہ وقت رحمت کا ہے اور کافر سے لعنت آتی ہے۔

۶۔ کافروں کے لئے دعائے مغفرت جائز نہیں اگرچہ قریبی رشتہ دار ہوں۔

۷۔ کافر کا ذبیحہ اور شکار مسلمان کے لئے حلال نہیں۔

۸۔ کافر کو مسلمان کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہیں۔

۹۔ کافر کی نماز جنازہ میں شریک ہونا یا اس کی قبر پر جانا بھی جائز نہیں۔

۱۰۔ جو کافر دارالسلام میں مسلمانوں کی رعایا ہوں ان کو فوج میں بھرتی کر کے جہاد میں ساتھ لے جانا جائز نہیں۔ معلوم نہیں کہ وہ سازش کر کے دارالحرب کے کافروں سے جا ملیں۔

یہ وہ اثرات اور دور رس نتائج ہیں جو ایک مسلمان کو کافر اور ایک کافر کو مسلمان سمجھنے سے لازم آتے ہیں۔ (بحوالہ ایمان اور کفر از مفتی محمد شفیع صاحب، مسلمان کون ہے اور کافر کون؟ از مولانا محمد ادریس کاندھلوی)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مسلمان کی تکفیر سے منع فرمایا ہے

۱۔ ''جس شخص نے اپنے بھائی کو کافر کہا تو ان دونوں میں سے ایک اس کلمے کا مستحق ہو گیا''۔ (مشکوۃ۔ باب حفظ اللسان والغیبۃ والشتم صفحہ ۴۱۱)

۲۔ ''جو شخص بھی اپنے کسی بھائی کو فسق یا کفر کا الزام دیتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ ہو تو خود اسی پر لوٹ آتا ہے'' (حوالہ مذکور)

۳۔ ''جس شخص نے کسی آدمی کو کافر کہہ کر پکارا یا یوں کہا اے اللہ کے دشمن اور وہ ایسا نہ ہو تو یہ کلمہ اس پر لوٹ جاتا ہے جس نے ایسا کہا'' (متفق علیہ۔ حوالہ مذکور)

۴۔ ''جو شخص اپنے بھائی کو کافر کہہ کر پکارے تو دونوں میں سے ایک پر کفر لوٹ آئے گا۔ اگر وہ شخص جس کو اس نے کافر کہا کافر ہے تو خیر ورنہ پکارنے والے پر لوٹ آئے گا''۔

(صحیح مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب بیان حال ایمان من قال لاخیہ المسلم کافر)

۵۔ ''نہیں تکفیر کرتا کوئی شخص کسی شخص کی مگر ان دونوں میں سے ایک کفر کا مستحق ہو جاتا

ہے۔ کیونکہ اگر وہ شخص فی الواقع کافر تھا تو کافر ہو ہی۔ ورنہ یہ تکفیر کرنے والا اس کی تکفیر کے سبب کافر ہو گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ ان دونوں میں سے ایک پر کفر واجب ہو گیا۔ (ہذہ نیب جامع)

ان احادیث سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہو گئی ہے کہ جس شخص کو کافر کہا گیا ہے وہ اگر فی الواقع کافر نہیں ہے تو کہنے والا یقیناً کافر ہو جائے گا۔ کیونکہ کسی کو کافر کہنے سے یہ مراد ہے کہ اس کے عقائد و نظریات کفریہ ہیں اور اگر فی الواقع اس کے عقائد میں کوئی چیز کفر کی نہیں بلکہ سب عقائد ایمان کے ہیں تو گویا ایمان کو کفر کہنا لازم آئے گا اور ایمان کو کفر کہنا بلاشبہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ہے۔ ارشاد باری ہے کہ "ومن یکفر بالایمان فقد حبط عملہ" (المائدہ نمبر ۵) جو شخص ایمان سے انکار کرے تو اس کے عمل ضائع ہو گئے۔

اہل تشیع کے اصول کے مطابق قرآن مجید کا ترجمہ حضرت محمد و آل محمد کی تفسیر اور ان کے ارشادات کے تابع ہوتا ہے اور جو ترجمہ ارشادات و توضیحات حضرات معصومین کی روشنی میں نہ کیا گیا ہو وہ تفسیر بالرائے کے مترادف سمجھا جاتا ہے اور جس نے اپنی رائے سے کسی ایک آیت کی بھی تفسیر کی وہ کافر ہے۔ (بحوالہ ترجمہ فرمان علی میں "التماس" از مجتہد حسن کراروی)

اس اصول کے تحت تمام مفسرین کرام اور ان کے متبعین کافر قرار پا گئے۔ علاوہ ازیں اہل تشیع عقیدہ امامت پر عدم ایمان کی وجہ سے بھی تمام اولین و آخرین مسلمانوں کی تکفیر کرتے ہیں لہٰذا مذکورہ بالا احادیث کی رو سے وہ "تکفیر مسلم" کی بناء پر بھی از خود ہی کافر قرار پاتے ہیں۔

مزید برآں: اگر اہل تشیع فی الواقع مومن و مسلم ہیں تو ان کے خلاف کفر کا فتویٰ دینے والے اکابرین اسلام یقیناً کافر قرار پائیں گے۔ کیا مفاد پرست، مصلحت و مداہنت کے شکار اور ایرانی نمک خور "علمائے اسلام" اس موخر الذکر فیصلے کو قبول کرنے پر آمادہ ہیں؟ بینوا و توجروا

ے فقیہ مصلحت بیں سے وہ رند بادہ خوار اچھا نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں

ے فان کنت لاتدری فتلک مصیبۃ و ان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

گذشتہ چودہ صدیوں میں اکابرین امت نے مختلف وجوہ کی بناء پر اہل تشیع کی تکفیر و تضلیل کے فتوے صادر فرمائے ہیں جس میں بطور خاص عقیدہ امامت منصوصہ و معصومہ افضل من النبوۃ، عقیدہ تحریف قرآن اور انکار خلافت شیخین و توہین و تکفیر صحابہ شامل ہیں۔ ان وجوہات کفر کو پیش نظر رکھتے ہوئے سب سے پہلے خالق کائنات اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ملاحظہ فرمائیں:

"وَمَن يَكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۝ (النساء نمبر ۱۳۶)

جو شخص اللہ تعالیٰ سے اور اس کے فرشتوں سے اور اس کی کتابوں سے اور اس کے رسولوں سے کفر کرے تو وہ بہت بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا۔

"وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرۃ نمبر ۱۳) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اور لوگوں (یعنی صحابہؓ) کی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو جواب دیتے ہیں کہ کیا ہم ایسا ایمان لائیں جیسا بے وقوف لائے ہیں۔ خبردار ہو جاؤ یقیناً یہی بے وقوف ہیں لیکن جانتے نہیں۔

منافقین نے جو لفظ صحابہ کرامؓ کے لئے استعمال کیا اللہ نے جواباً وہی لفظ ان کے لئے استعمال فرمایا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اہل تشیع جس لفظ کے ساتھ صحابہؓ کو یاد کریں گے (ظالم، غاصب، منافق، کافر، مرتد) تو سنت اللہ کے مطابق ان ہی الفاظ کے ساتھ انہیں بھی یاد کیا جائے گا۔

"سفہ" کا استعمال امور دنیوی اور اخروی دونوں کے متعلق ہوتا ہے یہاں اخروی اور دینی سفاہت مراد ہے۔ آج کے منافقین یہ باور کراتے ہیں کہ نعوذ باللہ صحابہ کرامؓ دولت ایمان ہی سے محروم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جدید و قدیم دونوں منافقین کی تردید فرمائی۔

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا "لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ" (الفتح نمبر ۲۹) تا کہ ان کی وجہ سے کافروں کو غیظ و غضب میں مبتلا کرے۔ یعنی صحابہ کرامؓ کا بڑھتا ہوا اثر و نفوذ اور ان کی روز افزوں قوت و طاقت کافروں کے لئے غیظ و غضب کا باعث تھی اس لئے کہ اس سے اسلام کا دائرہ پھیل اور کفر کا دائرہ سمٹ رہا تھا۔ اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے بعض ائمہ نے صحابہ کرامؓ سے بغض و عناد رکھنے والوں کو کافر قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ اس فرقہ کے دیگر عقائد بھی ان کے کفر پر ہی دال ہیں۔

شیعہ مفسر شیخ الطائفہ طوسی "لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ" کے تحت لکھتے ہیں کہ کفار اور مشرکین نبی ﷺ اور ان کے صحابہؓ کو دیکھ کر غصہ سے پیچ و تاب کھاتے ہیں (التبیان تحت الآیۃ)"

"وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ

وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ" (الحشر نمبر ۱۰)

اور (ان کے لئے) جو ان کے بعد آئیں جو کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ایمان داروں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ نہ ڈال اے ہمارے رب تو شفقت و مہربانی کرنے والا ہے۔

اس آیت سے پہلے صحابہؓ کے دو طبقوں مہاجرین اور انصار کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کی مدح و ثنا کر کے انہیں "صادقین" کا خطاب مرحمت فرمایا اور انصار کی مدح کر کے انہیں "مفلحین" کے لقب سے نوازا۔ اس کے بعد قیامت تک آنے والے مؤمنین (جو صحابہ کرامؓ کے عقیدت مند مداح و گرویدہ اور ان کے حق میں صاف دل اور دعا گو ہوں) کو "مستغفرین" کی صفت سے یاد فرمایا۔ یہ مؤخر الذکر طبقہ صحابہؓ کے حق میں یہ دعا کرتا ہے کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کینہ نہ ہونے دیجئے۔ اے ہمارے رب آپ بڑے رحیم اور شفیق ہیں۔

اس آیت کریمہ سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ بعد میں آنے والوں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان صحابہؓ (سابقین) کے لئے دعائے مغفرت کے ساتھ اپنے دلوں کو ان کے بارے میں غل و غش سے پاک رکھیں۔ سوءِ ظن اور بے اعتمادی سے دور رہیں اور ان کے حق میں استغفار کے ساتھ دعا گو رہیں کہ اسی سے بعد والوں کی نجات اور مقبولیت ممکن ہے۔

گویا کہ امت مسلمہ کے دو حصے ہیں ایک صحابہؓ اور دوسرے قیامت تک آنے والے مؤمنین۔ بعد کے وہ لوگ جو صحابہ کرامؓ کے حق میں دعا گو نہ ہوں بلکہ بدگو، ان پر سب و شتم کرنے والے، انہیں کافر کہنے والے، ان کے خلاف اپنے دلوں میں بغض و عناد، کھوٹ اور غل و غش لئے ہوئے ہوں تو اس طبقہ کے خسیس اور ذلیل القلب ہونے کی وجہ سے قرآن حکیم نے اسے مہاجرین، انصار اور مستغفرین کے ساتھ ملا کر اپنی عبارت میں جگہ نہیں دی۔ مگر یہ بدگو اور تبرا باز طبقہ مفہوم آیت سے دلالۃً ضرور سمجھ میں آ جاتا ہے۔ کیونکہ صحابہؓ کے بعد کے طبقات میں اگر کوئی اس "دعا گو" طبقہ میں نہ ہو گا تو لامحالہ اس کی ضد یعنی "بدگو" حضرات کے طبقہ میں ہو گا جو ملت اسلامیہ سے خارج متصور ہو گا۔

رسول اکرم ﷺ کا فیصلہ

"جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہ کو برا کہتے ہیں تو تم کہو اللہ کی لعنت ہو تمہارے شر پر" (مشکوۃ صفحہ ۵۵۴)

"بے شک اللہ نے مجھے پسند کیا اور پسند کئے میرے لئے صحابہ اور عنقریب ایک قوم ایسی آئے گی کہ برا کہے گی صحابہ کو اور ناقص خیال کریں گے ان کو۔ پس تم ان کی ہم نشینی اختیار نہ کرنا اور نہ ان کے ساتھ کھانا پینا اور نہ ان کے ساتھ نکاح کرنا"۔ (مظاہر حق صفحہ ۷۵۰ جلد ۴)

"میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرو اور ان کو میرے بعد نشانہ نہ بناؤ۔ جس نے ان کے ساتھ محبت کی اس نے گویا میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کی۔ اور جس نے ان سے بغض کیا اس نے گویا میرے ساتھ بغض کی وجہ سے ان سے بغض کیا اور جس نے ان کو ایذا دی اس نے گویا مجھے ایذا دی اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ تعالیٰ کو ایذا دی اور جس نے اللہ تعالیٰ کو ایذا دی پس قریب ہے کہ وہ ان کا مواخذہ کرے" (مشکوۃ صفحہ ۵۵۴)

رسول اللہ ﷺ ایک شخص پر نماز جنازہ پڑھنے کے لئے آئے مگر آپ ﷺ نے اس پر نماز نہ پڑھی۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ ہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ ﷺ نے کسی کی نماز جنازہ چھوڑ دی ہو۔ تو فرمایا۔ یہ عثمان سے بغض رکھتا تھا لہٰذا اللہ تعالیٰ بھی اس سے بغض رکھتے ہیں"۔ (جامع ترمذی)

حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دور میں شیعوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھا جاتا تھا

مشہور شیعہ عالم ڈاکٹر تیجانی سماوی اقرار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"فرقوں کی تقسیم رسول خدا کی وفات کے فوراً ہی بعد ہوگئی تھی جبکہ ابو بکر تخت خلافت پر بیٹھ چکے تھے اور صحابہ کی اکثریت نے ان کی بیعت کر لی تھی جبکہ علی بن ابی طالب، بنی ہاشم اور صحابہ میں سے وہ چند افراد جن میں اکثر غلام تھے اس خلافت کے مخالف تھے۔ واضح رہے کہ برسر اقتدار حکومت نے ان لوگوں کو مدینہ سے دور رہنے پر مجبور کر دیا اور بعض کو جلاوطن کر دیا اور انہیں دائرہ اسلام سے خارج سمجھنے لگے اور ان سے مقابلہ کے لئے وہی سلوک روا رکھا جو کافروں کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا اور ان پر وہی اقتصادی، اجتماعی اور سیاسی پابندیاں عائد کیں جو

کافروں پر عائد کی جاتی تھیں۔" (شیعہ نی الحدید ص ۲۹)

حضرت علیؑ کا فیصلہ

"اگر میں اپنے شیعوں کو جانچوں تو یہ زبانی دعوی کرنے والے اور باتیں بنانے والے نکلیں گے اور اگر ان کا امتحان لوں تو یہ سب مرتد نکلیں گے" ۔ (احسن الفتاوی صفحہ ۲۸۴ جلد ۱)

اُم المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ کا فیصلہ:

"تم لوگوں کو اصحاب محمد کے لئے استغفار کا حکم دیا گیا مگر تم نے ان پر لعن طعن کی۔ میں نے تمہارے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ یہ امت اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک کہ اس کے آخرین اولین پر لعنت نہ کریں۔" (الدر منثور تحت آیت نمبر ۱۰، سورۂ حشر)

صحابہ کرامؓ کا فتوی

شیعہ سکالر ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی لکھتے ہیں کہ:

"قرن اول کی حکومت اسلامی لوگوں کے دلوں میں صحابہ کی محبت و احترام کا بیج بونے میں اسی طرح کامیاب ہوگئی جس طرح امت مسلمہ کے دلوں میں حضرت علیؑ اور ان کی اولاد سے نفرت پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئی اور حضرت علیؑ پر منبروں سے لعنت کی گئی حضرت علیؑ کے شیعوں کو قتل و غارت کیا گیا، شہر بدر کیا گیا اور چونکہ معاویہ کے زمانہ میں جھوٹ، خرافات وغیرہ جیسے ذرائع ابلاغ بہت وسیع تھے اس لئے لوگ ہر شیعہ سے نفرت کرنے لگے اور شیعوں کی طرف دل کھول کر جھوٹے و فاسد عقائد منسوب کئے گئے کیونکہ یہی لوگ حکومت کے مخالف تھے۔ جیسے آج کل ہمارے یہاں ان کو اچھی پوسٹوں سے معزول کر دیا جاتا ہے اور موقع ملنے پر قتل کر دیا جاتا ہے۔" (تاکہ سچوں کے ساتھ ہو جاؤں صفحہ ۱۰۹)

اس کتاب کے مترجم حجۃ الاسلام مولانا روشن علی خان صاحب قبلہ نجفی مذکورہ عبارت کے تحت لکھتے ہیں کہ:

"یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کے مؤرخین اور رائیٹر حضرات نے شیعوں کا نام "روافض" رکھ دیا تھا، ان کو کافر کہا جاتا اور سمجھا جاتا تھا جیسے آج کل پاکستان میں "سپاہ صحابہ" نے شیعوں کے کفر کا فتوی دیا ہے۔ ہر جگہ "کافر کافر شیعہ کافر" دیواروں پر، ریلوے سٹیشنوں پر، بس اڈوں پر ہر ہر جگہ آپ کو لکھا ہوا نظر آئے گا۔ پاکستان جا کر دیکھ لیجئے" (حوالہ مذکور)

"دور صحابہ میں صحابہؓ کے بعد کے لوگوں میں سے جو بھی صحابہؓ کے حق میں ذرا سا گستاخ ہوتا یا دل میں ذرا سا بھی میل لیے ہوئے ہوتا تو صحابہؓ اسے "مستغفرین" میں داخل نہیں مانتے تھے جو صحابہؓ کے بعد قرآن کا ذکر فرمودہ طبقہ ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں ایک واقعہ یوں ہے کہ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو معلوم ہوا کہ ایک شخص حضرت عثمانؓ کی شان میں گستاخی کرتا ہے تو اسے بلایا اور اپنے سامنے بٹھلایا اور اس کے سامنے مہاجرین والی آیت "للفقراء المهاجرين" پڑھی اور فرمایا کہ کیا تو ان میں سے ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ پھر آپ نے انصار والی آیت "و الذین تبوّؤ الدار" پڑھی اور فرمایا کہ کیا تو ان میں سے ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ تو پھر آپ نے صحابہ کے بعد کے طبقہ مستغفرین والی آیت "و الذین جاءو من بعدهم" پڑھی اور فرمایا کہ کیا تو ان میں سے ہے؟ اس نے کہا۔ ہاں۔ امید ہے کہ میں ان میں سے ہوں۔ فرمایا نہیں۔ واللہ وہ شخص ان میں سے کبھی نہیں ہو سکتا جو صحابہؓ کے بارے میں گستاخی کرے اور دل میں ان کی طرف سے کھوٹ رکھتا ہو۔" (قومی ڈائجسٹ صفحہ ۷۷ صحابہ نمبر)

امام شعبی کبھی (م ۱۰۴ھ) کا فتویٰ

"میں تمہیں خواہشات کے غلام اور گمراہ رافضیوں سے اور ان کے شر سے بچنے کی نصیحت کرتا ہوں کیونکہ یہ مسلمانوں سے بغض و نفرت رکھتے ہیں" (منہاج السنہ صفحہ جلد ۱ ابن تیمیہ)

امام اعظم ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ) کا فتویٰ

"ائمہ حنفیہ نے منکرین خلافت شیخینؓ (ابو بکرؓ و عمرؓ) کو کافر کہا ہے ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ مسئلہ امام ابو حنیفہ سے لیا ہے کیونکہ وہ روافض کے حالات سے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ واقف ہیں۔ آپ کوفہ کے رہنے والے ہیں اور کوفہ رفض و شیعیت کا منبع ہے۔ جب امام ابو حنیفہ نے منکر خلافت صدیقؓ کو کافر کہا ہے تو ان پر لعنت کرنے والا ان کے نزدیک بدرجہ اولیٰ کافر ہوگا"

(الصواعق المحرقہ صفحہ ۲۵۹)

امام مالک (م ۱۷۹ھ) کا فتویٰ

موصوف نے سورۃ الفتح کی آخری آیت کے الفاظ "لیغیظ بهم الکفار" کو روافض کے کفر کی قرآنی دلیل قرار دیا اور یہ اصول بیان فرمایا کہ جو صحابہؓ سے جلے وہ کافر ہے اور اس سلسلہ میں علماء کی کثیر تعداد نے امام صاحب کی تائید کی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر و روح المعانی تحت الآیۃ)

• علامہ احمد بن حجر مکی (م ۹۷۴ھ) لکھتے ہیں کہ!

"و من ہذہ الآیۃ اخذ الامام مالک فی روایۃ عنہ بکفر الروافض الذین یبغضون الصحابۃ ومن غاظہ الصحابۃ فہو کافر۔ وہو ماخذ حسن یشہد لہ ظاہر الآیۃ"

(الصواعق المحرقۃ صفحہ ۳۱۰)

اس آیت (لیغیظ بہم الکفار) سے امام مالک نے شیعہ روافض کے کفر کا فتویٰ دیا ہے جیسا کہ ان سے روایت کیا گیا ہے کہ جو شخص صحابہ کرامؓ سے بغض رکھے وہ کافر ہے۔ امام مالک کا شیعہ رافضیوں کو اس آیت کے تحت کافر کہنا نہایت عمدہ ماخذ ہے جس پر ظاہر آیت دلالت کر رہی ہے۔

امام مالک اور دوسرے فقہاء نے بھی فرمایا ہے کہ جو شخص صحابہ کرامؓ سے بغض رکھے اور ان پر "سَبّ" کرے اس کا مال فئے میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ (شفا قاضی عیاض صفحہ ۲۶۳ جلد ۲)

امام شافعی (م ۲۰۴ھ) کا فتویٰ

"ثم وافقہ الشافعی فی قولہ بکفرہم و وافقہ ایضا جماعۃ من الائمۃ"

(الصواعق المحرقۃ صفحہ ۳۱۰)

اور امام مالک کے سلسلہ ماخذ میں امام شافعی نے بھی اتفاق کرتے ہوئے شیعوں کو کافر کہا ہے اور حضرات ائمہ کی ایک جماعت نے بھی اسی ماخذ سے اتفاق کرتے ہوئے شیعہ روافض کو کافر کہا ہے۔

امام شافعی کا ارشاد ہے کہ "ما رأیت قوما اشہد بالزور من الرافضۃ" (منہاج السنۃ صفحہ ۱۲ جلد ۲)
روافض سے زیادہ جھوٹی قوم میں نے کوئی نہیں دیکھی۔

امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) کا فتویٰ

جو شخص ابوبکرؓ، عمرؓ اور عائشہؓ پر سب و شتم کرے میں اسے اسلام پر نہیں دیکھتا۔ (الصارم المسلول صفحہ ۵۷۱)

استاذ محترم علامہ شمس الحق افغانی نے دوران درس فرمایا کہ ایک شخص نے قسم کھائی کہ "آج اگر میں دنیا کے سب سے زیادہ جھوٹے شخص سے بات نہ کروں میری بیوی مجھ پر حرام ہوگی اور اس کو تین طلاق ہو جائیں گی"

شام کے وقت اس نے امام احمد بن حنبل سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ "کسی عیسائی

یا رافضی" سے بات کرلو کہ دونوں "مکذبین الصادقین" ہیں۔ عیسائی حضرت عیسیٰ کو سچا پیغمبر مانتے ہیں لیکن جب وہ کہتے ہیں کہ میں اللہ کا بندہ ہوں تو وہ انہیں سچا ماننے کے باوجود جھوٹا کہتے ہیں۔ اسی طرح حضرت علیؓ برسر منبر عمر بھر شیخینؓ کی فضیلت بیان کرتے رہے۔ رافضی انہیں سچا امام ماننے کے باوجود جھوٹا بتاتے ہیں اور شیخینؓ کی فضیلت پر یقین کرنے کی بجائے انہیں غاصب اور کافر کہتے ہیں اس لئے ان دو (عیسائی و رافضی) سے بڑھ کر دنیا میں کوئی جھوٹا نہیں ہوسکتا۔

(ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان صفحہ ۳۳۔ اگست ۱۹۸۹ء)

علامہ عبداللہ بن ادریس الاودی (م ۱۹۲ھ) کا فتویٰ

شفع مسلمان کا حق ہے رافضی کا نہیں کیونکہ رافضی مسلمان نہیں ہے وہ کفار کے مثل ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ صحابہ کرامؓ سے بغض کفار رکھتے ہیں اور یہی معنی ہے امام احمد کے اس قول کا کہ میں نہیں دیکھتا اس شخص کو اسلام پر جو حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ و عائشہؓ کو سب کرتا ہے۔

(الصارم المسلول صفحہ ۵۷۰)

امام محمد بن یوسف فریابی (م ۲۱۲ھ) کا فتویٰ

امام موصوف سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو ابوبکرؓ کو سب کرتا ہے۔ فرمایا وہ کافر ہے۔ پھر سوال کیا گیا کہ ایسے شخص کا جنازہ پڑھا جائے یا نہیں؟ فرمایا ہرگز نہیں۔ پھر پوچھا گیا کہ وہ شخص آخر کلمہ تو پڑھتا ہے اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے؟ فرمایا۔ ایسے شخص کے کلمے کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس کے بدن کو ہاتھ مت لگاؤ بلکہ اس کی میت کو لکڑی سے گڑھے میں ڈال کر چھپا دو۔

(حوالہ مذکور بحوالہ الصدیق الاکبر صفحہ ۱۰ از محمد الفاروقی المصانی)

محدث ابوزرعہ (م ۲۶۴ھ) کا فتویٰ

جب تو کسی آدمی کو دیکھے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے کسی کو ناقص قرار دے رہا ہے پس تو سمجھ جا کہ وہ یقیناً زندیق ہے۔

(الاصابہ صفحہ ۱۰ جلد ۱)

امام ابن حزم اندلسی (م ۴۵۶ھ) کا فتویٰ

پورا فرقہ امامیہ، ان کے متقدمین اور متاخرین سب اس کے قائل ہیں کہ قرآن بدل ڈالا گیا ہے اس میں وہ کچھ بڑھا دیا اور شامل کر دیا گیا ہے جو اس میں نہیں تھا اور بہت کچھ کم بھی کر دیا گیا ہے اور بہت تبدیلی اور تحریف کی گئی ہے۔ موصوف اسلام اور قرآن پر عیسائیوں کے اس

اعتراض کہ "رافضیوں کا دعویٰ ہے کہ تمہارے نبی ﷺ کے صحابہ نے قرآن میں تحریف کر دی" کے جواب میں لکھتے ہیں کہ "فان الروافض لیسوا من المسلمین" روافض مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔ (الفصل فی الملل والنحل صفحہ ۸۰ جلد ۲، صفحہ ۷ جلد ۴)

قاضی عیاض مالکی (م ۵۴۴ھ) کا فتویٰ

جو شخص ایسی بات کہے جس کے نتیجہ میں امت گمراہ قرار پائے اور تمام صحابہ کرامؓ کی تکفیر ہوتی ہو تو ہم ایسے شخص کو قطعیت کے ساتھ کافر قرار دیں گے۔ اسی طرح ہم ایسے شخص کو بھی قطعیت کے ساتھ کافر قرار دیتے ہیں جو قرآن کا انکار کرے یا اس کے ایک ہی حرف کا انکار کرے یا اس کے کسی کلمہ کو بدلے یا اس میں اضافہ کرے۔ اور اسی طرح ہم ان غالی شیعوں کی اس عقیدہ کی وجہ سے بھی تکفیر کرتے ہیں کہ ان کے اماموں کا درجہ نبیوں سے بالاتر ہے۔

(کتاب الشفاء جلد ۲ صفحہ ۲۸۱، ۲۸۶، ۲۹۰ بحوالہ اقرا ڈائجسٹ شیعہ نمبر)

شیخ عبدالقادر جیلانی (۵۶۱ھ) کا فتویٰ

شیعوں کے تمام گروہ اس پر متفق ہیں کہ امام کا تعین اللہ تعالیٰ کے واضح حکم سے ہوتا ہے وہ معصوم ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ تمام صحابہؓ سے افضل ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ کو امام و خلیفہ نہ ماننے کی وجہ سے چند لوگوں کے سوا تمام صحابہ مرتد ہو گئے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ امام کو دنیا و دین کی تمام چیزوں کا علم ہوتا ہے۔ یہودیوں نے تورات میں تحریف کی۔ اسی طرح روافض بھی اپنے اس دعویٰ کی وجہ سے کہ قرآن میں تبدیلی کی گئی ہے قرآن مجید میں تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں۔ (ایسے عقائد رکھنے والے بلاشبہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں)

(غنیۃ الطالبین صفحہ ۱۵۶-۱۵۷ بحوالہ اقرا ڈائجسٹ شیعہ نمبر)

امام فخر الدین رازی (۶۰۶ھ) کا فتویٰ

رافضیوں کی طرف سے قرآن مجید میں تحریف کا دعویٰ اسلام کو باطل کر دیتا ہے۔

(تفسیر کبیر بحوالہ بینات صفحہ ۱۸۸ شیعہ نمبر)

علامہ کمال الدین ابن ہمام (۶۸۱ھ) کا فتویٰ

اگر رافضی صدیقؓ و عمرؓ کی خلافت کا منکر ہے تو وہ کافر ہے۔

(فتح القدیر جلد اول باب الامامت بحوالہ بینات شیعہ نمبر)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) کا فتویٰ

عصر حاضر کے ان مرتدین سے اللہ کی پناہ۔ یہ لوگ کھلم کھلا اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کی کتاب اور اس کے دین کے دشمن ہیں۔ اسلام سے خارج ہیں۔ یہ حضرت صدیق اکبرؓ اور ان کے ساتھیوں سے عداوت رکھنے والے ہیں اور اسی طرح کے مرتد اور کافر ہیں جیسے وہ مرتدین تھے جن سے صدیق اکبرؓ نے جنگ کی تھی۔ اگر کوئی صحابہ کرامؓ کی شان میں گستاخی کو جائز سمجھ کر کرے تو وہ کافر ہے۔ صحابہؓ کی شان میں گستاخی کرنے والا سزائے موت کا مستحق ہے۔ جو صدیق اکبرؓ کی شان میں گالی بکے وہ کافر ہے۔ رافضی کا ذبیحہ حرام ہے حالانکہ اہل کتاب کا ذبیحہ جائز ہے اور روافض کا ذبیحہ کھانا اس لئے جائز نہیں کہ شرعی حکم کے لحاظ سے یہ مرتد ہیں۔

(منہاج السنہ صفحہ ۱۹۸۔ ۲۰۰ جلد ۲، الصارم المسلول صفحہ ۵۷۰، بحوالہ قرار داد ڈائجسٹ صفحہ ۱۵۱)

امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب میں جا بجا لکھا ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں شیعوں نے کفار و مشرکین کا ساتھ دیا اور اسلام سے بے وفائی کی اور اسلامی سلطنت کو نقصان پہنچایا اور آخر میں ان کا قلم یہ لکھنے پر مجبور ہوا ہے کہ "فایامھم فی الاسلام کلھا سود" خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ان کی تاریخ بالکل سیاہ ہے۔ (منہاج السنہ جلد ۲ صفحہ ۱۱)

فتاویٰ بزازیہ

ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت کا منکر کافر ہے۔ عثمانؓ، علیؓ، طلحہؓ، زبیرؓ اور عائشہؓ کو کافر کہنے والے کو کافر کہنا واجب ہے۔ (فتاویٰ بزازیہ صفحہ ۳۱۸ جلد ۶ بحوالہ بینات صفحہ ۱۵۷)

شیخ الاسلام علامہ ابو سعود مفتی اعظم سلطنت عثمانیہ

شیعوں سے جنگ جہاد اکبر ہے اور ان سے جنگ میں ہمارا جو آدمی مارا جائے گا وہ شہید ہوگا۔ شیعہ اسلامی فرقوں سے خارج ہیں۔ ان کا کفر ایک سطح پر نہیں رہتا بلکہ بتدریج بڑھتا رہتا ہے۔ ہمارے گذشتہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ ان پر تلوار اٹھانا جائز ہے اور یہ کہ ان کے کافر ہونے میں جس کو شک ہو وہ خود کفر کا مرتکب قرار دیا جائے گا۔ چنانچہ امام اعظم، امام سفیان ثوری اور امام اوزاعی کا مسلک یہ ہے کہ اگر یہ لوگ توبہ کر کے اسلام میں آ جائیں تو انہیں قتل نہیں کیا جائے گا اور امید کی جا سکتی ہے کہ دوسرے کافروں کی طرح توبہ کے بعد ان کی بخشش ہو جائے گی۔ لیکن امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام لیث بن سعد اور بہت سے ائمہ کبار کا

مسلک یہ ہے کہ نہ ان کی توبہ قبول کی جائے گی اور نہ ہی ان کے اسلام لانے کا اعتبار کیا جائے گا۔ بلکہ حد جاری کرتے ہوئے ان کو قتل کر دیا جائے گا۔ (رسائل ابن عابدین شامی صفحہ ۳۶۹ جلد ۱ بحوالہ بینات صفحہ ۷۲)

ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ) کا فتویٰ

ہمارے دور کے رافضی تمام اہلسنت والجماعت کی تکفیر کا اعتقاد رکھنے کے علاوہ اکثر صحابہ کرامؓ کی تکفیر کرتے ہیں لہٰذا بغیر کسی نزاع کے بالاجماع رافضی کافر ہیں۔

(مرقاۃ صفحہ ۲۴۷ جلد ۹ بحوالہ ارشاد الشیعہ صفحہ ۲۰۹ از مولانا سرفراز خان صاحب صفدر)

ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں ان عقائد اور ان فرقوں کا بیان کرتے ہوئے جن کے کفر پر ائمہ اور علماء کا اجماع ہے تحریر فرمایا ہے کہ جو شخص قرآن کا انکار کرے، پورے قرآن کا یا اس کی کسی ایک سورت کا یا ایک ہی آیت کا (وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے) جو شخص شیخینؓ کی خلافت کا انکار کرے تو وہ کافر ہے۔ میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی خلافت بالاجماع بغیر نزاع کے ثابت ہے اور چونکہ اجماع بھی قطعی ادلہ میں سے ہے اس لئے اجماع کا منکر بھی کافر ہے۔ (شرح فقہ اکبر صفحہ ۱۹۸)

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (م ۱۰۳۴ھ) کا فتویٰ

حضرت مجدد الف ثانی طویل بحث کے بعد فرماتے ہیں کہ شیعہ کو کافر ٹھہرانا احادیث صحاح کے مطابق اور طریق سلف کے موافق ہے۔ (رد رفض صفحہ ۳۹)

موصوف "مکتوبات" میں ارقام فرماتے ہیں کہ تمام بدعتی فرقوں میں بدترین فرقہ وہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ سے بغض رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کو کفار فرمایا "لیغیظ بھم الکفار" (مکتوبات دفتر اول مکتوب نمبر ۵۴)

شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں کہ:

جہاں تک حضرت مجدد الف ثانی کا تعلق ہے تو انہوں نے اپنے حالات اور مزاج کے مطابق طریق کار اختیار کیا یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت موصوف کے احسانات سے بالخصوص برصغیر کے مسلمان کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے اور وہ مقام و مرتبے کے اعتبار سے کئی اہم امور میں شاہ ولی اللہ صاحب سے بہت بلند تھے۔ ان کی امتیازی خصوصیت ان کی "رگ فاروقیم" یعنی شدید اسلامی احساس ہے جو بار بار اپنے مکتوبات میں اس ترکیب کو دہراتے ہیں۔ سامانہ کے

خطیب نے خلفائے راشدین کا نام خطبہ میں نہ لیا تو حضرت کی رگ فاروقی حرکت میں آئی اور انہوں نے اکابر شہر کو لکھا کہ آپ لوگ کیوں اس خطیب کے ساتھ "شدت و غلظت" کے ساتھ پیش نہ آئے یہ رگ فاروقی ایک بڑی خوبی ہے اور جس وقت کی احقیقت اسلام خطرے میں ہو اس سے بڑھ کر کوئی خوبی نہیں۔

شیعوں کی نسبت حضرت مجدد کی رائے علمائے ماوراء النہر کی طرح انتہا پسندانہ تھی وہ انہیں کافر سمجھتے تھے اور ان کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم نے تو اورنگ زیب کے نام ایک خط میں شیعوں کو واجب القتل ٹھہرایا ہے۔ (دبستان مذاہب صفحہ ۷)

فتاویٰ عالمگیری

جو رافضی شیخین کو گالی بکے وہ کافر ہے جس نے صدیق اکبر کی امامت و خلافت کے برحق ہونے کا انکار کیا وہ بھی کافر ہے۔ بعض نے کہا ایسا شخص بدعتی ہے کافر نہیں۔ لیکن صحیح یہی ہے کہ وہ بدعتی نہیں بلکہ کافر ہے۔ یہ لوگ ملت اسلامیہ سے خارج ہیں اور ان کے احکامات وہی ہیں جو مرتدین کے ہیں۔ ظہیریہ میں یہی مذکور ہے۔

(فتاویٰ عالمگیری صفحہ ۲۶۴ جلد ۲ مطبوعہ باب المرتدین طبع ۱۳۱۰ھ مصر مدینہ)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) کا فتویٰ

شیعوں کی اصطلاح میں امام معصوم ہوتا ہے۔ اس کی اطاعت فرض ہوتی ہے۔ اللہ کی طرف سے مخلوق کی ہدایت کے لئے مقرر کیا جاتا ہے۔ اس پر باطنی وحی آتی ہے۔ پس در حقیقت وہ ختم نبوت کے منکر ہیں۔ اگر چہ زبان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء کہتے ہیں۔

(تفہیمات الٰہیہ صفحہ ۲۴۴۔ بحوالہ بینات صفحہ ۸)

"دین حق اسلام کے منکر و مخالف کا اگر حال یہ ہے کہ وہ ظاہر میں بھی اسلام کا منکر ہے اور باطن میں یعنی دل سے بھی منکر ہے تو اس کو کافر کہا جائے گا اور اگر اس کا حال یہ ہے کہ ظاہر میں اور زبان سے تو اسلام کا اقرار کرتا ہے لیکن دل سے منکر ہے تو اس کو منافق کہا جائے گا اور اگر ایسا ہے کہ بظاہر اسلام کو مانتا ہے اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے لیکن بعض ایسی دینی حقیقتوں کی جن کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعی اور بدیہی ہے ایسی تشریح اور تاویل کرتا ہے جو صحابہ و تابعین اور اجماع امت کے خلاف ہے تو اس کو زندیق کہا جائے گا۔"

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب نے زندقہ کی چند مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ اسی سلسلہ میں شیعوں کے بارے میں ارقام فرماتے ہیں۔

"اور اسی طرح وہ لوگ بھی زندیق ہیں جو کہتے ہیں کہ شیخین ابوبکرؓ و عمرؓ اہل جنت میں سے نہیں ہیں۔ یا جو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ خاتم النبیین ہیں لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد کسی کو نبی ﷺ نہ کہا جائے گا لیکن نبوت کی جو حقیقت ہے یعنی کسی انسان کا اللہ کی طرف سے مبعوث ہونا، اس کی اطاعت کا فرض ہونا اور اس کا معصوم ہونا یہ سب ہمارے اماموں کو حاصل ہے تو ایسے عقائد و خیالات رکھنے والے زندیق ہیں اور جمہور متاخرین حنفیہ اور شافعیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ لوگ سزائے موت کے مستحق ہیں۔

(مسوّی شرح موطا امام مالک صفحہ ۱۱۰ جلد ۲ بحوالہ اقرا ڈائجسٹ صفحہ ۱۵۶)

حضرت شاہ ولی اللہ کا ایک اہم مکاشفہ:

امامت کے بارے میں ان مشرکانہ عقائد کو سامنے رکھ کر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا یہ مکاشفہ و مکالمہ بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے جو ان کو عالم مراقبہ میں حاصل ہوا۔ وہ فرماتے ہیں:

میں نے آنحضرت ﷺ سے روحانی طور پر فرقہ شیعہ کے متعلق دریافت کیا تو مجھے جواب ملا کہ ان کا مذہب باطل ہے اور ان کے مذہب کا بطلان لفظ "امام" سے سمجھا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جب اس روحانی مراقبہ کی کیفیت ختم ہوئی تو مجھے خیال آیا کہ واقعی "امام" ان حضرات کے نزدیک وہ معصوم ہستی ہے جس کی اطاعت فرض ہے اور جس پر باطنی وحی آتی ہے اور حقیقت میں یہی نبی کی تعریف ہے اس لیے ان کا مذہب ختم نبوت کے انکار کا مستلزم ہے۔ (الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین صفحہ ۔۔ بحوالہ مقدمہ تصویریں صفحہ ۔۔ مؤلف مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۲۳۹ھ) کا فتویٰ

فرقہ امامیہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت سے منکر ہے اور کتب فقہ میں مذکور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا جس نے انکار کیا وہ اجماع امت کا منکر ہوا، وہ کافر ہو گیا، حنفی مسلک کے مطابق امامیہ شیعہ شرعی حکم کے لحاظ سے مرتد ہیں۔ (فتاویٰ عزیزیہ بحوالہ بینات صفحہ ۱۵۸-۱۶۳)

علامہ ابن عابدین شامی (م ۱۲۵۲ھ) کا فتویٰ

ردالمحتار باب المرتدین میں علامہ ابن عابدین کا رویہ تکفیر کے بارے میں سخت احتیاط

کا ہے جیسا کہ اس کے مطالعہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے تاہم وہ فرماتے ہیں کہ!

حضرات شیخین ؓ میں سے کسی ایک کو یا دونوں کو گالی دینے والا اور ان پر لعن طعن کرنے والا کافر ہے، اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی، علامہ دبوسی اور ابو اللیث کا یہی فتویٰ اور قول مختار بھی یہی ہے۔

اور خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے کہ رافضی جب شیخین کو گالی بکے یا ان پر لعن طعن کرے تو وہ کافر ہے، ہاں جو بدبخت سیدہ عائشہ صدیقہ کو تہمت لگائے یا صدیق اکبر کی صحابیت کا انکار کرے تو اس کے کفر میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ (در مختار ردالمختار صفحہ ۲۲۲ جلد ۳ باب المرتد بحوالہ اقرا ڈائجسٹ صفحہ ۱۵۲)

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی

(م ۱۲۹۷) بانی دار العلوم دیوبند

"مذہب اہل سنت بشہادت کلام اللہ و عترت رسول اللہ ﷺ صحیح اور مذہب شیعہ بشہادت کلام اللہ و عترت رسول اللہ ﷺ سراسر غلط ہے" (ہدیۃ الشیعہ صفحہ ۵)

حضرت نانوتویؒ نے نہ صرف "ہدیۃ الشیعہ" میں بلکہ "اجوبہ اربعین" میں بھی اہل تشیع کے گمراہ کن اعتراضات کے مسکت جوابات دیئے ہیں۔ جبکہ عملی طور پر وہ شیعیت کی سب سے بڑی لعنت اور اسلامی عقیدہ توحید پر کاری ضرب لگانے والی مشرکانہ رسم "تعزیہ داری" کو مٹانے کے لیے دیوبند کے ایک بزرگ اور حضرت گنگوہی کے مرید حاجی محمد یٰسین عرف دیوان جی کی حمایت و تائید میں میدان عمل میں اتر گئے اور دیوبند کے بہت سے سربرآوردہ لوگوں کی مجلس میں اعلان کیا کہ تعزیہ اٹھانے والے سن لیں کہ دیوان جی کی لاش کے ساتھ قاسم کی لاش پر سے بھی تعزیہ گزارہ جا سکتا ہے جب تک دونوں زندہ رہیں گے تعزیہ نہیں نکالا جا سکتا۔ اس طرح دیوبند کی عام مسجدوں سے تعزیہ کے رکھنے اور وہاں سے اٹھانے کی رسم بد کا خاتمہ ہو گیا۔

(بحوالہ دار العلوم دیوبند احیاء اسلام کی عظیم تحریک صفحہ ۳۲۹)

مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ)

شیعہ بے ادب ہر چند کلمہ توحید زبان سے کہے لیکن مسلمان نہیں ہو سکتا اگر ایک آیت قرآن شریف کا کوئی کلمہ کو منکر و مکذب ہو تو وہ کافر ہوتا ہے، کلمہ پڑھنے اور قبلہ کی طرف منہ کرنے سے مومن نہیں ہوتا اذیت محبوب رسول خدا، اذیت رسول اللہ ہے اور موذی رسول کافر ہے۔ ایسے شریروں کی تکفیر و تفسیق ہر مسلمان پر واجب ہے۔ (ہدایۃ الشیعہ صفحہ ۱۵ بحوالہ بینات صفحہ ۲۲۸)

مولانا محمد انور شاہ کشمیری (م ۱۳۵۲ھ)

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ میں سے کسی ایک کی خلافت کا منکر بھی کافر ہے۔ (اکفار الملحدین صفحہ ۸۵ بحوالہ بینات صفحہ ۱۵۶)

"اکثر تخریب السلطنة الاسلامیه علی یدی الروافض خذلهم الله و لعنهم الله" (فیض الباری صفحہ ۲۷۷ جلد ۲)

اکثر اسلامی حکومتوں کی بربادی روافض کے ہاتھوں ہوئی۔ اللہ ان کو رسوا کرے اور ان پر اس کی پھٹکار ہو۔

امام اہلسنت مولانا عبدالشکور لکھنوی (م ۱۳۸۱ھ)

شیعہ اثنا عشری قطعاً خارج از اسلام ہیں، ضروریات دین کا انکار قطعاً کفر ہے اور قرآن شریف ضروریات دین میں سے سب سے اعلیٰ و ارفع چیز ہے اور شیعہ بلا اختلاف کیا ان کے حقدمین اور کیا متاخرین سب کے سب تحریف قرآن کے قائل ہیں۔ (بحوالہ بینات صفحہ ۲۰۱)

اس فتویٰ پر مندرجہ ذیل جلیل القدر علمائے کرام نے تصدیقی دستخط ثبت فرمائے ہیں!
شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنی، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالرحمن امروہی، مولانا اعزاز علی، مولانا مفتی مہدی حسن شاہ، مولانا قاری محمد طیب، مولانا مفتی محمد شفیع اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہم۔

پیر سید مہر علی شاہ صاحبؒ گولڑوی (م ۱۳۵۶ھ)

جس شخص یا فرقہ میں یہ (شیعوں والے) اوصاف ہوں وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ ایسے شخص یا گمراہ فرقہ سے حسب اقتضائے "الحب للہ والبغض للہ" خلط ملط ہونا اور راہ رسم رکھنا منع ہے، شیخین حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو برا کہنے والا جمہور مسلمین کے نزدیک کافر ہے۔ ایسے اشخاص سے برتاؤ کرنا اور اتحاد رکھنا بالکل ممنوع ہے۔ (بحوالہ آفتاب ہدایت صفحہ ۱۰۵)

اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی (م ۱۳۴۰ھ)

بالجملہ ان رافضیوں، تبرائیوں (شیعوں) کے باب میں حکم قطعی اجماعی یہ ہے کہ وہ علی العموم کفار و مرتدین ہیں۔ ان کے ہاتھ کا ذبیحہ مردار ہے۔ ان کے ساتھ مناکحت نہ صرف حرام بلکہ خالص زنا ہے۔ جو ان کے ملعون عقیدوں پر آگاہ ہو کر پھر بھی انہیں مسلمان جانے یا ان کے

کافر ہونے میں شک کرے باجماع تمام ائمہ دین خود کافر ہے دین۔ ہے اور اس کے لیئے بھی یہی احکام ہیں جو ان کے لیئے مذکور ہوئے۔ مسلمانوں پر فرض ہے کہ اس فتویٰ کو بگوش ہوش سنیں اور اس پر عمل کر کے سچے پکے مسلمان بنیں۔ (ردّ رافضہ صفحہ ۳۱)

فخر المحدثین حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری

(م ۱۳۴۶ھ) صاحب المھند علی المفند

موصوف کے دل میں ردّ شیعیت کا شدید جذبہ موجزن تھا انہوں نے ردّ شیعیت میں صرف "مطرقۃ الکرامہ اور ہدایات الرشید" جیسی عظیم کتابیں ہی تحریر نہیں فرمائیں بلکہ وہ شیعہ مناظرین کو میدان مناظرہ میں بھی للکارتے رہے۔ انہوں نے ضلع مراد آباد میں شیعوں کے مجتہد اعظم کو میدان مناظرہ میں پکڑا اور اس وقت تک اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی جب تک کہ اپنی موجودگی میں امام اہل سنت مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی کو متکلم بنا کر کھڑا نہیں کر دیا اور پے درپے سوالات اور شیعی مذہب کے پوست کندہ عقائد کا پوسٹ مارٹم کر کے شیعوں کو اتنا رسوا نہیں کر دیا کہ وہ امروہہ چھوڑ کر راتوں رات چلے جائیں جب وہ فرار ہو گئے تب آپ امروہہ سے ہٹے حالانکہ اسی دوران حضرت شیخ الہند کا دہلی میں انتقال ہو جاتا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اسی روز امروہہ سے جنازہ اور تجہیز و تکفین میں شرکت کے لیئے دیوبند جاتے ہیں اور مولانا خلیل احمد صاحب جن کے حضرت شیخ الہند سے گوناگوں تعلقات تھے اس کے باوجود محض اس لیئے امروہہ سے نہیں ہٹے کہ شیعہ مناظرین کو غلط پروپیگنڈہ کا موقع مل جائے گا۔ اس جوش و جذبہ سے آپ نے شیعیت کا مقابلہ کیا۔ (بحوالہ دار العلوم دیوبند احیاء اسلام کی عظیم تحریک صفحہ ۳۲۶)

مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب (م ۱۳۴۷ھ)

مفتی اول دار العلوم دیوبند

"روافض کا وہ فرقہ جو بسبب سب شیخین و تکفیر صحابہ کافر ہے ان کی تجہیز و تکفین میں امداد کرنا اور ان کے جنازہ کی نماز پڑھنا اور ان کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا درست نہیں ہے اور ان سے بالکل متارکت اور مقاطعت کی جاوے تا کہ ان کو تنبیہ ہو اور وہ سنی ہو جاویں"

(فتاویٰ دار العلوم دیوبند مدلل و مکمل جلد پنجم صفحہ ۲۰۱۔ مطبوعہ دار الاشاعت کراچی سن ۱۹۸۶ء)

حضرت مفتی صاحب کی علمیت و فقاہت کے متعلق حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب

صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند رقم طر ... از ہیں کہ!

"آپ کی ذات جامع اوصـ ... اف اور جامع علوم تھی۔ علم میں مزید وسعت و حذاقت اور گہرائی افتاء کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کی طویل تعلیمی خدمت نے پیدا کر دی تھی۔ ذہانت و ذکاوت آپ کا خاندانی ورثہ تھی اس لیے ... فقاہت اور تفقہ فی الدین میں آپ کا سر بلند ہونا تعجب خیز نہ تھا۔ اخلاق کی بلندی حضرت اقدس ... مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندی قدس سرہ مہتمم ثانی دارالعلوم دیوبند کی صحبت و مجلس نشینی او ... استفادہ کا ثمرہ تھی اور اس طرح آپ علم و عمل، اخلاق و ملکات، معرفت و بصیرت اور فقاہت و درایـ ... ت کی بے مثل شخصیتوں میں سے ایک بلند پایہ شخصیت تھے جن سے دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کو ... زینت بخشی گئی۔"

(حوالہ مذکورہ جلد اول صفحہ ۳۴-۳۳ تحت پیش لفظ)

پیر سید کرم شاہ صاحب ... الازہری کے پیر و مرشد خواجہ قمر الدیـ ... ن سیالوی کا فتویٰ

اگر اوپر بہتے ہوئے پانی سے سور پانی ... پی لے تو اس سے پینا جائز ہے اور اگر شیعہ وہاں سے پانی پی لے تو پینا جائز نہیں کیونکہ وہ نجس اور دشمـ ... ن صحابہ ہیں۔

سیال شریف ... کا تازہ فتویٰ

شیعیت اسلام کے خلاف بدترین سازش ... ہے اور یہود و مجوس وغیرہ کی اسلام سے بدلہ لینے کی مذموم کوشش جس کو صرف اسلام کا لیبل لگا ... کر پیش کیا گیا ہے جو کہ درحقیقت یہودی اور مجوسی نظریات اور اعمال و اخلاق کا ایک چربہ ہے اور ... معجون مرکب اسے اسلام، قرآن اور اہلبیت سے قطعاً کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے۔ (شیخ الحدیث ... محمد اشرف سیالوی، بحوالہ تاریخی دستاویز صفحہ ۱۱۵)

دارالعلوم حزب الا ... حناف لاہور

جس فرقہ کے لوگوں کے یہ عقائد ہوں کہ حضـ ... رت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کو منافق مانے اور قرآن کریم کو غیر صحیح سمجھے اور متعہ کو جو با ... تفاق امت حرام ہے جائز سمجھے ایسے فرقہ کو ضرور بالضرور غیر مسلم اقلیت ٹھہرانا ضروری ہے ان کو مسلمـ ... ان ماننا غلطی ہے۔

(احقر العباد مولوی محمد رمضان مفتی دارالعلوم حزب الاحناف لاہور)

دار العلوم غوثیہ لاہور

جن لوگوں کے ایسے عقائد ہیں جیسے استفتاء میں لکھے گئے ہیں وہ بلا شک وشبہ دائرہ اسلام سے خارج اور غیر مسلم قرار پاتے ہیں (مفتی غلام سرور قادری دار العلوم غوثیہ لاہور)

جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور

جو شخص یا گروہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عفت وعصمت میں طعن کرتا ہے وہ سورہ نور کی آیات کا منکر ہے جن میں حضرت عائشہؓ کی برأت بیان کی گئی ہے اور قرآن کا منکر کافر ہے۔ پس استفتاء میں مذکورہ غلط اور گمراہ کن نظریات رکھنے والا شخص مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا ایسے شخص یا گروہ سے مسلمانوں کو تعلق رکھنا، ان کے جلسوں اور جلوسوں میں شامل ہونا ناجائز اور حرام ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ ایسے لوگوں کو اپنے معاشرے سے خارج کر دیں اور ان کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں۔ (مفتی عبد اللطیف جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور۔ بحوالہ تاریخی دستاویز صفحہ ۱۱۵)

حافظ صلاح الدین یوسف لاہور

استفتاء میں شیعہ حضرات کے جن عقائد کا ذکر کیا گیا ہے جو ان کی نہایت معتبر اور مستند کتابوں میں درج ہیں۔ یہ عقائد ان کے کفر کے اثبات کے لیئے کافی ہیں۔ ایسے سخت گمراہ کن عقائد رکھنے والا فرد اور گروہ یقیناً مسلمان نہیں ہو سکتا اس لیئے اب وقت آگیا ہے کہ اہل اسلام آستین کے ان سانپوں کو پہچانیں اور اہل وطن ان کی ان سازشوں سے آگاہ رہیں جو وہ اسلامی معاشرے میں رہتے ہوئے اسلام کی جڑیں کاٹنے کے لیئے کر رہے ہیں۔ اسلامی ممالک اور معاشروں میں ان کا سازشی وجود جسد ملت اسلامیہ میں ایک ناسور کی حیثیت رکھتا ہے جس کا کاٹ پھینکنا اسلام کی بقاء اور ملت اسلامیہ کے تحفظ کے لیئے انتہائی ضروری اور اس سے تغافل و تساہل نا قابل معافی جرم ہے۔ (حافظ صلاح الدین یوسف ایڈیٹر ہفت روزہ الاعتصام لاہور)

تصدیق: سواقی شیعہ، شیعی مسلمات کی رو سے اسلام سے علیحدہ قوم قرار پاتی ہے۔

(محمد عطاء اللہ حنیف ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۵)

جامعہ ابراہیمیہ سیالکوٹ

شیعہ اثنا عشریہ رافضیہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں کیونکہ یہ غالی فرقہ ان مسائل کا انکار کرتا ہے جو قطعی الثبوت، قطعی الدلالت اور ضروریات دین میں سے ہیں۔

ضروریات دین کا انکار باجماع امت کفر ہے۔ شیعہ اثنا عشریہ رافضیہ چونکہ موجودہ قرآن کا انکار کرتے ہیں جو ضروریات دین میں سے ہے اور خلافت راشدہ کا بھی انکار کرتے ہیں جس پر امت کا اجماع ہے اور اسی طرح صحابہ کرامؓ کا بھی انکار کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ فرقہ مذکورہ کفریہ عقائد کی بناء پر کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

(محمد علی جانباز جامعہ ابراہیمیہ سیالکوٹ بحوالہ اقرا ڈائجسٹ صفحہ ۱۱۲-۱۱۸)

مفکر اسلام مولانا مفتی محمود کا فتویٰ

اگر کوئی شیعہ حضرت عائشہؓ پر تہمت باندھتا ہے یا حضرت صدیق اکبرؓ کی صحابیت کا منکر ہے یا خلفائے ثلاثہؓ کو برا بھلا کہنا جائز سمجھتا ہے تو وہ خارج از اسلام ہے۔

(رجسٹر فتاویٰ مدرسہ قاسم العلوم ملتان جلد ۱۵ استفتاء ۱۰۱۷ بحوالہ بینات صفحہ ۲۲۲)

گزشتہ چودہ صدیوں میں اکابرین امت نے مختلف وجوہ کی بناء پر اہل تشیع کے کفر کا فتویٰ صادر کیا ہے مگر عصر حاضر میں بارہ اماموں کی امامت منصوصہ و معصومہ افضل من النبوۃ کا عقیدہ رکھنے والے فرقہ اثنا عشریہ کے بارے میں پہلی مرتبہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نے ایک تاریخی اور جامع استفتاء مرتب کر کے علمائے کرام کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ جس کے جواب میں برصغیر پاک و ہند، بنگلہ دیش، برطانیہ اور دیگر ممالک کے ایک ہزار سے زائد اکابر و اعاظم علماء و مفتیان نے شیعہ اثنا عشریہ کو انکار خلافت شیخین، توہین و تکفیر صحابہ، عقیدہ تحریف قرآن اور عقیدہ امامت کی بناء پر بالاتفاق کافر، مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا ہے۔ یہاں ان لاتعداد فتاویٰ میں سے بطور مثال صرف چند فتووں کا حوالہ ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے جن کی تصدیق برصغیر پاک و ہند کے سینکڑوں جید اور ممتاز علمائے کرام و مفتیان عظام نے کی ہے۔ ان فتووں میں دیئے گئے تفصیلی دلائل "متفقہ فیصلہ، ماہنامہ بینات اور ماہنامہ اقرا ڈائجسٹ شیعیت نمبر" میں ملاحظہ کئے جائیں۔

ماہنامہ بینات نے "بصائر و عبر" اور ماہنامہ اقرا ڈائجسٹ نے "تجدیدی کارنامہ" کے عنوانات سے مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید کا درج ذیل اقتباس شامل "نمبر" کیا ہے!

حضرت خاتم النبیین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین کا نام اسلام ہے۔ جو شخص اسلام کے تمام متواترات و مسلمات کو مانتا ہو وہ مسلمان کہلاتا ہے۔ جو شخص ضروریات

اسلام میں سے کسی ایک کا منکر ہو وہ پورے دین کا منکر اور آنحضرت ﷺ کا مکذب ہے اس لیئے دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ عام غلط فہمی یہ ہے کہ شیعہ مذہب بھی اسلام کے اندر مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ ہے یہ غلط فہمی اس لیئے ہوئی کہ شیعہ مذہب پر تقیہ کی سیاہ چادر تنی رہی ورنہ شیعہ مذہب نہ صرف یہ کہ بے شمار ضروریات دین اور متواترات اسلامی کا منکر ہے بلکہ اس کا کلمہ بھی جو دین کی اولین اساس ہے مسلمانوں سے الگ ہے اور قرآن کریم جو دین کا سرچشمہ ہے یہ اس کی تحریف کا بھی قائل ہے جس گروہ کا کلمہ اور قرآن تک مسلمانوں سے الگ ہو ان کو مسلمان کہنا خود اسلام کی نفی ہے۔

شیعہ مذہب اسلام کے بالمقابل کفر وارتداد، الحاد وزندقہ اور نفاق وشقاق کی وہ پہلی تحریک ہے جو اسلام کو مٹانے کے لیے کھڑی کی گئی۔ ہمارے مخدوم حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نے "ایرانی انقلاب۔ امام خمینی اور شیعیت" لکھ کر خمینی وشیعی تحریک کے اصل خدوخال اجاگر کردیئے اور اب اس موضوع پر یہ ان کی دوسری کتاب ہے جو "الفرقان لکھنؤ" کے خاص نمبر کی شکل میں آئی ہے۔ اس ناکارہ کا احساس یہ ہے کہ یہ پندرہویں صدی کے اوائل میں وہ خاص تجدیدی کارنامہ ہے جس کی توفیق حق تعالیٰ شانہ نے حضرت موصوف کو ارزانی فرمائی ہے۔

(ماہنامہ اقرأ ڈائجسٹ شیعیت نمبر صفحہ ۱۸)

محدث جلیل علامۃ العصر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی

اثنا عشری شیعہ بلا شک وشبہ کافر و مرتد ہیں کیونکہ وہ تحریف قرآن کے برملا قائل اور معتقد ہیں اور اس کا خود شیعوں کو اعتراف ہے۔ ان دونوں باتوں کا ناقابل تردید ثبوت خود مستفتی نے پیش کردیا ہے۔

اثنا عشری شیعوں کے خبیث اور کفریہ عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ رسول ﷺ کی وفات کے بعد چار شخصوں کے سوا سارے صحابہ بشمول تمام مہاجرین وانصار مرتد ہو گئے تھے یعنی کفر کی طرف پلٹ گئے تھے اور کفار کی بدترین قسم میں شامل ہو گئے تھے۔ پس یہ لوگ بالاجماع کافر ہیں اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اثنا عشری کے وجوہ کفر میں سے ایک وجہ انکار ختم نبوت بھی ہے اہل اسلام کے نزدیک

انبیاء علیہم السلام کے ساتھیوں وہ دونوں کی طرح کوئی معصوم اور مفترض الطاعت (جس کی اطاعت فرض ہو) نہیں ہے لیکن شیعوں کے عقیدہ میں امام بھی معصوم اور مفترض الطاعت ہوتا ہے اس پر وحی باطنی آتی ہے اس کو حلال و حرام کا اختیار ہوتا ہے وہ تمام کمالات و شرائط اور صفات میں انبیاء کا ہم پلہ ہوتا ہے اس میں اور پیغمبر میں کوئی فرق نہیں ہوتا بلکہ امامت کا مرتبہ پیغمبری سے بھی بالاتر ہے ان عبارتوں کے مطالعے کے بعد اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ اثنا عشری شیعہ "ختم نبوت" کو "خاتم النبیین" کے الفاظ کے تو قائل ہیں لیکن اس کی حقیقت کے قطعی منکر ہیں۔ الغرض وجوہ مفصلہ بالا کی بناء پر اثنا عشری شیعہ علمائے اسلام کے نزدیک کافر و مرتد ہیں۔

(ماہنامہ قومی ڈائجسٹ شیعیت نمبر صفحہ ۲۱۳، ۲۱۴)

مولانا ولی حسن صاحب مفتی اعظم پاکستان رئیس دار الافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

فاضل مستفتی نے شیعہ اثنا عشریہ کے جن حوالہ جات کا ذکر کیا ہے وہ ہم نے شیعہ کتابوں میں خود پڑھے ہیں بلکہ ان سے بڑھ کر شیعوں کی کتابوں میں انکی عبارات صاف صاف موجود ہیں ان عقائد کے ہوتے ہوئے اس فرقہ کے کافر اور خارج از اسلام ہونے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا ہے۔ صرف ان ہی تین (تحریف قرآن، عقیدہ امامت و تکفیر صحابہ) عقائد کی تخصیص نہیں بلکہ بغور نظر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شیعیت اسلام کے مقابلہ میں بالکل ایک الگ اور متوازی مذہب ہے جس میں کلمہ طیبہ سے لے کر میت کی تجہیز و تکفین تک تمام اصول و فروع اسلام سے الگ ہیں۔ اس لئے شیعہ اثنا عشریہ بلا شک و شبہ کافر ہیں۔ علمائے امت نے اثنا عشریہ شیعوں کو ہر زمانہ میں کافر قرار دیا۔

لہٰذا شیعہ اثنا عشری رافضی کافر ہیں۔ مسلمانوں سے ان کا نکاح شادی بیاہ جائز نہیں حرام ہے۔ مسلمانوں کے لئے ان کے جنازے میں شرکت جائز نہیں۔ ان کا ذبیحہ حلال نہیں۔ ان کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہیں۔ غرض ان کے ساتھ غیر مسلموں جیسا سلوک اور معاملہ کیا جائے۔

(حوالہ مذکور صفحہ ۳۰۳، ۳۰۴)

مفتی رشید احمد صاحب رئیس دار الافتاء والارشاد کراچی

شیعہ بلاشبہ کافر ہیں۔ ان کے کفر میں ذرہ سے تامل کی بھی کوئی گنجائش نہیں۔ ان کی کتابیں کفریات سے لبریز ہیں جن میں سب سے بڑی وجہ تکفیر عقیدہ تحریف قرآن ہے جو ان کے ہاں متواترات و مسلمات میں سے ہے۔ اگر کوئی شیعہ عقیدہ تحریف قرآن سے انکار کرتا ہے تو وہ بطور تقیہ ایسا کرتا ہے۔ شیعہ کا کفر دوسرے کفار سے بھی زیادہ خطرناک ہے اس لئے کہ یہ بطور تقیہ مسلمانوں میں گھس کر ان کی دنیا و آخرت دونوں برباد کرنے کی تگ و دو میں ہر وقت مصروف کار رہتے ہیں اور اس میں کامیاب بھی ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب اہل اسلام کو ان کا دجل و فریب سمجھنے کی فہم عطا فرمائیں اور ان کے شر سے حفاظت فرمائیں۔ (حوالہ ذکورہ صفحہ ۲۳۳)

شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدر

شیعہ اور روافض بے شمار گروہوں میں منقسم اور بٹے ہوئے ہیں مگر قدرے مشترک سب میں ایک ہے۔ راقم اثیم شیعہ اور روافض کو مسلمان نہیں سمجھتا اور جمہور محققین علمائے ملت بھی کھلے لفظوں میں ان کی تکفیر کرتے ہیں۔ راقم اثیم و یلئہ اس کا قائل ہے کہ اسلام کو جتنا نقصان روافض نے پہنچایا ہے وہ مجموعی لحاظ سے کسی کلمہ گو فرقہ سے نہیں پہنچا اور بحمد اللہ تعالیٰ علمائے حق نے اس کو خوب اجاگر کیا ہے۔

اس وقت اسلامی انقلاب کے نام سے جو طوفان بدتمیزی خمینی صاحب اور ایران کی طرف سے اٹھ رہا ہے جس کو دین سے ناواقف اور بے دین صحافی حربے لے کر شائع کر رہے ہیں وہ کسی طرح بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ علمی طور پر اس کی خوب تردید اور سرکوبی ہونی چاہئے تاکہ اس دور زندقہ و الحاد میں جس میں ہر طرف سے بے دینی کی برسات برس رہی ہے مسلمانوں کا ایمان محفوظ رہے۔ جس سمت خمینی صاحب اور ان کے چیلے امت کی کشتی لے جا رہے ہیں وہ ہلاکت اور بربادی کا راستہ ہے رشد و ہدایت کا ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ (ارشاد الشیعہ صفحہ ۲۰۰،۲۰۱)

مولانا محمد اکرم اعوان خلیفہ حضرت مولانا اللہ یار خان صاحب مرکزی امیر تنظیم الاخوان پاکستان

ہمارے ملک کی ۲ فیصد آبادی شیعہ حضرات کا نہ صرف اصرار بلکہ اس کے حق میں طاقت کا استعمال کہ ان کی فقہ جسے فقہ جعفریہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس ملک پر نافذ کی

جائے۔ حقیقتاً اہل تشیع مسلمان ہیں ہی نہیں۔ نہ ان کا دین اسلام ہے نہ ان کے عقائد اسلامی ہیں نہ ان کے اعمال اسلامی ہیں اور نہ یہ مسلمان ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ سنی اجتماع کو احساس ہو گیا کہ شیعہ حضرات کافر ہیں لیکن شیعوں کو صرف کافر منوانا ہی ضروری نہیں کافر تو پہلے ہی ہیں کوئی مانے یا نہ مانے بلکہ ضروری ہے کہ ہر مسلمان کو یہ بتلایا جائے کہ یہ صرف کافر ہی نہیں بلکہ دشمن اسلام ہیں کافر تو چین میں رہنے والے بھی ہیں۔ کافر تو جنوبی افریقہ میں بھی ہیں۔ یورپ میں بھی ہیں لیکن یہ سب کافر اپنی اپنی عبادات کرتے ہیں۔ اپنے کفریہ عقائد رکھتے ہیں۔ بعض اسلام سے عناد رکھتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنے عقائد، اپنے رسم و رواج اور اپنے اس طریقہ زندگی کو اسلام کا نام نہیں دیتا۔ جبکہ رافضیوں نے عقائد تو کافرانہ رکھے، رسم و رواج تو مشرکانہ رکھے طریقہ زندگی عین اسلام کی ضد پر وضع کیا اور پھر اس پر نام "اسلام" رکھا اور اسلام کے مقابلے میں ایک نیا اسلام اور اس کی ہر ہر عبادت کے مقابل میں اپنی عبادات وضع کیں اور اس گھناؤنی سازش سے دین اسلام کو مسخ کرنے کی وہ کوشش کی جو کوئی اور کافر ریاست یا مشرک فرقہ نہ کر سکا۔ حتیٰ کہ اسلامی فقہ کے بالمقابل اپنی من گھڑت فقہ تشکیل کی اور اس میں جو بین الاقوامی برائیاں تھیں ان کو دین بنا کر پیش کیا۔ دنیا بھر کی خرافات اکٹھی کیں اور پھر ان خرافات کو ایک اسلامی ریاست میں نافذ کرنے کا نہ صرف مطالبہ کیا بلکہ پوری قوت کے ساتھ اس کے نفاذ کے حق میں جلوس بھی نکالے اور حکومت پر دباؤ بھی ڈالا۔

ان حالات میں ہمیں مسلمانوں کو بتانا ہوگا کہ یہ سبائی ٹولہ اسلام کا دشمن ہے۔ لوگو یہ اتنی بڑی سازش ہے اسلام کے خلاف کہ جس نے امام الانبیاءؑ کے مرتبہ اور تقدس کو پامال کیا۔ صحابہؓ کی عظمت کو مجروح کیا اور جب یہ دو اس کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے تو اسلام کیسے رہ سکتا ہے؟ کیونکہ اسلام تو نام ہی ان تعلیمات کا ہے جو نبی آخر الزمان ﷺ نے صحابہؓ کو سکھلائیں اور پھر ان متبرک ہستیوں نے ساری دنیا کو بتلائیں تو یہ رافضی صرف کافر نہیں ہیں بلکہ اسلام کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ مسلمانو! ہوش کرو۔ اپنے دشمنوں اور ان کے عزائم سے باخبر رہو۔ اگر تم لوگ سوئے رہے تو یہ لوگ شروع سے ہی یہ چاہتے ہیں کہ دین اسلام کہیں نافذ نہ ہو اور اگر آپ کی غفلت سے یہ لوگ کامیاب ہو گئے تو تقدیر بھی آپ لوگوں کو معاف نہیں کرے گی۔

شیعیت خلاف اسلام ایک تحریک ہے جس کی پہلی اینٹ ہی کفر پر اور اسلام دشمنی پر

رکھی گئی ہے اوران کی اسلام دشمنی دوسرے کافروں کی نسبت کہیں زیادہ ہے یہ عام کافر نہیں ہیں۔
تو اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے دو راستے رہ جاتے ہیں یا تو شیعہ توبہ کر لیں اور ان خرافات سے باز آئیں اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو پھر حکومت یا حاکم کا فرض ہے کہ انہیں مرتد قرار دے تیسرا تو کوئی راستہ نہیں۔

(ماہنامہ الرشید ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ)

حضرت مولانا عبدالحق صاحب حقانی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب مدظلہ مفتی اعظم پاکستان فقہ اور فتاویٰ میں ہمارے مقتدا اور امام ہیں اور ہم مقتدی حضرات فتاویٰ میں صرف آپ کی اقتدا کرتے ہیں۔ اس لئے اس فتویٰ کی تصدیق و توثیق کی حضرت مفتی صاحب کے فتوے کے بعد کوئی ضرورت نہیں آپ کا فتویٰ ہم تمام علمائے دیوبند اور خدام کے لئے حجت اور دلیل ہے۔ آپ کے حکم کے پیش نظر سعادت کے لئے دستخط کر رہا ہوں ورنہ حضرت مفتی صاحب کے دستخط ہم سب کی طرف سے کافی ہیں اللہ تعالیٰ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہ اور حضرت مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی ولی حسن صاحب مدظلہ (یہ دونوں شخصیات اس وقت بقید حیات تھیں) کے اس جہاد کو قبول فرمائے۔ ان بزرگوں نے اس فتنہ کا بروقت احساس کیا اور اس مرض کو سرطان بننے سے قبل ہی امت مسلمہ سے کاٹ کر علیحدہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں ادنیٰ خادم کی حیثیت سے اس جدوجہد اور جہاد میں حضرت مفتی صاحب کا ساتھ دوں گا۔ اللہ تعالیٰ اس سعی کو قبول فرمائے۔

میرا مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی ولی حسن صاحب کے جواب سے اتفاق ہے۔
بلاشک وشبہ یہ فرقہ مرتد ہے۔ اس سے نکاح حرام اور کالعدم ہے۔

محمد فرید مفتی و استاد دارالعلوم حقانیہ (مولانا) سمیع الحق نائب مہتمم دارالعلوم حقانیہ۔

(ماہنامہ قرآن ڈائجسٹ شیعیت نمبر صفحہ ۱۲۷)

مولانا سمیع الحق صاحب امیر جمعیت علمائے اسلام (س گروپ) نے تو بہت پہلے (جب اہل تشیع ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں اپنے لئے سکولوں میں الگ شیعہ دینیات (بطور نصاب) کا مطالبہ کر رہے تھے) شیعہ مذہب کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

سدباب کے لئے جمعیت علمائے اسلام کے پلیٹ فارم پر ایک "قومی سنی کنونشن" منعقد کیا۔ جس میں تمام مذہبی جماعتوں پر مشتمل "متحدہ سنی محاذ" کا قیام عمل میں آیا جسے مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب نے مولانا سمیع الحق صاحب کی والدہ صاحبہ کا صدقہ جاریہ قرار دیا چنانچہ موصوف ماہنامہ الحق کے اداریہ میں لکھتے ہیں کہ:

"مرحومہ کے صدقہ جاریہ میں صرف دارالعلوم میں ان کے نسبی فرزندوں حضرت مولانا سمیع الحق اور حضرت مولانا انوار الحق کی خدمات دین اور تدریس علم ہی نہیں یا صرف قائد جمعیت مولانا سمیع الحق کی برپا کردہ تحریک نفاذ شریعت ، فوجی جرنیلوں اور حکمرانوں کے ایوان میں پیش کردہ شریعت بل، اعلاء کلمۃ الحق کے مساعی جمیلہ، کاروانِ جمعیت کی نظامت علیا، متحدہ شریعت محاذ کی تشکیل، شیعہ جارحیت اور خمینی ازم کے خلاف متحدہ سنی محاذ کی تجویز و تشکیل، جہاد افغانستان کے بارے میں ٹھوس موقف اور دینی جماعتوں کا متفقہ طور پر اس کی بھرپور حمایت کرنا۔ ان کے اعمال حسنہ اور باقیات صالحات میں ان کے اساتذہ کی طرح مرحومہ کا بھی بھرپور حصہ ہے۔ (ماہنامہ الحق نومبر ۱۹۸۷ء)

۳۰ مارچ ۱۹۹۱ء کو مولانا عبدالستار نیازی صاحب کی اقامت گاہ پر علماء اہلسنت جب ساجد نقوی کی امامت میں نماز پڑھنے لگے تو مولانا سمیع الحق صاحب نے یہ کہہ کر علیحدگی اختیار کرلی کہ "صدیوں کی مسافت ایک پل میں طے نہیں ہوسکتی" (روزنامہ پاکستان ۱۲ اپریل ۱۹۹۱ء)

۲۳ اپریل ۱۹۹۳ء کو پشاور میں ایک عظیم الشان "دفاع صحابہؓ و حق نواز شہید کانفرنس" میں مولانا سمیع الحق صاحب نے سپاہ صحابہؓ کے مشن کی حقانیت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"صحابہ کرامؓ نبی ﷺ کی نبوت کے گواہ ہیں اگر ان کی ذات محفوظ نہیں تو نبوت کے گواہ محفوظ نہیں۔ اس طرح نبوت پر حرف آئے گا اور یہی شیعیت کا اصل مقصد ہے۔ انہوں نے سپاہ صحابہؓ کے نعرہ "کافر کافر، شیعہ کافر" کی تائید کی اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب کو دعوت دی کہ اگر وہ بھی سپاہ صحابہؓ کے اس نعرہ کی تائید کردیں تو وہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے تمام اختلافات بھلا کر ان کی قیادت میں کام کرنے کے لئے تیار ہیں"۔ (ماہنامہ خلافت راشدہ صفحہ ۱۲۔ مئی، جون ۱۹۹۳ء)

اس کانفرنس کی کاروائی بیان کرتے ہوئے ایم آئی صدیقی لکھتے ہیں:

"یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اجلاس میں سپاہ صحابہؓ کے قیام سے اب تک

ہونے والے تمام اجلاسوں سے زیادہ حاضری تھی۔ کانفرنس کی خاص طور پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ کڑکتی ہوئی دھوپ میں بغیر شامیانوں کے ہزاروں افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگوں نے اس بات کو خوب سراہا جب مولانا سمیع الحق صاحب نے اپنی تقریر میں یہ فرمایا کہ اگر مولانا فضل الرحمن صاحب "کافر کافر شیعہ کافر" کے نعرہ کی تائید کردیں تو وہ مولانا فضل الرحمن صاحب سے تمام اختلافات بھلا کر ان کی قیادت میں کام کرنے کو تیار ہیں"۔ (حوالہ مذکورہ صفحہ)

ان ہی حقائق کی بنیاد پر مرید عباس یزدانی نے مولانا سمیع الحق صاحب کی طلب کردہ "ملی یکجہتی کونسل" کے پہلے اجلاس میں شریک ہونے سے انکار کردیا تھا اور کہا تھا کہ:

"ہم اس اجلاس میں اس لئے شامل نہیں ہوئے کہ ہمارے کچھ اعتراضات تھے۔ میں جیل میں تھا اور وہیں سے میں نے اپنی معروضات اس اجلاس میں شامل ہونے والی تمام جماعتوں تک پہنچادی تھیں۔ ایک اعتراض ہمیں مولانا سمیع الحق کی ذات پر بھی تھا۔ ان کی شخصیت ہمارے لئے غیر متنازع نہیں تھی۔ ان کا کردار افغانستان میں کبھی قابل رشک نہیں رہا۔ پاکستان میں بھی ان کی حیثیت بہرحال زیادہ موثر نہیں ہے۔ میرے خیال میں پاکستان میں فرقہ وارانہ "اساس گذاری" کا شرف انہیں کو حاصل ہے اس کی بنیاد انہوں نے ہی ڈالی ہے۔ آج بھی امن و اسلام کا نعرہ لگا کر افغانستان میں کود پڑنے والے "طالبان" ہوں یا پاکستان کی مسجدوں اور امام بارگاہوں میں معصوم لوگوں کو نشانہ بنانے والے سنگدل جنونی اکوڑہ خٹک سے ان کا تعلق چھپائے نہیں چھپتا۔ یہ لوگ پہلے اکوڑہ خٹک جاتے ہیں اور وہاں سے پورے پاکستان میں پھیل جاتے ہیں"۔ (ہفت روزہ تکبیر ۱۹ صفحہ ۲۷ مئی ۱۹۹۸ء)

مولانا سید محمد عبدالقادر آزاد خطیب شاہی مسجد لاہور

دین اسلام تمام انسانیت کا دین ہے۔ دین اسلام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ اور مقبول دین ہے ان الدین عند اللہ الاسلام محسن انسانیت رحمۃ للعالمین نبی اکرم ﷺ اور آپ کے جاں نثار صحابہ کرامؓ نے اس دین مقدس کو ہر قسم کے باطل و فاسد نظریات و عقائد سے محفوظ رکھا اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے دشمنان دین اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا اور ان کے ہر قسم کے ہتھکنڈوں اور سازشوں کو طشت از بام کردیا۔ انہی مقدس ہستیوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اسلام دنیا کے کونے کونے میں اپنی پوری خوشنمائیوں کے ساتھ چمک دمک رہا ہے اور اپنی پاکیزہ

تعلیمات سے انسانیت کی رہنمائی کر رہا ہے۔

لیکن افسوس! صد افسوس کہ بعض اسلام دشمن طاقتوں کے ایجنٹ اور مبلغ ان مقدس ہستیوں اور ذرائع کو نشانہ تنقید بنا کر بالواسطہ اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ وہ ہستیاں ہیں جن کی مسلسل عملی جدوجہد سے ہم تک اسلام صحیح و سالم پہنچا ہے۔

انہی اسلام کے دشمنوں سے ایک امام خمینی بھی ہیں جو اس دور کے دشمنان صحابہؓ کے سربراہ اور مقدمۃ الجیش ہیں جنہوں نے اپنے عقائد کی ترویج کے لبادے میں دین اسلام پر کاری ضرب لگائی ہے اور اپنی اسلام دشمنی اور بغض صحابہؓ کے عقیدے کو وحدت و اتحاد کے پروپیگنڈوں میں چھپانے کی کوشش کی ہے اور "کل حزب بمالدیھم فرحون" کی بنیاد پر یہ شخص اپنے غلط نظریات اور عقائد باطلہ کو ناواقف مسلمانوں پر مسلط کرنے کی کوشش میں معروف ہے اور عالم اسلام کو صیہونی یہودیوں اور کمیونسٹوں کے پنجے میں پھنسانے کے خواب دیکھ رہا ہے۔

ان تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ خمینی صاحب کی موجودہ تحریک اہل سنت کی نیست و نابودی کی ایک خفیہ سازش ہے ایران میں اہل سنت کے حالات سے تو کوئی شخص لاعلم نہیں ہے۔ ان پر ملازمتوں کے دروازے بند ہیں۔ تہران جہاں ستر لاکھ کی آبادی ہے اور جس شہر میں عیسائیوں، یہودیوں، زرتشتیوں، ہندوؤں اور سکھوں تک کی عبادت گاہیں موجود ہیں۔ وہاں اہل سنت کو جو وہاں تقریباً ۵ لاکھ ہیں ایک مسجد بنانے کی اجازت نہیں۔ ۱۹۸۰ء میں خمینی صاحب نے اہل سنت سے مسجد کے لیے زمین دینے کا وعدہ کیا۔ جب اہل سنت نے تین لاکھ تومان ایران کے قومی بنک میں جمع کرا دیئے تو خمینی صاحب کے حکم پر یہ رقم غصب کر لی گئی۔ ستر سال سے نماز عید حکومت سے خصوصی اجازت لے کر اہل سنت تہران کے گراؤنڈ میں پڑھتے تھے جو ۱۹۸۰ء میں خمینی صاحب نے لاٹھی چارج کرا کر سنی نمازیوں کو میدان سے بھگا دیا اور ہمیشہ کے لیے سنیوں پر سر عام نماز باجماعت کی پابندی لگا دی۔ ہم طوالت کے خوف سے ان باتوں میں جانے کی کوشش نہیں کریں گے البتہ اتنا ضرور کہیں گے کہ خمینی صاحب کا انقلاب اسلام سے بہت دور ہے اور وہاں کے سنی مسلمان ظلم و ستم کی چکی میں پھنسے ہوئے ہیں بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ایران اہل سنت کے لیے قبرستان اور مجاہدین و احرار کے لیے جیل کی کوٹھڑی بن چکا ہے اور ان مسائل کی روشنی میں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خمینی جو بظاہر وحدت و اتحاد کا داعی بنا ہوا

ہے صرف سنی عوام کو دھوکہ دینے اور شیعہ مذہب کو سنی مذہب پر مسلط کرنے کی غرض سے یعنی صاحب جو فرماتے ہیں کہ جو شیعہ سنی میں تفرقہ ڈالے وہ نہ سنی ہے نہ شیعہ ہے بلکہ وہ امریکہ اور روس کا ایجنٹ ہے۔ تو اس اصول کے تحت یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ خمینی صاحب خود بھی ان دونوں قوتوں میں سے کسی ایک کے ایجنٹ ہیں چونکہ وہ افتراق اور اختلاف کے بانی ہیں اور انہوں نے وحدت و اتحاد کو طشت ازبام کر دیا ہے اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ خمینی صاحب ان دونوں کے ایجنٹ ہیں تو یہ بات حقیقت سے بعید نہیں ہے اور "یریدون لیطفئوا نور الله بافواههم والله متم نوره ولو کره الکافرون" کا مطلب و تفسیر بھی ان باتوں کے بعد واضح ہو جاتی ہے۔

آخر میں تمام مسلمانان عالم سے استدعا ہے کہ خمینی جیسے تقیہ صفت مکاروں کے پروپیگنڈوں سے دھوکہ نہ کھائیں۔ یہ دشمنان اسلام کے ایجنٹ، رسول اکرم ﷺ، صحابہ کرامؓ اور امت مسلمہ کے مخالف ہیں۔ ۱۴ صدیوں سے اس قسم کے اشخاص اس کوشش میں مصروف ہیں تا کہ امت مسلمہ کو ان کے حقیقی دین و مذہب سے باز رکھیں اور مسلمانوں کی قوت اتحاد کو پاش پاش کر دیں"۔ (استاد خمینی اپنی کتابوں اور عقائد کے آئینے میں صفحہ ۱۲، ۵-۲۲، ۳۳)

مولانا عبدالقادر آزاد نے مذکورہ کتابچے کے علاوہ خمینی فتنے سے عالم اسلام کو آگاہ کرنے کے لیے عربی زبان میں بھی ایک کتابچہ تحریر کیا ہے جس کا نام ہے۔

"الفتنة الخمينية ـ أيها الرؤساء للدول الاسلامية والعلماء وزعماء المسلمين تعالوا نفكر في هذه الفتنة الكبرىٰ"

اس میں موصوف نے ایرانی انقلاب کو "الفتنة الخمينية" "الفتنة الكبرىٰ، الفتنة العظيمة، الفتنة الوبائية، الفتنة المشئومة" جیسے الفاظ سے یاد کرتے ہوئے کہا کہ:

حضرت في خدمتكم برسالة خالصة لتفكروا في هذه الفتنة العظيمة ولكن بالاسف الشديد لأن جميع رؤساء الدول الاسلامية و علمائها غافلون كل الغفلة عن هذه الفتنة الوبائية واول من فهم هذه الفتنة المشئومة هو انور السادات الرئيس المصري ه (الفتنة الخمينية صفحہ)

میں ایک خاص رسالے کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں تا کہ آپ اس فتنہ عظیمہ کے بارے میں غور و فکر کریں۔ لیکن انتہائی افسوس ہے کہ تمام اسلامی ممالک کے سربراہ اور ان کے علماء اس وبائی فتنہ سے مکمل طور پر غافل ہیں اور جس نے سب سے پہلے اس فتنہ کو سمجھا

وہ مصر کے صدر انوار السادات تھے۔

موصوف اپنے پہلے دورہ ایران کے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:"

لقد زرت ایران مرتین ورأیت فیها أمورا مخالفة لروح الاسلام وتعالیمه - رأینا علیٰ جدران فندق هلتون بطهران ثوبا ابیض کتبت علیه العبارة التالیة۔

"سنحرر الکعبة والقدس وفلسطین من أیدی الکفار" ۔ ورأینا بعض الایرانیین یوزعون کتبا ضد رؤسا الدول الاسلامیة عامة والملك السعودی خاصه۔

ثم رأینا بعد نصف ساعة من هذا الحدث اهانة أعلام الدول الاسلامیة ورؤسائها جاء ت سیارة اتوبیس مفتوحة (تریلر) و کان علیها۔

صورة رجل مقنع بالا وراق بشکل ریحان الرئیس الامریکی وفی عنقه عقد النعال ملفوفاً بجسده العلم الامریکی وعلیٰ یمینه صورة جلالة الملك خالد بن عبدالعزیز ملك السعودیة سابقا ملفوفابجسده العلم السعودی بشکل استفزازی مع عقد النعال علیٰ عنقه وعلیٰ یساره صورة حسنی مبارك رئیس جمهوریةمصر العربیه باشکالهما وصورة صدام حسین رئیس دولة العراق وصورة ملك حسین ملك الارد ن وغیرهم من رؤسا الدول الاسلامیة ومن خلفهم صورة یحمل رئیس وزراء اسرائیل علی مثل صورة الکلب وقد علق بذنبه رئیس باکستان الجنرال ضیاء الحق ملفوفا بجسده علم باکستان وفی عنقه عقد النعال و کانت صور رؤسا الدول الاسلامیةمقنعة بالا وراق ۔

میں نے دو مرتبہ ایران کا دورہ کیا ہے اور میں نے وہاں پر اسلامی روح اور مقاصد کے خلاف امور دیکھے۔ ہم نے تہران میں ہلٹون ہوٹل کی دیواروں پر ایک سفید کپڑا دیکھا جس پر درج ذیل عبارت لکھی ہوئی تھی:

"ہم عنقریب کعبہ شریف، بیت المقدس اور فلسطین کو کافروں کے ہاتھوں سے آزاد کرائیں گے"

ہم نے بعض ایرانیوں کو دیکھا جو ایسی کتابیں تقسیم کر رہے تھے جو عام طور پر اسلامی مملکتوں کے سربراہوں اور خاص طور پر سعودی عرب کے سربراہ کے خلاف تھیں پھر ہم نے اس

واقعہ کے آدھ گھنٹے کے بعد اسلامی ممالک کے جھنڈوں اور سربراہوں کی توہین دکھتی سا ایک ٹریلر آیا جس پر امریکی صدر کی امریکی پرچم میں لپٹی ہوئی تصویر تھی اور اس کے گلے میں جوتوں کا ہار تھا اور دائیں طرف سابق جلیل القدر بادشاہ خالد بن عبدالعزیز کی تصویر تھی جسم پر سعودی جھنڈا لپٹا ہوا تھا اس کی گردن میں بھی جوتوں کا ہار تھا۔ بائیں طرف مصر کے سربراہ حسنی مبارک کی تصویر تھی اور عراق کے صدر صدام حسین اور اردن کے شاہ حسین وغیرہ دیگر اسلامی ممالک کے سربراہوں کی تصاویر تھیں اور ان کے پیچھے اسرائیلی وزیر اعظم بیگن کی تصویر کتے کی طرح بنی ہوئی تھی جس کی دم پر پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق پاکستانی پرچم میں ملفوف لٹکے ہوئے تھے اور اس کی گردن میں بھی جوتوں کا ہار تھا۔

اس پر احتجاج کرتے ہوئے مولانا موصوف نے اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا جس پر وزیر خارجہ ڈاکٹر اکبر ولایتی نے معذرت کی اور پاکستان میں خمینی انقلاب برپا کرنے اور جنرل ضیاء الحق کا تختہ الٹنے کے لیے "مال" پیش کیا اور اپنے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلاتے ہوئے وعدہ کیا کہ اس کامیابی کے بعد مولانا عبدالقادر آزاد کو نئی انقلابی حکومت کا سربراہ اور شیخ علی اصغر خطیب جامع مسجد نیلا گنبد لاہور کو وزیر داخلہ اور شیخ عبدالرحمٰن نائب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور کو امور شرعیہ کا سربراہ بنا دیا جائے گا۔ اس پیشکش کا حال مولانا موصوف کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

"وفي اثنـاء ذلك جـاء نـا رجـل آخر يحـاول ان يغرينا بـالمـال وبـالمناصب فعرض علينا اموالاًوقال اطلبوا ما شئتم على ان تعودوا الى الحـفـل ثـم اخـذ يغرينا بشئ آخر وهو قوله لابدان يحكم باكستان العلماء واذاكنتم مستعدين لقيام ثورة خمينية في باكستان ضد حكومت ضياء الحـق فـنحن معكم نشد أزركم ونساعد كم بكل المساعدات حتى تنجح الثورة و نـعـاهـدكم على ان يكون الشيخ محمد عبدالقادر آزاد هو رئيس الـدولة والشيخ عـلـي اصـغـر خـطـيـب جـامـع نيلا گنبد لاهور يكون وزير الـداخـلية وفـضـيلة الشيخ عبدالرحمٰن نائب الرئيس الجامعة الاشرفية بلا هـور يـكـون رئيس المحاكم الشرعية بباكستان كل ذالك ونحن في الغرفة وفي نفس اللحظة جاء نارجل من قبل الدكتور اكبر ولايتي وزير الخارجية

یرانیة واخبرنا أن الدکتور فی انتظار کم فذ ھبنا الیه فی نحو ثمانیة عشر رجلا وفینا کبار علماء باکستان و بعض الصحفیین و مدیر الرائد الیومیة اللتی تصدد من باکستان منھا "ڈان کراچی" جنگ پاکستان، مسلم اسلام آباد، جسارت کراچی وغیرھم۔

اسی دوران ہمارے پاس ایک دوسرا آدمی آیا جو ہمیں مال و منصب کے ذریعے دھوکہ دینا چاہتا تھا اس نے ہمیں مال کی پیش کش کی اور کہا کہ تم جو چاہو مانگو اس شرط پر کہ تم میٹنگ میں شریک ہو گے۔ پھر کہا کہ پاکستان میں علماء کو حکومت کرنی چاہیے۔ اگر آپ ضیاء الحق کی حکومت کے خلاف خمینی انقلاب برپا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں تو ہم اس انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے آپ کے ساتھ مکمل تعاون کریں گے۔

ہم آپ کے ساتھ یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ اس انقلابی حکومت کے سربراہ مولانا عبدالقادر آزاد ہوں گے۔ جبکہ مولانا علی اصغر خطیب جامع مسجد نیلا گنبد لاہور وزیر داخلہ اور مولانا عبدالرحمٰن نائب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور شرعی امور کے سربراہ ہوں گے۔

ہم ایک کمرے میں تھے کہ اسی دوران ایران کے وزیر خارجہ ڈاکٹر اکبر ولایتی کی طرف سے ایک آدمی آیا۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم ان کی طرف گئے۔ ہم تقریباً اٹھارہ آدمی تھے جن میں پاکستان کے اکابر علماء اور پاکستان سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل "ڈان کراچی، جنگ، مسلم وغیرہ" کے ایڈیٹر اور صحافی حضرات بھی تھے۔

خامنہ ای نے علماء سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

"انطلقوا ایھا العلماء من ھذا المؤتمر بالثورۃ الاسلامیة ایرانیة فی بلادکم کی تفوزوا فی ھذا الجھد العظیم ولن تکاسلتم فلابدان یسألکم اللہ تعالیٰ منکم یوم القیامة یوم جمع الاکبر عن تقصیر فی حق اللہ وفی حق شعو بکم فماذا یکون جو ابکم یو مئذ؟ فما علینا الا البلاغ. (السنة المحمدیة ص ۴،۵،۳،۲،۹)

اے علماء کرام! آپ اس کانفرنس سے ایرانی اسلامی انقلاب کا عزم لے کر اپنے علاقوں کی طرف جائیں تا کہ آپ اس عظیم کوشش میں کامیاب ہو جائیں اور اگر آپ نے اس کام میں سستی دکھائی تو قیامت کے دن میدان حشر میں اللہ تعالیٰ اپنے حق اور عوام کے حق میں کوتاہی

کے بارے میں ضرور پوچھیں گے۔ پھر اس دن آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا؟

فما علینا الا البلاغ

رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کا فیصلہ

مفتی اعظم سعودی عرب شیخ عبدالعزیز بن باز نے رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں خمینی کے مرتد ہونے کے تمام فتووں کی تائید کر دی۔ انہوں نے رابطہ عالم اسلامی کے تمام مندوبین کو خمینی فتنہ کے خلاف اجتماعی موقف کے اختیار کرنے کی دعوت دی اور اس فتنہ کے قلع قمع پر زور دیا۔

چنانچہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے اجلاس کی ایک قرارداد میں خمینی کو کافر اور مرتد و خارج از اسلام قرار دے دیا گیا ہے۔ جس کی تفصیل عربی اخبار "المدینہ" وغیرہ میں آ چکی ہے۔

(عربی اخبار المسلمون ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۷ء)

الشیخ علی عبدالرحمٰن الحذیفی امام و خطیب مسجد نبوی ﷺ

محترم شیخ حذیفی صاحب نے ذیقعدہ ۱۴۱۸ھ میں اپنے تاریخی خطبہ جمعہ میں تمام مسلمانوں کو تین عظیم فتنوں یہودیت عیسائیت اور شیعیت سے خبردار کیا اور اسلام کے مقابلہ میں ان کے باطل عقائد سے آگاہ فرمایا اور قرآن و سنت کی روشنی میں ان کے ساتھ اتحاد اور میل جول کو عظیم اور ناقابل معافی جرم قرار دیا۔

محترم شیخ حذیفی صاحب نے ان فتنوں میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ خطرناک جس فتنے کو قرار دیا ہے ان ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔ "ھُمْ اَضَرُّ عَلَی الاِسْلَامِ مِنَ الْیَھُوْدِ وَالنَّصاریٰ" کہ یہ (شیعہ) لوگ اسلام کے حق میں یہود و نصاریٰ سے بھی زیادہ نقصان دہ ہیں۔ ان پر کبھی بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان کے مکر و فریب سے دفاع کے لیے ہر وقت کمربستہ رہیں۔ بے شک رفض (شیعیت) کا نسب عبداللہ بن سبا یہودی اور ابولولو مجوسی سے جا ملتا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے عقیدہ کا امتیازی تشخص برقرار رکھیں اور اللہ جو پسند کرتے ہیں اسی کو پسند کریں اور جو چیزیں اللہ کو ناگوار ہیں ان کو پسند نہ کریں اور اہل اسلام آپس میں ایک دوسرے کے مددگار اور متحد ہوں۔

(الشیخ علی عبدالرحمٰن الحذیفی کا جرأت مندانہ تاریخی خطبہ جمعہ صفحہ ۷ ماہنامہ نصرت العلوم جون ۱۹۹۸ء)

تین ہزار افغان علمائے کرام کا متفقہ فتویٰ

ایرانی عقائد کے مسئلہ کو اٹھادیا تو عالم اسلام ایران کے خلاف وہی فتویٰ دے گا جو روس کے خلاف دیا تھا۔ مفتی اعظم افغانستان مولانا عبدالعلی دیوبندی۔

کابل: جید عالم دین اور طالبان تحریک کے مفتی اعظم حضرت مولانا عبدالعلی دیوبندی نے علماء کے روح پرور اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ایران اپنی بدمعاشی سے باز نہیں آیا تو ان کے خبیث اور فاسد عقائد کی بنیاد پر ان کے خلاف ایسا فتویٰ دیں گے جیسے روس کے خلاف دیا تھا۔ ایران کے گندے اور خبیث ذہن رکھنے والے مصنفین اور مورخین نے واضح طور پر لکھا ہے کہ قرآن کریم پر ایمان نہیں لانا چاہئے کیونکہ العیاذ باللہ یہ کتاب اعداء الدین یعنی صحابہ کرامؓ نے جمع کی ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ اصل قرآن میں حضرت علی کا نام کئی جگہ موجود تھا لیکن دشمنان دین نے مٹادیا ہے۔

درحقیقت ان کی یہ باتیں قرآن مجید پر تنقید اور اس کا انکار ہے اور جو قرآن کا انکار کرتا ہے وہ مسلمان نہیں رہ سکتا۔ اس کے علاوہ متعہ یا نکاح موقت اجماع امت کی رو سے صریح زنا ہے جبکہ ایرانیوں کے یہاں ثواب کا درجہ رکھتا ہے۔ مولوی عبدالعلی دیوبندی نے کہا کہ ہمارے پاس ان کی کتابوں کے حوالے موجود ہیں وہ اپنے فاسد اور گمراہ عقائد سے ہرگز انکار نہیں کرسکتے۔ مولوی دیوبندی نے فرمایا کہ اگر ہم نے ایرانیوں کا عقیدہ چھیڑا تو عالم اسلام میں ایسا عالم کوئی نہیں ہوگا کہ وہ ایرانیوں کے خلاف وہ فتویٰ نہ دے جو روس کے خلاف دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ایران ہماری غیرت اور ایمانی قوت کا امتحان نہ لے۔ وہ ماسکو سے قوی نہیں۔ اللہ نے فرعون، ھامان کو ہلاک کردیا کیا وہ ایران کو تباہ نہیں کرسکتا؟ انہوں نے کہا کہ "دشمن اگر قوی است، اللہ قوی تر است" ایران اپنی قوت پر غرور نہ کرے۔ افغانوں نے نہتے ہوکر روس کو شکست دی ہے اللہ کی مدد سے ایران کو بھی دیں گے۔ ان شاء اللہ۔

{ہفت روزہ ضرب مومن کراچی صفحہ ۵۔۱۰ تا ۱۶ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ مطابق ۲ تا ۸ اکتوبر ۱۹۹۸ء}

اس تفصیل سے یہ واضح ہوگیا ہے کہ فرقہ اثنا عشریہ اپنے گمراہ کن باطل عقائد و نظریات کی بناء پر اہلسنت والجماعت کے جملہ فقہی مکاتب فکر کے علماء و مشائخ کے نزدیک کافر، مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہے جبکہ شیعہ کے دیگر فرقے ائمہ اثنا عشریہ کی امامت کے انکار اور ان کے

مقابلے میں غیر منصوص و غیر معصوم ائمہ کی امامت کے اقرار کی بناء پر خود اثنا عشریہ کے نزدیک بھی کافر قرار پا چکے ہیں۔

شیعہ سنی اتحاد

اہل تشیع کے جملہ فرقوں بالخصوص اثنا عشریہ کے عقائد و نظریات اور ان کے متعلق اکابرین امت کی آراء اور فتوے پڑھنے کے بعد کوئی مسلمان نہ تو انہیں "ملت اسلامیہ" کا حصہ تصور کر سکتا ہے اور نہ ہی انہیں "اتحاد بین المسلمین" کی دعوت دے سکتا ہے لیکن اس کے باوجود کچھ "مذہبی رہنما" ایسے بھی ہیں جو شیعہ سنی اتحاد کی نہ صرف رٹ لگا رہے ہیں بلکہ "اسلامی انقلاب" کے لیئے اسے ناگزیر بھی سمجھ رہے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔:

مصطفوی انقلاب کی جانب ایک تاریخ ساز قدم اعلامیہ وحدت

پاکستان عوامی تحریک اور تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے مابین طے پانے والا دس نکاتی فارمولا جو دونوں جماعتوں کے سربراہان کی منظوری سے بتاریخ ۱۲ جمادی الثانیہ ۱۴۱۰ھ بمطابق ۱۰ جنوری ۱۹۹۰ء بمقام لاہور جاری ہوا۔ اس میں یہ اعلان کیا گیا کہ:

"مملکت خداداد پاکستان، برصغیر کے مسلمانوں کی نبی اکرم ﷺ اور اسلام سے والہانہ محبت و عقیدت کی مظہر ہے۔ حصول پاکستان کی جدوجہد میں سب مسلمانوں کے مفادات مشترکہ تھے اور ان کی بے لوث قربانیاں بلا تفریق اور بلا امتیاز مسلک تھیں۔ تحریک پاکستان کے جہاد میں تمام مسلمانوں کا حصہ ان کا سرمایہ افتخار ہے۔ اب اس کی سالمیت، تحفظ، بقاء اور اس میں اسلام کی بالا دستی اور قرآن و سنت کی آئینی و قانونی حکمرانی کے نفاذ کیلئے اتحاد بین المسلمین اور قومی وحدت و یگانگت کی اہمیت محتاج بیان نہیں۔

اسی طرح عالمی سطح پر امت مسلمہ کی عزت و وقار کی بحالی اور سامراجی قوتوں کے مادی، فکری، سیاسی اور معاشی اثر و نفوذ اور غلبے کے خاتمے کیلئے ملت اسلامیہ کا اتحاد وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ وقت کی اس اہم ضرورت کی تکمیل کیلئے پاکستان عوامی تحریک — اور — تحریک نفاذ فقہ جعفریہ — مشترکہ دینی جدوجہد کا آغاز کر رہی ہیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور حضور نبی اکرم ﷺ کی رحمت کے

تصدق سے اتحاد کا یہ "اعلامیہ" پوری امت مسلمہ کیلئے نیک فال ثابت ہوگا۔ اس سے انشاء اللہ اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین باہمی رواداری اور اخوت کے جذبات کو فروغ ہوگا اور نہ صرف سر زمین پاکستان پر بلکہ عالمی سطح پر "مصطفوی انقلاب" کی نتیجہ خیز جدوجہد کیلئے مستحکم اتحاد اور کامل یگانگت کی بنیادیں استوار ہوں گی۔ اس متحدہ جدوجہد کے نتیجے میں "بولہبی و یزیدی" سیاست کا خاتمہ اور مصطفوی و حسینی سیاست کے عظیم دور کا آغاز ہوگا اور بالآخر دنیا کی تمام استعماری اور طاغوتی طاقتیں اسلام کی عظمت کے سامنے ہمیشہ کیلئے سرنگوں ہو جائیں گی۔

دستخط:۔ پاکستان عوامی تحریک	تحریک فقہ جعفریہ
۱۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری	علامہ ساجد علی نقوی
۲۔ مولانا احمد علی قصوری	آغا السید علی الموسوی
۳۔ مولانا محمد معراج الاسلام	مولانا موسیٰ بیگ۔ جامعۃ المنتظر لاہور

{اعلامیہ وحدت صفحہ ۵،۴}

لشکر طیبہ کے مرکزی امیر پروفیسر حافظ محمد سعید نے اہل تشیع کو اپنے سالانہ اجتماع میں شمولیت کی دعوت دے کر عملاً عظیم اسلامی اتحاد اور اخوت کا مظاہرہ کیا۔ اس اجتماع کی کاروائی حامد میر صاحب اپنے کالم "قلم کمان" میں بہ عنوان "آنسو ہچکیاں اور دعا" بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ!

"او بھائیو! فرقہ وارانہ گروہ بندیوں سے باہر نکل آؤ۔ خود کو اہل حدیث، دیو بندی، بریلوی اور شیعہ نہ کہو بلکہ صرف مسلمان بن جاؤ"۔ یہ الفاظ ۶ نومبر کی دوپہر مرید کے میں لاکھوں افراد کے عظیم اجتماع کے سامنے بیان کیئے جا رہے تھے۔ لاکھوں کے اس مجمعے کی توجہ اور سکوت یہ بتا رہا تھا کہ ایک سچے انسان کی زبان سے نکلنے والے الفاظ اپنا خوب اثر دکھا رہے ہیں۔
مرکز طیبہ میں حافظ محمد سعید خطبہ جمعہ دے رہے تھے اور ان کے خطبہ کو سننے والوں میں اہل حدیث، دیو بندی، بریلوی اور شیعہ بھی شامل تھے۔ پاکستان کی سرزمین پر ایسا عظیم اجتماع اور اسلامی اتحاد کا ایسا ایمان افروز مظاہرہ میں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ عظیم ہے وہ شخص اور عظیم ہے وہ جماعت جس نے اہل حدیثوں، دیو بندیوں، بریلویوں اور شیعوں کو صرف مسلمان بنا دیا، ایک ساتھ نماز پڑھا دی۔" {روزنامہ اوصاف ۸ نومبر ۱۹۹۸ء}

اسی طرح جمعیت علمائے اسلام (ف) کے سربراہ مولانا فضل الرحمن صاحب اپنے وفد کے ہمراہ ایڈیٹر اوصاف کے دفتر میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ!

"شیعہ سنی اتحاد اسلامی انقلاب کے لیئے بنیادی جزو کی حیثیت رکھتا ہے اور جب تک دونوں فرقوں کے درمیان اتحاد نہیں ہوگا انقلاب اسلامی کی منزل دور ہوتی جائے گی۔ انہوں نے شیعہ سنی اتحاد کے لیئے تجاویز پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ دونوں مسلک کے افراد ایک دوسرے کے خلاف تحریر و تقریر کا سلسلہ فوری طور پر بند کردیں اور دونوں مسلک کے ذمہ داران کو اپنے ان افراد کا نوٹس لینا ہوگا جو سڑکوں پر نعروں کے ذریعے ایک دوسرے کو کافر قرار دینے کے فتوے جاری کرتے ہیں۔" (روزنامہ اوصاف ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۸ء)

اگر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب، حافظ محمد سعید صاحب مولانا فضل الرحمن صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات کا موقف درست تسلیم کرلیا جائے تو ان تمام دیوبندی، بریلوی (حنفی مالکی، شافعی، حنبلی اور اہل حدیث "اکابرین اسلام" کی تکفیر لازم آتی ہے جنہوں نے بدلائل قاہرہ شیعہ کا کفر ثابت کر کے انہیں بدترین کافر قرار دیا ہے۔ سخت حیرت ہے کہ شیعہ عقائد و نظریات، اکابرین امت کی تصریحات اور علماء و کارکنوں کی عظیم قربانیوں کے باوجود اہل تشیع کو ملت اسلامیہ کا جزو تسلیم کر کے یہ اعلان کیا جارہا ہے کہ "شیعہ سنی اتحاد اسلامی انقلاب کے لیئے بنیادی جزو کی حیثیت رکھتا ہے اور جب تک دونوں فرقوں کے درمیان اتحاد نہیں ہوگا انقلاب اسلامی کی منزل دور ہوتی جائے گی۔"

فقیہ مصلحت بیں سے وہ رند بادہ خوار اچھا
نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں

یہ بیان اگر مولانا کوثر نیازی یا جماعت اسلامی کے احباب جاری کرتے تو "علمائے حق" اپنی پہلی فرصت میں ان کا تعاقب کر کے "حق گوئی" کا دینی فریضہ ادا کرتے جیسا کہ قبل ازیں کر چکے ہیں۔ چنانچہ حافظ ارشاد احمد صاحب دیوبندی نے کوثر نیازی صاحب کے رد میں اپنے مضمون کا عنوان ہی یہ منتخب کیا کہ "مولانا کوثر نیازی کا باپ گم ہوگیا ہے۔" —

اس پر گرفت کرتے ہوئے مولانا عبدالحق چوہان اپنے مضمون بہ عنوان "این گناہیست کہ در خانہ شما نیز کنند" میں لکھتے ہیں کہ!

"اس وقت نقیب ختم نبوت ملتان ماہ ذوالحج ۱۴۰۹ھ جولائی ۱۹۸۹ء پیش نظر ہے اس میں ایک مضمون بہ عنوان "امام خمینی کے انتقال پر مولانا کوثر نیازی کا شعر" خادم حسین شیخ اور ایک مضمون بہ عنوان "مولانا کوثر نیازی کا باپ گم ہو گیا ہے" محترم جناب حافظ ارشاد احمد دیوبندی ظاہر پیر کی طرف سے شریک اشاعت ہے۔ دونوں مضامین کا تعلق جناب کوثر نیازی کے اس فعل پر ہے کہ اس نے ایرانی سفیر کے پاس جا کر خمینی کی موت پر تعزیت کی اور تعزیتی کتاب میں یہ شعر تحریر کیا ہے۔

حال مادر ہجر رہبر کم تراز یعقوب نیست
اوپسر گم کردہ بود ما پدر گم کردہ ایم

ظاہر ہے ان دونوں حضرات کی یہ تحریر حمیت جذبہ اسلامی کے تحت ہے کیونکہ ان حضرات کو کوثر نیازی کے ساتھ کوئی مخاصمت نہیں اس لیئے ان حضرات کا یہ جذبہ مستحسن صد تحسین ہے خدا کرے مزید توفیق ہو کوثر نیازی کے عمل پر آپ کی تنقید صحیح اور بجا ہے لیکن کوثر نیازی کی شخصیت کوئی ایسی اہم شخصیت نہیں کہ جو تصلب دینی کے باعث نمایاں رتبے پر فائز ہو بلکہ وہ عام سیاسی مولوی ہے جس کی لچک دار شخصیت میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ہر حکومت وقت کے اقتدار میں جذب ہو جاتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی اگر آپ ان دیوبندی عمائد کے تاثرات پر تنقید کرتے جنہوں نے خمینی کی موت پر اس کے انقلاب کو "اسلامی انقلاب" سے تعبیر کیا ہے اور اس کو مرد مجاہد جیسے وقیع الفاظ سے تعبیر کیا ہے اس طرح کے جذبات کا اظہار کرنے والے کوئی ہما شما نہیں بلکہ وہ حضرات ہیں جن کو جمعیت علمائے اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل ہے ان حضرات کے ان لایعنی تاثرات کے اظہار پر آپ کا جذبۂ احساس کیوں موجزن نہیں ہوتا؟ یہ بے حسی صرف اس لیئے کہ آپ کے نام کے ساتھ بھی دیوبندی کا لاحقہ ہے اور وہ حضرات بھی اپنے آپ کو دیوبندی علماء مجاہدین کی طرف منسوب کرتے ہیں اگرچہ ان کے اعمال اس نسبت کی نفی کرتے ہیں۔

ایں گناہیست کہ در خانہ شما نیز کنند"۔ {ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان صفحہ ۵۵ اگست ۱۹۸۹ء}

جماعت اسلامی کے احباب اور اس کے رہنما بھی ایرانی انقلاب کو "اسلامی انقلاب" کا نام دیتے ہیں۔ علماء دیوبند نے بغیر کسی تاخیر کے ان کا خوب نوٹس لیا۔ چنانچہ ترجمان مسلک

علمائے دیوبند مولانا محمد عبداللہ صاحب مہتمم مدرسہ دارالہدیٰ بھکر و مدیر ماہنامہ انوار مدینہ لاہور لکھتے ہیں کہ:

"جماعت اسلامی کے نزدیک ایرانی انقلاب خالص اسلامی انقلاب ہے اور وہاں جو نظام حکومت ہے وہ مکمل اسلامی نظام ہے اور وہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسلامی نظام کا حصہ ہے اور اگر خدانخواستہ پاکستان میں خمینی صاحب کی ہدایات کے مطابق شیعہ لوگ انقلاب لانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور یہاں وہی دستور نافذ ہو جاتا ہے جو ایران میں نافذ ہے تو جماعت اسلامی کی یوم تاسیس سے لے کر آج تک کی جدوجہد اور تحریک کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ جماعت اسلامی کے رہنما خمینی صاحب کی ایسی زہریلی کتابوں کو بلند پایہ، سلجھی ہوئی اور اسلامی انقلاب کی بنیاد فرماتے ہیں اس سے جماعت اسلامی کی ذہنیت اور اس کی اصل حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کے بعد بھی کوئی ان کو اہل سنت میں شمار کرے تو اس کی سوچ اور فکر کا دیوالیہ پن ہی سمجھا جاسکتا ہے۔" (ماہنامہ انوار مدینہ لاہور صفحہ ۸۰، ستمبر ۱۹۸۶ء)

مولانا عبدالحق چوہان "ڈاکٹر محمد رشاد رفیق سالم کے مقدمہ منہاج السنۃ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

اس کتاب (منہاج السنۃ) پر ڈاکٹر محمد رشاد رفیق سالم کا مقدمہ ہے جو کہ انہوں نے ۱۰ محرم ۱۳۸۲ھ-۱۹۶۲ء کو مصر جدید میں اس کتاب کی اشاعت کے وقت تحریر کیا۔ اسی مقدمہ کے ضمن میں انہوں نے روافض کے بنیادی عقائد تحریر کر کے یہ بات واضح طور پر بیان کی ہے کہ اہل سنت اور روافض کے اختلاف کی نوعیت اصولی اور بنیادی ہے اس لیئے ان کے درمیان اتحاد ناممکن ہے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب کے اس گراں قدر مبحث کا افادہ عام کے لیئے اردو میں ترجمہ کیا ہے تاکہ عام لوگوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ اس اختلاف کی نوعیت بنیادی اور اصولی ہے فروعی نہیں۔ اگرچہ مولانا محمد منظور نعمانی کی تصنیف "ایرانی انقلاب" کی اشاعت کے بعد یہ بات واضح ہو چکی ہے لیکن پھر بھی ادائے فرض کی نیت سے ہم نے یہ ترجمہ کیا ہے کیونکہ ہمارے ملک میں جب بھی سیاسی فضاء میں تموج کے آثار پیدا ہوتے ہیں تو بعض علمائے کرام جن کے اذہان لادین سیاست کی وجہ سے زنگ آلود ہو کر مفلوج ہو چکے ہیں اہلسنت اور روافض کے اتحاد کا نعرہ لگاتے ہیں اور انہی علماء کے سٹیج سے یہ ڈرامہ بھی نشر ہو چکا ہے کہ اہل سنت کے ایک جید عالم نے ایک بدنام رافضی لیڈر کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ہاتھ بلند کیا اور ساتھ ہی یہ نعرہ لگایا کہ شیعہ سنی

بھائی بھائی اور یہ ارشاد بھی فرمایا کہ اہلسنت اور اہل تشیع ملت اسلامیہ کے سر کی دو آنکھیں ہیں۔

(ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان صفحہ ۳۰ اپریل ۱۹۹۹ء)

علمائے دیوبند کا خانقاہ سراجیہ کندیاں سے عقیدت کا گہرا تعلق ہے۔ خود مولانا مفتی محمود صاحبؒ اور مولانا فضل الرحمن صاحب بھی اس تعلق میں بندھے ہوئے ہیں۔ اس خانقاہ سے متعلق درج ذیل واقعہ ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے۔

"ایک مولوی صاحب حضرت ابوالسعد احمد خانؒ کے خلاف زبان درازی کرتے تھے جب حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحبؒ سے ملاقی ہوئے تو حضرت اقدس کے چہرے پر غیرت و جلال کے آثار نمایاں ہو گئے اور ان سے کہا بس مولوی صاحب زیادہ باتیں نہ کریں آپ ہمارے شیخ کے خلاف زبان درازی کرتے رہے ہیں اور ہمارے اکابر کا فرمان ہے

"ہر کہ با پیرے تو بد باشد تو باوے بد نباشی سگ از تو بہتر"

یہ فرماتے ہوئے حضرت اقدس کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے وہ مولوی صاحب چپکے سے اٹھے اور اپنا سامنہ لے کر چلے گئے۔ نعوذ باللہ من غضب الحلیم"

(تحفہ سعدیہ صفحہ ۳۰۲۔ مؤلفہ مولانا محبوب الٰہی صاحب خانقاہ سراجیہ کندیاں)

اگر موجودہ بزرگوں کے خلاف زبان درازی کرنے والوں کے متعلق غیرت و جلال کا مظاہرہ نہ کیا جائے تو ان کے بارے میں اکابرین کا ارشاد یہ ہے کہ "ہر کہ با پیرے تو بد باشد تو باوے بد نباشی سگ از تو بہتر" تو کیا گستاخان صحابہؓ کے خلاف غیرت و جلال کا مظاہرہ نہ کرنے والے اس جملے سے زیادہ کے حق دار نہیں ہوں گے؟

ے یہ مدعی اسلام تو ہیں ساتھی ہیں مگر بے گانوں کے
تقویٰ کی وہ بو ہی ان میں نہیں وہ رنگ نہیں ایمانوں کے

علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید لکھتے ہیں کہ: امت اسلامیہ کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ آج ہر انتشار و خلفشار کا داعی اتحاد و اتفاق کے بلند و بانگ دعوے کر رہا ہے۔ اہل مکر و دجل کی طرف سے اس لفظ کا استعمال اس قدر عام ہو گیا ہے کہ بہت سے سادہ لوح مسلمان ان کے فریب میں مبتلا ہو کر ان کے پھیلائے ہوئے جال کا شکار ہو چکے ہیں۔ چنانچہ قادیانی جو صلیبی استعمار کے پروردہ اور اسلام کے صاف و شفاف چہرے پر بدنما داغ ہیں وہ بھی اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں

تا کہ وہ اپنے زہر آلود عقائد کی نشر و اشاعت کے لئے راہ ہموار کر سکیں۔ اسی طرح بہائی جو کہ انگریز اور روس کی پیداوار ہیں وہ بھی اس لفظ کے پردے میں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے ہی شیعہ جو کہ یہودیوں کی اولاد اور اسلام کا نقاب اوڑھنے والا ایک یہودی گروہ ہے وہ بھی اپنے مکروہ چہرے کو چھپانے کیلئے اور انکشاف حقیقت کے خوف سے اس لفظ کا سہارا لیتا ہوا نظر آتا ہے تو اتحاد و اتفاق کا نعرہ در حقیقت ایسا کلمہ حق ہے جس کے در پردہ باطل چھپا ہوا ہے تا کہ اس خوبصورت نعرے کو بدترین مقاصد کیلئے ڈھال بنایا جا سکے۔

شیعہ فرقہ نے کچھ عرصہ سے مسلمان ممالک میں چھوٹے چھوٹے کتابچوں اور پمفلٹوں کی تقسیم کر رکھی ہے جن میں انہوں نے شیعہ سنی اتحاد کی طرف دعوت دی ہے اس سے ان کا مقصد اہلسنت کو شیعہ بنانا ہے تو یہ ہے وہ قبیح اور مذموم مقصد جو "اتحاد و تقریب" کے نعرے کے پس پردہ کار فرما ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی صاحب ایمان شخص قرآن کریم کے تقدس کو پامال کرنے والے اور تحریف قرآن جیسا کفریہ عقیدہ رکھنے والے سے فکری و نظری اتحاد کر لے اور ان کے ان کفریہ عقائد کی تردید کرنے کو وحدت امت کے خلاف تصور کر لے ایسا اتحاد یقیناً غیر فطری و غیر اسلامی ہے۔ کفار مکہ نے بھی حضور اکرم ﷺ سے ایسے اتحاد کا مطالبہ کیا تھا ان کے بتوں کا ابطال نہ کیا جائے اور شرک کی مذمت نہ کی جائے۔ مگر اس پر اللہ تعالیٰ کا واضح فرمان (سورۃ الکافرون) نازل ہوا ہے۔ ان آیات و احادیث کے مطالعہ کے باوجود بھی اگر کوئی شخص صحابہ کرامؓ کے خلاف اپنے سینے میں بغض و عناد رکھے تو اس سے اتحاد کرنا خلاف شریعت ہے۔ اسی طرح اگر یہ گروہ واقعی اتحاد بین المسلمین کا داعی ہے تو اس گروہ کو تحریف قرآن کے عقیدے سے تائب ہونا ہوگا اور یہ عقیدہ رکھنا ہوگا کہ موجودہ قرآن مجید ہر لحاظ سے مکمل ہے اور ہر قسم کی تحریف سے محفوظ ہے اور اس کی ترتیب وحی الٰہی کے مطابق ہے۔ شیعہ گروہ کو ایسے تمام افراد سے اظہار برأت کرنا ہوگا۔ جو اس قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں خواہ ان کے محدثین و مفسرین اور قدیم فقہاء مورخین ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ تحریف قرآن مجید کا عقیدہ اتحاد امت کے لئے زہر قاتل ہے۔ اسی طرح شیعہ گروہ کو تقیہ جو کہ کذب و نفاق کا دوسرا نام ہے سے بھی اظہار برأت کرنا ہوگا اور کذب و نفاق کو تقدس کا درجہ دینے کی بجائے کلیۃً اس سے اجتناب کرنا ہوگا۔ ان یہودی اور مجوسی عقائد سے توبہ کیئے بغیر "شیعہ سنی اتحاد" کا نعرہ محض فریب اور لایعنی ہی نہیں بلکہ امت

اسلامیہ کے خلاف ایک گھناؤنی سازش ہے اسی نعرے کی وجہ سے اس گروہ کو اہل اسلام کے خلاف سازشیں کرنے اور مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا موقع ملا۔ یہ نعرہ دراصل اسلام کو نقصان پہنچانے کیلئے راہ ہموار کرتا ہے۔ اس نعرے کی وجہ سے ہی یہودیوں اور مجوسیوں اور دوسرے اعدائے اسلام کو مسلمانوں کی صفوں میں گھس کر انہیں نقصان پہنچانے اور اسلامی عقائد کو مسخ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ (التوحید ملتان صفحہ ۱۰۵)

خطیب مسجد نبوی الشیخ علی عبدالرحمٰن الحذیفی فرماتے ہیں:۔

جس طرح یہودیت اور عیسائیت کا اسلام سے جوڑ اور اتحاد ممکن نہیں اسی طرح سے اہل سنت اور شیعوں کے درمیان اتحاد اور جوڑ ہر گز ممکن نہیں۔ اہل سنت تو قرآن کریم اور حدیث رسول ﷺ کے حامل ہیں ان کے ذریعے اللہ تبارک وتعالیٰ نے دین کی حفاظت فرمائی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہر دور میں اسلام کی سربلندی کیلئے جہاد کیا اور اپنے خون سے سنہری تاریخ رقم کی۔ جبکہ دوسری طرف روافض کا یہ حال ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ پر لعنت کرتے ہیں اور یوں دین اسلام کی بیخ کنی کرتے ہیں۔ بے شک صحابہ کرامؓ تو وہ عظیم شخصیات ہیں جن کے ذریعے ہم تک دین پہنچا ہے سو جو بدبخت ان پر لعن طعن کرے وہ دین اسلام کو منہدم کر رہا ہے۔

بھلا اہل سنت اور شیعہ میں اتحاد اور جوڑ کیسے ممکن ہے جب کہ شیعہ خلفائے ثلاثہ کو گالیاں دیتے ہیں اور ان شیعوں کا حضرت معاویہؓ پر لعن طعن کرنا درحقیقت حضرت حسنؓ پر طعن ہے اور یہ لوگ سیدہ عائشہ صدیقہؓ پر کس منہ سے لعنت بھیجتے ہیں حالانکہ ان کے ام المومنین ہونے کی تصریح خود رب العزت نے اپنے کلام میں کی ہے اور اہل سنت اور شیعوں کا اتحاد کیسے ممکن ہے جبکہ یہ روافض "امام الضلالت" گمراہی کے سردار خمینی کو معصوم کہتے ہیں اور یہ خود اس بات کا اقرار بھی کرتے ہیں کہ خمینی ان کے مہدی کا نائب ہے وہ مہدی جس کے بارے میں ان کا عقیدہ ہے کہ وہ ایک غار میں چھپے ہوئے ہیں چونکہ خمینی مہدی کا نائب ہے اور نائب کا حکم وہی ہوتا ہے جو اصل کا ہے۔ چنانچہ جب مہدی معصوم ہے اور نائب کا حکم وہی ہوتا ہے جو اصل کا ہے۔ چنانچہ جب مہدی معصوم ہے تو خمینی بھی معصوم ٹھہرا اور ان روافض نے صرف اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ یہ اپنے ہر فقیہ کی ولایت اور معصومیت کے بھی قائل ہیں۔

سو ان کو چاہئے کہ اپنے عقائد باطلہ سے فوراً توبہ کر کے دین اسلام میں داخل ہو جائیں

ورنہ ہم اہل سنت تو بال برابر بھی ان کے قریب نہیں ہو سکتے یہ لوگ اسلام کے حق میں یہود و نصاریٰ سے بھی زیادہ نقصان دہ ہیں ان پر کبھی بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان کے مکر و فریب سے دفاع کے لئے ہر وقت کمربستہ رہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "یہی لوگ اصل دشمن ہیں آپ ان سے ہوشیار رہیئے۔ اللہ انہیں غارت کرے کہاں پھرے چلے جا رہے ہیں"

(المنافقون نمبر ۴)

بے شک رفض کا نسب عبداللہ بن سبا یہودی اور ابولؤلؤ مجوسی سے جا ملتا ہے"۔

(خطبہ جمعہ مسجد نبوی بحوالہ نصرت العلوم جون ۱۹۹۸ء)

مسجد نبوی کے امام شیخ علی عبدالرحمٰن الحذیفی کے اس خطبہ جمعہ میں ایران کے سابق صدر رفسنجانی بھی موجود تھے مگر انہوں نے کسی مداہنت و مصلحت کے بغیر اہل تشیع کے عقائد و نظریات پر شدید تنقید کرتے ہوئے شیعیت کو اسلام کیلئے یہود و نصاریٰ سے بھی زیادہ خطرناک قرار دیا ہے۔ شیخ حذیفی کے اس شدید رد عمل کی وجہ ہفت روزہ ضرب مومن میں یہ بتائی گئی ہے:

شیخ حذیفی جیل سے رہا ہو کر "ابہا" تشریف لے گئے تو خصوصی مجلس میں امام مدینہ نے یہ انکشاف کیا کہ ایرانی صدر رفسنجانی سعودیہ کے دورے پر مدینہ پہنچا۔ حکومت نے مسجد نبوی کا دورہ میرے ذمہ لگایا میں رفسنجانی کو لے کر روضہ مقدسہ پر حاضر ہوا تو اس نے نبی کریم ﷺ کے سامنے حسب دستور درود پڑھا اور رک گیا میں نے کہا کہ آگے یہ حضرات شیخین ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہیں تو رفسنجانی نے (نقل کفر کفر نہ باشد) بے ساختہ کہا "اللہ یلعنہما" ان دونوں پر اللہ کی لعنت ہو (العیاذ باللہ) میں بہت سخت پریشان ہوا اور اس کی دیدہ دلیری پر میں حیرت میں ڈوب گیا۔ اگلے ہی دن جمعہ تھا۔ میں نے حق بیان کرنا فرض سمجھا لیکن امریکیوں کے خلاف جو بیان ہوا تو اس بارے میں سعودیہ کے طول و عرض میں بیشتر زبانوں پر جو بات ہے وہ یہ کہ رفسنجانی کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کی اگلی رات شیخ حذیفی نے ایک خواب دیکھا جس میں ان کو نبی کریم ﷺ کی زیارت ہوئی تو آپ ﷺ نے شیخ حذیفی سے فرمایا

میرے دروازہ پر میرے ساتھیوں پر لعنت بھیجی جا رہی ہے۔ میری مسجد کے ارد گرد یہود و نصاریٰ کی افواج نے محاصرہ کر رکھا ہے تمہاری زبانیں کب تک گنگ رہیں گی اور تم کب تک خاموش رہو گے۔

سعودیہ اور پاکستان کے کئی مستند علماء اس کا ذکر کر رہے ہیں مگر ابھی تک اس کی اس طرح تصدیق نہیں ہو سکی جس طرح "ابہا" سے ملنے والے رفسنجانی کے واقعہ کی تصدیق ہوئی۔

(ضرب مومن ۲۳ مئی تا ۲۹ مئی ۱۹۹۸ء بحوالہ ماہنامہ نصرت العلوم صفحہ ۴۹-۵۰ جون ۱۹۹۸ء)

ملک کے ممتاز عالم دین مولانا زاہد الراشدی صاحب شیخ الحدیث مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ شیخ حذیفی کے اس خطاب کے متعلق فرماتے ہیں:

"ہم نے یہ کیسٹ سنی ہے اور دل سے بے ساختہ ان کیلئے دعائیں نکلی ہیں کہ انہوں نے اس خطبہ جمعہ میں امریکہ، اسرائیل، مغربی ثقافت اور بین الاقوامی قوتوں کی اسلام دشمن سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ سنی شیعہ کشمکش کے حوالہ سے عالم اسلام کے دینی حلقوں کے جذبات کی جس جرأت کے ساتھ ترجمانی کی ہے سچی بات ہے کہ انہوں نے حق اور اہل حق کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دیں اور ہر قسم کی آزمائش اور ابتلاء سے ان کی حفاظت فرمائیں۔

ہم علمائے کرام سے گذارش کریں گے کہ وہ الشیخ علی حذیفی کا خطاب ضرور سنیں جس کی کیسٹ مدرسہ نصرت العلوم فاروق گنج گوجرانوالہ کے مدرس قاری محمد عبد اللہ صاحب سے حاصل کی جاسکتی ہے (اس خطاب کا مکمل اردو ترجمہ ماہنامہ نصرۃ العلوم جون کے شمارہ میں از صفحہ نمبر ۳۶ تا ۵۲ ملاحظہ فرمائیں) اور اس کے ساتھ الشیخ علی عبد الرحمٰن الحذیفی کیلئے خصوصی دعاؤں کا اہتمام کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں حفظ و امان میں رکھیں اور ہر طرح کی آزمائش و ابتلاء میں ثابت قدمی اور سرخروئی نصیب فرمائیں آمین یارب العالمین۔ (ماہنامہ نصرۃ العلوم صفحہ ۶۰-۶۱ مئی ۱۹۹۸ء)

جانشین امیر شریعت جناب ابو معاویہ سید عطاء المنعم شاہ صاحب بخاری فرماتے ہیں

"جس شخص نے توحید و رسالت کا اقرار کرنے کے باوجود صحابہ کی حرمت، عظمت اور عزت کا اعتراف نہیں کیا وہ سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن شریعت کا فہم، قرآن کا فہم، اسوہ رسول ﷺ کی حقیقت سے آشنائی قیامت تک اس کو نہیں آسکتی۔ صحابہ کو سمجھے گا نبی ﷺ سمجھ میں آجائے گا۔ نبی ﷺ سمجھ میں آجائے گا تو خدا سے آشنائی ہوگی۔" (الحق مئی صفحہ ۲۸ جلد)

"میں کہتا ہوں اے منافقین! امت کے نمک حرامو! ازواج و اصحاب رسول کے

غدارہو! اب بولو۔ پوری امت کو دھوکہ دینے والا۔ "ایران کا پوپ اعظم۔ مرگ بر امریکہ اور مرگ بر اسرائیل، امریکہ شیطان اکبر است" کہنے والا اور اندر سے اس کے ساتھ معاہدہ کر کے، ان سے اسلحہ خرید کر مسلمانوں کو قتل کرنے والا کون ہے؟ امریکہ شیطان اکبر ہے لیکن جس نے اس کی معرفت اسرائیل کا اسلحہ منگوایا اصل شیطان اکبر تو وہ ہے اور وہ "خمینی اور اس کا سبائی ٹولہ ہے۔

لیکن ہمارے بڑے بڑے بولنے والوں کی زبانیں بند ہیں۔ ان کو بھتہ اور وظیفہ بولنے نہیں دیتا۔ محرم میں ازواج و اصحاب رسول ﷺ بمعیت پوری امت کی تکذیب و توہین کرنے والی سراپا فتنہ تقاریر اور پیشاب پاخانہ سے زیادہ مکروہ اور پلید کیچڑ جس پر خدا کی لعنت برستی ہے جو ازواج و اصحاب رسول کو گالیاں دے کر پکایا اور بے غیرت و دیوث مسلم نما منافقین لیڈروں، لکھاریوں اور ایڈیٹروں کو کھلایا جاتا ہے در اصل وہ انہیں بولنے نہیں دیتا۔ تو جن کے منہ میں خنزیر کی بوٹی ہے اب وہ نہیں بولتے۔ اب بولیں وہ مولوی جو "شربت اور شراب دودھ اور پیشاب، بکرے اور سوئر" کے اس اتحاد کی "کفر آمیز" دعوت دیتے پھرتے ہیں۔ اب وہ ادیب اور شاعر بولیں جو علیؓ اور حسینؓ کو رسول ﷺ سے بڑھا کر بلکہ "خدا بنا کر" کفریہ قصائد و مناقب اور مراثی لکھ لکھ کر تبرائیوں کو خوش کرتے ہیں اور حقیقتاً اپنے لئے دوزخ کی سیٹیں ریزو کرا رہے ہیں۔ اب بولیں وہ جھوٹے مصنف، آتھر، اخبار نویس کہ جو سارا سال نام نہاد آل رسول ﷺ کی تعریف کے پردہ میں صحابہؓ کو گالیاں دلواتے ہیں لیکن ان کے ماتھے پر ازواج و اصحاب کے عطا فرمودہ دین کا ممنون ہو کر بھی غیرت و ندامت کے پسینہ کا قطرہ تک نمودار نہیں ہوتا۔ سارا سال سب و تبرا کرنے اور کرانے والے ان کے بھائی ہوں گے لیکن ایسا کوئی "خبیث و ملعون شخص اور فرقہ" ہرگز ہرگز ہمارا بھائی نہیں۔ لیکن ہمارا "تکر گدا واعظ" جو طرز فکر اور عمل کے لحاظ سے "بھنگی" چرسی اور "متعہ باز ذاکر" بن چکا ہے۔ ہمارا بد دیانت دانشور اور مقالہ نویس ایران کے ذاکر، پادریوں اور مجتہد پوپوں کو خوش کر کے انعام حاصل کرنے کے لئے اپنا بھتہ بنانے اور خنزیر سے زائد پلید رزق اور مال بٹورنے کے لئے اور اپنی مذہبی نوکری پکی کرنے کے لئے محرم میں اپنی خرافات مقبول بنوانے کی سہولت حاصل کرنے کے لئے وہ رافضیوں کی طرح مسلسل ج[illegible]رث کی نجا[illegible] [illegible]نا رہا ہے۔ یاد رکھو۔ یہ جرم نہ یہاں معاف ہو گا اور نہ قیامت کے دن معاف ہو گا۔ اس کی سزا ملے گی اور وہ منافقین کے لئے دائمی دوزخ سے کم نہیں ہو گی۔ مجھ سے سب کہتے ہیں جناب تھوڑی سی نرمی کریں۔ بے شک

امیر معاویہؓ بھی صحابی ہے لیکن علی علی ہے۔ میں کہتا ہوں۔ انکار علیؓ کی ذات میں نہیں انکار تو صحابہ کی دشمنی میں ہے۔ علیؓ کے ساتھ چکر کیوں ڈالتے ہو؟ حسنؓ و حسینؓ کا غلط واسطہ دے کر قوم کو گمراہ کیوں کرتے ہو؟ جب یہ کہا جائے تو کہتے ہو دیکھا جناب علیؓ کے خاندان کی کیسی توڑ پھوڑ کر رہا ہے؟ توبہ توبہ علیؓ کے خاندان کی جوتی بھی میرے لئے قابل احترام ہے لیکن کافر کو کافر کہوں گا چاہے میرا باپ ہو، چاہے علی کا باپ ہو، چاہے کسی کا باپ ہو۔ نبی ﷺ کی شریعت اور خدا کا قانون بھی کہتا ہے کہ: "مومن کو کافر کہنا بھی کفر ہے اور کافر کو مومن کہنا اس سے بھی بڑا کفر ہے"

{مطلوع سحر جلد اول صفحہ ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۲۵}

شیعہ کے دجل اور مکر و فریب کو سمجھنا ہمارے ادیبوں، دانشوروں، صحافیوں اور سیاسی مولویوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان کے تبرا کا انداز ملاحظہ فرمائیں۔

امام جعفر صادق کے سامنے ایک مخالف نے ایک شیعہ سے سوال کیا کہ تو اصحاب عشرہ کے بارے میں کیا کہتا ہے اس نے جواب دیا کہ میں ان کو اس خیر جمیل سے یاد کرتا ہوں جس کے باعث خدا میرے گناہوں کو معاف کرے اور میرے درجات کو بلند کرے۔ یہ جواب سن کر وہ سائل بولا۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھ کو تیرے بغض سے نجات دی میں تو تجھ کو بعض صحابہ کے بارے میں رافضی سمجھتا تھا۔ تب اس شخص نے کہا آگاہ ہو جو کوئی ان میں سے ایک کے ساتھ بغض رکھے اس پر خدا کی لعنت ہو۔ مخالف بولا شاید تو کچھ تاویل کرتا ہے۔ تو اس شخص کی بابت کیا کہتا ہے جو اصحاب عشرہ سے بغض رکھے اس پر شیعہ نے جواب دیا جو کوئی عشرہ یعنی دسوں سے دشمنی رکھے اس پر خدا اور فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔ یہ بات سنتے ہی وہ شخص اٹھ کھڑا ہوا اور دوڑ کر اس شیعہ کے سر پر بوسہ دیا اور کہنے لگا کہ میں نے جو تجھ کو آج سے پہلے رافضی ہونے کی تہمت لگائی تھی اس سے مجھ کو معاف کر اور میری خطا بخش دے۔ شیعہ نے کہا میں نے تجھ کو معاف کیا اور تو میرا بھائی ہے۔

بعد ازاں وہ شخص وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد حضرت علیہ السلام نے اس مومن سے فرمایا۔ شاباش۔ جزاك الله۔ کیا خوب جواب دیا تیرے حسن توریہ اور عمدہ تلطف نے (جس نے تجھ کو اس (سنی) کے ہاتھ سے چھڑ لیا اور تیرے دین میں کچھ رخنہ اندازی نہ کی) فرشتگان سماوی کو نہایت متعجب کیا۔ خدا نے ہمارے مخالفوں کے لئے نہایت رنج و الم بڑھایا اور

ہمارے دوست داروں کی مراد کو ان کے تقیہ میں ان سے مخفی رکھا۔ حضرت کا یہ ارشاد سن کر بعض اصحاب نے عرض کی اے فرزند رسول ﷺ ہماری رائے میں تو اس کا کلام اس ناصبی اور دشمن خدا و رسول ﷺ کے موافق ہی تھا۔ حضرت علیہ السلام نے جواب دیا کہ اگر تم اس کی مراد کو نہیں سمجھتے تو ہم تو سمجھتے ہیں اور خدا اس کا شاکر ہے۔ کیونکہ ہمارا دوست جو ہمارے دوستوں کا دوست اور ہمارے دشمنوں کا دشمن ہوتا ہے جب خدا اس کو امتحاناً مخالفان دین کے ساتھ مبتلا کرتا ہے تو اس کو ایسے جواب کی توفیق عطا کرتا ہے جس میں اس کا دین اور عزت سلامت رہیں اور اللہ تعالیٰ اس تقیہ کے عوض اس کو ثواب عظیم عطا فرماتا ہے۔ دیکھو تمہارے اس رفیق نے پہلے یہ کہا تھا کہ "جو کوئی ان میں سے ایک کو دشمن رکھے اس پر خدا کی لعنت ہو یعنی جو کوئی ان میں سے ایک کو عیب لگائے اور وہ امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ہیں اور اس نے دوسری دفعہ یہ کہا تھا کہ "جو کوئی ان دسوں کو عیب لگائے یا گالی دے اس پر خدا کی لعنت ہو" اور یہ اس نے سچ کہا کیونکہ جس نے ان دسوں کو عیب لگایا اس نے علی علیہ السلام کو بھی بلا ریب عیب لگایا اس لئے کہ وہ بھی اس تعداد میں شامل ہیں اور جب علی علیہ السلام کو عیب نہ لگایا اور ان کی مذمت نہ کی تو ان سب کو عیب نہ لگایا بلکہ صرف بعض کو معیوب ٹھہرایا.......

امام علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھ سے ایک شخص نے بیان کیا کہ ہم امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھے۔ اسی اثنا میں ایک شخص نے حاضر خدمت ہو کر عرض کی۔ اے فرزند رسول آج میں ایک شخص سے جو ہمارے ساتھ رہتا تھا اور ہم سے کہتا تھا کہ میں محب آل محمد ﷺ ہوں اور ان کے دشمنوں سے بیزار ہوں ایک عجیب بات دیکھی۔ آج کے دن میں نے اس کو دیکھا کہ خلعت شاہی پہنے ہے اور بغداد میں پھرایا جا رہا ہے اور اس کے آگے آگے کچھ لوگ پکار پکار کر کہتے جاتے ہیں۔ اس رافضی کی توبہ سنو۔ پھر اس سے کہتے ہیں کہ کہہ تب وہ کہتا ہے کہ "خَيْرُ النَّاسِ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اَبَا بَكْرٍ۔" جب وہ کہہ چکتا ہے تو وہ لوگ نہایت غل مچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس نے رافضی ہونے سے توبہ کی ہے اور ابوبکر کو علی بن ابی طالب علیہ السلام پر فضیلت دی ہے۔ حضرت علیہ السلام نے اس شخص سے فرمایا کہ خلوت میں مجھے اس بات کو ذکر کرنا۔ جب خلوت ہوئی تو اس نے پھر عرض کی۔ حضرت علیہ السلام نے فرمایا۔ میں نے اس لئے ان بے وقوف لوگوں کے سامنے اس شخص کے کلام کی تفسیر نہیں بیان کی کہ ایسا نہ ہو کوئی جان

کر ان مخالفوں سے کہہ دے اور وہ اس کے حال سے واقف ہو جائیں اور اس کو ایذا پہنچائیں۔

دیکھو اگر اس شخص نے یہ کہا ہوتا۔ "خَیرُ النَّاسِ بَعدَ رَسُولِ اللّٰہِ اَبُو بَکر" تو بے شک ابوبکر کو علیؑ پر فضیلت دیتا لیکن اس نے تو یہ کہا ہے کہ "خیر الناس بعد رسول اللہ ابابکر" یعنی اے ابوبکر۔ رسول خدا کے بعد سب آدمیوں سے بہتر...... اور اس سے وہ مطلب نہیں نکلتا جو عوام سمجھتے ہیں اور یہ اس لئے کیا گیا تا کہ عام جہال جو اس کے سامنے جا رہے ہیں خوش ہو جائیں اور وہ ان کی شرارتوں سے محفوظ رہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے توریہ کو ہمارے شیعوں اور محبوں کا محافظ مقرر کیا ہے۔

کسی شخص نے امام محمد تقی علیہ السلام سے عرض کی کہ اے فرزند رسول ﷺ میں جو آج محلہ کرخ سے گذرا تو لوگوں نے مجھے دیکھ کر کہا کہ یہ شخص محمد ابن علی علیہ السلام امام روافض کا ہم نشین ہے۔ اس سے پوچھو کہ رسول خدا کے بعد سب سے بہتر کون ہے؟ اگر اس نے جواب دیا کہ علی علیہ السلام بعد رسول خدا سب سے بہتر ہے تو اس کو قتل کرنا اور اگر کہا کہ ابوبکر ہے تو چھوڑ دینا۔ غرض ایک جمعیت کثیر نے مجھ پر ہجوم کیا اور مجھ سے سوال کیا کہ بعد رسول مختار خیر الناس کون شخص ہے؟ تب میں نے ان کو جواب دیا کہ "خَیرُ النَّاسِ بَعدَ رَسُولِ اللّٰہِ ابو بکر و عمر و عثمان" (تینوں ناموں کو مقام استفہام میں کہا اور اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور علی علیہ السلام کا نام نہ لیا۔ یہ سن کر بعض کہنے لگے کہ یہ تو ہم پر فوقیت لے گیا ہم تو اس جگہ علی علیہ السلام کو بھی ذکر کرتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اس میں مجھ کو کچھ تامل ہے میں یہ نہیں کہنے کا (میں یہ نہیں کہوں گا) تب وہ باہم کہنے لگے کہ یہ تو ہم سے بھی زیادہ متعصب ہے۔ ہمارا خیال اس کی نسبت غلط نکلا۔ یہ کہہ کر وہ سب چلے گئے اور اس طرح سے میں نے ان کے پنجے سے رہائی پائی۔ اے فرزند رسول ﷺ۔ اس میں میرا کچھ حرج تو نہیں ہوا۔ اس فقرے سے میرا مقصود استفہام تھا نہ کہ اخبار یعنی "کیا رسول خدا کے بعد فلاں وفلاں وفلاں سب سے بہتر تھے؟ حضرت علیہ السلام نے اس سے فرمایا خدا تیرے اس جواب کا شاکر ہوا اور اس کا اجر تیرے لئے لکھا اور اس کو کتاب حکیم یعنی لوح محفوظ میں ثبت کیا اور تیرے اس جواب کے ہر حرف کے عوض اس قدر چیزیں تیرے لئے واجب کیں کہ تمنا کرنے والوں کی تمنائیں اس سے قاصر ہیں اور آرزومندوں کی آرزوئیں وہاں تک نہیں پہنچتیں۔

ایک شخص نے امام علی نقی علیہ السلام کی خدمت بابرکت میں عرض کی آج میں شہر کے عام لوگوں کی ایک جماعت میں جا پھنسا اور انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور کہنے لگے اے شخص "کیا تو ابوبکر بن ابوقحافہ کی امامت کا قائل نہیں ہے"؟ اے فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی یہ بات سن کر میں ڈرا اور میں نے "نہیں" کا ارادہ کر کے از روئے تقیہ کہہ دیا کہ ہاں اس کا قائل ہوں۔ تب ان میں سے ایک اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ کر بولا تو تحریف کر کے کلام کرتا ہے۔ جو میں تجھے بتاؤں اس طرح سے لوگوں کو جواب دے۔ میں نے اس سے کہا کہ کہہ۔ تب اس نے مجھ سے کہا "کیا تو قائل ہے کہ ابوبکر بن ابی قحافہ رسول خدا کے بعد امام حق و عدل ہے؟ اور علی علیہ السلام کا امامت میں بے شک کوئی حق نہیں ہے"۔ میں نے اس کے جواب میں "نعم" اور اس کو ہاں کے معنی میں نہیں رکھا تھا بلکہ اس سے "اونٹ، گائے، بھیڑ" وغیرہ چوپائے جانور مراد لی تھی۔ وہ شخص بولا میں اس پر بس نہ کروں گا جب تک تو قسم نہ کھائے۔ اب تو اس طرح کہہ کہ "میں اس خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے اور وہ طالب اور غالب اور ذلت دینے والا اور پالنے والا اور ہلاک کرنے والا اور پوشیدہ اور ظاہر کا یکساں جاننے والا ہے" میں نے جواب دیا "نـعـم" اور میری اس کے کہنے سے چوپایہ مراد تھی نہ کہ ہاں۔ پھر اس نے کہا کہ میں اس پر بھی بس نہیں کرتا کہ جب تک تو یوں نہ کہہ کہ "قسم ہے اس خدا کی کہ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے اور لمبی قسم کھا کر نہ کہے کہ ابوبکر بن ابوقحافہ ہی امام ہے" تب میں نے جواب دیا کہ ابوبکر بن ابوقحافہ امام ہے۔ ہاں وہ اس شخص کا امام ہے جو اس کا پیرو ہو اور اس کو امام مانے۔ یہ سن کر وہ خاموش ہوئے اور مجھ کو "جزاك الله خيرا" کہا اور میں نے ان کے پنجے سے نجات پائی۔ یا حضرت علیہ السلام اب فرمایئے خدا کے نزدیک میرا کیا حال ہے فرمایا تیرا حال نیک ہے۔ خدا نے تیرے عمدہ تقیہ کے عوض اعلیٰ علیین میں تجھ کو ہمارا رفیق اور ہم نشین کیا۔

ابو یعقوب اور علی راویان تفسیر روایت کرتے ہیں کہ ایک دن ہم امام حسن عسکری علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھے کہ حضرت کے ایک اصحاب نے عرض کی کہ ہمارا ایک شیعہ بھائی جہال عامہ میں مبتلا تھا اور وہ امامت کے باب میں اس کی آزمائش کرتے تھے اور اس کو قسمیں دلاتے تھے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ہم کیا تدبیر کریں جو ان کے ہاتھ سے خلاصی ہو۔ میں نے پوچھا وہ کیا کہتے ہیں؟ وہ بولا مجھ سے کہتے ہیں "اے شخص کیا تو قائل ہے کہ رسول خدا کے بعد

فلاں ہی امام ہے؟" پس مجھ کو "نَعَم" کہنے کے سوا اور کچھ بن نہیں پڑتا اور نہ وہ مجھے مارتے ہیں اور جب میں نے نَعَم کہا تو بولے کہ "وَاللّٰہ" کہہ۔ تب میں نے کہا نَعَمْ اور میرا منشا اس نَعَم کے کہنے سے اونٹ، گائے، بھیڑ وغیرہ چوپائے جانور تھا۔ میں نے اس شخص سے کہا کہ جب وہ "واللّٰہ" کہلائیں تو "وَلِّیْ" (جیسے وَلّٰی زَیْدٌ عَنْ اَمْرٍ کَذَا۔ یعنی زید فلاں کام سے پھر گیا) کہہ دیا کر وہ اس کو تمیز نہ کر سکیں گے اور تو سلامت رہے گا۔ یہ سن کر اس نے مجھ سے کہا کہ اگر وہ میری اس بات کو معلوم کرلیں اور کہیں کہ "وَالــلّٰــہ" کہہ اور "ہاء" کو ظاہر کر۔ میں نے جواب دیا کہ "وَاللّٰہُ" بہ ضمہ ہائے کہہ دیا کر۔ کیونکہ جب ہا پر کسرہ نہ ہوگا تو قسم میں داخل نہ ہوگا۔ یہ سن کر وہ چلا گیا اور واپس آکر کہنے لگا کہ انہوں نے اس امر کو میرے سامنے پیش کیا اور مجھ کو قسم دلائی اور جس طرح تو نے تعلیم دی تھی میں نے اسی طرح سے کیا۔

اس شخص کی یہ تقریر سن کر حضرت علیہ السلام نے اس سے فرمایا کہ تو بموجب حدیث جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم "الدَّالُّ عَلَی الْخَیْرِ کفاعلہ" گویا خود اس فعل کا عمل میں لانے والا ہے۔ خدا نے تیرے اس ساتھی کے لئے اس تقیہ کے عوض اس قدر نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں درج کیں کہ ان کی تعداد ہمارے تقیہ کرنے والے شیعوں اور محبوں اور دوستوں کے مقام تقیہ میں استعمال کردہ الفاظ کے حروف اور ان تقیہ کرنے والوں کی تعداد کے برابر ہے کہ اگر صد سالہ گناہ بھی ان میں سے ایک ادنیٰ نیکی کے مقابل ہوں تو البتہ معاف ہو جائیں اور چونکہ تو نے اس کو ہدایت کی ہے اس لئے تجھ کو بھی اس کی مانند ثواب ملا۔ (آثار حیدری صفحہ ۳۲۶،۳۲۷ امامیہ کتب خانہ لاہور)

سیاسی مولویوں کا تو کیا ذکر؟ (الا ماشاء اللہ) جن علماء کا اس "راہ" سے کبھی گذر ہی نہیں ہوا اور انہوں نے نہ تو شیعیت کا کبھی مطالعہ کیا اور نہ ہی اہل تشیع سے ان کا کبھی واسطہ پڑا وہ بھی صحیح معنوں میں شیعیت کی حقیقت اور عقائد شیعہ سے آگاہ نہیں ہو سکے خود حضرت مولانا محمد منظور نعمانی (جنہوں نے شیعیت اور خمینیت کے فتنے کو دنیا بھر میں اجاگر کیا) اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس موقع پر راقم سطور اس واقعی حقیقت کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ ہمارے عوام اور کالجوں، یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ حضرات اور صحافیوں اور دانشوروں کا کیا ذکر ہم جیسے لوگ جنہوں نے دینی مدارس اور دارالعلوموں میں دینی تعلیم حاصل کی ہے اور "عالم دین" کہے اور سمجھے جاتے ہیں عام طور سے شیعہ مذہب کے بنیادی اصول وعقائد سے بھی واقف

نہیں ہوتے۔ سوائے ان کے جنہوں نے کسی خاص ضرورت سے ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہو۔ خود اس عاجز راقم سطور کا حال یہ ہے کہ اپنی مدرسی تعلیم اور اس کے بعد تدریس کے دور میں بھی شیعہ مذہب سے میں اس سے زیادہ واقف نہیں تھا جتنا ہمارے عام پڑھے لوگ واقف ہوتے ہیں (اور واقعہ یہ ہے کہ اس کو واقفیت سمجھنا ہی غلط ہے) لیکن جس حال میں ایرانی انقلاب کے سلسلہ کے اس پروپیگنڈے کو جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور اس کے اثرات کو دیکھ کر اس موضوع پر لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا اور میں نے اس کو دینی فریضہ سمجھا تو شیعیت سے ذاتی اور براہ راست واقفیت کے لئے میں نے مذہب شیعہ کی بنیادی اور مستند کتابوں کا اور خود امام خمینی کی تصانیف کا مطالعہ ضروری سمجھا۔ چنانچہ گذشتہ قریباً ایک سال میں۔ اس حالت میں کہ عمر اسی سے متجاوز ہو چکی ہے۔ ان کتابوں کے کئی ہزار صفحات پڑھے اور اب معلوم ہوا کہ میں شیعہ مذہب کے اچھا حصے سے بھی واقف نہیں تھا اور اس مطالعہ ہی سے یہ بات سامنے آئی کہ خمینی کے برپا کئے ہوئے ایرانی انقلاب کی حقیقت و نوعیت کو شیعیت سے اچھی واقفیت کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیونکہ مذہب شیعہ کا بنیادی عقیدہ "امامت" اور امام آخر الزمان مہدی منتظر کی "غیبت کبریٰ" کا شیعی عقیدہ و نظریہ ہی اس انقلاب کی اساس و بنیاد ہے"۔ (ایرانی انقلاب صفحہ ۳۲)

اللہ کرے کہ ہمارے سیاست سے وابستہ علماء شیعیت کی حقیقت کو اب بھی سمجھ جائیں اور یہ یقین کرلیں کہ "شیعہ سنی اتحاد اسلامی انقلاب کے لئے بنیادی جزو کی حیثیت ہرگز نہیں رکھتا، ان کے مابین عدم اتحاد سے انقلاب اسلامی کی منزل بالکل دور نہیں ہوگی بلکہ قریب ہوگی اور ان کے ساتھ اتحاد کے نتیجے میں جو نظام نافذ ہوگا وہ "دین اکبری" تو ہو سکتا ہے لیکن دین الٰہی اور نظام مصطفیٰ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

۔ فان کنت لا تدری فتلك مصیبة — وان کنت تدری فالمصیبة اعظم

۔ خلق اللہ للحروب رجالا — و رجالا للقصعة و الثرويد

۔ اک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک — اک عرض تمنا ہے سو وہ ہم کرتے رہیں گے

پیر سید نصیر الدین نصیر گیلانی (آف گولڑہ شریف) فرماتے ہیں:

"شیعہ اور خوارج کبھی اہل سنت والجماعت سے اتفاق و اتحاد کرنے کے حق میں نہیں۔ بلکہ ان کو اپنے عقیدے کے مطابق دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں اور صرف خود پر اکتفا

مومن کے اطلاق کو درست تصور کرتے ہیں۔آج کل بعض خودغرض، شیعہ سنی کے اتفاق و اتحاد کا علم اٹھائے ہوئے ہیں۔کانفرنسیں اور جلسے کرتے ہیں اور ہمارے اکثر سنی ان مجالس میں شرکت کو امام حسینؓ کے نام کی وجہ سے باعث برکت و رحمت سمجھتے ہیں۔ان پر واضح ہو کہ شیعہ اور خارجی ہرگز سنیوں کے بھائی نہیں بن سکتے اور سنیوں کے خلاف ان کے دلوں میں جو زہر بھرا ہوا ہے اسے وہ کبھی نکال نہیں سکتے۔حضرت امام حسینؓ کے نام پر شیعہ سادہ لوح سنیوں کو اپنی مجالس میں دعوت شرکت دیتے ہیں اور سنی ہیں کہ سر کے بل چل کر جاتے ہیں۔اگر سنیوں کی طرح شیعہ بھی صاف دل ہوتے تو جواباً سنیوں کی مجالس ذکر و فکر میں ضرور شرکت کرتے۔عقیدتاً نہ سہی۔رسماً ہی سہی۔مگر آپ نے کبھی دیکھا کہ کوئی شیعہ صدیق اکبرؓ کانفرنس، فاروق اعظمؓ کانفرنس یا ذوالنورینؓ کانفرنس میں شریک ہوا ہو اور اگر کبھی کسی مجبوری کی بناء پر ایسی مجالس میں پھنس بھی جائیں تو تقیہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں کیونکہ تقیہ ان کے ہاں عبادت کبریٰ ہے۔اگرچہ اس کے معنی کچھ اور ہی ہیں۔منافقت بھی تو تقیہ ہے۔گویا دل میں کچھ اور ہو اور ظاہر کچھ اور کیا جائے۔فرمایئے! اگر منافقت اس کو نہیں کہتے تو پھر منافقت کی تعریف کیا ہوگی؟ مطلب یہ ہے کہ اہل السنت کو حتی الامکان ان سے دور رہنا چاہئے۔بقول سید اکبر الہ آبادی

کھٹملوں پر زجر و طعن وغیظ سے منہ موڑیئے　　گرم پانی ڈالئے یا چارپائی چھوڑیئے

اگر یہ ہمیں کافر جانتے ہیں تو پھر ہم انہیں کیوں مسلمان گردانیں بقول حضرت امیر مینائی

جو تجھے بھول گئے تجھ کو بھی لازم ہے امیر　　خاک ڈال، آگ لگا، نام نہ لے یاد نہ کر

جو نام نہاد ذوات صدیق اکبرؓ، فاروقؓ، عثمان ذوالنورینؓ اور امہات المومنینؓ کی ذوات مقدسہ کے حق میں آج تک پاک نہ ہو سکے، وہ سنی المسلک اولیاء اللہ کے حق میں۔کس طرح اپنی ذہنیت کو پاک اور اپنے ضمیر کو صاف کر سکتے ہیں کیونکہ مؤخر الذکر حضرات (اولیاء) کا مقام مقدم الذکر صحابہؓ و امہاتؓ سے بڑھ کر تو نہیں ہو سکتا۔

کچھ شیعہ عقائد کے متعلق

اگرچہ شیعہ عقائد اب کوئی ایسی ڈھکی چھپی چیز نہیں جس سے اہل علم باخبر نہ ہوں۔تاہم یہاں امت مسلمہ کے ان افراد کے لئے شیعہ کے بعض عقائد کا اجمالی ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جو ابھی تک اپنی سادہ لوحی یا کم علمی کے سبب نابلد ہیں۔تاکہ عوام انہیں پڑھ کر کم از کم یہ اندازہ

تو کیا میں کہ کیا ایک مسلمان کے عقائد یہی ہونا چاہئیں؟۔ قارئین خود فیصلہ دیں کہ کیا کسی مسلمان کے ایسے عقائد ہو سکتے ہیں؟

اس کے بعد پیر صاحب نے قرآن مجید، رسالت، سیدہ عائشہ صدیقہؓ، اصحاب رسولؐ اور اہل بیت کے متعلق شیعہ عقائد تحریر کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ {نام و نسب از صفحہ ۲۶۵ تا صفحہ ۴۸۴}

موصوف ذیر عنوان "چند شیعوں سے ایک لطیف علمی مکالمہ" لکھتے ہیں۔

"ایک مرتبہ دو تین شیعہ جو اہل بیتؑ کی تعریف کے سبب میری بڑی عزت کرتے اور ہاتھ چومتے تھے آ گئے۔ دوران گفتگو ان میں سے ایک صاحب جو بڑے تعلیم یافتہ، تاریخ و ادب کے عالم اور تیز ذہن کے مالک تھے باتوں باتوں میں مجھ سے دریافت کرنے لگے کہ پیر صاحب میرے ذہن میں مدت سے ایک سوال انگڑائیاں لے رہا ہے۔ بڑے بڑے سنی دوستوں اور علماء سے پوچھا مگر آج تک کوئی مسکت اور شافی جواب نہیں ملا۔ آپ علمی خانوادے کے فرد ہیں ہو سکتا ہے میرے سوال کا آپ کے پاس کوئی جواب شافی ہو۔ میں ذرا فکر مند سا ہوا کہ اب یہ صاحب اصحاب ثلاثہ یا اسی قسم کے کسی نزاعی مسئلہ کو چھیڑنے کے درپے نظر آتے ہیں۔ بہرحال میں نے کہا کہ جناب ارشاد فرمایئے! کہنے لگے کہ اکثر سنی ہی شیعہ کی مجالس میں آتے جاتے اور پھر شیعہ مذہب اختیار کر کے شیعہ بن جاتے ہیں آپ کو کوئی شیعہ، سنیوں کی مجالس میں جاتے ہوا نظر نہیں آئے گا اور نہ سنی بنتے ہوئے دکھائی دے گا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ دراصل اس سوال سے شیعہ مذہب کی صداقت و حقانیت کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں کہ اس مذہب کی صداقتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ نتیجۃً دوسرے مسالک کے افراد بلا تامل اسے قبول کر کے شیعہ بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس سنیوں کا ایسا مذہب ہے جسے کوئی دوسرا فرقہ بالعموم اور شیعہ مسلک بالخصوص کبھی قبول نہیں کرتا۔ ان کے اس سوال نے میرے ذہن پر تازیانے کا کام کیا اور فی البدیہہ ایسا جواب پیش کیا کہ وہیں ٹھنڈے ہو گئے اور توبہ توبہ کرتے ہوئے چلتے بنے۔ میں نے کہا۔ آپ کا اس سوال سے یہی مدعا ہے نا کہ اگر شیعہ مذہب جھوٹا ہے تو سنی کیوں شیعہ بنتے ہیں؟ کہنے لگے ہاں۔ میں نے کہا کہ "ہمیشہ انسان ہی شیطان بنتا ہے، شیطان کبھی انسان نہیں بن سکتا" یعنی یہ تو سب کہتے ہیں کہ دیکھو دیکھو فلاں انسان شیطان بن گیا مگر آج تک کسی کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ دیکھو آج شیطان انسان بن گیا۔ لہٰذا کوئی سنی اگر بدقسمتی سے کبھی شیعہ

بن جائے تو یہی سمجھئے کہ ایک انسان تھا جو اب شیطان بن گیا اور اگر کوئی شیعہ یا کسی اور مسلک کا آدمی سنی نہیں بنتا تو یہی سمجھیے کہ کیا کبھی شیطان بھی انسان بنا؟ خیر یہ جواب سنتے ہوئے وہ لوگ تو رخصت ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد ملاقات ہوئی تو کہنے لگے تمہاری ذہانت اور طباعی کو دیکھتے ہیں تو تھا چومنے کو جی چاہتا ہے مگر جب یہ دیکھتے ہیں کہ تم نے محاوراتی آڑ لے کر ہمیں شیطان بنا دیا تو بات کرنے کو بھی جی نہیں کرتا۔ میں نے کہا جناب دیکھا اپنی باری کتنی تکلیف ہوتی ہے آپ کی کتابوں میں جب سیدہ عائشہؓ ابو بکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ اور عثمان غنیؓ جیسی ذوات مقدسہ کے لئے شیطان سے بھی بدتر الفاظ استعمال کئے گئے اور پھر آپ لوگ اپنی نجی محفلوں میں جی کھول کر تبرا بازی کرتے ہیں اور ہم انسانیت نواز لوگ پھر بھی آپ سے سلسلہ مراسم نہیں توڑتے۔ جب آپ صحابہ جیسی جلیل القدر ہستیوں کے لئے ہزار بار شیطان اور فاسق و فاجر کے الفاظ بول سکتے ہیں تو زندگی میں ان کے کسی ایک باضمیر اور نمک حلال غلام نے اگر صرف ایک بار آپ کو شیطان کہہ دیا تو کون سی قیامت آگئی۔

مانا کہ وہ نازک ہیں وہ نازوں کے پلے ہیں ہم کیوں نہ جلائیں انہیں، ہم بھی تو جلے ہیں

اگر امہات المومنین اور اصحاب ثلاثہؓ کے لئے آپ کے دل میں کسی قسم کے احترام کی گنجائش نہیں تو ہم جو اُن سے محبت و عقیدت رکھتے ہیں ہمارے سامنے کم از کم ان کی شان میں سخت سست الفاظ اپنے دہن سے نہ نکالا کریں۔ جس طرح آپ اپنے بارے میں صرف ایک بار یہ لفظ سن کر بھڑک اٹھے اسی طرح اگر صحابہ کرامؓ کے متعلق آپ ایسے نازیبا الفاظ استعمال کریں گے تو ہمارا بھڑک اٹھنا کون سا محال عادی ہے"؟ (تاہذب صفحات ۴۷۲،۴۷۳)

حضرت پیر صاحب زیر عنوان "اہل السنت والجماعت کے متعلق عقائد شیعہ" رقم طراز ہیں کہ:

"اب ذرا اتحاد پسند اور علم بردارانِ اخوت سنی حضرات اپنے کلیجے تھام کے بیٹھیں کہ ان کی باری ہے کیونکہ وہ "شیعہ سنی بھائی بھائی" کی رٹ لگاتے نہیں تھکتے اور اپنی محافل میں شیعہ کو اظہار اخوت کے لئے اہتماماً دعوت دیتے ہیں۔ خدا کرے کہ سنیوں کے حق میں شیعہ کا انداز فکر مثبت ہو جائے۔ ہمیں اس سے یقیناً بڑی خوشی ہوگی مگر اب تو

ہو چلی ختم انتظار میں عمر کوئی آتا نظر نہیں آتا

فی الحال ان کا سنیوں کے حق میں فتویٰ ملاحظہ فرمائیں:

شیعوں کے سب سے بڑے محدث محمد بن یعقوب الکلینی حضرت امام باقر کے نام سے یہ عقیدہ لکھتے ہیں "ان الناس کلھم اولاد بغایا ما خلا شیعتنا" "ہمارے شیعہ کے سوا سب کے سب لوگ حرام زادے ہیں　　{الروضۃ الکافی صفحہ ۱۳۵ جلد ۸}

مزید کرم فرمائی ملاحظہ ہو: "جب امام مہدی ظاہر ہوں گے تو دوسرے کافروں سے پہلے سنیوں کے علماء سے ابتداء کریں گے اور انہیں قتل کریں گے　　{حق الیقین صفحہ ۵۲۷ جلد ۲}

تفسیر مجمع البیان میں بھی حدیث کا یہ مضمون آنحضرت ﷺ سے مروی ہے۔ مشہور شیعہ عالم ملا محمد باقر مجلسی حضرت زین العابدین کے نام سے اہل السنت کو ان الفاظ میں کافر لکھ گئے "سائل نے حضرت زین العابدین سے دریافت کیا کہ مجھے صدیق اکبرؓ اور جناب عمرؓ کے حال سے آگاہ کریں تو آپ نے جواباً فرمایا کہ وہ دونوں کافر تھے اور جو کوئی انہیں (ابو بکر و عمر کو) دوست رکھے وہ بھی کافر ہے۔　　{حق الیقین صفحہ ۵۲۲ جلد ۲}

ایک اور گل افشانی ملاحظہ ہو جس میں اہل السنت کو ناصبی قرار دینے کا یہ پہلو حضرت امام علی النقی کے نام سے پیش کیا گیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں: "سوال کیا گیا کہ ناصبی کے بارے میں اس کے سوا کہ وہ ابو بکرؓ و عمرؓ کو حضرت علیؓ پر مقدم سمجھتا ہے اور ان کی امامت کا قائل ہے کچھ اور جاننا بھی ضروری ہے؟ حضرت نے فرمایا۔ جو کوئی یہ عقیدہ رکھتا ہو وہ ناصبی ہے"　　{حق الیقین صفحہ ۵۲۱ جلد ۲}

یہی ملا باقر مجلسی جو پہلے ناصبی کی یہ تعریف کر آئے ہیں مزید لکھتے ہیں "ناصبی (جو حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کو مقدم سمجھتا ہو) ولد الزنا سے بھی بدتر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتے سے بدتر کسی چیز کو نہیں بنایا　لیکن ناصبی خدا کے نزدیک کتے سے بھی زیادہ خوار و بدتر ہے"

{حق الیقین صفحہ ۵۱۹ جلد ۲}

اس کے بعد حضرت موصوف "امام انقلاب علامہ خمینی کے نظریات و خیالات" واضح کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "آپ نے دیکھا کہ خمینی صاحب کا توسنِ بے لگام۔ کس طرح حضرت عثمانؓ کو بھی روندتا نکل گیا یہاں تک کہ آپ کو بھی بدقماش کہہ گئے۔ انہیں اتنا بھی خیال نہ آیا کہ اُدھر وہ شیعہ سنی بھائی بھائی کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہیں اور اِدھر مسلمانوں کی ایک جماعت کثیر (سنیوں) کے اکابر پر سب و شتم کے دروازے بھی کھول رہے ہیں۔ جن باضمیر

مسلمانوں کے دل میں امہات المومنین، ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، اور دیگر اکابرامت کی ذرہ بھر بھی عزت ہے انہیں اتنا کچھ پڑھ لینے کے بعد تو بیدار ہونا چاہیے اور اگر اب بھی بیداری کا امکان نہیں تو پھر بے ضمیر اور ناپاک زندگی مبارک ہو۔

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید ضمیر پاک وخیال بلند وذوق لطیف (ضرب کلیم)

شیعہ کی محولہ بالا عبارات نقل کرنے کے دوران مجھے سلطان العارفین حضرت ابوسعید ابوالخیر قدس سرہ کی ایک رباعی یاد آ گئی۔ فرماتے ہیں۔

یا گردن روزگار را زنجیرے یا سرکشی زمانہ را تدبیرے
ایں زاغ وشاں بسے پرید ند بلند سنگے، چوبے، گرزے، خدنگے، تیرے

ترجمہ: آفاق کی گردن میں زنجیر ڈال کر اسے مسخر کر لے۔ یا زمانے کی سرکشی کا کوئی علاج کر۔ کیونکہ یہ زاغ فطرت (سنی کوے) حقیقۃ حدود سے بڑھ کر پرواز کر رہے ہیں۔ ان پر کسی پتھر، لکڑی، چھڑی یا تیر سے ضرب کاری لگاتے ہوئے انہیں آداب حدود سکھا۔

(نامذہب باب ہشتم صفحہ ۲۷۷-۲۸۰)

حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب امیر خدام اہلسنت پاکستان

"ماہ اپریل (۱۹۷۵ء) کے ہی گذشتہ ہفتہ میں ایک خط ناظم اتحاد طلبہ مدارس عربیہ لاہور کی طرف سے موصول ہوا جس میں ہمارے مدرسہ اظہار الاسلام کے طلباء کو بھی سنی، شیعہ مدارس کے طلباء کی متحدہ تنظیم میں شمولیت کی دعوت دی گئی تھی۔ چونکہ ہمارے نزدیک اس قسم کا شیعہ سنی اتحاد دینی مدارس کے طلباء کے لیئے انجام کار بہت خطرناک ہے کیونکہ اب تک تو سبائیت کے جراثیم سے اہل سنت کے دینی مدارس محفوظ رہے ہیں۔ اکابر علماء اہل سنت نے ہمیشہ فتنہ روافض سے تحفظ کے لیئے بڑی محنت کی ہے۔ متاخرین علماء میں سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ نے "تحفہ اثنا عشریہ" اور حضرت مولانا حیدر علی صاحب تلمیذ رشید شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے "منتہی الکلام" اور "ازالۃ الغین" جیسی ضخیم علمی تحقیقی کتابیں تصنیف کر کے مذہب اہل سنت اور مذہب اہل تشیع کا بنیادی اور اصولی دینی فرق واضح کر دیا ہے اور ان کے بعد امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ

نے تو تنہا اپنی خداداد علمی ذکاوت اور مخلصانہ تحریری اور تقریری جدوجہد سے سبائیت کے سیلاب کے آگے مضبوط بند باندھ دیا ہے۔ دیوبندی مسلک کے علماء ہوں یا بریلوی کے ہمیشہ فتنہ رفض سے سواداعظم اہل سنت کو بچانے کی کوشش کرتے چلے آرہے ہیں۔

علمائے اہل تحقیق جانتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "ماانا علیہ واصحابی" کے تحت اہل سنت ہی صرف ناجی فرقہ ہیں ان کے علاوہ رافضی اور خارجی وغیرہ ان ۷۲ ناری فرقوں میں سے ہیں جو جہنم کے راستے پر چلنے والے ہوں گے۔

اہل سنت کے دینی مدارس کا اصل مقصد ہی "ماانا علیہ واصحابی" کی تعلیم وتدریس ہے۔ اگر سنی طلباء دوران تدریس خلافت راشدہ کی حقانیت صحابہ کرام کا معیار حق ہونا وغیرہ مسائل دلائل وبراھین سے حل کرلیں تو علوم متداولہ سے فراغت کے بعد وہ عامۃ المسلمین کو "ماانا علیہ واصحابی" کی شاہراہ جنت دکھا سکتے ہیں۔ لیکن افسوس آج دینی مدارس کے طلباء کو بھی تحفظ ناموس صحابہؓ کی طرف کم توجہ ہے الا ماشاء اللہ اور اسی ذہن کی یہی وہ کمزوری ہے جو شیعیت اور سبائیت کے ساتھ بھی اتحاد کی دعوت دے رہی ہے۔

اس پرفتن دور میں "اتحاد واتحاد" کا نعرہ بلند ہے جس کی وجہ سے اتحاد کی مخالفت کرنے والا ہدف طعن بنایا جاتا ہے لیکن قابل فکر امر یہ ہے کہ کیا شہد اور زہر کا، مرض اور صحت کا اور حب اور بغض کا اتحاد بھی کارگر ہوسکتا ہے؟ جس طرح سیلاب کی روک تھام کے لیئے سیلاب میں ڈبونے والوں کو اور آگ سے بچاؤ کے لیئے آگ میں جھونکنے والوں کو شریک کار اور معاون نہیں بنایا جا سکتا اسی طرح منکرین سنت اور منکرین صحابہؓ کو بھی ان خالص دینی مدارس کی تنظیم واتحاد میں شریک کار نہیں بنایا جانا چاہیے جو کہ سنت اور صحابہؓ کے شرعی مقام کی تعلیم وحفاظت کے لیئے قائم کیئے گئے ہیں اور معمولی مشکلات وموانع کو اضطراری صورتوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا جن میں بقدر ضرورت حرام کا استعمال مباح ہو جاتا ہے۔ طلباء کے لیئے سفری سہولتیں حاصل کرنا اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ اس کی وجہ سے اہل سنت کے دینی مدارس کو ایک نئے ابتلاء میں ڈال دیا جائے اور ایسا کرنے سے سنیت اور شیعیت کی امتیازی حدود ہی ختم ہو جائیں گی۔ اگر تنظیم واتحاد کی بنیاد صرف طلباء کی برادری کو بنایا جائے قطع نظر بنیادی عقائد کے تو پھر اس متحدہ تنظیم میں مرزائی طلباء کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے اور عیسائی طلباء بھی شامل ہوں کیوں کہ سنی اور شیعہ کا اختلاف صرف

مکاتب فکر کا فروعی اختلاف نہیں بلکہ یہ ایک بنیادی دینی اختلاف ہے۔

جب اہل سنت اور اہل تشیع میں اتنا بنیادی اصولی اختلاف ہے کہ کلمۂ اسلام تک مشترک نہیں ہے تو دونوں مذہبوں کے دینی مدارس کے باہمی اتحاد اور مشترکہ تنظیم کی تجویز بالکل ناجائز ہے اگر آپ سنی ہیں اور سنی مذہب کو حق سمجھتے ہیں تو پھر اس فریب میں نہ آئیں ورنہ اگر باوجود شیعہ عقائد مذکورہ سے واقف ہونے کے آپ شیعہ سنی مذہبی اتحاد مدارس کی تنظیم میں حصہ لیں گے تو آپ مذہب اہل سنت کو سخت نقصان پہنچائیں گے اگر یہ مشترکہ اجلاس فی الواقع جامعہ مدنیہ لاہور میں ہوا ہے اور ایسی کوئی تنظیم قائم کر دی گئی ہے تو یہ میرا خط حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب مہتمم جامعہ مدنیہ کی خدمت میں بھی پیش کر دیں تا کہ مولانا موصوف دوسرے پہلوؤں کے پیش نظر سابقہ فیصلہ سے رجوع کر لیں۔ لہٰذا ان حالات میں مذہب اہل سنت والجماعت اور ناموس خلفاء عظامؓ اور صحابہ کرامؓ کے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ مرزائیوں کی طرح روافض وخوارج وغیرہ ان مذہبی گروہوں اور پارٹیوں سے بھی اجتناب واحتراز کیا جائے جو انکار صحابہؓ یا تنقید صحابہ کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہیں اور حضور رحمۃ للعلمین خاتم النبیین علیہ السلام کے ارشاد "ما انا علیہ واصحابی" کی شاہراہ جنت کو چھوڑ کر جہنم کے راستوں پر امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کو چلانا چاہتے ہیں۔ سنت طیبہ اور جماعت مقدسہ (صحابہ کرامؓ) کا حق تو ہم پر یہ تھا کہ مال وجان کی قربانی دے کر بھی ان کے ناموس کی حفاظت کی جاتی نہ یہ کہ عربی مدارس کے طلباء کے لیے چند دنیوی سفری مراعات حاصل کرنے کے لیے تحفظ عظمت صحابہ کرامؓ کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ سواد اعظم اہل سنت کو ہر قسم کے فتنوں سے محفوظ رکھیں تا کہ ان کے ذریعے پرچم خلافت راشدہ بلند ہو جائے۔" (عربی دینی مدارس کے سنی شیعہ اللہ کا اتحادی فتنہ صفحہ ۲۰)

اس طویل بحث کے آخر میں "علمائے اسلام" کی خدمت میں حضرت مولانا سعید الرحمٰن علوی" سابق مدیر ہفت روزہ خدام الدین لاہور کا ایک پر درد اور فکر انگیز اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

صدائے اسلام بنام علمائے کرام ومشائخ عظام وامت اسلام

اے علمائے اسلام اولیائے رحمٰن وامت اسلام

اٹھو اور عوام الناس کو خواب سے بیدار کرو اور دشمنان سنت وجماعت کے مقابلے میں

متحد ہو کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاؤ۔ ان لوگوں کے مقابلے میں جنہوں نے کلمہ اسلام و اذان، حکم وضو و صورت نماز کو بدل ڈالا۔

نیز اوقات سحر و افطار اور احکام حج و خمس و زکوۃ میں تغیر و تبدل کر دیا جنہوں نے تحریف قرآن کا عقیدہ اپنایا اور صحابہ کرامؓ سے روایت شدہ سرمایہ حدیث کو باطل ٹھہرایا جنہوں نے حضرت ابو بکر و عمر و عثمانؓ کی شرعی امامت کا انکار کیا جو اپنے بارہ اماموں کی امامت منصوصہ و معصومہ مفترض الطاعت، افضل من النبوۃ والرسالۃ پر ایمان لائے اس اعتقاد کے ساتھ کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے ائمہ کی سلطنت و اقتدار تکوینی کا تابع و غلام ہے۔ جنہوں نے معجزات انبیاء و مرسلین کو اپنے ائمہ کے ساتھ مخصوص کیا اور اقوال ائمہ کو احادیث معصومین کا نام دے کر سید المرسلین و خاتم النبیین کی احادیث و سنن کے مقام تک پہنچا دیا اور اس طرح اپنے ائمہ کو سنت و نبوت میں شریک ٹھہرانے کا باعث بنے۔ جنہوں نے گنتی کے چند افراد کو چھوڑ کر تمام صحابہ کرامؓ کو سیدنا علیؓ سے پہلے سیدنا ابو بکر و عمر و عثمانؓ کی بیعت امامت و خلافت کرنے کی بناء پر فاسق و کافر قرار دیا۔ جو نبی اسلام کے اہل بیت میں سے ازواج رسول ﷺ امہات المومنین کو خارج قرار دے کر نص قرآنی کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے اور تین دختران پیغمبر کو بے عقل جانوروں کی طرح بلا دلیل و حجت نبی اسلام ﷺ کی بجائے دوسرے باپ کی طرف منسوب کر کے جرم توہین رسول ﷺ کے مرتکب ہوئے۔ جنہوں نے اسلام کے نام پر تقیہ، متعہ، رجعت، بداء اور ایسی ہی دیگر خرافات کا سہارا لیا۔ جو سیدنا علیؓ و حسنؓ سے ان کے زمانہ خلافت میں غداری اور بے وفائیاں کرتے رہے۔ پھر سیدنا حسینؓ کو بیعت کے لئے کوفہ تشریف لانے کی دعوت دیتے ہوئے ہزاروں خطوط لکھے اور جنہوں نے ایک لاکھ سے زائد تعداد میں ہونے کے باوجود بے وفائی کرتے ہوئے انہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر ابن زیاد کی بیعت بسرعت تمام کر لی۔ پس حسینؓ و رفقائے حسینؓ ان کی سازشوں کے نتیجے میں شہید ہو گئے۔

اے علمائے اسلام و اولیائے رحمٰن! اٹھو اور عوام الناس کو بیدار کرو۔ شریعت و اسلام اور ناموس انبیاء و صحابہ کرامؓ کا دفاع و تحفظ کرو اور مصحف قرآن کو اسلام سے منسوب باطل فرقوں کی سازشوں سے بچا لو۔

اللہ تم سب کو اپنی رضا و پسند کے مطابق عمل کی توفیق دے اور دشمنان سنت و جماعت کو

تاقیامت ذلت ورسوائی عطافرمائے آمین (افکار شیعہ صفحہ ۵۴۲-۵۴۳)

اس بحث کی تکمیل کے ساتھ ہی زیر نظر کتاب "شیعیت تاریخ وافکار" (جس میں اہل تشیع کے تمام فرقوں کے عقائد ونظریات اور اس کی مکمل تاریخ زمانہ بزمانہ ازابتداء تااختتام بیسویں صدی یعنی ۳۱ دسمبر ۲۰۰۰ء مطابق ۴ شوال ۱۴۲۱ھ شامل ہے) مکمل ہوگئی ہے۔

فالحمد لله على ذلك حمدا كثيرا

باری تعالیٰ اس حقیر کاوش کو شرف قبول عطا فرمائے، غلطیوں اور خطاؤں کو معاف فرمائے، اس کتاب کو مخالفین، معاندین، ناقدین، مبغضین اور معترضین کی ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ نیز امت مسلمہ کو دشمنان اسلام کے مکائد سمجھنے، ان کے ہر وار سے محفوظ رہنے، حق بات کہنے اور حق بات قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے" آمین"

ان اريد الا الاصلاح ما استطعت و ماتوفيقي الا بالله

پروفیسر قاضی محمد طاہر علی الہاشمی

خطیب۔ مرکزی جامع مسجد

سیدنا معاویہؓ چوک حویلیاں ہزارہ

۴ شوال ۱۴۲۱ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۲۰۰۰ء

ماخذ، مصادر و مراجع

۱۔ قرآن مجید
۲۔ صحیح بخاری ——— امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری
۳۔ صحیح مسلم ——— امام مسلم بن حجاج نیشاپوری
۴۔ جامع ترمذی ——— ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی
۵۔ مسند احمد بن حنبل ——— امام احمد بن حنبل
۶۔ مشکوۃ المصابیح ——— شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ تبریزی
۷۔ مفردات القرآن ——— امام راغب اصفہانی
۸۔ لغات الحدیث ——— وحید الزمان خان
۹۔ منہاج السنۃ ——— امام ابن تیمیہ
۱۰۔ المنتقی ——— امام ذہبی
۱۱۔ طبقات ابن سعد ——— امام ابن سعد
۱۲۔ سیرت ابن ہشام ——— ابو محمد عبدالملک بن ہشام
۱۳۔ تاریخ طبری ——— ابن جریر طبری
۱۴۔ تاریخ مسعودی ——— ابوالحسن بن حسین بن علی المسعودی
۱۵۔ البدایہ والنہایہ ——— امام ابن کثیر
۱۶۔ تاریخ ابن خلدون ——— علامہ عبدالرحمٰن بن خلدون
۱۷۔ تاریخ الخلفاء ——— امام جلال الدین سیوطی
۱۸۔ تاریخ اسلام ——— اکبر شاہ خان نجیب آبادی
۱۹۔ تاریخ زوال ملت اسلامیہ ——— اکبر شاہ خان نجیب آبادی
۲۰۔ تاریخ اسلام ——— شاہ معین الدین ندوی
۲۱۔ تاریخ ادب عربی ——— ڈاکٹر زبید احمد
۲۲۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ——— شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
۲۳۔ خلافت اسلامیہ ——— مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی

۲۴۔ تاریخ ایران ——— پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی
۲۵۔ تاریخ اسلامی جمہوریہ ایران ——— شیخ محمد حیات
۲۶۔ ایران۔ افکار و عزائم ——— نذیر احمد
۲۷۔ تاریخ کشمیر ——— ڈاکٹر صابر فاروقی
۲۹۔ تاریخ پونچھ ——— محمد الدین فوق
۳۰۔ تاریخ تفسیر و مفسرین ——— پروفیسر غلام احمد حریری
۳۱۔ الصواعق المحرقہ ——— احمد بن حجر الہیتمی
۳۲۔ السیف المسلول ——— قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی
۳۳۔ آب کوثر ——— شیخ محمد اکرام
۳۴۔ موج کوثر ——— شیخ محمد اکرام
۳۵۔ رود کوثر ——— شیخ محمد اکرام
۳۶۔ شہاب نامہ ——— قدرت اللہ شہاب
۳۷۔ بنی اسرائیلی روایات ——— مولانا اسیر ادروی
۳۸۔ اوراق پارینہ ——— خواجہ غلام احمد پنڈت
۳۹۔ تاریخ پاکستان ——— مفتاح الدین ظفر
۴۰۔ مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی ——— اشرف ظفر لاہور
۴۱۔ ہندوستان میں مسلم فرقہ واریت ——— ڈاکٹر محمد ایوب قادری
۴۲۔ تحفہ اثنا عشریہ ——— شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی
۴۳۔ غنیۃ الطالبین ——— شیخ عبدالقادر جیلانی
۴۴۔ تاریخی دستاویز ——— مولانا ضیاء الرحمن فاروقی
۴۵۔ شیعیت کا اصلی روپ ——— غلام محمد۔ سندھ
۴۶۔ شیعیت ——— مترجم استاذ ابوزبیر مدنی
۴۷۔ افکار شیعہ ——— مولانا سعید الرحمن علوی
۴۸۔ حقیقت مذہب شیعہ ——— حکیم فیض عالم صدیقی

۴۹۔ عبداللہ بن سبا ——— حکیم فیض عالم صدیقی
۵۰۔ دو متضاد تصویریں ——— مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
۵۱۔ الوشیعۃ ——— علامہ موسیٰ جار اللہ
۵۲۔ یازدہ نجوم ——— مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی
۵۳۔ طلوع سحر ——— سید ابو معاویہ ابوذر بخاری
۵۴۔ سبائی سبز باغ ——— عزیز احمد صدیقی
۵۵۔ ارمغان نجم ——— عزیز احمد صدیقی
۵۶۔ اسلام اور منافقت ——— لیفٹیننٹ کمانڈر (ریٹائرڈ) عبدالجلیل خان
۵۷۔ آیات بینات ——— سید محمد مہدی علی خان
۵۸۔ ایرانی انقلاب ——— مولانا محمد منظور نعمانی
۵۹۔ متفقہ فتویٰ ——— مولانا محمد منظور نعمانی
۶۰۔ خمینی ازم ——— مولانا ضیاء الرحمان فاروقی
۶۱۔ انقلاب ایران ——— مولانا عتیق الرحمان سنبھلی
۶۲۔ آتش ایران ——— سید آل عمران مشہدی
۶۳۔ آتش کدہ ایران ——— اختر کاشمیری
۶۴۔ خمینیت عصر حاضر میں ——— مولانا حبیب الرحمن قاسمی
۶۵۔ استاد خمینی ——— سید عبدالقادر آزاد
۶۶۔ التحفۃ الحمیدیۃ ——— سید عبدالقادر آزاد
۶۷۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ——— پنجاب یونیورسٹی لاہور
۶۸۔ شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا ——— سید قاسم محمود لاہور
۶۹۔ شاہکار رسالت ——— غلام احمد پرویز
۷۰۔ فقہ القرآن ——— مولانا عمر احمد عثمانی
۷۱۔ الشیعۃ والسنۃ ——— علامہ احسان الٰہی ظہیر
۷۲۔ الشیعۃ والتشیع ——— علامہ احسان الٰہی ظہیر

۷۳۔ ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت ——— ڈاکٹر زاہد علی

۷۴۔ اسماعیلیہ اور عقیدہ امامت ——— سید تنظیم حسین

۷۵۔ مذاہب اسلام ——— شیخ محمد ابوزہرہ

۷۶۔ ارشاد الشیعہ ——— مولانا سرفراز خان صفدر

۷۷۔ عقائد جعفریہ ——— مولانا محمد علی

۷۸۔ تحفہ حسینیہ ——— علامہ محمد اشرف سیالوی

۷۹۔ شیعہ سنی اختلافات اور صراط مستقیم ——— مولانا محمد یوسف لدھیانوی

۸۰۔ حقیقت رفضیت ——— ڈاکٹر محمد یوسف نگرامی

۸۱۔ ہم سنی کیوں ہیں ——— حافظ مہر محمد میانوالی

۸۲۔ تحذیر المسلمین ——— مولانا اللہ یار خان

۸۳۔ مذہب شیعہ ——— خواجہ قمرالدین سیالوی

۸۴۔ مذہب شیعہ ——— ابومعاویہ نور حسین عارف

۸۵۔ مذاہب الاسلام ——— مولانا محمد نجم الغنی خان رامپوری

۸۶۔ اسلام اور عصر حاضر ——— مولانا سمیع الحق

۸۷۔ اسلامی تصوف ——— پروفیسر یوسف سلیم چشتی

۸۸۔ کلیات امدادیہ ——— مولانا امداد اللہ مہاجر مکی

۹۸۔ سلاسل طیبہ ——— مولانا حسین احمد مدنی رح

۹۰۔ شریعت اور طریقت ——— مولانا اشرف علی تھانوی

۹۱۔ تصوف اور طریقت ——— مولانا عبدالرحمن کیلانی

۹۲۔ تصوف و سلوک ——— مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی

۹۳۔ سنی موقف ——— مولانا علی شیر حیدری

۹۴۔ عالم اسلام کے خلاف سازشیں ——— عزیز الرحمن قریشی

۹۵۔ شیعیت کے داغ ——— نوید احسن ندوی

۹۶۔ نام و نسب ——— پیر سید نصیرالدین نصیر گیلانی (گولڑہ)

۹۷۔ ماہنامہ اقرا ڈائجسٹ ——— شیعیت نمبر کراچی
۹۸۔ ماہنامہ بینات ——— کراچی
۹۹۔ ماہنامہ نقیب ختم نبوت ——— ملتان
۱۰۰۔ ماہنامہ میثاق ——— لاہور
۱۰۱۔ ماہنامہ الحق ——— اکوڑہ خٹک
۱۰۲۔ ماہنامہ خلافت راشدہ ——— جھنگ
۱۰۳۔ ماہنامہ نصرت العلوم ——— گوجرانوالہ
۱۰۴۔ ماہنامہ تعلیم القرآن ——— راولپنڈی
۱۰۵۔ ماہنامہ الوار مدینہ ——— لاہور
۱۰۶۔ قومی ڈائجسٹ صحابہ نمبر ——— لاہور
۱۰۷۔ ہفت روزہ زندگی ——— لاہور
۱۰۸۔ ہفت روزہ تکبیر ——— کراچی
۱۰۹۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام ——— لاہور

کتب شیعہ

۱۱۰۔ ترجمہ قرآن ——— سید فرمان دہلوی
۱۱۱۔ القرآن المبین ——— سید امداد حسین کاظمی المشہدی
۱۱۲۔ آثار حیدری ——— امام حسن عسکری
۱۱۳۔ اصول کافی ——— محمد بن یعقوب کلینی
۱۱۴۔ الصحیح الجعفری ——— مترجمہ سید نجم الحسن کراروی
۱۱۵۔ عین الحیاۃ ——— ملا باقر مجلسی
۱۱۶۔ جلاء العیون ——— ملا باقر مجلسی
۱۱۷۔ حق الیقین ——— ملا باقر مجلسی
۱۱۸۔ تذکرۃ الائمہ ——— ملا باقر مجلسی
۱۱۹۔ کشف الاسرار ——— امام خمینی

۱۲۰۔ تحریر الوسیلہ ——— امام خمینی
۱۲۱۔ الحکومۃ الاسلامیۃ ——— امام خمینی
۱۲۲۔ تحفۃ العوام مع اضافہ ——— مولوی سید مظفر حسین قبلہ
۱۲۳۔ تحقیقی دستاویز ——— ابومصعب جوادی
۱۲۴۔ تاریخ شیعہ ——— ڈاکٹر باقر
۱۲۵۔ شیعیت کا آغاز کب اور کیسے؟ ——— باقر الصدر
۱۲۶۔ تاریخ شیعہ ——— محمد حسین مظفر
۱۲۷۔ شیعہ ——— علامہ سید محمد طباطبائی
۱۲۸۔ ادیان عالم اور فرقہ ہائے اسلام ——— علی حیدر نقوی
۱۲۹۔ اصل و اصول الشیعہ ——— آل کاشف الغطاء
۱۳۰۔ امام خمینی کے حالات زندگی ——— موسیٰ خان جلال زئی
۱۳۱۔ شیعہ ہی اہلسنت ہیں ——— ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی
۱۳۲۔ میں بھی سچوں کے ساتھ ہو جاؤں ——— ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی
۱۳۳۔ تذکرہ علماء امامیہ ——— سید حسین عارف نقوی
۱۳۴۔ تذکرۃ الاطہار ——— علامہ شیخ مفید
۱۳۵۔ عقائد الابرار ——— علامہ اشیر جاڑوی
۱۳۶۔ علائم الظہور ——— آقا محمد محسن
۱۳۷۔ مصباح العقائد ——— مرزا حسن الحائری
۱۳۸۔ وفات عائشہ ——— مرزا یوسف حسین
۱۳۹۔ آگ خانہ بتول پر ——— عبدالکریم مشتاق
۱۴۰۔ علی ولی اللہ ——— عبدالکریم مشتاق
۱۴۱۔ اثنا عشری شیعہ ڈائجسٹ ——— جولائی ۱۹۸۲ء کراچی
۱۴۲۔ جاگیر فدک ——— غلام حسین نجفی
۱۴۳۔ بغاوت بنی امیہ ——— غلام حسین نجفی

۱۴۴۔ قول مقبول ——— غلام حسین نجفی

۱۴۵۔ سہم مسموم ——— غلام حسین نجفی

۱۴۶۔ حقیقت فقہ حنفیہ ——— غلام حسین نجفی

۱۴۷۔ تحفہ حنفیہ ——— غلام حسین نجفی

۱۴۸۔ شیعان علی اور ان کی شان ——— غلام حسین نجفی

۱۴۹۔ کردار یزید ——— غلام حسین نجفی

۱۵۰۔ تاریخ اسلام .... علامہ محمد بشیر انصاری

۱۵۱۔ نہج البلاغہ .... مترجمہ مفتی جعفر حسین

۱۵۲۔ سیاست معاویہ و یزید .... منظور حسین بخاری

۱۵۳۔ سیاست راشدہ .... علی اکبر شاہ

۱۵۴۔ امامت و ملوکیت .... علامہ حسین بخش جاڑا

۱۵۵۔ خلافت و امامت .... حق برادرز لاہور

۱۵۶۔ فضائل مرتضوی .... ملا باقر علی

۱۵۷۔ ہزار تمہاری دس ہماری .... عبد الکریم مشتاق

۱۵۸۔ آواز (اعلان غدیر) .... عبد الکریم مشتاق

۱۵۹۔ چار یار .... عبد الکریم مشتاق

۱۶۰۔ یار رسول اور غار ثور .... عبد الکریم مشتاق

۱۶۱۔ بل اور بو .... عبد الکریم مشتاق

۱۶۲۔ مقام عمر .... علی اکبر شاہ

۱۶۳۔ شیخ سقیفہ .... علی اکبر شاہ

۱۶۴۔ شیعہ کافر تو سب کافر .... علی اکبر شاہ

۱۶۵۔ ماہنامہ وحدت اسلامی .... سفارت اسلامی جمہوری ایران اسلام آباد

وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُم مَّا يَكُونُ لَنَا أَن نَّتَكَلَّمَ بِهَٰذَا سُبْحَانَكَ هَٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ (النور)

اور کیوں نہ جب تم نے اس کو سنا تھا تو کہا ہوتا ہم کو نہیں لائق کہ منہ پر لائیں یہ بات اللہ تو پاک ہے یہ تو بڑا بہتان ہے۔

حدیثِ کلابِ حوأب کا تاریخی تحقیقی اور

علمی محاکمہ

بجوابِ رسالہ:

حدیث کلاب حوأب پر قیل و قال کا علمی محاسبہ

پروفیسر قاضی محمد طاہر علی الہاشمی

ضخامت ۶۰۱ صفحات　　زرِ تعاون ۵۰ روپے

ناشر: قاضی چن پیر الہاشمی اکیڈمی حویلیاں ہزارہ

پروفیسر قاضی محمد طاہر علی الہاشمی

کی چند ایمان افروز علمی و تحقیقی کتب

نمبر	کتاب	ضخامت	صفحات
1.	اصلاح معاشرہ	ضخامت	۹۶ صفحات
2.	تحقیق نکاح سیدہ	ضخامت	۱۴۴ صفحات
3.	اہلبیت رسول کون؟	ضخامت	۳۶۸ صفحات
4.	فرقہ مسعودیہ نام نہاد جماعت المسلمین کا علمی محاسبہ	ضخامت	۲۴۰ صفحات
5.	تعارف سیدنا معاویہؓ	ضخامت	۹۶ صفحات
6.	تذکرہ سیدنا معاویہؓ	ضخامت	۴۸۸ صفحات
7.	سیدنا معاویہؓ پر اعتراضات کا علمی تجزیہ	ضخامت	۵۷۶ صفحات
8.	حدیث حواب کا مصداق کون؟	ضخامت	۱۴۴ صفحات
9.	شیعیت تاریخ و افکار	ضخامت	۸۲۴ صفحات
10.	حدیث کلاب حواب کا تاریخی، تحقیقی اور علمی محاکمہ	ضخامت	۶۰۸ صفحات

قاضی چن پیر الہاشمی اکیڈمی

مرکزی جامع مسجد سیدنا معاویہؓ چوک حویلیاں ہزارہ